تہذیب الاخلاق

ادارہ تہذیب الاخلاق اور نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

محمد زکریا ورک*

آسمانی مسافر

ایک سال قبل ۱۴ جون ۱۹۹۴ء کو مانٹریال سے ۸۰ کیلومیٹر دور ایک گاؤں سینٹ رابرٹ (St. Robert) میں ایک کسان اپنے جانوروں کی رکھوالی کر رہا تھا کہ اچانک غیر ارادی طور پر اس کی نظر آسمان کی طرف اٹھی۔ اس نے ایک دھوئیں دار شعلہ نما کوئی چیز زمین کی طرف آتی دیکھی۔ چند لمحے بعد اس نے ایک دھماکہ سنا تو اسے یوں محسوس ہوا گویا کوئی جہاز ہوا میں پھٹ گیا ہو اور وہ چیز تیز رفتاری سے زمین کی طرف آ رہی ہے۔ وہ اسے بغور دیکھ تو نہ سکا مگر چند ہی لمحوں میں اس کے گرنے کی آواز اس کو سنائی دی۔ کچھ ہی دور پر اس نے دیکھا کہ اس کے جانور ایک دائرے کی صورت میں اکٹھے ہو کر سہمے کھڑے تھے۔

وہ اس مقام کی طرف لپکا تو اسے وہاں زمین میں ایک تازہ سوراخ نظر آیا جو قریب ۲۵ سینٹی میٹر گہرا تھا۔ سوراخ میں اسے ایک پتھر نظر آیا جو اس نے بیلچے سے باہر نکالا۔ سائز میں یہ خربوزے کے برابر تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود پتھر ہی آسمانی مسافر تھا جو ہزاروں ہزار میل کا سفر طے کر کے ابھی ابھی زمین پر گرا تھا۔

یہ شہاب ثاقب درحقیقت ایک بڑے ستارے کا حصہ تھا جو مانٹریال کی طرف آتے ہوئے ہوا میں Friction پیدا ہونے سے زبردست دھماکے سے پھٹ گیا تھا اور اس کا صرف معمولی سا حصہ زمین تک پہنچ سکا تھا۔ گاؤں کے اردگرد جب مزید ٹکڑوں کی تلاش کی گئی تو ۲۰ مزید چھوٹے چھوٹے پتھر دستیاب ہوئے تھے۔

کینیڈا کی تاریخ میں آج تک صرف بارہ واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ کسی شخص نے شہاب ثاقب گرتے دیکھا اور پھر بعد میں اسے دستیاب بھی کر لیا گیا۔ مانٹریال کے قریب جو شہاب ثاقب گرنے کا واقعہ رونما ہوا وہ شاید بیس سال میں صرف ایک دفعہ ہوتا ہے۔ آج سے چار بلین سال قبل جب سیارے وجود میں آ رہے تھے تو اس وقت جو مادہ سیارے بننے سے رہ گیا وہ Rubble کی صورت میں آج بھی خلا میں موجود ہے اور وقتاً فوقتاً زمین کے اندر شہاب ثاقب کی صورت میں داخل ہوتا رہتا ہے۔

سائنس دانوں کے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ خربوزے کے سائز کے شہاب ثاقب ہماری زمین کے اندر چند گھنٹوں میں کئی ایک داخل ہوتے ہیں۔ ایسے آنے والے پتھروں کی رفتار گیارہ کیلومیٹر سے لے کر ۷۰ کیلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ کرۂ زمین میں داخل ہو کر جب یہ EXPLODE ہوتے ہیں تو سطح زمین سے اوپر فضا میں یہ

---

* پوسٹ بکس ۶۵، کنگسٹن ، او این ، کے ۷ ایل ۴ وی ۶ ، کینیڈا

مجلسِ ادارت

پروفیسر شمیم احمد وائس چانسلر (صدر)

جناب سید حامد

جناب سید ہاشم علی

پروفیسر آل احمد سرور

پروفیسر نورالحسن نقوی

پروفیسر نعیم احمد

پروفیسر افتخار حسین صدیقی

پروفیسر اسرار احمد

پروفیسر کبیر احمد جائسی

جناب [illegible] شروانی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

۲۰ کیلومیٹر کی اونچائی تک نظر آجاتے ہیں۔

تباہ کن دھماکے۔

شہاب ثاقب جب زمین کی فضا میں داخل ہوتے ہیں تو اس سے دھماکہ پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ انسانی میں سب سے بڑا دھماکہ جو شہاب ثاقب سے پیدا ہوا وہ روس کے علاقے سائبیریا میں ۳۰ جون ۱۹۰۸ء کو رونما ہوا۔ اس عظیم دھماکے سے ایک ہزار مربع کیلومیٹر کا علاقہ بُری طرح متاثر ہوا۔ یہ دھماکہ اس قدر خوفناک تھا کہ ایک آدمی جو ۶۰ میل دور کھڑا تھا وہ زمین پر گر پڑا اور پیدا ہونے والی SHOCK WAVES سے وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس واقعہ کو TUNGUSKA-EVENT کہا جاتا ہے۔ دھماکے کے ہونے کی اصل وجہ ایک ۳۰ میٹر چوڑی چٹان تھی جو فضا میں ۱۰ کیلومیٹر اوپر بلندی میں یک لخت پھٹی۔ اس کے پھٹنے سے جو تباہی پیدا ہوئی وہ ۱۰ میگاٹن کے ایک ہائیڈروجن بم کے پھٹنے کے برابر تھی۔ کہتے ہیں کہ ۳۰ میل کے علاقے میں موجود تمام درخت جھلس کر راکھ ہو گئے تھے۔

زمین میں داخل ہونے والے شہاب ثاقب اور ہونے والے واقعات کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے شہاب ثاقب صحراؤں میں یا سمندر میں یا زمین کے بنجر و برفانی علاقوں میں گرتے ہیں جہاں آبادی زیادہ نہیں ہوتی۔ مانٹریال کے قریب جو شہاب ثاقب گرا تھا اس کو قریبی شہروں میں رہنے والے لوگوں نے بھی دیکھا تھا۔ اس ستارے کے گرنے سے جو فضاء میں ارتعاش پیدا ہوا وہ ۲۰۰ کیلومیٹر دور شہر اٹاوہ میں محسوس کیا گیا۔ ستارے کے گرنے کے بعد جو فضاء میں سفید دھواں دھار لکیر نمودار ہوئی تھی وہ فضا میں ۲ منٹ تک قائم رہی تھی۔

ستارے کی ملکیت۔

جب شہاب ثاقب کسی کی زمین یا گھر کے اوپر گرتا ہے تو وہ اس کی ملکیت بن جاتا ہے۔ دنیا میں جو لوگ ایسے آسمانی پتھر اکٹھے کرتے ہیں، وہ بعض دفعہ کوئی بھی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ بعض ستارے قیمتی دھاتوں سے بنے ہوتے ہیں۔ کینیڈا کی وفاقی حکومت کے ادارے جیولوجیکل سروے آف کینیڈا نے مانٹریال کے قریب گرنے والے ستارے کو ۱۰،۰۰۰ ڈالر ادا کر کے خرید لیا تھا اور اب اس ستارے کو National Meteriot Collection of Canada میں شامل کر لیا گیا ہے جہاں پہلے ہی ۷۰۰ ایسے ستاروں کے نمونے محفوظ ہیں۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ شہاب ثاقب کائنات کے سب سے زیادہ پُرانے پتھر ہیں ان کی اکثریت مریخ کے سیارے اور عطارد Jupiter کے سیارے کے درمیان پائی جانے والی ستاروں کے Asteroid Belt کے Junkyard سے آتی ہے۔ ماہرین فلکیات ان ستاروں کا گزشتہ دو سو سالوں سے عرق ریزی سے مطالعہ کرتے آرہے ہیں۔ ان ستاروں میں سے بعض آئرن اور نکل (Nickle) کی دھاتوں سے بنے ہوتے ہیں مگر ان کی اکثریت نوّے فی صد پتھر سے بنی ہوتی ہے۔ دنیا میں آج تک تین ہزار قسم کے شہاب ثاقب دریافت ہوئے ہیں ان میں سے ۵۰ قسم کے کینیڈا میں پائے جاتے ہیں۔

عجیب و غریب حقائق۔

- نیویارک کے ایک عجائب گھر میں ایک شہاب ثاقب کا وزن ۳۱ میٹرک ٹن ہے۔ اس کو مشہور و معروف امریکی رابرٹ پیری (Robert Peary) نے گرین لینڈ کے ملک میں تلاش کیا تھا۔ ۱۸۹۴ء

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۴ | جنوری۔فروری ۱۹۹۵ء | شمارہ ۱،۲

بانی: سرسید احمد خاں

مدیر

پروفیسر مسعود عالم

نائب مدیر

احمد مجتبیٰ قریشی

سرکولیشن انچارج: محمد عتیق

فی شمارہ 5 00 روپے — زر سالانہ: 65=00 — زر سالانہ طلبہ 45=00 روپے

بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک) 30=00 امریکی ڈالر — بیرونی ممالک (عام ڈاک) 15=00 امریکی ڈالر

لائف ممبر شپ (اندرون ملک) 650=00 روپے — لائف ممبر شپ (بیرون ممالک) 300=00 امریکی ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر: تہذیب الاخلاق اور نشانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۰۲۰۰۲ (یوپی) انڈیا۔ فون: 401027

میں امریکی حکومت نے یہ ستارہ خرید لیا اور اسے نیویارک کے عجائب گھر میں رکھ دیا گیا۔

- ۱۹۴۷ء میں سائبیریا کے علاقے میں جو شہاب ثاقب گرا تھا اس کا وزن ۱۰۰ میٹرک ٹن تھا۔
- امریکہ کی ریاست ایری زونا میں زمین میں ایک گڑھا (CRATER) ۴۱۵۰ فٹ لمبا اور ۵۷۰ فٹ گہرا ہے۔ یہ شہاب ثاقب کے گرنے سے ۵۰۰۰۰ سال قبل پیدا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد جو پتھر دستیاب ہوئے ہیں وہ لوہے کے بنے ہوئے تھے۔
- کینیڈا کے صوبہ اونٹاریو کے شہر BRENT میں شہاب ثاقب کے گرنے سے پیدا ہونے والے گڑھے کا قطر چار میل ہے۔ نیز سڈبری شہر میں موجود گڑھے کا قطر ۱۴۰ کیلو میٹر ہے۔
- عراق میں ایک ایسے گڑھے کا قطر ۲ میل ہے۔
- دنیا کا سب سے وزنی شہاب ثاقب ساؤتھ افریقہ میں موجود ہے۔ اس کا نام HOBA ہے اور اس کا وزن ۶۰ ٹن ہے۔ اسی طرح گرین لینڈ میں موجود شہاب ثاقب مسمّی TRENT کا وزن ۳۰ ٹن ہے۔
- ۳۰ نومبر ۱۹۵۴ء کو امریکہ کی ریاست الباما میں ایک خاتون اپنے گھر میں آرام کر رہی تھی کہ اچانک ۴ کیلو گرام کا شہاب ثاقب اس کے کمرے میں گرا جس سے اس کے بازو اور ٹانگ زخمی ہوگئے۔
- ۱۴ اگست ۱۹۹۲ء کو یوگنڈا میں ایک نوجوان کے سر پر شہاب ثاقب لگا مگر چوں کہ یہ کیلے کے درخت سے ہوکر گرا تھا اس لیے وہ زیادہ زخمی نہ ہوا۔

کار پر شہاب ثاقب

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو نیویارک ریاست کے شہر PEEKSKILL میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ ہائی اسکول کی طالب علم ایک لڑکی می شیل MICHELLE اپنے گھر میں شام کے وقت صوفے پر بیٹھی آرام کر رہی تھی کہ اس نے دھماکے کی آواز سنی جس سے اس کے گھر کی کھڑکیاں ہل گئیں۔ اس وقت شام کے سات بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے۔ یک لخت دھماکے سے گھبرا کر وہ باہر کو بھاگی تو اس نے دیکھا کہ اس کی شیورلیٹ کار کے پچھلے حصے میں سوراخ ہوگیا تھا۔ کار کے نیچے اس کو ایک سوراخ زمین میں نظر آیا جس میں فٹ بال کے سائز کا ایک پتھر پڑا ہوا تھا۔

می شیل کو یہ پتھر دیکھ کر بڑا تعجب ہوا اس نے پولس کو فون کیا مگر ان کا ردّ عمل یہ تھا کہ کسی نے شرارت کی ہوگی۔ عنقریب اخبار والوں کو اس کا علم ہوگیا اور جونہی یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی اس کو فون آنے شروع ہوگئے۔ بہت سے لوگ اس آسمانی مسافر کو خریدنے کو تیار تھے۔ اس نے یہ "آسمانی مسافر" ۵۹۰۰۰ امریکی ڈالر میں فروخت کر دیا اور ایک میوزیم والوں نے اس کی کار دس ہزار ڈالر میں خرید لی۔ یوں یہ پتھر اس کے لیے آسمانی مائدہ ثابت ہوا۔ قریبی شہروں میں جب لوگوں نے اس ستارے کو گرتے دیکھا تو انھوں نے ویڈیو فلم بنالی جو سائنس دانوں کو دے دی گئی۔ سائنس دانوں نے یہ بات اس پتھر کے مطالعے سے اخذ کی کہ یہ ستارہ یقیناً ASTEROID BELT سے آیا تھا۔ واقعی خدا جب دیتا ہے تو چھت پھاڑ کے دیتا ہے۔

170626
13.10.97

ترتیب

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس لائبریری کا سنگِ بنیاد بھی اسٹریچی ہال کے سنگ بنیاد کے ساتھ ساتھ ہی رکھا گیا تھا جو بانیٔ درس گاہ محسنِ قوم، مفکرِ زماں اور نابغۂ روزگار، رہبرِ قوم سر سید علیہ الرحمہ کی موجودگی میں ۱۸۷۷ء میں آیا تھا۔ یہی وہ مرکز تھا جو آج ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور جو پورے ایشیا میں اپنی نوع کا ایک یادگار مقام رکھتی ہے۔ جگہ اور وسعت کی تنگ دامانی کے باعث وہ محدود ضرور تھی تاہم مختلف شعبوں میں سیمینار لائبریریاں قائم کرکے کتابوں کی منتقلی دراصل اسی لائبریری کی توسیع تھی۔ آج بہرحال حالات مختلف ہیں۔

اس وقت یونیورسٹی کے لائبریرین بشیر الدین صاحب تھے جو بہت بعد میں پروفیسر بھی ہوگئے تھے۔ ان کے ہی دور میں لائبریری سائنس کے سرٹیفکیٹ اور مابعد ڈپلوما کورسز شروع کیے گئے اور اب تو ماشاء اللہ نہ صرف بی۔ ایس اور ایم۔ ایس بھی ہے بلکہ ایک مستقل شعبہ لائبریری سائنس کا قائم ہوچکا ہے جس میں تحقیق کا کام بھی ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ۱۹۹۵ء میں اکثر اچھی لائبریریوں اور خصوصاً مختلف یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں بنانے علی گڑھ کے لائبریرین کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں یہ کلاسیں عام طور پر شام کو ہوا کرتی تھیں اور کوئی بھی طالب علم اپنی اصل تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کورس میں بھی داخلہ لے سکتا تھا۔

اس طرح کے کئی اور کورسز تھے جو ایک ساتھ کیے جاسکتے تھے۔ مثلاً مختلف بیرونی زبانوں میں سرٹیفکیٹ جیسے فرانسیسی، جرمن اور ۱۹۵۱ء میں عربی میں بھی داخلے لیے جاسکتے تھے۔ بی۔ ٹی ایچ بھی ایم۔ اے کے ساتھ ساتھ کیا جاسکتا تھا۔ ایل ایل۔ بی بھی ایم۔ اے کے ساتھ کیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح تجوید کے لیے بھی داخلے ہوتے تھے۔ مگر کافی عرصے تک تعلیم (یعنی تھیوری اور پریکٹس) کے بعد حاضری اور امتحان اور پھر نتائج کا اعلان ہونے کے باوجود اس کا کوئی سرٹیفکیٹ نہیں ملتا تھا۔ اس کی تفصیلات انشاءاللہ بعد میں آئیں گی۔

ہم بات سائرن کی کررہے تھے جو اب (۱۹۹۵ء میں) شاید صرف یاد ماضی کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہرحال اُس وقت بھی چاند ہونے کی اطلاع، سحر اور افطار کے اوقات کے اعلان کے لیے یہ استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ یہی سائرن اگر بے وقت تین بار بج جائے تو یہ اس بات کی علامت تھا کہ خدا نخواستہ کوئی طالب علم یا استاذ اللہ کو پیارا ہوگیا اور پھر اس کے فوراً بعد کمرے کمرے نوٹس پہنچ جاتا تھا کہ کس کا انتقال ہوا ہے اور جنازہ کب اور کہاں سے اُٹھے گا۔ یہی سائرن اگر چھ بار بجتا تو یہ اس بات کی علامت ہوتا کہ دنیا کا کوئی بڑا آدمی نہ رہا اور اگر کہیں سات بار بجتا تو یہ سننے والوں کے لیے منحوس ترین خیال کیا جاتا۔ اس لیے کہ یہ صرف یونیورسٹی کے سربراہ یا پھر سربراہ ملک کی رحلت کی اطلاع کے لیے مخصوص تھا۔

انتقال کی اطلاع بذریعہ سائرن، بہرحال دلوں میں ہیجان پیدا کرتی تھی۔ بعض کمزور دل کے لوگوں کے لیے تو واقعی یہ کچھ عجیب سا ماحول پیدا کردیتی۔ مرحوم ذاکر صاحب جو اُس وقت بحیثیت وائس چانسلر نئے نئے آئے تھے خود دل کے مریض تھے چنانچہ وہ خود بھی اس طریقۂ اطلاع کے حق میں نہ تھے۔ اُن کے زمانے میں اسی سے متعلق ایک انتہائی تاریخی واقعہ رونما ہوا جو اگرچہ ان کے آنے کے کئی سال بعد وقوع پذیر ہوا تسلسل کے لیے یہیں درج کررہا ہوں۔

ذاکر صاحب کسی کام سے دہلی تشریف لے گئے تھے۔ غالباً اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈ پڑنے لگی تھی۔ ریڈیو سے اطلاع ملی کہ لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کردیا ہے۔ چوں کہ وہ علی گڑھ کے اولڈ بوائے بھی تھے اور اسٹوڈنٹس یونین کے صدر بھی رہ چکے تھے اُس وقت کی کابینہ یہ چاہتی تھی کہ لیاقت علی خاں کے انتقال کی

(تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے متفق ہو)

اطلاع بذریعہ سائرن دی جائے۔ اُن دنوں یہ سائرن باب اسحاق کے اوپر لگا ہوا تھا اور اس کا بٹن نیچے ہی برآمدے میں تھا جو ایک لکڑی کے بکس میں تھا اور اس پر تالا لگا ہوا تھا۔ طلبا پہلے تو سائرن بجانے والے کے پاس گئے مگر اس نے کہا کہ پہلے مجھے اجازت نامہ لا دیجیے۔ چوں کہ وائس چانسلر (ذاکر صاحب) باہر تھے، طلبا رجسٹرار کے پاس گئے۔ رجسٹرار نے صرف یہ کہا کہ ذاکر صاحب آنے ہی ہوں گے اُن کا انتظار کر لیجیے میں اجازت دینے سے قاصر ہوں۔ طلبا نے نہ جانے اس کا کیا مطلب نکالا اور ایک ہیجان سا اُن میں پیدا ہو گیا۔ بہرحال وہ سب کے سب پھر یونین آ گئے اور وہاں تقریریں ہوتی رہیں۔ بعد میں یہ طے پایا کہ عام طور پر طلبا یونین میں ہی رہیں۔ صرف چند لوگ وی۔سی کی کوٹھی پر (موجودہ وی۔سی لاج ذاکر صاحب کے زمانے میں ہی وی۔سی کی رہائش گاہ کے لیے منتخب ہوا تھا) جائیں اور ذاکر صاحب کے آتے ہی اُن سے اجازت حاصل کریں۔

تقریباً ۳۰-۴۰ طلبا وی۔سی لاج پہنچے اور باہر ہی انتظار کرتے رہے۔ ذاکر صاحب اپنی ذاتی کار (آسٹن سکس) سے دہلی سے آ رہے تھے۔ اتفاقاً گاڑی میں کچھ خرابی ہو گئی اور مجبوراً خورجہ رکنا پڑا۔ بہرکیف گاڑی ٹھیک ہوئی اور وہ تقریباً ۱۲ بجے شب کو یہاں پہنچے۔ اتنی رات گئے اپنی کوٹھی کے باہر اتنے سارے طلبا کو کھڑا دیکھ کر چونکے۔ گاڑی رکوائی اور دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ طلبا نے (جو خاصے جوش میں تھے) بغیر کسی تمہید کے یہ کہا کہ لیاقت علی صاحب کو گولی مار دی گئی ہے اور ہم سائرن بجانا چاہتے ہیں مگر رجسٹرار نہیں بجانے دیتے۔ ذاکر صاحب نے کافی سنجیدگی سے فرمایا کہ آخر آپ کیوں بجانا چاہتے ہیں۔ جس پر طلبا نے کہا کہ ایک تو وہ یہاں کے اولڈ بوائے تھے اور دوسرے ہماری یونین کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ ذاکر صاحب نے قدرے جھلا کر کہا کہ اگر آپ اپنے رجسٹرار کا کہنا نہیں مانتے تو پھر مجھ سے پوچھنے کیوں آئے ہیں، جائیے! جو آپ کے جی میں آئے کیجیے؛ بس پھر کیا تھا طلبا سیدھے یونین پہنچے اور پھر وہاں سے باب اسحاق۔ اس چھوٹے سے تالے کو کھولنا کیا بڑی بات تھی۔ ایک ذرا سے جھٹکے میں ہاتھ میں آ گیا اور پھر ایک نہیں دو نہیں تین نہیں لڑکوں نے پورے سات سائرن رات کے تقریباً ایک بجے بجائے۔ شہر کے لوگوں نے جب سنا تو گھبرا گئے۔ اس لیے کہ اس وقت مسلسل سائرنوں کا بجنا یقیناً غیر معمولی بات تھی۔ چوں کہ اس وقت صرف ریڈیو اور اخبار ہی ذرائع ابلاغ میں شامل تھے اور وہ بھی محدود لوگوں کے پاس ہی ہوتے تھے۔ وہ خبر ممکن ہے بہتوں نے سنی بھی نہ ہو۔ بہرحال شہر میں بھی ایک کھلبلی مچ گئی۔ ہاں البتہ اخباری نمائندوں نے فوراً دوڑ لگائی اور جاننے کی کوشش کی کہ واقعہ کیا ہے۔ مگر یہ وہ دور تھا کہ اکثر اخبارات کا ذہن اس مرکز تعلیم کے تئیں صاف نہ تھا اور وہ اس سے متعلق ہر چیز کو ایک خاص رنگ کی عینک لگا کر دیکھنے کے عادی تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہی ہوا کہ دوسرے دن اکثر اخبارات اور خصوصاً ہندی اخبارات کی شاہ سرخیوں میں یہ بات تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا اپنے شیخ الجامعہ تک کا کہنا نہیں مانتے۔ کئی اخبارات نے کچھ اور مزید گل کاریوں کی کوشش کی اور ایک انگریزی اخبار نے تو یہاں تک لکھ دیا 'MEND IT OR END IT'

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں اُس زمانے تک اسٹریچی ہال اور دوسری عمارتوں پر بالائی منزلیں نہیں ہوتی تھیں۔ یہی حال سر سید ہال کے کمروں کا بھی تھا۔ اُس وقت تک وی۔سی کا دفتر وکٹوریہ گیٹ کے نیچے (دائیں جانب) جہاں اب سر سید ہال (جنوب) کا پرووسٹ آفس ہے تھا۔ ذاکر صاحب تقریباً روزانہ اپنے دفتر تشریف لاتے تھے۔ اس سے پہلے کی ملاقاتیں اُن کی رہائش گاہ پر ہوتی تھیں۔

اس واقعہ کے ایک دن بعد جب ذاکر صاحب تشریف لا رہے تھے تو سامنے سے (پراکٹر آفس کی جانب سے) کچھ طالبات بھی ادھر آ رہی تھیں۔ سر سید ہال کے کسی کمرے کے بیک روم سے اُن طالبات پر کسی لڑکے نے آوازے کسے جن کو ذاکر صاحب نے سن لیا۔ ایک تو اخبارات کے رکیک حملوں سے وہ بھنے بیٹھے تھے اور اس پر یہ واقعہ! ذاکر صاحب کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی

روزہ اور ضبطِ نفس

روزے کے بے شمار اخلاقی و روحانی فائدوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان میں ضبطِ نفس کی طاقت پیدا کرتا ہے۔ اس بات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم ضبطِ نفس کا مطلب سمجھ لیں، پھر یہ معلوم کریں کہ اسلام کس قسم کا ضبطِ نفس چاہتا ہے اور اس کے بعد یہ دیکھیں کہ روزہ کس طرح یہ طاقت پیدا کرتا ہے۔

ضبطِ نفس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کی خودی جسم اور اس کی طاقتوں پر اچھی طرح قابو یافتہ ہو اور نفس کی خواہشات و جذبات پر اس کی گرفت اتنی مضبوط ہو کہ وہ اس کے فیصلوں کے تابع ہو کر رہیں۔ انسان کے وجود میں خودی کا مقام وہی ہے جو ایک سلطنت میں حکمراں کا مقام ہوا کرتا ہے۔ جسم اور اس کے اعضا خودی کے آلۂ کار ہیں۔ تمام جسمانی اور دماغی طاقتیں خودی کی خدمت کے لیے ہیں۔ نفس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ خودی کے حضور اپنی خواہشات کو درخواست کے طور پر پیش کرے۔ فیصلہ خودی کے اختیار میں ہے کہ وہ ان آلات اور طاقتوں کو کس مقصد کے لیے استعمال کرے اور نفس کی گزارشات میں سے کسے قبول اور کسے رد کرے۔ اگر کوئی خودی اتنی کمزور ہو کہ جسم کی مملکت میں وہ اپنا حکم اپنے منشا کے مطابق نہ چلا سکے اور اس کے لیے نفس کی خواہشیں مطالبات اور احکام کا درجہ رکھتی ہو تو وہ ایک مغلوب اور بے بس خودی ہے اس کی مثال اس سوار کی سی ہے جو اپنے گھوڑے کے قابو میں آ گیا ہو۔ ایسے کمزور انسان دنیا میں کسی قسم کی بھی کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ تاریخِ انسانی میں جن لوگوں نے اپنا کوئی نقش چھوڑا ہے وہی لوگ تھے جنھوں نے اپنے وجود کی طاقتوں کو بزور اپنا محکوم بنا کر رکھا ہے۔ جو خواہشاتِ نفس کے بندے اور جذبات کے غلام بن کر نہیں بلکہ ان کے آقا بن کر رہے ہیں۔ جن کے ارادے مضبوط اور عزم پختہ رہے ہیں۔

لیکن فرق اور بہت فرق ہے اس خودی میں جو خود خدا بن جائے اور اس خودی میں جو خدا کے تابع فرمان بن کر کام کرے۔ کامیاب زندگی کے لیے خودی کا قابو یافتہ ہونا تو بہرحال ضروری ہے۔ مگر جو خودی اپنے خالق سے آزاد اور دنیا کے مالک سے بے نیاز ہو، جو کسی بالاتر اخلاقی قانون کی پابند نہ ہو، جس کو کسی حساب لینے والے کی بازپرس کا اندیشہ نہ ہو، وہ اگر اپنے جسم و نفس کی طاقتوں پر قابو پا کر ایک بر زور خودی بن جائے تو وہ دنیا میں فرعون اور نمرود، ہٹلر اور مسولینی جیسے بڑے بڑے مفسد ہی پیدا کر سکتی ہے۔ ایسا ضبطِ نفس نہ قابلِ تعریف ہے اور نہ وہ اسلام کو مطلوب ہے۔ اسلام جس ضبطِ نفس کا قائل ہے وہ یہ ہے کہ پہلے انسان کی خودی اپنے خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے۔ اس کی رضا کی طلب اور اس کے قانون کی اطاعت کو اپنا شعار بنا لے۔ اس کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھے۔ پھر اس مسلم و مومن خودی کو اپنے جسم اور اس کی طاقتوں پر حاکمانہ اقتدار، اور اپنے نفس اور اس کی خواہشوں پر قاہرانہ تسلط حاصل ہو، تاکہ وہ دنیا میں ایک مصلح قوت بن سکے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پلیٹنم جو ... کے موقع پر

رسالہ تہذیب الاخلاق اور نشانت ے خصوصی نمبر

درج ذیل موضوعات پر اہلِ قلم حضرات کا تعاون درکار ہے۔ درخواست ہے کہ مضامین ۳۱ دسمبر ۱۹۹۵ء تک ہمیں بھیج دیے جائیں۔

- سرسید۔ تحریک اور شخصیت • مسلم یونیورسٹی تحریک۔ ...مدرسۃ العلوم مسلمانانِ ہند اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ۔
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء۔ یونیورسٹی کا قیام۔ یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیمات ۱۹۵۱ء۔ ۱۹۶۵ء میں ایکٹ کی منسوخی اور آرڈی نینس۔ ایکشن کمیٹی ۱۹۷۲ء کا ترمیمی ایکٹ اور اس کے خلاف ایجی ٹیشن ۱۹۸۱ء کا ترمیم شدہ ایکٹ۔
- یونیورسٹی کے تعلیمی شعبے۔ ان شعبوں کی نمایاں خدمات (الگ الگ شعبوں کی خدمات کا جائزہ)
- یونیورسٹی کے دیگر ادارے۔ یونیورسٹی اسکولس۔ ویمنس کالج۔ طبیہ ... ۔ انجینیرنگ کالج۔ پالی ٹکنک۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ انسٹی ٹیوٹ آف آپتھلمالوجی۔ میڈیکل کالج۔ انسٹی ٹیوٹ آف بائیو ٹکنالوجی۔ انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر۔ طبیہ دواخانہ • یونیورسٹی دفاتر۔
- یونیورسٹی کے اخبار و رسائل۔ علی گڑھ گزٹ۔ علی گڑھ میگزین۔ ہال میگزین۔ شعبہ جاتی جرنلس۔ فکر و نظر۔ تہذیب الاخلاق اور نشانت۔ یونیورسٹی پریس۔
- اسٹوڈنٹس یونین۔ نامور عہدے دار اور مقررین • ڈیوٹی سوسائٹی • اولڈ بوائز ایسوسی ایشن (معروف ابنائے قدیم) یونیورسٹی۔
- مسلم یونیورسٹی اور قومی سیاست (۱۹۴۷ء تک) تحریک آزادی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام۔ تحریک پاکستان اور مسلم
- مسلم یونیورسٹی اور قومی سیاست (۱۹۴۷ء تا حال)
- مسلم یونیورسٹی اردو زبان و ادب اور صحافت۔ تحریکات۔ شخصیات۔
- مسلم یونیورسٹی کھیل کے میدان میں۔ معروف کھلاڑی • مسلم یونیورسٹی اور ثقافت۔ ریڈیو۔ ٹی۔ وی۔ فلم۔ ڈراما موسیقی۔ مصوری۔ شخصیات۔
- مسلم یونیورسٹی اور مذہب۔ فکر و عمل • علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سیکولرازم کی ایک کارگہ عمل • مسلم یونیورسٹی اور خود اختیاری AUTONOMY
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اہم شخصیات۔ چانسلرس۔ پرو چانسلرس۔ وائس چانسلرس۔ پرو وائس چانسلرس۔ نامور اساتذہ اور دوسرے لوگ • علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کدھر؟ تعلیمی ترقی اور برتری۔ تجربے اور امکانات۔ معیار تعلیم۔
- سیاسی، نیم سیاسی اور مذہبی تنظیموں کے اثرات • ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں • اساتذہ کے مسائل۔
- طلبہ کے مسائل۔ بڑھتی ہوئی تعداد۔ اقامت گاہیں (ہال اور ہوسٹل) اسٹوڈنٹس یونین کا رول۔ ڈسپلن۔
- غیر تدریسی عملہ اور اس کے مسائل • فرقہ واریت اور علی گڑھ۔ یونیورسٹی اور علی گڑھ شہر۔
- نئے تقاضے اور مطالبے۔ ٹکنالوجی اور سائنس کی ترقی کی رفتار۔ مسلم یونیورسٹی اکیسویں صدی میں۔
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کردار۔ علی گڑھ کلچر۔

AMU Press, Exhibition Road, Aligarh. Ph. : 23846

یہ ہے اسلامی نقطۂ نظر سے ضبطِ نفس کی اصل حقیقت۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ روزہ کس طرح انسان میں یہ طاقت پیدا کرتا ہے۔

اگر آپ نفس و جسم کے مطالبات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں تین مطالبے اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں اور وہی سب سے زیادہ طاقت ور مطالبے ہیں۔ ایک غذا کا مطالبہ جس پر بقائے حیات کا انحصار ہے، دوسرا صنفی مطالبہ جس پر بقائے نوع کا انحصار ہے۔ تیسرا آرام کا مطالبہ جو قوتِ کارکردگی کی بحالی کے لیے ضروری ہے۔ یہ تینوں مطالبے اپنی حد کے اندر ہیں تو عین منشائے فطرت ہیں لیکن نفس و جسم کے پاس یہی تین پھندے ایسے ہیں کہ ذرا سی ڈھیل پاتے ہی وہ ان کے جال میں پھانس کر آدمی کی خودی کو الٹا اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مطالبہ بڑھ کر مطالبات کی ایک فہرست بن جاتا ہے اور ہر ایک زور لگاتا ہے کہ انسان اپنا مقصدِ زندگی، اپنے اصول اور اپنے ضمیر کے فتوے بھول کر بس اسی کے تقاضے پورا کرنے میں لگا رہے۔ ایک کمزور خودی جب ان تقاضوں سے مغلوب ہو جاتی ہے تو غذا کا مطالبہ اسے بندۂ شکم بنا دیتا ہے، صنفی جذبہ اس کو حیوانیت کے اسفل السافلین میں پہنچا دیتا ہے اور جسم کی آرام طلبی اس کے اندر ارادے کی کوئی قوت باقی رہنے نہیں دیتی۔ پھر وہ اپنے نفس و جسم کی حاکم نہیں بلکہ ان کی محکوم بن کر رہتی ہے اور اس کا کام بس یہ رہ جاتا ہے کہ اس کے احکام کو بھلے اور برے، جائز اور ناجائز تمام طریقوں سے بجا لایا کرے۔

روزہ نفس کی انہی تین خواہشوں کو اپنے ضابطہ کی گرفت میں لیتا ہے اور خودی کو ان پر قابو پانے کی مشق کراتا ہے۔ وہ اس خودی کو، جو خدا پر ایمان لا چکی ہے، یہ خبر دیتا ہے کہ تیرے خدا نے آج دن بھر کے لیے تجھ پر دانہ پانی حرام کر دیا ہے۔ اس مدت کے اندر تیرے مالک نے آج تیری صنفی خواہشات پر بھی پابندی عائد کر دی ہے۔ صبح صادق سے غروب آفتاب تک تیرے لیے حلال طریقے سے بھی ان خواہشات کو پورا کرنا حرام ہے۔ وہ اسے یہ اطلاع بھی دیتا ہے کہ تیرے رب کی خوشی اسی میں ہے کہ دن بھر کی بھوک پیاس کے بعد جب تو افطار کرے تو نڈھال ہو کر لیٹ نہ جا بلکہ اٹھ کر عام دنوں سے زیادہ اس کی عبادت کر۔ وہ اس کو یہ حکم بھی پہنچاتا ہے کہ نماز کی لمبی رکعتوں سے فارغ ہو کر جب تو آرام لے تو صبح تک مدہوش ہو کر نہ پڑ جا بلکہ معمول کے خلاف سحری کے لیے اٹھ اور صبح سے پہلے اپنے جسم کو غذا دے۔ یہ سارے احکام پہنچا دینے کے بعد وہ ان کی تعمیل کا معاملہ خود اسی پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی پولیس، کوئی سی آئی ڈی، کوئی خارجی دباؤ ڈالنے والی طاقت نہیں لگائی جاتی۔ وہ چھپ کر کھائے پیئے، یا صنفی خواہشات پوری کر لے تو خدا کے سوا کوئی اسے دیکھنے والا نہیں ہے۔ وہ تراویح سے بچنے کے لیے کوئی شرعی حیلہ کرے تو کوئی دنیوی طاقت اس پر گرفت نہیں کر سکتی۔ سب کچھ اس کے اپنے اوپر منحصر ہے۔ اگر مومن کی خودی واقعی خدا کی مطیع ہو چکی ہے اور اگر اس کے ارادے میں اتنا زور ہے کہ نفس پر قابو پا سکے تو وہ خود ہی غذا کی مانگ کو، صنفی خواہش کو اور آرام کی طلب کو اس ضابطے میں کس دے گا جو آج خلافِ معمول اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔

یہ صرف ایک دن کی مشق نہیں ہے۔ ایسی مشق کے لیے ایک دن کافی بھی نہیں ہو سکتا۔ مسلسل ۳۰ دن تک یہی مشق کرائی جاتی ہے سال بھر میں پورے ۷۲۰ گھنٹے کے لیے یہ پروگرام بنا دیا گیا ہے کہ رات کے آخری حصے میں اٹھ کر سحری کھاؤ، صبح پو پھٹتے ہی کھانا پینا بند کر دو، دن بھر ہر قسم کی غذا سے پرہیز کرو۔ غروبِ آفتاب کے بعد ٹھیک وقت پر افطار کرو، پھر رات کا ایک حصہ تراویح کی غیر معمولی نماز میں کھڑے ہو کر گزارو۔ اور چند گھنٹے آرام لینے کے بعد پھر دوسرے دن کے لیے یہی پروگرام شروع کر دو۔ اس طرح مہینہ بھر تک پے در پے نفس کے ان تین سب سے بڑے اور سب سے زیادہ طاقت ور مطالبوں کو ضابطے میں کستے رہنے سے خودی کے اندر یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق اپنے نفس و جسم پر حکومت کر سکے اور یہ عمر بھر میں صرف ایک ہی مرتبہ کا پروگرام نہیں ہے بلکہ سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد سے مرتے دم تک ہر سال میں ایک مہینہ اسی مشق کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ تاکہ نفس پر خودی کی گرفت بار بار تازہ اور سخت ہوتی رہے۔

یہ ساری مشق محض اس غرض کے لیے نہیں ہے کہ مومن کی

دی صرف اپنی بھوک پیاس، شہوت اور آرام طلبی پر قابو پالے زراس کی غرض یہ بھی نہیں ہے کہ اس کو نفس و جسم پر قابو صرف ایک رمضان ہی کے مہینے میں حاصل رہے۔ دراصل اس کا مدعا یہ ہے نفس کے ان تین سب سے زیادہ زور دار حربوں کا مقابلہ کرکے ہ اس کے سارے ہی جذبات اور ساری ہی خواہشات پر قابو یافتہ ہوجائے اور اس میں اتنی طاقت پیدا ہوجائے کہ محض رمضان ہی میں نہیں بلکہ رمضان کے بعد بھی باقی گیارہ مہینوں میں وہ ہر س خدمت کے لیے اپنے جسم اور اس کی طاقتوں سے کام لے سکے جو خدا نے اس پر فرض کی ہو۔ ہر اس بھلائی کے لیے کوشش کرسکے جس میں خدا کی رضا ہو، ہر اس برائی سے رک سکے جو خدا کو ناپسند ہو، اور اپنی خواہشات و جذبات کو ان حدود کا پابند بنا کر رکھ سکے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کردی ہیں۔ اس کی باگیں نفس کے قبضے میں نہ ہوں کہ جدھر جدھر وہ چاہے اسے کھینچے کھینچے پھرے بلکہ عنان اقتدار اس کے اپنے ہاتھ میں رہے اور نفس کی جن خواہشوں کو جس وقت جس حد تک اور جس طرح پورا کرنے کی خدا نے اجازت دی ہے انھیں اسی ضابطہ کے مطابق پورا کرے، اس کا ارادہ اتنا کمزور نہ ہو کہ فرض کو فرض جانتا بھی ہو، ادا بھی کرنا چاہتا ہو مگر جسم پر اس کا حکم ہی نہ چلتا ہو۔ نہیں، جسم کی مملکت میں وہ اس زبردست حاکم کی طرح رہے جو اپنے ماتحت عملہ سے ہر وقت اپنے حسب منشا کام لے سکتا ہو۔ یہی طاقت پیدا کرنا روزے کا اصل مقصد ہے۔ جس شخص نے روزے سے یہ طاقت حاصل نہ کی اس نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو بھوک پیاس اور رت جگے کی تکلیف دی۔

قرآن اور حدیث دونوں میں اس بات کو صاف صاف واضح کردیا گیا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا کہ روزے تم پر اس لیے فرض کیے گئے ہیں کہ تمہارے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا اس کا پانی اور کھانا چھڑوا دینے کی خدا کو کوئی حاجت نہیں نیز حضورؐ نے فرمایا بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جو روزے سے بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں پاتے۔

سیمینار

"دینی مدارس میں سائنس کی شمولیت"

از ۲،۳ر جولائی ۱۹۹۴ء

زیرِ اہتمام

مرکز فروغ سائنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پیش لفظ

گذشتہ سال یکم جولائی کو مرکز فروغ سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ سیمنار "دینی مدارس میں علوم سائنس کی شمولیت" پر منعقد ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبد القیوم، ڈائرکٹر مرکز کے اصرار پر اس موقع پر پڑھے گئے بیشتر مقالے تہذیب الاخلاق کے اس شمارے میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ مقالہ نگاروں کی اکثریت کا تعلق دینی مدارس سے ہے۔ بیشتر مقالات میں دینی علوم کی تدریس کے ساتھ جدید دنیاوی علوم بالخصوص سائنس کی تحصیل پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن ان علوم کی تدریس دینی مدارس میں اتنی آسان نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ ایسے ہی ایک سیمنار کا انعقاد مارچ ۱۹۸۵ء میں بھی مرکز نے کرایا تھا۔ دونوں مذاکروں کے درمیانی عرصے (سات سال) میں اس سلسلے میں پیش رفت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہماری ناچیز رائے میں جب تک ہندوستان کی دو معروف دینی جامعات دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ اس سمت میں پیش قدمی نہیں کریں گی بات نہیں بنے گی۔ درحقیقت یہ مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے۔ سو سال سے اوپر ہو گئے ہیں ہم ابھی تک "دین اختیار کرتے ہیں تو دنیا جاتی ہے اور دنیا کی فکر کرتے ہیں تو دین سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں" کے چکر ویو سے نہیں نکل پائے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم زندگی کی جیتی جاگتی حقیقتوں کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ ہم کو اپنے چند رویے بدلنا ہوں گے۔ مثلاً سعودی عرب اور ایران دونوں اسلامی مملکتیں ہیں، ان کے نوٹوں پر تصویریں چھپتی ہیں اور وہاں ٹیلی ویژن نیٹ ورک بھی قائم ہے۔ سوال یہ ہے کیا ان کے لئے ان چیزوں کا جواز ہے اور ہمارے لیے نہیں ہے؟ ہمارے بہت سے حلقے ووٹروں کے شناختی کارڈوں کے لئے تصویر کھنچوانا اور خاص طور پر مسلم خواتین کے لیے ناجائز سمجھتے ہیں اور اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ہمارے پاس اپنے ملک میں اپنی اہمیت کو تسلیم کرانے کا صرف ووٹ ہی تو ایک موثر ہتھیار ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ جب تک دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ اس سلسلے میں کوئی مثبت قدم نہیں اٹھائیں گے دینی تعلیم کے نصابات میں سائنسی علوم کی شمولیت کے امکانات موہوم ہیں۔ یہاں پر ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ مغربی طرز تعلیم کی نہج پر چلنے والے مسلم اداروں یا ورناکیولر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں برائے نام دینی نصاب، پڑھایا جاتا ہے۔ ان اداروں میں اس کے پڑھنے والے اور ذمہ داران کس حد تک اس معاملہ میں سنجیدہ ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ نہ تو اس مضمون میں کلاس کی حاضری دوسرے مضامین کے ساتھ شامل کر کے امتحان میں بیٹھنے کے حق کو قائم کرتی ہے اور نہ ہی نمبر محصلہ ڈویژن کے حصول میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ ادارے 'دینیات' کو جتنا سبک کر سکتے ہیں کر چکے ہیں۔ اب ایسے میں کسی "انگریزی داں اور انگریزی خواں" ادارے کی پیش قدمی کسی حد تک دینی مدارس کو قابلِ قبول ہو گی، کچھ کہا نہیں جا سکتا؟

مدیر

سید حامد

خطبۂ صدارت

دینی تعلیمی کانفرنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منعقدہ یکم جولائی ۱۹۹۴ء

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

ایک مدت ہوگئی دینی تعلیمی نظام کی طرف سے فکرمندی کو۔ وہ لوگ جو جدید تعلیم سے فیضیاب ہوئے ہیں جنھوں نے دنیا دیکھی ہے، جن کا ذہنی افق وسیع ہو چکا ہے ان کو آپ دو گروہوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ ان میں بڑا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کے پاس دینی تعلیم کو خاطر میں لانے کا وقت ہی نہیں ہے۔ دوسرا گروہ جو بہت چھوٹا ہے، دین سے وابستگی اور دینی تعلیم سے دلچسپی رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بہتوں کو دین کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ پہلے گروہ کے لیے مدارس ہونا نہ ہونا، دینی تعلیم کا وجود و عدم برابر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کچھ دستورِ اغیار کی پیروی کرتے ہوئے مدارس کو نگاہِ تحقیر سے دیکھنے لگیں یا سرپرستانہ انداز سے، چلتے پھرتے، کچھ تجاویز ان کی اصلاح کے لیے زبانِ دہن یا زبانِ قلم سے عوام کی بہبودی کے لیے معرضِ اظہار میں لے آئیں۔ یہاں تک ہم پہنچ گئے ہیں تو ذرا دیر کے لیے رکیے۔ جدید تعلیم سے فائدہ اٹھانے والوں میں جو لوگ دینی تعلیم کی طرف سے فکرمند نظر آئیں ان کی بات کو یہ کہہ کر نہ ٹالیے۔

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ان لوگوں کے دلوں میں درد ہے جبھی تو اپنے دائرے سے نکل کر دینی تعلیم کو زیادہ کارآمد اور زمانہ شناس اور بارآور بنانے کی فکر انھیں دامنگیر ہوئی ہے۔ ان کی بات کو غور سے سنیے اور سوچیے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس میں کام کی کوئی بات ہے بھی کہ نہیں۔ یہ نہ سوچیے کہ وہ آپ کے سکون کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور ان کا مقصدِ زندگی ہی یہ ہے کہ دینی تعلیم کے اس نظام کو جو صدیوں سے باجابت درہم برہم کر دیں۔ وہ کلمہ گو ہیں، اسلام کو سمجھنے کی کوشش انھوں نے بھی کی ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے مسئلوں کو انھوں نے اسلام کی روشنی میں حل کرنے کے جتن کیے ہیں۔ یہ لوگ جدید زندگی کی ان پیچیدگیوں سے جن کی آہٹ مدرسوں میں نہیں پہنچی، روشناس ہوئے ہیں۔ وہ دل میں درد رکھتے ہیں اور دماغ میں آگاہی۔ ان کی رائے کو پہلی نظر میں ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ اگر اس طرح ٹھکرایا گیا تو نقصان ان کا نہیں ہوگا۔ وہ تو ما علینا الا البلاغ کہہ کر بیٹھ رہیں گے۔

یہ بات بھی یاد رکھیے کہ مدارس کے نظامِ تعلیم کے بعض اجزا کی از کار رفتگی کا احساس صرف ان ہی لوگوں کو نہیں ہے جنھوں نے جدید تعلیم حاصل کی ہے۔ ان میں ہمارے کچھ علما و اکابرین شامل ہیں۔ ان میں سے صرف دو نام سن لیجیے، علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد — ندوۃ العلما کی بنیاد ہی دینی طرزِ تعلیم کو سدھارنے کے لیے رکھی گئی تھی اور جب ندوہ نے اپنے اس مقصد کو پوری طرح پورا نہیں کیا تو مذکورہ اکابرین نے صدائے احتجاج بلند کی۔ ان کی بات سنی نہیں گئی۔ اس کو بھی اب ایک صدی ہونے کو آ رہی ہے۔

بیسویں صدی میں زندگی نے بڑے بڑے ڈگ بھرے ہیں۔ اس کی رفتار ناقابلِ اعتبار اور تخیل ناپذیر حد تک تیز ہوگئی ہے۔ بادپا علوم کا ساتھ دنیا خوش خراموں اور اطمینان ورزوں کے لیے محال ہو گیا ہے۔ اس کے جلو میں آئے دن نت نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو حل کرنے اور ان

سکریٹری۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی۔ تعلیم آباد۔ سنگم وہار، نئی دہلی

ارنا روادی سے رہ بروں کو سلامت نکال لے جانے کا فرض علماء پر عاید
ا ہے. اس فرض کو وہی فارغین مدارس انجام دے سکیں گے جنھیں انکی
ہم نے زندگی کے رنگا رنگ اور ہرآن بدلتے ہوئے پہلوؤں سے شناسائی
م پہنچائی ہے. عصر حاضر کے تقاضوں کے علاوہ دعوت کے تقاضوں سے
ہ برآ ہونے کے لیے بھی دنیا اور زندگی کے تغیرات سے آگاہی ناگزیر
ہے. آپ کے دین کو اس وقت تک کوئی قبول نہیں کرے گا جب تک
آپ اس کے ذریعے جد ید زندگی کے مسائل کو حل کرکے نہ دکھا سکیں.
صرف آپ کی عبادات اور عقاید سے اثر کیوں لینے لگے.

آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ اطمینان کر لینا چاہوں گا کہ اس
ت تک جو دلیلیں آپ کے سامنے آئی ہیں آپ انھیں تسلیم کرتے
یں یا نہیں. اگر آپ انھیں تسلیم کرتے ہیں تو آپ کو یہ بات بھی ماننی
نے گی کہ مدارس کے نظام تعلیم میں وہ ساری تبدیلیاں لانی ہوں گی
ن کی طالب حالیہ پیچیدہ زندگی ہے. اگر ایسا ہے تو ہم دیر کیوں کریں.
ِتنی دیر کریں گے اتنا ہی مشکل ہمارے لیے کاروان علوم کو دوڑ کر پکڑنا ہو جائے
: نظام میں تبدیلی کے خلاف دلیلیں لائی گئی ہیں اور لائی جائیں گی. کہا
یا ہے اور کہا جائے گا کہ عصری مضامین داخل ہوئے تو اصل مقصد اور
ینی عنصر دب جائے گا یا تحلیل ہو جائے گا. طالبان علوم دین میں وہی
برائیاں جڑ پکڑ لیں گی جو عصری تعلیم کے طالب علموں میں پائی جاتی ہیں.
ین کی خدمت کا جذبہ کمزور پڑ جائے گا اور مینار و محراب موذن اور امام
و منبر خطیب کو اور مدرسے معلم کو ترس جائیں گے.

ان اندیشوں میں کتنا وزن ہے، ابھی تول کر دیکھ لیجیے. کوئی وجہ
نہیں کہ دینی عنصر عصری تعلیم کو پیٹھ دکھا جائے. عصری تعلیم اور دینی
تعلیم کو آپ ایک دوسرے کے درپے آزار کیوں سمجھتے ہیں. دونوں سے
ایک دوسرے کو تقویت پہنچنی چاہیے. اس قسم کا خوف کلیسا کو ہو سکتا تھا
جس نے علوم یا سائنس کو مذہب کا دشمن ٹھیرا دیا تھا. آپ نے اس
عہد آفریں اور حقیقت شناس سائنس داں گلیلیو کی کہانی ضرور پڑھی
ہوگی. اس کا تصور یہ تھا کہ اس نے کلیسا کے اس تصور کو باطل قرار دیا
تھا کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے. اس کے تجربات نے یہ بات ثابت
کردی تھی کہ یہ ہماری دنیا ہے جو سورج کا طواف کرتی ہے. ظاہر بینوں

نے جب یہ دیکھا کہ اطالوی سائنسداں حقیقت کی تہہ تک پہنچ گیا ہے اور
اس نے کلیسا کا خوف کھائے بنا اس زندہ اور تابندہ حقیقت کا اعلان
بھی کر دیا تو کلیسا نے اس 'فتنہ' کو فرو کرنے کے لیے اسے زنداں میں
ڈال دیا اور بالآخر اس بلند مرتبت عالم کو اپنے قول سے پھر جانے پر
مجبور کر دیا. بیچارے نے بہ درجۂ مجبوری زنداں کی بے چارگی کو ختم کرنے
اور علم اور مشاہدہ اور تجربہ کی کھلی ہوئی ہوا میں پھر سے سانس لینے کے
لیے کہہ دیا کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ غلط ہے. سوچیے کہ اس کوہ قامت
ہیئت داں کے دل پر کلیسا کے اس جبر سے کیا گزری ہوگی. غریب نے
تسکین قلب کے لیے پھر بھی دبی زبان سے یہ کہہ دیا کہ میرے کچھ کہہ دینے
سے زمین اپنی حرکت طواف باز تو نہیں آئے گی.

علوم اور تہذیب نے دنیا میں جو ترقی اب تک کی ہے وہ مشاہدہ'
تجربہ، غور و خوض اور اخذ نتائج سے کی ہے اور یہی قرآن کریم کی تعلیم ہے
جس نے بعثت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ۱۰۰ سال کے اندر
مسلمانوں کو علوم کا قافلہ سالار اور ایک عالم کا فرمانروا بنا دیا تھا. اس
وقت عصری اور دینی تعلیم کی تفریق سرے سے تھی ہی نہیں. یاد رکھیے
کہ اگر دین کی تعلیم صحیح ڈھنگ سے دی گئی تو اس کا پلہ عصری تعلیم پر بھاری
رہے گا. ہمیں عصری تعلیم یا عصری مضامین کے شمول سے خائف ہونے
کی ضرورت نہیں ہے. نور حق نفس اعدا سے بجھنے والا نہیں. دینی تعلیم کو
برائیوں کے خلاف حصار کا کام کرنا چاہیے. وہ تو قدروں کو دل و دماغ
میں پیوست کرنے کے لیے ہے. یوں بھی مدرسے کی دیواریں معاشرہ کی
برائیوں کو درآنے سے زیادہ دیر تک روک نہیں سکتیں. رہی یہ بات کہ
مینار و منبر و محراب سونے رہ جائیں گے اور مدرسے ویران. اول تو
ہمارے یہاں پروہتی نظام ہے ہی نہیں. اگر کہیں شاہی یا موروثی امام
نظر آئیں تو اسے دین سے انحراف سمجھیے. یہ دین کا اتباع ہرگز نہیں ہے.
نمازیوں میں جو زیادہ پرہیزگار ہے، امامت پر اسی کا حق ہے.
یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں کہ چند عصری مضامین کا شمول طالبانِ
علوم دین کو مسجد اور مدرسے سے برگشتہ کر دے گا. یہ بھی یاد رکھیے کہ
ہمارے مدارس میں عصری موضوعات دینی مباحث کے دوش بدوش
پہلے بھی چلے ہیں. اصلاح کا سجھاؤ دینے والے یہی تو کہتے ہیں کہ مدارس

کے نصاب کے غیر دینی اجزا، کو جو فرسودہ یا از کار رفتہ یا باطل ہو گئے ہیں
ساب سے خارج کر کے ایسے غیر دینی مضامین کو شامل کیا جائے جو ترقی یافتہ
ب اور حالیہ زندگی میں بہ غایت کارآمد ہو گئے ہیں۔ اور ایسے مضامین ک
سب کو بھی ضرورت کے مطابق بڑھا دیا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں
مل نصاب کرنے پر اعتراض کیوں کیا جائے۔ وہ مضمون جو افراد اور
عت کے محرکات اور ردعمل کو سمجھنے اور ان کے ساتھ آشتی اور خوش دلی
ے ساتھ بسر کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اسے یعنی نفسیات کو داخل نصاب کیوں
نہیں کیا جائے یہی حال عمرانیات کا ہے۔ یہی حالت ان علوم کی ہے جن
پر سائنس کا اجتماعی لیبل لگا دیا گیا ہے۔ پھر طالب علم کو اس سیارہ کے
رے میں معلومات کیوں نہ ہوں جس پر وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اور
ں نظام شمسی کے بارے میں جس کا ایک چھوٹا سا جزو وہ سیارہ ہے
جغرافیہ پڑھے بغیر زندگی بسر کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے محلے کے گلی کوچوں
ور اپنے مکان کے محل وقوع سے ناواقف ہونا۔ جغرافیہ بتاتا ہے کہاں،
تاریخ بتاتی ہے کب، سائنس بتاتا ہے کیسے اور کیوں۔ سارے سوالوں
کا جواب یہ علوم نہیں دے پائیں گے، بہت سے سوالوں کا صحیح جواب
ن کے بس میں نہیں، لیکن وہ واقفیت کو بڑھاتے، افق کو وسیع اور
ذہن کو روشن ضرور کرتے ہیں۔ ہم ان سے فائدہ نہ اٹھائیں تو ہم کفرانِ
نعمت کے مرتکب ہوں گے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں وہ صلاحیتیں دیں جن کی مدد
سے ہم بہت سی حقیقتوں کی تہہ تک پہنچ گئے، ہم نے ناآگہی کی سرحدوں
کو بہت پیچھے دھکیل دیا۔ ہم نے مصائب و شدائد، تکالیف اور خطرات
سے لوہا لیا۔ قدرت کی بھیانک طاقتوں کو تسخیر کیا۔ جو کچھ سیکھا، سمجھا،
اسے آنے والی نسلوں تک منتقل کیا اسی طرح تمدن نے سر اٹھایا، اسی
طرح تہذیب برپا ہوئی، اسی طرح وہ ترقیاں ممکن ہوئیں جن کا سرچشمہ
... ہے اور وسیلہ مادہ ہے۔ پروردگار کی مشیت یہی تھی۔ اس نے
انسان کو اسی کے ہاتھوں ترقی اور تہذیب کی اس منزل تک پہنچا دیا۔ ان
ترقیوں سے منہ وہی پھیرے گا جو ان گوناگوں نعمتوں کے لیے شکر گزار
ہونے کی توفیق نہیں رکھتا۔ ترقی کے ساتھ جو خرابیاں آئیں، ظاہر ہے
کہ ہمیں ان سے حذر کرنا ہے۔

یہ بات بھی بار بار سوچنے کی ہے کہ زندگی اور قدرت اور اس کے
مظاہر کی طرح علوم بھی ناقابل تقسیم ہیں اسلام جو ساری زندگی پر
حاوی ہے، زندگی کے مصنوعی بٹواروں کو تسلیم نہیں کرتا وہ ایک ضابطۂ
حیات ہے جس کا فرمان مہد سے لحد تک چلتا ہے، اور اس کی روح قطب
شمالی سے قطب جنوبی اور مشرق سے مغرب تک جاری و ساری ہے۔
انسان کی کیا مجال ہے کہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، اسے مصنوعی خانوں
میں بانٹ دے، جس دین نے رہبانیت کو قبول نہیں کیا وہ خود کو دنیا
سے الگ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ دنیا ہی کو تو صحیح راستے پر چلانے کے لیے
وہ آیا ہے۔ اس کی قلم رو زندگی کا ہر پہلو، زندگی کا ہر شعبہ ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ یہ احساس اب عام ہوتا جا رہا ہے۔ بیشتر مدارس
میں اساتذہ اور طلبہ مذکورہ خطوط پر نصاب کی توسیع کے طالب ہیں۔
لیکن دینی تعلیم کے بڑے مراکز شاید ابھی تک قایل نہیں ہوئے سوالیہ
نشان کس پر لگائیے۔ بصیرت پر یا دفاعی زاویۂ نگاہ پر۔ ہمارے ایک
بڑے دینی ادارے نے دینی تعلیم پر ایک کانفرنس ان ہی تاریخوں میں رکھی
ہے جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے یہ کانفرنس بلائی ہے جس میں آپ
شریک ہیں۔ اسے اتفاق کہیے یا ارادے کا نام دیجیے۔ کیا آپ اسے توارد
پر محمول کریں گے۔ یہ مسائل ساتھ بیٹھ کر حل کرنے کے ہیں۔ خدارا ملت
کو دو نیم ہونے سے بچائیے۔ زندگی کے، جو ایک نامیاتی وحدت ہے،
دو ٹکڑے کرنے سے کیا ملے گا؟ دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تو دین کہاں
باقی رہا۔ دین کو فاصلے پر رکھا تو دنیا نہ بگڑ جائے گی؟

ہم نے دیکھ لیا کہ دینی تعلیم کے اداروں کا نصاب چلا چلا کر تبدیلی
اور توسیع کا تقاضا کر رہا ہے۔ کانوں میں روئی دینے سے آواز تو
نہیں بیٹھے گی۔ تبدیلی کی بات آگے چل کر پھر آئے گی۔ نصاب میں تبدیلی
سے کم اہم طریق تدریس میں تبدیلی نہیں ہے۔ اس وقت دینی مدرسوں
میں زیادہ زور حافظہ پر دیا جاتا ہے۔ حافظہ کا سب سے ارفع مصرف
لاریب حفظ قرآن ہے، لیکن نصاب کی تفہیم ذہن ہی کے وسیلے سے
ہوتی ہے۔ عصری تعلیم کے طرز تدریس نے مدتیں ہوئیں حافظہ کے وزن
کو بہ حیثیت ایک دماغی قوت کے کم کر دیا اور ذہن کے کردار کو بڑھا دیا
ہے۔ سیکھنے اور سکھانے کا گر اب یہ ہے کہ طالب علم کے ذہن کو جستجو
سے تابندہ اور بیتاب کر دیا جائے۔ اسے غور و فکر کی شاہراہ پر

ڈال دیجیے پھر تعلیم علم کی ساری منزلیں اس پر آسان ہو جائیں گی، بات میں سے بات نکلے گی، پیاس بجھنے سے پہلے حلق سوکھنے لگے گا۔ طالب علم چار ورثے سوال کیا، کیوں، کب، اور کیسے سے رسم و راہ پیدا کرے گا، زندگی کے طویل اور پُر خطر سفر میں یہ چاروں رفیق اس کا ساتھ دیں گے۔

نصاب کا جہاں تک تعلق ہے، ہمارے بعض ادارے آگے بڑھ گئے ہیں، انھوں نے پیش قدمی دکھائی ہے۔ جامعۃ الفلاح نے جو اعظم گڑھ کے ضلع بلریا گنج میں واقع ہے، اہم عصری مضامین کو جرأت اور وسعت نظر کے ساتھ نصاب میں شامل کر لیا ہے۔ جے پور میں جامعۃ الہدیٰ نے دینی تعلیم کے ساتھ صنعتی یا ووکیشنل تربیت کا اہتمام بڑے پیمانہ پر کیا ہے۔ پہلا جب دینی مدارس کے لیے ووکیشنل ٹریننگ کی بات کی گئی تو کبھی کبھی یہ جواب دیا گیا کہ ہمارے یہ عصری خیر اندیش خود اپنے اسکولوں میں اس کا اہتمام کیوں نہیں کرتے۔ دینی تعلیمی اداروں میں اس کے شمول پر کیوں اصرار ہے؟ ہم کس طرح انھیں سمجھائیں کہ خدانخواستہ اس تجویز میں مدارس کے طلبا کو تحقیر کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ ووکیشنل ٹریننگ پا کر وہ بآسانی روزگار حاصل کر لیں گے۔ انھیں اپنوں اور بیگانوں سے ربط پیدا کرنے اور ان کے کام آنے کے مواقع ملیں گے۔ اور وہ اپنی راست روی اور کارگزاری اور حسن معاملہ کے نقوش دلوں پر بٹھا سکیں گے۔ دعوت کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی ہو سکتا ہے؟ اسے بدعت نہ سمجھیے کیونکہ اس روایت کا سرا صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جا کر ملتا ہے اور خود انگریزی اسکولوں میں ووکیشنل ٹریننگ کو داخل کرنے کی کوشش ایک عرصہ سے جاری ہے۔ کوٹھاری کمیشن (۶۶-۱۹۶۴ء) نے پلس ٹو کے نظر کی سفارش بھی اسی حیثیت سے کی تھی۔

نظر یاتی بحث ختم ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان اصلاحات کو عمل میں کیونکر لایا جائے؟ عمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وسائل کی ہے۔ چند بڑے بڑے مدارس کو چھوڑ کر باقی کی مالی حالت اطمینان کے لائق نہیں ہے۔ جس مشکل سے یہ مدارس چلائے جاتے ہیں اس کا تصور بھی ہم گھر بیٹھے نہیں کر سکتے۔ مہتمموں اور معلموں کا یہ بڑا کارنامہ ہے، ان کی یہ ایک عدیم المثال خدمت دین اور علم دین کی ہے۔ کام نہ زبانی ہمدردی سے چلے گا نہ نکتہ چینی سے۔ پہلے وسائل دیجیے، پھر اس کی ضرورت پیش آنے تو نکتہ چینی کیجیے۔ ہر ضلع اور ہر بڑے شہر میں مدرسوں کے لیے وسائل کی فراہمی کا باضابطہ انتظام ہونا چاہیے۔ یہ انتظام ہمیں خود کرنا ہے کوئی دوسرا ہمارے لیے یہ انتظام کرنے نہیں آئے گا۔

ایک اور ضرورت جو بہت عرصہ سے محسوس ہو رہی ہے وہ ایک مشترک نصاب کی ہے جو ہر جگہ رائج ہو۔ اور امتحان کے ایک نظام کی جو مرکزیت کے ساتھ چلایا جائے اور معلمین کی تربیت کی۔ ہر پیشہ اور ہر فن ٹریننگ چاہتا ہے۔

اصلاحات کو عملی شکل دینے سے پہلے ہمیں بنیادی اعداد و شمار اور ضروری اطلاعات حاصل کر لینی چاہییں۔ اس دشا میں کئی بار کوششیں ہوئیں۔ ہر کوشش نے دوسری کوششوں کو نظر انداز کیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں تو بن گئیں، معلومات کا قصر تعمیر نہ ہو سکا۔ جب کسی مسئلے کی چہار دیواری اس کا پھیلاؤ اور گہرائی نظر میں نہ ہو تو اس سے عہدہ برآ کیونکر ہوا جائے۔ ہمدرد ایجوکیشن نے ۱۲ سال ہوئے مراسلاتی سوالناموں کے ذریعے معلومات اکٹھا کی۔ جوابات بالعموم دھیان سے اور صحت کے ساتھ نہیں دیے گئے۔ اس بنا پر کوئی قابل اعتبار نتائج اخذ نہیں کیے جا سکے۔ ابھی دو سال ہوئے یہ کوشش زندہ کی گئی ہے۔ امید ہے کہ ۹۵ء کے طلوع ہونے کے معتبر اطلاعات اور نتائج ہماری دسترس میں ہوں گے۔ خود ہمارے میزبان نے بھی مطلوبہ اطلاعات جمع کیں اور ان کا گوشوارہ بنایا۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز نے بھی مدارس کا سروے اور ان کے بارے میں معلومات ملک گیر پیمانے پر دستیاب کیں۔ تینوں انجمنوں نے یہ کام ایک دوسرے سے بے نیاز ہو کر کیا۔ نتیجہ ظاہر ہے جو کام بہت پہلے مکمل ہو جانا چاہیے تھا وہ کئی عنوانوں سے ابھی تشنہ ہے۔ ہم سب کو چاہیے کہ ان اطلاعات اور ان سے ماخوذ نتائج کو عام کریں تاکہ ان کی بنیاد پر ایک منصوبہ مدارس کی تشکیل جدید کا برپا کیا جا سکے۔

مدارس والوں کو شکایت ہے کہ اسکول والے خواہ مخواہ دخل در معقولات کرتے ہیں۔ ہم تو اسکولوں کے معاملات اور ان کے نظام تعلیم کو نہ جھانک کر دیکھتے ہیں نہ ان میں دخل دیتے ہیں؟ تصویر کے دوسرے رخ کو بھی تو دیکھیے۔ اسکولوں اور ان میں پڑھنے والوں کو بجا طور پر یہ شکایت ہونی چاہیے کہ مدارس والے ان کی طرف دھیان کیوں نہیں

دیتے، ان کے مسائل میں دخل دینے سے گریز کیوں کرتے ہیں؟ ان کی بے توجہی اور بے نیازی اور اس سے زیادہ والدین کی بے اتفاقی کا ہی نتیجہ ہے کہ انگریزی اسکولوں کے طالب علم دین سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں۔ یہ صورت حالات انتہائی تشویش ناک ہے۔ ان طالب علموں کو دین کے بنیادی اصولوں سے آگاہ کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی اور تقسیم کی جائیں۔ یہ کون کرے گا؟ دینی اور فلاحی ادارے مل کر یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے ایک بڑی کوشش درکار ہوگی۔ اس بڑی مہم کو مدرسوں، اسکولوں، عالموں، دانشوروں اور اہل ثروت کا تعاون درکار ہوگا۔

بڑی بڑی اور باوسیلہ جامعات و مدارس کے لیے یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ تین طرح کے کورس اپنے طلباً کے لیے وا کردیں، پہلا شروع سے آخر تک بغیر کسی آمیزش یا اضافے کے صرف دینی تعلیم کا نصاب دوسرا کورس دینی تعلیم اہم عصری موضوعات کو شامل کرتے ہوئے، تیسرا دینی تعلیم کے ساتھ پیشہ ورانہ مہارت یا ووکیشنل ٹریننگ۔ انتخاب کے فیصلہ کا اختیار ظاہر ہے کہ طالب علم کو دیا جائے گا۔ بعض مدارس صرف دو طرح کے کورس فراہم کرسکیں گے۔ دینی اور دینی بشمول عصری یا دینی تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت دراصل ایسی جامعات اور مدارس کی تعداد بہت کم ہوگی جو تشتری پر تین کورس یا دو کورس رکھ کر طالب علم کو انتخاب کا موقع دے سکیں۔ وہ یا تو دین کے ساتھ اہم عصری مضامین یا ووکیشنل تربیت کو شامل کرسکیں گے۔ اس دور میں جب کہ جدید تعلیم، سرپرچوں یا modules کے ذریعے انتخاب مضامین کے دائرہ کو دن بہ دن وسیع کرتی جارہی ہے دینی تعلیم میں انتخاب کی وہ محدود گنجائش جس کا ذکر میں نے ابھی کیا، برمحل اور بے مصرف نہیں ہوگی۔

یہ بات شاید نظروں سے یک گونہ مخفی ہے کہ ہمارے ملک میں دینی تعلیم ایک حیرت انگیز اور گرانقدر عوامی جذبہ و جہد کا نتیجہ ہے۔ ہم اس پر زبان ستائش وا کرسکتے ہیں، چیں بہ جبیں نہیں ہوسکتے۔ مدارس کے اس زرّیں سلسلے میں وسعت، اہتمام، وسائل اور پھیلاؤ کے لحاظ سے بڑا تنوع ہے، ان مدارس کو آپ مشورہ ضرور دیں، بے شک ان کی شیرازہ بندی کی سبیل کریں، ان کے وسائل میں ترتیب، فراخی اور مداومت لانے کی امکانی کوشش کریں، اور ضرور کریں، لیکن انھیں بے کیف و بے رنگ یکسانیت کے شکنجے میں کسنے کا خیال زنہار دل میں نہ لائیں۔ پندرہ برس ہوئے، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ایک قابل قدر کوشش کی تھی۔ اس نے علماء اور دانشوروں کو اہم مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے کے لیے ایک ساتھ بٹھایا۔ گفتگو خوش گوار اور بارآور ماحول میں ہوئی۔ ہمیں جائزہ لینا چاہیے کہ بات کچھ آگے بڑھی یا نہیں! ان فیصلوں پر کچھ عمل بھی ہوسکا؟ اسی وضع کی ایک محفل پھر برپا ہونی چاہیے۔

علی گڑھ تحریک کے عظیم بانی سیّد والا گہر نے کتنے پتے کی بات کہہ دی کہ قرآن خدا کا قول ہے اور قدرت اس کا عمل۔ قدرت اور اس کے مظاہر اور اس کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور اس کا بھید پانے کی کوشش قرآن سے تحریک اور توانائی پاتی ہیں۔ قرآن اسی زندگی کو آئینہ دکھاتا ہے جو ہر پل حرکت میں ہے، ہر لمحہ بدل رہی ہے، وہ اس کائنات کو اپنی معیت میں سموتا اور سمیٹتا ہے جو ناپیدا کنار ہے۔ کائنات کا سارا نظام اپنی محیر العقول ترتیب و ہم آہنگی اور شب و روز اور زندگی اور موت کے تواتر کے ساتھ اپنے خالق بے ہمتا کی قدرت تخلیق پر گواہی لاتا ہے۔ وحدہٗ لاشریک می گوید۔ وہ خالق ذوالجلال والاکرام جو زندہ اور قائم رکھنے والا ہے جس کی کرسی میں یہ زمین اور سارے آسمان سمٹ آئے ہیں، اس کی عظمت و جلال، اس کی قدرت و کمال، اس کی ہدایت و ارشاد، کا تھوڑا بہت اندازہ بس ان لوگوں کو ہوتا ہے جو رات دن سوتے جاگتے قدرت کے مظاہر اور شئون پر غور کرتے ہیں اور بار بار یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ یہ طغیانی تخلیق باطل اور بے مقصد ہرگز نہیں ہے۔ سعدی شیراز نے کوئی چھ سو سال پہلے کہہ دیا تھا۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

(سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان کی نظر میں پیڑوں کی ٹہنیوں سے پھوٹنے والا ہر سبز پتہ پروردگار کو پہچاننے کے لیے ایک دفتر کی حیثیت رکھتا ہے) اللہ کو وہ شخص کیا سمجھے گا جو اس کی قدرت کے بھیدوں سے ناواقف ہے۔ یہ عوام ہی ہیں جو ان بھیدوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ عوام اور طالبان علم کا جہاں تک تعلق ہے

علوم سے اگر انھوں نے ناتا نہیں جوڑا تو معرفت حق سے یہ آئینہ محروم رہیں گے کیا وجہ ہے کہ ہمارے مدارس ان علوم کو اپنے احاطے میں داخل نہیں ہونے دیتے جنھیں قرآن کی تعلیم و تحریک، تعبیر و تفسیر نے از سر نو زندہ کیا تھا، جنھیں وسعت اور جلا بخشی تھی۔ علوم تو علوم، خود قرآن مجید کو ہمارے مدارس نے مرکزی حیثیت نہیں دی۔ قرآن کی روح ان میں سے بعض کو چھو تک نہیں گئی۔ قرآن کو مدارس میں بھی وہی جگہ ملنی چاہیے جو ہر مسلمان کے دل میں ہے۔ ہمارا دین قرآن و سنت پر مبنی ہے لیکن قرآن کی تفہیم کو صدر مدارس میں نہ جانے کیوں جگہ نہیں دی گئی۔ خود مسلمانوں نے قرآن کی جاں بخش، جہد آفریں اور حرکت انگیز تعلیم کو فراموش کر دیا۔ قرآن کو جزدان میں لپیٹ کر نسیاں کے طاق میں بڑے احترام کے ساتھ رکھ دیا۔

سر سید کے حسن نیت کا اثر ہے کہ علی گڑھ کو دینی مدارس کی فکر دامن گیر رہی ہے اور اس نے کبھی کبھی مدارس کو قریب لانے اور مضبوط کرنے کے لیے قدم بھی اٹھائے ہیں۔ اس نے مدارس کی کچھ اسناد کو تسلیم بھی کیا ہے۔ لیکن کیا اتنا کرنا کافی ہے۔ چند سال ہوئے بڑے عزائم کے ساتھ یونیورسٹی کے سنٹر فار پروموشن آف سائنس نے پروفیسر اسرار احمد صاحب کے زیر ہدایت دینی مدارس کے لیے عصری مضامین کا نصاب تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ باوصف اخلاص یہ کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا۔ عبدالقیوم صاحب نے مجھے ابھی بتایا کہ آٹھویں جماعت تک کا نصاب مرکز فروغ سائنس نے تیار کر لیا ہے اس کی رفتار کو تیز کرنا چاہیے۔

بہتر یہ ہو کہ یہ کانفرنس دینی تعلیم کے مسائل کو دوہرانے کے بجائے یہ فیصلہ کرے کہ عملی قدم کیا کیا اٹھانے چاہئیں۔ دینی تعلیم کے نصاب میں عصری مضامین میں سے کن کن کو شمول کے لیے چنا جائے۔ ایسے مضامین کی فہرست ترجیحی ترتیب کے ساتھ بنائی جائے تاکہ مختلف مدارس اپنے اپنے حوصلے اور اپنی بساط کے مطابق ان مضامین میں سے کچھ کو نصاب میں داخل کر سکیں۔ پھر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ غیر دینی مضامین کون سے ہیں، جنھیں الگ کر کے، ان کی جگہ پر ان مجوزہ مضامین کو داخل کیا جائے۔ یہ بھی سوچیے کہ آیا ٹائم ٹیبل میں روزانہ دو یا تین گھنٹوں کا اضافہ ممکن ہوگا۔ یا کل مدت تعلیم میں چند سالوں کے اضافہ کی طرف توجہ دی جائے یا دونوں کو آزمایا جائے۔ ایک بار اگر مدارس کے مہتمم حضرات جدید عصری مضامین کو داخل کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں تو پھر اوقات میعاد اور موضوعات کی تقسیم میں بہت سی تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔

مرکزی وزارت تعلیم نے چند ماہ ہوئے اعلان کیا تھا کہ ان مدارس کو جو بہ طیب خاطر جدید عصری مضامین کو داخل نصاب کرنا چاہتے ہیں اور ان کے پاس اس کے لیے وسائل نہیں ہیں، سرکار انھیں مجوزہ مضامین پڑھانے کے لیے امداد دے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مدارس کو اس پیش کش کو قبول کر لینا چاہیے۔

دینی مدارس کی خود مختاری اور تنوع کو محفوظ رکھتے ہوئے ایک ماڈل نصاب کی تشکیل و ترویج کا اہتمام کیجیے۔ ان مدارس کے لیے ایک مرکزی بورڈ بنانے کا منصوبہ شاید ابھی قبل از وقت ہوگا۔ لیکن سمت سفر کے تعین میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بڑی جامعات البتہ ایک مشترکہ کمیٹی بنا سکتی ہیں جو وقتاً فوقتاً مدارس کا معائنہ کرتی رہے۔

تین اداروں یا انجمنوں نے دینی مدارس میں تعمیری انداز سے دلچسپی لی ہے، پہلی انجمن تو یہی مرکز فروغ سائنس ہے، دوسری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی دہلی، تیسری اسلامک فاؤنڈیشن دہلی ہے۔ ان تینوں نے الگ الگ سروے کا کام کیا ہے۔ پہلی اور تیسری نے نصاب کی تیاری میں سرگرمی دکھائی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر یہ تینوں کمیٹیاں مل بیٹھیں اور سروے کے نتائج کا تجزیہ کر کے انھیں منظر عام پر لے آئیں۔ علمائے کرام سے مشورے کے بعد وہ عصری مضامین کے نصاب کو مکمل کر کے مشتہر اور فراہم کر دیں۔ مدارس اور ان کی پیشرفت کے متعلق اعداد و شمار کو جمع کرنے اور انھیں زیر نظر رکھنے کا کام بھی یہ کمیٹی کر سکتی ہے۔

ایک اور بڑا کام جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں، انگریزی اسکولوں کے طلبا کے لیے ایسی کتابوں، کتابچوں اور رسالوں کی تیاری اور اشاعت ہے جو انھیں دین سے آشنا کر دیں۔ مزید برآں ضرورت ہے متعلقہ انجمنوں اور اداروں میں رابطہ کی اور اس موضوع پر جو کانفرنسیں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی، ان میں تسلسل کی اور ان کے فیصلوں کو عمل میں لانے کی اور اس ضمن میں رائے عامہ تیار کرنے اور عوام کو باخبر رکھنے کی۔

ڈاکٹر عبدالقیوم

استقبالیہ خطبہ

آج مجھے بے حد خوشی ہے کہ تمام دشواریوں کے باوجود مرکز فروغ سائنس کی جانب سے، دینی مدارس میں سائنسی مضامین کی شمولیت، جیسے موضوع پر یہ سمینار عمل میں آہی گیا۔ ماحول کی پیچیدگی اور ملک کے حالات کے پیش نظر یہ پروگرام کئی مرتبہ ملتوی کیا جاچکا تھا۔

آج کا دن میرے لیے انتہائی فخر و مسرت کا دن ہے اور کیوں نہ ہو؟ آج مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مرکز فروغ سائنس کے ایک کارکن کی حیثیت سے اکابرین ملت، صاحب علم و فراست اور دانشور حضرات سے تبادلہ خیال کا موقع ملا ہے۔ میرے لیے تو سعادت کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے مرکز فروغ سائنس کی جانب سے اور خود اپنی جانب سے مہمان خصوصی جناب سید حامد صاحب کانفرنس کے مندوبین اور دوسرے مہمانوں کو خوش آمدید کہوں۔ مزید سعادت کی بات ہے کہ آج مجھ جیسے سائنس کے طالب علم کو ایک ایسی مجلس کے سامنے اظہار خیال کا موقع ملا ہے جس کے شرکا میں سے بیشتر اس پیغام حق کے حامل اور وارث ہیں جس کی حفاظت کا خود ہمارے خالق برحق نے وعدہ فرمایا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ جب ہم اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا احتساب کریں اور اس کے ازالے کی قرار واقعی کوشش کریں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ امت مسلمہ اس صدی میں تعلیمی و فکری انحطاط ذہنی پستی اور احساس کمتری کے جس مقام پر پہنچ گئی ہے شاید اس سے قبل کبھی نہ پہنچی تھی حالات یہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ ہندستان کے بیشتر اخبارات ہم کو پسماندہ، قدامت پسند، بنیاد پرست اور دوسرے تضحیکی خطابات سے نوازتے رہتے ہیں اور اکثر وہ حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں مگر ہم پر بھی تو لازم ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں اور خرابیوں سے باخبر رہیں۔ اپنی خرابیوں کا احساس ہم کو ہونا چاہیے اور پھر اپنی سعی مسلسل سے اور مثبت رویے کو بنیاد بنا کر اپنی برائیوں کو اچھائیوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ایک پہلو یہاں اور بھی لائق توجہ ہے کہ ایک طرف الحاد کی طاقتیں اور دوسری طرف دوسرے مذاہب کے چند افراد اس پر کمربستہ نظر آرہے ہیں کہ دین اسلام کو جو پہلے سے ہی قلعہ گزیں ہو گیا ہے یورشیں کر کے ٹکڑے ٹکڑے کردیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ہمارے دینی مدارس کے فارغین معاندین کے حملوں اور اعتراضوں کا جواب دیں گے مگر کیا ہم نے ان کو یہ کردار ادا کرنے کے لیے تیار بھی کیا ہے؟ کیا ان کی عام آگہی اور دوسرے متعلقہ علوم سے ان کی واقفیت اس معیار کی ہے کہ وہ الحاد اور دوسرے مبلغین کے ساتھ برابر کی سطح پر استدلال کے انداز میں گفتگو کر سکتے ہیں اگر ایسا نہیں ہے تو ہمیں اس طرف قدم بڑھانا ہے۔

انھیں حالات کے پیش نظر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنی

ڈائرکٹر سنٹر فار پروموشن آف سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے مرکز فروغ سائنس قائم کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ جناب سید حامد صاحب جن کی کوششوں سے یہ مرکز قائم ہوا وہ اس محفل کی صدارت فرما رہے ہیں اس مرکز کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں میں سائنس کی اہمیت کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ سائنسی مضامین میں مسلم زیر انتظام اسکولوں کے لیے تربیتی پروگرام منعقد کرنا ہے۔ اب تک ١٢ تربیتی پروگرام مسلم زیر انتظام اسکولوں اور دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے کیے جا چکے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مرکز کی کوششوں کے نتائج سامنے آرہے ہیں اور اس بات کا لوگوں کو شدت سے احساس ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں کچھ تبدیلی لائی جائے تاکہ دینی مدارس کے پروگرام کو بھی کافی موثر بنایا جاسکے اپنے پروگرام کو مزید موثر بنانے کے لیے وقتاً فوقتاً سمینار، کانفرنس اور خط و کتابت کے ذریعہ بھی آپ لوگوں سے رجوع کرتے رہے ہیں۔ لیکن بار بار ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا یہ پروگرام دینی مدارس میں سائنسی مضامین کی شمولیت کے جدوجہد کے لیے کافی ہیں میرے نزدیک بھی اور میرا خیال ہے کہ بیشتر اس سے اتفاق کریں گے کہ تربیتی پروگرام کے ساتھ ساتھ مرکز کو اپنی جدوجہد میں تیزی لانی چاہیے۔ اس سمینار کا مقصد صرف یہی ہے کہ صاحب علم اور دانشور اور علما حضرات مل کر بیٹھیں اور اس پر غور کریں اور مرکز کے لیے مشعل راہ بنیں کہ کس طرح سے اس کام کو انجام دیا جائے۔

آج یہ موضوع بحث نہ ہی نہیں کہ سائنس کی اہمیت کیا ہے۔ قرآن اور احادیث کے مطالعہ سے علم کا ایک بلند و وسیع تصور سامنے آتا ہے۔ تعلیم ایک جامع لفظ ہے جس میں خداشناسی اور خودشناسی دونوں ہی آجاتی ہیں۔ جہاں خداشناسی میں تسخیر کائنات، فطری تقاضوں کی تکمیل کے وسائل۔ انسانی ضروریات کی ہر شاخ شامل ہے۔ اسی علم کا تصور اسلام نے سب سے پہلے پیش کیا تھا اور ان تمام علوم و فنون کی تحصیل اور اشاعت کی ترغیب دی جو اللہ تعالیٰ کی صحیح پہچان اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی کی تعمیر اور اس کی مخلوق کے لیے نفع رسانی کا ذریعہ بن سکیں۔ ہم نے اس کے حکم و تدبر اور تعقل سے سرتابی کی تو دنیا کا رونا ہی کیا دین بھی معرض خطر میں نظر آتا ہے۔

ابھی تک جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم انگریزی خواں، دینی مدارس میں بڑی بڑی سائنسی تجربہ گاہیں قائم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں یا ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے وابستگان قرآن پاک، حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، فقہ، اصول فقہ اور علم الکلام سے دست بردار ہوکر اپنے نصاب تعلیم میں صرف عصری علوم داخل کرلیں۔ ہماری خواہش صرف اور صرف یہی ہے کہ دینی مدارس میں ہر ہر لمحہ قال اللہ اور قال الرسول کی ایمان پرور صدائیں گونجتی رہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ وقت آگیا ہے کہ دینی مدارس کے ارباب نظم و ضبط اور علما حضرات عصری تقاضوں سے چشم پوشی کی قدیم روایت کو ترک کرکے حقیقت پسندانہ روش اختیار کریں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ سائنسی علوم سے الحاد و بے دینی تو کجا، خالق کائنات کی معرفت کا دروازہ کھلتا ہے اور اس علیم و خبیر ہستی کے بے پایاں علم و حکمت کی کرشمہ سازیاں اور اس کے حسن تخلیق کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ عظیم سائنسدانوں اور سائنسی تخلیق کے شہسواروں کی بڑی اکثریت مذہب اور روحانیت کی قائل رہی ہے اور انھیں سائنس کی تنگ دامانی کا بھی احساس رہا ہے اور وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف رہے ہیں کہ سائنس اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود روحانیت کے بغیر انسانی مسائل کا حل پیش کرنے سے لاچار ہے۔

آج کے سمینار سے یہ بات واضح طور پر ظاہر ہو رہی ہے کہ آج یہ موضوع بحث ہے ہی نہیں کہ سائنس کو دینی مدارس میں داخل کیا جائے یا نہ کیا جائے بلکہ ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ کس طرح ہم دینی مدارس کے نصاب کو مرتب کریں کہ دنیوی مضامین کے لیے بھی اس میں گنجائش نکل سکے۔ نصاب پر اپنا اظہار خیال کرنے سے پہلے چند حقائق آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا۔

ہندوستان میں مسلم زیر انتظام جدید تعلیمی اداروں کے مقابلہ میں دینی تعلیمی اداروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جہاں درجہ آٹھ کے

مساوی یا اس سے اونچی سطح کی تعلیم دی جاتی ہے اور جن میں دو سو سے لے کر چند ہزار تک مسلم طلباء زیر تعلیم ہیں ایسے دینی مدارس کی تعداد ہندوستان میں تقریباً تین ہزار کے ہے اور اس کے برخلاف مسلم زیر انتظام جدید تعلیمی اداروں کی تعداد ۱۱۰۰ کے قریب ہے اور ان اسکولوں میں مسلم طلباء کی تعداد بھی ۴۰ فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مسلم خواندگی کا ایک بڑا حصہ دینی تعلیمی اداروں کا مرہون منت ہے۔ اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کی سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں حقیقی پیش رفت کے کسی منصوبہ بند کام میں دینی مدارس کو نظر انداز کرنا ایک غیر حقیقت پسندانہ عمل ہوگا۔

بات اتنے پر ہی ختم نہیں ہوتی۔ جونیئر ہائی اسکول اور ہائی اسکول میں داخل ہونے والے مسلم طلباء کی ایک بڑی تعداد دینی مکاتب کے راہ سے آتی ہے۔ ان مکاتب میں ریاضی اور سائنس کی تعلیم پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا۔ نتیجتاً مکاتب کی راہ سے آنے والے مسلم طلباء تو خود کو کلاس میں کمزور پاکر تعلیم سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں یا گھسٹتے ہوئے چلتے ہیں اور جیسے ہی موقع ملا ان مضامین اور بالخصوص ریاضی سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ بات اب واضح ہو چکی ہے کہ دور حاضر میں ریاضی کی اہمیت اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ سائنسی مضامین کی بات تو درکنار عصری علوم کی ہر شاخ میں کسی نہ کسی سطح پر ریاضی میں عبور حاصل کیے بغیر مہارت حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے اس پس منظر میں دیکھیے اور اس کی اہمیت کا اندازہ لگائیے

سوالنامہ کے ذریعے دینی مدارس سے جو اطلاعات حاصل کی جا سکی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں معروف عربی دینی مدارس کی مدت تعلیم کے تین درجہ ہیں۔

الف (۱) ابتدائی ۵ سال (۲) ثانوی ۴ سال (۳) اعلیٰ درجات (۵+۲) سال

ب (۱) ابتدائی ۵ سال (۲) ثانوی ۳ سال (۳) اعلیٰ درجات (۸+۲) سال

پ (۱) ابتدائی ۹ سال — (۲) اعلیٰ درجات (۵+۲) سال

ان سبھی مدارس میں ابتدائی سے ثانوی تک اردو، ہندی، فارسی دینیات، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ اور کہیں کہیں انگلش اور عام معلومات کی ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔ اعلیٰ درجات میں عربی ادب، قرآن و حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور کہیں کہیں انگریزی، علم و تمدن اور معاشیات میں سے ایک یا تینوں تعلیم دی جاتی ہیں۔ جن لوگوں کی وابستگی دینی مدارس اور دینی مدارس میں طرق تدریس سے گہری دلچسپی نہیں ہے ان کے لیے نہایت ہی مشکل بلکہ میں یہ کہوں گا کہ ناممکن سی بات ہے کہ وہ ترتیب یا ترمیم نصاب میں دخل انداز ہو سکیں ان حالات میں ہمارے علماء کی رہبری اور دلچسپی ہی دینی مدارس کے معاملات میں اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اعلیٰ درجات پر غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مدت کے لحاظ سے مختلف دینی مدارس میں تفریق ہے۔ ان حالات میں یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

چونکہ دینی مدارس کے اعلیٰ درجات کے نصاب مختلف طریقہ کے رائج ہیں اس لیے اس سمینار میں اگر علماء حضرات یا دینی مدارس کے متعلقین اس پر روشنی ڈالیں کہ سائنس یا دوسرے سیکولر مضامین کس حد تک دینی مدارس کے نصاب میں داخل کیے جا سکتے ہیں تو مناسب ہوگا۔ ان کے ہفتہ وار پڑھانے کی مدت کیا ہونی چاہیے تاکہ دینی مدارس کے مزاج میں بھی کوئی تبدیلی نہ آئے۔ ہمیں امید ہے کہ علماء حضرات کے مشورہ اور تجاویز سے تیار کیا ہوا نصاب لوگوں کے لیے قابل قبول ہوگا اور مرکز کو بھی اس سے ایک سمت ملے گی تاکہ سائنس کا نصاب بھی تیار کیا جا سکے۔

اس عظیم مقصد کی بازیابی کے لیے دینی مدارس کو جن جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اس کا ذکر میں خود کرنا چاہوں گا۔

(۱) زیر بحث مضمون کے نفاذ کی راہ میں اردو زبان میں متعلقہ مضامین پر کتاب کا حصول ایک دشوار کام ہے۔ لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مہاراشٹرا بورڈ کرناٹک بورڈ اور NCERT میں اردو کی کتابیں دستیاب ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مرکز نے بھی اس سلسلے میں کام شروع کر دیا ہے۔ درجہ اول سے لے کر آٹھویں تک کی سائنس سے متعلق کتابیں تقریباً تیار کی جا چکی ہیں۔ ان

کتابوں کو پرنٹ کرانے سے پہلے میں علما حضرات سے Comments لینا چاہوں گا۔ انشاء اللہ جلد ہی آپ لوگوں کی خدمت میں Comments کے لیے یہ بھیج دی جائیں گی۔

(۲) لائق اساتذہ کی عدم دستیابی۔ تقریباً اب سبھی خطوں میں سائنس کے ریٹائرڈ مسلم استاد اگر کوشش کی جائے تو مل جائیں گے۔ جو کم مشاہرہ پر بھی کام کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اپنے تجربات کی بنا پر اسکول میں سائنس کا ایک اچھا ماحول بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں بیشتر لوگ اسلامی قدروں کے نزدیک ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی اس کے لیے کوشاں ہے کہ کچھ مختصر مدت کے کورس اردو میں دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے تیار کیے جائیں خدا سے دعا کیجیے کہ ہمیں اس مرحلہ میں کامیابی مل سکے۔

(۳) تجربہ گاہ کی دشواری ہو سکتی ہے لیکن ہائی اسکول تک کی سائنس کی لیب کے لیے زیادہ مالی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔

(۴) اہم بات جو سائنسی مضامین کے لیے ہے کہ کلاس کے علاوہ بھی ان مضامین میں مہارت کے لیے مشق جاری رکھنی ہوں گی۔

(۵) سب سے اہم بات سائنس کے کورس کو ہائی اسکول کے مساوی تسلیم کرنے کا ہے لیکن ثانوی لیبل تک ہی سائنسی مضامین داخل کیے جائیں تو دقت نہیں پیش آئے گی۔

مرکز فروغ سائنس کی جانب سے یہ مسئلہ یونیورسٹی انتظامیہ کے سامنے رکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس پر زیادہ غور و فکر صرف اس لیے نہیں ہو سکا کہ ابھی وقت بہت دور ہے جب یہ مسئلہ درپیش ہوگا تو کوئی نہ کوئی حل نکالنے کی کوشش کی جائے گی۔ کچھ دن پہلے وزیر تعلیم کی طرف سے اردو یونیورسٹی کے قیام کا اعلان ہوا تھا۔ کچھ لوگوں کا مشورہ ہے کہ نصاب تعلیم کے تسلیم کا مرحلہ اردو یونیورسٹی کے قیام کے بعد حل ہو سکتا ہے۔ اردو یونیورسٹی کی کمیٹی کے ممبران کا خیال ہے کہ اردو یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد میں یہ بات شامل کی جائے کہ جو بھی کورس اردو میڈیم کے ذریعہ چل رہے ہیں ان سبھی کورسوں کو اردو یونیورسٹی سے الحاق کیا جائے اور تسلیم کیا جائے۔

یوپی گورنمنٹ بھی اس وقت خواہاں ہے کہ دینی مدارس میں سائنس اور دوسرے ایسے سیکولر مضامین کو فروغ دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ جلد ہی اس سلسلے میں گورنمنٹ کی جانب سے کوئی اعلان ہو۔ دوسری ایجنسیوں کے دروازہ پر بھی دستک دینی ہوگی۔

انشاءاللہ مرکز فروغ سائنس اپنی وسعت کے مطابق ملک و ملت کے رہنماؤں کی توجہ بھی اس کانفرنس میں منظور شدہ تجاویز کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرے گا تاکہ اس سلسلے کی ضروری سہولتوں کی فراہمی میں ان مدارس کی مدد ہو سکے۔

اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے میں مرکز کی جانب سے اس کانفرنس کے تمام مندوبوں، مقالہ نگاروں اور شرکا جلسہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بالخصوص ہم مہمان خصوصی جناب سید حامد صاحب کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہر ہر قدم پر ہماری رہنمائی کی، حوصلہ افزائی فرمائی، اس کانفرنس میں شریک ہونے کے ہمارے دعوت نامہ کو قبول کیا اور افتتاحی اجلاس کی صدارت کرنا بھی قبول فرمایا۔

یہ عین ممکن ہے کہ اپنی ناتجربہ کاری اور افراد و مسائل کی کمی کے باعث آپ ہماری مہمان نوازی میں کچھ کوتاہی محسوس کریں اس کے لیے ہم پیشگی معافی کے خواستگار ہیں۔

الطاف احمد اعظمی (علیگ)

دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت اور اس کا طریقۂ کار

(یہ مقالہ سنٹر فار پروموشن آف سائنس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے منعقدہ سیمینار مورخہ ۱ تا ۳ جولائی ۹۴ء کو پڑھا گیا)

علماء اور دینی مدارس کے ارباب اختیار دونوں کا خیال ہے کہ دینی مدارس میں جو نصاب تعلیم رائج ہے وہ دینی نقطۂ نظر سے بالکل درست ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی واقعی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی دلیل ان کی طرف سے یہ دی جاتی ہے کہ یہی نصاب تعلیم تو تھا جس نے ماضی میں مسلم قوم کی تمام ضرورتیں پوری کیں اور اسی نصاب تعلیم کے تحت وہ علماء پیدا ہوئے جنھوں نے علوم دینیہ میں نام پیدا کیا اور قوم کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

بے شک اسی نصاب تعلیم نے قوم کی دینی ضرورتیں پوری کیں اور اسی نصاب تعلیم نے بڑے بڑے علماء پیدا کیے۔ لیکن اس حقیقت سے صرف نظر نہ کریں کہ اب حالات کافی بدل چکے ہیں اور قوم کی دینی اور دنیوی ضرورتوں میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے موجودہ دینی نصاب تعلیم ناکافی ہے اور اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی کی اس ضرورت کا احساس ملت کے بعض دردمند علماء کو پہلے بھی رہا ہے۔ اسی احساس کے نتیجہ میں ندوۃ العلماء لکھنؤ مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ اور دیگر مدارس عربیہ کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن یہ تبدیلی محدود نوعیت کی تھی یعنی نصاب میں انگریزی زبان کو داخل کیا گیا اور زیر درس کتابوں میں کچھ ردو بدل ہوا۔ لیکن نصاب تعلیم میں کسی قسم کی بنیادی اور ہمہ گیر تبدیلی نہیں ہوئی۔ دینی اور دنیوی علوم کی تفریق کی جو منحوس بنا بعض ناگزیر سیاسی حالات نے ڈالی تھی وہ بدستور باقی رہی دینی مدارس کے نصاب تعلیم سے دنیوی علوم خارج ہو گئے اور دنیوی مدارس کے نصاب تعلیم سے دینی علوم۔ اس طرح ایک ناقص نصاب تعلیم دونوں جگہ رائج ہو گیا اور آج تک یہی ناقص نصاب تعلیم مروج ہے۔ نہ دینی مدارس کے لوگوں کو اس نقص و ناتمامی کا احساس ہے اور نہ دنیوی مدارس کے ارباب نظم و ضبط کو اس کمی کا ذرہ برابر خیال ہے۔ دونوں کے یہاں "کل حزب بما لدیہم فرحون" کا سا معاملہ ہے۔

ماضی میں بعض روشن خیال علماء نے دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں عصری ضرورتوں کے لحاظ سے تبدیلی کی وکالت کی۔ لیکن ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ مولانا ابو النظر رضوی امروہوی نے جمعیۃ العلماء کے اجلاس منعقدہ امروہہ کے موقع پر اپنے خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا۔

"شہر کے معزز رئیس مولوی سید منظم حسین جن کی سعی و کاوش سے

فیکلٹی آف سائنس جامعہ ہمدرد، ہمدرد نگر، نئی دہلی

اب تک اس درس گاہ (مولانا سید احمد حسین محدث امروہوی کی مسجد و مدرسہ) کا وقار قائم ہے گو طریقۂ تعلیم اور نصاب ہماری بدقسمتی سے یہاں بھی وہی ہے۔ جو پانچ سو برس پیشتر کی مذہبی ضروریات کے مطابق تیار کیا گیا تھا اور جسے دارالعلوم دیوبند سے لے کر ہر اسلامی مدرسہ میں آپ جاری پائیں گے۔ کاش سیاسی اور اقتصادی احتیاجات کے لحاظ سے جدید نصاب بنایا جائے۔" (۱)

جمعیۃ العلماء ہند نے اپنے اجلاس منعقدہ لاہور میں جو تجویز منظور کی وہ بھی ملاحظہ ہو۔

"جمعیۃ العلماء ہند کا یہ اجلاس مدارس عربیہ ودینیہ کے مروجہ نصاب میں دور حاضر کی ضروریات کے موافق اصلاح و تبدیلی کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہے اور مدارس عربیہ کے ذمہ دار حضرات اور تعلیمی جماعتوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی اس پر غور کرنے کے لیے باہمی مشورے اور تعاون سے مقرر کر کے ایک ایسا نصاب مرتب کرائیں جو دینی علوم کی تکمیل کے ساتھ ضروریات عصریہ میں بھی مہارت پیدا کرنے کا کفیل ہو" (۲)

افسوس کہ اس انقلاب انگیز تجویز پر عمل نہیں ہوا اور خود دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں آج تک کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں کی گئی حتیٰ کہ انگریزی زبان تک کو نصاب میں شامل نہیں کیا گیا۔ یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ نصاب تعلیم میں تبدیلی کا مطلب صرف چند کتابوں کی تبدیلی نہیں ہے ہر نصاب تعلیم خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی کسی نہ کسی فکر اور نظریے پر مبنی ہوتا ہے اور بعض عصری ضرورتوں کی تکمیل کے لیے وضع کیا جاتا ہے جب تک اس فکر و نظریہ میں قوت اور زندگی ہوتی ہے اور عصری ضرورتوں کی تکمیل حسب منشا ہو رہی ہوتی ہے نصاب تعلیم میں کسی تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جس وقت وہ فکر اور نظریہ مجروح ہوا اور ضروریات زمانہ میں تبدیلی واقع ہوئی تو نصاب تعلیم میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے جو قوم اس کے بعد بھی نصاب تعلیم میں تبدیلی کے عمل سے گریز کرتی ہے اس کا قومی وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اس قوم کے نونہالوں کے ذہنی قویٰ رفتہ رفتہ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اور آخر الامر وہ قوم قعر مذلت میں جا گرتی ہے جیسا کہ آج کل مسلم قوم کا حال ہے۔

راقم کے نزدیک دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی نہ صرف دنیوی ضرورتوں کے پیش نظر ضروری ہے بلکہ دینی لحاظ سے بھی اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ دنیوی اعتبار سے اس کا نقص یہ ہے کہ اس میں عصری علوم داخل نہیں ہیں اور دینی اعتبار سے سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم کو اس میں مرکزی حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ آگے انہی دو امور کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

نصاب تعلیم میں سائنسی علوم کی شمولیت

راقم اپنے علم کی حد تک پورا یقین رکھتا ہے کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں عصری بالخصوص سائنسی علوم کی شمولیت میں کوئی دینی قباحت نہیں ہے۔ قباحت تو کجا ان کی شمولیت کے بغیر دینی نصاب کو مکمل نہیں کہا جا سکتا ہے۔ امام غزالی کا جو دینی اور علمی مقام و مرتبہ ہے اس سے ہر صاحب علم واقف ہے۔ اگر وہ ایک طرف نقلی و عقلی علوم میں کامل دسترس رکھتے تھے تو دوسری طرف اسرار تصوف کے محرم تھے۔ وقت کے اس بحر العلوم نے علوم کی دو بنیادی قسمیں قرار دی ہیں، ایک فرض عین اور دوسری فرض کفایہ۔ فرض عین میں وہ علوم داخل ہیں جن کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے جیسے ارکان اسلام میں کلمۂ شہادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور دوسری دینی باتیں۔ اور فرض کفایہ سے مراد وہ علوم ہیں جن کا سیکھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ حسب ضرورت اگر کچھ مسلمان ان کو سیکھ لیں تو جماعت کے دوسرے لوگ بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ فرض کفایہ کی بھی دو قسمیں ہیں۔

(۱) علوم شرعی (۲) علوم دنیوی۔

علوم شرعیہ میں فرض کفایہ علوم کا تعلق تفسیر، حدیث، فقہ اور علم کلام وغیرہ سے ہے۔ اور دنیوی علوم میں جو علوم فرض کفایہ کا درجہ رکھتے ہیں ان میں طب، حساب، علم سیاست، پارچہ بافی، زراعت، ہیر کٹنگ اور خیاطی وغیرہ ہیں (۳) طب اور حساب کے متعلق امام غزالی لکھتے ہیں:

---

(۱) جمعیۃ العلماء ہند، مصنفہ پروین روزینہ، اسلام آباد، پاکستان ۱۹۸۱ء، ج ۲، ص ۵۲۔

(۲) ایضاً، ج ۲، ص ۵۵، اجلاس سیز دہم منعقدہ لاہور ۲۰ تا ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء)

(۳) احیاء العلوم، جلد ۱، صفحہ ۱۰، (کتاب العلم)

امافرض الکفایہ فھو کل علم لایستغنی عنہ فی قوام امور الدنیا کل طب انہ ھو ضروری فی حاجتہ بقاء الابدان، و کل حساب فانہ ضروری فی المعاملات وقسمۃ المواریث (۱)

"پس وہ تمام علوم فرض کفایہ ہیں جن کی حاجت امور دنیا کے قائم رکھنے میں ہے جیسے طب کہ وہ تندرستی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے یا جیسے حساب کہ معاملات، وصیتوں اور ترکوں کی تقسیم وغیرہ میں اس کی حاجت ہوتی ہے"

امام غزالی نے بڑی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ جب علوم دینیہ کی طرح بعض علوم دنیوی بھی فرض کفایہ ہیں تو مسلمان دنیوی علوم کی تحصیل کی طرف کیوں توجہ نہیں کرتے؟ فرماتے ہیں؛

"بعض شہر ایسے ہیں کہ جن میں ذمی کافروں کے سوا کوئی طبیب نہیں ہے اور فقہ کے وہ احکام جو طبیبوں سے متعلق ہیں ان میں ذمی کافروں کی شہادت کافی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ہم کسی ایسے شخص کو بھی نہیں دیکھتے کہ وہ علم طب کی تحصیل کی طرف مائل ہو بلکہ اس کے برعکس لوگ فقہ کی تحصیل میں مبالغہ کرتے ہیں" (۲)

امام غزالی نے احیاء العلوم میں اس خیال کی شدت کے ساتھ تردید کی ہے کہ علوم نقلیہ کے ساتھ علوم عقلیہ (۳) کا اجتماع و تطبیق ممکن نہیں ہے لکھتے ہیں۔

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علوم عقلی، شرعی علوم کے منافی ہیں اور ان دونوں کے درمیان اجتماع ناممکن ہے۔ درحقیقت یہ خیال لوگوں کی کم نظری اور کوتاہ بینی کی دلیل ہے۔ ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اس خیال سے۔ اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ بعض علوم شرعی خود آپس میں تناقض ہیں اور لوگ ان کے درمیان ربط و اجتماع نہیں پیدا کر پاتے اس لیے گمان کر بیٹھتے ہیں کہ یہ علوم دین میں نقص پیدا کرتے ہیں" (۴) علوم عقلی اور علوم شرعی میں تطبیق کی دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"محض تقلید کی دعوت دینے والے اپنی کم علمی کے باعث بالکل جاہل ہیں اور قرآن و سنت کی تجلیوں سے قطع نظر کرکے صرف عقل پر بھروسہ کرنے والے بھی سخت دھوکے میں ہیں۔ پس تم کو لازم ہے کہ ان دونوں گروہوں سے دور رہ کر دو اصلوں کے درمیان اجتماع و ربط پیدا کرو۔ بے شک علوم عقلی غذا کی مانند ہیں اور علوم شرعی دوا کی مانند" (۵)

امام غزالی کا تعلق عہد سلاجقہ (۱۰۲۹-۱۱۱۷ء) سے ہے گویا امام صاحب نے گیارہویں صدی عیسوی میں دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں عقلی علوم کی شمولیت کا مشورہ دیا تھا۔ اور یہ مشورہ نہایت صائب تھا اور اس کی افادیت آج بھی مسلم ہے۔

امام غزالی کے بعد میں ایک ایسے شخص کے خیالات پیش کرتا ہوں جو عالم بھی تھا اور شیخ طریقت بھی اور جس کا تعلق خود ہندوستان سے ہے۔ میری مراد حضرت ابوالحسن علی ہجویری سے ہے جن کی کتاب "کشف المحجوب" نہایت شہرت رکھتی ہے اور ہندوستان میں تصوف پر پہلی تصنیف ہے۔ علم اور علوم کے باب میں اس صوفی عالم کے خیالات ملاحظہ ہوں۔ لکھتے ہیں۔

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ ستین سنۃ یعنی ایک گھڑی کا تفکر ۶۰ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔" جس علم کا سیکھنا ہر ایک کے لیے فرض قرار دیا گیا ہے وہ خدا کی شریعت خصوصاً اس کے فرائض و واجبات کا علم ہے۔ اس کے ساتھ دوسرے علوم کا اس حد تک سیکھنا جس حد تک یہ شریعت الٰہی کے احکام اور ان

---

(۱) ایضاً ج ا ص ۱۰۹

(۲) احیاء العلوم ج ا ص ۱۱

(۳) عقلی علوم میں منطق و فلسفہ کے ساتھ اب عصری علوم بالخصوص سائنسی علوم بھی داخل ہیں۔

(۴) احیاء العلوم ج ا ص ۲۲-۲۵

(۵) احیاء العلوم ج ا ص ۲۲-۲۵

کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے درکار ہوں وہ آپ سے آپ ضروری ہو جاتا ہے مثلاً علم طبعیات، علم حساب، علم جغرافیہ، علم نجوم و ہیئت، علم سیاست، علم اقتصادیات، علم قانون اور علم صنعت و تجارت وغیرہ کیونکہ ان کے کم از کم اصولی علم کے بغیر انسان کی انفرادی و اجتماعی اور عمرانی زندگی کے مسائل کا فہم و ادراک اور ان پر اصول شریعت کا انطباق کرنا ممکن نہیں ہے اس سے زائد جس قدر علم آدمی حاصل کرلے وہ مستحسن اور مطلوب ہے لیکن فرض نہیں ہے۔ (۱)

اس روشن ضمیر صوفی کی تشریح کے مطابق وہ علوم دنیوی جو الٰہی شریعت کے فہم میں معاون بن سکتے ہیں۔ ان کی تحصیل بھی علوم شرعی کی طرح ضروری ہے۔ کیا عصری علوم اس زمرہ میں نہیں آتے؟ علم طب، علم حساب، علم طبعیات، علم ہیئت، علم سیاست اور علم اقتصاد میں سے کون سا علم ہے جو کتاب الٰہی اور اس کے احکام کے فہم کے لیے ضروری نہیں ہے۔ یہ بات تو ہر عالم دین جانتا ہے کہ قرآن مجید میں آثار مظاہر کائنات پر غور و فکر کی دعوت بکثرت دی گئی ہے۔ کیوں؟ کیا اس غور و فکر کے بغیر دین کی تفہیم ممکن نہ تھی؟ آپ جانتے ہیں کہ دین اسلام کا مغز و جوہر توحید ہے۔ یعنی خالق کائنات اور اس کی صفات کی صحیح معرفت اور آثار کائنات پر غور و فکر اس معرفت میں حد درجہ معین مددگار ہے۔ اس سے وقوع آخرت کا علم بھی حاصل ہوجاتا ہے قرآن مجید کی درج ذیل آیات سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ فرمایا گیا ہے (ترجمہ)

"بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں اور رات و دن کے باری باری سے آنے میں نشانیاں ہیں ان ارباب دانش کے لیے جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، کھڑے، بیٹھے اور پہلوؤں پر، اور آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں (اور جب غور و فکر کے نتیجہ میں ان پر اصل حقیقت بے نقاب ہوتی ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں) خدایا تیری حکمت اس عیب سے پاک ہے کہ تو عبث کام کرے۔ پس اے رب! ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچالے" (۲)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علوم جدیدہ بالخصوص سائنسی علوم کی مدد کے بغیر قرآن مجید کی ان آیات کی صحیح تفہیم ممکن نہیں جن کا تعلق انفس و آفاق کے آثار سے ہے (۳) میں یہاں بطور ثبوت سورہ بقرہ کی چند آیات پیش کرتا ہوں۔ فرمایا گیا ہے (ترجمہ):

"بے شک زمین اور آسمانوں کی تخلیق میں، رات اور دن کے باری باری سے آنے جانے میں، اور اس کشتی میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے چلتی ہے اور اس پانی میں جسے اللہ آسمان سے نازل کرتا ہے اور پھر اس سے مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے اور اس میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلاتا ہے، اور ہواؤں کی گردش میں اور آسمان و زمین کے درمیان معلق بادل میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔ (۴)

مذکورہ آیاتِ قرآنی میں جن مظاہر فطرت کا ذکر ہوا ہے ان کو اہل دانش و بینش کے لیے خداشناسی کی نشانیاں کہا گیا ہے۔ کیا کوئی عالم دین بتا سکتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کیوں کر ہوئی، لیل و نہار کا نظام کس طرح قائم ہے، سمندر کی پشت پر انسانوں کے لیے نفع بخش ساز و سامان اٹھائے ہوئے کشتیاں کس طرح غرقابی سے محفوظ ہر وقت رواں دواں رہتی ہیں۔ بارش کے پانی اور زمین سے حیات کی متنوع نمود میں کیا رشتہ ہے، ہواؤں کی گردش کا قانون کیا

۱۔ کشف المحجوب ص ۲۰ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دھلی (۱۹۸۱ء)

(۲) آل عمران ۱۹۰۔ ۱۹۱

(۳) اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحابۂ کرام اور بعد کے اہل علم نے ان آیات کا سرے سے کچھ مطلب ہی نہیں سمجھا تھا۔ انھوں نے اپنے عہد کے علم اور فہم کے مطابق ان کا مطلب یقیناً سمجھا تھا لیکن ان آیات کا واقعی علم اس دور میں ممکن نہ تھا۔ یہاں یہ نہ بھولیں کہ قرآن مجید آخری کتاب ہے اس میں ہر دور کے اہل علم کے لیے غور و فکر کا مواد مہیا کیا گیا ہے تاکہ وہ جان سکیں کہ یہ واقعی اللہ کی کتاب ہے۔

آسمان و زمین کے درمیان بادل کس قانون طبعی کے تحت مسخر ہے؟"(۱)

یقیناً کسی عالم دین کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ان سوالات کا جواب دے سکے اس لیے کہ وہ سائنسی علوم سے واقف نہیں اور سائنسی علوم سے واقفیت کے بغیر ان آیات کی واقعی تفہیم نہایت مشکل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سائنسی علوم کی تحصیل ہماری دینی ضرورت بھی ہے۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ سائنسی علوم کی تعلیم سے دینی عقاید خراب ہو جاتے ہیں۔ آج ملک کے گوشے گوشے میں ہزاروں سائنس داں ملیں گے کیا ان سب کے عقاید خراب ہیں اور کیا وہ سب ملحد و بے دین ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بے شک بعض سائنس داں ملحد رہے ہیں اور آج بھی ہیں لیکن خدا پر یقین رکھنے والے سائنس دانوں کی تعداد ہر دور میں زیادہ رہی ہے۔ آئنسٹائن جیسا عظیم المرتبت سائنس داں ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر اپنے یقین و ایمان کا اعلان کرتا ہے: (۲)

I believe in God who reveals himself in the orderly harmony of the univers

میں خدا پر اعتقاد رکھتا ہوں جو اس کائنات کی باضابطہ ترتیب اور ہم آہنگی کے پردہ میں جلوہ گر ہے۔

اگر سائنس کے بعض تصورات میں الحاد کے عناصر موجود ہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ ان سے دور بھاگیں۔ کیا یونانی فلسفہ میں جو دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں شامل ہے، الحادی عناصر نہیں پائے جاتے ہیں، پھر ان کو داخل درس کیوں کیا گیا؟ اگر ان خرابیوں کے باوجود یونانی فلسفہ کو شجر ممنوعہ نہیں سمجھا گیا اور مدتوں بڑے بڑے علما فضلا نے اس میں دماغ سوزی کی اور اس علم میں بعض بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں تو پھر سائنسی علوم سے ترک و ہجر کا سلوک کیوں؟ آپ فلسفۂ یونان کی طرح ان علوم کو بھی پڑھیں اور ان کے جن تصورات کی زد اسلامی عقاید پر پڑتی ہے ان کو خوب اچھی طرح سمجھ کر ان کی اسی طرح بیخ کنی کریں جس طرح کبھی امام غزالی نے "تہافتہ الفلاسفہ" لکھ کر ارسطو کے فلسفۂ الٰہیات کی تردید کی۔ امام غزالی کے وقت میں اہل علم کا ایک بڑا طبقہ فلسفۂ ارسطو سے اسی طرح مرعوب تھا جس طرح آج بہت سے لوگ سائنسی علوم سے مرعوب ہیں، امام غزالی لکھتے ہیں:

"ہمارے زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جن کو یہ زعم ہے کہ ان کا دل و دماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہے یہ لوگ مذہبی احکام و قیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حکما' قدیم مثلاً افلاطون اور ارسطو وغیرہ مذہب کو لغو سمجھتے تھے اور چونکہ یہ حکما، تمام علوم و فنون کے بانی اور موجد تھے اور عقل و ذہن میں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہوا اس لیے ان کا انکار مذہب اس بات کی بین دلیل ہے کہ مذہب حقیقت میں لغو اور باطل ہے۔ اور اس کے اصول و قواعد فرضی اور مصنوعی ہیں جو صرف ظاہر میں خوشنما اور دلفریب ہیں۔ اس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکما نے الٰہیات پر جو کچھ لکھا ہے اس میں ان میں ان کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیچۂ اطفال ہیں"۔ (۳)

سائنس پر کسی خاص قوم و ملک کو اجارہ داری حاصل نہیں ہے کہ وہ سائنس کے نام سے جس خیال اور نظریہ کو پیش کریں ان کو کسی نقد و جرح کے بغیر مان لینا ضروری ہے۔ آپ آگے بڑھیں اور سائنس کو مسلمان بنا لیں یعنی مطالعۂ کائنات کی بنا ان تصورات پر رکھیں جن کی تعلیم قرآن مجید میں دی گئی ہے۔ مثلاً مغربی سائنسداں نوامیس فطرت کا مطالعہ کرتے وقت اس بات سے مطلق سروکار نہیں رکھتے کہ اس کائنات کا کوئی خالق و مالک ہے۔ لیکن آپ اس مطالعہ کی غرض اللہ کے حیرت انگیز علم و حکمت کا مشاہدہ اور قوانین فطرت کی تفہیم قرار دیں تاکہ ان کی مدد سے ایک طرف سر توحید کی گرہ کشائی ہو تو دوسری

---

(۱) دیکھیں راقم کا مضمون تہذیب الاخلاق مئی ۱۹۸۷ء ص ۲۶

(۲) ملاحظہ فرمائیں راقم کی کتاب: ایمان و عمل کا قرآنی تصور ص ۵۲ (مطبوعہ علیگڑھ ۱۹۸۶ء)

(۳) تہافتہ الفلاسفہ ماخوذ از غزالی، علامہ شبلی نعمانی ص ۴۰ (مطبوعہ رنگین پریس دہلی)

طرف ... وسخر لکم ما فی السماوات وما فی الارض جمیعا منہ " (۱) کا قرآنی ارشاد حقیقت واقعہ بن سکے یعنی تسخیر کائنات جس سے انسانی تمدن کے ارتقاء کی راہیں کھلیں گی۔

اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں عصری علوم کی شمولیت سے نہ صرف دنیوی فوائد حاصل ہوں گے بلکہ دینی علوم کی تفہیم میں بھی ان سے مدد ملے گی۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی دینی جہت سے

دینی مدارس کے موجودہ نصاب تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت جہاں دنیوی مصالح کے لحاظ سے ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، وہاں خالصتہً دینی نقطۂ نظر سے بھی اس میں بنیادی تبدیلی درکار ہے۔ دینی مدارس میں جو نصاب تعلیم مروج ہے وہ حد درجہ غیر متوازن ہے۔ اس میں جو جگہ اصل علم کو ملنی تھی وہ بد قسمتی سے فروعی علوم کو حاصل ہوگئی۔ اور اس کی وجہ ایرانی تہذیب کا غلبہ ہے۔ جس کا آغاز ہندوستان میں سولھویں صدی عیسوی میں ہوا اور رفتہ رفتہ اپنے عروج کو پہنچا یہاں اس کی قدرے تفصیل کی ضرورت ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ عہد مغلیہ میں وسط ایشیاً اور ایران سے علماً وفضلا، کی ایک بڑی تعداد ہندوستان آئی اور حکومت کے مختلف مناصب پر فائز ہوئی۔ عہد مغلیہ سے پہلے ہندوستان میں جو نصاب تعلیم رائج تھا اس میں فقہ کو غلبہ حاصل تھا۔ یہاں فقہ سے مراد فقہ حنفی ہے۔ مولانا عبدالحی حسنی لکھتے ہیں۔

"اس دور میں فتاوی کی کثرت ملتی ہے اور کتاب وسنت پر فقہ کو تفوق حاصل تھا اور سنن ماثورہ سے مجتہدات کو تطبیق دی جاتی تھی حدیث میں علماء کوتاہ نظر واقع تھے۔ مشارق الانوار سے آگے ان کی نظر نہ جاتی تھی۔ اور جو شخص بغوی کی مصابیح السنہ پر عبور حاصل کر لیتا تھا۔ وہ خود کو محدث سمجھتا تھا۔ فقہی عصبیت درجۂ عروج پر تھی۔ غیاث الدین تغلق اس عہد کا ایک بادشاہ گزرا ہے۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ غنا کے شوقین تھے علمائے اس پر اعتراض کیا۔ مقدمہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوا بادشاہ نے شیخ کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور علماً سے کہا کہ وہ اس مسئلہ میں شیخ سے مناظرہ کریں۔ جب شیخ نے اپنے مسلک کے تائید میں مروی احادیث پیش کیں تو علماً نے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ "ہمارے وقت میں فقہ کو حدیث پر برتری حاصل ہے" اور بعض علماً نے یہ تک کہہ دیا کہ ہم ان احادیث کو سننا بھی نہیں چاہتے کیونکہ ان سے شافعی نے استدلال کیا ہے اور وہ ہمارے مذہب (فقہ حنفی) کا دشمن ہے۔" (۲)

فقہ کا یہ غلبہ زیادہ دن تک باقی نہ رہا۔ سلطان سکندر لودی (۱۴۸۸ - ۱۵۱۷) کے وقت میں فقہ کے پہلو بہ پہلو علوم عقلیہ کو بھی فروغ ملا خراسان سے آنے والے علمائے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نصاب تعلیم میں اپنے اپنے اساتذہ کی کتب معقولات کو داخل کیا۔ عہد مغلیہ (۱۵۲۶ - ۱۸۰۶ء) میں معقولات کو دوسرے علوم پر غلبہ حاصل ہوگیا اور اس غلبہ میں ایرانی فضلاً کا ہاتھ صاف نظر آتا ہے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں لکھا ہے کہ متاخرین ایرانی علما، کی کتابوں کو جو شخص ہندوستان لایا اور نصاب تعلیم کا جز بنایا وہ امیر فتح اللہ شیرازی تھا۔ انہی کے الفاظ میں:

"تصانیف علماء متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و مرزا جان، میر بہ ہندوستان آورد و در حلقۂ درس انداخت و جم غفیر از حاشیہ محفل میر استفادہ کردند و ازاں عہد معقولات را رواجی دیگر پیدا شد" (۳)

اس دور میں منطق وفلسفہ سے اہل علم کے شغف وانہماک کا جو عالم تھا اس کی تصویر مولانا عبدالحی حسنی نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:

"وعلم ان الناس کانوا یتہافتون علی المنطق والحکمۃ تتہافت الظمآن علی الماء" لوگ منطق وفلسفہ پر اس طرح دیوانہ وار ٹوٹے پڑتے

---

(۱) سورہ الجاثیہ - ۱۳
(۲) الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۱۲ (مطبوعہ دمشق ۱۹۵۰ء)
(۳) مآثر الکرام ص ۲۲۰ (مطبوعہ آگرہ ۱۹۱۰)
(۴) الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۱۶

تھے جیسے تشنہ لب پانی پر ٹوٹتا ہے"

امیر فتح اللہ شیرازی جس کا اوپر ذکر ہوا، ان ایرانی فضلا میں تھا جو عہد اکبر (۱۵۵۶-۱۶۰۶ء) میں دکن سے آگرہ آیا اور بادشاہ کے خاص مصاحبین میں شامل ہوا۔ یہ شخص علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں درجۂ اجتہاد رکھتا تھا بہت سے ہندی علمانے اس سے کسب فیض کیا۔ انہی میں ملا عبدالسلام لاہوری بھی تھے۔ انھوں نے چالیس سال تک لاہور میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے شاگردوں میں ملا محب اللہ الہ آبادی اور ملا عبدالسلام دیوی کو شہرت ملی۔ ہندوستان میں درس نظامی کے بانی ملا نظام الدین سہالوی کے والد ملا قطب الدین شہید سہالوی نے ان دونوں سے تعلیم حاصل کی تھی (۱) ملا نظام الدین سہالوی کے شاگرد ملا کمال الدین تھے اور ان کے شاگرد مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔ ملا نظام الدین سہالوی کے خلف الرشید مولانا عبدالعلی بحرالعلوم تھے جنھوں نے مدرسہ فرنگی محل کی بنیاد ڈالی۔

امیر فتح اللہ شیرازی خواجہ جمال الدین محمود کے شاگرد تھے اور یہ خود محقق دوانی کے شاگرد تھے۔ خواجہ جمال الدین کے دوسرے شاگرد مرزا جان شیرازی تھے۔ ان کے شاگرد ملا یوسف شیرازی اور ان کے شاگرد ملا محمد فاضل بدخشی اور ان کے شاگرد میرزاہد (۲) اور ان کے شاگرد شاہ عبدالرحیم (پدر شاہ ولی اللہ) تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے دو نمایاں علمی خانوادے یعنی خانوادہ شاہ ولی اللہ دہلوی اور خانوادہ ملا نظام الدین سہالوی ثم لکھنوی براہ راست ایرانی فضلا کے مرہون منت تھے۔ چنانچہ جو نصاب تعلیم بنا اس میں اس کی جھلک صاف ملتی ہے، دونوں کے نصاب میں معقولات کو نمایاں جگہ ملی۔ ملا نظام الدین سہالوی کے نصاب میں تنہا منطق کی ۱۵ کتابیں شامل تھیں لیکن تفسیر کی ایک کتاب جلالین تھی اور اس کی تعلیم بھی سورۃ بقرہ تک محدود تھی۔ (۳) اس کے برخلاف حدیث میں بخاری، مسلم، موطا، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ کو رکھا گیا

شاہ ولی اللہ دہلوی کے نصاب میں منطق و فلسفہ کی کتابیں اول الذکر نصاب سے کم تھیں یعنی کل تین عدد، منطق میں شرح شمسیہ اور شرح مطالع اور فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ۔ لیکن اس کمی کی تلافی انھوں نے اپنے متصوفانہ ذوق سے کی چنانچہ تصوف کی ۵ کتابیں شامل نصاب تھیں۔ یعنی عوارف المعارف، رسائل نقش بندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص۔ اس کے بالمقابل تفسیر کی دو کتابیں تھیں یعنی مدارک اور بیضاوی۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان دو کتب تفسیر کی تعلیم مکمل طور سے دی جاتی تھی یا ملا نظام الدین سہالوی کے نصاب کی طرح صرف چند سورتوں تک محدود تھی (۴)

اس وقت دینی مدارس میں جو نصاب تعلیم رائج ہے اس میں منطق و فلسفہ کی کتابیں پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ ان کی جگہ فقہ و حدیث کی کتابوں نے لے لی ہے۔ حدیث کی تعلیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں اس کے دورہ کا باقاعدہ انتظام ہے اگر اس نصاب میں کسی مضمون کو بادل نخواستہ جگہ دی گئی ہے تو وہ علم تفسیر ہے کسی مدرسہ میں قرآن مجید کا صرف ترجمہ پڑھا دیا جاتا ہے اور وہ بھی چند پاروں کا، اور کسی میں ترجمہ کے ساتھ چند سورتوں کی تفسیر بھی بیان کر دی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس میں اس وقت جو نصاب تعلیم داخل درس ہے وہ متعدد اعتبارات سے ناقص ہے اور اس میں حد درجہ عدم توازن ملتا ہے۔ نصاب میں فقہ و حدیث کو دوسرے علوم پر برتری حاصل ہے۔ پچھلے ادوار میں فقہ کا اعلیٰ اور تفصیلی علم تو قابل فہم ہے کیونکہ اس وقت اکثر مسلم ممالک میں اسلامی قانون نافذ تھا۔ لیکن عصر حاضر میں شاید ہی کوئی مسلم ملک ہو جس میں اسلام کے سیاسی، اقتصادی، عمرانی اور تعزیری قوانین کل کے کل نافذ ہوں۔ ان حالات میں فقہ کی اعلیٰ تعلیم بے معنی اور ضیاع وقت ہے۔ فقہ کی اسی قدر تعلیم کافی ہے۔ جتنی ایک شخص کو اپنی انفرادی زندگی میں

---

(۱) المسلمون فی الہند مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۹۶ (مطبعہ ۱۹۷۶ء)

(۲) شرح المواقف انہی کی تصنیف ہے جو عربی مدرسوں میں داخل ہے۔

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیں راقم کا مضمون تہذیب الاخلاق علی گڑھ مئی ۱۹۸۰ء

(۴) ایضاً

مطلوب ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس وقت دینی مدارس میں فقہ کی جو اعلیٰ تعلیم دی جارہی ہے وہ موجودہ ضروریات زمانہ کے مطابق نہیں ہے اس لیے کہ یہ ہزار سال پہلے کے حالات وضروریات کے لحاظ سے مدون کی گئی تھی۔ اس میں بہت کچھ حذف واضافہ کی ضرورت ہے۔

حدیث کی کتابوں کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ نقد و نظر کی محتاج نہیں ہیں۔ بخاری کے بارے میں تو یہ قول قبول عام کا درجہ حاصل کرچکا ہے کہ قرآن مجید کے بعد یہ صحیح ترین کتاب ہے۔ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ علماٗ حدیث نے کتب حدیث کی جو تنقیح وتہذیب کی ہے وہ قابل تحسین ہے لیکن ان کی ساری تنقیحات متن روایات سے متعلق ہیں۔ یعنی رجال کی تحقیق۔ متناً حدیث کی ایک کتاب بھی درایت کے اصولوں پر آج تک نہیں پرکھی گئی ہے جس سے اس کا درجہ ثقاہت بہرحال متاثر ہوا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ سارے دینی علوم ایک عرصۂ دراز سے جمود کے شکار ہیں ان میں کسی نوع کا کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ وحی الٰہی کی طرح ان علوم کو بھی ناقابل نقد و تنسیخ قرار دے دیا گیا ہے جو ایک مریض ذہن کی علامت ہے۔

دینی مدارس کے نصاب تعلیم کا دوسرا بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں دنیوی فرض کفایہ علوم نہیں پڑھائے جاتے ہیں جب کہ اس سے پہلے کے نصابات میں یہ علوم شامل تھے جیسے ریاضی، طب اور علم ہیئت وغیرہ۔ میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ عصر حاضر میں دنیوی علوم میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور ان میں اختصاص کا جو رجحان غالب ہے اس کی بنا پر اب کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ سارے دینی اور دنیوی علوم کو ایک ساتھ جمع کرسکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ علوم کی دینی اور دنیوی تقسیم کی موجودہ روش کو باقی رکھا جائے۔ اس صورتحال کا خاتمہ ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے ابتدائی سے ثانوی یعنی انٹرمیڈیٹ کی سطح تک ایک ایسا نصاب تعلیم مرتب کیا جائے جس میں عصری علوم کے ساتھ عربی زبان، تاریخ اسلام، قرآن مجید اور فقہ وحدیث کے منتخبات اردو زبان میں پڑھائے جائیں (۱)۔ دین کی اعلیٰ تعلیم صرف انہی لڑکوں کو دی جائے جو اشاعت اسلام کے ساتھ اس راہ میں ایثار و قربانی کا فطری داعیہ رکھتے ہوں۔ ایسے لڑکوں کو تکمیل علوم کے بعد ٹیکنیکی تعلیم دی جائے کہ پراگندہ روزی پراگندہ دل کی مثل غلط نہیں ہے اس مضمون کے آخر میں نصاب تعلیم کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ انہی خطوط پر ہے۔

دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تیسرا اور سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں قرآن مجید کی تعلیم کو ثانوی حیثیت حاصل ہے حالاں کہ یہی اصلی مضمون تھا جس میں سعی و جہد کا بڑا حصہ صرف ہونا چاہیے تھا جس طرح نظام شمسی میں سورج کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور سارے سیارے اس کے گرد گھومتے اور اس سے کسب نور کرتے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کو دینی علوم کے درمیان مرکزی حیثیت حاصل ہے اور بقیہ علوم کے لیے لازم ہے کہ وہ اسی مرکز کے گرد گھومیں اور اس سے مستنیر ہوں۔ لیکن کم سوادی علم اور فکر و نظر کی کج روی کے سبب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم فروعی علوم۔ یعنی حدیث وفقہ وغیرہ کی روشنی میں دی جاتی ہے اس مہلک ترین غلطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج دینی مدارس سے علم اور روحانیت دونوں نے رخت سفر باندھ لیا ہے۔ خسر الدنیا والاخرۃ کا معاملہ ہے مگر کم عقلی کا یہ عالم ہے کہ اسی ناقص اور غیر متوازن نصاب تعلیم پر ارباب دین نازاں و فرحاں ہیں اور کسی قیمت پر اس میں کسی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہیں۔

دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں متذکرہ بالا نقائص کے ازالہ کے لیے ضروری ہے کہ پورے نظام تعلیم کو از سر نو مرتب کیا جائے۔

---

(۱) پرائمری اور ثانوی تعلیم کو حکومت سے منظور کرایا جائے تاکہ جو لڑکے ثانوی تعلیم کے بعد مزید عصری علوم کی تحصیل یا کسی پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکی تعلیم کی طرف جائیں تو انھیں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

جزوی اصلاح کسی طرح بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوگی۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ مروجہ نصاب میں بعض عصری علوم داخل کر دینے سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا وہ غلطی پر ہیں۔ دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کی پیوند کاری سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا اس سے دینی علوم بھی متاثر ہوں گے اور عصری علوم کی تعلیم بھی ابتدائی سطح سے آگے نہ جاسکے گی۔ ذیل میں نصاب تعلیم کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ ان تمام خامیوں کا سدباب کرسکے گا جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اس میں دینی اور عصری علوم کا ایک خوش گوار امتزاج ہے اور دونوں کی تکمیل و اتمام کی راہ کھل گئی ہے۔

۱۔ عصری علوم کی تعلیم ضروری دینی علوم کے ساتھ

یہ تعلیم پرائمری سے انٹرمیڈیٹ کی سطح تک دی جائے اور ٹھیک اس نصاب کے مطابق دی جائے جو سرکاری مدارس میں رائج ہے اس لیے کہ اس نصاب کی تکمیل کے بعد ہی اسے سرکاری منظوری مل سکے گی جو اس نصاب کی کامیابی کے لیے ناگزیر ہے۔ اس مرحلہ میں دنیوی اور دینی علوم بایں طور پڑھائے جائیں۔

پرائمری: اس میں وہ تمام عصری علوم پڑھائے جائیں جو سرکاری مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ دینیات، تاریخ اسلام اور اردو زبان کی تعلیم بھی دی جائے۔

ہائی اسکول: اس میں مذکورہ عصری (۱) اور دینی علوم کے ساتھ عربی زبان بھی پڑھائی جائے۔

انٹرمیڈیٹ: اس مرحلہ میں عصری علوم کے ساتھ قرآن مجید، حدیث اور فقہ کے ضروری منتخب اجزاء اردو میں پڑھائے جائیں۔ (۲) عربی زبان کی تعلیم اس مرحلہ میں بھی جاری رکھی جائے۔

۲۔ دینی علوم کے ساتھ تکنیکی تعلیم

دینی علوم صرف ان طلبا کو پڑھائے جائیں جو اشاعت اسلام اور خدمت دین کا فطری جذبہ رکھتے ہوں اور اس راہ میں ہر طرح کا ایثار و قربانی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے علاوہ انٹرمیڈیٹ سطح تک عصری علوم کی تعلیم حاصل کر چکے ہوں۔ اعلیٰ دینی تعلیم کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جائے۔

پہلا مرحلہ: یہ مرحلہ قرآن مجید کی تعلیم کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں وقت نظر کے ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ مختصر تشریح کے ساتھ پڑھایا جائے۔ اور یہ تعلیم "یفسر بعضہ بعضاً" کے معروف تفسیری اصول کے مطابق ہو۔ اس مرحلے میں تفسیروں سے بالکل مدد نہ لی جائے۔ اس کے علاوہ اصول التاویل، اسالیب القرآن، نظم القرآن، بلاغۃ القرآن اور تاریخ القرآن جیسے مضامین بھی بالترتیب پڑھائے جائیں۔ انگریزی زبان اور عربی ادب کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ مدت تعلیم ۵ سال۔

دوسرا مرحلہ: اس مرحلہ میں فرض کفایہ شرعی علوم مثلاً حدیث فقہ اور علم کلام وغیرہ کی تعلیم قرآن مجید کی اصولی تعلیمات کی روشنی میں محققانہ انداز سے دی جائے۔ حدیث اور فقہ کی ایک ایک مختصر کتاب مع اصولوں کے پڑھا دی جائے۔ قدیم منطق و فلسفہ کی تعلیم تعارف مضمون کی حد تک دی جائے علم تفسیر اور علم فرائض پر چند محاضرات کافی ہونگے تاریخ فقہ اور تاریخ حدیث پر بھی محاضرات ہی مفید ثابت ہوں گے۔ تاریخ الاسلام بھی پڑھائی جائے۔ انگریزی زبان اور عربی ادب کی تعلیم بدستور جاری رکھی جائے ہر ممکن کوشش کی جائے کہ انگریزی اور عربی زبانوں پر طلبا کو کامل دسترس حاصل ہو۔

تیسرا مرحلہ: یہ مرحلہ تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں صرف ان لڑکوں کو لیا جائے جو دوسرے مرحلہ سے کامیابی کے ساتھ گزر چکے ہوں۔ کتابت، جلد سازی اور کمپیوٹر وغیرہ کی تعلیم حسب حالات دی جائے۔ اگر حالات و وسائل اجازت دیں تو اس مقصد کے لیے کوئی تکنیکل ادارہ کھولا جائے۔ مدت تعلیم و تربیت دو سال۔

اس مرحلہ کی تکمیل کے بعد طلبہ کو فضیلت کی سند دی جائے۔ اگر
باقی صفحہ ۳۲ پر

---

(۱) ریاضی اور سائنسی علوم کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔ (۲) قرآن مجید، حدیث اور فقہ کے وہی اجزا لیے جائیں جو تزکیہ نفس اور تعمیر اخلاق میں معاون ہوں۔ اس کے علاوہ توحید اور شرک کی حقیقت سے طلبا اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔

رفیق احمد سلفی

دینی مدارس کے نصاب اور نظام تعلیم میں اصلاح و تبدیلی وقت کی ضرورت

دینی مدارس کے تعلیمی نظام کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے اور اسے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا جذبہ بلاشبہ ایک مبارک اور قابل قدر جذبہ ہے بشرطیکہ یہ خلوص اور نیک نیتی پر مبنی ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ مسلمان اپنے دینی اقدار و روایات اور تہذیبی تشخص کے تعلق سے انتہائی حساس واقع ہوئے ہیں اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ اس طویل و عریض ملک میں دینی مدارس و مکاتب اور جامعات کا ایک بہترین سلسلہ قائم ہے دینی اقدار و روایات سے مسلمانوں کی جذباتی وابستگی اور ان کی حفاظت و صیانت اور نسل در نسل ان کی منتقلی کا جذبہ فراواں ہی ان مدارس کے قیام اور ان کے جاری رکھنے کا محرک ہے۔

دوسری طرف اس ملک میں مسلمانوں کے تہذیبی و تمدنی امتیازات کو ختم کرنے کی مختلف انداز کی تخریبی کوششیں ہو رہی ہیں اور ان کوششوں کی کامیابی میں دینی مدارس کو سب سے بڑا رخنہ سمجھا جاتا ہے جب کہ اگر دینی مدارس کا یہ سلسلہ موجود نہ ہوتا تو ملت اسلامیہ کے لیے اس ملک میں اپنا تہذیبی تشخص برقرار رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ اس لیے ان مدارس کے تعلق سے جب کوئی آواز اٹھتی ہے تو مسلمانوں کے حساس طبقہ کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں بالخصوص اس صورت میں جب یہ آواز کسی ایسے حلقے سے اٹھ رہی ہو جس کی نظر میں دینی قدروں کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو۔

دینی مدارس کے نصاب اور نظام تعلیم میں اصلاح و تبدیلی کی جو آواز اٹھ رہی ہے اس سے بھی خدشات اور اندیشے پیدا ہوتے ہیں اور یہ خدشات ایک حد تک بجا بھی ہیں کیونکہ اس ملک میں خود مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا رہا ہے جو دینی مدارس کے نظام تعلیم کو تلپٹ کر کے انھیں ان کے بنیادی مقاصد سے ہٹانے ہی کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہے۔ تاہم ایسے صالح فکر کے لوگ بھی بحمداللہ مسلم سوسائٹی میں موجود ہیں جو صدق دل سے ان مدارس کے تعلیمی نظام کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے انھیں اس لائق بنانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں پہلے سے زیادہ بہتر اور موثر کردار ادا کر سکیں۔ اس لیے وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے دینی مدارس کے نصاب میں اصلاح و تبدیلی کی اس آواز پر ہمیں لبیک کہنی چاہیے۔

دینی مدارس کے قیام کی اصل غرض و غایت جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے اسلامی سوسائٹی کی دینی ضروریات کی تکمیل ہے ۔ ا

ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سینٹر، جوگا بائی۔ نئی دہلی

کا قیام اس لیے عمل میں نہیں آیا ہے کہ یہ سماج کو سائنسداں، ڈاکٹر انجینیر یا صنعت کار فراہم کریں بلکہ ان کے قیام کا بنیادی مقصد دینی علوم کے ماہرین اور اسلامی مشن کے داعی و مبلغ پیدا کرنا ہے۔

میری اس گزارش کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ سوسائٹی کو عصری علوم کے ماہرین کی ضرورت نہیں، صحت مند سماج کے لیے یہ علوم ناگزیر ضرورت ہیں اور سوسائٹی میں ایسے اداروں کی ایک معتد بہ تعداد ہونی چاہیے جو ان بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کر سکیں۔

اسی طرح دینی علوم کے حاملین کو بھی ضروری حد تک عصری شعور و آگہی سے بہرہ ور ہونا چاہیے تاکہ وہ عصری چیلنجوں کا پوری بصیرت سے مقابلہ کر سکیں۔

بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ علم ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے اسے دین اور دنیا کے خانوں میں بانٹنا صحیح نہیں۔ اسلام اگر ضابطۂ حیات ہے تو اس کا علم زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہونا چاہیے مسلمان اپنی اقبال مندی کے دور میں ساری دنیا میں علم کے سالار کارواں رہے ہیں۔

یہاں میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ مسلمانوں کی اقبال مندی کا یہ دور بھی دینی اور دنیوی علوم کی تفریق سے خالی نہیں بجز چند مستثنیات کے دونوں علوم کے حاملین الگ الگ گروہوں میں منقسم رہے ہیں۔ قرآن وسنت کے نصوص میں بھی اس تفریق کے واضح اشارے موجود ہیں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے "انتم اعلم بامور دنیاکم" اور "من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین" فرما کر علم کو دو خانوں میں بانٹ دیا ہے اور دینی علوم اور ان کے حاملین کی افضلیت پر مہر تصدیق ثبت فرما دی ہے۔

دنیوی علم کا افادی پہلو اپنی تمام تر ترقیات کے باوجود اسی فانی زندگی تک منحصر ہے جب کہ دینی علوم آخرت کی ابدی وسرمدی زندگی کی سعادتوں اور کامرانیوں کا ذریعہ ہیں اس لیے دینی مدارس کے نصاب کی ترتیب میں دینی علوم کی یہ حیثیت بھی لازماً پیش نظر رہنی چاہیے۔

دینی مدارس کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ان مدارس کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ پہلی قسم ان مکاتب کی ہے جن میں صرف پرائمری درجات کی تعلیم ہوتی ہے۔

۲۔ دوسری قسم ان مدارس کی ہے جن میں پرائمری کے ساتھ متوسطہ اور ثانویہ کے بعض درجات کا بھی انتظام ہے۔

ان درجات کی حیثیت علوم کے لیے تمہید کی ہے یہ طلباء کو علوم کے اکتساب کے لیے آمادہ کرتے اور انھیں اس کا اہل بناتے ہیں، اس لیے ان درجات کے نصاب میں طلباء کے ذہنی معیار کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی عقائد، فقہ وسیرت اور اخلاق وآداب اور عربی زبان کے قواعد کے مضامین کے ساتھ ہندی، اردو، انگریزی، حساب، سائنس اور سماجیات وغیرہ مضامین کا ایسا امتزاج ہونا چاہیے کہ ان درجات سے نکلنے کے بعد طالب علم کے لیے علم کی کوئی بھی راہ مسدود نہ ہونے پائے اگر وہ علوم دینیہ یا اس کی کسی شاخ میں کمال پیدا کرنا چاہتا ہے تو دینی علوم کی کسی اعلی درسگاہ میں داخلہ لے سکے اور اگر وہ عصری علوم کی طرف جانا چاہتا ہے تو عصری کالجز اور یونیورسٹیوں میں اسے زیادہ زحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے بعض مدارس کے نصاب تعلیم میں بعض مفید اصلاحات ہوئی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان مدارس میں ایسے اساتذہ کی بڑی کمی رہی ہے جو طلباء اور تعلیم کی نفسیات سے واقف ہوں اور تعلیم وتدریس کی ذمہ داریوں کا صحیح شعور اور ادراک رکھتے ہوں اس کے ساتھ ساتھ ان مدارس میں ضروری تعلیمی وسائل کا بھی فقدان رہا ہے اس لیے متوقع نتائج نہیں نکل سکے ہیں۔

۳۔ تیسری قسم ان مدارس اور جامعات کی ہے جن میں علوم دینیہ کی اعلی تعلیم کا انتظام ہے۔ ان مدارس میں بعض جزوی ترمیموں کے ساتھ ابھی تک درس نظامی کا نصاب ہی رائج ہے جو مضامین، انتخاب کتب اور مقدار خواندگی ہر سہ لحاظ سے غور وخوض اور اصلاح کا طالب ہے۔

ان مدارس وجامعات میں پڑھائے جانے والے علوم دو طرح کے ہیں ایک وہ جن کی حیثیت ذرائع ووسائل کی ہے نحو وصرف، معانی وبیان، ادب وانشا اور منطق وغیرہ علوم اس ضمن میں آتے ہیں۔

دوسرے وہ جو مقصود بالذات ہیں مثلاً علوم قرآن وحدیث اور فقہ وعقائد وغیرہ۔

اس نصاب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں علوم آلیہ کو غلبہ حاصل ہے۔

اور جو علوم مقصود بالذات ہیں ان کا معاملہ بہت کمزور ہے مثال کے طور پر دینی مدارس کے نصاب میں توحید و عقیدہ کا مضمون جو علوم دینیہ کا اصل الاصول ہے اور جسے فقہ اکبر کا نام دیا گیا ہے شامل ہی نہیں اور اگر شامل ہے بھی تو اس کے لیے خیالی اور شرح عقائد نسفی جیسی کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے جو خالص متکلمانہ انداز پر لکھی گئی جن سے تشحیذ ذہنی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ توحید و عقائد کے مسائل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسی کتابیں نصاب میں شامل کی جائیں جو صحابۂ کرام، سلف صالحین، تابعین، محدثین، اور ائمہ دین کے منہج پر لکھی گئی ہوں، اور کتاب وسنت کے دلائل پر مبنی ہوں۔

اسی طرح فن تفسیر میں تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی کے چند صفحات پر اکتفا کر لیا جاتا ہے جو طالب علم میں قرآن فہمی کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لیے یکسر ناکافی ہیں۔

عقائد و احکام، قصص القرآن اور ایام اللہ کی آیات کے الگ الگ مجموعے خالص نصابی ضروریات کے تحت مرتب کیے جانے چاہئیں اور انھیں نصاب میں شامل کر کے متداول تفاسیر کی مدد سے طلباء کو جب ان میں عربی زبان و قواعد سے ضروری حد تک واقفیت ہو جائے ان آیات کا اس طرح تقابلی مطالعہ کرانا چاہیے کہ وہ قرآن کی روح کو سمجھ سکیں اور اس کے اسرار و معارف اور ظاہری و معنوی محاسن کا ادراک کر سکیں اور قرآن کا مقصد نزول ان کی سمجھ میں آسکے، اور نصاب کا بنیادی مضمون قرآن کو بناتے ہوئے تعلیم کے اونچے مراحل میں انھیں معیاری تفاسیر کا تقابلی مطالعہ کرانا چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ وہ اسرائیلیات، موضوع روایات اور غلط قصوں کہانیوں سے نجات پا سکیں دوسری جانب وہ عقلیت اور اعتزال کے جدید و قدیم فتنوں سے بھی بچ سکیں پوری کوشش اس بات کی ہونی چاہیے کہ طلباء کے اندر قرآن فہمی کا ذوق عربی زبان و ادب اور احادیث صحیحہ اور فہم سلف کی روشنی میں پیدا ہو تاکہ وہ قرآن کریم کے داعیانہ مقاصد کو اجاگر کرنے کی صلاحیت بہم پہنچا سکیں۔

فن حدیث کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے عہد سے پہلے حدیث کی تدریس کا سرے سے کوئی اہتمام ہی نہیں تھا نصاب میں پورے طور پر علوم عقلیہ کا غلبہ تھا، حدیث کے بجائے اعتزال زدہ متاخرین فقہا کی کتابوں کی تدریس کو اہمیت دی جاتی تھی۔ شاہ صاحب کی کوششوں سے حدیث کی طرف علماء کی توجہ مبذول ہوئی۔

اس وقت جن مدارس میں حدیث کی تعلیم دی جاتی ہے انھیں ہم تین خانوں میں بانٹ سکتے ہیں۔

۱۔ وہ مدارس جو مختلف درجات میں بلوغ المرام اور مشکوٰۃ المصابیح کے ساتھ کتب ستہ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ) نیز موطا امام مالک کی تعلیم دیتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ مقررہ کتب نصاب تک پڑھا دی جائیں۔

۲۔ دوسرے وہ مدارس جو آخری درجہ میں کتب ستہ کے ساتھ بعض دوسری اہم کتابوں کو ایک ہی سال کے اندر پوری پڑھا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

۳۔ تیسرے وہ مدارس جو مختلف درجات میں حدیث کی مشہور کتابوں کے چند منتخب ابواب پڑھا دینے کو کافی سمجھتے ہیں۔

موخر الذکر دونوں طریقے طالب علم میں حدیث کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لیے قطعاً ناکافی ہیں اور اول الذکر طریقہ کی خرابی یہ ہے کہ حدیث کی ضخیم کتابوں کو محدود وقت میں عملاً ختم کرانا ممکن نہیں ہوتا اور اگر کسی طرح سے اس کی کوشش کی بھی جائے تو طلباء اور اساتذہ میں سے کسی میں بھی وہ نشاط باقی نہیں رہتا جس کا یہ مہتم بالشان فن متقاضی ہے۔ نتیجتہً بہت سے ضروری ابواب و مباحث طالب علم کی نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں یا ان سے متعلق اس کی معلومات سطحی ہوتی ہیں۔

میری ناقص رائے میں فن حدیث کے جملہ ابواب و مباحث کو مختلف درجات میں اس طرح تقسیم کیا جانا چاہیے کہ کوئی باب چھوٹنے نہ پائے اور جو ابواب و مباحث جس کتاب میں سب سے زیادہ جامع ہوں انھیں اسی کتاب سے پڑھانے کی کوشش ہونی چاہیے

تکرار سے بچتے ہوئے قدرے تفصیل سے تمام ابواب ومباحث کو عملاً پڑھانا ممکن ہوسکتا ہے اگر تقسیم وانتخاب کا یہ عمل اس فن کے ماہرین کے ہاتھوں انجام پاجائے تو اصول حدیث کے ساتھ ساتھ اصول تخریج اور جرح وتعدیل وغیرہ ضروری علوم کے لیے بھی نصاب میں کچھ گھنٹیاں خاص کی جاسکتی ہیں، کیونکہ ان علوم کے بغیر فن کی روشنی میں کسی حدیث پر صحت وضعف یا حسن ووضع کا حکم نہیں لگاسکتے۔ ہندوستان کے مشائخ عموماً اس فن میں تقلیدی ذہن رکھتے ہیں وہ اپنی تحقیق سے کسی حدیث کی بابت صحت وضعف یا وضع کا فیصلہ نہیں کرسکتے اس سلسلے میں مزی، ذہبی، ابن حجر عسقلانی اور ماضی قریب کے لوگوں میں مولانا احمد حسن دہلوی، مولانا شمس الحق عظیم آبادی، احمد محمد شاکر اور معاصر علماء میں علامہ محمد ناصر الدین البانی کی تحقیقات سے استفادہ کا طلبا میں شوق پیدا کرنا چاہیے۔

فن حدیث میں محدثانہ بصیرت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بڑے مدارس میں درجہ تخصص کا خصوصی اہتمام ہو جس کے نصاب میں حدیث اور علوم حدیث کی کتب شامل ہوں حدیث کی تدریس میں یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ یہ قرآن پاک کی شرح وتفصیل اور تبیین ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی جو ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے یہ تفصیلی بیان ہے اس لیے طالب علم کی زندگی میں اس کے ظاہر وباطن اس کے بھرپور اثرات پیدا ہونا چاہیے۔

جہاں تک فقہ اور اصول فقہ کا معاملہ ہے اگرچہ اس کی اچھی خاصی مقدار ہمارے نصاب میں شامل ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے طلبا میں مسائل کے استخراج واستنباط کی صلاحیت نہیں پیدا ہوپاتی کیونکہ اس کے لیے کتاب وسنت کے نصوص کا استحضار اور ائمہ سلف کے اقوال واعمال اور ان کی تصریحات کا وسیع علم اور طرق استنباط پر ماہرانہ دسترس ضروری ہے جس کے پیدا کرنے سے ہمارا نصاب قاصر ہے۔

فقہ اور اصول فقہ کا نصاب کسی خاص مسلک ہی کی کتابوں میں محدود ومنحصر نہیں ہونا چاہیے دوسرے مشہور ائمہ کے فقہی مسائل ان کے دلائل اور طرق استنباط سے واقفیت بھی ضروری ہے اس سے مسلکی عصبیت کا ازالہ ہوگا، فکر ونظر میں وسعت اور بلندی پیدا ہوگی اور طالب علم خود اعتمادی کے ساتھ احکام ومسائل میں مجتہدانہ رائے قائم کرسکے گا۔

تفسیر وحدیث اور فقہ وغیرہ علوم کے ساتھ ساتھ ملت کی سیاسی، علمی، فکری اور ثقافتی تاریخ سے آگہی بھی دینی مدارس کے طلبا کے لیے بے حد ضروری ہے، ہماری ملی تاریخ کے اس طویل عہد میں کیا کیا سیاسی انقلابات آئے، کون کون سی سلطنتیں وجود میں آئیں اور ان کے عروج وزوال کی داستان کیا ہیں؟

اسی طرح ہماری علمی ارتقاء کی تاریخ کیا ہے؟ علوم وفنون خاص طور سے وہ علوم جو دینی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں ان کی نشوونما کس طرح ہوئی، ان کے ابتدائی حاملین کون لوگ ہیں، ترتیب وتدوین کا مرحلہ کن ہاتھوں سے انجام پایا اور کن کن لوگوں نے ان میں اضافے کیے، ان علوم وفنون کی اہم کتابیں کیا ہیں اور ان کے مصنفین کون ہیں؟

اسی طرح مختلف ادوار میں کون کون سے افکار ونظریات وجود میں آئے کہاں اور کن حالات میں پروان چڑھے اور معاشرے پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے ان ساری باتوں کا علم جب تک دینی مدارس کے طلباء کو نہیں ہوگا ان میں اپنی تہذیب وثقافت کی عظمت اور اس کی اہمیت کا احساس پیدا نہیں ہوسکے گا۔

اسی طرح دیگر اقوام ومذاہب خاص طور سے مغرب کی سیاسی فکری وعملی ارتقاء کی تاریخ سے واقفیت بھی ضروری ہے دینی مدارس کے نصاب میں ان علوم کی گنجائش ضرور رکھنی چاہیے اگر ان کی باقاعدہ تعلیم ممکن نہ ہوسکے تو طلبا کو کسی استاذ کی رہنمائی میں مناسب کتابوں کے مطالعہ پر مجبور کرکے اس کی تلافی کسی حد تک ممکن ہوسکتی ہے۔ اس کے لیے احمد محمد شاکر، محب الدین خطیب ناصر الدین اسد، محمد محمد حسین، مالک بن نبی، تقی الدین ہلالی، محمد بن یوسف سورتی، عبد العزیز میمنی، اور محمود محمد شاکر جیسے عباقر علماء کی تصنیفات و مولفات بہت مفید وکارآمد ہیں۔ طلباء کو ان سے استفادہ کی ترغیب

ہونی چاہیے۔

دینی مدارس کے نصاب کا ایک بڑا حصہ علوم عقلیہ پر مشتمل ہے۔ یونانی فلسفہ کی راہ سے دینی عقائد کے سلسلے میں جو شکوک و شبہات پھیل رہے تھے ان کے ازالہ کے لیے ان علوم کا سیکھنا ضروری سمجھا گیا تھا اسی ضرورت کے تحت علما نے دینی مدارس کے نصاب میں ان علوم کو شامل کیا تھا اگرچہ اس سے کچھ وقتی فائدے ہوئے لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ دین کی اصل تعلیمات فلسفہ و کلام کی لچ بحثیوں اور موشگافیوں میں گم ہو کر رہ گئیں اور علماء امت علمی مغالطوں اور سفسطوں کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر اس فطری طریق استدلال سے دور ہوتے چلے گئے جس پر صحابہ اور ائمہ دین قائم تھے۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ اب ان علوم کی افادیت ختم ہو گئی ہے اس لیے ان علوم کا غالب حصہ دینی مدارس کے نصاب سے حذف کر دیا جانا چاہیے اگر قدما کی کتابوں سے استفادہ کے لیے ان علوم کے مبادیات اور بنیادی اصطلاحات جاننا ضروری ہوں تو ایک آدھ کتاب نصاب میں باقی رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

زبان و ادب اور انشاء و قواعد وغیرہ علوم کی اچھی خاصی مقدار نصاب میں ہوتے ہوئے بھی ہمارے دینی مدارس کے عربی طلبا لکھنے اور بولنے پر قادر نہیں ہو پاتے یہ ہمارے نظام تعلیم کا نقص ہے ضرورت ہے کہ نئے تعلیمی رجحانات اور تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے لیے تیز رفتار اور اپٹوڈیٹ طریقے اختیار کیے جائیں اس مقصد کے لیے ایسی کتابوں کو شامل نصاب کرنا ہوگا جن میں تمرینات، مشقوں اور عملی تطبیقات پر زور ہو۔ ازھر اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ وغیرہ میں غیر عرب طلباء کے لیے جو نصابی کتابیں تیار ہوئی ہیں ان سے ہمیں اپنے مدارس کے نصاب میں استفادہ کرنا چاہیے۔

جہاں تک انگریزی زبان کا معاملہ ہے تو اس زبان کے تعلق سے ہمارے علماء کے رویوں میں خوش گوار تبدیلی آئی ہے پہلے انگریزی زبان کے سیکھنے کو کفر سمجھا جاتا تھا اب اسے خود علما اپنے بچوں کے لیے ضروری سمجھنے لگے ہیں بہت سے مدا
کے نصاب میں یہ ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل بھی۔
لیکن اس کے باوجود ابھی تک دینی مدارس کے نصاب میں ا
زبان کو وہ حیثیت نہیں دی گئی ہے جس کی یہ مستحق ہے ہمارے
عقاید و ایمانیات اس وقت جس فکری یلغار کی زد میں ہیں عموما
اسی زبان کے توسط سے ہم تک آرہی ہے اس لیے "بقدر ضرور
انگریزی" کے نظریہ کو ترک کر کے نصاب میں اس کا بھرپور عنصر
ہونا چاہیے تاکہ طلباء انگریزی سمجھنے لکھنے اور بولنے پر قادر
اس سے تبلیغ اسلام اور اشاعت دین کے لیے ایک وسیع فضا
فراہم ہوگی اور ان غلط فہمیوں کے ازالہ میں مدد ملے گی جن میں
مہذب اور تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے تعلق سے مبتلا ہے۔

یہ دینی مدارس کے نصاب کے سلسلے میں اس ناچیز کے احساسات
جنھیں اختصار کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش
کی گئی ہے۔

انھیں خطوط کی روشنی میں ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ
سنٹر نئی دہلی (مرکز ابوالکلام آزاد للتوعیہ السلامیہ) نے اپنے د
اور دہلی کے باہر کے تعلیمی اداروں کے لیے ماہرین کے مشورہ
سے ایک نصاب تعلیم وضع کیا ہے جس پر چند سالوں سے تجربا
ہو رہے ہیں۔

ابھی ہم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ ہم اپنے مقصد میں پ
طور سے کامیاب ہیں لیکن اپنے طلباء سے متعلق ملک اور بیرا
ملک سے جو تاثرات اور آراء ہمیں مل رہی ہیں وہ حوصلہ افزا

باقی صفحہ ۲۷ کا

کوئی طالب علم تکنیکی تعلیم حاصل کرنے کے بجائے مزید اعلیٰ تعلیم کے
کسی یونیورسٹی میں داخلہ کا خواہش مند ہو تو اس کو دوسرے مرا
تکمیل کے بعد سند فراغت دی جا سکتی ہے۔ سند فضیلت کو ایم۔ا
کے مساوی تسلیم کرایا جائے تاکہ اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند طلبا یونیورس
میں داخل ہو کر عربی زبان میں پی ایچ ڈی کر سکیں۔ اس سے
کے لیے کسب معاش میں آسانی پیدا ہوگی۔

محمد افضل

دینی مدارس میں ترمیم نصاب کی ضرورت اور اس کا طریقۂ کار

ماضی قریب و بعید میں ہندوستانی علما نے دینی مدارس میں ترمیم نصاب کے باب میں بہت کوششیں کیں۔ مگر افسوس کہ ان کی کوششوں اور کاوشوں کا فائدہ اور نتیجہ ہم کو عملی صورت میں دکھائی نہیں دیتا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ ان کی یہ انتھک کوششیں تمام رائیگاں اور اکارت ہوگئیں اور ان کی آوازیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں، اور قوم کو جھنجھوڑنے میں ناکام ثابت ہوئیں، جاگے مگر پھر غفلت کی نیند سوگئے۔

اور آج ہم جن کو دینی مدارس کہتے ہیں اور اس سے یہ توقع لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ بغیر کسی مذہبی تعصب کے دین اسلام کا کام کررہے ہیں۔ اصلاً وہ دینی مدارس نہیں ہیں، نہ ہی وہ خالص دین اسلام یا دین محمدی کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ بلکہ ان کی تمام تعلیمات مسلکی ہوتی ہیں۔ اور عوام گوناگوں مسائل میں الجھی ہوئی ہے۔ اس لیے آپ اس کو دینی مدارس کہنے کے بجائے مسلکی مدارس کہیں جن پر مسلک و مذہب کا اتنا گہرا رنگ چڑھا ہوتا ہے کہ اس کو آپ مختلف مسلک و مذہب کے حوالے اور نام سے پہچان سکتے ہیں۔ جیسے حنفی دیوبندی مدارس، حنفی بریلوی مدارس، اہل حدیث کے شیعہ مدارس، فقہ جعفریہ کے شیعہ مدارس وغیرہ وغیرہ۔

اور چونکہ ان کے فارغین علما کی تعلیم مذہبی اور گروہی عصبیت پر مبنی ہے اس لیے ان کی سوچ، فکر اور دعوتی تعلیم حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی عصبیت ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے ان کے کورسز بھی ہوتے ہیں اور سماجی اور عصری علوم کا دُور دُور تک کہیں نام و نشان بھی نہیں ہوتا ہے۔ اور اگر آپ ان سے ترمیم نصاب کی بات کریں تو جواب ملے گا کہ ہمارے یہاں حنفی مسلک وغیرہ کی مدلل تعلیم دی جاتی ہے اور اسی اعتبار سے قرآن کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر ہم اپنے موجودہ نصاب کو بدل دیں تو گویا کہ ہم اپنے اسلاف کی خلاف ورزی کررہے ہیں اور ان کے طریقۂ تعلیم سے ہٹ کر ایک نئے طرز پر تعلیم دیں گے۔ گویا کہ انھوں نے تقلید کو اپنا شعار بنا لیا ہے، عقل کو طاق نسیاں پر رکھ دیا ہے، جمود و خمود نے انھیں عملی اقدام کرنے سے روک دیا ہے اور پاؤں پسار کر بیٹھ گئے ہیں، قوت محرکہ جواب دے چکی ہے۔ اگر یہ علما مشاہدہ کرتے اور قرآن کی تعلیمات پر غور و تدبر کرتے تو معلوم ہوتا کہ اس کی تعلیم جمود و خمود اور تقلیدی اور مسلکی نہیں ہے بلکہ اس کی تمام تعلیمات غیر مسلکی اور کسی مذہبی عصبیت پر مبنی نہیں ہے۔ اور نہ قرآن مجید کو دیگر علوم و فنون سے دشمنی ہے۔ بلکہ تمام کے تمام علوم قرآن ہی سے مستعار ہیں

شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی

لیکن قرآنی کورسز اور ترتیم نصاب پر دل نوازانہ گفتگو کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ دینی مدارس میں ماضی کے نصاب اور ضمناً اس کی حیثیت اور کارکردگی اور اغراض ومقاصد کیا تھے، روشنی ڈال لی جائے تاکہ یہ پتہ چلے کہ ہمارے اسلاف اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے اور پھر ناکامی کہاں سے شروع ہو گئی ہے۔

ماضی میں دینی مدارس کے نصاب

ہندوستان میں دینی مدارس کے نصاب کی تاریخ بہت تاریکی میں ہے، کسی صحیح ذریعہ سے یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ زمانی اور سماجی لحاظ سے اس میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں، لیکن جب ہم تاریخ ہند کے اوراق کو پلٹتے ہیں اور غور سے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم دینی مدارس میں جو نصاب رائج تھے اس کی امتیازی خصوصیت نصاب تعلیم کا فارسی حصہ تھا اور اس زمانہ میں عربی نصاب کی ثانوی حیثیت تھی جو اسلام کا ورثہ تھا اور جو عالم اسلام سے ہندوستان میں منتقل ہوا تھا اور نصاب فارسی جو اہل عجم کا ورثہ تھا وہ ایران وغیرہ سے منتقل ہو کر آیا تھا۔ اور آج انگریزی تعلیم جو ہم کو عہدِ مغلیہ کے زوال کے بعد برطانیہ سے ملی ہے اس کو پڑھتے ہیں اور اس کی دیکھ ریکھ کرتے ہیں۔ اور افسوس کہ آدم تا ایں دم ہم نے دوسروں کے ہی ورثہ کی نگرانی کی ہے اور انہی کے فرسودہ باقیات سے تعلیم بھی حاصل کی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہمارا ذاتی ورثہ ہندوستان میں نہیں ہے جس سے ہم خود بھی فائدہ اٹھاتے اور دوسرے بھی فائدہ اٹھاتے اور ایسی صورت میں جب کسی کو تعلیم دیتے تو یقیناً وہ اثر کرتی۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ نصابِ تعلیم کے یہ دونوں حصے ہندوستان میں منتقل ہو کر آئے اور عہدِ مغلیہ کے زوال کے بعد ایک تیسرا نصاب انگریزی صورت میں آیا۔

اس لحاظ سے اگر ہم ہندوستان میں دینی مدارس کا نصابی جائزہ لیں تو اس کو چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور:

اس کا آغاز وابتدا ساتویں ہجری سے سمجھنا چاہیئے اور یہ زمانہ محمد بن قاسم کا ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا بھی ہے لیکن مکمل طور پر اس کا انجام دسویں صدی سے شروع ہوا تھا جیسا کہ مو عبدالحی ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات میں لکھے ہیں "اس کا آغاز ساتویں صدی ہجری سے سمجھنا چاہیئے اور انجام د صدی پر اس وقت ہوا جب کہ دوسرا دور شروع ہو گیا تھا کم و بیش دو سو برس تک مندرجہ ذیل فنون کی تحصیل معیار فضیلت سمجھی جاتی تھی، صرف نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تفسیر حدیث[۱۲] پر مشتمل کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔

اس دور میں اسلامی اور دنیوی علوم سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ کو اضافی شکل میں ہنر اور فن سکھایا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے معاشی اور اقتصادی حالات بہتر بنا سکیں، ملاحظہ ہو پروفیسر محمد سلیم کا وہ مقالہ جو انھوں نے ماضی میں مدرسے کی نصابی روایات پر لکھا تھا۔ "علوم اور دنیوی کی تحصیل سے فارغ ہو کر طالب کوئی ہنر سیکھتا تھا کوئی ذریعہ معاش ڈھونڈتا تھا۔ عربی ز کی تحصیل کرنے والے کو عالم اور فارسی نصاب کی تحصیل کرنے کو فاضل کہتے تھے اور دونوں نصابوں کی تکمیل کرنے والے کو عالم فاضل کہتے تھے۔[۱۳]

اور جب رفتہ رفتہ ملوک غزنویہ نے لاہور کو اپنا پایہ تخت بنایا تو اس شہر نے سب سے پہلے فائدہ اٹھایا اور اسی وقت فارسی مملکت کی زبان رہی ہے، ساری دفتری اور سرکاری کار اور مراسلات فارسی زبان میں ہوتی تھی۔ چونکہ اس دور میں فارسی سرکاری زبان تھی اس لیے تمام مدارس میں وہی ذریعہ تعلیم ہو لیکن کیونکہ عربی مذہبی زبان تھی اس لیے اس کی تعلیم نہایت ضروری تھی لیکن یاد رہے کہ عربی کو مذہبی زبان ہونے کے باوجود بھی حکومت میں سرکاری زبان ہونے کا حق حاصل نہیں تھا، اس معلوم ہوا کہ اس کا اقتدار جغرافیائی لحاظ سے ہے۔

اس دور کے علماء کرام کی زندگی سے معلوم ہوتا ہے ج

دورِ حاضر میں منطق و فلسفہ کی تعلیم کو معیارِ فضیلت سمجھا جاتا ہے اس زمانہ میں بھی فقہ اور اصولِ فقہ اور حدیث میں صرف مشارق الانوار کا پڑھ لینا کافی تصور کیا جاتا تھا اور جس کو یہ تعلیم حاصل ہوگئی اس کو فضیلت کی ڈگری مل جاتی تھی اور اسی کو امام الدنیا فی الحدیث کے لقب سے لوگ جانتے تھے۔ جیسا کہ مولانا عبدالحی دوسری جگہ لکھتے ہیں "اس زمانہ میں فقہ اور اصولِ فقہ معیارِ فضیلت تھا۔ حدیث میں صرف مشارق الانوار کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور جس خوش نصیب کو مصابیح ہاتھ آجاتی تھی وہ امام الدنیا فی الحدیث کے لقب کا مستحق ہو جاتا تھا۔"[۳۲]

اس دور میں مذہبی تعلیمات بہت معمولی دی جاتی تھی کہ طالب علم اپنے دینی مسائل کو حل کرے اور بقیہ تعلیمات سماجی، حکومتی، ضروریات کے لحاظ سے دی جاتی تھی۔ اور حکومت پورا تعاون کرتی تھی۔

دوسرا دور

نویں صدی ہجری کے آخر میں دو شخص عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ کا نام تاریخ میں ملتا ہے یہ دونوں شخص ملتان سے آئے تھے۔ اول الذکر دہلی میں فروکش ہوئے اور ثانی الذکر سنبھل میں قیام پذیر ہوئے۔ اس وقت سکندر لودھی کی ہندوستان میں حکومت تھی۔ لودھی حکومت نے ان دونوں بزرگوں کا بڑے کروفر سے خیر مقدم کیا، تھوڑے ہی دنوں میں ان دونوں حضرات نے اپنی لیاقت اور صلاحیت سے دربارِ لودھی میں سکہ جما لیا۔ اور اپنے علمی اور عملی کارنامے کی وجہ سے دینی مدارس میں تعلیمات کی ذمہ داری بھی قبول کرلی تھی۔ انھوں نے دورِ اول کے معیارِ تعلیم کو بہت بلند کیا۔ اور نصابِ تعلیم میں بہت اضافہ بھی کیا تھا۔ اسی زمانہ میں شروح اور فلسفہ و معقولات کا کافی حصہ دینی مدارس میں داخلِ نصاب تھا، جیسے شرح وقایہ، شرح جامی، شرح عقائد نسفی قاضی عضد کی تصانیف مطالع و مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم داخلِ نصاب ہوئیں۔ جیسا کہ مولانا عبدالحی نے شیخ عبدالقادر کی کتاب منتخب التواریخ سے اس زمانہ کے نصاب کے بارے میں نقل کیا ہے۔

"بر شرحین مفتاح محاکمہ کردہ و عضدی را کہ کتاب منتہیائینہ است میگویند کہ چہل مرتبہ از اول تا آخر درس گفتہ۔"[۳۳]

مذکورہ حوالہ سے دو چیزیں سامنے آئی ہیں ایک یہ کہ نویں صدی میں شروح کو مفتاح کی حیثیت حاصل تھی اور دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں قاضی عضد کے مطالع و مواقف کی اتنی اہمیت تھی کہ جس شخص نے اس کو پڑھ لیا تو پھر اس کے علم میں چار چاند لگ جاتا تھا۔ اور یہ کتابیں بہت جلد مقبولِ عام ہوگئیں۔ بدایونی کا یہ جملہ ملاحظہ کریں "ایں ہر دو عزیزاں ہنگام خرابی ملتان بہندوستان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادند و قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نہ بود۔"[۳۴]

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوا شیخ عزیز اللہ اور عبداللہ کے ہندوستان میں آنے کی وجہ سے علم معقول کو بڑی تقویت ملی ہے۔ اور شروح کا رواج ہوا ہے جب کہ ہندوستان میں ان حضرات کی آمد سے پہلے تمام کتابیں بغیر شرح اور کنجی (Helping Book) کے پڑھائی جاتی تھیں جس کی وجہ سے مذہبی دو چار کتابوں کو پڑھا دینے سے بھی اعلیٰ صلاحیت کے طلبہ مدرسوں سے نکلتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ موجودہ دور میں اتنی ساری کتابیں پڑھانے سے بھی بوکس طلبہ فارغ ہوتے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ شرح وغیرہ کا رواج بنا ہے۔ اور اس لیے طلبہ کے اندر سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور دینی مدارس کی سب سے بڑی ناکامی شرح کو داخلِ نصاب کرنا ہے۔ اور خدا کی طرف سے اس قوم پر سب سے بڑا عذاب یہی ہے کہ اس کے اندر سے سوچنے اور غور کرنے کی صلاحیت کو سلب کرلے۔

تیسرا دور

دوسرے دور میں نصاب درس میں ترمیمات کی وجہ سے لوگوں کے ذہن کھل گئے اور انھوں نے تعلید کا جامہ اتار پھینکا اور معیارِ تعلیم کو بلند کرنے کے متمنی ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں شاہ فتح اللہ شیرازی ہندوستان آئے تو ان کے علمی کمالات کی وجہ سے دربارِ اکبری نے عضد الملک کا خطاب دیا۔ اور انھوں نے سابق نصاب درس میں کچھ جدید علوم و فنون کے اضافے کیے جس کو علماء نے بسر و چشم قبول کرلیا اور پذیرائی بخشی، جدید علوم و فنون کی وجہ سے مدارس بھی

دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے رہے۔

عہدِ اکبری میں عوام کو جدید علوم سے روشناس اور متعارف کرانے میں بادشاہ اکبر کا بھی مذاق شامل تھا، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اکبر کے اندر علمی مذاق نہیں تھا بلکہ وہ اُمّی تھا دراصل انھوں نے اکبر کی زندگی اور قلمرو کی کا خوب گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ تقلیدی تحریر کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے اور گروہی عصبیت پر مبنی مطالعہ کیا ہے۔

اکبر علم دوست تھا اور اس کا ذوقِ مطالعہ بہت بلند تھا کتابی ذوق کو ہمہ گیر بنانے اور اسے فروغ دینے میں اپنے آپ کو دامے درمے قدمے سخنے نثار کیا تھا۔ اکبر کے ذوقِ مطالعہ اور اس کے کتب خانہ کے متعلق ابوالفضل نے لکھا ہے: "جہاں پناہ نے اپنے تبحرِ علمی سے کتب خانے کو چند حصوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ ایک شاخ قصرِ شاہی کے اندر ہے اور ایک باہر اور ان ہر دو شاخوں کو مختلف شعبوں میں تقسیم فرمایا ہے، ہمیشہ تمام علوم و فنون کی کتب و رسائل قیمت و فنون کی اہمیت کے اعتبار سے مختلف مدارج میں شمار کی جاتی ہیں۔ اور ہندی و فارسی و یونانی و کشمیری و عربی زبانوں کی کتابیں نظم و نثر کے اختلاف کے لحاظ سے ترتیب وار پیشگاہ حضور میں لائی جاتی ہیں علماء و فضلاء آگاہ دل کتابوں کی نوعیت کے متعلق جہاں پناہ سے عرض کرتے ہیں اور بادشاہ علم پرور ہر کتاب کو اول سے آخر تک سنتے ہیں۔ ہر روز جس صفحے یا سطر تک کتاب پڑھی جاتی ہے حضرت خود اپنے قلم سے اس مقام پر ہندسۂ شمار تحریر فرمادیتے ہیں اور پڑھنے والے کو عدد اوراق کے مطابق زرِ سرخ و سفید بطور انعام عطا ہوتا ہے۔

عہدِ اکبری میں کتب خانوں اور دینی مدارس کی ترقی کا سب سے بڑا سبب اکبر کا قدیم و جدید کتابوں سے ذاتی لگاؤ تھا، جیسا کہ اس کے ذوقِ مطالعہ کے باب میں محمد زبیر صاحب لکھتے ہیں: "اکبری عہد میں کتب خانوں کی ترقی کا سب سے بڑا سبب اکبر کا کتابوں سے ذاتی لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ کا بڑا دلدادہ تھا اور ان دونوں کے اشعار نہایت روانی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ اس کی علم نوازی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنی مملکت کے تمام صوبوں کے لیے یہ فرمان جاری کردیا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو دنیا میں علم و ہنر کی اشاعت ہوتی رہے تاکہ اہلِ کمال دنیا سے معدوم نہ ہوجائیں اور ان کی یادگار صفحۂ ہستی پر باقی رہے . . . . . اکبر کے اس کتابی ذوق کو دیکھ کر یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جاہلِ محض تھا بلکہ وہ پڑھا لکھا انسان۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں "ظفر نامہ" کا ایک قدیم نسخہ ہے جس کے سرورق پر اکبر کے دستِ خاص کا لکھا ہوا لفظ "فزوردین" موجود ہے۔ اس کے نیچے جہانگیر کے قلم سے لکھی ہوئی یہ تصدیق ہے کہ یہ لفظ عرش آشیانی کا لکھا ہوا ہے۔"

عہدِ اکبری، عہدِ جہانگیری اور عہدِ شاہجہانی میں جن کی تعداد خاندگی نصاب میں بہت بڑھ گئی تھی اور قدیم علوم و فنون کی جگہ جدید علوم و فنون نے لے لی تھی، کافی ترقی پر تھا۔ یہاں تک کہ اس دور میں مسلمان ہی ان مدارس میں پڑھتے تھے چوں کہ سرکاری ملازمتوں کے لیے فارسی کا علم ضروری تھا اس لیے بعد میں ہندو بھی ان مدارس میں داخل کیے گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماجی تعلق کے نتیجے میں ایک نئی زبان کی نشوونما ہوئی جس کو اردو کہا جاتا ہے یہ زبان اور ہندی تقریباً تقریباً ایک ہی ہیں سوائے اس کے کہ اردو کو فارسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے اور ہندی کو دیوناگری یا سنسکرت رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔

اس دورِ حکومت میں جو کتابیں داخلِ نصاب تھیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ عہدِ مغلیہ میں علم و فن کس قدر ترقی اور عروج پر تھا اور معلمین بھی بڑی دلچسپی سے درس و تدریس کا کام انجام دیتے تھے۔ اس درس میں استاد کی کم سے کم مدد شامل ہوتی تھی، طلبہ ازخود کتابوں کا مطالعہ کرکے آتے تھے۔ آج کل کی طرح اچٹتی تعلیم نہیں حاصل کرتے تھے بلکہ پورے انہماک سے پڑھتے تھے، ان کو بہت زیادہ کتابیں پڑھنے کو نہیں ملتی تھیں بلکہ طلبہ کو ایک دوسرے کے اشتراک سے مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں جو نصابِ تعلیم رائج تھا وہ یہ تھا۔ حساب، زراعت، ہندسہ، فلکیات، تدبیرِ منزل، سیاستِ مدنی، طب، منطق، علومِ طبعی، علومِ الٰہی، تاریخ، ہندوؤں کے لیے نیائے بیدانت پاتنجلی۔

اس زمانہ میں فارسی زبان کو سرکاری حیثیت حاصل تھی، اس لیے یہاں ایک نصابِ تعلیم فارسی زبان میں بتدریج ارتقا پذیر ہوگیا

تھا۔ مذکورہ نصاب تعلیم کے حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً سارا نصابِ تعلیم دنیا داری کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا اس لیے اس زمانہ میں نصابِ تعلیم عصری علوم کے لحاظ سے مرتب کیا گیا تھا اس نصابِ تعلیم کو پڑھ کر ایک شخص معاملہ فہم، زمانہ شناس، جدید علوم سے بہرہ ور اور حکومت اور دفتری مراسلات سے واقف ہوجاتا تھا اور عملی انسان بن جاتا تھا اور سیاسی، اقتصادی، سماجی اور معاشرتی زندگی کے تقاضے سے بخوبی واقف ہوجاتا تھا۔ ان سے متعلق امور سرانجام دینے کا اہل بن جاتا تھا۔ اس زمانہ میں مذہبی کتابیں بہت کم داخلِ نصاب تھیں۔ صرف تین یا چار کتابیں طلبہ کو مسائلِ دینویہ سے واقف کرانے کی خاطر پڑھائی جاتی تھیں اور ذہین طلبہ اس معمولی کتاب سے کسی قدر عربی کی معلومات حاصل کرلیتے تھے جیسا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں: "اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ ابتدا سے آخر تک اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کے ختم کرنے کی مدت پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی اور اس پوری مدت تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علماء صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھ سکتے تھے جیسے جلالین، مشکوٰۃ، فقہ، شرح وقایہ ہدایہ، بیضاوی۔" اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۹ — ۱۷۰۷) نے اپنے بھائیوں سے حکمرانی تو ظلم و تشدد اور خون آشامی کی بنا پر حاصل کی تھی لیکن بعد میں ظلم و تشدد سے اجتناب کرلیا تھا۔ اشوک کی طرح سے اس کی زندگی کے بھی دو حصے ہوسکتے ہیں، پہلا ظلم و تعدی اور دوسرا زاہد خشک۔ اسی دوسرے حصے میں اس نے کافی کام کیے ہیں۔ بہت سے دینی مدارس قائم کیے ہیں اور کئی کتابوں کا مولف بھی جو آج تک درس نظامیہ میں داخلِ نصاب ہیں، اس لیے ہم اس کے زہد و ورع اور سادہ لوح کی وجہ سے اس کی شخصیت کو دورِ چہارم میں شامل کرتے ہیں اور اس لیے بھی کہ عہدِ مغلیہ کا شیرازہ اور قدم ڈگمگانے کا عمل اسی کے دورِ حکومت سے شروع ہوگیا تھا۔

چوتھا دور

چوتھا دور بارہویں صدی ہجری میں قائم ہوا اور یہی وہ دور ہے جس کو تاریخ میں عہدِ عالمگیری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں دینی مدارس کے نصاب میں ترمیمات بہت زیادہ ہوئی تھیں۔ سابق میں دینی مدارس میں جو نصاب قائم کیے گئے تھے اورنگ زیب نے یکسر بدل دیا تھا۔ اسی دور میں دنیوی علوم سے زیادہ اہمیت علوم دینیات کی تھی۔ اس کی بڑی وجہ خود اورنگ زیب کی صوفیانہ زندگی ہے۔ اورنگ زیب کو منسوری اور عصری علوم سے کوئی رغبت اور دلچسپی نہیں تھی۔ وہ احکام قرآن و حدیث کی ترویج و احیا کی طرف مائل تھا۔ اس لیے دینی مدارس اور شاہی کتب خانے اسلامی علوم و ادب کا گہوارہ بن گئے تھے، جنگ و جدل کے ہنگاموں میں بھی اس کا صوفیانہ لباس نہیں اترتا تھا۔

اس کے دورِ اقتدار میں دو ایسے باکمال اور متبحر عالم دین اور زمانہ شناس کا نام ملتا ہے جس کو تاریخ فراموش نہیں کرسکتی ہے۔ اور ہماری طرف سے بھی یہ نہایت بے انصافی ہوگی کہ ہم اس موقع پر ان دونوں بزرگوں کا نام بھول جائیں۔ یہ دونوں بزرگ شاہ ولی اللہ (المتوفی ۱۱۷۴ھ) اور ملا قطب الدین سہالوی کی اولاد میں سے ملا نظام الدین سہالوی (۱۷۴۸ء) ہیں۔ اول الذکر مدینہ جانے سے پہلے نصابِ درس بنایا تھا جس کی وضاحت خاندگی یوں ظاہر فرمائی ہے۔ نحو۔ کافیہ، شرح جامی، منطق میں شرح شمسیہ، شرح مطالع، فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ، کلام میں شرح عقائد نسفی وغیرہ۔ فقہ میں شرح وقایہ، ہدایہ کامل، اصول فقہ میں حامی وغیرہ۔ بلاغت میں مختصر مطول، ہیئات و حساب میں بعض مختصر رسائل، طب میں موجز لقانون، حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی کسی قدر بخاری، تفسیر میں مدارک بیضاوی، تصوف میں عوارف المعارف و رسائل نقشبندیہ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جب شاہ صاحب عرب سے واپس آئے تو انھوں نے عرب کے طرز نصاب کو سامنے رکھ کر ایک جدید نصابِ تعلیم وضع کیا تھا مگر امتداد زمانہ کی بنا پر مقبول عام نصیب نہ ہوا۔ اس کے ناقابلِ قبول ہونے کا سبب مولانا عبدالحی صاحب لکھتے ہیں: "شاہ صاحب نے اپنی طرز کا ایک جدید نصاب بنایا تھا مگر چونکہ اس

زمانہ میں علم کا مرکز نقل دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہو چکا تھا اور تمام درس گاہوں میں منطق وحکمت کی چاشنی سے لوگوں کے کام و زبان آشنا ہو رہے تھے اس نصاب کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے نامور بیٹوں نے زمانہ کی روش سے مجبور ہو کر اس کو رواج دینے کی کوشش بھی نہیں کی۔ [11]

لیکن جس نصاب کو دینی مدارس میں داخل کیا گیا اور جس کو لوگوں نے قبول کیا اور جس شخصیت سے اورنگ زیب خود مرعوب تھا وہ ہیں ملا نظام الدین سہالوی جن کے نام سے عربی مدارس کا نصاب تعلیم درس نظامیہ منسوب ہے اور آج تک کسی قدر ترمیم و تبدیل کے ساتھ انہیں کا درس نصاب رائج ہے۔ اسی دقیانوسی نصاب تعلیم کو دیکھ کر اسماعیل میرٹھی نے کہا تھا۔

معلموں کو جو دیکھو تو روح دقیانوس
ہیں وہ بھی دخمہ فارس کے استخواں بردار

ملا نظام الدین صاحب شاہ ولی اللہ صاحب کے ہمعصر تھے، اس دور میں دینی مدارس میں جو کتابیں رائج تھیں ان کے ناموں کی تفصیل گزر چکی ہے۔ ملا نظام الدین نے اس پر بہت کچھ اضافہ کیا تھا، اس کے بعد جو نصاب بنائے گئے تھے اس کی ترمیمی شکل یہ ہے۔

صرف میں۔ میزان، منشعب صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ، نحو میں نحو میر، شرح مأۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی، منطق میں صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی مع میر، سلم العلوم، حکمت میں میبذی صدرا، شمس بازغہ، ریاضی میں خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس مقالہ اولیٰ، تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیہ، شرح چغمنی باب اول، بلاغت میں مختصر معانی مطول وغیرہ۔ فقہ میں شرح وقایہ اولین، ہدایہ آخرین، اصول فقہ میں نور الانوار توضیح تلویح، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ) کلام میں شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف، تفسیر میں جلالین، بیضاوی، حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح۔ [12]

اس کی بڑی خصوصیت تقلید پسندوں کے نزدیک یہ ہے کہ طالب علموں میں امعان نظر اور قوت مطالعہ پیدا کیا جائے لیکن اگر کوئی شخص تحقیق و تفتیش کی نظر درس نظامی پر اور شاہ ولی اللہ کے رائج نصاب پر ڈالے تو معلوم ہوگا کہ طالب علم کو بعد فراغت کسی مخصوص فن میں کمال اور دسترس حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ آج بھی ہر میدان علم سے ناپختہ علم لے کر واپس آتے ہیں۔ معدودے چند کے اور ان کی پوری زندگی بمصداق نیم ملا خطرہ ایمان گزرتی ہے۔

قرآن جس کو ہم منبع علوم وفنون کہتے ہیں، رہتی دنیا کے لیے رہنما تسلیم کرتے ہیں اور تمام قدیم وجدید علوم کا تجدیدی اور تصحیحی مرکز خیال کرتے ہیں کسی پہلو سے طالب علموں کو علم نہیں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن سے بے اعتنائی بڑھتی گئی اور دوسرے علم وفن نے بڑی آسانی سے اپنی جگہ لے لی، اور احادیث صحیحہ کا بھی مکمل علم نہیں ہوتا ہے کہ جس سے مسائل بہ آسانی مستنبط و مستخرج کر سکیں۔

پھر اس کے بعد اسلامی درسگاہوں کا زوال ہوتا گیا ہندوستان میں اسلامی حکومت کا چراغ گل ہو رہا تھا، مسلمانوں کی مادر علمی اور تعلیمی مجلسیں پراگندہ ہو رہی تھیں اس دور میں جو نصاب تعلیم متعین ہوا وہ دراصل سابق درس نظامیہ کی بگڑی شکل ہے اور یہی آج تک اسلامی مدارس میں رائج ہیں۔

ملا نظام الدین کا اورنگ زیب کے عہد حکومت میں درس نظامی کے ترتیب دینے کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ عصری اور سماجی ضروریات کے پیش نظر اس کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ نظام الدین کا طریقہ درس و نصاب یہ تھا کہ "وہ کتابی خصوصیات کا خیال لحاظ نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب کو محض ذریعہ تعلیم قرار دیتے تھے۔" [13] اور ان کے مطابق عصری اور سماجی ضروریات کے لحاظ سے نصاب کو تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور اس بات کو ذہن نشین کریں کہ ہر دور میں دینی اور غیر دینی مدارس میں ایک منظم نصاب ہوتا تھا، اور معلمین اسی کے مطابق درس و تدریس کا کام انجام دیتے تھے۔ اس لحاظ سے ہر دور کے نصاب تعلیم کو اصطلاحاً درس نظامیہ کہہ سکتے ہیں۔ اور ملا نظام الدین سے نسبت خاص کرنا، میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

بغاوتِ ہند کے بعد دینی مدارس کا قیام اور ان کے نصاب

برطانوی حکومت کی مسلم کش پالیسی کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ صدیوں سے غالب اور فاتح حکومت کو ایک صدی کے اندر شاہراہ حیات سے اٹھا کر کسی اندھے کنواں میں پھینک دیا، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء بمطابق ۱۲۷۳ھ میں انگریزوں نے تقریباً سات ہزار متبحر علمار کو تہ تیغ کر دیا۔ کتنی ماؤں کی گود کو ویران کر دیا۔ اور مسلم آبادیوں کو ویرانے میں تبدیل کر دیا۔ ایسے ہنگامی حالات میں قوم اور ملت کے غمخواہ ہی خواہ علما نے اپنے مذہب اور دین اسلام کو بچانے کے لیے دینی مدارس کا سنگ بنیاد رکھا۔ ان کا یہ عملی قدم قابلِ تحسین ہے لیکن ان کی طرف سے جو غلو ہوا تھا وہ قابلِ مذمت تھا۔ یوں تو انگریزوں کو سرکاری مسلمان اہلکاروں کو منظم کرنے کے لیے خصوصی ترتیب کی ضرورت محسوس ہوئی تو ۱۷۸۴ میں عربی تعلیم والا ایک مدرسہ قائم کیا اور ۱۷۹۱ میں سنسکرت ذریعہ تعلیم والا ایک کالج ہندوؤں کے لیے سرکاری طور پر قائم کیا۔ ان اداروں کے قیام کا مقصد ایسے افراد کی تیاری تھی جو قیام انصاف کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں کے قوانین کی مفید ترجمانی اور وضاحت کا فریضہ انجام دے سکیں۔[۱۲]

ہندوستان میں بغاوت کے بعد سب سے پہلے جس دینی مدرسہ کا نام ملتا ہے وہ فیض عام ہے جس کو مولانا عنایت احمد صاحب نے ہنڈمان کی قید کی رہائی کے بعد ۱۸۶۰ میں کانپور میں قائم کیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے بارے میں کتابوں میں پوری وضاحت نہیں ملتی ہے اس لیے ہم اس کی دینی خدمت اور نصاب کے باب میں وضاحت کرنے سے قاصر ہیں۔

اور اس ضمن میں ایک بات ذہن میں رکھتے چلیں کہ بغاوتِ ہند نے ہمارے علمار کے اندر حرکت اور نہضت پیدا کر دی تھی، اور جو لوگ اس وقت خانقاہیت کی طرف جا رہے تھے وہ بھی سوچنے پر مجبور تھے کہ انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کیا جائے۔ ان علمار میں سے دو ایسے باکمال عالم کا نام ملتا ہے جن کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی ہے۔ اور کرے گی تو تاریخ کے اوراق یکسر خالی رہ جائیں گے۔ اور تاریخ پڑھنے والا کوئی نہیں ملے گا۔

ان میں سے ایک نام سید احمد ہے اور اصلاحی و سماجی خدمات کے صلہ میں ۱۸۷۸ میں سر کا خطاب ملا جو ان کے نام کا اٹوٹ حصّہ بن گیا، ان کو دنیا سرسید احمد خاں سے جانتی ہے۔ دوسرا نام مولانا ابو القاسم نانوتوی کا آتا ہے جس کے قائم شدہ مدرسہ کے فارغین مدرسہ کی طرف نسبت کرنے کے بجائے مولانا کے نام کی طرف بڑے والہانہ انداز میں نسبت کر کے اپنے آپ کو قاسمی کہتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات ہمعصر تھے بلکہ یہ کہا جائے کہ پہلے ہم مزاج اور ہم درس تھے پھر بعد میں دونوں کے مزاج میں کسی قدر دوری ہو گئی۔

"سرسید احمد خاں اور مولانا ابو القاسم نانوتوی مولانا مملوک العلی سے بیعت تھے۔[لہ] اور جب وقت نے یکلخت جھٹکا دیا تو سرسید کی بیعت کی رسی ٹوٹ گئی اور مسلمانوں کے جدید مسائل پر سوچنے لگے۔ اور مولانا ابو القاسم صاحب کی بیعت کی رسی پکڑے پکڑے مسلمانوں کے دین کو بچانے اور حفاظت کی خاطر انگریزی اور عصری اور سماجی تعلیمات سے پرے ہٹ کر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ساتھ ۱۸۶۷ء میں دار العلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی۔

یہ مدرسہ ابتداً چھتہ کی مسجد کے فرش پر درخت انار کی ٹہنیوں کے سایہ میں تھا پھر اس کے بعد قاضی کی مسجد میں اور کرایہ کے مکانات میں تھا۔ لیکن حالات کے ساتھ ساتھ مدرسہ تعمیری اور تعلیمی دونوں اعتبار سے ترقی کرتا رہا، آج کل اس مدرسہ میں نئی تعمیرات زیادہ دکھائی دیتی ہیں لیکن نئے علوم زیادہ دکھائی نہیں دیتے ہیں۔

مدرسہ نے اپنے قدیم علوم اور قدیم نصاب کے اعتبار سے عملی دنیا میں کام کیا ہے۔ لیکن اگر اس مدرسہ کے نصاب میں کچھ جدید علوم داخل کر دیے جائیں تو اس کی ترقی میں چار چاند لگ سکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ تقلید کی ریت کو فرمودات باری تعالیٰ پر ترجیح دی اور جدید علوم

لہ سرسید اور مولانا محمد قاسم پیر بھائی تھے۔ دونوں نے ابتدائی مذہبی تعلیم مملوک العلی سے حاصل کی تھی ــــ فکر و نظر، نامورانِ علی گڑھ، پہلا کارواں ص ۲۱۶، جنوری تا ستمبر ۸۵ء۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سے کوسوں دور ہو گئے اور سمجھ بیٹھے کہ دینی علوم کے مقابلہ میں تمام علوم عبث ہیں۔ اور زنداں کی کال کوٹھڑی میں اس طرح سے جاکر بیٹھ گئے کہ اپنے رسول کی دلسوزی اور جانفزا تقریر بھی سننا گوارہ نہ کیا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ امام زہری بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت بن انصاری سے کہا "میرے پاس بادشاہوں کے خطوط آئے ہیں میں نہیں چاہتا کہ کوئی غیر اس کو پڑھے۔ کیا تم عبرانی یا سریانی زبانیں سیکھ سکتے ہو، میں نے کہا ہاں۔ اور پھر ہم نے ۱۷ دن میں یہ زبان سیکھ لی . . . . ۔ اور آپ نے تیراندازی کی ترغیب دی: علموا اولادکم الرمایۃ والسباحۃ ورکوب النخیل۔[۱۵]

اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دینی علوم کے ساتھ ساتھ غیر دینی علوم کے سیکھنے کی ہمت افزائی فرمائی تھی، اور مزید براں یہ معلوم ہوا کہ کوئی علم غیر ضروری نہیں ہے۔ بلکہ عصری اور سماجی لحاظ سے ہر علم و فن اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔

اور المیہ ہے کہ علوم سائنس سے بنی ہوئی فریج، ہوائی جہاز اور ٹرین جس پہ بیٹھ کر یہ لوگ دیوبند اور دوسرے دینی مدارس کا قصد کرتے ہیں، لیکن اس علم کو پڑھانا عظیم جرم سمجھتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ غور کرتے تو معلوم ہوتا کہ اگر تعلیمی نظام میں دنیاوی علوم شامل نہ کیے گئے تو وہ تعلیمی نظام کھجور کی خشک ٹہنی کے مانند ہو کر ناکارہ ہوتا جاتا ہے۔

کولمبس کہتا ہے "کوئی بھی تعلیمی نظام جو دنیا سے اپنا رشتہ توڑنے کی کوشش کرتا ہے، گل سڑ کر ٹھیک اسی طرح ناکارہ ہو کر رہ جائے گا جس طرح کہ انسانی عضو کو دوران خون کی رگوں سے جدا کر دیا جائے۔"[۱۶]

نقائص نصاب دینیہ

اس مدرسہ میں اور اس سے کچھ پہلے قائم شدہ ۱۸۶۶ء مدرسہ مظاہر العلوم (بانی مولانا سعادت علی) ہو یا سب سے قدیم شاہ عبدالرحیم کا مدرسہ رحیمیہ (۱۱۳۱ھ) ہو۔ سب میں غالباً درس نظامی کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ کسی میں بھی درس نظامی سے ہٹ کر تعلیم نہیں دی جاتی ہے۔

مدرسہ دارالعلوم اور مظاہر العلوم میں تو علوم جدیدہ کی تعلیم دینا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اور افسوس ہے کہ درس نظامیہ میں منطق و فلسفہ کا اس قدر زور ہے کہ ابتداء تا انتہا درس میں اس فن کی کسی نہ کسی کتاب کا داخل کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اور فلسفہ کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اس میں جزء لا یتجزی کا ابطال، خلا کا محال، عناصر کا چار ہونا، افلاک کا نو ہونا زمین کا ساکن ہونا شامل ہے۔ اور اسی کو کتابی دلائل سے ثابت کرتے ہیں لیکن اگر یہ لوگ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ علوم طبعیہ اور علوم تجربہ اور علم الہیت والافلاک کتنا ترقی کر چکا ہے اور مذکورہ مسلمات میں سے کتنے کو غلط ثابت کر دیا ہے، پتہ نہیں ہے۔ اس فن میں دنیا کتنے آگے بڑھ گئی ہے، احساس تک نہیں ہے۔ بلکہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں مگن ہیں۔

فقہ میں شرح وقایہ، نور الایضاح، کنز الدقائق، ہدایہ نور الانوار جیسی کتابیں داخل نصاب ہیں اور ان کتابوں میں سے وہی ابواب پڑھائے جاتے ہیں جو بالکل فرسودہ ہو چکے ہیں اور زمانہ کے اعتبار سے بے عمل ہو چکے ہیں، یعنی ابواب الحیض والاستحاضہ، ابواب التیمم، اور کنواں میں اگر کوئی جانور گر جائے کتنے ڈول پانی نکالنے ہونگے اور پھر غیر ضروری فقہائے کے اختلاف رٹائے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک ایک ہی فن کی اتنی ساری کتابوں کو پڑھانا طالب علم کی زندگی کو مفلوج اور ناکارہ بنانا ہے۔ اور ستم بالائے ستم ایک ہی فن کی دوسری کتابوں میں جیسے صرف و نحو میں، میزان، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ، نحو میر، شرح مائتہ عامل، ہدایہ نحو، کافیہ، شرح ملا جامی داخل نصاب ہیں اور ان میں گرامر کے بجائے فلسفہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور ان کتابوں میں اختلافی صرف کو زیادہ اہمیت حاصل ہے جیسے فعل پر اعراب آتا ہے کہ نہیں، اور اس میں امام قصائی اور امام جمیل کی رائے کیا ہے؟

علم کلام جس فرقہ باطلہ کا رد و استیصال کے لیے اس علم کو قائم کیا گیا ہے اب ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ لیکن تب بھی دینی مدارس میں علم کلام کے موضوع پر بہت ساری کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

حدیث میں بخاری، ترمذی، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ شامل ہیں ان میں سے جو غیر ضروری ابواب پڑھائے جاتے ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ اس طرح ہیں۔

تفسیر میں جلالین، مدارک اور بیضاوی بڑی شرح و بسط سے پڑھائی جاتی ہیں اور قرآن مجید کی کیا تعلیم ہے؟ اس پر کوئی توجہ نہیں ہے

دینی مدارس میں جہاں نصاب میں خامیاں (Demerits) ہیں وہیں بہت سی خوبیاں (Merits) بھی ہیں۔ معلمین غیر شعوری طور پر قرآنی اعتبار سے بہت سے فقہی ابواب، حدیث کے ابواب پڑھا دیتے ہیں جن کی ایک طالب علم کی زندگی میں آئے دن ضرورت پڑتی ہے۔ جیسے وضو، نکاح۔ وغیرہ وغیرہ

انشا اللہ ہم آگے ایک عصری اور سماجی نصاب اور قرآنی نصاب کے باب میں دل افروز گفتگو کریں گے لیکن اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دینی مدارس کا تذکرہ کر دیا جائے جن کو جدید دور کی دینی درسگاہوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔

جدید دور کی دینی درس گاہیں

مسلمانوں میں دوسرے مکتب فکر اور جدید سوچنے والوں کی ایک ذیلی شاخ بھی تھی وہ لوگ عصری اور سماجی تقاضوں کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور قدیم نصاب تعلیم میں اصلاح کے خواہاں بھی تھے، یہ لوگ نصاب میں کسی پیوندکاری کے بجائے ایک نیا نصاب وضع کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ اس فکر کے نمائندے مولانا محمد علی مونگیری، حبیب الرحمٰن شروانی، فضل الرحمٰن مرادآبادی اور علامہ شبلی نعمانی تھے۔

اور ۱۸۹۲ء/۱۳۱۰ھ میں ان علماء کی تنظیم بنام ندوۃ العلماء (بمقام کانپور) کا مقصد یہی تھا کہ اشاعت اسلام اور قیام مدارس میں جدید نصاب کو رواج دیا جائے۔

بالآخر اس تنظیم نے اس قدر ترقی کر لی کہ صدر تنظیم مولانا محمد علی مونگیری نے دارالعلوم ندوۃ العلماء ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں سنگ بنیاد رکھا۔ علماء نے اصلاح شدہ نصاب قبول کر لیا۔ اس طرح قدیم نصاب کی اصلاح کا دروازہ کھل گیا۔

شبلی ۱۹۰۴ء میں اس سے وابستہ ہوئے۔ مولانا شبلی کی علمی تربیت چونکہ سرسید احمد کے زیر سایہ ہوئی تھی اس لیے ندوۃ العلماء میں جدید علوم و فنون کے ساتھ عملی صنائع کی تعلیم بھی داخل کی گئی تھی۔ ان مقاصد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ادارے کا قیام اس ضرورت کے احساس کا نتیجہ تھا کہ قدیم علماء اور علی گڑھ کے بین بین ایک تعلیمی اور مذہبی طریقہ کار قائم ہو اور اس زمانہ میں اس طرح کی ایک تنظیم بھی قائم کی گئی تھی۔

"جب ۱۹۰۶ء میں دیوبند کے صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب تھے، تو انھوں نے ایک جمعیت الانصار قائم کی اور اس سلسلے میں علی گڑھ سے یہ معاہدہ ہوا کہ انگریزی خواندہ طلباء دارالعلوم دیوبند جاکر علوم اسلامیہ حاصل کریں، دارالعلوم اس کا خاص انتظام کرے گا۔ اسی طرح علی گڑھ کالج ان طلباء کو خاص انتظام کے ساتھ انگریزی کی تعلیم دے گا جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر علی گڑھ جائیں گے[12]"، لیکن افسوس کہ دارالعلوم دیوبند نے تو اب تک انگریزی تعلیم کو داخل نصاب نہیں کیا ہے چہ جائیکہ دیگر علوم پڑھائے جائیں۔

ندوہ کی نصابی خوبیاں اور خامیاں

ندوہ میں تعلیم کے تین مرحلے ہیں۔ ابتدائیہ، عالمیہ، فاضلیہ۔ ان تینوں مرحلوں میں طلبہ کو ضرورت سے زیادہ تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی ندوی حضرات تعلیمی تربیت کے لحاظ سے دنیا کے سامنے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے ہیں۔ علمی دنیا میں صرف انگلیوں پر شمار کیے جانے والے ندوی ہیں جن کی وجہ سے کچھ لوگ ندوہ کا نام لے لیتے ہیں لیکن اگر حقیقتاً آپ ان کا علمی اور عملی جائزہ لیں تو بالکل کورے اور سادہ دکھائی دیں گے بقول کسی شاعر کے ؎

جو دیکھنے میں مہکتا گلاب لگتا ہے
جو دیکھئے تو وہ انساں دھواں دھواں نکلا

ندوہ میں کتابی علوم تو بہت زیادہ ہیں، مگر وقت کے لحاظ سے ان کی حیثیت ایک بوڑھے درخت کی سی رہ گئی ہے۔ تاہم

ان میں کچھ کتابیں ایسی ہیں جن کو ابھی وقت کی ضرورت ہے۔ ان کو پڑھ کر طالب علم عربی زبان کا ماہر ہو سکتا ہے۔ اور اگر ابتدا میں کچھ جدید علوم داخل کر دیئے جائیں تو دنیاوی علوم میں بھی طالب علم کچھ نمایاں صلاحیت حاصل کر سکتا ہے۔

ندوہ میں جو کتابیں عالمیہ میں پڑھائی جاتی ہیں اسی کتاب کا دوسرا اور تیسرا حصہ اور کچھ دوسرے اصطلاحی نام مثلاً ادب و تاریخ وجغرافیہ کے کچھ حصے عالمیہ کے آخری سال میں پڑھا دیئے جاتے ہیں۔ فلسفہ اور منطق کی تعلیم تو اور مدارس کے مقابلہ میں ضرور برائے نام دی جاتی ہے لیکن دینی دنیاوی اعتبار سے جس علوم کی تعلیم کی ضرورت ہے اس سے عالم طالب علموں کو دور رکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید کا ترجمہ اور کچھ دوسری تفسیری کتابیں پڑھا دی جاتی ہیں مگر قرآن کے اصول و مبادی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔ قرآن مجید کو ایک عام کتاب کی شکل میں پڑھا دیا جاتا ہے۔ (افلا یتدبرون القرآن) کا کہیں نہیں پتہ ملتا ہے۔ اسی طرح ان کے یہاں جغرافیہ عالم اسلامی، تاریخ دروس التاریخ الاسلامی کا حال ہے۔

اور فضیلت میں صحیح مسلم کامل، تفسیر بیضاوی، دیوان المتنبی، حماسہ حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ داخل ہیں، اگر کوئی صاحب بصیرت مذکورہ کتابوں کا علمی جائزہ لے تو معلوم ہوگا کہ نہ تو صحیح ڈھنگ سے حدیث کا علم ہوتا ہے اور نہ قرآن مجید کا۔ ایسی صورت میں ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے، ندوہ میں اتنے سال گزارنے کے بعد بھی نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔

ندوہ کے نصاب پر اگر غور کریں تو کچھ بہتر کتابیں بھی ہیں جیسے ادب میں مختارات، البلاغۃ الواضح، حدیث میں ریاض الصالحین کی جگہ الموطا امام مالک کی داخل کر دی تو زیادہ بہتر حدیث کا نصاب ہو جائے گا اس لیے کہ یہ کتاب جہاں فقہ کی دنیا میں اپنا نام رکھتی ہے وہیں حدیث کی دنیا میں بھی اس کا نام لیا جاتا ہے۔

علی گڑھ اور دیوبند کو جو مقبولیت اپنے اپنے حلقوں میں حاصل ہوئی ہے وہ مقبولیت ندوہ کو حاصل نہ ہو سکی، دینی نصاب تقویٰ اور پرہیزگاری میں ندویوں کا کوئی امتیازی رنگ دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اسلامی فکر کو نمایاں پوزیشن دینے میں اہل ندوہ نے کوئی بہتر کارکردگی کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ تاہم ندویوں کے اندر دیگر دینی مدارس کے فارغین کے مقابلہ میں عربی زبان وادب کا صحیح مذاق ملتا ہے۔ جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر شخصی اور موروثی حکومت یا شخصیت پرستی کا زور ختم ہو جائے اور خلوص کی حکمرانی ہو تو عربی زبان وادب کا مذاق اور بہتر ہو سکتا ہے۔

اور اسی جدید دور میں جس جدید دینی مدرسہ کا نام آتا ہے وہ مدرسۃ الاصلاح ہے۔ پہلے مدرسۃ الاصلاح انجمن اصلاح المسلمین کی صورت میں تھا جس کے روح رواں مولانا شفیع تھے۔ مولانا نے ۱۹۰۹ء/۱۳۲۷ھ میں مدرسۃ الاصلاح کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ درسگاہ سرائے میر، مضافات اعظم گڑھ میں ایک چٹیل اور بنجر میدان میں قائم کی گئی ہے۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر علامہ شبلی ۱۹۱۲ء/۱۳۳۱ھ میں اور مولانا حمید الدین ۱۹۱۹ء/۱۳۳۸ھ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے مایوس ہو کر مدرسۃ الاصلاح چلے آئے۔

علامہ شبلی نے مدرسہ کے اغراض ومقاصد اور طریقۂ کار کا ابتدائی خاکہ مرتب کیا لیکن جب مولانا شبلی کا ۱۹۱۴ء میں انتقال ہو گیا تو مدرسہ درس نظامی کے اصول پر چلتا رہا۔

لیکن جب مولانا فراہی مدرسہ میں آئے ہیں تو ایک مرتبہ پھر اس کے نصاب میں ترمیم ہوئی۔ چونکہ مولانا فراہی قدیم وجدید علوم پر بہت گہری نگاہ رکھتے تھے بلکہ یہ کہا جائے کہ وہ ایک نابغۂ روزگار شخص اور عبقری تھے۔ لیکن یاد رہے کہ دونوں سرسید کے سایۂ عاطفت میں تربیت پا چکے تھے جس کا اثر ندوہ اور اصلاح میں اس وقت کے تعلیمی نصاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ زمانہ کے اعتبار سے بھی نصاب میں بہت زیادہ جھول تھا لیکن پھر بھی دونوں بزرگوں نے کافی نمایاں کام انجام دیا ہے جس کا عملی نتیجہ ندوہ اور اصلاح ہے۔

اصلاح کی نصابی خوبیاں اور خامیاں

اصلاح کا قدیم نصاب تو ہندوستان کے اکابر اہل علم کے تعلیمی تجربات کا نچوڑ تھا اور مرتب نے دعویٰ کیا ہے کہ "ہندوستان یا عالم اسلام کی کوئی درسگاہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس سے بہتر نصاب

ری نہیں کر سکی۔ [۱۹]

لیکن ہم یہاں قدیم نصاب سے قطع نظر اس جدید نصاب پر تگو کریں گے جو اس وقت مدرسہ میں رائج ہے۔

مدرسہ کا تعلیمی نصاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا مکتبی تعلیمات شتمل ہے۔ دوسرا عالمیت پر، تیسرا افضیلت پر۔

ابتدا میں طالب علم کو مکتبی علوم پڑھا دیے جاتے ہیں، لیکن ان وم کے پڑھانے والوں کا طریقۂ تعلیم کچھ اچھا نہیں ہے۔ جب کہ اس ں کچھ ایسی کتابیں ہیں، اگر طالب علم کو بہتر طور سے پڑھا دیا جائے ، اردو اور دیگر علوم میں ممتاز حیثیت حاصل ہو سکتی ہے اور ثانوی لوم میں اپنی امتیازی شان بنا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ابتدا ہی میں طالبعلموں ے ساتھ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تو پھر میدان علم و عمل ں پھسڈی ثابت ہوں گے۔

اور اگر مکتبی نصاب کو پانچ سال سے بڑھا کر آٹھ سال کر دیا جائے اور سائنسی اور دیگر علوم کو داخل کر دیا جائے تو مکتب کے ڑکے میدان علم و عمل میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کریں گے۔

مکتبی دور سے گزرنے کے بعد عربی دور شروع ہو جاتا ہے اور آج کل یہ دور دس سال نصاب تعلیم پر مشتمل ہے۔ عربی کا پہلا دور سات سال عالمیت پر مشتمل ہے۔ جن میں اب بھی بہت سے قدیم اور کچھ تھوڑے جدید علوم داخل نصاب ہیں۔

لیکن المیہ ہے کہ طالب علم نہ تو عربی زبان و ادب میں ماہر ہوتا ہے ورنہ قرآن مجید میں جو اس مدرسہ کا خاص مطمح نظر اور طرۂ امتیاز ہے۔ دسترس اور مہارت حاصل کرتا ہے۔ ویسے اس مدرسہ کو جو چیز مابہ الامتیاز رتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن فہمی میں کسی تفسیری کتاب کو داخل نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اگر قرآن مجید سے استنباط و استخراج کر کے کچھ کتابیں قرآن فہمی کے اصول و ضابطے کے طور پر لکھ دی جائیں تو وہ قرآن فہمی میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

فقہ اور احادیث پر جو کتابیں ہیں اس میں بہت ساری کتابیں غیر ضروری ہیں، اور غیر ضروری کتابوں کا پڑھانا تضییع اوقات ہے۔ اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی فقہ میں بہت ایسے ابواب ہیں جنکو نہیں پڑھانا چاہیئے جیسے باب الحیض اور باب الاستحاضہ وغیرہ وغیرہ ہیں۔

اور فضیلت میں مفصل اور دیگر غیر قرآنی علوم جن کے پڑھنے سے قرآن کی زبان اور عربی ادب متاثر ہو پڑھانے سے اجتناب کیا جائے۔

درس نظامیہ میں ترمیم نصاب اور اس کا طریقۂ کار

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد جتنے بھی دینی مدارس قائم کیے گئے تھے تمام میں تعلیم سماجی، اقتصادی اور عدلی لحاظ سے ضروری دی جاتی تھی لیکن اسلامی علوم میں جو سب سے بڑا خلا رہتا تھا، وہ قرآنی تعلیمات سے عدم توجہی تھا۔

قرآن مجید جو تمام علوم و فنون کا مرکز تصور کیا جاتا ہے اور جن سے یکسر علوم کی شاخیں جا ملتی ہیں، تعلیم و تعلم کرنے والے نہیں ملتے ہیں، لوگ اپنے صحیفۂ ہدایت سے بہت دور ہو گئے ہیں اور لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ قرآن مجید کو ہم لوگ نہیں سمجھ سکتے ہیں، اس کو تو ہمارے اکابر سمجھ چکے ہیں۔ افسوس کہ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ ممکن ہیں کہ ہمارے پاس غیر محرف صحیفہ موجود ہے۔ منطق و فلسفہ اور احادیث و فقہ کی تو ضخیم کتابیں ضرور پڑھائی جاتی ہیں لیکن حقیقتاً قرآن کی تعلیمات نہیں دی جاتی ہیں۔

اور اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں یہ کہنے کی جرأت رکھتا ہوں کہ حدیث کے اس ٹکڑے (لا تکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن) کو اصولی حیثیت دے کر قرآن مجید سے پہلے کسی علوم کو نہ پڑھایا جائے جس سے قرآن فہمی دشوار ہو جائے۔

اور اگر آپ قرآن کی صحیح تعلیمات اپنے دینی مدارس میں دینا چاہتے ہیں تو ایک ہی فن کی شامل کئی کئی کتابوں کو نکالنا پڑے گا۔ جیسے احادیث کا ایک پورا دفتر طالب علم کو پڑھایا جاتا ہے اسی طرح فقہ، نحو و صرف اور منطق و فلسفہ جیسے غیر ضروری نصاب طالب علم کو پڑھایا جاتا ہے۔ جب کہ طالب علم کا ذہن اس سے بالکل ابا کرتا ہے اور بہت سے طالب علم مدرسہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔

لیکن جب ہم دینی مدارس میں تبدیلی نصاب کی بات کرتے ہیں تو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ قدیم و جدید کو کم یا زیادہ

تناسبت سے ملانے کی بات کرتے ہیں تو ہم دراصل یہ تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں علوم کے درمیان ایک حد فاصل ہے، دراصل ایک ایسا نظام تعلیم مرتب کرنا چاہتے ہیں جس کے ابتدائی مرحلے میں سائنس، ریاضی یا نیوکلیائی طبیعات، باٹنی، بایولوجی وغیرہ کو مادری زبان میں پڑھائی جائے اس لیے کہ بات سمجھ میں زیادہ مادری زبان میں آتی ہے لیکن اس کی تعریفیں (Definitions) اور اصطلاحات (Terms) کو انگریزی زبان میں بتائی جائیں تاکہ طالب علم جب مدرسہ کی دنیا سے نکل کر کہیں دوسری جگہ جائے تو اپنے آپ کو اجنبی اور دنیا سے الگ تھلگ محسوس نہ کرے۔

اور دوسرے مرحلہ میں عربی زبان وادب اور انگریزی کی کتابیں پڑھائی جائیں اور تیسرے مرحلہ میں وہ کتابیں داخل نصاب ہوں جن کا تعلق قرآن مجید سے ہو۔ اور ان مدارس کے طلبہ کو عام ملازمتوں میں مواقع دینے کے لیے تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کے لیے کچھ ایسے مخصوص کورس مرتب کیے جائیں جنھیں پورا کرنے کے بعد وہ صنعت و حرفت کی دنیا میں بے یار و مددگار ثابت نہ ہو بلکہ اس کے لیے اس کورس کی حیثیت سے ڈگری بھی دے دی جائے۔ تاکہ سرکاری طور پر نہ سہی تو کم سے کم پرائیوٹ میں اپنی روزی روٹی کا مسئلہ حل کر سکے۔

لیکن جب تک خود مسلمان علوم کے مختلف شعبوں میں اتنی کامل مہارت حاصل نہ کرلیں کہ ان کا مقابلہ غیروں کے سامنے ہیچ دکھائی دے بالفاظ دیگر ہر میدان علم میں وہ ایک باکمال اور ماہر اور نابغہ بن جائے۔

درس نظامیہ کے غیر مقبول قدیم نصاب کے پیش نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے اہم تقاضوں اور قرآن کے مطابق ایک ایسے نصاب تعلیم کو ترتیب دیا جائے جو کم و بیش تمام علوم پر محیط ہو، ہو سکتا ہے آپ مجھ سے سوال کریں کہ کیسے درس نظامیہ کے نصاب کو غیر مقبول اور طویل اور بوجھل کہتے ہو، آپ کا یہ سوال تقلید پر مبنی ہے۔ اس لیے اس کا جواب مولانا مناظر احسن گیلانی کی زبانی سنیں جس کو انھوں نے سوانح قاسمی میں لکھا ہے "دارالعلوم کا تعلیمی نصاب کافی بوجھل اور طویل و عریض ہوتا چلا گیا۔ اس نصاب کے ختم کرنے میں پڑھنے والوں کی عمر کا کافی حصہ صرف ہو جاتا ہے۔"[۱۹]

اس لیے میں نے نصاب تعلیم کے تین ادوار اور مرحلے بنایا ہے جو انشاء اللہ طالب علموں کی زندگی کو علمی اور عملی بنانے میں بہت معاون ثابت ہوگا۔

دور اول (مکتبی دور)

اس دور کو آپ مکتبی دور کہہ سکتے ہیں۔ اس میں طالب علم کو ہر اس علم و فن پر مشتمل کتب کو پڑھا دینا چاہیے جو اس کی زندگی کو عملی بنا دیں، اور میدان علم و فن کے ابتدائی مرحلہ سے حسن و خوبی اپنی زندگی کی گاڑی نکال لے، کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہ کرے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مکتبی دور آٹھ سالوں پر محیط ہو، درجہ ذیل میں اجتماعی لحاظ سے نصاب اول تا ہشتم دیئے جا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ریاضی میں بنیادی حقائق - "Basic Addition" اور الجبرا اور جیامیٹری کی مشق کرائی جائے، اور اردو جو ہماری مادری زبان ہے یا کسی صوبہ میں جو اس کی مادری زبان ہو پوری شرح بسط سے پڑھائی جائے تاکہ طالب علم تحریر و تقریر اور خطابت اور اردو گرامر میں مہارت حاصل کرے۔ اسی طرح ہندی بھی پڑھائی جائے تاکہ سرکاری مراسلات میں کسی کمی کا احساس نہ کرے۔

ابتدا میں جغرافیہ، سائنس، انگریزی Elementary طور پر پڑھا دی جائے۔ لیکن چہارم تا ہشتم اس کی تعلیم اور بہتر کر دی جائے۔

اور تاریخ ہند اور تاریخ اسلام اور بقدر ضرورت Social Science دستور ہند نصاب میں شامل کیے جائیں۔ اور ششم تا ہشتم عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جائیں تاکہ اگر طالب علم مزید آگے پڑھنا چاہے تو آسانی ہو اور اگر مکتب کی تعلیم لے کر چھوڑ دے تب بھی اس کو قرآن مجید پڑھنے میں کچھ حلاوت اور عربی کی مہک ملے۔ اور اسلامیات اور دینیات پر مشتمل کچھ معنی خیز کتابیں نصاب میں داخل کی جائیں۔

اب اس مکتبی دور کو مکمل کر لینے کے بعد عربی دور شروع ہوگا۔

ملین اس دور میں مکتب کی فن کی کچھ کتابیں بھی ہوں گی، لیکن اس دور یں ہماری پوری کوشش ہوگی کہ دنیاوی اور دینی علوم میں افتراق کی بجائے امتزاج و اشتمال کی صورت باقی رہے۔ تاکہ طالب علم افتراق و انتشار کی گوناگوں پیچیدگیوں سے محفوظ رہے اور بلا کسی تفریق کے وہ علم دنیا و دین کا حصول کرے۔

لیکن ہم یہاں عربی دور کو دو حصوں میں تقسیم کریں گے تاکہ طالب علم کسی ایک streams میں اپنے آپ کو ممتاز کرلے۔

عربی کا ابتدائی دور

اس دور میں طالب علم کو وہ نصاب پڑھائے جائیں جو عربی زبان و ادب میں معاون و ممد ثابت ہوں جیسے نحو و صرف وغیرہ۔ لیکن اس دور میں بھی انگریزی ایک مستقل streams کی حیثیت سے رہے گی اور تعلیم نصاب میں جدید انگریزی اور عربی ضرور شامل کیے جائیں۔ تاکہ آج کل کی روزمرہ زبان کو سمجھ لے اور اپنی بات لوگوں کے سامنے بیان کر دے۔

اس دور کے چار سال میں سائنسی علوم کی اصطلاحات انگریزی زبان میں مکمل طور سے پڑھا دیئے جائیں اور جغرافیہ اور تاریخ کا نصاب ہندوستانی پیمانہ کے بجائے اب عالمی اور اسلامی پیمانہ پر دیئے جائیں اور عربی کا اردو میں اور اردو کا عربی میں ترجمہ کرایا جائے اور عربی کی ابتدائی کتابیں شامل کی جائیں۔ عربی کے ابتدائی دور چار سال کے بعد آخری چار سال میں طالب علم کو قرآن مجید کا پورا ترجمہ اور قرآن مجید سے مستنبط فقہ کی کوئی ایک کتاب اور قرآن مجید کے نزول اور انبیاء کرام کی زندگی کے لحاظ سے جغرافیہ کی تعلیم دی جائے تاکہ طالب علم کو قرآن کا جغرافیائی علم ہو جائے اور قرآن مجید کے لحاظ سے کچھ علم فرائض اور ایک اچھا مجموعہ حدیث بھی پڑھا دیا جائے۔

اور اس دور میں عربی ادب کی اچھے قدیم و جدید مصنفین کی کتابیں پڑھائی جائیں اور اردو زبان میں ترجمہ و تشریح کرنے کی بجائے عربی اور انگلش میں کرائے جائیں اور بول چال بھی اب عربی اور انگلش زبان میں کی جائے اور عربی کا Translation انگریزی میں اور انگریزی کا عربی میں کیا جائے، اور کتب سماوی کی تعلیم بھی دے دی جائے اور تکنیکی اور حرفتی تربیت بھی کسی قدر کرائی جائے۔

اب عالمیت کا دور پورا کرنے کے بعد طالب علم اگر مدرسہ چھوڑنا چاہے تو اس کو اہل مدرسہ عالم کی سند دے سکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے معیار تعلیم میں کہیں سے جھول نہ ہونے پائے، نہیں تو پھر مدرسہ میں اینٹ ہی دکھائی دے گی اور روح پرواز کر جائیگی۔

معیار تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ اخراجات کی پرواہ کیے بغیر اچھے اور ماہر اساتذہ کا تقرر کیا جائے اور ان پر نصاب تعلیم کے علاوہ کسی قسم کی پابندی نہیں کی جانی چاہیئے اور طالب علم کے لیے تعلیم اور اس کے مطالعہ کا خاطر خواہ انتظام کیا جانا چاہیئے۔ اس دور کو پورا کرنے کے بعد ایک علمی، حرفتی و صنعتی تربیتی مرحلہ اور ہوتا ہے جس کو ہم دور فضیلت کہتے ہیں گویا کہ مدرستی پیمانہ پر اس کو آپ Ph.D کہہ لیجیے۔ یہ تحقیق ایسی کتاب کے متعلق ہوگی جس کو صحیفۂ ہدایت کہتے ہیں اور جو علوم و فنون کا سرچشمہ ہے اور تمام علوم اس کے زیر سایہ تربیت پا رہے ہیں۔

دور فضیلت

اس دور میں انگریزی اب بھی ایک مستقل زبان کی حیثیت سے رہے گی لیکن اب اور دوسرے سائنسی علوم پڑھائے نہیں جائیں گے۔ اس دور میں تمام تر توجیہات کا مرکز قرآن مجید رہے گا اور اس کے ساتھ کچھ عربی ادب کی معیاری کتابیں بھی پڑھائی جائیں۔

اور قرآن مجید سے اخذ و استنباط کر کے بہت سی کتابیں پڑھائی جائیں جیسے قرآن مجید کے مضامین کے لحاظ سے کچھ مجموعۂ حدیث، مجموعۂ فقہ، قرآن مجید کے اصول و مبادی وغیرہ تاکہ طالب علم قرآن کا علم لے کر اہل دنیا کے سامنے لوٹے لیکن یہ بات ذہن میں رکھیں کہ تفسیر کی کوئی کتاب داخل نصاب نہ ہو بلکہ قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن کریم سے کریں۔ اس لیے کہ وہ انسانوں کی دراندازیوں سے پاک ہے، اور یہ بات اس کی شان کے خلاف ہے کہ کسی انسانی تحریر کو قرآن میں شامل کیا جائے۔ اور اس کو فہم قرآن کا ذریعہ سمجھا جائے بلکہ جو اصول و مبادی پڑھائی جائیں ضروری ہے کہ اس کا

استخراج ومصدر قرآن مجید ہو۔

لیکن آپ یہاں مجھ سے ایک سوال کریں گے کہ جتنی اسلامی کتابیں لکھی گئی ہیں اور قرآن کے جو اصول ومبادی تحریر کیے گئے ہیں وہ تمام کے تمام تو قرآنی طرزِ فکر پر مشتمل ہیں ـــــ آپ کا یہ سوال بالکل درست اور صائب ہے لیکن اگر آپ ان کتابوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں یکسر غیر قرآنی ہیں اور اس کی آیتوں کو سیاق وسباق کے تناظر میں دیکھا نہیں گیا۔

اس دور میں بھی طلبہ کو تکنیکی اور حرفتی اور صنعتی تربیت سکھائی جائے تاکہ طالبِ علم عام اور آزاد ملازمتوں میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار نہ سمجھے بلکہ مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد آزادانہ طور پر جہاں چاہے کام کر سکے، اور ڈپلوما کی ڈگری بھی دے دی جائے۔

اس طرح سے جب طالبِ علم سرکاری لحاظ سے نہ سہی پرائیوٹ لحاظ سے اپنے آپ کو کامیاب پائے گا تو ایک بلند حوصلہ، بلند مذاق سلیم اور زندہ دل انسان بن سکتا ہے۔

اور مدرسہ کی غرض وغایت بھی یہی ہے کہ اس کے چمن کی ہر پنکھڑی مکمل پھول بن جائے اور جس کی خوشبو سے دوسرے پھولوں کو رشک آئے۔ اور وہ بھی اپنی بہتر تہذیب وتربیت پر رشک کرے۔

اور طلبہ کے اندر لیاقت، دینی مدارس میں ترمیم نصاب اور اس کا معیارِ تعلیم اسی وقت بلند ہو سکتا ہے جب ہم اپنے اندر سے مسلکی ومذہبی رسہ کشی نکال دیں گے اور طلبہ اور تمام علماء کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کریں گے۔ اور طلبہ کی بہترین ذہن سازی کے لیے ضروری ہے کہ مسلکی کتابوں کو پڑھانے کے بجائے قرآنی کتابیں پڑھائی جائیں ـــــ میں یہ نہیں کہتا کہ مسلکی تعلیم بالکل نہیں ہونی چاہیے، پڑھانی چاہیے مگر کم، بس اتنی کہ انھیں اپنے اسلاف کے باب میں کچھ معلومات ہو جائے۔ ایسی صورت میں مسلکی طالب علم کے بجائے قرآنی طالبِ علم ہوں گے۔ علوم جدیدہ کے ماہر ہوں گے۔ قرآن ایک ہے اس لیے ایک پلیٹ فارم پر بدرجہ اولیٰ آجائیں گے۔

وما توفیقی الا باللہ

حواشی

۱۔ ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات، مولانا حکیم سید عبدالحی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) ص ۱۲۔ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

۲۔ فارسی بمعنی دنیوی علوم، ماضی میں مدرسے کی نصابی روایت پروفیسر سید محمد سلیم ص ۱۲۳ مرتب تعلم اسلامی تناظر میں، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد جنوری وجون ۱۹۸۷ء

۳۔ ہندوستان کا نصاب درس مذکورہ بالا ص ۱۳

۴۔ منتخب التواریخ جلد سوم شیخ عبدالقادر بحوالہ ہندوستان نصابِ درس ص ۱۶

۵۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، مولانا ابو الحسنات رفیق دارالمصنفین ص ۹۶ مطبوعہ معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۷۱ء/۱۲۸۱ھ

۶۔ آئین اکبری، علامہ ابوالفضل (اردو ترجمہ) جلد اول ص ۱۹۰ ـ ۱۹۱ دارالطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد (دکن)

۷۔ اسلامی کتب خانے ص ۲۱۳ ـــ ۲۱۲ الحاج محمد زبیر اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ مطبوعہ ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۱۹۶۱ء

۸۔ اصول تعلیم اور عمل تعلیم، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن سیفی پریمی ص ۹ ترقی اردو بیورو نئی دہلی

۹۔ آئین اکبری علامہ ابوالفضل (اردو ترجمہ) جلد اول ص ۲۰۰ مطبوعہ مذکورہ

۱۰۔ ہندوستانی مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت، مولانا مناظر احسن گیلانی جلد دوم ص ۴۰۰ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۸۴ء

۱۱۔ ہندوستان کا نصاب درس مذکورہ ص ۱۹

۱۲۔ ماخوذ از ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں مذکورہ با

باقی صفحہ ۴۰

مولانا عبدالسبحان خان

دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں ترمیم ضروری کیوں ؟

جس طرح دینی تعلیم اساس ہے معرفت خداوندی کے لیے اسی طرح عصری تعلیم بھی لازم ہے خدا کی کائنات کی معرفت کے لیے. یہ کیسے ممکن تھا کہ باری تعالیٰ اپنی معرفت کا حکم تو دے اپنے بندوں کے لیے لیکن جب وسیع کائنات پر اس حضرت انسان کو بحیثیت اپنے نائب و خلیفہ کے تصرف کا اختیار دیا ہے اس کائنات کو بغیر سمجھائے اس کے حوالہ کر دیا جاوے.

علم دین کی شاہانہ حیثیت نظر ضرورت تھی ایک ایسے علم کی جو خادمانہ انداز سے اس کی خدمت کرے، بغیر خادم کے آقا کا تصور نامکمل رہتا ہے. بغیر نوکر کے مالک کی شان ادھوری رہتی ہے بعینہٖ یہی مشابہت و مماثلت ہے علم دین اور علم دنیا میں۔

ملائکہ کو اللہ تعالےٰ نے صرف اپنی معرفت کے علم سے نوازا تھا اور حضرت آدمؑ کو اپنی معرفت کے علاوہ دنیوی رموز سے بھی آشنا کرایا.

اسلامی آئیڈیولوجی کی رو سے خلاق کائنات نے انسان کو خلعت وجود عطا کرنے کے بعد جس چیز سے نوازا وہ علم کی نعمت تھی اور یہ ایسے علم کی دولت تھی جس سے فرشتے بھی تہی دامن تھے یہ علم بغیر کسی قیود اور خانوں کی تقسیم کے مطلقاً علم تھا جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے. وعلم آدم الاسماء کلها (سورہ بقرہ) اور اسی نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے.

مسلمانوں کے دور عروج میں دمشق، قرطبہ، بغداد، جہاں دینی علوم کے اہم مرکز تھے. وہاں سائنس اور عصری علوم کے بھی یہ مقامات پورے طور پر علمبردار تھے. جابر ابن حیان زکریا رازی، بوعلی سینا ابوالقاسم زہراوی. البرونی. ابن رشد وغیرہ و دیگر بہت سی عظیم المرتبت شخصیتیں اس دور کی دین ہیں.

خدانخواستہ یہ حضرات نہ ملحد تھے نہ بد دین. حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام سے قبل معلوم دنیا میں سائنس کا تصور ہی ناپید تھا دیگر مذاہب کی پیروکار اقوام اپنی مذہبی عقیدت کے پیش نظر مظاہر کائنات کی بہت سی چیزوں کو ناقابل تسخیر سمجھتی تھیں. بلکہ ان کے بارے میں غور و خوض کرنا بھی ان کی شان میں بے ادبی تھی وہ چیزیں ان کی نظر میں صرف پوجا اور عبادت کے ہی لائق تھیں مثلاً پانی کے

صدر ادارہ اسلامیات نالاگڑھ، ضلع سولن (ہماچل پردیش)

بڑے بڑے سمندر، آگ کے آتش کدے، پہاڑ، درخت وغیرہ وغیرہ۔
لیکن اسلام نے جب لفظ اللہ اکبر کی تعلیم و تلقین کر کے اللہ اکبر کے فلسفہ کو دنیا کے سامنے رکھا تو ان تمام مظاہر کائنات کی عظمت و ہیبت کو تہہ و بالا کر دیا۔ اللہ اکبر کے عقیدہ نے انسان کو حوصلہ بخشا اور ہمت و جرأت دی کہ وہ سمندر کے سینے کو چیر کر اس سے بجلی پیدا کرے، پہاڑوں کو شق کر کے اس کی قیمتی معدنیات کو روئے زمین میں بکھیر دے درختوں کو اکھاڑ کر سر بسجود کر دے۔

کائنات کی جاندار اور بے جان قوتوں کی تسخیر ان سے براہ راست کشتی لڑ کر نہیں کی جا سکتی۔ یہ فریضہ صرف کائنات کی پوشیدہ قوتوں سے واقف ہو کر ہی انجام دیا جا سکتا ہے اور اسی کا نام علم طبیعی ہے اور نیچرل سائنس ہے اور ہم جانتے ہیں جملہ علوم طبیعہ کا اصل الاصول مطالعہ فطرت ہے جس کے لیے قرآن اپنے متبعین کو ایجابی طور پر مامور کرتا ہے۔ آئیے ان آیات کریمہ پر غور کریں جن میں کائناتی و عصری علوم کی رغبت قرآن کریم میں غور و فکر کی دعوت دے کر کی ہے افلم ینظروا الی السماء کیا انھوں نے آسمان کی طرف نہیں دیکھا ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس الی آخرہ بے شک عقلمندوں کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں رات دن کے تغیر و تبدل میں ان کشتیوں میں جو نفع کا سامان لیے ہوئے سمندر میں چلتی ہیں بیشمار نشانیاں ہیں ایک دوسرے مقام پر عاقلین کی پہچان یہ بتائی گئی ہے ویتفکرون فی خلق السموات والارض متفکرین وہ لوگ ہیں جو پوری کائنات کی تخلیق کے سلسلے میں اپنی قوت فکر کو لگائے ہوئے رکھتے ہیں۔

اسلام کا عقلیت پسندانہ مزاج

اسلام کے اقدار حیات میں خیر اعلیٰ حکمت ہی کو قرار دیا ہے ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا (بقرہ) اور جس کو حکمت ملی اس کو بہت بڑی نعمت ملی۔ قرآن کا تقریباً آٹھواں حصہ (یعنی ۷۵۶) آیات نظام کائنات سے متعلق ہیں بحوالہ القرآن والعلم العصر یہ مصنفہ شیخ طنطاوی جوہری رحمۃ اللہ علیہ مطبوعہ مصر ۱۹۵۱ء صہ ۴۴ قرآن کی آفاقیت و عمیق مطالعہ سے متاثر ہو کر حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (۱۰۵۸ء ۱۱۱۱ء) وہ رائے جو انھوں نے دنیوی علوم سے متعلق دی تھی وہ لکھتے ہیں۔ فرض کفایہ وہ علم ہے جس کے بغیر دنیاوی ضرورتیں انجام نہ پاسکتی ہوں مثلاً علم طب کیونکہ بقائے زندگی کے لیے یہ ضروری چیز ہے یا علم حساب ذات کیونکہ معاملات میں اور تقسیم ترکہ میں اس کی ضرورت پڑتی ہے (بحوالہ — الغزالی۔ علامہ شبلی نعمانی معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۸۶-۱۸۵) اس کے بعد لکھتے ہیں ہمارے اس قول پر کہ طب، و حساب فرض کفایہ ہیں۔ تعجب نہ کرنا چاہیے بلکہ صنعتی علوم بھی فرض کفایہ ہیں (بحوالہ المنقذ من الضلال الغزالی صہ ماخوذ۔ مزید لکھتے ہیں۔ بہت سے ایسے شہر ہیں جہاں صرف یہودی یا عیسائی طبیب ہیں اور ان کی شہادت فقہ کے طبی مسائل میں معتبر نہیں باوجود اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ طب کو کوئی نہیں سیکھتا اور فقہ پر گرے پڑتے ہیں بحوالہ الغزالی علامہ شبلی نعمانی معارف پریس اعظم گڑھ سنہ ۱۹۵۶ صہ ۱۸۵) حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ تاثرات اس بات کے لیے حجت ہیں کہ روح قرآن منافی یا مانع نہیں ہے۔ دیگر علوم عصریہ کے حصول کے لیے بلکہ ایجابی طور پر قرآن ترغیب دے رہا ہے اپنے پیروکاروں کے لیے کہ وہ دیگر علوم کو اپنا سرمایہ حیات بنائیں۔ نیز ایک مشہور حدیث کی روشنی میں کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن اینما وجد بھا فھو احق بھا (حدیث ترمذی، کلمہ حکمت مومن کی متاع گمشدہ ہے جہاں سے ملے وہ اسے لینے کا زیادہ حقدار ہے۔

موجودہ درس نظامی میں ترمیم ناگزیر؟

اب تک کی گفتگو سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ہمارے دینی مدارس میں جو نصاب پڑھایا جا رہا ہے اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ اسی نصاب تعلیم نے بڑے بڑے ذی استعداد جید، مفکر، مدبر، مفسرین و محدثین و علماء کرام پیدا کیے جنھوں نے اپنے وقت میں بڑا علمی انقلاب برپا کیا۔ اور آج مسلمانوں میں علم کی نسبت سے جو شرح

باقی صفحہ ۱۰۹ پر

مظفر حسین غزالی

دینی مدارس کے

اساتذہ اور فن تعلیم و تربیت

ہر کام کے لیے کچھ بنیادی عوامل اور اسباب کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً کھانا کھانا ہے تو کھانے کی اشیاء فراہم کرنی ہوں گی۔ اگر کہیں جانا ہے تو سواری کا انتظام کرنا ہو گا یا سواری کے استعمال کے لیے رقم خرچ کرنی ہوگی۔ کچھ لکھنا ہے تو کاغذ قلم فراہم کرنے کے علاوہ کیا لکھنا ہے یہ بھی سوچنا ہو گا اگر طبیب بننا ہے تو طب کا علم حاصل کرنا ہو گا اور اسے فن کی حیثیت سے سیکھنا ہو گا۔ اگر کسی مشین کا استعمال کرنا ہے تو اس کو استعمال کرنے کی تربیت حاصل کرنی ہو گی۔ الغرض دنیا کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے عوامل و اسباب کی فراہمی اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک معلم بننے کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہ ہو جبکہ تعلیمی نظام میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اس کی ذمہ داری نوخیز نسل تک علمی ورثے کو منتقل کرنا ہوتی ہے۔ یہ بذات خود ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ اس کی ادائیگی کے لیے یقیناً نوخیز نسل کے ذہن، اس کی دلچسپیوں اور پسند نہ پسند سے واقفیت استاد کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر استاد سیکھنے والوں کو وہ کچھ نہیں سکھا سکتا جو وہ سکھانا چاہتا ہے۔ ممکن ہے ایک وقت استاد علمی گفتگو کرنا چاہتا ہو لیکن اس وقت طلبا کھیلنا پسند کرتے ہوں ایسی صورت میں استاد کی باتوں میں طلبا دلچسپی نہیں لیں گے، اب ممکن ہے استاد کو طلباء پر غصہ آئے اور وہ ان کو سزا دے دے۔ جب کہ اس میں غلطی استاد ہی کی تھی۔ کیونکہ وہ نہیں سمجھ سکا کہ اس وقت طلباء کیا چاہتے ہیں۔ اگر وہ اس وقت طلباء کی مرضی کو سمجھ کر کچھ ایسا سکھائے جو ان کی مرضی کے مطابق ہو تو شاید وہ زیادہ سیکھ سکتے ہیں۔

بزرگوں نے بچوں کو پڑھانے کے لیے ایک لفظ "حکمت" کا استعمال کیا ہے کہ بچوں کو حکمت کے ساتھ پڑھایا جائے۔ اس لفظ کے معنی وہی ہیں جو انگریزی کے لفظ TECHNIC کے ہیں۔ اسی کو ماہرین تعلیم نے "طریقہ" سے موسوم کیا ہے پھر اس میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ کس عمر اور کس سطح کے طلبا کو پڑھانے کے لیے کس طریقے کو اختیار کیا جائے۔ کیونکہ ہر عمر اور ہر سطح کے بچوں کی دلچسپیاں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان کے ذہنوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ پھر ان کی لفظیات محدود، وسیع یا وسیع تر ہو سکتی ہے۔ استاد کو سبق شروع کرنے سے پہلے یہ اندازہ ضرور ہونا چاہیے کہ وہ جن کو پڑھانے جا رہا ہے ان کا ذخیرہ الفاظ

F-161 جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی

اور ذہنی سطح کیا ہے۔ جب یہ اندازہ ہو جائے گا تو اتنے یہ طے کرنے میں دیر نہیں لگے گی کہ سبق کے کن مباحث کو کس طرح رکھنا چاہیے تاکہ طلباً کی سبق میں دلچسپی بنی رہے۔ پھر سبق کو شروع کرنے سے پہلے اس کی تمہید کس طرح باندھنی چاہیے اس کا بھی استاد کو فیصلہ کرنا آسان ہوگا
ایک معروف طریقہ یہ ہے کہ جانی پہچانی چیزوں کی مدد سے انجانی چیزوں کو سکھایا جائے۔ مثلاً ایک بچہ کتے کو جانتا ہے اسے گیدڑ کے بارے میں بتانا ہے تو کتے کی مدد سے بتایا جاسکتا ہے کہ گیدڑ اس سے کتنا مختلف ہوتا ہے۔

عصری درسگاہوں میں اپنائے جانیوالے تدریسی طریقے

عصری درس گاہوں میں تدریس کے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان میں اس بات پر زور ہوتا ہے کہ طلباً تجربات و مشاہدات اور مطالعہ سے خود واقعات و حقائق سے دوچار ہوں اور پھر ان کا تجزیہ کرکے کسی خاص نتیجے پر پہنچیں۔ اس کے لیے متعدد طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان میں سے پہلا ہے استقرائی طریقہ تدریس۔ یہ وہی طریقہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی طلباً متعدد واقعات، حقائق یا مثالوں کا تجزیہ کرکے براہ راست کسی نتیجہ پر پہنچتے اور کوئی اصول، ضابطہ یا کلیہ اخذ کرتے ہیں اس طریقہ میں طلبہ سبق میں عملی دلچسپی لیتے ہیں اور ہمہ تن مصروف رہتے ہیں اس کی وجہ سے ان میں غور و فکر استدلال اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے خود اعتمادی بڑھتی ہے اور تحقیق و جستجو کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ البتہ استاد کی نگرانی ضروری ہوتی ہے کیونکہ صحیح نگرانی اور رہنمائی نہ ہونے کی صورت میں بسا اوقات طلباً چند خصوصی واقعات یا مثالوں سے کوئی کلیہ بنا لیتے ہیں حالانکہ دوسری بہت سی مثالوں پر اس کا انطباق نہیں ہوتا۔

استخراجی طریقہ تدریس یہ طریقہ استقرائی کی ضد ہے اس میں معلم خود ہی طلبہ کو کوئی عام اصول، ضابطہ یا کلیہ بتا دیتا ہے اور مخصوص مثالوں سے اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔ اس طریقے میں طالب علم کی حیثیت مجہول سامع کی ہوتی ہے اس لیے وہ سبق میں عملی دلچسپی نہیں لے پاتا البتہ اس میں استاد کا کام آسان ہوتا ہے کہ وہ طلبہ کو اپنے تجربہ اور علم کی بنیاد پر کوئی قاعدہ یا اصول بتا دیتا ہے۔ اور طلبا اسے یاد کرکے متعدد مسائل اس کی مدد سے حل کرتے رہتے ہیں، یہ طریقہ پختہ ذہن اور بڑی عمر کے طلبہ کے لیے مفید ہے اس میں کم وقت میں زیادہ معلومات بہم پہنچائی جاسکتی ہے۔ تحقیقاتی طریقے میں طلباً کو خود تجربہ و مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا ہے اس میں طلبا عملی دلچسپی لیتے ہیں اس طرح جو علم انھیں حاصل ہوتا ہے اسے وہ زندگی بھر نہیں بھولتے۔ وہ علم مستحکم ہوتا ہے اور انھیں اس پر بھروسا بھی ہوتا ہے اس سے طلبا میں جستجو اور تحقیق کا ذوق پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان میں مطالعہ مشاہدے اور تجربے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

کنڈر گارٹن طریقہ (بچوں کا باغ) اور مانٹیسوری طریقہ بہت چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مفید ہے۔ ان دونوں طریقوں میں کھیل کے ذریعے تعلیم پر زور ہوتا ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ بچوں کی مختلف، ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے مختلف دلچسپ کھیلوں میں بچوں کو مصروف کیا جائے اس طریقے سے رسمی تعلیم کے لیے بچہ تیار ہوجاتا ہے اور اس کا علم اس سطح پر آجاتا ہے کہ اب وہ رسمی تعلیم کو آسانی سے حاصل کرسکتا ہے کیونکہ اس میں اسکول کے ماحول کو گھر جیسا بنایا جاتا ہے۔ اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ گھر کے آزاد اور مانوس ماحول میں بچے کی جو تربیت ہوسکتی ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہوسکتی۔

اس کے علاوہ منصوبی طریقہ (پروجیکٹ میتھڈ) اور ڈالٹن پلان کا استعمال بھی عصری درس گاہوں میں کیا جاتا ہے۔ منصوبی طریقے میں طلبہ بہت دلچسپی لیتے ہیں کیونکہ وہ خود اپنی پسند سے منصوبے کا انتخاب کرتے ہیں، اس میں عملی کام زیادہ ہوتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے فطری ماحول تیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً بیماریوں کی روک تھام کے لیے نالیاں صاف کرنا یا معذوروں کی مدد کرنے کے لیے کیمپ لگانا وغیرہ۔ ڈالٹن پلان اس سے مختلف ہے اس میں اساتذہ کو سال بھر کا کام مضمون وار اس انداز سے ترتیب دینا پڑتا ہے کہ ہر مضمون کا پھیلاؤ اور اس ضمن میں انھیں کیا کرنا ہے طلبہ کو اس کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ سال بھر کے کام کو ایک ایک ماہ کی کھیپوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے عمومی قاعدے بتا کر طلبا سے مقررہ مدت میں کام کی تکمیل کا معاہدہ لیا

ملتا ہے ۔دوران میقات کام میں زحمتوں اور مشکلات کو دور کرنے میں اجتماعی وانفرادی امداد دی جاتی ہے اس سے طلبا میں احساس ذمہ داری اور کام کو مکمل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے دوسری طرف طلبا پوری طرح استاد پر منحصر نہ رہ کر خود ہی کتابوں، چارٹوں، پوسٹروں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی کی بنیاد پر کالج اور یونیورسٹیوں میں سمیسٹر (SEMESTER SYSTEM) نظام قائم ہوا۔ عصری درسگاہوں میں اس کے علاوہ بھی کئی اور طریقوں کو اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً بات چیت کا طریقہ، سوال وجواب کا طریقہ، اخباری یا اطلاعی طریقہ (اسے بیانیہ طریقے کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) اور لکچر یا خطابت کا طریقہ وغیرہ۔ اب سمعی وبصری اعانات کا استعمال بھی شروع ہوگیا ہے۔ اس جدید ٹکنالوجی کو صرف تعلیم کے عمل کو دلچسپ بنانے اور اس میں طلبا کا شوق پیدا کرنے کے لیے ہی استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے تعلیم کو زیادہ مفید اور بارآور بنانے کے ساتھ ساتھ جو مقاصد پیش نظر ہیں ان کا حصول بھی آسان ہوتا ہے۔

عصری اور دینی مدارس کا طریقۂ تدریس:

عصری درس گاہوں میں تدریس کے جو طریقے رائج ہیں ان کا ایک مجمل تعارف اوپر پیش کرچکا ہوں البتہ دینی مدارس اور عصری درس گاہوں کے طریقۂ تدریس میں کیا فرق ہے اس کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ میرے ناقص مطالعہ اور مشاہدے میں جو باتیں آئی ہیں ان کی بنیاد پر میرا یہ احساس ہے کہ دینی مدارس میں استخراجی اور بیانیہ طریقہ کو اختیار کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے میں اہل مدارس کی دو مجبوریاں ہیں۔ اول یہ کہ ان کے نصاب میں موضوعات (CONTENT) کی جگہ کتابیں ہیں اس لیے استاد کا پورا زور کتابوں کی عبارت کو حل کرنے اور ان کی تشریح کرنے پر صرف ہوتا ہے۔ اگر موضوعات طے ہوتے تو استاد کے لیے یہ آسان ہوتا کہ وہ اس موضوع سے متعلق مختلف کتابوں سے استفادہ کرکے لکچر دیتا جیسا کہ قرون اولیٰ کے اساتذہ کے یہاں املا کا طریقہ رائج تھا جس معنی میں آج لکچر لفظ کا استعمال ہوتا ہے اسی معنی میں املا لفظ کا استعمال ہوتا تھا۔ اسی لیے قدیم زمانے کے طلبا کو مباحثہ کرنے اور اساتذہ کے ساتھ سوال وجواب کرنے کا پورا موقع حاصل تھا۔ پھر کتابوں کو مقرر کرنے سے ایک چیز محسوس ہوتی ہے کہ جس عمر اور سطح کے طلبا کو جتنے وقت میں یہ کتابیں پڑھائی جارہی ہیں اس اعتبار سے یہ کتابیں زیادہ ہیں شاید اسی لیے اساتذہ پورے سال ان کتابوں کو ختم کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

دوسری مجبوری یہ ہے کہ استاد نے جو کچھ پڑھا ہے اور جس انداز سے پڑھا ہے۔ اسی طریقے سے اپنی سوچ، اپنے تجربے اور اپنے مشاہدے کی بنیاد پر حاصل کیے ہوئے علم کو کم سے کم وقت میں طلبا تک پہنچا دینا چاہتا ہے۔ اس لیے اس کا انداز روایتی ہوتا ہے۔ مدارس میں کئی استاد ایسے بھی ہوتے ہیں جو فی الواقع استاد بننا ہی نہیں چاہتے تھے اور ان کے اندر معلم کے اوصاف بھی موجود نہیں ہیں لیکن حالات کی مجبوری اور کوئی دوسرا کام نہ ملنے کی وجہ سے انھوں نے یہ پیشہ اختیار کرلیا ہے۔ ایسے اساتذہ سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کرنا کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہوگی۔ وہ نہ تعلیم میں طلبا کی دلچسپی پیدا کرسکتے ہیں اور نہ ہی تدریس کے نئے طریقوں کو اختیار کرکے طلبا میں علم کو منتقل کرسکتے ہیں۔

وہ جدید طریقے جو دینی تعلیم کے لیے اختیار کیے جاسکتے ہیں

دینی تعلیم کے مختلف موضوعات کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً عقاید اور فقہ کے لیے استقرائی طریقہ اپنایا جاسکتا ہے۔ یعنی مختلف مثالیں طلبا کے سامنے اس ترتیب سے رکھی جائیں کہ عقاید اور فقہ کے اصول طلبا از خود بنا سکیں۔ فقہ کے لیے منصوبہ طریقہ بھی مفید ہوسکتا ہے کہ استاد کچھ ایسے مسائل طلبا کے سامنے رکھے کہ جن کے بارے میں طلبا واقف نہ ہوں۔ پھر وہ ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے مطالعہ، مشاہدہ اور تحقیق کے بعد کچھ نتائج اخذ کرکے استاد کے سامنے پیش کریں۔ پھر استاد ان کی مناسب رہنمائی کرکے حقیقت تک پہنچنے میں مدد کرسکتا ہے۔ حدیث کے لیے سوال وجواب اور بات چیت کا طریقہ بھی مناسب ہوسکتا ہے۔ حضورؐ اسی اسلوب میں اپنی حکیمانہ تعلیمات کو پیش فرمایا کرتے تھے۔ کہ سامع

اور مخاطب پورے ذوق و شوق اور رغبت کے ساتھ اپنے کان اور دل آپؐ کی آواز کی طرف لگا دیتے۔ کبھی آپؐ سوال فرماتے کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ کیا سب سے بڑے بخیل سے تم واقف ہو؟ کبھی آپؐ فرماتے ہلاک ہوگیا تباہ ہوگیا، صحابۂ کرام سوال پر مجبور ہو جاتے کہ کون برباد ہوا؟ کس پر تباہی آئی؟ تب آپؐ ان کے سوال اور اشتیاق کے بعد اپنی بات کی تکمیل فرماتے، جو مبلغ اور داعی روانہ کیے جاتے ان کو تاکید کی جاتی کہ دیکھو آسان باتیں سکھاؤ مشکلات میں نہ ڈالو، قریب کرنے والی تعلیم دو، دور لے جانے والی تعلیم سے احتراز کرو وغیرہ قرآن کی بہت سی آیتوں کا اسلوب بھی ایسا ہے کہ ذہن متکلم کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس سے بھی تدریس طریقہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

صرف و نحو، زبان، ریاضی اور بلاغت وغیرہ کے لیے استخراجی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، لیکن تفسیر، اصول تفسیر، فلسفہ اور تاریخ کے لیے لکچر کا طریقہ ہی بہتر ہے۔ کیونکہ اس طریقہ سے استاد زیادہ مفید باتیں کم وقت میں بتا سکتا ہے۔ اور طلبہ کی دلچسپی بھی قائم رہ سکتی ہے تحقیقاتی اور بیانیہ طریقے کو بھی ضرورت کے مطابق مختلف جگہ اپنایا جا سکتا ہے۔ البتہ ڈالٹن پلان کی مدد سے مدارس کا تدریسی نظام بہتر ہو سکتا ہے۔ کنڈر گارٹن اور مانٹیسوری طریقوں کی شاید اعلیٰ تعلیم کے مدارس کو ضرورت نہیں ہے البتہ کچھ مخصوص مضامین کے لیے مخصوص جماعتوں میں سمعی و بصری اعانات کو بھی استعمال کرنا مفید ہوگا۔

سلف صالح اور ائمہ دین نے درس و تدریس کو مفید اور موثر بنانے کے طریقے خود بھی اختیار کیے اور اپنے متبعین کو بھی ایسے رہنما اصول عطا کیے۔ بعض بزرگان دین کے حالات پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ متعلم میں اکتاہٹ اور کسلمندی طاری نہ ہونے دیتے تھے۔ اور سبق بوجھل یا بے جان نہ بن جائے اس کا بہت خیال رکھتے تھے بعض حضرات استاد بننے کی خواہش میں ان بزرگوں کی مجلس سالہا سال تک پڑھنے اور تربیت کرنے کا ڈھنگ سیکھتے تھے۔ اسی لیے تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بعض اساتذہ کے حلقۂ درس میں ہزاروں طالب علم بے اختیار کھنچے چلے آتے تھے۔

درس وفا اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

معلمین کی تربیت کی ضرورت کیوں؟

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان مدارس میں جو طلبا آتے ہیں وہ سماج کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا ماحول بھی الگ ہوتا ہے۔ ان کی صلاحیت اور ذہانت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ سب کی سوچ اور سب کا یہاں آنے کا مقصد بھی مختلف ہو سکتا ہے اس کے علاوہ سب کا سیکھنے کا ذوق بھی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ کچھ ایک ہی بات کو بہت جلد سمجھ جاتے ہیں اور کچھ بہت سست رفتاری سے سیکھتے ہیں۔ اتنے متضاد افکار و اذہان اور مختلف اطوار و مزاج کے طلبا کی تعلیم ایک ہی ڈھنگ اور ایک ہی طریقہ سے کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ استاد کو پڑھاتے وقت پیچھے رہ جانے والوں کا خیال بھی رکھنا پڑے گا اور بہت تیز آگے چلنے والوں کی دلچسپی بھی بنائے رکھنی پڑے گی۔ استاد کی کامیابی اس میں نہیں ہے کہ وہ کتاب کی مشکل عبارت کو حل کرادے بلکہ اصل کامیابی تو طالب علموں کے سیکھنے کی مشکلات کا حل کرنا ہے۔

دینی مدارس میں استاد کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اسلامی نظام تعلیم میں استاد کی ذمہ داری صرف درس دینا نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری تربیت کرنا بھی ہے۔ اس لیے استاد کی شخصیت، اس کے اخلاق، کردار، عادت و اطوار، معاملات اور انداز گفتگو تک کا طلبہ پر اثر پڑتا ہے، یہی وہ چیز ہے جو اسلامی نظام تعلیم کو دوسرے نظامہائے تعلیم سے الگ کرتی ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں استاد کو مربی کی حیثیت دی گئی ہے۔ اس کی صحبت میں طلبا علم کو عمل میں لانا سیکھتے ہیں۔ اس طرح طلبا کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے اور ذہن و فکر، دل و دماغ اور جسم کی نشو و نما ہوتی ہے۔ استاد کے اعلیٰ مقام کو کسی شاعر نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی

استاد کی عظمت کا اندازہ اس حدیث سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس میں محسن انسانیت حضرت محمدؐ نے فخریہ ارشاد فرمایا ہے کہ "انما بعثت معلماً" بے شک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

اب اگر وہ شخص جس پر بڑی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اس ذمہ داری کو اٹھانے کا اہل نہ ہو تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کا کیا حشر ہوگا جو اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ یوں سمجھا جائے کہ اگر استاد کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے حلقۂ درس میں شریک طلبا کی ذہنی استعداد کیا ہے؟ ان کے سامنے سبق کی مشکلات کیا ہیں؟ وہ جو کچھ سکھانا چاہتا ہے طلبا اسے سیکھنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اس کا طلبا کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ وہ ان کی تربیت کیسے کر سکتا ہے؟ وہ ان کو کس طرح درس دے کہ ان کی اس میں دلچسپی پیدا ہو جائے؟ وہ اپنی آواز کو کہاں دھیما کرے اور کہاں زور سے بولے؟ وہ جن مباحث پر گفتگو کر رہا ہے وہ ان طلبا کے کس کام آئیں گے؟ اسے اپنے طلبا سے محبت، شفقت اور خیر خواہی کس حد تک کرنی چاہیے؟ وہ جو کچھ پڑھا رہا ہے اس کا طلبا کی عملی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ اس کی گفتگو ان کے معیار سے بلند تو نہیں ہے؟ اس کی باتیں ایسی سطحی اور غلط تو نہیں ہیں کہ طلبا انھیں استاد کی کم علمی پر محمول کریں؟ وغیرہ یہ اور اس طرح کے بہت سے سوال ہیں جن پر استاد کو اپنی بہترین کارکردگی کے لیے توجہ دینی ہوتی ہے اسی لیے آج کے زمانے میں اساتذہ کی تربیت ہر نظام تعلیم کا جز بن چکی ہے۔ تدریس کے لیے مختلف معیار کے تربیتی ادارے اور ان کے نصاب موجود ہیں۔ لیکن ہر استاد کے لیے خواہ وہ ابتدائی جماعتوں کو پڑھانے یا ابتدائی جماعتوں کو تربیت ناگزیر ہے۔

تربیت کیسے کی جائے؟

اس بات کو تو اب اہل مدارس تسلیم کرتے ہیں کہ مدارس کے معلمین کے لیے تربیت ضروری ہے لیکن ان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ مدارس کے معلمین کی تربیت کیسے کی جائے؟ اور کون ان کی تربیت کرے؟ تربیت کا خاکہ کیا ہو؟ اور اس کے لیے وسائل کی فراہمی کس طرح ہوگی وغیرہ۔ اس ضمن میں دو باتوں پر اگر اتفاق ہو جائے تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ تربیتی نظام بین المدارس ہو۔ یعنی کہ مدرسہ میں یہ پروگرام ایک ماہ یا اس سے زیادہ ضرورت کے مطابق چلایا جائے۔ اس میں اس مدرسہ کے کچھ یا سب اساتذہ کے علاوہ قریب کے مدارس کے اساتذہ تشریف لے آئیں یہ اپنی سہولت کے مطابق طے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مدرسہ کتنے اساتذہ کو ایک کیمپ میں بھیجے۔ اس کی دوسری شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ندوۃ العلما، دارالعلوم دیوبند، سبیل الرشاد بنگلور، سبیل الاسلام حیدرآباد اور اسی طرح کے دوسرے صوبوں میں کسی ایک یا دو مدارس کو تربیت معلمین کا مرکز بنا دیا جائے اور ان میں وقتاً فوقتاً کیمپ لگائے جائیں۔ ان کیمپوں میں ملک کے منتخب دینی مدارس کے بزرگ اساتذہ کو جن کی اپنے مضمون پر بہت گہری نظر ہو اور وہ فن تعلیم و تربیت سے بھی واقف ہوں انھیں تربیت کرنے کے لیے دعوت دی جائے اور کچھ شعبہ تعلیم ایسے مخلص مسلمانوں کو بلایا جائے جو مدارس سے ہمدردی بھی رکھتے ہوں اور ان مدارس کے معلمین کو نفسیات تعلیم، تاریخ تعلیم اور فلسفہ تعلیم سے واقف بھی کرا سکیں اور تدریسی مشق کے وقت ان چیزوں کو عملی طور پر دکھا بھی سکیں تاکہ تربیت کے بعد انھیں پڑھانے میں آسانی ہو۔

ان کیمپوں کے لیے وسائل کی فراہمی کی ذمہ داری یا تو ان مدارس کے سپرد ہو جن کے اساتذہ ان میں تربیت حاصل کر رہے ہوں یا پھر وہ ادارے معاونت کریں جو دینی مدارس کے معلمین کے لیے فن تعلیم و تربیت، کو ضروری سمجھتے ہیں یا پھر مخیر حضرات سے تعاون حاصل کیا جائے۔

یہاں یہ بات عرض کرنا ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تربیت یافتہ معلمین کو مدارس میں تقرر کے وقت فوقیت ملنی چاہیے اور جو حضرات کسی مدرسے میں پڑھا رہے ہیں اگر وہ تربیت حاصل کرتے ہیں تو ان کی تنخواہ میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہونا چاہیے تاکہ اس طرف اساتذہ کا رجحان ہو سکے۔ اس تھوڑی سی قربانی کے لیے اہل مدارس کو تیار ہونا پڑے گا۔ اس کے علاوہ تربیت کے وقت کی ان کو پوری تنخواہ

بھی ملنی چاہیے۔ تاکہ اساتذہ کو ان کیمپوں میں شریک ہونا آسان ہو

تربیت اساتذہ کے لیے نصاب کا خاکہ

تربیتی نظام کا مرکزی نکتہ یہ ہو کہ مستقبل کے معلمین میں ان کے نصب العین کا واضح شعور اور اس سے گہری وابستگی پیدا کرے۔ اور ان میں وہ اخلاقی کردار اور مشنری جذبہ پروان چڑھائے جو انھیں اس منصب کے تقاضے صحیح صحیح ادا کرنے کے لیے تیار کرے۔ نیز ان کے اندر مربی ہونے کا جذبہ پیدا کرے۔ اور طلبا کے ساتھ ان کے رشتے کا احیا کرے۔ تربیت معلمین کے لیے ترتیب دیا جانے والا نصاب درج ذیل نکات پر مشتمل ہو سکتا ہے۔

- اسلام میں تعلیم کی اہمیت۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں۔
- اساتذہ کا معیار اور مثالی اساتذہ
- تعلیم اور مقاصد تعلیم فلسفہ تعلیم کی اسلامی نقطہ نظر سے تشریح
- تعلیمی نفسیات، بچوں کی نفسیات۔ مختلف سطح کے طلبا کی ضرورتیں اور نفسیات۔
- تعلیمی تاریخ۔ علوم کی تاریخ۔
- دوسرے ممالک کے اساتذہ کا معیار تدریس اور طریق تدریس۔ جدید طریقہ ہائے تدریس کا تنقیدی جائزہ
- برصغیر میں توسیع علم کے سلسلے میں مسلمان اساتذہ کا کردار
- قرآن کو پڑھانے کا طریقہ
- حدیث کو پڑھانے کا طریقہ
- علم الکلام، فلسفہ، صرف و نحو، ہندسہ، ریاضی، بلاغت، زبانیں وغیرہ پڑھانے کا طریقہ
- فقہ اصول فقہ کو پڑھانے کا مطلوبہ
- تفسیر اور اصول تفسیر پڑھانے کا طریقہ
- سیاست اخلاق اور تدبیر کا علم
- امت مسلمہ کے مسائل کا شعور و آگہی تاکہ زیر تعلیم و تربیت طلبہ تک اسے منتقل کیا جا سکے۔
- تدریس کو موثر کرنے کے لیے جدید سمعی و بصری آلات کے استعمال سے واقفیت
- جدید علوم مثلاً علم سیاست، علم سائنس، علم معاشیات، علم سماجیات، طبیعی و حیاتی علوم اور عمرانیات کے پڑھانے کا طریقہ
- خارجی مطالعہ کی اہمیت، ضرورت اور مطالعہ کے لیے کتب کے منتخب کرنے کا طریقہ

یہ چند باتیں خاکے کی شکل میں بطور تجویز پیش کی گئی ہیں۔ اس کا فیصلہ کہ ان میں سے کونسی چیزیں مفید ہیں اور تربیتی نصاب میں انھیں جگہ دی جائے اہل مدارس ہی اپنی ضرورت کے تحت کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان باتوں کو سامنے رکھ کر کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ کچھ نئے نکات مرتب کیے جائیں۔ جو بھی نوعیت ہو مجھے تو اس پہلو کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانی تھی تاکہ مزید غور و فکر کے بعد تربیت معلمین کے بارے میں آپ حضرات کی طرف سے کوئی واضح بات یہاں سامنے آسکے۔

ڈاکٹر بدرالدین الحافظ

دینی مدارس اور سائنس کی تعلیم

اب موجودہ دو دعوت ناموں کی روشنی میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پہلی بات جس کی طرف ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کے خط میں اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ مرکز کسی سرکاری یا غیر سرکاری ایجنسی کا آلۂ کار نہیں ہے جس سے دینی مدارس میں کفر و الحاد کی طاقتیں جڑ پکڑیں یا مدارس کے نظم و ضبط میں دخل اندازی ہو اس لیے ان خطرات کو نظرانداز کر کے فروغ سائنس کی کوشش ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ یہ خدشات کوئی نئے نہیں ہیں جیسا کہ ڈاکٹر سلامت اللہ نے اپنی کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم" میں سائنسی تعلیم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ "دور جدید میں سائنس کا علم نہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ سائنس کی کارفرمائی اب زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتی ہے بلکہ اس لیے بھی کہ اب کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ لوگوں میں سائنسی نظریہ پیدا نہ ہو جائے، مسلمانوں کو اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے اس لیے کہ ماضی میں انھوں نے سائنس سے اس غلط فہمی کی بنا پر بے اعتنائی برتی کہ سائنس انھیں مذہب سے بیگانہ کر دے گی۔ تعصبات آسانی سے ختم نہیں ہوتے اس کے لیے منظم کوشش کرنی پڑتی ہے (۱)۔ اسی کتاب سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلم یونیورسٹی کا یہ مرکز جو چند سال سے مدارس میں فروغ سائنس کی کوشش کر رہا ہے مگر اس مہم میں اسے شمالی ہند کے مقابلہ جنوب میں زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ (۲) اگر ایسا ہے تو آخر یہ فرق کیوں اور اس کی وجوہات کیا ہو سکتی ہیں۔ کیا خدشات اور شکوک و شبہات کا وجود یا تناسب جنوب کے مقابلہ میں شمال میں زیادہ ہے؟ میرے خیال میں اس طرح کے شکوک کی بنیاد، دینی اور غیر دینی علوم کے لفظ میں مضمر ہے جو اہل مدارس کو سائنس کی طرف قدم بڑھاتے وقت سوچنے پر مجبور کرتی ہوگی مگر دینی اور غیر دینی کے دائرہ کی حدبندی کرنا بھی دشوار مرحلہ ہے۔ کیونکہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم کے ضمن میں لکھا ہے کہ مساجد کے حلقوں میں سے بعض میں سیکولر مضامین کی تعلیم ہوتی تھی مثلاً لغت اور شعر و ادب وغیرہ۔ ابن طولون کی مسجد میں تفسیر، حدیث، فقہ اور علم نجوم کا درس ہوتا تھا بعض مساجد میں تو طب بھی پڑھائی جاتی تھی۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ امام غزالی نے فقہ کا شمار سیکولر (غیر دینی) مضامین میں کیا ہے۔ (احیاء علوم الدین باب العلم) (۳)۔ ملاحظہ فرمائیے کہ امام غزالی جیسے متبحر عالم نے علوم

---

(۱) ڈاکٹر سلامت اللہ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم ص ۱۳۷ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۹۰ء

(۲) حوالہ سابقہ ص ۱۳۶

(۳) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی۔ مسلمانوں کا تعلیمی نظام ص ۲۸ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۹۲ء

صدر شعبۂ عربی، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

نہیں کس مصلحت سے فقہ کو غیر دینی علوم میں شمار کیا ہے جب کہ ہمارے خیال میں فقہ تو قرآن و حدیث کا نچوڑ اور شریعت کے جملہ احکام و قوانین کی جان ہے۔

مگر اس عظیم شخصیت کے نظریے پہ کوئی تبصرہ کیے بغیر اسلامی نظام تعلیم کی قدیم تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر دور میں خواہ وہ بے ضابطہ مساجد اور حلقوں کی دینی تعلیم کا زمانہ ہو یا گیارہویں صدی عیسوی سے درس نظامی کی باقاعدہ نصابی تعلیم ہمیشہ ایسے مضامین کو داخل درس رکھا گیا ہے جو قرآن و حدیث کی طرح خالص دینی ہوں یا اس کی درس و تدریس اور افہام و تفہیم میں معاون علوم جیسے صرف نحو منطق و فلسفہ ادب و شعر بلاغت و معانی وغیرہ جن میں حسب ضرورت ترمیم بھی ہوتی رہی مگر اس نصاب کے جملہ مضامین اور اس کے مصنفین پہ نگاہ ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ ہمیشہ صرف کتاب کے مغز و مفہوم اور جزوی یا کل افادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے داخل نصاب کیا گیا ہے کبھی اس امر کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا کہ صاحب کتاب کا عقیدہ و مسلک کیا ہے اور اس کے عقیدہ اور اخلاق سے ہمارا طالب علم متاثر ہو سکتا ہے۔

میرے خیال میں علمائے کرام کے سامنے اس کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے صرف چند ناموں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔ قدیم عربی شعر و ادب میں اصحاب معلقات، فرزدق، جریر اور اخطل، جمیل بثینہ، عمر بن ابی ربیعہ، کثیر عزہ، ابوالطیب المتنبی، جاحظ المعتزلی، ابوالعلاء المعری، اس فہرست میں جدید عربی ادب کے جبران مطران وغیرہ شامل نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ عام طور پر مدارس میں داخل نصاب نہیں ہے تفسیر میں صاحب کشاف علامہ زمخشری کا ہمارے عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر ان کی لغوی تحقیق کو اہل مدارس میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

صحاح ستہ کی جملہ کتابیں غیر حنفی علماء کی تدوین ہیں مگر ہر مدرسہ میں داخل نصاب ہیں اور ان کی تعلیم کے بغیر کوئی عالم فاضل ہو نہیں سکتا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نصاب کے مرتب کرنے والوں نے نہایت خلوص کے ساتھ صرف ایک ہی اصول سامنے رکھا کہ قرآن و حدیث کے سمجھنے سمجھانے کے لیے جس کی جو کتاب مفید ہو سکتی ہے اسے داخل درس رکھا جانا چاہیے اس سے ہمیں کلی فائدہ ہو رہا ہو یا جزوی، گویا اہل اصول یہ ٹھہرا الحکمۃ ضالۃ المومن۔ حکمت و دانائی تو مومن کا گمشدہ سرمایہ ہے۔ جہاں سے ملے اسے حاصل کرلے۔ دوسرا اصول خذ ما صفا ودع ما کدر۔ جو اچھا لگے لے لو جو برا لگے چھوڑ دو۔ اگر کسی کی تحقیق و معیار اچھا ہے مگر عقیدہ سے ہم متفق نہیں ہیں تو تحقیق لے لو اس کا عقیدہ مت اختیار کرو۔ میرے خیال میں اسی اصول کی روشنی میں اگر ہم موجودہ سائنس سے بھی حسب ضرورت استفادہ کے بارے میں غور کریں تو بے جا نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں ہمیں مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا یہ تعلیمی تصور بھی کافی حد تک روشنی عطا کر سکتا ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر مضامین کی تعلیم کا انتظام کرنے سے علم دین و دنیا ایک ہی چھت کے نیچے جمع ہو جائیں گے جس سے بلاشبہ منفعت پذیر ہوں گے اور مغائرت کا وہ پردہ جو دونوں کے درمیان حائل ہے اور جس نے علم دین کو بے حس اور علم دنیا کو بے روح اور دور از خدا بنا رکھا ہے اٹھ جائے گا (۱) اس کے بعد میں ایک بات یہ عرض کروں گا کہ اگر سائنس کو ہم خالص دینی مضامین سے مربوط کر کے دیکھیں تو وہ نہ صرف یہ کہ ہمیں دینی موضوع سے بہت قریب نظر آئے گی بلکہ خود تفسیر اور حدیث کی معنویت میں ایک نمایاں اضافہ محسوس ہوگا۔ اس ذیل میں فی الحال میں صرف دو مثالیں پیش کروں گا۔ قرآن کریم میں جا بجا شجر اور اشجار کا ذکر آیا ہے جس سے باری تعالیٰ کی نشانیاں اور انعام و اکرام کا اظہار مقصود ہے۔ مثلاً بیسویں سپارے کی پہلی آیت امن خلق السموات والارض وانزل لکم من السماء ماء فانبتنا بہ حدائق ذات بہجۃ ما کان لکم ان تنبتوا
"یا وہ ذات جس نے آسمان اور زمین کو بنایا اور اس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ سے ہم نے بارونق باغ اگائے تم سے ممکن نہ تھا کہ تم ان درختوں کو اگا سکو۔"

بظاہر اس آیت کا مفہوم بہت سادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے د

---

(۱) بانیان جامعہ، مرتبہ ڈاکٹر سعید انصاری، مکتبہ جامعہ نئی دہلی

پیدا کرنے کے لیے پہلے اس کے لازمی مستقر زمین کو وجود بخشا پھر دھوپ اور پانی کے لیے آسمان بنایا تاکہ ہر درخت اور جاندار کو لازمی غذا فراہم ہوسکے لیکن آخر میں صرف شجر کے لیے یہ بات کیوں کہی کہ تمہارے بس کا تو نہیں تھا کہ تم ایسے درخت اگا سکو اس کا جواب ہمیں ذرا غور و فکر اور طرح طرح کے تجربات کی روشنی میں ملے گا تب سمجھ میں آئے گا کہ یہ سادہ سا درخت جس کی رونق، سایہ، پھل پھول اور لکڑی کے فوائد سے ہم واقف ہیں ہماری نظروں سے ذرا اوجھل کتنا کثیر الفوائد قدرت کا ایک بیش بہا قیمتی شاہ کار ہے۔ سائنسدانوں کی تحقیق کے مطابق ہر جاندار کی زندگی کے لیے آکسیجن ضروری ہے جو اسے درختوں سے حاصل ہوتی ہے اور ہر جاندار کے جسم سے ہر وقت زہریلی گیس کاربن ڈائی آکسائڈ نکلتی رہتی ہے جسے یہ آس پاس کے درخت جذب کرکے اپنی غذا بنالیتے ہیں اور ایک اندازہ کے مطابق عام جسامت کا درخت ایک گھنٹہ میں تقریباً ڈھائی ٹن کاربن ڈائی آکسائڈ گیس ہوا سے جذب کرلیتا ہے اور تقریباً پونے دو ٹن تازہ آکسیجن ہوا میں چھوڑتا ہے جو جانداروں کے کام آتی ہے (۱) اس کے علاوہ درخت مٹی کے کٹاؤ کو روکتا ہے، زمین کو زرخیز بناتا ہے ہوا میں نمی کی مقدار کو کنٹرول کرتا ہے اور بارشوں کا سلسلہ قائم رکھتا ہے۔ پھر کتنے ننھے کیڑے مکوڑوں پرندوں کو سر چھپانے کی جگہ فراہم کرتا ہے اور اس کے پتوں سے کتنے جانور برسہا برس تک پل کر جوان بوڑھے ہوجاتے ہیں۔ ان کے دودھ غلاظت اور گوشت سے کتنے انسان فائدہ اٹھاتے ہیں کیا ایسی لامتناہی فوائد والی چیز کا بنانا انسان کے بس میں ممکن ہوسکتا ہے جس کی قیمت کا اندازہ لگانا ہی ناممکن ہے۔ یہ ہے قدرت کا عظیم کارنامہ۔

اس کے بعد ایک دوسری مثال لیجیے جس سے اندازہ ہوگا کہ سائنس کی روشنی میں حدیث کے مفہوم کو کس وسعت سے سمجھا جاسکتا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ، الا وھی القلب (۲) جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب تک وہ درست رہتا ہے سارا جسم درست رہتا ہے اور اگر اس میں فساد آجائے خرابی پیدا ہوجائے تو سارا بدن فاسد ہوجاتا ہے، خبردار رہو وہ قلب ہے۔ یہ ایک جامع حدیث ہے جس میں اعضاً جسمانی کی حرکات و سکنات اور خیر و شر کے عمل کے لیے قلب کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے مفہوم واضح ہے لیکن اس فرمان رسولؐ کو ایک دوسرے زاویہ سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

سائنسی یا طبی تحقیق کے مطابق قلب خاص ریشوں سے بنا ہوا ایک مضبوط عضو ہے جو سارے جسم کو خون پہونچاتا ہے، دن رات میں ایک جوان فرد کا دل کم و بیش ایک لاکھ پندرہ ہزار دو سو مرتبہ دھڑکتا ہے اور کسی لمحے جسم کے سوتے جاگتے اپنی ذمہ داری سے کوتاہی نہیں کرتا اس طرح جسم کے گوشہ گوشہ کی زندگی کا انحصار اسی مٹھی بھر عضو پر ہے مگر قلب کے اس عمل کے لیے خود اسے بھی تغذیہ کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو آکسیجن، گلوکوز، کیلشیم وغیرہ فراہم کرتا رہتا ہے اگر اس منظم اور مرتب سپلائی میں خلل واقع ہوجائے تو دل کے فعل میں زبردست خرابی آجاتی ہے اور اس کے خراب اثرات سارے جسم پر مرتب ہوتے ہیں یہاں تک کہ چراغ زندگی بھی گل ہوجاتا ہے، اس سپلائی کو معمول کے مطابق رکھنے کے لیے بہت سی احتیاطی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں جس کی تفصیلات ہمارا موضوع نہیں مگر جو کچھ عرض کیا گیا اس کی روشنی میں فرمان رسولؐ کی جامعیت اور معنویت میں کتنا اضافہ ہوجاتا ہے یہ ظاہر ہے اس کے بعد قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ اگر سائنس کا موضوع مدارس میں داخل کیا جائے تو اس کی کیا صورت ہوگی۔

میرے خیال میں مدارس کے موجودہ طریقہ تعلیم میں ردو بدل یا ترمیم تو قابل قبول نہ ہوگی کیونکہ وہ ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت جاری ہے ہاں سائنس یا انگریزی ایک اضافی اور اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل کیے جاسکتے ہیں جن کی تعلیم فی الحال ابتدا میں ہفتہ میں تین دن ہو بعد میں تجربہ کے مطابق اضافہ کیا جائے اور اس کی تدریس کے لیے ہر شہر میں کالج یا سکنڈری اسکول کے ریٹائرڈ صحت مند دیندار اساتذہ کی جزوی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں جو مدارس کے نئے تربیت یافتہ اساتذہ کے مقابلہ زیادہ مفید ہوں گے اس طرح مدارس کے فارغ التحصیل طلبا دینی علوم کے ساتھ حسب ضرورت دوسرے علوم سے بھی واقف ہوسکتے ہیں۔

---

(۱) ماہنامہ اردو سائنس ذاکر نگر نئی دہلی شمارہ جون ۹۴ء ص ۴۲
(۲) بخاری شریف۔ کتاب الایمان باب فضل من استبرا لدینہ

ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم

دینی مدارس میں

سائنسی مضامین کی شمولیت کیوں؟

خالق کائنات کی کنہ و حقیقت کی معرفت کو علم کہا جاتا ہے علم اپنے اس وسیع معنی میں ان تمام انواع کو شامل ہے جس کے ذریعے باری تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جاتی ہے اسی وجہ سے علم حاصل کرنے کی طرف قرآن و حدیث نے بڑی توجہ دلائی ہے اور علمائے اسلام نے اس کی عظمت و فضیلت پر متعدد گرانقدر کتابیں لکھی ہیں جس سے آپ حضرات اچھی طرح باخبر ہیں۔ شیخ سعدی نے حصول معرفت باری سے متعلق اپنا فیصلہ ان دو ٹوک لفظوں میں بیان کیا ہے۔

پئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

دینی اصطلاح میں اقرار توحید سے علم شروع ہوگا اور اثبات توحید پر اس کے سفر کی منزلیں ختم ہوں گی انفس ہوں یا آفاق یہ جلوۂ الٰہی کے مظاہر ہیں اس لیے جب ان اشیاء کی کنہ و حقیقت تک نظر جاتی ہے تو اس سے باری تعالیٰ کی خالقیت اور مالکیت کا علم ہوتا ہے اور اس صناع کی صنعت گری کا کلمہ زبان پڑھنے لگتی ہے یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ دینی ہے یا دنیوی بلکہ علم کی ایک کلی حیثیت ہے اور وہ ہمیشہ کل ہی رہے گا۔ اور اس کلی حیثیت سے ہمیں وہ خبر باطن سے آگاہ اور دولت ایمان سے سرشار کرتا رہے گا یہاں علم کی کوئی تقسیم نہیں کی گئی ہے ہر وہ علم جس سے باری تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو سکے اس کی تحصیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آج بعض دانشور حضرات علم کی تقسیم دینی اور دنیوی لحاظ سے کرکے ایک دوسرے کے مغایر قرار دیتے ہیں میرے نزدیک یہ بات قرین قیاس نہیں کیونکہ دین و دنیا ایک دوسرے کے مغایر نہیں دین کے مقابل بے دینی اور آزاد خیالی اور دنیا کے بالمقابل آخرت ہے قرآن نے ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة سے دنیا کو آخرت کے مقابل گردانا ہے اگر دین اور دنیا میں مغایرت ہوتی اللہ رب العزت دین سے وابستہ رہ کر دنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے محظوظ ہونے کی دعوت نہ دیتا البتہ دنیا کی لذتوں سے استفادہ کرنے میں اتباع رسول کو پیش نظر رکھنا ضروری قرار دیا ارشاد باری تعالیٰ ہے ما آتاکم الرسول فخذوہ ونہاکم عنہ فانتہوا اور غالباً لا رہبانیة فی الاسلام سے بھی ہمارے اس موقف کی تائید ہوتی ہے جس کا سطور بالا

لیکچرار شعبۂ تقابل ادیان ہمدرد یونیورسٹی، نئی دہلی

میں ذکر ہوا ہے متفکرین اسلام نے بھی باہمہ اور بے ہمہ کے فلسفہ میں بھی اسی امر کی طرف اشارہ کیا ہے. شرعی حدود کی پاسداری کرتے ہوئے دنیا کی تمام حسین و دلکش نعمتوں سے بہرہ ور ہونا باہمہ کا مفہوم ہے۔ اور دنیاوی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے ہوئے حیّ علی الصلوٰۃ کی آواز سنتے ہی تکبیر تحریمہ کا عمل بجالانا اور بیک وقت دنیا کی تمام نعمتوں کو حرام قرار دیتے ہوئے ایک حسن ازلی کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر لینا بے ہمہ ہے۔ ہر ذرہ کائنات کی تخلیق حضرت انسان کے لیے ہوئی ہے یہ رعنائیاں یہ زیبائشیں یہ آرائشیں سب کچھ انسان کی آسودگی کے لیے ہیں تاکہ حضرتِ انسان ان کے باعث حسن ابدی اور حسن ازلی کی طرف اپنی توجہ مبذول کر سکے اور جب اس کی ساری توجہ اس کی طرف مرکوز ہو جائے گی تو دنیا سے وہ ایسا بے گانہ ہو جائے گا جیسے کبھی دنیاوی لذتوں سے آشنا ہی نہیں ہوا. جنھوں نے سیرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق زندگی بسر کی ہے ان کی زندگی کا نقشہ ایسے ہی رہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی نامی گرامی شخصیت سے کون واقف نہیں جب باہمہ کے عالم میں ہوتے تھے تو انھیں انسان تو انسان، چوپایوں، جانوروں اور پرندوں تک کا خیال رہتا تھا اور جب بے ہمہ کے عالم میں ہوتے تھے تو حالت نماز میں بدن سے چبھی ہوئی تیر نکال لی جاتی تھی . اور انھیں ذرہ برابر احساس تک نہ ہوتا تھا. سطور بالا کی گفتگو کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ دین و دنیا میں کوئی مغایرت نہیں تو وہ علوم جن کو ہمارے کچھ دانشوروں نے دین اور دنیا میں تقسیم کر دیا ہے ان میں کیوں کر مغایرت ہو سکتی ہے اور اگر یہ تقسیم کسی حد تک جائز مان لیں تو یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ علم موجودہ تقسیم کی روشنی میں خواہ دینی ہو یا دنیاوی سب کا حاصل ایک ہے یعنی باری تعالیٰ کی معرفت لہٰذا اولاً ہمیں اس تقسیم سے گریز کرنا چاہیے . اور اگر یہ ممکن نہیں تو علم دنیا سے سائنس کا وہ حصہ جن کی تعلیم سے شرعی علوم کی تفہیم میں مدد مل رہی ہے انھیں ضرور شامل درس کرنا چاہیے۔ تاکہ قرآن و احادیث کے وہ مباحث جہاں سائنسی مضامین بیان کیے گئے ہیں ان کی کماحقہ تفہیم ہو سکے مثلاً قرآن میں جہاں پانی جل جائے گا کا مفہوم آیا ہے تو یہ ایک ایسی

حقیقت ہے جسے جدید ذہن رکھنے والا طبقہ ماننے پر تیار نہ ہوگا اگر قرآن کے اس سائنسی مضمون کو موجودہ نصابی جمود سے نکل کر عصری علوم کی روشنی میں اس طرح سمجھائیں گے کہ پانی دو اجزا پر مشتمل ہے ایک آکسیجن دوسرا ہائیڈروجن آکسیجن کا کام بھڑکانا اور ہائیڈروجن کا کام بھڑکنا ہے پانی ان دو گیسوں کا مرکب ہے اگر ہم کہیں کہ پانی اللہ کی قدرت کاملہ سے دو حصوں میں بٹ جائے گا تو نتیجتہً ہائیڈروجن جل جائے گا اور آکسیجن بھڑکائے گا. بات تقریباً وہی ہے ہمارے مفسرین عرصہ دراز سے جس کی تفسیریں مختلف انداز میں کرتے رہے ہیں لیکن جب عصری علوم کی روشنی میں سائنس کی وساطت سے بات سمجھانے کی کوشش کی گئی تو یہ توضیح دلپذیر بھی ہوئی اور جدید ذہن رکھنے والوں کے لیے قابل قبول بھی اس کے علاوہ رفتار شمس و قمر، بغیر عمد رفع آسمان، کشش و ثقل وغیرہ الغرض وہ تمام چیزیں جسے ہم بنام سائنس پڑھ کر مرعوب ہو جاتے ہیں لیکن غالباً ہم اس کی طرف توجہ نہیں کرتے کہ نت نئی سائنسی ایجادات جسے ہم سائنس دانوں کا عالمانہ کمال تصور کرتے ہیں اس کا ماخذ دراصل قرآن کریم ہے. اور اس کا ثبوت پہلے سے ہی اس میں موجود ہے اس وضاحت سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ قرآن کوئی سائنس کی کتاب ہے بلکہ قرآن ہی وہ واحد اور منفرد کتاب ہے جس میں ان حقائق کا ذکر آیا ہے جن کا تعلق تاریخ و جغرافیہ، طبعیات و فلکیات، اجرام سماوی علم الحیاۃ طب، انسان کی خلقت اور اس کے جسم کی تکوین و ترکیب اور ایسے بہت سے علوم سے گہرا ہے جن کے بارے میں گزشتہ صدیوں میں حقائق و معارف کا ایک نیا علم منکشف ہوا ہے اور افکار انسانی کے زمین و آسمان بدل گئے ہیں اس مقدس کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے جس کو علم جدید نے خلاف واقعہ ثابت کر دکھایا ہو ان اسرار و رموز کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے قرآن میں ان مضامین کی طرف کس قدر شرح و بسط کے ساتھ رہنمائی کی گئی ہے اس کے لیے صرف ایک شہادت کافی ہے جسے مشہور فرنچ فاضل مورس بکائی نے بائبل. قرآن اور سائنس نامی کتاب میں لکھا ہے. وہ لکھتا ہے.

"ان علمی پہلوؤں نے جو قرآن کے ساتھ مخصوص ہیں
ابتدا ہی میں مجھے حیران و ششدر بنا دیا میرے ذہن

میں کبھی بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایسی کتاب میں جس پر
تیرہ سو سے زیادہ مدت گزر چکی ہے اتنی بڑی تعداد
میں مختلف موضوعات سے تعلق رکھنے والے دعوے
اور اعلانات ہوں گے جن میں شدید تنوع پایا جاتا
ہے اور وہ جدید علمی تحقیق سے پورے طور پر مطابق
پائے جائیں گے۔"

(دراستہ الکتب المقدستہ فی ضوء المعارف الحدثیہ قاہرہ ص ۲۴۲)

اس کتاب پر مولانا ابوالحسن علی ندوی کا یہ ریمارک بھی قابل توجہ ہے
"مصنف نے اپنی کتاب میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے
اور آسمانوں، زمین کی پیدائش، کائنات کے وجود اجرام فلکی، ماہیت
آسمان، فلکی دنیا کے ارتقا فضائے آسمانی، پانی اور سمندروں کے
حیات انسان میں بنیادی کردار ادا کرنے سطح زمین اور پہاڑوں نباتات
اور حیوانات کی دنیا زندگی کے مبدأ و آغاز انسانی توالد و تناسل تربیت
جنین نیز اہم تاریخی واقعات پر علیحدہ علیحدہ بحث اور طبعیات، فلکیات،
علم الحیاۃ، طب اور تاریخ جدید تحقیقات کی روشنی میں قرآن مجید اور بائبل
کا تقابل مطالعہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔

"توراۃ وانجیل کی ان تصریحات کے مقابلہ میں قرآن مجید کی تصریحات
علم و تحقیق کے جدید ترین نتائج سے مطابقت میں بالکل منفرد اور ممتاز ہیں"

(دراستہ الکتب المقدستہ ص ۲۸۶)

اس تحقیق کے پس منظر میں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی ضروری ہے
کہ ہم قرآن میں شامل سائنسی مضامین کو جدید سائنس کی کسوٹی پر نہ پرکھیں
کیونکہ سائنس کے نظریات تغیر پذیر ہیں اور قرآن کا نظریہ اٹل اور
برجستہ ہے۔ مرور ایام کا قرآنی نظریات پر کوئی اثر نہیں پڑتا جہاں قرآن اور
سائنس کے نظریات متصادم نظر آئیں وہاں قرآن کے نظریات ہی کو مبنی
بر صداقت ماننا چاہیے بقول الفرڈ نورتھ وہائیٹ ہیڈ

"کیونکہ اس سائنس میں اکثر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں
لیکن جہاں تک اسلامی نظریات کا تعلق ہے اس میں
کسی تبدیلی کی گنجائش اس لیے نہیں ہے کہ یہ آخری الہامی
کتاب قرآن کریم سے ماخوذ ہے جو بفضلہ تعالیٰ آج بھی حرف بحرف
بجنسہ اسی صورت میں موجود ہے جس صورت میں آج
سے چودہ سو برس قبل بتدریج حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
پر نازل ہوا تھا

(قرآن مجید اور تخلیق انسان لکھنؤ ۱۹۶۰ء ص ۱۱)

ان مسلمات کی روشنی میں سائنس کا مطالعہ ہمارے لیے ناگزیر ہو گیا
ہے کیونکہ عہد حاضر میں سائنس کی ضرورت اور اس کی افادیت سے
انکار ممکن نہیں اگر ہم غروب آفتاب کے دلفریب منظر چاند کے ہالہ کی خوبصورتی
جگنو کی ٹھنڈی چمک دمک اور چمیلی کی دل آویز مہک اور اس طرح
دنیا کی بہت ساری نعمتوں سے اگر ہمیں محظوظ ہونا ہے تو سائنس کے
اصولوں سے تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے اس واقفیت سے میری
مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ سائنس کو درس نظامی کے پورے نصاب پر حاوی
کر دیا جائے بلکہ میری خواہش یہ ہے کہ جس طرح ہم دوسرے مضامین
کے بنیادی اصولوں کے پڑھانے پر اکتفا کرتے ہیں اسی طرح اگر سائنس
کے ان مبادیات کو شامل درس کر لیا جائے تو اس طرح قرآن کے
سائنسی مضامین کی عقدہ کشائی میں صرف مدد ہی نہ ملے گی بلکہ بہت
سارے پیش آمدہ مسائل کا حل بھی ممکن ہو سکے گا اور خاص طور سے
وہ نظریات جو اسلامی اصولوں سے متصادم ہیں ہم ان کا صحیح اور مدلل
جواب بھی دے سکیں گے مثلاً ڈارون کا مسئلہ ارتقا جس میں وہ کہتا ہے
کہ انسان کی تخلیق کیڑے مکوڑوں سے شروع ہو کر بندر اور لنگور سے ہوتے
ہوئے انسانوں کی موجودہ شکل تک پہنچی ہے جدید ذہن کے لوگوں میں
اس کا یہ نظریہ مقبول ہی نہیں بلکہ اکثر دانشور اس کے مؤید بھی ہیں۔ اگر
ہمارے علما کو سائنس کے مضامین سے تھوڑی بہت شد بد بھی ہوتی تو
بلاشبہ قرآن احادیث کی روشنی میں انسانی تخلیق کے ارتقا پر محققانہ انداز
میں ایسے نظریات پیش کرتے جس سے ڈارون کے ہفوات و اباطیل کے
پرخچے اڑ جاتے مگر افسوس اس کی تردید میں مسکت تحریر پیش کرنا تو در کنار
بیشتر حضرات کو ڈارون کے اس نظریے کی خبر تک نہ ہوگی بہر حال اسلام
نے انسانی تخلیق میں جس تدریجی اور ارتقائی مراحل کا ذکر کیا ہے عہد
حاضر میں اس کا سائنٹیفک مطالعہ بھی انتہائی مفید اور کارآمد ہوگا۔ یہ
اہل علم پر مخفی نہیں کیونکہ اللہ رب العزت کے اس ارتقائی عمل پر نازے

صفاتی نام میں "رب" کا صفتی نام شاہد ہے کیونکہ رب کے معنی ہیں تبدریج کسی چیز کو کمال تک پہنچانا ہمارے ناقص علم میں یہ خاصہ ذات باری تعالیٰ کے اسی نام کے ساتھ ہے۔ اسی وجہ سے بندگان خدا کو اپنی دعاؤں کی ابتدا "ربنا" سے کرنے کی تعلیم دی گئی ہے تاکہ اس بارگاہ مستجاب الدعوات میں کمال حقیقی تک پہنچنے کی وہ آرزو کرسکیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ جدید سائنس کا مطالعہ قرآن وحدیث کی خوب سے خوب تر اشاعت کے لیے صرف ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ علما جنھوں نے اشاعت دین کے حق کے سلسلے میں اپنی گرانقدر خدمات اسلامیات میں چھوڑی ہیں ان میں ایسے لوگ مل جائیں گے جنھیں سائنسی مضامین کی صرف شد بد نہ تھی بلکہ بعض مضامین میں بعض حضرات کو کمال حاصل تھا انھوں نے اس فن میں اپنی نگارشات چھوڑی ہیں اور اس علم کے ماہر اکابرین کی فنی لغزشات کا تعاقب بھی کیا ہے ایسے لوگوں میں امام احمد رضا، مولانا ظفرالدین قادری اور مولانا انور شاہ کشمیری کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے اول الذکر بزرگ نے نہ تو کسی مدرسے میں داخلہ لیا اور نہ ہی کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرکے باضابطہ کسی کورس کی تکمیل کی اتنا صرف کتابوں میں ملتا ہے کہ انھوں نے علوم عقلیہ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا نقی علی خاں، مولانا ابوالحسین احمد النوری مرزا عبدالعلی رامپوری اور مرزا غلام قادر بیگ سے کی مگر ان علوم میں کمال اپنی خداداد صلاحیت سے پیدا کیا۔ انھوں نے خود لکھا ہے جب ریاضی اور جیومیٹری وغیرہ کی تحصیل شروع کی تو ان کی فطری ذکاوت کو دیکھ کر ان کے والد ماجد مولانا محمد نقی علی خاں نے کہا۔

"تم اپنے علوم دینیہ کی طرف متوجہ رہو ان علوم کو خود حاصل کرلوگے۔"

(احمد رضا، الکلمۃ الملہمہ ص ٦ دہلی ١٩٧٢ء)

چنانچہ ایسا ہی ہوا ان علوم میں درک ہی نہ صرف حاصل کیا بلکہ ان علوم میں تصانیف اور حواشی بھی لکھے چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں۔

"حسب ارشاد سامی بعونہ تعالیٰ فقیر نے حساب جبر ومقابلہ ولوگارثم وعلم مربعات وعلم مثلث کروی وعلم ہیئت قدیمہ وہیئت جدیدہ وزیجات وارثما طیقی وغیرہا میں تصنیفات وتحریرات رائقہ لکھیں اور صدہا قواعد وضوابط خود ایجاد کیے۔ تحدثا بنعمۃ اللہ تعالیٰ

(الکلمۃ الملہمہ ص ٦)

اس تحریر کے پس منظر میں مشہور ریاضی داں پروفیسر سر ضیاالدین سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے یہ ریمارکس بھی قابل توجہ ہیں۔ سنہ ١٩٢٩ء میں قیام شملہ کے زمانے میں مولانا محمد حسین میرٹھی نے جب ان سے امام احمد رضا سے ملاقات کی تفصیلات دریافت کیں تو انھوں نے جواب دیا

ان کو علم لدنی حاصل تھا میرے سوال کا جواب بہت مشکل تھا اور لاحاصل تھا الیا فی البدیہہ جواب دیا گویا اس مسئلہ پر عرصہ سے ریسرچ کیا ہے۔ اب ہندوستان میں کوئی جاننے والا نہیں۔

(ظفرالدین قادری حیات اعلیٰ حضرت جلد اول ص ١٥٥)

پروفیسر موصوف کا غالباً یہی وہ تاثر تھا جس کا اظہار انھوں نے پروفیسر سلیمان اشرف بہاری صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ان لفظوں میں کیا۔

"صحیح معنی میں یہ ہستی نوبل پرائز کی مستحق ہے"

سطور بالا میں امام احمد رضا کا ذکر کرکے ان کے قد کو مزید اونچا کرنا مقصود نہیں بلکہ اس سے صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ انھوں نے سائنسی مضامین میں اتنا درک حاصل کیا جس کا اعتراف سر ضیاالدین جیسے عظیم سائنسداں نے کیا ہی نہیں بلکہ ان کے سامنے اپنی تہی دامنی کا بھی اعتراف کیا آج ہمارے علما جو یونیورسٹی کے اساتذہ سے مرعوب نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہی کہ یونیورسٹی کے اساتذہ ان مضامین کے ماہر ہوتے ہیں جن کی اس زمانے میں قدر وقیمت ہے حالانکہ شرعی علوم کی قدر وقیمت ہر زمانہ میں یکساں رہی ہے لیکن طلباء کی اس علم کی طرف سے بے اعتنائی اور سرپرستوں کی اس سے بے رغبتی سے واضح ہوتا ہے کہ معاشرہ کو اگر کوئی صحیح رخ دے سکتا ہے تو وہ علم سائنس ہے چنانچہ جب آپ یونیورسٹی اور مدارس کے طلباً کا ذہنی موازنہ کریں گے تو یہ کہنے میں آپ کو کوئی باک نہیں ہوگا کہ مسلم آبادی کے تقریباً ٨٠ فی صد حضرات

اپنے ذہین بچوں کا داخلہ یونیورسٹیوں میں کن جائز و ناجائز تدبیروں سے کراتے ہیں اس کی وضاحت کی یہاں چنداں ضرورت نہیں اور وہ طلبا جو ذہنی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں انھیں عربی مدارس میں ڈھکیل دیا جاتا ہے جہاں اس طرح کا تصور کارفرما ہو وہاں کس طرح معاشرہ کو ہم اسلامی فکر عطا کر سکتے ہیں؟ اس لیے ضروری ہے کہ ہم دینی مدارس کے نصاب کو سائنسی مضامین کی شمولیت سے جامع بنائیں تاکہ مدارس میں داخلہ لینے والا ہر طالب علم یونیورسٹی کے سامنے کسی قسم کا احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو کر ان سے دو بدو بات کر سکے اگر ہم سائنسی مضامین کی شمولیت سے نصاب کو عصر حاضر کی روشنی میں معیاری بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو شاید اس وقت جس انداز سے ہم یا ہمارے مدارس کے مقتدر علما دین متین کی خدمت میں مصروف ہیں اس سے کہیں بہتر انداز میں اشاعت دین حق کر کے اپنی ذمہ داری کما حقہ نبھا سکیں گے اس لیے کہ العلما سرج الازمنۃ کے ذریعے علما کو زمانے کا چراغ بتایا گیا ہے لہٰذا ہر زبان کے جاننے والے اور ہر فکر کے ماننے والے تک حق و صداقت کی صحیح روشنی پہنچانا ان کا فرض ہے اور اگر اس قدر وسیع پیمانے پر اشاعت دین حق ممکن نہ ہو سکے تو کم از کم وہ زبان جس کی شہرت عالمی ہو چکی ہے ان کو اپنا میڈیا بنائیں اور دور جدید میں یہ درجہ صرف انگریزی یا عربی زبان کو حاصل ہے اردو اور عربی زبان میں ہمارے علما حتی المقدور اشاعت دین حق میں سرگرم ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس زبان سے دانشوروں کا ایک طبقہ قطعی نابلد ہے اس وجہ سے انھیں اسلامی تعلیمات بہم پہونچانے کے لیے انگریزی زبان کو مدارس میں رواج بخشنے کی ضرورت ہے اور وہ بھی صرف اس حد تک نہیں کہ طلبا کسی فارم کی خانہ پری کے اہل ہو سکیں یا لفافے اور پوسٹ کارڈ پر انگریزی میں پتا لکھ سکیں بلکہ اس حد تک کہ آپ اپنی اسلامی فکر کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندوستان کے تمام ہر بڑے دینی مدارس میں انگریزی تعلیم کا بندوبست ہے لیکن وہ بندوبست ناقص اس لیے ہے کہ کسی بھی ادارے میں انگریزی تعلیم انٹرمیڈیٹ کی مساوی انگریزی سے آگے نہ بڑھ سکی ہے جب کہ ضرورت اس معیار سے آگے بڑھنے کی ہے کیونکہ یہ زبان بھی طلبا کی سائنسی مضامین سے دلچسپی پیدا کرنے میں معاون کردار ادا کرے گی۔ معاشرہ کے وہ افراد جنھیں اللہ رب العزت نے دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے بہرہ ور کیا ہے وہ چاہتے ہیں کہ عصری تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے بچوں کو دینی علوم سے بہرہ ور کر کے اسلام کا سچا خادم بنائیں مگر جب وہ اپنے اس مقصد میں کامیابی کے لیے مدارس کا دق الباب کرتے ہیں تو کہیں سے انھیں اس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ یہ بات میں ہوا میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ایسے مسائل بطور مشورہ اور برائے حل ہمارے سامنے آ چکے ہیں جس کا جواب ہمارے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا اور اگر مدارس کے ذمہ داران مستقبل قریب میں اس کا کوئی معقول حل نہ نکالیں گے تو قوم کے وہ افراد جو اپنے بچوں کو اسلامی حمیت کے پیش نظر عصری تقاضوں کی روشنی میں اسلام کو پرکھنے کا جذبہ رکھتے ہیں ان کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

جب ہم حال کے جھروکوں سے ماضی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہماری نظر ایسے دانشوروں پر پڑتی ہے جنھوں نے درس نظامی پڑھ کر ملت اسلامیہ کی خدمت مسجد و مدرسہ کے پلیٹ فارم سے نہیں کی ہے بلکہ اسی نصاب کے ذریعے سول سروسز میں کامیابی حاصل کر کے اعلیٰ عہدوں پر فائز بھی ہوئے ہیں۔ لودھی عہد کا نصاب درس اگر ایک طرف اشاعت دین کا کام انجام دیتا تھا تو دوسری طرف یہی نصاب اہم ملازمتیں بھی فراہم کرتا تھا۔ اس کی واحد وجہ عصری تقاضوں کے پیش نظر نصاب کا تیار ہونا اور ملا عزیز اللہ تلنبی اور ملا عبداللہ تلنبی کی کوششوں سے نصاب پر علوم عقلیہ کا حاوی ہونا تھا جس سے اس دور کے اغراض و مقاصد وابستہ تھے تو اگر اس دور کے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے علوم عقلیہ کے اس حصہ کو جس کا تعلق تجرباتی علوم سے ہے شامل کر کے نصاب کو مزاج زمانہ کا ہم آہنگ بنا دیا جائے تو یہ ایک مثبت قدم ہوگا۔ اگر ماضی کے علما نے ضرورت کے پیش نظر نصاب میں ترمیم کر کے اپنے مقصد کو پورا کیا تو اس دور کے علما کیوں نہیں عصری تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے نصاب میں ترمیم کر کے اپنے پیش رو علما کی اتباع کرتے ہوئے دوراندیشی اور وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہیں؟

مدارس میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں ان کی تقسیم دو طرح

جاسکتی ہے ایک علوم عالیہ دوسرے علوم آلیہ علوم آلیہ سے میری مراد وہ علوم ہیں جو مقصود بالذات تو نہیں البتہ ان کی تفہیم میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں جیسے عربی عبارتوں کی تفہیم کے لیے نحو وصرف معانی وبیان وغیرہ اس طرح عربی عبارتوں میں جو فکر ہوئی ہے اس کی تفہیم کے لیے ہم منطق وفلسفہ پڑھتے ہیں. علوم شرعیہ کے مضامین چونکہ مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر ان میں کسی کی تفہیم سائنس کی مبادیات کی تفہیم پر موقوف ہے. تو حسب ضرورت اسے شامل نصاب کرنے میں کوئی قباحت نہیں آنی چاہیے. علوم آلیہ کے وہ مضامین جو پورے نصاب پر حاوی ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق طلبہ کی ذہنی ورزش سے ہوتا ہے جس کا بظاہر کوئی حاصل نہیں اگر ان میں کچھ کمی کر کے وہ مضامین شامل درس کر لیے جائیں جو عصر حاضر کی ضرورت کے عین مطابق ہیں تو اس سے ایک بڑی کمی پوری ہو سکتی ہے. کیونکہ نصاب میں علوم عالیہ ہی اہم ہیں لہٰذا وہ علوم آلیہ جن کا براہ راست تعلق ان علوم آلیہ سے ہے ان کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے. مثلاً تفسیر کے لیے اصول تفسیر اور حدیث کے لیے اصول حدیث. اصول حدیث میں صرف ایک کتاب نخبۃ الفکر نصاب میں داخل ہے جب کہ اصول تفسیر میں بعض مدارس میں کوئی کتاب شامل درس نہیں ایسے مضامین کو بھی نصاب میں مناسب نمائندگی دینے کی ضرورت ہے. نصاب درس سے متعلق اس جرأت مندانہ خامہ فرسائی سے میری مراد چند نصابی کتابوں کو خارج کر کے کچھ غیر نصابی کتابوں کو شامل درس کرنا ہرگز نہیں کیونکہ اس نصابی ترمیم سے نہ تو ہمیں قرآن واحادیث کا گہرا علم حاصل ہو سکے گا اور نہ ہی ہم سائنس دانوں کے زمرے میں شامل ہو سکیں گے ایسے نصاب کی تحصیل کے بعد ہمیں علماء اور سائنس دانوں دونوں کے سامنے احساس کمتری کا شکار ہو کر رہنا پڑے گا اس لیے ترمیم سے مراد یہ ہے کہ عصر حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر ہم ایک ایسا نصاب وضع کریں جس میں دینی علوم کو دنیاوی علوم میں اس طرح اتار دیں کہ وہ اس کا دوران خون اور اس کی روح بن جائے اور مغربی علوم وفنون کے تمام صالح اجزاء کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی تہذیب کا حصہ بنا لے جب ہم اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے اور اس نئے نظام تعلیم کے ساتھ مدارس میں تعلیم رائج کر دیں گے تو بلاشبہ اس نصاب کے ذریعہ علماء کی ایسی جماعت تیار ہو گی جس کی عبقریت اور نابغیت سر دنیا رشک کرے گی مگر یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہو گا؛ مدارس کے ارباب حل وعقد سائنس کے اساتذہ کہاں سے فراہم کریں گے؟ پھر ان کی معقول تنخواہوں کا بندوبست کس طرح ہو گا؟ یہ ایک تفصیلی بحث ہے اس مرکز کے تحت ہونے والی پہلی کانفرنس میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی گئی تھی جو مرکز کے فائلوں میں محفوظ ان معروضات کی روشنی میں کسی نتیجہ پر بآسانی پہنچا جاسکتا ہے.

مولانا حبیب ریحان خاں ندوی

دین و سائنس علوم

ایک دوسرے کے مخالف نہیں

خدائے پاک نے انسان کو معزز و مکرم بنایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلا (اسراء ۷۰)

اور ہم نے بنی آدم کی تکریم کی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں، ان کو پاک چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔

مذکورہ بالا آیت میں انسانوں کو بحر و بر کی سواریوں پر بٹھانے اور رزق عطا کرنے کا تذکرہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خشکی اور تری میں پھیلے ہوئے وہ علوم جن سے پانی پر تیرنے والی کشتیاں اور زمین پر چلنے والی سواریاں اور زمین کے اندر سے پیدا ہونے والی اشیاء کا علم بھی انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔

تکریم انسانی کا سب سے بڑا مظہر علم ہے، اس پر قرآن پاک کی متعدد آیات واضح طور پر دلالت کرتی ہیں۔ جب خلافت کی پاسبانی کے لیے خدا نے انسان کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں نے تسبیح و تقدیس کی تعبدی اہمیت کے پیش نظر اپنا استحقاق ثابت کرنا چا اور اس نئی مخلوق کے پیدا کرنے کی حکمت پوچھی خدائے عزوجل۔ فرمایا "انی اعلم مالا تعلمون" (بقرہ ۳۰) میں وہ تمام حکمتیں جا ہوں جو تم نہیں جانتے، اس پر فرشتگان حکم بردار و مطیعان با تدس نے آدم کا اعتراف سکوتی انداز میں کرلیا لیکن حکمت خدا نے اس اجمالی جواب کے بعد تفصیلی جواب دیا اور آدم کی عظمت اظہار دلیل و حجت کے ساتھ برملا کرنا چاہا اور اس کے لیے سب زیادہ موزوں و معتبر چیز کو پیش کیا اور وہ علم تھا اور اس دا آدم کو تمام اسماء کا علم عطا ہوا۔

آیت کی طویل تفسیر و تشریح و اختلافات سے قطع نظر اتنو تو واضح ہے کہ اسماء سے مراد یا تو تمام اسماء کے صرف نام ہو سکتے یا ان کی ماہیت، صفات اور خواص بھی، ہمارا خیال ہے کہ "الا کلہا" میں تمام چیزوں اور مخلوقات کے نام اور صفات و خو سب شامل ہیں اور آدمؑ کے بعد یہ تمام علمی خواص اولاد آدم منتقل ہوتے رہے ہیں جن کی وجہ سے علمی و سائنسی و صنعتی و ط

دارالعلوم تاج المساجد، بھوپال

زرعی ترقیوں کے دروازے ہر زمانے میں کھلتے چلے گئے ہیں۔

کیونکہ لفظ اسم کا اشتقاق یا تو سمہ سے ہے جس کے معنی علامت اور نشان کے ہیں یا سمو سے ہے جس کے معنی رفعت و بلندی کے ہیں پس اگر اس کا اشتقاق لفظ سمہ سے مانا جائے تو اسماء کے معنی علامات اور نشانات ہوں گے اور علامات اور مسمیات کی صفات و ماہیت و خواص پر مشتمل ہوتی ہیں اور اس کا اشتقاق سمو سے مانا جائے تو بلندی و رفعت کی حیثیت سے صرف نام کا جان لینا معتبر نہیں جب تک کہ اس کی صفات و ماہیات و خصوصیات سے آگہی نہ ہو۔ اور یہ بات بھی عقلی طور پر واضح ہے کہ حقائق اشیاء کی معرفت مجرد اسماء کی معرفت سے افضل و ارفع ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ایمان علم سے زیادہ ارفع و افضل ہے لیکن فضیلت و تکریم کے لیے علم کا تذکرہ اسی لیے کیا گیا ہے کہ فرشتے اور حضرت آدمؑ دونوں مومن تھے۔ نیز یہ حقیقت بھی بے نقاب ہے کہ صحیح علم حق چاہے وہ کتاب اللہ یعنی خدا کی آیات مسطورہ کا ہو یا کتاب کائنات یعنی خدا کی آیات منشورہ کا ہو وہ انسان کو ایمان و یقین و اذعان پر پہنچاتا ہے اس لیے لفظ علم کے اس سلبی اور منفی مفہوم کا یہاں تذکرہ نہیں جسے علم علم حقیقت یا علم حقائق الاشیاء سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا جو کفر و الحاد اور بے یقینی و تذبذب تک پہنچائے۔

یہ حقیقت لفظ علم کی لغوی تشریح و تعریف اور ماہیت سے متعلق تفصیلی بحث کے بعد پتہ چلتی ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصراً یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ علم مطلق ادراک، یا مطلق تصدیق یا ادراک و تصدیق دونوں پر مشتمل ہے یعنی لفظ علم میں تصور و معرفت کے معنی پائے جاتے ہیں۔

اور تصور و معرفت کی اصل اول واجب الوجود ذات حق تعالیٰ کا تصور و معرفت ہے اسی لیے وہی علم حقیقی ہے جس کے عمل سے معلوم حقیقی تک پہنچا جا سکے۔ اور یہی علم ذات و صفات، آیات و کائنات و انفس و انسان کو اذعان و تقوی، صبر و ثبات، انابت و خشوع اور اخبات و خشیت کے اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جو علم الیقین کے بلند مرتبہ سے بھی بڑھ کر عین الیقین اور حق الیقین کی سرحدوں کو چھو لیتا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر علم کی فضیلت کا اظہار کیا ہے ان کو جمع کرنے سے ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ مختصراً یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ قرآن پاک نے علم کو حکمت سے تعبیر کیا ہے۔

قرآن پاک نے پوری دنیا اور اس کے ساز و سامان کو قلیل و ہیچ بتایا ہے۔ قل متاع الدنیا قلیل۔

اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تم کو علم خداوندی و حقیقی کے مقابلہ میں بہت کم علم عطا کیا گیا ہے۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا

لیکن وہ علم جو حکمت و تدبر اور فقہ کا حامل ہو جس انسان کے نصیب میں آ جائے وہ بڑا خوش قسمت ہے کہ اس کو خدا نے خیر کثیر کا حامل بنایا ہے۔ ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون اس آیت میں علماء اور علم کے عظیم رتبہ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے متعدد چیزوں کا تقابلی تذکرہ کیا گیا ہے جیسے خبیث و طیب، حرام و حلال، نابینا و بصیر، روشنی اور تاریکی، سایہ اور گرمی، جنت و دوزخ ، ان تعریفات اور تقسیمات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سب علم و جہل کی تفریق کے اساس ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اصح الاقوال میں یہی ہے کہ اولوالامر سے مراد علماء ہیں کہ حکام و عوام سب پر ان کی اطاعت واجب ہے اور اگر اس سے حکام مراد لیے جائیں تو یقیناً وہ حکام مراد ہیں جو عالم بھی ہوں یا کم از کم اہل علم کے مشورے پر کار بند ہوں۔

علم و علماء کی فضیلت پر حسب ذیل آیات بوجوہ دلالت کرتی ہے۔ یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات"

اللہ تعالیٰ نے چار اصناف کے درجات بلند فرمائے ہیں اہل بدر کو

دوسرے مومنین پر، مجاہدین کو قاعدین پر، اور صالحین کو غیر صالحین پر درجات عطا فرمائے ہیں۔ پھر علما کو تمام اصناف پر مطلق طور پر درجات عالیہ سے نوازا ہے۔ اس سے یقیناً یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ متاخرین اہل علم کا درجہ اصحاب بدر سے بلند ہو سکتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصحاب بدر میں جو جس درجہ کا عالم ہو گا اس کا درجہ اسی قدر بلند ہو گا۔

اقوال رسالتمآب میں علم کے شرف و فضیلت و درجات اتنے واضح اور زیادہ بیانات ہیں کہ اس مختصر وقت میں ان کی طرف توجہ ہی نہیں کی جا سکتی۔ صرف تین مختصر احادیث بغرض سعادت پیش کر دیتا ہوں۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ جو شخص طلب علم کی راہ پر چلتا ہے اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے ۔ من سلک طریقا یلتمس فیہ علما سہل اللہ لہ طریقا الی الجنۃ ۔ مسلم ہی کی ایک حدیث میں مرنے کے بعد انسان کے ذاتی اعمال کے منقطع ہو جانے کا تذکرہ ہے سوائے صدقہ جاریہ، ولد صالح جو اس کے لیے دعا کرے اور ایسا علم جس سے نفع حاصل ہوتا رہے ۔ ترمذی کی حدیث میں عالم کی فضیلت اتنی بتائی گئی ہے جتنی کہ فضیلت رسول پاکؐ کے ایک ادنیٰ صحابی پر"

اسلام کے سوا تمام ادیان عالم کے پیشوا علم کی فضیلت میں اس سے زیادہ بیان نہیں کر سکتے۔ اور نہ اشغال علمی کو عبادات نفلیہ پر ترجیح دے سکتے۔

بہر حال علم کی فضیلت پر کتاب و سنت اور عقل و نقل شاہد ہیں اور یہی تکریم انسانی کا سب سے بڑا مظہر ہے

یہاں ایک بحث یہ چھڑ جاتی ہے کہ علم سے کیا مراد ہے؟ اور کیا علوم دینیہ و شرعیہ کے علاوہ دوسرے علوم اس میں داخل ہیں یا نہیں اس کے تفصیلی جواب کے لیے چند حقائق پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

اسلام ایک عالمگیر پیغام حیات ہے اور اسلامی زندگی ایک جامع و کامل زندگی کا نام ہے جہاں انسان اور کائنات کا ہر ذرہ بندگیٔ رب کا مظہر ہے۔ اسلام کے سب سے عظیم مدرّس کے سب سے عظیم معلم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد آپ سے ایمان و یقین، صلوٰۃ و زکوٰۃ، حدود و تعزیرات، سود و قمار، حقوق و واجبات، زراعت و صناعت، اور تجارت و زراعت کے تمام علوم و مسائل سیکھتے تھے یعنی آپ ان کو ایمانیات اور عبادات کے ساتھ ساتھ جملہ علوم انسانیہ کی تعلیم دیتے تھے۔ اس لیے یقیناً یہ سب علوم انسانی ترقی کے لیے ناگزیر ہیں اور علم کی فضیلت میں شامل ہیں۔

مزید براں تفصیل اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ قرآن پاک کے احکام کا سرسری جائزہ لینے والا عالم ہی نہیں بلکہ ایک عام انسان بھی بوضوح یہ دیکھ سکتا ہے کہ اس میں جملہ انسانی ضرورتوں کے احکام پائے جاتے ہیں اور اس طرح کتاب الہٰی کا علم جملہ انسانی علوم پر مشتمل ہے اس لیے یہ سب علوم کتاب الہٰی کے نصوص سے علمی و شرعی و دینی علوم کہے جا سکتے ہیں۔ جو فرض کفایہ کے درجہ میں آتے ہیں لیکن شریعت کے وہ علم جن سے عقاید کی گمراہیوں سے بچا جا سکے اور حلال و حرام کی عام پہچان ہو اور عبادات صحیح طور پر ادا ہوں ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔

قرآن پاک میں تسخیر کائنات کی جو مفصل آیتیں ہیں وہ سب یہاں پیش نہیں کی جا سکتیں۔ صرف مثال کے طور پر سورہ ابراہیم (۳۳-۳۴) میں کشتیوں، دریاؤں، سورج و چاند اور رات دن کی تسخیر کا تذکرہ ہے۔ سورہ حج (۶۲) میں زمین کی تسخیر کا ذکر ہے۔ سورۂ جاثیہ میں آسمان و زمین کی ہر چیز کو انسان کے لیے مسخر کر دینے کا اعلان ہے۔ سورہ فصلت میں یہ وعدۂ الہٰی ہے کہ ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق و انفس دکھا دیں گے اور گویا آفاقی اور کائناتی علوم اور انسانی جان سے متعلق طب نفسیاتی علوم کے اس درجہ ارتقار کا تذکرہ ہے جس سے لوگ آفاق و انفس میں پھیلی ہوئی آیات الہٰی کو دیکھ لیں گے اور حق ان پر واضح ہو جائے گا۔

ان آیات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ علوم کی اس انسانی عقل و فہم و علم کے ذریعہ وجود میں آئیں گی جو

خود خدا کا سب سے عظیم معجزہ اور عطیہ ہے۔ نیز یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تسخیر کائنات کے اس عمل میں ہر زمانے کے حالات اور علوم کے مطابق ترقی ہوتی رہے گی۔ کبھی صرف اونٹ اور گھوڑا اور بادبانی کشتیاں سواری اور جنگ کا سامان ہوں گے اور کبھی ہوائی جہاز اور ٹینک اور آبدوزیں۔ یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جب اللہ نے انسان کے لیے "مافی السموات ومافی الارض" کو مسخر فرما دیا ہے تو اب آسمان، فضا، ہوا، ثریا، زمین اور تحت الثریٰ یعنی مافی السموات ومافی الارض کے تمام علوم کا حصول اس کے لیے نہ صرف یہ کہ ضروری ہے بلکہ ثواب اور برکت کا موجب اور فلاح وصلاح کا ضامن ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک آیت پیش کرتا ہوں ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء فاخرجنا به ثمرات مختلف الوانها ومن الجبال جدد بيض وحمر مختلف الوانها وغرابيب سود ۞ ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوانه كذلك انما يخشى اللہ من عباده العلمٰؤا ان اللہ عزيز غفور (فاطر ۲۷-۲۸)

ترجمہ: کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعہ سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید، سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے ہی اس سے ڈرتے ہیں بے شک اللہ زبردست اور غفور ہے۔

اس آیت میں پانی برسنے، مختلف رنگ کے پھلوں، پہاڑوں انسانوں اور حیوانوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ خدا سے حقیقی طور پر ڈرنے والے علماء ہی ہیں، اس لیے آیت میں علمائے شریعت کے ساتھ ساتھ علمائے انسانی کا وہ گروہ بھی شامل ہے جو علم زراعت، علم طبقات الارض، علم الحیوان والنبات، اور علم اعضاء وجوارح اور دوسری تخلیقی حقیقتوں سے واقف ہونے کے بعد پکار اٹھتا ہے کہ کائنات کا خالق ومالک وہی ذات ستودہ صفات ہے جس کا کوئی ثانی مثیل اور شریک نہیں ہے وقت کا دامن تنگ ہے ورنہ سینکڑوں سائنسدانوں کے وہ بیانات یہاں نقل کیے جاسکتے ہیں جو کائنات کے وسیع مطالعہ اور سائنس کے طویل تجربات کے بعد حظیرۃ قدس کی برق پاشیوں اور تجلّیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد انھوں نے لکھے ہیں جن میں وہ قلب ونظر اور اعضاء وجوارح حق کے معترف ومقر ہیں۔

اسی لیے اللہ کی کتاب سے جتنی زیادہ واقفیت ہوگی اسی قدر ایمان ویقین میں اضافہ ہوگا اور مکمل انسانی زندگی ترقی کے منازل سے ہم کنار ہوگی۔ اس لیے کتاب اللہ کے علم یعنی شرعی ودینی علوم کو افضل واشرف کہا گیا ہے کہ ان کے مطالعہ اور تعلیم سے دل اور دماغ کے بند دروازے کھلیں گے اور ایمان ویقین کی بہار کے ساتھ ساتھ دنیا میں امن وامان، ترقی وبہبود، تمدن وثقافت، کے تمام دروازے بھی کھل جائیں گے۔

کیا جب کولمبس نے امریکا کا اکتشاف کیا تھا اور جب زیابطیس کی ڈاکٹری دوا ایجاد ہوئی تھی اور جب ریڈیو، بجلی، ٹیلی ویژن موٹر، انجن، ہوائی جہاز اور اسی قسم کی بے شمار سائنسی وطبی ایجادات وجود میں آئی تھیں، یا جب انسان کے قدموں نے چاند کی زمین کو چھوا تھا۔ تو ان میں سے خدا کے انکار کی عقلی وعلمی دلیل بن سکتی ہے؟

انکار وتعلّی تو اس وقت ممکن ہے جب انسان ایک چاند نظام کشش کو بدل دے، کائنات سے باہر ایک نیا امریکہ ڈھونڈ نکالے خدا کی بخشی ہوئی بجلی، ہوا کشش اور طاقتوں کو کام میں لائے بغیر زندگی کا کوئی دوسرا نظام مہیا کردے۔ یہ ایجادیں اور سائنسی ترقیاں خدا کے اقتدار، علم وقدرت الٰہی کی وسعت اور اپنے جہل کے عرفان کا مقام ہے کہ خدا نے بجلی، ہوا، شعاعیں، ایٹم اور ساری کائناتی نظام سے مربوط چیزیں ابتدائے آفرینش سے پیدا کردی تھیں لیکن ان میں سے چند انتہائی معمولی علم وانکشاف انسان

تو اب جائز ہوا ہے۔

اس لیے اسلام کے نظام و نصاب تعلیم میں دین و دنیا کی تفریق نہیں تھی بلکہ اسلامی مدارس بغداد و قاہرہ، دمشق و حلب، فارس و مراکش اور قرطبہ و غرناطہ میں عقائد و عبادات، کتاب و سنت کی تشریحات، فقہ کے ساتھ ساتھ فلکیات، ہندسۂ اقلیدس، ریاضیات، کیمیا، علم حیوان و نبات، تشریح الاجسام، اور جملہ سائنسی و صنعتی و زرعی علوم کی تعلیم دیتے تھے اور ان کے فیض سے ترقی کا دور دورہ تھا۔ یورپ میں تمام علوم مسلمانوں کے توسط سے پہنچے۔ پوپ سلوستر دوم جامع قرطبہ کا طالب علم تھا، آج دنیا کی ترقی تمام تر مسلمان علما و حکما کی رہین منت ہے۔

اسلامی علما کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے تمام دوسری قوموں کے علوم و فنون کو اسلامی رنگ میں رنگ دیا اور ان سے ایمان و عقیدہ کی حفاظت اور دنیاوی فلاح و بہبود کا کام لیا۔ اور ان کے مضر اثرات کا ازالہ علمی تنقید و تجزیہ کے ذریعہ کیا۔

اگر جملہ علوم انسانی میں مسلمان علماء و فلاسفر و حکما کے صرف نام لکھے جائیں تو بے شمار صفحات اس کے لیے درکار ہوں گے۔

دینی و دنیوی علوم کی یہ تفریق بہت بعد میں ہوئی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں اور دراصل یہ داخلی تفریق نہیں تھی بلکہ خارجی و سامراجی اثر و رسوخ کی بنا پر ہوئی اور اس کا یہ منفی پہلو نکلا کہ دنیاوی علوم ایمان و یقین اور شریعت کی نگہبانی سے محروم ہوگئے اور دینی علوم دنیاوی ترقی سے غافل ہوکر کائنات و انفس میں کسی ایجاد و اختراع و ارتقا کی کوشش سے بے نیاز ہوکر صرف بحث و مباحثہ میں الجھ گئے، یا انتہائی اصلاحی کوششوں کے بعد عقاید کی اصلاح اور عبادات کے قیام پر راضی ہو گئے اور عالم کی پاسبانی اور خلافت علی الارض کی ذمہ داری اور جملہ کائناتی و آفاقی علوم میں کسی اہم کردار کی ادائیگی سے محروم ہو گئے۔

اکثر غیر منصف مفکرین اس موقع پر علمائے دین کی کوتاہی کا رونا روتے ہیں جو غلط ہے کیونکہ زمام سلطنت و سطوت کے نکل جانے عربی زبان کی بادشاہت بلاد عجم میں ضم ہو جانے، جدید طریقہ تعلیم میں دینی علوم کی بے وقعتی اور سامراجی و غیر مسلم حکومتوں کی منظم پالیسی کی وجہ سے یہ حالات رونما ہوئے۔

اس صورت حال کو بدلنے یا مستحسن بنانے کے لیے بار بار جزوی ترمیمات اور نصاب تعلیم کی اصلاحات وغیرہ کے طریقے آزمائے گئے ہیں لیکن کلی طور پر اصلاح اسی وقت ممکن ہے جب کتاب الٰہی قرآن پاک کی تعلیمات اس دنیا میں دوبارہ رائج ہو جائیں اور کائنات کا شر و فساد ختم ہو اور نظام زندگی قرآن سے مربوط ہوکر مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جائے لیکن کلی اصلاح ممکن و متوقع نہ ہو تو جزوی اصلاح سے دست کش ہو جانا دانش مندی نہیں ہے۔

سرزمین ہند میں ایسی اصلاحی تحریکیں برپا ہوتی رہیں۔ اس صدی کے اوائل میں ندوۃ العلماء کی اصلاحی کوششیں استحسان کی نظر سے دیکھی گئیں۔ متعدد علما کے ذہن میں بدلتے ہوئے حالات اور انگریزی سامراج کے مکمل غلبے و اقتدار کے پیش نظر یہ حالات پیدا ہوئے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم اور تاریخی شخصیت جو وجود میں آئی وہ مولانا شبلی نعمانی کی تھی۔ انھوں نے دینی تعلیم میں تبدیلی اور نصاب تعلیم میں ترمیم و حذف و اضافہ کا ایسا صور پھونکا کہ اس کا غلغلہ آج تک سنائی دیتا ہے۔ ابتدائی جدید علوم کو نظام درس میں داخل کیا گیا۔ انگریزی اور سنسکرت کی اعلیٰ تعلیم کی تجویز پیش کی جو بوجوہ اس وقت منظور نہ ہو سکی لیکن بعد میں تمام دینی ادارے اس پر غور کر رہے ہیں۔ شبلی کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک مدرسۂ فکر چھوڑ دیا جو ان کے بتائے ہوئے خطوط پر چل کر دینی تعلیم کی اصلاح کرنا چاہے تو مزید ترقی کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسرے علما و فضلا اور مکتبہائے فکر و نظر نے ان کوششوں میں حصہ نہیں لیا۔

موجودہ حالات گزشتہ حالات سے زیادہ تشویش ناک اور اہم ہیں اس لیے ان پر غور کرنے اور ان کی مشکلات کا حل تلاش کرنا آج علما و مفکرین و قائدین کے لیے وقت کی سب سے اہم خدمت اور ضرورت ہے۔

جن خارجی اثرات کا میں نے تذکرہ کیا ہے وہ کیوں کہ ابھی علم و فن کی دنیا پر باقی ہے اور انھیں کا اثر سوسائٹی کے سیاسی اجتماعی، اقتصادی اور تعلیمی نظام پر موجود ہے اس لیے جب تک وہ مکمل طور پر تبدیل نہ ہو مکمل دینی تعلیمات انقلاب ممکن نہیں ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کے تعلیمی نظام میں علم کی شاخ در شاخ تخصص کا دورہ ہے ایک شخص بیک وقت ڈاکٹر، انجینیر فلسفی تاجر اور کاشت کار نہیں ہو سکتا بلکہ علم و فن کے کسی مخصوص میدان میں اسے مہارت حاصل کرنی ضروری ہے۔ اسی طرح علم دین بھی ایک تخصصانہ علم ہے جس کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت کو تن من دھن کی قربانی دے کر ہر وقت میدان عمل میں موجود رہنا ہے، پھر علوم دینیہ میں بھی بے شمار علوم ہیں جو آخری مرحلے میں تخصیص اور مہارت چاہتے ہیں، ان کے لیے اچھے نصاب تعلیم، اچھے مدرسین، بے پناہ مطالعہ اور تحقیقی کاوش کی ضرورت ہے جو جذباتی تقریروں اور انشا پردازانہ تحریروں کے اس دور میں ممکن نہیں کیونکہ سیاسی سطحی امور کی طرح علمی و دینی دنیا میں بھی آج عالمانہ و محققانہ کاوشوں کی اتنی وقعت نہیں جتنی شعلہ بیانیوں، قصہ کہانیوں اور لن ترانیوں کی ہے۔

آج ہر شخص مسلمانوں کی علمی و اقتصادی ترقی کے لیے کوشاں ہے اور یہ صحیح بھی ہے لیکن صحیح علم دین باقی نہ رہا تو پھر وہ مسلمان کہاں باقی رہیں گے جن کی ترقی کے لیے ہم کوشاں ہیں۔ کیوں کہ زبان کی تبدیلی، تہذیب و ثقافت کی تبدیلی، عہدوں مناصب اور کرسیوں کی تبدیلی کے ساتھ اگر کوئی قوم اپنی میراث، اپنی تہذیب، اپنے علوم و آداب اور اپنے ایمان و شعور کی آگہی سے بے نیاز ہو کر میدان عمل میں آئے گی تو قانون قدرت کے لازمی نتیجہ کے طور پر وہ دوسری تہذیبوں میں ضم ہو جائے گی نہ اس کا دینی شعور باقی رہے گا اور نہ ملی تشخص۔

اس لیے عام دینی بیداری کی آج شدید ضرورت ہے اور اس دینی بیداری کے ساتھ علم کا قدیم تاریخی و مذہبی رشتہ جڑا ہوا ہے کیونکہ علم کے بغیر جہالت کے ذریعہ جو دینی بیداری پیدا ہوگی وہ نقصان دہ منفی اثرات اور مضر سلبی نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

اس لیے مسلم قوم کو تہذیبی اور تعلیمی لائنوں میں اپنے شدید تحفظ کی ضرورت ہے، ایک طالب علم جب کسی دوسرے ملک کا سفر کرتا ہے تو اسے کالرا کا حفاظتی انجکشن لگایا جانا ضروری تصور کیا جاتا ہے تو پھر ایمان و یقین سے محروم اور انسانی اقدار سے عاری ایک فریب خوردہ تہذیب کے دشت و جبل کی سیاحت کرتے وقت ایسے جراثیم کش انجکشن کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جو خدا کی بخشی ہوئی مادی و ذہنی لیاقتوں سے انکار خداوندی اور خدا کی پھیلی ہوئی نورانی تجلیوں سے ظلمت نفس کا سبق سکھانا چاہتی ہے اور انسان کے دل و ضمیر میں الحاد و لادینی کے زہریلے نشتر چبھانا چاہتی ہے جو ایک مسلمان کو کتاب و سنت کی پابندی پر رجعیت کا الزام لگاتی ہے اور قانون شریعت پر چلنے اور احکام خداوندی پر کاربند رہنے کو تعصب و تنگ نظری سے تعبیر کرتی ہے۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

دینی مدارس میں
ترمیم نصاب کی ضرورت اور اس کا طریقہ کار

دینی درس گاہوں کے نصاب تعلیم میں ترمیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور اگر ضرورت ہے تو اس کا طریقہ کیا ہونا چاہیے — ؟ ان سوالات پر غور کرنے سے پہلے ہمارے سامنے کچھ اور سوالات بھی ہیں جن کے جواب حاصل کیے بغیر ہم اس مسئلہ کے حل تک نہیں پہنچ سکتے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے؟

دو لفظوں میں تعلیم کا مقصد ہے "انسان کو انسان بنانا" اس زمین پر رہتے ہوئے انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے جو کچھ کرنا ہے، انسان اس کے انجام دینے کے قابل ہو جائے۔ انسان کی صلاحیتوں کو اس طرح نکھارا جائے کہ وہ انسانی سماج کا مفید اور کارآمد حصہ بن جائے۔ یہی انسان کو انسان بنانا ہے۔

جو چیز انسان اور دوسرے جانداروں میں خط فاصل کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان جسمانی وجود کے ساتھ ایک اخلاقی وجود بھی رکھتا ہے۔ انسان کے اس اخلاقی وجود کو قرآن نے لفظ "امانت" سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن مجید کی سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا

بیشک ہم نے "امانت" کو آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا اس کے باوجود یقیناً وہ بڑا ظالم اور بڑا ہی جاہل ہے۔

یہ "امانت" اخلاقی اقدار ہیں جن کو انسان کی سلیم فطرت قبول کرتی ہے جیسے انسان تسلیم کرتا ہے کہ:

- انصاف اچھا ہے اور ظلم برا ہے۔
- رحم اچھا ہے اور بیرحمی اچھی نہیں
- ایمانداری اچھی چیز ہے اور بے ایمانی بری ہے۔
- سچ اچھا ہے اور جھوٹ برا ہے۔

اسی طرح دوسری اخلاقی قدریں جن کو سب انسان مانتے ہیں۔ انسان کے ساتھ یہ مسئلہ ہے کہ وہ انسانی قدروں کو تسلیم کرتا ہے مگر اس کی خواہشات اس کے مفادات اور اس کے جذبات

جامعہ دارالسلام، مالیر کوٹلہ، پنجاب

ان کو ان قدروں سے مٹا دیتے ہیں۔ قرآن مجید کی مذکورہ آیت میں "اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا" میں یہی بات کہی گئی ہے کہ انسان اخلاقی امانت کا حامل ہونے کے باوجود جان بوجھ کر جذبات کی رو میں بہہ کر ظلم اور حق تلفی کی راہ اختیار کرتا ہے۔

انسان کو انسان بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کی زندگی میں اخلاقی قدریں اس طرح ابھاری جائیں کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اخلاق کا پیکر بن جائے۔

اگر انسان، انسان بن جائے، اخلاقی قدروں کا پیکر بن جائے تو زندگی کے مختلف میدانوں میں آگے بڑھنے کے لیے اس کو جن علوم و فنون کی ضرورت ہے، سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ، ڈاکٹری ان میں مہارت حاصل کرنا اس کی کامرانی کا سبب بنے گا ورنہ ان علوم میں مہارت اس کے لیے کامرانی کے بجائے تباہی کا سبب بن جائے گی۔ جب تعلیم کا مقصد انسان کو انسان بنانا قرار پایا تو یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسان کی عملی قوت کو حرکت میں لانے والی چند چیزیں ہیں۔

۱۔ یقین ۲۔ جذبۂ محبت و نفرت
۳۔ کسی نفع بخش چیز کو حاصل کرنے کی آرزو، یا کسی نقصان دینے والی چیز کا خوف۔ ۴۔ کسی مقصد اور نصب العین کی لگن

۱۔ انسان کے عمل اور اقدام کی پہلی بنیاد یقین ہے۔ یقین کے بغیر کردار نہیں بن سکتا۔ اور کردار کے بغیر انسان نہیں بن سکتا۔ ڈاکٹر اقبالؒ نے خوب کہا ہے۔

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بدتر ہے بے یقینی

یقین کی طاقت وہ طاقت ہے جو لوہے کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ایسا یقین جو حق و صداقت پر مبنی ہو اور جس کے نتیجہ میں انسان اخلاقی اقدار کا مجسمہ اور انسانیت و کردار کا پیکر بن جائے صرف انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور ان کے اسوے سے ملتا ہے

ان کی تعلیمات نے بگڑے ہوئے انسانوں کو انسان بنایا ہے، فاسد سماجوں کو سنوارا ہے۔

۲۔ دوسری چیز انسان کی عملی قوت کو حرکت میں لانے والی اس کے جذبات ہیں۔ محبت ہو یا نفرت و عداوت، انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ یقین کے ساتھ اگر محبت کی گرمی شامل نہ ہو تو انسان راہ حق میں کوئی بڑی قربانی نہیں دے سکتا۔

قوتِ عمل کا پہلا مرحلہ یقین اور دوسرا مرحلہ محبت و عشق ہے۔

۳۔ تیسری چیز جو عمل کے لیے محرک بنتی ہے۔ وہ نفع کی طلب اور نقصان کا ڈر ہے۔

دنیا کے فائدوں کی اپنی کشش ہے۔ نیکی، اخلاق، پرہیزگاری کی راہ میں انسان کو دشواریاں نظر آتی ہیں۔ راستہ صرف ایک ہی ہے کہ انسان کو بتایا جائے کہ یہ دنیا خواہ کتنی حسین نظر آئے بہرحال چند روزہ ہے۔ اصل فائدہ اور نقصان جو کچھ ہے وہ اس دنیا کے بعد کی زندگی میں ہے۔ وہ دنیا جو ابدی ہے انسان اس دنیا کی رنگینیوں میں ڈوب جانے کے لیے نہیں آیا۔ وہ حق و صداقت، خیر اور انسانیت پر چلنے اور انھیں قائم کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی ادا کرنے میں اس کا فائدہ ہے، اور ان ذمہ داریوں سے جی چرانے میں اس کا نقصان ہی نقصان ہے۔

۴۔ قوتِ عمل کو حرکت میں لانے والی چوتھی چیز کسی مقصد اور نصب العین کی لگن ہے۔ مقصد زندگی کا جنون ہی ہے جو افراد اور قوموں کو متحرک رکھتا ہے اور اس کے لیے مصیبتیں جھیلنے پر آمادہ کرتا ہے۔

یہ نصب العین اگر حق ہے اور اعلیٰ نصب العین ہے تو انسان انسان بنے گا۔ اگر نصب العین باطل اور پست ہے تو انسان پستی میں جائے گا۔

مسلمان کا نصب العین جو یقیناً حق اور اعلیٰ نصب العین ہے وہ ہے اخلاق اور کردار کا نمونہ بننا اور بنانا۔ اس بات کی جدوجہد کرنا کہ دنیا سے بدی، ظلم، فساد، شیطنیت مٹے۔ نیکی، انصاف، حق اور

انسانیت کا بول بالا ہو۔

تو تعلیم کا مقصد ہوا انسان کو انسان بنانا۔ اور انسان کی عملی زندگی کو نکھارنے، سنوارنے، حرکت میں لانے کے لیے یقین۔ جذبہ عشق؟ جلب منفعت؟ دفع مضرت۔ نصب العین سے وابستگی، ان چار چیزوں کی ضرورت ہے۔

اگر تعلیم میں یہ حرکت میں لانے والی چیزیں شامل نہ ہوں تو انسان عملی زندگی میں انسان نہیں بن سکتا۔ تعلیم کی یہ روح پورے نظام تعلیم کے ریشے ریشے میں اس طرح پیوست ہونی چاہیے جس طرح بدن کی رگ رگ میں خون دوڑتا ہے۔

زندگی ایک اکائی ہے۔ اس میں تقسیم نہیں ہے۔ اسی طرح تعلیم بھی ایک اکائی ہے اس میں دینی اور دنیوی کی تقسیم نہیں ہونی چاہیے۔ درس گاہوں میں تمام مفید اور ضروری علوم و فنون پڑھائے جائیں۔ مگر اس طرح کہ طلبا کا ایمان محکم۔ اور خدا پرستانہ کردار پختہ ہوتا چلا جائے۔ اور جب وہ دانش گاہوں اور تعلیم گاہوں سے نکلیں تو کامل فرزانگی اور انتہائی دیوانگی کی تصویر ہوں

ـــہ تباؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں

صرف دینی مدرسوں کے نصاب اور نظام میں ہی نہیں ہمیں اپنے پورے نظام تعلیم میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ اور اس کا اصل طریقہ کار ایک مکمل آزاد نظام تعلیم کا قیام ہے جو ہر طرح کے بیرونی اثرات سے مکمل طور پر پاک ہو۔ ایسا نظام تعلیم اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ اس ملک میں رہنے والی قوموں کی تہذیب، مذہب، روایات اور خصوصیات کو باقی رکھنے اور محفوظ رکھنے کی صورت، تہذیبی وفاق۔ کلچرل فیڈرل سسٹم کا قیام ہو سکتا ہے جس میں ہر قوم کو اپنی تعلیم۔ سماجی امور۔ اوقاف ـــــ مذہبی معاملات کو خود اپنے طور پر حکومتی اختیارات کے ساتھ چلانے کا اختیار اور حق دیا جائے۔ ایک سیکولر حکومت کے زیر سایہ آپ تہذیبی وفاق کے بغیر وہ تعلیمی نظام قائم نہیں کر سکتے جو کسی قوم کو اس کے اپنے انداز نظر کے مطابق تیار کرنے کا ذریعہ بن سکے۔ آپ مسلمان کو مسلمان اور ہندو کو ہندو نہیں بنا سکتے۔

دینی مدرسے ہوں یا اسکول کالج یونیورسٹیاں، ان کے نصاب تعلیم میں جزوی تبدیلی و ترمیم اور پیوند کاری سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ جب تک نظام تعلیم کے پیچھے واضح شعوری مقصد نہ ہو۔

تعلیم کے چار ادارے ہیں گھر۔ سماج۔ اسکول۔ اور ریاست یہ سب مل کر انسان کو انسان بناتے ہیں۔ اگر ان سب کا رخ ایک نہ ہو، سب ایک مقصد کے لیے کام نہ کر رہے ہوں باہم ٹکراؤ ہو تو تعلیمی نظام کامیاب نہ ہو سکے گا۔

ہمارے سامنے اس وقت تین طرح کے نظام تعلیم ہیں۔

۱۔ عصری تعلیم کا نظام ـــ جو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں چل رہا ہے ـــ یہ نظام تعلیم، ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد وجود میں آیا تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے انگریزی تعلیم حاصل نہ کی تو وہ نئے قومی نظام میں شریک نہ ہو سکیں گے اور پیچھے رہ جائیں گے۔

۲۔ دینی تعلیم کا نظام ـــ یہ نظام بھی، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد قائم ہوا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر قرآن وسنت اور عربی علوم کی تعلیم کا اہتمام نہ کیا گیا تو مسلمانوں کا رشتہ اپنے عقیدے و مذہب سے کٹ جائے گا اور وہ دینی تشخص سے محروم ہو جائیں گے

۳۔ اس کے درمیان تیسرا رخ چلا کہ اسکول کالجوں اور دینی مدرسوں کے نظام میں ہم آہنگی پیدا کر کے دونوں نظامہائے تعلیم کو یکجا کیا جائے حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں ایک نئے انقلابی تعلیمی نظام کی ضرورت ہے۔

ہم اس نظام تعلیم کو "بنیادی شخصی ضروریات" اور "ملی تقاضوں" کے دو دائروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

ہماری بنیادی شخصی ضروریات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ قرآن مجید کی مستقل تعلیم ـ جدید ترین طریقے پر
۲۔ مادری اور علاقائی زبان پر عبور
۳۔ اردو کی تعلیم

۴۔ دینی زبان عربی کی تعلیم
۵۔ بین الاقوامی زبان انگریزی کی تعلیم
۶۔ عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات کے بارے میں اتنا دینی علم کہ ایک صحیح مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرسکے۔
۷۔ اتنا حساب کہ روزمرہ کے معاملات میں دشواری نہ ہو۔
۸۔ سائنس کی بنیادی تعلیم
۹۔ ملکی اور بین الاقوامی حالات سے واقفیت

ان بنیادی شخصی ضروریات کو سامنے رکھ کر ہائی اسکول کے معیار تک نصاب تعلیم مرتب کیا جائے اور یہ کوشش کی جائے کہ کوئی مسلمان اس سے محروم نہ رہے۔

اس کے بعد دوسرے مرحلے کی تعلیم میں ملی ضرورت اور ملکی تقاضوں کو سامنے رکھ کر شعبوں کی تقسیم کی جائے۔ مثلاً

۱۔ ہمیں علوم دینیہ کے ماہر علماء کی ضرورت ہے جو ہمیں بڑے مدرسوں اور اسلامی جامعات سے حاصل ہوسکتے ہیں ان مدرسوں کے نصاب تعلیم اور نظام تربیت پر ازسر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ دینی اور اسلامی مدرسوں نے اسلامی اقدار کے تحفظ میں قابل قدر اور کلیدی رول ادا کیا ہے اگر یہ مدرسے نہ ہوتے تو سیاسی اور معاشی قوت سے محروم ملت اسلامیہ فکری اور تہذیبی سیلاب میں بہہ چکی ہوتی۔ اسکولوں اور کالجوں میں رائج عصری نظام تعلیم صرف جدید معلومات فراہم کرنے کے لیے نہ تھا بلکہ اس میں مغرب کی تہذیب اور اس کے افکار سموئے ہوئے تھے۔

سیاسی آزادی کے بعد حالات میں ایک زبردست تبدیلی آئی ہے۔ ان تغیرات کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر ازسر نو غور کریں۔ اسلام کی تعلیمات موجودہ زمانے کے تغیرات میں تعمیری رول ادا کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتی ہیں۔

۲۔ اس طرح ملی ضرورت کے تحت ہمیں بہترین مسلم سائنسدانوں کی ضرورت ہے جو سائنس کا مطالعہ اپنے نقطۂ نظر سے کریں۔
۳۔ ہمیں قابل ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔
۴۔ ہمیں ماہر انجینیروں کی ضرورت ہے۔
۵۔ ہمیں مسلم قانون دانوں کی ضرورت ہے۔
۶۔ ہمیں معاشیات کے ماہروں کی ضرورت ہے۔

اسی طرح ہمیں زندگی کے دوسرے شعبوں میں ماہرین کی ضرورت ہے۔ میٹرک کے بعد ہر طالب علم اپنے ذوق اور صلاحیت کے مطابق کسی ایک شعبے میں مہارت حاصل کرے اور ان تمام علوم پر اسلامی نقطۂ نظر سے عبور حاصل کرے۔ تعلیم کے اس نظام میں سب سے زیادہ اہمیت تربیت کی ہے اگر اسلامی اخلاق پیدا نہ ہوں تو محض کتابی علم کسی کام کا نہیں ہے۔

باقی صفحہ ۹۶ پر

ص ۱۰۰—۹۹
۱۳۔ ماخوذ از ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، مذکورہ بالا۔ ص ۱۰۰
۱۴۔ تعلیم اسلامی تناظر میں، سیمنار یکساں نظام تعلیم، سید معروف شاہ شیرازی ص ۱۶ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد اپریل ۸۶ء
۱۵۔ آغاز اسلام میں مسلمانوں کا نظام تعلیم (عہد بنی امیہ تک) پروفیسر محمد سلیم ص ۳۱-۲۹ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۸ء
۱۶۔ تعلیم اور اس کے سماجی پس منظر ص ۱۸۶، ڈاکٹر سلامت اللہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۲ء
۱۷۔ تعلیم اسلامی تناظر میں، ص ۱۰۳۵ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد مارچ اپریل ۱۹۸۶ء
۱۸۔ ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ص ۳۰۲ پروفیسر محمد سلیم، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، اپریل ۱۹۸۶ء
۱۹۔ سوانح قاسمی، مولانا مناظر احسن گیلانی، جلد دوم۔ ص ۲۹۱ بحوالہ سید محمد سلیم، ص ۲۶۷۔ ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، اپریل ۱۹۸۶ء

مولانا جمیل احمد قاسمی

دینی مدارس میں سائنس وریاضی کی تعلیم

سائنس اور ریاضی جیسے مضامین کو دینی مدارس کے نصاب میں داخل کرنا وقت کے تقاضوں کو سمجھنے، اسلام اور مسلمانوں کو جدید چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنے اور موجودہ دینی تعلیم کو مزید مفید بنانے کی ایک کوشش ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سلسلے کا کوئی اقدام اپنے پیچھے بہت ساری مخالفتوں، رکاوٹوں اور الزامات کو دعوت دے جس طرح اس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کے وقت مسلمان بچوں کو انگریزی تعلیم دینے کے اقدام پر مرحوم ومغفور سرسید احمد خاں صاحب بانیٔ یونیورسٹی کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر وہ اپنا مقصد لیے ہوئے اپنے راستے پر ڈٹے رہے اور حالات کا پامردی وجوانمردی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ یونیورسٹی کی ابتدائی عمارت کی تعمیر کے لیے چندہ کرنے نکلے تو بطور تمسخر ومذاق کچھ لوگوں نے ان کی جھولی میں پتھر ڈال دیے مگر موصوف نے اسے بھی یہ کہہ کر قبول کرلیا کہ میں اسے یونیورسٹی کی عمارتوں کی بنیادوں میں ڈال دوں گا۔ بالآخر نہ صرف یہ کہ وہ اس میدان میں کامیاب وکامراں ہوئے بلکہ مخالف موافق بن گئے، دشمن دوست بن گئے۔ مرحوم کو بعد میں اتنی زبردست تائید وحمایت اور نصرت وموافقت ملی جس کی مثال کے طور پر یہ عظیم یونیورسٹی ہمارے سامنے موجود ہے اور اس کی افادیت اور بین الاقوامی مقبولیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں

دینی مدارس میں سائنس کو داخل کرنے سے پہلے اور اس سلسلے میں کسی بھی اقدام سے پیشتر مناسب ہوگا کہ ان بڑے مدارس دینیہ جو اُمہات المدارس کا درجہ رکھتے ہیں میری مراد دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ سلفیہ بنارس اور عربی یونیورسٹی مبارک پور وغیرہ کے ذمہ داروں سے سنجیدگی کے ساتھ صلاح ومشورہ کرلینا چاہیے اور ان اکابرین کو پہلے اس بات پر رضامند کرلینا انتہا ضروری ہے تاکہ ان کی رہنمائی میں یا ان سے ملحق ادارے یا جو ادارے ان کے مسلک سے یگانگت رکھتے ہیں ان کو رضامند کرنا آسان ہوجائے اور سنٹر کے عزائم کو بروئے کار لانے میں کسی بڑی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بڑے ادارے آسانی سے رضامند ہوجائیں۔ اگر ہوگئے تو فبہا اور اگر نہ ہوئے تو پھر ہم اپنا کام اللہ کے بھروسے شروع کردیں اور چھوٹے مدارس سے ہی اس کا آغاز

مدرسہ مفتاح العلوم، جامع مسجد کوپر گاؤں، ضلع احمد نگر، مہاراشٹر

کریں۔ آئندہ اس کی افادیت کو دیکھ کر اور وقت کے تقاضے اور چیلنج کو سمجھ کر ہو سکتا ہے کہ ان بڑے اداروں کی تائید و حمایت حاصل کرنا آسان ہو جائے۔ میں اس سلسلے کی ایک مثال پیش کروں گا۔ میں شہر مالیگاؤں ضلع ناسک مہاراشٹر کا رہنے والا ہوں۔ آج سے تقریباً ۴۰ سال پہلے وہاں لڑکیوں کی اعلیٰ عربی دینی درس گاہ شہر کے کچھ پرانے قاسمی علما نے شروع کی جن میں میرے والد ماجد صاحب بھی تھے۔ اس وقت اندرون شہر کے بہت سارے علما نے بھی اس کی مخالفت کی اور یہ کہا کہ یہ نیا کام جس کے اندر قدم قدم پر فتنے کا احتمال ہے اور جسے علماء دیوبند نے بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا شروع کرنا ہرگز ٹھیک نہیں ہے یہ تجربہ لا تابع فیہ ہے اس کے نتائج فساد پر جا کر رکیں گے مگر کچھ ہی برسوں کے بعد اس کی افادیت سامنے آئی جو مخالف تھے انھوں نے اپنی بچیوں کو وہاں داخل کیا۔ آج تقریباً دو ہزار بچیاں حدیث و قرآن کی تعلیمات کے زیور سے آراستہ ہو رہی ہیں۔ اب تک فارغات کی تعداد تین ہزار ہ سو عالمات کی ہے، دارالعلوم دیوبند سے مرحوم مولانا فخر الدین صاحب جنھیں چچا کہا جاتا تھا اور ان کے ہمراہ مفتی شکیل احمد سیتاپوری صاحبان تشریف لائے تھے۔ حضرت علی میاں دامت برکاتہم وہاں آچکے۔ مولانا محمد تقی امینی نے حوصلہ افزا کلمات لکھے اور جلسے میں کہے۔ الغرض حالات موافق ہو گئے اور آج اسی درس گاہ کی حیثیت ایک بین الاقوامی درس گاہ کی ہے اور وہاں سے پڑھ کر اندرون ملک کے علاوہ بیرون ملک بھی شاخیں چل رہی ہیں۔ بیرون ملک کی ڈیڑھ سو لڑکیاں آج بھی وہاں زیر تعلیم ہیں۔ ساٹھ معلمات کا اسٹاف ہے۔ پانچ بلڈنگیں دارالاقامہ کی ہیں۔ سارا انتظام تعلیمی و تدریسی لڑکیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے نظر بد سے بچائے۔ آمین۔

کس معیار کے طلباء علوم دینیہ کو سائنس پڑھائی جائے اس سلسلے میں بعض شرکاء سمینار و مقالہ نگاروں کی رائے سے مجھے اتفاق ہے کہ زیادہ سے زیادہ سال چہارم تک کے طلباء کو یعنی شرح وقایہ تک یہ تعلیم دی جائے اس کے بعد سے اس سلسلے کو ختم کیا جائے اور صرف اور صرف خالص دینی تعلیم حدیث و تفسیر فقہ و اصول فقہ پڑھا کر ان کو فضیلت کی سند دی جائے تاکہ انما الاعمال بالخواتیم کی رو سے ان کے اندر دینی تعلیمات کی روح باقی رہے عصری تعلیم کے لازمی اثرات سے وہ اخیر سالوں میں بچے رہیں اور ضرورت کے مطابق ان کو علم سائنس و ریاضی بھی حاصل رہے۔

دینی تعلیم کے لیے مدارس دینیہ کو اکثر تھرڈ کلاس ذہن رکھنے والے، انتہائی شریر و بدمعاش، جو ماں باپ سے سنبھلتے نہ ہوں، پورے محلہ کے لیے دردِ سر بنے ہوئے ہوں، ایسے ماشاء اللہ ایسے طلباء ملتے ہیں پھر انھیں میں سے کچھ ہیرے جواہرات بن کر نکل جاتے ہیں اور قوم و ملت کی خدمت کرنا اپنا نصب العین سمجھتے ہیں ایسے طلباء زیادہ وقت مدرسے کے لیے نہیں دے سکتے اور یوں بھی مدارس میں نصاب کی کتابوں کی بہتات اور بعض غیر ضروری کتابیں اور فنون جن کی آج کے زمانے میں قطعاً ضرورت نہیں ہے مثلاً منطق و فلسفہ عربی ادب جاہلی وغیرہ کو کم کر کے اس کی جگہ سائنس و ریاضی کو جگہ دی جا سکتی ہے۔

آخری گزارش میں انتہائی ادب کے ساتھ سیمینار کے منعقد کرنے والوں سے عرض کروں گا ان کے دل بے شک خلوص سے بھرے ہوئے ہیں اور ان میں قوم و ملت کا درد ہے۔ وہ ملت کے نوجوانوں کی فلاح و بہبود کی سوچ رہے ہیں۔ مگر مقطع میں آ گئی ہے سخن گسترانہ بات۔ یہ لوگ جو بات دینی مدارس کے لیے سوچ رہے ہیں اور عصری تعلیم کو بھی مدارس میں داخل کرنے کی بات کر رہے ہیں وہ تصویر کے دوسرے رخ کو کیوں نہیں دیکھتے۔ وہ اپنے اسکولوں کالجوں میں دینی تعلیم قرآن و حدیث کی تعلیم کو کماحقہ جگہ کیوں نہیں دیتے اگر وہ لوگ مدارس عربیہ کو اپنے سے قریب کرنا چاہتے ہیں تو پھر کچھ آگے چل کر ان کا استقبال کرنا ہوگا۔ اور اپنے نصاب میں قرآن و حدیث کو داخل کرنا ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے اور نہیں سوچتے یا اگر یہ چیز ان کے دل میں چبھتی ہے یا پھر انھیں کوئی قانونی دشواری بھی نہیں ہے تو پھر ان کے خلوص کے اندر شک و شبہ کی راہیں نکل سکتی ہیں۔ اللھم اعذنا من شرور انفسنا ولا تکلنا الی انفسنا طرفۃ عین [illegible] الحمد للہ رب العالمین

عبدالمجید راہی کوپرگانوی

دینی مدارس میں عصری علوم کی ضرورت کیوں؟

فروغ سائنس کے زیر اہتمام ہونے والے اجلاس کی منزلِ مقصود یہ معلوم ہوتی ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے نونہالوں کو عصری علوم سائنس، ریاضی، جیومیٹری، اکنامکس نفرکس، انگریزی وغیرہ مروجہ علوم کا ماہر و کامل بنایا جائے۔

اور ملت اسلامیہ کی گود سے پھر ایک بار اس بزم گیتی میں ابن سینا، خوارزمی، رازی، ابن النفیس، ابن الذہبی، ابن حزم، ابن تیمیہ جیسے ماہر سائنس داں اور محققین پیدا ہوں، تاکہ امت مسلمہ کی تعلیمی پستی اور زوال کو دور کیا جائے، اور یہ کہ مسلمانوں کی پیشانی سے جہالت اور تعلیمی ومعاشی پسماندگی کا داغ دھل جائے۔

تعلیمی اور سائنسی جستجو و بیداری کو فروغ دینے کے لیے ماہرین تعلیم و تحقیق نے اس بات کو محسوس کیا کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں عصری علوم کی ترویج کی ضرورت ہے۔ اور گزشتہ چند برسوں سے یہ آواز علمی حلقوں میں گشت کر رہی ہے۔

مگر محسوس کیا جا رہا ہے کہ اس سلسلے میں علما و مفکرین دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں کیوں کہ ان کی آرا متضاد ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ دینی مدارس میں عصری علوم کی ترویج کی ضرورت ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مدارس کے نصاب تعلیم میں عصری علوم کی ترویج کی ضرورت نہیں ہے۔ مدارس دینیہ کے نصاب میں عصری علوم کی ضرورت و عدم ضرورت کے سلسلے میں ہم ان متضاد آرا کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیں تو زیادہ بہتر ہوگا تاکہ ہمیں اپنے اقدام میں رہنمائی حاصل ہو سکے، اس جائزے کے لیے یہی دو عنوان قائم کیے جا رہے ہیں

۱۔ ضرورت کیوں ہے؟ ۲۔ ضرورت کیوں نہیں؟

ضرورت کیوں ہے؟

اس سوال کے جواب میں قائلین ضرورت عہد اسلامی کے علم طب، علم سائنس، علم ہیئت، علم ریاضی کی تاریخ سے استدلال کرتے ہیں کہ دنیا کو سائنسی علوم سے آشنا کرانے والے مسلمان ہی ہیں۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ ظہور اسلام سے قبل، دنیا پر شرک چھایا ہوا تھا، کلیسا کے ظالم قوانین کی حکمرانی تھی۔ ان دونوں نے انسان کی ترقی کی راہیں مسدود کر رکھی تھیں، محرف عیسائیت کے جابرانہ اور دقیانوسی خیالات اور مشرکانہ عقائد اوہام پرستی سے ہٹ کر کوئی اگر نئی بات یا اپنی نئی تحقیق پیش کرتا تو موت کے تختہ پر پہنچا دیا جاتا تھا۔ وہ دور بے انتہا دردناک دور تھا جس نے ہزاروں برس تک ایمان کی روشنی

معلم۔ مدرسہ مفتاح العلوم کوپرگاؤں، احمد نگر، مہاراشٹر

سائنسی تحقیقات واختراعات کو روک رکھا،

مگر حبیب اللہ جل شانہ کی رحمت جوش میں آئی اور رحمۃ اللعالمین ت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُن کافرانہ اور مشرکانہ عقاید کے خاتمہ کے زر انسانی دنیا کو امن وسکون اور آزادی دلانے کے لیے رسول بھیجا تو تاریخ شاہد ہے کہ ۲۳ برس کے قلیل عرصہ میں توحید خالص عرب سے تجاوز ہو چکی تھی گویا ایک انقلاب تھا جو برپا ہوتا چلا گیا

عیسائیت کے محفوظ قلعے اس انقلاب کے سامنے ٹک نہ سکے ں کی زنجیریں کٹ گئیں، زندگی کا ہر شعبہ لہلہا رہا تھا، پھر اسی اسلامی اب نے سائنس وتحقیق کے دروازے کھول دیے یہاں تک وڑی ہی مدت میں سائنسی انقلاب برپا ہوا اور صدیوں تک رہا۔ چنانچہ سائنس کا مشہور مورخ جارج سارٹن کہتا ہے کہ

آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی عیسوی تک ساری دنیا کے میں جو اضافے ہوئے ہیں وہ عربوں اور مسلمانوں کی بدولت تے ہیں۔ مذا اسلامی انقلاب کی سائنسی وتصنیفی جھلکیاں ملاحظہ کیجیے۔

حضرت مسیح سے پہلے دنیا میں چار تمدنی مرکز تھے، ایران، چین دستان، یونان۔

عباسی خلیفہ منصور نے ۷۶۲ء میں بغداد شہر آباد کیا، اس نے مختلف توں کے علما اور دانشوروں کو جمع کیا اور دوسری زبانوں سے ترجمہ حوصلہ افزائی کی، ریاست کی سرپرستی میں یہ کام شروع کیا گیا۔ ۸۳۲ء ـ خلیفہ المامون نے بغداد میں بیت الحکمت کی بنیاد رکھی۔ اس کے تھ اس نے ایک رصدگاہ، ایک کتب خانہ اور ایک دارالترجمہ قائم یہاں دوسری زبانوں سے ترجمہ کا کام وسیع پیمانہ پر شروع ہوا۔ م بغداد کے ۰ ۵ سال کے اندر یونانی کتابوں کا بیشتر ذخیرہ عربوں کی یل میں آگیا تھا۔

عباسی دور میں کاغذ کی صنعت ایک گھریلو صنعت بن چکی ی، چنانچہ کثرت سے کتابیں لکھی جانے لگیں، دسویں صدی عیسوی میں بہ (اسپین) کے کتب خانہ میں چار لاکھ سے زائد کتابیں تھیں۔

اس زمانہ میں یورپ کا یہ حال تھا کہ کیتھولک انسائیکلو پیڈیا مطابق کینٹربری کا کتب خانہ تیرھویں صدی عیسوی میں ۱ ۵ تھی ۱۸۰۰ کتابوں کے ساتھ مسیحی کتب خانوں کی فہرست میں پہلے نمبر پہ تھا، ہوتا تھا، نویں صدی عیسوی کے نصف اول میں جغرافیہ سے خوارزمی اور اس کے ساتھیوں نے معلوم کیا تھا کہ زمین کا محیط بیس ہزار اور اس کا قطر ۶۵۰۰ میل ہے، یہ صحت نہایت حیرت انگیز ہے۔

دنیائے اسلام میں یہ سرگرمیاں ایسے زمانہ میں جاری تھیں جبکہ سارے کا سارا یورپ زمین کے چپٹی ہونے کا قائل تھا۔ بارہویں صدی کے وسط میں الادریسی نے دنیا کا ایک نیا نقشہ بنایا اس نقشہ میں اس نے دریائے نیل کا منبع بھی دکھایا جسے اہل یورپ انیسویں صدی میں جاکر دریافت کے قابل بنے۔

مسلمانوں نے اہل یورپ کو زمین گول ہونے کا عقیدہ اور مدوجزر کے اسباب کا تقریباً صحیح نظریہ منتقل کیا، تاریخ کے محققین نے کہا ہے کہ اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عرب سائنس وفلسفہ میں یونان کے شاگرد تھے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ وہ یونانی علوم کے صرف مترجم نہ تھے بلکہ انھوں نے خود اپنی طرف سے بہت زیادہ اضافے کیے ہیں، عربوں نے طبی کالج قائم کیے، اسپتال بنائے، جو اس سے پہلے یونان میں نہ تھے۔ خلافت عباسی کے دور میں بغداد دنیا کا سب سے پہلا طبیہ کالج تھا جو قائم کیا گیا۔ قاہرہ میں ایک ایسا اسپتال بنایا گیا جس میں بیک وقت ۸۰۰۰ آدمی رہ سکتے تھے، اس میں عورتوں اور مردوں کے وارڈ بنے ہوئے تھے، اسی طرح مختلف بیماریوں کے شعبے الگ الگ تھے۔

ہر ایک مرض کے لیے ماہر اطبا تھے۔ اس میں دوسرے مختلف انتظامات کے ساتھ ساتھ لائبریری اور لکچر روم بھی تھا۔ زکریا الرازی نے (م ۹۲۲) نے دنیا کی پہلی انسائیکلو پیڈیا الحاوی تیار کی۔ اس ضخیم کتاب میں ہر قسم کے امراض اور ان کی دواؤں کا مفصل تذکرہ تھا اس کتاب کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر یورپ میں پھیلی۔

ابن سینا (م ۱۰۳۷) نے عرب اطباء کے درمیان غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اس کی مشہور کتاب القانون فی الطب، یہ کتاب بھی لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر یورپ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب نے بقراط، جالینوس کی کتابوں سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ عرب طب گیارھویں صدی میں

۶ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا تھا۔

ابو اسحاق ابراہیم بن جندب تاریخ میں پہلا مسلم سائنس داں ہے جس نے دوربین کو ایجاد کیا۔

آٹھویں صدی میں پہلی بار محمد بن احمد البیرونی نے زمین کا محیط معلوم کیا۔ عبداللہ البیطار (م ۱۲۴۸) نباتات کا بہت بڑا ماہر تھا۔ فلپ ہٹی نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے نباتات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے افریقہ۔ ایشیا کے بڑے حصہ کا سفر کیا۔ ڈیڑھ ہزار پودوں کی مفصل معلومات کو درج کیا۔ یہ کتاب بھی مترجم ہو کر یورپ میں شائع ہوئی۔ اسلام دورِ جدید کا خالق، غرض کہ فلسفہ طب۔ سائنس۔ ریاضی۔ فزکس۔ کیمسٹری، علم ہندسہ، کیمیکل سائنس کے تمام علوم و فنون میں مسلمانوں نے زبردست کارنامے انجام دیے ہیں۔

یہ صرف چند متفرق اور غیر مرتب حوالے تھے جو اس حقیقت کی وضاحت کے لیے کافی ہیں بلکہ اسلام کا ظہور اور اسلامی انقلاب ہی سائنس و تحقیق اور اس دورِ جدید کا خالق ہے جس کا سہرا مسلم سائنس دانوں کے سر ہے۔

بعد میں جب صلیبی جنگوں کی بنا پر تباہی مچی تو مسلم حکومتیں خانہ جنگی کا شکار ہوئیں اور اس سے۔ اہل یورپ نے فائدہ اٹھا کر مسلم سائنس دانوں کی تحقیق و تصنیف کو اپنی زبانوں میں منتقل کر لیا۔ اور اسی کو بنیاد بنا کر سائنسی تحقیق کے جدید دور میں کامیاب ہوئے اور آج مسلم سائنسی علوم کے طفیل میں دنیا کے چودھری بن بیٹھے ہیں۔

آج سائنسی علوم کے فروغ دینے کا یہی مقصد ہے کہ مسلمان اپنے کھوئے ہوئے علمی مقام کو حاصل کریں۔ کیونکہ آج اسلام دشمن طاقتیں ہتھیاروں سے نہیں بلکہ عصری علوم بالخصوص سائنس میں کما حقہ کمال پیدا کرنے سے ہی پسپا ہو سکتی ہیں، اور یہی سائنسی علوم کی قوت مسلمانوں کو ایک بار پھر دنیا کا سرتاج بنا سکتی ہے اور یہی اسلامی سائنسی انقلاب اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا زبردست سبب بن سکتا ہے عہدِ اسلامی میں مسلمانوں کے سائنسی کارناموں کو پیش کرتے ہوئے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم عصری علوم کی ترویج کی ضرورت ہے۔

ضرورت کیوں نہیں؟

اس سوال کے جواب میں قائلینِ عدمِ ضرورت کا یہ خیال ہے کہ دینی مدارس کا بنیادی مقصد اسلام کے اساسی علوم کی حفاظت، اشاعت اور اسلامی تہذیب و تمدن کو فروغ دینا ہے، اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ایسے افرادِ معاشرہ کو فراہم کرنا ہے جو علمی، تحقیقی میدانوں میں مخالف سرگرمیوں کا دفاع کر سکیں، اور الحاد بے دینی کے زہریلے اثرات سے ملتِ اسلامیہ کو بچائیں۔

دینی مدارس کا یہ ایک مخصوص اور مقدس مقصد ہے، جو امت کے ہر ہر فرد کی انفرادی اور اجتماعی ضرورت ہے جو دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی نجات سے بہت زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ ایسے مقصد کے حامل ادارے دنیوی شغلوں سے لاتعلق رہیں تو زیادہ بہتر ہے، ورنہ مستقبل میں وہ اپنا مقصد بھی فوت کر دیں گے۔

اس خیال کے پیش نظر بعض کا خیال یہ ہے کہ دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں عصری علوم کی ضرورت نہیں ہے ایک سبب اس خیال کے اپنانے کا یہ بھی ہے کہ دینی مدارس میں عصری علوم کی جو آواز اٹھائی جا رہی ہے اور اس کے شیدائی اس کے بے شمار فوائد کو بڑے خوب صورت پیرائے میں پیش کر رہے ہیں، یہ محض لفاظی اور خیالی محل ہے، عملی اقدام کی صورت میں کفِ افسوس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

دورِ حاضر میں عصری علوم ہی پر اگر ملتِ اسلامیہ کی سرخروئی اور ترقی کا دارومدار ہے تو پھر مدارسِ دینیہ کے نصابِ تعلیم کے اندر ان علوم کی ترویج پر بحث و مباحثہ کے بجائے یہ عظیم انقلابی مقصد کو کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی بے شمار یونیورسٹیاں، چھوٹے بڑے کالجس جو مسلم حکومتوں اور مسلم اداروں کے زیرِ اہتمام چل رہے ہیں ان کے ذریعہ بروئے کار کیوں نہیں لایا جاتا۔ جبکہ ایسے عصری علوم کی درس گاہیں بھی وافر تعداد میں ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کا سوادِ اعظم بھی اسی کی جانب مائل ہے ذہین اور ذکی طالبانِ علوم حاصل ہیں

ملتِ اسلامیہ مسلم سائنسی انقلاب کو بروئے کار لانے میں مدارس کے مقابلے میں ان اداروں سے زیادہ تعاون لے سکتی ہے۔ کیونکہ مدارس تنگ حال بھی ہیں اور تنگ مال بھی۔ قوم کے نونہال چھٹ چھٹا کر آتے ہیں۔ اس لیے ان سے سائنس داں اور ریاضی داں، اور کسی ایجاد کا موجد بننے کی آرزو بیکار معلوم ہوتی ہے۔ لیکن طرفہ تماشہ ہے کہ مذکورہ یونیورسٹیاں اور مسلم رصد گاہیں اپنی طویل مدتِ تعلیم کے باوجود کسی قابلِ ذکر سائنس داں اور ریاضی داں پیش کرنے سے قاصر معلوم ہوتی ہے۔ تمام ملتِ اسلامیہ کا عصری علوم پر مائل ہونا اور مدتِ تعلیم کا دراز ہونا یہ ایسے امور ہیں کہ اب تک ایک ٹیم مسلم سائنس دانوں کی اور محققین کی ملک و ملت کی خدمت کرتی نظر آتی۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا۔ اگر ابن سینا اور البیطار، رازی اور خوارزمی پیدا کرنا ہے تو حصول سائنس و تحقیق کے لیے علم کی دیوانگی کا وہی طریقہ اور لگن شرط ہے جو ان سائنس دانوں میں پائی جاتی ہے، صرف کاغذی سند اور روٹی کی ضرورت پوری ہونے کے لیے حصولِ علم سائنس طالب علم کو حقیقی سائنس داں نہیں بنا سکتی۔

اس لیے ہم یہی کہتے ہیں کہ مدارس جس میدان میں جس مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں انھیں اسی حال پہ رہنے دیجیے۔ دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں عصری علوم کی ترویج کی ضرورت نہیں ہے۔

متضاد آرا کی روشنی میں صحیح فیصلہ

دونوں آرا اخلاص اور ملت کی ہمدردی پر مبنی ہیں۔ اور ہر ایک کا استدلال بھی حقائق کو سمیٹے ہوئے ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے آپس میں ایک دوسرے سے متنفر ہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اسی لیے امت مسلمہ کی خاطر دونوں مزید ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتے ہیں تاکہ دونوں کا اجتماع ملک و ملت کے لیے اور زیادہ نفع کا باعث بنے۔ لیکن غلط فہمیاں یوں پیدا ہو گئیں کہ عدم ضرورت کے قائلین یہ سمجھ بیٹھے کہ عصری علوم کو اپنا کر اساسی حقیقی علوم کی حفاظت و تعلیم بے معنی ہو کر رہ جائیں گی اسی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے کانفرنسوں اور سمیناروں میں غور و خوض کے لیے بلایا جاتا ہے کہ باہم مشوروں سے ایسا نصابِ تعلیم مرتب کریں گے کہ اصل مقاصد و مضامین کو متاثر کیے بغیر عصری علوم کو ترویج دی جائے اس ترمیم و اضافہ سے ایسے خوش گوار نتائج سامنے آئیں ہم عملی میدان میں اسکی ضرورت محسوس کریں۔ کیونکہ یہ سائنٹیفک دور ہے اور ہر چیز حتی کہ طریقۂ تعلیم بھی تغیر پذیر ہے اس لیے ایسے نصاب کی ضرورت ہے جو زمانہ کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اور ہمارے فارغین علماء و فضلا ہر میدان میں اپنا داعیانہ کردار نبھا سکیں اور یہ کمال ہمارے فارغین میں عصری علوم کے اپنائے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ ترمیم و اضافہ ضرورت کی حد تک ہوگا نہ کہ مکمل تبدیلی کی صورت میں اس میں ہماری کوشش یہ ہوگی کہ سائنس اور قرآنی تعلیم و تفسیر مسائل فقہ کے طریقۂ تعلیم اور عصری طریقۂ تعلیم میں جوڑ بیٹھ سکے۔ انشاء اللہ ہمارے لیے قرآن و حدیث اور فقہ کے افہام و تفہیم کے لیے عصری علوم کا ضروری اضافہ بے انتہا مددگار ثابت ہوگا۔ تاریخ بھی ایسے ضروری غیر دینی مضامین کے اضافہ پر شاہد ہے۔ اس کے ساتھ عصری علوم کے حامل اداروں کے لیے قائلین عدم ضرورت کا یہ مشورہ ہے کہ جس طرح ہم اہل مدارس کے لیے آپ فکرمند ہیں کہ ہم عصری تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ اسی طرح عصری علوم کے فضلاء ڈاکٹرس، انجینیرس، محققین و سائنس داں بھی اپنے دین و ایمان پر قائم رہ سکیں اور داعیانہ انداز سے اپنے علوم کا استعمال کر سکیں اس کے لیے ضروری ہے کہ عصری درس گاہوں کے نصابِ تعلیم میں بھی ایمانیات اور دینیات کو شامل کریں تاکہ دنیا و آخرت سُرخ روئی حاصل ہو۔ امید ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے مشوروں پر عمل کر کے ملتِ اسلامیہ کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند بننے کی کوشش کریں گے۔ وَبِاللّٰہِ التَّوفِیقِ اِلَّا بِاللّٰہ۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی

دینی مدارس میں
نصابِ تعلیم میں ترمیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟

مدارس عربیہ کو عام طور پر مصرف لاحاصل بلکہ ماڈرن طبقہ میں عضو معطل سمجھا جانے لگا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر جدید فکر سے متاثر نوجوان علماء کا بھی ایک طبقہ دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کو بیکار محض سمجھتا ہے۔ جہاں تک نصاب تعلیم میں خامی کی بات ہے اس اعتبار سے دینی مدارس کے نصاب میں ہی ترمیم کی ضرورت نہیں بلکہ پورے ملک کے نظام تعلیم میں ہی خامی ہے جس کو دور کرنا ضروری ہے۔ مدارس عربیہ کا نصاب اس اعتبار سے تو درست ہے کہ وہ صرف علم دین پر ہی زور دیتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی مدارس کی وجہ سے مسلمانوں کا غریب طبقہ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ طبقہ جس کو ہندوستانی سماج میں چھوٹی برادری کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے اکثر جو علم سے محروم رہتا تھا۔ اور ہندوستان کی مسلم تاریخ میں اس طبقے کے بہت کم افراد علم حاصل کر سکتے تھے۔ ہندوستان کے اس دور کے علماء کی بھی ایک کمی کہی جا سکتی ہے لیکن جب سے مدارس عربیہ کا قیام عمل میں آیا ہے ان مدارس کے ذریعہ ان غریبوں نے بھی علم حاصل کیا ہے آج بھی یہ مدارس عربیہ ان کی تعلیم کا اہم ذریعہ ہیں۔

تعلیم کا طریقہ اور موضوعات

بچے کو جو موضوعات پڑھائے جاتے ہیں ان سے بچے کے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور ان سے نئے افق پیدا ہوتے ہیں اس مرحلے میں تعلیم و تربیت کے لیے موضوعات کے انتخاب میں حکمت کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ مدرسے کی تعلیم کا نظام جو بچے کی چار پانچ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے بلوغ کے دور تک جاری رہتا ہے اور وہ بتدریج وسیع اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے اور بہت حد تک گھر کے نظام سے بھی مستغنی بنا دیتا ہے۔

نصابِ تعلیم کی اہمیت

انسانی ذہن و فکر کی تعمیر میں قول و فعل، فکر و عمل اور کردار سازی میں نصاب تعلیم اور نظام تربیت سب سے موثر کردار ادا کرتا ہے نظام تعلیم اور تربیت ایک موثر ترین عامل ہے وہ افراد جن کے مجموعہ سے سماج بنتا ہے وہ عمر کے ابتدائی حصہ میں جو تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں ان سے ان کی زندگیاں خاصی متاثر ہوتی ہیں۔ اور پھر یہ افراد

مہتمم ادارہ اصلاح الفکر، مسجد بالوگنج، شملہ ۵

سماج کے اصل عناصر بنتے ہیں۔ اس طرح تعلیم نوجوانوں کے ذریعے عمل کے ذریعہ سے جماعت اور معاشرہ پر اثرانداز ہوتی ہے۔

اصول و مزاج سمجھنے کی ضرورت

نصاب تعلیم و تربیت کا تعلیم کے مقصد سے بڑا گہرا تعلق ہے جیسا نصاب ہوتا ہے اس کے ویسے ہی نتائج سامنے آتے ہیں اور اسی کے مطابق نسلیں تیار ہوتی ہیں معاشرہ میں تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کرنے والے لوگ ایسے نصاب کو پسند کرتے ہیں جو معاشرہ میں رائج قدروں اور امنگوں کا آئینہ دار ہو۔ نئی نسل کی ترقی و بہبود کے لیے اسی نصاب کو اختیار کرنا چاہیے۔ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ طالب علموں کے ذہن کو دیکھا جائے کہ کیا وہ اس دور کے لیے ایک اچھے عالم کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کو نہ صرف یہ کہ دینی علوم مکمل پڑھائے جائیں بلکہ دعوتی کام کے لیے جس علم کی بھی ضرورت ہو وہ اس کو مکمل پڑھائی جائے جیسے فقہ میں چند کتابوں پر اکتفا نہ کیا جائے۔ بلکہ فقہ کے جو نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں ان کا علم مکمل دیا جائے۔ اگر کوئی طالب علم ذہنی اعتبار سے کمزور ہے تو اس کو ضروری دینی معلومات کے بعد کوئی دست کاری سکھلادی جائے تاکہ وہ خودداری سے اپنی روزی کما سکے۔

نصاب و کتاب ذریعہ ہے

نصاب و کتاب حصول علم کا صرف ذریعہ ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ معاملہ بھی وسیلے اور ذریعے ہی کا کرنا چاہیے اس کو مقصد کا درجہ دے دینا نہ صرف غلط بلکہ مضر بھی ہے۔ مسلمانوں نے اپنے عہد ترقی میں نصاب و کتاب کو وسیلہ اور ذریعہ ہی سمجھا ہے۔ اسی بنا پر دوسری اقوام کے مقابلے میں ان کو برتری حاصل رہی اور دوسری قوموں نے ان کو استاد مانا اور ان سے استفادہ کیا۔ لیکن جب مسلمانوں پر زوال کے اثرات شروع ہوئے۔ تو تعلیم کے میدان میں جمود کا عمل داخل ہوا۔ ماہرین تعلیم و تمدن کی نظر میں وجہ تنقید بنا

حالات مدارس

حالات کے تقاضے اور خطرات کی پے در پے بجنے والی صدائے جرس بھی دینی مدارس میں کوئی بیداری تا ہنوز نہ پیدا کر سکی۔ پورے مسلم معاشرہ کے لیے ایک مہلک موقف ہے۔ عربی مدارس کتاب و سنت پر استقامت اور صلابت کے طریقہ پر اصرار کی قابل قدر کوشش کے ساتھ نئے اور جدید مسائل پر توجہ اور نئے سوالات کے جوابات کی فکر کما حقہ نہ کر سکے۔ اور جو دین کے نمائندے اور دین کے داعیوں اور مبلغوں کو ڈھالنے کے عامل تھے ان کا تعلق تہذیب و تمدن کی لازوال قوت سے کمزور پڑ چکا جدید افکار و نظریات کی واقفیت کی روشنی کا وہاں گزر تک نہیں رہا جو ناقابل تلافی نقصان کا باعث بنا ہے۔ اسی وجہ سے ان مدارس کے فارغین کا بہت بڑا طبقہ دینی دعوتی کام بھی کما حقہ ادا نہیں کر سکتا

مدارس عربیہ کا نصاب

جہاں تک ہمارے مدارس کے نصاب کا تعلق ہے اس کے تین بڑے جز بنتے ہیں۔ پہلا ہماری ضرورت کے مطابق زبان و ادب کا جز۔ دوسرے مذہبی اور اخلاقی علوم۔ تیسرے زندگی کے سماجی علوم۔

تبدیلی نصاب کا تعلق

میری ناقص رائے میں یہ ہے کہ قرآن مجید اور صحاح ستہ کا متن تاقیامت شامل نصاب رہے گا اور رہنا بھی چاہیے۔ ان دونوں مضامین کو مستثنیٰ کر کے باقی سب مضامین اور کتابوں میں تبدیلی کی گنجائش ہے۔

علم تفسیر اور فقہ: ان دونوں عنوان پر جو کتابیں درس نظامی

میں داخل ہیں وہ ناکافی ہیں چونکہ نئے نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں اس لیے تفسیر اور فقہ کو اولیت دے کر مزید کتابوں کا اس میں اضافہ کیا جائے۔ مسلم پرسنل لا، جو ہمارے ملک میں رائج ہے اس کو بالتفسیر پڑھایا جائے تاکہ علمار اگر کسی بھی مسئلے پر بحث کریں تو ان کو پوری معلومات ہو۔ ملک کے آئین نے جو ہمیں بنیادی حقوق دیے ہیں ان کی تعلیم دینا بھی ضروری ہے تاکہ علمار، ملک کی ترقی میں برابر شامل رہیں۔

علم تاریخ

علم تاریخ سے ہمارے مدارس قریب قریب ناواقف ہیں، جبکہ علمائے ہندوستان کی آزادی میں برابر حصہ لیا ہے مگر ہم اس سے ناواقف رہتے ہیں تاریخ کو ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جانا ضروری ہے

علم نحو وصرف

علم نحو وصرف میں ایسی کتابیں لائی جائیں جن سے عربی زبان بولنے پر قدرت حاصل ہو اس سلسلے میں بلاد عربیہ کے نصاب سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

سماجی وانسانی علوم ومعلومات

اخلاقیات اور فکری علوم کے ساتھ ساتھ سماجیات کا اضافہ کوئی برا اضافہ نہیں ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بھی اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ وہ قابل قدر اضافہ ہے۔ انسان کی سماجی ضرورت زمانے کے فرق وتبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اور موجودہ عہد میں دنیا کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے قریب آجانے، انسانی سماجوں کے مابین رشتے اور تعلقات بڑھ جانے کے باعث سماجی علوم ومعلومات سے واقفیت ازبس ضروری ہے۔ اسی کے تحت ضروری سائنسی علوم بھی آجاتے ہیں جن کا حاصل کرنا دعوتی کام کو بڑھاوا دینے کے لیے بھی ضروری ہے، مغربی ممالک میں جو لوگ بھی دعوتی کام کو انجام دے رہے ہیں ان میں علماً کا طبقہ بہت کم ہے اس کمی کی وجہ ان علوم کا حاصل نہ کرنا ہے، جو اس دور میں ضروری ہیں۔

یورپ سے استفادہ اور مغربی علوم سے استفادہ

زندگی کے تجرباتی علوم سے یورپ کو دنیاوی زندگی میں فتوحات ملی اور مادی زندگی کے میدان میں غلبہ حاصل ہوا۔ اس کی وجہ سے دیگر قوموں کو بشمول مسلمان ان علوم وتجربات اور کامیابیوں کا جائزہ لینے اور قابل استفادہ کوششوں میں استفادہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ خاص طور پر اس لیے کہ مسلمانوں کی آخری صدیاں انحطاط اور علمی جمود میں گزریں۔ جس کی وجہ سے ہمیں ایک طرف دین، اخلاق اور ان کی صفات اور اعلیٰ نظریات میں اپنے اسلاف کے علوم وتجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تو دوسری طرف دنیاوی ترقی وتمدن کے لیے ان انکشافات اور تحقیقات سے بھی فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے جو ہمارے اسلاف کی ہی کوششوں کے بعد ظہور میں آئیں۔ غرض یہ ہے کہ "الحكمة ضالة المومن" کے تحت ہمیں جدید علوم سے اور جدید تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

آخری گزارش

دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کتب اس معنی میں اگر ہوجائے کہ جدید مسائل سماجی اور اخلاقی علم علمار کے طبقہ کو ہو۔ تو میرے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر علم تفسیر علم فقہ علم حدیث میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی نہ ہونی چاہیے بلکہ زمانے اور حالات کے مطابق اضافہ کیا جائے اور سائنسی علوم انگریزی وہندی زبان کو داخل نصاب کر دیا جائے۔ ایک ایسا بورڈ تشکیل کیا جائے جو پورے ملک کے جید علمار پر مشتمل ہو۔ جس کے تحت جملہ مدارس عربیہ کے سالانہ امتحانات لیے جائیں اور وہ بورڈ حکومت ہند سے منظور شدہ ہو۔ اس سے ہمارے علمائے دین میں خود اعتمادی اور خودداری پیدا ہوگی اور مسلمانوں کا صاحب حیثیت طبقہ بھی علم دین حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس سمینار میں ایک کمیٹی تشکیل دے دی جائے۔ جو مدارس عربیہ کے ذمہ داران سے گفتگو کرے تاکہ یہ بورڈ جلدی بن جائے جو کچھ میں نے گزارشات کی ہیں ہے کہ اس پر غور کیا جائے گا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں خلوص سے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے

حکیم عبدالحق خاں

مدارسِ اسلامیہ کے لیے جدید نصابِ تعلیم

وطن ہند کے عربی / اسلامی مدارس کے لیے جدید نصاب تعلیم جس میں ریاضی، سائنس اور تاریخ و معاشیات جیسے عصری علوم شامل ہوں، ناگزیر ضرورت بن چکا ہے۔ اس موقف کے حامی نہ صرف علماء دین و دنیا ہیں بلکہ وہ عام مسلمان اس کا تقاضا کر رہے ہیں جن کے بچے ان مدارس اور کالجز میں تعلیم پاتے ہیں۔ دراصل تعلیم کی دو بالکل الگ دھاراؤں نے جو نتائج دیے اور جو نسل نو سامنے آئی اسے دیکھ کر ہر ذی ہوش مستقبل کے لیے فکرمند ہے۔ اس پر غور و فکر کے لیے ارباب ملت اکٹھا ہوئے اور کئی بار کانفرنس و سیمینارز منعقد ہو چکے ہیں۔ اب یہ تحریک تجربہ اور نفاذ کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ کیا اور کس مقدار میں پڑھایا جائے اس پر بھی کافی حد تک بحث ہو چکی ہے۔ جدید نصاب نافذ کرنے میں جو دشواریاں آئیں گی اس پر بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مرکز فروغ سائنس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر انتظام منعقد ہونے والی پچھلی کانفرنس جو "مدارس عربیہ میں سائنسی علوم کی ترویج" کے نام سے ہوئی تھی اس میں جو مقالے پڑھے گئے تھے اور قراردادیں پاس ہوئی تھیں اگر اس کی روداد دیکھی جائے تو یہ سب کچھ مل جائے گا۔ مثلاً سائنس و ریاضی وغیرہ داخل نصاب کرنے پر مصارف بڑھ جائیں گے اور سب سے مشکل بات یہ ہے کہ مدارس کا موجودہ نصاب بذات خود اتنا بوجھل ہے کہ مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ اساتذہ و کتب کی فراہمی، تجربہ گاہوں کے اخراجات وغیرہ۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ اگر کوئی کام مشکل ہے مگر مفید ہے تو ہم اسے ہر قیمت پر کر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور خدا اس میں ہمیں کامیابی سے نوازتا ہے۔ اگر کام کی تکمیل کو نہ بھی پہنچے پھر بھی ہم ایک مفید تحریک شروع کرنے کا فائدہ ضرور پاتے ہیں۔ اس لیے فنڈ کتب، اساتذہ کی فراہمی کوئی بہت دشوار مسائل نہیں ہیں۔ سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ مدارس عربیہ کا نصاب پہلے ہی سے بوجھل ہے اگر مزید مضامین اس میں داخل کر دیے گئے تو سارا نظام معطل ہو سکتا ہے۔ یہ خدشہ کافی حد تک صحیح اور وزن دار ہے۔ اس مسئلے کو حل کیے بغیر کچھ بھی کرنا نقصان دہ ثابت ہوگا کیونکہ کسی اور مضمون کو پڑھنے پڑھانے کے لیے مدارس میں فی الحال کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس مشکل مسئلہ کا حل یہ ہے کہ طریقۂ تدریس کو بدلا جائے۔ درس و تدریس کا وہ تیز رفتار طریقہ اپنایا جائے جو عصر جدید کی دیگر درس گاہوں میں رائج ہے۔ کتابوں کی شرحیں نہ پڑھا کر فنون کی تعلیم دی جائے، مضامین کی تدریس ہو۔ جدید طریقۂ تدریس (Pedagogy) اور جماعت وار تعلیم کے ذریعہ وقت کے بے جا اسراف کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح جدید مضامین کے لیے وقت فراہم ہو سکے گا۔ نیز یہ کہ کل تعلیمی مدت کو بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ دشواری بھی ختم ہو سکتی ہے اور مدارس میں سائنس و ریاضی کی تعلیم کو جگہ دی جا سکتی ہے۔

جدید نصاب تعلیم کیا ہو؟ اور مقدار خواندگی کتنی ہو؟ اوقات درس

مدرسہ قرآنیہ آدم پور اکبر، جون پور ۔ ۲۲۲۰۰۱

کیا ہوں؛

اس کا ایک اجمالی خاکہ دیا جا رہا ہے۔ یہ حرف آخر نہیں بلکہ ایک ابتدائی کوشش ہے۔ اس نصابی خاکے میں عربی و فارسی بورڈ یوپی الٰہ آباد سے منظور شدہ مدارس کے درس عالیہ کے نصاب کی بھی رعایت کی گئی ہے۔ کیونکہ خاصی تعداد ایسے مدارس کی بھی ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ مدارس بھی اس سے متاثر ہوں گے بلکہ عربی فارسی بورڈ بھی اپنے نصاب میں کچھ اسی قسم کی ترمیم و تبدیلی کا خواہاں ہے۔

کل تعلیم کو تین مراحل ابتدائیہ، متوسطہ اور عالیہ میں تقسیم کر دیا جائے اور کل مدت تعلیم آٹھ جمع دو، جمع دو جمع تین جمع دو کے تحت سترہ برس کر دی جائے۔ ابتدائیہ کی تعلیمی مدت آٹھ برس (پانچ + تین کے قاعدے پر) ہوگی، اس کے بعد متوسط کا مرحلہ ہوگا جس میں ۲ + ۲ کے اصول پر دو امتحانات ہوں گے جن کی مدت تعلیم چار برس ہوگی۔ اس کے بعد عالمیت کی ڈگری ۳ برس کی تعلیم پر ہوگی اور آخری ڈگری فضیلت ہوگی۔ جس کی تعلیمی مدت دو برس (مثل ماسٹر ڈگری) ہوگی۔ موخرالذکر دونوں ڈگریاں مرحلۂ عالیہ میں ہوں گی۔ اور ہونہار و ذہین طلبہ کو فضیلت کے بعد کسی عنوان پر تحقیق و تخصیص کا موقع دیا جائے اس کے علاوہ Vocational کورسس بھی چلائے جائیں۔ جیسے تدریسی ماہر صحافت وغیرہ۔ خط جو کہ ہر مدرسہ کا لازمہ ہے اسے متوسط کا ڈپلوما تصور کیا جائے مگر اس کے ساتھ ضروری دینیات کے علاوہ کتابت، خطاطی، ٹائپ وغیرہ میں سے بھی ایک چیز ضرور سکھائی جائے۔

مرحلہ وار تعلیم کی تفصیل

شمار	درجہ، امتحان/ڈگری	مدت تعلیم	مرحلہ کا نام	مساوی بدرجہ
۱.	تحتانیہ (۱ - ۵)	۵ برس	ابتدائیہ	پرائمری پنجم
۲.	وسطانیہ (۶ - ۸)	۳ برس	"	جونیر ہائی اسکول
۳.	فوقانیہ (اول و دوم)	۲ برس	متوسطہ	ہائی اسکول
۴	مولوی (اول و دوم)	۲ برس	"	انٹرمیڈیٹ
۵.	عالم (اول، دوم، سوم)	۳ برس	عالیہ	بیچلرس ڈگری
۶.	فاضل (اول، دوم)	۲ برس	"	ماسٹر ڈگری

امتحانات یا ڈگریوں کے جو بھی نام رکھے جائیں مگر تعلیمی مدت میں کمی نہ کی جائے۔

درجہ وار مضامین اور ہفتہ وار تدریسی گھنٹیاں

درجات تحتانیہ — مضامین مع پیریڈ

درجہ								
اول	اردو	عربی قاعدہ و پارہ عم ناظرہ	حساب	دینیات	عام معلومات	ڈرل		
	۱۲	۱۲	۱۲	۲	۱	۳		
دوم	اردو	ناظرہ قرآن	دینیات	ہندی	حساب	عام معلومات مع ڈرل		
	۱۲	۱۲	۲	۳	۱۲	۳		
سوم	اردو	ناظرہ قرآن	دینیات	ہندی	حساب	تاریخ و جغرافیہ	سائنس	ڈرل
	۲	۱۲	۳	۲	۱۲	۳	۳	"
چہارم	اردو	ختم ناظرہ قرآن	دینیات	ہندی	حساب	تاریخ و جغرافیہ	سائنس	ڈرل
	۲	۹	۳	۲	۹	۲	۲	"
پنجم	اردو	عربی زبان	دینیات	ہندی	حساب	تاریخ و جغرافیہ	سائنس	ڈرل
	۲	۲	۲	۲	۹	۲	۲	"

درجات وسطانیہ — مضامین کی ہفتہ وار گھنٹیاں

درجہ								
ششم، ہفتم اور ہشتم (VI، VII، VIII)	اردو	عربی زبان	ہندی	انگریزی	دینیات	ریاضی	تاریخ و جغرافیہ	سائنس
	۲	۲	۲	۲	۲	۲	۲	۲

مرحلۂ دوم میں دو امتحانات فوقانیہ اور مولوی کے نام سے دو دو برس کی تعلیم پر مشتمل ہوں گے جو بالترتیب ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے معیار کے ہوں گے اور ان میں مضامین کے تدریس کی تفصیل حسب ذیل ہوگی۔

فوقانیہ سال اول و دوم:

لازمی مضامین	ہفتہ وار گھنٹیاں	اختیاری مضامین	ہفتہ وار گھنٹیاں
۱. عربی ادب	۹	۱. سائنس طبیعیات و کیمیا	۹
۲. قرآنیات و عقائد	۹	۲. حیاتیات	۶
۳. فقہ و حدیث	۶	۳. معاشیات	۶
۴. ریاضی	۹	۴. جغرافیہ	۶
		۵. انگریزی/ہندی	۶
		۶. معقولات	۶

نوٹ : اختیاری مضامین میں سے صرف دو مضامین کا انتخاب کیا جائے گا۔
۱ اس طرح کل ۶ مضامین کی تعلیم ہوگی۔ حیاتیات بغیر سائنس کے نہ دی جائے اور ریاضی میں ارتھمیٹک، الجبرا اور جیومیٹری کی ہی تعلیم دی جائے گی۔ فلکیات وغیرہ سے گریز کیا جائے۔

مرحلۂ دوم یعنی متوسط کا دوسرا امتحان مولوی نام سے دو برس کی تعلیم پر مشتمل ہوگا اس میں ۲ لازمی اور تین اختیاری مضامین ہوں گے اس
۱ طرح کل پانچ مضامین کی تعلیم ہوگی۔

مولوی سال اول و دوم :۔

لازمی مضامین	ہفتہ وار تدریسی گھنٹیاں	اختیاری مضامین	ہفتہ وار گھنٹیاں
۱۔ عربی ادب	۹	۱۔ طبیعیات	۹
۲۔ قرآنیات و سیرت	۶	۲۔ کیمیات	۹
حدیث و فقہ	۶	۳۔ حیاتیات ریاضی	۹
		۴۔ جغرافیہ	۹
		۵۔ انگریزی/ہندی/فارسی	۹
		۶۔ معقولات	۹
		۷۔ معاشیات	۹
		۸۔ خطاطی و ٹائپ	۹
		۹۔ تاریخ عرب و اسلام	۹

نوٹ: اختیاری مضامین سے صرف ۳ مضامین کا انتخاب کیا جائے گا۔ سال آخر کا امتحان فائنل امتحان ہوا کرے گا۔

مرحلۂ سوم یعنی عالیہ میں دو ڈگریاں بالترتیب عالم اور فاضل ہوں گی اول الذکر کی تعلیمی مدت کم از کم ۳ برس اور آخر الذکر ڈگری کورس کی تعلیمی مدت ۲ برس ہوگی اور ہر برس کے امتحانات کے نمبرات کو جوڑ کر سال آخر میں نتیجہ مرتب کیا جائے گا۔ عالمیت کو ۳ گروپ میں تقسیم کیا جائے اور طالب علم کی صلاحیت اور دلچسپی کے لحاظ سے کسی ایک گروپ میں داخلہ دیا جائے۔ یہ گروپ دینی، ادبی اور فنی ہوں گے۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

الف ۔ عالم دینیات کے لیے حسب ذیل مضامین تجویز کیے جاتے ہیں۔
۱۔ قرآنیات و عقاید، ۲۔ حدیث و اصول حدیث، ۳۔ فقہ و اصول فقہ۔ تاریخ و سیرت اور فرائض۔

ب۔ عالم ادبیات کے لیے مندرجہ ذیل مضامین تجویز کیے جاتے ہیں۔
۱۔ عربی ادب/فارسی ادب، ۲۔ انگریزی/ہندی ادب، ۳۔ سیرت نبوی اور ثقافت عرب۔

نوٹ۔ ہر ایک میں سے ایک اس طرح کل ۳ مضامین کی تعلیم ہوگی۔

ج۔ عالم فنونیات :
۱۔ عربی، فارسی انگریزی ادب میں سے ایک، ۲۔ ثقافت عرب و اسلام یا تاریخ اسلام میں سے ایک، ۳۔ خطاطی و ٹائپ یا صحافت یا لائبریری سائنس میں سے ایک۔

مرحلۂ سوم، عالیہ کی آخری ڈگری فاضل کے لیے طالب علم کو درج ذیل میں سے کسی ایک مضمون کے انتخاب کی سہولت دی جائے

مضامین برائے فاضل :۔ قرآن، عربی ادب، فارسی ادب، فقہ، حدیث، تاریخ اسلام۔ اسلام اور ادیان عالم، ثقافت عرب و اسلام

مرحلۂ عالیہ میں صرف ان طلبہ کو داخلہ دیا جائے جنھوں نے فوقانیہ اور مولوی امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کیے ہوں اور آگے کی تعلیم میں واقعی دلچسپی رکھتے ہوں۔ ورنہ انھیں مولوی امتحان کے بعد پیشہ ورانہ ڈپلوما کورسیز میں بھیجا جائے۔

پیشہ ورانہ تعلیم میں ایکوکیشن، ووڈ کرافٹ، ریفری جریشن، وائر کنڈیشنگ ڈپلوما فارمیسی کورس، ڈرافٹس مین سول، موٹر میکینکس وغیرہ میں سے کسی ٹریڈ میں مولوی کا امتحان کے بعد انتخاب کی سہولت دی جائے۔ بہتر ہوگا کہ زراعت و باغبانی جیسے مفید پیشوں کی تعلیم کا بھی نظم کیا جائے۔ مگر یہ سب کسی ایک ہی ادارے میں ممکن نہیں ہے لہٰذا ہر بڑا ادارہ اپنی ضرورت و حیثیت کے لحاظ سے مختلف ٹریڈز کی تعلیم و ٹریننگ کا انتظام کرے۔

امتحانات کے لیے ایک مرکزی بورڈ قائم کیا جائے جو تمام اداروں کے امتحانات اپنی نگرانی میں کرائے اور اسناد و ڈگریوں پر بھی نگاہ رکھے اور معیار تعلیم کو اوپر اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

مدارس کے اساتذہ کو تدریسی ٹریننگ دینے کا انتظام کیا جائے اور انھیں جدید طریقۂ تدریس (Pedagogy) سکھائی جائے اور اس پر عمل درآمد کرایا جائے۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر ناممکن نہیں۔ بس وہ پس و پیش دور ہو جائے جو بارش کے پہلے قطرہ کو ہوتی ہے تو انشاء اللہ یہ ابر رحمت برسے گا اور ہماری کھیتیاں ہری ہو جائیں گی۔ خدا ہم کو آپ کو کامیاب کرے۔

جلال الدین وزیرآبادی

دینی مدارس میں
ترمیم نصاب کی ضرورت اور طریقۂ کار

دینی مدارس میں ترمیم نصاب کی ضرورت پر آج سے سیکڑوں برس پہلے علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا آزادؒ و مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے زور دیا تھا مگر اہل مدارس کی دیدہ دلیری اور حقائق سے چشم پوشی نے ان اسلامی قلعوں کو اس طرح مسمار کردیا ہے جیسے عراق و ایران کی جنگ نے اور موجودہ یمن کی خانہ جنگی نے منہ دکھایا ہے گویا کہ ؎

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا (اقبالؔ)

آج ہمارا فاضل عضو فاضل تسلیم کیا جاتا ہے۔ چیلنجوں کو قبول کرنے سے کتراتا ہے۔ احساس کمتری، عاجزی کا شکار بن جاتا ہے۔ ہاں البتہ چند دینی مسائل مثلاً وضو، نماز، حیض، انفاس، طلاق اور نکاح کے باب میں ملت کا شیرازہ بکھرتا نظر آتا ہے۔ ایک ایک گاؤں، محلہ میں کئی کئی مدارس، مساجد مسلکی معیار پر قائم کرتا چلا جاتا ہے اور اسٹیج پر یہ شعر بڑی خوش الحانی سے پڑھتا ہے ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا (اقبالؔ)

آج کے علماء دین کو محصور کر رہے ہیں۔ نہ انھیں زبان آتی ہے نہ تاریخ نہ علم شریعت کا مطالعہ ہے نہ قرآن مجید پر تحقیقی نظر اور علم حدیث تو فقہ کے بوجھ سے دبا ہوا ہے۔ تعصب، تنگ نظری، کشاؤ نے ایک ایسی اسپرٹ پیدا کر دی ہے جس سے پوری ملت انتشار کا شکار ہے۔ جو علم خلق خدا کو نفع رسانی کے لیے، کائنات کے اسرار پر پڑے پردوں کو اٹھانے کے لیے آیا تھا۔ طبقات الارض، علم الحیوانات کا علم کیوں مفید ہے فلکیات و سمندری علوم و فنون کی افادیت پر ابھارتا ہے۔ وہم نے بڑی تن آسانی سے غیروں کو وارث بنا دیا ہے، کیا ہمارا فاضل اور ان اسلامی قلعوں کے محافظ واقف ہیں۔ آپ ہی فرمائیں کہ یہ قلعے کیسے محفوظ رہیں گے؟

شخصیت سازی کا جو معیار اسلاف سے ملا تھا وہ آج ہماری دانست میں گم ہو گیا ہے۔ اسی طرح دین و دنیا دونوں اعتبار سے کمی آگئی ہے اور ہم نے بذات خود دین و دنیا میں ایک طویل فصیل قائم کر رکھی ہے۔ اور اس تقسیم کو اتنا پختہ کر دیا ہے کہ حرم من علما، کا میدان ہے اور انجینیرس، ڈاکٹرس، پروفیسرس کے ہاتھوں میں دنیا ہے جبکہ یہی علماء و فضلاء نماز اور عام دعاؤں میں ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار کا ورد کرتے ہیں۔

الجامعۃ الاسلامیہ، تلکنا، شیوپتی نگر، سدھارتھ نگر (یوپی)

تاریخ کے صفحات میں یہ واقعہ آپ نے پڑھا ہوگا کہ جب سر راس مسعود حیدرآباد کے ایجوکیشن منسٹر بنے اور حضور نظام نے ان کی قابلیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حیدرآباد جیسے عظیم علاقہ کے لیے تعلیم منتخب کیا تو آپ سرکاری دورے پر لندن تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے بہت ساری جگہوں کا دورہ کیا وہیں ایک پادری کی دعوت پر اس کے تعلیمی ادارے کو آپ نے دیکھا جو ہر ضرورت کی چیز سے آراستہ تھا وہاں کے بچوں کو باہر نہیں جانا پڑتا تھا۔ پادری نے اس ادارے کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ سر راس مسعود اس ادارہ کو دیکھتے رہے۔ وہ دیکھتا رہا۔ یہ خاموش رہے کوئی تبصرہ نہ فرمایا۔ پادری کو تکلیف ہوئی۔ حتیٰ کہ واپسی کا وقت ہوگیا وہ گاڑی پر بیٹھنے لگے۔ پادری سے نہ رہا گیا کہ ہمارے کیے دھرے کی تعریف نہ ہوسکی۔ اس نے پوچھا کہ آپ نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ تب سر راس مسعود نے سوال کیا کہ یہ بچے فارغ التحصیل کے بعد کہاں جائیں گے؟ کس دنیا میں داخل ہوں گے؟ پادری نے جواب دیا کہ اس دنیا میں داخل ہوں گے جہاں ہم آپ رہتے ہیں۔ سر راس مسعود نے فرمایا کہ اس دنیا میں تو شیطان بھی رہتے ہیں اور تم نے اپنے بچوں کو خالص فرشتہ بنادیا۔ یہاں کے شیطان ان کو فوراً مغلوب کردیں گے۔

آپ سارے حضرات سے سوال ہے کہ آج امریکہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس موقع پر اس کی تصویر، اس کی معلومات اس کی رپورٹ آپ کو T.V پر دکھائی دیتی ہے اور عالم اسلام اور اسلامی اداروں کی رپورٹ کیسی ہے؟ آخر کیوں؟ انھوں نے کل آنے والے حالات کا اندازہ آج ہی سے لگا رکھا ہے اور ہم اسی نصاب پر قانع ہیں جو ہزار سالہ ہے۔ یک رخہ ہے۔ جمود و تعطل سے ہم کنار ہے اسے گلے سے لگائے بیٹھے ہیں۔

دردمندان ملت! ہندوستان میں ہمیں پہلے برٹش سامراج و عیسائی سامراج سے مقابلہ تھا مگر آج برہمنیت اور کٹر ہندتو سے ہے۔ ایک طوفان ہے جس سے ملت اسلامیہ کو مقابلہ کرنا ہے۔ ہم صاحب کتاب صاحب رسالت، صاحب تاریخ، صاحب نسبت اور صاحب ایمان و عمل ہیں تو کیا یہ صرف قول سے پورا ہوجائے گا یا اس کے لیے عمل و عملی اقدام بھی ضروری ہے۔ اردو ٹائمز بمبئی اشاعت مجریہ ۵ر جون ۱۹۹۴ء کے سرورق پر جمعیت اہل حدیث کی ایک اجلاس کی کارکردگی پیش ہوئی ہے جس میں وزیر مملکت پی ایم سعید صاحب نے فرمایا ہے کہ مسلمان پوری آبادی کا 15٪ ہے اور تعلیمی میدان میں 3٪ ہے یہ معیار ترقی کا نہیں تنزلی کا ہے اور بغیر علم کے کوئی قوم ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتی۔ فانی نے کتنی سچی بات کہی ہے۔

؎ خود مسیحا خود ہی قاتل ہیں تو وہ بھی کیا کریں
زخم دل پیدا کریں یا زخم دل اچھا کریں

یہ دور قدیم منطق و فلسفہ کا نہیں بلکہ جدید سائنسی دور کا متقاضی ہے۔ جو انسان کے وجود سے لے کر عدم تک کے اسرار و رموز پر دسترس کا دعویدار ہے اور اتنے رموز و اسرار سے پردے اٹھا چکا ہے کہ حقائق کا علم رکھنے والے حضرات دست بدنداں ہیں چہ جائیکہ مدارس اسلامیہ کے رسمی طلباً اور نظر کو خیرہ کرنے والی دنیا کے طالب۔

اگر آج سے بہت پہلے ان علوم جدیدہ سے ہم مدارس کے طلباً واقف کار ہوتے تو جدید نئے فتنے جیسے بابری مسجد کا المیہ، اور اس جیسی بہت قدیم عمارتیں و عبادت خانے ان غیر مسلم اور ملت اسلامیہ کے مفاد کو نقصان پہنچانے والوں سے محفوظ رہتیں مگر ہم نے علم مناظرہ اور فرسودہ محاکات کی بھول بھلیاں میں محصور رہ گئے اور کتنے دور ہوگئے اس کا احصا ناممکن سا ہوگیا ہے۔ بقول شاعر ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم

نئے ہندوستان کی تعمیر میں صرف علوم جدیدہ کے ماہرین کی بھی ضرورت نہیں بلکہ مدارس اسلامیہ کے علما، فضلا، کی بھی ضرورت ہے جو امن و شانتی کے ساتھ بغیر کسی دنیاوی مصلحت کے دینی تقاضوں کو پوری کرتے ہیں۔ ایک اچھا شہری بننے کے لیے مدارس اسلامیہ کے طلبا و اساتذہ کو آگے آنا ہوگا۔ کیونکہ اگرچہ آج ان کے ہاتھ میں قوت دفع نہیں ہے تو اچھا شہری بن کر زندہ رہنے کی صلاحیت تو ہونی ہی چاہیے۔ ملک و ملت کے یہ آبرو اگر ان حقائق سے دور رہے تو امن و سلامتی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

اس لیے نصاب تعلیم میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔

طریقہ کار

۱۔ نہایت ہی اخلاص کے ساتھ ضرورت کی تکمیل کے لیے حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے ایک خط عملی اقدام کرنا جس سے نقل محض تماشا لب بام رہ جائے۔

۲۔ آنے والے کل کے مقابلے کے لیے اپنی انفرادیت و انا کو قائم کرنا ہوگا۔

۳۔ انتظامیہ کمیٹی اور اساتذہ کرام کو نئی لگن کے ساتھ ملک و ملت کی کشتی پار لگانے کے لیے سمجھوتہ کرنے کے عہد کے ساتھ طلبا کا داخلہ مدرسین کی تنخواہوں پر نظر ثانی کرنی ہوگی سائنس کے سبب طلبا کے داخلے کی شرائط میں ... اصول اپنانا اور ایک مضمون میں خصوصی لیاقت پیدا کرنے کی ذمہ داری لینی ہوگی۔

۴۔ ہفتہ کی ۳۶ گھنٹیوں میں ۶ گھنٹیاں نئے مضامین کے لیے رائج کرنی ہوں گی۔ اور امہات المضامین یعنی تفسیر و حدیث کے ساتھ سائنس، معاشیات، سیاسیات، صنعت و حرفت کی بھی اتنی ضرورت و افادیت محسوس کرنی ہوگی جتنی کہ امہات کی تسلیم کی جاتی ہے۔

۵۔ طلبا کو خصوصی کونسلنگ کرانی ہوگی اور انھیں اس طرح باور کرانا ہوگا کہ یہ فنون دین و دنیا دونوں کی کامیابی کے ضامن ہیں اور لازم و ملزوم بھی اس طرح خیریت جاں، راحت تن و صحت داماں کا خیال ترک کرنا ہوگا۔

۶۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، جامعہ ہمدرد دہلی، فاؤنڈیشن فار ایجوکیشن کو نئے نصاب کی تیاری میں تعاون دینا چاہیے اور بڑے مدارس کو مضامین تبدیلی کا رخ دینا چاہیے۔

۷۔ مرکز فروغ سائنس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو سائنسی مضامین کے نصاب کی تیاری اور طریقۂ کار میں پیش قدمی دکھانی چاہیے اور تدریس و ٹریننگ کے حصار سے نکل کر عملی درس و تدریس کے لیے جو بنائی جا سکے تاکہ مدرسہ کا عالم اور کالج کے عربی میں یکسانیت کا روپ آسکے۔

۸۔ مدارس کو جامع علوم و فنون کی تعلیم کے لیے قائم کیا جائے مسلکی عصبیت سے بلند ہوکر جامع عمر کی خدمت کی جائے تاکہ متعلقہ حلقہ ... فیہا نجید کم و منہا نخرجکم تارۃ اخری کی لت ٹوٹ سکے یعنی نقد امامت، موذنی، مدرسی، خطیب بن دینے عملی انقلاب کی راہ ہموار کی جائے۔

۹۔ یہ مدارس ہندوستان کی امانت و تہذیب ہیں ہم کو اچھا شہری بن کر ... کا نمونہ بننا ہے اور اللہ کی مخلوقات کو عبادت سمجھ کر ... مدارس کی حقائق طلبا کی ضرورت کے پیش نظر نظام ... اصلاح کے لیے آگے آنا ہے تاکہ ہمارے اسلاف کا فیض ... جاری و ساری رہے۔

۱۰۔ ہمت ... علما کرام و زاد سفر کی ذمہ داری مرکز فروغ سائنس و ... پر ہو جتنی نصاب تیار کیا رکھا جائے اور نصاب ... کیوں چپٹے اور آج بھی علما ... عوام کے ساتھ ... رہتے ہیں۔ ورنہ علما حضرات دست کشی کا رخ اختیار کر لیں گے۔

۱۱۔ سارے دینی مدارس کو اس پروگرام میں شریک نہ کیا جائے بلکہ منتخب مدارس کو ہدف بنایا جائے۔

۱۲۔ مدرسین کے ساتھ منتظمین جامعہ و مدرسہ کو بھی شریک حال کیا جائے تاکہ فیصلہ کے نفاذ میں مشکلات پیدا نہ ہوں۔

۱۳۔ علی گڑھ نہ بلا کر علاقہ کے اعتبار سے جملہ واقع مدارس کے اساتذہ و منتظمین کو اس طرح کے سیمینار میں شریک کیا جائے اور افادیت سے آگاہ کیا جائے۔

قادری شاہ مسعود احمد رضوی قادری چشتی

دینی مدارس کے لیے سائنسی نصاب کی تشکیل

گو کہ میرا موضوع دینی مدارس کے لیے سائنسی نصاب کی تشکیل درحقیقت دارہ پڑھانے کی مدت سے متعلق ہے۔ لیکن اس میں تھوڑی سی بحث دینی مدارس میں ترمیم نصاب کی ضرورت اور اس کا طریقۂ کار اور دینی مدارس میں سائنسی مضامین کی شمولیت کے سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رول سے متعلق بھی کی گئی ہے۔

قرآن سائنس کا مخالف نہیں ہے تقریباً ... ایسی آیات ہیں جن میں مظاہر فطرت یعنی سائنسی علوم سے متعلق ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ دور حاضر کے مسلمان اور قیامت تک آنے والی نسلیں رموز قرآن اور ارشادات احادیث نبویہ صلعم میں غور و خوض اور تحقیق کے ذریعہ ایسے ایجادات ظہور میں لائیں جس سے نہ صرف وہ بلکہ جملہ بنی نوع انسان استفادہ کر سکیں جیسے ہی مرکز فروغ سائنس کا مراسلہ خادم کے ہاتھ لگا مختلف مکتب خیال کے حامل حضرات سے تبادلۂ خیالات کرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاحب نے تو صاف اور صریح طور پر یہ کہہ دیا کہ دینی تعلیم کے مدرسوں میں سائنس کی قطعی ضرورت نہیں کیونکہ طلباء نے دینی تعلیم کو اپنا موضوع بنالیا ہے اور اگر سائنسی علوم کو شامل کیا گیا تو ان کا ذہن منتشر ہو جائے گا اور Concentration بگڑ جائے گا لہٰذا ان کو Distrub نہیں کیا جائے۔

میرے والد ماجد ایک ڈاکٹر اور ماہر امراض چشم ہیں۔ اپنی یونیورسٹی کی تعمیر کے دور کی باتیں اور واقعات سناتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں دو شعبہ جات تھے ایک تو شعبہ فنون (Science & Technology) اور دوسرا شعبہ دینیات شعبہ فنون کے طلباء جیسا کہ ہمارا تجربہ ہے کہ اکثر ترقی پسند اور ماڈرن ہوتے ہیں تو یہ طلبا شعبہ دینیات کو شعبہ جنون سے تعبیر کرتے تھے اس پس منظر میں میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو کلی نہ سہی کچھ حد تک تو لازمی طور پر سائنسی علوم سے روشناس کرایا جائے تاکہ ایک تو ان کی احساس کمتری جاتی رہے دوسرے وہ سائنس سے یکسر ناآشنا بھی نہ رہیں۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پستی کو پیش نظر رکھ کر انگریزی اور سائنسی علوم کی تعلیم کا اپنے معرکۃ الآرا [illegible] Mohammadan Institutes جو بعد میں ایک عظیم الشان اور باوقار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ یہاں کے فارغ التحصیل دنیا کی نامور ہستیاں ثابت ہوئیں اور اپنی لیاقت اور صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام سرسید احمد کا بہترین کارنامہ اور ہماری قوم پر احسان عظیم ہے۔ یہ منارۂ نور ہے اور تادیر یہ اپنی ضیا سے عالم کو نور بخشتا رہے گا۔

آپ تمام حضرات میری نظر میں محقق ہیں اب آپ مجھے بتلائیے کہ

صدر دینی تعلیمی کمیٹی۔ مدرسہ تعلیم الاسلام دار دو، مسجد شام بیگ اندرون دبیر پورہ حیدرآباد (آندھرا پردیش)

عہد نبوی صلعم میں سائنسی ایجادات کیا کیا ہوئیں؟ اور پھر اس کے بعد عہد خلفائے راشدینؓ پھر اس کے بعد عہد خلفائے بنی امیہ اور اس کے بعد خلفائے بنی عباس۔ عربوں کا کیمیا، الجبرا، ریاضی، طب علم، فلکیات وغیرہ کا ماہر ہونا ثابت ہے۔

سائنس کا ایک طالب علم جب اس کی تاریخ پر نظر دوڑاتا ہے تو اسے یونانی دور کے بعد یکلخت یورپی نشاط ثانیہ کا آغاز دکھائی دیتا ہے جدید سائنس چونکہ مغرب کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہے اس لیے اس کی تاریخ کے لیے بھی ہمیں مغربی ماخذوں پر تکیہ کرنا پڑتا ہے تاریخ سائنس کا ایک طالب علم ان ماخذوں کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتا ہے کہ ان دو ادوار کے درمیان ایک ہزار برس کو کیا ہوا؟ اس دور میں ہونے والی سائنسی ترقی کہاں ہوئی اور یونانی علوم عصر جدید میں کس راستے سے داخل ہوئے۔ ایجادات کی تاریخ میں بھی ارشمیدس کی چرخی (۲۶۰ ق م) کے بعد گٹن برگ کا چھاپہ خانہ (۱۲۵۰) نظر آتا ہے۔ درمیانی ایک ڈیڑھ ہزار برس کا ارتقار غائب ہے۔ اور یہی وہ دور ہے جسے اسلامی سائنس کا نام دینا یورپی مورخین کو پسند نہیں۔

اگرچہ تاریخ سائنس ایک نیا مضمون نہیں تاہم اس کا احیائے بیسویں صدی ہی میں ہو سکا۔ اس سلسلے میں جارج سارٹن، مقدمہ تاریخ سائنس" لکھ کر بہت بلند مرتبے پر فائز نظر آتا ہے۔ اس نے اسلامی دور کی سائنس کا تعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ مگر چونکہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی اس لیے اسلامی سائنس کے اکثر گوشے ابھر کر سامنے نہیں آسکے۔

رومن سلطنت کے زوال کے بعد یونانی سائنس کے ورثہ کو جس قوم کے مشاہیر نے محفوظ رکھا اور اس پر مزید تحقیق و تفتیش کی وہ مسلمان تھے یونانیوں نے سائنس کی ترویج تو کر دی تھی لیکن ان کے یہاں تلاش و تحقیق باریک بینی، تفصیلی مشاہدات اور اس یقینی علم کی کمی تھی جو تجربات سے حاصل ہوتی ہے۔ ارسطو طبیعیات کی کتاب لکھ کر تو فارغ ہو گیا لیکن اس نے تجربہ ایک بھی نہ کیا۔ علوم سے اہل یونان کی دلچسپی صرف منطق کی حد تک تھی۔ یونانیوں کے بعد اہل روما آئے لیکن وہ صرف سائنس کی افادیت کے قائل رہے۔ ان کے پہلے دور میں اقلیدس، ہیروفلکوس، اور ارشمیدس جیسے بلند پایہ مفکرین بھی ان اثرات سے مبرا نہیں تھے۔ اس کے بعد صرف مسلمانوں ہی نے سائنس کی تحقیق کا بیڑہ اٹھایا۔ رابرٹ بریفالٹ مسلمانوں کی شان میں لکھتا ہے۔

سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح، تفتیش کے نئے طریقے اور پیمائش، مشاہدے کے نئے اسلوب ہیں، جن سے یونانی بے خبر تھے۔ یورپ میں اس روح اور ان اسالیب کو رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔ اب اگر اس دور کے یورپ پر نظر ڈالیں جسے مغربی مصنفین غلطی یا شرمندگی سے تاریک دور کہتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ مادی اقتدار پاتے ہی عیسائیت کے علمبرداروں نے دوسرے دنیوی علوم کو نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی تھی۔ روما کے اصول افادیت کے ردعمل کے طور پر عقاید دینی کی تائید کا جذبہ پیدا ہوا اور مذہب کا ایسا تسلط ہوا کہ عرصہ دراز تک سائنس کے حقیقی احیاء کی کوئی امید نہ رہی۔ اگر سارٹن کا یہ قول صحیح ہے تو پھر یونانی سائنس عصر جدید تک کن راستوں کے ذریعہ پہنچی۔ اس کا جواب اس زمانے کے تفصیلی حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا۔

اسکندر اعظم کے بعد اس کا سپہ سالار بطلیموس (ثانی) حکمراں ہوا۔ یہ علم کا قدردان تھا۔ اس کے کتب خانے میں پانچ لاکھ کے قریب کتابیں تھیں۔ جولیس سیزر نے اس کا نصف حصہ تباہ کر دیا اور باقی نصف کتابیں عیسائیوں نے برسر اقتدار آتے ہی تباہ کر دیں۔ اپنے ماتھے پر سے کلنک کا یہ ٹیکہ مٹانے کے لیے عیسائی مورخوں نے اس کتب خانے کو جلانے کا الزام حضرت عمرؓ پر لگایا ہے حالانکہ یہ واقعہ اسلام سے دو سو برس قبل پیش آچکا تھا۔ جب یونان اور مصر رومی سلطنت کے زیر اثر آ گئے تو یہاں کے مدرسے بند کر دیے گئے ان کے شہنشاہ جسٹینین نے تعلیم ممنوع قرار دی تھی ظاہر ہے یہ واقعہ اسی زمانہ میں پیش آیا ہوگا۔

جب تمام عیسائی سلطنتوں میں تعلیم ممنوع قرار دے دی گئی تو صرف اسکندریہ میں ہائی پیشیا کا مدرسہ رہ گیا۔ ہائی پیشیا اپنے زمانے کی بہت بڑی عالمہ تھی۔ اس نے اپنے بیت الحکمت میں علم کا ٹمٹماتا دیا روشن رکھنا چاہا لیکن مسیحی ایک عالمہ کا وجود بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک روز جب وہ اپنے مدرسے کی طرف جا رہی تھی تو پادریوں اور ان کے معتقدوں نے اسے راستے میں گھیر لیا اور بے دردی سے قتل کر دیا۔ یہ تھا اس دور مسیحی کے یورپ کا حال۔ ان کے پاس کتابیں نام کو نہ تھیں

ظاہر ہے جب کتابیں نہ رہیں گی تو علم کہاں ہوگا۔ اس لیے عرصہ دراز تک یورپ پر جہالت کی تاریکی چھائی رہی۔ اس وقت اگر مسلمان نہ ہوتے اور وہ اپنے مذہب کے احکام کے علم کی مشعلیں روشن نہ رکھتے تو انصاف کی بات یہ ہے کہ یونانیوں کے علمی سرمائے کا موجودہ یورپ تک پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوجاتا۔ لوگوں نے یونانی علم بھلا دیا تھا۔ مسلمانوں نے بڑی تلاش اور تحقیق کے بعد اسے اکٹھا کیا اسے عربی لباس پہنایا اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا۔

ساتویں صدی عیسوی میں مسلمان وسط ایشیا فارس شمالی افریقہ اور اسپین تک پھیل چکے تھے۔ ان کے تجارتی قافلے اس وقت کی شاہراہوں پر رواں دواں تھے جن میں سامان تجارت کے ساتھ ساتھ دنیا کے علوم و فنون بھی منتقل ہوتے۔ یونان، ہند اور ایران کی سائنس بھی مسلمانوں کے پاس جمع ہوچکی تھی۔ اس زمانے میں علوم کا ایک سے دوسرے ملک کو منتقل ہونا بہت مشکل تھا۔ اکثر کتب سریانی (شامی) سے عربی میں ترجمہ ہوئیں اور بعد ازاں عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوکر بالآخر یورپ کی دوسری زبانوں میں منتقل ہوئیں۔

اسلامی دنیا میں عیسائیت کے برعکس زبانوں پر قفل نہ چڑھائے گئے نہ غور و فکر پہ پابندی لگائی گئی۔ نہ حکماء علماء کے پیچھے خفیہ پولیس رکھی گئی نہ مفکروں اور فلسفیوں کو مذہب کے نام پر زندہ جلایا گیا اور نہ مذہب کے نام پر کسی کو علم حاصل کرنے سے روکا گیا بلکہ مسلمانوں کے خلفاء کی طرف سے عالموں، ادیبوں، مہندس اور سائنس دانوں کی بہت زیادہ سرپرستی کی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ صرف چند ہی صدیوں میں اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ سائنسی تحقیق پھیلتی چلی گئی۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ مسلمانوں نے جس ملک کو فتح کیا وہاں علم کے خزانوں کی تلاش شروع کی اور یوں جتنی بھی کتابیں دستیاب ہوئیں دار الحکومت کو بھیج دی جاتیں۔ وہاں ان کی حفاظت اور ترجمے کا کام ہوتا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے کہ "علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے" بغداد کے عباسی خلفاء نے ہندوستان اور قسطنطنیہ تک سفارتیں بھیجیں تاکہ وہاں سے علمی حیثیت کی کتابیں ہر قیمت پر خریدی جائیں۔ نادر قلمی نسخوں کی تلاش، خرید و فروخت اور کتب خانے قائم کرنے کے لیے خلفاء وزراء، امراء اور عوام میں مقابلہ رہتا تھا۔ مدرسوں اور علماء کی سرپرستی بڑھ چڑھ کر کی جاتی تھی۔

مسلمانوں کے ہاں علم کا بنیادی ماخذ قرآن مجید اور تعلیمات و اسوۂ رسول تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہر مروجہ ذریعہ علم کو بھی استعمال کیا ان کے بنیادی فکر اور مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والے علوم کے باہمی امتزاج و مباحث ہی نے انھیں اس امر پر مجبور کیا تھا کہ وہ اکثر علوم میں تصدیق اور پرکھ کے لیے تجربہ کو استعمال کریں اور تجربی علوم کو فروغ دیں۔

تجربی بنیادوں پر مبنی علم، سائنس، کو مسلمانوں کے ہاں عمومی قبولیت حاصل تھی اور مسلمانوں کے کسی بھی فرقے نے اس سے تعرض نہ کیا۔ کیونکہ اس میں بنیادی اصولوں کو استعمال کیا جاتا تھا جن کی طرف مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن مجید رہنمائی کرتی ہے۔ قرآن مجید نے یہ اعلان کردیا تھا کہ یقین یعنی علم کے تین ارتقائی پیمانے ہیں۔

۱۔ علم بذریعہ استنباط جسے استدلال یا عقلی علم بھی کہتے ہیں اسے علم الیقین کا نام دیا

۲۔ علم بذریعہ مشاہدہ جسے حسی یا مشاہداتی علم بھی کہتے ہیں اسے عین الیقین کا نام دیا گیا۔

۳۔ علم بذریعہ تجربہ جسے وارداتی اور تجربی علم کہتے ہیں اسے حق الیقین کا نام دیا گیا۔

اگر سر سید احمد خاں صاحب ہمت مرداں اور دور اندیشی سے کام نہ کرتے تو ایسا دینی عصری تعلیم کا مایۂ ناز ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وجود میں نہ آتا اور مسلمان تعلیمی پستی اور معاشی ذلت کی منجدھار میں پھنسے رہتے۔

شکیل احمد

دینی مدارس میں ترمیم نصاب کی ضرورت
اور
اس کا طریقہ کار

نصاب تعلیم جب بھی مرتب کیا جاتا ہے وہ اس مقصد کو پورا کرتا ہے جس مقصد کے لیے ادارہ کا قیام عمل میں آتا ہے۔ اگر ہم اسلاف کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جو نصاب تعلیم تھا وہ ایسا متوازن تھا جس کے ذریعے طلبا کو دینی علوم کی تحصیل سے علم آخرت کے بلند مدارج بھی حاصل تھے اور ساتھ ہی وہ ایسے علوم و فنون سے بھی آشنا تھے جس کے باعث وہ دنیا میں بھی غیروں سے ممتاز، زیادہ باوقار اور سربلند تھے۔ گویا قرآن کریم کی یہ دعا ان کے پیش نظر تھی۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً

(ہمارے رب تو ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور اچھائی عطا کر اور آخرت میں بھی)

صدیوں تک اسلاف اس اصول پر کاربند رہے۔ وہ علم کی ہمہ گیری کو تسلیم کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ علوم و فنون کی ترقی و ایجادات میں قافلہ سالار تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ چار صدیاں ایسی گزریں کہ جب عصری علوم میں کوئی اضافہ ایسا نہیں ہوا جو مسلمانوں کا رہین منت نہ ہو۔ خود ہمارے ملک ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط سے قبل ہمارے مدارس میں قرآن پاک کے مفسرین، محدثین اور فقہا کے ساتھ ماہرین ریاضیات و طبیعیات اور مورخین و اطبا بھی پیدا ہوئے لیکن ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کو حالات کی برہمی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ ناساعدہ حالات پیش آئے کہ مسلمانوں کے علماء ربانیین و ارباب بصیرت نے ضروری سمجھا کہ مدارس کی شکل میں ایسے قلعے بنائے جائیں جو مسلمانوں کی دینی و اخلاقی قدروں کی حفاظت کے ضامن بن سکیں۔ ان مدارس کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ایک طرف اپنی نوجوان نسل کو علوم دینیہ سے بہرہ ور کیا جائے اور صحیح اسلامی طرز پر ان کی تربیت کی جائے تاکہ وہ اسلامی تعلیمات، قرآنی احکامات اور نبوی ارشادات کا چلتا پھرتا اور جیتا جاگتا نمونہ ہوں تو دوسری طرف ان کو اسلام کے عقائد اور اسلامی تعلیمات و شعائر پر مخالفین کی جانب سے کیے جانے والے حملوں سے نہ صرف باخبر کیا جائے بلکہ ان کا موثر دفاع بھی کیا جائے۔ اس سلسلے میں اس کا خصوصی خیال بھی رکھا گیا کہ وہ کسی قسم کے نفسیاتی دباؤ میں آئے بغیر اور کسی طرح کے احساس کمتری کا شکا

ہوئے بغیر مخالفین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسلام کی ابدیت، اس کے عقائد اور شعائر کی حقانیت کو ثابت کر سکیں۔ اگر آپ تاریخ کا بنظر مطالعہ کریں تو واضح ہو جائے گا کہ ان اسلامی مدارس نے جو اسلام کی خدمت کی ہے وہ آخر دور میں اسلام کی حفاظت و تبلیغ و اشاعت کے لیے کی جانے والی کوششوں میں سرفہرست ہے۔ یہ مدارس اپنے انداز ہائے فکر اور نصاب ہائے تعلیم میں اگرچہ قدرے مختلف ہیں لیکن ان کا مقصد اور ان کی غایت ایک ہے اور وہ ہے ناموس شریعت کا تحفظ اور اسلامی اقدار و تشخص کی بقا۔ یہ نصابی اختلاف مظہر ہے اس بصیرت قلبی اور فراست ایمانی کا جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے ان علماء کرام میں ودیعت کی تھی اور جس کی بدولت انھوں نے تاریخ کے ہر دور میں خصوصاً اس عہد آخر میں امت کی صحیح اور بروقت راہنمائی کی ہے اور اسلام کے روشن چراغ کو باد مخالف کے جھونکوں اور خطرناک طوفانوں سے بچایا ہے۔ یہ ان کی فراست علمی ہی تھی کہ انھوں نے ہر دور میں نصاب تعلیم کی ترتیب کے وقت عہد حاضر کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا۔ ہندوستان کے مشہور و معروف ادارے دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ نے بھی اپنے نصاب ہائے تعلیم کی ترتیب کے وقت اسلام کو درپیش چیلنج و وقت کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا ہے۔

ملک میں اس وقت دینی مدارس کی تعداد ہزاروں سے ہے۔ آزادی کے بعد اگر ان مدارس کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان کے فارغین کی اکثریت احساس کمتری کا شکار ہے۔ ایسے فضلاء کرام بلکہ اساتذہ کرام کی تعداد بھی کافی ہے جن کی ساری عمر خالص دینی ماحول میں تعلیم و تعلّم میں ہی گزری مگر وہ اپنے بچوں کو غیر اسلامی مدارس میں تعلیم دلا رہے ہیں۔ اہل خیر کی جانب سے زکوٰۃ کا قریب ۸۵ فی صد حصہ جو کروڑوں روپیہ ہے ہر سال دینی مدارس پر صرف ہوتا ہے مگر یہی صاحب ثروت اور اہل خیر حضرات بیشتر اپنے نونہالوں کو کونوینٹ اسکولوں میں تعلیم دلانا پسند کرتے ہیں ایسا کیوں؟ اس کی ایک وجہ تو ہماری اسلام سے بڑھتی ہوئی دوری ہے تو دوسری جانب ہمارے دینی مدارس میں بھی خامیاں ہیں جن کی طرف اگر فوری توجہ نہ دی گئی تو یہ مدارس بھی محض چند افراد کے لیے ذریعہ معاش بن کر رہ جائیں گے۔

ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ پھر دینی مدارس اپنے نصاب تعلیم پر نظر ثانی کریں اور وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری ترمیمات کریں مگر اس احتیاط سے کہ اصل دینی تعلیم مجروح نہ ہو اور ہمارے طلباء میں خود اعتمادی کے ساتھ خود اعتمادی کا بھی جذبہ پیدا ہو عصری علوم کو اس غرض سے نصاب میں شامل کرنا کہ طلباء کے لیے ملازمتوں کے دروازے کھل جائیں زیادہ مناسب نہیں ہے۔ اصل مقصد یہ ہو کہ وہ عہد حاضر کے علوم و فنون سے بھی واقف ہوں اور آخرت کی سربلندی کے ساتھ دنیا میں باوقار زندگی گزار سکیں۔

دینی مدارس کے نصاب تعلیم پر نظر ثانی اور اصلاح کے ساتھ ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل تجاویز پر بھی غور کر لیا جائے۔

۱۔ ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے یہ مدارس اسلامیہ غیر مربوط ہیں۔ ضروری ہے کہ کسی بھی معروف دارالعلوم یا جامعہ سے ان کا الحاق ہو تاکہ ان کے تعلیمی معیار اور نظم و ضبط پر نظر رکھی جا سکے۔

۲۔ بیشتر مدارس میں تحریر پر زور نہیں دیا جاتا یہی وجہ ہے کہ فارغین کی کثیر تعداد تحریر میں کمزور ہوتی ہے اور اپنی مادری زبان میں بھی خط نہیں لکھ سکتا۔

۳۔ اردو کی پختگی کے ساتھ ساتھ ہندی اور علاقائی زبان کی بھی تعلیم ہو۔

۴۔ طلباء کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے۔ نشست و برخاست میں شعور، مہذب گفتگو اور صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھا جائے۔ دیہات کے بیشتر مدارس ان باتوں کی طرف کم توجہ دیتے ہیں۔

۵۔ اساتذہ کرام کی ٹریننگ کا معقول بندوبست ہو۔

۶۔ ملک گیر سطح پر ضروری ہے کہ علماء کرام، ماہرین تعلیمات اور دانشوروں پر مشتمل ایک ایسا بورڈ ہو جو مختلف سطح کے مدارس کے لیے ان کے حالات کے مطابق سفارشات کرے جن کی روشنی میں مدارس رہنمائی حاصل کریں۔

دینی مدارس کی کثیر تعداد مالی وسائل کی شکار ہے ان کے طلبا

جو بیشتر غریب و نادار ہیں اپنے گرد و پیش کے مسائل سے بے خبر اور حالات کے تقاضوں سے بیگانہ نظر آتے ہیں وہ دوسروں کی چارہ گری غمخواری اور حاجت روائی کرنے کے بجائے خود ہی حاجت مند نظر آتے ہیں۔ ماحول میں وہ اجنبیت محسوس کرتے ہیں اور دین کی اشاعت کے مقدس مشن کی انجام دہی سے خود کو قاصر پاتے ہیں۔ اس کے برعکس عصری یا سیکولر درس گاہوں کے طلباً ماحول کو ہموار تو کر لیتے ہیں لیکن دین و ملت کے تقاضوں اور آخرت کی جواب دہی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ہمارے بعض لوگ ان اداروں کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر دینی مدارس کے طلبار کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ یہ ان کی کم نظری ہے۔ ان کی ذہنی وسعت دنیا تک ہی محدود ہے۔ جب کہ ہماری ابدی زندگی آخرت کی ہے۔

ضرورت ہے کہ ان دینی مدارس کے معیار کو بلند کیا جائے طالبانِ علوم نبوت کی حوصلہ افزائی کی جائے اور نصاب تعلیم کو جدید تقاضوں کو شریعت کی حدود میں رہ کر ہم آہنگ کیا جائے۔ اس کے لیے طریقۂ کار کیا ہو؟ ماضی میں اسلاف کی مثالیں موجود ہیں جب عباسی دور حکومت میں یونانی علوم کی یلغار ہوئی اور مذہب میں شکوک و ابہام کی وبا پھیلی تو الحاد و بے دینی کے اس سیلاب کو روکنے کے لیے خود مسلمانوں نے یونانی علوم و فنون میں مہارت حاصل کی اور اس فتنہ کا سدباب کیا۔ گویا ان دنوں حالات کا تقاضا تھا کہ علمار کرام نہ صرف یونانی منطق و فلسفہ سیکھیں بلکہ اس میں مہارت حاصل کریں۔ اسی طرح آج کے دور میں حالات کا تقاضا ہے مدارس عربیہ کے نصاب میں ایسی اصلاح کی جائے کہ جس سے ایک طرف مدارس کی دینی و دعوتی روح بھی مضمحل نہ ہو اور دوسری طرف وہاں کے فارغین ملک و سماج کے لیے مفید و سودمند بھی ثابت ہوں۔

انسان کی فطرت ہے کہ کسی بھی نئی سمت پہلا قدم اٹھانے میں جھجک محسوس ہوتی ہے۔ یہی جھجک ترقی کی راہ میں روڑہ بن جاتی ہے اور انسان فرسودہ اور روایتی طریقوں سے سرمو انحراف نہیں کرتا۔ دینی مدارس بھی اسی جھجک کا شکار رہیں۔ ضرورت ہے ان کو راہنمائی کی۔ بعض اہم دینی اداروں نے اس سمت قدم اٹھایا ہے۔ بیداری کی لہر آئی ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں درمندان ملت نے کئی سیمینار کیے ہ عام طور پر اب محسوس کیا جانے لگا ہے کہ نصاب تعلیم میں تبدیلی کی، اور موجودہ دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر نیا نصاب تعلیم تشکیہ دیا جائے۔

اس سلسلے میں جامعۃ الہدایہ جے پور نے پہلا عملی قدم اٹھا جس کی میں نمائندگی کر رہا ہوں۔ جامعہ میں اعلیٰ دینی تعلیم کے س ٹیکنیکل تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ابتدائی آٹھ سالوں میں جامعہ نے تعلیمی میدان میں جو تجربہ کیا ہے وہ الحمد للہ کامیاب ہے میں خود اسی جامعہ سے فارغ ہوں اور اب جامعہ کے کمپیو سکیشن میں بحیثیت معلم خدمات انجام دے رہا ہوں۔

جامعۃ الہدایہ صرف ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک جس کا مقصد اسلامی اقدار و روایات کی حفاظت اور دینی علو ترویج و اشاعت نیز صنعتی و تکنیکی ہر جہت میں مسلمانوں کی تر کے لیے قدم اٹھانا ہے تاکہ وہ باعزت زندگی گزار سکیں۔ جامعہ قیام صرف ایک فرد واحد مرد آہن، عارف باللہ حضرت مولانا شہ محمد عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تیس سالہ شب و روز کی تگ و کا نتیجہ ہے۔ جامعۃ الہدایہ کے بانی نے آئین نو سے ڈرنے کے بجا آئینِ نو کے چیلنج کو قبول کیا اور میدان عمل میں قدم جمانے کے لیے اسلامی نظام حیات اور دین و دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلنے والی تہ کا منصوبہ بنایا۔ حضرت مولانا شاہ محمد عبدالرحیم صاحب مجددیؒ نے شرو میں جب یہ صدا بلند کی تو کوئی لبیک کہنے والا نہیں تھا اور یہ آوا صدا بصحرا ثابت ہوتی نظر آئی لیکن خدا کے فضل اور حضرت مولانا یقین محکم عمل پیہم، دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی کی بدولت آج ادارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ تعلیم کے اس نئے میدان میں چراغ کی حیثیت رکھتا ہے۔

نصاب تعلیم میں ترمیم کی ضرورت محسوس کرنے کے بعد طریقۂ کیا ہو؟ اس کے لیے جامعۃ الہدایہ نمونہ کے طور پر موجود ہے۔ طلب صادق رکھنے والوں کے لیے مرجع باد نما کی حیثیت رکھتا ضرورت ہے کہ جامعہ میں جاکر وہاں کے نظام تعلیم کا مشاہدہ کیا ۔

باقی صفحہ ۱۷

مفتی محمد خبیب ندوی

دینی مدارس میں
سائنس کی شمولیت وقت کی ضرورت

اسلام دین فطرت ہے اور مسلمانوں کی زندگی کے تمام تر علمی، اخلاقی اور تمدنی چشمے صرف دو ہیں کلام ربانی جسے وحی الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں دوسرے حدیث نبوی جسے سنت سے تعبیر کرتے ہیں لہٰذا ہمیں سائنسی نعمت کو بھی ان ہی دو چشموں میں تلاش کرنی ہے۔ قرآن کریم پر غور کرنے سے انسان کے دل پر یہ نقش گہرا ہو جاتا ہے کہ جس بلاغت کی قوت سے قرآن کریم نے توحید رسالت، پاکیزگی اخلاق، اعمال صالحہ، حلال و حرام کی تاکید اور ترغیب فرمائی گئی ہے اسی قوت بلاغت سے علم کے متعلق بھی ترغیب و تاکید ہے علم کے متعلق آیات قرآنی بے شمار ہیں[1] سورۂ اقرأ کی ابتدائی پانچ آیتیں، سورۂ المجادلہ، سورۂ البقرہ، سورۂ الفاطر، سورہ الزمر، کی آیتوں میں انسانی ترقی، مدارج کے ذرائع، عظمت و جلال ربانی سے متاثر ہو کر اس کی بارگاہ میں جھکنے کو ایمانی قوت کا اعلیٰ ثمرہ بتاتے ہوئے علم کو روشنی، بینائی، سایہ، اور حیات سے تعبیر کرتے ہوئے جہالت کو اندھا پن، تاریکی اور موت سے تشبیہ دی ہے اور میں سمجھتا ہوں اس سے موثر پیرایہ علم و جہل کے مقابلے کا نہیں ہوسکتا۔

قرآن مقدس آیات قدرت پر غور و فکر کی تاکید بھی کرتا ہے اور سائنس میں غور و فکر کو جو اہمیت ہے وہ سب پر عیاں ہے اور غور و فکر تدبر و تعقل کو علوم میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اس لیے جب قانون قدرت پر ارباب فکر نے دماغ سوزی کی وہی انسانی فکر کا سرمایہ لازوال بن گیا۔ چنانچہ قرآن کریم نے عالم کے واقعات پر، اس کے تغیرات پر، اپنے گرد و پیش کے حالات پر، اور خود اپنی ہستی پر غور و فکر کرنے اور اچھی طرح دیکھنے، سوچنے سمجھنے کی بار بار تاکید کرتا ہے کہ ان پر غور و فکر کرو، اور نتائج اخذ کرو، جو جزئیات تمہارے سامنے ہیں ان سے کلیات بناؤ اور صنعت سے صانع کا پتہ لگاؤ ڈھونڈیں اور حجاب تک محدود مت رکھو بلکہ ان کے پردہ میں جمال حقیقی کا جلوہ دیکھنے کی کوشش کرو۔ تفصیل کے لیے مندرجہ ذیل آیات قرآنیہ ملاحظہ کی جائیں۔ آیت نمبر ۴، ۱البقرہ آیت ۱۱۱ سورۂ یوسف، آیت ۱۱ سورۂ انعام، آیت ۸، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۸، سورۂ الروم، آیت ۵۳۔ سورہ حم السجدہ، آیت ۱۲، ۱۳، سورۂ النحل، آیت نمبر ۵ سورۂ یونس، ان تمام آیتوں میں حقائق کی معرفت نظام کائنات کے مطالعہ، عقل و فہم، اور شعور و ادراک کی دعوت دینے

---

[1] تقریباً سات سو سے زیادہ آیتیں ایسی ہیں جن میں لفظ علم اور اس کے مترادفات آئے ہیں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو المعجم المفہرس للالفاظ القرآن ۱۲ خ

جنرل سکریٹری، رضوان لائبریری، تمبور، سیتاپور۔ (یو۔پی)

کی نیز جو علما اور محققین تین پر کائنات کے اسرار اور خالق وجود کی عظمت منکشف ہوئی ان کو اپنا محبوب و پسندیدہ لقب عبد بنا کر من عبادہ العلماء جیسے خطاب سے نوازا۔ اور جگہ جگہ قدرت کی نشانیوں پر اہل فکر و نظر اور صاحب عقل کو دعوت دی۔ بیا متوں سے بار بار کرکے بتلایا گیا کہ قدرت کی نشانیاں اور معجزات ان لوگوں کے لیے بیان کیے جاتے ہیں جو سمجھ بوجھ رکھتے اور جاننے والے ہیں۔

مذہب اسلام نے اپنے ماننے والوں کو علوم وفنون، صنعت و حرفت، تہذیب و تمدن، غرضیکہ ہر طرح کی نعمتوں سے مالا مال کیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی بیش بہا ایجادات، تحقیقات اور انکشافات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ سب علوم وفنون میں چاہے وہ علم ریاضی ہو یا جبر ومقابلہ، ہیئت، طبیعات، کیمیا، نباتات و حیوانات، جغرافیہ، طب، فلکیات، معاشیات، تجارت غرضیکہ کون سا علم ہے جس میں مسلمانوں نے رہبری نہ کی ہو۔ ان حوالہ جات آیات قرآنیہ سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو چکی ہے کہ قرآن نے جگہ جگہ انسان کو تدبر، تفکر، تفقہ اور تعقل کی دعوت دی ہے تاکہ وہ آیات الٰہیہ کا مشاہدہ کرسکے۔

یہی سائنس جس کی دینی مدارس میں شمولیت جس کے لیے سیمینار منعقد ہو رہا ہے اور جس کی شمولیت کے بارے میں مختلف مکاتب فکر نے اپنے اپنے گرانقدر خیالات ظاہر کیے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے چونکہ دینی مدارس کے ذمہ داران و طلبہ اس سے بالکل غیر مانوس ہیں اسی وجہ سے ان کو نئی چیز لگتی ہے جبکہ سائنس تو نام ہے ایک نقطہ نظر کا، طرز فکر کا، رویہ کا حقیقت کے بارے میں تصوراتی یا خوش فہم ہونا سائنس نہیں ہے حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا سائنس ہے۔ سائنس سے فقط یہ مراد ہے کہ انسان کے عقل اور خیالات عقل و حکمت پر مبنی ہیں۔ اس لیے سائنس کی ایجادات اور انکشافات سے انسان کو آسائش، نفع ہونے کے ساتھ ان کے عقاید میں پختگی آتی ہے۔

اور اب تو یہ بات بالکل عیاں ہو چکی ہے کہ ہماری موجودہ سائنس کی ترقی سے دن بدن خدا شناسی اور اسلام کی حقانیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مشہور مفکر اسلام اور ماہر سائنسدان ابن رشد مسلمانوں کے سائنسی مطالعے کا مقصد بیان کرتے ہیں عمر تشریح البدن Anatomy کا مطالعہ کرنے سے ایمان باللہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ خود امام غزالی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب احیاء علوم الدین میں صحیح سوچ فکر کو اور صحیح سمجھ و بوجھ کو انسان کی عظیم خصوصیات قرار دیتے ہوئے لکھے ہیں کہ اسی کے ذریعہ انسان اللہ کی قربت حاصل کرتا ہے۔ سائنسی ترقی سے خدا شناسی کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں اور جس قدر سائنس ترقی کر رہی ہے اسی قدر رموز خلقت اور نظام کائنات سے پردے نقاب زیادہ سے زیادہ سرکتی جا رہی ہے اور خدائی وجود کے بارے میں ہمارے ایمان میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ اس عظیم المرتبت مقصد وجود کا نظام جتنا زیادہ واضح ہوگا اسی کے مطابق بنانے والے کی قدرت و حکمت زیادہ سے زیادہ ظاہر اور عیاں ہوگی اور اس چیز کا اعتراف خود بڑے بڑے عظیم سائنسدانوں نے بھی کیا ہے چنانچہ ہرشل Herschal کے الفاظ میں "جتنا جتنا دائرہ وسیع ہوگا اسی قدر ازلی اور ابدی خدا کے اثبات کے لیے طاقتور اور دندان شکن دلیلیں زیادہ ہاتھ آئیں گی" مونٹ Maunt نے دائرۃ المعارف میں لکھا ہے "علوم کی اہمیت اس لیے بھی اور زیادہ ہے کہ وہ ہماری عقلوں کو اتنا بلند کر دیتے ہیں کہ ان کے ذریعے خدا کی عظمت کو محسوس کرتے ہیں" (ج ا۔ ۵۰۳۵)

اس تفصیل سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ سائنس وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس سے واقفیت از حد ضروری ہے اور اس واقفیت میں ہمارے دینی مدارس کے فضلا بھی ہمارے شانہ بشانہ ہوں جس کے لیے پہلی سیڑھی ان کے نصاب تعلیم میں سائنس کی شمولیت ہے تبھی تو وہ واقف ہوسکیں گے اور ان کو دیگر علوم کی طرح سائنس کی بھی تعلیم دی جائے۔ لہٰذا میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں سائنس کو شامل کیا جائے اور ہمارے فضلا مدارس کو دیگر علوم کی واقفیت کے ساتھ ساتھ سائنس سے واقف ہونا بھی بہت ضروری ہے ایک دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کو واقفیت کیسے کرائی جائے یعنی سائنسی واقفیت کے لیے یا تو ان کے نصاب میں جزوی ترمیم کی جاوے یا پھر الگ سے ان کو تعلیم دلائی جائے۔ جہاں تک تعلق الگ سے تعلیم اور واقفیت کا ہے تو یہ مشکل امر ہے کیونکہ ایک عالم دین ابتدائی تعلیم سے آخری تعلیم تک جیسے دورہ

حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے ایک طویل عرصہ اور عمر کا ایک معتدبہ حصہ ختم ہو جاتا ہے، لہٰذا الگ سے تعلیم کے بارے میں سوچنا غیر مفید ہوگا۔ البتہ دوسری چیز یعنی ان کے نصاب تعلیم میں جزوی ترمیم کی جائے اور وہ جزوی ترمیم نصاب تعلیم میں اس لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ نصاب تعلیم کی اصلاح بہت ہی ضروری ہے۔ کیونکہ درس نظامی کے نصاب تعلیم کے بارے میں اب سے بہت پہلے مشہور مورخ اور نزہتہ الخواطر، والاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام کے مصنف نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور بڑی دیدہ ریزی اور باریک بینی سے ہزاروں صفحات کے مطالعے کے بعد ہندوستان کے نصاب درس نظامی پر فاضلانہ مضمون سپرد قلم فرمایا جو ١٩٠٩ء میں الندوہ کی جلد ششم نمبر ایک میں شائع ہوا اور اس زمانہ سے لے کر اب تک مقبول ہوا اور ابھی حال ہی میں مفکر اسلام اور ممتاز عالم دین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی ندوی نے اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ ایک الگ کتابچہ کی شکل میں شائع بھی کیا ہے۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب رقم طراز ہیں "اس زمانہ میں جو نصاب تعلیم مدارس عربیہ میں درس نظامی کے نام سے رائج ہے وہ درس نظامیہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے کیونکہ درس نظامیہ میں منطق میں بہت سی کتابوں کا اضافہ بغیر غور و فکر کے خود بخود ہوگیا ہے جسے ہم تعبیر کریں تو صحیح طور پر ناخواندہ مہمان، یا سبزہ خودرو سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس میں منطق کی ١٥ کتابیں تفسیر کی دو بلاغت کی دو کتابیں شامل ہیں جب کہ منطق کی کتابیں جو داخل درس ہیں ان میں خلط مبحث بہت ہے نیز اس نصاب میں جغرافیہ، تاریخ، علم اعجاز القرآن، اور ضروری علوم بالکل نہیں جس کی سخت ضرورت ہے لہٰذا میرے خیال میں وہ نصاب درس جو آج کل بلا استثنا ہر مدرسہ میں جاری ہے اس سے ادب اور حدیث کی کتابوں کو خارج سمجھنا چاہیے۔"[٣]

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں میں سمجھتا ہوں کہ درس نظامیہ کے نصاب میں ہی جزوی ترمیم کی جائے او منطق کی زائد کتب کی جگہ سائنس کو شامل کر کے سائنس سے اتنی واقفیت ضرور کرادی جائے جس سے کہ سائنس سے ہر فاضل مکمل طور پر واقف ہو سکے۔

ایک بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ یہ شمولیت آخری کلاس (دورۂ حدیث) سے پہلے پہلے ہو یعنی کہ سال آخر میں کوئی ترمیم نہ کی جائے بس ابتدائی متوسط، عالیہ میں ترمیم کی جائے اور منطق و فلسفہ کی جگہ سائنس کو شامل کیا جائے۔

اخیر میں بطور تجویز یہ بات بھی عرض کر دوں کہ اس کام کے لیے مندرجہ ذیل اقدام بہت ضروری ہوں گے۔

١۔ ان مدارس میں جہاں دورۂ حدیث شریف ہوتا ہے کہ نظمائے تعلیمات، و مہتممین سے رابطہ قائم کیا جائے اور اسلامی سائنس کے ماہر حضرات سمیت ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جو اس کام کو پورا کرے۔

٢۔ نصاب تیار کر کے اس کو اسلامی سائنس کے ماہرین مطالعہ کر کے منظوری دیں۔

٣۔ ابتدائی طلبا کو واقفیت اور اساتذہ کو ترغیب دلانے کے لیے اس طرح پروگرام مرکز فروغ سائنس مختلف مدارس و جامعات میں منعقد کرے۔

٤۔ سائنس کی شمولیت کے پیش نظر مقصد اصل خدا کی خوشنودی اور اسلام کی حقانیت کو اجاگر کرنا ہو۔

باقی صفحہ ٩٤ کا

اور غور و فکر کی حدود سے نکل کر کچھ ٹھوس اقدام کیے جائیں۔ جو نمونہ سامنے آچکا ہے اسے بروئے کار لایا جائے اور جامعہ نے جن تجربات میں کامیابی حاصل کر لی اس سے آگے بڑھ کر سوچا جائے۔

آخر میں امید ہے کہ یہ محفل مقالات (سمینار) دینی مدارس کے حق میں مفید ثابت ہوگی اور انشاءاللہ جلد ہی اچھے نتائج مرتب ہونگے اور ہماری آنے والی نسلیں اس ملک میں باوقار زندگی گزاریں گی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ط

حواشی: ١۔ اس کا جدید ایڈیشن دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی سے ٨ جلدوں میں ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے

٢۔ اس کا اصل نام معارف العوارف فی انواع العلوم والمعارف ہے۔ خ

٣۔ ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات از مولانا حکیم سید عبدالحیٔ

کی نشانیوں پر علما اور محققین جن پر کائنات کے سربستہ راز اور عالم وجود کی عظمت منکشف ہوتی ان کو اپنا محبوب و پسندیدہ لقب عبد الرحمن عباد اللہ العلماء جیسے خطابات سے نوازا۔ اور جگہ جگہ قدرت کی نشانیوں پر اہل فکر و نظر اور صاحب عقل کو دعوت دی اور بیان سے بار بار بتلایا گیا کہ قدرت کی نشانیاں اور معجزات ان لوگوں کے لیے بیان کیے جاتے ہیں جو سمجھ بوجھ رکھتے اور جاننا چاہتے ہیں۔

مذہب اسلام نے اپنے ماننے والوں کو علوم و فنون، صنعت و حرفت، تہذیب و تمدن، غرضیکہ ہر طرح کی نعمتوں سے مالا مال کیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی بیش بہا ایجادات، تحقیقات اور انکشافات سے تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ علوم و فنون میں چاہے قسم ریاضی ہو یا جبر و مقابلہ، ہیئت، طبیعیات، کیمیا، نباتات و حیوانات، جغرافیہ، طب، فلکیات، معاشیات، تجارت، غرضیکہ وہ کون سا علم ہے جس میں مسلمانوں نے رہبری نہ کی ہو اور مذکورہ بالا آیات قرآنیہ سے یہ بات کامل طور پر واضح ہو چکی ہے کہ قرآن نے جگہ جگہ انسان کو تدبر، تفکر، تفقہ اور تعقل کی دعوت دی ہے تاکہ وہ آیات الٰہیہ کا مشاہدہ کرے۔

یہی سائنس جس کی دینی مدارس میں شمولیت جس کے لیے سیمینار منعقد ہو رہا ہے اور جس کی شمولیت کے بارے میں مختلف مکاتب فکر نے اپنے اپنے گرانقدر خیالات ظاہر کیے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے چونکہ دینی مدارس کے ذمہ داران و طلبا اس سے بالکل غیر مانوس ہیں اسی وجہ سے ان کو نئی چیز لگتی ہے جب کہ سائنس تو نام ہے ایک نقطۂ نظر کا، طرز فکر کا، رویہ کا حقیقت کے بارے میں تصوراتی یا خوش فہم ہونا سائنس نہیں ہے حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا سائنس ہے۔ سائنس سے فقط یہ مراد ہے کہ انسان کے عقل اور خیالات عقل و حکمت پر مبنی ہیں۔ اس لیے سائنس کی ایجادات اور انکشافات سے انسان کو آسائش، نفع ہونے کے ساتھ ان کے عقاید میں پختگی آتی ہے۔

اب تو یہ بات بالکل عیاں ہو چکی ہے کہ ہماری موجودہ سائنس کی ترقی سے دن بدن خدا شناسی، اور اسلام کی حقانیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مشہور مفکر اسلام اور ماہر سائنسدان ابن رشد مسلمانوں کے سائنسی مطالعے کا مقصد بیان کرتے ہیں علم تشریح البدن Anatomy کا مطالعہ کرنے سے ایمان باللہ میں اضافہ ہوتا۔ خود امام غزالی نے اپنے مشہور زمانہ کتاب احیاء علوم الدین میں صحیح سوچ فکر کو اور صحیح سمجھ و بوجھ کو انسان کی عظیم خصوصیات قرار دیتے ہوئے ہیں کہ اسی کے ذریعہ انسان اللہ کی قربت حاصل کرتا ہے۔ سائنسی ترقی خدا شناسی کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں اور جس قدر سائنس ترقی کر رہی ہے اسی قدر رموز خلقت اور نظام کائنات سے پردے نقاب زیادہ سے زیادہ سرکتی جا رہی ہے اور خدائی کے بارے میں ہمارے ایمان میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ اس عظیم الشان مقصد وجود کا نظام جتنا زیادہ واضح ہوگا اسی کے مطابق بنانے والے کی قدرت و حکمت زیادہ سے زیادہ ظاہر اور عیاں ہوگی اور اس چیز کا اعتراف خود بڑے بڑے عظیم سائنسدانوں نے بھی کیا ہے چنانچہ ہرشل Hershal کے الفاظ ہیں "جتنا دائرہ وسیع ہوگا اسی قدر ازلی اور ابدی خدا کے اثبات کے لیے طاقتور اور زندہ تر دلیلیں زیادہ ہاتھ آئیں گی" مونٹ unt نے دائرۃ المعارف میں لکھا ہے "علوم کی اہمیت اس لیے بھی اور ہے کہ وہ ہماری عقلوں کو اتنا بلند کر دیتے ہیں کہ ان کے ذریعہ خدا کی عظمت کو محسوس کرتے ہیں۔ (ج ا ۔ ۲۵، ۵)

اس تفصیل سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ سائنس وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس سے واقفیت از حد ضروری ہے اور اس واقفیت سے ہمارے دینی مدارس کے فضلا بھی ہمارے شانہ بشانہ ہوں جس کے پہلی سیڑھی ان کے نصاب تعلیم میں سائنس کی شمولیت ہے تبھی تو واقف ہو سکیں گے اور ان کو دیگر علوم کی طرح سائنس کی بھی تعلیم دی جائے۔ لہٰذا میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں سائنس کو شامل کیا جائے اور ہمارے فضلا مدارس کو دیگر علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس سے واقف ہونا بھی بہت ضروری ہے ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کو واقفیت کیسے کرائی جائے یعنی سائنسی واقفیت کے یا تو ان کے نصاب میں جزوی ترمیم کی جاوے یا پھر الگ سے ان کو تعلیم دلائی جائے۔ جہاں تک تعلق الگ سے تعلیم اور واقفیت کا ہے تو بیکار ہے کیونکہ ایک عالم دین ابتدائی تعلیم سے آخری تعلیم تک جسے دو

حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے ایک طویل عرصہ اور عمر کا ایک معتد بہ حصہ ختم ہوجاتا ہے۔ لہذا الگ سے تعلیم کے بارے میں سوچنا غیر مفید ہوگا۔ البتہ دوسری چیز یعنی ان کے نصاب تعلیم میں جزدی ترمیم کی جائے اور وہ جزدی ترمیم نصاب تعلیم میں اس لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ نصاب تعلیم کی اصلاح بہت ہی ضروری ہے۔ کیونکہ درس نظامی کے نصاب تعلیم کے بارے میں اب سے بہت پہلے مشہور مورخ اور نزہتہ الخواطر، والاعلام بمن فی تاریخ الہند من اعلام کے مصنف نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور بڑی دیدہ ریزی اور باریک بینی سے ہزاروں صفحات کے مطالعے کے بعد ہندوستان کے نصاب درس نظامی پر فاضلانہ مضمون سپرد قلم فرمایا جو ۱۹۰۹ء میں الندوہ کی جلد ششم نمبر ایک میں شائع ہوا اور اس زمانہ سے لے کر اب تک مقبول ہوا اور ابھی حال ہی میں مفکر اسلام اور ممتاز عالم دین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی ندوی نے اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ ایک الگ کتابچہ کی شکل میں شائع بھی کیا ہے) مولانا عبدالحیؒ صاحب رقم طراز ہیں "اس زمانہ میں جو نصاب تعلیم مدارس عربیہ میں درس نظامی کے نام سے رائج ہے وہ درس نظامیہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے کیونکہ درس نظامیہ میں منطق میں بہت سی کتابوں کا اضافہ بغیر غور و فکر کے خود بخود ہوگیا ہے جسے ہم تعبیر کریں تو صحیح طور پر ناخواندہ مہمان، یا سبزہ خودرو سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس میں منطق کی ۱۵ کتابیں۔ تفسیر کی دو بلاغت کی دو کتابیں شامل ہیں جب کہ منطق کی کتابیں جو داخل درس ہیں ان میں غلط مبحث بہت ہے نیز اس نصاب میں جغرافیہ۔ تاریخ، علم اعجاز القرآن، اور ضروری علوم بالکل نہیں جس کی سخت ضرورت ہے لہذا میرے خیال میں وہ نصاب درس جو آج کل بلا استثنا ہر مدرسہ میں جاری ہے اس سے ادب اور حدیث کی کتابوں کو خارج سمجھنا چاہیے"۔[۳]

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں میں سمجھتا ہوں کہ درس نظامیہ کے نصاب میں ہی جزوی ترمیم کی جائے اور منطق کی زائد کتب کی جگہ سائنس کو شامل کرکے سائنس سے اتنی واقفیت ضرور کرادی جائے جس سے کہ سائنس سے ہر فاضل مکمل طور پر واقف ہوسکے۔

ایک بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ یہ شمولیت آخری کلاس (دورۂ حدیث) سے پہلے پہلے ہو یعنی کہ سال آخر میں کوئی ترمیم نہ کی جائے بس ابتدائی متوسط، عالیہ میں ترمیم کی جائے اور منطق و فلسفہ کی جگہ سائنس کو شامل کیا جائے۔

اخیر میں بطور تجویز یہ بات بھی عرض کردوں کہ اس کام کے لیے مندرجہ ذیل اقدام بہت ضروری ہوں گے۔

۱۔ ان مدارس میں جہاں دورۂ حدیث شریف ہوتا ہے کہ نظمائے تعلیمات، و مہتمین سے رابطہ قائم کیا جائے اور اسلامی سائنس کے ماہر حضرات سمیت ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جو اس کام کو پورا کرے۔

۲۔ نصاب تیار کرکے اس کو اسلامی سائنس کے ماہرین مطالعہ کرکے منظوری دیں۔

۳۔ ابتدائی طلبا کو واقفیت اور اساتذہ کو ترغیب دلانے کے لیے اس طرح پروگرام مرکز فروغ سائنس مختلف مدارس و جامعات میں منعقد کرے۔

۴۔ سائنس کی شمولیت کے پیش نظر مقصد اصل خدا کی خوشنودی اور اسلام کی حقانیت کو اجاگر کرنا ہو۔

باقی صفحہ ۹۴ کا

اور غور و فکر کی حدود سے نکل کر کچھ ٹھوس اقدام کیے جائیں۔ جو نمونہ سامنے آچکا ہے اسے بروئے کار لایا جائے اور جامعہ نے جن تجربات میں کامیابی حاصل کرلی اس سے آگے بڑھ کر سوچا جائے۔

آخر میں امید ہے کہ یہ محفل مقالات (سمینار) دینی مدارس کے حق میں مفید ثابت ہوگی اور انشاء اللہ جلد ہی اچھے نتائج مرتب ہونگے اور ہماری آنے والی نسلیں اس ملک میں باوقار زندگی گزار سکیں گی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْن ؁

حواشی: ۱۔ اس کا جدید ایڈیشن دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی سے ۶ جلدوں میں ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے

۲۔ اس کا اصل نام معارف العوارف فی انواع العلوم والمعارف ہے۔ خ

۳۔ ہندوستان کا نصاب درس اور اسکے تغیرات از مولانا حکیم سید عبدالحیؒ

محمد عالم انصاری

دینی مدارس میں ترمیم نصاب کی ضرورت اور اس کا طریقہ کار

یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی تغیر پذیر ہے، آئے دن اس کے اندر تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں. جس طرح ایک دریا یا سمندر کی موجیں ایک دوسرے سے مختلف و مماثل ہوتی ہیں اور وہ ایک دوسرے سے کلی طور پر میل نہیں کھاتیں. اسی طرح زمانہ کا یہ تغیر پورے عہد پر اثرانداز اور افکار و خیالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کے مذاق اور ان کی اہمیت و افادیت کا معیار بھی تبدیل ہو جاتا ہے چنانچہ جس طرح زندگی

ہر دم رواں، ہر دم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

آئے دن اپنا روپ بدلتی رہتی ہے. اسی طرح علوم و فنون کا معیار فضیلت بھی اثرانداز ہوتا رہتا ہے اور جس طرح زمانہ بدلتا رہتا ہے علوم و فنون کا بھی معیار تبدیل ہوتا رہتا ہے اگر کسی نظام نصاب و تعلیم میں بھی وقت کے تقاضوں اور زمانہ کے تغیرات کا پورا پاس و لحاظ کرنا ہوتا ہے کیونکہ بقول مفکر، نصاب تعلیم کسی قوم کے فکری ارتقاء اس کے علمی تجربوں، اس کے طریق فکر، اور اس کی ذہنی صلاحیت کی ہانڈی کا سرپوش ہوا کرتا ہے نصاب تعلیم

کسی قوم کے مطالبے اس کے نصاب تعلیم پر فکری سطح اور اس کی ذہنی صلاحیت کا نقطۂ عروج (climax) ہوتا ہے اس لیے کسی نصاب تعلیم پر اس قوم کے علمی تجربوں، اس ملت کی عمل نمائندگی کرنے والے گروہ کی نفسیات اور اس ملک کے ماحول سے الگ کر کے غور نہیں کیا جا سکتا. نصاب تعلیم اس ماحول کا ایک علمی اظہار ہوتا ہے نصاب تعلیم کا بھی ایک ضمیر ہوتا ہے اور اس کی ایک روح ہوتی ہے جو اس کے پورے جسم میں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے. یا دوسرے الفاظ میں نصاب تعلیم کی حیثیت طبیب کے نسخہ کی ہے کہ وہ مریض کی حالت اور اس کا مزاج و موسم اور آب و ہوا کو مدنظر رکھ کر ایک تناسب سے دواؤں کا انتخاب کرتا ہے جس طرح طبیب کے نسخہ میں لکھی ہوئی ہر دوا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ طبیب نے جو تناسب اور دواؤں کی جو مقدار متعین کی ہے اس کا بھی پورا لحاظ رکھا جائے ہم روزمرہ یہ دیکھتے ہیں کہ معالج کبھی سرے سے کسی دوا کو نسخہ سے کاٹ دیتا ہے اور کبھی کسی دوا کو گھٹا اور بڑھا دیتا ہے. زمانہ اور حالات کے تغیر کا خیال ہمارے اسلاف نے پورے

مدرس، مدرسہ ضیاء الاسلام، تحصیل فتح پور، بارہ بنکی (یو. پی)

طے ہے کیا۔ خود حضور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا پورا پاس و لحاظ رکھا۔ آپؐ نے صحابہ کرام کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، کیونکہ یہودیوں، عیسائیوں اور دوسری غیر مسلم قوموں سے مراسلت اور معاہدوں کے سلسلے میں عبرانی یا دوسری زبانوں کے رسم الخط اور زبان کے علم کی ضرورت ہوتی تھی۔ صحابہ کرام نے عبرانی و سریانی اور دوسری زبانیں سیکھی تھیں۔ ہندوستان میں بھی مختلف ادوار میں ہمارے اسلاف نے زمانے کے حالات اور تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں اصلاحات کیں۔ جس کی تفصیل تاریخ وسوانح کی کتابوں میں ملتی ہے لیکن جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ یہ زندگی تغیر پذیر ہے اور ہر آن رواں دواں ہے اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اس میں روانی ہے وہیں ٹھہراؤ بھی ہے۔ اگر زمانہ ان دونوں حقیقتوں میں کسی ایک سے محروم ہو جائے تو اس کی افادیت مفقود ہو جائے گی چنانچہ اسلاف نے اس بات وقرار اور روانی کو مدنظر رکھتے ہوئے نصاب تعلیم میں ترمیم کی لیتی نصاب تعلیم کا کچھ حصہ غیر متغیر اور اساسی ہوگا اور کچھ متغیر جو زمانہ کے حالات وتقاضوں کے مطابق بدلتا رہے گا۔ نصاب تعلیم کے اس تغیر و تبدیلی کا منکر دراصل زمانے کی نبض شناسی اور دور اندیشی سے کوسوں دور ہے یہ حقیقت ہر ایک کو تسلیم کرنی ہوگی کہ زمانے اور حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ نظام اور نصاب تعلیم میں ترمیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح اب جنگی آلات میں نمایاں تبدیلی ہو گئی ہے اور ہاتھی گھوڑوں اور تلواروں کے مقابلہ میں طیارے مشین گن اور میزائل وغیرہ ایجاد ہو گئے ہیں کیا آج ٹینک، طیارہ شکن میزائل اور بکتر بند گاڑیوں کا مقابلہ تلوار اور نیزہ سے کیا جا سکتا ہے

آج زمانہ بہت بدل گیا ہے لوگوں کے افکار وخیالات اور ان کی نفسیات میں نمایاں تبدیلی آگئی ہے۔ سائنس کی ترقی نے مادیت اور اختراعات وایجادات کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ علوم وفنون کے میدان میں بڑے اہم تغیرات ہوئے اور اس مشینی عہد میں کمپیوٹر نظام نے ارتقاء کی وہ منزلیں طے کیں جو محیر العقل اور دل ودماغ کو خیرہ کر دینے والی ہیں۔ ہفتوں اور عشرہ کا کام اب لمحوں میں انجام پا جاتا ہے۔ کمپیوٹر نظام کے ذریعہ علم نے بھی بڑی ترقی کی اور آئے دن اس میں مزید ترقی ہوتی جا رہی ہے ایسے حالات میں یہ اور ضروری ہے کہ ان مدارس میں جہاں قدیم فرسودہ نظام درس قائم ہے اس میں علوم جدیدہ کو داخل کیا جائے تاکہ وہ زمانہ سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ مثلاً اس وقت علوم عصریہ میں انگریزی زبان کو لیجیے جو بین الاقوامی زبان International Language کی حیثیت رکھتی ہے آج اس کے حصول کے بغیر انسان ہزار دشوار گزار مراحل سے گزرتا ہے اور انگریزی سے کورے ہونے پر دعوت اسلامی کے میدان میں ہم نمایاں خدمات بھی سرانجام نہیں دے سکتے۔

اب دور حاضر میں کمپیوٹرائز نظام کو لیجیے اس کے ذریعہ علوم و فنون کو سمیٹنا اور ان کا ذخیرہ وحفاظت اتنا آسان ہو گیا ہے کہ بڑی بڑی لائبریریاں اس معاملہ میں کوتاہ ہیں اسی طرح دوسرے عصری علوم وغیرہ وغیرہ کم از کم اس حد تک ان علوم وفنون کا علم ضروری ہے کہ انسان صالح وغیرہ کی تمیز کرے۔ تاکہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اس کے صالح اور مضر استعمال کی نشان دہی کر سکے۔ اور اس کے بیجا اور غیر صالح استعمال پر ٹوک سکے۔ جس طرح سائنسی علم کے ذریعہ ہمیں تمام سہولیات مہیا ہیں اسی طرح اس سے ہلاکت کے سامان بھی کیے جاتے ہیں۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک مکتوب کے جواب میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ہم انھیں کی باتوں پر اپنا مقالہ ختم کرتے ہیں۔

جس طرح معاشیات، اقتصادیات، عمرانیات وتمدنیات وغیرہ بہت سے علوم وفنون انسانیت کے خادم ہیں۔ اور آج کے اس دور میں کاروان حیات انسانی ان کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اسی طرح فن سائنس بھی ہے۔ خادم انسانیت ہونے کی حیثیت سے اس فن کو حاصل کیا جائے اور اس سے انسانیت کی فلاح وبہبود، راحت وآسائش کا کام لیا جائے شرعاً بالکل اجازت ہے۔

ہاں البتہ سائنس کے ذریعہ انسان کی ہلاکت کے سامان پیدا کیے جائیں سائنسی ترقی کے بل بوتے پر طاقت ور دوسرے کمزور پر ظلم کرے اور اس کے حقوق کو پامال کرے تو شریعت سائنس کے اس غلط استعمال کو جائز نہ رکھے گی۔ اس لیے سائنسی ترقیات کی طرف توجہ مبذول کرنے سے پہلے ایسے افراد کو تیار کرنا ضروری ہے کہ جو ایمان اور عمل صالح کی دولت سے مالا مال ہوں اور خوف خداوندی ان پر ہر آن اور ہر لمحہ طاری ہو تاکہ وہ خدا ترس ہو کر رحمۃ اللعالمین کا نمونہ بن کر تمام عالم انسانیت کے لیے بجائے نقصان رساں ہونے کے راحت رساں ہوں جیسا کہ حضورؐ نے تیرہ سالہ زندگی میں حضرات صحابہ کرامؓ کو بنایا تھا۔ اور ایسے افراد کی تیاری کا مرکز یہ دینی درس گاہیں ہیں۔ جن کو مدارس عربیہ کہا جاتا ہے ان دینی درس گاہوں میں داخل ہو کر جب اخلاص نیت اور طلب صادق کے ساتھ علوم دینیہ کو حاصل کیا جاتا ہے تو ضرور اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (اللہ سے اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے وہی ڈرتے ہیں۔) الحاصل۔ اہل سائنس جب ان مذکورہ اوصاف سے واقف ہوں گے تو وہ تمام عالم انسانیت کے لیے سراسر راحت رساں ہوں گے نہ کہ ضرر رساں۔ جیسا کہ آج کے دور میں مشاہدہ ہو رہا ہے۔

اگر دنیا کے اوپر ایک طائرانہ نظر دوڑائی جائے تو بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر دور میں مسلمانوں نے کوئی نہ کوئی ایجادات ضرور کی ہیں۔ لیکن افسوس کہ آج مسلمانوں کا نام موجدات کی فہرست میں شاید ہی دیکھنے کو ملتا ہو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ آج ہم علوم و فنون کے میدان سے کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ بلکہ تنقیدی مزاج کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں اور تجویدی مزاج کو بالائے طاق رکھتے ہیں لہذا مرکز فروغ سائنس Centre For Promotion of Science کے ارادوں اور اس کی محنت کو مضبوط اور مستحکم بنانے کا عہد کریں تاکہ مدارس عربیہ سے نکلنے والا طالب علم نہ صرف مولوی ہو بلکہ سائنس کے میدان میں بھی اپنی ایک پہچان بنانے کی اہلیت رکھتا ہو اور مستقبل میں ماضی کی یاد کو تازہ کر سکے۔ ہمیں امید ہے کہ گزشتہ سمیناروں کو مدنظر رکھتے ہوئے آئندہ سالوں میں ہم اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے تاکہ وقت اور علم کا صحیح استعمال ہو سکے۔

نفیس احمد ندوی

دینی مدارس میں سائنسی مضامین کی شمولیت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مدارس اسلامیہ کے مسائل وامکانات پر اہم قدم اٹھایا ہے، اور مرکز فروغ سائنس قائم کرکے دینی مکاتب و مدارس کو مزید فعال ومتحرک بنانے کے لیے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ اور مرکز فروغ سائنس کے ذمہ داروں کی دردمندی، دل جمعی اور حوصلہ مندی ہمارے لیے قابل قدر اور لائق ستائش ہے جس کا اندازہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد نسیم فاروقی صاحب کے اس مکتوب سے ہوتا ہے جو تہذیب الاخلاق انتخاب نمبر اکتوبر ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ شیخ الجامعہ لکھتے ہیں کہ:

"تہذیب الاخلاق کو دینی مدارس کے نظام تعلیم، ان کے مسائل وامکانات پر بھی خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ مسلمان طلبا کی ایک بڑی تعداد انہی دینی مدرسوں سے نکل کر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آتی ہے اور عصری تعلیم حاصل کرتی ہے۔ ان مدرسوں کے جو بھی مسائل ہیں تہذیب الاخلاق کو ان پر کھل کر بحث کرنی چاہیے۔"

مرکز فروغ سائنس کو دور سے شک وشبہات کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے اہل اہتمام کو گورنمنٹ کا ایجنٹ تصور کیا جاتا ہے لیکن قریب آنے سے یہ شک وشبہات اور خدشات کافور ہو جاتے ہیں۔ انہی شک وشبہات اور اعتراضات کی وجہ سے مرکز فروغ سائنس اپنے آپ کو نامساعد حالات میں ہونے کا تصور کرتا ہے لیکن معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ تمام دینی مدارس کے اہل اہتمام کو اس کا احساس ہو چلا ہے کہ قدیم صالح علوم کے ساتھ جدید نافع علوم کو شامل نصاب کیا جائے۔ لیکن دو چیزیں ابھی ترمیم نصاب کو عملی جامہ پہنانے میں حائل ہے۔

١. قدیم نصاب تعلیم سے جذباتی وروایتی وابستگی۔
٢. جدید نافع نصاب تعلیم کی عدم فراہمی۔

بقول سید حامد صاحب یہ کام نظریاتی کم عملی زیادہ ہے: اس لیے محض زبان سے ترمیم نصاب کی بات کہہ دینا اور اس کے متبادل کوئی معقول نصاب تیار کرنا اس میدان میں زیادہ کارگر نہ ہوگا۔

جس طرح شرعی عدالتوں اور دار القضاء کا نظام نظریاتی کم اور عملی زیادہ ہے۔ جب تک دار القضاء کے قیام کے سلسلے میں نظریاتی طور پر عرض ومعروض کیا جاتا رہا تو لوگ اعتراض کرتے رہے لیکن پٹنہ، لکھنؤ وغیرہ میں یہ نظام عملاً قائم کر دیا گیا تو چل پڑا۔ نہ صرف چل پڑا بلکہ لوگ اس کو اپنی تسکین کا ذریعہ تصور کرتے ہیں اور بغیر کسی فورس کے اپنے مسائل کو خود بخود لاتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں مقدمات فیصل ہو چکے۔

ترمیم نصاب حالات کا تقاضہ اور وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ترمیم نصاب کے سلسلے میں تحریکیں ہر دور میں چلتی رہی ہیں۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں بھی اس کی تحریکیں چلی ہیں جو کلی طور پر نہ سہی لیکن جزوی طور پر ضرور کامیاب ہوئیں۔ مثلاً سر سید احمد خاںؒ، علامہ شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندویؒ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ ان تمام مفکرین ملت نے ترمیم نصاب کے سلسلے میں نہ صرف نظریاتی بلکہ عملی قدم اٹھایا اور اس میں بہت حد تک کامیاب رہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے نزدیک ترمیم نصاب

سے مقصود، سائنسی مضامین کی شمولیت نہ رہی ہو بلکہ دوسرے مفید علوم پیش نظر رہے ہوں۔

مولانا علی میاں کی زیر سرپرستی دار العلوم ندوۃ العلماء میں گزشتہ دس سالوں کے اندر ترمیم نصاب پر متعدد کانفرنسیں ہو چکی ہیں، جس میں ملک اور بیرون ملک کی ممتاز شخصیتوں نے حصہ لیا اور مقالات پیش کیے۔ مرکز فروغ سائنس ان مقالات کا جائزہ لے کر ایک رائے عامہ قائم کر سکتا ہے کہ ترمیم نصاب کے سلسلے میں علماء کرام کا کیا نقطہ نظر ہے۔

مرکز فروغ سائنس اگر اعتراضات و اشکالات کی زد میں آ کر اپنی تحریک سے کنارہ کش ہو جاتا ہے تو یہ ملت کا عظیم خسارہ ہوگا۔

علامہ شبلی نے ترمیم نصاب کی تحریک نہ صرف ہندوستان میں چلائی بلکہ بیرون ہند، مصر، شام، قسطنطنیہ اور مدینہ منورہ میں اپنی تحریک کی آواز بلند کیا جس سے علماء نے کافی اختلاف بھی کیا۔ لیکن پھر بھی وہ آواز دب نہ سکی، بقول علامہ سید سلیمان ندوی

"مولانا مرحوم (شبلیؒ) نے ندوۃ العلماء کے وجود سے پہلے ہی اس کے ترمیم نصاب سے متعلق سب سے پہلی آواز سفرنامہ روم و مصر و شام میں ١٨٩٢ء میں اٹھائی تھی اور ہندوستان کے ساتھ قسطنطنیہ اور مصر کے مذہبی مدرسوں اور خاص طور سے جامع ازھر کے نصاب و طریق تعلیم و تربیت پر بڑی دل سوزی سے افسوس و حسرت کے آنسو گرائے۔ آنسو کے یہ قطرے بے اثر نہ رہے اسی کے چند سال بعد ١٨٩٩ء میں جامع ازھر کی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کے متعلق سید رشید رضا ایڈیٹر "المنار" مصر نے مسلسل مضامین لکھے۔ ٣٠ جمادی الثانی ١٣١٧ھ کے "المنار" میں اپنی اصلاحی تحریک کے سلسلے میں دنیائے اسلام کے جن تین نامور علماء کے نام سند اً پیش کیے، وہ یہ تھے: شیخ احمد جان روسی، شیخ شبقبطی مغربی (مراکش)، اور شیخ شبلیؒ نعمانی ہندی۔ اس کے بعد مزید لکھتے ہیں کہ اگر ١٩١٣ء کی تحریک جامعہ مدینہ کی کامیاب تو اصلاح ہو جاتی مدارس کی یہ تحریک ساری دنیائے اسلام میں پھیل جاتی:

حیات شبلی دیباچہ ص۱۔ مطبوعہ دار المصنفین

دینی مدارس میں جو علوم رائج ہیں، انکی دو قسمیں ہیں۔

(١) علوم عالیہ ۔ قرآن و حدیث و فقہ

(٢) علوم آلیہ (عقلیہ) منطق و فلسفہ وغیرہ

ترمیم نصاب کے متعلق سے جو بات کہی جاتی ہے اس کا تعلق دوسری قسم سے ہے۔ ان کا نہ مذہب سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی عقیدے سے بلکہ ان کی حیثیت وسائل اور ذرائع کی ہے۔ تا کہ افہام و تفہیم میں مدد مل سکے۔

وقت کی ضرورت اور تقاضوں کے پیش نظر وسائل و ذرائع میں تبدیلی پیدا کرنا کسی قسم کی رکاوٹ کا باعث نہ ہوگا۔ بلکہ مختلف وجوہ سے مفید ہوگا اور اگر ترمیم و تبدیلی پیدا نہ کی جائے تو حیات انسانی جمود و تعطل کا شکار ہوگی۔ خواہ وہ اسباب معیشت ہوں یا وسائل علم آج سائنس کے زیر اثر نت نئے مسائل معرض وجود میں آ رہے ہیں۔ اگر علوم جدیدہ کو داخل نصاب درس کر دیا جائے تو جدید فقہی مسائل کے حل کرنے میں مدد ملے گی۔ بقول علامہ شبلی۔

"اگر آج ہمارے فقہا انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کیے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند قرار پا سکتے"

(حیات شبلی، ١٣٥)

محض نصاب درس کی بنیاد پر دینی مدارس اور عصری اسکولوں کے درمیان ایک زبردست خلیج حائل ہے۔ اس خلیج کو پاٹنے کی علماء دین اور جدید تعلیم یافتہ دونوں طبقوں نے کوششیں کیں لیکن اب تک اس کا کوئی حل نہ نکل سکا۔ امید ہے کہ مرکز فروغ سائنس اس خلیج کو پاٹنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

سائنسی مضامین کی شمولیت:

دینی مدارس ایک خاص نہج اور ایک خاص مقصد کے تحت چل رہے ہیں اور ایک خاص نصاب تعلیم کے پابند ہیں۔ اس نصاب میں ترمیم کرنا اور نئے نصاب کی تشکیل کرنا ایک غور طلب مسئلہ ہے عموماً بڑے مدارس اسلامیہ کا نصاب درس چار مرحلوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

باقی صفحہ ١١١ پر

محمد ارشاد احمد رضوی

دینی مدارس کے لیے سائنسی نصاب کی تشکیل

اور

ہفتہ وار پڑھانے کی مدت

جس سائنس کی اساس مشاہدات و تجربات پر قائم ہو، اس کی اہمیت کسی ذی شعور طبقہ سے پوشیدہ نہیں مگر اب تک اسے اسلامی دانش گاہوں میں اس کا مقام نہ مل سکا۔ آخر اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے درپردہ کارفرما جن عوامل و احساسات اب تک ہماری رسائی ہوسکی انھیں آپ حضرات کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں، اخیر میں اسلامی نصاب کے اندر سائنس کی شمولیت اور اس کے طریقۂ تدریس پر بھی کچھ گفتگو رہے گی۔

وہ عوامل حسب ذیل ہیں۔

(۱) اسلام سے متصادم سائنسی نظریات (۲) اجنبی راہوں سے اس کی آمد (۳) انتظامیہ کی غفلت اور احساس کمتری ـــ پہلے کے دو عناوین براہ راست سائنس سے تعلق رکھتے ہیں اور آخری عنوان ذمہ داران مدارس سے وابستہ ہے۔ جب تک ہم ان اسباب تک رسائی اور ان کا موثر علاج نہ ڈھونڈ لیں گے اس وقت تک مدارس کی فضا سائنس کے لیے سازگار نہیں ہوسکتی۔ اب ہم قدرے تفصیل مذکورہ بالا عناوین پر روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱) اسلام سے متصادم سائنسی نظریات:

ہم سائنس کے فکری ذخیرے کو تین شعبوں میں تقسیم کرسکتے ہیں (۱) اسلامی اقدار سے متصادم نظریات جیسے گردش زمین اور انسانی ارتقاء کا نظریہ۔ (۲) وہ غیر متصادم نظریات جن کا ذکر اسلام کے اندر بھی ملتا ہے جیسے سیارات کی گردش (۳) وہ غیر متصادم نظریات جن کا افکار اسلامی کے ذخائر میں منفی یا مثبت کسی قسم کا کوئی تذکرہ نہیں مثلاً طبعیات وغیرہ۔

چونکہ موجودہ سائنس کے اندر ایک شعبہ ایسا بھی تھا جس سے براہ راست اسلامی بنیادوں پر ضرب پڑتی تھی اس لیے اس کا وجود اسلامیان عالم کے لیے خوش گوار ثابت نہ ہوا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا پورا وجود ہی فکری الحاد اور ذہنی ارتداد کا مصدر کہا گیا اور ایسا بھی نہیں یہ فکری ماحول یونہی محض توہمات بے جا کا ثمرہ تھا بلکہ موجودہ طبقہ کی آزادانہ روی اور یورپین فکری الحاد کا طوفان

الجامعۃ السلفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

اس خیال کی تقویت کے سامان فراہم کر رہا تھا جب کہ بات ایسی نہ تھی اور نہ ہی اس کا یہ علاج تھا نہ تو پوری سائنس الحاد و بے دینی کا مرکز تھی اور نہ ہی اسے اپنے ماحول سے بے دخل کر دینا اس کا علاج کیونکہ سائنس ایک ذریعہ اور آلہ ہے اگر اسے صحیح مقاصد اور صالح مفادات کے لیے استعمال کیا گیا تو اس کے خوش گوار اثرات برآمد ہوں گے اور اگر غلط نظریات کا آلہ کار بنایا گیا تو الحاد و بے دینی کے جراثیم جنم لیں گے۔ اس لیے سائنس کو اسلام مخالف یا دینی جذبوں کا دشمن سمجھنا میرے نزدیک زیادتی ہے کیونکہ فکر و تدبر اور تسخیر کائنات کا فلسفہ تو خود اسلام کے داعیانہ نظام کا اہم باب ہے۔ اور سائنس ہے بھی کیا؟ یہی تو مشاہدات و تجربات کا ایک مسلسل اور مربوط فکری اور عملی نظام ہے۔ اس مرحلہ پر پہنچنے کے بعد خود مدارس اسلامیہ کے اندر رائج شدہ نصاب سے متعلق ایک سوال ذہنی افق پہ ابھرتا ہے کہ مذکورہ نصاب کے اندر بھی تو ایسا لٹریچر شامل ہے جو اپنے اندر فکری الحاد اور سراسر اسلام مخالف نظریات کا بھرپور مواد رکھتا ہے تو پھر کیوں اسے خوب مزے لے لے کر پڑھایا جاتا ہے اور سائنس کو اسلامی فضا کے لیے ناسازگار سمجھ کر ایک کنارے لگا دیا جاتا ہے۔ کیا یہ لٹریچر س طلبہ کے ذہنی افق کو پراگندہ نہیں کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ طالبان علوم نبوت میں فلسفہ کے ملحدانہ افکار و خیالات اثرانداز نہ ہونے کے دو سبب ہیں۔ (۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ خود اس نصاب کے اندر عقاید و کلام کی کتابیں شامل ہیں جس سے طلبہ کی ذہن سازی اتنی مضبوط بنیادوں پر ہو جاتی ہے کہ وہ اس سے متصادم نظریات کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے اور اس طور سے وہ ان مسموم افکار کا شکار ہونے سے محفوظ رہتے ہیں (۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اساتذہ کا انداز تدریس ایسا ہوتا ہے جس سے خود بخود ان مضامین کی بے قدری طلبہ کی نگاہوں میں بھر جاتی ہے، مزید برآں وہ متصادم نظریات کا اسلامیات کی روشنی میں استدلالی محاسبہ بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان طلبہ کے نزدیک ان نظریات کی کوئی اہمیت اور وزن باقی نہیں رہتا اس لیے ان مضامین کی تاثیر کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس لیے سائنس کے پرجوش حامیوں کو بھی یہی انداز اپنانا ہوگا جس کے لیے کرنا یہ ہوگا اسلامی خطوط پر ایک سائنسی نصاب ترتیب دیا جائے اور جدید علم کلام ان متصادم نظریات کی تردید اسی انداز استدلال کے کی جائے جس طور سے ان نظریات کو ثابت کیا گیا ہے اور اسے بھی شامل نصاب کیا جائے۔ تالیف قلب کی روایات کو اپناتے ہوئے مدارس کی فضا کو سائنسی نظریات سے مانوس کرنا ہوگا اس سلسلے میں ادارۂ مرکز فروغ سائنس ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے اگر اس طرح اور دیگر مراکز قائم کر کے تربیتی کورس کا دقفہ کم کر دیا تو اور تیزی کے ساتھ اس سمت پیش رفت ہو سکے گی۔

۲۔ اجنبی راہوں سے اس کی آمد۔

جب مغرب نے علم و فن اور تحقیق و اکتشاف کی زمام قیادت اپنے ہاتھوں میں لے لی اور نئے نئے تجربات کے ذریعہ دنیا کو محو حیرت بنادیا تو اہل اسلام کو اپنے ماضی کی تابناکی اور حال کی محرومی سے سبق سیکھتے ہوئے اس شاہراہ پہ فوراً پیش رفت کرنی چاہیے تھی مگر ہم نے اسے ایک اجنبی قوم، اجنبی زبان اور اجنبی ملک کی دریافت سمجھ کر اس کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ ہماری فضائیں ان سے نفرتوں کا اظہار کر رہی تھیں گو اس وقت ان نفرت انگیزیوں کے کچھ واقعی اسباب بھی تھے۔ انگریز تمام اسلامی تشخصات کو پامال کرنے پر تلے ہوئے تھے مگر دشمنی اور نفرت انگیزی کا محور غلط تسلیم کیا گیا یہ صحیح ہے کہ آثار ہی کے سہارے حقائق کی تلاش اور شناخت کی جاتی ہے بہت کم ایسی حقیقت پسند نگاہیں ہوتی ہیں جو آثار سے نہ الجھ کر براہ راست حقائق تک رسائی حاصل کرنا چاہتی ہیں مگر تحقیق جستجو اسی نگاہ کی متلاشی ہوتی ہے جو صحیح معنوں میں حقائق تک پہنچنے کا جذبہ رکھتی ہیں۔ شاید میرا مفہوم جملوں کے نیچے دب کر رہ گیا۔ اسے ایک مفکر کے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ ہم انگریز اور انگریزی میں فرق نہ کر سکے۔ اور چونکہ سائنس کا زیادہ تر ذخیرہ انگریزی میں تھا یا صرف ہندی زبان تک منتقل ہو سکا تھا مزید برآں اسے ایک ایسے قوم کی فکری کاشت بھی تصور کر لیا گیا تھا جو اسلام دشمنی میں اوروں کی قیادت کر رہی تھی۔ اسی لیے شاید یہ نظریات دینی ماحول میں برگ و بار نہ پا سکے اور اسلامی دانش کدوں میں اسے کوئی مقام نہ مل سکا۔ مگر اب رفتہ رفتہ عقلیں اس سے اور اس کی اہمیت سے مانوس ہوتی جا رہی ہیں۔ انگریزی زبان سے بھی وحشت کا وصف ختم ہوتا جا رہا ہے اور اسے اردو کے قالب میں ڈھالنے کی بھی

روایت عام ہوتی جارہی ہے مگر سارے کام بہت سست رفتاری سے ہو رہے ہیں۔ اس صف میں مدارس تو اور بھی تدریج عمل کے آئینہ دار ہیں۔

سائنس کی نمایاں اشاعت کے لیے ضروری ہے کہ سائنس کا صالح اور معتدبہ عنصر اردو زبان اور عربی زبان میں منتقل کیا جائے کیونکہ ذہن و دماغ مانوس لب و لہجہ میں کسی بات کو بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔ مدارس کے اندر عربی ادب اور عربی ادب کی جانب خاص توجہ دی جائے نہ صرف یہ کہ اسے محض زبان دانی تک محدود رکھا جائے بلکہ ماہرین فن کے ذریعے اس کے اندر لکھنے پڑھنے اور بولنے کی یکساں مہارت پیدا کی جائے۔ اور اس امتیازی رجحان کو بھی عام کرنا ضروری ہے کہ انگریزی اور انگریزی دو علیحدہ وجود ہیں۔ اس کے دو فائدے مرتب ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ تحقیق اکتشاف کی راہیں ہموار ہوں گی اور اس کے لیے ایک وسیع میدان ہاتھ آئے گا پھر ہم اپنی متاع گم گشتہ کو پا سکیں گے اور دوسرا یہ کہ جو فکری الحاد یورپین لٹریچر کے ذریعہ جدید ذہنوں تک منتقل کیا جارہا ہے اس سے ہم آشنا ہو سکیں گے اور اس سحر سامری کا زور توڑنے کے لیے خود کو تیار کر سکیں گے۔

۴۔ انتظامیہ کی غفلت اور احساس کمتری۔

مگر ان سب پر مستزاد مدارس اسلامیہ اور دینی دانش کدوں کے ارباب حل و عقد کی حالات کے تقاضوں سے غفلت اور بے خبری ہے اور دراصل یہ غفلت علم و فن کی اہمیت ناشناسی کی راہ سے آتی ہے۔ آج کل ان کے نزدیک مدارس اسلامیہ اور دینی تعلیم کی اہمیت صرف ایک جاب ڈیوٹی کی سی رہ گئی ہے کہ شب و روز گزرتے رہیں اور طلبہ کی آمد و رفت جاری رہے اور بس! ان کے اعلیٰ ترین مقاصد کیا ہیں؟ اور ان مقاصد کی تکمیل کی راہ کون سے ذرائع زیادہ مفید اور معاون ہو سکتے ہیں؟ انھیں عصری اسلوب اور ماحول کے مذاق سے کیسے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے؟ موجودہ لائحہ عمل کے اندر کیا خامیاں ہیں! اور انھیں کیسے دور کیا جاسکتا ہے! ان تمام احتسابات سے خود کو بے نیاز اور مستغنی تصور کرتے ہیں جب کہ ایک صالح معاشرہ اور پاکیزہ ماحول کی تشکیل کے لیے ارباب بصیرت کے اندر قوت محاسبہ کی بیداری ایک لازمی وصف ہے جس کے بغیر ایک صالح معاشرہ کا تصور بھی ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس کے طلبہ کے سامنے بھی کوئی بلند اور واضح مقصد اور اپنے مراتب کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ان کے مستقبل کا افق مبہم سا ہوتا ہے اور تکمیل کے بعد اگلی راہوں کا تعین نہایت دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے۔ جب کہ انسان اپنے مقاصد کی بلندی ہی کے سہارے پہچانا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام کا قائدانہ تصور ہمہ گیر اوصاف اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ تغافل شعاری کے ساتھ ساتھ احساس کمتری بھی دامن گیر ہوتا ہے۔ اس لیے بھی اپنے لیے سائنس کو ناسازگار سمجھتے ہیں۔ مزید برآں روایت پسندی کے شدید رجحان کی وجہ سے قدیم علمی ورثہ کے اندر تبدیلی کو پسند نہیں کرتے۔ روایت پسندی کا رجحان بلاشبہ محمود و پسندیدہ ہے کہ اسی کے ذریعے اسلام اپنے صحیح تصورات کے ساتھ ہم تک پہنچا۔ مگر اس حد تک نہیں کہ اس سے خود اسلام کے ہمہ گیر نظام کے تصور کو ٹھیس پہنچے۔ ہر دور میں حالات کے تقاضوں کے پیش نظر تعلیمی طریقوں اور نظریات کے اندر ترمیم و تبدیلی کی روایات ملتی ہیں۔ اس لیے آج بھی عصری تقاضوں کے پیش نظر مروجہ نصاب کے اندر بھی جزوی ترمیم ضرور ہونی چاہیے۔ اسی ضمن میں ماہرین فن کا فقدان یا کمیاب ہونا بھی ایک سبب گردانا جا سکتا ہے۔ مگر بلند مقصد، محکم عزم اور پختہ حوصلے کے سامنے اس قسم کی مشکلات کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ جب ذوق جنوں پہاڑوں کا جگر چاک کر سکتا ہے۔ سمندر کی وسعتیں سمیٹ سکتا ہے تو کیا ان مشکلات کو سر نہیں کر سکتا؟ اور ہماری صفوں میں وہ بلند ہمت اساطین فن نہیں پیدا ہو سکتے جن کی صلاحیتوں کو یورپ بھی حیرت کی نگاہ سے دیکھے؟

سائنسی نصاب کی مدارس کے مروجہ نصاب میں شمولیت اور طریقہ کار

مذکورہ بالا بیانات کے بعد یہ بات بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ دینی دانش کدوں میں سائنسی نصاب کی شمولیت ازبس ضروری ہے۔ اس کی ترویج کے چند اسباب کی جانب سابقہ سطور میں اشارہ ہو چکا ہے۔ اب صرف اتنی بات زیر گفتگو رہ جاتی ہے کہ اسے رائج شدہ نصاب کے اندر کس جگہ اور کیسے شامل کیا جائے اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہم پہلے مدارس کے درجات اولیہ

ان کے اندر پڑھائے جانے والے فنون کے بارے میں پہلے سمجھ لیں تاکہ ترمیم کے اندر فنون کو باہم اہمیت کے اعتبار سے ممتاز رکھا جا سکے۔ مدارس اور درجات کے تین طبقے ہوتے ہیں (۱) ابتدائی۔ پرائمری۔ (۲) وسطی (اعدادیہ تا رابعہ) مڈل۔ (۳) نہائی (گریجویشن، خامسہ تا ثامنہ یعنی عالمیت اور فضیلت) ہر ایک طبقہ میں علوم و فنون کے اقسام اور تعداد مختلف ہے۔ ابتدائی مدارس کے نصاب میں مندرجہ ذیل فنون شامل ہیں (۱) ناظرہ (۲) خوشخطی (۳) ابتدائی اردو، ہندی، انگریزی زبانیں (۴) ابتدائی حساب۔ چونکہ عمر کے ابتدائی ایام میں ذہنی کینوس بہت مختصر ہوتا ہے پھر عمر کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے اس لیے اسی ذہنی معیار پر نصاب کا دائرہ بھی پہلے مختصر، پھر وسیع پھر وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے

(۲) وسطی مڈل کا نصاب مندرجہ ذیل فنون پر مشتمل ہوتا ہے (۱) ابتدائی فقہ، اصول فقہ (۲) نحو (۳) صرف (۴) ابتدائی منطق و فلسفہ (۵) ابتدائی عربی اور انگریزی ادب (۶) فارسی ادب (۷) عروض و قوافی (۸) ابتدائی بلاغت (۹) سیرت و سوانح (۱۰) حساب و خوشخطی۔

۳- نہائی (گریجویشن) کا معیار تعلیم مندرجہ ذیل فنون پر منحصر ہوتا ہے۔ (۱) تفسیر (۲) حدیث و اصول حدیث (۳) فقہ و اصول فقہ (۴) عقائد و کلام (۵) فرائض (۶) معیاری عربی و انگریزی ادب (۷) مناظرہ (۸) معیاری منطق و فلسفہ (۹) تاریخ (۱۰) سیرت سوانح۔ (۱۱) تجوید و قرات۔

ابتدائی مدارس سائنس کی شمولیت کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ بچوں کا نصاب نفس مختصر اور بنیادی اصولوں پر مشتمل ہو بہتر ہے۔ انہیں متعلقہ مضامین اور عملی تربیت کا عادی بنانا چاہیے وسطی نہائی مدارس میں جن درجات کے اندر فلسفہ کی کتابیں شامل ہیں ان میں جدید سائنس کو قدیم فلسفہ کا متبادل نصاب تصور کر کے ان کی جگہ پر سائنسی کتابیں شامل کر لی جائیں۔ ہاں جن درجات میں فلسفیانہ نظام تعلیم کا اہتمام نہیں ہے وہاں کچھ غور و خوض سے کام لے کر نصاب میں ترمیم کرنی ہوگی۔ مگر اس ترمیماتی اور متبادلانہ نظام تعلیم کے رائج کرنے پر یہ بات خاص طور سے ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ مدارس اسلامیہ کے قیام کا بنیادی مقصد علوم نبویہ کی ترویج و اشاعت ہے اس لیے اسلامیات اس راہ میں معاون فنون مثلاً نحو و صرف وغیرہ سے دست بردار تو ہو نہیں سکتے البتہ علوم آلیہ میں وہ فنون جو اسلامی نظریہ تعلیم کی جہت سے اس قدر اہمیت کے حامل نہیں اور وہ از کار رفتہ ہو چکے ہیں مثلاً منطق کی بعض کتابیں جیسے حمد اللہ وغیرہ یا بعض فنون کی وہ کتابیں جن کی اسی فن میں اس سے بہتر متبادل کتابیں ہیں جن کے ہوتے ہوئے ان کتابوں کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہ جاتی مثلاً اصول فقہ میں حسامی اور توضیح وغیرہ۔ ان کی جگہ پر جدید اسلامی سائنس اور جدید علم کلام کی نصابی کتابیں داخل نصاب کی جا سکتی ہیں۔ مگر اس نصاب کو وقفہ جاتی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے ایک مستقل فن کی حیثیت سے تمام اوقات درس پر حاوی ہونا چاہیے میری رائے اس امر کی تائید میں نہیں کہ ایسے یا اس قسم کے دوسرے مضامین کو ہفتہ وار نہ پڑھایا جائے کیونکہ اس سے اسباق کے درمیان وقفہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ان مضامین سے کماحقہ تعلق نہیں پیدا ہو پاتا اور ذہن اور دماغ اور مضمون کے درمیان اجنبیت کی غیر مانوس فضا چھائی رہتی ہے جس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ اس فن یا مضمون میں طالب علم کے اندر بصیرت نہیں پیدا ہو پاتی اور بصیرت کا فقدان ان مقاصد سے انحراف کے مترادف ہوگا جن کے پیش نظر مذکورہ نصاب میں اس مضمون کی شمولیت عمل میں آئی تھی۔ ہاں ہفتہ وارانہ تعلیمی پروگرام زیادہ سے زیادہ عبوری دور تک رکھا جا سکتا ہے تاکہ رفتہ رفتہ اس سے انس پیدا ہوتا جائے پھر بعد میں چل کر اسے مستقل نصاب کی شکل دے دی۔

اخیر میں یہ عرض کرتا ہوا رخصت ہوتا ہوں کہ اگر سائنس (تحقیق و اکتشاف) کے میدان میں پیش رفت کر کے تلافی مافات کرنے کی سعی پیہم جاری رہی تو وہ دن دور نہیں کہ دنیا ہماری ایجادات و اکتشافات پھر سے حیرت کی نگاہوں سے دیکھے اور پھر ہم ایک بار اپنے حال کا رشتہ ماضی کی درخشانی سے جوڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ دریا سے بچھڑے ہوئے قطرے کا دوبارہ دریا میں جا ملنا محال نہیں۔

محمد مہتاب عالم قاسمی

مدارس اسلامیہ کا نصاب و نظام تعلیم

ہندوستان کی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے حضرات بخوبی حاصل نہیں کہ اس سرزمین پر اسلام کی صدائے بازگشت پہلی صدی ہجری سے ہی سنائی دینے لگی تھی اور رفتہ رفتہ یہاں کے باشندگان اس کے فیوض و برکات سے مستفید ہوتے رہے، حتیٰ کہ زمانہ سلاطین مغلیہ میں آفتاب اسلام اپنی چمک اور دمک کے ساتھ بام عروج پر پہنچ گیا، خواجہ باقی باللہ، مجدد الف ثانیؒ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، شیخ علی متقیؒ، مولانا محمد بن طاہر پٹنیؒ وغیرہم جیسے سیکڑوں علماء و اصفیاء اور ان کے خلفاء و مریدین نے اپنی اپنی اصلاحی تبلیغی اور تعلیمی سرگرمیوں سے پورے ہندوستان کو جگمگا دیا تھا، لاتعداد مدارس اور خانقاہیں آباد تھیں اور ہر چہار طرف علم، اخلاق، روحانیت، اور امن و امان کا دورہ تھا۔

جب گردش زمانہ سے سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا اور مسلمانوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے ظالم و جابر برطانیہ قہر الٰہی کی صورت میں ہندوستان پر مسلط ہوا تو آہستہ آہستہ ۱۸۵۷ء میں وہ نوبت آپہنچی کہ ہندوستان ایک مہیب و سنسان خاردار جنگل دکھائی دینے لگا۔ چاروں طرف بے دینی کی آندھی چلنے لگی، شکوک و شبہات کے سیاہ بادل منڈلانے لگے۔ اسلام پر اعتراضات و اتہامات کی بوچھار شروع کر دی گئی۔ مسلم نوجوان اس ابھرتی ہوئی مغربی تہذیب و تعلیم سے الحاد و دہریت کی زد میں آنے لگے۔ اور صاف نظر آنے لگا کہ اگر یہی سیل و نہا رہے تو وہ دن دور نہیں کہ آئندہ نسلیں اسلامی تہذیب و معاشرت اور سنت و شریعت سے رشتہ توڑ کر کفر و الحاد کی رو میں بہہ جائیں گے ان حالات کے پیش نظر اللہ کے مخلص بندوں کی ایک جماعت دین محمدی کی حمایت، اسلامی تعلیمات کے تحفظ اور اس کی اشاعت کے لیے میدان عمل میں کود پڑی۔ تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے پورے ہندوستان میں ایسے دینی مکاتب و مدارس کا جال بچھا دیا جو ان کے نزدیک اسلامی قلعے تھے۔ انھوں نے ان مدارس و مکاتب کے لیے جو نصاب و نظام تعلیم مرتب کیا وہ خالصتاً اسلامی طرز کے تھے۔ عصری علوم و فنون اور عصری تقاضوں کا قطعاً کوئی لحاظ رکھے بغیر سادگی، جفاکشی اور قناعت اس کی بنیاد تھی، ان اللہ والوں نے اپنا کام بے نفسی، خاموشی اور نظم و ضبط کے ساتھ اس طرح انجام دیا کہ ارتداد کے فتنے و بے دینی کے سیلاب کے آگے سد سکندری حائل کر دی اور حالات کی تمام ناسازگاریوں کے باوجود اسلام پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رہ گیا۔ اسی بنا پر ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے ان مدارس عربیہ پر تنقید کرنے والے ایک اہل قلم سے فرمایا تھا کہ ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا، جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح ہسپانیہ

مدرسہ کنز مرغوب، پٹن۔ گجرات پن 384266

میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر کے سوا اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔"

آج کے بدلتے ہوئے حالات میں ان مدارس ومکاتب اسلامیہ کی ضرورت وافادیت پر مثبت ومنفی بحثیں کی جارہی ہیں اور ان کے نصاب ونظام تعلیم میں ترمیم واضافہ کا مطالبہ کیا جارہا ہے، بلاشبہ ان مدارس کے نظام ونصاب میں بعض خامیاں ایسی ہیں جو فوری توجہ کی مستحق ہیں۔ اس سلسلے میں بعض تجاویز نہایت مخلصانہ اور حقائق پر مبنی ہیں۔ لیکن بعض حلقوں کی طرف سے ایسے بھی مشورے دیے جارہے ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا گیا تو اسلام کے یہ قلعے جو ایثار وقناعت اور دینی تعلیم کی نشر واشاعت کے لیے وجود میں آئے تھے، کہیں صرف معاشی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ نہ بن جائیں۔ اس لیے کسی طرح کی ترمیم و اضافہ سے پہلے درج ذیل پہلوؤں پر بھی غور کرلینا چاہیے۔

- یہاں کا مسلمان جو ہمیشہ سے ہزاروں کی تعداد میں مدارس و مکاتب قائم کرکے دین کی حفاظت کا انتظام کرتا رہا ہے اور آج بھی حالات کی ناسازگاریوں کے باوجود مسلمان قوم صرف دینی تعلیم بالفاظ دیگر قرآن وحدیث کے نام پر کروڑوں روپے خرچ کررہی ہے کیا اس رقم کو بجائے اس کے صنعت وحرفت کی تعلیم پر خرچ کرنا دیانت داری کے خلاف نہیں ہے؟ اور کیا قوم کسی مدرسے کو صنعت وحرفت کی تعلیم کے نام پر رقم فراہم کرے گی؟ مشاہدہ تو یہ ہے کہ عصری تعلیمی ادارے بھی فراہمی مالیات کے لیے مدرسہ کا ضمیمہ لگالیتے ہیں۔
- کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سائنس وٹکنالوجی کی انتہائی تعلیم کے لیے انگریزی وریاضی میں مکمل مہارت اور اس سے کماحقہ واقفیت نہایت ضروری ہے، کیا مدرسہ کا طالب علم جو ۱۰ سالہ محنت کے باوجود عربی زبان پر قادر نہیں ہوپاتا کیا وہ اپنے موضوع سے انصاف کرتے ہوئے انگریزی اور ریاضی پر بھی قادر ہوسکتا ہے؟
- کیا اس سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ دور میں ایک فی صدی مدارس میں بھی قدیم علوم وفنون مثلاً فلسفۂ قدیم ہیئت، منطق وغیرہ کی کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں، نیز نئے حالات کی روشنی میں عربی زبان وادب اور بقدر ضرورت انگریزی وغیرہ کا نیا نصاب کیا رائج الوقت نہیں ہے؟
- عربی مدارس کے نصاب میں کمی کرکے پیشہ ورانہ تعلیم کو جگہ دینے والے حضرات کیا اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ مذہب اسلام کی ہمہ گیری اور وسعت کے پیش نظر محدود نصاب اور مختصر وقت کی تعلیم، زندگی کے متنوع اور کثیر الانواع حالات میں رہنمائی کے لیے بالکل ہی ناکافی ہے۔
- جس مطلوبہ اسلامی وعصری نصاب تعلیم کا مطالبہ کیا جارہا ہے کیا ممالک عربیہ واسلامیہ کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں وہی نصاب رائج نہیں ہے؟ جب بحیثیت مسلمان ہماری ہی قوم کی ایک بڑی جماعت یہ فریضہ حکومتوں کی نگرانی میں انجام دے رہی ہے تو کیا یہ مناسب نہیں کہ آیت پاک "وتلکن منکم ... لیتفقہوا فی الدین" کے مطابق ایک جماعت صرف اور صرف تفسیر فقہ وحدیث کی خدمت میں لگی ہے جس جماعت کی تعریف زبان رسالت میں "خیرکم من تعلیم القرآن وعلمہ" کہہ کر کی گئی ہے۔ بالخصوص آج کے حالات میں جہاں اخلاقی گراوٹ تعیش پسندی جنسی انارکی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، کیا ان حالات میں یہ ضروری نہیں ہے کہ کچھ لوگ، صبر وقناعت عفت حیا صدق وصفا اخلاص ومروت ایثار وتوکل جیسے اعلیٰ اقدار کے نگہبان وعلمبردار بنے رہیں اور صرف وعظ ونصیحت، تربیت نسلیک، افتا، وتدریس جیسی خدمتیں انجام دیتے رہیں۔

ان گزارشات کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مدارس اسلامیہ کے نصاب میں کسی قسم کی ترمیم واضافے کے قائل نہیں، ہمیں صرف اس ترمیم کے غیر مفید اجزا سے اختلاف ہے، جو حضرات ٹکنالوجی کی بات کرتے ہیں ان سے ہم صرف اتنی گزارش کریں گے کہ اب یہ بات عملاً ممکن نہیں کہ ایک شخص کسب معاش کے لیے کوئی مستقل پیشہ بھی اختیار کرے اور معاشرے کی دینی خدمت بھی تمام کمال انجام دے آج کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ اپنا اور اپنے بچوں

پیٹ پالنے کے لیے ہمہ وقتی محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس محنت سے فراغت کے بعد عموماً انسان اس قابل نہیں رہتا کہ قابل لحاظ دینی خدمت انجام دے سکے، لہٰذا اس دور میں ایسی اکا دکا مثالیں تو ہوسکتی ہیں کہ ایک عالم کسب معاش کے لیے کوئی مستقل پیشہ اپنائے اور فارغ اوقات میں دینی خدمت انجام دے لیکن علماء کو بحیثیت مجموعی یہ مشورہ دینا کہ وہ تحصیل معاش کے لیے کوئی دوسرا ہنر سیکھیں درحقیقت معاشرے کی دینی ضرورت کو معطل کردینے کے مترادف ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں اس قسم کی صنعتی تعلیم کا اضافہ ہماری نظر میں دینی مدارس کے اصل مقصد میں مخل انداز ہی ثابت ہوگا۔

جہاں تک سائنس کی تعلیم کا تعلق ہے ایک عالم دین کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ اس شعبے کی عام ضروری معلومات رکھتا ہو لیکن ان کو باقاعدہ پڑھنے اور سیکھنے کی تجویز نہ مزاج مدارس سے میل کھاتی ہے اور نہ کوئی طالب علم اپنے موضوع سے انصاف کرتے ہوئے ان مضامین کی کماحقہ تعلیم وتربیت حاصل کرسکتا ہے۔

اس کے علاوہ بعض مضامین ایسے ضرور ہیں کہ جن سے آج کے دور میں ایک اچھے عالم دین کو اچھی خاصی واقفیت ہونی ضروری ہے۔ جس کے ذریعے وہ اپنے تبلیغی اصلاحی اور تحقیقی مقاصد میں کامیاب ہوسکیں۔ ان تجاویز کو ہم مختصراً اس طرح بیان کرسکتے ہیں۔

- عصری تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے طلبہ کو دو عالمی زبانوں جدید عربی اور انگریزی اور کم از کم ایک علاقائی زبان سے واقف کرانا۔
- مستشرقین کے طرز فکر اور ان کے کاموں سے براہ راست واقفیت حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنا۔
- عہد حاضر میں رائج شدہ معاملات کی تہہ تک پہنچنے اور ان میں سے جو شرعاً ناجائز ہیں ان کا متبادل راستہ تجویز کرنے کے لیے معاشیات و مالیات کا معتد بہ مطالعہ کے اسباب و مواقع فراہم کرنا۔

اس کے علاوہ اور بھی وہ تجاویز و ترامیم ہیں جن کی وجہ سے مدارس عربیہ واسلامیہ کے اصل مزاج و مذاق کو برقرار رکھنے میں کوئی دشواری نہ ہو تو ہم کو نہ صرف کوئی اعتراض نہیں بلکہ ہم اس کی پوری قوت سے حمایت کرنے کے لیے تیار ہیں بس اصل شرط یہ ہے کہ صورۃ وسیرۃ اتباع سنت پر مبنی مدارس کا اصل مزاج و مذاق کسی بھی مرحلے میں مجروح نہ ہونے پائے۔

باقی صفحہ ۴۸ کا

تناسب ہے وہ انھیں دینی علوم کے مراکز و مکاتیب کا مرہون منت ہے موجودہ درس نظامی کی ابتدا تاریخ کے اس دور میں ہوئی ہے کہ جو مسلمانوں کے عروج کا دور ہے۔ اسلامی مبلغین و فاتحین جب جزیرۃ العرب سے باہر کی دنیا میں پہنچے تو انھیں مختلف عقاید مذاہب اور مختلف علوم و فنون سے واسطہ پڑا ان علوم سے ٹکرانے یا اعتراض و احتجاج کرنے کے بجائے انھیں متاع گمشدہ سمجھ کر اپنے اندر سمیٹ لیا منطق و فلسفہ اس دور کے اعلیٰ علوم مانے جاتے تھے چنانچہ آج کے درس نظامی میں منطق و فلسفہ کی کتابیں ہمارے دینی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان میں طلبہ کتنی دلچسپی لیتے ہیں اسے ہمارے علمائے کرام اچھی طرح جانتے ہیں۔ بنیادی وجہ یہی ہے کہ طلبا کے سامنے موجودہ دور میں منطق و فلسفہ کی غیر افادیت اظہر من الشمس ہے

موجودہ درس نظامی میں عربی ادب میں متنبی، نفحۃ العرب، نفحۃ الیمن، دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ وغیرہ آج کی جدید عربی سے ان کتابوں کا بالکل جوڑ نہیں، شرح تہذیب، ملا حسن، مسلم سلم، مقامات وغیرہ

جدید فکری علوم سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں فہم قرآن و حدیث کی تائید و تصدیق کے لیے جتنی سائنس معاون و مددگار ہوسکتی ہے دیگر عصری علوم نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا درس نظامی سے رطب و یابس نکالنے کی اشد ضرورت ہے۔ اب مسئلہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ اسکی آسان صورت یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا متعلقہ شعبہ ایسا نصاب موجودہ درس نظامی کی روشنی میں مرتب کرے جس سے دینی تعلیم کی اساس بھی باقی رہے اور دینی مدارس کا تشخص بھی نیز دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلما لکھنؤ اور دوسرے ہندوستان کے اہم دینی مدارس کے ذمہ دار حضرات سے مطلوبہ نصاب کی تائید و تصدیق کرائی جاوے اگر ان حضرات کی رائے میں نصاب میں کوئی کمی ہو تو یونیورسٹی اس پر پھر نظر ثانی کرے اس طرح افہام و تفہیم کا سلسلہ مابین علمائے دین و دنیا کے ہوگا تو اس کے نتائج انشاء اللہ قوم و ملت کے لیے خوش آئند ہوں گے

ڈاکٹر کنور محمد یوسف امین*

دینی مدارس کے لیے سائنسی نصاب کی تشکیل

سائنسی حقائق کا صحیح مقدمات اور ترتیب کے ساتھ بیان

دینی مدارس میں سائنس کی تدریس کے لیے نئے انداز بیان اور کتابوں کی ضرورت ہے۔ سائنس کا مروجہ بیان اور کتابیں مدارس کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں جن کا بیان اس مقالہ کی حدود سے متجاوز ہے سائنس کے مناسب طرز بیان اور کتب کو وضع کرنے کے لیے بعض اصولوں اور مقاصد کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ یہ بیان اسلام کے تصور سائنس سے مطابقت رکھتا ہو۔ اسلام فکر وعمل کے ہر گوشہ میں حق وصداقت کی بازیافت کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے اور اس کے عقائد واحکامات انسان کے تمام فطری وعملی امور کو اس طرح متاثر ومربوط کرتے ہیں کہ وہ حق کے مطابق ہوجائیں۔ چنانچہ Nature یعنی آفاق والنفس کے علم اور مطالعہ کے لیے بھی اسلام نے انتہائی اساسی اور عمیق بدیہیات ومسلمات پیش کیے ہیں۔ ان بنیادوں پر استوار سائنس سب سے زیادہ صحیح اور نقائص سے پاک ہوگی۔ جسے تمام عالم میں رائج ہونا چاہیے۔ اس کام میں امت مسلمہ کو کلیدی اور اقدامی رول ادا کرنا چاہیے۔ خاص طور سے مدارس میں اس قسم کے ہی سائنس کو پڑھانا چاہیے۔ تاکہ اسلام کے یہ تلفے نہ صرف مغربی سائنس سے وابستہ مادہ پرستانہ خیالات کی زہرناکیوں سے محفوظ رکھ سکیں بلکہ سائنسی جہت سے بھی توحیدی نقطۂ نظر ہی کو تقویت حاصل ہو۔

اسلامی بنیادوں پر استوار صحت مند اور فطری سائنس کو وجود میں آنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔ لیکن کم از کم جدید سائنسی حقائق کو اس طرح مربوط ومنظم کیا جاسکتا ہے اور انھیں ایسے مقدمات کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے جن سے وہ کسی حد تک ایسی شکل اختیار کرسکیں جس کا تقاضا اسلام کرتا ہے۔

اسلام کے مطابق Nature اپنے مادی پہلو تک محدود نہیں ہے، بلکہ غیبی موجودات سے اتصال بھی رکھتا ہے مثلاً آفاق میں فرشتوں کا تصرف ہے اور انفس میں روح وقلب کی کارفرمائی ہے۔ مزید براں وجود کی یہ شہودی وغیبی سطحیں اپنی اپنی سطح پر افقی لحاظ سے بھی مربوط ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ عمودی اعتبار سے بھی مربوط ہیں۔ ثالثاً یہ مربوط ومنظم شہودی وغیبی کائنات اپنے وجود کے لیے کلیتہً اور ہمہ وقت اللہ تبارک وتعالیٰ پر منحصر ہے۔ رابعاً کائنات اس کے تمام اجزا اور ان کی باہم ترکیب

* ریڈر اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کسی مقصد کے حصول کے لیے ہے۔ اسلام یہ بھی بتاتا ہے کہ انسان ان تمام امور کا علم بھی حاصل کرسکتا ہے جس کے [illegible] طریقہ) میں مشاہدہ اور تجربات بھی شامل ہیں، وجدان (Intuition) اور عقل (Reason) کا کردار بھی ہے اور وحی الٰہی کو اس میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مسلمانوں نے جس عظیم سائنس کو وجود بخشا اس کی تشکل اور طریقۂ مطالعہ ایسا ہی تھا۔ البیرونی، ابن سینا اور اخوان الصفا نے نہ صرف طبیعیات، فلکیات اور حیاتیات میں محیر العقل دریافتیں کیں بلکہ ان کے باہمی اور غیبی اضافات کے ساتھ ربط، اللہ تبارک و تعالیٰ پر انحصار مقصدیت اور توحید و صفاتِ الٰہی کی آیات (نشانیاں) ہونے کو بیان کیا

سابقہ تین دہائیوں میں چوٹی کے مسلم مفکرین نے اس میدان میں فیصلہ کن پیش قدمی کی ہے جن میں ملیشیا کے سید محمد النقیب العطاس، امریکہ میں مقیم سید حسین نصر، لندن کے ضیاء الدین سردار، کیمبرج میں واقع اسلامک اکیڈمی اور علی گڑھ میں کام کررہے Centre for Studies on Science وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ Organization of Islamic Countries کے تحت پاکستان میں سنہ ۱۹۸۰ء میں منعقد ہونے والی II World Conference on Muslim Education کی جانب سے سائنس اور ٹکنالوجی کو اسلامی بنیادوں پر استوار کیے جانے کی ضرورت پر قرارداد منظور کی گئی۔ بعض اداروں نے یہ کام شروع بھی کردیا ہے مثلاً ملیشیا کی "اکیڈمی سائنس اسلامی ملیشیا" (ASASI) نے Secondary School Integrated Curriculum کی تیاری میں اہم رول ادا کیا جسے ۱۹۸۰ء میں نافذ کیا گیا اور جس کو اسلامی سائنس کے نصاب کا ایک کامیاب نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

اسلام سے ہم آہنگ صحت مند اور فطری سائنس کی نشاۃ ثانیہ کے کام سے متعلق علمی و تحقیقی جرائد، کتب نیز نصابوں اور درسی کتابوں کی مدد سے جدید سائنسی حقائق کو مناسب مقدمات اور ترتیب کے ساتھ ڈھال کر مدارس کے لیے سائنس کی درسی کتابیں تیار کی جاتی ہیں جو ممکنہ حد تک مغربی سائنس کے کائنات کے محض مادی پہلو سے متعلق بکھرے ہوئے حقائق کو جو صراحتاً نہیں تو کنایتہً خدا، غیب اور مقصدیت کا انکار کررہے ہیں ایک ایسی شکل میں پیش کرتی ہوں جن میں یہ حقائق اللہ کی توحید اور صفات کی نشانیاں بھی نظر آرہی ہوں۔ اپنی شہودی سطح پر اور اپنے غیبی اضافات کے ساتھ مربوط بھی محسوس ہورہے ہوں، غیب اور شہادت کے کائناتی کل کے اجزا کے طور پر کلیتہً اللہ تبارک و تعالیٰ پر وجودی لحاظ سے منحصر بھی دیکھے جارہے ہوں اور ان کی مقصدیت بھی نظر آرہی ہو۔

باقی صفحہ ۱۰۲ کا

(۱) ابتدائی
(۲) ثانوی
(۳) عالمیت
(۴) فضیلت

موخر الذکر دو مرحلوں (عالمیت و فضیلت) میں سائنس کو داخلِ نصاب کرنے کی بات کرنا ایسا ہی ہے جیسے آرٹ فیکلٹی میں سائنس کو داخلِ نصاب کرنے کا مطالبہ کرنا۔ البتہ ابتدائی اور ثانوی مرحلوں میں سائنسی مضامین کی شمولیت ممکن ہے۔

ابتدائی اور ثانوی دو مرحلے تقریباً ہائی اسکول کے مساوی ہیں درجہ پانچ تک تو عموماً دینی تعلیمی کونسل کا نصاب رائج ہے جس میں سائنس داخل ہے۔ البتہ ثانویہ میں زیادہ تر صرف و نحو عربی ادب و انشاء کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور کچھ فقہ و حدیث کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان دو مرحلوں میں اگر قدیم نصاب کو ترمیم کرکے سائنسی مضامین کی شمولیت کردی جائے تو زیادہ خلل واقع نہ ہوگا اور مدارس کے مقاصد بھی فوت نہ ہوں گے لیکن پھر بھی یہ مسئلہ مدارس کے اربابِ حل و عقد کی طرف رجوع کرنے ہی سے حل ہوسکے گا۔

ڈاکٹر محمد اسحاق

الامین تحریک اور اس کے بانی

تقسیم ہند کا سانحہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اندوہناک باب ہے۔ آزادی کے کوئی پندرہ برس تک مسلمانوں کے ہوش و حواس گم رہے بلکہ ساری قوم پر ایک سکتہ طاری رہا۔ ۱۹۶۰ء تک ہمارے دانشوروں کو ایک بات سمجھ میں آگئی کہ ہماری ساری مصیبتوں، غربت و افلاس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے وہ مسلم قوم کی جہالت اور تعلیم سے دوری بلکہ مولانا حالی کی زبان میں سب ہی پکار اٹھے۔

اب وقت کا ناطق یہی ہے کہ جو کچھ ہے، دنیا میں تعلیم ہی ہے

پھر چند درد مند کھڑے ہوئے، بعض منزل کی مشکلات دیکھ کر وہیں بیٹھ گئے۔ اور کچھ اسی گھپ اندھیرے میں چل پڑے اور اسی تاریکی میں روشن راستے بنا لیے۔ ان ہی میں ایک نام ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا بھی ہے جنھوں نے اپنا تعلیمی مشن ۱۹۶۳ء میں بنگلور سے شروع کیا جب کہ وہ ابھی ماسٹر آف سرجری کے طالب علم تھے اور عمر ۲۹ سال کی تھی۔

انھیں یہ خیال شدید طور پر ستانے لگا کہ مسلمانوں کا ایسا کوئی پلیٹ فارم نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ اپنا مستقبل سنوارنے کے منصوبے بنا سکیں۔ یہاں پر موصوف کی "الامین تحریک" سے متعلق مختصر سے مختصر طور پر تعارف کروانا مقصود ہے۔ تاکہ تعلیم، معاشی و معاشرتی اصلاح کے کام کرنے والوں کی بہت سی کام کی باتیں مل جائیں گی۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ کس طرح ایک آرٹس، سائنس اور کامرس کالج قائم ہو جائے۔ اسی خیال لے کر شہر کی بہت سی اہم شخصیتوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہر شہر میں چند اشخاص ضرور ایسے ہوتے ہیں کہ وہ تعمیری کام کی مخالفت کرتے ہیں۔" چنانچہ میں نے اپنے کام کی شروعات بڑی خاموشی سے کرنے کی ٹھان لی۔ جب کام خاموشی سے ہونے لگا میرا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ وہ حضرات جو کام کرنے سے پہلے اپنے کام تشہیر کرتے ہیں وہ بلا وجہ اپنے مخالفین کی حسد کی آگ بھڑکا دیتے ہیں جو ان کے کام رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں جب جسٹس بشیر احمد سعید کی رہنمائی میں ساؤتھ انڈیا ٹرسٹ" کا قیام عمل میں آیا۔ اسی کے میمورنڈم آف ایسوسی ایشن کو "الامین" کے لیے اپنا لیا گیا۔ اس کے مطابق یہ اصول رکھا گیا کہ پہلے دس سال تک کوئی انتخابات نہیں ہوں گے۔ ان قوانین نے "الامین" کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ شرارتی عناصر کو بھی اس سے دور رکھا۔

کونسا کام پیسہ کے بغیر چلا ہے محض جذبہ اور اخلاص کس کام ڈاکٹر صاحب کو پہلی مرتبہ چندہ اور عطیات جمع کرنے کی مشکلات کا تجربہ ہوا۔ اگر وہ خود اپنا ذاتی سرمایہ نہ لگاتے۔ اپنی اور اپنی بیگم صاحبہ کی جائدادیں فروخت کر کے وہ اس مشن کو دل و جان سے نہ چلا۔ ہوتے تو کبھی کے وہ اپنے مقصد میں ناکام رہ جاتے ان کی ما ما

ریٹائرڈ پرنسپل کالج آف ایجوکیشن، بازار گارڈ، حیدرآباد

پریشانیوں اور حیرانیوں کو دیکھ کر لوگ کہتے "میاں یہ تعلیمی کام عیسائی مشنری والوں کو ہی شوبھا دیتا ہے۔" لیکن خدا کا بندہ جب مایوس ہو جاتا ہے تو پھر غیب سے اس کی مدد و رہنمائی شروع ہو جاتی ہے۔ "کالج بہرحال چل رہا تھا۔ کشمیر سے کسی نے الامین سوسائٹی کے نام ایک روپیہ چندہ منی آرڈر کیا۔ ڈاکٹر صاحب اس بے غرض محسن کے ایثار سے بہت متاثر ہوئے۔ تفریحی پروگرام اس آس میں منعقد کیے گئے کہ ان سے کافی آمدنی ہوگی۔ لیکن جتنا کچھ جمع ہوتا وہ پروگرام کے اخراجات کے سبب ہی برابر ہو جاتا۔ ایک رات ایسا ہی ایک پروگرام چل رہا تھا اور اس سے کوئی خاطر خواہ آمدنی کی امید نہیں تھی۔ میری بیٹی گود میں تھی اور زار و قطار میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔" کالج میں اساتذہ کی تنخواہیں اور دوسرے اخراجات کے لیے میں نے بیوی کا باغیچہ اور اپنا ذاتی مکان فروخت کر دیا۔ ۱۹۷۶ء تک یہ کالج سنبھل گیا جس میں دو ہزار طلبا تعلیم پانے لگے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ سوسائٹی کا ارتقا میرے بغیر بھی ہو سکتا ہے تو فخر کے ساتھ میں نے نہ صرف سکریٹری بلکہ مجلس انتظامیہ کا یہ کار خیر ایک دوسرے فرد کی کارکردگی میں دے دیا۔ میرے استعفے سے مسلمانوں کی تاریخ میں نئے باب کی ابتدا ہوئی۔ میں نے اپنا اصول بنا لیا، جب کوئی ادارہ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے تو وہاں سے ہٹ جاتا ہوں۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے اس انقلابی فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ہی ادارہ کے بانی بن کر نہ رہے۔ ان کے اس ایثار و جذبہ کا اثر یہ ہوا کہ کام کرنے کے لیے کئی ایک مخلص سامنے آ گئے جنھیں خود اعتمادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی ان کے کام میں نہ دخل دیا اور راہنمائی کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ "الامین" کے تحت کئی ادارے نہایت کامیابی کے ساتھ کام کرنے لگے بلکہ ہر ادارہ اپنی جگہ اپنے کام کا ایک شاندار ریکارڈ رکھتا ہے۔ ۱۹۶۹ء تک لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ممتاز احمد خاں بڑے کام کا آدمی ہے۔ اب کیا تھا ہر طرف سے لوگوں کا تقاضا شروع ہو گیا کہ یہاں پر ہائی اسکول قائم کر دیں۔ یہاں گرلز اسکول کی ضرورت ہے۔ ۱۹۸۶ء تک مختلف مقامات پر بارہ ہائی اسکول قائم ہو چکے تھے۔ تعلیم کے ساتھ صحت کا بھی خیال آیا۔ ۱۹۷۱ء "الامین میڈیکل ٹرسٹ ہسپتال" (بنگلور) قائم ہوا۔ اس ٹرسٹ کے صدر سر مرزا اسماعیل کے نامور فرزند ہمایوں مرزا ہوئے۔ اس کی شروعات سات افراد کے سات سو روپے سے ہوئی۔ ۱۹۹۰ء تک اس کا اثاثہ ایک کروڑ تک پہنچ گیا۔ ۱۹۹۲ء تک ۶ پروفیشنل کالجز چل پڑے۔ کالج آف فارمیسی، انجنیئرنگ کالج، کالج آف ایجوکیشن، لا کالج، ڈینٹل کالج وغیرہ۔ ۱۹۸۴ء میں کرناٹک کے چیف منسٹر جناب ہیگڑے نے بیجاپور میں میڈیکل کالج کھولنے کی اجازت دے دی۔ اس کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن آج بیجاپور میں یہ میڈیکل کالج ۱۵۰ ایکڑ زمین کے رقبہ پر بہت سی عمارتوں میں شاندار خدمات انجام دے رہا ہے۔ تعلیم اور صحت کے ساتھ ساتھ لوگوں نے مسلمانوں کی اقتصادی حالت درست کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ ۱۹۷۷ء میں "الامین کوآپریٹیو بنک" قائم کیا گیا۔ ۲۵ سال کے عرصہ میں اس کے ڈپازٹ کی رقم ۳ لاکھ سے ۵۰ کروڑ تک پہنچ گئی۔ بنگلور میں اس کی پانچ شاخیں کام کر رہی ہیں۔ جب یہ ادارہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا تو ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اس کے بورڈ آف ڈائرکٹرس سے استعفیٰ دے دیا۔

"یہ ادارے میرے لیے مسافر خانوں کی طرح ہیں۔"

اب مجھ سے رہا نہ گیا۔ یہاں پہنچ کر ایک بڑا سوال یہ تھا کہ عام طور ادارہ کے بانی لائف ممبر تو رہتے ہیں۔ برسوں کسی ادارہ کی ذمہ داری سنبھالنے اور اسے پروان چڑھانے کے بعد اپنے آپ کو پوری طرح الگ کر لینا کوئی آسان بات نہیں ہے اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ادارہ غیر ذمہ دار اور بددیانت لوگوں کے ہاتھوں میں جا کر زوال پذیر ہو جاتا ہے پھر آپ اتنے بڑے بڑے ادارے کس طرح کس اعتماد پر چھوڑ بیٹھے؟" اس کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے کسی کی اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں، قابلیت و صلاحیت کی شہرت متاثر نہیں کرتیں۔ ان باتوں پر میں نے کبھی بھروسہ نہیں کیا ہے بلکہ ہمیشہ میں نے آدمی میں اخلاص اور کام کی لگن کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخلص اور دھن کے پکے لوگوں کی ایک ٹیم کارکردہ ہو گئی۔ مثال کے طور پر موصوف نے بتلایا کہ ہنا آباد سے ایک وظیفہ یاب بس ڈرائیور میرے پاس بنگلور آئے اور مجھ سے کہا کہ ہماری بستی میں کوئی اسکول

نہیں ہے۔ پندرہ ہزار روپے میں ایک زمین فروخت ہو رہی ہے۔ اگر یہ زمین خرید لی جائے تو پھر اسکول کی عمارت کا کام ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنی لڑکی کی شادی کے لیے چار ہزار روپے رکھے ہیں وہ آپ لے لیں۔ میں اس ضعیف ڈرائیور کے خلوص سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے خود پندرہ ہزار روپے کا انتظام کرکے وہ زمین لے لی۔ اس دوران ان کے پیر میں فریکچر ہو گیا۔ پھر وہ کینسر میں مبتلا ہو گئے۔ وہ کئی مرتبہ مجھ سے ملنے آئے اور خطوط کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن کسی وقت بھی اس خدا کے بندے نے اپنے مرض اور مجبوریوں کا اشارہ تک نہیں کیا۔ ان صاحب کا انتقال ہو گیا، لیکن آج ہمنا آباد کا ہائی اسکول قوم کے بچوں سے بھرا ہوا ہے۔ دیکھیے میں بنگلور میں بیٹھ کر وہ کام نہیں کر سکتا جو مقامی لوگ اپنے مقام پر کر سکتے ہیں مخلص لوگوں کو کام کا موقع مل جائے اور ان پر اعتماد کیا جائے۔ تو وہ اداروں کو غیر معمولی ترقی دے سکتے ہیں۔

"الامین مالیاتی سرمایہ کاری کارپوریشن" کی بنیاد بھی اسی طرح ڈالی گئی۔ چھ سال کے عرصہ میں اس ادارہ کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ایک قلیل عرصہ میں اس کے ڈپازٹ کی رقم چھ کروڑ تک پہنچ گئی ۱۹۷۹ء میں اسلامی مالیاتی طریقہ کار پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اب "الامین تحریک" کی شہرت بہت ہونے لگی۔ اپنی بات اپنی زبان میں لوگوں تک پہونچانے کے لیے ایک اخبار "سالار" کا اجرا عمل میں آیا۔ جو بنگلور کا مشہور روزنامہ ہے۔ بمبئی میں "بیت الحجاج" کا قیام بھی مشکل حالات میں کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچا، کھیل کود میں مسلم طلبہ کو آگے آنے کے لیے "الامین کلب" قائم کیا۔ جو آج کل کھیل کے میدان میں ہمارے شہر میں مشہور ہے۔ ۱۹۶۸ء میں "الامین اسکالر شپ اسکیم" شروع کی گئی۔ اس اسکیم کے تحت ہر سال تین ہزار طلبہ کو پندرہ لاکھ روپے کی خطیر رقم اسکالرشپ دی جاتی ہے۔ یہ طلبا ہندوستان کے کونے کونے سے تعلق رکھتے ہیں۔ "الامین تحریک" کرناٹک، تامل ناڈو، کیرالا، گجرات، اڑیسہ، بنگال، اترپردیش، مہاراشٹر، آندھرا پردیش، اور نہ معلوم کہاں تک پہنچ گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بتلایا کہ آج کوئی ایک سو ادارے ہائی اسکول، کالجز، دواخانے، پروفیشنل کالجز چل رہے ہیں۔ جن میں ۴۰ ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ ان میں اچھی خاصی تعداد غیر مسلم طلبا کی بھی ہے۔ ان تمام اداروں میں چار ہزار سے زیادہ افراد کو روزگار مل چکا ہے۔ یہاں پر میں نے ایک سوال یہ کیا کہ آپ کو ان اداروں کے قیام میں حکومت اور عہدہ داروں سے کوئی تعاون نہیں ملا ہوگا۔ بلکہ بہت سی مشکلات پیدا کر دی گئی ہوں گی۔ اس کی تو آپ کو ضرور شکایت ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اگر حکومت اور عہدہ دار ہمارے ساتھ تعاون نہ کرتے تو اتنے سارے ادارے ہم کیسے قائم کر پاتے۔ ہر محکمہ نے ہماری مدد کی۔ اور ریزرو بینک آف انڈیا کا تعاون نہ ہوتا تو ہم بینک کیسے قائم کر سکتے تھے۔ جب صاحب اقتدار لوگوں کو ہماری دھن اور لگن کا پتہ چلا تو ہمیں بے اندازہ کوآپریشن ملا جس کے ہم مشکور ہیں۔

جنوبی ہند کے مسلمانوں میں تعلیمی شعور پیدا کرنے اور ان کی ہمہ جہتی ترقی کے لیے صحت اور معاشی و اقتصادی حالت درست کرنے کے لیے "الامین تحریک" نے جو کام کیے ہیں اس سے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی بے شمار صلاحیتوں اور بے پناہ اخلاص کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان کا نام جنوبی ہند میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ سے جڑ گیا ہے۔ اگر کام کا جذبہ سچا ہو، اخلاص ہو اور اپنے مقصد سے کوئی عشق رکھتا ہو تو یہ جذبہ سیکڑوں چشموں کو جنم دیتا ہے جس کا فیضان وقت کے لامتناہی دھارے تک جاری رہتا ہے۔ حضور اکرم صلعم کا لقب "الامین" تھا اس نام کی برکت سے "الامین تحریک" کی ترقی قابل رشک ہے۔

ایس منظر نیاز

پندرہ نکاتی پروگرام و اقلیتوں کی فلاح وبہبود

ہمارا ملک مختلف مذاہب عقیدوں ونظریات کے حامل لوگوں کا وطن ہے۔ آئین میں تمام شہریوں کو کچھ بنیادی حقوق دیے گئے ہیں۔ مختلف مذاہب کے پیرکاروں میں مذہبی اور لسانی اقلیتیں بھی شامل ہیں۔ بنیادی حقوق میں ہر فرد کو اپنے عقیدے کے مطابق عمل کرنے اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے اور دیگر متعلقہ امور کا انتظام کرنے کا حق بھی دیا گیا ہے۔ آئین کے آرٹیکل ۲۹ اور ۳۰ کے تحت اقلیتوں کو اپنی ثقافت کے تحفظ اور اپنی ضروریات کے مطابق تعلیمی اداروں کے قیام اور انتظام والنصرام کے حقوق کو بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

آئین میں اقلیتوں کو جو بنیادی حقوق دیے گئے ہیں ان کے علاوہ سرکار ان کی فلاح وبہبود کو یقینی بنانے اور انھیں جان ومال کا تحفظ دینے کے لیے بھی ذمہ دار ہے۔ مرکزی حکومت نے اقلیتوں کو قومی دھارے میں شامل کرنے اور تعمیر ملک میں برابر سے شریک کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے ہیں۔ چنانچہ مئی ۱۹۹۲ء میں پندرہ نکاتی پروگرام وضع کیا گیا ہے اس پروگرام پر عمل درآمد ریاستی حکومتوں اور حکومت ہند کے متعلقہ مرکزی محکموں اور وزارتوں کے توسط سے کیا جارہا ہے۔ قومی سطح پر پانچ فرقوں یعنی مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں بدھمت کے پیروکاروں اور یہودیوں کو اقلیتوں کی شکل میں تسلیم کیا گیا ہے۔

وزارت داخلہ قومی ایکتا کونسل کے توسط سے بلاتفریق زبان و مذہب سماج کے تمام طبقات کی یکجہتی کے لیے کوشاں ہے۔

پندرہ نکاتی پروگرام کے خدوخال

پندرہ نکاتی پروگرام کا مقصد اقلیتوں کی ہمہ گیر ترقی، تحفظ اور ان میں خود اعتمادی بحال کرنا ہے۔ اس کے تحت فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے اور ان پر قابو پانے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور امن کو بڑھاوا دینے اور اقلیتوں میں اعتماد بحال کرنے سے متعلق اقدامات بھی شامل کیے گئے ہیں، سرکاری نوکریوں، ریاستوں اور مرکزی پولیس فورس میں ملازمین کی بھرتی، ریلوے، قومیائے گئے بینکوں، سرکاری دائرہ کار کی صنعتوں وغیرہ میں ملازمتوں کے معاملہ میں متعلقہ کمیٹیوں میں اقلیتی فرقے کی نمائندگی کے ذریعے اقلیتوں پر خصوصی توجہ مرکوز کرنے کا اہتمام

یہ مضمون ادارہ کو پریس انفارمیشن بیورو، گورنمنٹ آف انڈیا کے توسط سے ملا ہے۔

کیا گیا ہے تاکہ بھرتی میں اقلیتوں کے ساتھ کسی طرح کی تفریق نہ برتی جا سکے۔

پندرہ نکاتی پروگرام کے تحت اقلیتی طبقات کے اہل امیدواروں کو کوچنگ فراہم کرانے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے تاکہ وہ مرکزی و ریاستی حکومتوں، بینکوں وغیرہ کے تحت منعقد کرائے جانے والے مقابلے کے امتحانات میں شامل ہونے کے لائق بن سکیں۔ پندرہ نکاتی پروگرام فرقہ کی اکثریت والی بستیوں و علاقوں میں پالی ٹیکنک اور آئی ٹی آئی کھولنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے تاکہ اقلیتی فرقوں کے امیدوار پیشہ ورانہ تعلیم سے آراستہ ہوکر روزگار سے لگ سکیں۔ مختلف النوع ترقیاتی اسکیموں کا فائدہ اقلیتوں کو بھی برابر سے مل سکے اس کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ وقف سے متعلق معاملات، وقف جائداد، قبرستانوں وغیرہ پر ناجائز قبضے کو ہٹانے کی تجویز بھی پندرہ نکاتی پروگرام میں شامل ہیں۔ اقلیتوں سے متعلق معاملات کو نپٹانے کے لیے مرکزی و ریاستی سطح پر اقلیتی مراکز کے قیام کی تجویز بھی اس میں شامل ہے۔

پندرہ نکاتی پروگرام کی عمل آوری

اقلیتوں کے لیے پندرہ نکاتی پروگرام پر ریاستوں، مرکزی انتظام کے علاقوں اور دیگر متعلقہ مرکزی وزارتوں، محکموں کے ذریعہ عملدرآمد کیا جا رہا ہے۔ مکمل پروگرام کی نگرانی کا بھی اہتمام ہے اور وزارت بہبود کا اقلیتی ونگ اس کے عمل درآمد کی نگرانی کرتا ہے۔ وزارت تمام متعلقہ ریاستوں، محکموں سے سہ ماہی رپورٹ بھی طلب کرتی ہے۔ حاصل شدہ اطلاعات جمع کرکے ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور پروگرام پر عمل درآمد میں جو خامیاں نظر آتی ہیں انھیں متعلقہ حکام کے علم میں لاکر دور کیا جاتا ہے۔

خیال ہے کہ وزیر کی صدارت میں بہبود سے متعلق کابینہ کمیٹی کی ازسرنو تشکیل عمل میں آئی ہے اور یہ کمیٹی باقاعدہ مصروف عمل ہے۔ ریاستی سطح پر اس پروگرام کی نگرانی عام طور پر وزیر اعلیٰ و چیف سکریٹری کی سطح پر کی جاتی ہے ضلع کی سطح پر پروگرام کی نگرانی عام طور سے ڈپٹی کمشنر و ڈپٹی مجسٹریٹ کے ذریعہ ماہانہ بنیاد پر کی جاتی ہے۔

پندرہ نکاتی پروگرام پر عمل درآمد اور اس کی نگرانی سے کافی حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے ہیں۔ پایا گیا ہے کہ اقلیتوں میں اس پروگرام سے کافی بیداری پیدا ہوئی ہے اور ریاستی حکومتیں اور مرکزی انتظام کے علاقے کی حکومتیں بھی اقلیتوں کے مختلف النوع مسائل پر توجہ دینے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کسی بھی ملک کی پیشانی پر زبردست داغ ہوتے ہیں جو ایک طرف ملک کے امن و امان کو تباہ کر دیتے ہیں اور دوسری جانب اقتصادی ترقی کے لیے سم قاتل ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ پندرہ نکاتی پروگرام کے تحت ریاستی حکومتوں کو صلاح دی گئی ہے کہ جہاں کہیں بھی فرقہ وارانہ تشدد کے معاملات بڑے پیمانے پر سامنے آئیں فرقہ وارانہ جرائم کی سنوائی کے لیے وہاں خصوصی عدالتیں قائم کی جائیں۔ فرقہ وارانہ فسادات میں مرنے والوں و زخمی یا معذور ہونے والوں کے معاملے میں ادا کی جانے والی امدادی رقم ۲۰ ہزار روپے سے بڑھا کر ۵۰ ہزار روپے کر دی گئی ہے۔ کم آمدنی والے طبقات کے فساد زدہ افراد کی بیواؤں کو ۵۰۰ روپے کی ماہانہ پنشن دینے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

بیشتر ریاستی حکومتوں نے ۱۹۹۰ء میں وزارت داخلہ سے جاری رہنما خطوط کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے تحت فساد میں مارے جانے والے فرد کے قریبی عزیز کو ایک لاکھ روپے کی امداد، اور مستقلاً معذور ہونے والوں کو ۵۰ ہزار روپے کی رقم ادا کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے۔ فساد کے دوران ہلاک ہونے والے افراد کی بیواؤں کو نوکری، مکان بنانے کے لیے زمین الاٹ کرنے، بینک قرض جیسی امداد بھی فراہم کرائی جا سکتی ہے۔

ریپڈ ایکشن فورس

حکومت نے ریپڈ ایکشن فورس بھی قائم کی ہے اسے فرقہ وارانہ فسادات کی صورت حال سے نمٹنے کی خصوصی تربیت دی گئی ہے اس فورس میں اقلیتی فرقوں کی نمائندگی کا باقاعدہ خیال رکھا گیا ہے۔

ریاستی حکومتوں کو ریاستی پولیس فورس میں اقلیتوں کے افراد کی بہتر نمائندگی کو یقینی بنانے اور قانون اور انتظام سے متعلق کاموں کے لیے ملی جلی پولیس بٹالین تشکیل دینے کی صلاح بھی دی گئی ہے اس طرح کا فیصلہ مرکزی پولیس فورس کے ضمن میں بھی لیا گیا ہے۔

اقلیتوں میں بے روزگاری کا عام مسئلہ ہے اس سے نمٹنے کے لیے وزارت محنت کے تحت روزگار اور تربیت ڈائرکٹوریٹ نے ریاستی حکومتوں کو احکامات جاری کیے ہیں کہ اقلیتی فرقوں کے افراد کو روزگار کے لیے رجسٹریشن کرانے اور نامزدگی حاصل کرنے کے لیے کسی طرح کی دقت کا سامنا نہ ہو۔ اس ضمن میں خصوصی رجسٹریشن مہمات چلانے کی ہدایتیں بھی جاری کی گئی ہیں۔ تمام انتخابی کمیٹیوں، بھرتی بورڈوں میں اقلیتی فرقوں کی نمائندگی کا بھی اہتمام کیا گیا ہے تاکہ انتخاب کے عمل میں کسی طرح کا بھید بھاؤ نہ برتا جاسکے۔ منڈل کمیشن کی رپورٹ اور اس کے بعد اس ضمن میں کی گئی کارروائیوں سے اس امر کو یقینی بنایا گیا ہے کہ پس ماندہ طبقات کے زمرے میں آنے والے افراد کو بھارت سرکار کے تحت سول سروسز اور دوسری اسامیوں میں ریزرویشن کا فائدہ حاصل ہوسکے۔

پیشہ ورانہ تربیت

یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل سچ ہے کہ ہر پڑھے لکھے نوجوان کو نوکری نہیں مل سکتی کیونکہ نوکریوں کی تعداد نوجوانوں کے مقابلے میں کم ہے لہذا ضروری ہے کہ ایسے نوجوانوں کو تکنیکی پیشہ ورانہ تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ اقلیتی فرقے کے نوجوانوں کے لیے معقول تکنیکی و پیشہ ورانہ تعلیم کا انتظام کرنے کی غرض سے اقلیتی اکثریت والے علاقوں میں اجتماعی پالی ٹیکنیک اداروں کے توسیعی مراکز مصروف عمل ہیں۔ ایسے پالی ٹیکنیکوں سے مختلف اسکیموں کے تحت تمام اقلیتی اکثریت والے اضلاع شامل کیے گئے ہیں۔

کوچنگ اسکیمیں

مختلف النوع مقابلہ جاتی امتحانات میں بیٹھنے والے اقلیتی فرقوں کے کمزور طبقات کے امیدواروں کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ۲۰ یونیورسٹیوں اور ۳۲ کالجوں کے توسط سے ایک کوچنگ اسکیم چلا رہا ہے۔ ایسے کوچنگ مراکز چلانے کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن یونیورسٹیوں اور کالجوں کو امدادی رقم فراہم کراتا ہے۔ اقلیتی طبقات کے امیدواروں کو سرکاری بینکوں کے مختلف النوع مقابلہ جاتی امتحانات میں بیٹھنے کے لیے تیاری کرنے کی غرض سے وزارت بہبود نے ۹۱-۱۹۹۰ء کے دوران مقتدر رضاکارانہ اداروں کے ذریعہ امتحانات سے قبل کی کوچنگ فراہم کرانے کی اسکیم شروع کی تھی۔ اب تک اس طرح کے بہت سے مراکز قائم ہوچکے ہیں اور اقلیتی فرقوں کے بہت سے امیدواروں کو ان سے خاطر خواہ فائدہ حاصل ہوا ہے۔

قومی اقلیتی کمیشن

اقلیتی طبقات کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے مئی ۱۹۹۲ء میں قومی اقلیتی کمیشن ایکٹ بھی منظور کیا گیا تھا اور اس طرح سے اقلیتی کمیشن کا قیام ۱۷ مئی ۱۹۹۳ء کو عمل میں آیا ہے اور جسٹس (ریٹائرڈ) محمد سردار علی خان کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے۔ اقلیتوں کے اس قومی کمیشن کو بہت سے اختیارات دیے گئے ہیں۔ یہ کمیشن مرکز اور ریاستوں کے تحت اقلیتوں کی ترقی اور پیش رفت کا تجزیہ کرے گا آئین اور پارلیمنٹ اور ریاستی قانون ساز اسمبلی کے ذریعے پاس کردہ قوانین میں حاصل تحفظات پر موثر طریقے سے عمل درآمد کی نگرانی تحفظاتی تجاویز پر موثر عمل درآمد کی سفارش۔ اقلیتوں کے حقوق کی نگرانی و شکایتوں کی جانچ، اقلیتوں کے خلاف برتے جانے والے بھید بھاؤ اور مسائل کا حل اور ان کے تدارک کے لیے سفارشات اقلیتوں کے سماجی اقتصادی مسائل کا مطالعہ اور تجزیہ لیے سفارشات، اقلیتوں کے سماجی اقتصادی مسائل کا مطالعہ اور تجزیہ اقلیتوں کو درپیش معاملات میں رپورٹ تیار کرنے وغیرہ کا کام بھی انجام دے گا۔ خیال رہے کہ اس کمیشن کو ملک کی عام سول عدالتوں جیسے اختیارات حاصل ہیں اور ان اختیارات کی وجہ سے اقلیتوں کا قومی کمیشن ایک مضبوط ادارے کی شکل میں سامنے آیا ہے اور توقع کی

جانی چاہیے کہ اس سے اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کی جائز حفاظت و نگرانی ہو سکے گی۔

کسی بھی ملک کی بنیادی ترقی اس کے مالی و قدرتی وسائل پر منحصر ہوتی ہے اور قدرتی اور مالی وسائل براہ راست شہریوں کی خوش حالی یا فارغ البالی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہمارا ملک ترقی پذیر ممالک میں شمار ہوتا ہے اور یہاں کے تقریباً ۷۰ فی صد عوام گاؤں میں سکونت پذیر ہیں۔ اقلیتی فرقہ کی بیروزگاری سب سے بڑا مسئلہ ہے جو دیگر بہت سے مسائل کا موجب ہے۔ چنانچہ حکومت نے اقلیتی فرقے کے لوگوں کے لیے ایک قومی مالیاتی کارپوریشن بھی قائم کی ہے جو اقلیتی فرقے کے لوگوں کو سرمایہ فراہم کرے گی تاکہ وہ اپنے حالات کے لحاظ سے چھوٹے موٹے روزگار یا صنعتیں شروع کر سکیں۔

بھارت میں کچھ طبقات ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن کی اپنی خاص زبان ہے اور وہ اس مخصوص زبان کے اعتبار سے لسانی اقلیت کہے جاتے ہیں اس کے لیے حکومت نے خصوصی لسانی اقلیت کمشنر کا عہدہ قائم کیا ہے

لسانی اقلیتوں کے مفادات کا کمشنر ایسی اقلیتوں کو آئین میں دی گئی عام تحفظاتی تجاویز سے متعلق تمام معاملات کی جانچ کر کے ان کی رپورٹ صدر جمہوریہ ہند یا اس کے ذریعہ مقررہ حکام کو پیش کرتا ہے یہ رپورٹ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے روبرو پیش ہوتی ہے اور اس کے بعد ریاستی حکومتوں کو ضروری کارروائی کے لیے ارسال کر دی جاتی ہے۔

لسانی اقلیتی کمشنر

لسانی اقلیتی کمشنر کا ہیڈکوارٹر الہ آباد میں ہے اور علاقائی دفاتر کلکتہ، بیلگام اور مدراس میں واقع ہیں۔ ۹۴-۱۹۹۳ء کے لیے لسانی اقلیتی کمشنر کے دفتر کا بجٹ ۲۸ لاکھ روپے ہے۔

مختصراً اقلیتوں کی بہبود کا پندرہ نکاتی پروگرام ایک جامع اور ہمہ گیر پروگرام ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پروگرام کو سنجیدگی سے نافذ کیا جائے ساتھ ہی اس پر عمل درآمد کی نگرانی سے متعلق نظام کو مزید چاق و چوبند بنایا جائے کیونکہ اصل مشکل اس کی غیر موثر اور ناقص عمل آوری سے پیش آتی ہے اور مفاد پرست عناصر سرکار کی اسکیموں کا فائدہ مستحق لوگوں تک نہیں پہنچنے دیتے۔ جب نفاذ کی نگرانی سے متعلق ادارے اور نظام پوری طرح سے فعال اور مستعد ہوں گے تو پھر پندرہ نکاتی پروگرام بہت جلد اقلیتوں کی فلاح اور بہبود کے نصب العین کو حاصل کرنے میں ہماری مدد کر سکے گا۔ پھر وہ دن دور نہ ہوگا جب اقلیتی فرقے بھی جہالت، غریبی، بے روزگاری، پست ہمتی اور پسماندگی سے نکل کر ترقی کے راستے پر پوری شان و آن بان سے رواں دواں ہوں گے اور تعمیر ملک اور تعمیر قوم کے کام میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوں گے اور صحیح معنوں میں قومی دھارے میں شامل ہو سکیں گے۔

روزوں میں

خاص طور پر اپنی صحت کا خیال رکھیے!

روح کی پاکیزگی کے ساتھ جسمانی قوت کو قائم رکھنا بھی لازمی ہے!

عام دنوں کے برعکس رمضان المبارک میں روزہ داروں کے معمولات میں بہت زیادہ اُتھل پُتھل ہو جاتی ہے۔ افطار و سحر میں غذائی بے اعتدالیاں ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں قبض، ضعفِ اعصاب، جسمانی خشکی، چڑچڑا پن اور تھکن وغیرہ جیسی شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

سنکارا

روزہ داروں کے لیے تغذیہ کی خرابی سے بچاؤ کا وسیلہ

سنکارا روزہ داروں کے لیے ایک ایسا بے بدل اور بیش بہا تحفہ ہے، جو جسم کے ہر حصّہ کو غذائی مواد کی مطلوبہ رسد بہم پہنچاتا ہے۔
سنکارا تمام ضروری وٹامنوں کے ساتھ لازمی اور ضروری عناصر اور قدرتی دواؤں کا ایسا بے مثال ٹانک ہے، جو رمضان المبارک کی خصوصی عبادات اور ریاضات کے لیے بروقت آپ کو چاق چوبند بناتا ہے۔

یہ دوسرے بہت سے ٹانکوں کے برعکس الکحل سے پاک ہے اور الکحل کا استعمال طبی اور مذہبی نقطۂ نظر سے جائز نہیں۔

رمضان المبارک میں طاقت کے خیال سے معدہ کو غیر ضروری چیزوں سے نہ بھریے۔ بحالیِ قوت کے لیے سنکارا بہت کافی ہے۔



ہمدرد

معدنیات، وٹامنوں اور قدرتی دواؤں کا نادر مرکب

سنکارا

عالمی فیملی ٹانک ہر موسم کے لیے

HWL-8718

مطبوعات ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

اقبالیات

کلیات اقبال اردو — صدی ایڈیشن — ۵۰/۰۰
ماشورِ اقبال — آل احمد سرور — ۱۲۵/۰۰
اقبال معاصرین کی نظر میں — وقار عظیم — ۵۰/۰۰
اقبال کی اردو نثر — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ۲۰/۰۰
اقبال شاعر و مفکر — پروفیسر نورالحسن نقوی — ۸۵/۰۰
بانگِ درا (عکسی) — علامہ اقبال — ۲۵/۰۰
بالِ جبریل (عکسی) — " — ۱۵/۰۰
ضربِ کلیم (عکسی) — " — ۱۵/۰۰
ہندستان ہمارا اردو (عکسی) — " — ۵/۰۰

غالبیات

دیوانِ غالب — مقدمہ نورالحسن نقوی — ۲۵/۰۰
غالب شخص اور شاعر — مجنوں گورکھپوری — ۴۵/۰۰

سرسید

سرسید احمد خاں اور ان کا عہد — ثریا حسین — ۲۰۰/۰۰
مطالعہ سرسید احمد خاں — عبدالحق — ۲۵/۰۰
سرسید اور ان کے نامور رفقاء — سید عبداللہ — ۴۰/۰۰
انتخاب مضامین سرسید — آل احمد سرور — ۱۲/۰۰
سرسید ایک تعارف — پروفیسر خلیق احمد نظامی — ۴/۰۰

فیض

کلامِ فیض (عکسی) — فیض احمد فیض — ۲۵/۰۰
نقشِ فریادی (عکسی) — " — ۷/۰۰
دستِ صبا (عکسی) — " — ۷/۵۰
زنداں نامہ (عکسی) — " — ۷/۵۰
دستِ تہِ سنگ (عکسی) — " — ۶/۰۰

لسانیات

مقدمہ تاریخ زبان اردو — ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۳۰/۰۰
اردو کی لسانی تشکیل — ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ — ۴۰/۰۰
اردو لسانیات — ڈاکٹر شوکت سبزواری — ۱۵/۰۰

ادب و تنقید

فکرِ روشن — آل احمد سرور — ۱۰۰/۰۰
خواب باقی ہیں (خودنوشت) — آل احمد سرور — ۱۵۰/۰۰
پہچان اور پرکھ / کچھ خطبے کچھ مقالے — آل احمد سرور — ۱۵۰/-
کتب خانہ — رضا علی عابدی — ۱۰۰/۰۰
جرنلزم — ۱۰۰/۰۰
جدید شاعری — پروفیسر ظہیر احمد صدیقی — ۸۰/۰۰
ادبی اساس تنقید — پروفیسر گوپی چند نارنگ — ۱۵/۰۰
انگریزی ادب کی مختصر تاریخ — ڈاکٹر محمد یسین — ۹۰/۰۰
ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش — عبدالمغنی — ۵۰/۰۰

مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت — ابوالکلام قاسمی — ۱۰۰/۰۰
اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار — نیلم فرزانہ — ۱۰۰/۰۰
جدید افسانہ: اردو ہندی — طارق چھتاری — ۱۰۰/۰۰
اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل — ڈاکٹر صغیر افراہیم — ۸۰/۰۰
کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید — طارق سعید — ۷۵/۰۰
اسلوبیاتی مطالعے — پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ — ۵۰/۰۰
جدید اردو نظم: نظریہ و عمل — عقیل احمد صدیقی — ۹۰/۰۰
انشائیہ اور انشائیے — سید محمد حسنین — ۴۰/۰۰
مقدمہ کلام آتش — خلیل الرحمن اعظمی — ۲۵/۰۰
اردو ادب میں طنز و مزاح — وزیر آغا — ۳۵/۰۰
اردو ادب کی تاریخ — عظیم الحق جنیدی — ۲۴/۰۰
اردو ناول کی تاریخ و تنقید — علی عباس حسینی — ۴۰/۰۰
اردو ڈراما کی تاریخ و تنقید — عشرت رحمانی — ۴۰/۰۰
دکنی ادب کی تاریخ — محی الدین قادری زور — ۱۵/۰۰
اردو تنقید کا ارتقاء — عبادت بریلوی — ۴۰/۰۰
فنِ افسانہ نگاری — وقار عظیم — ۲۵/۰۰
نیا افسانہ — " — ۲۵/۰۰
اردو قصیدہ نگاری — ام ہانی اشرف — ۲۰/۰۰
اردو مرثیہ نگاری — " — ۲۵/۰۰
ناول کا فن — مترجم ابوالکلام قاسمی — ۲۰/۰۰
آج کا اردو ادب — ابواللیث صدیقی — ۲۵/۰۰
اردو مثنوی کا ارتقاء — عبدالقادر سروری — ۱۵/۰۰
اردو کی تین مثنویاں — خان رشید — ۲۰/۰۰
اردو کیسے پڑھائیں — سلیم عبداللہ — ۱۵/۰۰
آیئے اردو سیکھیں — ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ — ۱۰/۰۰
پریم چند ایک نقیب — ڈاکٹر صغیر افراہیم — ۳۰/۰۰
احساس و ادراک — ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — ۲۲/۰۰
انیس شناسی — ڈاکٹر فضل امام — ۱۶/۰۰
چہرہ پس چہرہ — ڈاکٹر ابن فرید — ۲۵/۰۰
میں ہم اور ادب — " — ۲۰/۰۰
غزل کی سرگزشت — اختر انصاری — ۱۲/۰۰
مولوی نذیر احمد کی کہانی — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۷/۵۰
یونانی ڈراما — مترجم عتیق احمد صدیقی — ۲۰/۰۰
موازنۂ انیس و دبیر — مقدمہ ڈاکٹر فضل امام — ۱۵/۰۰
مقدمہ شعر و شاعری — مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی — ۲۰/۰۰
امراؤ جان ادا — مقدمہ تمکین کاظمی — ۲۵/۰۰
مجموعہ نظم حالی — مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — ۱۲/۰۰
مثنوی گلزار نسیم — ۱۲/۰۰
مثنوی سحر البیان — ۱۲/۰۰

آثار جی — مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن

سیاسیات و تاریخ

دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) — محمد ہاشم قدوائی
تاریخ افکار سیاسی (ہسٹری آف پالیٹیکل تھاٹ) — "
اصول سیاسیات (پرنسپل آف پالیٹکس) — "
جمہوریۂ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) — "
مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس) — "
مبادیات علم مدنیت (ایلیمنٹس آف سوکس) — "
اسلامی تاریخ — اے۔ اے۔ ہاشمی

متفرق

جدید تعلیمی مسائل — ڈاکٹر ضیاء الدین علوی
اصول تعلیم — ڈاکٹر ضیاء الدین علوی
عام معلومات — "
ایجادات کی کہانی — "
علم سماجیات تصورات و نظریات — "
جدید علم سائنس — وزارت حسین
رہبر صحت — مسرت زمانی
رہبر تندرستی — "
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویئے — "
علم خانہ داری — "
بچوں کی تربیت — "
گلدستہ مضامین و انشاپردازی — ڈاکٹر محمد عارف خاں — ۰۰/
تفہیم ابلاغت — وہاب اشرفی
اردو صرف — ڈاکٹر انصاراللہ
اردو نحو — "
اردو شکشک (ہندی کے ذریعے اردو سیکھئے) — "
ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر — ایم۔ اے۔ شہید

ناول اور افسانے

حضرت جان (ناول) — قاضی عبدالستار
دارا شکوہ (ناول) — " — ۰۰/
صلاح الدین ایوبی (ناول) — " — ۰۰/
شب گزیدہ (ناول) — "
چار ناولٹ (ناولٹ) — قرۃ العین حیدر — ۰۰/
روشنی کی رفتار (افسانے) — " — ۰۰/
ضدی (ناولٹ) — عصمت چغتائی — ۰۰/
راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے — ڈاکٹر اطہر پرویز — ۰۰/
ہمارے پسندیدہ افسانے — " — ۰۰/
اردو کے تیرہ افسانے — " — ۰۰/
منٹو کے نمائندہ افسانے — " — ۰۰/
پریم چند کے نمائندہ افسانے — مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس — ۰۰/
نمائندہ مختصر افسانے — مرتبہ محمد طاہر فاروقی — ۰۰/
نیلمبر (افسانے) — حمیدہ سلطان — ۰۰/
زیبا (ناول) — جیلانی بانو — ۰۰/

ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

فون - ۴۰۰۰۶۸

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۴ — مارچ ۱۹۹۵ء — شمارہ ۳

بانی: سرسید احمد خاں

مدیر

پروفیسر مسعود عالم

نائب مدیر

احمد مجتبیٰ قریشی

سرکولیشن انچارج: محمد عتیق

فی شمارہ: 6=50 روپے — زرسالانہ: 65=00 — زرسالانہ طلبہ 45=00 روپے

بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک) 30=00 امریکی ڈالر — بیرونی ممالک (عام ڈاک) 15-00 امریکی ڈالر

لائف ممبرشپ (اندرونِ ملک) 650-00 روپے — لائف ممبرشپ (بیرونِ ممالک) 300-00 امریکی ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اور نشانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۰۰۲۰۲ (یوپی) انڈیا۔ فون: 401027

ترتیب

(تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے متفق ہو)

[redacted]

اداریہ

آفریں!

مسز متھلیش یادو

مارچ کا شمارہ ابھی طباعت کی منزل سے نہیں گزرا تھا کہ علی گڑھ ایک بار پھر روایتی فساد کی لپیٹ میں آگیا۔ ایک معمولی جھگڑا ایک ہولناک فساد کی شکل اختیار کرتے کرتے رہ گیا۔ علی گڑھ دنیا میں اگر مسلم یونیورسٹی اور تالے کی وجہ سے جانا جاتا ہے تو تقسیم ملک کے بعد کے فرقہ وارانہ فسادات کے لئے بھی بدنام ہے۔ کئی بار ایسا ہو چکا ہے کہ مہینوں تک یہ سلسلہ چلا ہے اور سینکڑوں لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، کروڑوں روپیہ کا نقصان ہوا، ہزاروں غریب بے نوا مفلس، بوڑھے، بچے مرد اور عورتیں نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے، لوٹ پاٹ، قتل و غارت گری، آگ زنی کے بھیانک واقعات اور مسلسل کرفیو کے عذاب نے اکثر اس جیتے جاگتے شہر کو شہر خموشاں میں بدل دیا ہے۔ اس بار بھی اندیشہ یہی تھا، لیکن ضلع حکام کی سختی، صوبائی حکومت کی بروقت کارروائی، اعلیٰ حکام کے تبادلے اور لوگوں یعنی علی گڑھ کے باسیوں کے آپس میں نہ لڑنے کی قوتِ ارادی نے علی گڑھ کو ایک بھیانک تباہی اور بربادی سے بچالیا۔ [redacted] اس موقع پر مسز متھلیش یادو کی غیر معمولی جرأت، مذہبی رواداری، انسان دوستی اور کمال درجہ کی نسائی غیرت کا صدق دل سے اعتراف نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی۔

ادھر بہت دنوں سے شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ ہر دو فرقے کے لوگوں میں بالارادہ ایک دوسرے کے جان و مال اور ناموس کو بچانے کیلئے لوگوں نے جان کی بازیاں لگا دی ہوں۔ وہ دن جب جواہر لال نہرو، مولانا حفظ الرحمٰن اور سبھدرا جوشی جیسے اولو العزم لوگ بلا خوف و خطر دلی کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں مسلح گروہوں کے ہاتھوں سے ہتھیار چھین کر نہتے لوگوں کو بچاتے پھرتے تھے محض یادیں بن کر رہ گئے ہیں۔ اور وہ دن بھی دور نہیں جب یہ یادیں بھی باقی نہ رہیں گی کیونکہ آج کل تو بچانے والے خود اپنی جان بچانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں لیکن۔ ۸ مارچ ۱۹۹۵ء کو مسز متھلیش یادو نے مسلمانوں کی بارات کی ایک بس کے لوگوں کو غنڈوں کے ہاتھوں اپنی جان کی بازی لگا کر بچانے میں جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کے لئے بڑے سے بڑا اعزاز اور انعام چھوٹا ہے۔ علی گڑھ میں اس سے پہلے بھی انسانی ہمدردی کے مظاہرے دیکھنے میں آتے رہے ہیں لیکن مسز یادو نے جس طرح ڈٹ کر اور کھل کر فرقہ وارانہ غنڈہ گردی کے منھ پر طمانچہ مارا ہے اس کی مثالیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک کمزور اور ناتواں عورت نے جب یہ دیکھا کہ بلوائی لوٹ پاٹ کے علاوہ عورتوں اور لڑکیوں کی بے آبروئی پر بھی تلے ہوتے ہیں تو نسوانی غیرت نے درگا کا روپ اختیار کر لیا اور ان کو بھگا کر ہی دم لیا۔ آج علی گڑھ فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ میری ایک بیٹی نے جو کام کر دکھایا وہ اس نفسا نفسی کے دور میں شاید ہی کوئی انجام دے سکے۔ آج کے ہندوستان میں کسی عورت کا وحشی اور درندہ صفت مردوں کے مقابلہ میں آنا اور منھ توڑ جواب دینا ایک غیر معمولی بات ہے۔ آزادی نسواں کا نعرہ بلند کرنے والی عورتیں اور مرد، انسانی حقوق کی بات کرنے والی تنظیمیں، فرقہ واریت کی بیخ کنی کرنے والے بیان باز، کمیٹیاں اور کونسلیں آئیں اور مسز یادو سے معلوم کریں کہ تم کو ایسی ہمت، ایسا ارادہ، ایسا عزم اور ایسی روشنی کہاں سے ملی کہ تم نے اکیلے اتنا بڑا کام کر دکھایا، ہم نے تو نہ معلوم کتنے جلسے جلوس، دن، ہفتے مہینے اور سال اسی غور و فکر میں بتا دیئے، کتنی رقم خطیر ان سب پر صرف کی، اور دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام ہو گئیں لیکن پھر بھی تمہارے مرتبے

کو نہیں پہنچ سکے۔ بس باتیں، باتیں اور باتیں۔

فرقہ واریت، گروہ بندی اور عصبیت، خواہ ہندو مسلمان کی ہو یا اونچی ذات نیچی ذات کی، یا ہندی بولنے والے اور کسی زبان کے شیدائیوں کی ایک لعنت بن کر ہم پر مسلط ہو چکی ہے یہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی ہے۔ ہر کوئی اس کی لپیٹ میں ہے۔ کونسل، کوئی کمیٹی، کوئی فوج اور دستہ اس کو پورے طور پر نہیں بجھا سکتا، یا نہ توڑا جا سکتا ہے۔ لیکن جب کبھی اس ڈھیر کو چھیڑا جاتا ہے تو نفرت بھرے انگارے اور شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ کا کوئی حل ہے یا نہیں

انسان کو ناامید تو کسی بات سے نہیں ہونا چاہیئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر پورے طور پانے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ جس طرح رحمدلی، فیاضی، مروّت اور خوش خلقی انسانی سرشت ہی داخل ہیں اس طرح ظلم و اور کج خلقی بھی انسانوں ہی سے سرزد ہوتی ہے۔ ہاں ان پر قدغن عائد کی جا سکتی ہے حکومت وقت کے فرائض میں تو یہ داخل ہے، خود فرد اور جماعت کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر آگے بڑھ کر آتے اور انتظامیہ کا ہاتھ بٹاتے۔ یہ سوچنا کہ صرف سرکاری محافظ ہی اس کام کو انجام دیں، صحیح نہیں۔ یہ ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ قانون کی پابندی کرے اور قانون شکنی کرنے والوں قانون پر عمل درآمد کرنے والی ایجنسیوں کی مدد کرے۔ کم سے کم زبان ہی سے ان باتوں کی مذمت کرے اور اس بات پر کبھی خو کہ کسی خاص فرقے یا گروہ یا فرد پر کوئی مصیبت آن پڑے تو کہا جائے کہ انکو اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے اور خاص طور پر آفات سماوی اور ارضی پر کیوں کہ بداعمالیوں کے محاسبے کا سامنا کسی کو کبھی بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ ایسے میں ہمدردی کے دو بول بڑے سے بڑے سنگدل دشمن کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ فرقہ پرستی کی لعنت سے کوئی حکومت چھٹکارا نہیں دلا سکتی جب تک کہ ہر دو متحارب فریق اس کو خود نہ ختم کر لیں۔ اس کے لیے، عام مردوں اور عورتوں کو آگے آنا پڑے گا۔ مسز منیلیش یادو نے اپنے دلیرانہ عمل سے ایک مثال قائم کر دی ہے، جو نہ صرف عام شہریوں بلکہ حکومت کے ایوانوں میں براجمان گدی نشینوں، دنیائے سیاست کے بے تاج بادشاہوں اور جنگ، سوداگروں کے لیے مشعل راہ ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق؟

مُدیر

ڈاکٹر محمد اسلم اصلاحی *

ملت کا عمود

المعلم عبدالحمید الفراہی (۱۸۶۱ء - ۱۹۳۰ء) ہمارے عہد کے ایک ممتاز عالم دین اور مفسر قرآن گزرے ہیں۔انہوں نے تقریباً تیس چالیس کا عرصہ کتب الہی کے رموز و نکات پر غور و خوض اور تدبر میں صرف کیا۔ان کی اس عالمانہ اور محققانہ کاوش کے ماحصل کو اگر دو لفظوں میں بیان کرنے کے لیے کہا جائے تو ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ "نظم قرآن"۔ نظم سے المعلم کی مراد یہ تھی کہ قرآن کی ہر سورہ اور ہر سورہ کی ہر ایک آیت نہ صرف الفاظ و تراکیب کے لحاظ سے مطالب و معانی کے اعتبار سے باہمدگر مربوط و منظوم ہے اور ان کے مابین پایا جانے والا ظاہری بعد اور تفاوت ایک ایسے منہاں ربط و ضبط سے عبارت ہے جسے آشکار کرنے کے لیے تفکر و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ تفکر و تدبر کس قدر اہم ہے اس کا اندازہ کرانے کے لیے قرآن کی آیت افلا یتدبرون القرآن (۱) کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے۔یہ تفکر و تدبر کن خطوط اور کن نکات کی روشنی میں کیا جائے اس کی وضاحت "المعلم" نے اپنی مختلف تصانیف میں انتہائی مدلل اور منطقی اسلوب میں کی ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے جس کلیدی نکتہ کو بار بار اور زور دے کر بیان کیا ہے وہ ہے "عمود" یعنی ہر سورہ کا محوری مضمون، علامہ کا کہنا ہے کہ آپ قرآن کی کسی بھی چھوٹی بڑی سورہ پر غائرانہ نگاہ ڈالیں تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ اس کی ہر ایک آیت کسی مرکزی مضمون کی آئینہ دار ہے۔اس وضاحت کے بعد مثلاً اگر ہم سورہ "الحجرات" کا باریک بینی سے مطالعہ کریں تو ہمیں اس نتیجہ تک پہنچنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ اس سورہ کی ہر ایک آیت میں بدخلقی کو ہدف لعنت و ملامت بنایا گیا ہے۔اس بدخلقی میں ہم نبی کے سامنے بلند آواز میں بات کرنے سے لے کر عام غیبت اور عیب جوئی کے معاملہ کو شامل کر سکتے ہیں۔اب اگر کوئی شخص بدخلقی کو جو مذکورہ سورہ کا مرکزی مضمون ہے، مد نظر رکھے گا تو اسے فاسق کی خبر کو ناقابل اعتبار ٹھہرانے اور نبی کے سامنے بدوؤں کے احسان جتلانے میں کوئی تضاد یا تشتر گر بگی نظر نہیں آئے گی۔

الغرض قرآن کی جملہ آیتوں اور سورتوں کی افہام و تفہیم کے سلسلے میں المعلم نے عمود کے تعین کو اولین اور اساسی اہمیت دی ہے اور اس طرح مجموعی طور پر وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خود قرآن کا ایک جامع اور محوری عمود توحید ہے۔بالفاظ دیگر توحید کے ہی گرد و پیش قرآن کریم کے جملہ معانی و مطالب گردش کرتے ہیں اس بنیادی فکر کو اگر دھیان میں رکھا جائے تو قرآن کا لفظ لفظ ابن تیمیہ کے بقول یفسر القرآن بالقرآن کی زندہ تعبیر نظر آئے گا۔اس تفصیلی تمہید سے جہاں یہ حقیقت

---

* ریڈر شعبہ عربی، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر ۱۹۰۰۰۶ کشمیر

عیاں ہو جاتی ہے کہ قرآن سے مختلف مضامین کو ایک دھاگے میں باندھنے کا عمدہ اور بہترین طریقہ عمود کا تعین ہے وہیں یہ سوال بھی ذہنوں میں فطری طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے کہ آخر ملت کے مختلف فرقوں کی شیرازہ بندی کے لیے کس اساس اور جامع نقطہ کو عمود کا درجہ عطا کیا جائے ۔ مذکورہ بالا وضاحتوں کی روشنی میں ظاہر ہے کہ ہم میں سے ہر ایک سلیم الطبع اور صحیح الفکر شخص (الا ماشاء اللہ) کا جواب یہی ہو گا کہ جب قرآن کا اساسی مضمون توحید ہے تو پھر کیوں نہ اسی توحید کو ملت بیضا کی شیرازہ بندی کا عمود قرار دیا جائے اور اسی توحید کو ہم مختلف فرقوں اور دھڑوں کے مابین اتحاد فکر اور اشتراک عمل کا ذریعہ بنائیں ۔ ہم سب کا اگر یہی جواب ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے تو حلقہ بگوشان اسلام کی تمام جماعتوں سے ہم قرآن کے الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے یہی کہیں گے کہ "تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا" (٣) یعنی ہم سب اپنی معاشرتی و اخلاقی علمی و فکری کاوشوں کا مرکزی مضمون توحید کو قرار دے لیں اور جماعتی نظریاتی و جماعتی تعصبات و تحفظات سے پاک ہو کر اپنی اور غیروں کی ہر بات، ہر خیال اور ہر فکر کو اسی توحید کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کریں اور اپنے تمام دینی و دنیوی معاملات و مقدمات میں ڈھونڈھ نکالیں تو ان پہلوؤں کو جن کے ڈانڈے کسی نہ کسی طور پر توحید سے جا ملتے ہیں ۔ اس پس منظر میں اگر ہم صدق دلی اور خلوص نیت کے ساتھ اپنی کوششوں کو جاری رکھیں گے تو ہم بظاہر دو انتہائی الگ الگ باتوں میں بھی کوئی نہ کوئی قدر مشترک تلاش کر لیں گے ۔ ہم لوگوں میں سے بھلا کون اس حقیقت سے واقف نہیں کہ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ عبادت الٰہی کے مختلف مظاہر و ہیئات سے متصف ہونے کے باوجود کلمہ، توحید کی مختلف شہادتیں اور شکلیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک شکل کسی نہ کسی طور پر ایک دوسرے میں مدغم بھی ہے اور جدا بھی ۔ مثلاً ہم اگر نماز اور روزہ کو اس پہلو سے دیکھیں کہ روزہ جس طرح رمضان کے مہینہ میں ایک مسلمان اور اس کی نفسانی خواہشات کے درمیان حائل ہوتا ہے اسی طرح نماز بھی عامۃ المسلمین کو فواحش و منکرات سے روکتی ہے، تو ہمیں اسلام کے ان دو بنیادی ارکان کے درمیان یکگونہ مشابہت اور مماثلت نظر آئے گی (٤)۔ اسی طرح اگر نماز اور حج کے درمیان قدر مشترک تلاش کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ جس طرح حج طواف کعبہ کا نام ہے اسی طرح نماز کی منجملہ شرائط میں ایک شرط خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنا بھی ہے ۔ یعنی دونوں کا تعلق بیت اللہ سے ہے (٥)۔ اس پہلو سے ہمیں یہ دو ارکان باہم گر مربوط نظر آتے ہیں علاوہ ازیں اگر کوئی شخص نماز اور زکوۃ کے درمیان مماثلت ڈھونڈھنا چاہے تو اسے ذرا سی تفکیر و تحمیص سے پتہ چل جائے گا کہ ان دونوں رکنوں کی اصل، محبت اور تعلق خاطر ہے یعنی نماز اگر اللہ اور بندے کے مابین پائے جانے والے تعلق کا نتیجہ ہے تو زکوۃ بندے اور بندے کے درمیان پائے جانے والے رشتہ کی آئینہ دار ہے ۔

مذکورہ بالا وضاحتوں کی روشنی میں جو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ارکان اسلام اپنی ہیئات و اشکال کے لحاظ سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں اور قرآنی آیات و سور اپنے معانی و مطالب کے اعتبار سے کتنی ہی الگ الگ کیوں نہ ہوں لیکن ان علیحدگیوں اور انفرادیتوں کے باوجود ان میں کوئی ایسا عمود، کوئی محوری فکر اور کوئی ایسی سلک اتحاد ضرور موجود ہے جو ان سبھی کو باہم گر باندھے ہوئے ہے اب اس حقیقت کا اقتضاء ہے کہ ہم ملت اور ملت کے سواد اعظم کے درمیان کسی ایسے عمود کسی ایسے کلمۃ سواء بیننا کو ڈھونڈھ نکالیں جو ہماری صفوں میں موجود چھوٹی چھوٹی کھائیوں کو پاٹ دے اور ہمیں حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم اور رزم حق و باطل میں فولاد کی طرح سخت بنا دے ۔ وہ نسخہ کیمیا، وہ رشتہ امید اور وہ جامعہ الحکم ظاہر ہے کہ "الصلوٰۃ الحکم واحد" (٦) کے ماسوا اور کیا چیز ہو سکتی ۔ لہٰذا موجودہ حالات میں ہمارے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ ہم باہمی روابط و تعلقات کا حل اسی

نسخہ کیمیا کی روشنی میں تلاش کریں، اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہم خبط عشواء (اندھی اونٹنی) کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے رہیں گے اور مقابل صف اعداء بھیڑی گئی جنگلوں کا تمام پورس کے ہاتھیوں کی طرح اپنی صفوں کو روند کر کریں گے اور تو اور ہمیشہ ایک دوسرے کی مذہبی، علمی اور معاشرتی خدمات کو شکوک و شبہات کی نظروں سے دیکھیں گے اور اپنے ہی دل کے داغوں کو بدنما قرار دینے میں فخر محسوس کریں گے اور غالباً یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ آج ہماری صلاحیتوں اور توانائیوں کا ایک بہت بڑا حصہ آپس میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے، ذلیل کرنے اور کم از کم علم دین سے ناواقف قرار دینے میں صرف ہوتا ہے۔

یک طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس گھن اور بیماری سے ہمارا مذہبی بزعم خود قدرے روشن دماغ تعلیم یافتہ طبقہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس حقیقت کا اندازہ کرنے کے لیے مشہور نو مسلمہ مریم جمیلہ کے درج ذیل مترجم خیالات کو نقل کر دینا کافی ہے۔

> "غیر ملکی نو آباد کاروں کے سامنے ہماری پستی اور پسپائی کے نتیجہ میں پیدا شدہ خرابیاں ہمارے درمیان، ہماری صفوں میں ایسے رہنماؤں کی موجودگی کا پیش خیمہ بنیں جنھوں نے بر ملا اہل مغرب کی طرف اپنا دست تعاون بڑھایا اور عام مسلمانوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین کی وہ خود ان کے جلو میں چلے گئے، ان کی معاشرت اختیار کی اور جلب منفعت کی خاطر اسلامی دنیا میں مادی نقطہ نظر کی بنیاد رکھی۔ اس قبیل کے لوگوں کے سرخیل ہندوستان میں سر سید احمد خاں، مصر میں مفتی محمد عبدہ، ایران میں رضا شاہ پہلوی اور ترکی میں ضیا گوک الپ اور مصطفی کمال اتاترک ہیں" (۷)۔

بہن مریم جمیلہ کے صدق و اخلاص کا ہمیں صمیم قلب سے اعتراف ہے تاہم ہمیں حیرت ہے کہ مذکورہ عبارت کی تعریب کرنے والے لائق فائق روشن دماغ عالم دین کو کیوں کر یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ سر سید احمد خاں اور رضا شاہ پہلوی کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دینے پر ایک مختصر سا حاشیہ لگا دیتے۔ نیتوں کا حال تو صرف علام الغیوب کو معلوم ہے تاہم یہاں پر حاشیہ کا نہ لگایا جانا غماز ہے اس حقیقت کا کہ ترجمہ کرنے والا مصنفہ کے خیالات سے متفق ہے۔ مریم جمیلہ ایک امریکن نژاد خاتون ہیں لہذا سر سید کے بارے میں ان کے دائرہ علم کا محدود ہونا ایک فطری بات ہے لیکن ندوۃ العلماء جیسے عظیم الشان تعلیمی ادارے کے ایک اہم رکن رکین کے بارے میں یہ خیال رکھنا درست نہیں ہو گا کہ اسے سر سید اور مصطفی کمال اتاترک کے کارناموں کے درمیان تفاوت و تفریق کی صلاحیت نہیں ہے۔ سر سید کی خدمات جلیلہ اور ان خدمات کے مالہا و ماعلیہا سے برصغیر ہند و پاک کے جملہ مسلمان اچھی طرح واقف ہیں لہذا ان کے کارناموں کا یہاں ذکر تحصیل حاصل کے مترادف ہے۔ پھر بھی یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ان کا یعنی سر سید کا معاملہ ایک مجتہد کا سا تھا اگر وہ کسی مسئلے کے سلسلے میں صحیح نتیجے پر پہنچے تو انہیں دو گنا اجر ملے گا اور اگر انہوں نے غلط نتیجہ اخذ کیا تو انہیں ایک گنا ثواب ملے گا ہی۔ اجر و ثواب کے معاملہ کو چونکہ اللہ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے لہذا ہم میں سے کسی بھی شخص کے لیے یہ روا نہیں کہ وہ اجر و ثواب کے ترازو جسے اللہ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے، لے کر عامۃ المسلمین کی جزا و سزا کا فیصلہ کرتا پھرے۔

بہر حال مذکورہ بالا ساری باتیں یہاں جملہ معترضہ کے طور پر آ گئی ہیں۔ ان کی نشاندہی کا مقصد در حقیقت اس بنیادی نقص کی طرف اشارہ کرنا ہے جو عمود ملت کے عدم تعین کا لازمی نتیجہ ہے۔ عمود ملت کا تعین اگر ہو جاتا تو ہم ملت کے مختلف مکاتب فکر کو اسی کی روشنی میں جانچتے پرکھتے اور اپنی رائے قائم کرتے اور تلاش کرتے ان پہلوؤں کو جو کہ کافرین و مشرکین

کے مقابلے میں ایک کلمہ گو بھائی کو ہم سے قریب تر کر دیتے ہیں۔ میرے نزدیک موجودہ مسلمان دانشوروں کے فکری انتشار اور گروہی تعصبات کی بنیادی وجہ اسلامی تعلیمات کے عمود سے بے توجہی ہے۔ بنابریں کتاب الٰہی کی افہام و تفہیم کے لیے جس طرح المعلم فراہی نے عمود کے تعین کو ایک اساسی شرط قرار دیا ہے اسی طرح ملت کی صفوں میں نظم و انضباط پیدا کرنے کے لیے عمود کا تعین ضروری ہے۔ ایک ایسا عمود ہو جو جملہ خدائی ہدایات و ارشادات کا اصل الاصول ملب و لباب اور عروۃ وثقیٰ ہو۔ گزشتہ وضاحتوں سے یہ بات سامنے آگئی ہے کہ توحید کے اندر وہ تمام اوصاف موجود ہیں جن کی اساس پر اسے حبل اللہ کا درجہ عطا کیا جا سکتا ہے۔ ارکان اسلام میں بلاشبہ توحید ہی وہ محوری فکر ہے جو چار دانگ عالم کے جملہ مسلمانوں کو ایک رشتۂ اتحاد میں باندھے ہوئے ہے۔ موجودہ زمانے میں اس طرح کے رشتۂ اتحاد کی کس قدر ضرورت ہے اس کا احساس دنیا کے ہر بالغ نظر مسلمان کو ہے۔ امر واقعہ ہے کہ جب تک امت مسلمہ کے اس سلک اتحاد کی بازیافت نہیں ہو جاتی اس وقت تک انتشار و افتراق کی آندھیاں ہمیں برگ ہائے خزاں رسیدہ کی طرح نہ صرف ٹکراتی رہیں گی بلکہ ہمیں مجبور کرتی رہیں گی کہ ہم در در کی ٹھوکریں کھاتے پھریں اور غیروں کی کاسہ لیسی کرتے رہیں ان قوموں کی جو ابھی کل تک ہمارے خوان نعمت کے ٹکڑوں کی پروردہ تھیں اور ان کے لیے مثل منارہ نور تھے وہ ہماری تقلید و اتباع کو سرمایہ افتخار سمجھتی تھیں۔

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ جب کبھی بھی ملت بیضا کو انتشار و بحران کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کے اکابرین و مفکرین نے اس مہر رشتۂ اتحاد کو ڈھونڈھ نکالنے کی سرتوڑ کوشش کی ہے جو مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کو دنیا والوں کے سامنے ایک اکائی کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر عہد عباسی کے وسط میں جب یونانی علوم و معارف اور منطق مترجم ہو کر مسلمانوں کے علمی حلقوں میں رواج پا گئے اور حلقہ بگوشان اسلام نے اشاعرہ، معتزلہ، مرجیئہ اور جبریہ و قدریہ جیسے مختلف فکری گروہوں میں تقسیم ہو کر آپس میں تکفیر بازی اور کشت و خون کا بازار گرم کر دیا تو دردمندان ملت نے ارواح و مملکات کے اس زیاں و ضیاع کے سدباب کی خاطر اس عمود اور اس نقطہ ارتباط کو ڈھونڈھنا شروع کر دیا جس کی روشنی میں جملہ مسلمانوں کو ایک جھنڈے کے تلے جمع کرنا ممکن ہو سکے۔ اس سلسلے میں ان کی کوششوں کا ماحصل یہ تھا کہ ہر وہ شخص مسلمان ہے جو قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت اسلام کے دو اہم اور بنیادی ارکان نماز اور حج یعنی خانہ کعبہ اس عظیم اتحاد کا محور بنے جسے جدید اصطلاح میں بین الملکی اتحاد یا پین اسلامزم (Pan-Islamism) کہا جاتا ہے۔ اکابرین کی ان مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ مذکورہ بالا تمام فکری گروہ ہماری تاریخ پارینہ کا ایک حصہ بن گئے اور آج ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ان جماعتوں کے نام سے بھی واقف ہوں۔

گزشتہ کئی صدیوں سے مسلمانان عالم ایک بار پھر کم و بیش ویسی ہی صورت حال سے دوچار ہیں جس کا سامنا انہیں زمانہ ماضی میں یونانی علوم و معارف کے ترجمے کے وقت کرنا پڑا تھا اور جس کا تدارک بعد خرابی بسیار اس وقت ممکن ہو سکا جب دردمند دانشوران قوم نے قبلہ رخ نماز پڑھنے کو عمود قرار دے کر ایک دوسرے کے خلاف شمشیر برہنہ مسلمانوں کو باہم شیر و شکر کر دیا اور دنیا والوں پر یہ ثابت کر دیا کہ ملت بیضا کے فکری انتشار کا اسم اعظم خود اسلامی تعلیمات کے اندر مضمر ہے بس ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت کے آئینہ میں آج ایک بار پھر ضرورت آن پڑی ہے کہ ملت کا صحیح رخ متعین کیا جائے اور اس اسم اعظم کی از سر نو بازیافت کی جائے جو وقت پڑنے پر ہمارے منتشر قلوب و ارواح کو انسیت و محبت کی آماجگاہ بنا دے اور آیت "ترسالا

اتجعل فی قلوبنا غلاللذین آمنوا (۸)" کی چلتی پھرتی تفسیر بنادے اور ہم ایک بار پھر باہمد گر مربوط ہو کر اللہ کے دشمنوں کے سامنے بنیان مرصوص (۹) بن جائیں ۔ یہ تمام اوصاف صرف اسی صورت میں ممکن ہیں جب ہم کامل غور و فکر کے بعد ملت کے عمود کو کچھ اس طرح متعین کردیں کہ اس میں کسی معترض کے لیے اعتراض اور کسی منتقد کے لیے انتقاد کی گنجائش نہ رہے ۔ اس ضمن میں کلمۂ توحید ایک صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے ۔ فی الحال جہاں تک ہمارے علم وایقان کا تعلق ہے کلمہ توحید بجا طور پر وہ اسم اعظم ہے جس کے ذریعہ ملت بیضا کی ازسر نو شیرازہ بندی بآسانی ممکن ہے تاہم یہ حقیقت نظروں سے اوجھل نہ رہے کہ کلمہ ، توحید کی معجزاتی اثر آفرینی کے لیے صرف زبان سے لاالہ الااللہ کہہ دینا کافی نہ ہو گا بلکہ اس کے لیے دل و نگاہ کو صحیح معنوں میں مسلمان کرنا پڑے گا ۔اس کلمہ وحدت کی خاطر ہمیں ان تمام ذاتی خاندانی نیز علاقائی ولسانی تعصبات و تحفظات سے خود کو بلند کرنا ہو گا جو کلمہ گویان حق کو مختلف خانوں میں تقسیم کیے ہوئے ہیں اور جن کی بنیاد پر ہم باہم کشت و خوں کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں اور ایک بھائی دوسرے بھائی کا دشمن بنا ہوا ہے۔

کلمہ ، توحید کو ملت کا عمود قرار دینے کے بعد ہم مسلمانوں کے درمیان نہ صرف عہد رسالتماب کی روح مواخات بیدار ہو جائے گی بلکہ ہم وحدانیت سے قریب تر دیگر اہل مذاہب سے بھی قرآن کے الفاظ میں یہ کہہ سکیں گے کہ "آمنا بالذی انزل الینا و الیکم والٰہنا والٰہکم واحد و نحن لہ مسلمون " یعنی ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہمارے اور تمہارے لیے نازل ہوئی ہے ۔ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہے اور ہم سبھی اس کے سامنے سر فگندہ ہیں ۔ان الہامی کلمات کے مفہوم و مدعا میں اس قدر وسعت اور جامعیت ہے کہ ان پر صدق دلی اور خلوص نیت کے ساتھ ایمان لانے کا مطلب اپنوں کو گلے لگانے کے ساتھ ساتھ غیر سمجھی جانے والی قوموں کی ایک قابل لحاظ تعداد کو اپنے سے قریب تر کر لینا اور اس کو اس بات کا موقع فراہم کرنا ہے کہ وہ دین اسلام کی ان تعلیمات کا سنجیدگی اور متانت کے ساتھ مطالعہ کرے جو دیگر مذاہب کی تعلیمات سے قدرے مختلف ہیں۔ غیر مسلم اقوام کا یہ سنجیدہ مطالعہ یقیناً ان پر دائمی سعادت اور لازوال خوش بختی کے دروازے کھول دے گا۔

بعض تاریخی شواہد و نظائر کا ذکر اگر طوالت کا موجب نہ ہوتا تو ہم یہاں ایسے متعدد واقعات نقل کرتے جو حقیقی معنوں میں رسول اکرم کو صرف رحمۃ للمسلمین نہیں بلکہ رحمۃ للعالمین ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں اسلامی تعلیمات میں اس قدر وسعت اور لچک ہے پھر بھی یہ مقام حیرت واستعجاب ہے کہ ہم میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے نادانوں کی موجود ہے جو خدا کے اس واضح حکم "لاتکونوا من المشرکین الذین فرقوا دینہم و کانوا شیعا"(۱۰) پر مطلق دھیان نہیں دیتے اور جو آب ریشم کے کیڑوں کی طرح اپنا ایک خول بناتے ہیں بعد ازاں اس خول سے باہر جس کسی کو دیکھتے ہیں اسے بلا تردد تکلف "دین نکالا" قرار دے دیتے ہیں ۔ان ریشمی کیڑوں جن کی قدر و قیمت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو، پر یہ واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ خدائی سنت کے مطابق اپنی بساط بھر ان فرائض کو انجام دیتے رہیں جن کا انہیں مکلف "بنایا گیا ہے وہ اور ان کی طرح کے دیگر ہم جنس کیڑے اگر یونہی ایک دوسرے کے کاموں میں مداخلت کیے بغیر اپنی ذمہ داریوں کو صدق دلی کے ساتھ ادا کرتے رہیں گے تو وہ دن دور نہیں جب کوئی مرد کامل ان کی کاوشوں کو سلک توحید سے گوندھ کر انہیں دوسروں کے لیے نا قابل تسخیر بنا دے گا اور ہم حسب سابق "انتم الاعلون "(۱۱) کی جیتی جاگتی تفسیر بن جائیں گے یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم رحماء بینہم اور اشداء علی الکفار (۱۲) کو اپنی عملی زندگی کا جزء لاینفک بنالیں۔

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

عادل صدیقی

مولانا شوکت علی

اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی ہندوستان کی تاریخ میں اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس دور میں ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ راجہ رام موہن رائے، سر سید احمد خاں، موتی لال نہرو، مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد سبھی سو ڈیڑھ سو سال کے اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ نئے اور تازہ افکار پرانی روایتوں سے ٹکرانے لگے تھے۔ اس دور کی ان اہم شخصیتوں کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے ملک کی مختلف تہذیبوں، خاص کر ہندوؤں اور مسلمانوں کی ثقافت کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا اور ملک کی آزادی کے لیے مشترکہ سیاسی جدوجہد کو ضروری سمجھا۔

علی برادران بھی انہیں چند قد آور شخصیتوں میں سے تھے جنھوں نے ارض ہند کو بیرونی تسلط سے نجات دلانے کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کو دسانئے وطن کی صف میں لا کر کھڑا کیا۔ علی برادران سے مراد مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی سے ہے۔ ان کی والدہ محترمہ "بی اماں" کے نام سے سارے ہندوستان میں مشہور تھیں۔ اس زمانے میں ہر بڑے چھوٹے بوڑھے بچے کی زبان پر یہ شعر تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی	جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی	جان بیٹا خلافت پہ دے دو

مولانا شوکت علی ۱۰ مارچ ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق اتر پردیش میں ضلع بجنور کے نجیب آباد کے ایک شریف گھرانے سے تھا۔ ۱۸۵۷ کے ہنگامہ رستخیز کے بعد وہ لوگ مراد آباد کے قریب کسی قصبہ میں چلے گئے تھے جہاں کہ ان کے دادا جناب علی بخش کو سلطنت انگلشیہ نے ایک جاگیر عطا کر دی تھی، علی بخش کی دوستی نواب رامپور جناب یوسف علی خاں ناظم سے ہو گئی تھی۔ نواب صاحب علی بخش کے صاحبزادے عبدالعلی خاں کی خوش اطواری کو بے حد پسند کرتے تھے، چنانچہ نواب صاحب نے عبدالعلی خاں کو اپنا درباری بنا لیا اور عبدالعلی خاں رامپور میں رہنے لگے۔ یہاں ان کے یہاں ایک بیٹا تولد ہوا جس کا نام انہوں نے شوکت علی رکھا۔ ۱۸۸۰ میں عبدالعلی خاں ۳۱ سال کی عمر میں ہیضے کے سبب وفات پا گئے۔ انہوں نے اپنے پیچھے اپنی بیوہ، ایک لڑکی اور پانچ بیٹے چھوڑے۔ سب سے بڑا بیٹا تیرہ سال کا تھا اور سب سے چھوٹا دو سال کا، ان کی ماں پر بچوں کی پرورش کی ذمہ داری آن پڑی۔ ۲۷ سالہ بیوہ خاتون عابدی بیگم بعد میں بی اماں کہلائیں۔ وہ انتہائی حوصلہ مند خاتون تھیں، وہ خود

تو تعلیم یافتہ نہ تھیں لیکن انہوں نے اپنے بیٹوں کو تعلیم دلائی۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ مدرسہ کی تعلیم پر ہی زور دیا جاتا تھا۔ جدید تعلیم سے مسلمان متنفر تھے لیکن بی اماں نے روایت کے خلاف اور اپنے کنبہ والوں کی مخالفت کے باوجود بریلی کے اسکول میں جدید تعلیم کے لیے ایک لڑکے کو بھیج ہی دیا۔ جب بی اماں نے اپنے دوسرے بیٹے کو بھی اسکول بھیجنا چاہا تو خرچہ کا سوال رکاوٹ بنا۔ بی اماں نے اپنے ایک ہندو پڑوسی کے ذریعہ اپنا زیور گروی رکھا اور شوکت علی کو بریلی کے اسکول میں داخل کیا۔ شوکت علی کچھ دن بریلی میں گزارنے کے بعد ۱۸۸۸ میں علی گڑھ چلے گئے جہاں ان کا ایک بھائی پہلے ہی سے زیر تعلیم تھا۔

کالج کے دنوں میں شوکت علی کو کرکٹ کا بہت شوق تھا اور وہ کالج کے کپتان بھی رہے۔ ۱۸۹۰ میں انہوں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ وہ "اولڈ بوائے" نامی کالج کی میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ انہوں نے ایم۔ اے۔ او کالج کو یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کے لیے گھوم پھر کر چندہ بھی کیا۔ لکھنؤ کے مشہور عالم دین مولانا عبدالباری ان کے روحانی مرشد تھے۔ ان کے دوسرے چھوٹے بھائی محمد علی اس وقت انگریزی کا ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" اور اردو روزنامہ "ہمدرد" نکال رہے تھے۔ جب محمد علی کی صحت خراب ہو گئی تو ان دونوں اخبارات کی ذمہ داری بھی مولانا شوکت علی نے سنبھالی۔

پہلی جنگ عظیم کے موقع پر علی برادران یعنی مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے برطانیہ سرکار کے خلاف آواز اٹھائی اور اس پر سخت نکتہ چینی کی۔ سلطنت انگلشیہ نے قوم کو بھڑکانے کے الزام میں ۳۰ مئی ۱۹۱۵ء کو گرفتار کر لیا اور ان کو سیاسی قیدی بنا کر مختلف مقامات پر رکھا۔ مولانا شوکت علی جن محکمہ سے ریٹائر ہونے کے بعد پنشن پا رہے تھے، وہ ضبط کر لی گئی جنگ کے خاتمہ پر ہندوستان کی سیاسی صورت حال اس قدر قابو سے باہر ہو گئی تھی کہ وہ سیاسی قیدیوں کو مزید جیل میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں علی برادران کو رہا کر دیا گیا۔

اس رہائی کے بعد شوکت علی ہندوستان کے ایک اہم مجاہد آزادی بنے، انہوں نے گاندھی جی کی رفاقت قبول کی اور انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے۔ مولانا شوکت علی نے پورے ملک کا دورہ کر کے گاندھی جی کا پیغام گھر گھر پہونچایا اور عوام میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کیا۔ مشہور مورخ مشیر الحق کا کہنا ہے کہ مولانا شوکت علی اور ان کے بھائی محمد علی دونوں ہی نے گاندھی جی کے پیغام سے ہندوستانی مسلمانوں کو متعارف کرایا اور اس کی اہمیت ان پر واضح کی۔ مولانا شوکت علی نے آل انڈیا خلافت کمیٹی کے کام کو ملک گیر پیمانہ پر پھیلایا۔ اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ خلافت عثمانیہ کو اتحادیوں کے حملوں سے محفوظ کرایا جائے جو کہ اسے تباہ کرنے کے درپے تھے۔ انہوں نے ملک میں گھوم کر خلافت کمیٹی کے لیے چندہ اکٹھا کیا۔

مولانا ابوالحسن ندوی جن کو عرف عام میں علی میاں کہا جاتا ہے اپنی کتاب "پرانے چراغ" میں لکھتے ہیں کہ "جنہوں نے ۲۲-۱۹۲۱ء کا زمانہ نہیں دیکھا، ان کو کیا بتایا جائے اس وقت ہندوستان کیسا آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اتحادیوں کی فتح، سلطنت عثمانیہ کے خلاف ان کے منصوبوں اور خلافت کو ختم کر دینے کی خبر نے سارے ہندوستان میں آگ لگا رکھی تھی، مسجدوں، مجلسوں، مدرسوں، گھروں، دکانوں، خلوت اور جلوت کہیں کوئی اس گفتگو کے سوا کوئی گفتگو نہ تھی، ہمارا شہر لکھنؤ جو شروع سے سیاسی تحریکوں کا بڑا مرکز رہا ہے، اس تحریک میں پیش پیش تھا۔ اس تحریک کے ایک بڑے رہنما مولانا عبدالباری اسی شہر کے رہنے والے تھے جن کا دولت خانہ سرائے فرنگی محل اس تحریک کے ہندو مسلم رہنماؤں کی لکھنؤ میں فرودگاہ تھی اور خود گاندھی جی وہیں ٹھہرا کرتے تھے۔ اسی شہر میں چند سال پہلے مولانا شبلی نے اپنی وہ ولولہ انگیز نظم پڑھی تھی جو "ہنگامہ بلقان" کے نام

سے سارے ہندوستان میں مشہور ہوئی تھی اور جس کے دو شعر یہ تھے :

خلافت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک　　چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
زوال دولت عثماں زوال ملک و ملت　　عزیزو فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

مولانا علی میاں لکھتے ہیں کہ "اس وقت محمد علی ہندوستان کے بے تاج بادشاہ معلوم ہوتے تھے چھوٹے چھوٹے رسالوں میں اس طرح کی نظمیں ہوتیں اور ایسی تصویریں ہوتیں جن میں دکھایا گیا ہوتا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان رسہ کشی ہو رہی ہے ۔ہندوستانیوں کی ٹیم میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی اپنے بھاری بھرکم جثہ کے ساتھ ہیں اور انہیں کا پلڑا بھاری ہے ۔ شہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کی حکومت اٹھ گئی ہے اور علی برادران اور گاندھی جی ہی کی حکومت ہے"۔

مولانا شوکت علی نے مسلمانوں میں عدم تعاون تحریک کو مقبول عام بنانے کے لیے انتھک کوششیں کیں ۔۱۹۲۳ء میں مولانا شوکت علی کو کناڈا میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی جہاں کہ ہندوستانیوں کی سماجی حالت سدھارنے کے لیے قراردادیں پاس کی گئیں ۔ایک قرارداد کی روشنی میں ہندوستان سیوادل (انڈین سوشل کور) تشکیل دیا گیا۔ اس دل کا پہلا اجلاس ۱۹۲۴ء میں بلگام میں ہوا ۔ ۱۹۲۵ء میں دوسرا اجلاس ہوا جس کی صدارت مسٹر گوسوامی نے کی۔

مولانا شوکت علی نے ۱۹۲۰ء میں ممبئی سے ایک اردو روزنامہ جاری کیا جس کا نام ہے "خلافت"۔شروع میں یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور اس کا نام تھا "خلافت عثمانیہ"۔ زندگی کے آخری ایام میں ان کو سنٹرل لجسلیٹیو کونسل آف انڈیا کا رکن منتخب کر لیا گیا۔ وہ آخر دم تک ایک صاف گو مجاہد آزادی کی حیثیت سے رہے اور دلی میں ۲۶ نومبر ۱۹۳۸ء کو وفات پائی اور دلی کی جامع مسجد کے قریب مدفون ہیں ۔

مولانا شوکت علی نے محسوس کر لیا تھا اگر ہندوستانی مسلمان اسلامی ممالک کو مغربی سامراج کے تسلط سے نجات دلانا چاہتے ہیں تو ان کو اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کو آزاد کرانا ہے ۔اس طرح انہوں نے ایک طرف تو مسلمانوں کی سیاسی اور نیم مذہبی جماعتوں میں آزادی کی روح پھونکنا شروع کی اور دوسری طرف خود مہاتما گاندھی کی قیادت میں انڈین نیشنل کانگریس کے زیادہ سے زیادہ کام کو اہمیت دی ۔ مسلمانوں کو کانگریس میں لانے ،شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور دوسرے علماء کو کانگریس کا حامی بنانے اور مہاتما گاندھی کے عدم تعاون کے پروگرام کو خلافت کانفرنس اور نیشنل کانگریس میں منظور کروانے میں علی برادران نے کلیدی رول ادا کیا۔

مولانا شوکت علی کے انداز فکر اور ان کے سرفروشانہ جد و جہد کے محرکات کو سمجھنے کے لیے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے فوراً بعد کی صورت حال پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے ۔ اس جنگ کی ناکامیابی کا سب سے زیادہ نقصان ہندوستانی مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑا شمالی ہندوستان کے مسلمان تو بہت ہی زیادہ متاثر دکھائی دیتے تھے ۔انہوں نے محسوس کر لیا اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے انہیں عصری تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ چنانچہ سر سید احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد سب ہی، مسلم علماء اور دانشوروں کے اس سلسلے کی نمایندگی کرتے ہیں جس نے ہندوستانیوں کو پراگندگی اور انتشار سے نکال کر ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ مولانا شوکت علی اسی ہراول دستہ کے معتبر رکن تھے۔

مولانا شوکت علی کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ خود کو ہر نئے سیاسی رخ کے مطابق اپنے نظریات میں تبدیلی لانے کے لیے تیار پاتے تھے ۔ چنانچہ ان کی معیت میں کانگریس کو کئی گراں قدر رہنما ملے جن میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود کے اسمائے گرامی شامل ہیں ۔ انہوں نے قوم پرست مسلمانوں کی حیثیت سے ہندوستان کی جد و جہد آزادی میں جو نمایاں رول ادا کیا، وہ ہندوستان کی تاریخ آزادی کا انمول سرمایہ ہے ۔ زیادہ تر قوم پرست مسلمان کانگریس کے غیر متزلزل حامی اور گاندھی جی، موتی لال نہرو، اور جواہر لال نہرو کے مخلص ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے ۔ ہندوستان کی جد و جہد آزادی کی ایک بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس کے حصول کے لیے ملک کے سبھی طبقات نے بلالحاظ مذہب و ملت کندھے سے کندھا ملا کر کام کیا ۔

مولانا شوکت علی کو جدید ہندوستان کی عوامی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے ۔ وہ ہندوستان کی جد و جہد آزادی کی ایک اہم شخصیت ہیں ۔ ان کی بھاری بھرکم شخصیت تلخی اور بغض و عناد سے پاک تھی ۔ ان کی دردمندی، نیکی، شرافت، وضعداری اور سخاوت نے مولانا کو اپنے زمانے کی ایک قابل قدر سیاسی حیثیت عطا کی ۔ ان کی بے لوث خدمات، انسان دوستی اور مستحکم نظریات آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہیں ۔

(بشکریہ پریس انفارمیشن بیورو، حکومت ہند)

اعلانِ ملکیت

مالک ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ قومیت ۔ ہندوستانی

ایڈیٹر ۔ مسعود عالم پرنٹر پبلیشر ۔ مسعود عالم

پریس ۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ ۔ اشاعت کی مدت ۔ ماہانہ

مقام اشاعت ۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق اور نشانت، ۱۔ شبلی روڈ، اے ایم یو، علی گڑھ

میں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے یقین کی حد تک درست ہیں ۔

مسعود عالم

(دستخط)

محمد اللہ خان *

مسلمان اور اشتعال انگیزی

ہر انسان کی سرشت میں قدرتی طور پر کچھ خواہشیں اور کچھ جذبے رچے بسے ہوتے ہیں۔ جس میں اس کے ارادہ و تدبیر کو ذرا سا بھی دخل نہیں ہوتا مثلاً ہر شخص کو کھانے پینے۔ سردی گرمی سے بچنے اور نفس کشی کی قدرتی خواہش ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کی طبیعت کے موافق کوئی کام ہو جائے تو اسے خوشی اور طبیعت کے خلاف انجام پائے تو رنج ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا شخص اسے پریشان کرے تو اس کے دل میں انتقام کا جذبہ ابھر آتا ہے۔

غصہ بھی اسی نوعیت کا ایک انتہائی اہم اور ضروری جذبہ ہے۔ اس کے ذریعہ ہر انسان کی خودداری، امتیاز اور انفرادیت قائم رہتی ہے اور اجتماعی نظام وانتظام بھی۔ چنانچہ جس شخص کو غصہ آتا ہی نہ ہو وہ ایک اچھا منتظم کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے ماتحت سستی اور غیر ذمہ داری سے کام کریں گے یا کام کو بگاڑیں گے تو وہ ان کی گرفت نہ کر سکے گا۔ جس کے نتیجہ میں وہ لوگ خود سری اختیار کرلیں گے اور پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

کوئی شخص کسی پر ظلم کرتا ہے اس کی عزت ختم کرنا چاہتا ہے اس کے جائز حقوق پر قوت یا چالاکی سے قبضہ کرلیتا ہے تو اس شخص کو اپنے مخالف پر غصہ آجاتا ہے جس کے جوش میں وہ پوری قوت سے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے کر گزرتا ہے۔ غصہ کی حالت میں اس کی ظاہری اور باطنی صلاحیتیں مکمل طور پر بروئے کار آجاتی ہیں اور وہ ان ابھری ہوئی قوتوں کو پوری طرح کام میں لانے پر قادر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غصہ کا ہی خروش مظلوم گروہوں اور قوموں کو ان سے زیادہ طاقتور اور منظم گروہوں کے مقابلہ میں اپنے حقوق کی حفاظت کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال صرف اسی صورت میں مفید اور کارگر ہو سکتا ہے جب کہ وہ بھڑک کر اشتعال کی شکل نہ اختیار کرے اور عقل وخرد کی گرفت سے آزاد نہ ہو جائے۔ قرآن پاک، احادیث شریفہ اور بزرگوں کے اقوال و ملفوظات میں اس قسم کے غصہ کو اعلیٰ انسانی اخلاق، نیک اعمال اور بہترین صلاحیتوں کو تباہ کر دینے والا شیطانی وسوسہ قرار دیا گیا ہے۔

ہمارے آقا حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی جد و جہد میں گزری اور اسلامی اصولوں کی اشاعت کے دوران کفار مکہ نے آپ کے ساتھ وحشیانہ اور توہین آمیز رویہ اختیار کیا اس کے باوجود آپ کے کسی قول و عمل سے بے قابو غصہ یا اشتعال کا اظہار نہیں ہوا۔ اور حضور انور نے ان اشرار کی انتہائی بیہودہ حرکتوں کو بھی بڑے تحمل اور خندہ پیشانی

---

* چوک سہاور، ضلع ایٹہ۔ (یوپی)

سے برداشت فرماتے ہوئے اپنے جذبات کو ہمیشہ قابو میں رکھا اور ان کے حق میں کبھی بددعا بھی نہیں فرمائی۔ وہی لوگ فتح مکہ کے بعد آپ کی خدمت میں پیش کیے گیے تو آپ کے چہرہ مبارک پر غصہ کے آثار بھی نمودار نہیں ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں انتہائی کشادہ دلی سے معاف فرما کر آزاد کر دیا۔

حضور اکرم کے اسی غیر معمولی تحمل اور غصہ پر مکمل قابو رکھنے کا اثر تھا کہ آپ کی قوت عمل اور فکر و فہم کفار مکہ کی اجتماعی قوت، اثر و رسوخ، کافی مادی مسائل اور اجتماعی سوجھ بوجھ پر ہمیشہ حاوی رہی اور آپ اللہ تعالی کے فضل و کرم سے نازک ترین مواقع پر بھی فتح و نصرت سے ہمکنار ہوتے رہے اور آپ کے مخالفین کو ذلت و رسوائی اور ناکامی و نامرادی کا سامنا کرنا پڑا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی اسوہ اور تعلیمات کی روشنی میں صحابہؓ کرام اور بزرگان دین نے بھی غصہ اور اشتعال پر قابو پانے اور قابو رکھنے کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیا تھا یہاں تک کہ صوفیائے کرام نے جو اپنی کریمانہ شخصیتوں اور بلند کرداری کے سبب سے اسلام کی اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ غصہ پر قابو رکھنے کے لیے بڑے زریں اصول و ضابطے وضع فرمائے ہیں بلکہ ہمارے ان بزرگوں کا تو یہ فرمانا ہے کہ جب تک غصہ پر قابو حاصل نہ کر لیا جائے معرفت الہی حاصل ہو ہی نہیں سکتی

لیکن افسوس کہ آج کے دور میں بجز چند مستثنیات کے ہمارے مسلمان بھائی انفرادی اور اجتماعی سطح پر اتنی جلدی مشتعل ہو جاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ معمولی معمولی باتوں پر بھڑک اٹھنا اور اشتعال کی شدت میں انتہائی نامناسب طریقے اختیار کر لینا جو اسلامی تعلیمات اور عام انسانی اخلاق کے قطعاً منافی ہوتے ہیں ان کی زندگیوں کا معمول بن گیا ہے جس کی وجہ سے ان کے انفرادی اور اجتماعی معاملات نہایت خراب ہو گئے ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے مفسد مخالفوں نے ان کی اس کیفیت کا اچھی طرح اندازہ لگا لیا ہے اور تجربہ بھی کر لیا ہے۔ اسی لیے آئے دن دنیا کے تقریباً ہر اس خطہ میں جہاں مسلمان آباد ہیں اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ کوئی چالاک اور شاطر شخص یا گروہ مسلمانوں کو بھڑکانے کے لیے کوئی ایسی چھچھوری حرکت کر دیتا ہے کہ جس سے مسلمانوں کو قلبی تکلیف پہنچ سکتی ہے۔ مثلاً کوئی دل آزار تقریر کر دی گئی۔ کوئی بیہودہ مضمون یا کتاب لکھ دی گئی۔ وہ تقریر یا تحریر کتنی ہی فضول ہو زود حس مسلمانوں کے کانوں میں اس کی بھنک پڑتے ہی اس کی غیر معمولی تشہیر ہو جاتی ہے اور مسلمان مشتعل ہو کر اس کے خلاف وسیع پیمانہ پر پر شور احتجاج کرنے لگتے ہیں۔ اسی وقت اسلام دشمن میڈیا ان واقعات کو لے کر مسلمانوں کے خلاف دشنام طرازی کر کے جلتی آگ پر تیل چھڑکنے لگتی ہے۔

اس اشتعال انگیز ماحول میں خود مسلم سماج کے اندر ایسے لوگ سوئے لنگوٹے سے مضبوط ہو کر میدان عمل میں نکل آتے ہیں کہ جو سستی شہرت، دولت یا قوم کی سیادت حاصل کرنے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی اشتعال انگیزی کے نتیجے میں ہزاروں مشتعل مسلمانوں کا خون بہہ جاتا ہے ملی کی جائدادیں تباہ ہو جاتی ہیں اور وہ قید و بند کی تکلیفوں میں مبتلا کر دیے جاتے ہیں۔ ایسے خود غرض لوگوں کو باہر کا محاذ ہاتھ نہیں آتا تو وہ مسلمانوں کے فقہی گروہوں کو مشتعل کر کے انھیں کو آپس میں بھڑا دیتے ہیں۔

اس قسم کے اشتعال انگیز موقعوں پر مسلمان مشتعل نہ ہو کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ حالات و واقعات کا جائزہ لیں

اور یہ طے کریں کہ کون سے واقعات نظر انداز کرنے کے قابل ہیں اور کون سے معاملات ایسے ہیں کہ جن سے نبٹنے کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے۔ اور جن معاملات سے نبٹنے کا فیصلہ کیا جائے اس کے لیے بھی دور رس دانشمندانہ اقدامات تجویز کیے جائیں اور کسی بھی مرحلے میں بیجا اشتعال کو قریب بھی نہ آنے دیا جائے۔ جو واقعات نظر انداز کرنے کے قابل ہوں انہیں ایسے نظر انداز کر دیا جائے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ بہت سے پیچیدہ مسئلے اس طرح بھی حل ہو جاتے ہیں اور اشتعال انگیز بیہودگیاں اپنی موت آپ مر جاتی ہیں۔ اس کے بعد شرپسند لوگوں کو اس قسم کے مسائل اٹھانے کی اس لیے بیتابی نہیں ہوتی کہ اس سے انہیں کوئی فائدہ حاصل ہونے کی توقع نہیں رہتی۔

ہمارے پرانے دانشوروں کی شاگردوں یا اولاد کی تعلیم و تربیت کے بارے میں یہ حکیمانہ رائے ہے کہ استاد اپنے شاگردوں اور ماں باپ اپنے بچوں کو غصہ کی حالت میں کبھی سزا نہ دیں بلکہ غصہ فرو ہونے کا انتظار کریں اور جب ان کا ذہن متوازن ہو جائے تو خوب سوچ سمجھ کر سزا دیں۔ ہمارے بزرگوں نے اس زریں اصول پر عمل کر کے تعلیم و تربیت کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ چنانچہ اسی اصول کو نشان راہ سمجھ کر شدید غصہ کے دباؤ میں دیگر اہم فیصلے بھی نہ کیے جائیں اور غصہ فرو ہونے کا انتظار کر لیا جائے تو میری ناچیز رائے میں بہت سے انفرادی اور اجتماعی نقصانوں سے بچا جا سکتا ہے اور بہت سے بے فیض کاموں میں جو انفرادی اور اجتماعی قوت ضائع ہو جاتی ہے وہ دین و ملت کے زیادہ اہم اور بنیادی کاموں میں صرف ہو کر تاریخی کارناموں کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔

غصہ کو اشتعال انگیزی کا رخ نہ اختیار کرنے دیا جائے اور اس قوت کو صحیح ڈھنگ سے استعمال کر لیا جائے تو وہ غصہ انتہائی مفید اور موثر ہتھیار کا کام دے سکتا ہے۔ یہ نہ کیا جا سکے تو وہ کمزور افراد اور گروہوں کی نپی تلی قوت کو بھی ضائع کر کے انہیں بالکل ہی تباہ کر دیتا ہے۔ دانشوروں کے نزدیک غصہ کی زیادتی کمزوری کی دلیل ہوتی ہے۔

(باقی صفحہ ۹ کا)

مراجع

(۱) محمد آیت ۲۴۔ (۲) مقدمۃ فی اصول التفسیر از ابن تیمیۃ، ص ۹۳۔ (۳) آل عمران آیت ۹۴۔ (۴) نماز دین کا ستون از شیخ متولی الشعراوی، مترجمہ محمد اسلم اصلاحی صفحہ ۲۲ - ۲۴۔ (۵) علامہ حمید الدین فراہی از محمد عنایت اللہ سبحانی صفحہ ۴۵۔ (۶) العنکبوت آیت ۲۴ (۷) پندرہ روزہ الرائد، شمارہ ۷، ۸ اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ (۸) الحشر آیت ۱۰۔ (۹) الصف آیت ۲۔ (۱۰) العنکبوت آیت ۴۶۔ (۱۱) محمد آیت ۳۵۔ (۱۲) الفتح آیت ۲۹۔

احمد رشید شیروانی ٭

"رب زدنی علماً"

اے میرے رب میرے علم کو زیادہ کر

مناسب ہے کہ وقتاً فوقتاً ہم اسلام کی تعلیمات کو دہرالیں ۔ ٹھنڈے دل سے ان عظیم اور مفید تعلیمات کے بارے میں سوچیں اور پھر خلوص اور نیک نیتی سے ان پر عمل کریں تو ہم اسی دنیا میں اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں گے ۔

کلام پاک میں ایک دعا ہے "رب زدنی علما" یعنی اے میرے رب میرے علم کو بڑھا ۔ جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تب مجھے یہ دعا بتائی گئی ۔ خواہ مخواہ اپنی عقل (جو ہے تھوڑی سی مگر اس وقت بہت معلوم ہوتی تھی) کو ٹھونسنے کی عادت تھی ۔ میں نے سوچا، واہ یہ خوب رہی کہ ہم کچھ پڑھیں لکھیں نہیں، سال بھر گھومتے پھریں اور جب امتحان سر پر آئے تو بیٹھ کر "رب زدنی علما" کا ورد کرنے لگیں کہ اللہ میاں آپ ہمارا علم بڑھا کر ہمیں امتحان میں ہر مضمون میں ڈسٹنکشن دلوا دیجئے ۔ ارے بھائی علم حاصل کرنا ہے تو کلاس میں جاؤ، لیکچر غور سے سنو، لائبریری میں جاؤ کتابیں پڑھو ۔ اللہ میاں کسی کا علم زبردستی کیوں بڑھا دیں گے ؟ لیکن جب امتحان سر پر آئے تو عقل درست ہوگئی ۔ جو کچھ پڑھا بھی تھا وہ کبھی یاد رہتا تھا کبھی نہیں ۔ جو پڑھنے بیٹھتے تھے وہ کچھ سمجھ میں آتا تھا کچھ نہیں ۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کتاب پڑھنے بیٹھیں تو اس میں سب کچھ سوجھ بھی جائے الفاظ اور جملے تو سوجھتے ہیں مگر معانی ہمیشہ سب کے سب نہیں سوجھتے ۔ ہم شیکسپیئر کا وہ ڈرامہ پڑھتے ہیں جو پہلے چار بار پڑھا ہے تو نظر کسی ایسی چیز پر اٹکتی ہے جس پر سے پہلی چار بار پھسل کر گزر گئی تھی ۔ کوئی نئی چیز سمجھ میں آتی ہے ۔ کوئی نیا پوائنٹ نظر آتا ہے ۔

چنانچہ علم کے حصول میں دماغ حاضر ہونا ضروری ہے ۔ پوری توجہ کا مبذول ہونا مددگار ہے ۔ اور دماغ کو حاضر اور توجہ کو مرکوز کرنے میں دعا سے مدد ملتی ہے، تقویت ملتی ہے ۔ اس لئے طالب علم دعا کرتے ہیں "رب زدنی علما" ۔

ویرانہ میں بھٹکنے والے

جب تک ہم اسکول، کالج، یونیورسٹی میں تھے تو معلوم تھا کہ ہمیں کیا علم حاصل کرنا ہے ۔ سلیبس موجود تھا، کتابوں کی فہرست دی ہوئی تھی ۔ کیا کیا پڑھنا ہے سب پتہ تھا ۔ پروفیسر محمد حبیب اور ڈاکٹر نورالحسن جیسے اساتذہ رہنمائی فرماتے تھے ۔ لیکن یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا ۔ پتہ چلا کہ علم کے گوہر یکتا عمیق سمندر کی تہوں میں پڑے ہیں اور غواص علم کا اللہ نگہباں ہو کیونکہ ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی ۔

٭ ۲۰-اے، کناٹ پلیس، نئی دہلی-۱۰۰۰۱

ظاہر ہے گہرا غوطہ لگائے بغیر بہت اچھے موتی ملنے مشکل ہیں۔ لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر غوطہ میں کوئی موتی ہی مل جائے اس لئے علم حاصل کرنے کے لئے انسان کی اپنی کوشش کے ساتھ رب کریم کی مدد کا شامل حال ہونا ضروری ہے ورنہ علم کا متلاشی غوطہ کھاتا ہی رہ جائے، ایک بیابان میں، ایک لق و دق صحرا میں بھٹکتا ہی پھرے اور اسے کچھ نہ ملے۔ اس لئے دعا کرو "رب زدنی علما"۔

ایک بات اور سمجھ میں آئی کہ علم کا حصول تخریبی یعنی شیطانی کاموں کے لئے بھی کیا جاسکتا ہے۔ جو عالم ایسا کرے وہ خبیث بھی ہے اور بدنصیب بھی۔ لیکن جو شخص اپنے رب سے دعا کرے گا کہ "اے میرے رب میرے علم کو بڑھا"، وہ پھر اپنے علم کو بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے ہی استعمال کرے گا۔ اس لئے علم حاصل کرنے کی انتھک، مسلسل اور مستقل کوشش کے ساتھ ہم کو خلوص اور صدق دل سے دعا کرنی چاہئے "رب زدنی علما۔"

لاعلمی کا احساس علم کی شروعات ہے۔

دعا سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ دعا کرنے والا اپنی کوتاہیوں اور مجبوریوں سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ابھی اس کے پاس بہت کم علم ہے اور وہ یہ بھی پوری طرح نہیں جانتا کہ ابھی اسے اور کیا کیا علم حاصل کرنا ہے۔ وہ علم کہاں کہاں مل سکتا ہے۔ یہی احساس سچے علم کی شروعات ہے۔ علم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جیسے جیسے ہم علم حاصل کرتے جاتے ہیں ہم کو یہ معلوم ہوتا جاتا ہے کہ ابھی اور بھی کیا کیا جاننے کی ہمیں ضرورت ہے۔ اس لئے جو شخص دعا کرے گا وہ یقیناً اپنی بے کسی اور لاچاری سے واقف ہوگا اور یہ جانتا ہوگا کہ علم حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ احساس ہو کہ ہم جو جانتے ہیں وہ بہت تھوڑا ہے، بہت محدود ہے اور جو ہم نہیں جانتے وہ بہت زیادہ ہے، بہت وسیع ہے۔

جب بھی ہمیں کچھ علم حاصل ہوتا ہے ہمکو ساتھ ساتھ اپنی لاعلمی کا اتنا ہی زیادہ صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ ہم کو یہ پتہ چلتا ہے ہمارا علم ابھی کتنا کم، کتنا نامکمل، کتنا ناکافی ہے اور ہمیں اس میں کیا کیا کمی پوری کرنی ہے۔ اور اس احساس کے ساتھ سچے طالب علم کو یقیناً اپنی حقارت اور بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہی احساس ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیتا ہے۔ "رب زدنی علما" اور پھر سچا عالم کبھی مغرور یا گھمنڈی نہیں ہوتا۔ کبھی اپنے آپ کو فارغ التحصیل نہیں سمجھتا (جیسے کہ کچھ جاہل، کم فہم، نام نہاد عالم اپنے آپ کو سمجھتے ہیں) اور اسی لئے علم کا پرخلوص اور حقیقی متلاشی گڑگڑا کر کہتا ہے اے رحمان و رحیم، اے کافی و کریم، اے عالم اور علیم، ہو دانی، ہو دانا، ہو گیانی، انتریامی، ہو بھٹکوں کو راہ دکھانے والے، ہمارے دلوں اور ہمارے دماغوں کے دروازے کھلے رکھ اور جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہمارے لئے علم کے چراغ روشن کردے تاکہ ہم تیری کائنات، تیری تخلیق تیری بنائی ہوئی قدرت کے نظام کو تھوڑا سا تو سمجھ سکیں۔ "رب زدنی علما"۔

تہذیب الاخلاق اور نشانت

کی

خصوصی پیش کش

سرسید احمد ڈے ۱۹۹۵ کے موقع پر

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی

پلیٹنم جوبلی نمبر

مصنفین، قارئین اور اولڈ بوائز سے اشتراک عمل کی

اپیل

ادارۂ تہذیب الاخلاق اور نشانت

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

سید ساجد الحق رضوی (علیگ) •

مقررین ـــ مسایل اور حل

مقرر کی ایک بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر دلعزیزی چاہتا ہے اور اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کی تعریف کریں اور داد تحسین دیں اور یہ جہاں ایک طرف کمزوری ہے وہاں دوسری طرف اس کے لیے ایک اہم مسئلہ ہے کہ کس طرح وہ اپنی بات کو دلچسپ اور دلنشیں بنا کر اپنے سامعین کے سامنے پیش کرے۔ اس کے لیے سامعین کے مزاج کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ سامعین چونکہ مزاج، معیار تعلیم اور ذہنی اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں اس لیے مقرر کی دشواری بڑھ جاتی ہے کہ سامعین کے کس طبقہ کا لحاظ کرے اور کس کا نہ کرے۔ مقرر کی تقریر کا ایک حصہ کچھ لوگوں کے لیے دلچسپ دلنشیں اور علمی ہوتا ہے اور دوسرے طبقہ کے لیے وہی حصہ غیر دلچسپ اور غیر عالمانہ ہوتا ہے۔ الفاظ کا گورکھ دھندا کچھ لو کے لیے مسرور کن ہوتا ہے اور کچھ کے لیے غیر موزوں اور غیر معیاری ہوتا ہے۔ مقرر کو اپنے بیان کو دلچسپ بنانے کے اشعار کا سہارا لینا بھی پڑتا ہے اور روایتوں، کرامتوں، خوابوں، غیر مستند تاریخی روایات اور غیر معیاری کتابوں پر بھی سہارا پڑتا ہے۔ علامہ اقبال نے تو نہایت تند اور تیز لہجہ میں اپنے شعر میں اشارہ فرمایا ہے۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی   یہ امت روایات میں کھو گئی

اگر ہم علامہ اقبال کا سا تند اور تیز لہجہ اختیار نہ کریں تب بھی یہ بات تو ضروری ہے ہی کہ واقعات اور روایات کے انتخاب میں مقرر کو نہایت احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے کہ اس کے بیان کیے ہوئے واقعات کو سامعین یاد کر لیتے ہیں ان کو مستند سمجھنے لگتے ہیں اور ان سے بعض اوقات غلط نتائج بھی اخذ کر لیتے ہیں۔ لہذا واقعات اور روایات کے بیان میں مستند اہم باتوں کا ہی ذکر آنا ضروری ہے۔ زور بیان کے سلسلے میں بھی دو مقرر نہایت اہم گزرے ہیں۔ بسمرو اور ڈزرائیلی، ایک کی یہ تھی کہ وہ اپنی تقریر کے ذریعہ سے آگ لگا دیتا تھا اور آگ لگانے پر اپنی عوام کو آمادہ کر دیتا تھا اور لوگ واہ واہ کر تے لیکن وقت کے گزرنے کے بعد سامعین یہ سمجھ جاتے تھے کہ وقتی جوش و خروش کے علاوہ ان کو اس تقریر سے کچھ نہیں ہوا۔ دوسرا مقرر جوش و خروش کو ٹھنڈا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، لگی ہوئی آگ پر پانی ڈال دیتا تھا اور ایسی دعوت فکر تھا کہ لوگ مہینوں سوچتے رہ جاتے تھے کہ کیا کریں اور سماج کی اس خرابی کو کس طرح دور کریں جس کی طرف مقرر نے کیا ہے لہذا سب سے بڑا معیار عقل سلیم ہی ہے شے لطیف جو مقرر اور سامعین کے لیے مشعل ہدایت ہوتی ہے۔ زمانہ کا بھی

• ایڈووکیٹ، ماہنامہ ضیاء حرم جامع العلوم فرقانیہ، مسٹن گنج، رامپور (یوپی)

ہو جاتا ہے کہ باتیں آج سے سو برس پہلے صحیح تھیں اور وہ اثر انداز ہوتی تھیں لیکن آج نہیں۔ ایک مشہور مقرر نے اپنی تقریر میں نوابین کی عظمت اور ان کے شاہانہ جلال و جمال کا نہایت موثر طریقہ پر نقشہ کھینچا جو کسی وقت موثر ہو سکتا تھا لیکن سامعین پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اس لیے کہ سامعین میں اس شاہانہ جمال و جلال کا کوئی تصور نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو امتداد زمانہ سے باغیانہ شکل اور مخالفانہ رویہ اختیار کر چکا تھا لیکن پچاس سال پہلے وہی تقریر لوگوں کو آنسوؤں سے رلا سکتی تھی۔ اس لیے مقرر کے پیش نظر زمانہ کا فرق بھی کافی اہمیت رکھتا ہے اور اگر وہ زمانہ کا لحاظ نہیں رکھتا تو وہ تقریر بے اثر ہو جاتی ہے

بعض واقعات جذبات کے زیر اثر یا اضطراری یا اضطرابی کیفیت کے تحت بعض لوگوں سے سرزد ہو جاتے ہیں۔ ان کو بیان کرنے میں بھی دشواری اور خرابی ہوتی ہے۔ سامعین ان کو اصول اور ضابطہ سمجھ لیتے ہیں اور ان کو اپنی زندگی میں برتنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ خالص غیر معمولی ذہنی کیفیت میں واقع ہوتے ہیں اور ان سے کوئی ضابطہ یا اصول حیات مرتب نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا کام محدثین نے کیا کہ ہر مسئلہ کو اس کے بیان کرنے والوں کی صلاحیت، حافظہ اور تفقہ فی الدین کے اصول پر طے کیا ہے اور کتنے راوی اس کی روایت کرتے ہیں۔ اس کو بھی کافی اہمیت دی ہے۔ لیکن بعض اوقات محدثانہ اصول سے ہٹ کر عقیدت مندانہ طرز فکر پر آجاتے ہیں اور عقیدت مندانہ طرز فکر کوئی منطقی طرز فکر نہیں ہے اور اس کی غلطیاں تاریخ، قصص اور سوانح عمریوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

اب مقررین کی قسموں کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایک طبقہ سیاسی مقررین کا ہوتا ہے جن کی تقریروں کو سامعین وقتی اور حال کی ضرورتوں کے تحت شمار کرتے ہیں ان کو صداقت اور عدالت کے پیمانہ پر تولا اور پرکھا نہیں جاتا بلکہ سیاسی جماعتوں کے منشور، جماعتوں کے مصالح اور جماعتوں کی وقتی ضرورتوں کے تحت دیکھا جاتا ہے۔ ان کے بیان کیے ہوئے واقعات ایک خاص نقطہ نظر سے سمجھے جاتے ہیں۔ اگر یہ تقریریں انتخابی مہم کے سلسلے میں ہوں تو ان میں کیے ہوئے وعدوں کو وعدہ محبوب سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ زور بیان اور تقریر کا تسلسل مقرر کی کامیابی کے لیے کافی ہوتا ہے اور ان تقریروں میں آج کی کہی ہوئی بات کی تردید بھی ہو سکتی ہے اور تکذیب بھی۔ پارٹی کے بدلنے سے مقررین کی تقریروں میں زمین اور آسمان کا فرق بھی ہو جاتا ہے بعض اوقات یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ سرکاری ملازمتوں کے بعد اس حکومت کی مشین کے پرزے اسی مشینری کے خلاف کھڑکھڑاہٹ کرنے لگتے ہیں اور جس حکومت کے استبداد کے وہ حصہ تھے آج اسی استبداد کے خلاف نعرہ حق بلند کرنے لگتے ہیں لیکن سامعین کی نظر میں ان تقریروں کی کوئی علمی عظمت نہیں ہوتی ہے اس لیے کہ عوام جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ سیاسی کھیل کا حصہ ہے۔ ان تقریروں کے مصالح اور تقاضے بھی عارضی ہوتے ہیں اور ان کے نتائج بھی عوام وقتی اور عارضی جانتے ہیں۔ ان تقریروں میں صرف جوش بیان کی اہمیت ہے حالانکہ شعلہ بیانی فن خطابت میں تیسرے درجے کی چیز ہے۔ لوگوں نے کبھی ان کو اعلیٰ ترین مقام نہیں دیا۔ ان میں صرف لفاظی، ذو معنی الفاظ کے استعمال، طنز و مزاح سے تقریر آسمانی رفعت اختیار کر لیتی ہے۔

ایک قسم مقررین کی وہ ہے جن کا موضوع نہایت سنجیدہ اور خشک ہوا کرتا ہے۔ ان میں علمی اور تحقیقی مسایل کا بیان ہوتا ہے، ژرف نگاہی سے کام لیا جاتا ہے، دوسروں کی علمی تردید ہوتی ہے۔ ان تقریروں میں دلچسپی لینے والوں کی تعداد سامعین میں پانچ فی صد بھی نہیں ہوتی۔ باقی سامعین پر غنودگی کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے یا بقول شخصے اپنا گھر یاد کرنے

لگتے ہیں ۔مقرر کی زبان خشک، گفتگو روکھی پھیکی لیکن علمی اور تحقیقاتی ۔مقرر اپنے زبان سے نکلے ہر لفظ کی ذمہ داری محسوس کرتا ہے اور اس کا مخاطب بھی اس علم کے جاننے والے ہوتے ہیں ۔ اگر کسی واقعہ کو بیان کرتا ہے یا کسی عمارت، کسی مقام کے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کرتا ہے ۔ تو یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر میری کوئی بات غلط ثابت ہو گئی تو برسوں کی محنت برباد ہوجائے گی ۔برسوں کے مطالعہ اور تحقیق اور تفتیش کا اظہار چند گھنٹوں میں کر دیتا ہے ۔ایک عظیم مقرر نے ایک مرتبہ یہ بات کہی "یہ جو تقریریں ایک گھنٹے میں کرتا ہوں وہ برسوں کی محنت، کاوش، تحمیل اور فکر کا نتیجہ ہوتی ہے ۔"یہ تقریریں زینت کتاب بن جاتی ہیں اور ان کے پڑھنے والوں کی تعداد بھی ہمیشہ کم ہوا کرتی ہے ۔ علامہ اقبال کے خطبات جو Reconstruction of Islamic Thought کے نام سے مشہور ہیں یا سید سلیمان ندوی کے خطبات مدارس اس کی بہترین مثالیں ہیں جو ہمارے علم وادب کی موجودہ تاریخ سے پیش کی جاسکتی ہیں ۔

مقررین کا تیسرا طبقہ وہ ہے جن کا موضوع دین اور مذہب ہوتا ہے اور ان کے سامعین سیدھے سادھے، عقیدت مند اور سادہ لوح ہوا کرتے ہیں ۔اہل علم ان جلسوں سے گریز کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی کسی مصلحت سے ان جلسوں میں پھنس جاتے ہیں اور سخت ذہنی ہیجانی اور الجھن کا شکار رہتے ہیں ۔ مقررین کو سخت گزار راستوں سے گزرنا ہوتا ہے ۔ وہ دلچسپ واقعات بیان کرنا چاہتے ہیں وہ واقعات بھی آجاتے ہیں جو غیر مستند اور غیر علمی ہوتے ہیں اور ان سے دین و مذہب کی بنیادوں کو نقصان پہنچتا ہے اور بعض اوقات غیر محسوس طور پر سامعین کے ایک طبقے کی الجھنوں اور تشکیک میں اضافہ ہوجاتا ہے ۔ کوئی باعلم سامع جلسہ سے کچھ حاصل کرکے نہیں اضافہ کچھ کھو کر واپس آتا ہے ۔لفاظی الفاظ کا گورکھ دھندا، کرامات پر اصرار، غیر مستند کشف اور غیر مستند خوابوں پر بے حد سہارا کیا جاتا ہے اور صرف کسی بات کے کسی کتاب میں لکھے ہوئے ہونے کو کافی سمجھا جاتا ہے ۔روایت کے ساتھ ساتھ درایت کے اصول کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا ۔ہر کتاب میں لکھا ہوا ہر واقعہ صحیح نہیں ہوتا خبر احاد پر کلیات قائم کر دیے جاتے ہیں ۔ایک عالم متبحر نے مجھ سے ایک مرتبہ یہ کہا کہ معاملہ، خبر اور روایت دونوں میں جس قدر ندرت ہو اتنا ہی زائد ثبوت کی ضرورت ہے حالانکہ عمل اس کے خلاف ہوتا ہے ۔ نادر اور محیر العقول واقعات کے سلسلے میں غیر اہم اور غیر مستند روایات کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے ۔اس موقعہ پر مقررین کو سامعین کا تابع ہوجانا پڑتا ہے ۔ مقررین کو یہ خیال ہوتا ہے کہ جس بات سے عوام خوش ہوجائیں وہ کہنا چاہیے اور تنقید واقعات کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ۔ بعض اوقات زمانہ کے فرق کو محسوس نہیں کیا جاتا۔ صحیح اور مستند باتیں بھی ایک زمانہ کے بعد وہ اثر پیدا نہیں کرتیں جو کسی زمانہ میں اثر پیدا کر سکتی ہوں گی ۔ آج سائنس کا دور ہے اور سائنس کی معلومات عام ہیں اور کوئی ذہن سائنس کی تحقیقات کے خلاف کسی بات کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہے ۔ سائنس درحقیقت کائنات میں جو کچھ ہورہا ہے اس کے مطالعہ کا نام ہے اور ہر مطالعہ کو شواہد سے ثابت کرنا ہے لہذا کوئی بھی ذی علم آدمی سائنس کی مبادیات کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ سائنس سے یہ مقررین پورے طور پر واقف نہیں ہوتے لہذا سائنس کی معلومات کا جب اظہار کرتے ہیں تو اس میں بیشتر غلطیاں ہو جاتی ہیں اس لیے ان پر لازم ہے کہ سائنس کے کسی مسئلہ کو بیان کرنے سے پہلے اس کے متعلق پوری تحقیق اور تفتیش کرائیں تاکہ کوئی غلطی سرزد نہ ہو ۔سائنس کو شجر ممنوعہ نہ سمجھیں اور اس کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کریں ۔سر سید کے بقول سائنس Work of God ہے اور دین Word of God (افعال خداوندی کا مطالعہ اور اقوال خداوندی کا

مطالعہ) ہے اور دونوں میں کوئی تفاوت اور فرق ممکن نہیں ہے۔

آخری بات اس سلسلے میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ تقریر میں سائنس کے حوالہ جات اور دوسرے مذاہب کے واقعات اور کتب تواریخ کے اقتباسات نہایت احتیاط اور تحقیق اور تفتیش کے ساتھ پیش کرنا چاہیے جب تک پورے مسئلہ پر قدرت نہ ہو اور اس کے بارے میں عمیق مطالعہ نہ ہو ان کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ سائنس پر وہ جملے کر دیے جاتے ہیں جو صحیح نہیں ہوتے اور وہ باتیں بیان کردی جاتی ہیں جن کو سائنس کا طالب علم بھی غلط سمجھ لیتا ہے۔ اسی طرح تاریخ کے ناقص حوالے اور دوسرے مذاہب کے ذکر بلا اس کے علم کی پوری تحقیق اور تفتیش کے تقریر کو غلط اور بے وزن کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اپنی رائے کے خلاف جو مصنفین ہیں ان کی کتابوں کے حوالے اصل متن (Text) پڑھ کر دینا چاہیے دوسروں کے کیے ہوئے اقتباسات (Extract) سے نہیں دینا چاہیے اس لیے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اقتباسات غلط ہوتے ہیں اور اپنے مقصد کے تحت تبدیلی اور تحریف کرکے دیے جاتے ہیں۔

بہرنوع تقریر کو ایک عمومی درس سمجھنا چاہیے اور مقرر کو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کا ذمہ دار ہے اور تقریر لوگوں کو بھکانے اور ان کے ذہن کو مفلوج کرنے اور قوت فکر کو مضمحل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ تعلیم اور تدریس کا ایک اہم فریضہ ہے اور اس ذمہ داری کو نہایت احتیاط، تحقیق اور تفتیش کے بعد ادا کرنا چاہیئے۔ اور ہر غلط بات کی ذمہ داری مقرر کو جانی چاہیے۔ وما علینا الا البلاغ۔

تہذیب الاخلاق

شرح اشتہارات

۱-	بیک ٹائیٹل پیج	(پورا صفحہ)	۱۲۰۰	روپے
	بیک ٹائیٹل پیج	(آدھا صفحہ)	۶۰۰	روپے
	بیک ٹائیٹل پیج	(چوتھائی صفحہ)	۳۰۰	روپے
۲-	بیک انر ٹائیٹل پیج	(پورا صفحہ)	۱۰۰۰	روپے
	بیک انر ٹائیٹل پیج	(آدھا صفحہ)	۵۰۰	روپے
	بیک انر ٹائیٹل پیج	(چوتھائی صفحہ)	۲۵۰	روپے
۳-	انر سائڈ پیج	(پورا صفحہ)	۷۵۰	روپے
	انر سائڈ پیج	(آدھا صفحہ)	۴۰۰	روپے
	انر سائڈ پیج	(چوتھائی صفحہ)	۲۰۰	روپے

نوٹ: مشتہرین کو ۳۳ فی صد کی رعایت دی جائے گی۔

سرکولیشن انچارج

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی *

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ - ادبی و لسانی اہمیت

سرسید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی کی جانب سے ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء سے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں "اخبار سائنٹیفک سوسائٹی" جاری ہوا جو بعد میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے مشہور ہوا۔ ابتدا میں یہ ہفتہ وار نکلا پھر سہ روزہ ہوگیا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں اسے دوبارہ ہفتہ وار کر دیا گیا (۱)۔ اس میں ملکی و خبروں اور حالات حاضرہ پر تبصرے کے علاوہ سوسائٹی میں دیے گئے لیکچر، سیاسی، سماجی، معاشرتی، اور تعلیمی امور سے متعلق مضامین اور انگریزی اخباروں میں شائع شدہ منتخب تحریروں کے ترجمے بھی جگہ پاتے تھے۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی سیاسی، سماجی اور صحافتی خدمات سے قطع نظر ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس نے سادہ اور کاروباری نثر کو فروغ دیا اور معاصر صحافت کے عمومی مزاج سے ہٹ کر ادبی مسائل پر غور و فکر کی ایک نئی طرح ڈالی۔

گزٹ سے قبل اردو اخباروں میں ادب کے نام پر بالعموم جو تحریریں شائع ہوتی تھیں ان کا بنیادی مقصد قارئین کے لیے تفریح طبع کا سامان فراہم کرنا تھا۔ چنانچہ ان کی دنیا غزلوں، نظموں اور قصے کہانیوں تک محدود تھی۔ غزل کیسی ہونی چاہیے؟ نظم کی خوبی یا خرابی کیا ہے؟ نثر کو کیسے فروغ دیا جائے؟ زبان کی ترویج و ترقی میں سنجیدہ علمی مضامین کا بھی ایک کردار ہوتا ہے، اسلوب بیان اور خیال کے نئے زاویے بھی ممکن ہیں، ان باتوں سے اخباری صفحات کے گوشۂ ادب کو سروکار نہ تھا جو عوام کو پسند ہے۔ وہی چھاپو، یہ تھا معاصر صحافت کا رجحان۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے اس رجحان سے گریز کیا۔ اس میں غزلوں، نظموں اور قصے کہانیوں کے لیے کوئی گوشہ مختص نہیں کیا گیا بلکہ علمی مضامین کی اشاعت پر زور دیا گیا جس سے زبان کو موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے وسعت ملی۔ عمدہ کتابوں پر تبصرے کیے گئے، یہ بھی ایک اہم کام تھا اور ادب اور انشا کی عصری صورت حال سے بحث کی گئی مسائل سے۔ بحث کی یہ کوشش بھی اردو شعر و ادب کے لیے فال نیک ثابت ہوئی۔ یہی وہ اخبار ہے جس کے صفحات پر مقفیٰ و مسجع نثر کے خلاف آواز اٹھائی گئی

> "جو تفاوت آورد اور آمد میں ہے وہ بخوبی دکھائی دیتا ہے۔ قافیہ بندی کی عبارت ایک آورد ہوتی ہے جیسے کوئی ایک بھاری لٹھے کو رسی باندھ کے زور سے کھینچتا لے جاتا ہو۔ یہ خوبی علم انشا کی، بغیر اس کے رشیائی خیالات اور رشیائی طرز تحریر کو نہ چھوڑا جاوے، حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ ہم سے اب تک وہ

---

* لکچرر شعبہ اردو، جوائنٹ ایڈیٹر "فکر و نظر" علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

خیالات دور نہیں ہوئے۔پس ہماری تمام تحریروں میں خواہ عربی میں ہوں خواہ فارسی وار دو میں، وہ نقص موجود ہیں مقفی و مسجع عبارت دو چار صفحات لکھ دینی کچھ بڑی بات نہیں ہے، مشکل کام مطلب نگاری ہے"(۲)

ایک شمارے میں اردو شاعری سے بے اطمینانی کا اس طرح اظہار کیا گیا :

"فن نظم جو ہر زبان کی جان اور زبان داں کا جوہر ہے، بہت ہی بدنما صورت میں نظر آتا ہے"(۳)

۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائیڈ ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم پنجاب کی تحریک پر لاہور میں انجمن پنجاب کے تحت موضوعاتی نظموں کو رواج دینے کی کوشش کی گئی تو انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے اس کی بھرپور حمایت کی ۔

"ہم نہایت خوش ہیں کہ آج کل ہمارے اس پرانے خیال کی تائید میں پنجاب کے لائق و فائق ڈائریکٹر بہادر کی توجہ سے ایک جلسہ خاص اسی مقصد سے ہوا کہ ہمارے ملک کی دیسی نظم کو ترقی دی جاوے اور اس کی اصلاح کی فکر کی جاوے ۔ ہماری دانست میں ہمارے ملک کی نظم کا گویا یہ دم اخیر تھا اور ایک رمق ہی باقی تھی کہ اس کی بقا کی فکر اطبا حاذق کو ہوئی ۔ کیا عجب ہے کہ یہ قریب المرگ سنبھل جاوے ۔اگر چندے اور ایسی ہی غفلت رہتی تو اس کا کام تمام ہوچکا تھا۔پھر اس کے حق میں کوئی تدبیر کیا موثر ہوتی"(۴)

ایک اشاعت میں مسرت کے ساتھ یہ اطلاع فراہم کی گئی کہ " ہم نے سنا ہے کہ ارباب کمال لکھنؤ نے بھی ایک خاص جلسے کی طرح ڈالی ہے جس کا نام مشاعرہ ہے ۔اس کا منشا یہ ہے کہ شعرائے لکھنؤ بھی اپنے وسعت خیال کو صرف انہیں معمولی مضامین میں محدود نہ رکھیں اور صرف اسی پرانی طرز پر نہ جمے رہیں جو اب تک ہند میں مروج ہے بلکہ وہ طرز جدید جس کے محرک مولوی محمد حسین صاحب آزاد ہیں، سب لوگ اختیار کریں اور ہر قسم کے مضامین نظم زبان میں ظاہر کرنے کا قصد کریں جس کے سبب سے اردو زبان بھی مثل اور زبانوں کے کارآمد اور مفید زبان ثابت ہو۔ ہمارے صاحب کار سپانڈنٹ کی رائے ہے کہ اب وہ مبارک وقت نزدیک ہوتا جاتا ہے کہ نظم اردو پر جو یہ طعن تھا کہ اس میں عام مضامین ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے وہ طعن رفتہ رفتہ ختم ہوجاوے ۔ پس ہم کو بھی اپنے صاحب کار سپانڈنٹ کی اس رائے سے اتفاق ہے اور ہم بھی اس وقت کو نہایت خوشی سے مبارک وقت کہیں گے جبکہ ہمارے ملک کے اہل زبان اپنی جودت طبع کو اپنی عمدہ زبان کے عزیز اور وسیع ثابت کرنے میں صرف کریں گے ۔ اگر نظر ہوش سے دیکھا جاوے تو فی الواقع زبان کی یہی خوبی نہیں ہے کہ معمولی عاشقانہ مضامین کے علاوہ اور کچھ اس میں نہ ملے ۔ بلکہ زبان کی خوبی یہی ہے کہ اس میں ہر طرح کے مضامین موجود ہوں ۔اگر عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، وغیرہ زبانوں کو دیکھا جاوے تو کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں ایسے خیال موجود نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے اس زبان کی خوبی ثابت ہوتی ہے۔ علی الخصوص نظم ہر ایک زبان کی ایسی ہی ہے ۔ بہ خلاف ہماری اردو زبان کے جس کی نظم میں سوائے معمولی مضامین کے اور نثر میں بیگانہ زبان کے ترجموں کے اصلی اور مفید مضامین سادہ اور فصیح طرز سے ظاہر ہی نہیں کیے گئے ۔ مگر مرحبا ہے مولوی محمد حسین صاحب آزاد کے اس خیال پر جنھوں نے اردو زبان کی وقعت قائم کرنے کے لیے ایک عمدہ تحریک فرمائی ہے"(۵)

اردو شاعری میں اصلاح کی ضرورت کا احساس سرسید کے بعض دیگر معاصرین کو بھی تھا ۔ ایسے حضرات کے تاثرات و خیالات کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے نمایاں طور پر شائع کیا۔ چنانچہ اس کے مختلف شماروں میں اس نوع کی بہت سی تحریریں ملتی

ہیں ایک مضمون کی چند سطریں ملاحظہ ہوں :

"اوائل ایام میں یورپ کی شائستگی اور تہذیب کی بنیاد شاعروں ہی نے ڈالی۔ ان کی تصانیف اگر مطالعہ کی جاویں تو کوئی ایسی نہ پائی جاوے گی جو قومی ہمدردی یا تہذیب اخلاق یا دیگر امور مفیدہ سے خالی ہو۔ یورپ کے مہذب اور شائستہ کرنے میں علاوہ مسلمانوں کی عالی ہمتی کے اس فرقے کا بھی بڑا حصہ ہے ان کی تصنیفات اور تحریرات تہذیب اخلاق کے جلسوں میں پڑھی اور سنائی جاتی تھیں۔ انہیں میں بعضوں کے اعلیٰ خیالوں نے ان کی قوم کو غلامی سے رہائی دلائی مگر افسوس کہ ہمارے ملک کی شاعری نے ہمارے زخموں پر نمک ہی کا کام دیا ان کے اشعار عموماً ناچ ورنگ کی محفلوں میں، قوالوں اور گویوں کے طائفوں میں، گداگروں، بھنگیوں اور بے نوشوں کے میلوں میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں۔ کسی شاعر نے قامت لمبی، زلف مشکیں، چشم نرگسیں کی تعریف میں مضمون آرائی کی۔ کسی استاد نے صراحی میں بادہ گلگوں، ساقی سیم تن کی توصیف میں عرق ریزی فرمائی۔ اگر کسی امیر سے کچھ مطلب ہوا تو ان کی خوشامدانہ اور زاید از حد مدح گوئی سے مٹی خراب کی۔ کسی سے ان بن ہوئی تو ہجو نامعقول سے اس کا خاکہ اڑایا۔ یورپ کی شاعری نے پندرھویں صدی سے آج تک جو وہاں کی قوموں اور سلطنتوں کو فایدہ پہنچایا ہے سارا جہاں دیکھ رہا ہے اور ہمارے شاعروں نے ہماری قوم اور سلطنت ہند کو جس حالت میں لا ڈالا، تمام عالم جانتا ہے" (۶)

یہ وہی نقطہ نظر ہے جو کچھ دنوں بعد نکھر کر اردو کی پہلی تنقیدی کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" میں سامنے آیا۔ شاعری کی سماجی اہمیت اور تاثیر کے پیش نظر اس سے زندگی کو سنوارنے اور اخلاق کو بہتر بنانے کی خواہش، لب و رخسار، بادہ گلگوں، ساقی سیم تن جیسے الفاظ کے استعمال، غیر ضروری تعریف، ہجو، نازک خیالی، استعارے اور مبالغے کو نامناسب قرار دینا اور اس قسم کے کلام کو تہذیب اور شائستگی میں بگاڑ کا سبب ٹھہرانا۔ شاعری سے متعلق یہ نقطہ نظر اپنی خامیوں کے باوجود، ان دنوں وقت کی آواز تھا۔ اس آواز کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مضامین بلکہ کتابوں پر لکھے گئے تبصروں میں بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ مثلاً

> "ہم نے اس مثنوی کو اکثر مقامات سے دیکھا، بلاشبہ اس میں عمدہ مضامین ہیں جن سے ہر قسم کی اخلاقی نصیحت، دینی و دنیوی، ظاہری و باطنی حاصل ہوتی ہے۔ نظم بھی صاف اور خوش ادا اور بحر بھی دلچسپ ہے۔ ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے زمانے میں لایق بزرگ اب اس قسم کی تحریروں پر متوجہ ہوئے ہیں۔ اگرچہ قدیم بزرگوں نے بھی اس طرز ادائے سخن پر جس طرح کہ اس مثنوی میں ہوا ہے، بہت کچھ لکھا ہے اور بہت ذخیرہ ہمارے لیے چھوڑا ہے مگر اردو زبان میں اس قسم کے مضامین کی نہایت کمی ہے"

ذکر ہے مولوی عبدالحکیم کی مثنوی "فکر حکیم" کا جو مولوی محمد حیات مہتمم مطبع ضیائی میرٹھ نے شائع کی تھی۔ مبصر کو مثنوی اس لیے پسند آئی کہ "اس میں عمدہ مضامین ہیں جن سے ہر قسم کی اخلاقی نصیحت دینی و دنیوی، ظاہری و باطنی حاصل ہوتی ہے"۔ اور اس پر مسرت کا اظہار کیا گیا کہ اس مثنوی کے مضامین سے "بہت کچھ فایدہ ہماری زبان اور ہمارے اخلاق کو پہنچنے والا ہے"۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایک شمارے میں محمد نعمت اللہ دہلوی نے شبلی کی مثنوی "صبح امید" کو ایک نئے طرز کی مثنوی بتاتے ہوئے لکھا :

"اس میں نہ کسی عاشق کا دو کھڑا ہے اور نہ کسی معشوق کا قصہ بلکہ اپنی کرنی اور اپنی بھرنی کا نمونہ ہے یعنی مدرستہ العلوم علی گڑھ کے قایم ہونے کی ایک مختصر تاریخ نظم میں ہے اور اسی کے ضمن میں قوم کے کرتوت جستہ جستہ بیان کیے ہیں مثنوی کا بے ساختہ مضمون اور اس کے الفاظ کی سادگی اور بندش کی روانی باوجود خدوخال کی تعریف اور مبالغہ آمیز باتوں سے خالی ہونے کے دل میں گھر کرتی ہے "(۸)

آخر میں تبصرہ نگار نے یہ دعا بھی مانگی کہ "اے خدا تو ہمارے ہاں کے کل شاعر بھائیوں کو یہ توفیق عطا کر کہ وہ اپنی اس پرانی بے ثمر شاعری کو چھوڑ کر اپنی قوت خیالیہ اور بیانیہ کو اس قسم کی تصنیفات میں صرف کریں جس سے قوم کو بھی نفع پہنچے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ایک اخبار تھا۔ اسے سائنٹفک سوسائٹی کے ترجمان کی حیثیت حاصل تھی۔ زبان و ادب کی براہ راست خدمت اس کے دائرے کار میں نہ تھی لیکن اس نے اپنے محدود دائرے میں رہ کر یہ کام بھی کیا۔ ادبی مسائل پر غور و فکر کی دعوت دی۔ نثر کی وسعت و اہمیت واضح کی۔ زبان کی ترقی میں سنجیدہ علمی مضامین کے کردار کا احساس دلایا، وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لیے ذہنوں کو آمادہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سادہ نثر لکھنے والوں کی ایک جماعت تیار کر دی۔

حواشی

(۱) انسٹی ٹیوٹ گزٹ جون ۱۸۷۷ء تک سائنٹفک سوسائٹی کے تحت شائع ہوتا رہا۔ جب سوسائٹی عملی طور پر معطل ہوئی اور اس کے ممبران کی تعداد گھٹ کر چار تک پہنچ گئی تو سر سید کی تجویز پر مدرستہ العلوم کی مجلس منتظمہ نے اس کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور یوں یہ اخبار مارچ ۱۸۹۸ء تک نکلتا رہا۔ (۲)۔ ہمارا علم ادب۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مع پروگرس۔ ۲۰ نومبر ۱۸۷۷ء (۳) تدبیر ترقی نظم۔ اخبار سین ٹیفک سوسیٹی۔ ۵ جون ۱۸۷۴ء (۴) ایضاً (۵)۔ اخبار سین ٹیفک سوسیٹی ۹۔۱ اکتوبر ۱۸۷۴ء۔ (۶) علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مع پروگرس ۵ فروری ۱۸۸۱ء (۷)۔ محمد حسن آزاد کی کتاب "آب حیات" شائع ہوئی تو اس کے حوالے سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی کہ جو تبدیلی کہ اس زمانہ میں اردو میں ہوئی، درحقیقت اردو زبان کے علم و ادب میں واقعہ عظیم ہے... زمانہ حال کی اردو نثر مضامین مفید اور دقیق مسائل اور علمی اور اصلی واقعات کے بیان سے مالامال ہے۔ (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۵ جنوری ۱۸۸۱) ۸۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۶ اپریل ۱۸۸۶

ذکیۃ الزہرا *

"عورت" ___ قرآن اور سنت کی روشنی میں

خداوند عالم اپنی کتاب ہدایت میں یہ ارشاد فرمارہا ہے کہ "اناھدینٰہ السبیل ۔اماشاکراواما کفورا" (سورہ الدھر ۔۳) گویا اگر ہدایت حاصل کی تو شکر کیا اور اگر نہیں حاصل کی تو کفر کیا۔ تمہارا کام ہدایت کا انتظام نہیں ہے بلکہ یہ اس کا کام ہے ۔ خداوند تعالی صاف لفظوں میں کہہ رہا ہے کہ ہمارا کام ہے کہ ہم ہدایت کا انتظام کریں تمہارا کام صرف اطاعت کرنا ہے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نے آخر ہماری ہدایت کا کیا انتظام کیا۔ تو قرآن پھر بڑھ کر پکارے گا اے رسول ان مسلمانوں سے یہ فرمادیجیے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو کیوں کہ ایسا کرنے سے خدا خود تم کو دوست رکھے گا"۔ (آل عمران ۔۳۱) ۔ اور کہیں یوں ارشاد باری ہورہا ہے کہ "یہ رسول تو تمہارے لئے بہترین نمونہ عمل ہیں ان کو دیکھتے جاؤ اور ان کی پیروی واتباع کرتے جاؤ"۔ (الاحزاب ۲۱) ۔

ان آیات کی روشنی میں چند اہم سوال اٹھ رہے ہیں ۔ خدا کا وعدہ ہے کہ اس نے ہدایت کی سبیل کی ۔یقیناً کی ۔لیکن، آخر خدا نے ہم عورتوں کے لیے کون سی سبیل کی؟ ان کے لیے کون سا نمونہ عمل ہے؟ یا ہم عورتیں اتنی جامع ہیں کہ انہیں ہدایت کے سلسلے میں کسی نمونہ کی ضرورت ہی نہیں ۔ یا پھر اسلام میں بھی ۔یہودیت اور عیسائیت کی طرح عورت کا کوئی مقام نہیں؟ اور اگر مقام ہے تو ہدایت کی ضرورت ہے تو پھر کوئی نہ کوئی نمونۂ عمل بھی ہو گا۔ کیا آج اسلام پر جو طرح طرح کے الزامات لگائے جارہے ہیں ان میں کوئی صداقت ہے؟ مثلاً (ابھی حال ہی میں) تسلیمہ نسرین جس کا کہنا ہے کہ اسلام میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں اس کے کوئی حقوق نہیں اور عورتوں کو حقوق دلانے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے اصول و قوانین کو بدل دینا چاہیے (کاش انہوں نے قرآن مجید کو غور سے پڑھا ہوتا تو اسلامی قوانین کو بدلنے کی بات نہ کہتیں بلکہ کہنا ہی تھا تو صرف حقوق زن کی بات اسلامی سماج میں کہتیں)۔ بہرحال تسلیمہ کے اس بیان پر آج مسلمان ان کے قتل کا فتوی دے رہے ہیں لیکن کیا ہم نے کبھی یہ غور کرنے کی کوشش کی کہ مسلمان خود اس کا کتنا ذمہ دار ہے ۔ کیا اس نے ایمان اور قرآن کے دامن کو چھوڑ نہیں دیا اور اپنے چاروں طرف کے معاشرے کو قبول نہیں کر لیا۔ اگر نہیں کیا تو بتائے کہ یہ جہیز کی علت کیسی نہ ملنے پر ظلم پہ آمادہ ہونا کیسا۔ آئے دن جہالت کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی عورت مرد کے ظلم کا شکار، یہ سب کیا ہے؟ اور یہی نہیں بلکہ مسلمان عورت کو چہار دیواری میں اور حرم میں قید رکھنا چاہتا ہے، عورت کو مسلمان نے بھی صرف ایک کھلونا بنالیا ہے ۔

---

* ایس ٹی ہائی اسکول، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

رسول نے تو "دختر کشی" کی رسم کو جڑ سے مٹا دیا۔ لڑکیوں کو جان سے مارنے کی ممانعت کی لیکن آج کا مسلمان فیوٹی سائیڈ (foeticid) پر دوسروں کی طرح عمل کر رہا ہے ۔ میں سمجھتی ہوں کہ شاید یہی وہ پس منظر ہے جو تسلیمہ جیسی ہستیاں جنم لے رہی ہیں ۔ شاید ہم مسلمان قرآن اور رسول کو فراموش کر بیٹھے ۔ ہم نے لفظ "ہدایت" تو یاد رکھا لیکن ہدایت کی "سبیل" کو بھول گئے ۔ ہم نے قرآن کو طاق کی زینت بنا دیا اور اس کو رٹ کر مقابلے تو جیت لیے، قاری تو بن گئے لیکن اس کے مطلب و معانی سے بے خبر رہے، اس کے نکتوں کو نہ سمجھ سکے کیونکہ ترجمان قرآن کے دامن کو چھوڑ بیٹھے ہیں ۔ افسوس ہے اس حالت پر کہ قرآن صامت کو سمجھ نہ سکے اور بھول گئے اور قرآن ناطق سے ناتا نہ جوڑ پائے ۔ قرآن مجید کی اس آیت پر جب نگاہ پڑتی ہے کہ جس میں خداوند عالم صاف لفظوں میں فرمارہا ہے کہ " اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں صاحب امر ہوں " (سورہ النساء ۔۵۹) یعنی اللہ کی اطاعت تو واجب ہے ہی اس کے ساتھ رسول کی اطاعت کرو اور صرف رسول ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی بھی اطاعت لازمی قرار دی جو صاحب امر ہیں ۔ لیجیے "اناھدیناہ السبیل" کی آیت بھی واضح ہو گئی یعنی اب صرف رسول ہی نہیں بلکہ اہل بیت رسول کی اطاعت بھی لازمی قرار پا گئی ہے ۔ (ظاہر ہے اہل بیت میں مخدرات عصمت بھی شامل ہیں) کاش ہم مسلمانوں نے قرآنی آیات پر عمل کیا ہوتا تو آج سماج کی یہ حالت نہ ہوتی ۔ بہر حال اگر ہمیں اسلامی سماج کو سمجھنا ہے اور مقام زن اور حقوق زن کو پرکھنا ہے تو قرآن اور رسول سے رجوع کرنا ہو گا۔

قرآن مجید میں ایک سورہ ہے سورہ توبہ جس میں خداوند عالم ارشاد فرمارہا ہے کہ : "ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں باہم ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہیں ۔ یہ لوگ اچھائی کا حکم دیتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں، نیز پابندی سے نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے اور خدا کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں" (سورہ توبہ : ۷۱)۔

ایک دوسری آیت ملاحظہ ہو : ویتوب اللہ علی المومنین والمومنات و کان اللہ غفور الرحیما" یعنی اللہ ایمان دار مردوں اور ایمان دار عورتوں کی توبہ قبول فرمائے گا خدا بڑا بخشنے والا بڑی مہربانی کرنے والا ہے "۔ (سورہ الاحزاب ۷۳) اس طرح کی ایک دو نہیں متعدد آیات قرآن مجید میں موجود ہیں جس میں ایمان دار مردوں کے ساتھ ایمان دار عورتوں (سورہ الاحزاب ۔ ۳۵) منافق مردوں کے ساتھ منافق عورتوں (سورہ توبہ ۔ ۶۷) اور مومن مردوں کے ساتھ مومن عورتوں کا تذکرہ ساتھ ساتھ موجود ہے اور کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ "مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ولی ہیں ۔ یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ادا کرتے ہیں ۔ نماز ادا کرتے ہیں ۔ زکوۃ دیتے ہیں اور خدا و رسول کی اطاعت کرتے ہیں " ۔ (سورہ توبہ ۔ ۶۷)

اس وقت جو یہ چند آیات اور ان کے تراجم جو آپ کے سامنے پیش کیے گئے وہ اس بات کی کوشش ہے کہ عورت کے مقام کا تعین کیا جا سکے ۔ عورت کی منزلت اور مرتبہ اور اس کے مقام کو قرآن و سنت کی روشنی میں اس طرح پیش کرنا کہ تاریخ سازی میں عورت کا کوئی بنیادی کردار ہے یا نہیں، وہ اس قابل بھی ہے کہ اس کا کوئی کردار ہو؟ نیز اسلامی نقطۂ نگاہ سے اور اسلامی تعلیمات کے حوالے سے اس مسئلہ کی حقیقت کیا ہے ؟ آپ کو یقیناً تعجب ہو گا اور خوشی بھی (جو ہم عورتوں کے لیے یقینی ہے) اگر یہ کہا جائے کہ تحقیقات و مشاہدات سے ثابت ہے کہ عورت خود بھی تاریخ ساز ہے اور مرد کی شخصیت سازی میں بھی موثر کردار انجام دیتی ہے ۔ اس مسئلے کے پیش نظر تاریخ سازی میں عورت کی بالواسطہ تاثیر ناقابل انکار ہے۔

جب ہم قرآن مجید کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ تاریخ مذہب و دین کے بنانے میں مرد و زن دونوں نے کردار

انجام دیے ۔ قرآن مجید حضرت آدم کے ذکر میں فرماتا ہے ۔ "ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو اور اس میں جو بھی چاہے کھاؤ پیو ۔ لیکن اس درخت کے نزدیک نہ جانا ورنہ نافرمان ہو جاؤ گے" (سورہ الاعراف ۔۱۹) غور فرمایا آپ نے ؟ آدم و حوا دونوں کے کردار کا ذکر ہے ۔ یہ نہیں کہ حضرت آدم کی حیثیت حقیقی ہے اور جناب حوا کی اضافی بلکہ خداوند عالم کے خطاب میں دونوں موجود ہیں ۔ اس کا علم دونوں کو ہے ۔ شیطان نے "ازلھما" یعنی وسوسہ بھی دونوں ہی کے دلوں میں ڈالا ۔ (سورہ الاعراف ۔۲۰)

ابراہیم کے قصے میں جب قرآن مجید حضرت ابراہیم اور حضرت سارہ کے بارے میں گفتگو فرماتا ہے تو سارہ کے ذکر میں بھی اسی ادب و احترام کو ملحوظ رکھتا ہے جب ابراہیم خلیل اللہ کا ذکر کرتا ہے یعنی جب فرشتوں نے نازل ہو کر ابراہیم کو صاحب اولاد ہونے کا مژدہ دیا تو ابراہیم کے کانوں کی طرح سارہ کے کانوں نے بھی ان کی آواز سنی ۔ جس کے جواب میں انہوں نے کہا "میں اس بزرگ سن میں ماں بنوں گی جبکہ میرا شوہر بھی عمر رسیدہ ہے" ؟ (سورہ ھود ۔۷۲ ۔۷۱) تو فرشتے سارہ سے بھی اسی طرح ہم کلام ہوتے ہیں جیسے وہ حضرت ابراہیم سے مخاطب ہوئے ۔ کہتے ہیں "کیا تم اللہ تعالیٰ کے امر سے متعجب ہو ۔ خدا کی رحمتیں ہوں تمہارے خاندان پر" ۔ (سورہ ھود ۔۷۲) ۔ پھر جب مادر موسیٰ کا ذکر ہوتا ہے خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے "ہم نے مادر موسیٰ کو وحی کی کہ اپنے بچے کو دودھ پلاؤ اور جب تمہیں اس کے بارے میں کوئی خوف ستائے تو اس کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دینا ۔ ہم اسے تمہارے پاس واپس لائیں گے اور اسے اپنا پیغمبر بنائیں گے" (القصص ایت ۷ ۔۶) واقعہ سب کو معلوم ہے ، موسیٰ کی پرورش ہو رہی ہے اپنے ہی دشمن کے محل یعنی فرعون کے یہاں ۔ کون پال رہا ہے ، آسیہ ۔ ایک عورت ، ایک پیغمبر کی پرورش و پاداش اور اس کی حفاظت ایک عورت کر رہی ہے ، عورت بھی کون فرعون کی بیوی ، سبحان اللہ کیا کہنا آسیہ کا ۔ کیسی آزاد طبع اور باہمت خاتون تھیں اور کتنی عظیم شخصیت ۔

عورت کارگاہ ہستی میں ایک اہم کردار ہے ۔ اس کو خدائے قدوس کی صنعت کا بہترین شاہکار قرار دیا گیا ہے ۔ عورت دنیا کی زینت ، قوموں کی عزت ، رازدار حقیقت ، محافظ شریعت اور رمز اخوت ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ تخلیق و تعمیر انسان کا گہوارہ اولین ہے ۔ اسی کی گود میں پل کر انسان انسانیت کے درجہ کمال پر فائز ہوتا ہے اور بلکہ اگر میں یہ کہا جائے کہ "رسالت" نے اسی کی گود میں آنکھیں کھولیں ، نہ صرف آنکھیں کھولیں بلکہ پروان چڑھی ۔ امامت اسی گود میں پلی بڑھی ، اور یہی نہیں بلکہ کربلا میں امامت (نسل رسول) کی محافظ ، امامت کو بچانے والی یہی عورت ہے ۔ کربلا کے واقعات کے پیش نظر امام حسین ، نواسہ رسول کو دوسرا بانئی اسلام کہا جاتا ہے ۔ (ملاحظہ کریں ۔ فاضل و محقق مولانا الحاج سید سبط الحسن ۔ "امام حسین دوسرے بانی اسلام" ایک تحقیقی مقالہ ۔ طبع میرٹھ ۔ بار اول جنوری ۱۹۷۰ء) اگر حضرت زینب کے کردار کو کربلا کی تاریخ سے الگ کر دیں تو کربلا کی تاریخ مکمل ہو سکتی ہے ؟ نہیں ، حسین کا مشن بغیر مخدرات عصمت کے پورا نہیں ہو سکتا ۔

بہر حال ان چند مثالوں سے پتہ چلا کہ عورت خود اپنا مستقل وجود رکھتی ہے ۔ حقوق کے لحاظ سے مرد یا عورت کسی ایک کو دوسرے پر برتری نہیں ہے ۔ اسلام میں اس حقیقت کو باور کرایا گیا ہے کہ دونوں کا ایک دوسرے پر حق ہے ۔ کیونکہ ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں باہم ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہیں ۔ اللہ نے دنیا بنائی ، حضرت آدم کا پتلا تیار ہوا وہ ساتھ ہی حوا کا بھی ۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ تنہا آدم اس دنیا کی زینت کے لیے (استغفر اللہ) ناکافی تھے ۔ ابوالبشر حضرت آدم دنیا میں آ گئے برسوں فراق حضرت حوا میں روتے رہے ۔۔۔ دنیا کو آباد نہ کر سکے جب تک کہ حوا آپ کو نہ مل گئیں ۔ ہمارے

ایک ہاتھ میں قرآن ہے تو دوسرے ہاتھ میں سنت حق۔ یہ بات روز روشن کی طرح ہے کہ قرآن اور سنت حق نے عورت کا کس قدر احترام کیا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا نے عورت کو وہ اعزاز دیا جو مردوں کو نہ ملا، تو چونکئے گا نہیں۔ قرآن مجید میں ایک سورہ کی سرخی ہے "النساء"؟ کوئی مرد مجھے بتائے کہ "رجال" کے عنوان سے کوئی سورہ قرآن میں نازل ہوا؟ نہیں، پورا قرآن دیکھ ڈالیے کوئی سورہ اس عنوان کی موجود نہیں، اس مقام پر اگر کوئی یہ کہے کہ کیوں نہیں۔ "سورہ ابراہیم"، "سورہ یوسف"، "سورہ یونس" اور "سورہ محمد" وغیرہ جو ہیں یہ مردوں کے نام کی سورتیں ہی تو ہیں، تو میرا جواب ہے۔ ہاں ہیں، مگر یہ خاص خاص اشخاص کے نام کے ذیل میں ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو قرآن نے اس سلسلے میں بھی عورت کے ساتھ ناانصافی نہیں کی ہے، ایک خاص خاتون کے نام سے بھی سورہ موجود ہے جس کا نام "سورہ مریم" ہے

مرد اور عورت میں جنس، طبیعت اور فطرت کے لحاظ سے اختلاف ہو تو ہو مگر یہ ماننا پڑے گا کہ خلقت اور عمل میں دونوں یکساں ہیں۔ اس کے ثبوت میں خلاق عالم ہی کا ارشاد ملاحظہ ہو جس کا ترجمہ ہے کہ "اے انسانوں اس اللہ سے ڈرو جس نے تمہیں ایک نفس واحدہ سے خلق کیا" (سورہ النساء۔۱)۔ ظاہر ہے لفظ "ایھا الناس" میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ اگر دنیا والے فطرت کا یہ اصول تسلیم کرلیں تو آئے دن جو سننے کو ملتا ہے مرد کی بالادستی کا خود ساختہ جھگڑا ہی ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے۔ الغرض معلوم ہوا کہ خلقت کا مرکز دونوں کا ایک ہی ہے یعنی نفس واحدہ۔ اب رہا عمل تو ارشاد رب العزت ہو رہا ہے کہ "مرد اور عورت میں سے جو بھی نیک عمل کرے اور مومن ہو ہم اسے پاکیزہ زندگی دیں گے اور بہت اچھی جزا؟ دیں گے" (سورہ نحل۔۹۷)۔ اگر ہم قرآن شریف کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ جہاں اللہ نے انبیاء پر "وحی" نازل کی ہے وہاں ایک نبی کی ماں پر بھی "وحی" نازل کی۔ حضرت موسی کی مادر گرامی کو یوں وحی ہوتی ہے جس میں حضرت موسی سے خطاب ہے "جس وقت ہم نے تمہاری والدہ کی طرف وہ وحی کی تھی جو اب بھی وحی کی جاتی ہے کہ اس کو ایک صندوق میں ڈال دو" (سورہ طہ۔۳۸ دیکھا آپ نے اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم اس بات کی تصدیق کر رہا ہے کہ اس نے مادر موسی پر وحی نازل کی۔ کیا کہنا منزلت مادر موسی کا کہ جن پر خدا نے وحی نازل کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک نبی کی ماں وہ خاتون ہیں جنہیں خدا نے مقدس مقام کی خدمت کے لیے قبول کرلیا۔ جن کے لیے جنت سے خوان نعمت آیا، جن سے فرشتہ کلام کرتا ہے اور جن کا خدا اصطفی کرتا ہے یعنی منتخب کرتا ہے۔ چند برگزیدہ ہستیوں میں، جیسے حضرت آدم، حضرت نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کا اصطفی کرتا ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کس برگزیدہ خاتون کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔ وہ خاتون ہیں حضرت عیسی کی مادر گرامی حضرت مریم سورہ آل عمران۔۳۷۔۳۶)۔ سورہ آل عمران کی چھتیسویں آیت اور اس کی تفسیر سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ گرامی نے جب وہ حاملہ تھیں نذر کی تھی کہ جب بچہ پیدا ہوگا تو وہ اسے عبادت گاہ یعنی بیت المقدس قبلہ اول کی خدمت کے لیے وقف کردیں گی، مگر جب حضرت مریم پیدا ہوگئیں تو مادر مریم نے تعجب کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ صرف لڑکا ہی عبادت گاہ کی خدمت کرسکتا ہے مگر اس کے بعد کی آیت یعنی سینتیسویں آیت اور اس کی تفسیر سے پتہ چلتا ہے کہ خدا نے حضرت مریم ہی کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے قبول فرما لیا اور حضرت مریم نے اس عبادت گاہ کی خدمت کی تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک عورت بھی اس عہدہ کو سنبھال سکتی ہے (یا یوں کہوں کہ لڑکی اور لڑکے میں کوئی فرق نہیں) اور پھر حضرت مریم وہ ہیں جن سے فرشتہ کلام کرتا ہے اور خدا انہیں مقام اصطفی عطا کرتا ہے۔ ارشاد رب العزت ہو رہا ہے (ترجمہ) جب فرشتوں

نے کہا "اے مریم یقیناً اللہ نے تم کو چن لیا اور تم کو پاک قرار دیا اور تمام زمانے بھر کی عورتوں سے برگزیدہ کیا" ۔ (سورہ آل عمران ۔ ۴۱) ۔ مختصر یہ کہ اللہ کے نزدیک انبیاء کی صورت میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ ایک صالح خاتون بھی اس مقام کو پالیتی ہے جہاں اس پر وحی ہوتی ہے ۔ فرشتہ کلام کرتا ہے اور اسے خدا عبادت گاہ کی خدمت کے لیے قبول کرلیتا ہے ۔ اللہ عادل ہے اس کی بارگاہ میں ،میدان عمل میں عورت اور مرد دونوں برابر ہیں

بے شک تاریخ مذہب و دین کے بنانے میں مرد و زن دونوں کے کردار یکساں ہیں ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد نبوی کے ابتدائی دنوں میں اسلام نے دو افراد کی وجہ سے قوت و قدرت پائی ۔ ایک رسول خدا اور دوسری نمایاں شخصیت حضرت خدیجہ الکبری کی تھی ۔ ان دونوں نے اسلامی تاریخ بنانے میں بڑا فعال اور موثر کردار انجام دیا ۔ اگر اس عظیم خاتون کی فداکاریاں نہ ہوتیں اور وہ نبی کی اپنے مال اور اپنی عظیم شخصیت سے مدد نہ کرتیں تو اسلام اس سرعت سے ترقی نہ کرسکتا ۔ یہی وجہ تھی کہ حضور سرور کائنات اپنی عمر کے آخری لمحہ تک جب کبھی حضرت خدیجہ کا ذکر آتا اشک بار ہوجاتے ۔ پس تاریخ اسلام ایک ایسی تاریخ ہے جسے مرد اور عورت دونوں نے اپنے اپنے حدود میں رہتے ہوئے بنایا ہے لیکن دوسری طرف جب ہم اپنی زندگی میں : سہی اپنی ،بلکہ اپنے معاشرے میں ،رسالوں میں ،اخباروں میں، آپس کی میٹنگس میں پڑھتے ، دیکھتے اور سنتے ہیں کہ "عورت" نام ہے مظلومیت کا ۔ عورت کا ماضی محکومی اور مجبوری کی تاریخ ہے ۔ اور مرد حاکم ۔جبر واستبداد کرنے والا ۔ عورت کے حقوق کو پامال کرنے والا ۔ حالانکہ یہ جبر و محکومی دین اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے کیونکہ خلاق عالم نے عورت و مرد کا رشتہ غلام و آقا کا نہیں بتایا، بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے سرپرست ،معاون و مددگار اور شریک کار ہیں ۔ ان کا باہمی رشتہ رقابت یا استحصال کا نہیں بلکہ رفاقت کا ہونا چاہیے اس لیے کہ دونوں کا ایک ہی راستہ ہوتا ہے ۔ مومن مرد اور مومن عورت کا فلسفہ حیات اور راہ عمل ایک ہی ہے ۔ اور وہ راستہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے ۔ صاحب ایمان عورت ظلم کے آگے سر تسلیم خم کرنے والی اور معاشرے کی برائیوں سے سمجھوتہ کرنے والی ہستی نہیں ہے ۔ بلکہ اس کا راستہ ظلم کے خلاف قیام کا اور برائیوں کے خلاف جہاد کا راستہ ہے ۔ اسے حق کے راستے کا سپاہی ہونا چاہیے ۔

ہم اپنی نجی زندگی میں عورت کے محض چار روپ جانتے ہیں بیٹی ، بہن ، بیوی اور ماں ۔ لیکن ان حیثیتوں میں اور ان کے علاوہ بھی وہ زن مبارز ہے یہ روپ اسے اسلام نے عطا کیا ہے ۔ اسلام نے جن خواتین کو دنیا کے سامنے مثال بنا کر پیش کیا وہ سر جھکانے والی نہیں بلکہ کافرانہ اور جاہلانہ روایات کو پامال کرنے والی خواتین ہیں ۔ حضرت خدیجہ الکبری نے جناب رسالت مآب سے شادی کے بعد ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی بتوں کے سامنے سر نہیں جھکایا ۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں بت پرستی کی حکومت ہو وہاں ایک خاتون جو اس طبقے سے تعلق رکھتی ہو ، جسے زندہ دفن کر دیا جاتا ہو وہ اتنی جرات کا مظاہرہ کرے کہ کبھی بتوں کے آگے سر نہ جھکائے ۔ غرض ایسے معاشرے میں جو شاید پوری تاریخ میں عورتوں کے لیے بدترین معاشرہ تھا جس میں عورت غلامی کا شکار تھی ،ایک ایسی ہستی پیدا ہوتی ہے جو تاریخ انسانی کی آزاد ترین خاتون ہیں ۔

پروفیسر مسعود الرحمن خاں ندوی *

صیہونی ادب میں فلسطینیوں کی تصویر

ڈاکٹر محمود حمیدہ نے "عربوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے صیہونی ادب کی حکمت عملی" کے موضوع پر عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ، کے شعبہ عربی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری امتیازی درجہ میں حاصل کی۔ محمود خشبہ نے ان کے تھیسیز پر مفصل رپورٹ ہفتہ وار "العالم الاسلامی" مکہ مکرمہ کے دو شماروں (نمبر ۱۳۱۱، بتاریخ ۱۰-۱۶ مئی ۹۳ صفحہ ۸-۹ اور نمبر ۱۳۱۳، ۲۰ جون ۱۹۹۳ء صفحہ ۸-۹) میں شائع کی۔ اس رپورٹ کی معلومات اور اقتباسات کی روشنی میں یہ تاثرات سپرد قلم کیے گئے ہیں۔

صیہونی ادب عام طور پر عربوں اور خاص کر مسلم عرب فلسطینیوں کو انسانی فطری صفات سے مجرد (De-humanize) کرکے ان کی ایسی بگڑی، گندی، گھناؤنی تصویر پیش کرتا ہے کہ وہ اتنے کم درجہ کی مخلوق معلوم ہوں جن کو عام انسانوں کی طرح حقوق و تحفظات حاصل نہ ہونا چاہیے تاکہ ان کے ساتھ کیا جانے والا غیر انسانی، وحشیانہ برتاؤ اور ظلم و زیادتی کسی کے ضمیر پر بوجھ نہ بنے۔ صیہونی ادباء و مفکرین کی ان سوچی سمجھی کوششوں سے یہودیوں کی وہ نسل تیار ہوئی جو عربوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں۔ جیسا کہ ۱۹۸۳ء میں سیکنڈری درجات کی فلسطینی طالبات کے اسکولوں میں ان کو بانجھ کرنے والی زہریلی گیس چھوڑنے کے انسانیت سوز واقعہ اور اس پر اسرائیلی ذمہ داروں کے وحشیانہ ردعمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے خلاف مظاہرہ کرنے والے فلسطینی طلبہ کی سنگ باری کے جواب میں اسرائیلی چیف آف جنرل اسٹاف جرنل رفائیل ایتان نے حکم دیا تھا کہ ان طلبہ کے خصیے کاٹ دیے جائیں تاکہ وہ مرد ہی نہ رہ پائیں۔ جب اسرائیلی کنیسٹ کے ایک رکن نے اس خبر کی تصدیق چاہی تو انہوں نے باصرار کہا کہ ہر سنگ باری کے جواب میں ہم دس یہودی کالونیاں بنائیں گے تاکہ پھر فلسطینیوں کو سنگ باری کا موقعہ ہی نہ ملے، بلکہ وہ شیشیوں میں بند کیڑوں کی طرح ایک دوسرے کو کھا جائیں۔

عبرانی ادب کی فکری بنیادوں کی جڑیں صیہونی مفروضات۔ یہودی قوم کی برتری، سامی نسل کے خلاف انسان دشمنی کا واویلا، فلسطین کی تاریخی ملکیت کا دعوی، جلا وطنی (Diaspora) کی داستان، افتادہ زمین اور متروک کھیتوں کے کھو کھلے دعوے وغیرہ دیگر فرضی داستانی اوہام و خرافات سے جڑی ہوئی ہیں۔ اور ان دعووں کے جواز اور اثبات کے لیے ادبی میدان میں بھی شعوری طور پر پوری کوشش جاری رہی ہیں اور جن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ فلسطین کو عرب اقتدار کے تحت ایک

---

* سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پست اور بگڑا ہوا علاقہ ثابت کیا جائے۔ مشرق میں مغرب کے نام نہاد استبدادی دور کی طرح، فلسطین میں صیہونیت کو تہذیب و ترقی اور ثقافت و تمدن کا نقطہ آغاز بتایا جائے، اور مسلم عرب فلسطینیوں کی ہر صفت و خوبی کو نظر انداز کر کے ان کی ایسی وحشتناک مکروہ تصویر پیش کی جائے جس سے ان کی مکاری و فریب کاری، خیانت و خباثت، بزدلی و کم ظرفی کے ساتھ حیوانی صفات کا نقش بھی دلوں پر جم جائے، تاکہ نئے آباد کیے ہوئے یہودی مہاجرین کے دل میں ان کے لیے انسانی ہمدردی ہی نہ ہو بلکہ ان کے ساتھ حیوانی برتاؤ کرنے میں ان کو کوئی احساس گناہ بھی نہ ہو۔ صیہونی ناول نگار اسرائیل زینگویل کے الفاظ میں "Soil with out people of the people without land" (یعنی بغیر قوم کی سرزمین، اس قوم کے لیے جس کے پاس زمین نہیں) کا خواب پورا ہو۔

ریزاڈومب (۱۹۱۱۔ ۱۹۴۸ء) نے اپنی کتاب "عبرانی نثری ادب میں عرب" سات اسرائیلی کاتبوں کے آٹھ ادبی نمونوں کا مطالعہ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صدی کی ابتدائی دور میں بھی پاک و صاف ادبی تخلیقات میں عرب اسلامی فلسطینی کردار کا تصور اسرائیلی صیہونی فکر و تخیل سے مختلف نہ تھا۔ جیسا کہ موشیہ سمیلانسکی (۱۸۷۴۔ ۱۹۵۳ء) (جو خواجہ موسی کے نام سے مشہور ہے) کے درج ذیل اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے۔ اس نے اپنی خود نوشت سوانح میں یافا سے ریشون لیستون کالونی جاتے ہوئے پہلی بار جب عربوں کو دیکھا، تو وہ ان کو وہاں پا کر پریشان، فکر مند اور غصہ ہوا۔ اس نے لکھا ہے :-

> "یہ عرب یہاں کیا کر رہے ہیں؟ یہ فقیر اور گندے کیوں ہیں۔ جبکہ ان کے گاؤں کے آس پاس کی زمین بار آور و زرخیز ہے؟ ... یہ وحشی ہیں، زمانہ امن میں خوش رہتے ہیں، لیکن جب برانگیختہ ہوتے ہیں تو قاتل بن جاتے ہیں .... بھوکے فقیر آدمی کے ساتھ اپنی سوکھی روٹی بھی بانٹ لیتے ہیں، لیکن جو چیز حاصل کرنا چاہیں اور اس کو حاصل نہ کر سکیں تو قتل کر بیٹھتے ہیں۔"

یعنی کاتب یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ عرب نہ زمین کی ملکیت کے اہل ہیں، نہ وہ اس پر کاشت کر سکتے ہیں۔ قصہ "عائشہ" میں وہ ایک فلسطینی بوڑھے عبداللہ بن شیخ کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

> "چھوٹا قد، بدصورت، بے غیرت اور نفرت و کراہیت سے بھری ہوئی بدروح، اس کے جذباتی احساسات پست، پیسوں کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہے، ان کو شمار کرتا رہتا ہے، قابل اعتبار نہیں ہو سکتا، نہ اپنا وعدہ کبھی پورا کرتا ہے، جو شخص بھی اس کی راہ میں حائل ہو اس کے لیے اس کے پاس فقط نفرت ہے۔"

اسحق شامی (۱۸۸۹۔ ۱۹۴۹ء) "بطریق کا انتقام" میں ایک مسلم عرب فلسطینی کی تند مزاجی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

> "دھیرے دھیرے اپنی صدری کے بٹن توڑنے لگا، چوغہ کے نیچے چھپی ہوئی موٹی گردن کے آس پاس لپٹے ہوئے رومال کو اتارنے لگا، تو اس کا سیاہ رنگ سینہ دکھائی دیا۔ اس کے کالے بال لمبے، سخت، اور الجھے ہوئے تھے.....اس وقت اس نے اپنے بے ڈول بدن کو گیلری میں کھلنے والے دروازہ کی طرف موڑا۔"

اور بدوؤں کے تشدد و بدمزاجی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

> "صحرا کی خشکی اور سورج کی تمازت ان کے سانولے رنگ، جھری زدہ چہروں اور مزاج کی حدت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی طوطے جیسی ناکیں، سر کے رنگین رومالوں میں سے پرندوں کی تیز چونچوں کی طرح

ابھری رہتی ہیں۔ اور آنکھیں ایسی شرر بار گویا کہ آگ سے نکلی ہوں۔"

اسرائیل زراحی (۱۹۰۹۔۱۹۴۲ء) "سلوان کاؤں" میں ترکوں اور برطانوی فوجوں کے درمیان معرکوں کے دوران ایک گاؤں کے عرب باشندوں کی سفاکی، بے رحمی اور جرائم پیشہ زندگی کے بارے میں لکھتا ہے۔

"قریبی گاؤں کے عرب، مقتولین کا ساز و سامان چھیننے، مردوں کے مال و متاع کی چوری کرنے کے لیے آگ میں گھس جاتے ہیں، انگوٹھی والی انگلی کاٹ لیتے ہیں، سونے کے دانت منہ سے نکال لیتے ہیں۔"

روزنامہ "الاھرام" کے مرکز مطالعات سیاسی و حکمت عملی کے مدیر جناب یسین کے خیال کے مطابق عرب اسلامی فلسطینی شخصیت و کردار کے بارے میں اسرائیلی ایک تصویر نہیں بلکہ تین تصویریں پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ بوبری تصویر ــــ جو مارتن بوبر کی طرف منسوب ہے۔ یہ عربوں کے بارے میں معتدل نظریہ کی قائل تھی۔ ان کے وطن سے بے وطن کیے جانے کے تاریخی ظلم کا اعتراف کرتی تھی۔ فلسطینی زمین پر فلسطینیوں کے کامل حقوق کے قائل نہ ہونے کے باوجود ان کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنے کی دعوت دیتی تھی۔ مگر یہ رجحان یہودی روشن خیالی کے چند تاریخی لمحات کی یادگار بن کر رہ گیا ہے۔ ۲۔ بن گوریئنی تصویر ــ جو بن گورین کی طرف منسوب ہے۔ اس کا یقین ہے کہ عرب صرف طاقت ہی کی زبان جانتے ہیں، اس لیے ان کے ساتھ صرف طاقت کی زبان ہی استعمال کی جانی چاہیے۔ یہ تصویر صرف اسرائیل کے روایتی منتخب طبقہ کی ترجمانی ہی نہیں کرتی بلکہ ان کی وسعت پسندی اور دہشت گردی پر مبنی ظالمانہ صیہونی منصوبہ بندی کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ ۳۔ وایزمینی تصویر ــ جو وایزمین کی طرف منسوب ہے، اور یہ بھی ظلم و زیادتی پر مبنی سابق بن گوریئنی تصویر سے کم ظالمانہ نہیں ہے۔

ان کے علاوہ اسرائیل کے معاصر اعلی طبقہ کا خیال ہے کہ عرب شخصیت کی گھٹی میں ظلم و زیادتی رچی بسی ہے۔ وہ جنگ وجدال پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ خود اسلام کی جنگجویانہ صفت ہے کیونکہ اس نے مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے لوگوں پر فوقیت دی ہے۔ عربوں کی جذباتیت کی وجہ تہذیبی کمزوری ہے۔ وہ شخصیت کے بحران سے بھی دوچار ہیں، اس لیے ان کو نامرادی کا احساس گھیرے رہتا ہے۔ یعنی وہ اسرائیلی عقل پسندی کا مقابلہ عربی جذباتیت، یہودی امن پسندی کا مقابلہ عربوں کی ظلم و زیادتی کی خصلت، اسرائیلی ترقی کا مقابلہ عربوں کی پستی اور اسرائیلی حقیقت پسندی کا مقابلہ عربی وہم پرستی سے کرتے ہیں۔ ان اسرائیلی علما کے خیال میں عرب شخصیت جمود و ہٹ دھرمی کا شکار ہے اور وہ فطری کمزوریوں کی وجہ سے اپنی منفی صفات پر قابو پانے کی اہل نہیں ہے۔ اسرائیلی رائے عامہ اگرچہ عربوں کے مسائل کو قابل اعتنا نہیں سمجھتی، لیکن ان کی طرف سے شکوک و شبہات میں بھی مبتلا رہتی ہے۔ اس لیے عربوں کے خلاف سخت پابندیوں اور ظالمانہ اقدامات کی انتقامی سیاست کی تائید کرتی ہے، کیونکہ اس کے نزدیک اسرائیل کے وجود و بقا کو عربوں کے انسانی حقوق پر بہرحال ترجیح حاصل ہے، بلکہ وہ فلسطینی پناہ گزینوں کے حقوق کی منکر ہے۔ اکثریت کے خیال میں عرب کاہل، کند ذہن، اسرائیل سے نفرت کرنے والے، سنگدل خائن و بزدل ہیں اور اسرائیلیوں کے مقابلے میں ہیچ اور پست حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود حمیدہ نے اپنے پی ایچ ڈی مقالہ میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۷ء تک کے اسرائیلی افسانہ نگار ادیبوں کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے اور ان تحریروں سے ابھرنے والی تصویر اور واقعی صورت حال کے درمیان مقابلہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ یہ

تحریریں فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلی حکام کے دہشت گردانہ اقدامات میں بڑی حد تک معاون ہوتی ہیں۔ ان تحریروں میں فلسطینی عربوں کے خارجی مظہر، جسمانی ساخت، ہر ہر عضو ــــ چہرہ، آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پیر، قدم کی جو مکروہ تصویر کشی کی گئی ہے ڈاکٹر حمیدہ نے اس کی تفصیلی مثالیں پیش کی ہیں۔ جیسے چہرہ کی جھریاں، پیلاپن، مردنی، جمود، بے وقوفی، مسکراہٹ، حقارت، کند ذہنی، مکاری، آنکھ کا بوجھل پن، ورم، شرارت، خوف، شرانگیزی، شعلہ باری، دانتوں کی گندگی، بھیڑیے اور لومڑی کے دانتوں جیسی خونخواریت۔ ہاتھوں کی سختی و کرختگی، سوکھاپن، جھریاں، غیر معمولی حجم، وحشیانہ حرکتیں، ننگے پیر وغیرہ۔ پھر طبیعت و مزاج سے متعلق ان ادیبوں کی تحریروں میں فلسطینی شخصیت خون کے پیاسے جنگلی جانوروں کی طرح ابھرتی ہے، تاکہ اسرائیلی فوجیوں کی انتقامی اور ظالمانہ کارروائیوں کے لیے ذہن تیار رہیں۔ یہ فلسطینی بچوں تک کے بارے میں خوفناک تصویر کشی ایک معمول کی بات معلوم ہوتی ہے جیسے کہ س۔ یزہار کے قصہ "ویرانہ" میں ایک یہودی نے عرب بچے کے بارے میں شلومو اور یہودا کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ "وہ بڑا ہوکر زہریلا سانپ بنے گا"۔ یوسف اریکا کے قصہ "ایک رات کا منظر" میں فلسطینی جانبازوں کے ایک گروہ کی وحشیانہ تصویر کے آخر میں لکھا گیا۔ "ان میں ایک بچہ تھا، مگر وحشی آدمی کی طرح معلوم ہوتا تھا"۔ اور مردخای طبیب کے قصہ "موسیٰ کا ستارہ" میں یہودیہ پر حملہ کرنے والے بچوں کو "مزاج کے اعتبار سے وحشی" کہا گیا ہے، نیز ان کو موسیٰ کے قتل کا سبب بتایا گیا ہے۔ اسی طرح اریکا کے قصہ "ایک رات کا منظر" میں اہارون جلعادی یہودی پر حملہ کرنے والوں میں وہ "ایک بڑا غیرت مند قاتل بچہ تھا۔" نیز ناتان شاحم کے قصہ "راستہ کی دھول" میں چند عرب نوجوانوں نے کفتورفیتس یہودی کی موٹر کار کو روکا تو "ان میں سے ایک نوجوان جھکا، پتھر اٹھایا اور زور سے موٹر کی طرف دے مارا"۔ اس طرح ناتان شاحم نے نہ صرف عرب بچوں اور نوجوانوں کی جنگجویانہ طبیعت کو نمایاں کیا، بلکہ یہودی کفتورفیتس کی اس غیر انسانی وحشیانہ حرکت کو چھپانے کی کوشش کی کہ وہ ایک عرب نوجوان کو اپنی موٹر سے کچل چکا تھا۔

اس کے علاوہ عرب فلسطینی جانبازوں کو ان ادیبوں نے چور، ڈاکو، گھس پیٹھیا اور غنڈہ گروہوں کے افراد زیادتیاں کرتے ہوئے دکھایا ہے، اور گرفتاری کے بعد ان کی بزدلی، ذلت و حقارت کو نمایاں کیا ہے۔ انہوں نے فلسطینیوں کے مذہبی مقدس اعمال جیسے نماز، روزہ، حج اور مساجد کو بھی تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ عام طور پر ان ادبی تخلیقات میں فلسطین میں عرب ـ یہودی تعلقات کا تصور غائب ہے۔ فلسطینی قوم کے وجود اور ان کے قانونی حقوق کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ان کا ذکر ہمیشہ فلسطین میں یہودی زندگی کے حاشیہ و کنارہ پر بہت ملست ضمنی طور پر آتا ہے۔ کیونکہ ان کا اصل مقصد کسی نہ کسی طرح ان کے نزدیک اس عجیب و غریب مخلوق سے چھٹکارا ہے۔ بعض صہیونی ادبی تخلیقات میں قصداً یا بلا قصد فلسطینیوں کے حق، اس کے لیے ان کی مسلسل جد و جہد اور اس جد و جہد کے نتیجہ میں نئی عرب فلسطینی شخصیت کے ظہور کی پیشگوئی کا ذکر بھی آیا ہے۔ ڈاکٹر محمود حمیدہ کے خیال میں یقیناً وہ اسلامی فلسطینی شخصیت ہوگی جو دہشت گردی اور اسرائیلی ظلم و زیادتی کے سامنے سپر ڈالنے والی نہ ہوگی، بلکہ سابقہ تجربوں سے بھرپور، چھنے ہوئے وطن کی واپسی کے لیے پکارنے والی شخصیت ہوگی، جس کی پکار کسی ہنکائے ہوئے جانور کی پکار کی طرح نہ ہوگی، بلکہ وہ اس شیر کی دھاڑ کی طرح ہوگی، جس کو درد و تکلیف مزید جد و جہد اور سعی پیہم پر ابھارتی ہے۔

محمد زکریا ورک *

نئی سائنسی ایجادات

امریکہ میں عنقریب کاروں میں ایسے جدید کمپیوٹر نصب کیے جائیں گے جن کی مدد سے ڈرائیور اپنا راستہ بغیر کسی کاغذی نقشہ کے بآسانی تلاش کر سکیں گے ایسے کمپیوٹر ایک اجنبی کو نئے شہر میں اس کے جائے قیام اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے مختلف سڑکوں کی نشان دہی آسانی سے کر سکیں گے۔ سائنس داں ایسے کمپیوٹر بنانے کی بھی کوشش کر رہے ہیں جو انسان سے ہدایت لے کر اس کو لکھے ہوئے ٹائپ شدہ مسودہ، میں تبدیل کر سکیں گے۔ ایسے کمپیوٹر انسان کی آواز کو اس حد تک معین طور پر پہچان سکیں گے کہ اگر انسان یہ کہے "ڈاکٹر اختر کو فون کرو" تو ڈاکٹر کا فون نمبر بغیر انگلی ہلائے خود بخود ڈائل ہو جائے گا۔ ایسی مشینیں یا کمپیوٹر بنانے سے سائنس دانوں کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ ایسے کمپیوٹر ایجاد کر سکیں جو انسان سے یوں گفتگو کریں جیسے دو انسان آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔

گزشتہ سال فلوریڈا امریکہ کی ریاست میں ایک خاتون سیلز مین نے ایک تجرباتی کار اولڈز موبیل ڈرائیو کی جس کے اندر Computrized Navigation System نصب کیا ہوا تھا۔ اس خاتون کا کہنا ہے کہ جب وہ کار میں بیٹھی تو وہ شہر کی انجان جگہ پر تھی اس کا گھر وہاں سے اندازاً ۲۵ منٹ کے فاصلہ پر تھا اور اسے گھر جانے کا راستہ ٹھیک معلوم نہ تھا اس نے کار کے اندر نصب کمپیوٹر میں اپنا ایڈریس ٹائپ کیا تو کمپیوٹر نے اسے ہدایت کی کہ گھر جانے کے لیے فلاں سڑک پر جاؤ پھر دائیں طرف مڑو ٹریفک لائٹ کے بعد جو اسٹاپ سائن آئے وہاں سے بائیں ہاتھ مڑنے کے بعد گھر بالکل سامنے ہو گا اس نیویگیشن سسٹم کا نام "گائڈ اسٹار" ہے اس کی قیمت ۱۹۹۵ امریکن ڈالر ہے ستمبر ۱۹۹۴ء سے یہ نیویگیشن سسٹم کیلی فورنیا کی ریاست میں تمام کار ڈیلروں سے مل سکتا ہے اور امید واثق ہے کہ اگلے سال ۱۹۹۶ء تک یہ امریکہ میں ہر کار ڈیلر سے دستیاب ہو سکے گا۔

نیویارک شہر کی ٹیلی فون کمپنی Nynex نے ایک نئی ٹیلی فون سروس کا آغاز کیا ہے۔ جس کا نام Voice-dialing ہے اس سروس کے تحت۔ بجائے فون ڈائل کرنے کے انسان فون سے یوں گویا ہوتا ہے "بھائی جان کو فون کرو" تو بھائی جان کا فون نمبر ڈائل ہو جاتا ہے۔ اس سروس کی فیس ۵ ڈالر ماہانہ ہے انسان ۵۰ فون نمبر ٹیلی فون سیٹ کے اندر اسٹور کر سکتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ فون آواز کو پہچانتا ہے اس لیے گھر میں والد کی غیر موجودگی میں فرزند ارجمند ویڈیو اسٹور سے فلمیں منگوانا چاہے تو فون نمبر ڈائل نہیں ہو گا۔

---

* کنگسٹن، کینیڈا

حال ہی کی اخباری رپورٹ کے مطابق دنیا کی کمپیوٹر بنانے والی کمپنی انٹر نیشنل بزنس مشین (آئی بی ایم) نے ایک نیا سافٹ ویئر تیار کیا ہے جس کا نام Voice talk ہے۔ اس کی قیمت ۹۹۵ امریکن ڈالر ہے۔ یہ سافٹ ویئر ان لوگوں کے لیے بہت سود مند ہو گا جن کو روزانہ لانگ ہینڈ میں تفصیلی نوٹس لکھنے ضروری ہوتے ہیں مثلاً ٹیکساس کے ایک ہسپتال میں ایک ڈاکٹر مریضوں کا معائنہ کرنے کے بعد جو کہیں نوٹس لکھتا ہے اب وہ پرسنل کمپیوٹر کو State کر دیتا ہے ازاں بعد کمپیوٹر ان تفصیلی نوٹس کو پرنٹر پر ٹائپ بھی کر دیتا ہے۔ یوں اس عمل میں وقت کی بچت کے علاوہ غلطی کا امکان بھی کم ہو جاتا ہے

ہائی ٹیک دودھ اور گائے

کینیڈا میں گائے کو "انوائرمنٹ فرینڈلی" بنانے کے لیے ملک کے دارالحکومت اٹاوہ میں موجود ایک فارم پر ایک گائے پر مختلف تجربات کیے جا رہے ہیں۔ سائنس داں کوئی ایسا طریقہ یا دوا یا خوراک بنانا چاہتے ہیں جس سے گائے میتھین گیس پیدا کرنا کم کر دے۔ چوبیس گھنٹے کے عرصہ میں گائے اپنے جسم سے ۶۰۰ (چھ سو) لیٹر میتھین (Methane) گیس خارج کرتی ہے یہ گیس مجموعی طور پر کرہ ارض کے درجہ حرارت کو بڑھانے میں مضر ثابت ہو رہی ہے۔ گائے کے نظام ہاضمہ سے ملتے جلتے نظام رکھنے والے جانور ہماری فضا میں ۲۵ فیصد گیس میتھین گیس خارج کرتے ہیں۔ میتھین بھی گیسوں میں سے ایک "گرین ہاؤس" ہے جس کی بنا پر زمین کا درجہ حرارت رفتہ رفتہ خطرناک حد تک بڑھ رہا ہے۔

حول اسٹین (Holstein) نسل سے تعلق رکھنے والی اس گائے کو عرف عام میں Betsy کے نام سے پکارا جاتا ہے اس کی پہچان کے لیے اس کے کان پر ایک نمبر ۷۱۱-۹۰-۵ کا ٹیگ آویزاں ہے۔ بیسویں صدی کے جدید شعبہ سائنس جینیات میں ریسرچ کے طفیل یہ گائے خوراک میں تبدیلی کے باعث میتھین گیس کم پیدا کرے گی اور دودھ زیادہ دینا شروع کر دے گی۔ Betsy کو اس کرہ ارض کا مکین بنے صرف چار سال ہوئے اس کی خوراک میں پروٹین کم استعمال کرنے سے یہ گیس کم خارج کرنے کے علاوہ اس کا دودھ چکنائیت میں کم نیز اس کے گوشت میں کولیسٹرول بھی کم ہو گا۔ گائے کی سبز رنگ کی خوراک میں بیکٹیریا اور Fungi کے مہین ٹکڑے شامل کیے گئے ہیں۔ تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اس خوراک کے باعث یہ اب روزانہ ۴۵ کلو گرام دودھ دیتی ہے

کینیڈا کے وفاقی شعبہ زراعت میں سائنس داں اس وقت مندرجہ ذیل ہائی ٹیک فوڈ بنانے میں شب و روز مصروف عمل ہیں :

• لو میتھین گائے : سائنس دانوں کا خیال ہے کہ وہ گائے کے معدہ میں موجود بیکٹیریا کو جینیاتی طور پر بدل سکتے ہیں اس کی بنا پر گائے میتھین گیس کم پیدا کرے گی اور دودھ پہلے سے زیادہ پیدا کرے گی۔

• لو فیٹ ملک (Low Fat Milk) : ۔ سائنس دانوں نے ایک نیا پروٹین ایجاد کیا ہے جس سے چوپائے خوراک کو اب آسانی سے ہضم کر سکیں گے اور یوں ان کے جسم سے کم چکنائی والا دودھ پیدا ہو گا اس پروٹین کو مارکیٹ میں آنے کے لیے تین سال لگیں گے چونکہ ایسے جانوروں کے جسم میں کولیسٹرول کم ہو گا اس لیے ایسی خوراک کو "ڈیزائنر فوڈ" (Designer Food) کا نام دیا گیا ہے۔

• اوس سے مزاحمت رکھنے والی فصلیں : ۔ سائنس داں کینیڈا میں ونٹر وھیٹ کے جین سپرنگ وھیٹ Spring

(Wheat) میں ڈال کر گندم اگانے کا موسم بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں یوں گندم کے جین بدلنے سے یہ اوس کے خلاف مزاحمت پیدا کرے گی اسی طرح ایسے ٹماٹر بھی بنائے جا رہے ہیں جو Freeze Resistant ہوں گے

* دودھ کے لیے نیا BST ہارمون : جینیٹک انجینیرنگ سے بنایا جانے والا جدید ہارمون Bovine Somototrophin گائے کے جسم میں ڈالنے سے دودھ کی پروڈکشن ۲۵ فی صد بڑھ جاتی ہے امریکہ میں ایسا دودھ مارکیٹ میں بدستیاب ہے، کینیڈا میں ایسا دودھ ۱۹۹۵ء میں شاید وفاقی حکومت کی منظوری کے بعد آجائے گا۔

نیا ٹماٹر (Flavr Savr) :۔جینیات کے عمل سے بننے والا نیا ٹماٹر اب زیادہ حد تک سرخ رہے گا اور سڑنے ،گلنے میں اب دیر لگے گی۔یہ ٹماٹر امریکہ کی مارکیٹ میں آگیا ہے۔اب امریکہ کی گرم آب و ہوا والی ریاستوں سے ٹماٹروں کو ٹرکوں میں لاد کر گیس دے کر سرخ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

سورج کی طرح روشنی دینے والا بلب

امریکہ کی وفاقی وزارت توانائی نے مستقبل کے روشنی کے بلب کو ایک نئی سطح میں ابھی سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ ڈیپارٹمنٹ آف انرجی کے لائٹ ریسرچ سیکشن کے پروگرام مینجر کا کہنا ہے کہ روشنی کے بلب اور فلوروسینٹ ٹیوب کی جگہ مستقبل قریب میں نیا سلفر بلب زیادہ پائیدار اور سستا ثابت ہوگا۔یہ بلب Electrodless ہوگا یعنی روشنی پیدا کرنے کے لیے اس کے اندر کسی عنصر کے جلنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔اس بلب سے اس قدر کثیر مقدار میں روشنی پیدا ہوگی کہ مستقبل کے کمپیوٹروں ،ہائی ٹیک مشینوں کے چھوٹے چھوٹے سرکٹ دیکھنے کے لیے یہ روشنی نہایت ضروری ہوگی۔اس نئے بلب کے استعمال سے مشینوں میں کوالٹی کنٹرول بھی اچھی ہوجائے گی۔

مستقبل کے اس نئے بلب کو امریکہ کی ایک کمپنی فیوژن لائٹنگ آف راک ویل میری لینڈ نے ایجاد کیا ہے۔اس بلب کے اندر آرگن گیس (Argon)اور ذرا سا سلفر کا ایک مینٹ کوارٹز کے بنے ہوئے بلب میں مقید ہوگا۔اس بلب کے اندر سے جب ۲۰۴ بلب سائیکلز فی سکینڈ مائیکرو ویو شعاعوں کو گزارا گیا تو بلب کے اندر سے سورج کی شعاعوں کے مانند تیز و تند روشنی خارج ہوئی۔یہ بلب روشنی پرانے اصول کے مطابق ہی پیدا کرے گا یعنی ایٹم کے اندر الیکٹرون کے انرجی لیول کو عارضی طور پر تبدیل کر دیا جاتا۔یاد رہے کہ الیکٹرون ایٹم کے مرکز کے اندر مسلسل گھومنے کے دوران انرجی کی مختلف حالتوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

جب ایٹم کو خارجی طور پر ایکسٹرا توانائی سے Blast کیا جائے تو الیکٹرون کے اندر انرجی لیول بڑھ جاتا ہے۔اس کی مثال بجلی کے روشن بلب کے اندر حرارت یا ناردرن لائٹ (Aurora Borealius)میں سولر پارٹیکلز نیز سلفر بلب کے اندر مائیکرو ویو سے دی جا سکتی ہے ایٹم کے اندر توانائی کا یہ لیول غیر فطری ہوتا ہے اور جلد ہی نارمل حالت میں آجاتا ہے۔اس نارمل حالت کے آنے میں ایکسٹرا توانائی فوٹان (Photon) کی صورت میں ایٹم سے خارج ہوتی ہے۔فوٹان روشنی کا سب سے چھوٹا انفرادی یونٹ ہوتا ہے۔

نئے سلفر کا بلب گولف بال کے سائز کا ہوگا جو موجودہ ۱۰۰ روشنی کے بلبوں کے برابر روشنی پیدا کر سکے گا۔بلب میں جو آرگن گیس استعمال ہوگی وہ زمین کے اندر سے ہماری فضا میں آتی ہے اور ہماری فضا میں صرف ایک فیصد ہوتی ہے۔یہ گیس

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

پروفیسر عتیق احمد صدیقی •

اقلیتی تعلیمی ادارے

اترپردیش کی موجودہ حکومت نے مسلم معاملات میں ذرا نرمی کا رویہ اختیار کیا ہے۔انصاف و مساوات کی بنیاد پر کچھ اقدام کرنے شروع کیے ہیں۔اردو کے بارے میں کچھ کشادہ ذہنی کا ثبوت دینا شروع کیا ہے۔ملازمتوں میں نمایندگی دینے کے اعلانات کیے ہیں۔اقلیتوں کے ادارے قائم کرنے کے آئینی حق کو عملاً تسلیم کرنے کی طرف قدم اٹھائے ہیں۔

آئین ہند نے اس حقیقت کو مختلف طریقوں سے تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان ایک کثیر لسانی، کثیر تہذیبی اور کثیر مذہبی ملک ہے۔ہندو اکثریت میں ہیں لیکن اول تو ملک کا آئین سکولر رکھا گیا ہے، جس کو بڑی حد تک مذہب سے سروکار نہیں، لیکن دوسرے مذاہب کے وجود کو بھی تسلیم کیا گیا ہے اور ان کے ماننے والوں کو مساوی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔آئین کی دفعات ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸ میں ان کی تشریحات کی گئی ہیں۔دفعہ ۲۵(۱) میں بیان کیا گیا ہے

"تمام اشخاص کو آزادی ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے، اس کی پیروی اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے، بشرطیکہ امن عامہ، اخلاق عامہ، صحت عامہ اور اس حصہ کی دیگر توضیعات متاثر نہ ہوں"

ملک کے طول و عرض میں تہذیب و ثقافت کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ان کی بنیاد میں ہندوستانیت کی کارفرمائی ہونے کے باوجود ان کا تنوع نمایاں ہے۔ہندی کو خواہ مرکزی سرکاری رابطہ کی زبان تسلیم کر لیا گیا ہو، لیکن دوسری زبانوں کے وجود اور ان کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔آئین کی دفعہ ۲۹ میں ضمانت دی گئی کہ

"بھارت کے علاقہ میں یا اس کے کسی حصہ میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقہ کو جس کی اس کی اپنی الگ جداگانہ زبان، رسم خط یا ثقافت ہو اس کو محفوظ رکھنے کا حق ہوگا"۔

پھر ملک کی بڑی زبانوں کو قومی زبان کی حیثیت سے آئین کی آٹھویں شیڈول میں شامل کر کے ان کے وجود کا تحفظ کیا گیا۔

مذہب، تہذیب و ثقافت اور زبان کے تحفظ و ترویج کا سب سے بڑا ذریعہ تعلیمی ادارے ہیں۔اسی لیے آئین میں بالخصوص دفعہ ۳۰ کو شامل کیا گیا، جس کے دو حصہ کیے گئے۔ایک میں اقلیتوں کو حسب ذیل ادارے قائم کرنے کا حق دیا گیا اور دوسرے میں حکومت کے شعبوں کو پابند کیا گیا کہ وہ کوئی تعصب نہ برتیں۔اس دفعہ کی عبارت حسب ذیل ہے

۳۰(۱) تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بناء پر ہوں یا زبان کی اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام

• سابق پروفیسر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کرنے کا حق ہو گا۔

(۲) مملکت تعلیمی اداروں کو امداد عطا کرنے میں کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بناء پر امتیاز نہ برتے گی کہ وہ کسی اقلیت کے زیر انتظام ہے، خواہ وہ اقلیت مذہب کی بناء پر ہو یا زبان کی۔

لیکن اس دفعہ کے عملی نفاذ میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ اتر پردیش میں، جہاں کی حکومتیں اور ان سے بھی زیادہ سرکاری عملہ مسلم معاملات میں معاندانہ اور مخالفانہ روش کا اظہار کرتا رہا ہے، سب سے زیادہ رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ اتر پردیش کے تعلیمی ضابطوں میں دفعہ ۳۰ کے تحت اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا اقلیتوں کا حق تسلیم کیا گیا اور ان کے تحت یہ بھی مانا گیا کہ اس ریاست میں مسلمان، عیسائی، پارسی، بدھ، سکھ اور جین مذہبی اقلیتی فرقے ہیں لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس آئینی دفعہ کے تحت اپنا ادارہ قائم کرنے کی ہر درخواست کو التواء میں ڈالا گیا۔ ایسی تقریباً دو سو درخواستیں التوا میں پڑی ہوئی تھیں۔ بعض درخواستوں پر دس دس پندرہ پندرہ سال گذر چکے تھے۔ کسی نہ کسی عذر پر ان کو منظوری نہیں دی جاری تھی اور اس طرح مسلمانوں کو ان کے آئینی حقوق سے محروم رکھا جارہا تھا۔ اب موجودہ حکومت نے ان فضول کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی سمت میں قدم اٹھایا ہے (دوسری ریاستوں میں اتنی تنگ نظری نہیں برتی گئی اور اقلیتی اداروں کو تسلیم کیا گیا)۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ کوئی رعایتی معاملہ نہیں، بلکہ ان کو وہ حق دلادینا ہے جس کی آئین ہند میں ضمانت دی گئی ہے اور جس سے اب تک انہیں محروم رکھا جارہا تھا اور اس طرح تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کی ہمت شکنی کی جارہی تھی۔ ان دو سو معاملات میں سے ابھی صرف ۱۳۲ اداروں کو ان کی اقلیتی حیثیت میں تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن توقع کی جاتی ہے کہ جلد ہی دیگر اداروں کو بھی یہ منظوری حاصل ہو جائے گی۔

لیکن کسی تعلیمی ادارے کو اقلیتی ادارے کی حیثیت میں تسلیم کرانے کا آخر فائدہ کیا ہے؟ اس سے کون سا خاص مقصد حاصل ہوتا ہے؟ ضابطہ کے مطابق اقلیتی اداروں کو بھی عمارت، عملہ، نصاب، تعلیمی معیار اور ان دیگر تمام شرائط کو پورا کرنا ہوتا ہے جو محکمہ تعلیم کی طرف سے عائد ہوتی ہیں۔ حکومت کا مالی تعاون بھی بس اسی طرح مل سکتا ہے، جس طرح دیگر اداروں کو، پھر اقلیتی اداروں کا مطالبہ کیوں؟ ان سوالات کا جواب خود آئین کی مذکورہ دفعہ ۳۰ میں موجود ہے۔ اس کے تحت ادارے قائم کرنے کا حق "مذہبی یا لسانی اقلیتوں" کو دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی ضمانت اور یقین دہانی ہے کہ اقلیتیں اپنی زبان اور اپنے مذہب (جس کا ایک حصہ تہذیب اور ثقافت بھی ہے) کے تحفظ کے لیے آزادی سے اقدام کر سکتی ہیں۔ گویا اقلیتی اداروں کو مندرجہ ذیل معاملات میں آزادی ہوتی ہے

۱۔ وہ اپنا ذریعہ تعلیم خود مقرر کر سکتے ہیں۔ ۲۔ وہ اپنی زبان کی تعلیم کا انتظام کر سکتے ہیں۔ ۳۔ وہ حکومت کے مجوزہ اور منظور شدہ نصاب کے علاوہ اپنے فرقہ کے بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کر سکتے ہیں۔ ۴۔ وہ اپنے فرقہ کی ثقافت کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ ۵۔ وہ مجلس منتظمہ / حاکمہ میں متعلقہ فرقہ کی موثر اکثریت (خواہ یہ سو فیصد ہو) رکھ سکتے ہیں اور ریاست اس مجلس کی تشکیل میں مداخلت نہیں کر سکتی (بشرطیکہ یہ قواعد و ضوابط کے مطابق ہو) ۶۔ تقررات میں انتظامیہ کو پوری آزادی ہوتی ہے۔ ۷۔ انتظامیہ کو عملہ پر مکمل اختیار ہوتا ہے۔ ۸۔ یہ ادارے داخلوں میں اپنے فرقہ کے امیدواروں کو ترجیح دے سکتے ہیں (عدالت عالیہ نے اس کو ۵۰ فیصد کر دیا ہے)۔ ۹۔ درج فہرست ذاتوں / قبائل کے افراد کے تحفظ سے متعلق سرکاری احکام کا نفاذ ان کے لیے ضروری نہیں

ہوتا۔

یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ان اداروں کو بھی حکومت کے مقرر کردہ تمام ضوابط کی پابندی ہوتا ہے۔ مثلاً عملہ کے تقرر میں آزادی ہے کہ عام اسکولوں کے لیے انتخابی کمیٹی میں محکمہ تعلیم کا نامزد کردہ ایک نمایندہ ضرور ہوتا ہے لیکن اقلیتی ادارے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ تقرر کے لیے جو شرائط (تعلیمی استعداد وغیرہ) محکمہ تعلیم نے مقرر کی ہیں ان کا پورا کیا جانا لازمی ہے۔ اپنی زبان، مذہب اور ثقافت کی تعلیم کا انتظام یہ ادارے کر سکتے ہیں۔ مگر حکومت کے مقرر کردہ نصاب کی پابندی بھی کرنا ہوگی۔ وغیرہ

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقلیتی ادارے مذکورہ بالا مراعات میں سے آخری پانچ کا فائدہ تو اٹھانا چاہتے ہیں لیکن ابتدائی چار مقاصد کو نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ انھیں کی بنیادی اہمیت ہے۔ کتنے اقلیتی تعلیمی ادارے ہیں جنھوں نے اس بات پر اصرار کیا ہو کہ وہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہتے ہیں؟ حالانکہ ان کو اس کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ (یہ بات الگ ہے کہ کسی ادارے کی طرف سے اگر یہ مطالبہ کیا بھی گیا تو افسر شاہی نے اس میں برابر روڑے اٹکائے ایسے ہی جیسے خود اقلیتی ادارے کی حیثیت میں منظوری دینے میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں) کتنے اقلیتی اداروں میں اردو اور دینیات کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہے؟ کتنے اقلیتی تعلیمی ادارے ثقافتی امور کے فروغ کے لیے کوشش کرتے ہیں؟

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکثر و بیشتر انتظامیہ اپنی خود مختاری کا غلط استعمال کرتی ہے۔ تقررات میں ناواجب طرفداریاں کی جاتی ہیں، عملہ کے ساتھ ناانصافیوں اور نازیبا سلوک کو روا رکھا جاتا ہے۔ اس سے عملہ میں بے دلی اور پھر کشمکش اور تصادم کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ادارے کی رقوم اور جائدادوں کا غلط سلط استعمال کیا جاتا ہے ادارے کی ترقی کے لیے خاطر خواہ کوشش اور کاوش نہیں کی جاتی جس کے نتیجے میں یہ ادارے ابھرنے اٹھنے کے بجائے انحطاط اور زوال کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اراکین انتظامیہ میں مفادات کا (اور کبھی کبھی صرف انا کا) ٹکراؤ ہوتا ہے تو تنازعات بھیانک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

عام اداروں میں انتظامی خرابیاں ہوں تو اگرچہ وہاں بھی یہ بری ہی بات ہے، لیکن اقلیتی اداروں میں اس طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں تو یہ برائی اور بھی مکروہ ہوتی ہے۔ حکومت کی نظریں برابر ان اداروں پر لگی رہتی ہیں کہ کب اور کہاں گرفت کرنے کا موقع ملے اور کسی بھی معمولی سی بات کو بہانہ بنا کر الزام تراشی کی جائے یا ادارے کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔ اترپردیش میں (اور دوسری ریاستوں میں بھی) بہت سے ادارے ہیں جن کی انتظامیہ کو باہمی جھگڑوں کے باعث حکومت نے معطل کیا اور اپنا عامل مقرر کر دیا۔ جگ ہنسائی کا بھی موقع ہم نے فراہم کیا اور اپنے حقوق و اختیارات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

جب کسی ادارے کو ہم نے اقلیتی ادارے کی حیثیت سے تسلیم کرا لیا تو ہماری ذمہ داری میں اضافہ ہو گیا۔ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ انتظامی طور پر کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہونے دیں جس پر کسی کو انگشت نمائی کا موقع ملے۔ انتظامیہ کمیٹی کے اراکین، پرنسپل اور تدریسی عملہ میں یگانگت اور ہم آہنگی برقرار رہنی چاہیے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب تمام متعلقین ذاتی مفادات کو نظر انداز کر کے صرف ادارہ کی بھلائی کو پیش نظر رکھیں اور جملہ امور میں حق و انصاف اور تعلیمی تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے

قانون اور ضابطہ کی پابندی کریں۔ کسی کو حق تلفی اور ناانصافی کا احساس نہ ہو۔ ادارے کے ساتھ وفاداری کو ہر شخص اپنا فرض محسوس کرے۔ نزاعی معاملات پیدا ہوں تو جمہوری طریقہ پر گفتگو کر کے ان کے بارے میں فیصلے کیے جائیں۔ پھر بھی مفاہمت نہ ہو تو ثالثی کا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں ملت کے معتبر افراد کی مدد لی جائے۔

جن اداروں کے لیے یہ خصوصی درجہ حاصل کیا جاتا ہے ان پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی امتیازی خصوصیات کے ساتھ اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کریں اور اس سے اپنا تشخص قائم کریں۔ مثلاً

(۱) ان اداروں کا تعلیمی معیار بہتر سے بہتر ہو تا کہ یہاں کے طالب علموں میں وہ لیاقت اور فضیلت پیدا ہو جو دوسروں کے لیے نمونہ کا کام دے۔ اقلیتوں کے لیے فضیلت یابی ہی ان کی بقا اور ترقی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

(۲) یہ ادارے اولاً تو اردو ذریعہ تعلیم کی اجازت حاصل کریں، جو ان کا آئینی حق ہے (خواہ متوازی طور پر ہندی ذریعہ تعلیم کے سیکشن بھی چلائیں) نہیں تو اردو کی تدریس کی کوئی نہ کوئی گنجائش نکالیں۔ اس کے لیے سہ لسانی فارمولے کو بھی استعمال کیا جاسکتا ہے یا اردو کو ایک اضافی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاسکتا ہے۔

(۳) ان میں دینیات کی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہیے تا کہ مسلم بچے اپنے مذہب و ثقافت سے واقفیت حاصل کر سکیں اور ان کی ذہنی نشو و نما میں اس سے مدد ملے۔

(۴) ان اداروں کے طالب علموں کی اخلاقی و تہذیبی حالت دوسرے عام اسکولوں کے طلبہ سے بہتر ہونی چاہیے تا کہ اپنے عادات و اطوار اور اپنے نظم و ضبط کے لحاظ سے ان کو الگ پہچانا جا سکے اور یہ طالب علم دوسروں کے لیے نمونہ بن سکیں۔

یہ سب آسان کام نہیں ہیں، لیکن ناممکن بھی نہیں۔ ان کے لیے شعوری طور پر جدوجہد کرنی ہو گی۔ طلبہ، تدریسی عملہ و انتظامیہ کے اراکین سبھی کو اپنے فرائض اور ذمہ داریاں پوری کرنی ہوں گی۔ واضح اور متعین مقاصد کو سامنے رکھ کر کوشش کرنی ہو گی۔ ہم یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے کہ اس دور میں پورا معاشرہ ہی انحطاط کا شکار ہے اس میں ایک تعلیمی ادارہ کیا کر سکتا ہے یا ان اثرات سے کیسے بچ سکتا ہے اگر ہم نے اپنے ادارے کے لیے ایک مخصوص حیثیت حاصل کی ہے تو ہمیں کچھ اضافی ذمہ داریوں کو بھی قبول کرنا ہو گا۔ اول تو انھیں سیاست کی بازیگری سے پاک رکھنا ہو گا، تمام اداروں کے مقابلے میں بہتر معیار قائم کرنے ہوں گے، نظم و ضبط کا ثبوت دینا ہو گا، بہتر تعلیمی نتائج پیش کرنے ہوں گے، طالب علموں کی ہمہ جہت نشو و نما پر توجہ مرکوز کرنی ہو گی، ان اداروں کو مسلم تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بنانا ہو گا اور اردو کی تعلیم کا مضبوط نظام قائم کرنا ہو گا۔

کچھ ادارے پہلے سے اقلیتی حیثیت سے منظور شدہ ہیں، کچھ اب منظور ہوئے ہیں، مزید بھی اس حیثیت کی منظوری حاصل کر لیں گے۔ اجتماعیت میں برکت ہوتی ہے۔ یہ سب اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کے تصور کو ترک کر کے باہمی امداد و تعاون کی روح پیدا کریں۔ سب سر جوڑ کر بیٹھیں اور تمام اداروں کی فلاح و بہبود اور معیار بندی کے مشترک پروگرام بنائیں، ان میں باہم دگر تعاون کریں اور ایک دوسرے کو تقویت بہم پہنچائیں تا کہ "اقلیتی ادارہ" اور "اچھا تعلیمی ادارہ" ہم معنی ہو جائیں۔

ضیاء الرحمان اعظمی *

ہماری تعلیم اور تعلیمی درس گاہیں

مکتب یا دوسری ابتدائی درجات کی درسگاہیں ہوں یا کالج اور یونیورسٹیاں ہوں کسی ملک میں یہی وہ مخصوص ادار- ہوتے ہیں جہاں بچے رسمی طور سے تعلیم پاتے ہیں اور جہاں وہ آگے چل کر مختلف علوم اور فنون سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔یہی روشن مقامات ہیں جہاں ان کے ذہن و جذبات کی تربیت ہوتی ہے اور ان کے فکر و عمل کے گوشے نئی اور شاداب راہیں پا- ہیں۔یونیورسٹی کمیشن نے ان اداروں کو، خصوصاً یونیورسٹی کو "قومی باطنی زندگی کی مقدس پناہ گاہ" سے تعبیر کیا ہے اور ا کے تربیت یافتہ نوجوانوں کو "تہذیب کے روشن خیال رہنما" سے۔یہی نوجوان کسی ملک کو خوشحال، طاقتور اور عظیم بناتے ہیں اس لئے ان اداروں کو ملک کا ضمیر اور اس کا دھڑکتا ہوا دل کہا گیا ہے۔ایک اچھا اور صحت مند معاشرہ ان اداروں ہی کا مر منت ہوتا ہے اور ملک کی ترقی و خوشحالی اور اس کی قوت و مضبوطی کی ڈور ان ہی نوجوانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس - کہا گیا ہے جیسے کلاس روم ہوں گے ویسا ہی ملک ہوگا۔اس حقیقت کا اظہار ۱۹۶۶ء میں کوٹھاری تعلیمی کمیشن نے ان الفاظ کیا ہے "ہمارے ملک کی تقدیر اس کے کلاس روموں میں بن رہی ہے۔یہ افسانہ سرائی نہیں، حقیقت ہے"

باتیں کتنی اچھی، خیالات کتنے عظیم، لیکن افسوس یہ سارے خیالات کتابوں کے صفحات پر بڑی حد تک زینت بن کر رہے۔عملاً تعلیم کو وہ معیار دینے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی جس کا اظہار تقریر اور تحریر میں بار بار فرمایا جاتا رہا، یا جس اسے استحقاق تھا۔سچ تو یہ ہے حکومت نے اسے ہمیشہ ثانوی حیثیت کی چیز سمجھا، بلکہ اس سے بھی کمتر۔پروفیسر ہمایوں ک کے بقول "ایوان حکومت میں تعلیم ہمیشہ (Back bench matter) ہی رہی اور اس سے زیادہ افسوسناک یہ کہ لوگوں- اپنی بے دماغی اور بے حسی سے اس کی یہ حیثیت تسلیم بھی کرلی۔ہمارے ان منفی رویوں کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔آزا کی فضا میں سانسیں لیتے ہوئے تقریباً نصف صدی گذر گئی ہماری خواندگی کی شرح میں بہت کم اضافہ ہوا ہے۔ہماری ا بے حسی اور تعلیم بیزاری کا کوئی معقول جواز نہیں ہے۔آج ہم ایک آزاد اور جمہوری ملک میں سانس لے رہے ہیں۔اس جمہو نظام کی بقا اور استحکام کے لئے پڑھے لکھے اچھے شہری، جنہیں اپنی ذمہ داریوں کی واقفیت واحساس اور انہیں نبھانے کا جذبہ لازمی شرطیں ہیں۔یہ اچھے شہری تعلیم گاہوں کی پیداوار ہو سکتے ہیں۔اس لئے کسی جمہوریت میں اس کے شہریوں کے لئے کی دو ناگزیر ضروریات ہیں جن کا پورا کرنا حکومت کا اولین فرض ہوتا ہے، ایک خوراک ہے تو دوسرا تعلیم۔آج ہمارے دیس

---

* لکچرر شعبہ تعلیم، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

جمہوریت ایک تماشہ کی چیز ہے ۔اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہماری آبادی کا تقریباً دو تہائی حصہ ہنوز ناخواندہ ہے اور جو تعلیم ہے بھی وہ عموماً ناقص اور غیر تسلی بخش ۔ ملک میں یقیناً کچھ اچھے اور بہت اچھے تعلیمی ادارے ہیں اور اچھے تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد آخاصی ہے جو عمدہ ماڈرن تعلیم سے آراستہ ہیں، جو سائنس اور ٹکنولوجی اور دوسرے علوم اور فنون میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں لیکن اچھے ادارے ہوں یا اچھے پڑھے لکھے لوگ، ہماری روز افزوں آبادی میں ان کا تناسب آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں ۔ورلڈ بینک (World Bank) کی رپورٹ کے مطابق اس صدی کے اختتام پر ہندوستان کی آبادی ایک ارب ہو جائے گی جس کی آدھی تعداد ،یعنی ۵۰ کروڑ لوگ ناخواندہ ہوں گے اور یہ عالمی ناخواندگی کا ۵۴ فیصد ہو گا۔ گویا دنیا کے سارے ان پڑھوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ان پڑھ اکیلے بھارت میں ہوں گے ۔یہ صورت حال ایوان حکومت میں ہمارے سیاسی رہنماؤں ،ہماری ملکہ پالیسی بنانے والوں، اور ہمارے تعلیمی منتظم کاروں کی کم سوادی اور کوتاہ بینی پر دال ہے ۔

آج دنیا کے ترقی یافتہ ممالک جو ہم سے آگے ہیں اور جن کے لوگ ہم سے زیادہ متمول، آسودہ اور خوش حال ہیں اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ہم سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں ۔انہیں تعلیم کی افضلیت اور اپنے تعلیمی اداروں کی سرفرازی پر ناز ہے ۔انہوں نے تعلیم گاہوں کو چرچ کی طرح مقدس جانا ہے ۔دوسری جنگ کے آغاز میں انگلستان کے وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل نے اپنی کابینہ کے ہنگامی اجلاس میں وزیروں کو خطاب کرتے ہوئے جنگ سے پیدا شدہ صورت حال میں وزارتوں سے پیسے خرچ نہ کرنے کی تاکید کی اور کہا "ہر وزارت میں پیسوں کی کٹوتی کی جائے گی"۔

"سوائے وزارت تعلیم کے ۔" ایک آواز ابھری۔ سبھی لوگ بشمول چرچل ششدر رہ گئے ۔یہ تھے وہاں کے وزیر تعلیم ٹام لنسن ۔ٹام لنسن نے مزید کہا "جناب والا۔ میری وزارت پیسے خرچ نہیں کر رہی ہے بلکہ قوم کے بہتر مستقبل کی تشکیل میں لگا رہی ہے"۔ تعلیم کی نسبت ترقی یافتہ ممالک کا شروع سے یہی قوی رجحان رہا ہے ۔اپنے ان ہی مثبت رویوں کے باعث وہ قومیں آج دنیا کی اقوام میں سرخرو اور سربلند ہیں اور زندگی کی ساری کیف و رعنائیاں ان کے قدموں پر ہیں ۔دوسری طرف وہ ممالک، بالخصوص تیسری دنیا کے دیس ہیں جن کے آگے تعلیم ہمیشہ ایک بے وقعت اور غیر اہم چیز بن کے رہی ۔ آج وہ دیس بھی کمزور ہیں اور وہاں کے لوگ بھی دنیا کی نعمتوں سے محروم ،پسماندگی و درماندگی اور زبوں حالی کی تصویر ہیں ۔لوگ یورپ وامریکہ کی ترقی کی چکاچوند سے حیران ہیں لیکن کیوں؟ جن قوموں نے تعلیم کو آبرو بخشی، درسگاہوں کو مقدس جانا تجربہ خانوں کو عبادت گاہ بنایا ۔ کاوش اور جدوجہد کی پرستش کی، اور کسب علم کی خاطر بے حد و حساب ریاضت کی ،حق وانصاف کا تقاضا بھی یہی تھا کہ آسودگی و شادمانی ان ہی قوموں کا حصہ بنتی اور ترقی و استحکام ان ہی ملکوں کا نصیب ہوتا۔

آزاد بھارت میں تعلیم کی بیچارگی اور تعلیمی اداروں کی زبوں حالی کا اندازہ کچھ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ "چوتھے کل ہند تعلیمی جائزے " کے مطابق کالج اور یونیورسٹیوں کا پیٹ بھرنے والے ،ہماری تعلیم کی ریڑھ کی ہڈی ،یعنی ہمارے ابتدائی درجات کے اسکولوں کا حال زار مندرجہ ذیل ہے :

(۱) ملک میں ساڑھے تیرہ فیصد اسکول بغیر کسی بلڈنگ کے ہیں ۔

(۲) چالیس فیصد اسکول پھونس کے چھپر میں ہیں ۔

(۳) ایک لاکھ باسٹھ ہزار اسکولوں میں چٹائی، تختہ سیاہ وغیرہ بھی نہیں ہیں ۔

(۴) ایک لاکھ پینسٹھ ہزار اسکولوں میں صرف ایک استاد فی اسکول کی نسبت ہے۔

یہاں ترقی یافتہ ممالک سے اپنے ملک کی تعلیمی صورت حال کا موازنہ مقصود نہیں ہے، صرف یہ دکھانا مقصود
کے ساتھ ہماری حکومت کے برتاؤ اور ہمارے اپنے لوگوں کی بے حسی کا کیا حال رہا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ت
معاشی رشتہ بھی استوار ہوتا ہے، معاشرہ کی صحت مندی اور ملک کی ترقی کی ضمانت بھی ملتی ہے، تہذیب اور کلچر کا
بھی ہوتی ہے اور انفرادی زندگی بھی سنورتی ہے۔ اس روشنی میں تعلیمی جائزہ کی مندرجہ بالا تصویر آنکھوں کو صرف نم
ہے۔ شاید صورت حال کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے ۱۹۸۶ میں حکومت نے "نئی تعلیمی پالیسی" کا اعلان کیا جس کے تحت ا
میں "آپریشن بلیک بورڈ" کی اصطلاح کا استعمال کیا گیا یعنی اب بھارت کے بھی اسکول کم از کم دو استادوں اور دوسر
تدریسی اشیاء و آلات سے آراستہ ہونگے۔ لیکن افسوس یہ خواب اب تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا ہے

رہی یونیورسٹی یا اونچی تعلیم جس پر ملک کی ترقی کا انحصار ہے، سو وہ بھی اپنی ضروریات، اپنے نصاب، اپنی ا
اپنے معیار کے لئے سخت توجہ طلب ہے۔ لگ بھگ چھ (۶) ہزار کالجوں میں چالیس فیصد ادارے پیسے اور فنڈ کی کمی
ایسے نیم جان نظر آتے ہیں کہ ان کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ یونیورسٹی تعلیم پر حکومت اپنی قومی آمدنی کا
فیصد خرچ کر رہی ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں سات آٹھ فیصد خرچ کیا جاتا ہے۔ اب ذرا ان اونچی تعلیم گاہوں کا نز
جائزہ لیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ کالجوں کو انتظامیہ، خصوصاً ان کے منیجر اور پرنسپل وغیرہ اپنی جاگیر سمجھتے ہیں چنانچہ بڑے
روپیے خرد برد کئے جاتے ہیں۔ کسی تعلیمی اور فلاحی کام پر دھیان نہیں دیا جاتا، ایڈمیشن سے لے کر امتحان تک زبردست
کا بازار گرم رہتا ہے۔ ایسے میں چاپلوسی کا ماحول پنپتا ہے، گروہ بندی پروان چڑھتی ہے اور کالج دوسری طرح ط
عنوانیوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ اس پر ملک کی گندی سیاست کی پرچھائیاں مستزاد۔ غرض ایسی فضا میں کوئی علمی ما
پیدا ہوتا، صرف "معمولی پن" (mediocrity) ابھرتا ہے۔ اور یہ معمولی لوگ کھیل تماشہ میں دلچسپی دکھاتے ہیں، لکھ
سے بھاگتے ہیں، مسابقت سے جی چراتے ہیں۔ نہ ان کی آنکھوں میں کوئی شعلہ دکھائی دیتا ہے نہ
کوئی کسک۔ ان کو ڈگری ضرور مل جاتی ہے مگر وہ کالج اور یونیورسٹیوں سے عموماً کورے دماغ کے ساتھ واپس جاتے
کا حال بقول خواجہ غلام السیدین "ان بد نصیبوں سا ہوتا ہے جو کسی عمدہ دسترخوان سے جس پر انواع و اقسام کے لذیذ کھ
ہوں، بھوکے پیٹ لوٹ آئیں۔" یہ سچ بھی ہے۔ آج ان میں حلم، بردباری، تہذیب، شائستگی، سنجیدگی، متانت، خاکساری
وقار جیسی صفات حمیدہ ڈھونڈنے سے نہیں ملتیں۔ ان کے قلب و دماغ کے افلاس پر ترس آتا ہے۔ ان کو دیکھ کر ہمارا
ہے۔ اور یہ تعلیم گاہیں جو علم کے گوہر لٹانے کے سوا شخصیت کی تشکیل اور کردار سازی کے لئے اپنا وجود رکھتی ہیں،
لذت سے بیگانہ ہیں۔ ہائے افسوس، آج اس گلشن میں باد بہاری کے نرم جھونکے چلتے دکھائی نہیں دیتے۔ وحشت اور و
علاوہ آج وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

مختار احمد مکی *

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

اسلام نے تعلیم کے حصول پر کافی زور دیا ہے۔ حضور اکرم پر نازل ہونے والی پہلی وحی علم کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ذرائع تعلیم کی بھی وضاحت کرتی ہے۔ قرآن کریم میں علم و حکمت کو خیراً کثیراً کہا گیا ہے۔ مسلمانوں کا دستور عمل قرآن ہے اور اس کے لفظی معنی پڑھنا ہے یا وہ چیز جو بار بار پڑھی جائے قرآن میں اس کے لیے دوسرا لفظ کتاب استعمال کیا گیا ہے اور اس کے لفظی معنی میں لکھنا یا کوئی بھی چیز جو تحریری شکل میں ہو (مکتوب) اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی لے لی گئی ہو۔ رسول اکرم پر جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تو سب سے پہلے اس کو آپ لکھوا دیتے تھے۔ قرآن کریم کو بار بار پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ نماز اسے پڑھے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

قرآن کا حکم ہے اگر تم نہیں جانتے ہو تو ان سے دریافت کرو جو کہ جانتے ہیں اور ایک حدیث ہے کہ اس موقع پر علم کو چھپانے والے کو قیامت کے دن سخت ترین سزا دی جائے گی۔ اس طرح استفسار، پوچھ تاچھ اور تجسس جو موجودہ سائنس کی بنیاد سمجھی جاتی ہے، وہ اسلام کا ہی جوہر ہے۔ قرآن کریم میں فکر، تلاش، جستجو، استفسار تجسس اور مطالعہ فطرت کی دعوت دی گئی ہے۔ مومنوں کو نظام کائنات و فطرت کو سمجھنے اور اپنی عقل کو استعمال کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ قرآن بار بار مسلمانوں کو ارض و سما کی تخلیق پر غور کرنے، سمندر کو مسخر کرنے اور شمس و قمر سے استفادہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور جو اس پر غور و خوض نہیں کرتے انہیں چوپایوں سے تشبیہ دیتا ہے، علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے اور تلاش علم میں عرب سے چین جیسے دور دراز علاقے کے دشوار سفر کی تلقین صرف مروجہ علم دین کے لیے نہیں تھی۔ حضور اکرم کے سیکڑوں اقوال ہیں جس میں انہوں نے علم و حکمت کی اہمیت کو بتلایا ہے۔ ان کی مقبول ترین دعا تھی "اے اللہ مجھے اشیا کی حقیقت کا علم عطا کر"۔ انہوں نے اپنے متعلق کہا ہے کہ "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں" (انما بعثت معلماً) اسلام کی علم پروری کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ غزوات میں ہاتھ آنے والے قیدیوں کی رہائی کا فدیہ حضور اکرم نقد رقم کے بجائے (ایسے وقت میں جب مسلمانوں کو اس کی شدید ضرورت تھی) دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا قرار دیتے ہیں۔ اسلام میں تعلیم کا سب سے پہلا مرکز مدینہ کا صفہ نامی چبوترہ تھا۔ جس میں ستر (۷۰) تا اسی (۸۰) اصحاب صفہ خود رسول اکرم اور دوسرے صحابیوں سے تعلیم حاصل کرتے۔ اس میں حضرت معاذ بن جبل مالی امور کے نگراں تھے اور حضرت عبادہ بن صامت انصاری لوگوں کو لکھنا

---

* ۴۳۔ سی، نیو کالونی، آزاد نگر، جمشید پور۔ (بہار)

سکھاتے تھے۔ اصحاب صفہ اپنی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے خود بھی محنت کرتے اور کماتے۔ حضرت ابوہریرہ اسی مدرسہ کے تربیت یافتہ تھے۔ خلفائے راشدین بھی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کے حصول کی تلقین کرتے رہے۔ ابوبکر کا مشہور قول ہے کہ علم پیغمبروں کی میراث ہے جبکہ دولت قارون اور فرعون کی۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ علماء کی تکریم خدا کی بندگی ہے اور علم انسانوں کا سب سے بڑا زیور ہے۔

قرآنی تعلیم رسول اکرم کے اقوال اور صحابہ کے تعلیم کے حصول کی تلقین کا ہی نتیجہ تھا کہ جس ملک میں اسا قبل ۱۷، ۱۸ افراد خواندہ تھے۔ وہاں عام خواندگی کا اوسط کافی بڑھ گیا، جہاں ایک بھی کتاب کا وجود اسلام سے قبل نہیں متہ صفین (۳۵ھ) کے موقع پر قرآن مجید کے ہزاروں نسخہ بلند ہو گئے۔ اسلام کی پہلی چار صدی میں اس حد تک وسعت آئی الرجال کی کتابوں میں اس دور کے پانچ لاکھ علماء کے مفصل حالات ملتے ہیں۔ مسلمانوں کے دور عروج میں ہزاروں کی تا ادیب، شاعر، مورخ، اور سائنس داں پیدا ہوئے۔ مغرب نے سائنس کا پہلا سبق طلیطلہ (Teledo)، سرقسطہ اور ؟ درسگاہوں سے حاصل کیا۔ انہوں نے علوم کی نئی شمعوں کو ان قندیلوں سے روشن کیا جو صدیوں سے عالم اسلام میں روشن جارج سارٹن نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "سائنس کی تاریخ" میں ان مسلمان سائنسدانوں کا نام کافی احترام سے لیا ہے ؟ سائنسدانوں کے پیش رو تھے۔ سارٹن نے سائنسی کارناموں کی تاریخ کو نصف صدی کی اکائیوں میں تقسیم کیا ہے اور صدی کے کارناموں کو اس عہد کی ایک مرکزی شخصیت سے منسوب کیا ہے۔ اس طرح کی اکائیوں کا سلسلہ وہ ۴۵۰ ق شروع کرتے ہوئے ان تمام عہد کو افلاطون، ارسطو، اقلیدس، ارکیمیڈس وغیرہ سائنسدانوں سے منسوب کرتے ہوئے.. ۔ کو چینی حکیم چیون سانگ اور ہی چنگ کا کارنامہ قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ۷۵۰ء سے ۱۱۰۰ء تک یعنی ساڑھے تین سو سال ک زمانہ جابر بن حیان (۷۲۷ء تا ۸۱۲ء)، محمد ابن موسیٰ الخوارزمی (۸۰۰ء تا ۸۴۷ء)، المسعودی (۹۵۷ء)، ابوالوفا (۹۰۸ء تا ۹۳۶ء)، البیرونی تا ۱۰۳۷ء)، بوعلی سینا (۹۸۰ء تا ۱۰۳۷ء)، ابن الہیثم (۹۶۵ء تا ۱۰۳۹ء)، عمر خیام (۱۰۴۸ء تا ۱۱۲۲ء) وغیرہ عرب، ترک، افغان، اور اہل ای سائنسدانوں کا کارنامہ قرار دیا جن کا تعلق اسلام سے تھا۔ ۱۱۰۰ء کے بعد پہلی بار یورپین اسکالر روجر بیکن اور d of Cremona وغیرہ کا نام شامل ہے لیکن اس اعزاز میں ابن رشد (۱۱۲۶ء تا ۱۱۹۸ء)، نصیر الدین طوسی (۱۲۰۱ء تا ۱۲۷۴ء) جیسے ماہر شامل ہیں۔

تعلیم کی اس اہمیت کا احساس مسلمانوں کے مختلف ممالک میں پھیلنے تک جاری رہا وہ جس طرف بھی گئے اپنے علم و حکمت کی قندیلوں کو بھی ساتھ لیتے گئے۔

(باقی صفحہ ۳۹ کا)

دوسری گیسوں جیسے ہیلیئم (Helium)، نی آن (Neon)، کرپٹان (Krypton) اور ایکسی نان (Xenon) کی ط ضر گیسوں میں شمار ہوتی ہے سائنس داں کہتے ہیں کہ مستقبل قریب میں تمام بلب Electrodless ہوں گے۔ یہ بلب کی طرح روشنی خارج کرتا ہے۔

کمانڈر ایس۔ این۔ اے فردوسی٭

بازگشت

ابھی تک داخلے مکمل نہیں ہوئے تھے لہذا ہر نو وارد کو جہاں وقتی طور پر رکھا گیا تھا وہ وہیں پر تھا خاکسار کے کمرے میں لکھنؤ کے ایک صاحب (مرزاجی) بی ایس سی (فائنل) کے طالب علم بھی تھے ان کے مضامین میں جغرافیہ، جیولوجی اور کیمسٹری شامل تھے ایک رات مرزاجی اپنی پریکٹیکل کاپی تیار کر رہے تھے۔ شاید کافی دیر ہو چکی تھی اور پریکٹیکل امتحانات جلد ہونے والے تھے۔اس لیے کچھ گھبرائے گھبرائے سے معلوم پڑے۔ مجھے خصوصی طور پر جغرافیہ سے لگاؤ تھا لہذا میں نے مرزاجی سے پیش کش کی اگر وہ کہیں تو میں ان کی کاپی مکمل کرنے میں ہاتھ بٹاؤں مرزاجی گھبرا کر بولے کہ میاں صاحب زادے یہ بی۔ایس سی فائنل کی کاپی ہے۔اس پر میری ڈیویژن کا دارو مدار ہے۔میں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت زیادہ سے زیادہ ایک شیٹ (صفحہ) ہی تو خراب ہو گی لہذا وہ تیار ہو گئے میں نے ان کا وہ صفحہ ان سے بھی جلدی تیار کر دیا اور بقول ان کے ان سے بہتر بن گیا۔ تو وہ بولے کہ میاں جب تم کو جغرافیہ اتنا آتا ہے تو تم کہاں پھنس گئے اس چکر میں جاؤ بایولوجی یا میتھس کے ساتھ I.Sc کرو اور میڈیکل یا انجینیرنگ کے مقابلے میں بیٹھو اگر نہیں آئے تو بھی B.Sc میں تم کو جغرافیہ اور جیولوجی مل جائے گا۔میں نے ان کی اس ستائش پر اپنے ان اساتذہ کے لیے دعائے خیر جن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کے نتیجہ میں مجھے یہ ٹوٹا پھوٹا علم حاصل ہو سکا تھا۔بہر حال اب نتیجہ یہ ہوا کہ مرزاجی کی آدھی سے زیادہ کاپی میں نے ہی تیار کی۔

ایک دن صبح آٹھ بجے کے قریب چھ بار سائرن بجا۔یہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔اس سے پہلے مرحوم رضا کے لیے تین بار ہی سائرن بجا تھا۔ ویسے عام طور پر روزانہ کلاس سے پندرہ منٹ پہلے اور ہر روز رات کو ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے یہ سائرن بجا کرتا تھا۔سینیرز نے بتایا کہ کسی بڑے شخص کا انتقال ہوا ہے۔ تھوڑی دیر میں نوٹس بھی آگیا (اس زمانے میں ہر نوٹس کمرے کمرے تقسیم کیا جاتا تھا)۔اس کے ذریعہ پتہ چلا کہ میرے محسن کرنل حیدر اب اس دنیائے فانی میں نہ رہے۔ان دنوں وہ قائم مقام وائس چانسلر تھے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی میں وہاں کے جلسہ تقسیم اسناد (کانووکیشن) کو خطاب کرنے بنارس تشریف لے گئے تھے۔ وہیں جلسہ میں ہی دل کا دورہ پڑا اور بالآخر وہیں راہی ملک بقا ہوئے۔ان کا جسد خاکی علی گڑھ لایا گیا اور بعد نماز جنازہ منتواں میں تدفین عمل میں آئی۔

کرنل حیدر کے انتقال کے بعد فزکس کے پروفیسر ڈاکٹر پی۔ایس گل، ڈین فیکلٹی آف سائنس مقرر ہوئے گل صاحب

٭ سابق پبلک ریلیشنز افیسر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ، وائس چانسلر ، اپنے ساتھ امریکہ سے لائے تھے ۔ گل صاحب وہاں کاسمک ریز (ic Rays
کام کر رہے تھے ۔ اس وقت یہ جدید ترین تحقیقی کام تھا ۔ چنانچہ ان کے ساتھ ہی یہ کام یہاں بھی شروع کیا گیا ۔ :
ہے کہ اس وقت تک یہ تحقیقی کام بھابھا اٹامک (بمبئی) میں بھی شروع نہیں ہوا تھا ۔ دراصل سائنس داں سورج سے
والی ان شعاعوں کی رفتار معلوم کرنے کے لیے شعاعوں کے ان ذرات کا شمار کر رہے تھے جن سے یہ پتہ چل سکے ک
میں کتنے ذرات نیچے آتے ہیں ۔ ان کے شمار کے لیے ایک خصوصی مشین جو امریکہ میں بنی تھی ، گل صاحب کے ایک امر
نے جو ان کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے تحفتاً دی تھی ۔ یہ مشین یہاں فزکس ڈپارٹمنٹ میں لگائی گئی تھی ۔ (آج کل
میں بایو کیمسٹری کا شعبہ کھل گیا ہے) ۔ گل صاحب کے ایک شاگرد یٰسین صاحب اس کے انچارج بنائے گئے ۔ اس
کی ایجاد بالکل ابتدائی (بلکہ تھیوری کی) منزل میں تھی لہٰذا یہ ضروری تھا کہ ہر ۴ ۔ ۵ منٹ بعد جو اعداد و شمار (۶
اس مشین پر آجاتے تھے انہیں کوئی شخص دیکھ کر نوٹ کرے ۔ چنانچہ یٰسین صاحب نے تو اپنا بستر ہی اس مشی
لا کر بچھا دیا تھا اور وہ یہ کام مہینوں کرتے رہے ۔ بعد میں گل صاحب سے اختلافات کے باعث یٰسین صاحب علی گڑھ
گئے ۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا سطح سمندر سے اونچائی کا کوئی اثر ان شعاعوں اور ان کے ذرات پر بھی پڑتا ہے ، دو لیبور
سری لنکا اور دوسری بارہ مولا (کشمیر) میں قائم کی گئیں جو براہ راست اسی یونیورسٹی کی نگرانی میں کام کرتی تھیں ۔ ،
گل صاحب کی خدمت میں اپنی درخواست لے کر حاضر ہوا کہ میرے مضامین تبدیل کر دیے جائیں ۔ موصوف نے
کہ فارم بھرنے سے پہلے آپ کو یہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیے تھا ، خیر اب اس کے بعد یہ پھر نہ تبدیل کیا جائے گا ۔

گل صاحب کے امریکن دوست اکثر آتے اور یہ لوگ طرح طرح کے تجربات کرتے ۔ ایک دن موسم ذرا اچ
ہوائیں چل رہی تھیں ۔ جمنیزیم کے پاس جہاں اب فٹ بال گراؤنڈ ہے گل صاحب اپنے انہیں امریکن دوستوں کے س
تھے ۔ یہ لوگ سات بڑے بڑے غباروں میں گیس بھر رہے تھے ، یہ غبارے سفید ربر کے بنے ہوئے تھے ۔ ان ک
بڑے پھیلے ہوئے سنگھاڑے کی سی تھی ۔ قطر تقریباً بیس فٹ رہا ہوگا ۔ جب گیس بھر گئی تو تھوڑے تھوڑے وقفے
انہیں چھوڑتے رہے ۔ دراصل ان غباروں کے نیچے یہ ایک آلہ لگا دیتے تھے جس پر یہ نوٹ تھا کہ یہ آلہ جس شخص کو ملے
اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فزکس ڈپارٹمنٹ کو واپس کر دے ۔ اسے آنے جانے کا خرچ اور انعام دیا جائے گا ۔
شمال کی جانب تھا باری باری یہ غبارے اسی طرف کو روانہ ہو گئے ۔ دوسرے دن تقریباً سارے ہی اخبارات میں ہ
ہمالہ کی طرف اڑن طشتریاں دیکھی گئیں جو نیپال کی طرف چلی گئیں ۔ جن کو معلوم تھا وہ ہنسے لیکن گل صاحب کو ب
دینا پڑا کہ وہ اڑن طشتریاں نہیں بلکہ ہمارے اڑائے گئے تجرباتی غبارے تھے ۔ اس میں غلطی اخبار والوں کی بھی نہیں ت
اڑن طشتریوں کا خوب چرچہ تھا ۔ روزانہ ہی کوئی نہ کوئی خبر شائع ہوتی کہ آج ناروے میں تو کل سویڈن میں یا پھر جر
طشتری دیکھی گئی ۔ خبروں کی اس گہما گہمی میں ہمارے اخبار والوں نے سوچا کہ لو آج دور کی کوڑی ان کے ہاتھ لگ گئ
سائنس داں اس تجربہ سے انہیں شعاعوں کے ذرات کو شمار کرنا چاہتے تھے اور دیکھنا چاہتے تھے کہ کرہ ارض کی بد
شمار کیا ہے ۔ سنا ہے کہ ان سات میں سے صرف ایک آلہ جو واقعی نیپال کے بارڈر پر گرا تھا کسی نے لا کر دیا تھا ۔

ہم اپنی عام بول چال میں قیامت کے دن کا ذکر کرتے ہیں ۔ شعرا درازی وقت کے اظہار کے لیے قیامہ

ذکر کر لیتے ہیں ۔ لیکن علی گڑھ میں بھی ایک قیامت کی رات نوواردوں کے لیے مشہور تھی ۔ ہر نیا آنے والا ہانپتے کانپتے دلوں سے اس کا انتظار کرتا تھا۔ مگر یہ رات فائنل الاٹمنٹ کے بعد ہی آتی تھی ۔ اللہ اللہ کر کے داخلے مکمل ہونے اور پھر سینیئر طلبہ سے مشورے کے بعد نوواردوں کے بھی کمرے طے کر دیے گئے ۔ خاکسار کو ۱۸ نمبر کا کمرہ ملا ۔ اس میں چھوٹا سا بیک روم بھی تھا جہاں سامان وغیرہ رکھا جا سکتا تھا ۔ اسی کے ایک حصہ میں غسلخانہ تھا۔ اس وقت ہر کمرہ میں غسلخانہ ضرور ہوتا تھا ۔ بیت الخلاء ہوسٹل کے ایک سرے پر بنے ہوتے تھے صرف آفتاب ہوسٹل ایسا تھا جہاں کمروں میں غسلخانے نہیں تھے ۔ روم پارٹنر میاں حامد (جانی میاں) ملے ۔ یہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ سنبھل کے رہنے والے تھے اور تعلق سے اپنے نانا اور اپنے دادا کے اکلوتے تھے ۔ زمیندارانہ فضا میں پلے بڑھے تھے ، اب آپ خود تصور فرمالیں کہ کیا چیز رہے ہوں گے ۔ کمرہ نمبر ۲۰ میں چینگوندائل رکھے گئے لیکن میری اور ان کی دوستی اس وقت تک رہی جب تک وہ آفتاب ہوسٹل میں منتقل نہیں ہو گئے ۔ جانی میاں کے لوکل گارجین (قاری) محمود صاحب تھے جو اس وقت رجسٹرار تھے ۔ شوق میں جانی میاں نے بھی I.Sc. میں داخلہ لے لیا مگر سائنس والوں کی انگریزی کی کلاس پہلے پیریڈ میں لگتی تھی اور وہ بھی وہاں جہاں اب انجینیرنگ کالج کی ورکشاپ ہے ۔ صبح صبح اٹھ کر بھاگنا پڑتا تھا اور میاں جانی ٹھہرے چندر مکھی اور سورج مکھی ۔ بغیر سورج دیکھے بستر کیسے چھوڑ سکتے تھے ۔ نتیجہ کے طور پر روزانہ لیٹ ہوتے اور نووارد ہونے کے سبب اساتذہ سے سنتے ۔ آخر تنگ آ کر بھائی نے محمود صاحب کی مدد سے I.Sc. چھوڑ کر I.A میں داخلہ لے لیا ۔ بعد میں حضرت نے B.A اور پھر B.Ed کیا اور آج کل دلی کے ایک سیکنڈری اسکول میں استاد ہیں ۔

انگریزی کے استادوں میں اس وقت بی ۔ اے خاں صاحب ، سلامت اللہ صاحب ، اسلوب احمد انصاری صاحب ، مسعود صاحب اور منیر صاحب قابل ذکر ہیں ۔ اول دو تو اب اس دار فانی میں موجود نہیں ہاں بعد کے تینوں اساتذہ الحمدللہ ابھی سلامت ہیں ، اللہ انہیں تندرستی اور لمبی حیات سے نوازے ۔ ہر استاد کا اپنا الگ اسٹائل تھا ۔ بی ۔ اے خاں صاحب جونیئرز کی کلاسیں نہیں لیتے تھے ۔ سلامت صاحب کافی وجیہ تھے ۔ انداز فکر پر کمیونزم کا غلبہ تھا مگر خود ہیرے کی کافی گراں انگوٹھی پہنتے تھے ۔ ویسے بھی خوش لباس تھے ۔ ایک دن ویسے ہی بات چیت کے دوران خاکسار نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ بزرگوار آپ جس انداز فکر کو بہتر سمجھتے ہیں اس کے تحت یہ کچھ مناسب نہیں لگتا کہ آپ اتنی قیمتی ہیرے کی انگوٹھی زیب تن کریں تو موصوف مسکرائے اور فرمایا تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ میں نے خریدی نہیں ہے بلکہ سسرال والوں نے دی ہے ۔ سلامت صاحب ایک اچھے استاد تھے ۔

اسلوب صاحب اسکالر ٹائپ کے استاد تھے ۔ کم گو اور نرم گو ۔ آہستہ آواز میں گفتگو فرماتے مگر وقت کے بے حد پابند ۔ شیروانی اور پتلی مہری کا پائجامہ (وہ آج بھی) زیب تن فرماتے ہیں ۔ مسعود صاحب بھی اسلوب صاحب سے کافی ملتے تھے مگر یہ ان سے زیادہ کھلے ہوئے تھے (آج بھی ان کا انداز ویسا ہی ہے) اور منیر صاحب جو آج کل ایک پبلک اسکول چلا رہے ہیں ، ان سے بات چیت کیجیئے تو ان کے انداز میں اب بھی کوئی فرق محسوس نہیں ہو گا ۔ یہ کچھ دن فوجی اسکول میں بھی پڑھا آئے تھے ۔ لہٰذا ڈسپلین کی وہی توقع یہ اپنے سویلین (Civilian) طلبہ سے بھی کسی حد تک کرتے تھے ۔

دیگر مضامین کے اساتذہ کا ذکر انشاءاللہ بعد میں آئے گا ۔ فی الحال اس قیامت خیز شب کا ذکر ہو جائے جس کا ہر نووارد دھڑکتے دل کے ساتھ منتظر رہا کرتا تھا ۔ میرا مطلب انٹروڈکشن نائٹ سے ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ذکر سے پہلے اس وقت کے عام ماحول پر اگر ایک نگاہ ڈال لی جائے تو زیادہ لطف آئے گا ۔

--- --- ------

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ اس وقت صرف چار ہال تھے یعنی سر سید، آفتاب، وی۔ایم اور سر شاہ سلیمان۔ این۔ آر۔ ایس۔ سی اور وومنز کالج کو وہ درجہ حاصل نہ تھا جو ان ہالوں کو تھا۔ ان کا نظم و نسق تقریباً سینیئر طلبہ اپنے اساتذہ (پرووسٹ اور وارڈن صاحبان) کی نگرانی میں چلاتے تھے۔ مثلاً ہر ہال کا ایک سینیئر ہال مانیٹر ہوتا تھا جو بہت بڑی چیز تھی۔ نہ صرف یونیورسٹی کے امور میں وہ ایک مشیر کا درجہ رکھتا تھا بلکہ یہاں سے جانے کے بعد بھی، نوکریوں وغیرہ کے لیے بھی اس کی اہمیت تھی۔ اور واقعی وہ کوئی بہت فعال اور ہر اعتبار سے اس پوسٹ کا اہل ہوتا۔ پڑھنے لکھنے، کھیل کود اور ثقافتی زندگی میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں ہوتا تھا۔ وہ خصوصاً پرووسٹ کا براہ راست مشیر ہوتا۔ اسی طرح ہر ہوسٹل کا ایک سینیئر ہاؤس مانیٹر ہوتا یہ ویسے تو سینیئر ہال کے تحت ہوتا مگر اپنے وارڈن کا مشیر اور ان کی صلاح پر کام کرتا۔ اس کے پاس ایک حاضری رجسٹر ہوتا جس میں وہ تمام طلبہ کی حاضری لگاتا۔ اگر کسی کو باہر جانا ہوتا یا وقتی رخصت کی ضرورت ہوتی تو وہ اسی سینیئر ہاؤس کو اپنی درخواست دیتا جسے وہ اپنے وارڈن سے منظور یا نامنظور ... کی رپورٹ پر تادیبی کارروائی، کھانے کا ڈائننگ ہال سے اجرا یا منسوخی ہوتی۔ یہ بھی ایک اہم پوسٹ ہوتی تھی۔ ... تو اب بھی یہ پوسٹیں موجود ہیں مگر شاید ان کی اہمیت اپنے کمروں کے باہر تختیاں لگانے سے آگے کچھ نہیں ...

اسی زمانے میں (۱۹۵۰ میں) ہر طالب علم کے لیے ضروری تھا کہ داخلہ پورا کرانے کے بعد دس دن کے اندر اندر اپنی شیروانی سلوا لے۔ گرمیوں کے لیے سفید یا بادامی اور سردیوں کے لیے کالی شیروانی لازمی تھی۔ اسی طرح طالبات کے لیے کالے برقعے کی ہدایت تھی۔ سارے ملک کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں علی گڑھ والوں کی نقل میں کالی شیروانیاں اور کالے برقعے پہنتے یہ برقعے پرانے برقعوں سے مختلف ہوتے جو آج بھی اکثر دکھائی دے جاتے ہیں۔ یہ باتیں اس وقت بھی پراسپیکٹس میں لکھی ہوتی تھیں اور آج بھی لکھی جاتی ہیں۔ مگر اس وقت واقعتاً دس دن کے بعد طالب علم اپنی کلاس میں بغیر شیروانی کے داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح شہر جانا یا کوئی فنکشن اٹینڈ کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ آج طلبہ سے داخلے کے وقت "گرم شیروانی کے کپڑے کا پیسہ لے لیا جاتا ہے مگر اب رواج شیروانی کا تقریباً غائب سا ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری بات بڑی اہم یہ تھی کہ ہر رات (حتیٰ کہ چھٹیوں میں بھی) ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے سائرن بجتا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب ہوسٹل کی طرف چلو۔ ہر طالب علم کو نو بجے تک اپنے اپنے ہوسٹل میں آنا لازم تھا۔ نو سے دس بجے تک وہ طلبہ داخل ہوتے جن کے پاس وارڈن کا منظور کردہ پروانہ ہوتا۔ دس بجے کے بعد کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اور صرف وہ شخص آ سکتا تھا جس کو خاص اجازت نامہ دیا گیا ہو۔ یہ عام طور پر ایم۔اے، ایم۔ایس سی یا پی۔ایچ ڈی کے طلبہ کو ملتا تھا جو اپنے اپنے شعبوں کی لائبریریوں میں یا پھر لیبوریٹریوں سے دیر میں لوٹتے۔ مگر نو بجے کے بعد ہر آنے والے کو اپنا نام گیٹ پر ہوسٹل کے رجسٹر میں درج کرنا ہوتا جو دوسرے دن سینیئر ہاؤس کے پاس آتا جسے وہ وارڈن کو پیش کرتا۔ اس پر اگر کارروائی کی ضرورت ہوتی تو سینیئر ہاؤس پرچی جاری کرتا کہ آپ فلاں وقت وارڈن سے ملیں۔ یہ پرچی تھانے کے سمن سے کم نہ ہوتی۔ اس میں کوئی رعایت نہ ہوتی۔ وارڈن کبھی سمجھا کر، کبھی ڈانٹ پھٹکار کر، کبھی تحریری وارننگ اور کبھی فائن کے ذریعہ معاملہ کو نمٹاتا۔ زیادہ سنگین معاملہ ہوتا تو روم شفٹ کر دیا جاتا اور اگر معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہوتا تو پرووسٹ کو رپورٹ ہوتی معطلی ہوتی، فائن ہوتا یا ہوسٹل شفٹ کر دیا جاتا۔ خصوصاً سینیئر طلبہ اپنے لیے بے حد شرمندگی کی بات تصور کرتے کیونکہ ہر ایسے حکم سے متعلق نوٹس کمرے کمرے گھما دیا جاتا۔ معاملہ اگر اس سے بھی

زیادہ سنگین ہوتا تو ایک ماہ یا دو ماہ کے لیے معطلی (Suspension) یا سال کے آخیر تک کے لیے معطلی، مخصوص مدت کے لیے شہر کا جانا بند (Out of bond) یا پھر بہت ہی سنگین جرم کی پاداش میں رسٹیکیشن تک کر دیا جاتا۔ رسٹیکیشن عام طور پر مارپیٹ یا امتحان وغیرہ میں غیر قانونی حرکت کے باعث ہوتا۔

اسی طرح کا ایک اور نظام کھانے کا بھی تھا۔ہال کے چار وارڈنوں میں سے ایک کچن کا بھی انچارج ہوتا۔(آج کل یہ ایک پوسٹ بن گئی ہے)۔اس کے ساتھ طلبہ کی ایک ٹیم ہوتی جس میں ایک سینیئر ہال فوڈ مانیٹر اور ہر ہوسٹل سے ایک ایک فوڈ مانیٹر شامل ہوتا۔ یہ لوگ کچن کی پوری دیکھ بھال کرتے۔ ٹھیکیدار کی نگرانی ہوتی،ہفتہ میں ایک میٹنگ ہوتی جس میں ہفتہ بھر کا مینو اور سوئٹ ڈش طے کی جاتی، یہ مانیٹر باری باری سے (اپنی اپنی ڈیوٹی کے تحت) یہ دیکھتے کہ اشیاء کی طے کردہ مقدار استعمال کی جارہی ہے یا نہیں۔اس کے علاوہ جب کھانے نکال کر بیروں کو دیے جاتے تو بھی یہ مانیٹر وہاں ہوتے کہ دی جانے والی مقدار ٹھیک ہے یا نہیں۔ پھر بھی باورچی جو ٹھیکیدار کے ہی زیر اثر ہوتے اپنی ہاتھ کی صفائی دکھانے سے باز نہ آتے۔اور پھر۔بیرے؟ آٹھ کھانوں کے نو کھانے بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کمال تھا۔ اکثر طلبہ ان بیروں کو پیسے دیتے کہ ایک کھانا زاید (Guest Ticket) لے آنا۔ کھانا آجاتا اور پیسے بیروں کی جیب میں۔ مگر جب پکڑے جاتے تو پوری لعن طعن ہوتی۔سال کے اختتام پر سالانہ ڈنر، سرسید ڈے ڈنر اور نمائش کا ڈنر ان سب کا اہتمام بھی یہی سینیئر فوڈ کرتا۔ٹھیکیدار صاحب ان مانیٹر ان کو خوش رکھنے کے لیے اکثر سوئٹ ڈش کی ایک آدھ پلیٹ چکھنے اور پاس کرنے کے لیے بھیجتے رہتے لیکن جو سخت ہوتے وہ ان کی ان مہربانیوں سے متاثر نہ ہوتے۔ آج جبکہ اکثر ہالوں میں ڈائننگ ہال میں طلبہ کی رہائش ہے وہ تصور اب تقریباً معدوم ہوتا جارہا ہے۔ کوئی طالب علم بغیر بغیر شیروانی کے ڈائننگ ہال میں بھی داخل نہیں ہوسکتا تھا۔اب تو ڈائننگ ہال کیا کلاسوں، جلسوں، تقریبوں یہاں تک کہ نمائش تک میں طلبہ بغیر شیروانی کے گھومتے رہتے ہیں۔ان میں اور ایک غیر علیگ میں کوئی امتیاز نہیں۔ورنہ ہر علیگ اپنی شیروانی سے جس پر یونیورسٹی کا مونوگرام لگا ہوتا اور اس کے جیب میں اس کا شناختی کارڈ ہوتا اور اپنے طور طریقوں سے جس میں شوخی تو ہوتی جو زندہ دلی کی علامت ہے، بدتہذیبی ہرگز نہ ہوتی، الگ پہچانا جاتا۔ آج کا حال ہمارے اور آپ کے سامنے ہے۔یہ ایک سوالیہ نشان بن کر بار بار ابھرتا ہے کہ آخر اس کا ذمہ دار کون ہے۔؟ کوئی ان سے پوچھے کہ آپ کو شیروانی پہننے سے کون روکتا ہے، آپ کو با ادب ہونے سے کون منع کرتا ہے؟ آپ سے کون کہتا ہے کہ آپ اپنی امتیازی شان خود ہی کھو بیٹھیں جس پر ساری دنیا کے علیگ فخر کرتے تھے؟

ایک تیسرا نظام پروکٹوریل سسٹم تھا۔ہر ہوسٹل سے ایک ایک وارڈن کے اوپر ہر ہال سے ایک اور ان سب کے اوپر پوری یونیورسٹی سے منتخب کردہ ایک سینیئر پروکٹوریل مانیٹر (SPM) ہوتا تھا۔یہ پوری ٹیم پروکٹر کے زیر نگرانی کام کرتے تھے

پروکٹوریل مانیٹر اکثر دو دو ساتھ ہوتے اور طلبہ کو اسٹیشن پر، سنیما گھروں پر اور نمائش میں چیک کرتے۔یہ سارے طلبہ خود شیروانیوں میں ملبوس ہوتے۔ کالر تک کے بٹن بند۔سر پر کوئی سی ٹوپی (پہلے ترکی ٹوپی ہوا کرتی تھی جو تقسیم وطن کے بعد بدلنے لگی اور اس کی جگہ مختلف ٹوپیاں آنے لگیں)۔

ع ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ

ان لی اپنی جیبوں میں خود ان کے شناختی کارڈ ہوتے اور سینہ پر سفید رنگ کا چمکتا ہوا تمغہ ہوتا جس میں بڑا سا P ہوتا۔ یہ کسی بھی طالب علم کو ہوسٹل سے باہر چیک کر سکتے تھے۔ ان کی رپورٹ پر سخت سے سخت سزا مل سکتی تھی۔ ظاہر ہے ان طلبہ کا انتخاب بہت ٹھوک بجا کر ہوتا تھا اور خاص طور پر SPM ہونا تو بہت ہی بڑے اعزاز کی بات تھی۔ یہ طلبہ بعد میں اگر پولس کے افسر یا ڈپٹی مجسٹریٹ وغیرہ کے لیے امیدوار ہوتے تو ان کے اس تجربے اور اعزاز کو وزن دیا جاتا۔

اس وقت پروفیسر محمد شفیع مرحوم سربراہ کامرس ڈپارٹمنٹ (اس لیے کہ اس وقت تک کامرس کی الگ فیکلٹی قائم نہیں ہوئی تھی) پرو کٹر تھے۔ (ان کی تفصیلات بعد میں آئیں گی) اور ان کے نائب یعنی ڈپٹی پرو کٹر مختار صاحب (جو اپنے قد و قامت کے اعتبار سے دوستوں میں مختار گھوڑا کے نام سے معروف تھے) ایک علیگ کا پورا نمونہ تھے۔ آپ جغرافیہ کے اچھے استاد تھے۔ طلبہ میں ہر دل عزیز بھی تھے لیکن سخت گیر بھی اتنے ہی تھے۔ خواہ کوئی موسم ہو وہ شیروانی پہنتے (گرمیوں میں عام طور پر ہلکی بادامی دھاریوں والی اور سردیوں میں سیاہ شیروانی زیب تن فرماتے) مگر سر پر ہمیشہ ترکی ٹوپی ہوتی۔ ان کی یہ وضع ریٹائرمنٹ کے بعد تک قائم رہی۔

ان تین کے علاوہ ایک چوتھا نظام اور بھی تھا اور بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نظام کو تھیوڈور ماریسن نے سر سید علیہ رحمہ کی زندگی میں ہی قائم کر دیا تھا۔ وہ نظام ہے پریئر مانیٹر (Prayer Moniter)۔ اس کے تحت ہر ہال میں دو سینئر ہال پریئر مانیٹر (ایک سنی اور دوسرا شیعہ) اور ان کے ساتھ ہر ہوسٹل میں ایک ایک پریئر مانیٹر ہوتے تھے۔ سر سید کے زمانے سے غیر حاضری پر دو پیسے کا فائن بھی ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۰ء تک گھٹتے گھٹتے یہاں تک آ گیا تھا کہ پریئر مانیٹر مقرر تو ہو جاتا تھا اور اس کو نماز کی حاضری کا ایک رجسٹر بھی دیا جاتا تھا (یہ خاکسار خود ۵۱-۱۹۵۰ء میں میکڈانلڈ کا پریئر مانیٹر مقرر کیا گیا تھا۔) مگر اس کا کام بس اتنا رہ گیا تھا کہ وہ کمرہ کمرہ جا کر نماز کی طرف ساتھیوں کو راغب کرے۔ آج شاید اب وہ بھی نہیں رہا۔ صرف سینئر پریئر مانیٹر مقرر ہوتا ہے جو کمرے کے باہر تختی لگانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتا۔

یہ بات بھی قابل تحریر ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک ایسا اقامتی تعلیمی ادارہ ہے جہاں کی تقریباً ہر اقامت گاہ میں ایک مسجد ہے اور اس مسجد کا امام اور وہاں کا موذن دونوں ہی یونیورسٹی کے باقاعدہ ملازم ہیں۔ ان کو وہ ساری مراعات حاصل ہیں جو یونیورسٹی کے کسی بھی دیگر ملازم کو ملتی ہیں۔ مثلاً گریڈ، ترقی، پی ایف، گریجوٹی، سالانہ چھٹی، رہائشی مکان، پنشن وغیرہ۔ اس اعتبار سے اگر ہم دیکھیں تو شاید پورے وطن عزیز میں ایسی مثال کہیں اور دکھائی نہیں دے گی۔ ان ائمہ مساجد اور موذن صاحبان پر ایک ناظم مقرر ہیں اور وہ بھی یونیورسٹی کے باقاعدہ ملازم۔ یونیورسٹی کی جامع مسجد کے امام صاحب کو جو درجہ اور اسٹیٹس (Status) حاصل ہے شاید ہندوستان کی کسی مسجد کے امام کو حاصل نہیں۔ وہ لوگ جو سر سید علیہ رحمہ پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں ذرا غور فرمائیں کہ اس "نیچری" کے قائم کردہ اس ادارہ میں ان دینی پیشواؤں کا کیا احترام اور عزت ہے کیا وہ اس کی مثال کہیں اور پیش کر سکتے ہیں؟ آج (۱۹۹۵ء) میں الحمدللہ اس یونیورسٹی میں ساٹھ سے زیادہ ہوسٹل ہیں۔ اکثر کی الگ مسجد ہے، بعض جگہ چار ہوسٹلوں کے لیے ایک مسجد قائم ہے۔ ہر کے لیے امام اور موذن مقرر ہیں۔ پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ رمضان میں تراویح اور کئی جگہ تو جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے۔ (باقی آئندہ)



بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت
شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ
کے لئے
جملہ مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں
کے لیے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے
پھنسی، خارش اور داد
کھجلی کی دوا
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

ایک مکمل ہیلتھ ٹانک، بلکہ اور بھی بہت کچھ!



سنکارا

آپ کی صحت کے لیے ایک بھرپور ٹانک

سنکارا لازمی عناصر، جڑی بوٹیوں اور وٹامنوں کا نادر مرکب ہے۔ اس میں آئرن، کیلشیم اور زنک کی کافی مقدار ہے۔ انتہائی اہمیت، سنکارا میں الکحل بالکل نہیں ہے۔ سنکارا آپ کی کس طرح مدد کرتا ہے؟

اسکول جانے والے بچوں کے لیے:

سنکارا جسمانی اور ذہنی توانائی بڑھانے میں مدد کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنکارا میں موجود مقوی عناصر، خصوصاً زنک اور آیوڈین، جو دماغ کے خلیوں کو مناسب مقدار میں غذا فراہم کرتے ہیں۔ یہ قوتِ حافظہ کی صلاحیت بھی بڑھاتا ہے۔

حاملہ خواتین کے لیے:

سنکارا حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی ماؤں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس میں ماں اور بچے کی صحت کے لیے ضروری فولک ایسڈ، وٹامن بی ۱۲، آئرن، کیلشیم اور زنک کافی مقدار میں ہیں۔

بالغوں کے لیے:

دباؤ اور تناؤ بھری اس دنیا میں سنکارا مہلک امراض سے حفاظت کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ سنکارا دورانِ خون کو معمول کے مطابق رکھنے اور گردے اور جگر کے اطراف میں کثافتوں کے جمع ہونے سے روکنے میں مدد کرتا ہے۔

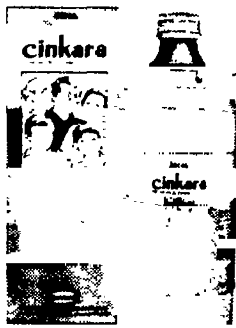
ضعیفوں کے لیے:

سنکارا ضعیفوں کے لیے قابلِ مثال اور طاقت بحال کرنے والا ٹانک ہے۔ اعتدال میں کمی آجانے کے سبب پیدا ہونے والے امراض اور ضعیفی میں پریشان کرنے والی بیماریوں سے حفاظت کرتا ہے۔ ان میں اکثر امراض کا سبب خراب اور غیر متناسب غذا ہے۔

تو آج ہی سنکارا لے آیئے۔ یہ پورے خاندان کے لیے قابلِ مثال صحت بخش ٹانک ہے۔

چند مشہور ٹانکوں میں موجود آئرن، کیلشیم، زنک اور الکحل کی مقدار (فی خوراک) کا موازنہ۔

Reputed brands of tonics	Iron (mg)	Calcium (mn)	Zinc (mg)	Alcohol content percent (V/V)	Contents per unit pack
1	–	12 4	–	12.00	400
2.	–	–	–	11.0	240
3.	9.68	–	–	–	454
4	13.00	–	–	–	200
5.	21 50	–	0.00682	5.5	200
6.	.16.709	–	–	–	300
7	–	–	–	–	200
8.	7 63	–	0.50	–	100
9	5.80	9.50	–	9.5	300
Cinkara	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]



لازمی بنیادی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب

ہمدرد

سنکارا

مشہور عالمی فیملی ٹانک، ہر موسم میں سب کے لیے

Chalsa Leo Burnett D HWL 1491 (Rd)

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۴ — اپریل ۱۹۹۵ء — شمارہ ۴

بانی: سرسید احمد خاں

مدیر

پروفیسر مسعود عالم

نائب مدیر

احمد مجتبیٰ قریشی

سرکولیشن انچارج: محمد عتیق

فی شمارہ:	6-50	روپے	زرسالانہ: 65-00	زرسالانہ طلبہ	45-00 روپے
بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک)	30-00	امریکی ڈالر	بیرونی ممالک (عام ڈاک)	15-00	امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ (اندرون ملک)	650-00	روپے	لائف ممبرشپ (بیرون ممالک)	300-00	امریکی ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق ادارہ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۰۰۲۲ (یوپی) انڈیا۔ فون: 401027

ترتیب

(تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے متفق ہو)

قاضی مزمل الدین ندوی*

مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کیلئے صالح افرادی قوّت کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو شعور و سلیقہ دیا ہے۔ وہ منظم اور باضابطہ زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ لہٰذا فطری طور پر انسانی مجموعے اپنی اجتماعی زندگی کا توازن برقرار رکھنے کے لئے وفاق بناتے، کسی کو اپنا قائد تسلیم کرتے اور اپنے اجتماعی معاملات کی حدبندیاں قائم کرتے ہیں۔ اس اجتماعیت اور قیادت کے انتخاب کی ضرورت جتنی علاقائی اور قبائلی پیمانہ پر ہوتی ہے اتنی ہی ملکی اور بین الاقوامی پیمانہ پر بھی۔ تاکہ انسانی مفاد کیلئے باہم تعاون کیا جاسکے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دُنیا بے شمار معاشی، سیاسی اور اجتماعی الجھنوں کا شکار ہوتی ہے، اور اس کا حل یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی قانون اور ضابطہ کا پابند بنالے۔ پھر اسکے سائے میں امن و سکون کی زندگی گزارے اور ترقی کی راہیں وسیع اور رفتار تیز سے تیز تر کرتے رہیں، اپنی اس فطری اور واقعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے دنیا مختلف نظریہ ہائے فکر اور فلسفہ ہائے حیات کو اپناتی اور ترک کرتی رہی ہے۔ مختلف زمانوں میں مختلف افراد مختلف نظریے لیکر قیادت کے اسٹیج پر نمودار ہوتے اور غائب ہوتے رہے ہیں اور انسانی تاریخ ریت کے تودوں کی طرح بنتی اور بگڑتی رہی۔

انسانی زندگی کی ترقی و انحطاط اور عروج و زوال کی تاریخ میں اسلام نے ایک کامیاب رول ادا کیا ہے، اور دنیا کے سامنے ایسا مضبوط اور ہمہ جہتی نظام حیات پیش کیا ہے جو دنیا کے تمام نظاموں پر اس اعتبار سے فوقیت رکھتا ہے کہ وہ ایسے انسان کی ذہنی اپج نہیں جو کسی مخصوص طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جسے بالضرور کسی انسانی گروہ سے دلچسپی اور لگاؤ ہوتا ہے جو اپنے کچھ ذاتی اور شخصی احساسات، جذبات اور رجحانات رکھتا ہے بلکہ یہ اس خالق کائنات کا وضع کردہ قانون ہے جو اس کائنات کا مدبر بھی ہے اور جس کا علم اور قدرت کائنات کے ذرہ ذرہ پر محیط ہے۔

زندگی کے عملی میدان میں جب اس قانون خداوندی کو بالادستی حاصل ہوئی تو دنیا نے دیکھا، مسلمانوں کے عہدِ قیادت کی تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ لوگ صدقات و خیرات لے کر نکلتے اور کوئی مستحق نہ ملتا تھا۔ ایک نوجوان عورت سونے سے لدی ہوئی ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تنہا پیدل سفر کرتی اور کوئی شخص اس کے جان و مال اور عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ غربت دور ہوگئی خوشحالی عام ہوگئی۔ عدل و انصاف کا ایسا ماحول پیدا ہوا کہ کہا جانے لگا: "بکری اور بھیڑیا ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں۔" اخلاقی قدریں قائم ہوئیں۔ زندگی کے تمام میدانوں سے کرپشن ختم ہوگیا اور انسان سعادت کی زندگی گزارنے لگا۔

---

* سرسیّد کالونی، نندربار، ۴۲۵۴۱۲ دھولے، مہاراشٹر

اسلام ساری انسانیت کے لئے رحمت کا آسمانی پیغام بن کر آیا۔ وہی اس کا مستحق ہے کہ اسے زندگی کا دستور العمل بنایا جائے۔ اسکی بالادستی تسلیم کی جائے اور قیادت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دی جائے۔

لیکن کسی نظام حیات کی صرف نظریاتی قوت ہی اس کے نافذ العمل ہونے کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے ایسا عملہ بھی درکار ہے جو اس نظام سے جذباتی لگاؤ رکھتا ہو اور ساتھ ہی قیادت کی مطلوبہ صفات کا حامل بھی ہو۔ اس پر عبقریت کا اطلاق کیا جاسکے ۔ وہ اپنے نظام کا گہرا اور تفصیلی علم رکھتا ہو۔ اس کی روح سے واقف اور اس کی بنیادوں اور اصولوں کا زبردست شعور رکھتا ہو۔ ساتھ ہی وہ زندگی کی ضرورتوں اس کے تقاضوں اور دنیا کی الجھنوں کا واقف کار بھی ہو۔ انتہائی ذہانت اور باریک بینی کے ساتھ زندگی کی ضرورتوں کی تشخیص کرے اور اپنے نظام کی روشنی میں اس کا مناسب حل تجویز کرسکے ۔ پھر اس کے قابل عمل ہونے اور دنیا کی الجھنیں دور کرسکنے کی صلاحیت کا دنیا سے اعتراف کرائے اور آگے بڑھ کر اپنی عملی قوت سے اسے نافذ کرے۔ پھر جو وسائل و مواقع حاصل ہوں ان کو کام میں لاتے ہوئے دنیا کو فلاح و کامیابی اور نجات سے ہمکنار کرنے کے لئے صالح جدوجہد کرے۔

اسلام کے داعی اور معلم اول محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کے سامنے اسلام کا مکمل و جامع نظام حیات پیش کیا اور ساتھ ہی ایسی آدم گری اور مردم سازی کی ، ایسا افرادی مجموعہ تیار کیا جس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ انہوں نے جذبۂ للہیت اور حرارتِ ایمانی کے ساتھ روح فرسا مظالم برداشت کئے جب کچھ قوت حاصل ہوئی تو اسلام کی راہ کے کانٹوں کو نہایت انہماک و جستجو کے ساتھ صاف کیا۔ پھر دنیا کے ایک بڑے حصہ پر اسلام کے عادلانہ قانون کے نفاذ نے دنیا کو روشناس کرایا کہ اسلام ہی انکے امن و سلامتی، کامیابی و فلاح اور ترقی و نجات کا ضامن ہے۔ پھر جب بسا اوقات انہیں بعض خطوں سے ہٹ جانا پڑا تو اس کے باشندوں نے مسلمانوں کی حفاظت سے محرومی پر آنسو بہائے۔

جب اسلام کا نظام نافذ ہوا تو ایسی افرادی قوت موجود تھی جو اپنے دین کے ساتھ جذباتی لگاؤ رکھنے ایمان، امانتداری اور دینداری کی اعلیٰ صفات سے متصف ہونے کے ساتھ زندگی کے تمام میدانوں میں قیادت اور لیڈر شپ کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے خلفاء موجود تھے جو اپنی انفرادی زندگی میں تو گلیم پوش اور بوریہ نشین تھے۔ لیکن قیادت کی اعلیٰ ترین صفات سے متصف تھے کہ ہزاروں میل دور رہ کر بیشتر حکمراں عمرؓ کا نام سن کر کانپ جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے خالد بن ولیدؓ کے سامنے حضرت عمرؓ کی کچھ شکایت کی اور فتنہ کا اندیشہ ظاہر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے عمرؓ کے ہوتے ہوئے کسی فتنہ کا اندیشہ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اٹھنے والے فتنوں پر قابو پانے کے لئے سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے جو اقدامات کئے ان سے انکی ذہانت قوت ارادی اور حوصلہ کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

خالد بن ولیدؓ، عبیدہ بن جراحؓ، سعد بن وقاصؓ اور عمرو بن عاصؓ جیسے جرنیل موجود تھے جو زمینوں کے دل چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔ جنگلوں اور بیابانوں سے گزر کر دریاؤں میں گھوڑے دوڑائے اور خدا کی زمین پر خدا کی عظمت کا جھنڈا گاڑ دیا اور تقریباً پچاس لاکھ مربع میل کے وسیع رقبہ میں قانون خداوندی کی بالادستی قائم ہو گئی۔

ربعی بن عامرؓ جیسے سفراء موجود تھے جو لٹکتی ہوئی تلواروں کے نیچے، مسلح دشمنوں کے نرغہ میں اور ظالم بادشاہوں کے درباروں میں ببانگ دہل اسلام کی حقانیت کا اعلان کرنے کی جرأت رکھتے تھے۔ ابوعبیدہؓ حذیفہ بن یمانؓ اور ابوموسیٰ اشعری جیسے خدا ترس عمال (گورنر) موجود تھے۔ علی بن ابی طالبؓ، معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبادہ بن صامتؓ جیسے ماہر علماء اور

عدل پرور قاضی موجود تھے۔ ایسے داعی موجود تھے جو انسانوں کی ہدایت اور پیغام خداوندی کو عام کرنے کیلئے دلوں میں ایک تڑپ رکھتے تھے۔ راتوں میں خدا کے حضور گڑگڑا کر دعائیں کرتے۔ پھر صبح ہوتے ہی اپنے مشن پر روانہ ہوجاتے اور ایسی لگن کے ساتھ لوگوں کو اسلام کی طرف بلاتے کہ ان کے اخلاص کی بدولت خدا نے پوری پوری بستیوں کی ہدایت کے فیصلے فرمائے۔ ایسے سرفروش مجاہدین کی جماعتیں بھی موجود تھیں کہ جب "وَسَارِعُوٓا إِلَىٰ مَغۡفِرَةٖ مِّن رَّبِّكُمۡ عَرۡضُهَا ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلۡأَرۡضُ" کی صدا بلند ہوئی تو انہوں نے ہر قسم کی مادی منفعت، مال غنیمت کی لالچ اور کشور کشائی کی تمنا سے بلند ہوکر صرف خدا کی خوشنودی کے لئے اپنی جانوں کو قربان کیا۔ "إني لأجد ريح الجنة دون أحد" کا نعرہ لگاتے ہوئے عجیب کیف و سرور کے عالم میں وہ دشمنوں کے جتھوں میں گھستے اور شہادت کے جام نوش کرتے تھے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اپنی قلیل تعداد کے باوجود باطل طاقتوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے افراد کی جیسی تربیت فرمائی۔ ان کی صلاحیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جس طرح انھیں زندگی کے مختلف میدانوں کی قیادت کے لئے تیار کیا۔ پھر انھیں جو ذمہ داریاں سونپی کہ گویا وہ انھیں کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ اور زندگی کے خانے میں جہاں انھیں فِٹ کیا گویا کہ وہ پہلے سے ان کے لئے خالی تھا۔ اس پر کام کرنا علم وتحقیق کا ایک محنت طلب موضوع ہے۔ ہم یہاں چند جزئی واقعات کی جانب اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الناس معادن كمعادن الذهب والفضة خياركم في الجاهلية خياركم في الاسلام" لوگ سونے اور چاندی کی طرح ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں جو لوگ اچھے تھے عہد اسلام میں بھی وہ اچھے ہیں۔ یعنی صلاحتیں اور استعدادیں اللہ نے انسان کی فطرت میں ودیعت فرمائی ہے۔ اپنی فطری خصوصیات کے اعتبار سے جو لوگ اسلام قبول کرنے سے پہلے قابل قدر تھے۔ اسلام لانے کے بعد بھی وہ قابل قدر ہیں۔ چنانچہ خلیفہ ثانی عمر بن خطابؓ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی لگن کے ساتھ دعا فرمائی تھی: "اللهم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب او بأبي جهل بن هشام" اے اللہ اسلام کو عمر بن خطاب یا ابو جہل بن ہشام کے ذریعہ قوت عطا فرما۔ سپہ سالار اسلام حضرت خالد بن ولیدؓ کے اسلام کی بھی آپؐ کو اتنی ہی فکر تھی۔ لہٰذا ان کے بھائی ولید بن ولید سے فرمایا: "کیا اس جیسا شخص بھی اسلام کی سچائی سے ناواقف ہے۔ اگر خالد اسلام لے آئے تو ہم اسے پیچھے نہیں رکھیں گے۔" (حیاۃ الصحابہ) پھر انکے اسلام لانے کے بعد اسلامی لشکر کے ساتھ ان کی سب سے پہلی پیش قدمی اور جنگ موتہ میں ایک دفاعی کارنامہ انجام دینے پر انھیں "سیف اللہ" کا خطاب عطا فرما کر آپؐ نے ان کی کیسی ہمت افزائی فرمائی۔ مدینہ میں ایک ذہین صحابی حضرت زید بن ثابتؓ کو یہودیوں کی مذہبی زبان سیکھنے کا حکم دیا اور انہوں نے اس میں صرف پندرہ دن میں مہارت حاصل کرلی۔ بدر کے قیدیوں کو بڑی بڑی رقمیں لیکر رہا کیا گیا لیکن جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے سردار حضرت ابوسفیان کے ساتھ جو سلوک فرمایا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ قابلِ قدر صلاحیتوں کو دوسرے محاذوں سے ہٹا کر اسلام کے محاذ پر استعمال کرنے کے سلسلہ میں کتنے کوشاں تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت ہوشمندی اور دقت نظر سے ایک قیمتی افرادی مجموعہ تیار کیا اور ۳۱ ا کی تربیت فرمائی

جس سے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اللہ کے بندوں کو غیروں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی سکھائی۔ ادیان وملل کے جور وستم سے نجات دلا کر اسلام کے عدل وانصاف سے روشناس کرایا اور دُنیا کی تنگنائیوں سے نکال کر اسلام کی روشنی میں دنیا کی وسعتوں کی سیر کرائی۔

آج دنیا شدید معاشی بحران کا شکار ہے۔ کرپشن اور انار کی زندگی کے تمام شعبوں میں پھیلی ہوئی ہے اور کسی نئے عالمی نظام کی تشکیل کے لئے سرگرداں ہے۔ سرمایہ داری کو منسوخ قرار دیا جا چکا۔ کیونزم اور سوشلزم کو بھی بیخ وبن سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے۔ جمہوریت کے پاس بھی دُنیا کے امن وسکون اور نجات کا سامان نہیں ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اسلام ہی دنیا کی الجھنوں اور اس کے تمام مسائل کا کامیاب حل پیش کر سکتا ہے۔

لیکن اسلام کے پیغام رحمت کو عام کرنے، موجودہ حالات میں زندگی کے مسائل کا صحیح حل دریافت کرنے اور اس کے نفاذ کو تکمیلی مراحل تک پہنچانے کے لئے زبردست افرادی قوّت کی ضرورت ہے۔ صحافت زمانہ کے نئے ادب، تعلیم، علمی قیادت، سیاست، سیادت اور زندگی کے مختلف میدانوں میں کام کرنے والے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو دنیا پر اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا سکّہ جما دیں۔ دنیا کی اقلیت، ثقافت اور کلچر کے رگ ریشہ میں سرایت کر جائے۔ دنیا کے ادب اور فلسفہ کے چمن میں اپنا نشیمن بنا لیں اور زندگی کے تمام شعبوں پر اس طرح چھا جائیں کہ متمدن دُنیا ان کی عقل سے سوچنے، ان کی زبان سے بولنے اور ان کے قلم سے لکھنے پر مجبور ہو جائے۔ ان کا ایمان قوی اور تمنائیں جلیل ہوں۔ وہ مادہ اور معدہ کی دنیا سے آزاد ہو کر خدا کی خوشنودی کے لئے جینا چاہتے ہوں، ان کی عبقریت اور کردار کی پاکیزگی کا تجربہ کر کے دنیا اپنی نجات اور ترقی کو انکی ذات سے مربوط کرنے پر مجبور ہو سکتی ہے، کیونکہ دنیا بلندی کے سامنے سرنگوں ہوتی ہے اور دماغ بلند دماغوں کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

آخر میں ہم دینی وعصری تعلیم اور تربیتی وثقافتی سرگرمیوں سے متعلق دوستوں سے عرض کرنا چاہتے ہیں جو مستقبل کے دھندلکوں میں اپنی آئندہ کی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں جو موجودہ حالات میں مسلمانوں کی مظلومیت، بے چارگی اور کسمپرسی سے پریشان ہیں، جو مُسلمان کے ماضی کی کھوئی ہوئی عزت وسربلندی پر آنسو بہاتے ہیں اور اپنے تابناک ماضی کی روشنی میں اپنے مستقبل کی کامیابی کا راستہ تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے مختصر سے مختصر دائرہ کار میں مُسلمانوں کے مستقبل کی بنیادیں نصب کر سکتے ہیں۔ ضرورت عزم وحوصلہ، سنجیدگی استقلال اور عمل وپیہم کی ہے۔ ہمارے انہیں نونہالوں میں ایسے ہونہار، نہایت جینیس عبقری، غیر معمولی قوتِ ارادی کے مالک اور بے مثال عزم وحوصلہ والے افراد موجود ہیں جو اگر اٹھ کھڑے ہوں تو دنیا کو زیر وزبر کر سکتے ہیں۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

آخر میں ہم اپنا قلم قرآن کریم کی اس آیت پر روکتے ہیں؛

لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا ○

پروفیسر محمد سالم قدوائی*

اسلام میں اخلاق کی اہمیت

دُنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں ان سب میں اخلاق کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبین تھے اور ہر چیز کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔ آپؐ نے جہاں زندگی کے تمام دوسرے شعبوں کے لیے منظم اصول پیش کیے وہیں آپ نے اخلاق کو انسانی کردار کی بنیاد قرار دیا اور حسن اخلاق پر زور دیا۔ آپؐ نے فرمایا: "میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں"

عبادات کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ اس سے اخلاق میں بہتری اور کردار میں پختگی پیدا ہو۔ خدا کے نیک اور مقبول بندے وہی ہیں جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیم دیتے تھے اس کا ایک بہت بڑا جزو اخلاق کا تھا۔ اسلام میں اخلاق کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد جو دُعا مانگتے تھے اس میں یہ الفاظ بھی شامل تھے: "اے میرے خدا تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی فرما تیرے سوا کوئی بہتر اخلاق کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔" ایک اور جگہ ہے: "مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔"

دنیا کے سارے مذاہب اخلاق کا ماخذ سوائے خدا کے اور کسی کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ خدا نے اپنے احکام کے ساتھ انسانی فطرت میں بھی اس کو ودیعت رکھا ہے۔ اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ احکام الٰہی سمجھ کر ادا کیے جائیں۔ وہ خدا کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں اور اس میں اور ہمارے ضمیر میں جس قدر مطابقت ہوگی روحانیت اتنی ہی اعلیٰ وارفع ہوگی۔

ایک مسافر کی دیکھ بھال اور ایک مریض کی تیمارداری انسانی فرائض میں بھی داخل ہے اور مذہب بھی اس کا حکم دیتا ہے ایسا کرنے میں ایک طرف تو انسان کو خوشی ومسرت کا احساس ہوتا ہے کہ وہ کسی کے کام آیا۔ دوسری طرف ایک مذہبی فریضہ بھی ادا ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ حکم بھی ہے کہ حسن سلوک تو کرو لیکن اس کے بدلے کے طالب نہ ہو، اگر اپنی کسی غرض یا دنیاوی مفاد کی خاطر حسن سلوک کیا گیا تو وہ نہ تو سماج میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے نہ ہی مذہب اسے پسند کرتا ہے۔ اخلاص نیت ہمارے مذہب کی بنیاد ہے اور یہی حسن اخلاق کا پہلا زینہ ہے۔ اسلام ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ اخلاق کی غرض وغایت کیا ہونا چاہیے۔ ہم بہت سے کام کرتے ہیں جو کسی نہ کسی غرض پر مبنی ہوتے ہیں۔ مثلاً راستہ میں کسی کمزور بوڑھے کے سامان کو اُٹھا کر اس کے گھر تک پہنچا دینے میں ہماری غرض یہ ہو سکتی ہے کہ بوڑھا خوش ہو کر کچھ انعام دے دے یا لوگ یہ دیکھ کر ہماری تعریف کریں، یا لوگ ہمیں بہت نیک اور اچھا انسان سمجھیں لیکن اسلام کا نقطۂ نظر اس سے مختلف ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل ہو، ایک اچھے مسلمان

---

* ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، اے ایم یو۔ علی گڑھ

تہذیب الاخلاق۔ اپریل ۱۹۹۵ء

کی پہچان بھی یہی ہے کہ اس کی رضا کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہ بنایا جائے۔ اخلاق نام ہے انسانوں کے باہمی تعلقات حسن سلوک اور ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عاید ہوتے ہیں، ان کو ادا کرنے کا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے لوگوں کو تجرد، عزلت اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے سے روکا ہے۔ کیونکہ ایسی زندگی میں اخلاق کے استعمال کی گنجایش نہیں ہوتی اور لوگ ایک دوسرے سے دور ہوجاتے ہیں، یہ اسلام کی روح کے منافی ہے۔ اسلام تو اجتماعی زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص سب سے علیحدہ ہوکر لوگوں کی پریشانیوں اور ان کے مسایل کو سمجھے اور حل کرے۔ جو شخص اپنی زندگی کو محدود کرے گا، وہ جماعتی مشکلات کو کس طرح حل کرے گا، دین کی تعلیم و تبلیغ اور لوگوں کی اصلاح اس کے لیے کیوں کر ممکن ہوگی۔ قرآنی احکام کی رو سے انسان کو صرف اپنی بھلائی اور نجات نہیں بلکہ اپنے اہل و عیال اور جاننے والوں کی بھلائی اور نجات کے لیے کوشش کرنا بھی عین فرض ہے۔ حدیث میں ہے کہ " تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگراں ہے اُس سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔"

دُنیا اصل میں ایک ایسا میدان ہے جہاں تمام بنی نوع انسان مل جل کر اپنی زندگی کے راستے طے کرتے ہیں، ایک ساتھ رہنے سہنے اور چلنے میں ظاہر ہے تکلیف بھی ہوتی ہے اور ہر ایک کو دوسرے کا خیال بھی کرنا پڑتا ہے، اس لیے جو شخص ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہوجاتا ہے وہ کامیاب نہیں سمجھا جاتا، اور اسے مذہب کا صحیح نمونہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ایک مسلمان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کا خیال رکھے، مشکلات کو حل کرے، اچھی باتوں اور اچھے عمل کی تاکید کرے اور برائیوں اور غلط کاموں سے روکے، یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے قرآن مجید میں ہے: " تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے لیے لائی گئی ہو، اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بُری بات سے روکتے ہو"۔ اسلام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے اسی لیے ایک دوسرے کی دیکھ بھال اور نگرانی ہر ایک کا فرض ہے اور ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ اپنے بھائی کو گمراہی سے بچائے اور سیدھے اور سچے راستہ پر چلنے کی تاکید کرے۔ حضرت موسیٰؑ کی تعلیم کی بنیاد عدل و انصاف تھی، حضرت عیسیٰؑ نے محض اخلاق کی تعلیم دی۔ برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کا حکم دیا۔ نفرت کے بدلے محبت کا سلوک کرنے کی تاکید کی، لیکن رسول اللہ صلعم کی تعلیم میں ان دونوں کا امتزاج نظر آتا ہے اور کامل انسان وہی سمجھا جاتا ہے جو عادل بھی ہو اور محسن بھی اس لیے کہ خدائے عزوجل عدل اور احسان دونوں کا حکم دیتا ہے۔

اسلام میں اخلاق کی تعلیم پر اس لیے بھی زور دیا گیا ہے کہ اس سے امن و سکون اور صلح و آشتی کا ماحول پیدا ہوتا ہے جو ہمارے مذہب کی روح ہے، دنیا میں امن و امان قایم کرنے اور عدل و انصاف کی بنیاد رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ فتنہ و فساد کا خاتمہ ہو اور اس کے لیے قانون اور اخلاقی حدود کا تعین ضروری ہے۔ قانون انسان کو مجبور کرسکتا ہے کہ وہ برائیوں سے بچے لیکن دل میں ان برائیوں کی طرف سے نفرت اور کراہ پیدا نہیں کرتا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وقتی طور پر برائیوں پر پابندی لگ جاتی ہے لیکن موقع ملتے ہی وہ پھر شروع ہوجاتی ہیں۔ البتہ اگر قانون کے ساتھ اخلاقی قیود کو بھی شامل کردیا جائے تو دل میں ان برائیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے اور انسان ان سے ہمیشہ بچ کر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام قوانین نظام اخلاق پر مبنی ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں ہر جگہ حسن اخلاق، رواداری، اخلاص بھائی چارہ اور محبت پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید اسلامی نظام کی بنیادی کتاب ہے۔ اس میں بھی ہر جگہ اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے اور ہر قانون کو اسی سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ اسلام نے یتیموں، بیواؤں، عورتوں، غلاموں اور اس قسم کے دوسرے لوگوں کو ان کے حقوق دلوائے جو ظلم و زیادتیاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کرتے تھے، ان کو موقوف کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ ایک ایسا ماحول پیدا ہو جہاں لوگ اپنی عزت نفس اور خود داری

کے ساتھ زندہ رہیں اور کوئی شخص اپنے دوسرے ساتھی کو نقصان نہ پہنچا سکے۔

رسول اللہ صلعم کی تعلیمات میں بھی اخلاق کا پہلو ہر جگہ نظر آتا ہے، جب نبوت سے قبل ہر شخص آپ کی عزت و توقیر آپ کے حسن اخلاق ہی کی وجہ سے کرتا تھا امانت و صداقت اخلاق ہی کا ایک حصّہ ہے۔ نبوت کے بعد جب آپؐ نے اعلائے کلمۃ الحق کا سلسلہ شروع کیا تو اپنے پرائے بن گئے اور دوست دشمنی پر آمادہ ہوئے لیکن آپ نے ہمیشہ ان لوگوں سے ہمدردی اور محبت کا ہی سلوک کیا۔ لوگ آپ کو تکلیفیں پہنچاتے تو آپ نہ صرف ان کو معاف کر دیتے بلکہ ان کے لیے دعائے خیر فرماتے۔ اس بوڑھی عورت کا قصّہ تو سب ہی کو معلوم ہے جو آپؐ پر کوڑا پھینکتی اور تکلیف پہنچاتی لیکن جب وہ بیمار ہوئی تو آپ اس کی عیادت کو گئے، اور خدمت بھی کی۔ جنگوں میں جو قیدی آتے تھے آپ ان کے ساتھ اچھے سلوک کا حکم دیتے، غلاموں کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتے، جو لوگ آپ کی خدمت میں رہے ان کا بیان ہے کہ آپؐ نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کہی جس سے ان کو تکلیف ہو۔ کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہ لیا۔ لوگ آپ سے تیز لہجے میں گفتگو کرتے لیکن آپ ان کو نرم گفتاری سے موہ لیتے۔ جو آپ سے ایک بار مل لیتا وہ ہمیشہ کے لیے آپ کا ہو جاتا۔ انتقام کی قدرت کے باوجود معاف کر دینا بڑی بلند ہمتی اور اعلیٰ ترین اخلاق کا ثبوت ہے۔ اس کی زبردست مثال رسول اللہ صلعم نے فتح مکہؐ کے دن قایم کی۔ تمام مجرمین آپ کے سامنے تھے اور سب پر خوف و لرزہ طاری تھا اور سمجھتے تھے کہ آج حضور صلعم ان سے ان کے ایک ایک ظلم کا بدلہ لیں گے، لیکن آپؐ نے نہ صرف ان سب کو معاف کر دیا بلکہ ان میں سے کئی لوگوں کے گھروں کو دار الامن قرار دیا اور کئی لوگوں کے بارے میں کہا کہ جو ان کی پناہ میں آجائے گا وہ معافی پائے گا۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا مذہب ہو جو عفو و درگزر اور ایسے اخلاق کاملہ کی مثال پیش کر سکے۔ اسی عفو و درگزر اور صبر و تحمل کو اخلاق بہادری اور بلند ہمتی سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسے خدا کی خوشنودی اور رضا کا سبب بتایا گیا ہے اور مسلمانوں کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں اخلاقی تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی مثالوں کے ساتھ اسے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ

پیسوں کی زبان

بدعنوانی اور رشوت ستانی جیسے الفاظ ہمارے لیے نئے نہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ہمارے یہاں آج بدعنوانی اور رشوت معمول کا حصہ بن گئی ہے تو شاید غلط نہ ہو۔ گزشتہ چند سالوں سے "چمک" کا پاکستان کے اعلیٰ ترین جمہوری ایوانوں میں بھی چرچا ہے جب کہ ایک سابق وزیر خزانہ ومنصوبہ بندی ڈاکٹر محبوب الحق چند سال قبل یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ پاکستان میں ہر سال اربوں روپے سرکاری خزانے میں جمع ہونے کے بجائے بدعنوانی اور رشوت کی نذر ہو جاتے ہیں۔ تاہم اب یہ مسئلہ صرف پاکستان ہی کا نہیں رہا بلکہ دُنیا بھر میں بدعنوانی اور رشوت ستانی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ مثلاً گھانا کے دارالحکومت میں ایک شخص اپنی کار میں کہیں جا رہا ہوتا ہے کہ اچانک ٹریفک پولیس کا ایک اہل کار اسے رکنے کا اشارہ کرتا ہے اور جب ڈرائیور سڑک کے کنارے کار روک لیتا ہے تو وہ اہل کار اسے بتاتا ہے کہ اس نے ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بائیں جانب موڑ کاٹا ہے۔ لہٰذا اس پر پچاس "یک" کا جرمانہ ہوگا۔ پھر وہ اہل کار جرمانہ کی رقم وصول کر لیتا ہے کوئی رسید جاری نہیں کرتا۔ بیجنگ میں ایک کمپنی کو اپنے ٹیلی فون کی مرمت کرانی ہے۔ اس پر کتنا خرچ آئے گا؟ زیادہ نہیں۔ بس مقامی ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف آفس جانا ہوگا اور متعلقہ اہل کار کی مٹھی گرم کرنا ہوگی۔ لاگورا کے وینی زویلن پورٹ پر آموں کو برآمد کرنے کے لیے ایک شخص دن بھر متعلقہ کاغذات پُر کرتا ہے لیکن آخری لمحے میں ایک اہل کار اس سے معذرت چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے تمام کاغذات دوبارہ پُر کرنے ہوں گے یا پھر وہ "خصوصی فیس" ادا کرے ورنہ اپنے آموں کو بندرگاہ پر سڑتا ہوا دیکھے۔

رشوت ستانی ہر جگہ ہے۔ مصر میں اسے "بخشش" کہا جاتا ہے تو کینیا میں "ڈیش" اور میکسیکو میں "مورڈیڈا"۔ اٹلی اور فرانس میں اچھی شہرت رکھنے والے جج بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں جب کہ برطانیہ میں دو وزراء بدعنوانیوں کے الزامات کے باعث وزارتوں سے استعفیٰ دے چکے ہیں۔ ترقی پذیر دنیا کے ممالک میں معیشت میں بالخصوص جب کہ کمیونزم کے حصار سے نکل کر کیپٹل ازم کے دائرے میں داخل ہونے والے ممالک میں بالعموم بدعنوانی عروج پر ہے جس کے باعث ان ممالک میں سیاسی بے چینی پائی جاتی ہے امریکی صدر کلنٹن کی انتظامیہ نے میامی میں ہونے والی کانفرنس کے ایجنڈے میں بدعنوانی کے نکتے کو شامل کیا جب کہ برطانوی وزیر برائے بین الاقوامی ترقی لنڈا چاکر کا کہنا ہے کہ بدعنوانی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

امریکی حکومت فارن کرپٹ پریکٹیسز ایکٹ کے نفاذ کے ۱۷ سال بعد امیر ممالک سے یہ وعدے لینے میں مئی ۱۹۹۴ء میں کامیاب ہوگئی ہے کہ وہ بھی اپنے اپنے ممالک میں اسی نوعیت کی قانون سازی کریں گے۔ ترقی پذیر ممالک میں تھائی لینڈ سے نائجیریا تک بدعنوانیوں کے خلاف تحریکیں طاقت ور ہوتی جا رہی ہیں۔ برلن سے تعلق رکھنے والے ایک لابنگ گروپ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے سیاسی ذرائع سے

ناجائز فائدہ حاصل کرنے کے خلاف جدّوجہد شروع کرنے کا عندیہ دیا ہے۔ ایسا کیسے اور کیوں ہوگیا؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جب معاشی ترقی کے منصوبوں سے وابستہ افراد نے دیکھا کہ امدادوں سے چلنے والے منصوبے سیاسی ذرائع سے ناجائز فوائد حاصل کرنے والوں کے ہاتھوں ہائی جیک ہوگئے ہیں تو انھوں نے مزاحمت کی ٹھانی۔ غریب عوام کے ساتھ اس سے بڑا مذاق کیا ہوگا کہ خانہ جنگی سے تباہ ہوجانے والے ملک انگولا کے سماجی بہبود کے وزیر نے ۳۰۰ مرسڈیز کاریں درآمد کی ہیں۔

بعض ممالک میں بدعنوانیاں دوسرے انداز میں پھیل رہی ہیں۔ ہانگ کانگ نے ۱۹۷۴ء میں بدعنوانیوں کے خلاف ایک آزاد اور طاقتور کمیشن قائم کرکے کافی نیک نامی کمائی تھی لیکن چین کے ساتھ اس کی بڑھتی ہوئی تجارت نے بدعنوانیوں کے ایک نئے دور کا آغاز کردیا ہے۔ مثلاً گزشتہ سال کسٹم کے ۹ افسران کو چوری کی کاریں اور الیکٹرانک کا سامان چین اسمگل کرنے میں مدد دینے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ چین میں کافی بدعنوانی ہے اور ہانگ کانگ کے حکام کو خدشہ ہے کہ ۱۹۹۷ء میں ہانگ کانگ کے چین کے کنٹرول میں جانے کے بعد بدعنوانیوں کے بارے میں ہانگ کانگ کی اچھی شہرت ختم ہوجائے گی۔ تھائی لینڈ میں عصمت فروشی غیرقانونی فعل ہے تاہم ہزاروں کی تعداد میں عصمت فروشی کے اڈے متعلقہ حکام کی زیرِ سرپرستی چل رہے ہیں۔ یہ اڈے حکام کو ماہانہ ۱۲۰ تا ۶۰۰ ڈالر بطور "نذرانہ" دیتے ہیں۔ بینکاک کی ایک یونیورسٹی کی حالیہ تحقیق کے مطابق شہر کے ایک ہزار "انٹرٹینمنٹ ہاؤسز" مقامی پولیس کو مجموعی طور پر ماہانہ تقریباً ۲ لاکھ ڈالر بطور رشوت ادا کرتے ہیں۔ اس کے بدلے میں پولیس ان مراکز کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔ بینکاک کے ایک ریٹائرڈ پولیس کرنل کے بینک اکاونٹ میں ۹ لاکھ بیس ہزار ڈالر کا پتہ چلا ہے۔ ان مراکز میں ایڈز کا مرض تیزی سے پھیل رہا ہے۔ محکمۂ صحت کے حکام کے مطابق ۴ لاکھ سے زائد تھائی باشندوں میں ایڈز کے وائرس موجود ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر میں یہ وائرس عصمت فروشی کے مراکز سے منتقل ہوئے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود آزاد معیشت کی اصلاحات کا پروگرام جو کہ گزشتہ دو دہائیوں سے جاری ہے اور بجٹ کا خسارہ کم کرنے اور زرِ تلافی میں کمی کرنے پر زور دیتا ہے، اس کے ذریعے بدعنوانیوں پر ضرب کاری لگائی جاسکتی ہے اور ایسا ممکن ہے آج سے پندرہ برس قبل آپ کو یہ جاننے کے لیے کہ کمیونسٹ دنیا اور لاطینی امریکا بدعنوان تھے کسی ذہین آدمی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں پرانے سیاسی اور معاشی نظاموں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا اور ان کی جگہ نئے مقامی سیاسی طاقت کے ذرائع نے لی تھی۔ تاہم اس کے نتائج قابلِ نکتہ چینی تھے۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر آندرے تسیفر کا کہنا ہے کہ آج کے روس میں ہر شخص آزادانہ طور پر رشوت وصول کر رہا ہے۔ بدلتی ہوئی معیشت میں بدعنوانی کا کوئی منظم طریقہ نہیں ہر شخص اپنی راہ پر ہے اور یہ بدعنوانی کو مزید تباہ کن بنادیتا ہے۔ عالمی بینک کے ایک حالیہ سروے کے مطابق ۶۵ فی صد روسی باشندوں کا کہنا ہے کہ سابق کمیونسٹ نظام کے تحت ان کی زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ روس کی اصلاحات کا خواب دیکھنے والے ان دنوں اس خوف میں مبتلا ہیں کہ اصلاحات کے پروگرام کے ساتھ بدعنوانی کا تعلق پیدا ہوجانے کے باعث قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کے ہاتھ مضبوط ہوجائیں گے جن کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کے ہاتھ صاف ہیں۔

وینی زویلا میں کارلوس اینڈریز پیریز کی حکومت نے ۱۹۸۹ء میں آزاد معاشی اصلاحات کا پیکج متعارف کرایا تھا جس کے تحت زرِ تلافی میں کٹوتی کی جارہی تھی اور بعض اداروں کو نجی تحویل میں دینے کا عمل شروع کردیا گیا تھا لیکن یہ اصلاحات بدعنوانیوں کی نذر ہوگئیں اور اینڈریز پیریز کے گرد موجود سیاسی افراد نے اپنے لیے فوری طور پر نئے راستے تلاش کرلیے۔ انھوں نے زرِ مبادلہ کے نئے قوانین کو بڑی چابک دستی سے برآمد کنندگان کے حق میں کردیا اور مطالبہ کیا کہ بیرونی سرمایہ کاروں کو ملک

سے نکال باہر کیا جائے اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے اور وینزویلا کی آزاد معیشت کی نئی پالیسی کے تحت تیزی سے وہاں سرمایہ کاری کرنے والے بیرونی سرمایہ کاروں کو نکال باہر کر دیا گیا۔ ۱۹۹۳ء میں ایک صحافی نے انکشاف کیا تھا کہ وینزویلا کے سینٹرل بینک سے صدر کے "صوابدیدی فنڈ" میں ایک کروڑ ۷ لاکھ ڈالر منتقل کیے گئے تھے۔ کارلوس پیریز کو گزشتہ سال ان کے عہدے سے علیحدہ کر دیا گیا تھا اور رافیل کالڈیرا کی نئی حکومت نے دھمکی دی ہے کہ وہ آزاد معیشت کی اصلاحات کے پروگرام کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک سکتی ہے۔ کچھ کچھ ایسی ہی صورت حال افریقہ میں بھی ہے۔ اس براعظم میں زیمبیا میں ۱۹۹۱ء میں ہونے والے انتخابات ایک اہم پیش رفت تھے جس کے نتیجے میں اصلاحات کے حامی فریڈرک چیلوبا کی حکومت قائم ہوئی تھی، لیکن ان کی حکومت کے متعدد اراکین بدعنوانیوں میں ملوث ہوگئے جب کہ دیگر کو برخاست کر دیا گیا۔ اب صدر چیلوبا کے مخالف کینیتھ کاؤنڈا نے ایک بار پھر صدر کے عہدے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی ہے اور ان کے حامی لوساکا میں ایک نغمہ بجا رہے ہیں جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کینیتھ کاؤنڈا نے اپنے دورِ حکومت میں ملکی خزانے کو بھرا جب کہ صدر چیلوبا ملکی خزانہ خالی کر رہے ہیں۔ اس پروپیگنڈے کے باعث معیشت میں اصلاحات کے نظام کو دھکا پہنچ سکتا ہے۔

امریکا کی وزارتِ خزانہ کے انڈر سیکریٹری اور عالمی بینک کے سابق چیف اکنامسٹ لارنس سمرز کا کہنا ہے کہ ایک موثر تعلیمی نظام بنانے کی نسبت کٹوتی کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ قیمتوں میں اضافہ کر دینا بہت آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ قیمتوں کا لوگوں کی آمدنی کے مطابق تعین کیا جائے۔ ایک ریگولیٹری فریم ورک بنانے کی بہ نسبت کسی صنعت کی نج کاری آسان ہوتی ہے۔

ارجنٹائن میں بھی بدعنوانی عام ہے۔ اس ملک کے صدر کارلوس مینم نے سرکاری ٹھیکوں میں دلچسپی رکھنے والی ایک اطالوی کمپنی سے ایک لاکھ ڈالر کی مالیت کی کار بہ طور رشوت لی تھی۔

جج بھی رشوت وصول کرتے ہیں۔

یہ نائجیریا کا ایک بین الاقوامی ہوائی اڈہ ہے جہاں ایک مسافر ضروری کارروائی کے لیے متعلقہ حکام کے پاس پہنچتا ہے تو ایک سیکورٹی گارڈ اس سے سوال کرتا ہے کہ "کیا آپ کے پاس ہمارے پینے کے لیے کچھ ہے؟" نائجیریا میں بدعنوانی کا مضبوط جال موجود ہے۔ یہاں ڈاکٹرز مریضوں کو منشیات تجویز کرتے ہیں۔ جج صاحب رشوت وصول کرتے ہیں اور تیل کے ریونیو کے لاکھوں ڈالرز حکام کی جیب میں چلے جاتے ہیں۔ نائجیریا میں پہلے ایسی صورت حال نہیں تھی۔ ۱۹۶۰ء میں اس ملک نے برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد موثر سول سروس کو فروغ دیا تھا جو تاجر برادری سے بالکل الگ تھلگ تھی اور سرکاری ریونیو اور اخراجات کی پائی پائی کے لیے حکومت کو جواب دہ تھی۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط تک جب تیل کی برآمد سے ملک کے زرمبادلہ کا ۹۰ فی صد حاصل ہونے لگا تھا ملک میں کافی تبدیلیاں آچکی تھیں۔

اس دوران دو اہم تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ ۱۹۶۶ء میں ملک میں بغاوت ہوئی اور ۱۹۷۳ء میں پٹرولیم کی قیمتوں میں اضافہ ہوگیا۔ نائجیریا میں راتوں رات "پیٹرو ڈالرز" کا سیلاب آگیا اور لوگ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں رہے۔ بینک حکام او ور انوائسنگ کرنے لگے۔ سرکاری حکام نے اپنے ذاتی اکاؤنٹس میں بڑی بڑی رقومات جمع کرانا شروع کر دیں۔ سینئر سول سرونٹس نے بھاری کمیشن وصول کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۹۳ء میں عدالتی دستاویزات میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ملک کے سینئر فوجی حکام اور وزرا کو ساحلی زمینیں نہایت کم قیمتوں پر فروخت کی گئی تھیں۔ اپنے عہدوں کا ناجائز فائدہ اٹھانے والوں میں ملک کے موجودہ طاقتور آرمی جنرل ثانی اباچا وزیر دفاع چیف آف جنرل اسٹاف جنرل اولادیپو دایا وزیر انصاف اطلاعات اور امور خارجہ اور نائیجیرین لیبر کانگریس کے رہنما شامل ہیں۔

ملک کی سرکاری آئیل کمپنی کے سربراہ اور چھ دیگر سینیئر حکام پر ایندھن سے متعلق ایک معاہدے میں ۴ کروڑ دس لاکھ ڈالر کمانے کا الزام عائد کیا گیا تھا تاہم بعد ازاں ان تمام افراد کو رہا کر دیا گیا تھا اور مقدمے کی فائل کو دبا دیا گیا تھا۔

نائیجیریا پر ۱۹۷۶ سے ۱۹۷۹ء تک حکمرانی کرنے والے جنرل اولیوسگن اوباسانجو اس ملک کے وہ واحد فوجی حکمران تھے جنہوں نے سویلین حکمرانی کو بحال کرنے کا وعدہ پورا کیا۔ ۱۹۹۳ء میں بدعنوانی کے خلاف بنائے جانے والے گروپ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل میں وہ نمایاں مقام رکھنے والے افریقی ہیں جو بدعنوانی کے خلاف کامیاب جنگ کے لیے جمہوریت کو متعارف کرانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اوباسانجو کہتے ہیں اوسطاً افریقی فطری طور پر یورپی یا دیگر ممالک کے باشندوں سے زیادہ بدعنوان نہیں ہوتے۔ دیگر ممالک میں انسدادی ادارے اور قوانین ہوتے ہیں جن پر عمل درآمد بھی ہوتا ہے۔ نتیجتاً بدعنوانی کے رجحان کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے جب کہ نائیجیریا میں ایسا نہیں۔

سرکاری پابندیاں بدعنوانی کی بڑی وجہ ہے؟

دنیا کے ہر خطے میں بدعنوانی جدید سیاست اور معیشت کا لازمی جزو بن گئی ہے۔ ہر آنے والے دن میں ایک نیا اسکینڈل سامنے آتا ہے اور صحافی اور سیاست داں انھیں سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے اوائل میں بینک آف کریڈیٹ اینڈ کامرس کے اسکینڈل نے متعدد ممالک کی حکومتوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آج سے کئی سال قبل معیشت دانوں نے یہ مفروضہ قائم کیا تھا کہ بدعنوانی بذات خود ایک مسئلہ نہیں بلکہ کنٹرولڈ معیشت اصل مسئلہ ہے جس میں پہیے کو گریس لگائے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ یونیورسٹی آف شکاگو کے لیری بیکر کہتے ہیں کہ بدعنوانی معیشت میں حکومت کی مداخلت کا منطقی نتیجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کے جس ملک میں آپ زیادہ پابندیاں پائیں گے وہاں بدعنوانی بھی زیادہ ہوگی۔ اقتصادی نظریے کے مطابق مارکیٹ میں کسی حکومت کی غیر ضروری مداخلت مارکیٹ کی کارکردگی کو کم کرتی ہے۔ اس کی مثال افریقہ ہے جہاں کسی بھی قسم کی سرگرمی کے لیے کاغذی کارروائیوں کا پہاڑ درکار ہوتا ہے۔

اقتصادی ماہرین کے مطابق بدعنوانی کے خاتمے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ معیشت پر سے تمام سرکاری پابندیاں اٹھالی جائیں۔ یونیورسٹی آف شکاگو کے رابرٹ وشنی اور ہارورڈ یونیورسٹی کے آندری شلیفر کے مطابق لاطینی امریکہ اور پرانے کمیونسٹ ممالک کی پابند مارکیٹیں آزاد مارکیٹوں میں تبدیل ہو رہی ہیں جس کے باعث انھیں متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ماضی میں کمیونسٹ سوویت یونین میں اور اب ممکنہ طور پر چین میں بدعنوانیوں پر ریاست کی اجارہ داری ہے وہ کہتے ہیں کہ چین میں رشوت نے ایک ٹیکس کی شکل اختیار کر لی ہے جب کہ روس کی ان دنوں یہ حالت ہے کہ وہاں رشوت ستانی کی روک تھام کے لیے کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں اور ہر شخص آزادی سے رشوت وصول کر رہا ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی کے جگدیش بھگوتی کا کہنا ہے کہ ایک ایسے نظام میں جہاں ہر شخص بدعنوانی میں حصہ دار بننا چاہتا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ اسے اپنا حصہ کیسے وصول کرنا ہے معیشت تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ متنبہ کرتے ہیں کہ رشوت ستانی کسی ملک کے لیے انتہائی تباہ کن ہوتی ہے اور ریونیو ملکی خزانے کے بجائے بیورو کریٹس کی جیب میں جانے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ حکومت اتنی قلاش ہو جاتی ہے کہ وہ ملک کے کسی منصوبے پر سرمایہ لگانے کے قابل نہیں رہتی اور اسے بیرونی سرمایہ کاروں کی ملک میں سرمایہ کاری کے لیے حوصلہ افزائی کرنا پڑتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بدعنوان بیوروکریٹس میں تھوڑی بہت شرم ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ رشوت لینے کے عمل کو خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔ رابرٹ وشنی اور آندری شلیفر کہتے ہیں کہ بد دیانت حکام زیادہ کمیشن حاصل کرنے کے لیے ملک کی ضروریات کو مدنظر رکھنے کے بجائے مہنگے ترین سامان اور آلات خریدتے ہیں۔

ماہرین معیشت و اقتصادیات کے نئے نظریوں کے مطابق صرف کسی ملک کی اقتصادیات پر سے حکومت کا کنٹرول کم کرنے سے بدعنوانیوں پر قابو نہیں پایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک ضروری مگر ناکافی قدم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان ممالک میں جہاں

بدعنوانی روایت بن گئی ہو وہاں اس کی روک تھام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بیوروکریٹس کو اچھی تنخواہ دی جائے۔ پریس اور عدلیہ کے ان افراد کی حوصلہ افزائی کی جائے جو بدعنوانیوں کے خلاف آواز اُٹھاتے ہوں اور لوگوں میں اچھے اخلاق کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ تاہم بدقسمتی یہ ہے کہ یہ ایسے کام نہیں جو ایک رات میں ہو جائیں۔

کیا بدعنوانیوں کے خلاف جنگ ترقی پذیر ممالک میں جیتی جائے گی؟

نئی آزاد معیشت کی اصلاحات کے ضمن میں یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ اس وقت کس قسم کا قدم اُٹھایا جانا چاہیے۔ ہیٹی سے یوکرین تک قومیائی گئی صنعتیں بدعنوانیوں کا روایتی ذریعہ ہیں، عالمی بینک کے ایک اعلیٰ عہدے دار کا کہنا ہے کہ قومی ملکیت والے ادارے بدعنوان عناصر کے لیے ہمیشہ کھیل کا میدان رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان اداروں کی نج کاری سے ایک ایسی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے جسے ایک روسی ماہر اقتصادیات نے "مغرب کا جنگلی کیپٹل ازم" کا نام دیا ہے تاہم اس کا متبادل عموماً بدتر ثابت ہوا ہے۔ دولت مند ممالک ایسے قوانین بنا سکتے اور ان پر عمل درآمد کرا سکتے ہیں جو اُن کے ملک کے اداروں کو بیرونی حکومتوں کو رشوت دینے سے روک سکتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق جرمنی میں کارپوریٹ ٹیکس ریٹرن سے ۵۰ تا ۶۰ کروڑ ڈوئچے مارکس "ضروری اخراجات" کے نام پر ہضم کر لیے جاتے ہیں۔ بہرحال بدعنوانی کے خلاف جنگ ترقی پذیر ممالک میں جیتی جائے گی نہ کہ دولت مند دنیا میں۔ اس ضمن میں حوصلہ افزا شواہد ملے ہیں۔ مثلاً تھائی لینڈ، زمبابوے اور دیگر ممالک میں کمیشن برائے انسدادِ بدعنوانی قائم کیے جا چکے ہیں۔ روس سے وینیزویلا تک صحافی اس ضمن میں بڑے رسک لے رہے ہیں اور بدعنوانیوں کے واقعات کا کھوج لگا رہے ہیں۔ ارجنٹائن اور دیگر ممالک میں وکلاء بدعنوانیوں کے خلاف قانونی جنگ لڑ رہے ہیں۔ چین میں گزشتہ دنوں وکلاء نے بدعنوانیوں کے ایسے پانچ ہزار مقدمات کی نمائش کی جنہیں سرکاری ایجنٹوں نے ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۴ء تک قائم کیا تھا۔ اس نمائش کو دیگر افراد کے علاوہ ہزاروں بیوروکریٹس نے بھی دیکھا۔

ترقی پذیر ممالک میں بدعنوانیوں کے خلاف مہم چلانے والے آج کل اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ماہرینِ معیشت کو سیاست کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔ میکسیکو کی سوک الائنس کے ڈائرکٹر سرجیو آگایو کہتے ہیں کہ آپ ترقی کو ایک اچھی حکومت سے علیحدہ نہیں کر سکتے یعنی ایک اچھی حکومت اور ترقی کے عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بدعنوانی کے خلاف کام کرنے والے میکسیکو کے ایک اخبار کے مدیر جارج زیپیڈا کا کہنا ہے کہ کوسٹاریکا بدعنوانی کے حوالے سے اس لیے صاف ستھرا ہے کہ وہاں نچلی سطح تک جمہوری روایات پختہ ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے رابرٹ پٹنم اٹلی کی سیاست کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اٹلی کے مختلف علاقوں میں جمہوریت اور خوش حالی کی سطحیں مختلف ہیں اور اس کی وجہ ان کی ۶۰۰ سالہ قدیم روایات ہیں۔ اُن کے تجزیے کے مطابق اٹلی کے شمالی علاقے میں چھوٹی چھوٹی ایسوسی ایشنز قائم کرنے کی روایت ہے جب کہ جنوبی علاقے میں مجاز حکومتوں اور مافیا کا کنٹرول ہے۔ لہٰذا شمالی علاقوں میں جدید اور صاف ستھرے اور معاشرے کی تعمیر جنوبی علاقوں کی نسبت بہت زیادہ آسان ہے۔ وہ کہتے ہیں دنیا کے ان علاقوں میں جہاں آمریت قائم ہے اور غربت عام ہے بدعنوانیوں کے خلاف کام کرنا آسان نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عالمی سطح پر گزشتہ دو عشروں میں معیشت نے قابلِ قدر ترقی کی ہے۔ تاہم اگر واضح اقدامات نہیں کیے گئے تو بدعنوانی کا عفریت اس ترقی کو زہر آلود کر دے گا۔

(بشکریہ ندائے ملت لکھنؤ)

تہذیب الاخلاق اور نشانت

کی

خصوصی پیش کش

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی

پلیٹنم جوبلی نمبر

مصنفین، قارئین اور اولڈ بوائز سے اشتراک عمل کی

اپیل

ادارہ تہذیب الاخلاق اور نشانت

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

ڈاکٹر محمد حبیب الحق انصاری *

سائنس اور مذہب

سائنس ہی کو سب کچھ مان لینے والوں کی طرف سے اکثر مذہب پر اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ اس مضمون میں ان اعتراضات کا جائزہ لیا جائے گا۔ مضمون سوال و جواب کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ مضمون کے پہلے حصّے میں ایک کٹر سائنسی کی طرف سے مذہب پر کیے جانے والے اعتراضات لکھے گئے ہیں۔ مضمون کے دوسرے حصے میں ان اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں۔

سائنس کے اصول و نظریات پر اندھا یقین رکھنے والوں کی طرف سے پہلا اعتراض:

تخلیق کائنات :— عہد نامۂ قدیم اور قرآن اس بات پر متفق ہیں کہ زمین اور آسمانوں کی تخلیق چھ دن میں ہوئی (ملاحظہ ہو آیات اعراف ۵۴، یونس ۳، ہود ۷، فرقان ۵۹، سجدہ ۴، قٓ ۳۸، حدید ۴ وغیرہ) قرآن میں کئی جگہ کہا گیا ہے کہ زمین اور سات آسمانوں کو چھ دن میں پیدا کیا گیا۔ عہد نامۂ قدیم میں تفصیل دی ہے کہ ہر ہر دن کیا کیا پیدا کیا۔ قرآن میں ایک جگہ دو دو دن کی تفصیل دی ہے۔ مختصر یہ کہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ کائنات کی تخلیق چھ دن میں ہوئی۔ اس کے برخلاف کونیات (Cosmology) کے بڑا دھماکہ نظریہ (Big Bang Theory) کے مطابق جب تقریباً دس ارب سال سے زیادہ پہلے اشعاع (Radiation) اور ابتدائی جیسے (Elementary Particles) اکثیر کثافت کی حالت سے پھیلنا شروع ہوئے تو لمحہ بہ لمحہ طبیعیات کے قوانین کے مطابق ان کی کیفیت تبدیل ہوتی گئی۔ زمین کی موجودہ شکل کوئی پانچ ارب سال پرانی ہے۔ زندہ نامیوں کا فروغ تقریباً ساڑھے تین ارب سال پہلے شروع ہوا۔ اندازاً انسان زمین پر دس لاکھ سال یا اس سے پہلے سے موجود ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر یہ کہنا کہ یہ سب کچھ چھ دن میں پیدا ہوا بظاہر ناقابلِ فہم معلوم ہوتا ہے۔

مذہب پر یقین نہ رکھنے والوں کی طرف سے دوسرا اعتراض:

حضرت نوحؑ کی عمر:— عہد نامۂ قدیم اور قرآن اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت نوحؑ کی عمر نو سو برس سے بھی زیادہ تھی (ملاحظہ ہو آیت عنکبوت ۱۴)۔ عہد نامۂ قدیم میں آدم، نوح وغیرہ کی عمریں ہزار ہزار برس کے لگ بھگ بتائی گئی ہیں۔ شجرے دیے گئے ہیں، فرداً فرداً عمریں دی گئی ہیں۔ جوڑنے پر پتہ چلا تھا کہ اس طرح ان شجروں اور عمروں کے مطابق تخلیقِ کائنات آج سے محض پانچ چھ ہزار سال قبل ہو جانا تھا۔ قرآن میں صاف لکھا ہے کہ نوحؑ نے نو سو پچاس برس تبلیغ کی۔ یہاں بھی قرآن اور عہد نامۂ قدیم متفق نظر آتے ہیں لیکن انسان کے اعضا کی ساخت اور انسان اور آثار قدیمہ کی سائنسیں جیسے پیلیوز ولوجی (Paleozoology)

---

* ڈپارٹمنٹ آف فزکس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

انتھراپالوجی (Anthropology) یا آرکیالوجی (Archaeology) اِس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ہزار برس کی عمریں نہ آج کل ہوسکتی ہیں نہ کبھی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں انسان پہلی بار محض پانچ چھ ہزار برس پہلے ہی وجود میں نہیں آیا۔ ایک طرح کے مخصوص متمدن بود و باش کا آغاز ضرور پانچ چھ ہزار برس پہلے ہونا مانا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ درست کیسے ہے کہ اسے تخلیقِ آدم کی عمر بتایا جائے۔

نہ ہی یہ ماننا ممکن ہے کہ دلائی لاما یا فرعون کی طرح نوح بھی کسی ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ایک عہدے کا نام تھا۔ یہ قیاس زیادہ صحیح ہے کہ جس طرح فرعون سے مراد قرآن میں ایک مخصوص فرعون یعنی رعمسیس ثانی (Ramases II) سے تھی، اسی طرح نوح سے مراد ایک مخصوص فرد ہی ہوسکتا ہے۔

ہم یہ کیسے مان لیں کہ نوح کی عمر ہزار برس کے اطراف تھی اور نوح نے نوسو پچاس برس تبلیغ کی۔

شہابِ ثاقب :- قرآن میں کئی جگہ ٹوٹتے تاروں کا ذکر ہے (ملاحظہ ہو سورہ صٰفٰت آیات ۱۰، جن - ۹)۔ ایک جگہ صاف لکھا ہے کہ یہ شیاطین کو مار بھگانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ تاکہ شیاطین اوپری آسمانوں تک نہ پہنچ سکیں۔ سائنس بتاتی ہے کہ ہزاروں چھوٹے بڑے ٹکڑے یعنی (Meteoroids) روزانہ زمین کے کرۂ ہوا میں داخل ہوکر بھسم ہوتے رہتے ہیں اور ان میں سے بعض بڑے بڑے ہی جل کر روشن ہوتے اور مناسب حالات میں دکھائی بھی دے جاتے ہیں۔ یہ زمین کی سورج کے اطراف گردش اور سورج کی فضا کی وسعتوں میں مع اپنے سارے سیاروں کے سفر کرنے کا راست نتیجہ ہوتا ہے مصنوعی سیارچے (Satellites) اور راکٹ بھی بالائی فضا سے کرۂ ہوا میں داخل ہونے پر اسی طرح رگڑ کھا کر گرم اور روشن ہو سکتے ہیں جیسے کہ شہابِ ثاقب ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہابِ ثاقب ایک قابلِ تحکم (Controllable) مظہر ہے جس کا شیاطین وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سات آسمان :- قرآن میں کئی جگہ سات آسمانوں کا ذکر ہے (ملاحظہ ہو (سورہ بقرہ آیات ۲۹۔ سورہ مومنون آیت ۱۷، حٰمٓ سجدہ ۹-۱۲، نبا ۱۲، مُلک ۳، نوح ۱۵ وغیرہ)۔ کئی جگہ کہا گیا ہے کہ کائنات سے مُراد زمین، سات آسمانوں اور جو اُن کے درمیان ہے وہ ہے۔ قرآن کی تبلیغ ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی۔ اس سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے یعنی چار صدی قبل مسیح میں یونانی کونیات میں مثلاً ارسطو (Aristotle) کا نظریہ تھا کہ زمین کے اطراف سات کرہ نما آسمان ہیں۔ ان میں ہر آسمان مخصوص سیاروں، چاند، تاروں وغیرہ سے مختص کیا جاتا تھا۔ مثلاً چاند ایک آسمان پر گردش کر رہا ہے سورج ایک اور آسمان پر گردش کر رہا ہے، ایک اور آسمان پر کوئی اور سیارہ وغیرہ حتیٰ کہ سب سے دور کا ستارہ ٹھہرے ہوئے تاروں کا آسمان سمجھا جاتا تھا۔ زمین کو کائنات کا مرکز سمجھا جاتا رہا۔ قرآن کی تبلیغ کی ابتدا کے تقریباً ایک ہزار برس بعد ہی یہ بات یقین سے معلوم ہوسکی کہ کائنات کا مرکز زمین تو ہے ہی نہیں بلکہ مقامی طور پر فقط چاند زمین کے اطراف گھوم رہا ہے، جب کہ سیارے مع اپنے چاندوں کے سورج کے اطراف گھوم رہے ہیں۔ سورج کے یہ سیارے بھی سات نہیں بلکہ پتہ چلا نو دس ہیں۔ یہی نہیں بلکہ فلکیات کی رُو سے ہمارے کہکشاں میں ہمارے سورج کی طرح کے اربوں سورج ہیں اور کائنات میں ہمارے کہکشاں کی طرح کے اربوں کہکشاں ہیں جو کم و بیش ملتے جلتے اوسط سائز کے ہیں اور جن کے درمیان باہم فاصلے تقریباً اُن کے سائزوں کے پیمانے کے ہیں۔ اس طرح ہر سو تا حدِ نظر کہکشاؤں کا ایک سلسلہ سا پھیلا ہوا ہے جو ایک بتدریج اور مسلسل پھیلتی کائنات کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ان حالات میں کوئی سات آسمانوں پر کیوں کر ایمان لاسکتا ہے۔ جب کہ یہ بھی معلوم ہے کہ نیلے آسمان کی نیلاہٹ بھی محض سورج

کی روشنی کے کرۂ ہوا کے ذرّات سے بکھراؤ کا ایک ضووی مظہر ہوتا ہے اور سائنس دانوں کے نزدیک آسمان نام کی کوئی چیز سرے سے ہے ہی نہیں۔

اب ان اعتراضات کے جوابات ملاحظہ کیجیے مگر اس سے پہلے چند بنیادی باتوں کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

اسلام کی چند بنیادی باتیں:

ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ فرشتے، شیطان، کائنات، انسان سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ انسانی فطرت کا خاصہ رہا ہے کہ شیطان کے بہکانے میں آسکتی ہے۔ اگرچہ شیطان اللہ تعالیٰ کا باغی ہے لیکن شیطان کو اللہ تعالیٰ نے تا قیامت انسان کو بہکاسکنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ساتھ ہی شیطان کی چالوں سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے اچھے بندوں کے لیے ہدایت اور نصیحت بھیجتا رہا ہے۔ یہ ہدایات نبیوں پر فرشتوں سے وحی کے ذریعے نازل ہوتی رہیں اور آسمانی کتابوں کی شکل میں یکجا کی گئیں۔ حضرت محمد مصطفیٰ ؐ آخری نبی ہیں اور اسلام دین حق اور تکمیل نعمت ہے۔ اسلام سب دینوں پر غالب ہونے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان دار، اچھے کام کرنے اور صبر، شکر، احسان اور تقویٰ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ کفر، ظلم، فسق و فجور کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ مشرکین کو کبھی معاف نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور جہاں ہدایت و عزت اُس کی جانب سے ہے تو گمراہی اور ذلّت بھی اسی کی جانب سے ہے کوئی اگر کافر ہے تو بھی اللہ تعالیٰ کے منشا سے ہی کافر ہے۔

ہر شخص اپنے کیے کا ذمّہ دار ہے۔ قیامت کے دن مُردے زندہ کیے جائیں گے اور حساب کتاب ہوگا۔ ہر کسی سے پورا پورا انصاف ہوگا اور اسے اپنے کیے کی سزا یا جزا ملے گی۔ اچھے لوگ جنت میں اور بُرے دوزخ میں جائیں گے جو علی الترتیب خدا کی نعمتوں اور خدا کے عذاب کی جگہیں ہوں گی۔

اچھا مسلمان ادائیگی حق میں پوری فرض شناسی سے کام لیتا ہے، والدین کی خدمت کرتا ہے۔ محتاج لوگوں اور غریب رشتے داروں کی مدد کرتا ہے، یتیموں کا سہارا بنتا ہے، مسافروں کو مہمان کرتا ہے، ہمسایوں کی خبر گیری کرتا ہے اور ماتحتوں سے حسن سلوک روا رکھتا ہے۔ اچھا مسلمان واہی تباہی بکنے یا لہو و لعب سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اچھا مسلمان مفسد نہیں ہوتا، مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرتا۔ نماز، روزے کا پابند اور ہر کام محض خدا کی پسند کے مطابق کرنے والا ہوتا ہے۔ اچھا مسلمان قانع ہوتا ہے اور شکر گزار ہوتا ہے نہ زیادہ خرچ کرنے والا ہوتا ہے نہ بخل کرتا ہے بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرتا ہے۔ اچھا مسلمان اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کی راہ میں جدّوجہد اور جہاد کرتا ہے تاکہ آخرت میں نیک بندوں میں شمار کیا جائے۔ اچھا مسلمان جہاں دنیا کی متاع کو قلیل اور آخرت کو سب کچھ جاننے والا ہوتا ہے، وہاں وہ ہر لمحہ اللہ کے حضور دست بدعا رہتا ہے کہ وہ راہِ راست پر چلنے کا اہل ہو سکے اور اللہ اُسے صالح بننے اور صالح کام کرنے کی ہی ہمیشہ توفیق عطا کرے۔

اب تم خود ہی بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ، فرشتوں، شیطان، قیامت، موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا، جنت، دوزخ، جن، حور ان سب کو بغیر غیب پر ایمان لائے تم کیسے مان سکتے ہو۔ قرآن حکیم میں شروع ہی میں درج ہے کہ:

"یہ کتاب حق راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو۔ وہ خدا سے ڈرنے والے ایسے ہیں جو یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں (یعنی غیب) پر۔" (بقرہ ۔ ۲،۳)

ارشاد ہوتا ہے کہ

"آسمانوں اور زمین میں جتنی غیب کی باتیں ہیں اُن کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے" (ہود — ۱۲۳)

" (اللہ تعالیٰ) جاننے والا ہے غیب کا اور ظاہر چیزوں کا" (رعد — ۹)

قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ارشاد ہوتا ہے۔

" اور نہ میں غیب کو جانتا ہوں (الّا اس کے کہ جو اللہ مجھے بتا دے)" (انعام — ۵۰)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوتی ہے:

" فرما دیجیے کہ غیب کی خبر صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ (مجھے نہیں)۔" (یونس — ۲۰)

ان باتوں سے ثابت ہوا کہ بندوں کے لیے یہ زیبا نہیں کہ غیب کے عالم ہونے کا دعویٰ کریں بلکہ غیب پر ایمان لائیں۔ غیب پر ایمان نہیں لا سکتے تو مسلمان نہیں ہو سکتے۔ غیب پر ایمان کا سب سے پہلا جزو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ:

" اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ ہیں۔" (حشر ۲۴)

واقعہ یہ ہے کہ محرکِ اول (First Cause) یا منصفِ اعلیٰ یا لافانی یکتائے صفات، قادرِ مطلق (Omnipotent) عالم کل (Omniscience) ان میں سے کسی طرح بھی اپنے طور پر تم خدا کو پہچاننے کی کوشش کر سکتے ہو جب تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس کی صفات کو مان لیا تو فرشتوں، شیطان، قیامت، موت کے بعد زندگی، جنت، دوزخ، پر ایمان لانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اللہ پر ایمانِ مجمل ایک طرح سے سارے ایمان کی جڑ ہے۔

تخلیقِ کائنات (چھ دن میں)، حضرت نوح علیہ السلام کی عمر (ہزار برس سے زیادہ)، شہابِ ثاقب اور سات آسمانوں کے تذکرے پر جو اعتراضات ہیں اُن میں سے اگر نصیحت کا پہلو نظر انداز کر دیا جائے تو ان میں علاوہ محض متشبہ المراد باتوں کے اور کیا رہ جاتا ہے۔

تخلیق کائنات :— جہاں تک چھ دن کی بات ہے وہاں قرآن میں "یوم" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں جہاں یوم قیامت کا ذکر ہے وہاں ارشاد ہوتا ہے کہ یہ یوم تمہارے ہزاروں سالوں کے برابر ہوگا۔ (ملاحظہ ہو سورۂ سجدہ ۵، معارج ۴)۔ خود خاص نظریۂ اضافیت (Special Theory of Relativity) کے مطابق مطلق وقت کی بجائے اضافی وقت (Relative time) کی بات زیادہ درست ہے۔ مثلاً دو جڑواں بھائیوں میں سے ایک زمین پر رہ جائے اور دوسرا نور کی سی تیزی سے دور دراز کے تاروں تک اڑان کرتا جائے اور پھر واپس اسی طرح راکٹ میں زمین پر آئے تو مثلاً اڑنے والا بھائی محض ایک دو برس بوڑھا تو زمین پر رہنے والا بھائی تیس چالیس برس بوڑھا ہو چکا ہوگا۔ حد تو یہ ہے کہ روشنی کی رفتار سے رواں مشاہد کے لیے وقت بالکل ٹھہر سا جاتا ہے جب کہ ساکت مشاہد اسی طرح سے بوڑھا ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب خود سائنس داں اس بات کو مانتے ہیں تو پھر محض چھ دنوں کے ذکر پر اعتراض کیسے ہو سکتا ہے۔ جب کہ ان چھ دنوں کا مطلب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کونیات کے یہ نتائج اس حد میں کس حد تک جائز ہیں۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ خود خاص اضافیت کی مسلماتی اساس کس حد تک "منطقی" یا "عقلی" کہی جا سکتی ہے۔ چوتھی بات یہ کہ کیا بڑا دھماکہ نظریے کے علاوہ کوئی اور کونیاتی نظریہ تخلیقِ کائنات کا نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے مسلسل تخلیق (Continuous Creation) کا ایک متبادل نظریہ بھی موجود ہے جو کلیتاً رد نہیں کیا گیا ہے یعنی کونیات میں تخلیق کائنات کے ایک سے زیادہ متبادل نظریے ہیں۔ یعنی کسی ایک نظریے کو حقیقتِ مطلق سمجھ کر مانا نہیں جا سکتا۔ کوئی ایک نظریہ بھی شک سے بالاتر نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ تخلیق کائنات کے طبیعیاتی نظریے متشبہ باتیں ہو سکتی ہیں جن پر بحث

کی گنجائش ہے۔

اس ضمن میں ایک سوال یہ ہے کہ کیا ریاضی کے عدد کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے؟ ذرا اس لطیفے پر غور کرو۔ لطیفہ یوں ہے کہ اگر ایک آدمی ایک مکان چھ مہینے میں بنا کر پورا کر سکتا ہے تو چھ آدمی اسی مکان کو ایک مہینے میں پورا کر سکتے ہیں اور اسی طرح اکائی کے قاعدے (Method of Unitary) کے مطابق ہی ایک سو بچپن لاکھ باون ہزار آدمیوں کو اسی مکان کو قریب قریب ایک سکنڈ میں بنا کر پورا کر دینا چاہیے!! لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ایسا ہوتا بھی ہے؟ نہیں تو پھر سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا؟ اگر کیفیت یوں ہوتی کہ ریاضی کا یہ سہل ماڈل لاگو ہو سکتا تو حاصل کردہ نتیجہ درست ہی کہلاتا لیکن حقیقت نہ محض ریاضی سے بیان ہو سکتی ہے نہ محض طبیعیات سے۔ حقیقت کے استقرائی (Approximate) ماڈل تشکیل دیے جا سکتے ہیں اور وہ حدیں دریافت کرنے کی کوشش کر سکتی ہیں جن میں یہ لاگو ہوتے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح حقیقت اور دین کی رو سے کچھ ماہر طبیعیات کی رو سے کچھ اور سچائی کی طرح سچائی کی جانچ یعنی (Verification) کے طریقے بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک بات اور جو اکثر سننے میں آتی ہے وہ منطق کا ایک مسئلہ ہے جسے گوئیڈل (Godel) کے ثبوت کے نام سے جانا جا رہا ہے۔ ریاضی کی مدد سے جو نتائج اخذ کیے جاتے ہیں تکرار معنیٰ (Tautologous) کہلائے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح منطقی طور پر نتیجے کے سچ یا جھوٹ ہونے کا دار و مدار ان مفروضات یا مسلمات پر ہوتا ہے جو بحث و استدلال کی شروعات میں بنیاد کے طور پر مان لیے جاتے ہیں۔ یہ بات کسی منطقی استدلال میں مسلمات کی غیر معمولی اہمیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کرٹ گوئیڈل کے مطابق ریاضیاتی مسلمات کا کوئی بھی مجموعہ بیک وقت مکمل (Complete) اور متوافق (Consistent) دونوں نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر مکمل ہو تو متوافق نہیں ہوگا اور اگر متوافق ہوگا تو مکمل نہیں ہوگا —

ریاضیات، طبیعیات کی منطق، نحوی ترکیب (Syntax Language) مہیا کرتی ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ریاضیاتی استدلال کے تکرار معنیٰ ہونے کے باعث طبیعیاتی نظریوں کے سچ اور جھوٹ کا دار و مدار مسلمات کے منطقی طور پر سچ اور جھوٹ ہونے پر منحصر ہے اور مسلمات کی بابت ثابت شدہ ہے کہ بیک وقت منطقی طور پر مکمل اور متوافق نہیں ہو سکتے!

حضرت نوح کی عمر:۔ جہاں تک سائنسی نظریوں سے نتائج اخذ کرنے کا تعلق ہے اس پر اوپر ہی بہت کچھ بیان کیا جا چکا ہے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ قرآن رشد و ہدایت کا صحیفہ ہے۔ اس کا انداز بیان ناصحانہ ہے۔ بہت کچھ باتیں اس میں مجازاً بھی کہی گئی ہیں۔ ذرا استعاروں کے عام استعمال پر غور کرو۔ فرض کرو میں نے کہا میں آٹھ آٹھ آنسو رویا تو تم ناپنے لگے کہ واقعی آٹھ آنسو تھے یا چھ تھے یا سولہ تھے! میں نے کہا میں شرم سے پانی پانی ہو گیا تو تم کیمیائی جانچ کے آلے لے آئے کہ تجزیہ کر کے بتا دو کہ میں واقعی پانی بن گیا یا گوشت پوست میں قائم ہوں! میں نے کہا میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا تو تم نے میرا کلیجہ لیا اور چھلنی لی، دونوں کو پاس پاس رکھا، آلوں سے مشاہدہ کیا اور کہنے لگے کہ اس کلیجے اور اس چھلنی میں بہت فرق ہے۔ اس لیے ریاضیاتی اور مشاہداتی طور پر یہ کہنا غلط ہے کہ کلیجہ چھلنی ہو گیا تو تم ہی بتاؤ کہ کوئی تمہیں بے وقوف کہے گا یا نہیں۔

اب اگر قرآن نے کہا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے نو سو برس سے زیادہ تبلیغ کی لیکن پھر بھی ان کی قوم مائل بہ نصیحت نہیں ہوئی تو یہاں نو سو برسوں کے ہی ناپنے تولنے کی کیا تک ہے۔ یاد رکھو کہ بات کس نوعیت کی ہو رہی ہے تو اگر اسی نوعیت کی سمجھ پیدا کرو گے تو سمجھ دار کہلاؤ گے ورنہ رشد و ہدایت، عبرت و نصیحت جو اس بیان کا منشا ہے، تم تک نہ پہنچ پائے گی۔

کچھ یہی حال اور باتوں کا بھی ہے۔

ساتت آسمان: تم نے خود کہا کہ عرصۂ دراز تک نظر آنے والی کُل کائنات کو زمین اور سات آسمانوں اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہے پر مشتمل سمجھا جاتا رہا تو اگر سات آسمانوں سے مراد تم چاند تاروں کا کُل نظر آنے والا نظام لو تو بجائے گمراہ ہونے کے قرآن کے اس ذکر کو تجزیہ، تجسّس اور دلچسپی سے معمور پاؤ گے اور نصیحت پاؤ گے کہ کس طرح یہ وسیع ترین کائنات چار سُو بکھری موجود ہے۔

مادّہ پرست حقیقت کو معروضی (Objective) اور عینیت پرست (Idealist) حقیقت کو ذاتی یا خیالی Subjective بتاتے ہیں۔ وجودیت (Existentialism) میں یاسپر (Jaspers) بتاتا ہے کہ حقیقت نہ تو معروضی ہوتی ہے نہ خیالی بلکہ ذات اور کائنات کے تبادلِ فعل (Interaction) کا نتیجہ ہوتی ہے۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا طبیعیات میں کوانٹم نظریے میں پیمائش (Measurement) کو بالآخر طبعی نظام اور پیمائشی آلے کے تبادلِ فعل سے حاصل شدہ کیفیت کے مشاہدے کے نتیجے کے طور پر نہیں لیا جاتا اور نہ عدم یقین کا کوانٹم میکانیکی اصول (Principle of Uncertainty) جو کوانٹم نظریے کی بنیاد ہے کیوں درست ہوتا؟ یاد رکھنے کی بات ہے کہ کوانٹم نظریہ آج کی طبیعیات کے دو کلیدی نظریوں میں سے ایک ہے اور جہاں تک عدمِ یقین کے اصول کا تعلق ہے تو یہ بات خود اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ ساری کوانٹم میکانیکس اِسی عدمِ یقین کے اصول پر قائم ہے اور جس دن کوئی یہ بات ثابت کر دے کہ عدمِ یقین کا اصول غلط ہے تو اسی دن کوانٹم نظریے کی منسوخی کا دن بھی ہو گا۔

اس سے قطع نظر کہ حقیقت معروض اور ذات دونوں کے باہم تبادلِ فعل کا نام ہے کہ نہیں ہے یہ بات پہلے ہی کہی جا چکی ہے کہ قرآن اور ریاضی کے فارمولوں یا طبیعیات یا انجینئرنگ کی تخصیصی کتابوں (Treatises) میں بہت فرق ہے۔ دونوں کو ایک ہی نظر سے کیسے دیکھا جا سکتا ہے۔ بس اگر یہ امتیاز ملحوظ رکھا جائے کہ قرآن کی متشابہ المراد آیات اُمّ الکتاب نہیں ہیں تو شکوک و شبہات سے گزر کر قرآنی رُشد و ہدایت سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

شہابِ ثاقب:- جب کوئی غیب پر ایمان لے آیا اور قرآن کی طرف خلوصِ دل اور نیک نیتی سے رجوع ہوا تو شیاطین یا ملائکہ کے تذکرے پر سطحی اعتراضات خود بہ خود ختم ہو گئے۔ جب خدا قادرِ مطلق ہے تو کیا وہ خود ہمارے ذریعے سے اپنے منشا کی تکمیل نہیں کروا سکتا؟ ضرور کروا سکتا ہے تو ہمارا کسی بات پر قادر ہونا بھی محض اس بات کی دلیل ہوئی کہ خدا کا منشا ہی تھا کہ یہ علم یا اختیار یا یہ کمال اب ہمیں حاصل ہو۔ اس طرح شہابِ ثاقب کے بیان کی دینی توجیہ کی نصیحت قابلِ قبول ہو جاتی ہے۔

آخر میں مَیں فلسفۂ سائنس کے دو نکتے پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ سائنس کی ترویج قیاس (Conjecture) اور ردِّ قیاس (Refutation) کے عمل سے ہوتی ہے اور شاید یہی بات جدلیاتی مادیت کی رو سے بھی کہی جاتی ہے۔ INFINITELY — KNOWABLE دوسرا نکتہ یہ ہے کہ خود جدلیاتی مادیت کی رُو سے جہاں مادہ شئے مطلق ہے وہاں وہ لامتناہی حد تک قابلِ علم (Infinitely knowable) بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں سائنس ہمیشہ بڑھتی پھیلتی بدلتی رہے گی اور علمِ انسانی ارتقا پاتا ہی چلا جائے گا۔ اسی بنا پر کم از کم سائنسی نظریے کو اٹل یا امرِ مطلق نہیں سمجھا جا سکتا یہ بات مسلّم ہے۔

مظفر حسین غزالی*

دینی مدارس میں جدید علوم کی تعلیم

اس مسئلہ پر گفتگو کرنے سے قبل اس نقطہ پر غور کر لیجیے کہ اسلام کا مزاج اوّل روز سے ہی بین العلومی ہے قرآن حکیم اور احادیث رسالت کے مندرجات پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ ھمنا ہو ھوھ ہے یعنی پوری زندگی کو محیط ہے۔ اس کی واضح مثال پہلی وحی کے وہ الفاظ ہیں جن میں نہ صرف پڑھنے پر زور ہے بلکہ اس میں تخلیقِ کائنات اور انسان کی پیدائش کے فلسفے کے علاوہ تحصیلِ علم اور اس کی اشاعت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ ان میں سے ہر ایک چیز کو آج مکمل ایک فن کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نقطے کو اسلاف نے اچھی طرح سمجھا تھا جس کا پرتو ہمیں ان قدیم درس گاہوں میں نظر آتا ہے جو بین العلومی طرز پر قائم تھیں۔ ان میں اُن تمام علوم کی تعلیم کا نظم موجود تھا جو اس وقت تک معرضِ وجود میں آچکے تھے۔

ہندوستان میں اس مسئلہ کے کچھ تاریخی عوامل ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کی وجہ سے مدارس کے نظام میں جو تبدیلیاں آئیں وہ وقتی طور پر صحیح بلکہ اہم تھیں لیکن حالات کی تبدیلی کے ساتھ ان کے نصاب و نظامِ تعلیم میں ترمیم ناگزیر تھی اس کا احساس بھی علماءِ کرام میں پچھلے سو سالوں سے موجود ہے لیکن اس کی ضرورت کو آج شدّت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ فاؤنڈیشن فار ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ نئی دہلی کے دینی مدارس سیمینار اور آل انڈیا ملّی کونسل کے دینی مدارس کنونشن میں علماء نے ان احساسات کو ظاہر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے اپنے نصاب میں ترمیم کی، تاریخ اسلام کو اس میں شامل کیا اور پورے نصاب کو از سرِ نو مرتب کیا۔ ان سیمیناروں اور کنونشنوں میں یہ نقطہ اُبھرا کہ نصاب ایسا ہو جو علومِ مقصودہ کا درک طلبہ میں پیدا کر سکے۔ یہ اور اس طرح کی دوسری کوششیں اس بات کی غماز ہیں کہ دینی مدارس کے نصاب کو موجودہ ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے کی طرف سوچا جا رہا ہے۔

عصری علوم اور تکنیکی مضامین کو مدارس میں متعارف کرانے کے سلسلے میں دو نقطۂ نظر ہیں۔ قطع نظر ان کے جو ابھی تک مدارس کے اندر ان علوم و فنون کے داخلے کو سمِّ قاتل تصوّر کرتے ہیں یا جو حالات سے زیادہ باخبر نہیں ہیں۔ ان کے سوالوں کا جواب دینے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ممکن ہے ان دو نظریات کی وضاحت میں ان کو اپنے سوالوں کا جواب بھی مل جائے۔ پہلا گروہ یہ چاہتا ہے کہ مدارس کے نصاب میں عصری علوم اور تکنیکی فنون کو شامل ہونا چاہیئے تاکہ ایک عالمِ دین باہنر اور

---

* 38-37-A ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

جدید علوم سے آراستہ ہو کر اس درس گاہ سے باہر نکلے۔ دوسرا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ فارغ ہونے والا طالب علم عصری علوم وفنون اور موجودہ تقاضوں سے واقف تو ہو لیکن بنیادی طور پر وہ عالم دین ہو۔ بالفاظ دیگر دینی علوم کا ماہر ہو۔ اس کے لیے یہ گروہ مشورہ دیتا ہے کہ عصری علوم و تکنیکی فنون اس کے نصاب کا حصّہ نہ ہوں بلکہ ان کا علم یا تو وہ خارجی مطالعہ کے ذریعے حاصل کرے یا پھر ایک خاص مدّت کے بعد اُسے ان علوم کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس گروہ نے عصری علوم کو نصاب کا حصّہ بنائے جانے میں یہ اشکال ظاہر کیا ہے کہ اس سے طلبہ کسی بھی علم کے ماہر نہیں ہو سکیں گے۔ اس دعوے کے ثبوت میں وہ دو مثالیں پیش کرتے ہیں اوّل یہ کہ خود دارالعلوم دیوبند میں کپڑے سینے، چمڑے کا کام اور کتابت وغیرہ کو جب نصاب کا حصّہ بنایا گیا تھا تو بعض طلبہ کی پوری توجہ ان چیزوں کے سیکھنے میں صرف ہونے لگی۔ اس سے ان کی دینی علوم میں دسترس کم ہوئی۔ دارالعلوم کے ذمّہ داروں نے جب اسے محسوس کیا تو نصاب سے ان چیزوں کو خارج کر دیا۔ اس کی دوسری مثال جامعہ ہدایت رحیمی جے پور ہے جہاں طلبہ کو کمپیوٹر اور آئی۔ ٹی۔ آئی کی سطح کے کورس بھی عالمیت' فضیلت کے ساتھ کرائے جاتے ہیں۔ وہاں کے طلبہ اور اساتذہ سے انٹرویو کرنے پر معلوم ہوا کہ طلبہ پورے پورے وقت انتشار کا شکار رہتے ہیں۔ دینی علوم میں انھیں گہرا علم حاصل نہیں ہو پاتا اور ان تکنیکی کورسوں کو پڑھ کر انھیں سرکاری نوکریاں بھی حاصل نہیں ہو پاتیں۔ البتہ وہ اپنا کام یا پرائیویٹ ورکشاپوں وغیرہ میں کام کرنے کے قابل بن جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ مدارس میں آنے والے اکثر طلبہ کی مالی حالت ایسی نہیں ہوتی کہ وہ اپنا کام کر سکیں۔

میرے خیال میں ندوۃ العلماء، جامعۃ الفلاح اور جامعہ دارالسلام عمر آباد' تمل ناڈو کی یہ تجویز مناسب ہے کہ علوم مقصودہ قرآن حدیث، فقہ، تفسیر، اصول حدیث، اصول فقہ وغیرہ میں کوئی کمی نہ کی جائے بلکہ 'معقولات' میں فلسفہ، منطق، نجوم، ہیئت' بلاغت' اور دوسرے علوم کی تدریسی کتب کو کم کر کے اس کی جگہ مبادی سیاسیات، مبادی معاشیات، مبادی سائنس' تاریخ، جغرافیہ' عام معلومات اور انگریزی کو نصاب کا حصّہ بنایا جائے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ان عصری علوم کی صرف مبادیات یا بنیادی باتوں سے طلبہ کو ہلکے پھلکے انداز میں متعارف کرایا جائے۔ تاکہ طالب علم کی محنت علوم مقصودہ پر ہی صرف ہو۔ یہاں تکنیکی تعلیم کے سلسلے میں قاضی مجاہدالاسلام صاحب کی یہ تجویز قابلِ ذکر ہے جو انھوں نے آل انڈیا ملیؔ کونسل کے دینی مدارس کنونشن ۲۳-۲۵ ستمبر ۹۴ء کو اپنی تقریر میں پیش کی تھی کہ اہلِ مدارس کو چاہیے کہ وہ ایک حد کے بعد طلبہ کو اجازت دے دیں کہ اُن میں جو طلبہ چاہیں دینی علوم میں محنت کر کے تخصیص کی منزل میں داخل ہو جائیں اور جو طلبہ چاہیں وہ تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کریں۔ قاضی صاحب کی یہ تجویز خاصی اہم معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر سطح کی تعلیم کے لیے کم سے کم اہلیت کا معیار مقرر ہوتا ہے۔ پھر دینی مدارس کے طلبہ کے لیے ایسا کوئی معیار متعین نہ کیا جائے یہ کیسے ممکن ہے۔

جو اہلِ مدارس عصری علوم کو نصابِ تعلیم کا جز بنائے جانے کے سلسلے میں سنجیدہ ہیں ان کے سامنے دو بنیادی مسئلے ہیں۔ ایک درسی کتب کی فراہمی کا اور دوسرا اساتذہ کی دستیابی یا اُن کی تربیت کا۔ عصری علوم کی جو کتب بازار میں موجود ہیں وہ اُن کی ضرورت کو پورا نہیں کر پاتیں کیونکہ وہ ایک خاص منصوبے کے تحت درجہ وار ترتیب دی گئی ہیں۔ اگر ہم نے کسی خاص شعبۂ علم کی ابتدائی کتاب فرض کیجیے عالم کی پہلی جماعت کے لیے منظور کی تو اس جماعت کے طالب علم کے لیے وہ بچکانہ کتاب ہوگی جس کی طرف طالب علم کوئی خاص توجہ نہ دے سکے گا لیکن اگر اس جماعت میں ثانوی سطح کی کتاب کو پڑھانا طے کیا جائے تو طالب علم کو اُسے سمجھنے میں دشواری ہوگی کیونکہ اس کتاب میں بہت سے مباحث ایسے ہوں گے جو پہلے پڑھائی جا چکی باتوں پر منحصر ہوں گے۔ اگر کسی نے ان موضوعات کو پہلے پڑھا ہی نہ ہو تو وہ ان مباحث کو کیسے سمجھے گا۔ اس کی صرف دو صورتیں ہیں یا تو استاد سبق پڑھانے سے پہلے ان بنیادی باتوں سے طلبہ کو واقف

کرائے جن کی واقفیت کے بغیر طالب علم اس سبق کو سمجھ نہیں سکتے۔ یا پھر درسی کتاب اس انداز سے مرتب ہو کہ اس میں ابتدا سے آپ کے مطلوبہ معیار تک کے مباحث اس اسلوب میں طلبہ کے سامنے ہوں کہ اُن میں وہ دلچسپی لے سکیں۔ یہاں یہ ضرورت بہرحال سامنے آتی ہے کہ مدارس کے لیے عصری علوم کی کتابیں ان کے معیار اور مزاج کے مطابق تیار کی جائیں۔ محض عصری علوم کی افادیت بیان کرنے اور مدارس کو جدید علوم داخل کرنے پر آمادہ کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ وہ کس مضمون کے لیے کون سی کتاب داخلِ نصاب کر سکتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اساتذہ کی فراہمی یا ان کی تربیت کرنا بھی بہت اہم ہے۔ درسی کتاب موجود ہو لیکن اُسے پڑھانے والا کوئی نہ ہو تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس کام کے لیے مدارس کو دینی فکر رکھنے والے ایسے اساتذہ درکار ہوں گے جو اس خاص شعبۂ علم کی اچھی صلاحیت رکھتے ہوں۔ تاکہ وہ اپنے مضمون کو پڑھاتے ہوئے جہاں ضرورت محسوس کریں وہاں اسلام کے نقطۂ نگاہ سے بھی طلبہ کو واقف کر دیں۔ ظاہر ہے ایسی صلاحیت رکھنے والے اساتذہ بہت کم ہوں گے۔ البتہ ایسے حضرات بڑی تعداد میں مل سکتے ہیں جو مضمون کی گہری واقفیت رکھتے ہیں اگر ان کی تربیت اس انداز سے کر دی جائے تو وہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ یا پھر دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مدارس کے اساتذہ کی تربیت کا نظم ہو۔ انھیں اس مضمون سے اچھی طرح واقف کرایا جائے۔ ان کی معلومات کو اس حد تک وسعت دی جائے کہ وہ اپنے مدرسے میں جاکر اس مضمون کو پڑھانے کے قابل ہو جائیں۔ ۱

جب بات تربیت کی آہی گئی ہے تو یہاں یہ بھی جائزہ لے لیا جائے کہ مدارس کے طریقۂ تعلیم میں کیا تبدیلیاں لائی جائیں کہ طلبہ کی صلاحیتوں کی اور بہتر نشو و نما ہو سکے۔ زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ فنِ تعلیم و تربیت میں بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔ پڑھنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے گئے ہیں۔ ایسے آلات کو استعمال کیا جانے لگا ہے جن سے استاد اپنی بات اور موثر طریقے پر طلبہ کے سامنے رکھ سکتا ہے۔ اب تو یہ سوچا جاتا ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات ہم کیسے پہنچائی جائے؟ طلبہ کی دلچسپی کو عام کاموں میں کیسے باقی رکھا جائے؟ طالب علم بغیر تعلیم حاصل کیے بتائے یا کسی دوسرے ڈر کی وجہ سے مدرسہ چھوڑ کر چلا جائے اس میں درس گاہ کی کامیابی نہیں بلکہ وہ درس گاہ کامیاب سمجھی جاتی ہے جہاں سے طالب علم وہ سیکھ کر نکلے جو وہ سیکھنے آیا ہے۔ ذی شعور اہلِ مدارس کو ان باتوں کا احساس ہے وہ اس طرف گہرائی سے سوچ بھی رہے ہیں۔ مدارس میں سمعی و بصری آلات کے استعمال پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "حکمت" کے ساتھ تعلیم دینے پر زور دیا ہے۔ اس حکمت میں دو باتیں پوشیدہ ہیں۔ ایک نفسیات اور دوسرا طریقہ، یعنی پڑھاتے وقت طالب علم کی نفسیات کا خیال رکھا جائے اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ طالب علم کی سیکھنے میں دلچسپی بنی رہے۔ مدارس اسلامیہ میں عام طور پر بیانیہ یا خطابت اور سوال وجواب کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ تدریس کے لیے مختلف طریقے ایجاد ہو چکے ہیں جن کی بہت کم معلومات مدارس اسلامیہ کے اساتذہ کو ہے۔ اگر ان طریقوں سے مدارس کے اساتذہ کو واقف کرایا جائے تو اُن کا درس اور زیادہ موثر ہو سکتا ہے۔ اس سے طلبہ کو بھی بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔ مدرسے کے اساتذہ اپنے فن کی گہری واقفیت رکھتے ہیں نیز انھوں نے اس مضمون کی متعدد مستند کتب کا مطالعہ بھی کیا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا نظام اس طرح کا ہے کہ ہر وقت وہ تعلیم و تعلّم کے ماحول میں رہتے ہیں اور مختلف موضوعات پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کل تک جس مسئلے کے بارے میں وہ پانچ دلیلیں پیش کرتے تھے، آج اسی بحث کے ضمن میں چھ یا سات دلیلیں دیتے ہیں یا ان کے استدلال کے طریقے میں کچھ تبدیلی آجاتی ہے۔ ایسا محض امکانی طور پر نہیں ہوتا بلکہ یہ مسلسل غور و فکر کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ اس

گفتگو سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جب دینی مدارس کے اساتذہ خود ہی غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور پڑھانے و استدلال کے طریقوں کو تبدیل کرتے رہتے ہیں تو انھیں تدریسی تربیت کی کیا ضرورت ہے۔ تدریسی تربیت کی ضرورت اس لیے باقی رہتی ہے کہ قرآن حکیم کا واضح فرمان موجود ہے: وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ (ہر جاننے والے کے اوپر بھی ایک جاننے والا ہوتا ہے) لہٰذا خوب سے خوب تر کی خواہش اور دینی مدارس کی تعلیم کے مقاصد کی بار آوری کے لیے تربیتی نظام کا قیام ضروری ہے۔ البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کے فرائض کون لوگ ادا کریں؟ اس ضمن میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔ تربیت دینے کے لیے ایسے حضرات کو منتخب کرنا ہوگا جو فنِ تعلیم و تربیت کی جدید ترین تحقیقات سے واقف ہوں اور تدریسی مہارت رکھنے کے ساتھ دینی علوم میں گہری دسترس رکھتے ہوں۔ ہندوستان میں شاید ایسے حضرات بہت ہی کم ملیں گے جن میں بیک وقت یہ صلاحیت موجود ہو۔ اس لیے ماہرینِ تعلیم اور دینی مدارس کے ایسے بزرگ اساتذہ کو ایک جگہ جمع کیا جائے جو دینی علوم کو پڑھانے میں اپنی بڑی عمر لگا چکے ہیں نیز تعلیم و تعلم سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ علمی مزاج رکھتے ہوں۔ ایسے حضرات مل کر یہ کام کر سکتے ہیں۔ اگر یہ تربیتی نظام مستقل چلتا رہا تو پھر اہلِ مدارس میں سے بہت سے ایسے افراد تیار ہو جائیں گے جو تدریب اساتذۂ مدارس کے کام میں معاون ہو سکتے ہیں۔

عصری علوم کی درسیات جو بازار میں آسانی سے مل جاتی ہیں انھیں مدارس میں داخل کرنے کی دشواریوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ البتہ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ یہ عصری علوم اپنے اندر ایسے نظریات بھی رکھتے ہیں جو دینی مدارس کے مقاصد کی ضد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصری درس گاہوں میں جو لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں ان پر اسلام مخالف نظریات کا اثر کچھ زیادہ ہی جلدی ہوتا ہے۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ کئی طلبہ جن کی ابتدائی سے ثانوی تک تعلیم دینی ماحول میں ہوئی یا کسی دینی مدرسے میں ہوئی لیکن جب وہ کالج پہنچے اور عصری علوم کی تحصیل شروع کی تو عام طلبہ سے بڑھ کر انھوں نے اس نئے ماحول کا اثر قبول کیا۔ بعض طلبہ تو یہاں تک آگے بڑھے کہ انھوں نے صرف داڑھی مونچھ صاف کرانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ الحاد کی منزل بھی دیکھتے دیکھتے پار کر گئے اور کئی طلبہ کی ایسی مثالیں بھی ہیں جو اسلام مخالف نظریات رکھنے والی اور اسلام کو نقصان پہنچانے والی تنظیموں کے سرگرم رکن بن گئے۔ اس کیفیت کے پیدا کرنے میں عصری علوم کی درسیات، عصری درس گاہوں کے پروفیسر حضرات اور ان درس گاہوں کے ماحول کا، کس کا کتنا حصہ ہے اس کا جائزہ لینے کا یہاں موقع نہیں لیکن یہ تینوں عامل یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ کی اچھی یا بری فکر بنانے میں شریک ہیں۔ اس لیے بھی مدارس کے لیے عصری علوم کی ایسی درسیات تیار کرانے کی ضرورت ہے جن میں غیر اسلامی نظریات کی شمولیت نہ ہو۔ وہ کوئی خاص نظریہ یا فکر بنانے کا کام نہ کریں بلکہ صرف نفسِ مضمون سے طلبہ کو واقف کرا سکیں لیکن اگر کوئی ایسی چیز پڑھانی ناگزیر ہو جو اسلام کے نظریے کے خلاف ہو یا جس کا اسلام کے اصولوں کے مطابق پڑھانا درست نہیں تو ان مقامات پر اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت ضرور بیش کی جانی چاہیے۔

میرے علم کے مطابق ابھی تک فاؤنڈیشن فار ایجوکیشنل ڈولپمنٹ نے اس نقطۂ نگاہ سے مدارس کے لیے عصری علوم کی درسیات تیار کرانے کا کام شروع کیا ہے۔ ابھی تک فاؤنڈیشن نے اس سلسلہ کی چار کتابیں شائع کی ہیں۔ جغرافیہ عالمِ اسلام، تاریخ تہذیبِ اسلامی (اسلام سے قبل سے عہدِ نبوی تک)، انسان اور اس کا ماحول اور اساتذہ کے لیے اسلامی نظامِ تعلیم کے خد و خال۔ اس کے علاوہ مبادیٔ سیاسیات، مبادی معاشیات، مبادی سماجیات، مبادی سائنس، بھارت کا جغرافیہ، جغرافیہ عالم طبعی جغرافیہ اور دیگر کتب اشاعت کے مراحل طے کر رہی ہیں۔ فاؤنڈیشن کے پیشِ نظر دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کا منصوبہ بھی ہے لیکن اگر اس میدان میں دوسری سوسائٹیاں دلچسپی لیتی ہیں تو فاؤنڈیشن ان کی رہنمائی کرنے اور ان کو اپنا تعاون دینے

محمد اسحاق*

بچّہ اسکول سے کیوں بھاگتا ہے

کوئی ۲۵ برس پہلے کی بات ہے کہ مجھے گوداوری دکھنی (کریم نگر) میں ایک سرکاری تقریب میں شرکت کے لیے تعلیمات کی دو خواتین عہدہ داروں کے ساتھ جیپ کار میں سفر کرنا پڑا۔ کوئی دو گھنٹے بعد ہماری جیپ کار جنگل میں ایک ریلوے کراسنگ کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ کچھ ہی دیر میں ایک مال گاڑی درختوں کے جھنڈ سے مست ناگن کی طرح نمودار ہوئی اور بل کھاتے ہوئے گزرنے لگی۔ ایک خاتون ان ڈبوں کو زیر لب گننے لگیں دوسری خاتون نے تلگو میں اسے ڈانٹا: "چل گدھی بچوں کی طرح کیا گن رہی ہے؟" اس خاتون نے مسکرا کر جواب دیا کہ اس سنسان بیابان میں پہاڑیوں کے درمیان سے مال گاڑی کا یوں انگڑائی لیتے گزرنا کیسے اچھا نہیں لگتا۔ میں تو چاہتی ہوں کہ کسی طرح اچھل کر ایک ڈبّہ کی چھت پر بیٹھ جاؤں اور جہاں وہ لے چلتی ہے چلی جاؤں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ "بچے" اور بلیاں ہر اس شئے میں دلچسپی لیتی ہیں جو حرکت کرتی ہے۔ "cats and children are v ry much interested in every thing that moves!"

ہماری عمریں لمبی ہو جائیں لیکن بچپن ہم میں چھپا بیٹھا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہمارے ماحول سے بچوں کی شرارتیں اور مسکراہٹیں نکال لی جائیں تو لوگ پاگل ہو جائیں۔

اکثر مائیں یہ شکایت کرتی ہیں کہ میرا بچّہ اسکول سے کیوں بھاگتا ہے اسی حقیقت کی بنیاد پر ماہرین تعلیم ڈراپ آوٹ کی وجوہات پر رپورٹس تیار کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے سے قبل بچہ کی فطرت کی عکاسی شیکسپیر نے اپنی ایک خوبصورت نظم "آدمی کے عمر کی سات منزلیں" (Seven Stages of Man) میں اسکول جاتے کا منظر یوں کھینچا ہے:

Then The whining School boy with his S tchel
and Shining Morning faces Creeping like Snail
Unwillingly to School"

[پھر وہ صبح کا تازہ چہرہ لیے ہوئے کتابوں کا بستہ اٹھائے، رونی صورت
بنا کر اسکول کی طرف گھونگھے کی طرح رینگتے ہوئے بیزاری سے قدم اٹھاتا ہے]۔

مثل یہ ہے کہ جب ہم بچوں کی نفسیات، عادات و اطوار اور ان کی دلچسپیوں سے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو خود اپنے بچپن کو بھول جاتے ہیں۔ اکثر والدین بچوں کے سامنے فلسفے کی زبان میں بہت بلندی سے بات کرتے ہیں، حالانکہ ماں باپ کو

---

* جاوید منزل، مکان نمبر ۶-۶۱۴-۴-۱۱، بازار گارڈ، حیدرآباد۔

بچے کے پیروں کے نیچے زمین دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ بچے کا دل ہمیشہ کھیل کود، چیخ و پکار، دنگا فساد، مار دھاڑ، چیڑ پھاڑ اور توڑ پھوڑ میں لگا رہتا ہے۔ پڑھنے میں اس کا جی نہیں لگتا۔ اس کے بستے سے آج کاپی غائب ہے تو ہمسایہ کی کنگھی، ربر اور پنسل موجود، کتاب کی شکل و صورت بگڑی ہوتی ہے تو لکیروں، تصویروں اور بے معنیٰ رنگوں کی دھنک ساری کاپیوں میں نظر آئے گی۔ ٹیچرس کی شکایتیں، نصیحتیں ماں باپ کی دھمکیاں، ٹیچرس کی سزائیں، بنچوں پر کھڑا کرنا، ہم جماعت طلبہ میں بے عزت کرنا، کون خود دار اس ماحول میں ابھرے گا۔ ایسی تعلیم کو دور سے سلام۔ پڑھنا لکھنا ویسے بھی کیا ضروری ہے جب کہ سارے محلہ میں ایک دو لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ ان سارے خیالات کا ہجوم لے کر اسکول پہنچا۔ بیٹھنے کے لیے جگہ نہیں ہے۔ پہلے ہی سے ایک ایک جماعت میں ۹۰، ۱۰۰ بچے ہیں جو جگہ کے حق مالکانہ کے لیے جھگڑ رہے ہیں۔ ان میں جو زور آور لیڈر ٹائپ کے ہیں اپنی دھاک بٹھا رکھی ہے، ٹیچر بھی ان کی قیادت کو مانتے ہیں۔ دھول دھپّا لڑائی جھگڑا ہر روز کا معمول ہے۔ ٹیچرس دس پندرہ منٹ دیر سے داخل ہوئے۔ اس جم غفیر کی حاضری لینے میں دس منٹ لگ گئے باقی ۲۰ منٹ میں کچھ پڑھا دیا۔ گھنٹہ ختم ہوا۔ ریاضی کے ٹیچر نے آتے ہی چھڑی سے پیٹنا شروع کیا۔ بلیک بورڈ پر اب اعداد رقص کر رہے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نہ پینے کے لیے پانی ہے اور نہ حاجت کے لیے صاف جگہ۔ کھیل کود کے لیے نہ تو میدان ہے نہ کلاس روم سے آزاد ہونے کے لیے کوئی راستہ۔ ادھر اسکول کی چھٹی ہوئی سینکڑوں بچوں نے شور مچایا چلو اس تنگ و تاریک قید خانہ سے چھٹکارا ملا۔ گھر آتے ہی کتابوں کا بستہ پٹک دیا۔ جوتے یونیفام گھر کے ہر کونے میں پڑے ہوئے ہیں۔ صورت اُتری ہوئی، بال پریشان، خود ماں باپ کو بھی ایسے وقت کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

اس پر مزید یہ کہ طریقۂ تدریس غیر دلچسپ، اسکول کا ماحول تنگ و تاریک، کتابوں کاپیوں کے انبار سے نفرت، اسکول کے ڈسپلین سے وحشت، وحشیانہ سزاؤں کا خوف، ہوم ورک میں سر کھپانے کا دردِ سر، آخر اس Torture chamber "عذابِ جان" سے چھٹکارا پانے کے لیے بھاگے گا نہیں تو کیا کرے گا۔ اگر وہ نہیں بھاگتا ہے تو پھر بچہ نہیں۔

ہمارے اسکولوں میں ڈراپ آوٹ Drop out کا فی صد بہت زیادہ ہے۔ ہمدرد فاونڈیشن کی سروے رپورٹ کے مطابق اگر پہلی جماعت میں ایک سو بچے شریک ہیں تو پانچویں جماعت تک نصف غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ پت جھڑ ہر موسم میں جاری رہتا ہے۔ دسویں جماعت میں پہنچنے تک ایک سو میں صرف دس باقی رہ جاتے ہیں یعنی ع "تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا" پیسے کی صورت میں کروڑوں روپیے کے ضایع ہونے کا اتنا غم نہیں جتنا کہ قوم اور ملت کے ذہنِ انسانی کا ۹۰ فی صد زرخیز حصّہ یوں ضایع ہو گیا جو کسی اچھے کام کا نہیں رہا۔ پھر اس جاہل اور کاہل قوم پر کئی وجوہات کی بنا پر احباب / رشتہ داروں اور حکومتوں کو جتنا کچھ ساری زندگی خرچ کرنا پڑے گا وہ الگ رہا۔

میسکو (حیدرآباد) Mesco کے صدر ڈاکٹر حیدرخاں نے ایک مرتبہ ایک اہم بنیادی سوال کیا کہ ہمارے اسکولوں میں غریب والدین کے بچے ہی پڑھنے آتے ہیں۔ خود والدین پڑھے لکھے نہیں اور ان کے محلوں کا ماحول بھی تنگ و تاریک ہی نہیں بلکہ ہر برائی سے بھرپور ہوتا ہے۔ جو بچے کھاتے پیتے گھرانوں کے ہیں وہ اچھے اسکولوں میں پڑھتے ہیں جن کی تعداد بس ہمارے معاشرے کا دو چار فی صد ہو سکتا ہے۔ یہ غریب بچے کہیں کارخانوں میں چھوٹے موٹے کام کرنے مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں۔ مدرسے کی اہمیت سے ان کے والدین واقف نہیں۔ ایسے میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟

اوپر کی ساری تفصیل سے ایک بات ضرور سمجھ میں آگئی ہوگی کہ ہر وہ تعلیم جو بچہ کی جبلی تقاضوں Instinctive Forces

باقی صفحہ ۳۹ پر

عبدالودود انصاری *

مائیکرو ٹیچنگ ـــــ ایک نظر میں!!

کسی بھی قوم کی ترقی کا انحصار اس کے شہریوں کی اچھی خوبیوں پر ہوتا ہے۔ شہریوں کی صفت خارجی طور پر نہیں بلکہ صحیح پیمائش کے لحاظ سے ان کی تعلیم پر مبنی ہوتی ہے۔ ان کی تعلیم کا معیار اور عناصر سے زیادہ ان کے معلّم پر منحصر ہوتا ہے اور معلّم کی زیادہ تر صفات اس کی اپنی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ دونوں پہلو تعلیمی پیشہ اختیار کرنے کے بعد میں نمودار ہوتے ہیں۔ لہذا کہا جا سکتا ہے کہ معلّم آسمانِ تعلیم کا ایسا درخشندہ ستارہ ہے جس کی روشنی سے کئی نسلیں فیض یاب ہو سکتی ہیں۔ کسی انگریزی شاعر نے کہا ہے ـــــ "صرف مال و زر ہی نہیں بلکہ انسان ہی لوگوں کو عظیم اور طاقت ور بناتا ہے" ـــــ یقیناً انسان سے مُراد معلّم ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لائق معلّم بنائے نہیں جاتے بلکہ پیدا ہوتے ہیں یہ ایک منطقی ذوالجتین اور مغالطہ آمیز جملہ ہے بلکہ تربیت سے ایک اچھا معلّم خوب سے خوب تر بن سکتا ہے اور ایک ناقص استاد بھی باضابطہ تدریسی طریقۂ کار کی مدد سے اپنی تدریسی صلاحیت میں اصلاح، کشش اور ہنرمندی پیدا کر سکتا ہے۔ معلمی کے پیشے کی تربیت اور مشق ایک معلّم کے لیے اتنا ہی لازم ہے۔ جتنا دیگر پیشوں کے لیے ہے۔ موادِ مضمون کی واقفیت کے ساتھ ایک معلّم کو ناقص اور روایتی طریقۂ کار سے ہٹ کر جدید سائنسی فنِ تدریس کو اپناتے ہوئے عملِ تدریس کی ضرورت ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک ڈاکٹر، انجینئر، موسیقار، فن کار اور سنگ تراش وغیرہ کے تعلق سے یہ بات نہیں کہی جاتی کہ وہ لوگ پیدائشی ماہر ہوتے ہیں۔ پھر ایک معلّم جس پر نہ صرف طلبہ بلکہ ملک و قوم کے مستقبل کی تابناکی منحصر ہوتی ہے وہ مشق کے بغیر کس طرح لائق و فائق ہو سکتا ہے۔ سنگ تراش پر غور کیجیے سب سے پہلے وہ سنگ تراشی کا ہنر سیکھتا ہے، پھر بت کے دیگر اعضا کی تراش و خراش کے ساتھ اسے جاذبِ نظر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح ایک کسمساتا ہوا بت نمودار ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک کامیاب معلم کے لیے علم و فن کی حصولیابی کے بعد کسی تربیتی درس گاہ میں مشق کے بعد اپنے فرائض کی انجام دہی بلاشبہ اس کی تدریسی صلاحیت کو موثر بنانے میں معاون ہوگی کیوں کہ تعلیمی میدان میں تدریسی طریقۂ کار کی تکنیک اور تراکیب کی اصطلاحات میں کافی رفتار سے ترقی ہو رہی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ درس و تدریس کسی ایک عمل کا نام نہیں بلکہ یہ بسیار عمل کے عملی مظاہرے کے برتنے کا نام ہے جس کے لیے معلّم کو مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس بسیار عمل کے اندر بہت سارے زبانی (Verbal) اور تحریری (Non-Verbal) عمل شامل

* پرنسپل، اردو میڈیم گورنمنٹ ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، تالی کل، ہوگلی (مغربی بنگال)

ہیں۔ مثلاً تشریح کرنا (Explaining) تصویر بنانا (Drawing) انعام دینا (Rewarding) مسکرانا (Smiling) سر سے اشارہ کرنا (Nodding) حرکات جسمانی (Gesture) نقل و حرکت (Movement) وغیرہ شامل ہیں۔ تدریس اس پیچیدہ عمل کو محدود تعداد میں بطور اجزاء (Components) منقسم کیا گیا ہے جس میں سے ہر ایک جزو کو تدریسی مہارت (Teaching Skill) کہتے ہیں۔

مائیکرو ٹیچنگ کیا ہے؟

مائیکرو ٹیچنگ ایک جدید تدریسی تکنیک ہے جس میں زیر تربیت معلم مضمون کی ایک اکائی کو کسی خاص تدریسی ہنر کے استعمال سے طلبہ کی ایک چھوٹی جماعت (6 تا 15) کو ایک مختصر مدت (5-10) منٹ کے لیے مشق کرتا ہے۔ مائیکرو ٹیچنگ انگریزی لفظ مائیکرو (Micro) سے ماخوذ ہے جس کے معنی "چھوٹے" کے ہوتے ہیں۔ اس طریقے کی ایجاد USA کے اسٹنفورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ تحقیق و فروغ میں Dwight Allen کی نگرانی میں ہوئی۔ دراصل Acheson جو ایک پی ایچ۔ ڈی کا طالب علم تھا۔ اس نے اس بات کی کوشش کی کہ ایک زیر تربیت معلم اپنی تدریس کے مظاہرۂ عمل کو ویڈیو کیسٹ ریکارڈنگ کے ذریعہ خود اپنے تدریسی عمل کی خوبیوں اور خامیوں کی اصلاح کر سکتا ہے یا نہیں۔ Acheson کی کوشش سے مثبت نتیجہ برآمد ہوا اور اس طریقۂ کار کی ایلن نے اچھے اور نہایت واضح طور پر تعریف پیش کی جس کو مائیکرو ٹیچنگ کہتے ہیں۔ ایلن کے مطابق "مائیکرو ٹیچنگ درجے کے شمار اور وقت کے لحاظ سے پیمائشی تدریس ہے"۔ بی۔ ایم۔ شور نے مائیکرو ٹیچنگ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ مائیکرو ٹیچنگ حقیقی تدریس ہے جو کام کے فاصلے، طلبہ کی تعداد اور وقت کو کم کر دیتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ایلن اور ریان نے مائیکرو ٹیچنگ کے بارے میں اپنے خیال کا اس طرح اظہار کیا ہے کہ مائیکرو ٹیچنگ ایسی تربیت ہے جو ملازمت کے قبل اور دوران ملازمت پیشہ ور معلم کی ترقی پر عاید ہوتی ہے۔ یہ تدریس معلم کو مشاق بناتی ہے اور ہدایت دیتی ہے کہ کلاس کی نفسیاتی الجھن کو کیسے کم کیا جائے۔ اس طرح معلم حضرات اپنے کام کو انجام دے کر بہت حد تک بازرسی (Feed-Back) حاصل کر سکتے ہیں۔ بُش ایک ماہر تعلیم نے ۱۹۶۸ء میں مائیکرو ٹیچنگ کے فوائد کو اس طرح بیان کیا ہے کہ مائیکرو ٹیچنگ معلم کی وہ تعلیمی تکنیک ہے جو معلم کو واضح طور پر تیار کردہ اسباق کو پانچ یا دس منٹوں میں حقیقی طلبہ کی جماعت پر مظاہرہ کرنے کے قابل بناتا ہے اور موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ طلبہ پر اس تعلیم کے اثرات کا جائزہ لے سکے۔

مذکورہ بالا حوالہ جات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مائیکرو ٹیچنگ جماعت میں بچوں کو پڑھانے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک تجربہ گاہی یا دارالعملی (Laboratical) اور تحلیلی (Analytical) طریقہ ہے۔ اس طرح مائیکرو ٹیچنگ کو مائیکرو ٹریننگ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

مائیکرو ٹیچنگ کے اقدام:—

اس طریقۂ کار کے تحت ایک معلم کو بالترتیب درج ذیل اقدام پر عمل کرنا پڑتا ہے۔

۱۔ زیر تربیت معلم سب سے پہلے مضمون کی ایک اکائی کی منصوبہ بندی کسی ایک ہنر پر کرتا ہے۔

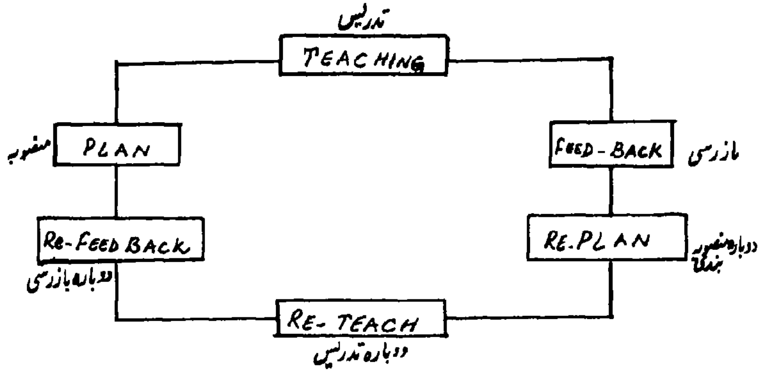
۲۔ منصوبہ بندی کے تدریسی منصوبے کو طلبہ کی ایک چھوٹی جماعت (6 - 15) کی تعداد کو درس دیتا ہے۔

۳۔ درس مختصر مدت (5 - 10) منٹ کا ہوتا ہے۔

۴۔ تدریس کے اختتام پر فی الفور وہ اپنے ہم جماعت یا نگراں یا کچھ آلے مثلاً ویڈیو ٹیپ، ٹیلی ویژن کے ذریعہ بازرسی کرتا ہے۔ حاصل کیے گئے بازرسی کی روشنی میں زیر تربیت معلم اپنی خامیوں کو درست کر کے پھر سے سبق کی منصوبہ بندی یا تدریسی منصوبہ مرتب کرتا ہے۔

۵۔ دوسری بار بنائے ہوئے تدریسی منصوبے کو پھر سے اپنی جماعت کے ساتھیوں کے مختلف گروپوں میں درس دیتا ہے۔

۶۔ زیرتربیت معلم پھر بازرسی پاتا ہے اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اس کی تدریس مکمل اور تشفی بخش نہ ہوجائے۔ مندرجہ بالا اقدام کو ذیل کے خاکے کی مدد سے پیش کیا جاسکتا ہے۔



اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مائیکروٹیچنگ ایک تشریحی مشق ہے جس سے درس و تدریس کی پیچیدگی میں کمی پیدا ہوجاتی ہے جس بناپر تدریسی عمل نہایت ہی موثر ہوجاتا ہے۔

میئر (Meier 1968) نے حسب ذیل اصولوں کو مرتب کیا ہے جس پر مائیکروٹیچنگ کے طریقہ کار منحصر ہوتے ہیں۔

۱۔ جب کسی چیز کے سکھانے کے فیصلے کا تعین کیا جائے تو سیکھنے والے کی صلاحیت کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

۲۔ سیکھنے والے کے اندر سیکھنے کا جذبہ ہونا لازمی ہے۔

۳۔ درحقیقت مقاصد ہمیشہ پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔

۴۔ مائیکروٹیچنگ تدریس کے صرف ایک عمل پر مبنی ہوتا ہے۔

۵۔ زیرتربیت معلم کے لیے لازم ہے کہ وہ ضرورت کے تحت اپنی عادت میں ترمیم کرنے کے لیے مصمم ارادے کا مظاہرہ کرے۔

۶۔ علمیت اور صلاحیت کا مظاہرہ سیکھنے والوں کو مدد پہنچاتا ہے۔

۷۔ فوری بازرسی کی وجہ سے تبادلے میں اضافہ ہوجاتا ہے تاکہ زیرتربیت معلم کو اپنی خامیوں کا احساس ہو، جس سے اس کی مشق پائیدار بن سکے۔

کسی مشہور ماہر تعلیم نے مائیکروٹیچنگ کی خوبیاں اس طرح بیان کی ہیں۔

۱ یہ طریقہ زیرتربیت معلم کو تدریسی ہنر کے استعمال کا موقع فراہم کرتا ہے۔

۲۔ تدریسی ہنر اور تدریسی کردار کی مشق کی جاسکتی ہے۔

۳۔ اس طرح ہنر تدریس حقیقی طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مائیکروٹیچنگ کے طریقۂ کار:— مائیکروٹیچنگ کے طریقے سے زیرتربیت اساتذہ کے لیے درج ذیل اقدامات کو عملی طور پر

بالترتیب تدریس میں عمدگی پیدا کی جا سکتی ہے۔

۱۔ سب سے پہلے زیر تربیت معلم کو مائیکرو ٹیچنگ کی وضاحت، اس کے اجزا کی ترکیب اور اس کی خوبیوں و خامیوں کو اجاگر کیا جائے۔

۲۔ مذاکرہ کے ذریعہ تدریسی ہنر کی شکل، اس کے نفسیاتی خواص اور اس کے اجزا، کی ترکیب سے مکمل واقفیت فراہم کی جائے۔

۳۔ تدریسی ہنر سے مکمل واقفیت کے بعد مائیکرو سبق کا نمونہ (Model) ہونا چاہیے جسے نمونۂ سبق (Model lesson) کہتے ہیں۔ یہ خاصیت ذیل کے طریقوں سے پیدا کی جا سکتی ہے۔

(الف) زیر تربیت معلم خود مائیکرو سبق پر درس دیتا ہے۔

(ب) زیر تربیت معلم مائیکرو سبق کو پڑھا کر سنا سکتا ہے۔

(ج) نمونۂ سبق تحریری شکل میں زیر تربیت معلم کو فراہم کیا جا سکتا ہے۔

(د) نمونۂ سبق ویڈیو ٹیپ پر ریکارڈ کر کے معلّم اپنی تدریس کو خوب سے خوب تر بنا سکتا ہے۔

۴۔ نمونۂ سبق کے مظاہرہ کے دوران زیر تربیت معلم نہایت غور سے سبق کا مطالعہ کرتے ہیں اور معیاری و غیر معیاری سبق میں امتیاز کرتے ہوئے تشخیص یا تعین قدر کرتے ہیں۔ سبق پر تبصرے کے لیے ہر زیر تربیت معلم کو الگ الگ تدریسی ہنر کے لیے مشاہداتی کاغذ (Observation Sheet) دیے جاتے ہیں۔

۵۔ زیر تربیت معلم کو کسی مضمون کی ایک اکائی کے لیے ایک تدریسی ہنر کو استعمال کرنے کے لیے سبق کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔

۶۔ اس کے بعد زیر تربیت معلم (5 - 10) ہم جماعت زیر تربیت ساتھیوں کی چھوٹی جماعت کو مختصر مدّت تقریباً ۶ منٹ کے لیے درس دیتا ہے جسے تدریسی اجلاس (Teaching Session) کہتے ہیں۔ اس تدریس کو ویڈیو یا عام کیسٹ پر ریکارڈ کر لیا جاتا ہے یا وہاں کوئی تربیت یافتہ معلّم یا کوئی ماہر تعلیم یا ہم جماعت ساتھیوں میں ہی نگراں کا کام انجام دیتا ہے۔

۷۔ تدریسی اجلاس کے بعد زیر تربیت معلّم کو بازرسی دی جاتی ہے جو تدریسی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرتی ہے۔ اسے بازرسی اجلاس (Feed-Back Session) کہتے ہیں۔

۸۔ بازرسی کی روشنی میں معلّم اپنے اسباق کی دوبارہ تنقیح کرتا ہے جسے دوبارہ منصوبہ بندی اجلاس (Re-Plan-Session) کہتے ہیں۔

۹۔ دوبارہ منصوبہ بندی اجلاس کے سبق کو پھر زیر تربیت معلم پڑھاتا ہے اس کو دوبارہ تدریسی اجلاس (Re-Teach-Session) کہتے ہیں۔ اس وقت بھی نگراں کے ذریعہ تدریس کی نگرانی ہوتی ہے اور معلّم کو پھر بازرسی دی جاتی ہے اور اس کی خوبیاں اور خامیاں اجاگر کی جاتی ہیں۔ اس بازرسی کی روشنی میں پھر معلّم اپنے اسباق کی خامیاں دور کرتا ہے اس سیشن کو دوبارہ بازرسی سیشن (Re-Feed Back Session) کہتے ہیں اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ زیر تربیت معلّم کا سبق مکمل اور تشفی بخش نہ ہو جائے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مائیکرو ٹیچنگ کے پانچ ہی دائرہ نما اقدامات ہیں جس کے اردگرد تدریسی عمل گھومتا رہتا ہے۔ (۱) تدریس۔ (۲) بازرسی (۳) دوبارہ سبق کی منصوبہ بندی (۴) دوبارہ تدریس اور (۵) دوبارہ بازرسی۔

مائیکرو ٹیچنگ میں بازرسی (Feed-Back in Micro Teaching) مائیکرو ٹیچنگ جیسی جدید اور سائنٹیفک طریقے کے تکنیک کے لیے بازرسی نہایت ضروری ہے جو زیر تربیت معلموں کی تدریس کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کر کے اس کی تدریس

کو معیاری بناتا ہے۔ بازرسی درج ذیل طریقوں سے سودمند ہوتی ہے۔

۱- بازرسی نمونۂ سبق کی تکمیل میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

۲- بازرسی سے تدریس کی خوبیاں اور خامیاں دونوں اجاگر ہوتی ہیں۔

۳- نگراں بازرسی کے ذریعے زیر تربیت معلم کی تدریس کو عمدہ اور لائق تدریس کے لیے حوصلہ اور امنگ بڑھاتا ہے۔

۴- بازرسی سے زیر تربیت معلم کو یہ واقفیت ہوتی ہے کہ تدریسی مشق کے ذریعہ کون کون تدریسی اجزاء کو دہراتا ہے۔

۵ بازرسی سے سبق کی منصوبہ بندی میں ترمیم و اصلاح کے لیے ضروری ہدایات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بازرسی درج ذیل طریقوں سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

(الف) اگر ٹیپ ریکارڈ یا ٹیلی ویژن کے ذریعے معلم کی تدریس ریکارڈ کرلی جائے تو معلم خود ریکارڈ بجا کر یا ٹیلی ویژن دیکھ کر بازرسی پاسکتا ہے۔

(ب) معلمی کی تعلیم دینے والا مدرس تدریسی ہنر کی پیمائش قدر کرتا ہے اور اس کی روشنی میں بازرسی دیتا ہے۔

(ج) تربیتی درس گاہوں میں ٹیپ ریکارڈ، ٹیلی ویژن اور نگراں کی عدم موجودگی میں معلم خود اپنی جماعت کے ساتھیوں کے ذریعے بازرسی پاسکتا ہے۔

مائیکرو ٹیچنگ میں نگراں کا کردار :— نگراں کے تحت تدریس کی نگرانی کے ذریعے معلم اپنے طریقۂ تدریس کے ہنر کا صحیح مظاہرہ اور تجربے کی مشق حاصل کرتا ہے۔ اس طرح ایک نگراں معلموں کے لیے ایک اہم کردار ادا کرتا ہے — براؤن (Brown) نے اپنی کتاب Micro-Teaching میں نگراں کی اہمیت اور اس کے فرائض کے تعلق سے لکھا ہے:

۱- نگراں کو تدریسی ہنر میں مہارت ہونی چاہیے اور نگرانی میں منہمک ہو کر اپنے فرائض سے عہدہ برآں ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ مائیکرو ٹیچنگ کے تمام طریقوں کی مکمل جانکاری ہونی چاہیے۔

۲- نگراں اور زیر تربیت معلموں کے درمیان تعلقات خوش گوار ہونا چاہیے تاکہ سیکھنے اور سکھانے کا جذبہ شدت سے پیدا ہو اور وہ اپنی تدریس سے مثبت نتائج حاصل کر سکے۔

۳- اگر نگراں کو کسی تدریسی ہنر میں کوئی کسر یا تنگ کی گنجائش رہی تو زیر تربیت معلموں کے وقت کی بربادی کے ساتھ مقاصد کی تکمیل میں رکاوٹ ہوگی۔ یہ عمل معلموں کے حق میں ضرر رساں ہے۔

۴- بعض نگراں تدریسی ہنر کے استعمال میں اپنے خیالات کو زبردستی تھوپنا چاہتے ہیں جو درست نہیں ہے۔

۵- نگراں کے سب سے اہم کارکردگی اس کے اور زیر تربیت معلم کے درمیان آپسی تعلقات پر مبنی ہے۔ تاکہ معلم تدریسی ہنر کو خوش دلی اور تندہی سے سیکھ سکے اور عملاً بروئے کار لاسکے۔

۶- نگراں کی صحیح نگرانی ایک زیر تربیت معلم کو ایک کامیاب استاد بناتا ہے۔

۷- نگراں مائیکرو ٹیچنگ کے ذریعے تدریسی ہنر کے مقاصد کو عملی طور پر انجام دے اور اس کے مرتبے کے لیے صحیح راستہ متعین کرے۔

۸- نگراں کو زیر تربیت معلموں کے ذریعے صحیح اور عمدہ تدریسی ہنر کے استعمال پر بطور انعام توصیفی کلمات سے نوازے اور ان کی حوصلہ افزائی کرے۔

مائیکرو ٹیچنگ کے فوائد: (۱)۔ یہ ایک حقیقی تدریسی طریقہ ہے۔ (۲)۔ یہ عام درجوں میں تدریس کی پیچیدگی کو دور کرتا ہے (۳)۔ زیر تربیت معلّم کی تمام تر توجہ اور مشق سبق کے کسی خاص تدریسی ہنر پر مرکوز ہوتا ہے۔ (۴)۔ معلّم کو مواد کی ایک چھوٹی اکائی کی ہی منصوبہ بندی کرنا پڑتی ہے۔ (۵)۔ معلّم کے تدریسی عمل اور کارکردگی نگراں کے ماتحت ہوتی ہے۔ (۶) معلم کو تدریس کے فوراً بعد بازرسی مل جاتی ہے جس سے اُسے اپنی تدریس کی خامیوں اور خوبیوں سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ (۷) ویڈیو ٹیپ کا استعمال کر کے معلّم خود اپنی تدریس کی بازرسی کر سکتا ہے۔ (۸)۔ مشق کے لیے معلّم کو کسی دوسرے اسکول میں جانا نہیں پڑتا ہے۔ (۹) اس میں وقت کی بچت کے ساتھ طلبہ کے اندر غیر انضباط کا مسئلہ نہیں ہوتا ہے۔

مائیکرو ٹیچنگ کی خامیاں:۔ (۱)۔ اس طریقے کا خاص مضمون صرف تدریس کے ہنر پر مرکوز ہوتا ہے۔ پورے مضمون کی تدریس ممکن نہیں۔ (۲)۔ مائیکرو ٹیچنگ میں اگرچہ وقت کی بچت ہوتی ہے لیکن دیکھا جائے تو وقت کافی صرف ہوتا ہے مثلاً اگر ایک جماعت میں ۵ زیر تربیت اساتذہ ہیں اور ایک استاد کو ایک ہنر کی تدریس' بازرسی' دوبارہ سبق کی منصوبہ بندی، دوبارہ تدریس' دوبارہ بازرسی کا سلسلہ مکمل کرنے کے لیے ۳۵ منٹ لگتے ہیں (جیسا کہ بیشتر ماہرین کی رائے ہے) تو اس طرح ۵ معلم کے لیے ایک ہنر کے استعمال میں 5x35 = 175 منٹ وقت کی ضرورت ہوگی۔ (۳) مائیکرو ٹیچنگ کے عمل میں ایک وقت میں صرف ایک ہی زیر تربیت معلّم کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (۴) جلد بازرسی (Immediate Feed Back) سبھی حالات میں نہیں دیا جا سکتا۔ (۵)۔ مائیکرو ٹیچنگ قلیل وقفہ کے باعث معلّم کی پیمائش قدر (Evaluation) صحیح طور پر نہیں ہو پاتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۵ کا)

کو تیار ہے۔

بہر حال یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر غور و فکر کرنے اور باہم صلاح مشورہ کرنے کے بعد کوئی حکمتِ عملی مرتب کی جائے۔ اس پہلو پر غور کرتے وقت ان مدارس کے نصابِ تعلیم اور ذمہ داران کی موجودگی ضروری ہے جنھوں نے اس سلسلے میں پیش رفت کی ہے۔ وہ اس کی خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے عملی تجربات کی روشنی میں کوئی بہتر فیصلہ ہونے کی امید زیادہ قوی ہے۔ ان کی موجودگی کے بغیر جو بھی اقدام کیا جائے گا وہ شاید اتنا عملی نہیں ہوگا جتنا کہ ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر قیصر جہاں ہاشمی *

اسلام امن پسند ہے، جنگ پسند نہیں

جنگ آپسی مروت، اخوت، ہمدردی اور محبت جیسے پاکیزہ اور لطیف جذبات کو پامال کرتی ہے۔ ماحول، آب وہوا اور ذہن انسانی کو تباہ کرتی ہے۔ امن وآشتی، سکون اور ترقی کی دشمن ہے۔ اسی لیے محض نسبی اور نسلی تعصب اور مذہب کو بنیاد بنا کر جنگ کرنا اور عداوت وبغض باندھ کر ماحول کو پراگندہ کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسلام قومی یک جہتی کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن کریم میں دوسرے مذاہب کے لوگوں سے بھی حسنِ سلوک کرنے اور مروّت کا برتاؤ رکھنے کو پسند فرمایا گیا ہے۔

ترجمہ: "اللہ تم کو اس بات سے منع نہیں کرتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف
کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں
تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔" (الممتحنہ ۸)

فتنہ وفساد برپا کرنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ امن پسند قوموں سے لڑنا منع ہے۔ دنیاوی نفع اور غرض کی خاطر جنگ جہاد نہیں ہے۔

ترجمہ: "یا جو تمہارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں۔ نہ تم سے لڑنا
چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے اور اگر اللہ چاہتا تو اُن کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی
تم سے لڑتے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز آئیں اور
تمہاری طرف صلح وآشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر دست
درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔" (النساء ۹۰)

جس قوم نے ظلم وجبر کیا ہے اور بحالت مجبوری اس کے ظلم وستم کو روکنے اور اپنی حفاظت کرنے کے لیے جنگ کرنی پڑے، تب بھی اگر اس دوران ظالم شر سے باز آجائیں اور صلح کرنا چاہیں تو اس حالت میں جنگ روا نہیں رہتی۔

ترجمہ: "پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔" (البقرہ ۱۹۲)

---

* شعبۂ دینیات (سنی) سینیر سکنڈری اسکول، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ایک اور جگہ فرمایا:

ترجمہ: "پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔" (البقرہ - ۱۹۳)

قرآن کریم کی تعلیمات کے مطابق جنگ مادی اغراض کے لیے جائز نہیں ہے۔ نہ اُن لوگوں پر ہاتھ اُٹھانے کی اجازت ہے جو دین حق کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتے اور نہ لڑائی میں یعنی جائز حالات کے تحت لڑی جانے والی جنگ میں جاہلیت کے طریقوں اور وحشیانہ حرکتیں کرنے کی اجازت نہیں ہے قطعی طور پر منع ہے۔ عورتوں اور بچوں، بوڑھوں اور زخمیوں پر ہاتھ اُٹھانے کی ممانعت ہے دشمن کے مقتولوں کا مُثلہ کرنا، کھیتوں، ہرے بھرے درختوں اور مویشیوں کو خواہ مخواہ برباد کرنا اور دوسرے ظالمانہ افعال بالکل ناروا ہیں۔

ترجمہ: "اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔" (البقرہ ۱۹۰)

قوت کا استعمال وہیں کیا جائے جہاں ناگزیر ہو اور اسی حد تک کیا جائے جتنی ضرورت ہو۔

رنگ، نسل، اونچ نیچ، ذات پات اور زبان کو لے کر جنگ کرنا قومی اتحاد کو خطرے میں ڈالنا، معاشرے کے سکون کو برہم کرنا جہالت اور غیر مہذب ہونے کی نشانیاں ہیں۔ اسلام نے ان تمام تفرقات کو یک قلم موقوف کر دیا۔

ترجمہ: "اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔" (الحجرات ۱۳)

یعنی انسانوں کا عزت دار اور شریف ہونا کسی خاص خاندان، گھرانے، ذات و نسل اور رنگ و زبان اور دولت وغیرہ کی بنا پر نہیں بلکہ انسان کا عزت دار اور شریف ہونا اس کے عمل کی بنیاد پر ہے جو جتنا نیک و صالح ہے معاشرے کے لیے نفع بخش ہے وہی معزز و شریف ہے۔

ناروا کسی کا قتل کر دینا سخت گناہ ہے لیکن سماج میں فتنہ و فساد پھیلانا قتل کرنے سے بھی بڑھ کر گناہ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ فتنہ و فساد وہ بھڑکتا ہوا بے لگام شعلہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی پوری قوم جل کر بھسم ہو جاتی ہے، آزاد سے غلام بن جاتی ہے، تاریخ کا سنہرا دور سیاہ دور میں بدل جاتا ہے۔

ترجمہ: "اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ بُرا ہے۔" (البقرہ ۱۹۱)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام حرکات و سکنات جن کی وجہ سے انفرادی یا اجتماعی طور پر کسی کے جائز اور حق و جذبات مجروح ہوں اور ظلم و تشدد کی آگ بھڑکے وہ کسی قوم کے سمجھ دار اور مہذب و متمدن افراد کا کام نہیں ہو سکتا۔

ترجمہ: "اور زمین میں فساد برپا مت کرو۔" (الاعراف ۵۶)

ظلم کرنے اور ظلم کو سہتے رہنے سے بھی منع فرمایا گیا ہے۔ کیوں کہ ظلم و جبر کو سہتے رہنے سے بھی ظالموں، مجرموں اور باغیوں کو بڑھاوا ملتا ہے۔ جہالت کے اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے کم ظرف، بزدل اپنے کو بہادر اور طاقتور ماننے لگتے ہیں۔

ترجمہ: "نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔" (البقرہ ۲۷۹)

اسلامی جہاد کا مقصد فتنہ و فساد اور ظلم و جبر اور تشدد کو ختم کرنا ہے اور یہ بڑے عزم و ہمت اور بہادری، صبر و تحمل، قربانی، جرات، شجاعت اور رحم و ہمدردی، خداترسی، حق و فرض شناسی کے ملے جلے متوازن جذبات کا کام ہے۔

جہاد کے معنی ہیں مشقت وجد و جہد کرنا، پوری کوشش کرنا، طاقت لگا دینا، اللہ کے راستے میں محنت و کاوش کرنا، قوت صرف کر دینا۔ (ماخوذ از "القاموس المحیط الزاوی طاہر احمد)۔

حق کی تعلیم کا مقصد معاشرے کی اصلاح اور انسانیت کی فلاح اور امن بحال کرنا اور سلامتی قائم رکھنا ہے۔

ترجمہ: "اور وہ (اللہ تعالیٰ) جو اپنے بندے پر واضح آیتیں بھیجتا ہے تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لائے اور بیشک اللہ تمہارے ساتھ بڑا شفیق اور مہربان ہے۔" (الحدید ۹)

حق کی حمایت مظلوم کی مدد، نفس کشی، ایثار و قربانی، قربتِ الٰہی کی خواہش، مساوات و محبت کا برتاؤ، طاقت و قوت کا مکمل طور پر صحیح استعمال، صبر و استقلال، ارادے کی مضبوطی، آزمائشوں کے باوجود یقین کے ساتھ راہِ مستقیم پر گامزن رہنا، اللہ اور اس کے رسول کی ہر معاملے میں اطاعت و اتباع کا پورا اہتمام رکھنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں جان و مال سے سعی۔ یہ وہ کردار ساز عظیم صفات ہیں جو انسان کو اللہ کا محبوب بندہ بنا دیتی ہیں اور ان صفات سے متصف انسان خود اس لائق ہو جاتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کا اتباع کریں تو فلاح پائیں۔ یہ عظمت ہے معاشرے میں امن بحال کرنے والے، محسن اور صالح انسانوں کی۔

ترجمہ: "ان لوگوں کے طرزِ عمل میں تمہارے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہے اچھا نمونہ ہے۔" (الممتحنہ ۶)

(باقی صفحہ ۲۷ کا)

کے خلاف ہوگی۔ وہ بچوں کی نفسیات اور فطرت کے خلاف ہوگی جو قابلِ نفرت اور بغاوت کا پیش خیمہ ہوگی۔ اس کا ایک ہی حل ہے وہ یہ کہ بچے کے فطری رجحانات، میلانات اور خواہشات کے مطابق اسکول کی زندگی کو ڈھالا جائے۔ ہم سارے ملک میں آسانی سے غربت اور جہالت کے ماحول کو بدل نہیں سکتے لیکن ساری کمیونٹی کے بچوں کے لیے ایک اچھا ماحول اسکول میں دے سکتے ہیں۔ کھیل کود، تعلیمی مقابلے، اسکوٹنگ، تعلیمی تفریح وغیرہ کی سہولتیں دیجیے تاکہ بچے کی شخصیت کے جوہر پھوٹ پڑنے کے راستے نکل آئیں۔ اب دیکھیے اسکول ان کے دل کی دھڑکن اور ان کی خوشیوں کا مینار ہوگا۔ اسکول کی چھٹی ہوئی تو افسوس ہوگا۔ بچہ اسکول سے نہیں بلکہ اسکول کی طرف بھاگے گا۔ بھاگنے کی سمت اس طرح بدل جائے تو تعلیم کی دنیا میں دیکھتے ہی دیکھتے انقلاب آجائے گا۔

(ترجمہ) پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی *

اسلام کے پروانے

لارڈ ہیڈلی فاروق

ان کا نام رائٹ آنورایبل سر رولینڈ جورج ایلسن تھا۔ ۱۸۵۵ء میں ولادت ہوئی۔ برطانیہ کی نمایاں شخصیات میں ان کا شمار تھا۔ کیمبرج میں تعلیم پائی۔ ۱۸۷۷ء میں لورڈ بنے۔ پہلے فوج کی خدمت کیپٹن کی حیثیت سے کی۔ پھر نارتھ منسٹر کی پیدل چوتھی بٹالین میں لیفٹننٹ کرنل کے عہدے پر فائز رہے۔ اصلاً انجینیر تھے مگر ممتاز ادبی ذوق رکھتے تھے۔ سیاست کے علاوہ تصنیف و تالیف سے بھی شغل تھا جریدہ "سالسبری جورنل" کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ ان کی متعدد تصانیف میں A western Awakening to Islam بھی ہے۔ ۱۶ نومبر ۱۹۱۳ء کو اسلام کا اعلان کر کے رحمت اللہ فاروقی نام رکھا اور حج کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان کا سفر ۱۹۲۸ء میں کیا تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ میرے دوست سمجھتے ہوں گے کہ میں نے مسلمانوں کے اثر سے اسلام قبول کیا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ میرے سالہا سال کے مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ مسلمانوں سے تو میری گفتگو چند ہفتے پہلے شروع ہوئی تھی اور مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی اور شرح صدر ہوا کہ میرے نظریات کی بنیادیں اور نتیجے تمام تر اسلامی تعلیمات کے موافق تھے۔ قرآن کریم کی رو سے بھی دین کا اختیار انسان کے ذاتی اطمینان و خوشی سے ہونا چاہیے جبر و اکراہ سے نہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا بھی شاید یہی مطلب ہوگا جب انھوں نے اپنے حواریوں سے فرمایا تھا کہ "جب تم سفر کروگے تو ممکن ہے کوئی تمہاری بات نہ سنے یا قبول نہ کرے۔" (یادری مرقس کی انجیل، اصحاح ۲)

میں نے بہت سے پروٹسٹنٹ عقیدے کے ماننے والے غیرت مند مبلغین کو دیکھا ہے کہ وہ رومن کیتھولک ممالک میں اپنے عقائد کی تبلیغ اپنا فرض سمجھتے ہیں، مگر ان کے الجھے ہوئے طریقے نفس پر گراں گزرتے ہیں، کراہیت پیدا ہوتی ہے اور پرانے حقد و حسد اور جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں جو خود دین کی عزت و احترام کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ مزید افسوس مجھے اس بات پر ہوتا ہے کہ عیسائی تبلیغی وفود یہی طریقے اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ میری نظر میں تو اس کا کوئی جواز نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کو عیسائی بنایا جائے جو عملاً حقیقی عیسائی تعلیمات سے قریب تر ہیں۔ میرا مطلب اسلام میں بھلائی و نیکی، عفو و درگذر، رواداری اور عقلی افق کی کشادگی سے ہے جو موجودہ مختلف عیسائی مذاہب کے متشددانہ تنگ عقائد کے برخلاف حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کے مشابہ ہیں۔

مثال کے طور پر اناسی مذہب اپنے بڑے مقام و مرتبے کے باوجود بنیادی عیسائی عقیدہ "تثلیث" کو انتہائی پیچیدگی سے پیش کرتے ہوئے پوری وضاحت سے کہتا ہے کہ وہ کیتھولک عقیدے کی نمائندگی کر رہا ہے، اس لیے اگر ہم کو نجات مطلوب ہے تو اس کو مانیں

* سینئر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مرد ہم ہمیشہ کے لیے ہلاک ہوجائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ جس رب کو ہم بڑا رحیم مانتے ہیں اسی کو ظالم وجابر، سرکش وسنگدل ترین انسان سے مشابہ قرار دے رہے ہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ عقیدۂ تثلیث پر ایمان رکھنے والے کمزور بندوں کی بیان کی ہوئی صفات سے بہت بلند و پاک ہے۔

دوسری مثال کا تعلق عیسائیت کو نیکی و بھلائی و محبت کی ضرورت سے ہے۔ میرے اسلام کی طرف رجحان سے متعلق ایک خط میں اس کو بھیجنے والے نے لکھا تھا کہ "اگر میں مسیح کی الوہیت پر ایمان نہ لایا تو مجھے نجات نہیں ملے گی" جب کہ میرے نزدیک اس سے زیادہ اہمیت اس مسئلے کی تھی کہ "کیا حضرت مسیحؑ نے واقعی اللہ کا پیغام جنس بشری کو پہنچایا یا نہیں؟" خدا کا شکر ہے کہ اس بارے میں مجھے کوئی شک نہ ہوا اور میری دعا ہے کہ مسیحؑ کے بارے میں اللہ تعالیٰ میرا ایمان ایک مسلمان کی طرح قائم و دائم رکھے میں نے پہلے بھی بار بار کہا ہے کہ اسلام اور حضرت مسیحؑ کی لائی ہوئی مسیحیت دراصل دو جداگانہ دین نہیں (بلکہ ایک دین ہے ان الدین عند اللہ الاسلام (آل عمران ۱۹) ترجمہ: بیشک (معتبر) دین اللہ کے نزدیک اسلام رہا ہے۔ یعنی اللہ کی تابع داری اور خود سپردگی۔ مترجم)۔

ان تنگ نظر متشدد مذاہب کی وجہ سے تو لوگ اللہ پر ایمان ہی سے منحرف ہو رہے ہیں، جب کہ دوسری طرف ایک ایسے دین کی پیاس ہے جو عقل کو مخاطب کرے اور فطرتِ انسانی کے موافق ہو۔ میں تو ہمیشہ یہ پوچھتا ہوں کہ "کیا کسی نے کسی مسلمان کو ایمان سے الحاد کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے؟" ہوسکتا ہے ایسی بعض انفرادی مثالیں مل جائیں لیکن میں تو ان کو بھی شک وشبہ اور احتیاط کی نظر ہی سے دیکھتا ہوں۔

میرے خیال میں تو اس وقت ہزاروں مرد وعورتیں اپنے دل میں مسلمان ہیں، لیکن عرف عام کا لحاظ، تنقید والزام بازی سے خوف اور اجتماعی مشکلات سے بچنے کی خواہش کی وجہ سے وہ اپنے اسلام کا اعلان نہیں کرتے۔ میں نے یہ سب جانتے بوجھتے اپنے اسلام کا اعلان کیا کہ میرے بیشتر رشتہ دار واحباب اپنے عرف کے لحاظ سے مجھ کو گمراہ سمجھیں گے، جس پر کسی نصیحت و دعا کا اثر ہونے والا نہیں۔ اس کی وجہ سے میں اُن کے احترام ومحبت سے بھی محروم ہوا۔ مگر میرا عقیدہ جیسا بیس سال پہلے تھا وہی آج بھی ہے۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ پہلے کے مقابلے میں اب حضرت مسیحؑ پر میرا ایمان بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اس لیے میں دوسرے لوگوں کو بھی اسی راستے کی طرف بلاتا ہوں جس کے بارے میں اخلاص سے میرا اعتقاد ہے کہ یہی صراطِ مستقیم (سیدھا راستہ) ہے۔ یہ ان لوگوں کی قسمت سنوارے گا جو میرے اقدام کو ترقی کی طرف آگے کا قدم سمجھتے ہیں۔ یہ کسی حال میں بھی عیسائیت سے عداوت کے ہم معنی نہیں۔ (ماہنامہ التوحید، قاہرہ، ۲۳؍۴؍ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ صفحہ ۵۳ - ۵۵)

محمد اسد لیوپولڈ وائس

ان کا نام لیوپولڈ وائس تھا۔ ۱۹۰۰ء میں آسٹریا کے شہر لیوو میں (جو اب پولینڈ کے تابع ہے) ولادت ہوئی بائیس سال کی عمر میں مشرقِ وسطیٰ کا سفر کیا۔ جریدہ "فرنکفورٹیر زیتنگ" کے نمایاں غیر ملکی مراسلہ نگار رہے۔ اسلام کے اعلان کے بعد عالم اسلامی کے بڑے پیمانے پر سفر کیے اور شمالی افریقہ سے لے کر مشرقی افغانستان تک متعدد جگہ کام کیا۔ کئی سال تک اسلام کے گہرے مطالعے کے بعد عصر جدید میں اسلام کے نمایاں نشان وترجمان بن گئے۔ قیام پاکستان کے بعد مغربی پنجاب میں تجدید اسلام ادارے کے مدیر مقرر ہوئے۔ اقوام متحدہ میں باری باری پاکستان کے مندوب رہے۔ ان کی دو اہم کتابیں Islam at the Cross road اور Way to Makkah ہیں۔ ایک ماہنامہ "عرفات" کے نام سے نکالا۔

آن کا بیان ہے کہ ۱۹۲۲ء میں یورپ کے بعض بڑے جرائد کے مراسلہ نگار کی حیثیت سے ایشیا و افریقہ کے سفر پر نکلا تو تقریباً میرا تمام وقت مشرقی اسلامی ممالک ہی میں گزرا۔ ابتدا میں ان اقوام سے میری دلچسپی ایک اجنبی شخص کی طرح تھی مگر میں نے اس معاشرے کو یورپی معاشرے سے بالکل مختلف پایا تو میرا دل اس فلسفۂ حیات کے ٹھہرے ہوئے سمندر کی طرف کھنچنا شروع ہوا بلکہ یورپ کے تیز رفتار مشینی اندازِ زندگی کے مقابلے میں اس کو میں فطری انسانی زندگی کے رواں دواں قافلے سے تعبیر کرتا ہوں بہرحال اس احساس نے تدریجی طور پر اس اختلاف کے اسباب جاننے کی طرف متوجہ کیا تو میں نے اسلام کی دینی تعلیمات کا مطالعہ شروع کیا۔ اس وقت اگرچہ اسلام قبول کرنے کا کوئی قوی سبب معلوم نہیں ہوتا تھا، لیکن یہ بات صحیح تھی کہ میں ایک ترقی یافتہ انسانی معاشرے کی زندہ تصویر ضرور دیکھی، جس کا نظم وضبط اندرونی تضادات سے پاک تھا اور صحیح برادرانہ احساس کا بڑا حصہ اس کو نصیب تھا۔

اس کے برخلاف دوسری حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ اسلامی تعلیمات کے تحت جو مثالی زندگی مسلمانوں کو حاصل ہو سکتی تھی وہ اس سے بالکل دور ہو چکے ہیں۔ اسلام میں موجود تمام فعّال و متحرک عناصر مسلمانوں میں کاہلی وجمود کا سبب بن گئے ہیں، اسلام میں جود وسخا اور جانی و مالی قربانی کے برعکس آج کے مسلمان عقلی افق کی تنگی اور سہولت و عافیت کی زندگی پر قانع ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کے ماضی وحال کے تناظر میں یہ عجیب تضاد دیکھ کر مجھ کو بہت مسرت ہوئی اور اس معمّے کو حل کرنے کی فکر لگ گئی۔ خالص خیالی تجربے کے طور پر میں نے اپنے کو ایک مسلمان کی حیثیت میں رکھ کر غور کیا تو صحیح وجہ سامنے آئی کہ مسلمانوں کے اجتماعی و ثقافتی پچھڑے پن کا تنہا سبب یہ ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات اور اس کی روح سے دھیرے دھیرے دور ہو چکے ہیں۔ اسلامی معاشرہ تو قائم ہے مگر بے روح جسم کی طرح۔ عالمِ اسلام کی قوت کا راز جس عنصر میں تھا اسی سے بے توجہی نے آج ان کو موجودہ کمزوری میں مبتلا کیا۔ ابتدا سے اسلامی معاشرہ صرف دین کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ اس بنیاد کی کمزوری کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ساتھ مربوط ثقافتی ڈھانچہ بھی کمزور ہو گیا اور اگر اس طرف کما حقہٗ توجہ نہ کی گئی تو یہی اس کے زوال اور مکمل خاتمہ کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

اسلام کی تعلیمات کی طاقت اور زندگی میں ان کو واقعی تطبیق کی لامحدود صلاحیت جیسے جیسے مجھ پر واضح ہوتی گئی ان سے میرا اتنا ہی لگاؤ بڑھتا گیا اور یہ سوال پریشان کرتا رہا کہ ان تعلیمات سے مکمل وابستگی اور واقعی زندگی میں ان پر حقیقی عمل سے مسلمان کیوں دستبردار ہوئے؟ عالمِ اسلام کے تمام مفکرین سے اس پر تبادلۂ خیال ہوا اور یہی میرا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ اس موضوع کی اہمیت کا مجھے اتنا یقین ہو گیا کہ غیر مسلم ہونے کے باوجود مسلمانوں کے سامنے میں اسلام کی مدافعت کرتا اور مسلمانوں کی لاپرواہی اور بے توجہی پر تنقید کرتا۔ اس پوری مدت میں اپنی اندرونی حالت سے بے خبر تھا کہ افغانستان کے پہاڑوں پر ۱۹۲۵ء کے موسمِ خزاں میں وہ دن آیا جب وہاں کے ایک علاقے کے ایک نوجوان حاکم نے مجھ سے اچانک کہا: "لیکن تم تو لاعلمی میں اس وقت مسلمان ہو" میں حیرت زدہ ہو کر خاموش ہو گیا، لیکن ۱۹۲۶ء میں یورپ واپسی پر مجھے یقین ہو گیا کہ میرے فکر و عمل کا منطقی نتیجہ اسلام قبول کر لینا ہے۔

ان حالات میں اسلام قبول کرنے کے بعد سے مجھ سے بار بار پوچھا جاتا ہے کہ "میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟ اور متعین طور پر وہ کیا چیز تھی جس نے مجھ کو اس طرف مائل کیا؟" میں اعتراف کرتا ہوں کہ یقینی طور پر میں اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتا۔ اسلامی تعلیمات میں کوئی ایک چیز تو تھی نہیں کہ جس نے میرے ہوش و حواس پر قبضہ کیا ہو۔ وہ تو اس کی

روحانی تعلیمات کے مربوط و موزوں و مکمل مجموعہ کا گہرا نقش تھا جو زندگی کے عملی پروگرام کی تشکیل کرتا ہے۔ نہ پہلے میرے لیے اسلام کے کسی ایک پہلو کی تاثیر کو دوسرے کے مقابلے میں متعین کرنا ممکن تھا نہ اب ہے۔ اس لیے کہ اسلام تو مجھے ایک ایسی مضبوط و مستحکم عمارت کی طرح معلوم ہوتا ہے جس کی تشکیل و تعمیر کے تمام موزوں اجزاء ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، ان کو جکڑے ہوئے ہیں۔ اور ان میں کوئی کمی و زیادتی نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ مکمل توازن اور جامع و شامل استحکام کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔

ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظریات و تعلیمات کے اس موزوں و محکم امتزاج کا ہی میرے دل پر سب سے زیادہ اثر ہوا ہو، یا دوسرے عوامل بھی ہوں جن کا اس وقت میں تجزیہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اس موضوع کا تعلق محبت سے ہے جو اس دین کے لیے میرے دل میں پروان چڑھی۔ سب جانتے ہیں کہ محبت میں ہماری خواہشات، تنہائی کے احساسات، بلند مقاصد، طاقت و کمزوری، عاجزی و بے بسی اور دیگر طرح طرح کے عوامل کا دخل ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے محسوس ہوئے بغیر اسلام میرے دل کی گہرائی میں ایسے داخل ہوا جیسے کہ ایک چور رات کی تاریکی میں گھر میں گھستا ہے، لیکن چور کی طرح باہر نکلنے کے لیے نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لیے میرے دل میں سما جانے کے لیے اور تب سے میں اپنی پوری کوشش کرتا ہوں کہ اسلام کے بارے میں جو کچھ جاننا ممکن ہے اس کی معرفت حاصل کروں، اسی لیے قرآن شریف پڑھا، حدیث نبوی کا مطالعہ کیا، اسلام کی زبان سیکھی اور اس کی تاریخ سے واقفیت حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ مزید توفیق دینے والا ہے۔ (ماہنامہ التوحید، قاہرہ، ۲۳/۶ جمادی الثانی ۱۴۱۵ھ، صفحہ ۵۱–۵۳)

محمد اسکندر راسیل ووب (۱۸۴۶ — ۱۹۱۶ء)

ہڈسن (کولمبیا، ولایات متحدہ امریکہ) میں پیدا ہوئے۔ ہڈسن نیویارک میں تعلیم پائی۔ افسانہ و مقالہ نویسی میں شہرت حاصل کی۔ صحافت میں نام کمایا۔ "سینٹ جوزیف گزٹ" اور "میسوری ریپبلکن" رسالوں کے مدیر اعلیٰ رہے۔ ۱۸۸۷ء میں منیلا (فلپین) میں امریکہ کے قونصل متعین ہوئے۔ اسی زمانے میں اسلام کا مطالعہ کیا اور ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے پھر عالم اسلامی کے سفر کیے اور باقی زندگی اس کی دعوت و تبلیغ میں گزاری۔ امریکہ میں جماعت دعوتِ اسلامی کے صدر رہے۔ یکم اکتوبر ۱۹۱۶ء کو وفات ہوئی۔

ان کا کہنا تھا کہ میں ایک عیسائی ملک میں پیدا ہوا، جہاں عیسائیت کا بول بالا تھا، بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہاں آرتھوڈکس عیسائیت کا وعظ و نصیحت کے منبروں سے بڑھ چڑھ کر زبانی چرچا ہوتا تھا، مگر میں نے طویل مطالعہ کے بعد اسلام کو اپنی زندگی کا راستہ چنا۔ اس لیے کہ میں نے اس کو تمام دینوں میں سب سے بہتر پایا، کیوں کہ یہی وہ تنہا دین ہے جو جنس بشری کی روحانی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے۔

بچپن میں میرے اندر قدرتی دینی جوش و سرگرمی کی کمی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب مجھ کو خود اعتمادی اور اپنی ذات پر اختیار کی آزادی کا شعور نصیب ہوا تو گرجا کے جمود و سرد مہری سے میرا دل بیزار ہو گیا، پھر میں نے اس کی طرف پلٹ کر رُخ نہ کیا۔ خوش قسمتی سے مجھ میں عقلی تجسس کی صلاحیت تھی، اس لیے میں ہر چیز کی علت اور اس کے سبب کی تلاش میں رہتا تھا۔ عقلی و منطقی وسائل سے دینی و لادینی لوگ عیسائیت کے عقیدے کی حقیقت سے مجھ کو مطمئن نہ کر سکے۔ تنگ آ کر وہ یہی کہتے کہ یہ غامض و مخفی مسائل ہیں جو میرے شعوری معیار سے بلند ہیں۔

مشرقی ادیان کے مطالعے کی طرف میری توجہ ہوئی تو میں نے مل (Mill)، کانٹ (Kant)

لوک (Locke)، ہیگل (Hegel) اور ہکسلے (Huxley) کی تحریریں پڑھیں، ایسے اہلِ قلم ومفکرین کے لیکچرسن اور گفتگوئیں سنیں جو گویا بزعمِ خود ذرّہ (atom) اور خلیہ (cell) کے دانائے رموز تھے مگر ان میں سے کوئی بھی مجھ کو روح کی حقیقت، اس کا ماضی وحال اور موت کے بعد اس کا حشر نہ بتا سکا۔

اس تفصیل سے خودستائی مقصود نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ اسلام پر اعتقاد کسی گمراہی، غلطی، اندھے ایمان یا جذباتی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ یہ ایمان، ایمان دارانہ، تجسسانہ، دقیقہ رس مطالعہ کی دین اور حقیقت جاننے کی خواہش وعزم کا نتیجہ تھا جو کسی سابق رائے یا رجحان سے متاثر نہ ہوا۔

اسلامی عقیدہ کی حقیقی روح اللہ تعالیٰ کے ارادے کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے میں ہے اور اس کا رکنِ رکین نماز ہے۔ اسلام عالمی بھائی چارگی، سارے جہانوں میں محبت اور تمام لوگوں کے لیے بھلائی کی دعوت دیتا ہے۔ وہ عقل و قول وعمل اور بدن کی طہارت وپاکیزگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ دنیا کے معروف ادیان میں وہ بلاشبہ سب سے سادہ اور بیک وقت جنس بشری کو اعلیٰ مراتب تک پہنچانے والا دین ہے۔ (ماہنامہ التوحید، قاہرہ، ۲۳/ شوال ۱۴۱۵ھ۔ صفحہ ۶۰ - ۶۱)

عبداللہ ارشبولڈ ہملٹن

سابق نام چارلز آڈوارڈ ارشبولڈ ہملٹن تھا۔ ۱۰/ دسمبر ۱۸۷۶ء کو ولادت ہوئی۔ برطانوی حکومت کے باعزت عہدے داروں میں سے تھے۔ دفاعی افواج میں لیفٹننٹ بھی رہے۔ سلزی میں کنزرویٹو سوسائٹی کے صدر تھے۔ خدمات کے صلہ میں حکومتِ برطانیہ نے آپ کو مختلف درجات کے BARON اعزازات سے نوازا۔ باقاعدہ اسلام ۲۰/ دسمبر ۱۹۲۳ء کو قبول کیا۔

ان کا کہنا ہے کہ سن شعور کو پہنچتے پہنچتے اسلام کے جمال ورونق اور سادگی وصفائی نے میرے دل کو لبھانا شروع کیا، باوجودیکہ میں عیسائی ماحول میں پیدا ہوا تھا اور اسی حیثیت سے پرورش پائی تھی لیکن میں کبھی گرجا کے مسلمہ عقائد پر ایمان نہ لاسکا۔ میں ہمیشہ اندھے ایمان پر عقل وشعور کو ترجیح دیتا تھا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ میں نے اپنے خالق کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا چاہی، لیکن میں نے محسوس کیا کہ رومن اور انگلینڈ دونوں گرجا میری تشفی کا سامان فراہم نہیں کرتے۔ چنانچہ اسلام پر اعتقاد میرے ضمیر کی آواز پر تھا، اسی لمحے سے میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ میں صحیح انسانی جذبے سے قریب ہونا شروع ہوگیا ہوں۔

ایسا کوئی دین نہیں ہے جس کو نادانوں کی دشمنی اور غرض مندوں کے حقد وحسد کا ایسا سامنا کرنا پڑا ہو جیسا کہ اسلام کو پیش آیا۔ کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ صرف یہی وہ دین ہے جس کے ماننے والوں میں بیشتر لوگ طاقتور کمزوروں کے ساتھ اور مالدار غریبوں کے ساتھ ایک دوسرے سے لطف ومحبت اور ہمدردی کا بڑا جذبہ رکھتے ہیں۔ ورنہ اس وقت دنیا کا یہ حال ہے کہ وہ تین گروہوں میں بٹی ہوئی ہے:

۱۔ مالدار جن کو اللہ نے اپنی مہربانی سے نوازا ہے اور ان کو مال ودولت اور جائدادیں عطا فرما رکھی ہیں۔
۲۔ محنت کش جو اپنی روزی کمانے کے لیے دن رات جدوجہد اور محنت مزدوری کرتے ہیں۔
۳۔ بے روزگار جن کی بڑی تعداد کو کام کے مواقع حاصل نہیں یا ان کو ان کی کسی غلطی و کوتاہی کے بغیر اُن کے معاشروں نے اپنے سے خارج گردان رکھا ہے۔

مگر اسلام انفرادی اور شخصی صلاحیتوں کا اعتبار کرتا ہے، اس لیے کہ وہ تعمیر کا نظام ہے، تخریب کا نہیں۔ اس لیے ایک مالدار مالک

روحانی تعلیمات کے مربوط و موزوں و مکمل مجموعہ کا گہرا نقش تھا جو زندگی کے عملی پروگرام کی تشکیل کرتا ہے۔ نہ پہلے میرے لیے اسلام کے کسی ایک پہلو کی تاثیر کو دوسرے کے مقابلے میں متعین کرنا ممکن تھا نہ اب ہے۔ اس لیے کہ اسلام تو مجھے ایک ایسی مضبوط و مستحکم عمارت کی طرح معلوم ہوتا ہے جس کی تشکیل و تعمیر کے تمام موزوں اجزا، ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، ان کو جکڑے ہوئے ہیں۔ اور ان میں کوئی کمی و زیادتی نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ مکمل توازن اور جامع و شامل استحکام کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔

ہوسکتا ہے کہ اسلامی نظریات و تعلیمات کے اس موزوں و محکم امتزاج کا ہی میرے دل پر سب سے زیادہ اثر ہوا ہو، یا دوسرے عوامل بھی ہوں جن کا اس وقت میں تجزیہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اس موضوع کا تعلق محبت سے ہے جو اس دین کے لیے میرے دل میں پروان چڑھی۔ سب جانتے ہیں کہ محبت میں ہماری خواہشات، تنہائی کے احساسات، بلند مقاصد، طاقت و کمزوری، عاجزی و بے بسی اور دیگر طرح طرح کے عوامل کا دخل ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے محسوس ہوئے بغیر اسلام میرے دل کی گہرائی میں ایسے داخل ہوا جیسے کہ ایک چور رات کی تاریکی میں گھر میں گھستا ہے، لیکن چور کی طرح باہر نکلنے کے لیے نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لیے میرے دل میں سما جانے کے لیے اور تب سے میں اپنی پوری کوشش کرتا ہوں کہ اسلام کے بارے میں جو کچھ جاننا ممکن ہے اس کی معرفت حاصل کروں، اسی لیے قرآن شریف پڑھا، حدیث نبوی کا مطالعہ کیا، اسلام کی زبان سیکھی اور اس کی تاریخ سے واقفیت حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ مزید توفیق دینے والا ہے۔ (ماہنامہ التوحید، قاہرہ، ۲۳/۶ جمادی الثانی ۱۴۱۵ھ، صفحہ ۵۱—۵۳)

محمد اسکندر راسیل ووب (۱۸۴۶—۱۹۱۶ء)

ہڈسن (کولمبیا، ولایات متحدہ امریکہ) میں پیدا ہوئے۔ ہڈسن نیویارک میں تعلیم پائی۔ افسانہ و مقالہ نویسی میں شہرت حاصل کی۔ صحافت میں نام کمایا۔ "سینٹ جوزیف گزٹ" اور "میسوری ریپبلکن" رسالوں کے مدیر اعلیٰ رہے۔ ۱۸۸۷ء میں منیلا (فلپین) میں امریکہ کے قونصل متعین ہوئے۔ اسی زمانے میں اسلام کا مطالعہ کیا اور ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے پھر عالم اسلامی کے سفر کیے اور باقی زندگی اس کی دعوت و تبلیغ میں گزاری۔ امریکہ میں جماعت دعوت اسلامی کے صدر رہے۔ یکم اکتوبر ۱۹۱۶ء کو وفات ہوئی۔

ان کا کہنا تھا کہ میں ایک عیسائی ملک میں پیدا ہوا، جہاں عیسائیت کا بول بالا تھا، بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہاں آرتھوڈکس عیسائیت کا وعظ و نصیحت کے منبروں سے بڑھ چڑھ کر زبانی چرچا ہوتا تھا، مگر میں نے طویل مطالعہ کے بعد اسلام کو اپنی زندگی کا راستہ چنا۔ اس لیے کہ میں نے اس کو تمام دینوں میں سب سے بہتر پایا، کیوں کہ یہی وہ تنہا دین ہے جو جنس بشری کی روحانی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے۔

بچپن میں میرے اندر قدرتی دینی جوش و سرگرمی کی کمی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب مجھ کو خود اعتمادی اور اپنی ذات پر اختیار کی آزادی کا شعور نصیب ہوا تو گرجا کے جمود و سرد مہری سے میرا دل بیزار ہوگیا، پھر میں نے اس کی طرف پلٹ کر رُخ نہ کیا۔ خوش قسمتی سے مجھ میں عقلی تجسس کی صلاحیت تھی، اس لیے میں ہر چیز کی علت اور اس کے سبب کی تلاش میں رہتا تھا، عقلی و منطقی وسائل سے دینی ولا دینی لوگ عیسائیت کے عقیدے کی حقیقت سے مجھ کو مطمئن نہ کرسکے۔ تنگ آکر وہ یہی کہتے کہ یہ غامض و مخفی مسائل ہیں جو میرے شعوری معیار سے بلند ہیں۔

مشرقی ادیان کے مطالعے کی طرف میری توجہ ہوئی تو میں نے مِل (Mill)، کانٹ (Kant)،

لوک (Locke)، ہیگل (Hegel) اور ہکسلے (Huxley) کی تحریریں پڑھیں، ایسے اہلِ قلم ومفکرین کے لیکچرس اور گفتگوئیں سنیں جو گویا بزعمِ خود ذرّہ (Atom) اور خلیہ (cell) کے دانائے رموز تھے مگر ان میں سے کوئی بھی مجھ کو روح کی حقیقت، اس کا ماضی وحال اور موت کے بعد اس کا حشر نہ بتا سکا۔

اس تفصیل سے خودستائی مقصود نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ اِسلام پر اعتقاد کسی گمراہی، غلطی، اندھے ایمان یا جذباتی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ یہ ایمان، ایمان دارانہ، متجسسانہ، دقیقہ رس مطالعۂ دین اور حقیقت جاننے کی خواہش وعزم کا نتیجہ تھا جو کسی سابق رائے یا رجحان سے متاثر نہ ہوا۔

اِسلامی عقیدہ کی حقیقی روح اللہ تعالیٰ کے ارادے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں ہے اور اس کا رکنِ رکین نماز ہے۔ اِسلام عالمی بھائی چارگی، سارے جہانوں میں محبت اور تمام لوگوں کے لیے بھلائی کی دعوت دیتا ہے۔ وہ عقل و قول وعمل اور بدن کی طہارت وپاکیزگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ دنیا کے معروف ادیان میں وہ بلاشبہ سب سے سادہ اور بیک وقت جنس بشری کو اعلیٰ مراتب تک پہنچانے والا دین ہے۔ (ماہنامہ التوحید، قاہرہ، ۲۳/۱۰ شوال ۱۴۱۵ھ - صفحہ ۶۰ - ۶۱)

عبداللہ آرشیبولڈ ہملٹن

سابق نام چارلز اڈوارڈ آرشیبولڈ ہملٹن تھا۔ ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو ولادت ہوئی۔ برطانوی حکومت کے باعزت عہدے داروں میں تھے۔ دفاعی افواج میں لیفٹننٹ بھی رہے۔ سلزی میں کنزرویٹو سوسائٹی کے صدر تھے۔ خدمات کے صلہ میں حکومتِ برطانیہ نے آپ کو مختلف درجات کے BARON اعزازات سے نوازا۔ باقاعدہ اِسلام ۲۰ر دسمبر ۱۹۲۳ء کو قبول کیا۔

ان کا کہنا ہے کہ سن شعور کو پہنچتے پہنچتے اسلام کے جمال ورونق اور سادگی وصفائی نے میرے دل کو لبھانا شروع کیا، باوجودیکہ میں عیسائی ماحول میں پیدا ہوا تھا اور اسی حیثیت سے پرورش پائی تھی لیکن میں کبھی گرجا کے مسلمہ عقائد پر ایمان نہ لا سکا۔ میں ہمیشہ اندھے ایمان پر عقل وشعور کو ترجیح دیتا تھا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ میں نے اپنے خالق کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا چاہی، لیکن میں نے محسوس کیا کہ رومن اور انگلیکنڈ دونوں گرجا میری تشنگی کا سامان فراہم نہیں کرتے۔ چنانچہ اسلام پر اعتقاد میرے ضمیر کی آواز پر تھا، اسی لمحے سے میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ میں کچھ انسانی جذبے سے قریب ہونا شروع ہو گیا ہوں۔

ایسا کوئی دین نہیں ہے جس کو نادانوں کی دشمنی اور غرض مندوں کے حقد وحسد کا ایسا سامنا کرنا پڑا ہو جیسا کہ اِسلام کو پیش آیا۔ کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ صرف یہی وہ دین ہے جس کے ماننے والوں میں بیشتر لوگ طاقتور کمزوروں کے ساتھ اور مالدار غریبوں کے ساتھ ایک دوسرے سے لطف ومحبت اور ہمدردی کا بڑا جذبہ رکھتے ہیں۔ ورنہ اس وقت دنیا کا یہ حال ہے کہ وہ تین گروہوں میں بٹی ہوئی ہے:

۱۔ مالدار جن کو اللہ نے اپنی مہربانی سے نوازا ہے اور ان کو مال ودولت اور جائدادیں عطا فرما رکھی ہیں۔
۲ محنت کش جو اپنی روزی کمانے کے لیے دن رات جدوجہد اور محنت مزدوری کرتے ہیں۔
۳ بے روزگار جن کی بڑی تعداد کو کام کے مواقع حاصل نہیں یا ان کو ان کی کسی غلطی وکوتاہی کے بغیر اُن کے معاشروں نے اپنے سے خارج گردان رکھا ہے۔

مگر اِسلام انفرادی اور شخصی صلاحیتوں کا اعتبار کرتا ہے، اس لیے کہ وہ تعمیر کا نظام ہے، تخریب کا نہیں۔ اس لیے ایک مالدار مالک

زمین کو دیکھیے کہ جس کو اپنی زمین میں کھیتی کی ضرورت نہیں، اس لیے وہ ایک مقررہ مدت تک اس میں زراعت نہیں کرتا اور ذاتی ملکیت خود بخود عام ملکیت (پبلک انٹریسٹ) میں بدل جاتی ہے۔ اب اسلامی تعلیمات کے مطابق اس کی ملکیت اس میں پہلے کھیتی کرنے والے کو منتقل ہو جائے گی۔

اِس کے علاوہ اسلام نے مسلمانوں پر جُوا یا اس سے مشابہ دوسرے کام جن میں قسمت کو دخل ہو اور سود و شراب وغیرہ کو حرام کیا ہے جو جنسِ بشری کے لیے ہمیشہ بڑے المیوں کا سبب بنتے رہے ہیں۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے سائے میں کسی فرد کو اس سے کم قسمت والے شخص کے استحصال کی آزادی نہیں ہے۔ ہم مسلمان (بے عملی کی حد تک) جبر و قدر کے بھی قائل نہیں ہیں بلکہ اعمال کے ان معیاروں پر یقین رکھتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے مقرر فرما دیا ہے اور ہم کو ان کے لحاظ کا شعور عطا فرمایا ہے، اسی لیے عمل کے بغیر ایمان کی ہماری نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے۔ کیوں کہ ایمان سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں ہوتا جب تک کہ ہماری زندگی ایمان کی حقیقت کی عملی تطبیق میں نہ بدل جائے۔ ہم کو اس دنیا میں ہمارے تمام اعمال کی شخصی ذمہ داری اور آخرت میں ان کی جواب دہی کا یقین ہے، جب کہ ہم میں سے ہر فرد کو اس کا نامۂ اعمال دیا جائے گا اور جس دن کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

اِسلام انسان کی فطرتِ سلیمہ پر تخلیق کے اصول کو مانتا ہے جس میں کسی پیدائشی احساسِ گناہ کا کوئی دخل نہیں ہے اور مرد و عورت پر مشتمل جنس بشری کی ایک نفس سے تخلیق پر زور دیتا ہے، جن کی روح میں ایک دوسرے کے ہمسر ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو برابر کی صلاحیتیں بخشی ہیں تاکہ ہر فرد (اپنی ذمّہ داری پر) عقلی و روحانی و اخلاقی راستہ اپنی مرضی سے اختیار کرے۔

نوعِ بشری میں اسلام کی مقرر کردہ عالمی جامع و شامل اخوت پر طویل بحث کی ہیں اس لیے ضروری محسوس نہیں کرتا کہ یہ تو اسلام کی ایک مسلمہ امتیازی صفت ہے۔ اس میں حاکم و محکوم، مالک و مزدور یا مالدار و غریب کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ اس کے نزدیک سب کے سب ایک دوسرے کے برابر ہیں۔

(ماہنامہ التوحید، قاہرہ، مصر، ج ۲۳، شمارہ ۷، رجب ۱۴۱۵ھ، ص ۶۱-۶۲)

ڈاکٹر نثار احمد*

ترقی کی رفتار

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حقیقی جمہوریت کا قیام سماجی انصاف اور مساوات کے وسیلے ہی سے ممکن ہے۔ اس شعور کو کرنے اور عام کرنے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت نے اپنے قومی ترقیاتی پروگرام میں تعلیم کو مرکزی حیثیت دی ہے اور اس صدی کے اختتام تک "سب کے لیے تعلیم" کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ازسرِنو کوششیں تیز تر کردی ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مالی وسائل میں اضافہ کیا گیا ہے۔ غریبوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے تعلیم بالغان اور ابتدائی تعلیم اخراجات میں اضافہ کیا گیا ہے۔ تعلیم کی نظر ثانی شدہ پالیسی کے مطابق تعلیمی نظام کے استحکام کے لیے پیشہ ورانہ تعلیمی نظام اور تکنیکی کی فراہمی پر خصوصی زور ہے۔ اس اعتبار سے ضلع اور بلاک کی سطح پر پیشہ ور اداروں اور تکنیکی عملے کی فراہمی اور ادارہ جاتی صلاحیت پہنچانے پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ مکمل خواندگی کی تحریک کے تحت ۱۴ ریاستوں کے ۳۱۲ اضلاع میں مختلف تعلیمی پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ڈھائی کروڑ افراد گنتی اور خواندگی کا مرحلہ طے کر چکے ہیں۔ ان نوخواندہ افراد کی تعلیم میں دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے مختلف پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔ خواندگی کی اس تحریک کا زیادہ زور ہندی بولی جانے والی ریاستوں میں ہے۔ ۱۹۸۶ء کی تعلیم کی نئی قومی پالیسی کے تحت پرائمری تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ آپریشن بلیک بورڈ کے نام سے ایک اسکیم مرتب کی گئی جس کے تحت ہر پرائمری اسکول کے لیے کم سے کم بنیادی ضرورتوں کا تعین کیا گیا ہے۔ تعلیم و تربیت کے ضلعی ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ اسی کے ساتھ اسکول میں داخل ہونے سے بچے رہنے والے بچوں کے لیے غیر رسمی تعلیمی پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ قومی سطح پر ایک نصابی ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے۔ اس نئے تعلیمی پروگرام کے تحت ضلع کی سطح پر جو پرائمری تعلیم کا پروگرام شروع کیا گیا ہے وہ صرف اُن اضلاع تک محدود نہیں جو پسماندہ ہیں بلکہ اس کے علاوہ ایسے اضلاع میں بھی شروع کیا گیا ہے جن میں مکمل خواندگی کی تحریک کامیاب ہونے کی وجہ سے پرائمری تعلیم کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ نیشنل اوپن اسکول کے ایک پراجیکٹ کے تحت D Education tant ... کا پروگرام شروع کیا گیا ہے جس سے نوخواندہ افراد اور وہ طلبہ جو درمیان میں تعلیم ترک کر دیتے ہیں اور وہ لڑکے جو لکھنے پڑھنے کی ابتدائی صلاحیت رکھتے ہیں مستفید ہوتے ہیں۔ بہرکیف اُن پیش قدمیوں اور ان اسکیموں کے نفاذ سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ آئندہ پانچ سالوں میں سب کے لیے تعلیم کا نشانہ حاصل کر لیا جائے گا۔

انسدادِ آلودگی کی حکمتِ عملی۔

صنعتی انقلاب اور جدید ٹکنالوجی کا ایک انتہائی خطرناک پہلو اس سے پیدا شدہ ماحولیاتی آلودگی ہے اور یہ ماحولیاتی آلودگی

* سر ضیاء الدین ہال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نوعِ انسانی کے لیے خطرناک حد تک مضرت رساں ہے۔ اس لیے آلودگی کے انسداد کے لیے عالمی پیمانے پر کوششیں کی جارہی ہیں۔ یوں تو مختلف مادّوں کے ذریعے ماحول آلودہ رہتا ہے لیکن ہوا اور پانی دو ایسے وسائل ہیں جو بڑے پیمانے پر ماحولیاتی آلودگی کا باعث بنتے ہیں۔ فضائی آلودگی پیدا کرنے میں گاڑیوں سے نکلنے والے دھوئیں کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ بڑے شہر خصوصاً دہلی، بمبئی، بنگلور، کلکتہ اور احمد آباد بالترتیب فضائی آلودگی کے سب سے زیادہ شکار ہیں۔ لہٰذا انسدادِ آلودگی کے مرکزی بورڈ نے ایک ایسے عملی منصوبے کی سفارش کی ہے جس سے گاڑیوں کے دھوئیں کے ذریعے پھیلنے والی آلودگی کو کم کیا جاسکے اور اس آلودگی پر قابو پایا جاسکے۔ چنانچہ گاڑیوں کی تیاریوں کے اسٹیشن پر ایک ایسی تکنیک سے کام لیا جاتا ہے جس سے دھوئیں کا اخراج کم سے کم ہو۔ اس کے علاوہ پٹرول کو کیمیائی طریقے سے اس طرح بنا دیا جاتا ہے کہ وہ کم آلودگی کا باعث بنے۔ بائی پاس اور فلائی اوور زیادہ سے زیادہ بنانے کی بھی سفارش کی گئی ہے۔ فضائی آلودگی دمہ کے مرض کا بھی باعث بن رہی ہے۔ صنعتوں سے بھی بڑے پیمانے پر فضائی آلودگی اور آبی آلودگی پیدا ہورہی ہے۔ لہٰذا صنعتوں سے نکلنے والے فضلات کو کیمیاوی عمل کے ذریعے کار آمد بنانے کی بھی سفارش کی گئی ہے۔ آلودگی پھیلانے والی صنعتوں کو بھیڑ بھاڑ والے علاقوں سے دوسرے جانے کے لیے مالی امداد کی بھی سفارش کی گئی ہے۔ گھریلو استعمال شدہ پانی اور صنعتوں کا استعمال شدہ پانی سے بھی بڑے پیمانے پر آبی آلودگی پیدا ہورہی ہے۔ لہٰذا اس کے انسداد کے لیے بھی بڑے پیمانے پر کوششیں کی جارہی ہیں۔ چنانچہ ۹۵-۱۹۹۴ء میں دریائی پانی کے تحفظ کے لیے ایک قومی منصوبہ شروع کیا گیا ہے جس کے تحت مختلف دریاؤں بشمول جمنا اور گومتی کے پانی کو صاف کرنے کا عملی منصوبہ تیار کیا گیا ہے اس کے علاوہ بڑے پیمانے پر شجرکاری کی بھی تحریک شروع کی گئی ہے جس سے شور کی آلودگی اور فضائی آلودگی کو کم کرنے میں کافی حد تک مدد ملے گی۔

معذور افراد کے لیے یکساں مواقع

اعداد وشمار کے تجزیئے کے بعد یونیسیف نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دس بچوں میں سے ایک بچہ معذور پیدا ہوتا ہے یا ابتدائی عمر میں معذور ہو جاتا ہے۔ ماہرین کی ایک رائے کے مطابق ہندوستان میں معذور بچوں کی تعداد ساڑھے سات کروڑ ہے۔ حکومتِ ہند نے آئینی اور سماجی ذمّہ داری کو محسوس کرتے ہوئے معذور افراد کی بہبود کے لیے بہت سے پروگرام شروع کیے ہیں۔ وزارت بہبود نے قومی سطح پر کئی ادارے قایم کیے ہیں۔ بصارت سے محروم افراد کا ایک ادارہ دہرہ دون میں ہے جسمانی طور سے معذور افراد کے لیے کلکتہ اور نئی دہلی میں ایک ایک ادارے موجود ہیں۔ ذہنی طور سے معذور افراد کے لیے سکندر آباد میں ایک ادارہ ہے۔ سماعت اور گویائی سے محروم افراد کے لیے بمبئی میں ایک ادارہ ہے۔ معذور افراد کی باز آباد کاری کے سلسلے میں تربیت و تحقیق کے لیے کٹک میں ایک ادارہ ہے۔ ان مراکز میں معذور افراد کی باز آباد کاری کے انتظام کے مختلف شعبوں میں پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ معذور افراد کی باز آباد کاری کے ضلعی مراکز کی اسکیم شروع کی گئی ہے جن میں معذوری کے انسداد اور احتیاطی تدابیر پر زور ہے۔ اس سلسلے کے ایک اہم پروگرام کا نام "امدادی سامان اور آلات کی اسکیم" ہے۔ اس اسکیم کے تحت معذور افراد کو سماعت کے لیے امدادی سامان، پہیوں والی کرسیاں، بیساکھیاں، بریل کی سلیٹوں جیسا تعلیمی امدادی ساز وسامان فراہم کیا جاتا ہے۔ معذور افراد کی ایک اہم ضرورت تعلیم ہے۔ لہٰذا پرائمری اسکول سے یونیورسٹی کی سطح تک حکومت انھیں وظیفے اور امداد دیتی ہے۔ کچھ یونیورسٹیاں معذور افراد کی موثر تعلیم کے لیے اساتذہ کو مخصوص تربیت دیتی ہیں۔ حکومت نے معذور افراد کے لیے کلاس "سی" اور "ڈی" کی ملازمتوں میں تین فی صد کوٹا مقرر کیا ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں معذور افراد کے لیے یکساں مواقع کی فراہمی ان کے مفادات کے تحفظ اور سماجی کاموں میں

ان کی بھرپور شرکت کے لیے قانون کا مسودہ تیار کیا گیا ہے جس کو پارلیمنٹ میں پیش ہونا ہے۔ اس سے معذور افراد کے معیار زندگی کو بہتر بنایا جاسکے گا اور ان کی ترقی ہوسکے گی۔

غریبی کا خاتمہ

۹۶ - ۱۹۹۵ء کے مرکزی بجٹ میں ایک جامع انداز میں غریبی دور کرنے اور اس پر قابو پانے کی حکمتِ عملی اپنائی گئی ہے لہٰذا مندرجہ ذیل نکات پر زور دیا گیا ہے ؛

۱۔ دیہی اور زرعی بنیادی ڈھانچے کے لیے رقم کی فراہمی۔
۲۔ ہتھ کرگھا نیز کھادی اور دیہی صنعتوں کی ترقی و فروغ۔
۳۔ دیہات میں تعمیراتِ مکانات پر زور۔
۴۔ سماجی بیمہ کی اسکیموں کی شروعات۔

بجٹ میں دیہی ترقی کے اخراجات میں اضافہ کیا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ متعلقہ اسکیموں کا فائدہ مستحق لوگوں تک پہنچ سکے۔ گاؤں میں روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے پروگرام یعنی جواہر روزگار یوجنا اور یقینی روزگار یوجنا کی اسکیم کے اخراجات میں اضافہ کیا گیا ہے۔ درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لیے رعایتی نرخ پر دس لاکھ مکانات بنائے جانے کی اسکیم بھی ہے۔ اس کے علاوہ سماجی امداد کی اسکیم کے تحت غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے بوڑھوں، عورتوں اور بیواؤں کو پنشن اور امداد دینے کی بھی اسکیم ہے۔

تہذیب الاخلاق

شرح اشتہارات

۱۔	بیک ٹائیٹل پیج	(پورا صفحہ)	۱۲۰۰	روپے
	بیک ٹائیٹل پیج	(آدھا صفحہ)	۶۰۰	روپے
	بیک ٹائیٹل پیج	(چوتھائی صفحہ)	۳۰۰	روپے
۲۔	بیک انر ٹائیٹل پیج	(پورا صفحہ)	۱۰۰۰	روپے
	بیک انر ٹائیٹل پیج	(آدھا صفحہ)	۵۰۰	روپے
	بیک انر ٹائیٹل پیج	(چوتھائی صفحہ)	۲۵۰	روپے
۳۔	انر سائڈ پیج	(پورا صفحہ)	۷۵۰	روپے
	انر سائڈ پیج	(آدھا صفحہ)	۴۰۰	روپے
	انر سائڈ پیج	(چوتھائی صفحہ)	۲۰۰	روپے

نوٹ: مشتہرین کو ۳۳ فی صد کی رعایت دی جائے گی۔

سرکولیشن انچارج

ڈاکٹر اقبال احمد قاسمی ٭

طائفہ و طوائف

شعر و نغمہ اظہار جذبات اور ترجمانی ، خیالات کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے قوموں کی ثقافت نے دنیا کو جہاں بہت کچھ بطور وراثت کے دیا فن موسیقی و کمال شعر گوئی کو اس سے علاحدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اس میدان میں عربوں اور ایرانیوں نے بطور خاص اپنے اثرات چھوڑے ، صحرائے عرب میں اونٹوں کی رفتار کو بڑھانے کے لیے "حُدی خوانی" اور مغل دورِ سلطنت میں "شکار قمری" کے ذریعہ جانوروں کو رام کر لینے کا فن اپنے کمال کی شہادت بذاتِ خود ہے ، خلیفہ ہارون رشید کے شبستان طرب میں ایک طرف اسحاق موصلی اور ابراہیم مہدی کی لَے گونجتی ہوئی سُنائی دیتی ہے تو دوسری طرف مصر کے اوپیرا ہاؤس Opera House میں شیخ احمد سلامہ کا جوق اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتا نظر آتا ہے۔ زندگی کی کروٹوں کے بہت سے رنگ ہیں ، کہیں شعر ، کہیں نغمہ کبھی آنسو تو کبھی مسکراہٹ اور انہی کروٹوں اور متاع زیست کو لٹانے جو ٹولیاں چار دانگ عالم میں بکھرا کرتی تھیں انکو طائفہ/طوائف (منڈلی) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ احمد سلامہ کا جوق مصر میں بہت مشہور اور نامور تھا، "جوق" وہاں منڈلی کے معنی میں بولا جاتا ہے ، ہم نے یہاں طائفہ کا لفظ اختیار کیا ہے ، پھر اس کی جمع طوائف ہوئی اور رفتہ رفتہ طوائف کے لفظ سے مفرد معنیٰ پیدا کر لئے یعنی زن رقّاصہ و مغنیہ کے معنیٰ میں بولا جانے لگا۔ [1] طائفہ یا منڈلی میں زن و مرد سبھی شامل ہوتے تھے بعد میں یہ لفظ عورتوں کے ایک مخصوص طبقہ کے لئے مختص ہوگیا۔

انسانی تہذیب نے بہت سی انگڑائیاں لیں، آدمی غاروں کے اندھیرے سے نکل کر دنیائے رنگ و بو میں آیا تو اسے نت نئے مسائل سے دو چار ہونا پڑا ، انسان کی روزمرہ کی مصروفیات جو بھی رہی ہوں اور اس کی پیشہ ورانہ مشغولیات کی نوعیت جیسی بھی ہو لیکن اس کے سامنے اپنے بچوں کی نشو و پرداخت اور ان کی پرورش کے لئے وقت نکالنا مشکل نظر آنے لگا۔ جس کے نتیجہ میں اسے اپنی اولاد کی تربیت کا غم کھانے لگا کہ ایک اچھے معاشرہ کی تشکیل کیونکر ممکن ہے؟ اور بچوں کو تربیت دینے کے لیے ان کو تہذیب و ثقافت کی لوری کون سُنائے ؟؟ اس کام کا بیڑا سب سے پہلے عرب کے بادیہ نشینوں نے اٹھایا ، وہ دیہات سے قصبوں اور شہروں میں آکر تہذیب و ثقافت کی تعلیم دینے کے لئے انہوں نے چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ لیجانا شروع کیا چونکہ یہ لوگ گھومتے پھرتے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے آتے رہتے تھے اس لئے ان کو "طائفہ" کا نام دیا گیا۔ یہ طائفہ بڑے زیرک سوجھ بوجھ کے مالک اور مہذب و شائستہ ہوتے تھے ، ان کی اپنی ذاتی زندگیوں میں دلچسپی کا یہی ایک

٭ سابق پرنسپل جامعہ طبیہ دیوبند (الالف ممبر تہذیب الاخلاق)

تہذیب الاخلاق۔ اپریل ۱۹۹۵ء

سامان تھا کہ دن بھر کا تھکا ہوا سورج جب شام کو آگ کے دریا میں ڈوبنے لگتا، اور رات جب اپنی سیاہ چادر تان دیتی تو یہ طائفے بربط و مضراب کے تاروں سے نالہ ہائے دِل نکال کر اپنی اور اپنے ہمسایوں کی تفریح طبع کا سامان کرتے تھے۔ ریگستانوں کی جھلسا دینے والی گرمی، صحراؤں کی تیز دھوپ اور نخلستانوں کے تشنہ سائے ان کو سکون دینے سے قاصر نظر آتے تھے، ان حالات سے دو چار رہتے رہتے جب سماجی ترقی کا پرند کچھ اور اوپر اٹھا تو، بجائے اس کے کہ بدوی لوگ گاؤں سے شہر آتے انہوں نے شہروں کو ہی اپنا مسکن بنا لیا اور روساء و امراء کے بچّوں کو تربیت دیکر اپنا معاش چلانے لگے اس سے شہری والدین کو بھی سہولت ہوئی اور اس کے بجائے کہ وہ اپنے جگر گوشوں کو اپنے سے علاحدہ کرتے انہوں نے اپنی نظروں کے سامنے رکھتے ہوئے اپنے بچوں کو تربیت کے لئے ان طائفوں کے حوالے کیا۔

یہ بات بالعموم معلوم ہے کہ ہندوستان میں نوابین و امراء اپنی اولاد کی تربیت اور ان میں تہذیب و شائستگی کے عناصر کی تربیت کے لئے طوائفوں کے پاس بھیجا کرتے تھے جس سے وہ آداب معاشرت و تمدّن سیکھتے تھے، ریاست اودھ و دکن وغیرہ کی تہذیب اس کی گواہ ہے کہ نوابین و امراء میں نسلاً بعد نسل یہ روایت قائم رہی اور پھر وہ زمانہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ شرفاء کی اولاد کی تربیت کے لئے ان کے درباروں میں موسیقی دانوں اور ماہرین فنون لطیفہ کی آمد کا اہتمام کیا جانے لگا، بقول مولانا آزاد مرحوم:

"امراء و شرفاء کی اولاد کی تعلیم و تربیت کیلئے جس طرح تمام فنون مدارس کی تحصیل کا اہتمام کیا جاتا تھا اسی طرح موسیقی کی تحصیل کا بھی اہتمام کیا جاتا، ملک کے ہر حصّے سے باکمالان فن کی مانگ آتی دہلی، آگرہ، لاہور، احمد آباد کے گوّیے بڑی بڑی تنخواہوں پر امراء و شرفاء کے گھروں میں ملازم رکھے جاتے تھے، جو نوجوان تکمیل علم کے لئے بڑے بڑے شہروں میں آتے وہ وہاں کے عالموں اور مدرسوں کے ساتھ وہاں کے باکمالان موسیقی کو بھی ڈھونڈتے اور پھر ان کے حلقۂ تعلیم میں زانوکے تحصیل تہہ کرتے۔" [۲]

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی مرحوم کے نام اپنے مکتوب میں مولانا آزاد نے لکھا ہے:

"شیخ سلیم چشتی کا پوتا اسلام خاں جب جہانگیر کے عہد میں بنگال کا صوبیدار ہوا تو اس کی سرکار میں اسّی ہزار روپیہ ماہوار راگ و رقص کے طائفوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔" [۳]

"سرس بائی جو شہزادہ مراد بخش کی محبوبہ تھی "خیال" گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ مگر خود شہزادے کی فن دانی کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ وہ اس کی شاگردی پر ناز کرتی، اورنگ زیب نے جب مراد کو قید کیا تو سرس بائی بھی تیار ہوگئی کہ اسکے ساتھ قید و بند کی سختیاں گوارہ کرے۔ چنانچہ شہزادہ مراد کے ساتھ قلعہ گوالیار میں عرصہ تک محبوس رہی۔" [۴]

"شہزادہ خرّم (شاہجہاں) کی ماں متی جو راجہ اودے سنگھ کی بیٹی تھی جب جہانگیر کے محل میں آئی تو اس کے گانے کا محل میں شہرہ ہوا جہانگیر چونکہ خود ماہر فن تھا اس لئے اس نے امتحان لیا اور دیکھا کہ امتحان میں پوری اتری تو بہت خوش ہوا اور خوش آواز خواصوں کا ایک حلقہ اس کے سپرد کر دیا کہ اپنی تعلیم و تربیت سے انہیں تیار کرے۔"

الٰہ آباد کی مشہور زمانہ طوائف گوہر بائی کا نام کسے نہیں معلوم، یہ اکبر الٰہ آبادی کے معتقدین میں سے تھی، ایک روز گوہر بائی نے موصوف سے فرمائش کی کہ حضرت میری شان میں کوئی ایسا قصیدہ لکھیں جو میرے لئے ایک لازوالی سوغات ثابت ہو، اکبر نے جو چند اشعار اس کی شان میں کہے اس میں ایک شعر یہ بھی تھا:

؎ خوش نصیب ایسا بھلا کون ہے گوہر کے سوا ٭ سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

اودھی تہذیب کی ترجمانی، شہیر وقت طوائف امراؤ جان ادا کی داستان زندگی ہر کسی کی زبان زد ہے اور عرصہ تک کج کلاہان

لکھنؤ وفیض آباد کے دلوں پر اس کی حکمرانی رہی ہے، جس کی زندگی کی مفصّل تصویرکشی مرزا ہادی رسوا نے کی ہے۔ ایک زمانہ میں مصری مغنیّہ طاہرہ طنطاوی کا بڑا شہرہ تھا، شیخ احمد سلامہ بھی طاہرہ طنطاوی کی فن دانی کا اعتراف کرتا تھا، بقول مولانا آزاد وہ خود بھی بلائے جان تھی اور اس کی آواز اس سے زیادہ آفت ہوش وایمان تھی۔ ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں:

" جس زمانہ کے یہ واقعات لکھ رہا ہوں اس سے کئی سال بعد مصر میں امّ کلثوم کی شہرت ہوئی اور اب تک قائم ہے، میں نے اس کے بے شمار ریکارڈ سنے ہیں اور قاہرہ، انقرہ، طرابلس الغرب فلسطین اور سنگاپور کے ریڈیو اسٹیشن آج بھی اس کی نواؤں سے گونجتے ہیں۔" [۱]

بعد کے دنوں میں ام کلثوم کو "کوکب الشرق" کا لقب ملا جس کی سحر انگیز آواز عربوں کے دلوں کی دھڑکن بنی رہی اور جس کے پروگراموں کو سننے کے لئے لوگ سرِشام ہی جلسگاہ جاتے اور ختم سحر پر واپس ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ام کلثوم میں یہ خوبی تھی کہ جیسے جیسے رات کا جادو چڑھتا جاتا اس کی آواز کی سحر انگیزی اور شادابی بڑھتی جاتی تھی چند سال پیشتر ام کلثوم کی بعض کیسٹیں راقم کے ایک دوست نے صنعاء سے بھیجی تھیں جن میں "موسم الربیع" "الحب کلہ" اور "اغدا القاک" وغیرہ شامل تھیں۔

مرورِ ایام اور گردشِ شب و روز نے اس لفظ، اس فن اور اس ذوقِ لطیف کے ساتھ کچھ نئی چالیں چلیں اور جو لوگ شائستگی کا سبق سیکھنے کے لئے ان طائفوں کی چوکھٹوں تک جاتے تھے وہ ان سے اپنی ہوس کی آگ بجھانے لگے، اور اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کرنے لگے۔ دوسری طرف اس مخصوص طبقہ کی عورتوں نے اپنے اس نفیس پیشہ کو ناپسندیدہ طریقہ سے کسب معاش کا ذریعہ بنالیا اور شائستگی کے اس طویل سفر میں تہذیب کا پرند چلتے چلتے تھک گیا اور حالاتِ حاضرہ نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔

طوائف کے نام سے کسی بھی سنجیدہ و شائستہ آدمی کو اب بھلے ہی گھن آتا ہو مگر ماضی کے تہذیب یافتہ سماج میں اس کا ایک مقام تھا، اس کی ایک حیثیت اور تاریخ تھی، اچھی چیزوں کے غلط استعمال اور غلط چیزوں کے بہتر استعمال سے اس شئی کی قدریں بدل جاتی ہیں۔ وَضَعُ الشئیِ فِی غَیرِ مَحَلِہٖ یعنی جس چیز کا جو مقام ہے اگر اس کو وہ مقام حاصل نہ ہو تو اس کو ظلم کہتے ہیں، اس فن، پیشہ اور اس ذوقِ لطیف کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ اس کی خوبیوں پر برائیوں کی چادر اتنی دبیز ہوتی چلی گئی کہ اس کو وضع الشئی فِی غَیرِ مَحَلِہٖ سے دوچار ہونا پڑا ورنہ مولانا آزاد یہ نہ لکھتے کہ:

" قوموں کے عروج و ترقی کے زمانہ بھی جو اشتغال تحسین فکر اور تہذیب طبع کا باعث ہوتا ہے وہی دورِ تنزل میں فکر کیلئے آفت اور طبیعت کے لئے تہلکہ بن جاتا ہے ایک ہی چیز حسن استعمال اور اعتدالِ عمل سے فضل و کمال کا زیور ہوتی ہے اور سوءِ استعمال اور افراط و تفریطِ عمل سے بداخلاقی اور صد عیبی کا دھبا بن جاتی ہے۔ موسیقی کا ایک شوق تو اکبر کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے بعد جب کمر کھولتا تو مجلس سماع و نشاط سے ان کی تھکن مٹاتا اور پھر ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا کہ جب تک محل کی عورتیں اسے دھکیل دھکیل کر پردے سے باہر نہ کر دیتیں دیوان خانے میں قدم نہیں رکھتا تھا۔ صفدر جنگ جب دیوان کی مہمات سے تھک جاتا تو موسیقی کے باکمالوں کو باریاب کرتا، اسی کی نسل میں واجد علی شاہ کا یہ حال تھا کہ جب طبلہ بجاتے بجاتے تھک جاتا تو تازہ دم ہونے کے لئے اپنے وزیر علی نقی کو باریابی کا موقع دیتا۔ دونوں کی حالتوں میں جو فرق تھا وہ محتاجِ بیان نہیں۔" [۲]

حواشی: [۱] غبارِ خاطر۔ مولانا آزاد۔ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] ایضاً [۶] ایضاً [۷] ایضاً [۸] ایضاً۔

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی*

ابطال غلامی ـــــ ایک مختصر تعارف

سر سید کے سامنے اہم مسئلہ یہ تھا کہ اسلام پر عاید کردہ الزامات کے علمی و تحقیقی جواب دیے جائیں۔ اس موضوع پر انھوں نے کئی تصانیف تحریر کیں۔ انہی میں سے ایک "ابطال غلامی" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے مستشرقین کے اس الزام کو بے بنیاد ثابت کیا کہ اسلام غلامی کا علمبردار ہے۔ اسلام وہ تنہا مذہب ہے جس نے غلامی کے خلاف آواز بلند کی اور غلاموں کو اپنی آغوش میں پناہ دی۔ سر سید نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ غلامی فطرت انسانی کے خلاف ہے، فطرت انسانی آزادی اور خود مختاری سے مربوط ہے، لیکن افسوس کہ اس دور میں بھی غلامی کی ریت برقرار رہی۔ حضرت عیسیٰؑ نے غلامی کے خلاف ایک لفظ تک ادا نہیں کیا۔ ارسطو نے انسان کی تقسیم آزادی اور غلام کے اعتبار سے برقرار رکھی۔ افلاطون نے یہ اعلان کیا کہ صرف یونانیوں کو غلام نہیں ہونا چاہیے۔ تمام مشرقی اقوام میں غلامی کا رواج پایا جاتا تھا۔ یہودیوں اور ایرانیوں کے یہاں یہ غلامی قانوناً جائز تھی۔ یونانیوں اور رومیوں کے یہاں بھی یہ لعنت موجود تھی اور ہندوؤں میں دھرم شاستر کے بموجب غلامی جائز تھی۔ امریکہ کی جب دریافت ہوئی تو وہاں بھی غلاموں کی تجارت عروج پر تھی۔ اس تجارت کا آغاز ۱۵۶۲ء میں ایک انگریز سر جان ہاکس نے کیا اس کے بعد میں ۱۷۸۸ء میں ڈبلیو ڈلون، طامس کلرکسن اور گرینول شارپ کی کوششوں سے اس تجارت کا خاتمہ ہوا۔ ۱۸۱۲ء میں غلامی کی تجارت کرنے والوں کو دوام مع جلا وطنی کی سزا سنائی گئی۔ سر سید کہتے ہیں کہ غلامی کے خاتمہ کے متعلق انگریزوں کی خدمات لایق تعریف ہیں۔ لیکن مسلم سلاطین کے یہاں غلامی کا بد ترین فعل اب بھی پوری شد و مد سے جاری ہے۔ اسی لیے دشمنان اسلام نے اس سے نتیجہ نکالا کہ مذہب اسلام میں غلامی جائز ہے۔ چنانچہ مسٹر رسل نے اپنی کتاب میں غلامی کے خاتمہ کے سلسلے میں مصر کے خدیو اسماعیل کی مساعی کی تعریف کرتے ہوئے یہ اظہار خیال کیا کہ اس نے اپنے مذہب و ایمان کے برخلاف کارنمایاں انجام دیا۔ اسی کے پیش نظر سر سید نے غلامی کے متعلق اسلامی موقف کو پیش کیا۔

کتاب کے دیباچہ میں غلامی کے نقصانات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسلام میں غلامی کو ایک فعل شنیع قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ "کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ اور کیا نہیں بتا دیئے ہم نے اس کو دو گھاٹیوں کے راستے پھر وہ کیوں نہیں پھلانگ جاتا گھاٹی کو، تو جانتا ہے کہ وہ کیا گھاٹی ہے، وہ غلام کا آزاد کرنا ہے" غلامی کی رد میں آپ نے فرمایا کہ "اللہ نے زمین کے پردے پر کوئی چیز غلام آزاد کرنے سے زیادہ پیاری پیدا نہیں کی"۔ قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں آیا ہے کہ "لڑائی کے بعد نہیں بھلائی کے پیش نظر یا فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے"

کتاب کے پہلے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ بعثت رسول سے قبل عرب کے اندر غلامی کا رواج شباب پر تھا۔ دوسرے

---

* لکچرر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ۔

باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کے آنے کے بعد دفعتاً غلامی کے خلاف آواز بلند نہیں کی گئی بلکہ رفتہ رفتہ غلاموں کو آزاد کرانے اور غلامی کی راہ کو مسدود کرنے کی تدابیر اختیار کی گئیں۔ پہلے یہ ترغیب دی گئی کہ غلام آزاد کرنا ایک نہایت قابل ستائش فعل ہے ۔لونڈیوں کو غلام کے لفظ سے پکارنے سے منع کیا گیا۔ آگے اس کتاب میں سرسید نے یہ بتایا کہ قرآن مجید میں غلامی کے متعلق جو احکام بیان ہوئے ہیں یہ ان غلاموں سے متعلق ہیں جو دور جاہلیت اور نزول آیت سے قبل حریت کے غلام ہو چکے تھے۔ سرسید نے آگے قرآن مجید میں غلامی سے متعلق آیات کو نقل کر کے یہ ثابت کیا کہ مذہب اسلام میں رقیت مستقلہ جائز نہیں ہے ۔ لفظ ملیکت پر بحث کرتے ہوئے سرسید نے بتایا کہ قرآن کریم کے رو سے جنگ میں پکڑے ہوئے قیدیوں کو مستقل غلامی میں نہیں رکھا جا سکتا ۔اسی طرح لڑائی میں پکڑی گئی عورتوں سے مباشرت کرنی درست نہیں ہے۔ آگے قرآن میں وارد لفظ "رقبہ" پر اظہار خیال کرتے ہوئے سرسید نے بتایا کہ اس سے قرآن کریم میں دائمی غلامی مراد نہیں ہے۔ یہ بھی بتایا کہ لفظ "الرقاب" قرآن کریم میں دو بار آیا ہے لیکن اس سے بھی دائمی غلامی کا مفہوم نہیں نکلتا۔اسی طرح حدیث میں آئے ہوئے دو لفظ غلام اور جاریہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ اب بھی غلامی کی رسم برقرار ہے۔

آگے سرسید نے کہا کہ جنگ میں پکڑے ہوئے کافر قیدیوں، دارالحرب سے زبردستی پکڑ کر لائے ہوئے کافروں، کافر بادشاہ کا کسی مسلمان کو بطور نذر، ہدیہ، جزیہ و خراج کافروں کو دینا، کوئی حربی دارالاسلام میں بغیر امان کے آجائے، ان تمام صورتوں میں علماء اسلام کے یہاں بسبب غلبہ و استیلاء کے لیے وہ مسلمانوں کے غلام ہو جاتے ہیں ۔سرسید نے اس سے اختلاف کیا ہے اور اس بابت پر دلیلیں فراہم کی ہیں کہ غلام نہیں ہوتے ہیں بلکہ علماء کا یہ اپنا اختراع کردہ قانون ہے۔ آگے باب چہارم میں قرآن مجید اور حدیث کی روشنی میں یہ بات منظر عام پر لائی گئی ہے کہ جنگ کے دوران پکڑے گئے قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جاسکتا۔اس سلسلے میں سرسید نے فقہاء کے اقوال کا بھی جائزہ لیا ہے اور مفسرین کی آراء کو بھی زیر بحث لے آئے ہیں۔

باب پنجم میں قرآن مجید کی رو سے ثابت کیا گیا ہے کہ قیدیوں کو غلام اور لونڈی نہ بنایا جائے، اس موضوع سے متعلق کچھ تفاسیر کا بھی سرسید نے جائزہ لیا ہے۔ آگے سرسید نے فقہا کے ان افعال کو ہدف تنقید بنایا کہ قیدیوں کو چھوڑنا جائز نہیں ۔ان کا قتل کرنا جائز ہے نیز لونڈی اور غلام بنانا بھی جائز ہے ۔اس کا ذکر کیا گیا کہ جو قرآن میں قیدیوں کو احسان کے پیش نظر اور فدیہ لے کر چھوڑ دینا آیا ہے۔ اس کا صرف یہی مفہوم ہے نہ کہ کچھ اور ۔ باب ششم میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ آیت من و فداء کے نزول کے بعد کسی کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام نہیں بنایا۔جن حدیثوں سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ آپ نے غلام بنائے ۔اس کا باب ہفتم میں جواب دیتے ہوئے سرسید نے بتایا کہ من و فداء کی آیت کے نزول کے بعد آپ نے کسی کو غلام یا لونڈی نہیں بنایا۔اس موضوع سے متعلق احادیث کی صحت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

سرسید نے غلام سے متعلق آیات اور احادیث کی روشنی میں جو مسئلہ اٹھایا ہے اس سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن ان کے یہ خیالات غایت درجہ غور و خوض کی بنیاد پر قائم کیے گئے ہیں۔ وہ روایتی اور رسمی اسلوب میں سوچنے کے عادی نہیں تھے بلکہ ان کی طبیعت پر پوری طرح اجتہادی عنصر غالب تھا۔ وہ قرآن و حدیث کو تفاسیر اور شرحوں سے سمجھنے کے بجائے عقل و خرد کو بروئے کار لاتے تھے ۔اس کتاب میں جہاں ایک طرف مستشرقین کے بے جا عائد کردہ الزامات کے جواب فراہم کیے گئے ہیں وہیں مفسرین کی بھی بہت سے لغزشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

عوام کی بہبود کے پروگرام

۹۶-۱۹۹۵ء کی بجٹ تجاویز میں سماج کے کمزور طبقات کی آمدنی بڑھانے والی بہت سی نئی اسکیمیں شامل ہیں۔ ان تجاویز میں دیہات کی ترقی، روزگار، غریبی دور کرنے کے پروگرام، معذور افراد کی بہبود کے پروگرام نیز اقلیتوں کی بہبود کے بہت سے اقدامات شامل کیے گئے ہیں۔ بجٹ تجاویز کے مطابق ایسا فنڈ قائم کیا جائے گا جس سے دیہات میں ترقی کے لیے بنیادی ڈھانچہ مضبوط کیا جا سکے۔ درج فہرست ذاتوں اور قبائل ارکان کے لیے مزید قرضوں کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے بھی تجاویز میں کہا گیا ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو جدید بنانے کے لیے بھی ایک فنڈ کھولا جائے گا۔ غریب اور ضرورت مند لوگوں کو قومی سماجی امداد فراہم کی جائے گی۔ نیز اندرا آواس یوجنا کے تحت ۱۰ لاکھ گھر تعمیر کرائے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اسکولی بچوں کو دوپہر کا کھانا بھی فراہم کیا جائے گا۔ بہت سی زرعی اشیاء پر سے محصولات کم کیے گئے ہیں۔ اسی طرح طبی آلات وسامان پر سے بھی ڈیوٹی کم کی گئی ہے، تاکہ صحت کی دیکھ بھال کا عمل بآسانی انجام پا سکے۔

سرکار نے حال ہی میں کچھ وزارتوں کی نئے سرے سے تشکیل کی ہے۔ مثلاً دیہی اور شہری ترقی۔ اُس کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کو فائدہ پہنچانے والے پروگراموں میں موثر ڈھنگ سے عمل درآمد ہو سکے۔ اِن مدوں کے لیے منصوبے میں پہلے سے کہیں زیادہ رقومات مختص کی گئی ہیں۔

غریبی دور کرنے اور دیہات کی ترقی کے پروگرام:

سرکار نے غریبی دور کرنے کے پروگراموں کو اعلیٰ ترین ترجیح دی ہے۔ مرکزی سیکٹر میں روزگار کے لیے منصوبہ جاتی مصارف اور غریبی دور کرنے والے پروگراموں کے مصارف مسلسل تیزی کے ساتھ بڑھتے رہے ہیں۔ پچھلے بجٹ میں دیہی ترقی کے محکمے کے اخراجات بڑھا کر ۷۰ ارب دس کروڑ روپے کر دیے گئے ہیں جو ۹۳-۱۹۹۲ء میں اس کام کے لیے مختص کردہ ۳۱۰۰ کروڑ روپے کے دوگنے سے بھی زیادہ ہیں ۹۶-۱۹۹۵ء میں یہ رقم اور بڑھا دی گئی اور ۷۷ ارب روپے تک پہنچ گئی۔ اس طرح سرکار آٹھویں منصوبے میں اس کام کے لیے متعین کردہ ۳۰ ہزار کروڑ روپے کے اس نشانے تک پہنچ گئی جو کہ اس نے مرکزی سیکٹر میں دیہات کی ترقی کے لیے رکھا ہے۔ دیہی ترقی کے محکمے نے ۹۲-۱۹۹۱ء میں آٹھ لاکھ افراد کو روزگار مہیا کرایا گیا۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں ایک ارب

۲۹ کروڑ افرادی دنوں کا روزگار فراہم کرنے پر زور ہوگا۔

ہندوستانی سماج سے صدیوں پرانا غریبی کا بوجھ اتارنا ضروری ہے۔ چنانچہ سرکار اس کے لیے برابر کوششیں کر رہی ہے اس کے لیے ایک طرف سرمایہ کاری میں اضافہ نیز جدید کاری کے عمل کو تیز کرنے پر زور دیا ہے اور دوسری طرف کچھ ایسے پروگرام شروع کیے گئے ہیں جن سے غریبی دور ہو سکے۔ بجٹ میں رکھی گئی ٹیکس تجاویز اور مرکزی منصوبے کے لیے مختص کردہ اقدامات کی مدد سے غریبی دور کرنے کی حکمتِ عملی کو موثر بنانے پر زور ہے۔ چنانچہ شہروں سے غریبی دور کرنے کے لیے فنڈ میں دیے گئے عطیات ٹیکس کے لیے قابلِ محسوب آمدنی میں سے تمام کے تمام منہا کر دیے جائیں گے۔ وزیر اعظم نے سالِ گذشتہ اس فنڈ کے قیام کا اعلان کیا تھا اور اسی اعلان کی تکمیل میں یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔

دیہی پروجیکٹوں کے لیے فنڈ

دیہات میں ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے درکار بنیادی کاموں میں تیزی لانے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے ایک دیہی فنڈ قائم کیا گیا ہے جس سے سڑکوں کی تعمیر اور آب رسانی وسیلوں کے فروغ پر زور دیا جاسکے گا۔ یہ فنڈ زراعتی اور دیہی ترقی قومی بینک میں کھولا جائے گا اور اپریل ۱۹۹۵ء سے اس کا آغاز ہوگا۔ اس سے ریاستی سرکاروں کو قرضے ملیں گے۔ ریاستی ملکیت کی کارپوریشنیں بھی اس سے رقم لے سکیں گی۔ تاکہ وہ اُن پراجیکٹوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں جو پہلے سے چلے آرہے ہیں۔ اس طرح پراجیکٹوں میں متوسط درجے کی چھوٹی آب پاشی کے پراجیکٹ مٹی کے تحفظ کے پروگرام اور دیگر مختلف قسم کے ترقیاتی پروگرام شامل ہیں۔

سماجی امداد کی اسکیموں سے ایک کروڑ چالیس لاکھ غریب افراد کو فائدہ ہوگا۔

زندگی بیمہ کارپوریشن نے ایک نئی اسکیم گروپ لائف انشورنس کے نام سے شروع کی ہے جس کے تحت سماج کے کمزور طبقات کے لیے بہت سے سماجی امداد کے فائدے مہیا کرائے گئے ہیں۔ دیہات میں پنچایتیں اس اسکیم کو لاگو کریں گی اس کی رُو سے معمولی سالانہ پریمیم ۷۰ روپے کے لگ بھگ ادا کرکے پانچ ہزار روپے فراہم کیے جانے کے امکانات ہوتے ہیں۔ غریب اور ضرورت مند لوگوں کے لیے قومی سطح کی سماجی امداد کی اسکیم چلانے کی تجویز ہے۔ اس اسکیم کا ایک حصہ یہ ہے کہ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے بوڑھوں کو جو ۶۵ سال سے اوپر ہیں ۷۵ روپے ماہانہ پنشن دیے جانے کی اسکیم ہے۔ ایک اور تجویز کی رُو سے اگر کسی ایسے ہی غریب کنبہ کا روزی روٹی کمانے والا فرد وفات پا جائے تو اس کنبہ کو پانچ ہزار روپے کی یک مشت رقم دی جائے گی۔ غریب گھرانے کی عورتوں کو پہلے دو بچوں کی پیدائش پر ولادت سے قبل اور مابعد ولادت دیکھ بھال کے سلسلے میں امداد ملے گی۔ اس سے غریبی کی سطح سے زندگی گزارنے والی تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ عورتوں کو فائدہ پہنچے گا۔

معذور افراد کے لیے ٹیکسوں کی ادائیگی کے لیے ان کی آمدنی سے اس وقت ۲۰ ہزار روپے گھٹائے جاتے ہیں۔ اب اس رقم کو بڑھا کر ۴۰ ہزار روپے کیا جا رہا ہے۔ اگر کسی ماں باپ کا معذور بچہ ہے تو اُن کی قابلِ ٹیکس آمدنی میں مزید بیس ہزار روپے کی تخفیف کی جائے گی۔ بشرطیکہ یہ رقم زندگی بیمہ کارپوریشن، یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا وغیرہ میں اس خیال سے جمع کرادی جائے کہ اس سے معذور بچے کی دیکھ بھال کی جائے گی۔

ٹریڈ یونینیں جو فنڈ قائم کرتی ہیں اور پھر ان سے جو آمدنی ہوتی ہے اسے اگر ملازمین کی بہبود اور ان کے لواحقین کی بھلائی پر خرچ کیا جائے گا تو یہ رقم انکم ٹیکس سے مستثنیٰ کر دی جائے گی۔

۵۰ لاکھ رہائشی مکانات :—— اندرا آواس یوجنا کے تحت تقریباً ۴ لاکھ رہائشی مکانات ۹۵-۱۹۹۴ء میں رہائش

خرچ پر درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل اور آزاد کرائے گئے بندھوا مزدوروں کو دیے جانے کی امید ہے۔ ۹۶-۱۹۹۵ میں نشانہ بڑھاکر دوگنے سے بھی زیادہ کر دیا گیا ہے اور اب کے برس دس لاکھ مکانات اسی طرح رعایتی نرخ پر بانٹے جائیں گے۔ آئندہ پا برسوں میں ۵۰ لاکھ دیہی مکانات تعمیر کیے جانے کا منصوبہ ہے۔

درج فہرست ذاتیں اور قبائل:

سو ایسے اضلاع میں جہاں قبائلی آبادی کے ارکان کافی تعداد میں ہیں، علاقائی بنکوں اور کوآپریٹو بنکوں کے توسط سے ان کو قرض دینے کے لیے ۴۰۰ کروڑ روپے کی رقومات رکھی گئی ہیں۔ زراعت اور دیہی ترقی کا قومی بنک ان قرضوں کا خصوصی طور پر الگ سے انتظام کرے گا۔ یہ بنک مزید سو کروڑ روپے سے شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے ان ارکان کو قرضے مہیا کرائے گا جن نشاندہی مندرجہ فہرست ذاتوں اور قبائل کی کارپوریشن کرائیں گی۔

اقلیتوں کی بہبود۔

اقلیتوں کی ترقی و مالیات کی قومی کارپوریشن کی آمدنی کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ یہ کارپوریشن اقلیتوں کی ترقیاتی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کے لیے قائم کی گئی ہے۔ اگر کسی بھی ریاست میں اسی طرح کی کوئی اور ریاستی کارپوریشن قائم کی جائے گی تو اسے بھی انکم ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا جائے گا۔ ان کارپوریشنوں کے لیے دیے گئے عطیات کو انکم ٹیکس کی رعایت کا فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہوگا

کھادی اور ہینڈلوم سیکٹر کے لیے مزید امداد۔

بنکوں کے ذریعے کھادی اور گرام ادیوگ کمیشن کو کنسورشیم کی بنیاد پر ایک ہزار روپے دیے جائیں گے۔ اس سے دیہی صنعتوں کے کمیشن کو بھی فائدہ ہوگا اور اس کی وجہ سے کھادی اور گرام ادیوگ زیادہ مضبوط ہوں گے۔ ہینڈلوم مراکز کو قرضوں کی فراہمی بڑھانے کے لیے بھی اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ہماری رنگ سازی کے کارخانوں کو بھی قرضے ملیں گے۔ یہ وہ کارخانے ہوں گے جو سال گزشتہ کی اعلان کردہ اسکیم کے تحت کھولے جا رہے ہیں۔

اسکولی بچوں کو دوپہر کا کھانا۔

اسکولی بچوں کو دوپہر کے کھانے کی اسکیم کا فائدہ یہ ہوا کہ بچوں کو تغذیہ بخش خوراک ملی اور اسکولوں میں ان کی حاضری کا اوسط بڑھا۔ پرائمری تعلیم کو ترجیح دی جا رہی ہے اور پبلک سیکٹر اداروں کے پاس خوراک کے وافر ذخیرے موجود ہیں۔ لہٰذا مرکزی حکومت نے ان اسکیموں کی مرحلے وار توسیع کا منصوبہ بنایا ہے۔ ایک کمیٹی ۹۶-۱۹۹۵ میں ان پر عمل درآمد کے سلسلے کی تفاصیل مرتب کرے گی۔

تعلیم، صحت اور خاندانی بہبود کے لیے مزید اخراجات۔

سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے تعلیم کے مواقع زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے۔ لڑکیوں اور عورتوں کا سماجی مرتبہ بڑھانے کے لیے پرائمری تعلیم کے اخراجات میں ۲۴٫۵ فی صد اضافہ کرکے انھیں ۱۶۵۱ کروڑ روپے کر دیا گیا ہے۔

صحت اور خاندانی بہبود کے محکموں کے لیے ۹۶-۱۹۹۵ میں رقومات بڑھاکر ۲۲ ارب ۱۵ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔ خاندانی بہبود کے لیے ۳۶۷ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ ان سے براہ راست دیہات کو فائدہ پہنچے گا۔ ان میں ۱۶۰ کروڑ روپے وہ ہوں گے جن سے ۹۵۷۷ دیہی ذیلی مراکز کی دیکھ بھال کی جائے گی۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا فروغ :—— چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا ترقیاتی بنک حصہ‌کاری کے لیے ٹکنالوجی فنڈ

کھولے گا۔ اس رقم سے پراجیکٹوں کو میعاری بنانے میں مدد ملے گی اور ان چھوٹے کارخانوں میں تیار مال باہر ملکوں کو بھیجا جا سکے گا۔ اس وقت چھوٹے پیمانے کے صنعتی یونٹ جن کا کاروبار پچھلے مالی سال دو کروڑ روپے سے تجاوز نہ کر سکا ایکسائز محصولات میں رعایتوں کے مستحق سمجھے گئے ہیں۔ معاشی ترقی میں ان کارخانوں کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے ۳ کروڑ روپے تک کا کاروبار کرنے والے صنعتی ادارے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا فائدہ اٹھانے کے مجاز قرار دیے گئے ہیں۔

معاشی ترقی میں اضافہ۔

قومی معیشت کی ترقی ۹۵-۱۹۹۴ میں ۵ء۳ فی صد رہی۔ جب کہ ۹۲-۱۹۹۱ میں یہ ایک فی صد سے بھی کم تھی ہندوستانی صنعت نے اپریل تا نومبر ۱۹۹۴ء ۸ء۷ فی صد ترقی کی۔ مینوفیکچرنگ کے شعبوں میں یہ شرح اور بھی زیادہ یعنی ۹ء۲ فیصد رہی۔ ۹۵-۱۹۹۴ میں صنعتی سرمایہ کاری میں دوبارہ جان پڑی۔ ٹکنالوجی کے معیار میں اضافے اور جدید کاری نے ترقی کا یہ رخ دکھایا۔ ۹۳-۱۹۹۲ میں ۳۰ لاکھ نئی نوکریاں پیدا کی گئیں۔ آئندہ اور برسوں میں تقریباً ۱۲۰ لاکھ نئی نوکریوں کے مواقع نکالے جانے کی امید ہے۔

خوراک کی بے مثال پیداوار اور ذخائر۔

اس سال اناج کی پیداوار ۱۸ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن تک پہنچ جانے کی توقع ہے، جب کہ ۹۲-۱۹۹۱ میں یہ ۱۶ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن تھی۔ کسانوں کو نفع بخش قیمتوں کی وجہ سے فائدہ ہوا۔ انھوں نے دل و جان سے محنت کرکے پیداوار بڑھائی۔ خوراکی اجناس کا ذخیرہ بڑھ کر یکم جنوری ۱۹۹۵ کو ۳ کروڑ ۱۰ لاکھ ٹن تک پہنچ گیا۔ جب کہ تین سال قبل یہ ایک کروڑ ۴۷ لاکھ ٹن تھا۔
یہ حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ آنے والے سال میں اقتصادی کارگزاری اور بہتر نتائج دکھائے گی اور سرمایہ کاری میں اضافہ سے روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے اور سماج کے سبھی طبقے اس سے مستفید ہوں گے۔

[پریس انفارمیشن بیورو، گورنمنٹ آف انڈیا کے توسط سے]۔

اعلانِ ملکیت

مالک : علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ — قومیت : ہندوستانی

ایڈیٹر: مسعود عالم — پرنٹر پبلشر : مسعود عالم

پریس : علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ — اشاعت کی مدت: ماہانہ

مقام اشاعت : ماہنامہ تہذیب الاخلاق اور نشانت: ا۔شبلی روڈ، اے۔ایم۔یو۔ علی گڑھ

میں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے یقین کی حد تک درست ہیں۔

مسعود عالم
(دستخط)



دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

ایک مکمل ہیلتھ ٹانک، بلکہ اور بھی بہت کچھ!



سنکارا
آپ کی صحت کے لیے ایک بھرپور ٹانک

سنکارا لازمی عناصر، جڑی بوٹیوں اور وٹامنوں کا نادر مرکب ہے۔ اس میں آئرن، کیلشیم اور زنک کی کافی مقدار ہے۔ اتنا ہی نہیں، سنکارا میں الکحل بالکل نہیں ہے۔ سنکارا آپ کی کس طرح مدد کرتا ہے؟

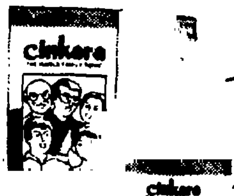
اسکول جانے والے بچوں کے لیے:
سنکارا بھوک اور ذہنی توانائی بڑھانے میں مدد کرتا ہے۔ اس کی وجہ ہے سنکارا میں موجود مقوّی عناصر (بالخصوص زنک اور آیوڈین) جو دماغ کے خلیوں کو بڑی مقدار میں غذا فراہم کرتے ہیں۔ یہ قوتِ حافظہ کی اصلاح بھی کرتا ہے۔

حاملہ خواتین کے لیے:
سنکارا حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی ماؤں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس میں ماں اور بچہ کی صحت کے لیے ضروری فولک ایسڈ، وٹامن بی ۱۲، آئرن، کیلشیم اور زنک کافی مقدار میں ہیں۔

بالغوں کے لیے:
دباؤ اور تناؤ بھری اس دنیا میں سنکارا مہلک امراض سے حفاظت کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ سنکارا دورانِ خون کو معمول کے مطابق رکھنے اور جگر کے افعال میں کثافتوں کے جمع ہونے سے روکنے میں مدد کرتا ہے۔

ضعیفوں کے لیے:
سنکارا ضعیفوں کے لیے قابلِ بحالی اور طاقت بحال کرنے والا ٹانک ہے۔ اشتہا میں کمی آجانے کے سبب پیدا ہونے والے امراض اور ضعیفی میں پریشان کرنے والی بیماریوں سے حفاظت کرتا ہے۔ ان میں اکثر امراض کا سبب خراب اور غیر متناسب غذا ہے۔

تو آج ہی سنکارا لے آئیے۔ یہ پورے خاندان کے لیے قابلِ بحالی صحت بخش ٹانک ہے۔



چند مشہور ٹانکوں میں موجود آئرن، کیلشیم، زنک اور الکحل کی مقدار (فی خوراک) کا موازنہ۔

Repuated brands of tonics	Iron (mg)	Calcium (mg)	Zinc (mg)	Alcohol content percent (V/V)	Contents per unit pack
1	—	12.4	—	12.00	400
2.	—	—	—	11.0	240
3.	[illegible]	—	—	—	454
4.	13.00	—	—	—	200
5.	21.50	—	[illegible]	5.5	200
6.	.16.709	—	—	—	300
7.	—	—	—	—	200
8.	7.83	—	0.50	—	100
9.	5.00	9.50	—	9.5	300
Cinkara	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

لازمی بنیادی عناصر،
وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا
نادر مرکب

ہمدرد

سنکارا

مشہور عالمی قدرتی ٹانک، ہر موسم میں سب کے لیے

Chalee Leo Burnett D HWR 1495 URD

[redacted]

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۴ — مئی ۱۹۹۵ء — شمارہ ۵

بانی : سرسید احمد خاں

مدیر

پروفیسر مسعود عالم

شریک مدیر

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی

نائب مدیر

احمد مجتبیٰ قریشی

سرکولیشن انچارج : محمد عتیق

فی شمارہ :	6=50	روپے	زر سالانہ : 65-00	زر سالانہ طلبہ	45-00 روپے
بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک)	30-00	امریکی ڈالر	بیرونی ممالک (عام ڈاک)	15-00	امریکی ڈالر
لائف ممبر شپ (اندرون ملک)	650-00	روپے	لائف ممبر شپ (بیرون ممالک)	300-00	امریکی ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق ادارہ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۰۲۰۰۲ (یوپی) انڈیا۔ فون : 401027

ترتیب

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے متفق ہو]
ایڈیٹر، پبلشر پروفیسر مسعود عالم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کے توسط سے چھپوا کر ادارۂ تہذیب الاخلاق اور نشانات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا۔

اداریہ

پہلے مدرسۃ العلوم مسلمانانِ ہند بعد ازاں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ برصغیر کے مسلمانوں کی ترقی کے لیے نشانِ راہ بنے اور جب ۱۹۲۰ عیسوی میں 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' کا قیام عمل میں آیا تو سر سیّد کا خواب ایک حقیقت میں بدل گیا اور مسلمانانِ ہند کی دیرینہ آرزو پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ سر سید نے شمالی ہند میں مسلمانوں اور ہندوستانیوں کی تعلیمی ترقی کے سلسلے میں جو انتھک کوششیں کیں وہ کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں بھلے ہی بعضوں کو وہ نہ دکھائی دیں۔ ایسے لوگوں کی بے بصری اور کوتاہ بینی پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔ سر سیّد نے اس سلسلے میں حالات اور افراد سے جو ٹکر لی اس کی مثال کم ہی ملتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ پچھلی دو چار صدیوں میں تو مسلمانوں میں اس مرتبے کا آدمی پیدا نہیں ہوا۔ سر سیّد کے قایم کردہ اس ادارے ہی کا یہ فیضان ہے کہ آج دُنیا کے گوشے گوشے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فرزندوں نے اپنی مادرِ علمی کا نام روشن کر رکھا ہے۔

دُنیا کو سنوارنے اور سجانے میں، زندگی کو سلیقہ دینے میں، علم و آگہی کے فروغ میں، ہنر کو فن اور فن کو نشاطِ روح بنا دینے میں جامعات یعنی یونیورسٹیوں اور درس گاہوں کا بہت اہم رول رہا ہے۔ خاص طور پر پچھلے دو سو سال میں دُنیا نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اور خاص طور پر ہماری اس جاتی صدی میں، وہ علم و فن کے ان گہواروں جن کو یونیورسٹیاں کہا جاتا ہے، کی ہی مرہونِ منت ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بھی اپنی خدمات کے ذریعے دنیا میں اپنے ملک و ملّت کا نام روشن کیا ہے۔ سالِ رواں یونیورسٹی کے قیام کا پچھتر واں سال ہے۔ تقریباً سب ہی بڑے ادارے اپنی 'جبلی' چاہے وہ سلور ہو، گولڈن ہو یا پھر پلیٹنیم بڑے اہتمام سے مناتے ہیں اور صدی تقریبات تو بہت دھوم سے منائی جاتی ہیں۔ ان سب تقریبات کی اپنی ایک افادیت ہے۔ ان موقعوں پر اپنی کارگزاریوں کو نمایاں طور پر پیش کرنے کی غرض سے جلسے کیے جاتے ہیں، نمائشیں لگائی جاتی ہیں، ثقافتی، تہذیبی اور کھیل کود کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ مقصود یہ کہ پروپیگنڈا کے ذریعے اپنے کو سب تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ تاکہ ہر خاص و عام جان جائے کہ ہم بھی 'ہیں'، 'سیتھے' اور 'رہیں گے'۔ ملک و قوم کا مستقبل سنوارنے کے لیے تعمیری پروگراموں کے خاکے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی میں بھی یہ تقریبات منائی جاتی رہی ہیں لیکن ان کی کوئی قابلِ ذکر یادگار نہیں ملتی۔ پچھلے دو موقعوں یعنی ایم۔ اے او کالج کی صد سالہ تقریبات اور ہجری کی چہاردہ سالہ تقریبات کے سلسلے میں جو کمی رہ گئی تھی اس کی تلافی پلیٹنیم جبلی ۱۹۹۵ء کو شاندار طور پر منا کر کی جانی چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس بار ایک نہیں کئی شاندار یادگاریں قایم ہونی چاہئیں تاکہ ۲۰۲۰ء میں جب صد سالہ جشن منایا جائے تو حوصلے اور عزائم اور بلند ہوں۔ اس ضمن میں ہمارے ذہن میں بہت سی تجاویز ہیں جس کا خاکہ انشاء اللہ جون کے شمارے میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔

ادارہ تہذیب الاخلاق اس سلسلے میں ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کا اہتمام کر رہا ہے جس میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں کون سے بڑے کام انجام پائے، یونیورسٹی کے باہر ملک گیر اور عالم گیر سطح پر فرزندان علی گڑھ کی علم و ادب، سیاست، ثقافت اور کھیل کود کے شعبوں میں قابل ذکر خدمات کا ایک تفصیلی جائزہ، دلچسپ اور معلوماتی مضامین کی شکل میں پیش کیا جائے گا۔ لیکن اس پروگرام کی کامیابی کا انحصار اہل قلم حضرات کے تعاون پر ہے۔ اگر ہم کو بڑے پیمانے پر تعاون ملا تو اس کی اشاعت ایک سے زائد شماروں میں کی جاسکے گی ورنہ پھر ایک شمارے پر اکتفا کرنا ہوگا۔ بہرحال وقت کی تحدید اور موقع کے تقاضے کے تحت اس کو ماہ دسمبر کے اواخر تک منظر عام پر آجانا چاہیے۔ کیونکہ ۱۹۲۰ء میں اسی مہینے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ (مجریہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۰ء) کے تحت مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ چنانچہ معاونین سے درخواست ہے کہ ۱۵ اکتوبر تک ادارے کو یہ مضامین مل جانے چاہییں تاکہ کتابت اور طباعت کے لیے خاطر خواہ وقت مل سکے۔ پیش نظر شمارے میں ٹائیٹل کور کے پچھلے ورق کے آخری صفحے پر مذکورہ شمارے کا ایک خاکہ درج ہے۔ جو صاحبان جس موضوع پر لکھنا چاہیں وہ بلا تکلف اور بلا تاخیر ہم کو مطلع کریں اور اگر اس وقت تک اس موضوع کو کسی دوسرے صاحب نے منتخب نہیں کر لیا ہے تو وہ موضوع ان کے لیے مختص کر دیا جائے گا اور اس کی اطلاع بھی دے دی جائے گی۔ اس سلسلے میں ادارے کی جانب سے یونیورسٹی کے سابق اور موجودہ اساتذہ، اولڈ بوائز، دانشور اور مشاہیر کی خدمت میں خطوط روانہ کیے جا رہے ہیں بہر نوع اگر کسی وجہ سے کسی صاحب کے پاس خط نہ پہنچے اور کسی واسطے سے ان تک یہ خبر پہنچ جائے تو اس کام کو اپنا سمجھ کر اس میں شرکت فرمائیں ؎

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

ہمیں بڑی مسرت ہے کہ جناب محمود الرحمٰن نے یکم مئی کو وائس چانسلری کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ادھر کچھ عرصے سے مایوسی اور بے یقینی کی جو فضا یونیورسٹی پر چھائی ہوئی ہے بہت جلد امید اور اعتماد میں بدل جائے گی اور ایک بار پھر سیّد کا یہ چمن زمانے کی نظر بد کا شکار ہونے سے بچ جائے گا۔ ہمیں اس مرحلے پر نئے وائس چانسلر کے ہاتھوں کو مضبوط کرنا ہوگا۔

مدیر

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی*

قربانی کا فلسفہ

(خطبہ عید الاضحیٰ)

معبود کو راضی کرنے کے لیے بندے کے پاس یہی کچھ ہے کہ وہ اس کے آگے سر جھکا دے۔ اس کے نام کا ورد کرے، اس کی یاد دل میں بسائے رہے۔ اس کی خاطر روزہ رکھے۔ اس کے نام پر نذر و نیاز اور صدقہ وخیرات کرے۔ اس کے گھر کی زیارت کرے اور اس کے نام پر قربانی کرے۔ یہ سب کچھ اگر دیوی دیوتا یعنی غیر اللہ کے لیے کیا جائے تو شرک ہے اور اگر صرف اللہ کے لیے کیا جائے تو یہی توحید ہے۔ اظہار بندگی اور اعلان سرافگندگی ہے۔ مسلمان عید الاضحیٰ کے دن جانور کو قبلہ رو لٹا کر جب اس کی گردن پر چھری پھیرتا ہے تو اسی توحید اور عبدیت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں:

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ۔ (انعام ۱۶۲-۱۶۳)

[میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں]۔

آسمانی شریعتوں میں معبود حقیقی کو راضی کرنے کے جو طریقے رائج رہے ہیں ان میں نماز، روزہ، زکوٰۃ کے ساتھ قربانی کو بھی قدر مشترک کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ (الحج - ۳۴)

[ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا تاکہ اس امت کے لوگ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے اور اسی کے تم مطیع و فرماں بردار بنو اور بشارت دے دو عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو]

انسانی تاریخ کے معتبر ماخذ قرآن کریم کے مطابق روئے زمین پر سب سے پہلے آدم کے دو بیٹوں یعنی ہابیل و قابیل نے قربانی دی تھی ان میں سے خداترس کی قربانی تو قبول ہوئی اور نفس پرست کی قربانی رد کر دی گئی۔ قرآن کہتا ہے:

إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ ۖ قَالَ

---

* ناظم دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ مئی ۱۹۹۵ء

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (المائدہ ۲۷)

[جب ان دونوں نے قربانی کی تو اُن میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی اس نے کہا میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اس نے جواب دیا کہ اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے]۔

مگر قربانی کی عظیم تاریخ اور شاندار روایت وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں خدا خود اپنے دو جلیل القدر نبیوں کو منتہ تک پہنچا کر ان کے جذب وشوق، عزم وحزم اور ایثار وقربانی کا امتحان لیتا ہے۔ دنیا کے موجودہ مذہبی خاندانوں کے مورِ اعلیٰ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے بڑھاپے میں صالح اولاد کی دُعا مانگی تھی۔ دُعا کی قبولیت چہیتے اسماعیل کی شکل میں ظاہر ہو قدرت نے ابراہیم کو بیداری میں بیٹا عطا کیا اور خواب میں اس زندگی کا نذرانہ مانگ لیا۔ بڑھاپے کا سہارا مانگ کر اللہ درحقیقت باپ کا امتحان لیا اور باپ نے جان کی قربانی مانگ کر بیٹے کا امتحان لیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس صالح اولاد کی دُعا مانگی تھی وہ کتنی صالح ہے۔ بیٹے نے جواب میں اپنی گردن پیش کر کے سعادت مندی پر مہرثبت کی اور برگزیدہ باپ نے بیٹے کو منہ کے بل لٹا کر خوابِ کو شرمندۂ تعبیر کر دیا۔ گلا کاٹنے سے پہلے قدرت نے آگے بڑھ کر ابراہیم کے خنجر بکف ہاتھ تھام لیے۔ مقصد جاں نثاروں کا خون نہیں امتحان تھا اور اسماعیل علیہ السلام کی جگہ مینڈھے کی قربانی سنت اللہ قرار پائی۔ اس حساس لمحے کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن کہتا

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓـؤُا الْمُبِيْنُ وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ (الصافات ۱۰۳ - ۱۰۹)

[جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو پیشانی کے بل گرا دیا اور ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا اور اس کی تعریف توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیم پر]۔

ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی یہی وراثت ہے جسے مسلمان سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ اسی کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ (مسلم)

[یہ قربانی تمہارے بابا ابراہیم کی سنت ہے]۔

بیٹے کو منہ کے بل لٹانے سے پہلے ابراہیم واسماعیل دونوں اللہ کے حکم کے آگے سر جھکا چکے تھے اور اپنی خوشی کو اس کی مرضی پر قربان کر چکے تھے جسے قرآن فلما اسلما وتلہ للجبین سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ سبق قربانی کرنے والے تمام مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ جانور کو لٹا کر ذبح کرنے سے پہلے خود احکام خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ یعنی جانور کا نذرانہ پیش کرنے سے پہلے اپنی جان وتن بھی اللہ کی مرضی پر نثار کرنے کا عہد کریں۔ کیونکہ ذبیحہ جانور کا گوشت، خون اور ہڈی سب کچھ زمین پر رہ جائے گا اور اللہ کے یہاں شرف قبولیت حاصل کرنے والی چیز جذبۂ دل، عزم ونیت اور اخلاصِ عمل ہوگا۔ قرآن کہتا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج ۳۷)

[نہ قربانی کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے]۔

اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ (مسند احمد ۲ ص۲۸۵)

[اللہ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دل اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے]

قربانی میں جس جانور کو ذبح کیا جائے شریعت کا حکم یہ ہے کہ وہ جانور بے عیب ہو اس کا کوئی عضو کٹا ہوا نہ ہو۔ اس میں کوئی مرض نہ ہو یعنی ہر لحاظ سے پاک وصاف ہو بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے جانور کو پالنے اور موٹا کرنے کا بھی حکم دیا ہے:

سَمِّنُوْا ضَحَايَاكُمْ فَإِنَّهَا عَلَى الصِّرَاطِ مَطَايَاكُمْ (ابن ماجہ)

[قربانی کے جانوروں کو موٹا کرو کیوں کہ وہ پل صراط پر تمہاری سواری بنیں گے]

جانور جسم و جان سے مرکب ہے۔ اس میں عقل نہیں ہوتی، اس پر کوئی قانون جاری نہیں ہوتا اس لیے جسمانی عیب سے پاک جانوروں کو خدا کے حضور ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ مگر انسان عقل وخرد سے نوازا گیا ہے وہ دل و دماغ کا مالک ہے، اس پر اخلاقی ضابطے اور شرعی قانون نافذ ہوتے ہیں۔ اس لیے اسے چاہیے کہ خدا کی بارگاہ میں نذرانہ پیش کرتے وقت اپنے آپ کو ہر گناہ اور ہر عیب سے پاک لے جائے ورنہ یہ قربانی کیسی ہوگی کہ جانور تو بے عیب پیش کیا جائے اور انسان عیب دار، ذبیحہ تو توانا و تندرست ہو مگر قربانی کرنے والا روحانی واخلاقی امراض کا شکار۔ جانور تو انسان کے لیے اپنی گردن کٹا دے مگر انسان خدا کی مرضی پر اپنی گردن جھکا نہ سکے۔ اس لیے قربانی سے پہلے دل وجان کو قربان کرنے کا عزم و حوصلہ چاہیے۔

بیسویں صدی کا مادہ پرست ذہن یہ سوچتا ہے کہ کروڑوں بلکہ اربوں کی تعداد میں بیک وقت جانوروں کو ذبح کرنے کا حاصل کیا ہے اگر اس کی رقم کسی فلاحی اور رفاہی اسکیم میں، تعلیم و ثقافت کے فروغ میں، تجارتی اور امداد باہمی کے مراکز کے قیام میں صرف کردی جائے تو ایک انقلاب رونما ہوسکتا ہے اور جانوروں کی زندگی بھی بچ سکتی ہے، مگر سنیے عبادت اور عقیدے کا سرا بندے کے ہاتھ نہیں بلکہ خدا کے پاس ہوتا ہے۔ اس لیے اپنے حکم کی حکمت و مصلحت وہی بہتر جانتا ہے۔ البتہ اگر قربانی کے لیے یہ خیال درست مان لیا جائے تو حج کے لیے بھی کہا جائے گا کہ اتنا طویل سفر اور اتنی کثیر رقم کا حاصل محض ایک گھر کا طواف؟ کیوں نہ اس رقم سے کوئی تعلیم گاہ کھولی جائے اور بینک اور اسپتال چلائے جائیں۔ پھر معاملہ یہاں تک پہنچے گا کہ نماز، روزہ، صدقات اور جہاد سبھی کچھ کا متبادل تلاش کرلیا جائے گا اور نوبت عقائد کی ترمیم تک جا پہنچے گی۔ تسلیم کرنے والے ذہن کے لیے یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ قربانی میں اس کے لیے بھلائی رکھی گئی ہے اور اس کے گوشت میں غریبوں، ناداروں کا حصہ لگایا گیا ہے۔ جو تعاون باہمی اور اجتماعی کفالت کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (الحج ۳۶)

[اور قربانی کے جانوروں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے تمہارے لیے ان میں بھلائی ہے۔ پس انھیں کھڑا کرکے ان پر اللہ کا نام لو اور جب ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور ان کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں اور ان کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکریہ ادا کرو]

مختصر یہ ہے کہ قربانی مسلمانوں کو حضرت ابراہیم اور اسماعیل کی طرح اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کردینے کا سبق دیتی ہے اور غافل انسانوں کو یہ کہہ کر جگاتی ہے ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

منشی حکیم الدین عتیق*

حج کی حقیقت

"حج" کے معنی عربی زبان میں زیارت کا قصد کرنے کے ہیں اور حج کو حج اسی لیے کہتے ہیں کہ مسلمان دنیا کے کونے کونے سے کھینچ کر ہر سال خانہ کعبہ کی زیارت کا قصد کرتے ہیں، خانہ کعبہ کی تعمیر کس نے کی؟ اور کس مقصد کے لیے؟ خانہ کعبہ کی زیارت، طواف اور دوسرے مناسک حج کا مقصد کیا ہے؟ حج کی حقیقت و روح کو سمجھنے کے لیے ان سوالات کا جواب جاننا ضروری ہے۔

خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید کے داعی اور اللہ کے جلیل القدر نبی و رسول تھے۔ آپ نے توحید کی دعوت اور اقامت میں اپنی پوری زندگی لگا دی۔ اس دعوت کی خاطر آپ نے ہر طرح کی مصیبتیں جھیلیں، باپ نے گھر سے نکالا، قوم نے مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ وقت کے اقتدار نے آپ کو زندہ جلا دینے کا فیصلہ کیا۔ آخرش وہی ہوا کہ آپ کو جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا۔

مگر اللہ تعالیٰ کی شان کریمی نے آپ کو اس آگ میں صحیح و سالم رکھا اور بالآخر آپ کو اسی دعوت توحید کے جرم میں اپنے گھر اور اپنی قوم اور اپنے ملک کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنا پڑا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر اس مرد حق آگاہ نے توحید کی دعوت سے منھ نہ موڑا۔ وہ وطن سے نکل کر شام گئے۔ فلسطین پہنچے اور مصر و حجاز کی خاک چھانی اور یہ سب محض اس لیے کیا کہ توحید کا پیغام بھٹکی ہوئی دنیا تک پہنچا دیں۔ آخر کار آپ نے اللہ کے حکم سے اللہ کی بندگی اور دعوتِ توحید کا ایک مرکز بنایا۔ یہ مرکز خانہ کعبہ تھا۔ جو حجاز کی بے آب و گیاہ زمین میں بنایا گیا تھا۔ آپ نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس بے آب و گیاہ زمین میں بسایا۔ تاکہ توحید کی دعوت پھیلانے اور شرک کا استیصال کرنے میں وہ باپ کے دست راست ہوں اور ان کی اولاد ان کے بعد اس عظیم کام کو سنبھالے۔

خانہ کعبہ کی تعمیر اور حج کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا۔

وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝

اور یاد کرو اس بات کو ہم نے ابراہیم کے لیے (اپنے) گھر کی جگہ مقرر کی کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور میرے گھر کو پاک رکھو، طواف کرنے والوں اور قیام رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے اور لوگوں میں حج

---

* مدرسہ جامعہ فاروقیہ صبرحد، پوسٹ صبرحد، ضلع جون پور

تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۔ مئی ۱۹۹۵ء

کے لیے آنے کی منادی کر دو۔ وہ تمہارے پاس پیدل اور چھریرے بدن اونٹنیوں پر پُر نشیب راہوں سے آئیں گے]۔

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر سے اصل اور بنیادی مقصود یہ ہے کہ وہ اللہ کی لاشریک پرستش و بندگی کا مرکز بنے اور اس کے ذریعے شرک کا استیصال ہو۔ توحید کس چیز کا نام ہے؟ اور شرک کسے کہتے ہیں؟ اس کا جاننا ایک مسلمان کے لیے ہر چیز کے جاننے سے زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ شرک کو چھوڑنے اور توحید کو اختیار کیے بغیر نہ انسان کا ایمان معتبر ہے اور نہ اس کی نجات ممکن۔ قرآن مجید میں ہے جس کا مفہوم مختصر یوں ہے کہ یقیناً اللہ اس گناہ کو (ہرگز) معاف نہ فرمائیں گے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اس کے ماسوا کوئی بھی گناہ ہو، اُسے وہ جس کے لیے چاہے گا معاف فرمادے گا اور جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے وہ گمراہی میں بہت آگے نکل جاتا ہے۔

اسی طرح سورۂ مائدہ کی آیت ہے جس کا مفہوم یہ ہے یہ حقیقت ہے جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کیا۔ اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر چکا ہے۔ ایسے شخص کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے لوگوں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

بلاشبہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ اسلام کے اہم ستون ہیں لیکن ایمان ان سے بھی اہم اور مقدم ہے۔ کیونکہ اس کی حیثیت اسلام کی بنیاد کی ہے۔ ایمان اگر صحیح نہ ہو تو کوئی عبادت اور کوئی عمل مقبول نہیں اور ایمان کے صحیح و درست ہوجانے کے بعد ہر صحیح عمل معتبر ہے۔ یہ ہے ایمان کا مقام۔

ایمان کا سب سے اہم اور سب سے بنیادی جزیہ ہے کہ انسان شرک کو چھوڑ کر توحید کی راہ اختیار کرے، یہ اسلام کا اولین تقاضا اور اللہ کی بندگی کی راہ پر پہلا قدم ہے۔ جسے اُٹھائے بغیر کوئی اگلا قدم اُٹھایا نہیں جاسکتا اور اگر اُٹھایا بھی جائے گا تو وہ خدا کی بندگی اور اس کے دین کی سمت نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے سب سے پہلے جس بات کی دعوت دی اور زندگی کے آخری لمحے تک جس چیز پر مسلسل زور دیتے رہے وہ شرک سے پرہیز اور توحید پر استقامت تھی۔ ہر نبی کی دعوت کا مرکزی نقطہ یہ تھا:

اُعبدوا اللّٰہ مَا لکم من الٰہٍ غیرہٗ

[اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں]۔

قرآن پاک کا مطالعہ کیجیے تو وہ شرک کی تردید، توحید کے اثبات اور اس کے تقاضوں کی تفصیل سے بھرا ہوا نظر آئے گا۔

اب ایک نظر یہ دیکھ لیں کہ توحید کیا ہے اور شرک کسے کہتے ہیں۔ قرآن پاک اور احادیث نبویؐ کی واضح اور روشن تصریحات سے توحید کی جو حقیقت غیر مشتبہ طور پر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا انسان کا اور اس پوری کائنات کا نہ کوئی خالق و پروردگار ہے نہ مالک و مدبر اور نہ حاکم و فرماں روا۔ اُسی ایک ہستی کے ہاتھ میں ساری کائنات کی زمام کار ہے اور اسی کا اقتدار چپے چپے اور ہر ذرّے ذرّے پر حاوی، اس کے اقتدار، اس کی حاکمیت و فرمانروائی اور اس کی ربوبیت و خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ نفع اور نقصان، خوش حالی اور بدحالی مرض و تندرستی، زندگی و موت تمام تر اُسی کے دست قدرت میں ہیں۔ اس کے سوا نہ کوئی حاجت روا و مشکل کشا ہے۔ نہ دعاؤں کو سننے اور نہ مرادوں کو پورا کرنے والا۔ نہ پرستش و بندگی کا مستحق۔ اس کے فیصلوں کو کوئی بدلنے والا اور اس کے حکم کو کوئی روکنے والا نہیں۔

مالک و فرمارو ا اور پروردگار معبود بس وہی ہے باقی سب اس کے محکوم، سب اس کی رعیت اور سب اُس کے عاجز بندے

ہیں۔ اُس ایک ہستی کے سوا کسی کے آگے سر جھکانا اور کسی کی پرستش و بندگی کرنا صحیح نہیں ہے، نہ کسی سے دعائیں مانگنا اور حاجتیں اور مرادیں طلب کرنا درست اور نہ کسی کے لیے نذریں اور منتیں ماننا روا۔ اسی کی ہدایت، ہدایت ہے۔ اسی کا دین دین ہے، اسی کا نازل کردہ قانون قانون ہے۔ بھروسا اسی پر کرنا چاہیے، خوف اسی سے کھانا چاہیئے۔ تقویٰ اسی کا اختیار کرنا چاہیے، غلامی بے چوں وچرا اسی کی ہونی چاہیے اور اسی کی رضا کو اپنی زندگی کا مقصود بنانا چاہیے۔ یہ توحید ہے اور اس کے خلاف رویہ شرک۔ اسلام کی عبادات اور اس کے ارکان اسی توحید کی یاد دہانی اور اسی حقیقت کو انسانی دل و دماغ میں پیوست و جاگزیں کرنے کے لیے ہیں۔ جیسا کہ اوپر آچکا ہے اسلام کا پہلا رکن توحید جس کی ادائگی کے بغیر کوئی شخص مسلمان شمار نہیں ہوسکتا یہ ہے کہ انسان دل کے یقین و اذعان کے ساتھ اس بات کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے بندے اور رسول ہیں۔ یہ درحقیقت اس بات کا عزم ہے کہ مومن شرک سے بچے گا۔ پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت و غلامی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا اتباع کرے گا۔

نماز اسی حقیقت کو دن میں پانچ بار پوری قوت سے یاد دلاتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ انسان کو خدا ہی کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا چاہیے۔ اسی کے آگے جھکنا اور سجدہ ریز ہونا چاہیے اور اسی کے آستانے کو اپنا قبلہ اور اپنی سجدہ گاہ بنانا چاہیے۔

حج بھی اسی حقیقت کی یاد دہانی اور اسی یقین کو پختہ کرنے کے لیے ہے۔ یہ بات شروع ہی میں آچکی ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر صرف اسی لیے ہوئی ہے کہ وہ خدا کی لاشریک پرستش و بندگی اور دعوت و توحید کا مرکز بنے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے اس گھر کی تعمیر کے وقت جو دعا کی تھی (جو کہ سورۂ ابراہیم کی آیت ۲۵ تا ۲۷) جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی کہ اے میرے رب اس علاقے کو مقام امن بنا، مجھے اور میرے بچوں کو بت پرستی سے بچا۔ اے میرے رب ان بتوں نے بہتیرے لوگوں کو گمراہ کیا ہے اور جو کوئی میرے طریقے کی پیروی کرے تو وہ میرا ہے اور جو میرے طریقے سے پھر جائے تو اے پروردگار تو غفور الرحیم ہے۔ اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد کو بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسادیا، اس لیے کہ یہ نماز قایم کریں۔

خانہ کعبہ ایک ایسی عمارت ہے جس میں نہ کوئی مزار ہے نہ کوئی تصویر، نہ کوئی مورتی اور نہ کوئی بت۔ وہ صرف اللہ کی پرستش و بندگی کی جگہ ہے جس میں کسی پرستش و بندگی کا کوئی شائبہ نہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں نے اللہ کے اس گھر کو اپنے بزرگوں اور پیغمبروں کی تصویروں اور بتوں سے بھر رکھا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ توحید کے مرکز کو شرک کی تمام آلودگیوں سے پاک کردیں۔ چنانچہ فتح مکہ کے وقت پہلا کام آپ نے یہی کیا کہ اس مرکز توحید سے شرک کی تمام آلودگیوں سے پاک کرکے اُسے توحید کا مرکز بنادیا۔ مشرکین زمانۂ جاہلیت میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ حج کرتے تھے لیکن مشرکانہ اعمال و رسوم کے ساتھ تلبیہ وہ اس طرح کرتے تھے:

لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ إِلَّا شَرِيْكًا

[میں حاضر ہوا ہوں (اے اللہ) تیرا کوئی شریک نہیں]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے نہ صرف ان تمام مشرکانہ رسوم و اعمال کو بند کردیا بلکہ مشرکین کو ان کے شرک کی وجہ سے حج کرنے ہی سے روک دیا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایھا الذین آمنوا انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا (سورۂ توبہ)

[اے ایمان والو مشرک تو سراپا نجاست ہیں، اس لیے یہ اس سال کے بعد خانہ کعبہ کے پاس نہ آنے پائیں]۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے اس فرمان کی تعمیل کی اور منادی فرمادی کہ کوئی مشرک حج کرنے نہ آئے۔ اللہ کے فرمان اور رسول پاک کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ شرک ایک ایسی گندگی ہے جس کے ہوتے ہوئے نہ صرف حج مقبول نہیں بلکہ ایسے لوگوں کو خانۂ کعبہ کے قریب جانے کا حق بھی نہیں ہے اور یہ اسی لیے کہ حج کی روح توحید ہے اور خانۂ کعبہ مرکز توحید۔

خانہ کعبہ کے ایک گوشہ میں ایک سیاہ پتھر ہے جس کو حجر اسود (سیاہ پتھر) کہتے ہیں۔ یہ پتھر کسی چیز کی مورتی نہیں اور نہ اس میں کوئی تصویر یا نقش و نگار ہیں۔ اسے چوم کر یا اس کی طرف اشارہ کرکے خانہ کعبہ کا طواف شروع کیا جاتا ہے۔ یہ محض اس لیے تاکہ واضح ہو کہ آستاں بوسی بھی خدا ہی کے لیے مخصوص ہے۔ اس پتھر کو چومنے سے کسی ناسمجھ کا ذہن بت پرستی کی طرف منتقل نہ ہو جائے۔ اس خطرے کو محسوس کرکے دین کے ایک بہت بڑے رمز شناس حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے اس بات کا یقین کے ساتھ علم ہے (اے حجر اسود) تو بس ایک پتھر ہے۔ تیرے ہاتھ میں نہ نفع ہے نہ نقصان۔ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے نہ دیکھا ہوتا تو میں ہرگز نہ چومتا۔

اسی طرح صفا اور مروہ پر چڑھنے کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اللہ کو یاد کیا اور جس کی پیروی ہر حاجی کے لیے مسنون ہے۔ یہ بھی توحید کی یاد دہانی ہوتی ہے۔

قیام عرفات میں جو حج کا اہم ترین جزو ہے اس کو بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ذکر منقول ہے اور جسے آپ نے بہترین دعا فرمایا:

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اُسی کے لیے اقتدار و فرماروائی ہے اور اسی کے لیے حمد اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (ترمذی)

اشفاق احمد عارفی*

مولانا آزاد اور سیکولرازم

مولانا ابوالکلام آزاد اور سیکولرزم کی پہلی کڑی "سیکولرزم" ہونی چاہیے۔ اس لیے ضروری ہے کہ پہلے سیکولرزم کا مفہوم متعین کر لیا جائے۔ کسی مجرد تصور کی تعریف اور ایسی جامع تعریف کرنا جس میں تمام جزئیات سمٹ آئیں، مشکل امر ہے۔ اس لیے اس کے مفہوم، عناصر اور دائرہ کار کا تعین ضروری ہے۔

کانسائز آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق سیکولرزم دنیاوی معاملات سے متعلق ہے مذہبی امور سے متعلق نہیں ہے[1]۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق سیکولرزم ایک غیر مذہبی اور مذہب مخالف رویہ اور تحریک ہے جس کو بعد میں ایک مذہبی پشت پناہی اور جواز بھی حاصل ہو گیا[2]۔ انسائیکلوپیڈیا آف امریکانا کے مطابق سیکولرزم ہر قسم کی فکری آزادی سے متعلق ایک ذہنی رویہ ہے[3]۔ سیکولرزم کی متداول اور مروّجہ تعریف اور مفہوم میں قومیت، سیاست، تہذیب و تمدن، مذہب، آرٹ، زبان و ادب اور ان کے متعلق نظریات و تصورات شامل ہیں۔ تہذیب یا کلچر کے تعلق اور علم معاشرت کے نقطۂ نظر سے اگر سیکولرزم کا دائرۂ بحث مقرر کرنا چاہیں تو بقول ڈاکٹر سیّد محمد ضیاء الدین علوی

> "علم معاشرت کے ماہرین کے خیال میں تہذیب انسانی زندگی کے ہر پہلو سے وابستہ ہے۔ اس میں مادی، سماجی، مذہبی اور ذہنی چیزیں شامل ہیں۔ مثلاً کسی ملک کے سماجی رسم و رواج، مذہبی عقائد اور اخلاقی قدریں، فنون لطیفہ، علوم اور فنون"[4]

سیکولرزم اور تعصّب عام طور پر اکثریت اور اقلیت کے درمیان مخالفت اور موافقت اور رواداری پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ایک ذہنی رویہ کی حیثیت سے اس کا ظہور ذات پات، نسل اور علاقائی سطح پر بھی ہو سکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہر سطح پر اور ہر شکل میں سیکولرزم کے داعی تھے۔ یہ ان کا کردار ہی ہے کہ وہ بلا امتیاز مذہب و ملّت اور رنگ و نسل ملک کے تمام باشندوں کے درمیان تعصب اور تنگ نظری کے بجائے رواداری، ہم آہنگی، ذہن کی کشادگی اور وسعتِ نظر پیدا کرنا چاہتے تھے اور وہ دادھا کرشنن اور ٹیگور کے حوالے سے انسانی کثرت میں وحدت پر زور دیتے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ سیکولرزم اور قومیت سے من حیث القوم مضبوط کرنا چاہتے تھے اور قومیت کو مسلمانوں کے ذہن، اُس کے عقیدے اور اس کی شخصیت کا ایک جزو لاینفک بنانا اور قومیت کے جذبے سے اُس کے دل کو گرما اور لہو کو تڑپانا چاہتے تھے۔

مولانا آزاد کے سیکولر نظریات سے بحث کرنے سے قبل قومیت اور مذہب سے اس کے تعلق کی وضاحت ضروری ہو گی۔ بقول

---

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، ۴۴ مزمل ہوسٹل، وی۔ ایم ہال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

آل احمد سرور "قومیت کا تصوّر موجودہ تصور جغرافیائی وحدت ہے لیکن قومیت صرف جغرافیے کی مرہون منت نہیں۔ اس میں تاریخ، تہذیب، اقتصادی مفاد کی وحدت بھی ضروری ہے۔ سب سے زیادہ یگانگت کے احساس کی۔ قومیں مذہب سے نہیں بنتیں وطن اور اس کی مشترکہ تاریخ و تہذیب سے بنتی ہیں۔" [شہ]

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ڈاکٹر سیّد عابد حسین کی کتاب "قومی تہذیب کا مسئلہ" پر پیش لفظ لکھتے ہوئے ہندوستانی تہذیب اور اس کے سیکولر مزاج و نظریات کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے:

"ہندوستان کی کئی ہزار سال کی تہذیبی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس میں گوناگوں کثرت کے اندر وحدت کا جو باریک رشتہ موجود ہے وہ ارباب قوت و جبر و تشدد سے نہیں بلکہ عارفوں کے وجدان سے، فلسفیوں کی فکر سے، زاہدوں کی ریاضت سے اور فن کاروں کے تخیل سے پیدا ہوا ہے اور یہی سادھن ہیں جن کے ذریعے سے اُسے زیادہ وسیع، مضبوط اور پائیدار بنایا جا سکتا ہے۔ شاید لوگوں کو تعجب ہو کہ ہماری تہذیب کی جڑیں تو روحانی قدروں میں محفوظ ہیں لیکن ہماری حکومت غیر مذہبی ہے۔ دراصل غیر مذہبی ہونے سے مراد لامذہبیت یا دہریت یا مادی راحت کو اہم سمجھنا نہیں بلکہ اس بات کا اعلان کرنا اور اس پر زور دینا کہ روحانی قدریں عالم گیر ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔" [لہ]

ڈاکٹر رادھا کرشنن کی وضاحت سے ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور سیکولرزم کے بارے میں دو اہم نکات سامنے آئے ہیں، جس کی روشنی میں مولانا کے سیکولر ذہن اور رویے کی تعمیر و تشکیل تک رسائی ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ ہندوستانی مزاج ابتدا سے عقاید و نظریات اور مذہب و معتقدات کی کثرت کے باوجود ہم آہنگی اور رواداری کی وحدت کا حامل رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کے اس مزاج کی تعمیر کسی شاہانہ، آمرانہ یا سیاسی قوت و تدبیر سے نہیں بلکہ صوفیوں، بزرگوں اور ولیوں کے ذریعے روحانی قدروں سے ہوتی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو مولانا کی شخصیت انفرادی، وراثتی اور خاندانی اعتبار سے بھی اور تہذیبی تاریخی نہج پر بھی سیکولر ہی واقع ہوئی تھی۔ اس حقیقت کے اعتراف کے لیے شواہد کی ضرورت نہیں کہ مولانا کو اپنی خاندانی روایت و وراثت اور والد کی تربیت سے روحانی اور انسانی قدروں کا وسیع سرمایہ ملا تھا جس پر ہندوستان کی کئی ہزار سال کی تہذیبی تاریخ کے مطالعہ اور انکشاف و علم نے جلا بخشی کر کے ایقان کا درجہ بخش دیا تھا جس کے ذریعہ مولانا نے مذہبی رواداری، ہم آہنگی اور سیکولرزم کا پورا فلسفہ مرتب کیا۔

ڈاکٹر سیّد عابد حسین نے اپنی تصنیف "ہندوستان قومیت اور قومی تہذیب" میں متحدہ قومیت کی چار لازمی شرائط میں جغرافیائی وحدت، معاشی وحدت، تہذیبی وحدت (نسل اور مذہب) اور لسانی وحدت (مشترکہ زبان) کو شمار کیا ہے۔ اس فہرست کی تہذیبی شق کو وسعت دے کر مذہب، نسل، آرٹ، ادب اور فنون وغیرہ تک وسیع کیا جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد کی سیکولر شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے رشید الدین خاں لکھتے ہیں:

"مولانا آزاد جن اعلیٰ سیاسی قدروں پر ایقان رکھتے ہیں وہ تھیں انسانی ہم آہنگی، مذہبی گروہوں میں صلح و آشتی، جمہوری طرزِ حکومت، انسانی حقوق، مساوات اور ہندوستان جیسے مختلف مذاہب، مختلف زبانوں اور مختلف علاقوں پر منقسم ملک کی آزادی، سالمیت اور ترقی کے لیے متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کا ایک وفاقی معاشرہ اور وفاقی طرزِ حکومت پر مبنی نظام حیات۔" [شہ]

مولانا آزاد کو اُن کی شخصیت اور فکر کے پورے پس منظر میں دیکھا جائے تو ان کار وخیالات کا ہر گوشہ سیکولر اور روادارانہ ہے۔ اتحاد و اتفاق اور ہم آہنگی اور رواداری کی اسلامی روح اور ہندوستانی روایت سے پورے طور پر باخبر تھے اور اُس کے بطن سے انھوں نے اپ مشہور "متحدہ قومیت" کا سیکولر قومی نظریہ اخذ کیا تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنے خطبہ رام گڑھ میں کیا:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کے کوئی بھی چھوٹے سے چھوٹے حصے کو بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ ایک اور بھی احساس رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوی سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔

"ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہوچکا ہے کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی روح سرزمین اس کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دُنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کا ملاپ تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا یہ اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کردیا۔"

"ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے۔ یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی۔ ہم نے دولت اس کے حوالے کردی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی، جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور مساوات کا پیام دیا۔"

"تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعوا رکھتا ہے جیسا دعوی ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک

ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں اور ہندو مذہب کے پیرو ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور باشندگان ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔

"ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے، مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ عام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹانا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب اور معاشرے کو پھر تازہ کریں جو ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیوں کہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید ۔سطر) (سطر ۷،۷،۸ کی مذہب میں ضرورت ہے مگر معاشرت میں یہ ترقی سے انکار کرنا ہے۔

"ہماری ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہے ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں، علیحدگی کا کوئی بناوٹی سا تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا دے سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔" [۵۸]

ہندوستان کی متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کو مولانا اپنے لیے اولین اہمیت بلکہ بنیادی شرط اور شرعی فریضہ قرار دیتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"________ میں اپنے لیے کوئی خدمت سمجھتا ہوں تو وہ صرف یہی ہے کہ کتاب اللہ کی طرف لوگوں کو بلاؤں۔ مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے تمام کاموں میں الگ تھلگ تھے۔ علی گڑھ کی پالیسی مسلم قومی پالیسی سمجھی جاتی تھی کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ رہیں۔ میں نے دعوت دی کہ اگر مسلمان ہندوستان کی

زندگی میں بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے عظیم الشان فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہونا چاہیے کہ اتفاق کا قدم بڑھائیں اور بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں۔ مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا ان کے مذہبی عمل سے تھا۔" [۹]

"سب سے پہلی حیثیت یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہو جائیں ـ ـ ـ ـ ـ میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری بھائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کرلیں"۔ [۱۰]

مولانا ابوالکلام آزاد کے قومی اتحاد و یک جہتی اور سیکولر نظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے سابق وزیراعظم جواہر لال نہرو نے تسلیم کیا ہے کہ:

"اس عظیم المرتبت ہندوستانی میں نئی پود کے اخذ و جذب کے واسطے بہت کچھ ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں زبردست عالم دین اور ہندوستانی اتحاد کے نمائندہ اور شارح ہیں اور ان دونوں چیزوں کے اتحاد میں انھوں نے مطلقاً دقت محسوس نہیں کی۔ ان سے کم علم لوگوں کو ہندوستانی زندگیوں کے اختلاف میں ایک باہمی آویزش نظر آتی ہے لیکن مولانا عام سطح سے بہت بلند واقع ہوئے تھے اور ان بلندیوں سے انھوں نے نہ صرف اس تنوع کے پس پردہ حقیقی اتحاد و یک جہتی کو دیکھ لیا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کرلیا ہے کہ ہندوستان اور اس کی قومی زندگی کی مختلف سمتوں کی نجات اسی یک جہتی اور اتحاد سے وابستہ ہے"۔ [۱۱]

مولانا ہندو مسلم اتحاد اور فرقہ وارانہ رواداری و یک جہتی کے اتنے زبردست حامی اور قومی نظریاتی علاحدگی کے ایسے مخالف تھے کہ انھوں نے لکھنؤ کے ایک اجتماع میں جو خالص مذہبی بنیاد پر بلایا گیا تھا۔ فرقہ واریت کی دوٹوک لفظوں میں مذمت کرتے ہوئے آئندہ اس سے محفوظ رہنے کی پرزور اپیل کی۔

"جہاں تک اس اجتماع کا تعلق ہے آپ صاف دوٹوک فیصلہ کرلیں کہ آئندہ کوئی مسلم مجلس، کوئی مسلم نظام، سیاسی میدان میں فرقہ واری بنیاد پر قایم نہ کریں گے۔ کسی مجلس کے مقصد پر فرقہ واریت کی پرچھائیں بھی نہ پڑنی چاہیے"۔ [۱۲]

مولانا سیاسی سطح پر فرقہ پرستی اور ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر سیاست میں مذہب کی آمیزش کے مخالف تھے۔ اسی لیے فرماتے ہیں:

"پولیٹکل میدان میں فرقہ پرستی ملک کے لیے بھی اور ملت کے لیے بھی زہر قاتل ہے۔ صرف ایسی فرقہ وارانہ جماعتیں ہونی چاہئیں جو مذہبی، تعلیمی اور تمدنی معاملات سے متعلق ہوں۔ یہ خانہ ضروری ہے اور اس کو لازماً بھرنا چاہیے۔ ـ ـ ـ ملک کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اور ملک کے مستقبل کی خاطر یہ ضروری ہوگیا ہے کہ فرقہ پرستی جو مذہب کے نام سے ابھاری گئی ہے، ملک کی سیاسی زندگی سے نکال دی جائے"

مولانا مذہب اور زبان و نسل کی بنیاد پر تقسیم کے قایل نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے ہمیشہ اپنے سیکولر نظریات کی تبلیغ کی اور نظریہ پاکستان اور تقسیم وطن کی زبردست مخالفت کی۔ انھوں نے مسلم لیگیوں اور پاکستان اور تقسیم کے حامیوں کو تاریخی شہادت کی روشنی میں باور کرانے

کی کوشش کی۔

" یہ صحیح ہے کہ اسلام نے ایک ایسے سماج کی تشکیل کی کوشش کی جو نسلی لسانی اور اقتصادی اور سیاسی سرحدوں سے ماورا ہے۔ تاریخ نے بہرحال یہ ثابت کر دیا ہے کہ پہلی چند دہائیوں کے بعد یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کے بعد اسلام تمام مسلم ممالک کو اسلام کی بنیاد پر ایک ریاست نہ بنا سکا۔" [۳۳]

مولانا آزاد کے سیکولر قومی نظریات پر محاکمہ کرتے ہوئے رشید الدین خاں فرماتے ہیں:

" مولانا نے پہلی جنگ عظیم کے بعد کے عالمگیر انقلابی تبدیلیوں میں ترک اور عرب قومی تحریکوں سے یہ بنیادی سبق سیکھا کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر نہیں ہوتی، بلکہ قوم کے مختلف عناصر کے امتزاج سے یہ ابھرتی ہے اور ایک نیا سیاسی شعور پیدا کرتی ہے۔ انھوں نے اس بنیادی حقیقت کو سمجھ کر یہ مان لیا کہ قومیت کی اساس مذہب اور ماورا سماجی تشخص علاقائی وحدت (TERRITORAL UNITY) اور سیکولر سیاسی محرکات پر مبنی ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ یہ اعتراض خود ان کے لیے بھی نیا تھا۔ کیوں کہ ۱۹۲۰ء تک وہ علی برادر مسلم حب الوطنی اور عالمگیر اسلامی اخوت کے قایل تھے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں سیکولر علاقہ واری قومیت کا کوئی ذکر اس وقت تک نہیں تھا۔"

مولانا نے کل ہند خلافت کانفرنس کو کانپور میں ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

" ہندوستان کے موجودہ منظر کا سب سے زیادہ دردانگیز پہلو اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب مشرقی ممالک کے موجودہ تغیرات کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے جب کہ مشرق کی تبدیلیاں آزادی اور ترقی کی طرف جارہی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ملک قدم اٹھا کر صرف تھک ہی نہیں گیا ہے بلکہ واپسی کے لیے پیچھے دیکھ رہا ہے ------ ہندوستان کی طرح شام میں بھی مختلف مذاہب اور نسل کی مشترک آبادی ہے۔ وہاں کے دروزی قبایل (DRUZE) عام مسلمان اور مسیحی جماعتیں صدیوں سے باہم دگر قتل و غارت میں سرگرم رہی ہیں۔ مسلمانوں اور مسیحیوں کے مغربی اختلافات کے لیے صرف صلیبی لڑائیوں Crusades کا افسانہ کافی ہے جس کے آٹھ خونی سیلاب اسی سرزمین میں بہہ بہہ کر خشک ہو چکے ہیں۔ تاہم آج اپنے ملک کی آزادی کے لیے ان سب کا متحدہ نعرہ ہے۔ الدین للواحد والوطن للجمہور۔ وطن سب کے لیے ہے اور ہر شخص کا دین اس کے لیے ہے۔ لیکن ہندوستان کا کیا حال ہے؟ یہ ہے کہ اس کی بہترین تعلیمی اور سیاسی پیداوار بھی آج اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں۔ ذہنی منافرت، جماعتی تعصب، فرقہ وارانہ تنگ دلی اور محکومانہ ذہنیت کے تمام مفاسد ہماری راہ بدستور روکے کھڑے ہیں۔" [۳۴]

ہندوستان میں سیکولر قدروں کی شروعات کے لیے مولانا آزاد کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

" زندگی کا دوسرا نصف جو گوناگوں تجربات اور فکری پختہ کاری کے بعد ان کے شباب کے نصف النہار میں بعمر ۳۵ سال شروع ہوا اور ۶۹ سال چھ مہینہ کی عمر میں اختتام کو پہنچا۔ انھوں نے پورا کا پورا ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ قومیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور ہندوستان قومیت کے ملے جلے ورثے کی حفاظت اور نگہداشت اور قوم کے مزاج میں جمہوری سیکولر اور وفاقی سیاسی قدروں کو پروان چڑھانے میں

صرف کردیا۔" ۳۱؎

مولانا آزاد کا غیر فرقہ وارانہ سیاسی نظریہ بھی اُن کی سیکولرزم کی ناقابلِ تردید مثال ہے۔ انھوں نے جد وجہدِ آزادی کے لیے ہندوستانی مزاج اور روایات سے ہم آہنگ جو سیاسی مہم شروع کی اس کی روح اور ضمیر سے بھی ان کے سیکولر نظریہ کا پتا چلتا ہے۔ مولانا نے غیر فرقہ وارانہ سیاست اور مشترکہ سیاسی تحریک کو اپنا شعار اور شیوہ بنایا اور آخر عمر تک اس پر زور دیتے رہے۔ یہ اُن کے سیکولر ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔

سیاست اور مذہب کی آمیزش ہو یا متحدہ قومیت مشترکہ تہذیب اور مساجد میں خطبات سیاسیہ کا جواز اور ہندو مسلم اتحاد مولانا کے تمام نظریات ان کے سیکولر نظریات کے غماز ہیں۔

سیکولرزم کی راہ میں عام طور پر علاقائیت، مذہب، نسل، زبان اور دوسرے تہذیبی و تمدنی اختلافات حائل ہوتے ہیں۔ مولانا نے خالص اسلامی اور قرآنی بنیادوں پر اس قسم کی تمام حدبندیوں کو انسان کی آپسی شناخت بتاتے ہوئے سیکولرزم اور رواداری پر زور دیا۔

" تاریخ کے ہر دور میں آپ دیکھیں گے کہ انسان نے دنیا میں بہت سی حدبندیاں قائم کی ہیں جیسے جغرافیائی حدبندی کہا جاتا ہے، یہ یورپ ہے، یہ ایشیا ہے، یہ عرب ہے یہ ہندوستان وغیرہ۔ مذہبی حدبندی ہم کہتے ہیں یہ مسلمان ہے، یہ عیسائی ہے، یہ ہندو ہے یہ سکھ وغیرہ۔

قومی حدبندی، کہا جاتا ہے یہ انگریز ہے یہ اطالین یہ ہندی وغیرہ۔

لسانی حدبندی: کہا جائے گا یہ فلاں زبان کا بولنے والا ہے، یہ فلاں زبان کا وغیرہ۔ ایسے ہی رنگ و نسل کی حدبندی وغیرہ۔

یہ تمام حدبندیاں ہماری زندگی کی قدرتی ضروریات ہیں لیکن جب تک یہ تعمیری دائرے میں رہتی ہیں، ہمارے لیے ایک بڑا سہارا بنتی ہیں اور جب یہ تخریبی رنگ اختیار کر لیتی ہیں تو گروہ انسانی کو تباہ کرنے والی اور مٹا دینے والی بن جایا کرتی ہیں۔

دنیا کی پوری تاریخ میں جب بھی ان حدبندیوں کا غلط استعمال ہونے لگتا ہے تو وہی مقاصد جو ان کے سہارے چلتے تھے، خاک میں مل جاتے ہیں۔" ۳۲؎

مولانا کے نزدیک قوم (NATION) کا تصور ایک متحدہ اور مشترکہ قومیت کا تھا اور ان کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد و اتفاق اور اشتراک و ہم آہنگی کا مکمل مذہبی اور تاریخی جواز تھا۔ اپنے قومی سیکولر نظریات کی بنیاد انھوں نے حضور صلعم کے میثاق مدینہ ۶۲۲ء پر قائم کیا اور امت کا ترجمہ (NATION) سے کیا اور آزادی کے لیے ہندوؤں سے تعاون مسلمانوں کا مذہبی فریضہ قرار دیا:

" ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی قوم اور (Nation) بن جائیں ______ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان تھی۔ اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا ہے بجنسہٖ اس کے الفاظ ہیں' انہ امۃ واحدۃ ' ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں صلح کر لیتے ہیں

اتفاق کہتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن (NATION) بننا چاہتے ہیں اور ایک قوم بننا چاہتے ہیں۔ امت کے معنیٰ ہیں، نیشن، قوم اور واحد کے معنیٰ ہیں ایک۔" [۵۱]

مولانا آزاد ہندوستان میں بھی ایک ملی میثاق کے آرزومند تھے۔ وہ ہندوستان کے سیکولر قومی نصب العین کے ہندو مسلم اتحاد و مذہبی رواداری و یگانگت پر مشتمل نظریے کو فروغ دینا چاہتے تھے، اس لیے فرماتے ہیں:

"حضرات! اس سلسلے میں مجھے یہ بھی یاد دلانے دیجیے کہ اب ہمیں اس بات میں تساہل نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان کے لیے ایک ایسا میثاق قومی تیار ہو جائے جو نہ صرف ہمارے قومی نصب العین کو ہمیشہ کے لیے صاف اور واضح کر دے بلکہ ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے باہمی علویت اور روزمرہ کے پیش آنے والے جھگڑوں کا بھی فیصلہ کر دے۔" [۵۲]

قومیت کی یہ بنیاد مولانا کے نزدیک اسلامی نظریۂ قومیت کے مغائر اور مخالف نہیں تھا۔ چنانچہ اسلام اور قومیت پر روشنی لیتے ہوئے کہتے ہیں

"نہ تو اسلام کی وسعت نظر کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ قومیت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا، نہ قومیت کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اسلامی ذہنیت کا دائرہ تنگ کیا جائے۔ یہ دونوں صورتیں افراط و تفریط میں داخل ہیں اور ہر معاملہ کی طرح یہاں بھی حقیقت افراط میں نہیں بلکہ وسط میں ڈھونڈنی چاہیے۔" [۵۳]

مولانا آزاد کے نظریات میں متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے ساتھ ساتھ سیکولر متحدہ قومی تعلیمی پالیسی کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے جس کا اظہار ۱۸ فروری ۱۹۴۷ء کو ایک پریس کانفرنس میں ہوا تھا۔ ان کے مطابق "صحیح طور پر آزادانہ اور انسانی قدروں سے بھرپور تعلیم ہی لوگوں میں زبردست تبدیلی کا باعث ہو سکتی ہے اور انھیں ترقی کی طرف لے جا سکتی ہے۔"

یہاں لفظ "آزادانہ" اور "انسانی قدروں سے بھرپور تعلیم" مولانا کے سیکولر تعلیمی نظریات کے غماز ہیں۔ مولانا ہندوستانی نظام تعلیم میں کسی مخصوص مذہب کی آمیزش کے مخالف تھے۔ اس لیے کہ آئندہ مذہب کے فروعی نزاعات ملک کے سیکولر ڈھانچے کو کمزور کر سکتے تھے۔ اس لیے مولانا نے مذہبی تعصبات سے آزاد اور ان انسانی قدروں سے بھرپور تعلیم پر زور دیا جو تمام مذہب ملک اور عقیدہ و خیالات کی اچھی قدروں پر مشتمل ہو اور ان کے درمیان آپسی قومی ہم آہنگی کو فروغ دے سکے ـــــ یہ مولانا کی تعلیمی اتحاد یا تعلیمی ہم آہنگی کی کوشش کی بہترین مثال ہے جس کے بغیر قومی یا سیاسی اتحاد و ہم آہنگی ممکن نہیں تھی۔

مولانا اپنے سیکولر تعلیمی نظریات کے ذریعے ہندوستان میں ایک تعلیمی اتحاد پیدا کر کے ایک سیکولر قدر کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ ملک کے سیکولر قومی ڈھانچے کی مضبوط اور مستحکم تشکیل کے لیے ادب، فنون لطیفہ، سائنس و ٹکنالوجی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی تمام شاخوں کے نظام کو سیکولر بنیادوں، غیر فرقہ وارانہ اصولوں، عالمی اور انسانی نقطۂ نظر کی بنیاد پر استوار کرنے پر زور دیتے رہے۔ چنانچہ اپنی ایک تقریر میں کہتے ہیں۔

"ادب، فنون لطیفہ، سائنس و ٹکنالوجی اور پیشہ وارانہ تعلیم کی تمام شاخوں کے نظام کو ایسی سیکولر بنیادوں اور غیر فرقہ وارانہ اصولوں پر قایم کرنا ہے جس میں ملک کے تمام بسنے والوں کو ایک عالمی اور انسانی نقطۂ نظر کے ساتھ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔"

اول الذکر سائنس و ٹکنالوجی اور اس کی نت نئی ایجادات و ترتیب سے مکمل ہوتا ہے، جب کہ دوسرا ادب اور فنون لطیفہ سے تشکیل و

تہذیب حاصل کرتا ہے۔ تہذیبی اور تعلیمی اعتبار سے مولانا سائنس و ٹکنالوجی اور ادب و فنون لطیفہ دونوں سطحوں پر سیکولر قومی نظریات کو فروغ دینے کی عملی کوشش کرتے رہے۔ ملک میں سائنس اور تکنیکی ترقی کے لیے جہاں آل انڈیا کونسل آف سائنس اینڈ ٹیکنیکل ایجوکیشن کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ) انڈین کونسل فار ایگریکلچرل ریسرچ اور ایٹمی ترقی کا ادارہ قائم کیا وہیں سماجی علوم کے فروغ کے لیے انڈین کاونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ اور انڈین کونسل فار سوشل سائنسز ریسرچ جیسے ادارے قائم کیے اور ان کی کارکردگی کو بنیادی انسانی جذبات، انسانی اقدار اور انسانیت کی فلاح و مفاد میں کام کرنے کا نظریہ پیش کر کے انھیں ایک سیکولر مزاج کا پابند بنانے پر زور دیا۔

مولانا کے سیکولر نظریات و خیالات میں ادب اور فنون لطیفہ کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک ادب اور فنون لطیفہ مختلف ممالک اور ہندوستان کے مختلف مذاہب و عقائد کے درمیان ہم آہنگی، رواداری اور امن و آشتی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لیے وہ قومی نظام تعلیم میں فنون، لطیفہ کو ایک خاص مقام دلانا چاہتے تھے اور اس کے بغیر کسی قومی نظام تعلیم کو مکمل خیال نہیں کرتے تھے۔

مولانا نے اپنے نظریات کو صرف نظری حیثیت سے نہیں چھوڑا بلکہ ساہتیہ اکادمی، سنگیت اور ناٹک اکادمی اور للت کلا اکادمی کی شکل میں انھیں عملی جامہ بھی پہنایا۔ ادب، رقص و موسیقی اور مصوری کی ان اکادمیوں کے سربراہ خود مولانا ہی تھے۔ انھوں نے ان اکادمیوں کا مقصد ملک کے مختلف علاقوں کے ادبی اور فنی میلانات کو سمو کر انھیں قومی سطح پر ایک نئی وحدت عطا کرنا قرار دیا۔ ہندوستان میں سیکولرزم کے عملی فروغ کی راہ میں مولانا کے یہ کارنامے ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔

مولانا اس صداقت سے باخبر تھے کہ ان سیکولر خطوط پر ملک کی ہمہ جہت ترقی اور فروغ کے لیے ملک کے ہر طبقہ کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ جس ملک اور معاشرے میں انسانیت، سیکولرزم، اتحاد اور ہم آہنگی کی بنیاد گھر آنگن اور ماں کی گود میں ڈالی جائے، آئندہ بھی کمزوری نہیں ہوتی۔ اس لیے انھوں نے مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم و تربیت پر بھی برابر توجہ دلائی۔ چنانچہ ۱۳ مارچ ۱۹۴۹ء کی ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے تعلیم نسواں کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> "تعلیم سماج کے ہر طبقے کے لیے لازمی ہے، سب کی ترقی کے لیے سب کا ہی تعلیم سے باخبر ہونا لازمی ہے۔ ترقی کے لیے تعلیم سے زیادہ اور کوئی کامیاب ذریعہ نہیں، تعلیم سب کا پیدائشی حق ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ہماری عورتیں تعلیم حاصل کرنے لگیں تو ہمارا آدھا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ کیوں کہ تعلیم یافتہ مائیں ہمارے تعلیمی نظام میں بچوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں سب سے زیادہ موثر ہوں گی۔"

مولانا سماج کے ہر طبقے میں قومی سیکولر شعور و اقدار پیدا کرنا ضروری تصور کرتے تھے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے ملک میں تعلیم بالغان اور اس کے فروغ پر زور دیا۔ وہ تعلیم بالغان کے پروگرام کے ذریعے بالغوں کو نہ صرف خواندہ بنانا چاہتے تھے بلکہ انھیں اہم اور لازمی سماجی، قومی اور سیکولر اقدار سے بھی واقف کرانے کی تمنا رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم بالغان کے تین پہلو تھے۔ خواندگی، ذہنوں کی بیداری اور ضروری حقوق و فرائض سے آگاہی۔ انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں تعلیم بالغان کے سلسلے میں کہا تھا۔

> "سماجی تعلیم اور تعلیم بالغان ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ ہمیں عوام کو اچھے شہری بنانے کے لیے نہ صرف انھیں لکھنا پڑھنا سکھانا ہے بلکہ انھیں سماجی تعلیم کے ذریعہ زندگی کی بنیادی قدروں کی طرف بھی توجہ دلانی ہے۔"

سیکولرزم اور تعصب کا تعلق صرف نظریات و تصورات اور فکر و خیال ہی سے نہیں بلکہ زبان بھی اس کے دائرے میں شامل

ہے۔لسانی فرقہ واریت اور تعصب کے اسی خوف سے مولانا نے اپنا لسانی سیکولر نظریہ پیش کیا۔

مولانا اتحاد اور سیکولرزم کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کرتے تھے۔مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی کتاب "آزاد کی کہانی" میں مولانا کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

" اگر ہم ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے ساتھ مختلف صوبوں اور حصوں کی یگانگت کا مسئلہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔میں سمجھتا ہوں کہ روز ایک نئی تفریق پرونشیل ازم کی بڑھتی جارہی ہے۔آپ یقین کیجیے کہ یہ چیز آگے چل کر انڈین نیشنلٹی کے لیے سخت مُضر ثابت ہوگی۔"

مولانا آزاد نے اس اقتباس میں جس بات کا خدشہ ظاہر کیا تھا، آج کے حالات اس کی صداقت پیش کر رہے ہیں۔وہ چاہتے تھے کہ تعلیم کے ذریعے قومیت کے تصوّر کو فروغ ملنا چاہیے۔ان کا خیال تھا کہ قومی اتحاد کی راہ میں زبان بھی اہم رول ادا کرسکتی ہے اور زبانوں کی تفریق قومی اتحاد کے تصور کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔اسی پس منظر میں انھوں نے سہ لسانی فارمولے کے ذریعہ ملک میں لسانی اتحاد اور ہم آہنگی پر زور دیا تھا۔وہ ملی جلی زبان ہندوستانی (اردو) کو ملک کی قومی زبان بنائے جانے کے حامی تھے۔ انگریزی کو بین الاقوامی زبان کے طور پر پڑھانا چاہتے تھے اور دستور میں منظور شدہ زبانوں میں سے کسی ایک جنوب کی زبان کو شمال کے لوگوں کو اور شمال کی کسی ایک زبان کو جنوب کے لوگوں کو پڑھائے جانے کی تجویز پیش کرتے تھے لیکن قومی زبان کے سلسلے میں انھیں ملک کے ہندی نواز شدت پسندوں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ملک کی قومی سرکاری زبان ہندی تسلیم کرلی گئی اور ہندوستانی زبان کے ان کے تصوّر کی شکل میں لسانی اتحاد اور ہم آہنگی کے ذریعے ملک میں قومی اتحاد کی لسانی بنیاد مضبوط اور مستحکم نہ ہوسکی۔

مولانا آزاد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے ذاتی، شخصی، سیاسی اور مذہبی نظریات اور ابتدائی خاندانی اور وراثتی ماحول و نظریات میں بعد المشرقین ہے جب کہ غور کیا جائے تو مولانا کے تمام سیاسی و تمدنی اور تہذیبی سیکولر نظریات کی مذہبی بنیاد و جواز ان کے ابتدائی خاندانی پس منظر کی پیداوار ہیں جن میں مولانا کی پرورش ہوئی تھی۔اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے آئندہ اپنے تمام سیکولر اور سیاسی نظریات کا مذہبی جواز پیش کیا۔

سیاسی زندگی اپنی مجرد شکل میں تمدنی زندگی کا ایک حصّہ ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا کے سیاسی نظریات مذہبی فکر ہی کا ایک تسلسل معلوم پڑتے ہیں۔ اخلاق و عبادات کے بعد مدنی سطح پر معاملات کے سلسلے میں اسلام جو نظریۂ حیات پیش کرتا ہے مولانا نے اس کو اپنا سیاسی نصب العین بنایا۔

مولانا کے سیاسی اور سیکولر نظریات کے اس خاندانی پس منظر کا اظہار خود ان کے اپنے اقوال سے ہوتا ہے۔اپنی خاندانی اور نسلی وراثت کے متعلق فرماتے ہیں۔

" جہاں تک طبیعت کی سیرت اور عادات و خصائل کا تعلق ہے، میں اپنی خاندانی اور نسلی وراثت سے بے خبر نہیں ہوں۔پھر انسان کی اخلاقی اور معاشرتی صورت کا قالب نسل و خاندان کی مٹی سے بنتا ہے۔۔۔۔ اپنا سُراغ کہیں نہیں ملتا۔۔۔۔۔" [۲]

مولانا نے مذہب کو اس کی روایتی شکل سے ہٹ کر حقیقی شکل میں دیکھا اور اپنی اجتہادی فکر کی بدولت روایتی مذہب کی راہ سے حقیقی مذہب تک رسائی حاصل کی۔

مولانا کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خاندانی ورثے کو تقلید نہیں بلکہ شک اور اجتہاد کی نظر سے دیکھا اور تقلید کی بندش سے آزادی کی راہ نکالی۔ باوجودیکہ ان کی تعلیم خاندان کے موروثی عقاید کے عین مطابق تھی، تقلید و توارث سے گریز اور علم و نظر نے ہی انھیں ایک نئے اور وسیع صداقت سے سرفراز کیا ــــــ اپنے اس ذہنی سفر کو خود بیان کرتے ہیں:

"انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک ۔ ۔ ۔ شک کی یہی چبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیل راہ بنی ۔ بلاشبہ اس نے پچھلے سرمایوں سے تہی دست کر دیا تھا مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی اور بالآخر اس کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزل مقصود تک پہنچا دیا۔" [۲۱]

مولانا کے لیے یقین و طمانیت کی یہی منزلِ مقصود سیکولرزم، اتحاد اور رواداری اور یک جہتی و یگانگت کی منزل تھی جس کے وہ اخیر عمر تک داعی اور مؤید رہے۔

مولانا کے فکر و نظر کے باب میں یہیں پر آکر ان کی انفرادیت واضح ہو جاتی ہے جس کی طرف انھوں نے یوں اشارہ کیا ہے:

"مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔" [۲۲]

مولانا اپنے تمام تر فکر و خیال اور نظریات کی بنیاد مذہب اور قرآن پر استوار کرتے ہیں خواہ متحدہ قومیت کا نظریہ ہو یا مشترکہ تہذیب کا مسئلہ، ہندو مسلم اتحاد ہو یا مذہبی یگانگت و رواداری۔ مولانا اپنے ہر خیال کی بنیاد قرآن اور مذہب میں تلاش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

"ہم نے تو اپنے پولیٹکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی توحیدی تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" [۲۳]

مولانا کے نظریہ جہاد اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اگر ان کی سیاسی سرگرمیوں کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ان کے سیاسی فکری نظام میں مذہب و سیاست کی ہم آہنگی اور اشتراک اور ان کے سیاسی اور سیکولر نظریات کی مذہبی بنیاد واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ان کے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ کا مطلب کفار یا غیر مسلموں سے جہاد مطلق نہیں بلکہ دفاعی جہاد ہے اور اس طرح قومی آزادی، مذہبی ہم آہنگی و رواداری اور قومی و ملکی مفاد و مصالح میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل امر بالمعروف کے زمرے میں داخل ہے۔ مولانا نے انھیں مذہبی حوالوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کو اور ہندوؤں کو انگریز کے خلاف قومی مفاد کے لیے آپس میں متحد و معاون ہونے پر زور دیا۔

رشید الدین خاں مولانا کے سیکولرزم کے مذہبی جواز پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

"مولانا آزاد کا بڑا انوکھا اور بہت اہم کام یہی تھا کہ انھوں نے روحِ اسلام کو روحِ عصر کے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور ان مثبت ترقی پسند اور صحت مند قدروں کو جیسے جمہوریت، قومی اتحاد، سیکولر سماج، عالمگیر انسانیت، بنیادی انسانی حقوق اور آزادی ملک وقوم کو اسلامی نظریہ سیاسی کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی۔" [۲۴]

آزادی کے قبل اور بعد مولانا کے مذہبی اور سیاسی تصورات و نظریات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کی سیکولر فکر کی تدریجی تبدیلی اور ترقی کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا تحریر کرتے ہیں:

"اگر ذمیوں میں ایسے اشخاص ہوں جو وطن کی مدافعت میں مسلمانوں سے زیادہ قوی ہوں یا کسی دوسری شے میں مسلمانوں سے زیادہ واقف ہوں تو امام کو ان کی رایوں سے مستفید ہونا چاہیے۔ لوگ اگر اپنی قوم کے مصالح و حقوق کے لیے اپنی قوم کی طرف سے نیابتاً ہماری مجلس میں آئیں تو کیا حرج ہے بلکہ ایسے لوگ اگر مسلمانوں کے نایب ہوں اور ان کے حقوق کی مدافعت کریں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔" [۲۵]

مولانا کے مذہبی خیالات کی سیکولر روح پر ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ خیال درست ہے

"انھوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے۔ مذہب کی روح ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے۔ مذہب کی روح خدمت کی روح ہے۔ مذہب کی روح دوسروں کے لیے اپنے کو مٹانے کی روح ہے۔ مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ ساری زندگی کی وحدت ماننے کی روح ہے۔" [۲۶]

مولانا کی سیکولرزم اور اتحادی نظریے پر بعض اوقات یہ کہہ کر نکتہ چینی کی گئی ہے یہ اُن کی وقتی اور سیاسی مصلحت کی پالیسی تھی لیکن خود مولانا کے الفاظ اس کی تردید کرتے ہیں:

"بہر حال ہندو مسلمانوں کے اتفاق کے لیے آپ کے سامنے یہ حقیقت لانا چاہتا تھا کہ اگر مسلمانوں نے محبت کا ہاتھ اپنے ہمسایوں کی طرف بڑھایا ہاتھ اپنے ہمسایوں کی طرف بڑھایا تو یہ ان کا عمل محض وقتی اور دفاعی نہیں ہے، پولیٹکل چال نہیں ہے، بلکہ ان کو یقین کرنا چاہیے کہ مسلمانوں نے محبت کا آغوش خود نہیں کھولا ہے بلکہ اُن کے خدا نے، ان کے قوانین شریعت نے بڑھوایا ہے۔ چوں کہ اس کی بنیاد شریعت پر ہے اس لیے عزیزانِ من یہ سب کچھ ترکِ موالات کے مسئلہ میں نہیں بلکہ بیس سال بیشتر بھی میرا یہی اعتقاد تھا۔" [۲۷]

بعض اوقات مولانا کی سیاست اور مذہب کی آمیزش اور مذہبی اپیل پر یہ کہہ کر نکتہ چینی کی گئی ہے کہ مولانا سیاست کو مذہب کے رنگ میں نہیں دیکھتے بلکہ مذہب کو سیاسی تصور سے پرکھتے تھے۔ حالانکہ وسیع النظری کے ساتھ دیکھا جائے تو اس کی مثال دنیا کے مختلف ممالک میں برپا عظیم سیاسی و سماجی تحریکوں اور انقلابوں میں بھی مل سکتی ہے۔ خصوصاً مشرقی ذہن اور مزاج کسی بھی تحریک کو مذہب سے الگ مجرد شکل میں قبول اور برداشت کرنے کا عادی ہی نہیں رہا ہے۔ اس سے پہلے ہندوستان ہی میں سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک بھی مذہب ہی کے سہارے چل سکی تھی جس کے نتیجے میں سرسید کو مذہبی قیل و قال میں بھی پڑنا پڑا تھا۔ اسی طرح مولانا کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے محض سیاسی بنیادوں پر تحریک چلانا ممکن ہی نہیں تھا۔ سرسید کے اثرات سے قطع نظر یہ وقت کی ضرورت اور تقاضے کے ساتھ ساتھ خود مولانا کے مزاج اور ان کی ذہنی تربیت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے بھی اپنے پورے سیاسی اور سیکولر فکر اور فلسفے کی بنیادیں قرآن پر قایم کیں اور مذہبی اپیل سے کام لیا۔

اخیر میں مولانا کی تفسیر سورہ فاتحہ کی طرف اشارہ ضروری ہوگا جو ان کی سیکولر فکر و نظر اور روادارانہ پالیسی کا مدار و مرکز

۷۔ مولانا نے اس میں ربوبیت، عدالت دین اور صراطِ مستقیم اور اس کی تشریح کے ضمن میں اپنے سیکولر، اتحادی اور رواداری نظریات پورا پورا قرآنی اور مذہبی جواز پیش کر دیا ہے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی علمی اور فکری تاریخ میں بقائے باہم اور مذہبی آہنگی اور رواداری اور قومی اتحاد و یک جہتی کے ایک ایسے نظریے کی مدلل وکالت کی ہے جس سے بہ قول جواہر لال نہرو ہندوستان کا اسلامی ذہن اس وقت تک بالکل بیگانہ تھا۔

اس پوری بحث و تمحیص سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سلسلے میں مولانا کا ذہنی سفر مذہب کے محدود دائرے سے سیکولرزم اور رواداری کی طرف وسعت حاصل کرتا گیا اور آزادی ہند کے بعد ہندوستان کے آئین میں دستوری شکل اختیار کر کے اپنی حقیقت اور صداقت تسلیم کروا گیا۔

اسی ضمن میں اگر یہ بھی کہا جائے تو درست ہے کہ آئین کے بیالیسویں ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۶ء کے ذریعے لفظ Secular کا اضافہ مولانا کے سیکولر نظریات کے عین مطابق اور موافق تھا۔

حوالے

۱۔ ہندوستان ٹائمز ۱۵ر مارچ ۱۹۹۳ء
۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا جلد ۹، ص ۱۹
۳ انسائیکلوپیڈیا آف امریکانا۔ انٹرنیشنل ایڈیشن جلد ۲۴، ص ۵۲۱
۴ نصاب جنرل ایجوکیشن ۔۔۔ سماجی علوم "ہندوستان کا سماجی ورثہ"۔ مقدمہ از ڈاکٹر سید محمد ضیاء الدین علوی، شعبہ جنرل ایجوکیشن مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
۵۔ آل احمد سرور "ہندوستانی قومیت اور مسلمان" جامعہ، مارچ ۱۹۶۳ء
۶۔ ڈاکٹر سید عابد حسین قومی تہذیب کا مسئلہ۔ پیش لفظ ڈاکٹر رادھا کرشنن، ص ۹ - ۱۰
۷۔ رشید الدین خاں مولانا آزاد شخصیت، سیاست اور پیغام۔ ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۹ء ص ۱۲۷
۸۔ خطبات آزاد ۔۔۔۔ ص ۲۹۷ - ۳۰۰
۹۔ ظ۔ انصاری۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ذہنی سفر۔ نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۶۰
۱۰۔ خطبات آزاد۔ مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، خطبۂ صدارت مجلس خلافت آگرہ، ۲۵ر اگست ۱۹۲۱ء، ص ۴۷
۱۱ ایک غیر معمولی سیاست داں۔ جواہر لعل نہرو۔ ابوالکلام آزاد احوال و آثار، ص ۲۰
۱۲۔ خطبۂ صدارت اجتماع لکھنؤ دسمبر ۱۹۴۷ء، آثار ابوالکلام آزاد، قاضی عبد الغفار، ص ۹۱۔
۱۳۔ آزاد "ہماری آزادی" آل احمد سرور، فکر و نظر، ابوالکلام آزاد نمبر، بحوالہ ڈگلس، ص ۲۲۵
۱۴۔ رشید الدین خاں ۔ مولانا ابوالکلام آزاد، شخصیت، سیاست، پیغام۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ص ۱۰۷ ۱۰۹
۱۵۔ ایضاً ص ۲۲

۱۶۔ خطبہ "مہاتما گاندھی کی یادگار" نئی دلی، فروری ۱۹۴۸ء؛ خطباتِ آزاد، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۸۵ء؛ ص ۳۴۵ ۳۴۶

۱۷۔ خطبۂ آزاد مجلس خلافت آگرہ، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۲۱ء؛ خطباتِ آزاد، اردو کتاب گھر، کوچہ فولاد خاں، دلی، ص ۳۹۔۴۰

۱۸۔ خطباتِ آزاد۔ مرتبہ مالک رام ص ۲۱۰۔

۱۹۔ اِسلام اور قومیت۔ مضامین ابوالکلام آزاد، مرتبہ ثناءاللہ خاں، لاہور، ص ۱۴۲ ۱۴۳

۲۰۔ غبارِ خاطر۔ مرتبہ مالک رام۔ ساہتیہ اکادمی، ۱۹۸۳ء ص ۹۴۔ ۹۵

۲۱۔ ایضاً ص ۱۰۰۔۔۔۱۰۱

۲۲۔ ایضاً ص ۹۲

۲۳۔ الہلال کے مقاصد اور پولیٹیکل تعلیم (ایک خط کا جواب) الہلال جلد نمبر ۹۔ نمبر ۱، ۸ر ستمبر ۱۹۱۲ء، اتر پردیش اردو اکادمی ایڈیشن، ص ۲۰۱۔

۲۴۔ رشید الدین خاں۔ مولانا آزاد، شخصیت، سیاست، پیغام" ص ۱۲۳

۲۵ الہلال، ۱۳ر نومبر ۱۹۱۲ء مقالہ الاسلام والاصلاح۔ سررچرڈ وڈ۔

۲۶۔ ایک ہمہ گیر شخصیت، ڈاکٹر ذاکر حسین، ابوالکلام آزاد نمبر، پبلی کیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ، اولڈ سکریٹریٹ دہلی۔

۲۷ خطباتِ آزاد۔ ص ۴۲

پروفیسر عتیق احمد صدیقی *

اسکولوں کی انتظامیہ کا انحطاط

تعلیم کا مقصد نئی نسل تک صرف معلومات پہنچانا نہیں بلکہ ادب آموزی اور انسانیت سازی اس کا بنیادی مقصد ہے۔ زیرِ تعلیم طلبا کے اخلاق و عادات درست ہوں، ان کے اندر نیک صفات پیدا ہوں، وہ معاشرے کا ایک مفید حصّہ بن کر اپنے عادات واطوار کے اعتبار سے دوسروں کے لیے نمونہ ثابت ہوں اور معاشرے کے لیے رحمت بن جائیں۔ پھر یہ بھی کہ ان کی شخصیت کے جوہر کھلیں قدرت نے ان کو جو صلاحیتیں دی ہیں اُن کو نشو ونما کا موقع ملے۔ ہر طالب علم کی استعدادِ فطری کو غذا فراہم ہو اور وہ اسے مفید طور پر استعمال کر سکے۔ گویا تعلیم کے عمل میں ادب آموزی اور شخصیت سازی بنیادی شرط ہے۔ یہ ایسا کام ہے جو معاشرے کے لیے رحمت ہے۔ اسی لیے قدیم الایام میں خانقاہیں اور آشرم جو تعلیم کا مرکز ہوتے تھے ان کو بھی تقدیس کا درجہ حاصل ہوتا۔ تعلیم کے لیے جب مدرسوں کا علیحدہ سے قیام ہونے لگا تو تقدس کی یہ روایت ان کو منتقل ہو گئی۔ حکمرانوں اور صاحب حیثیت افراد نے خود مدرسے قائم کیے، ان کے ساتھ بڑی بڑی جائیدادیں منسلک کیں کہ ان کے اخراجات کی کفالت ہو سکے اور وہ آزادانہ طور پر اپنا کام انجام دے سکیں۔ آج بھی بہت سے اوقاف ان ایثار پیشہ لوگوں کے عمل خیر کی گواہی دیتے ہیں۔ مدرسے جو علم وتعلیم کے سرچشمے تھے ان کو عبادت گاہوں جیسا تقدس حاصل رہا۔ ان کے لیے کچھ کرنے، سخن وقدم اور دام ودرم سے ان کو فائدہ پہنچائے، ان کی ایک ایک اینٹ کی حفاظت کرنے اور ان کو ترقی دینے کا جذبہ ہر دل میں موجزن رہا۔

لیکن پچھلے چالیس پچاس سال میں اس تصوّر میں زبردست تبدیلی آ گئی۔ اب تعلیم ایک تجارتی تصوّر بن گیا ہے۔ جمہوری حکومت نے آئین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تعلیم کے فروغ کی اپنی کوششوں کو تیز تر کیا تو اس کے لیے سرمایہ بھی فراہم کیا۔ اس کی چمک دمک نے ایسے بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جن کو تعلیم سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ بے غرض لوگوں کے بجائے خود غرض لوگ، ایثار پیشہ کے بجائے استحصال پیشہ ان اسکولوں/کالجوں کی طرف متوجہ ہونے لگے اور تجارت کی سی چھین جھپٹ اور لوٹ کھسوٹ یہاں بھی شروع ہو گئی۔ خود اسکول/کالج کھولنا ایک نفع بخش کاروبار بن گیا۔ انتظامیہ، معلّمین اور طلبا تعلیمی اداروں کے ستون ہیں۔ تینوں ہی اس بدلے رجحان سے متاثر ہیں۔ اس وقت کی گفتگو کو ہم مسلم اسکولوں کی انتظامیہ تک ہی محدود رکھیں گے۔

گزشتہ پچاس سال کی قومی زندگی پر نظر ڈالیں تو ایک بات بہت واضح نظر آتی ہے۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار جن کو مذہب کی تائید بھی حاصل تھی، ہر شعبۂ زندگی سے ختم ہو رہی ہیں۔ ذہن کے کاروباری ہونے کی یہ منزل آ گئی ہے کہ پیسہ یا اقتدار سے ماورا ہو کر ہم کسی کام کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتے، بلکہ اقتدار بھی حصولِ زر ہی کا ذریعہ بنتا ہے۔ ملک میں سیاسی عمل نے جو رُخ

---

* سابق پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ختیار کیا ہے اس نے ہوسِ زر اور ہوسِ اقتدار کو کچھ زیادہ ہی بڑھا دیا ہے۔ اس کا اثر پوری قومی زندگی پر پڑا ہے۔ ہر شخص جلد از جلد دولت مند بن جانا چاہتا ہے۔ نیچے سے لے کر اوپر تک رشوت کی گرم بازاری ہے۔ حصولِ اقتدار کا ہر ممکن ذریعہ استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے اور اُن کے متعلقین بھی اس صورت حال کا شکار ہو گئے۔

ہر ادارے میں سیکڑوں بلکہ کہیں کہیں ہزاروں طالب علم ہوتے ہیں اور ایک اچھی خاصی تعداد تدریسی عملہ اور دیگر کارکنان کی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ادارے کی سربراہی حاصل ہو جائے (انتظامیہ مجلس کے صدر، سکریٹری یا ادارے کے منیجر وغیرہ بن جائیے) تو اُن سب پر اقتدار و اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ بہت سے وہ لوگ جو اقتدار کے دوسرے سیاسی مواقع سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے وہ اس کو غنیمت جانتے ہیں یا اس کو سیاسی اقتدار کا زینہ بناتے ہیں۔ کیوں کہ ہر سیاسی جماعت ایسے اشخاص کی تلاش میں رہتی ہے جن کے دائرۂ اثر میں کچھ لوگ ہوں۔ ایسے تمام لوگ جن کو ہوسِ اقتدار پریشان رکھتی ہے، تعلیمی اداروں کو اپنے قبضہ و تصرف میں لانا چاہتے ہیں، ان کو تعلیم سے سروکار نہیں ہوتا۔ وہ اس کے جغرافیہ سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ ان میں ایثار و خدمت کا جذبہ بھی مفقود ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں ہوسِ زر کی تکمیل یا اپنے جذبۂ حکمرانی کی تسکین۔ ادارے کے تدریسی اور غیر تدریسی عملہ کو وہ اپنا ملازم تصور کرنے لگتے ہیں۔ ان کو خویش پروری کا ایک موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ وہ ہر معاملے میں دخیل ہوتے ہیں اور تعلیم سے مس نہ ہونے کے باعث ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں جس میں تعلیم کو فروغ ملنا ممکن نہیں رہتا۔ پرنسپل اور تدریسی عملہ جس کا تعلق درس و تدریس سے ہے اس صورتِ حال پر ناگواری محسوس کرتا ہے اور پھر یہی ناگواری جھگڑوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس سے گروہ بندیوں کو پنپنے کا موقع ملتا ہے۔ پرنسپل ایک گروہ کی سرپرستی کرتے ہیں تو منیجر دوسرے گروہ کی، صدر صاحب تیسرے گروہ کی اور سکریٹری کسی چوتھے گروہ کی۔ اس طرح ادارے سے متعلق تمام لوگ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ ناگواریوں، تلخیوں اور جھگڑوں کے ماحول میں تعلیمی عمل تو مجروح ہوتا ہی ہے، ہر شخص خود مختار اور بے لگام ہو جاتا ہے۔ بے جا سرپرستیاں عملہ کے لوگوں کو خود سر بنا دیتی ہیں۔ مدرسین کی ادارے کے تعلیمی کاموں سے دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اسکول میں صرف وقت گزاری کرتے ہیں اور اسکول کے باہر ٹیوشنوں یا دوسرے کاروبار سے اپنی کمائی میں اضافہ کرتے ہیں۔

کچھ عرصے پہلے تک حکومت امداد کا کل روپیہ اسکولوں کو دے دیتی تھی۔ عملہ کی تنخواہ کی تقسیم انتظامیہ کی ذمہ داری تھی اور اسے عملہ کی تنخواہ میں کتر بیونت کا موقع مل جاتا تھا۔ رسید پر کچھ رقم ہوتی اور ملازمین کے ہاتھ کچھ اور رقم آتی۔ کبھی کبھی تنخواہ کے رجسٹر میں کچھ فرضی نام بھی ہوتے۔ یہ بددیانتی بھی تھی اور مالی استحصال بھی۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے حکومت نے تدریسی عملے کو بنک کے ذریعے براہ راست تنخواہ دینے کا طریقہ شروع کیا۔ اس سے مالی استحصال تو ختم ہو گیا لیکن ساتھ ہی عملہ اپنے آپ کو انتظامیہ کے اثر سے بھی آزاد تصور کرنے لگا اور یوں نظام میں ابتری پیدا ہو گئی۔ کام نہ کرنے کے مواقع اور روشن ہو گئے، باہمی کشمکش میں بھی اضافہ ہو گیا۔

قدیم اداروں کے ساتھ اُن کے بانیین کی وقف کردہ بہت سی املاک ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ صحرائی اور سکنائی جائدادوں کی شکل میں ہیں۔ صحرائی جائدادوں میں کہیں کاشت ہوتی ہے اور کہیں باغات ہیں۔ سکنائی جائدادوں میں دکانیں اور مکانات ہیں۔ واقفین کا مقصد یہ تھا کہ ان کی آمدنی سے ادارے کی ضرورتوں کی کفالت ہوتی رہے۔ عملہ کی تنخواہیں دی جائیں، تعمیرات کا کام ہو، عمارت کی تجدید کاری ہو، ترقیاتی کام ہوں، نادار طلبا کی مدد کی جائے اور دیگر تمام اخراجات پورے ہوں۔ جن اداروں کو حکومت کی امداد ملنے لگی ہے (اور بیشتر اداروں کو مل رہی ہے) وہ تنخواہ کے بارے میں سبکدوش ہو گئے۔ صرف تعمیرات، دیگر ترقیاتی کام اور متفرق اخراجات کا معاملہ باقی رہا۔ جن کے لیے ان جائدادوں کی آمدنی بہت کافی ہو سکتی تھی۔ بڑھتی ہوئی معیشت اور بدلتے

ہوئے معاشرے کے ساتھ اب جائدادوں کی قیمتیں آسمانوں کو چھونے لگی ہیں۔ شہری جائداد کی مانگ بڑھ رہی ہے اور اسی کے ساتھ خود غرض اور ہوس پرست لوگوں کے دلوں میں لالچ کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ ایک مرتبہ ایسے کسی ادارے کی انتظامیہ پر قابض ہو جائیں تو پھر اس سے متعلق جائداد سے متمتع ہونے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے۔ منتظمہ کی ذمہ داری تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ وہ ان جائدادوں کی حفاظت اسی طرح کریں جیسے اپنی ذاتی جائدادوں کی کرتے ہیں، ان سے حاصل ہونے والے منافع کو بڑھانے کی کوشش کریں اور ان کو ادارے کی بہتری کے لیے استعمال کریں لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ یا تو منتظمین کی بے توجہی کی وجہ سے دوسرے ان جائدادوں کو ہڑپ کر رہے ہیں یا خود منتظمہ ہی ان کو ذاتی فائدے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ ایک صاحب جو ایک اسکول کے بیس پچیس سال سے منیجر بنے بیٹھے ہیں، اس کی کاشت کی زمینوں کو اپنی زمینوں کے ساتھ ملا کر استعمال کر رہے ہیں۔ اسکول کی عمارت خستگی اور بوسیدگی کا شکار ہے مگر ایک اینٹ بھی نہیں رکھی جاتی۔ لیباریٹری اور لائبریری کا نام صفر ہے اور کسی کی مجال نہیں جو اُن سے بازپرس کر سکے یا ان کو اس منصب سے ہٹا سکے۔

اداروں کے ساتھ وابستہ شہری جائدادوں کو زیادہ سود مند بنانے کے لیے دکانیں بنانے کا رواج ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی پگڑی کی رسم چل پڑی ہے۔ تعمیر سے پہلے ہی متوقع کرایہ داروں سے ہزارہا روپیے لے لیے جاتے ہیں۔ یہ سب "زیر دست" معاملے ہوتے ہیں اور اس میں ہیر پھیر کے بڑے مواقع ہیں۔ ان مواقع کو "حوصلہ مند" لوگ کیوں ہاتھ سے جانے دیں گے!

اب یہ جائدادیں، یہ سرمایہ یا سرمایہ افزائی کے ذریعے، جاہ و منصب کے وسیلے اور اختیار و اقتدار کے مواقع "طالع آزماؤں" کے لیے وجہ کشش بنے ہوئے ہیں۔ قوت بازو اب سکۂ رائج الوقت ہے۔ دھونس، دباؤ، تگڑم، سیاسی جوڑ توڑ، مکر و فریب غرض ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے خود غرض لوگ ان اداروں کی انتظامیہ پر قابض ہوتے جا رہے ہیں اور ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ حال ہی میں خبر آئی کہ سہارنپور کے انڈسٹریل مسلم گرلز انٹر کالج میں ۲۵ لاکھ روپیے کا غبن ہوا اور کالج کے منیجر، صدر، خزانچی اور دیگر عہدے داروں پر روپیہ خرد برد کرنے کے الزام میں مقدمہ دائر کر دیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے اثرات سے کام لے کر اپنی گرفتاری کو رکوا دیا ہے۔ یہ تو ایک مثال ہے جہاں راز طشت از بام ہو گیا، ورنہ بیشتر اداروں میں اسی طرح خرد برد گول مال اور مالی بدعنوانیاں دھڑلے سے ہو رہی ہیں۔ استثنائی صورتوں میں ہی شاید کسی انتظامیہ کو ادارے کی فلاح، اس کی ترقی اور اس کے تعلیمی نظام نیز تعلیمی معیاروں کی بہتری سے کوئی سروکار ہو۔ جب مفادات کا تصادم ہوتا ہے تو باہمی جھگڑے شروع ہوتے ہیں۔ تمتع کے ان وسائل پر مختلف افراد قابض ہونا چاہتے ہیں۔ جائز و ناجائز ہر طرح سے قوت آزمائی کرتے ہیں جس کا منفی اثر اداروں پر پڑنا لابدی ہو جاتا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں جمشید پور (بہار) کے ایک اردو میڈیم اسکول میں ایسے ہی جھگڑوں میں دو افراد کا قتل ہو گیا کہ اسکول کے پاس پانچ لاکھ روپیے کے قریب رقم پس انداز تھی۔ سوال یہ تھا کہ اس پر تصرف کس کا ہو۔ جھگڑا بڑھا، دو قتل ہوئے، اسکول بند ہو گیا۔ اس کے طلبا کا کم از کم ایک سال برباد ہونا تو یقینی ہو گیا۔ یہ ایک انتہائی شکل ہو سکتی ہے لیکن بے شمار اداروں میں آپسی تنازعات کے نتیجے میں انتظامیہ کے اراکین ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ عدالتوں میں مقدمے قائم ہیں۔ انانیت اور خود غرضیاں مسائل کو حل ہونے نہیں دیتیں۔ ایسی صورت میں حکومت کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ ان متصادم و متحارب گروہوں کو طاق پر بٹھائے اور خود ان اداروں کا انتظام سنبھالے۔ مغربی اتر پردیش کے بہت سے اضلاع میں متعدد مسلم اقلیتی اداروں کی انتظامیہ معطل اور سرکاری افسران نگراں مقرر ہیں۔ اس سے خود اقلیتی اداروں کی حیثیت مجروح ہوتی ہے۔

انتظامیہ کی لوٹ کھسوٹ اور اداروں کے وسائل کو خرد برد کرنے کا ایک اور شاخسانہ پیدا ہوا۔ سرکاری افسران کے دل میں

محمد زکریا ورک*

آسمانی مسافر

ایک سال قبل ۱۴ جون ۱۹۹۴ء کو مانٹریال سے ۸۰ کیلومیٹر دور ایک گاؤں سینٹ رابرٹ (St. Robert) میں ایک کسان اپنے جانوروں کی رکھوالی کر رہا تھا کہ اچانک غیر ارادی طور پر اس کی نظر آسمان کی طرف اٹھی۔ اُس نے ایک دھوئیں دار شعلہ نما کوئی چیز زمین کی طرف آتی دیکھی۔ چند لمحے بعد اُس نے ایک دھماکہ سُنا تو اُسے یوں محسوس ہوا گویا کوئی جہاز ہوا میں پھٹ گیا ہو اور وہ چیز تیز رفتاری سے زمین کی طرف آ رہی ہے۔ وہ اسے بغور دیکھ تو نہ سکا مگر چند ہی لمحوں میں اس کے گرنے کی آواز اس کو سُنائی دی۔ کچھ ہی دور پر اس نے دیکھا کہ اس کے جانور ایک دائرے کی صورت میں اکٹھے ہو کر سہمے کھڑے تھے۔ وہ اس مقام کی طرف لپکا تو اسے وہاں زمین میں ایک تازہ سوراخ نظر آیا جو قریب ۲۵ سینٹی میٹر گہرا تھا۔ سوراخ میں اسے ایک پتھر نظر آیا جو اس نے بیلچے سے باہر نکالا۔ سائز میں یہ خربوزے کے برابر تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود پتھر ہی آسمانی مسافر تھا جو ہزاروں ہزار میل کا سفر طے کر کے ابھی ابھی زمین پر گرا تھا۔

یہ شہاب ثاقب درحقیقت ایک بڑے ستارے کا حصہ تھا جو مانٹریال کی طرف آتے ہوئے ہوا میں Friction پیدا ہونے سے زبردست دھماکے سے پھٹ گیا تھا اور اس کا صرف معمولی سا حصہ زمین تک پہنچ سکا تھا۔ گاؤں کے اردگرد جب مزید ٹکڑوں کی تلاش کی گئی تو ۲۰ مزید چھوٹے چھوٹے پتھر دستیاب ہوئے تھے۔

کینیڈا کی تاریخ میں آج تک صرف بارہ واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ کسی شخص نے شہاب ثاقب گرتے دیکھا اور پھر بعد میں اسے دستیاب بھی کر لیا گیا۔ مانٹریال کے قریب جو شہاب ثاقب گرنے کا واقعہ رونما ہوا وہ شاید بیس سال میں صرف ایک دفعہ ہوتا ہے۔ آج سے چار بلین سال قبل جب سیّارے وجود میں آ رہے تھے تو اس وقت جو مادہ سیّارے بننے سے رہ گیا وہ Rubble کی صورت میں آج بھی خلاء میں موجود ہے اور وقتاً فوقتاً زمین کے اندر شہاب ثاقب کی صورت میں داخل ہوتا رہتا ہے۔

سائنس دانوں کے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ خربوزے کے سائز کے شہاب ثاقب ہماری زمین کے اندر چند گھنٹوں میں کئی ایک داخل ہوتے ہیں۔ ایسے آنے والے پتھروں کی رفتار گیارہ کیلومیٹر سے لے کر ۷۰ کیلومیٹر فی سکینڈ ہوتی ہے۔ کرۂ زمین میں داخل ہو کر جب یہ EXPLODE ہوتے ہیں تو سطحِ زمین سے اوپر فضاء میں یہ

---

* پوسٹ بکس ۲۵ء، کنگسٹن او این۔ کے ۷ ایل ۴ وی ۶، کینیڈا۔

محمد زکریا ورک ٭

خلائی جہاز سے شہر ارم کی دریافت

ہر مسلمان اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو ہمارے پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطہر قلب پر تئیس سال کے عرصے میں نازل ہوا۔ اس کا ہر لفظ ہر نقطہ محفوظ ہے اور اس کی ہر بات ہر اطلاع درست ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ الفجر میں جزیرہ عرب میں مدفون ایک شہر کا ذکر ہوا ہے جس کا نام "ارم" تھا اور جس میں عاد کی قوم آباد تھی۔ عاد قوم کی سطوت و جبروت کا ذکر قرآن پاک کی ۶۳ آیات میں گیارہ مختلف سورتوں میں ہوا ہے۔ یہ سورتیں ہجرت سے قبل مکہ کے ایام میں نازل ہوئی تھیں۔ مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمائیں۔

"اور عاد کو بھی اور ثمود کو بھی (ہماری طرف سے ایک ہلا دینے والے عذاب نے پکڑ لیا) اور (اے اہل مکہ) تم پر ان شہروں کا حال خوب ظاہر ہے۔ (۳۸ : ۲۹)

حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم عاد کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کیا تم ہر ایک اونچے مقام پر جھوٹی شہرت کے لیے یادگار عمارتیں بناتے ہو اور تم بڑے بڑے محل بناتے ہو گویا کہ تم ہمیشہ زندہ اور قائم رہو گے۔ (الشعراء) (۲۹ '۱۲۸ – ۲۶)

"اور ہم ان بستیوں کو بھی ہلاک کر چکے ہیں جو تمہارے اردگرد ہیں (۲۷ : ۴۶) الاحقاف۔

شہر ارم کا ذکر قرآن پاک میں یوں ہوا ہے۔

الم تر کیف فعل ربک بعاد ۝ ارم ذات العماد ۝ التی لم یخلق مثلها فی البلاد ۝ (۸۹:۶)

"کیا تجھے معلوم ہے کہ تیرے رب نے قوم عاد سے کیا معاملہ کیا یعنی ارم شہر والوں سے جو بڑے بڑے ستونوں والی عمارتوں میں رہتے تھے، وہ لوگ جن کے زور و قوت کے برابر کی کوئی قوم ان ملکوں میں پیدا ہی نہیں کی گئی تھی۔"

شہر ارم کی تباہی اور دنیا سے مٹ جانے کا ذکر قرآن پاک میں یوں ہوا ہے۔

ارم شہر کی دریافت

قرآن مجید میں جس میناروں والے شہر ارم کا ذکر ہوا ہے وہ موجودہ شہر شصر" (SHISR) کے نیچے مدفون تھا۔ اس بات کا انکشاف امریکہ کی اسپیس ایجنسی ناسا (NASA) کے شٹل چیلنجر (CHALLENGER) کے ریڈار امیجنگ سسٹم سے جزیرۂ عرب

٭ کنگسٹن، کینیڈا۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ مئی ۱۹۹۵ء

بالخصوص الربع الخالی کی لی جانے والی زیر زمین تصاویر سے ہوا ہے۔ اس تین ہزار سال پرانے ارم شہر کو تلاش کرنے کے لیے امریکہ کے ایک ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر جیورس ذارین (JURIS ZARIN) جو امریکہ کی میسوری اسٹیٹ یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں اور ایک دوسرے شخص نکولس کلیپ (NICHOLAS CLAPP) جو امریکہ کے ہر دلعزیز شہر لاس اینجلز میں ڈاکومنٹری فلم بناتے ہیں، کلیپ کے ایک دوست جارج ہیجز (George Hedges) جو پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں۔ موخرالذکر دو اصحاب نے مل کر اس پراجیکٹ کے لیے سرمایہ اکٹھا کیا اور دسمبر ۱۹۹۱ء میں اس شہر کے مقام کا تعین ہونے کے بعد کھدائی کا کام شروع ہوا۔

نکولس کلیپ کو اس پراجیکٹ میں دلچسپی ایک کتاب ARABIC FELIX پڑھنے کے بعد ہوئی جو ایک برطانوی مصنف اور محقق برٹرام ٹامس (BERTRAM THOMAS) نے ۱۹۳۲ء میں لکھی تھی۔ برٹرام ٹامس نے اپنی کتاب میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ عمان کے عرب بدوؤں نے اس سے شداد ابن عاد کے جنت ارضی شہر ادبار کا ذکر کیا تھا جو ریت کے نیچے کہیں مدفون تھا۔ جزیرۂ عرب کے علاقہ الربع الخالی کے جنوبی حصّہ میں ایک دفعہ سفر کے دوران عرب بدوؤں نے ٹامس کو ریت میں بنے ہوئے صدیوں پرانے راستے دکھائے تھے جو شہر ادبار کی طرف جاتے تھے مسٹر کلیپ نے کیلی فورنیا کی مشہور لائبریری HUNTINGTON LIBRARY میں محفوظ پرانے مسودات اور نقشوں سے اس بات کا تعین کر لیا کہ واقعی یہ شہر ادبار عمان ملک میں ریت کے نیچے کہیں مدفون ہے۔ اس کتابی و دستاویزی ثبوت کے ملنے پر اس نے ناسا (NASA) کی جیٹ پروپلشن لیبارٹری پاسا دینا کیلی فورنیا (Jet Propulsion Laboratory Pasodena California) کے سائنس دانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ عمان کے مخصوص علاقے کی خلائی جہاز چیلنجر کے RADAR IMAGING سے تصاویر لیں۔ چنانچہ ان تصاویر کے لینے کے بعد جب ان تصاویر کو غور سے دیکھا گیا تو ریت کے نیچے مدفون ایسے راستے ملے جو اوبار کی طرف جاتے تھے۔

مسٹر کلیپ نے جو نقشے اس مقصد کے لیے استعمال کیے ان میں مشہور یونانی جیوگرافر PTOLEMY کے نقشے بھی شامل تھے جو اس نے ۲۰۰ صدی بعد مسیح بنائے تھے۔ اس یونانی نقشہ نویس نے اپنے نقشوں میں ایک اہم تجارتی مرکز کا مقام بھی دیا تھا جس کا نام اس نے OMANUM EMPORIUM (عمان مارکیٹ) رکھا تھا PTOLEMY کے نقشے اور سٹلائٹ کے ذریعے لی جانے والی دونوں تصاویر کے مطابق اس شہر کا مقام SHISR کے نخلستان میں بنتا تھا

جب اوبار شہر کے مقام کی کھدائی کا کام شروع ہوا تو ۶۰ فٹ ریت کے نیچے مدفون ایک قلعہ دریافت ہوا جو قریب دو ہزار سال پرانا تھا۔ یہ قلعہ OCTAGONAL آٹھ سمت کا تھا جس کی دیواریں ۶۰ فٹ لمبی اور دو فٹ موٹی اور ۱۲ فٹ اونچی تھیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اوبار شہر کا ذکر مشہور کتاب الف لیلیٰ ولیلی میں بھی ہوا ہے۔ نیز مشہور زمانہ لارنس آف عریبیا نے اس شہر کا "ریت کا اٹیلان ٹس" (ATLANTIS SAND) کے نام سے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ شہر لوبان خوشبو (FRANKINCENSE) کا اپنے وقت میں عظیم الشان "شاپنگ سینٹر" تھا۔ جنوبی عمان کے علاقے الربع الخالی سے اس شہر کے جو آثار دریافت ہوئے ہیں، اس کے مطابق گھروں کی دیواریں آٹھ سمت لے کٹے ہوئے لایم اسٹون پتھروں سے بنی ہوئی تھیں۔ قلعہ کے آٹھ بلند مینار تھے جن میں سے سات میناروں کے آثار مل گئے ہیں۔ یہ مینار ریگی اینٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ گھروں میں کشادہ کمرے تھے جن میں لوبان (اگربتی کی طرح) خوشبو جلانے کے لیے چولہے بنے ہوئے تھے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ شہر ۲۸۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۱۰۰۰ بعد مسیح تک آباد رہا تھا اور اس کی تباہی کی تاریخ اغلباً

اوبار شہر کی تلاش کے لیے پراجیکٹ ۱۹۸۱ء میں مسٹر کلیپ نے شروع کیا۔ ۱۹۸۴ء میں چیلنجر سے لی جانے والی تصا سے اس کے صحیح مقام کا تعین ہوا۔ نومبر ۱۹۹۱ء میں شہر کی تلاش اور کھدائی کا کام شروع ہوا اور جنوری ۱۹۹۲ء میں شہر تلاش ناسا کے خلائی جہاز چیلنجر کے ریڈار امیجنگ سسٹم سے جو تصاویر لی گئیں ان کے مطالعہ کے لیے جس جیالوجسٹ نے سب سے زیا کام کیا اس میں ڈاکٹر رانلڈ بلام (DR. RONALD BLOM) کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس شہر کی تلاش کی کہانی، یہ دنیا سے نیست نابود کیسے ہوا اس دلچسپ داستان کا جواب مندرجہ ذیل انٹرویو سے ملتا ہے جو کینیڈا کے قومی "ریڈیو کینیڈین براڈ کاسٹنگ کارپوریشن" کے پروگرام ہوسٹ باب میکڈانلڈ نے ڈاکٹر بلام سے لیا اور ۱۶/ اپریل ۱۹۹۴ء کو ریڈیو پر نشر کیا گیا۔

باب میکڈانلڈ کے تعارفی کلمات:

سامعین آپ شاید اس بات کا یقین نہ کریں کہ خلاء اور پرانے عرب قصہ و کہانی میں ایک گہرا تعلق ہے مگر امریکہ کے خلائی جہاز چیلنجر میں موجود خلا نورد ASTRONAUT جزیرۂ عرب میں عمان کے صحرا کی طرف اپنا ۳۶ ملین ڈالر کی لاگت کا ریڈار امیجنگ سسٹم اوبار کے گم شدہ شہر کا نقشہ بنانے کے لیے استعمال کر چکے ہیں "اوبار" عرب قصص و حکایات میں محفوظ ایک شہر کا نام ہے۔ ایسا شہر جو دولت سے مالا مال ہونے کے علاوہ بدا عمالیوں اور فسق و فجور میں بھی شہرت رکھتا تھا۔ تین ہزار سال قبل یہ شہر درخت سے نکلنے والے رس "لوبان" کا بہت بڑا ٹریڈنگ سینٹر تھا۔ لوبان بطور مرہم کے استعمال ہونے کے ساتھ مُردوں کو جلانے کے رسم و رواج میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ بعض لوگ اسے بطور خوشبو (اگربتی) بھی جلاتے تھے۔ پرانے زمانے میں لوبان سونے کی طرح بہت قیمتی ہوتا تھا اور اس کی تجارت بہت نفع مند ہوتی تھی۔ یہ بات کہ آیا "اوبار" ایک حقیقت تھا یا افسانہ تاریخ داں اس بات پر بہت کچھ قلم بند کر چکے ہیں۔ چنانچہ ایک پرانے مورخ PTOLEMY نے ۲۰۰ سال بعد مسیح جو شہروں کے نقشے بنائے ان میں اس شہر کا بھی ذکر کیا ہے۔ نیز مسلمانوں کی الہامی کتاب قرآن میں بھی اس شہر کا ذکر "ارم" کے نام سے ہوا ہے۔

ایک روایت کے مطابق "اوبار" تین ہزار سال تک تجارت کا مرکز رہا مگر ۳۰۰ سال بعد مسیح کے لگ بھگ اس کا نام نشان اچانک مٹ گیا۔ بہت سے لوگوں نے اس کو تلاش کرنے کی ناکام کوششیں کی ہیں، بشمول لارنس آف عربیا کے جس نے اس شہر کو "ریت کا اٹلانٹس" کے نام سے موسوم کیا تھا مگر اس کی تلاش قسمت نے امریکہ کے ایک فلم بنانے والے ایک جیالوجسٹ اور ایک خلائی سائنس داں کے لیے لکھ چھوڑی تھی جنھوں نے اس افسانوی شہر کو خلاء سے جہاز کے ذریعے سیٹلائیٹ سے تصاویر لے کر تلاش کیا۔ ایک جیالوجسٹ جس نے اس شہر کی تلاش میں بھرپور حصہ لیا اس کا نام ڈاکٹر رانلڈ بلام ہے جو کیلی فورنیا کی جیٹ پروپلشن لیبارٹری میں کام کرتے ہیں۔

میکڈانلڈ: ڈاکٹر بلام اوبار شہر کی اصل حقیقت کیا تھی؟

ڈاکٹر بلام: اوبار ایک ایسا شہر تھا جہاں لوبان کی تجارت ہوتی تھی۔ یہاں سے اونٹوں کے کارواں لمبے سفر کے لیے روانہ ہوتے تھے گویا یہ امریکہ کے شہر سینٹ لوئیس کی طرح تھا جہاں ہر جگہ سے لوگ آتے تھے، تاکہ وہ آگے مختلف مقامات کو روانہ ہوسکیں۔ گویا اوبار ایک مرکزی مقام تھا جہاں سے لوگ دور دراز سفروں کے لیے تیاری کے بعد روانہ ہوتے تھے۔

میکڈانلڈ: کیا "اوبار" شہر صحرا کے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لیے آخری مقام تھا۔

ڈاکٹر بلام: بالکل ٹھیک۔

میکڈانلڈ: کیا اوبار ایک بہت بڑا شہر تھا؟

ڈاکٹر بلام: بذات خود یہ ایک بہت بڑا شہر نہ تھا۔ شہر کے مرکزی مقام میں ایک کنواں تھا۔ جس کے اردگرد قلعہ تعمیر تھا جس کسی کا پانی پر کنٹرول تھا وہ ہر چیز پر کنٹرول رکھتا تھا۔ کنویں کے اردگرد تاجروں کی اور مسافروں کی ایک کمیونٹی آباد تھی، جو یہاں لین دین کے لیے آتے یا کارواں میں شامل ہونے کے لیے آتے تھے تو بذات خود شہر چھوٹا تھا مگر اس میں ایک بہت بڑی عارضی آبادی مقیم رہتی تھی۔

میکڈانلڈ: یہ شہر یا نخلستان گم کیسے ہوا؟

ڈاکٹر بلام: اس کے گم ہونے کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ اوبار کا آخری بادشاہ شداد ابن عاد بہت ریاکار انسان تھا اس کے رہنے سہنے کا طریق عیاشی دولت مندوں جیسا تھا اور قرآن حکیم کی آیات کے مطابق اوبار قہر الٰہی کے تحت اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے دنیا سے نیست و نابود ہوا۔ اس کے دنیا سے مٹ جانے کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ ۳۰۰ بعد مسیح کے لگ بھگ لوبان کی تجارت ایک دم ختم ہو گئی اور اس کی قیمت بہت گر گئی تو شاید اس لحاظ سے یہ اوبار کی اقتصادی موت تھی، جب کہ انسان اوبار کے اصل مقام پہ جا کر جو بات مشاہدہ کرتا ہے اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اوبار کا مرکزی قلعہ ایک SINK-HOLE میں گر کر تباہ ہوا تھا جو کہ فی الحقیقت ان کی پانی کی سپلائی کا اصل ذریعہ تھا تو یوں کہہ لیں کہ قلعہ کا انجام تباہ کن ہوا مگر اس تباہ کن واقعہ کی اصل تاریخ ابھی تک معین نہیں ہوسکی۔

میکڈانلڈ: مجھے سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک ناسا کا سائنس داں اور جیالوجسٹ اوبار کے گم شدہ شہر کی تلاش میں کیسے شامل ہوا؟

ڈاکٹر بلام: بہت عجیب اور حیران کن طریق سے ۱۹۸۱ء میں خلائی جہاز میں جو پہلا ریڈار امیجنگ کا تجربہ ہوا تھا میں اس تجربہ میں شومئی قسمت سے شامل تھا۔ اس تجربے میں ہم نے دیکھا کہ ریڈار کے ذریعے صحارا کے ریگستان کی جو تصاویر لی گئیں اس میں ریت کے نیچے جو کچھ دفن تھا اس کی ہم منظر کشی کر سکتے تھے۔ درحقیقت ریت کے نیچے ہم آسانی سے دو میٹر تک مدفون اشیاء اور زمین کے مناظر کو بڑی آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔ جب اس تجربے کے ریزلٹ منظر عام پر آئے تو ہمیں سینکڑوں افراد کے فون آئے ان میں سے بعض ایک افراد اپنے خاندان کا چھپایا ہوا خزانہ تلاش کرنا چاہتے تھے۔ بعض افراد نے ہم سے یہ استفسار کیا کہ اگر ہم ان کو فلاں علاقے کے نیچے مدفون اشیاء کی تاریخ بتلا دیں تو باقی کا وہ خود تلاش کر لیں گے تو گویا عجیب عجیب قسم کے لوگ ہمیں فون کیا کرتے تھے۔

ان لوگوں میں سے تاہم ایک شخص جس نے ہمیں فون کیا اس کا نام نکولس کلیپ تھا جو لاس اینجلز میں فلمیں بناتے ہیں اور جو عمان ملک کا سفر کر چکے تھے ان کو اوبار شہر کے گم ہونے اور اس کے محل وقوع کا کچھ اندازہ ضرور تھا۔ ان کو یہ بھی علم تھا کہ اوبار قہر الٰہی کے مطابق نیست و نابود ہوا تھا تو ان کی تحریک پر ہمیں یہ خیال آیا کہ ہمارے پاس ٹیکنالوجی تو موجود ہے، کیوں نہ اس ٹیکنالوجی کو اس گم شدہ صدیوں

پُرانے شہر کی تلاش میں استعمال کیا جائے تو یہ ہماری اس مہم میں شامل ہونے کی وجہ تسمیہ تھی۔

میکڈانلڈ: جب خلائی جہاز کے ریڈار نے ریت کے نیچے شہر کی تصاویر لیں تو آپ نے کیا دیکھا تھا؟

ڈاکٹر بلام: ہم نے ریت کے نیچے شاہراہوں (رہائی ویز) کے آثار دیکھے جس سے ہمیں یہ احساس ہوا کہ اس علاقے میں تجارت کا ایک منظم سسٹم قایم تھا۔ شاہراہوں کا نشان ملنے سے ہماری ہمت بڑھ گئی۔

میکڈانلڈ: جب آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے شاہراہوں کے نشان دیکھے تو یہ ٹریکس کس قسم کے تھے؟

ڈاکٹر بلام: ریڈار سے لی ہوئی تصاویر کے تعبیر کرنے کے لحاظ سے ہم نے جو امیجز (IMAGES) دیکھے، وہ سیدھے خطوط کی صورت میں تھے جو ہمیں قدرتی نہ لگے بلکہ وہ ایسے راستے اور سڑکیں دکھائی دیئے جو ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتے تھے۔ یہ گویا امریکہ میں کسی شہر میں "فری وے" سسٹم کا نقشہ دیکھنے کے برابر تھا۔ جب ہم نے یہ تمام امیجز اکٹھے ملا کر رکھے تو ہمیں یہ پتا چلا کہ یہ درحقیقت ایک مرکزی مقام پر لانے والے راستے تھے CONCENTRATION POINTS جو نخلستان کے اندر موجود تھے ان مرکزی مقامات میں سے ایک مقام اوبار شہر کے بالکل اندر جا پہنچا۔ موجودہ حالات میں یہ ایک ماڈرن گاؤں ہے اور اس گاؤں میں رہنے والے افراد کو اوبار کے نیست و نابود ہونے کے قصے کا بخوبی علم ہے، لیکن ان کو یہ خبر نہ تھی کہ وہ اس عین مقام پر آباد ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اوبار صحرا کے اندر دور کہیں آباد تھا۔

میکڈانلڈ: ریڈار امیجنگ سے جو شاہراہوں کے نشانات آپ نے دیکھے کیا آج بھی وہ زیر استعمال ہیں؟

ڈاکٹر بلام: ان صحرائی سڑکوں یا شاہراہوں میں سے بہت سی اب بھی زیر استعمال ہیں۔ آج سے دو یا تین ہزار سال قبل جو صحرائی راستے لوگ استعمال کرتے تھے وہ آج بھی استعمال ہو رہے ہیں یہ درحقیقت ایک معمہ ہے۔

میکڈانلڈ: لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ صحرائی راستے درحقیقت ہزاروں سال پرانے تھے نہ کہ جدید؟

ڈاکٹر بلام: ان صحرائی راستوں کے پُرانے ہونے کی ایک دلیل یہ تھی کہ ہمیں ان شاہراہوں کے ساتھ پڑے ہوئے جو پرانے برتن، اوزار اور کھلونے ملے وہ ہزاروں سال پُرانے تھے یا یوں سمجھ لیں کہ اگر آپ کو کسی شاہراہ پر پیپسی کا کین (PEPSI CAN) ملے تو آپ مزید تلاش کریں گے تو آپ کو چھوٹے راستوں کے درمیان مزید چیزیں ملیں گی۔ پھر ہمیں ان راستوں پر پتھر کے زمانے کے اوزار بھی ملے۔ یوں اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ راستے بڑے عرصے سے موجود تھے اور یوں اس بات سے اس علاقے کی عمر کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

میکڈانلڈ: جب آپ نے اوبار شہر کے مقام کا صحیح تعین کر لیا اور جب آپ وہاں گئے تو اس جگہ کو کیسا پایا؟

ڈاکٹر بلام: قلعہ کی دیواریں دوہرے بلاک سے بنی ہوئی تھیں، اس کا بہت سا حصہ تو نیست و نابود ہو چکا تھا وہاں بہت سارے مینار بھی ہمیں ملے جو کم از کم تیس سے چالیس فٹ اونچے تھے اور جو کچھ وہاں اب موجود ہے وہ بہت خستہ حالت میں ہے مگر جو کچھ ہے وہ تحقیق کا شوق رکھنے والے شخص کے لیے کافی ہے ماہرین آثار قدیمہ اب وہاں کھدائی کا کام کر رہے ہیں۔ عمان کی حکومت نے ایک کمپنی کے ساتھ تین سال

کا معاہدہ کیا ہے۔ کھدائی کے ساتھ ساتھ بہت ساری نئی چیزیں دریافت ہو رہی ہیں، وہاں کے کنویں کا اصل مقام مل گیا ہے۔ گویا اس طرح وہاں بہت کچھ قابل دید ہے۔

میکڈانلڈ: آثار قدیمہ میں سے کیا وہاں کوئی ایسی چیز ملی ہے جس سے اندازہ ہو سکے کہ "اوبار" پر تباہی کیسے نازل ہوئی؟ یہ زمین دوز کیسے ہو گیا؟

ڈاکٹر بلام: شہر کے لیے پانی کی سپلائی ایک سنک ہول سے آتی تھی۔ شہر کے اردگرد کی زمین میں لائم اسٹون بہت تھا۔ یہ "سنک ہول" گویا لائم اسٹون میں ایک بہت بڑا گڑھا تھا یا یوں کہہ لیں کہ قلعہ کی وسیع و عریض کمپلیکس کے نیچے غار تھی جہاں سے پانی نکالا جاتا تھا۔ یہ غار اس سنک ہول میں زمین دوز ہو گئی جو پورے قلعہ کو نگل گئی ایسے واقعات فلوریڈا امریکہ میں اکثر وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں، جہاں سننے میں آتا ہے کہ فلاں کا گھر "سنک ہول" میں دھنس کر تباہ ہو گیا۔

یہ واقعہ کب ہوا اس کی تاریخ بہت اہم ہے مگر اس کا صحیح تعین ابھی تک نہیں ہو سکا۔ شاید اوبار شہر کے دنیا سے نیست و نابود ہونے یا قہر الٰہی کا مورد ہونے کا یہ ایک ذریعہ تھا، جب یہ واقعہ رونما ہوا اس وقت اگر وہاں لوگ موجود تھے تو امید ہے کھدائی کرنے پر اور بھی اسباب و اشیاء ملیں گی، اگر یہ شہر زمین میں رفتہ رفتہ دھنسنا شروع ہوا یا اس وقت زمین میں گیا جب لوگ وہاں سے بھاگ چکے تھے تو شاید وہاں "سنک ہول" کے علاقے میں کچھ بھی نہ ہو۔ بہرحال یہ ایک ایسی دل سوز کہانی ہے جو ابھی لوگوں نے سنی نہیں۔

میکڈانلڈ: ڈاکٹر بلام آپ کا بہت بہت شکریہ۔

واللہ اعلم بالصواب

1. LOST CITY OF UBAR - 16TH APRIL 1994 - CANADIAN BROADCASTING CORPORATION, TORONTO HOST: BOB MACDONALD.
2. DR. RONALD BLOM
   JET PROPULSION LABORATORY NASA.
   4800-OAKGROVE-DR PASADENA 91109-8099 USA
   PHONE 1-818-354-4681
3. UBAR FABLED LOST CITY, FOUND BY L.A TEAM THE LOS ANGELES TIMES. FEB 5, 1992 SECTION A1, A12
4. THE GLORIOUS KORAN - M. PICKTHALL PAGE 439.
5. THE WHIG STANDARD, KINGSTON, FEB 5/92 Page 17.
6. A GEOGRAPHICAL HISTORY OF QURAN
   BY SYED M.D. NADVI, 1939, LAHORE PAKISTAN.

احمد رشید (علیگ) *

تعلیم کے مقاصد اور ہندوستانی تقاضے

تعلیم کے مقاصد کے سلسلے میں اس امر پر تمام مفکرین متفق اللفظ ہیں کہ تعلیم بچہ کی مکمل شخصیت کی تعمیر و تشکیل کرتی ہے۔ شخصیت انسان کی بیرونی وضع و قطع کا ہی نام نہیں بلکہ اس کے اندرونی عوامل کے علاوہ، زندگی گزارنے کے طور طریقے، اس کے برتنے اور زندگی کے ساتھ رویہ اختیار کرنے کا فعل بھی شامل ہے۔ لاریب تاریخی تبدیلیوں، زندگی اور کائنات کے تقاضوں کے تحت تعلیم کے مقاصد بھی بدلتے رہے ہیں۔ جہاں بچہ کے اخلاق و کردار تعمیر کرنے اور ایک اچھا شہری بنانے کے لیے یہ عمل ضروری قرار دیا گیا ہے وہیں روزی اور روٹی کمانے کے لیے بچہ کو تیار کرنا بھی اس سے وابستہ کر دیا گیا ہے مگر اس کو بنیادی مقصد اس لیے قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ انسان کے ساتھ پیٹ ہے اور اس کے لیے کمانا اس کی مجبوری، اس کو بھرنے کے لیے صرف تعلیم کا یہ اصلی مقصد نہیں ہوسکتا چونکہ غیر تعلیم یافتہ ہو یا کائنات میں رہنے والے حیوانات و نباتات سب ہی مختلف ذرائع اور وسائل سے پیٹ بھر لیتے ہیں مسئلہ ہے زندگی، سماج اور کائنات کے ساتھ اپنا اعلیٰ قسم کا رویہ برتنے کا۔ اپنے گرد و پیش کے ماحول میں بہتر ربط و ضبط بنانا انسان کے لیے اس لیے ضروری ہے کیونکہ وہ اس سماج میں رہنے کے لیے محتاج ہے۔

تعلیم کے جہاں دیگر مقاصد ہیں وہاں یہ بھی ہونا چاہیے کہ انسان عمل اور رد عمل پر سوالیہ نشان لگائے۔ رد عمل، وجہ، عمل ہے لیکن عمل کے پس پشت ان اسباب اور عوامل کا پتہ لگایا جائے کہ کوئی فعل خواہ مناسب ہو یا غیر مناسب، کیوں رونما ہوا؟ حالانکہ مناسب رویوں پر سوچنے کی عام طور پر گنجائش نہیں ہوتی مگر پھر بھی انسان کی نیت اور پوشیدہ فطرت کو جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ بظاہر کوئی اچھے عمل کے پس پردہ اس کے اندر کا چالاک انسان کس طرح مخاطب کو اپنے مکر میں پھانستا ہے چونکہ یہ عمل زیادہ خطرناک ہے بہ نسبت اس مکر وہ عمل کے جس سے انسان اپنا تحفظ کر لیتا ہے۔ ہماری ملت کی بدنصیبی یہ ہے کہ سامنے بیٹھ کر اپنے اعلیٰ اخلاق و کردار کا ثبوت دیا جاتا ہے اور کمر موڑتے ہی اس کے اندر کیڑے نکالے جاتے ہیں اور بہت ہی معصوم بن کر مخاطب کو اپنے مکر و فریب کا نہ صرف شکار بنایا جاتا ہے بلکہ فخریہ انداز میں اپنی ذہانت اور سیاست کا چرچا بھی کیا جاتا ہے۔

جہاں تک دوسرے غیر مناسب رویے کی بات ہے تو انسان کی ذات سے رونما ہونے والے افعال کے پیچھے وہ عوامل

---

* سرائے رحمان، علیگڑھ

تلاش کرنا بہت ضروری ہے جس سے اس انسان کی حقیقت کا اندازہ ہو سکے تاکہ اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جاسکے۔ یہ عوامل روزانہ زندگی میں ہونے والے واقعات اور حادثات کا نتیجہ ہی نہیں ہوتے بلکہ انسان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور اس سے ظاہر ہونے والے اعمال کو سمجھنے کے لیے اس کے رابطے، گرد و پیش کا ماحول، تعلیمی اثرات، اس کا پیشہ اس کا گھریلو ماحول، جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، سماجی حالات، مذہبی اثرات کو بھی جاننا ہوگا مثلاً میر کو میر بنانے میں تاریخی حالات، سیاسی بدحالی کے علاوہ ان کی زندگی کی حرماں نصیبی نے جہاں ان کے فن شاعری کو جلا بخشی وہیں ان کے مزاج میں اس قدر چڑچڑاپن پیدا کر دیا کہ وہ صرف شاعری کے ہی ہو کر رہ گئے مگر کائنات اور انسانیت کے نہ ہو سکے اگر وہ بہترین شاعر نہ بن گئے ہوتے تو یقیناً ایک گھٹیا انسان ہو کر رہ جاتے۔ لیکن یہ ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ بڑا فنکار بڑا صنعت کار یا زندگی کا کوئی بھی اعلیٰ عہدہ حاصل کر لینے سے پہلے انسان کا صحیح معنوں میں انسان ہونا از حد ضروری ہے چونکہ کائنات کو دسترس میں لے لینا آسان ہے مگر انسانیت پر قابو پانا بہت مشکل ہے، انسانوں کو گرفت میں لینا بہت ہی آسان ہے مگر دلوں پر فتح حاصل کرنا ایک دشوار لیکن عظیم کارنامہ ہے کیونکہ اپنی خودی اور انا کو مٹانا، انکساری، خاکساری اور خلوص جیسے اعلیٰ جواہر سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا زندگی کی سب سے بڑی پیش رفت ہے تب کہیں جا کر دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے۔

ہماری ملت کی بدحالی اور پستی کی ایک وجہ اس کی اخلاقی قدروں کا انحطاط بھی ہے۔ تعلیمی تناسب میں اگر ہم نے اضافہ کر بھی لیا تو کیا تعلیم کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ تعلیم کا بنیادی مقصد مکمل شخصیت کی تکمیل میں پوشیدہ ہے۔ وہ ناخواندہ قوم، اس تعلیم یافتہ قوم سے کہیں زیادہ بہتر ہے جس کا اخلاقی سطح پر دیوالیہ نکل گیا ہو۔ کسی بھی قوم کی شناخت صرف تعلیمی ترقی نہیں ہے جس سے تکنیکی، سائنسی اور سیاسی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں لیکن اخلاقی اور نفسیاتی حدید گیوں اور کائنات کے ساتھ برتے جانے والے رویوں کا شعور پیدا نہ ہوا تو صحیح معنوں میں تعلیم کا حق ادا نہیں ہوا۔ بہت آسان ہے یہ رائے قائم کرنا کہ فلاں ساتھی بداخلاق ہو گیا ہے کیونکہ اس نے چائے نہیں پلائی۔ لیکن کیوں نہیں پلائی؟ یہ جاننے کے لیے اعلیٰ شعور چاہیے۔ کیا تعلیم اس مقصد کو پورا کر سکتی ہے؟

ہماری ملت کے اخلاقی زوال کی داستان گھر گھر دہرائی جاتی ہے مگر کیا ان عوامل اور اسباب کو تلاش کر کے پھر ان کا سدباب کیا گیا؟ آزادی سے ایک دہائی قبل اور ۹۲ء تک تاریخی، سیاسی اور سماجی اسباب کی تلاش و جستجو کیا خود ایک اہم موضوع نہیں ہے۔ اس دوران ملت کا استحصال کس کس طرح سے نہیں ہوا؟ ایک سلسلہ ہے جو آج تک جاری ہے، غیروں سے تو شکوہ کیا، اپنوں نے بھی۔ کیا ملت کی معصومیت سے سیاسی مفادات حاصل نہیں کیے؟ کیا تقسیم ملک کے موضوع پر تقسیم ملت، تقسیم خاندان، تقسیم انسانیت، کے طور پر کبھی غور کیا گیا؟ یہ موضوع سیاسی پس منظر میں فتح و شکست کی اصطلاح تو دے سکتا ہے لیکن ان آنسوؤں کو سمجھنے کا شعور نہیں دے سکتا کہ مرنے والا انسان ایک ماں کا بیٹا ہوتا ہے صرف ہندو اور مسلمان نہیں ہوتا جو ایک ہی جیسے درد زہ کی تولید ہوتا ہے اور زمین پر بہنے والا لہو کسی رام و رحیم کی تقسیم کا مکمل طور سے منکر ہوتا ہے اصل میں ہماری رائے اور فیصلے پولیس کی تفتیش یا عدالتی کارروائی کی طرح انسان کی ذات سے سرزد ہونے والے افعال و اعمال کو دیکھ کر صادر ہوتے ہیں اور یہی رویہ اسکول، کالج اور مکاتب کی درس و تدریس میں اپنایا جاتا ہے جن کے نتائج بڑے خطرناک نکلتے ہیں۔ ہمارے طلبہ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود فرسٹریشن، بے چینی اور بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے

سیاستداں، ہمارے سادہ لوح طلبہ کو سیاسی مفادات حاصل کرنے کے لیے آلہ، کار بنا کر ان کا ناجائز استعمال کرنے لگتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی روزگار سے جو جائیں تو بھی وہ ملک و قوم کے لیے مفید ثابت نہیں ہو پاتے۔ جہاں ہمارے تعلیمی نظام کی یہ خرابی ہے وہیں ہمارے جمہوری نظام کا یہ سیاہ پہلو ہے کہ پارٹی مفادات کے سامنے ہمارے رہنما ملکی مسائل کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اس وقت ملک کی بقاء اتحاد اور اس کی ترقی کا مسئلہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں ہمارے طلبہ بی۔ جے۔ پی والے کانگریسی یا مسلم لیگی تو بن جاتے ہیں لیکن ہندوستانی نہیں بن پاتے۔

موجودہ پس منظر میں ایک الزام ہے کہ مسلمان قومی دھارے سے کٹ گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کا سبب مستقل سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی استحصال ہے۔ اس کو یکساں مواقع فراہم نہ ہونا، حکومت اور سیاسی رہنماؤں کا غیر جانبدارانہ رویہ، پنجاب، کشمیر، تامل ناڈ، آسام اور بنگال کے مسائل کو ایک ہی عینک سے نہ دیکھنا ذہنی انتشار اور دل سوزی کا سبب بن جاتا ہے۔ ایک موقع پر نہرو جی نے کہا تھا کہ اکثریت میں جس دن انتہاپسندی آ گئی اس دن ہندوستان ٹوٹ جائے گا۔ اگر مسلمان قومی چشمہ سے کٹ جاتا ہے تو یہ رد عمل ہے اکثریتی طبقہ میں انتہاپسندی کے جذبہ کا۔

یہاں ایک قابل افسوس پہلو یہ بھی ہے کہ ہماری ملت کا کوئی قائد نہیں؟ لیکن کیا ہم نے کوئی قائد تسلیم کیا ہے۔ دراصل ہم اپنے قائد کا ایک مثالی تصور اپنے ذہنوں میں رکھتے ہیں۔ اس کی کوئی بھی خطا نظر انداز کرنے کو تیار نہیں ہوتے تو کیا ان حالات میں کوئی نبی یا فرشتہ اس قوم کی قیادت کرنے کے لیے زمین پر آئے گا۔

اس وسیع تناظر میں ملک کے موجودہ حالات پر غور کیا جائے تو اس کا بنیادی سبب تعلیمی پس ماندگی کے علاوہ تعلیمی نظام کی خرابی بھی ہے جو بہترین شہری اور بہترین انسان بنانے میں ناکام ہو گیا ہے۔ جب تک تعلیم Job Oriented نہیں ہوگی اس وقت تک یہ فرسٹریشن اور طلبہ کا سیاسی استحصال کیے جانے کا سلسلہ بند نہیں ہو سکتا۔

تعلیمی نظام میں Moral Education کو جو محض نمبروں تک محدود ہے عملی زندگی میں لانے کی خصوصی کوشش نہیں ہوگی اور اس کو صرف ایک مضمون کی طرح شامل رکھا گیا (جو پاس ہونے والے مقررہ نمبروں تک محدود رہا) تو طلبہ کا ذہنی انتشار ختم نہیں ہوگا۔ بے شک اساتذہ بچوں کو مضمون محنت سے پڑھاتے ہیں لیکن اس مضمون سے ان کی دلچسپی برقرار رکھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم کے سلسلے میں اساتذہ اور والدین و سرپرست وغیرہ بچوں کی دلچسپی نظرانداز کرتے ہوئے منشا کے مطابق ان کی نشو و نما کرنا چاہتے ہیں ان کو فطری طور سے پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لیے حصول علم ایک بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ بچوں کو مضمون پڑھانا ایک الگ بات ہے لیکن کسی مضمون سے دلچسپی قائم کرنا دوسری بات ہے۔ پہلی صورت میں زندگی کے تقاضے تو پورے ہو سکتے ہیں لیکن تعلیمی تقاضے پورے نہیں ہو پاتے۔ ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ تعلیم اور عملی زندگی کے درمیان میں رابطہ کچھ ٹوٹ سا گیا ہے جو کچھ کتابوں اور اسکولوں میں پڑھ کر اور ڈگریاں حاصل کر کے آتے ہیں وہ ہماری عملی زندگی سے میل نہیں کھاتا یا تو ہمارا سماج وہ نہیں ہے جو ہم پڑھ کر آتے ہیں یا جیسا ہونے کی توقع رکھتے ہیں۔ تعلیم اور سماج کے درمیان سے اس خلیج کو ختم اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک تعلیم ہماری زندگی اور سماج کے تقاضوں کو پورا نہیں کر دے گی۔ یا یہ کہ تعلیمی نظام کے مطابق سماج اور زندگی میں کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ کتنا عجیب سا لگتا ہے۔ بچہ جب یہ رٹتا ہے "جھوٹ بولنا پاپ ہے، جھوٹ بولنا پاپ ہے" مگر جب کوئی

روازے پر دستک دیتا ہے تو بچہ سے باپ کہلاتا ہے کہ کہہ دو کہ "پاپا ہیں نہیں"۔

یہ تو رہی تعلیم سے متعلق ایک بحث؟ جہاں تک مادری زبان کا معاملہ ہے تمام ماہرین تعلیم اس امر پر متفق ہیں کہ ری زبان ہی بچہ کے لیے موثر ذریعہ تعلیم ہے۔ گاندھی جی نے خصوصی طور سے مادری زبان پر زور دیا ہے۔

مادری زبان کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ زبان قوموں کی تہذیبی اور ثقافتی میراث ہوتی ہے اور اس کا تحفظ اور قی اس کے بولنے والوں کی ذمہ داری ہے۔ اردو زبان ہمارا ادبی اور مذہبی سرمایہ ہی نہیں بلکہ یہ ہماری تہذیب و تمدن کی امانت دار ہے۔ کسی بھی زبان کی بقاء اور فنا اس کے بولنے والوں پر منحصر ہے جس قدر اس زبان کو بولیں گے پڑھیں گے اور اپنی روزانہ ندگی میں استعمال کریں گے اسی قدر اس کو ترقی ملے گی۔ اردو زبان کی ترقی کے لیے حکومت پر منحصر رہنا مناسب نہیں۔ کتنے گ ہیں جو اردو رسائل، اردو اخبارات کو خرید کر پڑھتے ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو خطوط پر اردو میں پتہ لکھتے ہیں؟ حال تو ہمارا یہ ہے نہ اردو سے روزی روٹی کمانے والوں کے بچے بھی انگریزی بولتے ہیں؟ تو ہمیں کیا حق ہے کہ ہم مادری زبان کے سلسلے میں لب کشائی کریں۔؟

مختصر یہ کہ تعلیم کا مقصد صرف درس و تدریس ہی نہیں ہے بلکہ بچے کی مکمل شخصیت کی نشو و نما ہے۔ اس لیے نصابی لیم کے علاوہ ادبی، علمی، ثقافتی وغیرہ مشاغل کے بچے کی ہمہ گیر شخصیت بنانے اور سنوارنے میں بہت دخل ہوتا ہے۔ یہ مشاغل بچے کی اخلاقی قدریں، سماجی اقدار، صحت مند عادات کی نشو و نما کرنے میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں ان غیر درسی مشاغل کے ریعہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔

تعلیم کے عمومی مقاصد میں یہ شامل ہے کہ طلبہ کے اندر اپنے خیالات، احساسات کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ وہ پنی زبان کو صحت، صفائی اور شائستگی کے ساتھ تقریر و تحریر میں استعمال کرسکیں۔ اچھے ادب کے مطالعے سے زندگی کی اعلیٰ اقدار کا عرفان حاصل کر سکیں۔ اصناف سخن اور نمائندہ اسالیب سے واقف ہو کر خود بھی کوئی اسلوب بیان اختیار کر سکیں۔ اپنی ذہنی توں اور تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھا سکیں اور شعر و ادب کی ان قدروں کو جان سکیں جن سے زندگی عبارت ہے۔ زبان کی علیم کا مقصد محض زبان پر قدرت حاصل کرنا نہیں بلکہ انسان کے نقطہ نظر میں وسعت پیدا کرنا اور زندگی کے مسائل کا حل ڈھونڈنا ہے ساتھ ہی انسان کے عمل اور ردعمل کے پس پشت عناصر (Factors) کو تلاش کرنا بھی ہے۔ جن کی وجہ سے کسی ر دیا سماج سے وہ رونما ہوا۔؟

مرتبہ : ڈاکٹر مشرف علی*

اوزون چادر ــــــ اہمیت و اثرات

تقریباً بیسویں صدی کے وسط میں انگلستان کے نوبل انعام یافتہ اور بین الاقوامی شہرت کے انگریزی ادیب اور فلسفی برٹرنڈ رسل (Bertrand Russell) نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ صنعتی ترقی کے اثرات کے نتیجے میں بیسویں صدی کے اختتام پر انسان ایسی مہلک بیماریوں اور حالات میں گرفتار ہوگا جس کا نہ کوئی علاج ممکن ہوگا اور نہ اُن حالات کی کشمکش سے انسان کو نجات مل سکے گی۔ یہ بیماریاں اور حالات انسان کے اپنے ہاتھوں کے پیدا کیے ہوئے ہوں گے جو خاص کر تین باتوں کا نتیجہ ہوں گے ۔

۱- انسان حرص وہوس کی شدت میں مقید ہو کر ذہنی کشمکش میں گرفتار ہوگا اور اس سے وہ ٹینشن (Tension) کا شکار ہوگا۔

۲- انتھک کوشش و جدوجہد سے جسمانی تھکاوٹ (Fatigue) میں مبتلا رہے گا جس سے مختلف بیماریاں رونما ہوں گی ۔

۳- انسان کی مجموعی اور انفرادی حرکات سے ماحولیاتی توازن میں انتشار اور پراگندگی Pollution پیدا ہوگی۔

رسل کا کہنا تھا کہ انسان درحقیقت اپنے خود کے وجود سے غافل اور مستقبل سے لاپرواہ ہونے کی حدود کو توڑنے میں کوئی کمی نہ رکھے گا۔ رسل کی پیشین گوئیاں آج کے جائزے اور قوموں کی گوناگوں ترقی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جدوجہد کے تجزیے پر صادق آتی ہیں۔ موجودہ سائنسی ایجادات سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب انسان اپنی حیات اور موت کی اہمیت سے غافل ہو جائے گا اور وہ مصنوعی انسان روبوٹ (ROBOT) کے ذریعے اپنے سارے کام کمپیوٹر (Computer) کے توسط سے انجام دینے لگے گا۔

موجودہ حالات کے مشاہدے سے یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دوڑ ایک رُخ پر قائم ہے۔ کم و بیش دنیا کی بیشتر قوموں کا نصب العین قومی سطح پر ایک ہی ہے کہ ایک ملک دوسرے ملک کی ایجادات اور ٹکنولوجی میں دوسرے ملک پر حاوی رہے۔ اقتصادیات میں اس کی ایسی مضبوط حالت ہو کہ دوسری قوموں پر اس کی گرفت قایم رہے۔ یہ نصب العین قوموں کو خاص طور سے بڑی قوموں اور طاقتور ملکوں کو سب کچھ کرنے پر آمادہ کرتا جا رہا ہے ۔ اس نصب العین سے انسان کو نہ اپنے قیمتی وجود کی اہمیت کا احساس ہے اور نہ مستقبل کے

---

* سابق ریڈر، شعبۂ قانون، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ مئی ۱۹۹۵ء

مان کے تحفظ پر اس کی نظر ہے۔ اپنے ہر عمل کو صحیح سمجھ کر آندھی و طوفان کی طرح محرک و عمل پیرا ہے۔

مذکورہ نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ترقی یافتہ ملکوں نے خاص طور پر اور اُن کی تقلید میں ترقی پذیر ممالک نے بھی بڑی مشینوں ایجاد کو لازم تصوّر کر کے بڑے بڑے کارخانے قایم کیے۔ کیوں کہ ان صنعتی کارخانوں اور بڑی مشینوں کی ایجاد سے ہی ایک ملک سرے ملک پر حاوی ہونے میں کامیاب ہو سکے گا۔ ماحولیاتی ادب میں ان بڑے کارخانوں کو سبز گہواروں یا خانہ سبز سے تشبیہ دیتے ں اور ان کارخانوں سے مسلسل خارج ہوتی رہنے والی زہریلی گیسیں فضا میں شامل ہو کر ماحولیاتی توازن پر اثر انداز ہو کر اس کو دہ کرتی ہے یا ان کو قدرتی اجزا کو توڑ کر دوسری شکل اختیار کرتی ہے۔ اِس اثر کو سبز گہواروں کے اثرات (Green House Effect) کہتے ہیں۔ سبز گہواروں یا خانہ سبز کی مثال ماحولیاتی ادب میں اس لیے مروج ہوئی کہ سبز گہوارے اُن شیشے کے کمروں کے داخلی اور خارجی درجۂ حرارت کے مشابہ ہیں جن میں سبز پودے اگائے جاتے ہیں۔ ان کمروں میں سورج کی شعاعیں خل ہو کر اس کے اندر کے درجۂ حرارت پر اثر ڈالتی ہیں مگر جو گرمی اس میں پیدا ہوتی ہے وہ منعکس (Reflect) و کر باہر نہیں جا پاتی۔ کیوں کہ شیشے یا پلاسٹک کی بنی چھت گرمی کو باہر جانے سے روک لیتی ہے جس کے نتیجے میں اس کے اندر کی فضا گرم رہتی ہے۔ سورج کی شعاعوں سے زمین گرم ہوتی ہے اور وہ گرمی منعکس ہو کر فضا میں پھیل جاتی ہے۔ اگر ان دونوں تناسب برابر ہے تو زمین کے درجۂ حرارت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور پورے ماحول اور زمین کا درجۂ حرارت متوازن رہے ۔ اس کے برعکس سورج کی شعاعوں سے پیدا شدہ گرمی زمین پر قایم ایسے کارخانے، جن سے مختلف گیسیں نکلتی رہتی ہیں، شامل ہو کر اوپر جانے سے رُک جائیں جیسا گرین ہاؤس یا خانہ سبز میں ہوتا ہے تو زمین کا درجۂ حرارت اوسط سے بڑھ جائے اور سورج کی شعاعوں کی گرمی ان کارخانوں سے نکلتی گیسوں کی گرمی دونوں کا درجۂ حرارت اتنا ہو سکتا ہے کہ زمین اور اس کے اوپر کی فضا انتہائی گرم رہے۔ زمین کی اس گرمی کو گلوبل وارمنگ (Global Warming) کہتے ہیں۔ گلوبل وارمنگ کے دو واضح نتائج ہوں گے۔ پہلا یہ کہ انسانی صحت اور زراعت پر اس کا مضر اثر پڑے گا۔ دوسرا یہ کہ زمین کی فضا گرم ہونے سے قطب شمالی اور قطب جنوبی کی منجمد برف پگھلنا شروع ہو گی جس سے سمندر کی اوسط سطح میں اضافہ ہوگا جس کے نتیجے میں دنیا کے وہ جزیرے یا خطّے جو سطح سمندر سے نشیب میں ہیں، غرقِ آب ہو سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر زمین کی آب و ہوا (Climate) پر اثر پڑے گا اور اس کے نتائج ہر اعتبار سے خطرناک ہوں گے۔

گہوارۂ سبز یا خانۂ سبز کے اثرات آج سارے عالم کے ماحولیاتی نظام کو متاثر اور غیر متوازن کیے ہوئے ہے۔ گہوارۂ سبز سے مسلسل نکلتی ہوئی گیسیں جن میں کاربن ڈائی آکسائڈ اور سلفر کی مقدار زیادہ ہوتی ہے جو فضا میں شامل ہوتی رہتی ہیں جن کے مضر اثرات آب و ہوا انسانی صحت اور زراعت پر پڑتا رہتا ہے۔

ماحولیاتی نظام کو متوازن رکھنے اور انسانی صحت کے تحفظ کے لیے قدرت نے بے شمار طریقے اور حکمتیں زمین کے اوپر اور فضائے بسیط میں قایم کر رکھی ہیں۔ مثلاً زمین کی سطح پر درخت، پہاڑ، دریا، چشمے وغیرہ سب انسانی صحت کے لیے قدرت نے عطا کیے ہیں جو اس کی فلاح اور صحت کے لیے مصروف ہیں۔ اسی طرح آسمان یا آفاقی ماحول میں چاند، سورج، ستارے اور اُن کی گردش انسان کی صحت کے ضامن ہیں۔

آفاق کی فضائے بسیط کے سائنسی تجزیے سے اِس کا انکشاف ہوا کہ کرۂ ارض کے اوپر کی فضا پانچ پرتوں (Layers) میں تقسیم ہے۔ پہلی پرت جو زمین سے قریب ہے جس کا فاصلہ سطح زمین سے تقریباً پچیس سے تیس کلومیٹر تک ہے۔ اِس پرت کو

ٹروپواسفیر (Tropo sphere) کہتے ہیں۔ اس کے اوپر دوسری پرت ہے جو ضخیم ہے جس کی دوری سطح زمین سے کلومیٹر تک ہے اس کو استحکامی پرت یا اسٹرٹواسفیر (Strato sphere) کہتے ہیں۔ اسٹرٹو اسفیر سے اوپر تیسری چادر زمین سے اسّی کلومیٹر کی بلندی سے شروع ہوتی ہے میزو اسفیر کہلاتی ہے۔ چوتھی پرت تقریباً چار سو پچاس کلومیٹر کے اوپر کا ہے جو تھرمو اسفیر کہلاتا ہے اور پھر اُس کے اوپر جو تقریباً نو سو کلومیٹر کرۂ زمین سے اوپر ہے اس کو اکسو اسفیر اسپیس (Space) یا خلا، کہتے ہیں۔ جہاں کی فضا نیلی اور سرد ہوتی ہے۔ یہ ساری پرتیں یا لیرس انتہائی اہم کام انجام دیتی ہیں جس کا کچھ علم انسان کو ہو چکا ہے اور بہت کچھ ان کی افادیت سے انسان ہنوز نابلد ہے۔

۱۹۸۵ء میں انگلستان کے انٹارٹیکا کا مشاہدہ کرنے والے سائنس دانوں نے گیس کی ایک پرت دریافت کی جو کرۂ ارض سے تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے پر ٹروپو سفیر کے بالائی سطح اور اسٹرٹو اسفیر کی نچلی سطح پر چادر یا اسکرین کے مانند کرۂ ارض کو غلاف کیے ہوئے ہے جس کا اہم کام سورج کی بنفشی شعاعیں (Ultra Violet Radiation) کو زمین پر آنے سے روکنا۔ اس چادر یا پرت کو اوزون لیر (Ozone Lyer) کہتے ہیں۔ مذکورہ سائنس دانوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ اس چادر میں سوراخ پڑنا شروع ہو گئے ہیں اور اس کی ضخامت کم ہوتی جا رہی ہے۔ جس سے اس کا امکان ہے کہ سورج کی انتہا مضر شعاعیں زمین پر آنا شروع ہو جاتیں۔ یعنی بنفشی شعاعیں (Ultra Violet Rays) زمین پر گرنے لگیں جن کے آنے سے انتہائی مضر نتائج رونما ہوں گے جیسے جلد کی بیماریاں، جلد کا کینسر، آنکھوں کی روشنی کا ضائع ہونا اور دیگر لاعلاج امراض جن میں انسان مبتلا ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ زراعت اور ہر جاندار پر اس کا خطرناک اثر پڑے گا۔

اوزون لیر کی اہم خاصیت یہ ہے کہ سورج کی بنفشی شعاعوں کو اپنے میں جذب کرتی ہے جس سے یہ شعاعیں زمین تک نہیں پہنچ پاتیں۔ انگلستان کے سائنس دانوں نے آگاہ کیا کہ یہ چادر اپنی ضخامت کم کرتی جا رہی ہے۔ ایک دریافت کے مطابق اگر اوزون چار یا پانچ فیصد سے بیس فی صد تک پتلی اور کمزور ہو گئی تو اگلے چالیس سال میں سورج کی بنفشی شعاعیں زمین کے آباد علاقوں پر پوری طرح گرنا شروع ہو جائیں گی جو انسانی صحت اور زراعت کے لیے انتہائی خطرناک اور مہلک ہوں گی۔

اوزون لیر کو انسان اپنے عمل سے کئی اعتبار سے نقصان پہنچا رہا ہے۔ سبز گہواروں سے مسلسل نکلتی گیسیں نیوکلیائی دھما کے سے اور اس سے کہیں زیادہ نقصان کلورو فلورو کاربن گیس سے مسلسل ہو رہا ہے۔ یہ گیس ریفریجریشن (ٹھنڈک سے ماحول کو ایک خاص درجۂ حرارت پر قائم رکھنے والی مشینیں اور ایر کنڈیشننگ (ہوا کو ایک ہی درجۂ حرارت پر قائم رکھنے کی مشین) میں سب سے زیادہ استعمال ہوتی ہیں۔ یہ گیس فضا میں شامل ہو کر ایک طویل مدت تک رہتی ہے۔ سائنسی تخمینہ کے مطابق یہ گیس ڈیڑھ سو سال سے چار سو سال تک فضا میں رہتی ہے۔ اس گیس کے فضا میں شامل ہونے اور اوپر جانے سے اوزون پرت کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے اور اس کی دبازت میں فرق آنا شروع ہو گیا ہے۔ اس گیس کا اتنا گہرا اثر اوزون پرت پر پڑتا ہے کہ اس میں سوراخ ہو جاتے ہیں جو سائنس دانوں نے دریافت کیے ہیں۔ اگر اس پرت کی حفاظت نہ کی گئی اور گہوارۂ سبز سے نکلی گیسیں اسی مقدار میں نکلتی رہیں اور ان پر قابو حاصل نہ کیا گیا اور کلورو فلورو کاربن گیس فضا میں شامل ہوتی رہی تو اوزون پرت کو زبردست نقصان پہنچے گا جس کے نتیجے میں انسان اور زراعت کو بنفشی شعاعوں کے زمین پر پڑنے سے انسان مہلک بیماریوں میں گرفتار ہو کر ہلاکت میں مبتلا ہو جائے گا

جون ۱۹۹۲ء میں ریو ڈی جنیرو میں ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں کرۂ ارض کی حفاظت پر مباحثے ہوئے۔ اس

کانفرنس میں بڑے اور ترقی یافتہ ممالک کو اوزون پرت کو نقصان پہنچانے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ کیوں کہ بڑے ملکوں ہی نے بڑے بڑے کارخانے قایم کیے ہیں جن سے زہریلی گیسیں فضا کو آلودہ کر رہی ہیں اور اوزون لیر کے نقصان پہنچنے کا سبب ہیں۔ اس کانفرنس میں ہر ملک نے اس کا اعادہ کیا کہ وہ اپنے اپنے طور پر گہوارۂ سبز کے مضر اثرات کو کم کرنے کا ایک مکمل اور جامع منصوبہ تیار کر کے عمل درآمد کرے گا۔ اس عالمی کانفرنس کی شہرت کے ساتھ یہ توقع کی گئی تھی کہ اس کانفرنس کے نتائج خاطر خواہ ہوں گے اور کرۂ ارض کے تحفظ کے پروگرام رونما ہوں گے۔ اس کانفرنس کے بعد ہر ملک کی توجہ فضائی آلودگی اور اوزون پرت کو محفوظ کرنے کی طرف ضرور ہے مگر اپنے صنعتی نظام کو قایم رکھتے ہوئے اس کی کوشش ہے کہ فضائی آلودگی پر قابو حاصل ہو جائے اور زمین کو بنفشی شعاعوں سے محفوظ رکھا جائے۔

مذہبی یا غیر مذہبی دونوں اعتبار سے انسان کا عمل پوری کائنات میں اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا بہتر عمل اس کی اپنی فلاح کا ضامن ہے اور غلط عمل اُس کے اپنے لیے مُضر اور تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ قدرت نے زمین کے اوپر اور فضائے بسیط میں جو نظم قایم کیا ہے اور جو کچھ عطا کیا ہے وہ سب انسان کے وجود کو قایم اور جاری رکھنے کے لیے بہت کافی ہے۔ مگر اس نظام کو منتشر کرنے کی ذمہ داری انسانی عمل ہی ہے۔ اس کے بہتر عمل سے قدرت کے نظام پر بہتر اثرات پڑتے ہیں اور غلط حرکات سے قدرت کا نظام متاثر ہوتا ہے اور غلط عمل سے قدرت کا نظام ٹوٹتا ہے اور مزید مسلسل غلط عمل سے قدرت کا ایک ایسا بھی مقام آسکتا ہے کہ قدرت کا نظام ایسا درہم برہم ہو جائے کہ انسان کا اپنا وجود خطرے میں پڑ جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ برٹرنڈ رسل کی پیشین گوئیاں موجودہ حالات کے مشاہدے پر صادق آرہی ہیں۔ مذہبی اعتبار سے ماحول کی آلودگی انسان، حیوانات اور زراعت کے لیے مضر اور انسان کے اخلاقی فرض کے خلاف ہے۔ ہر مذہب اس کی تائید کرتا ہے کہ ماحول کو قدرتی حالت میں قایم رکھنا انسان کا فرض ہے۔ ماحول یعنی ہوا، پانی، شجر، مٹی اور آسمانی ماحول سب انسان کی فلاح اور بہتر صحت کے لیے ہیں۔ قرآن کریم انتہائی روشن اور زرّیں الفاظ میں انسان کو مخاطب کرتا ہے کہ "ساری پریشانیاں اور تکلیفیں تمہارے اپنے ہاتھ کی پیدا کردہ ہیں"۔ زمین اور آسمان پر جو کچھ پیدا کیا گیا ہے وہ تمہاری اچھائی اور وجود کو قایم رکھنے کے لیے کیا گیا ہے۔ یہ سب تمہاری بہتر زندگی کے لیے کافی ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ 'توازن قایم رکھو'۔ یعنی انسان کو اپنے بہتر عمل میں توازن قایم رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ قناعت اور متاعِ قلیل پر بار بار توجہ دلائی ہے۔ کیوں کہ انسان کی اسی میں فلاح ہے، بقا ہے، بیماریوں سے حفاظت و نجات کے ساتھ زمین و آسمان کی ہر شے کے قدرتی تناسب کے ساتھ قایم رہنے کی ضمانت ہے مگر انسان اپنے حرص و ہوس کی شدّت میں اور اپنے نصب العین کی تحصیل کے خاطر مذہبی اور سماجی اعتبار سے ماحول کے تحفظ کے سلسلے میں تاکید کو اہمیت دینے کے بجائے جدید طریقے، سائنسی ایجادات کر کے اپنی اور ماحول کی حفاظت اور توازن کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہے جس کے نتیجے میں انسان کی فکر و پریشانیاں کم ہونے کے بجائے اور بڑھتی جارہی ہیں وہ جتنی زیادہ سائنسی ایجادات کرتا جارہا ہے اتنا ہی اس کے لیے سکون کی تلاش بڑھتی جارہی ہے بیماری، تھکاوٹ اور ذہنی کش مکش میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ آج کی ماحولیاتی پراگندگی، بڑھتی ہوئی بیماریاں اور ذہنی کشیدگی کے پیش نظر اس بات کی اہم ضرورت اور تقاضا ہے کہ دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک اپنی صنعتی سرگرمیوں کی رفتار کو کم کر کے قدرت کے نظام اور فضائی آلودگی کے تحفظ کے منصوبوں کو ترجیح دیں۔ اوزون پرت جو بنی نوع انسان، زراعت اور ہر جاندار کے لیے ایک قدرت کی طرف سے حفاظتی عطیہ ہے۔ اُس کی حفاظت آج اور مستقبل کے انسان کی صحت اور وجود کی ضمانت ہے۔ سبز گہواروں یا خانہ سبز سے نکلتی گیسیں اگر اسی مقدار میں فضا میں شامل ہوتی رہیں تو زمین کا درجۂ حرارت یقیناً بڑھے گا، جس کے نتیجے میں زمین کی آب و ہوا گرم ہوگی۔ قیاس ہے کہ گرمی کی شدّت سے آئندہ پچاس سال میں تقریباً دو لاکھ انسان سالانہ ختم ہو سکتے ہیں۔ ایسے حالات سے دوچار ہو۔ زیر پیش نظر آج کا دن 'کل' کی حفاظت کی فکر و تدبر کے لیے انتہائی قیمتی ہے۔

ریشماں وودود انصاری *

ہماری تعلیم ــــ منظر پس منظر

علم ایک ایسا لفظ ہے جس کو انسان زمانہ قدیم کے مہذب دور سے سنتا آرہا ہے اور جب تک اس دنیا میں رہے گا سنتا رہے گا۔ جس شخص نے علم کو عملی طور پر اپنالیا اس شخص نے گویا مادی اور ابدی زندگی میں کامیابی کی ضمانت حاصل کرلی۔ تاریخ نے ہمیشہ ایسے لوگوں کی سوانحی تفصیلات کو روشنی کا ذریعہ بنایا ہے۔ اجتماعی اور مذہبی طور پر علم حاصل کرنے کی ترغیب جس قدر مذہب اسلام نے دی ہے اور اس کی روشنی میں عمل کرنے کی تلقین کی ہے دنیا کے کسی اور مذہب یا جماعت نے نہیں کی۔ لیکن آج دوسری قومیں دنیا میں ترقی کے اسباب و وجوہات کو بخوبی سمجھ کر ان پر عمل کر رہی ہیں اور نتیجتاً آج پوری دنیا میں ان کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ایسے لوگ مذہب اسلام پر ایک رجعت پسندی یا تقلید پسندی کا لیبل لگاتے ہیں حالانکہ اسلام کے ماننے والوں سے ان لوگوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

آئیے اب کچھ اقوال کو نقل کرتی ہوں جو علم کا منظر پس منظر ہے۔ حضرت علی نے فرمایا کہ کتابیں اہل علم کے لیے باغات ہوتی ہیں۔ صاحب علم مر جانے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور جاہل جیتے جی مر چکا ہوتا ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ جو گمان کرتا ہے کہ وہ حصول تعلیم سے بے نیاز ہو گیا اس کو اپنے اوپر رونا چاہیے۔ اسپنسر جن کو جدید تعلیم کے معماروں میں مانا گیا ہے کا قول ہے "تعلیم انسان کے باطن اور ظاہر میں تعلق پیدا کرتی ہے"۔ ہارن نے کہا ـــ "تعلیم کے ذریعہ انسان فطرت، ماحول، دنیا اور اپنے آس پاس کے افراد کے ساتھ تعلق پیدا کرتا ہے" ایک انوکھا اور پر کشش اور دل موہ لینے والا قول مشہور ماہر تعلیم لاک کا ہے "پودے پرورش کرنے سے اچھی طرح نشو نما پاتے ہیں اور انسان تعلیم سے" اگر سبھی فلاسفر اور مفکرین کے اقوال تعلیم کے سلسلے سے نقل کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی۔ اب متذکرہ اقوال کے آئینہ میں غور کریں کہ ہماری اور ہمارے معاشرے کی تصویر کیسی ہے؟ کیا ہم اس بات کے لیے فکر مند ہیں کہ جو طالب العلم طبقہ ہے وہ علم کی بلندی پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے یا جو گارجین حضرات ہیں وہ اپنے بچوں کی تعلیم کی ضرورت کہاں تک محسوس کر رہے ہیں؟ آج عام طور پر مسلمانوں سے ایک سوال کیا جائے کہ آپ نے اپنی تعلیم کو مزید آگے کیوں نہیں بڑھایا تو صرف یہی جواب ملے گا کہ حالات اچھے نہیں تھے اور ہمارا کوئی گائڈ نہیں تھا۔ حالانکہ یہ جواب معقول نہیں ہے۔ ایک مشہور بزرگ کا ارشاد ہے کہ میں نے پانچ باتوں کو تلاش کیا تو پانچ جگہ پایا۔ ان میں سے جب علم کو تلاش کیا تو بھوک میں پایا۔ ان کا یہ ارشاد سمندر کو کوزے میں بند

---

* ندی پار، آسنول - ۲ (مغربی بنگال)

کرنے کے مترادف ہے۔ علم کی معراج کو جن لوگوں نے چھوا اور جو اپنے اپنے وقت کی قد آور شخصیت بن کر ابھرے ان میں سے بیشتر کی ابتدائی حالت مالی اعتبار سے یتیمی جیسی تھی مگر اپنی پیہم کوششوں سے وہ کامیاب ترین انسان گزرے ہیں۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو علم اور پریشانی ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ امام مالک کا قول ہے کہ علم حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اس کی راہ میں فقر و فاقہ کی لذت نہ چکھی جائے۔ امام طبرانی نے علم حدیث کی طلب میں کافی مشقت اٹھائی۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ تیس برس تک ان کو بستر میسر نہیں ہو سکا بلکہ وہ چٹائی پر سوتے تھے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر نے بڑی تکلیف سے علم حاصل کیا۔ طالب علمی کے زمانہ میں مولی کے پتے کھا کھا کر علم حاصل کیا۔ امام احمد بن حنبل کا قصہ مشہور ہے۔ ایک دن معمول کے برخلاف درس میں نہ آئے سبھی کو تشویش ہوئی کیونکہ وہ غیر حاضر کبھی نہیں ہوتے تھے، سب ساتھیوں نے حالات معلوم کیے تو پتہ چلا کہ ان کے کپڑے چوری ہو گئے اور ان کے پاس پیسے نہیں تھے کہ کپڑے خریدتے۔ ان ہی کے بارے میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں ازار بند بن بن کر اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔

اب آئیے جدید تعلیم کے بانیوں کے حالات پر بھی سرسری نگاہ ڈالی جائے۔ ہندوستان میں ایشور چندر بندو پادھیائے کے نام سے کون واقف نہیں جنہیں ودیا ساگر یعنی علم کا سمندر کا خطاب ملا ہے۔ کلکتہ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان کی زندگی بہت تکلیف اور دکھ میں گزری۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ انہیں کھانا بھی پکانا پڑتا تھا۔ برتن صاف کرنا، جھاڑو دینا، سارا کام ان کو خود کرنا پڑتا تھا۔ اسکول جاتے جاتے راستے میں سبق کی تیاری کرتے تھے۔ شوق اور محنت سے اپنی تعلیم مکمل کر کے صرف اکیس برس کی عمر میں "ودیا ساگر" کا خطاب حاصل کر لیا۔ مائیکل فراڈے جن کو برقیات کے میدان میں ایک اہم شخصیت مانا جاتا ہے ان کے بچپن کی مالی حالت یہ تھی کہ ایک جلد ساز کی دوکان پر نوکر تھے۔ اب چند ایسی ہستیوں کا ذکر کرنا ضروری ہے جنھوں نے یتیمی کی حالت میں بھی علم کے سمندر میں ایسے غوطے لگائے اور انمول و قیمتی جواہر چنے کہ آج بھی ان لوگوں کا نام نہایت عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ سر آئزک نیوٹن سے کون ناواقف ہے۔ وہ یتیم تھے۔ بنگال کے مشہور سائنسداں ڈاکٹر ایم۔ این۔ ساہا "ساہا انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیر فزکس" یتیم تھے۔ اپنے وقت کی عظیم الشان شخصیت مولانا محمد علی جوہر یتیم تھے، قطب الدین کاکی یتیم تھے۔ ابن سینا یتیم تھے۔ خواجہ حسن نظامی یتیم ہو گئے تھے، ان کے والد کا سایہ پانچ سال میں ہی اٹھ گیا تھا، گھر کی غربت کا یہ عالم تھا کہ بیشتر اوقات فاقہ رہتا تھا۔ ان ہستیوں نے کبھی حالات کے آگے سر نہیں جھکایا۔ آئیے کچھ معذور ہستیوں کا بھی ذکر ہو جائے، مصر کے سابق وزیر تعلیم اور ادبیات کے پروفیسر ڈاکٹر طہ حسین مشہور شاعر اور ادیب بچپن ہی سے نابینا تھے۔ انہوں نے ادبیات میں فرانس سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ایک قدم آگے اور بڑھائیے مشہور انگریزی کے شاعر جان ملٹن جن کو "فردوس گم گشتہ" سے پہچانا جاتا ہے وہ بھی اندھے تھے۔ یہ سب وہ ہستیاں تھیں جنھوں نے معذوری کا دلیرانہ مقابلہ کیا اور علم کو ہی اپنی ترقی کے لیے ہتھیار کے بطور پر استعمال کیا۔ پھر ہم حالات حالات کی رٹ لگا کر کبھی بھی علم کے سلسلے میں عذر پیش نہیں کر سکتے۔ دلیرانہ مقابلہ، عمل پیہم، مسلسل صبر آزمائی، حالات سے نبرد آزمائی اور مایوسی سے نفرت جیسے عناصر کو اپنے اندر پیدا کرنا ہو گا۔ بقول ہندوستان کے ایک مسلم ماہر تعلیم کے ہندوستان میں ایک مسلم طالب علم کو اپنے اندر برادران وطن کے دو طلبہ کی جانکاری کے برابر جانکاری حاصل کرنا ہو گی تب ہی وہ اپنا مقام پا سکتا ہے۔

اب ذرا ہندوستان میں تعلیم نسواں کی جانب بھی نظر کریں ۔ یہ مغالطہ ہے کہ مذہب اسلام نے لڑکیوں کو جدید سائنسی تعلیم سے باز رکھا ہے ۔ بلکہ یہ ذمہ داری پوری قوم پر ہے کہ وہ شرعی حدود کا تعین کریں اور وسائل پیدا کریں جن کے اندر رہ کر ہم مسلم خواتین بھی سائنس اور جدید ٹکنالوجی کے میدان میں مردوں کے مد مقابل کھڑی ہو سکیں ۔ میری نظر میں علم کے میدان میں لڑکیوں کی ترقی کی ضرورت لڑکوں سے کسی قدر کم نہیں ۔ شرط یہ ہے کہ خاتوں کو شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ جدید تعلیم کی درس و تدریس کے مواقع فراہم ہوں ۔ مغربی بنگال کے فاضل گورنر پروفیسر نورالحسن مرحوم نے کسی موقع پر فرمایا تھا " کسی لڑکے کو تعلیم دینا ایک فرد کو تعلیم دینا ہے مگر ایک لڑکی کو تعلیم دینا ایک خاندان کو تعلیم دینا ہے " ۔ ابراہم لنکن نے ایک بار کہا تھا " مجھے سات پڑھی لکھی مائیں دو، میں تمہیں ایک بہترین قوم دونگا " ۔ کیا آج کی مسلم خواتین ایک بہترین قوم کی تخلیق کی صلاحیت پیدا نہیں کر سکتی ہیں ؟ بالکل کر سکتی ہیں شرط یہ ہے کہ مسلمان اس کا انتظام کریں جہاں وہ اپنی ذہانت ، عمل ، کوشش اور صلاحیت کا بھر پور مظاہرہ اسلامی حدود کے اندر رہ کر کر سکیں ۔ آخر وہ کون سی طاقت ہے جس کے بل بوتے پر ایک مسلم عورت آج ہندوستان میں جسٹس کے عہدہ پر فائز ہوئی ۔

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی*

حسین اور عزمِ حسین

حضرت حسین، سرورِ کائنات کے نواسے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی فاطمہ زہرا کے فرزند، علی کرم اللہ وجہٗ کے بیٹے، امام حسن کے چھوٹے بھائی۔ کنیت ابو عبداللہ، لقب سبطِ رسول اللہ اور ریحانۃ الرسول۔ ۵ شعبان ۴ ہجری بروز منگل مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ بعض نے شعبان ۳ ہجری کی تیسری تاریخ بدھ کا دن بھی لکھا ہے مگر اوّل الذکر روایت زیادہ معتبر ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جنتی نوجوانوں کا سردار فرمایا۔ ارشاد فرمایا:

"بے شک حسن اور حسین دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ دونوں بھائیوں سے بے حد پیار تھا۔ ایک دفعہ سرورِ کائنات حضرت فاطمہ کے مکان کے قریب سے گزر رہے تھے کہ حضرت حسین کے رونے کی آواز سنی، گھر کے اندر تشریف لے گئے اور خاتونِ جنت سے ارشاد فرمایا:

"کیا تمہیں نہیں معلوم کہ مجھے ان کے رونے سے تکلیف ہوتی ہے۔"

رحمۃ اللعالمین کا یہی چہیتا حسین محرم الحرام ۶۱ ہجری کی دسویں تاریخ کو جمعہ کے دن بعد نماز ظہر میدان کربلا میں لشکر یزید کے ہاتھوں شہید ہوا۔ سر مبارک جنت البقیع (مدینہ منورہ) میں دفن کیا گیا اور جسد اطہر دشتِ کربلا میں سپردِ خاک ہوا۔

عشق و اخلاص کی تاریخ کا یہ بھی ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ وہ صاحب صبر و رضا، حسین باصفا جس نے راہِ خدا میں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے کا فیصلہ کیا تھا، اپنے ارادے میں ایسا کامیاب ہوا کہ شہادت کے بعد دفن بھی ہوا تو اس شان سے کہ سر کہیں اور ہے، جسم کہیں اور۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۶۰ ہجری میں دمشق میں یزید نامی ایک ایسا شخص مملکت اسلامیہ کا حکمراں بن بیٹھا جس کے بارے میں یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ خلافت کی ذمّہ داریوں کو نبھانا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ خود حضرت حسین کی یہی رائے تھی۔ چنانچہ جب مدینے میں یزید کے نمائندے نے آپ سے حاکمِ وقت کی وفاداری کا حلف لینا چاہا تو آپ راتوں رات مدینے سے نکل کھڑے ہوئے اور مع اہل و عیال مکّے جا پہنچے۔ مکّے میں قیام کیے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اہلِ کوفہ نے خطوط لکھ کر اپنی وفاداری کا یقین دلانا شروع کر دیا۔ بعض نے قاصد کے ذریعے پیغام بھیجا کہ یزید خلافت کا اہل نہیں۔ ہمیں اس کی حکومت، اس کا طور طریقہ پسند نہیں، اس کی بیعت گوارا نہیں۔ وہ زبردستی ہم سے اپنی بالادستی منوانا چاہتا ہے۔ اگر آپ نے آنے میں دیر کی تو ممکن ہے اس کے منصوبے پورے ہو جائیں۔ لہٰذا ملّت کی آبرومندانہ زندگی کی خاطر خدارا جلد تشریف لائیے۔ ہم خود کو آپ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔" اہلِ کوفہ کے اس اصرار نے احساس ذمّہ داری کو بڑھا دیا۔

---

* لکچرر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ - مئی ۱۹۹۵ء

خیال ہوا کہ اگر آج ہم نے اُن کی درخواست رد کر دی تو کل دُنیا یہی کہے گی کہ جب دین کا کارواں لُٹ رہا تھا تو رہبر کائنات کا نواسہ تماشائی بنا بیٹھا تھا اور جب بادِ مخالف کے جھونکے بہارِ شریعت کو پامال کر رہے تھے تو فاطمہ کا لال گوشۂ عافیت میں چین کی نیند رہا تھا!

حضرت امام اتنا بڑا الزام اپنے سر لینے کو تیار نہ ہو سکے۔ انھوں نے کوفہ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دوستوں اور عزیزوں کو معلوم ہوا تو سبھی نے اس سفر کی مخالفت کی۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر نے کہا "یہیں رہ کر خلافت کا اعلان کیجیے اور اہلِ عراق کو کہیے حجاز آکر آپ کی مدد کریں۔ ہم لوگ بھی ہر طرح سے آپ کی تائید و حمایت کریں گے۔" حضرت امام نے اس رائے سے اختلاف ہوئے ارشاد فرمایا: "میں نے والدِ محترم سے سنا ہے کہ حرم شریف میں ایک مینڈھا ذبح ہوگا جس سے اس کی حرمت ختم ہوگی۔ میں وہ مینڈھا نہیں بننا چاہتا۔"

اسی درمیان آپ کے چچا زاد بھائی عبداللہ ابن جعفر نے مدینے سے خط لکھا:

"میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ اپنے ارادے سے باز آجائیے کیوں کہ اس میں آپ کے لیے ہلاکت اور آپ کے اہلِ بیت کے لیے بربادی ہے۔ اگر آپ قتل ہوگئے تو زمین کا نور بجھ جائے گا۔ اس وقت ایک آپ ہی ہمارے لیے ہدایت کا نشان اور امیدوں کا مرکز ہیں۔ سفر میں جلدی نہ کیجیے۔ میں آتا ہوں۔"

لیکن یہ مخلصانہ مشورہ بھی عزمِ صمیم کی راہ میں حائل نہ ہو سکا۔ بالآخر اہلِ مکّہ کے مشورے سے طے پایا کہ پہلے کوفہ کے حالات کا لینے کے لیے کسی آدمی کو وہاں بھیجا جائے اور جب اطمینانِ خاطر ہو جائے تو سیّدنا امام تشریف لے جائیں۔

چنانچہ آپ کی اجازت سے آپ کے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کوفہ روانہ ہوئے جہاں اُن کا پُرجوش خیر مقدم ہوا۔ تقریباً ہزار اور بعض روایتوں کے مطابق اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی اور جان کی بازی لگا دینے کی قسمیں کھائیں۔ یہ دیکھ کر حضرت مسلم نے امام حسین کو پیغام بھیجا کہ یہاں کے لوگ پوری طرح ہمارے ساتھ ہیں۔ آپ بلا تاخیر تشریف لائیں۔

پیغام ملتے ہی آپ نے رختِ سفر باندھا اور ذی الحجہ ۶۰ ہجری کی پہلی، تیسری یا آٹھویں تاریخ کو مع اہل و عیال کوفہ روانگی کا قصد فرمایا۔ اس موقع پر عبداللہ ابن عباس نے ایک بار پھر گزارش کی۔

"ابن عم! مجھ سے کہے بغیر رہا نہیں جاتا۔ کیوں کہ میں اس راہ میں آپ کی ہلاکت اور بربادی دیکھ رہا ہوں۔ آپ یہاں رہنا نہیں چاہتے تو یمن چلے جائیں۔ وہاں کے لوگ آپ کے والد کے طرف دار ہیں۔ علاقہ دشوار گزار اور پہاڑی ہے، قلعے بھی ہیں۔ انشاء اللہ دشمنوں کی شرارت سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن خدارا کوفہ ہرگز نہ جائیں۔ اہلِ عراق دغاباز ہیں۔ ان کا اعتبار نہ کیجیے۔ وہ آپ کو بلاتے ہیں تو اُن سے کہیے کہ پہلے مخالفین کو اپنے علاقے سے نکال دو۔"

امام حسین نے یہ سن کر کہا: "جانتا ہوں کہ تم میرے خیر خواہ ہو لیکن میں عزم کر چکا۔"

ابن عباس نے پھر کہا: "آپ کی یہی مرضی ہے تو کم از کم عورتوں اور بچوں کو یہیں چھوڑ دیجیے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ ان کی آنکھوں کے سامنے کہیں اسی طرح شہید نہ کر ڈالے جائیں جس طرح حضرت عثمان شہید کر دیے گئے۔"

لیکن شفیق بھائی کی درد میں ڈوبی ہوئی یہ مخلصانہ گزارش بھی حضرت حسین کے ارادوں کی زنجیر نہ بن سکی۔ پھر حضرت ابوبکر

بن حارث نے سمجھانا چاہا، ماضی کے تلخ تجربات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا:

"آپ کے والد ماجد تو خلیفہ وقت تھے اور عام مسلمانوں پر ان کا خاصا اثر بھی تھا۔ لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے احکام پر سر جھکاتے تھے۔ اس سب کے باوجود وقت آیا تو لوگوں نے کتنی آسانی سے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا بلکہ شدید مخالفت بھی کی۔ پھر خدا کو جو منظور تھا سو ہوا۔ اُن کے بعد آپ کے بھائی کے ساتھ عراقیوں نے جو سلوک کیا وہ بھی کسی سے چھپا نہیں۔ پھر آپ کس امید پر اپنے والد اور بھائی کے دشمنوں کے پاس جا رہے ہیں۔ یقین جانیے کہ مال و دولت کا لالچ پل بھر میں انھیں آپ سے دور کر دے گا۔ وہ آپ کے دشمنوں سے مل جائیں گے بلکہ خود آپ کے دشمن بن جائیں گے۔"

مگر یہ درخواست بھی مسموع نہ ہوئی۔ بعض دوسرے احباب نے بھی مستقبل کے خطرات کے پیشِ نظر سفرِ کوفہ کی مخالفت کی لیکن عزمِ حسین نے ہر ایک کو زبانِ حال سے یہی جواب دیا۔ دوستو! مجھے جانے دو۔ جانتا ہوں کہ اس راہ میں جان کے لالے بھی پڑ سکتے ہیں مگر کیا تمہیں نہیں معلوم؟ کبھی کبھی موت زندگی سے زیادہ خوب صورت اور صد رشکِ حیات بلکہ حیات بخش ہوتی ہے! میں نے تمہارے مشوروں کا بھی احترام کیا ہے۔ کوفہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے مسلم بن عقیل کو بھیجا۔ اب جب کہ اُن کا خط آ چکا ہے، میں کیسے رُک سکتا ہوں؟ حالات کی سنگینی سے مجھے انکار نہیں لیکن اس وقت میرے لیے یہی ایک راستہ ہے۔

کیا حضرت حسین نے اس ایک راستہ کا انتخاب کر کے کوئی بھول کی؟ کچھ لوگوں کا یہی خیال ہے لیکن جو یہ سمجھتے ہیں کہ عراقیوں کی دعوت پر لبیک کہنا حضرت امام کی اجتہادی غلطی تھی، انھیں اس نکتے پر بھی نگاہ رکھنا چاہیے کہ دعوت دین کے نام پر دی گئی تھی۔ اگر حضرت حسین اسے رد کر دیتے تو آج دُنیا یہ سوچ سکتی تھی کہ رحمتہ اللعالمین کے نواسۂ عالی وقار کے سینے میں ملت کا اتنا بھی درد نہ تھا کہ وہ دین کے نام پر آواز دینے والوں کا دل رکھ لیتے۔ ممکن ہے اس صورت میں تاریخِ اسلام کے کسی مبصر کے ذہن میں یہ خیال بھی آ جاتا کہ امام نے کوفہ نہ جا کر غلطی کی۔ چلے گئے ہوتے تو شاید ایک بار پھر عالمِ اسلام خلافت کے مقدس جھنڈے تلے جمع ہو جاتا۔

حضرت حسین کے عزمِ سفر نے اس امکانی غلط فہمی کا سدّباب کر دیا۔ اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ امام کا مقصد ملّت میں خلفشار پیدا کرنا نہیں تھا، ذہنوں کو بیدار کرنا تھا۔ یہ بتانا مقصود تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظامِ حکومت اور ہے، یزید کا اندازِ حکومت اور ہے۔

محمد اسحاق *

اچھے ٹیچرز کی تلاش میں

سارے نظامِ تعلیم میں کلاس روم میں پڑھانے کا کام سب سے زیادہ اہم ہے۔ معاشرہ اور ملک کے مفاد میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ بچوں کو اچھی معیاری تعلیم دی جائے تاکہ بچوں کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی و روحانی نشو و نما کے امکانات و ہیجانات کو پورا کر سکے۔ اس کی شخصیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ بچے کی خوابیدہ صلاحیتیں ممکنہ حد تک ترقی کر جائیں جو اس کی زندگی میں ترقی اور کامیابی کا باعث ہو سکیں۔ مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ سارے تعلیمی نظام میں جو مسائل بنیادی اور مرکزی نوعیت کے ہیں وہ صرف دو ہیں ــــ ٹیچر اور اس کے پڑھانے کی قابلیت، اس کو ذرا وضاحت کے ساتھ یوں کہا جا سکتا ہے۔

۱۔ کس طرح قابل مرد اور خواتین کو اس پیشہ کی طرف راغب کیا جائے؟

۲۔ طلبہ کو موثر تعلیم کس طرح دی جائے تاکہ بچوں کی نشو و نما، فطری تقاضوں اور کھوج و جستجو کو مہمیز کر سکے ــــ وسیع نقطہ نظر سے وہ ملک و قوم کی ضروریات کو پورا کر سکیں۔

جان ڈیوی (John Dewey) کا کہنا ہے کہ تعلیمی میدان میں ساری اصلاحات صرف ایک شرط کی تابع ہیں ــــ ان لوگوں کی قابلیت و صلاحیت پر موقوف ہیں جو پیشہ تدریس سے منسلک ہیں۔

یونسکو (Unesco) کے تحت ایک ٹیچرز ٹریننگ ورکشاپ کی رپورٹ میں اس بات کو ریکارڈ کیا گیا ہے کہ "اساتذہ نہ کہ بچہ تمام تعلیمی مسائل کا معمہ لاینحل ہے۔ شاید نصف درجن اسکیم کامیاب ہو جائیں اگر موزوں ٹیچرز کلاس روم میں نوخیز نسل کی تعلیم کے ذمہ دار ہو جائیں۔

ہمارے ملک میں مدارس کھولنا کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ پرائمری سے یونیورسٹی سطح تک اچھے ٹیچرز کا ملنا دشوار ہو گیا ہے۔ دوسری طرف یہ مسئلہ بھی آسان نہیں کہ کس طرح ٹیچر کو اچھا ٹیچر بنایا جائے تاکہ اسے اپنے پیشے سے انس ہو۔ اس سلسلے میں کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن کا یہ مشاہدہ نوٹ کرنے کے قابل ہے "اچھی سے اچھی تعلیمی اسکیمات ناکام ہو جائیں گی جنہیں ان اسکیموں کو روبہ عمل لانا ہے وہ اگر غیر تربیت یافتہ ہوں اور خود سے تیار نہ ہوں لیکن ان ناقص اسکیم بھی کامیاب ہو جائے گی اگر ٹیچرز اچھے ہوں اور اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہوں۔"

جہاں کہیں کسی اسکول انتظامیہ سے سابقہ پڑتا ہے وہاں پر یہی ایک پریشان کن سوال ہے کہ اچھے تربیت یافتہ ٹیچرز

• ریٹائرڈ، نسیل مکان نمبر ۶ / ۳۳-۲-۳ بازار گارڈ، حیدرآباد ــــ

نہیں ملتے۔ کچھ تو اسکول کا فائنانس اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ سب کو گورنمنٹ اسکیل دیں دراصل ٹیچرز کا مشاہرہ اس اسکول کے تعلیمی معیار کے لیے بار پیما کا کام دیتا ہے۔ اگر ٹیچرز کی تنخواہیں ہزار بارہ سو کے اندر ہیں تو پھر اس گرانی کے زمانے میں جب تک گزر بسر کے لیے کوئی دوسری آمدنی کا ذریعہ نہ ہو وہ دل لگا کر پڑھا نہیں سکتا۔ گورنمنٹ پرائمری اور سکنڈری اسکولوں کے ٹیچروں کی تنخواہیں آج کل چار پانچ ہزار روپیہ ماہانہ ہیں۔ اتنی اچھی تنخواہیں وہ اگر پاتے ہیں تو ضرور وہ بہترین مثالی ٹیچرز ہوں گے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ان پر خاطر خواہ کوئی کنٹرول نہیں کر سکتا۔ گورنمنٹ کی ملازمت میں بڑی عافیت اور سکون ہے۔ کسی کی نااہلی ثابت بھی ہو جائے تو قوانین کچھ ایسے ہیں کہ ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ خانگی اسکولوں میں اعلیٰ معیاری تنخواہیں نہیں دی جاسکتیں۔ ایک تو یہ کہ خود ان خانگی اسکولوں کو اپنا معیار باقی رکھنے کے لیے بہت سے اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں تاکہ معاشرہ میں ان کا وقار باقی رہے دوسرے یہ کہ کم تر مشاہرہ پر اچھے ٹیچرز عام بے روزگاری کی وجہ سے مل جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں لیڈی ٹیچرز کی بہتات بھی مشاہرہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ خواتین کی کچھ مجبوریاں ہیں وہ کمتر مشاہرہ پر کام کرنے کے لیے راضی ہو جاتی ہیں بشرطیکہ اسکول مکان کے قریب ہو اور وہ اپنی شادی کے انتظار میں ہوں۔ لیکن خواتین ٹیچرز اکثر محنتی اور ذمہ دار پائی گئی ہیں۔ عذرا پبلک اسکول کے سربراہ نے شکایت کی کہ ہمارا اسکول شادی خانہ بن گیا ہے۔ اس تعلیمی سال کے دوران ۴۲ میں سے چھ لیڈی ٹیچرز کی شادیاں ہو گئیں اور وہ ہمارے اسکول کو الوداع کہہ گئیں۔ تعلیمی سال کے دوران یہ خلفشار ہمیں بہت مہنگا پڑتا ہے۔ جہاں خواتین ٹیچرز ہوں گی ان کے مسائل سے ہمدردی ضروری ہے۔ کنڈرگارٹن سے ساتویں جماعت تک لیڈی ٹیچرز بہت کامیاب اور موثر ہوتی ہیں سکنڈری اسٹیج اور کالج کی سطح پر مرد ٹیچرز کامیاب رہیں گے۔ لیکن یہ کوئی آزمودہ فارمولہ نہیں ہے۔ ان کی شکایت یہ ہے کہ جیسے ہی بات چیت طے ہوئی اب ان کا دل پڑھانے میں نہیں لگتا بلکہ جلد اڑنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ وہ اسکول کو ویٹنگ روم بنائے رکھتی ہیں اس مسئلہ کا آسان حل یہ ہے کہ ہمیشہ دس پندرہ منتخب ٹیچرز کا ہر مضمون میں ایک دو کے حساب سے پینل پہلے ہی سے تیار رکھیں۔ جب کبھی کسی ٹیچر کی جانب سے ایک ماہ قبل نوٹس ملے فوراً اس منتخب لسٹ سے اس مضمون کی ٹیچر کو ایک ہفتہ قبل ہی اسکول میں رجوع کریں تاکہ جانے والی ٹیچر نئی ٹیچر کو اسکول کے ماحول، طلبہ سے ملاقات، نصاب کی تکمیل، ہوم ورک وغیرہ سے واقف کرواسکے۔ ایسی صورت میں کوئی خلاء باقی نہیں رہتا۔ دس پندرہ دن بھی کوئی ٹیچر رخصت لے لے طلبہ کو بہت نقصان ہوتا ہے لیکن اکثر انتظامیہ مہینے دو مہینے کی غیر حاضری میں بھی اکثر کچھ نہیں کر پاتے۔

ٹیچرز کے انتخاب میں کسی سفارش اور دوسری باتوں کا لحاظ پاس نہیں رکھنا چاہیے۔ ایک ناقص ٹیچر ہو تو سینکڑوں بلکہ ہزاروں طلبہ کا نقصان ہوتا ہے ایک اچھا ٹیچر ہو تو پوری ایک نسل اس کی ذات سے فیض یاب ہوتی ہے۔ ٹیچرز سے انٹرویو کے بعد انہیں کسی کلاس میں پڑھانے کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لینا نہایت مفید ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ایک سال میں ٹیچر کی قابلیت و صلاحیت کو جانچنے کا کافی موقع ملتا ہے۔ اگر کسی ٹیچر میں بہتر ٹیچر بننے کی صلاحیت اور توقع نہیں ہے تو سال کے ختم پر اس کی چھٹی کر دینا چاہیے۔ خراب ٹیچر کو برداشت کرتے جانا دراصل بچوں کے ساتھ ظلم ہی نہیں بلکہ معاشرہ کے خلاف ایک جرم ہے۔

بعض اسکولوں میں یہ خوش فہمی عام ہے کہ ٹرینڈ ٹیچرز سے ان ٹرینڈ ٹیچرز ہی بہتر ہوتے ہیں۔ انہیں تنخواہیں بھی کم دینا پڑتی ہیں۔ دراصل تربیت یافتہ ٹیچر کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ بعض اچھے ٹیچرز کو ان کے کام کو قریب سے دیکھا جائے تو

معلوم ہوگا کہ انہیں بھی ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ سارے ملک میں سینکڑوں سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کے سنٹرل اسکولس ہیں جن میں ایک بھی ان ٹرینڈ ٹیچر کا گزر نہیں۔ آندھرا پردیش ایجوکیشن کوڈ کے تحت یہ شرط عاید کردی گئی ہے کہ اسکولوں میں صرف تربیت یافتہ ٹیچرز کا تقرر کیا جائے۔ ٹرینڈ ٹیچرز کی عدم دستیابی اور ان کے مشاہرہ کی وجہ خانگی اسکولوں میں غیر تربیت یافتہ ٹیچرس کی بھرمار ہے۔

ایک اور خام خیال مثالی ٹیچر یا Born Teacher کا ہے جسے کوئی تربیت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک نایاب اور لمیاب شئے ہے جو شاید ہزاروں میں ایک مل جائے۔ ورنہ ہر محنتی ٹیچر کو مثالی ٹیچر سمجھنا غلطی ہے۔

اچھے ٹیچرز ہی کسی تعلیمی ادارہ کی شان ہوتے ہیں۔ کرسچین مشنری اسکولوں میں اور بعض دوسرے اچھے اسکولوں میں گورنمنٹ کی مقررہ شرح سے تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ ان کے شرائط ملازمت بھی گورنمنٹ کے مقررہ اصولوں کے تحت ہوتے ہیں۔ یہاں انتظامیہ ایمانداری سے کام لیتا ہے اور ٹیچرز بھی پوری تن دہی سے کام کرتے ہیں ان اسکولوں کی شہرت اور عظمت کا راز اچھے ٹیچرز اور ان کا کام ہے۔ تعلیم کی دنیا میں ٹیچرز کی تنخواہوں کو انسانی وسائل کے فروغ کے لیے ساری دنیا میں اب بہترین سرمایہ کاری سمجھا جانے لگا ہے۔ ساری قوم کی ترقی کا راز مطمئن ٹیچر ہے۔ وہ ادارے خوش قسمت ہیں جہاں کے ٹیچر مطمئن ہیں اور پڑھانے کے کام میں ایسے مشغول ہوں کہ انہیں ادھر ادھر دیکھ کر نہ تو حسرت ہوتی ہو اور نہ اپنی آسودہ زندگی سے ہٹ کر انہیں ہاتھ پیر مارنے کی ضرورت پڑتی ہو۔

راحت ابرار*

ہمارے نئے وائس چانسلر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب محمود الرحمن ہندوستان کے اس عظیم قومی ورثے کی خدمت کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز تصوّر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سرسیّد احمد خاں نے اس دانش گاہ کے لیے جو منصوبہ مرتب کیا تھا اس کے نقوش ہمارے تساہل اور غفلت کی وجہ سے دُھندلے ہوتے جا رہے ہیں۔ موسمِ خزاں کو موسمِ بہار میں بدلنے کے لیے اس میں ایک مرتبہ پھر رنگوں کو بھرنا ہے تاکہ وہ نقوش اُبھر سکیں اور صحیح سمت میں اس ادارے کو آگے بڑھایا جا سکے۔ تاکہ بانیِ درس گاہ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

ان کی ترجیحات میں اولین ترجیح نظم و نسق کی بحالی، تعلیمی معیار میں بہتری اور نوجوانوں میں احساسِ مایوسی اور محرومی کے بجائے خود اعتمادی کے ساتھ اعلیٰ ملازمتوں کے مواقع فراہم کرانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے زیادہ تر نوجوان محرومیت اور مایوسی کا شکار ہیں، وہ ملازمتوں کے مقابلوں میں شریک نہیں ہوتے۔ وہ اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کم سے کم ایک ہزار لڑکے آئی۔ اے۔ ایس اور دوسری سرکاری ملازمتوں کے مقابلہ جاتی امتحانات میں ہر سال شریک ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک "کیریر کونسلنگ سینٹر" بہت جلد قائم کیا جائے گا جس کا بنیادی کام لڑکوں کو روزگار سے متعلق معلومات فراہم کرانا ہوگا اور انھیں اس لائق بنانا ہوگا کہ وہ ملک کے اہم عہدوں کے مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہوں۔ انھوں نے کہا کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتی جب تک کہ نوجوانوں کی شخصیت کو پھلنے پھولنے، ترقی کرنے، حصولِ علم، تلاش و جستجو اور تحقیق کے وافر مواقع فراہم نہ کیے جائیں۔

مسلم یونیورسٹی کے اقامتی کردار سے متعلق جناب محمود الرحمن کا خیال ہے کہ اقامتی زندگی کا بنیادی مقصد طلبا کی کردار سازی ہوتا ہے ہاسٹل لائف طلبا کو مہذب شہری بنانے کی تربیت گاہیں ہوتی ہیں۔ ڈائننگ ہال کے نظام سے اخلاقی قدروں کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور ان میں ایک دوسرے سے محبّت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے مگر بدقسمتی سے یہاں کا اقامتی کردار جو اس ادارے کا طرۂ امتیاز تھا وہ دھیرے دھیرے ختم ہوتا چلا گیا اور ڈائننگ ہال طلبا کے رہائشی کمروں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہاسٹل طلبا کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ غیر طالب علموں کے لیے۔ بعض ہاسٹلوں سے متعلق اس طرح کی شکایتیں مل رہی ہیں کہ وہاں ایسے لوگ بھی قیام پذیر ہیں جو کسی بھی کورس کے طالب علم نہیں ہیں۔ ایسے عناصر سے ہوسٹلوں کو پاک صاف کیا جائے گا اور طالب علموں کو اچھا کھانا مہیا کرایا جائے گا۔ غریب و نادار طلبا کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہر طرح سے ان کو مالی امداد فراہم کرائی جائے گی اور ہاسٹل کی سطح پر ایسے طلبا کی نشان دہی کی جائے گی جو ذہین ہیں مگر معاشی بدحالی کی وجہ سے اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک نہیں ہو رہے۔

جناب محمود الرحمن کا خیال ہے کہ جو ادارے انتشار اور خلفشار کا شکار ہوتے ہیں وہ ترقی نہیں کر پاتے۔ کسی بھی مہذب سماج کی ترقی کے

---

* اسسٹنٹ پی۔ آر۔ او، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تہذیب الاخلاق علی گڑھ مئی ۱۹۹۵ء

لیے ضروری ہے نہ وہ اختلافات سے دور رہ کر اپنی تمام تر توانائی تعمیری اور اصلاحی کاموں پر صرف کرے تاکہ اس ادارے کی ساکھ اس کا وقار باقی رہ سکے۔ طلباء میں نظم و نسق کا ہونا بہت ضروری ہے۔ انھیں اپنے اساتذہ کا احترام کرنا چاہیے اور اساتذہ کو اپنے طالب علموں سے شفقت اور محبت سے پیش آنا چاہیے۔ طلباء اور اساتذہ کے رشتے جتنے استوار ہوں گے اس سے ڈسپلن شکنی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

وائس چانسلر صاحب نے کہا کہ ہمارے نوجوانوں کو اپنے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں بھی حصہ لینا چاہیے کیونکہ ایک زمانے تک علی گڑھ اپنے کھیلوں کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔ یہاں کی ہاکی ٹیم کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ایک خصوصی مقام حاصل تھا۔ علی گڑھ میں گھڑ سواری کا الگ سے نظم ہے جو ہندوستان کی کسی بھی دوسری یونیورسٹی میں نہیں ہے۔ طالب علموں کو کھیل میں مہارت حاصل کرنے کے لیے بھرپور مواقع فراہم کیے جائیں گے۔

انھوں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں طلباء رات کو دو بجے تک پڑھتے ہیں۔ خود انھوں نے بھی رات کو بارہ بجے دیکھا کہ طلباء کی بہت بڑی تعداد لائبریری میں موجود تھی۔ وہ طلباء کے اس علمی ذوق و شوق سے بیحد متاثر ہوئے ہیں۔ اب یہ لائبریری ۲۴ گھنٹے کھلتی ہے۔ تاکہ ہر طالب علم اپنی سہولت کے لحاظ سے وہاں جا کر پڑھ سکے۔ دُنیا کی یہ پہلی لائبریری ہے جو دن رات کھلی رہتی ہے۔

جناب محمود الرحمٰن نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی کی ہمہ جہت ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ بعض نئے شعبوں کو قائم کیا جائے اور بعض شعبوں کی توسیع کی جائے مگر اس سلسلے میں وہ کسی سے چندہ مانگنے کے خلاف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنے وسائل خود تلاش کرنے ہوں گے اور توسیع کے کاموں میں سرمائے کی کمی نہیں ہونے دی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ بنی نوع انسان کی خدمت اور نامساعد حالات کا مقابلہ کرنا ہی میری زندگی کا نصب العین رہا ہے۔

انھوں نے کہا کہ داخلہ پالیسی کو بہت ہی صاف و شفاف بنانا ہوگا اور داخلوں میں وائس چانسلر کی بیس فیصد نامزدگی کو بھی اہلیت کی بنیاد پر کیا جائے گا تاکہ ذہین اور مستحق امیدوار اپنے حق سے محروم نہ رہ سکے۔ انھوں نے کہا کہ اقامتی اداروں میں طلباء کی حاضری میں کسی بھی طرح کی رعایت نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ طالب علم کا بنیادی مقصد علم حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا حاضری اور نظم و نسق میں کسی بھی طرح کی ڈھیل نہیں دی جائے گی۔ تعلیمی معیار کے لیے ضروری ہے کہ طلباء باقاعدہ کلاسوں میں حاضر ہوں اور اپنی تمام تر توجہ تعلیمی سرگرمیوں پر صرف کریں۔

وائس چانسلر صاحب نے کہا کہ یونیورسٹی سے ملحق اسکولوں کے معیارِ تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے بھی عملی اقدامات کرنے ہوں گے کیوں کہ تعلیمی معیار کی اصل بنیاد یہی اسکول ہیں۔ اگر اسکولوں کا معیار بہتر ہوگا تو اس کا اثر یونیورسٹی کے معیارِ تعلیم پر بھی پڑے گا۔

انھوں نے کہا کہ علی گڑھ اپنی روایات اور اقدار کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اپنا ایک خصوصی کلچر ہے اور اس کلچر میں اس کے لباس کو بھی خاص دخل ہے۔ ان کی کوشش ہوگی کہ یونیورسٹی یونیفارم کو لازمی قرار دیا جائے تاکہ کسی بھی طالب علم کی شناخت اس کے لباس سے ہو سکے۔

وائس چانسلر جناب محمود الرحمٰن نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علم و دانش کا مینارۂ نور ہے اور انھیں امید ہے کہ یہاں کے تمام طلباء، اساتذہ اور غیر تدریسی عملہ اس تاریخی و تہذیبی ورثہ کی ترقی اور بہتری کے لیے ان کے ساتھ عملی تعاون کریں گے۔

ایک مکمل ہیلتھ ٹانک، بلکہ اور بھی بہت کچھ!



سنکارا
آپ کی صحت کے لیے ایک بھرپور ٹانک

سنکارا لازمی عناصر، جڑی بوٹیوں اور وٹامنوں کا نادر مرکب ہے۔ اس میں آئرن، کیلشیم اور زنک کی کافی مقدار ہے۔ اتنا ہی نہیں، سنکارا میں الکحل بالکل نہیں ہے۔ سنکارا آپ کی کس طرح مدد کرتا ہے؟

اسکول جانے والے بچوں کے لیے:
سنکارا بھوک اور ذہنی توانائی بڑھانے میں مدد کرتا ہے۔ اس کی وجہ ہے سنکارا میں موجود مقوی عناصر (بالخصوص زنک اور آیوڈین) جو دماغ کے خلیوں کو بڑی مقدار میں غذا فراہم کرتے ہیں۔ یہ قوتِ حافظہ کی اصلاح بھی کرتا ہے۔

حاملہ خواتین کے لیے:
سنکارا حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی ماؤں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس میں ماں اور بچے کی صحت کے لیے ضروری فولک ایسڈ، وٹامن بی ۱۲، آئرن، کیلشیم اور زنک کافی مقدار میں ہیں۔

بالغوں کے لیے:
دباؤ اور تناؤ بھری اس دنیا میں سنکارا مہلک امراض سے حفاظت کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ سنکارا دورانِ خون کو معمول کے مطابق رکھنے اور جگر کے اطراف میں کثافتوں کے جمع ہونے سے روکنے میں مدد کرتا ہے۔

ضعیفوں کے لیے:
سنکارا ضعیفوں کے لیے قابلِ مثال اور طاقت بحال کرنے والا ٹانک ہے۔ استعمال میں کمی آجانے کے سبب پیدا ہونے والے امراض اور ضعیفی میں پریشان کرنے والی بیماریوں سے حفاظت کرتا ہے۔ ان میں اکثر امراض کا سبب خراب اور غیر متناسب غذا ہے۔

تو آج ہی سنکارا لے آئیے۔ یہ پورے خاندان کے لیے قابلِ مثال صحت بخش ٹانک ہے۔

چند مشہور ٹانکوں میں موجود آئرن، کیلشیم، زنک اور الکحل کی مقدار (فی خوراک) کا موازنہ۔

Reputed brands of tonics	Iron (mg)	Calcium (mm)	Zinc (mg)	Alcohol content percent (V/V)	Contents per unit pack
1	–	12.4	–	12.00	400
2.	–	–	–	11.0	240
3.	9.60	–	–	–	454
4	13.00	–	–	–	200
5.	21.50	–	0.00002	5.5	200
6.	.16.700	–	–	–	300
7.	–	–	–	–	200
8.	7.83	–	0.50	–	100
9.	5.60	9.50	–	9.5	300
Cinkara	[illegible]	[illegible]	2.00	[illegible]	[illegible]



لازمی بنیادی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب

ہمدرد
سنکارا
مشہور عالمی قیمتی ٹانک، ہر موسم میں سب کے لیے

Chaitra Leo Burnett-D HWL 1489 URD


شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ
کے لئے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں
کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے
پھنسی، خارش اور داد
کی دوا
مشہور اور مفید دوائیں
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

ر۱۴ جون ۱۹۹۵ء شمارہ ۶

بَانی: سَرسَیّد احمد خان

مُدیر

پروفیسر مسعود عالم

شریک مُدیر ______ نائب مُدیر

اکٹر قمر الہدیٰ فریدی ______ احمد مجتبیٰ قریشی

سرکولیشن انچارج: محمد عتیق قاضی

شمارہ	6 = 50	روپے	زرسالانہ 00 = 65	زرسالانہ طلبہ 00 = 45	روپے
ونی ممالک (ہوائی ڈاک)	30 = 00	امریکی ڈالر	بیرونی ممالک (عام ڈاک)	00 = 15	امریکی ڈالر
ُف ممبرشپ (اندرون ملک)	650 = 00	روپے	لائف ممبرشپ (بیرون ملک)	00 = 300	امریکی ڈالر

ترسیلِ زر کا پتہ

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اورنشانت

ترتیب

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے متفق ہو]
ایڈیٹر پبلیشر پروفیسر مسعود عالم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کے توسط سے چھپوا کر ادارۂ تہذیب الاخلاق اور نشانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا۔

اداریہ

سرسید نے ایک موقع پر کہا تھا "کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے غیرتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھودے"۔ سرسید نے تو یہ بات ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم الشان تاریخی ورثے کے بارے میں کہی تھی جو ہزاروں سال کی کمائی ہے اور واقعی جس کی حفاظت کرنا کسی قوم کے زندہ و پائندہ ہونے کی علامت ہے۔ ہم اس تناظر میں آپ کو جس تاریخی ورثے کے تحفظ کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں وہ کچھ ہی عرصے پہلے ہم کو ترکہ میں ملا ہے۔ سرسید نے اپنی جوانی کے خاصے شب و روز دہلی کے کھنڈرات اور قدیم عمارتوں کی تحقیق پر صرف کیے تھے اور یہ کام انہوں نے بلاوجہ نہیں کیا تھا۔ ان کا تاریخی شعور غضب کی چیز تھی، اس نے نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں میں بیداری کی ایک لہر دوڑائی بلکہ ان کو روشن خیالی اور عملیت (Pragmatism) کی نئی ڈگر پر ڈال دیا۔ سرسید کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کا کھلا ہوا ذہن تھا اور ہمارا خیال ہے کہ تواریخ گذشتہ اور خاص طور پر قدیم عمارتوں کی شان و شوکت اور ان کے بلند بام و در نے غیر شعوری طور پر صفتِ مذکورہ سے ان کو بدرجہ اتم متصف کر دیا تھا۔
مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے جو ان کو قلبی لگاؤ تھا اس کے بارے میں کسی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ ہم تو صرف آپ کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ان عظیم الشان عمارات کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جن میں سے بعض کی تکمیل سرسید کی حیات ہی میں ہو گئی تھی اور بعض کی ان کے بعد ہوئی۔

ہم نے اپنے گزشتہ اداریے میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کی ۷۵ سالہ جوبلی کے موقع پر ہم چند تجاویز تہذیب الاخلاق کے ذریعہ فرزندانِ علی گڑھ، ابنائے قدیم، قوم کے ہمدردوں اور خاص طور پر وائس چانسلر صاحب کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان پر غور کیا جائے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی جائے اور وائس چانسلر صاحب اس سلسلے میں ہماری، سب کی رہنمائی فرمائیں۔ یوں تو جوبلی جیسے موقعوں پر جلسے جلوس اور پروپیگنڈے پر زیادہ زور ہوتا ہے۔ لیکن بعض کام ایسے بھی انجام دیے جاتے ہیں جو واقعی یادگار بن جاتے ہیں۔

- فی الحال ہماری اس بڑھتی اور پھیلتی ہوئی یونیورسٹی کو سخت ضرورت ہے مزید عمارتوں کی، تدریس کے لیے بھی اور رہائش کے لیے بھی۔ نئے تقاضوں کے تحت اور بڑھتے ہوئے قدموں کا ساتھ دینے کے لیے مختلف فیکلٹیوں میں نئے نئے شعبے قائم کیے گئے ہیں۔ فیکلٹیز میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اور مزید اضافوں کے امکانات ہیں۔ ان کے لیے نئے کلاس روم، تجربے گاہیں اور دفاتر درکار ہیں۔ اساتذہ اور دوسرے اسٹاف کے بیٹھنے اور کام کرنے کے لیے بھی کمرے ہونے چاہییں۔ ان سب پر مستزاد طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے تناسب سے نئی رہائش گاہوں کی ضرورت ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے کورسز کے لیے مکانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شاذونادر ہی کچھ پیسہ ملتا ہے۔ وہ بھی اشک شوئی کے لیے۔ چنانچہ جو نئے کورسز شروع کیے گئے ہیں ان کی گاڑی کسی نہ کسی صورت سے اب تک کھینچی جاتی رہی ہے لیکن صورتِ حال کو اطمینان بخش ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔
- اس عرصے میں طلبہ کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن نئے ہوسٹلوں میں اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ

دو ہالوں کی تعمیر کا کام جاری ہے جن کے مکمل ہونے کے بعد بھی جگہوں کی کافی کمی رہے گی۔ کم سے کم دو ہزار رہائشی جگہیں موجودہ صورت سے نمٹنے کے لیے درکار ہوں گی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے بنانے کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے؟ یو۔جی۔سی۔ مدد ضرور کرے گی لیکن صرف دو تین سو جگہوں کے لیے، سوال باقی کا ہے۔؟

آپ سرسید ہال کی عمارت کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ ڈالیے، درو دیوار پر یادگاری پتھر لگے ہوئے ملیں گے۔ اسٹریچی ہال کی حسین و خوبصورت عمارت میں بیسیوں کتبے لگے ہوئے ہیں جن پر معطی کا نام پتہ درج ہے۔ بلا مبالغہ ایس ساؤتھ کے ہر کمرے پر یہ پتھر نصب ہیں ممکن ہے کہ آج کے دور میں لوگ اس کو معیوب سمجھیں جو محض نادانی ہوگی یہ بات تو پوری قوم کے لیے باعث فخر ہے کہ اس ادارے کی تعمیر میں اتنے بہت سے لوگوں نے حصہ لیا۔ سرسید نے جو واقعی اپنے عہد کے بہت بڑے لوگوں میں سے تھے دست سوال دراز کرنے میں کبھی شرم محسوس نہیں کی۔ آپ خیال فرمائیں کہ اگر سرسید اس تحریک کو اس انداز سے نہ چلاتے تو کیا یہ سب کچھ ہوتا جو آج ہمارے اور آپ کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ کیا آج سرسید کے اس عمل کو دہرایا جا سکتا ہے؟ بے شک ہم کو قوم کے سامنے یہ مسئلہ رکھنا ہوگا کہ یہ قومی ادارہ جس کے لیے ہم برابر "ہماری یونیورسٹی" "ہماری یونیورسٹی" کی رٹ لگاتے رہتے ہیں کیا اس کو ہم آج کے دور میں چند عمارتیں نہیں دے سکتے۔ قومی غیرت اور حمیت، عزت نفس اور خودداری نام کی کوئی چیز اگر ہم میں باقی ہے تو باحیثیت لوگ، ہمدرد لوگ اور صاحب عزم آگے آئیں اور اس کام میں یونیورسٹی کی مدد کریں۔ خاص طور پر پلیٹینم جوبلی کے موقع پر سرسید کو کیا اس سے بڑا خراج عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے۔

سرسید ہال میں جامع مسجد سے لٹن لائبریری تک جن عمارتوں کا سلسلہ ہے وہ نہ صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے اہم ہیں بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کی آئینہ دار اور یہی گواہ بھی ہیں۔ مشتاق منزل، آسمان منزل، نظام میوزم، اسٹریچی ہال، بیک منزل اور لٹن لائبریری کی عمارتیں اپنے طرز تعمیر اور در و بام کی تزئین کے اعتبار سے باوجود سادگی کے جلال و جمال کی مظہر ہیں ؎

تراجلال و جمال مرد خدا کی دلیل وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

وکٹوریہ گیٹ جو مسلم یونیورسٹی اور سرسید ہال کا صدر دروازہ ہے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں عمارتوں سے اس عظیم الشان ادارے کی داغ بیل پڑی اور ایک عرصہ تک یہ مسلم یونیورسٹی کا محور بنی رہیں۔ ان عمارتوں کے طرز تعمیر اور ان کی عمارت سازی کے فن پر علیحدہ سے ایک مقالہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ فی الوقت اس پر کوئی تبصرہ مقصود بھی نہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے ارتقا میں ان عمارتوں کی جو اہمیت رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان عمارتوں کے تاریخی پس منظر میں ان کی خصوصی دیکھ بھال ہونی چاہیے۔ اسٹریچی ہال جیسی شاندار عمارت کسی دوسری یونیورسٹی میں ملنا مشکل ہے۔ لیکن آج یہ جس کس مپرسی کی حالت میں ہے وہ وضاحت چاہتی ہے۔ جواب ہم کو دینا ہے کیونکہ ہم اس کے وارث ہیں۔ کبھی کبھار بیڈمنٹن کی مشق یا ٹورنامنٹ یا پھر عیدین کی نمازیں یا کوئی غیر اہم سی تقریب اس کا مقدر بن چکی ہیں۔ یہی وہ عمارتیں ہیں جن کی تعمیر میں بقول حالی "برسوں بلا ناغہ دو دو پہر اور تمام تمام دن سخت سے سخت موسموں میں وہ خود (سرسید) مزدور بنا جا کر بیٹھے ہیں۔ اور اپنے سامنے راج مزدوروں اور سنگتراشوں ...

تو سرسید حسن کو دیوانگی کی حد تک مدرستہ العلوم سے عشق تھا کر گزرے اب یونیورسٹی کے کسی صدر نشیں سے اُس کی غیر معمولی مصروفیات کی بنا پر اس بات کی امید کرنا امید موہوم سے زیادہ نہیں۔ گو کہ زمانہ بدل گیا ہے، اس کے تقاضے بدل گئے ہیں لیکن پھر بھی ان کے وارثوں سے یہ تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کم سے کم ان کی اس یادگار کو برقرار رکھیں۔ بلکہ اس کو مسلم یونیورسٹی کا سب سے دلکش قطعہ بنانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں۔ اس ضمن میں ہم کو کچھ اہم فیصلے کرنے ہوں گے۔

(۱) اس پورے علاقہ کی خصوصی دیکھ ریکھ کے لیے یونیورسٹی کو الگ سے اپنا ایک آرکیالوجی کا شعبہ قائم کرنا ہوگا۔

(۲) اس وقت جو کمرے سینٹرل ہوسٹل کے نام سے طلبہ کی رہائش کے لیے مخصوص ہیں ان کو خالی کرانا ہوگا اور ان کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنا ہوگا۔ ان کمروں میں یونیورسٹی کا شعبۂ رابطۂ عامہ، پبلیکیشن ڈویژن، علی گڑھ گزٹ تہذیب الاخلاق اور فکر و نظر کے دفاتر قائم کیے جا سکتے ہیں اور کسی ایک کمرے کو پریس کانفرنس کے لیے مخصوص کیا جا سکتا ہے۔

(۳) اسٹریچی ہال میں ایک اوسط درجے کا بہت خوبصورت اور جدید ترین الکٹرونک آلات سے لیس آڈیٹوریم قایم کیا جا سکتا ہے جس میں تقریباً پانچ سو نشستوں کا انتظام ہو سکتا ہے۔ یہاں یونیورسٹی کورٹ اور اکیڈمک کونسل کی میٹنگوں کے علاوہ یونیورسٹی کے سیمنار اور کانفرنسوں کا انعقاد بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۴) نظام میوزیم کی عمارت میں یونیورسٹی سے متعلق میوزیم ہونا چاہیے۔

(۵) بیک منزل اور لٹن لائبریری میں کوچنگ اینڈ گائیڈنس سینٹر کی لائبریری اور ریڈنگ روم قائم کیا جا سکتا ہے

(۶) ایس۔ ایس۔ ایسٹ میں جو لکچر تھیٹر ہے اور غالباً یونیورسٹی کی قدیم ترین لکچر تھیٹر ہے اس کو اسی صورت میں رکھا جانا چاہیے۔ کوچنگ سینٹر کے بڑے کلاس اس میں لگنے چاہییں۔ موجودہ کوچنگ سینٹر میں ایس۔ ایس ہال (نارتھ) کا کامن روم اور ریڈنگ روم منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ایس۔ ایس ہال (ساؤتھ) کے کامن روم کو موجودہ لینڈ اینڈ گارڈن کے دفتر میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اور دفتر کو کہیں اور جگہ دی جا سکتی ہے۔

کسی زمانے میں پوری یونیورسٹی ایس ایس ہال میں ہوا کرتی تھی لہٰذا اس وقت اسٹریچی ہال کمپلکس کو درس و تدریس جیسے اہم کام کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ویسے ان عمارتوں کے سلسلے میں یونیورسٹی کورٹ کی واضح ہدایات بھی ہیں جو یونیورسٹی آرکائیوز سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ بہر حال ہماری ناچیز رائے میں اس کمپلکس کو رہائش، تفریح اور کھیل کود کے لیے ہرگز استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئی رہائش گاہیں اور کھیل کود کے لیے انڈور اسٹیڈیم تعمیر کرانا چاہیے اور اگر اس کام کے لیے ہم قوم کے سامنے دست سوال دراز کریں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

● "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ"، جس کا اجرا ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے ترجمان کی حیثیت سے ہوا تھا اور بغیر کسی رکاوٹ کے علی گڑھ گزٹ کے نام سے ۱۹۹۳ء تک نکلتا رہا، پھر اچانک بند ہو گیا اس کی جگہ News & Views و خبر و نظر نے لے لی۔ ہم کو اس نئے خبرنامے کے نکلنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک اخبار جو اتنے طویل عرصے تک بغیر کبھی بند ہوئے نکلتا رہا یکلخت بند کر دیا گیا، یقیناً خوش آئند بات نہیں ہے۔ وائس چانسلر صاحب اس امر کی طرف اپنی خصوصی توجہ فرمائیں۔

جہاں تک اور دوسری تقریبات کے انعقاد کا تعلق ہے وہ ضروری ہیں خاص طور پر یونیورسٹی کا کانوکیشن (۱۹۸۶ء کے بعد نہیں ہوا) کہ یہ ایک ایسی تقریب ہے جو کسی بھی اعلیٰ تعلیمی ادارے کے نارمل ہونے کی پختہ دلیل ہے۔

سید حامد*

پہرے دار کی موت

اس نے اپنی راہ الگ نکال لی تھی۔ چھوٹے شہر میں ہر شخص اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ کسی کو کسی کی فکر نہ تھی۔ پھر شہر کی سلامتی اور خوشحالی کی سبیل کون کرتا؟ ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ زندگی کا مقصد ہے کھاؤ پیو، عیش کرو اور خدا کی وہ کثیر مخلوق جسے کھانا ٹھیک سے میسر نہیں، اس کی طرف مڑکر بھی نہ دیکھو۔ خود غرضی نے شہر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے، لوگ بکھر کر رہ گئے تھے۔ کسی دوسرے کی مدد کرنے، اس کی حاجت روائی کرنے کے لیے یہ لوگ تیار نہیں تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ پھر دوسرے بھی وقت پڑنے پر ان کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔ نفسی نفسی کا بازار گرم رہے گا۔ شہر فصیل جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی تھی لیکن جو لوگ گھر سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ شہر فصیل کی مرمت کے لیے پیسہ اور وقت کیوں خرچ کرنے لگے۔ اس شہر کی عافیت کو ہر وقت خطرہ تھا۔ اس کے اطراف میں جو بڑا شہر تھا سارے ساز و سامان اور تمام وسایل پر اسی کا قبضہ ہو جاتا تھا۔ چھوٹا اور شکستہ خستہ شہر تنگی اور بدحالی میں گزر کر رہا تھا۔ ملک کی سرکار بھی اس کو نظر انداز کیے بیٹھی تھی۔ شہری ایک آواز ہو کر کچھ مانگتے تو وہ سنتی بھی لیکن یہاں تو خود غرضی کے تحت اتنی ہی آوازیں اُٹھتی تھیں جتنے آدمی تھے اور وہ بھی ایک دوسرے سے برسرِپیکار، ایک دوسرے کے درپئے آزار۔

چھوٹے شہر والوں کو پڑھنے لکھنے سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ "رزق دینے والا اللہ ہے۔ ہمیں جتنی ضرورت ہوگی قوتِ بازو سے کمالیں گے"۔ پڑھنے لکھنے کا نام نہ لیتے۔ لڑنے جھگڑنے میں پیش پیش رہتے۔ دُنیا تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور وہ پیچھے کی طرف جا رہا تھا اور اپنی پس روی پر مطمئن تھے۔ گھمنڈ اور اکڑ نے ان کو اور کھوکھلا کر دیا تھا۔ خوابِ غفلت میں پڑے رہتے، جاگتے تو باہمی عداوت اور الزام و دشنام کا راگ الاپتے۔ ایک دوسرے کی نیت پر شبہ، ایک دوسرے سے بدگمانی۔ یہی ان کا شعار تھا، یہی ان کا مشغلہ۔ حسد اور غیبت نے انھیں کہیں کا نہ رکھا تھا۔ شہر اجڑتا چلا گیا اور ان کی طمانیت پر کوئی آنچ نہیں آئی۔

ہاں! ان ہی لوگوں میں سے گنتی کے کچھ لوگ ایسے اُٹھتے جنھوں نے علم کی شمعیں روشن کیں، عمارتیں بنائیں، ادارے کھولے، کالج قایم کیے، انجینیرنگ کالج اور میڈیکل کالج بھی ان کی کوششوں سے وجود میں آئے۔ چوں کہ اس شہر میں اس طرح کے تعمیری ذہن اور علمی بصیرت والے افراد بہت کم تھے۔ اس لیے ان کی بڑی قدر ہوئی۔ انھوں نے بڑا نام کمایا، سماج میں ان کی عزت بڑھی، اقتدار بڑھا۔ عوام نے انھیں سر پر بٹھایا۔ اُن کے فلاحی کاموں نے جا بجا خراج حاصل کیا۔ انھیں اپنی محنت کا گویا صلہ مل گیا۔ جب تک ان کے قایم کیے ہوئے ادارے باقی ہیں اُن کا نام زندہ رہے گا۔ عام غفلت کے اندھیرے میں اداروں کے بانیوں کا نام اور چمکتا ہے۔

* سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی، 110062

اسی شہر سے ایک اور شخص اُٹھا۔ نام و نمود سے بے نیاز، بیگانہ۔ اس نے کوئی ادارہ قایم نہیں کیا، کوئی انجمن نہیں بنائی۔ اس نے اپنے ذمّہ وہ کام لیے جن سے بکھراؤ دور ہوتا ہے، ناسلامتی کا احساس مٹتا ہے۔ تفرقہ اور انتشار سے نجات ملتی ہے۔ ربطِ باہم کو فروغ ہوتا ہے۔ جہالت زایل ہوتی ہے۔ اس نے فصیلِ شہر کی مرمت شروع کی۔ جب وقت ملتا ٹوٹے ہوئے رَدّے درست کرنے میں لگ جاتا۔ اس نے پہرہ داری اختیار کی اور پیروکاری۔ پہرہ داری سے مراد داخلی طور پر تعلیم و تنظیم کے ذریعے اہلِ شہر کو متحد، باخبر اور مضبوط بنانا، انھیں خطرات سے بروقت آگاہ کرنا۔ پیروکاری کے دو رُخ ہیں، ایک سرکار کی طرف، دوسرا عوام کی جانب۔ پیروی یا پیروکاری کی اہمیت اس لیے بہت بڑھ گئی ہے کہ اس شہر کے باشندے ترجمانی کو ترستے ہیں۔ ان کے نمائندے ان کے حق میں اربابِ اختیار کے سامنے کبھی منھ نہیں کھولتے۔ انھیں اس کا موقع نہ بزدلی دیتی ہے نہ خود غرضی۔ اس شخص نے سوچا کہ جو کام عوام کے نمائندے نہیں کر رہے ہیں وہ اسے کرنا چاہیے۔ حکومت کو یہ بتانا ضروری ہے کہ شہریوں کے مسایل کیا ہیں۔ ان کے ساتھ کیا کیا غفلتیں برتی گئی ہیں، تلافی مافات اب کس طور کی جا سکتی ہے۔ غفلت سے باز آکر اگر حکومت کوئی احکام اس شہر کے عوام کے حق میں صادر کرتی ہے تو یہ شخص ان کی تعمیل پر نظر رکھتا ہے۔ مبادا سرکاری ملازمین ڈنڈی نہ مار دیں۔ ایسا نہ ہو کہ حکومت کو ہمدردی اور فراخ دلی کی داد بھی مل جائے اور شہریوں کو فائدہ بھی نہ پہنچے۔ حکومت کا دائرۂ کار اور حلقۂ اختیار اور حصارِ انتفاع اتنا وسیع ہے کہ جو اس کی نگہِ لطف سے محروم ہوا وہ ہر طرح سے ٹوٹے بنا نہیں رہا۔ 'نگہِ لطف'، تو غلطی سے زبانِ قلم سے نکل گیا، مقصود نگہِ انصاف تھی۔ اپنے حقوق اور سرکار کے پیدا کردہ مواقع سے باخبر رہنا اور جرأت کے ساتھ انصاف کا مطالبہ کرنا اور انصاف نہ ملنے پر احتجاج کرنا، ترجمانی اور پیروی کا یہ فرض تھا جو اس شخص نے اپنے طور پر جرأت اور مداومت کے ساتھ انجام دیا۔ اسے اس صبر طلب، دوررس اور دیرپا کام کی نہ داد ملی، نہ درکار تھی۔ وہ اپنے کام کی افادیت سے واقف تھا؛ عمر کا آخری حصّہ اس نے اسی میں لگا دیا۔ پہرہ داری کے ساتھ تو کبھی کبھی کانوں میں پڑھی گئی لیکن پیروی، سرکار سے چھوٹے شہر کے مکینوں کی پیروی وہ مدّتوں بڑی خاموشی کے ساتھ کرتا رہا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اس نے جو کچھ حکومت کو سمجھایا، جو کچھ منظور کرایا، اس پر عمل کی جس طرح نگہداری کی، وہ سب کچھ نگاہوں سے اوجھل رہا؛ لیکن اثر اس کا سارے شہر میں سرایت کر گیا۔ امکانات سے آگہی حوصلے کو غیر محسوس طور پر بڑھاتی ہے اور عوام کو ہنگامہ خیزی کے بجائے تعمیری جدّوجہد کی طرف لاتی ہے۔

پہرہ داری کا انداز یہ تھا کہ فصیل کی دیواریں گرنے لگتیں تو اُن کی مرمت کا سر و سامان کرتا۔ کجی دور کرنا، کنّی بسولی لے کر جہاں چھید ہو جاتے، رخنے پڑ جاتے انھیں اینٹ اور گارے سے بھرتا۔ کیسا انوکھا پہرے دار تھا کہ ضرورت پڑنے پر معماری بھی کر لیتا تھا۔ دیواریں مضبوط اور مستحکم نہ ہوں تو پہرے کے کیا معنیٰ۔ مرمت نہ کرتا تو حفاظت کیسی ہوتی۔ بے حسی اور خود غرضی کی دیواروں میں البتہ اس نے تحریر و تقریر سے شگاف ڈالے۔ جابجا جلسے کیے اور حکومت سے پے در پے مطالبات کیے کہ اس شہر کی شکایات کو دور کرے اور اسے پسماندگی سے نجات دلانے کے لیے پروگرام بنائے۔ اقتصادی بدحالی اور تعلیمی پچھڑے پن سے اسے چھٹکارا دلانے کی تدبیر کرے۔ اس نے گھریلو دھندوں اور صنعتوں کے سروے کرائے۔ اس نے نئی تعلیمی پالیسی میں محروموں کی امداد کے لیے ایک باب کا اضافہ کروایا۔ اسے یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ ملک کے بندوبست میں چھوٹے شہر کے باشندوں کا حصّہ نہیں کے برابر ہے۔ سرکاری نوکریاں ان غریبوں کو کہاں ملتی ہیں۔ اس نے حکومت کا دروازہ کھٹکھٹایا کہ نوکریوں میں تحفظ نہیں دیتے ہو تو مقابلے کے لایق تو بن جانے دو۔ مختلف متعلقہ وزارتوں میں کئی سال کی جدوجہد کے بعد اس نے چھوٹے شہریوں کو مقابلے کے لیے تیار کرنے کی اسکیم منظور کرائی اور دس سال تک اس کے نفاذ میں یو۔جی۔سی کی مدد کرتا رہا۔ اس اسکیم کے تحت قایم ہونے والے ۵۳ مراکز نے کچھ کامیابیاں حاصل کیں لیکن ایک بڑا کام انھوں نے یہ کیا کہ عوام کے اندر مقابلے کی آگ کو سلگا دیا۔ بڑی کامیابی البتہ ایک اسٹڈی سرکل

نے حاصل کی جو اس کے زیرِ ہدایت نئی دلّی میں تربیت ہوتی رہی۔

ایک نئی یونیورسٹی کو وجود میں لانے میں بھی اس کا بڑا دخل رہا، اسی نے پروجیکٹ بنایا، اسی نے مختلف مراحل سے گزار کرا منظور کرایا۔ تعلیمی سروے کا ملک گیر کام اس کے زیرِ ہدایت انجام کو پہنچا۔ تلاشِ صلاحیت اور وظایف کی اسکیم اسی کے ہاتھوں نے ڈھالی۔ شاہجہاں آباد اور بیرونِ شاہجہاں آباد تین اسکول اس کی نگرانی میں چلتے رہے۔ ہمارے پہرے دار نے حکومت کے ان شعبوں سے جو تعلیم، تربیت اور روزگار سے تعلق رکھتے ہیں، رابطہ قایم کیا۔ سینٹرل وقف کونسل اور مولانا آزاد ایجوکیشن فاونڈیشن کے ذریعے اس نے تعلیم و تربیت کی راہیں نکالیں۔ اردو یونیورسٹی کی تجویز کے خاکے میں اس نے آب و رنگ بھرا اور اس کو تعلیم تسلسل کی بازیابی کی نہج پر ڈال دیا اور ابتدا سے لے کر ایکٹ بننے تک کے سارے مرحلوں میں اردو یونیورسٹی کمیٹی کی سفارش کی نگہداری کی۔ مسز گاندھی کے پندرہ نکاتی پروگرام اور نئی تعلیمی پالیسی کے عملی پروگرام کا مفصل جائزہ اس نے لیا اور سرکار کو بتا کہ چھوٹے ہنر والوں کے فایدے کے یہ پروگرام کاغذ سے آگے بڑھنے نہیں پائے۔

پیرو کار کی پیروی یک رخی نہیں تھی۔ ایک طرف حکومت سے رجوع، دوسری طرف عوام سے خطاب، ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔ بہت دنوں تک اس نے اپنی بات مضامین کے ذریعے پہنچائی، پھر وہ کارواں لے کر ان کے دروازوں پر دستک دینے کے لیے نکلا۔ ان سے التجا کی خدارا پڑھو لکھو، سوچو سمجھو، مل کر رہو، معاشرے کو بری رسموں اور عادتوں سے بچاؤ، اردو زبان کی فکر کرو، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دو۔

اس نے دینی مدارس کا رشتہ عصری تعلیم سے جوڑنے کی کوشش کی، ان کی اسناد کو تسلیم کرایا، ان سے التجا کی کہ عصری مضامین کو بھی نصاب میں داخل کریں اور حکومت سے رجوع کیا کہ اپنے اعلان کی لاج رکھے اور مدارس کی مدد عصری تعلیم کے لیے افرادی قوت سے کرے۔ پہرے دار کی آنکھ ہر وقت نگراں تھی، جہاں سرخ روشنی نظر آئی، اس نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔ بابری مسجد کے بارے میں اس کی بات کسی نے نہیں سنی۔ وہ چاہتا تھا کہ فیصلہ عدالت پر چھوڑا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مفاہمت کی بات کی جائے۔ اس کے بجائے جارحانہ انداز اختیار کیا گیا جس سے انتہا پسند ہندووں کی بن آئی اور ملک کی سیاست کا پانسہ پلٹ گیا۔ مسجد کو تنگ نظروں نے شہید کر دیا۔ حوصلے ایسے ٹوٹے کہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ آزمائش کی اس گھڑی میں اس نے شکستہ دلوں کی ڈھارس بندھائی، حوصلہ بڑھایا، انھیں سمجھایا کہ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ مظلوموں نے اس کی پر استقامت، بے خوف، سنجیدہ آواز سے ہمت اور اعتماد اخذ کیا۔ پہرے دار کی آواز پہلے کی طرح پاٹ دار تھی۔ اس میں نہ ارتعاش تھا نہ خوف، نہ مایوسی، نہ اضطراب۔

چھوٹے شہر کے سب سے بڑے ادارے پر اس کی ہر وقت نگاہ تھی کہ دوست نما دشمن اس کے درپئے استحصال و آزار تھے اور یہ ادارہ سرچشمہ سارے شہر کے لیے علم روشنی اور توانائی کا تھا۔ وہ اس سے دور دور رہا لیکن جب کبھی ادارہ پر مصیبت آئی وہ کود پڑا اور اس وقت تک نہ ہٹا جب تک آفت ٹل نہ گئی اور دشمن پسپا نہ ہو گئے۔

پہرے داری اور پیرو کاری کرتے ہوئے ایک روز اس نے رختِ سفر باندھ لیا۔ بالکل اسی انداز سے جیسے وہ دنیا میں آیا تھا۔ کسی کو پتہ نہیں چلا کب آیا اور کب چلا گیا۔

برہنہ آیا تھا یاں عدم سے برہنہ یاں سے چلا عدم کو
نہ بوئے کافور میں نے سونگھی، نہ داغ مجھ کو لگا کفن کا

فارسی کا ایک قطعہ ہے:

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو — ہمہ خنداں بُدند و تو گریان
آں چناں زی کہ وقتِ مُردنِ تو — ہمہ گریاں بوند و تو خندان

[تجھے یاد ہے جب تو دنیا میں آیا تھا اس وقت سب ہنس رہے تھے اور تو رو رہا تھا۔ زندگی اس طرح بسر کر کہ جب تو دُنیا سے جانے لگے تو سب روتے ہوں اور تو ہنس رہا ہو] ۔

پہرے دار دُنیا سے ہنستا ہوا تو نہیں گیا، جس شہر کے باہر وہ پہرہ دیا کرتا تھا اس کی طرف سے وہ آخر دم تک فکرمند رہا۔ شہر فصیل اب بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ پیوندکاری سے دراصل کام نہیں چلتا۔ اطمینان کی اتنی رمق ضرور تھی کہ علم کی ضرورت کا عوام کو کچھ احساس ہو چلا تھا، سیّد والا گہر نے جو شمع روشن کی تھی، اس کی لو مدھم ہونے کے بعد پھر اُجلا گئی تھی۔ زیاں کا احساس جو دب گیا تھا، اُبھرنے لگا۔ پہرہ دار جاتے وقت یہ تو نہ کہہ سکا کہ

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم — شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

[میں نے اپنی عمر کا نچوڑ ایک حبیب کی راہ میں نچھاور کر دیا۔ اپنی زندگی سے خوش ہوں کہ جو کام کرنے کا تھا میں کر گزرا] ۔

لیکن یہ خیال ڈھارس بندھاتا رہا کہ یار کی راہ میں چند قدم چلنے کی توفیق تو ہو گئی۔ جانکنی کے وقت یہ بات بھی اس کے لیے سکون کا باعث تھی کہ اس نے اپنی ذاتی اغراض کو بروے کار نہ آنے دیا۔ مقاصد میں شرک کو گوارا نہیں کیا۔ فصیل کی مرمت میں لگانے کے لیے جو اینٹیں اس نے منگائیں ان میں سے ایک اینٹ اپنے گھر میں بھی لگائے، یہ خیال کبھی اس کے ذہن میں نہ آیا۔ جو روشنی اس نے پھیلائی تھی اس سے اپنے آنگن میں اُجالا کر دے یہ اس نے کبھی نہیں سوچا۔ ناموری کی خواہش نے جب کبھی سر اُٹھایا پہرے دار نے اسے کچل دیا۔ اسے اس کا اضطراب ضرور تھا کہ بُلاوا آنے سے پہلے وہ اپنے نجی مسایل کو سمیٹ نہ سکا۔ لیکن دنیا کا کام پورا کس نے کیا ہے۔ یہ کام اگر پورا ہو جاتا تو شاید وہ فکرمند مسکراہٹ کے ساتھ داعیٔ اجل کو لبیک کہتا۔ نزع کے عالم میں یہ آرزو اسے بیتاب کیے ہوئے تھی۔

اس سے پہلے موت آجائے کہ نقشِ رُوئے دوست — موت کے پرتو سے کچھ مدھم نظر آنے لگے

جانے والی کی روداد تو آپ نے سن لی۔

جو لوگ رہ گئے، انھیں روتے کسی نے نہیں دیکھا۔ نہ وہ ہنستا ہوا گیا نہ دُنیا کو روتا ہوا چھوڑ گیا۔ خلقِ خدا کو خبر بھی نہ ہوئی اس کے جانے کی۔ ہمسایہ میں بعض لوگوں نے "جاگتے رہو" کی آواز نہ سنی تو انھوں نے سوچا کہ بوڑھے کی قضا آگئی۔ آخر کب تک جیتا۔ تین چوتھائی صدی کیا کم ہوتی ہے۔ دوامی پڑھ لکھوا کر تو کوئی نہیں لاتا۔ بعض لوگ جو اس سے عاجز تھے انھوں نے کہا اچھا ہوا بُڈھا مر گیا۔ 'جاگتے رہو، جاگتے رہو'، سے نیندیں حرام کر دیتا تھا۔ اس پر مستزاد رات بھر کھانستے رہنا۔ ایسا لگتا تھا اسے دوسروں کا سونا ناگوار تھا۔ خود نیند نہ آئے تو سب کی نیندیں اچاٹ دینا کہاں کی شرافت ہے۔ چلو پاپ کٹا۔ مختصر یہ کہ لوگ اس آواز کو اور آواز دینے والے کو چند روز میں بھول گئے۔ کوئی ادارہ، کوئی انجمن، کوئی عمارت کوئی لوحِ مزار، کوئی کتبہ اس کے نام کا باقی نہیں رہا۔ آنے پر تو اختیار تھا نہ اس میں انتخاب کی کوئی گنجایش تھی لیکن گیا وہ اسی طرح جیسے وہ چاہتا تھا۔ پہرے دار کے ایک مزاج داں نے کہا سب لوگ آتے بھی تنہا ہیں اور جاتے بھی تنہا ہیں لیکن پہرے دار آنے اور جانے کے بیچ میں بھی تنہا تھا۔ زندگی بھر وہ اکیلا رہا، اکیلا آیا، اکیلا گیا۔ اس نے اس طرح کاٹی کہ دن میں پیروکاری کرتا رہا اور رات کو پہرے داری۔

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

پروفیسر محمد یٰسین انصار کا*

ڈاکٹر ضیاءالدّین کے چند کارنامے

انسانی زندگی کی مدت مجموعی طور پر تین حصوں میں منقسم کی جا سکتی ہے۔ اول بچپن کا زمانہ جب کہ انسان کو ما
حال اور مستقبل کا کوئی شعور ہی نہیں ہوتا۔ فکروں سے آزاد اور اپنے ماحول ہی کو زندگی سمجھتا ہے۔ دوم آگے بڑھے
جوانی دیکھی۔ اس دور میں ماضی و حال قریب قریب ایک ہو جاتے ہیں اور مستقبل، ماضی اور حال پر حاوی ہو جاتا ہے۔
تیسرا دور پیری کا ہے اس دور میں انسان ماضی اور ماضی کے واقعات ہی میں سرگرداں رہتا ہے۔ سوتے میں بھی ماضی
ہی وابستہ واقعات خواب میں نظر آتے ہیں۔ زندگی کے اس دور میں انسان یا تو اپنے کو ماضی ہی سے وابستہ کر لیتا
اور اپنے ماضی اور وہ بھی اپنے بچپن اور جوانی کے درمیان دور سے جا لگتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس دور میں زند
بعد الموت کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ ہر صورت میں حال کی طرف توجہ کم ہو جاتی ہے۔

میں سنہ ۱۹۴۲ء میں اس عظیم درسگاہ جس کو عام طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانا جاتا ہے قریب ۱۸
سال کی عمر میں داخل ہوا۔ ایس۔ ایس ایسٹ کمرہ نمبر ۲۲ میں رہا۔ غالباً یہ اس عظیم درسگاہ کے زریں دور کا آخری ز
تھا۔ اس دور کے اساتذہ میں ڈاکٹر سر ضیاءالدین (جو اس وقت وائس چانسلر بھی تھے) پروفیسر عبدالمجید قریشی
(جو ایس۔ ایس حال کے پرووسٹ بھی تھے) کرنل محمد حیدر، پروفیسر بابر مرزا۔ پروفیسر ہادی حسن۔ پروفیسر محمد حبیب
قابل ذکر ہیں۔ یوں تو مجموعی طور پر تمام اساتذہ قابل صد احترام تھے اور طلبہ بھی انھیں اعلیٰ معیار اساتذہ کی طرح تھے۔
ایک اپنا ثانی آپ تھا۔ اساتذہ کو طالب علموں سے پدرانہ شفقت اور یونیورسٹی دلی لگاؤ تھا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان اساتذہ میں سے بعض میں مقناطیسی کشش تھی۔ ایک بار ان سے ملنے کے بعد
بار بار ان سے ملنے کو جی بے قرار رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو یہ کشش اپنے دل کے راز بھی ان اساتذہ پر افشاں کرنے کا
بن جاتی تھی۔ ان اساتذہ میں بعض دماغ پر حکومت کرتے تو بعض دل پر کچھ ایسے بھی تھے جو دل و دماغ دونوں پر حکومت
کرتے تھے۔ مگر کچھ اساتذہ دل و دماغ پر حکومت کرنے کے علاوہ اپنے گہرے نقوش اپنے شاگردوں پر چھوڑ گئے۔ ان میں
سے ایک استاد سر ضیاءالدین احمد بھی ہیں۔

سر ضیاءالدین نے مجھ کو سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں SPHERICAL-TRIGNOMETRY اور فلکیات (STRONOMY
کا درس دیا۔ ان مضامین میں ان کے معاون اور معین محترم استاد ابوالکاظم رضوی مرحوم تھے۔ غالباً وہ اسی سال

---

* سابق پرنسپل ذاکر حسین انجینئرنگ کالج۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ موجودہ پتہ :۔ اللہ والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جون ۱۹۹۵ء

شعبۂ ریاضیات میں استاد کی حیثیت سے مقرر ہوئے تھے۔

اس زمانہ میں شعبۂ ریاضیات باب اسحٰق کے پاس بالائی منزل میں تھا اور شعبہ کے صدر محترم استاد عبدالمجید قریشی مرحوم تھے۔ وائس چانسلر کا دفتر وکٹوریہ گیٹ کے پاس بالائی منزل میں تھا۔ دفتر نہایت مختصر اور زمانہ کی ٹیپ ٹاپ دکروفر سے بالکل مبرا تھا۔ ایک سیدھا سادا دفتر جسمیں کوئی بناوٹ اور سجاوٹ نہیں تھی۔ دوچار کلرک دوچار میزیں اور ٹائپ کرنے کی مشین۔ ہر خاص و عام چلمن اٹھا کر وائس چانسلر سے مل سکتا تھا اور اپنی مشکلات اور مسائل بیان کرسکتا تھا مگر اس کی نوبت بہت کم آتی تھی کیوں کہ طلبہ کے بیشتر مسائل پرووسٹ، وارڈن یا پھر طلبہ خود یا اساتذہ ہی حل کردیا کرتے تھے۔ وائس چانسلر کا دفتر تو صرف جہانگیر کی عدالت تھی کہ گھنٹہ بجایا اور وائس چانسلر صاحب متوجہ ہوئے...... سر ضیاء الدین مرحوم بیحد مشغول انسان تھے زیادہ تر یونیورسٹی کے معاملات، مالی امداد فراہم کرنے اور نئے نئے شعبہ جات کے منصوبے بناتے رہتے تھے اکثر و بیشتر دہلی اور علی گڈھ کے درمیان سفر کرتے صبح کو علیگڈھ تو شام دہلی میں بسر کرتے۔

باوجود اپنی مشغولیات بحیثیت وائس چانسلر اور دیگر فرائض کی ادائیگی کے اپنے درس وتدریس کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے جیسے اپنے دوسرے کاموں کو۔ کلاس مقررہ وقت اور متعینہ تاریخ پر لیتے۔ اگر ممکن نہ ہوتا تو اس کا اعلان قبل از وقت کرادینا اپنا فرض سمجھتے اور ان کی جگہ استاد ابوالکاظم رضوی مرحوم سبق دیتے۔ چنانچہ دو متوازی خطوط پر دو مضامین کا درس ہوتا۔ یعنی ایک درس ڈاکٹر صاحب کا اور دوسرا سبق رضوی صاحب کا۔ ڈاکٹر صاحب کا معمول یہ تھا کہ وہ سیدھے علیگڈھ ریلوے اسٹیشن سے اپنی ایک پرانی ذاتی موٹر کار سے وکٹوریہ گیٹ آتے اور وہاں سے شعبہ ریاضیات تک بغیر کسی چپراسی یا معاون کے تنہا پیدل چل کر آتے۔ لیکچر کے اہم نکات کا خاکہ باقاعدہ تسلسل کے ساتھ ان کے پیش نظر رہتا۔ ساتھ ہی ساتھ دنیا کا ایک عدد گلوب اور ستاروں اور سیاروں کی ایک عدد اٹیلس پہلے سے موجود رہتا۔

میں ڈاکٹر صاحب کے درس میں پہلی صف میں ان کے بالمقابل بیٹھتا اور باقاعدگی سے ان کے نوٹس لیتا اور بعد کو ان کے نوک و پلک درست کرکے مزید ترتیب دیتا۔ میرے ہم جماعت کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی علمی کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے درس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ ایک روز مرحوم بہت ناراض ہوئے اور طلبا کے نوٹس چیک کیے۔ نوٹس دیکھکر اور برہم ہوئے اور پوری جماعت کو اپنے دولت کدہ واقع میرس روڈ پر طلب فرمایا۔ خاطر و مدارات کے بعد اپنے لندن یونیورسٹی کی طالب علمی کے زمانہ کے نوٹس دکھائے۔ ہم لوگ ان کے کلاس نوٹس دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ باقاعدہ رنگین تشریحی خاکے اور بڑی ترتیب وسلیقہ سے دائرے مثلث وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ ان نوٹس دیکھ کر میرے دل پر گہرا اثر ہوا اور میں نے بھی اپنے آئندہ نوٹس تیار کرنے میں ڈاکٹر صاحب ہی کے نوٹس کو نمونہ بنالیا۔ بعد کو ترتیب، تسلسل اور سلیقہ سے پڑھنا اور پڑھانا میرے لیے بیحد مفید ثابت ہوا۔

منجملہ یونیورسٹی کو فروغ دینے کے استاد محترم کے تین اہم کام ہیں۔ ان سے مرحوم کی دوراندیشی، وسیع النظری اور ملک وملت اور یونیورسٹی سے لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے کے بعد سر ضیاء الدین نے حکومت کے کہنے پر WAR TECHNICIAN COURSES کا افتتاح کیا اس کا ایک ہوسٹل (جواب ایم۔ایم ہوسٹل ہے) بنایا۔ اس کورس کے کلاس موجودہ دفتر

پرنسپل انجنیرنگ کالج کے نیچے کی منزل میں ہوتے تھے۔ یہی اور دیگر ایسے کورس آگے چل کر ڈگری اور ڈپلوما انجن
ہو گئے۔ راقم الحروف نے ۱۹۴۴ء میں ڈگری کورس میں داخلہ لیا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم انجنیرنگ کالج آتے۔ اس
بنانے کے لیے وہ ایک انگریز پرنسپل پروفیسر میتھومین کو لائے۔ کلاس سرفراز ہاؤس اور لکچر گیلری میں ہوتے مجھے انہو
چھوٹی پرانی میز کرسیوں اور ایک چھوٹے سے پرنسپل کے دفتر میں بیٹھ کر پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔ مگر اساتذہ او
نے اپنے کو کالج اور طلبہ کے لیے وقف اور نذر کر دیا تھا۔ کلاس چھوٹے چھوٹے، کرسیاں تختہ کی، بلیک بورڈ مختصر
ایک الماری پر مشتمل اور ساز و سامان بہت معمولی بلکہ نہ ہونے کے برابر ایک دو کلاس تو پیڑ کے نیچے بھی ہوتے

ڈاکٹر صاحب کی کوشش سے ڈگری اور ڈپلوما مرکزی حکومت نے منظور کر لیے مگر کچھ صوبائی حکومتوں خاص
نے منظور نہیں کیے۔ چنانچہ پاس شدہ گریجویٹ لڑکوں کی ملازمت کا مسئلہ صوبائی حکومتوں میں التوا میں رہا۔ ڈا
تھکے نہیں اور منظوری کے لیے کوشاں رہے۔ ۱۹۴۶ء میں راقم الحروف کی جماعت کے یہ کام سپرد کیا کہ ہ
سول انجنیرنگ میں ریڈر محترم شبیر علی اسمٰعیلی کی قیادت میں علی گڑھ کی شید و فیکٹری جس میں اب آئی۔ ٹی آئی ہے، کا تخم
وہ تخمینا بنایا گیا اور کالج میں یہ خبر گرم جوشی سے گشت کر گئی کہ شیڈ و فیکٹریاں یونیورسٹی نے حکومت سے خرید لی ہیں یہ سب کچھ ڈاکٹر
مرحوم ہی کر رہے تھے۔ بعد میں وہ کیوں کر یونیورسٹی کے قبضہ اور ملکیت میں نہ رہیں یہ راز ہے۔ اس کے علاوہ کالج کے لیے ملا
کئی ٹرک، ہوائی جہاز، راڈار اور بہت سا الیکٹرونک کا سامان مرحوم حکومت سے لائے۔ چنانچہ منجملہ اس سامان کے ساتھ ا
جرمن الیکٹرونک انجنیر مسمیٰ برمن جو جرمن نسل کے تھے بھی آئے اور انہوں نے لڑکوں کو الیکٹرونک کے سامان کو استعمال کا
دی۔ افسوس یہ ہے کہ اس زمانہ کے ایک پروفیسر نے برمن کی علمی اور عملی صلاحیتوں کو پہچاننے سے انکار کیا اور
جس الیکٹرونک انجنیرنگ کا دنیا میں شور ہے شاید علی گڑھ ملک میں اس فن میں سب پر سبقت لے جاتا۔ انجن
فیکلٹی آج ترقی کی طرف گامزن ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ فیکلٹی میں سب ہی کورس ہیں۔ اساتذہ کا تعلیمی معیار بہت
ہے۔ کلاس روم کشادہ، میز کرسیاں اچھی اور تمام سہولیتیں فراہم ہیں۔ لائبریری تو ناک ہے انجنیرنگ کالج کی سا
سامان کا جواب نہیں مگر علم کے پیاسوں کی کمی ہے شاید اس کی وجہ ہر چیز کی فراوانی ہے۔ سرفراز ہاؤس کو دیکھیں او
انجنیرنگ فیکلٹی سے مقابلہ کریں تو اہل بصیرت کو عبرت ہو گی۔ اب یہ سر ضیاء الدین اور ان کے پیش رو حضرات کے خ
کی تعبیر ہے۔ علم کی پیاس عیش میں نہیں بلکہ تنگ و دو میں پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا خواب میڈیکل کالج کا قیام تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا اور اس کے قیام کے لیے ایک کثیر
درکار تھی۔ اس رقم کو فراہم کرنے کے لیے چندہ کیا۔ شہر شہر خود پھرے اور ایک پروفیسر جو ہفت زبان ہونے کے علاوہ جاد
بھی تھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہو لیے۔ یہ بڑے خوب رو بلکہ حسین و دلکش، شیریں زبان پروفیسر ہادی حسن مرحوم
طالبعلموں سے "جان من" ان کا تکیہ کلام تھا۔ ہادی حسن مرحوم دن رات سفر کرتے تھے اور ملک کے کونے کونے
چندہ لاتے ان حضرات کو کتنی ذاتی تکلیف اور ذہنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو گا اس کا اندازہ ان جیسے لوگ ہی
لگا سکتے ہیں۔ البتہ ان کی محنتوں کا صلہ میڈیکل کالج ہے جس سے آج ہزارہا انسان فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ افسوس کہ
سر ضیاء الدین کی حیات میں کالج قائم نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر صاحب کالج کے لیے ایک پورے ملٹری اسپتال کا ساز و سامان و آلات لائے اس میں ہر طرح کا

تھا یہ سب سامان انگلش ہاؤس نزد تار والے بنگلہ کے کمروں میں رکھ دیا گیا تاکہ کالج کے قیام کے وقت کام آئے۔ یہ تھی دوربینی، دوراندیشی اور ملت سے لگاؤ۔ سرضیاء الدین کا مشن ابھی نامکمل ہے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میڈیکل کالج میں چند نئے نصاباتِ تعلیم کی ضرورت ہے۔ ان نئے نصابات کی نشاندہی تو اس مضمون کے ماہرین تعلیم ہی کر سکتے ہیں، لیکن دانتوں کا کالج و پیرا میڈیکل کورس اور PHYSIOTHERAPY اور اسی قسم کے دیگر نصاب وقت کی پکار ہیں۔ ان کے علاوہ سوپر اسپیشلائزیشن (SUPER SPECIALISATION) بھی اہم ہیں۔ ہسپتالوں کے انتظامی امور کے مسائل دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ یہ مسائل عام طور پر طبی امداد سے زیادہ بجلی و پانی اور گیس کی فراہمی سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ نئے نئے بجلی کے آلات و عمارت کی دیکھ بھال و صفائی اور وقت پر آلات کی مرمت کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ ان مسائل کے پیش نظر ہسپتال کا انتظام HOSPITAL ADMINISTRATION ڈاکٹروں سے دور اور انجنیروں سے زیادہ قریب ہوتا جا رہا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ملے جلے کورس کا نصاب مرتب کیا جائے۔ یہ نصاب کئی شعبوں پر مشتمل ہوگا اور اس کا درس بھی کئی شعبہ مل کر دیں گے۔ یہ کورس ابھی عام نہیں ہے اور صرف چند یونیورسٹیوں ہی میں ہے۔ ڈبلو، ایچ، او۔ اس کورس میں دلچسپی رکھتی ہے اور ممکن ہے کہ یہ ادارہ ملازمت کے مواقع بھی بظاہر بہت اچھے ہیں۔

سرضیاء الدین کا تیسرا منصوبہ زرعی کالج کا قیام تھا۔ اس منصوبے کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے اپنے اثر و رسوخ اور ذرائع سے مرکزی حکومت سے علی گڑھ قلعہ اور اس کی ملحق آراضی یونیورسٹی کو دلائی۔ اس کے علاوہ حکومت نے بہت بڑا کوارسی فارم لیا۔ ۱۹۴۷ء تک یونیورسٹی کوارسی فارم کی مالک اور اس پر قابض تھی۔ اگر میری یادداشت مجھے دھوکہ نہیں دے رہی ہے تو ایک صاحب مسمّٰی لقمان صاحب فارم کے انچارج تھے۔ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ فارم چند شرائط پر دوبارہ مرکزی حکومت کو یونیورسٹی نے دے دیا۔ کوارسی فارم کیوں اور کیسے یونیورسٹی کی ملکیت سے نکل گیا؟ اس معاملہ کا پتہ صرف پرانی فائل اور کاغذات ہی سے مل سکتا ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ زرعی کالج چھوٹے پیمانہ پر حال میں شروع ہو گیا ہے اور اس کے چلانے والے نہایت ہی مخلص اور لائق حضرات ہیں۔

خدا کرے یہ چھوٹا پیمانہ وقت کے ساتھ بڑا ہو جائے اور اس زراعت سے متعلقہ تمام شعبہ مل کر ایک فیکلٹی ہو جائیں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی توجہ اب ڈیری فارمنگ کی طرف ہے تاکہ ملک میں دودھ اور دودھ سے تیار شدہ اشیاء کی فراوانی ہو اور ملک کے نوجوانوں کے لیے روزگار کے ذرائع بڑھیں ڈیری فارمنگ سے متعلق تمام مضامین تدریس وقت کی ضرورت ہے

ان تمام اور دیگر منصوبوں کے حصول کے لیے یونیورسٹی میں پرسکون فضا و اساتذہ اور طلبہ کا علمی رجحان ضروری ہے۔ اساتذہ اپنے انتظامی امور جو ان کو سونپے گیے ہیں ثانوی حیثیت دیں اور درس اور تدریس کو اپنا فرض عین تصور کریں۔ اسی طرح طلبا حصول علم کو دینی فریضے کی طرح اہم سمجھیں۔

بدلنا ہے تو رندوں سے کہو اپنا چلن بدلیں — محض ساقی بدل جانے سے میخانہ نہ بدلے گا

پروفیسر مقبول احمد *

صلاحیتوں کی بنیاد ، نشوونما اور صحیح استعمال

خداداد صلاحیتوں کی ودیعت کا ضرور کوئی مقصد ہے۔ مختلف اشخاص میں مختلف صلاحیتوں کے کچھ راز ضرور ہوں گے۔ اس کارخانہ قدرت میں ہر شخص کا ایک کردار ہے جسے بہر حال اسے ادا کرنا ہے۔ اسی قانونِ قدرت پر دنیا ایک خاص انداز سے جاری و ساری ہے۔

اللہ نے دنیا کو کھیل کود لہو و لعب یا جائے تماشا کے لیے پیدا نہیں کیا۔ ہر زندگی کا ایک مقصد ہے۔ تمام مخلوق ضروریات انسانی کے لیے پیدا کی گئیں ہیں۔ یوں تو بنی آدم کے فرائضِ عام مقرر ہیں۔ اس کے علاوہ مخصوص اور چیدہ اشخاص کے فرائض ان کی خداداد صلاحیتوں کی ودیعت کے مطابق ہیں۔ یہ انسانی ارتقا و ترقی نیز علوم و فنون کی بارآوری کے لیے ضروری ہے۔ ہر نفسِ انسانی کے لیے اس کی صلاحیتوں کے مطابق ایک مقرر شدہ "کردار" کا ادا کرنے کو "تقدیر" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہر نفس کو اس کی طاقت کے مطابق بوجھ دیے جانے کا ذکر کیا ہے

انسان کی فطرت میں خیر اور شر دونوں موجود ہیں۔ اسلام نفس امارہ کو دبا کر رکھنا اور نفس لوامہ کو ابھارتے رہنا سکھاتا ہے۔ اس کے لیے بھی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ صلاحیتیں کچھ تو پیدائشی ہیں اور کچھ انسان اپنی کوششوں اور مجاہدوں سے پیدا کرتا ہے۔ زندگی کی ابتدا ہوتے ہی ہر ذی نفس کو خداداد وجدان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنی زندگی کے شروع کے ایام میں اسے کیا کرنا ہے۔ بچہ کے پیدا ہوتے ہی اس کے دل و دماغ میں یہ بات بتدریج نشوونما پانے لگتی ہے کہ مخصوص ہدایت خداوندی اور احکام کے ذریعے یہ صلاحیتیں اللہ اپنے منتخب شدہ بندوں کے لیے معین کر دیتا ہے ایسی برگزیدہ ہستیوں میں پیغمبروں کے ساتھ اہل باطن بھی شامل ہیں۔

انسانی جسم کی بنیاد یعنی اعضا ایک جیسے ہو سکتے ہیں مگر دماغی اور جسمانی قوتیں مختلف ہوتی ہیں جس کا اصل محرک (Genes) توارثی نطفہ ہے۔ یہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ ان میں کبھی غیر معمولی تبدیلی بھی پیدا ہوتی ہے جو انسانی بناوٹ اور نشوونما و دماغی قوت میں غیر معمولی خصوصیتیں اور تبدیلیاں پیدا کر سکتی ہے۔

اچھے جینس (Genes) توارثی نطفہ غیر معمولی صلاحیتوں کی بنیاد ہیں اس کا تعلق خاندان سے ہے۔ اسی لیے خاندان کے بڑے اثرات ہیں۔ بچے کی جینس کا تعلق براہِ راست یا بلا واسطہ اس کے ماں باپ اور اجداد و اسلاف سے ہے۔ اسی لیے خاندان کی بڑی اہمیت ہے۔ شیر کی اولاد شیر ہوتی ہے اور چوہے کی چوہا۔

جینس (Genes) بے حد باریک ہوتے ہیں ان کو بغیر طاقت ور خوردبین کے دیکھا نہیں جا سکتا ان کی ایک خاص

---

* ۹ ۔ رپن اسٹریٹ ، کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۱۶ ۔

ساخت سے مرد اور دوسری سے عورت کا پیدا ہونا قانونِ قدرت ہے۔ ان کی مختلف ترتیب سے مختلف نتائج اور مختلف پیدائشی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔

صلاحیتوں کی بنیاد اور دماغ و بیل تو رحم مادر میں شروع ہی سے پڑ جاتی ہے جس کی آہستہ آہستہ نشوونما ہوتی ہے ماحول رحم مادری کے اثرات کا بھی اہم رول ہے۔ اس کی بنیاد پر اس کے اثرات بعد پیدائش بھی قائم رہتی ہیں اور آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی لیے ماں کو صاف و شستہ ماحول میں رہنا، اچھے خیالات کو پروان دینا، اچھی کتابیں پڑھنا بے حد مفید ہے۔

عرصہ ہوا ایک ہندوستانی سرجن نے جو بعد میں ہندوستان کے محکمہ صحت کے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے مانچسٹر کی ایک لیبر ٹری میں چند تجربات کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ ماں کی غذاؤں میں ضروری اشیاء کی کمی اور ماں کی بیماریوں کے خراب اثرات، رحم مادری میں بچوں پر پڑنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ماں کی فکر، خیالات اور حِس کا اثر بھی ان غیر زائیدہ بچوں پر پڑتا ہے۔ اسی لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ماں کو مناسب غذایت فراہم کی جائے اور اس کو دماغی سکون بھی حاصل ہو۔ بیماریوں سے بچایا جائے اور اس کے لیے مختلف اقدام اٹھائے جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس کے خراب اثرات سے بچوں میں پیدائشی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ نیز بعض تکالیف کے بعد عود کر جانے کے امکانات بھی ہیں

ماں کے لیے عموماً کم از کم ۷۰ گرام پروٹین، ۷۰ گرام تیل، گھی، مکھن ملا کر اور ساتھ ساتھ ہر قسم کے پھل اور وٹامن، ساگ و سبزی، ضروری غذا ہے تاکہ بچہ صحت مند ہو۔ اسی طرح دودھ اور کیلشیم کی ضرورت ہے۔ ماں کی ہر بیماری کا فوری علاج بھی ضروری ہے۔ نوزائیدہ بچے کی آمد کے لیے بڑے اہتمام کی ضرورت ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہندوستانی ڈاکٹر درگا سوامی نے لیور پول (LIVER POOL) میں حاملہ جانوروں کے بچوں پر مختلف دور میں مختلف چیزوں کے اثرات کا مشاہدہ کیا تھا مضر چیزوں کے زہریلے اثرات سے مختلف پیدائشی بیماریاں ہو سکتی ہیں۔ یہی بات انسانوں کے لیے بھی ہے۔ اسی لیے دورانِ حمل ضروری اقدام سے بچوں کو چند مہلک بیماریوں سے بچایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے تمام موجودہ تدابیر کا استعمال ضروری ہے تاکہ بچے تندرست اور باصلاحیت پیدا ہوں۔ صحیح اصولِ صحت کا جاننا اور اگر ضرورت ہو تو صحیح دواؤں کا استعمال لازمی ہے

یہ ہمیشہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ایک صحیح و سالم نیز پوری طرح تندرست جسم میں ہی ایک اچھے دماغ اور اس کی پوری صلاحیتوں کو قائم و دائم رکھا جا سکتا ہے۔

حاملہ خواتین کو ٹیٹنس (TETNAS) ایسی موذی بیماری سے بچانے کے لیے اس کے ٹیکے حمل قرار ہونے پر ایک ماہ کے اندر اور چار ماہ کے بعد دینا چاہیے اور آخری نو ماہ کے بعد۔

بچوں میں مختلف بیماریوں سے بچنے کے لیے حسب ذیل اقدام ضروری ہیں۔

(۱) (TRIPLE ANTIGEN) ٹرپل انٹی جن کے انجکشن ۱½ ماہ پر، بی۔ سی۔ جی اور پولیو کی پہلی خوراک۔

(۲) ۲½ ماہ پر۔ ٹرپل انٹی جن کا دوسرا ٹیکہ اور پولیو کی دوسری خوراک (۳) ۹ ماہ پر خسرہ کا ٹیکہ (۴) ۱۶ سے ۲۴ ماہ کے درمیان TETNAS TOXOID ڈی۔ پی۔ ٹی کا بوسٹر ٹیکہ اور پولیو (POLIO) کی خوراک۔

اچھے بچوں اور ان کی صلاحیتوں کی ایک جھلک شروع میں ہی نمایاں ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ہونہار بروا کے

ہوتے چلتے پھرتے....... ایک خام لوہے یا عمدہ لکڑی یا شہتیر کو کس طرح استعمال کیا جائے۔ اور اس کا کیا بنایا جائے، یہ خود ہم پر منحصر ہے۔ اسٹیل کے لوہے کو اگر استعمال ہی نہ کیا جائے تو بیکار اور بے مصرف ہو جاتا ہے۔ لوہا زنگ آلود ہو کر آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے، لکڑی سڑ جاتی ہے اگر اس اسٹیل کو صیقل کریں یا اچھا ملمع چڑھا جائے تو عمدہ سے عمدہ چیزیں بن سکتی ہیں۔ یہی حال شہتیر کا ہے۔ اس کے لیے صحیح منصوبے کوششِ پیہم اور بے پناہ مجاہدے کی ضرورت ہے۔

پیدائش کے بعد ہی وجدان سے بچہ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے ماں کا دودھ پینا ہے اور کس طرح پینا ہے۔ ماں نفسیاتی خواہشات اور ہارمونس (HORMONES) کی پیدائش کی وجہ سے ماں کا اپنے بچوں کو اپنا دودھ پلانا ضروری ہے۔ مغربی فکر کے زیرِ اثر اکثر مائیں اس کا خیال کم کرتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ماں کا دودھ پلانے کا رواج عام ہے۔ اس سے بچہ کی قوتِ دماغ بڑھتی ہے اور ماں سے جسمانی قربت، یہ نفسیاتی لگاؤ اور بچوں میں قلبی سکون پیدا کرتا ہے۔ اس سے بچوں میں انسانی قدریں بڑھتی ہیں۔ اس سے بچوں اور والدین میں ایک دوسرے سے محبت بڑھتی ہے

آج کل مغرب میں بڑھتے ہوئے جرائم، جنسی بے راہ روی اور غیر انسانی حرکتیں عام ہیں۔ ان کی ایک وجہ بچوں کو ماں کا دودھ نہ پلانا اور دوسرے شروع سے ان کو الگ تھلگ رکھنا ہے۔ اسلام نے اسی لیے ماں یا دایہ کا دودھ پلانا ضروری قرار دیا ہے۔

بچوں کو ڈھائی سال تک ماں کا دودھ ملنے سے ان میں قوتِ دماغ زیادہ، بیماریاں کم، جسمانی قوت دل و دماغ کی ترقی اور معقول نفسیاتی توازن پیدا ہوتا ہے۔ مغربی بچوں میں جو عام خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں وہ زیادہ تر اس کے فقدان سے ہیں۔ اسی طرح شروع سے ہی پوری غذائیت اور بضرورت عمر، مناسب مقدار میں پروٹینز اور وٹامن کھلانا چاہیے۔

بچہ کس ماحول میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا، اس کے دور رس اثرات ہوتے ہیں۔ بچوں کی صحیح جسمانی نشوونما اور پرورش کے لیے عمر کے لحاظ سے معقول غذا اور دیکھ بھال لازمی ہے زرخیز زمین میں اگر تخم بھی اچھے ہوں تو صحیح آبپاشی سے پودے اچھے اور پھول پھل سے لدے ہوتے ہیں، بچوں کی صحیح غذائیت اور ان کی دیکھ بھال ضروری ہے یہ آبپاشی اور کھاد کی طرح ہے۔

ماں کی بیماریوں کا اثر بچوں پر پڑتا ہے۔ اب حیاتی سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ ماں کی بیماری اور خاص طور پر زچگی کے دوران، اس کے کیا اثرات پڑیں گے کو بتایا جا سکتا ہے۔ پیدائشی بیماریاں جینس (GENES) کی خرابی کے علاوہ جسمانی غذاؤں کی کمی یا خراب اور زہریلے مادوں کے اثر سے ہو سکتی ہیں ان سب کے لیے مناسب اقدام ضروری ہیں .... تعلیم کا سلسلہ رحمِ مادر ہی سے شروع ہو کر تا حیات چلتا رہتا ہے۔ شاید یہ بچے کی ابتدائی نشوونما کے بعد قوتِ احساس پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے اسی وقت سے بچہ اپنے ماحول کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ ہر وہ چیز جو ماں پر اثر انداز ہوتی، اس کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ بچوں پر پڑتا ہے۔ پاکی اور صفائی سے رہنا نیک خیالات کا دل میں لانا اور اچھے اعمال کرنا ان سب کا اثر شروع سے ہی پڑتا رہتا ہے۔ اکثر حاملہ ماؤں نے مختلف آوازوں اور گانوں و قرآت قرآن کے اثرات اپنے بچوں پر محسوس کیے ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں کی حرکتوں کی رفتار اور دیگر مشاہدات سے اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

بچوں کے لیے اچھے اور بامعنی نام پسند کرنا سنت ہے۔ چند نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھے۔ خاص طور سے وہ نام جو قرآن شریف میں آتے ہیں۔ نام کے کوئی خراب معنی نہ ہونا چاہیے۔ اچھے ناموں کے اچھے اثرات ہوتے ہیں۔

تعلیم و تربیت کی ابتدائی بنیاد پر گھر والوں کا اثر کافی اہم، اور دیرپا ہوتا ہے۔ اگر یہ ناقص ہو گئی تو پوری دیوار کی بنیاد ناقص و کمزور ہوگی۔ اور اس لیے اس پر عمارت بھی ناقص اور کج ہوگی۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اپنے اور اپنے گھر والوں کا اخلاق بلند کریں۔ حلال و حرام کا خیال رکھیں۔ خود کو سنواریں اور گھر کا ماحول ٹھیک کریں تاکہ بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت درست ہو سکے۔

نوزائیدہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی صاف اور صحیح ماحول ضروری ہے۔ گھروں کی دیکھ بھال، رکھ رکھاؤ، مذہبی و اخلاقی ماحول پیدا کرنا، گھر کی مالکن کی ذمہ داری ہے۔ تعلیم نسواں، دیگر وجوہ کے علاوہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ماؤں میں صحیح ذوق اور عمدہ کردار پیدا ہو سکے، جس کا اثر بچوں پر پڑنا لازمی ہے۔ انگریزی کی مشہور کہاوت ہے "وہ ہاتھ جو پالنوں کو ہلاتے ہیں وہی دنیا پر حکومت کرتے ہیں"

بچوں کو گود میں بٹھانا، کھلانا اور یہاں تک کہ کاندھوں پر بٹھانا (سنت رسولؐ) ان سب کو بڑی اہمیت ہے اور یہ چیزیں نفسیاتی طور پر پُراثر ہوتی ہیں۔ شرافت، انسانیت، محبت، اخلاق، والدین کی عزت اور دیگر چیزوں کی بنیاد یہیں سے شروع ہوتی ہے ...... بچوں اور اپنے گھر کی اقتصادی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ باپ کا بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں بھی حصہ لینا ضروری ہے تھوڑا سا وقت اس کام کے لیے دینا ہوگا، تاکہ اولاد کی ذہنی، اخلاقی، مذہبی اور تعلیمی رہنمائی ہو اور وہ صحیح راستوں پر گامزن ہو سکے۔

انسانی زندگی میں مذہب ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ مذہب ہمارے کردار کو بلند کرتا ہے۔ ہم میں سچائی، ایمانداری خوفِ خدا، رواداری، صبر و استقامت پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے ہمارے گھروں کا ماحول صاف اور صحیح طور پر مذہبی ہونا لازمی ہے۔ .... ایک بڑا اہم کام حصول رزق کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ اس کے لیے تعلیم اور کسی خاص کام میں مہارت پیدا کرنا ضروری ہے۔ تعلیم کو صرف حصولِ رزق کے لیے حاصل کرنا بھی غلط ہے۔ اگر مقصد صرف حصولِ رزق ہو تو یہ انسانی ارتقا، روحانی پرورش اور اخلاقی بلندی کے لیے بالکل بے کار ہے اگر زندگی کا مقصد، کھانا، پینا، پہننا، اور رہنا ہی ہو تو اس کے لیے ایسی تعلیم کافی ہے۔ مگر تعلیم کا مقصد اس سے کہیں زیادہ بلند تر ہے۔ ایک زمانے میں کھاتے پیتے گھروں میں اتالیق کا رواج تھا۔ ضروری ہے کہ اس کو پھر رائج کرنے کی کوشش کی جائے آج کل اکثر و بیشتر یہ ممکن نہیں ہوتا اگر ہو سکے تو بڑا نافع ہوگا۔ شروع ہی سے جسمانی ورزش، پیراکی، اپنے باغ کی آب پاشی اور ان کی دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ اس سے جسم چست و تندرست رہتا ہے۔ پڑھائی لکھائی کے بعد یہ دماغ کو تازہ کرتا ہے۔ ایک تندرست جسم نہ صرف اچھے دماغ پیدا کرتا ہے بلکہ اس کی اچھی نشو و نما بھی کرتا ہے۔

بچوں کا کافی وقت اسکول میں صرف ہوتا ہے اس لیے ان کے اسکولوں کا معیار اچھا ہونا ضروری ہے۔ ہمیشہ اچھے اور معیاری اسکولوں میں داخلے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ایسے اسکولوں میں مسلمانوں کے لیے ریزرویشن ضروری ہے۔ ترقی کی بنیاد یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ایک نہایت ضروری بات ہے، بچوں کے لیے ان کے گھروں میں بھی دلچسپی کے سامان مہیا کرنا چاہیے تاکہ اگر ماحول سازگار ہو تو دماغی ترقی ہو۔

■ مادری زبانوں کا گھر میں استعمال اور اسکولوں میں ان کو زبانِ اول کے طور پر تعلیم سے دماغی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ غیر مادری زبان میں اچھی طرح واقفیت کے لیے جو وقت صرف ہوتا ہے وہ بچ جاتا ہے۔ نئی خیالات اور دماغی فکر کو مادری زبان میں ہی اچھی طرح بیان کیا یا سنایا جا سکتا ہے اس سے ادبیت کے معیار بھی بلند ہوتے ہیں اور لکھنے پڑھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

اچھے کالجوں اور دارالعلوم میں داخلے اور اگر ہو سکے تو اس کے ہوسٹل میں قیام، صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ تبادلہ خیالات مفید ہوتے ہیں۔ اس سے تعلقات بڑھتے ہیں۔ مل جل کر رہنے کی عادت ہوتی ہے۔ یہ سب آئندہ کی زندگی کے لیے بہتر ہے۔

جب بچے ذرا بڑے ہو جائیں تو اس وقت ہم اپنی تعلیم کا مقصد اپنے تجربوں کا جوشینہ، اپنی تاریخ، خاندان اور ملک و ملت کی روایتوں کو آسانی سے ان کی گھٹیوں میں داخل کر سکتے ہیں ہمارے اپنے بچوں کا ہم پر سب سے زیادہ حق ہے ہمیں اپنے خیالات و جذبات سے بچوں کو اچھی طرح مستفیض ہونے کا پورا موقع دینا چاہیے ہمارا ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ضروری ہے۔ بچپن ہی سے ان کے سوال و جواب اور ان کی ہر نئی چیز جاننے کی کوشش کو نگاہِ تحسین سے دیکھنا چاہیے۔ ان کے سوالوں سے گھبرانا اور نہ ہی پریشان ہونا چاہیے۔ بلکہ ان کے قابلِ فہم جواب دینا چاہیے۔ چھوٹے موٹے کھلونے اور دیگر ایسی چیزیں جس سے ان کی ذہنی ترقی ہو اور ان کے اندر نئی باتیں پیدا کرنے یا نئی دریافت کرنے کے رجحانات پیدا ہوں، ان کے لیے مہیا کرنا ضروری ہے آج کل ان کے لیے بلڈنگ بلوک لوگو (LOGO) اسپرنگ یا بیٹری سے چلنے والی گاڑیاں، ہوائی جہاز کمپیوٹر کے کھیل اگر مہیا کیے جا سکتے ہوں تو ضرور کیے جائیں۔

مذہبی اور قومی جذبوں کو پروان چڑھانے کے لیے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی کتابوں کی ضرورت ہے جو کم داموں میں فراوانی سے دستیاب ہو سکیں۔ اور ان کو پڑھ کر سنایا جائے۔ جب ذرا بڑے ہوں تو خود کبھی کبھی پڑھنے کی کوشش کریں۔ افسوس ہے کہ اردو میں ایسے لٹریچر کی کمی ہے۔ بچوں کے لیے اسلامیات پر تو ایسا لٹریچر قریب قریب ناپید ہے یہ وقت کی بڑی ضرورت ہے کم از کم ایک ملی ادارہ ایسے لٹریچر کی اشاعت اور فروغ کے لیے ہونا ہی چاہیے۔ مذہبی سطح پر ذرا بڑے بچوں کو مسدس حالی، بانگ درا (اقبال)، شاہنامہ اسلام (حفیظ جالندھری) کو پڑھ کر سنانا اور سمجھانا ضروری ہے۔ .... مسلمان گھرانوں میں بچپن ہی سے قرآن شریف کی سورتیں، قرآن اور ان کے معنی اور تھوڑی سی تفسیر جاننا ضروری ہے یہ روزمرہ صبح کا معمول ہونا چاہیے۔ ۱۵-۲۰ سورتوں کا حفظ ہونا اشد ضروری ہے، جن کو ہر نماز میں بدل بدل کر پڑھا جا سکے۔

موجودہ دور میں بچوں کے لیے اسلام اور رسول خدا کے متعلق چھوٹے چھوٹے کیسٹ (CASETTE) نرسری نظمیں (RHYM) کے انداز پر بنانا ضروری ہے۔ یہ دلکش اور پر اثر آواز میں پیش کرنے کے لیے ایک سود مند تجارتی ادارہ بنایا جا سکتا ہے۔ مغربی ممالک میں اس کی ابتدا حال ہی میں ہوئی ہے۔ بچوں میں انہماک اور یکسوئی کی عادت شروع سے ڈالنا چاہیے۔ اس کے لیے والدین کو سخت مجاہدہ کرنا ہوگا۔ یہ بڑے پتے کا کام ہے اسی لیے سمجھدار تعلیم یافتہ و مذہبی والدین ہونے کے بڑے فائدے ہیں۔

اکثر ایک یا چند خاندانوں، شہر کے کسی حصے، گاؤں یا قصبوں میں کچھ ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے کہ صلاحیت

اور قابلیت کے ابھرنے میں کافی آسانی ہوتی ہے۔ اس کی بہترین مثالیں لکھنؤ میں فرنگی محل اور ندوہ، دیوبند میں دارالعلوم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اقامت گاہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ (تقسیم سے پہلے)، اعظم گڑھ کے چند گاؤں اور بلگرام ہیں۔ انگلینڈ میں آکسفورڈ کیمبرج، امریکہ میں بوسٹن و ہارورڈ اور کیلی فورنیا وغیرہ۔ اس سے قابلیت اور اہلیت بڑھانے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس لیے بچوں کو اچھے ماحول کی سخت ضرورت ہے تاکہ ان کی صلاحیتیں اور قابلیت ابھر سکیں۔

مطالعہ کے لیے معین کی ہوئی پُرسکون جگہ جہاں شوروغل نہ ہو، کمرہ چھوٹا ہی سہی، مگر روشن اور بارونق ہو۔ ضروری ہے، تاکہ بچے پرسکون طور پر پڑھ سکیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ وہ کیسی کتابیں پڑھ رہے ہیں، اس پر نظر رکھی جائے اوقات مطالعہ کا معین کرنا ضروری ہے۔ ہر بچے کا نماز مغرب سے قبل اپنے کمروں میں آجانا نہایت ضروری ہے۔

بچوں میں شروع ہی سے یہ عادت ڈالنی چاہیے کہ ———— اپنے سبق کی مشکلوں کا حل وہ اسکول ہی میں اپنے استادوں سے رجوع ہو کر پوری طرح معلوم کر لیں اس کے لیے ان کے دل میں جھجک نہ ہونی چاہیے۔ والدین کا فرض ہے کہ جب اسکول سے واپس ہوں تو ان کی کتابوں کاپیوں اور نوٹس پر نظر ڈال لیں تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اسکول میں کیا اور کیسا کر رہے ہیں۔ تعلیم بالغان کے بہت سے فائدوں کے علاوہ یہ بھی ہے کہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

پڑھے لکھے والدین کا فرض ہے کہ اپنی استعداد کے مطابق ان کی مدد کریں اور (ہوم ٹاسک) گھر پر لکھنے پڑھنے کے اس کے دیئے ہوئے کاموں کے وقت معین پر موجود رہیں۔ کبھی کبھی اچھے استادوں کی مدد ضروری ہو سکتی ہے استادوں کو گھروں میں بلا کر یا بچوں کو ان کے گھروں پر بھیج کر مستقل پڑھوانے کی ضرورت بہت کم پڑنی چاہیے۔ اصولاً اس سے دریغ کیا جائے۔ اونچے درجوں کے بچوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی اور بہنوں کی مدد کریں اور ایک اچھی روایت قائم کریں۔ کبھی کبھی سخت مضامین کو اگر ۲ یا ۳ بچے ساتھ مل کر پڑھیں تو کچھ آسانی ہو جاتی ہے۔ ان سب سے صلاحیتیں بڑھتی ہیں۔

بچوں کے اسکول اور محلے کے ساتھی شریف اور دیندار ہوں، ان کی استطاعت قریب قریب برابر ہو۔ تاکہ احساس کمتری نہ ہونے پائے۔ مسئلوں پر غور و خوض، پرواز اور بلندیِ فکر کی عادت شروع سے ڈالنا چاہیے۔ ان سب کے بھی بڑے فائدے ہیں یہ تمام چیزیں بچوں کی استعداد کے مناسبت سے ہونی چاہیے۔ خود اپنے پر بھروسہ ہونا چاہیے "پدرم سلطان بود" کا خیال دل سے نکال دینا ضروری ہے۔ گھروں کے ماحول کو کچھ اس طرح بدل دیا جائے کہ پڑھنے پڑھانے کی روایت پیدا ہو جائے۔ ضرورت ہے کہ اچھے ماحول میں اور اچھی روایتوں سے بچے علم کے فدائی ہوں نہ کہ فیشن، کپڑوں جوتوں، بناؤ سنگھار کے۔ اس کے لیے اصلاحِ ماحول و معاشرہ ازحد ضروری ہے۔

ایک زمانہ میں اگر مسلمان بچے علم الحساب میں اچھے ہوتے تو ان کو "بنیے" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس طرح اگر کچھ ضروری چیزیں حفظ کرتے تو "رٹو طوطا" کہا جاتا تھا اس سے ان کی ہمت شکنی ہوتی ہے یہ سب بند کرنا ہوگا۔ گھروں میں اچھی کتابوں کی دستیابی اور سستی کتابوں کی بھرمار ہونا چاہیے۔ جن کا تعلق مذہب، اخلاقیات، تاریخ اور دیگر مضامین سے ہو۔ کتابیں اچھی ہوں اور بہت ساری اور بہت قسموں کی۔ خالی وقتوں میں ان پر سرسری نظر سے بھی فائدے ہیں۔ اس سے بچوں میں ذوق مطالعہ پیدا ہوتا ہے۔ فحش کتابوں، رسالوں اور اشتہارات کا گھر میں گزر بھی

نہ ہو۔ وقت کی پابندی اور اچھی کتابوں کے مطالعہ سے علم کی بنیاد پختہ ہوتی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مالی طور پر یہ کمزور بچوں کے لیے محلوں میں ان چیزوں کی فراہمی صاحب حیثیت لوگ بچوں کی لائبریریوں کی شکل میں کار خیر کے طور پر قائم کریں اور اس طرح قومی تعمیر میں اپنی ذمہ داری پوری کریں۔

پارٹیوں کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ یک جنسی پارٹیوں میں جا کر مغرب سے پہلے واپس آجانا ضروری ہے۔ مخلوط پارٹیوں میں جانا کسی طرح گوارا نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہیں سے تمام برائیوں اور بری عادتوں کی ابتدا ہوتی ہے فحش باتوں کا تذکرہ، فحش کتابوں کو پڑھنا، سگریٹ، شراب نوشی، سینما دیکھنا، وی سی آر، منشیات کی عادت اور دیگر بری باتوں کی یہیں سے شروعات ہوتی ہیں۔ ان تمام پابندیوں کے باوجود جب تک برائیوں کا احساس بچوں میں خود نہ پیدا ہو ان سے مستقل بچنا محال ہے۔ اس کے لیے مذہبی اور اخلاقی تعلیم اور گھروں کے ماحول اور اصلاح معاشرہ کی سخت ضرورت ہے ان سب طریقوں سے آہستہ آہستہ اچھی صلاحیت خود بخود پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

آج کل ٹی۔ وی، وی سی آر اور فلمیں عام ہیں۔ ان کے موذی اثرات نوخیز بچوں پر بڑی تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ سرمایہ داروں کی ہوس اور ان چیزوں اور مشغلوں کو مقبول عام بنانے کی کوشش نے اخلاقی سطح کو بد سے بدتر کر دیا ہے۔ یہ بالکل قابل قبول نہیں نیز اس چکر میں بچوں کا کافی وقت برباد ہو جاتا ہے۔ ان پر سخت کنٹرول کی ضرورت ہے۔ اگر ضرورت ہو تو ان چیزوں پر قفل بھی لگایا جا سکتا ہے اکثر ان کی آواز اس قدر بلند ہوتی ہے کہ نہ تو وہ خود لکھ پڑھ سکتے ہیں نہ دوسرے۔ یہ سب ترقی کی راہوں کے صدراہ ہیں۔

بغیر مطالعہ اور غور وخوض اور عالموں کی صحبت کے، نہ صرف علم حاصل کرنا مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اس طرح ماہرینِ فن و پیشہ کی صحبت بھی ضروری ہے۔ صرف درسی کتابیں ہی نہیں، بلکہ دیگر ضروری کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے ان میں ضروری اطلاعات پر سرسری نظر سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ علم وفن اور معلومات کو ذہن نشیں کرنا ضروری ہے اس کے کچھ طریقے ہیں، جن کا جاننا ضروری ہے۔ اس طرح اپنی صلاحیتوں کا زیادہ سے زیادہ مفید استعمال کیا جا سکتا ہے۔ . . . . . آج کل نصاب تعلیم وسیع ہو گئے ہیں کہ اگر کسی مضمون کو شروع ہی سے اور پہلی مرتبہ پڑھتے وقت ہی، اچھی کتابوں یا ماخذ نیز ذرائع اطلاعات، پر مختلف رنگوں کی پنسل سے نشانات نہ لگائے جائیں تو دوبارہ پڑھتے وقت کافی وقت صرف ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کے حافظے اتنے عمدہ ہیں کہ ایک مرتبہ پڑھ لینے کے بعد تمام باتیں ذہن میں محفوظ ہو جائیں۔ اس لیے اہم باتوں کے نیچے یا اوپر سیاہ پنسل سے اور زیادہ اہم کو نیلے رنگ کی پنسل سے نشان لگانا بہتر ہے۔ دوبارہ پڑھتے وقت صرف ان باتوں پر سرخ نشان لگائیں جن کو پڑھ کر پوری بات یاد آجائے۔ اس کے بعد امتحانات کے زمانہ میں صرف سرخ نشانات پڑھنا کافی ہو گا۔

ہر صفحہ کے بیچ میں یا نیچے اس صفحہ کا مخفف بنا کر لکھ دیں۔ اگر کم جگہ ہو تو الگ کاغذ کے صفحے کتاب میں چسپاں کر دینا چاہیے یا کتاب کے آخر میں کافی سادے کاغذات لگا دیں۔ اب ضرورت ہے کہ کتابیں چھاپتے وقت کافی سادہ حاشیے چھوڑے جائیں اور کتاب کے آخر میں کافی سادے کاغذات لگے ہوئے ہوں۔

کبھی کبھی چند باتوں کو حفظ کر لینا ضروری اور مقدم ہے۔ نیچے درجوں میں اس کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، اور اونچے درجوں میں بتدریج کم ہوتی جاتی ہے۔ فارمولوں اور اکویشن کے لیے یہ لازمی ہے اس کے لیے ایک چھوٹی سی ڈائری جو

ب میں آسانی سے آجائے۔ استعمال کی جائے۔ تاکہ آسانی سے اس کو گاہے بگاہے دیکھا جاسکے اس سے حفظ جلد ہو جاتا ۔ کچھ سبق یا باتیں نقشوں یا چارٹ کے ذریعے سیکھنے اور یاد رکھنے میں آسانی ہوتی ہے وہ مضامین جن میں جسم کی بناوٹ رات اور مشینوں کے سرکٹ (CIRCUITS) یا پرزوں کی صحیح جگہ لگانے کے متعلق ہو، ان کے لیے یہ نقشے اور چارٹ CHAR بذات خود بنانے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ اس کو اکثر دیکھ لینے سے ضرورت کے وقت پورا نقشہ یا چارٹ نظروں ے سامنے آجاتا ہے۔ ذرا نظر بند کی اور تصویر دیکھ لی۔

ذہانت پیدا کرنے، علم حاصل کرنے اور اونچے امتحانات کے لیے قرب وجوار میں لائبریریوں کا ہونا ضروری ہے۔ کبھی کبھی ل جاکر مطالعہ کرنا اور ماخذ کتابوں کو صرف ضروری حد تک پڑھنا، دائرہ معلومات کو وسیع کرتا ہے۔ گزشتہ دس سالوں کے انات کے پرچوں کا خود بیٹھکر حل کرنا اور وقت معین سے پہلے اس کو پورا کرلینا از حد ضروری ہے۔ ہر سوال پر ان کے روں کی مناسبت سے ہی دینا چاہیے۔ دوران امتحانات اور اس کے پہلے سے صحت کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ے۔ امتحان سے پہلے والی رات کو ضرور ۵ یا ۶ گھنٹہ سو لینے سے دل ودماغ تازہ اور جسم چست رہتا ہے۔ اس رات کو پورا مون تیزی و روانی سے اور سرسری طور پر دیکھ لینا ضروری ہے۔ آپ جتنے بھی قابل ہوں، اگر آپ ممتحن کے سوالوں کا ا جواب صحیح طور پر نہ دے سکے تو امتحان کے لیے بیکار ہوگا۔ اسی لیے سوال کے ہر حصے کا جواب دینا ضروری ہے، جو مانی اور دلچسپی سے ممتحن پڑھ سکے۔ اپنی تحریر اور انداز تحریر، اس طرح پیش کریں کہ اہم باتیں نمایاں ہوں، اور ایک یں ممتحن کو اطمینان ہو جائے۔ وہ سمجھ سکے کہ آپ کو وہ سب باتیں معلوم ہیں جن کی آپ سے امید کی جاسکتی ہے۔

سوالات کے جواب میں نمبروں اور وقت صرف کرنے کا تناسب ہونا ضروری ہے۔ پرچے ختم کرلینے کے بعد اتنا قت آپ کے پاس رہے کہ جوابات کو دوبارہ پڑھ لیا جاسکے۔ کوئی غلطی اگر ہو گئی ہو تو ٹھیک کرلیا جائے۔ اور اگر ئی بات بھول ہو گئی ہو تو اس کو لکھنے کا وقت رہے۔ مناسب الفاظ میں خیالات کی ادائیگی کی عادت شروع سے لنا چاہیے۔ ایسے جملے استعمال کیے جائیں جو صاف اور واضح ہوں۔ ادبیات میں زبان شیریں اور شستہ ہو۔ خطابت، ث و مباحثہ کی عادت شروع سے ڈالنا چاہیے۔ اس کے لیے آداب گفتگو وطریقہ خطابت کا جاننا ضروری ہے۔ اس سے بانی امتحانات میں بڑی مدد ملتی ہے۔ فارسی کا ادب اچھا اور زبان شیریں ہونے کے باوجود عرب اپنے خطابت پر ناز رتے اور ایرانیوں کو عجمی کہتے تھے۔ جن مسئلوں پر آپ ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں ان کا ذکر ران گفتگو، شان اور بے نیازی سے صرف اشارے کے طور پر کردینے سے اکثر خاطر خواہ فائدے ہوتے ہیں۔ اور موضوع تگو بدل کر آپ کے موافق ہو سکتا ہے۔ اس سے کامیابی کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔

اللہ کارساز ہے وہی ہم کو صحیح راستے بتاتا ہے اور ہدایت دیتا ہے۔ بحیثیت مسلمان ہم کو تمام کام مع امتحانات، اللہ کے نام سے شروع کرنا چاہیے۔ کامیابی کے لیے سخت محنت اور جدوجہد کی ضرورت تو ہے ہی، مگر نتیجے اللہ کے ہاتھ ہیں۔ ساتھ ساتھ دعاؤں کا بھی اثر ہے۔

اللہ کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتوں کی پوری طرح نشوونما اور ان کو صحیح طور سے ستعمال نہ کرنا کفران نعمت ہے۔ صلاحیتوں کو پورے عروج تک پہنچانا خود اپنا ذاتی فرض ہے۔ اس کے صحیح استعمال رنے کے لیے بلند معیار تعلیم، اخلاقیات، صحیح مذہبی ماحول اور سرپرستی کی ضرورت ہے۔

صحیح راستوں پر گامزن ہونے میں دشواریاں لازمی ہیں۔ شیطان بہکاتا رہتا ہے، دلوں میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے۔ اس کے خلاف مجاہدہ ضروری ہے تاکہ صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہو۔ اگر صلاحیتوں کا غلط استعمال ہوا تو اس سے بہتر غیر صلاحیت رہنا ہی ہے۔ اگر زمانی یا مکانی حالات سازگار نہ ہوں تو انتظار کرنا یا مقامِ عمل کو بدل دینا ضروری ہوتا ہے۔ یہی سنت رسول ہے۔

اللہ تعالیٰ جب کسی انسان کو صلاحیتیں دیتا ہے تو اس کے در پردہ کچھ مقاصد ہوتے ہیں۔ اگر اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہ کیا گیا تو اللہ یوم حشر سوال کرے گا کہ اس بخشی ہوئی نعمتوں کا کس طرح استعمال کیا گیا۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے تعلیمی وظیفے

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نئے تعلیمی سال کے لیے قرض وظیفے جاری کرنے کے واسطے درخواستیں طلب کرتی ہے۔ صرف ایسے مسلم طلبہ وطالبات درخواست بھیجنے کے مجاز ہوں گے جنہوں نے دسواں درجہ (میٹرک) کم از کم ۸۰ فی صد، بارہواں (اس کا مساوی امتحان ۷۵ فی صد اور گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن وغیرہ کم از کم ۷۰ فی صد نمبروں سے پاس کیا ہو۔ جن طالب علموں کے نمبر اپنی اپنی ریاستوں میں سب سے زیادہ پائے جائیں گے، صرف ان ہی طلبہ وطالبات کو اکتوبر ۱۹۹۵ میں کسی وقت سوسائٹی کے خرچ پر دہلی بلایا جائے گا دہلی میں دو دن قیام کرانے کے دوران ان کا انگریزی میں تحریری امتحان، معلومات عامہ (جنرل نالج امتحان) اور انٹرویو لیا جائے گا۔ اس کے بعد ہی وظیفوں کا فیصلہ ہوگا۔ وظیفہ میٹرک پاس کو ۲۵۰ روپے، انٹر پاس کو ۳۵۰ روپے گریجویٹ کو ۵۰۰ روپے اور پوسٹ گریجویٹ کو ۱۲۰۰ روپے ماہانہ دیا جائے گا۔ جو طلبہ وطالبات وظیفے کے حقدار ٹھہریں گے، ان کو بانڈ بھر کر دینا ہوگا، کہ تعلیم مکمل کر لینے کے زیادہ سے زیادہ دو سال کے بعد سے قرض وظیفہ کی رقم وہ ماہ بہ ماہ (اگر چاہیں تو اقساط بھی) ان ہی قسطوں میں واپس کرنا شروع کر دیں گے جن قسطوں میں وہ ان کو ملی تھی۔ وظیفہ پانے والے طلبہ کی تعلیمی پیش رفت کا ہر سال احتساب ہوگا، اور اگر رفتار اطمینان بخش پائی گئی تو وظیفہ کی تجدید کی جائے گی۔

اس اسکیم کے تحت ۱۹۸۶ سے اب تک ۲۳۶ مسلم طلبہ وطالبات فیضیاب ہو چکے ہیں جو ملک کی ۲۱ مختلف ریاستوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ غیر ملکی طلبہ کو یہ وظیفہ نہیں دیا جاتا۔ وظیفہ کی اسکیم سوسائٹی نے اپنے صدر حکیم عبدالحمید صاحب کی ایما پر صرف اس لیے شروع کی ہے کہ ہندوستانی مسلمان جو تعلیم میں بہت پیچھے ہیں، انہیں ان کے دوسرے ہم وطنوں کی طرح تعلیمی میدان میں آگے لایا جائے، تاکہ وہ تعلیمی پس ماندگی سے نکل کر ملک کی ترقی میں زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکیں۔

جو مسلم طلبہ یہ وظائف پانے کے خواہشمند ہیں اور جن کا ارادہ ہے کہ تعلیم کا سلسلہ عصری تعلیم کے کسی تسلیم شدہ ادارے میں کم از کم ۱۹۹۶-۹۷ تعلیمی سال تک جاری رکھیں گے، وہ سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۰ کے نام خط بھیج کر درخواست فارم منگوا سکتے ہیں۔ بھرے ہوئے فارم ۱۶ ستمبر تک وصول کیے جائیں گے۔ تاخیر سے آنے والی درخواستوں پر غور ممکن نہ ہوگا۔

سید حامد
سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی

[redacted]

محمد شمیم الزماں*

اسلامی کٹر واد ـ حقیقت یا پروپگنڈا

موجودہ دور میں عالمی نقشے پر جگہ جگہ مسلم دشمنی اور صہیونی جارحیت پسندی کے نمونے نظر آرہے ہیں۔ خواہ وہ اسرائیل اور فلسطین کا معاملہ ہو، یا بوسنیا ہرزے گوینا کا، چیچنیا میں مسلمانوں کی نسل کشی کی تدبیریں ہوں یا کشمیر میں قتل و غارت گری کا خوفناک اور سفاکانہ کھیل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے صہیونی اور سامراجی طاقتوں نے صرف اسلام دشمنی کو اپنا شیوہ بنالیا ہے اور ان سب کے پس پردہ عالمی سطح پر بین الاقوامی سیاست میں مسلم کشی کو ایک خاص جزو بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

روس کے زوال کے بعد عالمی سیاست یک قطبی دھرے پر چل رہی ہے اور سامراجی طاقتوں کے ایک بار پھر با اثر ہونے کے اشارے مل رہے ہیں۔ روس کی بیخ کنی کے پیچھے امریکی صدر بش کی خارجہ پالیسی کو سراہا گیا اور عراق کے خلاف امریکہ اور دوست ممالک کے ذریعے چھیڑی گئی جنگ کو کامیابی سے ہم کنار کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ نے عالمی پیمانے پر ہر اس مسئلے میں ٹانگ اڑانا اپنا وطیرہ بنالیا ہے جو کسی بھی صورت میں مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہو۔

۱۹۹۳ء میں بھارت کا دورہ کرنے والے امریکی سینٹر (Pressler) لیری پریسلر نے اپنے ایک بیان میں یہ خیال آرائی کی کہ " ہندوستان کی سرحد سے لگا شمال مغرب کا خطہ مسلم بنیاد پرستی کے چنگل میں آگیا ہے اس سے بھارت سمیت پوری دنیا کو خطرہ لاحق ہے کیوں کہ اس علاقے میں "عالمی قوت" بن جانے کی پوری صلاحیت ہے۔" لیری پریسلر کے اس بیان کے پیچھے جو ذہن کار فرما ہے اس کا تجزیہ کرنے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ گویا اس وقت صہیونی اور سامراجی ذہن کے خلاف اگر کوئی دوسری طاقت محاذ آرائی کی صلاحیت رکھتی ہے تو وہ محض اسلام ہے۔ اسلام کے سوا کسی دوسری فکر کے ماننے والوں میں یہ طاقت نہیں کہ وہ سامراجی طاقتوں کے خلاف کمربستہ ہوسکیں۔ روس کا زوال پذیر سوشلزم کا تصور اس بیان کی تصدیق کرتا ہے کہ بہت کم وقت میں اپنی ابتدا سے انتہا کو پہنچنے والا کمیونزم کا تصور کسی بھی صورت میں سامراجیت یا آمریت کا مقابل نہیں ہوسکتا۔

دوسری جانب صدیوں سے سامراجی قوتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والی طاقت اسلام آج بھی اپنی ہمہ گیری کے باعث زندہ و تابندہ ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ اسلام کے خلاف بڑھتی ہوئی شورشیں اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کیے جارہے جابرانہ اور ظالمانہ ہتھکنڈے آخر کس بات کی غمازی کرتے ہیں۔ مغربی ممالک اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعے یہ خبر عام کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں کہ دنیا کو اسلامی کٹر واد کا خطرہ لاحق ہے لیکن یہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے چھیڑی ہوئی پروپیگنڈہ جنگ آخر کس کی ایما پر ہے۔ سوڈان میں آنے والا اسلامی انقلاب سامراجی طاقت کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ الجیریا، مراکش اور دیگر ممالک میں اسلامی تحریک

---

* معرفت سید قادر علی صاحب، بجلی کی دکان، شمشاد مارکیٹ، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔

کے ذریعے حکومت کی سربراہی اگر مسلمانوں کے ہاتھوں میں جاتی تو شاید یہ عرب کی سرزمین پر سامراجی طاقتوں کے ذریعے کھیلے جا رہے
فسطائی کھیل کے لیے ایک نیا حزب اختلاف بن کر سامنے آتی۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اسلامی کٹرواد پنپ رہا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر دنیا
اسلامی سربراوردہ ہونے کی وجہ سے پھر دوقطبی سیاست کا مرکز بن گئی تو ان فسطائی سامراجی طاقتوں کا کیا ہوگا جن کے آبا میں سے ایک
دنوسٹراڈمیس نے ان کے لیے مستقبل کی مرثیہ خوانی سیکڑوں سال پہلے کر دی ہے۔ اسلام کے خلاف اٹھائے جا رہے اقدام میں مغربی ملکوں
کا بڑا مرکزی رول رہا ہے اور خواہ وہ افغانستان کا مسئلہ رہا ہو یا فلسطین کا، عراق کا معاملہ رہا ہو یا بوسنیا کا ان طاقتوں کی
زبان ایسے مسایل پر یک طرفہ قینچی کی طرح استعمال ہوتی ہے۔ بڑے پیمانے پر انسانی حقوق کی پامالی ان کے ضمیر سے نہیں ٹکراتی۔ بوسنیا،
فلسطین اور چیچنیا میں کھیلے جا رہے حیوانی کھیلوں سے ان کی آنکھیں نہیں شرماتیں۔ افغانستان میں انھیں اسلامی کٹرواد نظر آتا
ہے۔ بوسنیا اور فلسطین میں یہودی جارحیت پسندی کے مظاہرے کے خلاف مسلمانوں کا دفاع اسلامی قوتوں کے "خطرہ" کے امکانات
روشن کرتا نظر آتا ہے۔ یہ دوہرے معیار اسی صہیونی فکر کے غماز ہیں جس کے تحت دنیا پر صدیوں تک سامراجی طاقتوں نے حکومت کی ہے۔
دراصل ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد ان فسطائی طاقتوں کو سوشلزم اور کمیونزم کے عنوان سے ایک نئی مخالفت کا سامنا کرنا
پڑا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں اور اس کے بعد دنیا کے بے شمار ملکوں میں روس کو اپنی مخالفت میں گھسیٹ کر اسے ہمیشہ کے لیے ختم
کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کوریا، کیوبا، ویت نام، افغانستان اور عرب۔ اسرائیل جنگوں میں روس کو ناقابل فراموش کامیابی ملی
اور سامراجی ممالک کے سرغنہ ملک نے اپنی خارجہ پالیسی کے مسلسل ابواب روس کی تخریب کے لیے موقوف کر دیے۔ بالآخر صدر
گورباچوف کے پرسٹرویکا نے ان طاقتوں کو روس میں اپنے پنجے گاڑنے کا موقع فراہم کر دیا اور روس چند ہی مہینوں کے اندر
اندر حاشیے پر نظر آنے لگا۔ آخر کار روس مختلف ریاستوں میں تقسیم ہو گیا اور وہ ریاستیں جو ماضی میں عظیم "ترکستان" کا
حصہ تھیں دوبارہ اپنی مسلم اکثریت کی بنا پر اپنی قومی اور مذہبی اخوت کا دم بھرنے لگیں۔ تاجکستان، آذربائیجان، ازبکستان اور
ترکمانستان ان ریاستوں میں اہم ہیں جہاں کی ۶۵ فی صد آبادی فارسی بولتی ہے اور ایک لسانی ڈور میں بندھی اتنی بڑی آبادی
کی زندگی کے دوسرے شعبوں میں ایک دوسرے کے قریب تر آنے کی کوششوں کو محض اسلامی کٹرواد نہیں کہا جا سکتا لیکن اس
نفسیاتی خوف کو کیا کہیے۔ یہ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر اور اس کی طاقت سے اس درجہ سراسیمہ ہیں کہ اذان کی آواز بھی انھیں اپنی موت
کی بازگشت معلوم پڑتی ہے۔ افغانستان میں برسوں سے لڑی جا رہی جنگ نہ تو اسلام کے تحفظ کی جنگ تھی اور نہ مسلمانوں کے
تشخص کی۔ بلکہ یہ جنگ مادر وطن کی بازیابی اور آزادی کے لیے لڑا جانے والا معرکہ تھی جس نے بالآخر صہیونی اور فسطائی طاقتوں کو
چاروں خانے چت کر دیا لیکن مغربی ذرایع ابلاغ نے افغانوں کی بے شمار قربانیوں کے بعد حاصل ہونے والی آزادی کو کٹرواد سے
موسوم کیا۔ لیری پریسلر کا یہ کہنا کہ "اسلامی کٹرواد سے دنیا کو خطرہ لاحق ہے کیونکہ اس (ہندوستان) علاقے میں عالمی قوت بننے
کی پوری صلاحیت موجود ہے" تو یہ دراصل نفسیاتی خوف کا ہی اثر ہے کہ یہ سامراجی اور صہیونی طاقتیں اسلام اور اس کے پیروکاروں
کو مستقبل کا مقتدر اعلیٰ سمجھ رہی ہیں۔ امریکہ اپنے حواریوں سمیت ایشیا میں کسی بھی قیمت پر اپنا کنٹرول روم قایم کرنے کے
درپے ہے۔ کیوں کہ سیاسی اعداد و شمار کے مطابق معاشی اور دوسرے قدرتی وسایل کی بنا پر ایشیا ہی مستقبل میں عالمی بازار
کا سب سے بڑا کنزیومر (consumer) ثابت ہو سکتا ہے۔ جاپان، چین اور بھارت کی بڑھتی ہوئی تکنیکی اور فوجی
طاقتوں نے امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کی نیندیں حرام کر دی ہیں لیکن جاپان، چین اور بھارت کے علاوہ جو سب
سے بڑی طاقت نظریاتی اور مذہبی اصولوں پر ہموار ہو رہی ہے وہ مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کے درمیان بڑھتا ہوا اتحاد

ہے۔ ابھی حال ہی میں بوسنیائی ممالک کے خلاف ظلم واستبداد کا سلسلہ بند کرنے کے لیے پاکستان سمیت کئی دوسرے مسلم ممالک نے آرگنائزیشن آف اسلامک کنٹریز کے تحت جو سیاسی اقدامات کیے ہیں وہ ناٹو (N.A.T.O) یا بعض یورپی اتحادیوں کی آنکھوں میں شہتیر کی مانند ہیں۔ ایک ادھوری سی خبر آئی کہ O.I.C کے بعض ممالک اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ مسلم ممالک پر مشتمل ایک الگ اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ موجودہ اقوام متحدہ کی اسلام مخالف یک طرفہ سیاسی حکمت عملیوں کو متوازن کیا جا سکے اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو عالمی سطح پر تحفظ فراہم کیا جا سکے۔ O.I.C کے کراچی اجلاس میں ان ممالک نے اپنی اسلامی شناخت کے تحفظ کو ایجنڈے کا مرکزی مقصد بھی قرار دیا تھا۔ دوسری جانب روس کے قبضے سے آزاد ممالک مشرق وسطیٰ کے ملکوں کی ہم نشینی میں ایک اکنامک کوآپریشن آرگنائزیشن کے قیام کے بعد پاکستان اور افغانستان سمیت اپنی معاشی طاقت کو صحیح سمت دینے اور نئے معاشی اور تکنیکی شعبوں میں ایک دوسرے کو امداد دینے کی راہیں استوار کر رہے ہیں۔ ان سب وجوہات کی بنا پر مغربی ممالک کے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی اس ہمہ گیر طاقت کے چیلنج کو قبول کر سکیں اور یہ تبھی ممکن ہے جب امریکہ جو اُن سامراجی طاقتوں کا سرغنہ ہے اپنے تمام شیطانی منصوبوں سمیت اس علاقے میں موجود ہو اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب نت نئے الزامات لگا کر پروپیگنڈے کے ذریعے عالمی رائے عامّہ کو مسلمانوں کے خلاف کر دیا جائے۔

بدقسمتی سے بھارت کو چین اور پاکستان سمیت مغربی ایشیا کے ممالک کے خلاف استعمال کرنے کی نئی سازشیں رچائی جا رہی ہیں اور بھارت کا ایک طبقہ صہیونی بہکاوے میں آکر انھیں پالیسیوں پر سرگرم عمل ہے۔ "ہندوتو" اور "ہندو بستر جاگرن" کے شعلوں کو مغربی ذرائع ابلاغ خاموشی سے ہوا دے رہے ہیں اور بھارت میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے منصوبے روبہ عمل ہیں۔ بھارت آزادی کے بعد اپنی نہایت کم عمری کے باوجود ایشیا میں بگ برادر (BIG BROTHER) یعنی بڑے بھائی کا امتیاز حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ جواہر لال نہرو کی دانش مندانہ داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کے طفیل بھارت نے جو ترقیات کی منازل طے کی ہیں وہ اپنے آپ میں مثال ہیں۔ ایٹمی صلاحیت کے حصول کے بعد بھارت بھی سامراجی قوتوں کی آنکھ کا کانٹا بن گیا اور تب سے ہی کوششیں جاری ہیں کہ کسی طرح بھارت کو اس کی راہِ مستقیم سے بھٹکا کر تباہیوں کے اندھیرے غار میں دھکیل دیا جائے۔ مغربی پالیسی کی روح "لڑاؤ اور راج کرو" کے تحت بھارت کو مذہبی ٹکراؤ کے راستے پر ڈال دیا گیا ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت اور اس کے بعد رونما ہونے والے بدنصیبیوں کا شکار پورے بھارت کو ہونا پڑا ہے۔ بمبئی بم دھماکوں کے ذریعے ملک کے سب سے بڑے صنعتی اور اقتصادی مرکز کو تباہ کرنے کی کوشش اور پورے ملک کی مجموعی ترقی کی لہر کو منجمد کرنے کی سازشیں، اسی سامراجی ذہن کا شاخسانہ ہیں جن کا شکار پہلے بھی بھارت کو غلام بنانے کے منصوبے کے تحت کیا گیا تھا۔

لیکن بین الاقوامی سطح پر کسی خاص طرز فکر کو مکمل طور پر چیرہ دستیوں کا شکار بنانے سے سامراجی اور صہیونی منصوبے کامیاب نہیں ہو سکتے اور نہ پھر اسلام تو کوئی مذہب نہیں، ایک طرز حیات ہے، ایک تہذیب ہے اور تہذیبیں آسانی سے یا کسی کے مٹائے نہیں مٹائی جا سکتیں۔ اسی طرح مسلمان کوئی قوم نہیں ہے بلکہ یہ اسلام کی تہذیب کی آغوش میں پروردہ ایک ذہنیت ہے جو ایک دن سیلِ آب کی طرح سامراجی اور صہیونی خاشاک کو بہالے جائے گی۔

۲۶ نومبر ۱۹۹۲ء کے نوبھارت ٹائمز میں آشوتوش نام کے کسی صاحب کا مضمون "دنیا کے پردے پر پھیلا اسلامی

کٹرواد" شایع ہوا تھا جس میں انھوں نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "تبھی تو اسٹیج پر ایک ساتھ کئی سمتوں میں کہیں نو نازیت کا مکھوٹا ہے، کہیں پر ہٹ، ویٹر جاگرن کا تو کہیں مسلم کٹرواد کا۔ ان میں مسلم کٹرواد اپنی تاریخی، مذہبی اور سماجی پس منظر کی وجہ سے سب سے زیادہ خطرناک معلوم پڑتا ہے۔" آشوتوش صاحب کا یہ خیال غالباً مغربی ذرایع ابلاغ کے ذریعے چلائی گئی اس سازش سے متاثر نظر آتا ہے جس کے تحت بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے تاریخی اور موجودہ کردار کو مسخ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

بھارت کو آزادی کے بعد سے اب تک بے شمار فرقہ وارانہ فسادات کا تجربہ ہوا ہے۔ ایک پورا نظام مسلمانوں کے خلاف ابلیسیت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں دراندازیاں کرکے سچائی کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جارہا ہے۔ جابہ جا جلسوں، عام سبھاؤں کے ذریعے آنے والی نسلوں کو مسلم عوام کے خلاف تعلیمات دی جارہی ہیں لیکن یہ ناعاقبت اندیش شاید یہ بھول رہے ہیں کہ ہندوستان گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ مسلمانوں نے بھارت پر حکومت بے شک کی لیکن انھوں نے بھارت سے کچھ لیا نہیں بلکہ انھوں نے بھارت کو اپنا گھر بنا لیا اور اپنی ساری تہذیبی و ثقافتی وراثتیں آنے والی نسلوں کی نذر کر گئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو آج غدار وطن اور ملک دشمن ہونے کے الزامات سے نوازا جارہا ہے لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کو ہی ان مجنونانہ حرکتوں کا ہدف کیوں بنایا جارہا ہے۔ ہندوستان جیسے امن و آشتی کا مرکز سمجھا جاتا رہا ہے، آج مختلف قسم کے فسادات کا مرکز بن گیا ہے۔ آخر وہ کون لوگ ہیں جو بھارت کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دبانا چاہتے ہیں۔ غالباً اس پوری سازش کے پیچھے وہی لوگ ہیں جنھوں نے بھارت کو کئی سو سالوں تک غلام بنائے رکھا ہے۔ جنھوں نے تختِ طاؤس، کوہ نور اور اس جیسی بے شمار دولت سے اپنے خزانے معمور کر لیے ہیں۔ ماضی کے دشمن، حال کے دوست نہیں ہو سکتے اور جو ماضی میں دوست رہے ہوں انھیں مستقبل کا دشمن نہیں بنانا چاہیے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ اسلام ایک طرزِ فکر ہے، زندگی گزارنے کی ایک روشِ خاص ہے اور طرزِ فکر نسلی، سرحدی، مذہبی اور اس قسم کی تمام حد بندیوں سے ماوریٰ ہوتا ہے۔ اسلام بھی ایسی ہر ممکنہ و غیر ممکنہ حد بندیوں سے بلند ہے، اسے بدنام نہیں بدل دیتا ہے۔ خود کو وسیع تر کرنے کی صلاحیت اگر کٹرواد کے مضحکہ خیز نام سے پکاری جائے تو یہ ایک طفلانہ اور دانش مندانہ فعل ہوگا۔ مغربی پروپیگنڈہ مشینری اور ہندوستان میں خلفشار پیدا کرنے والی طاقتوں کو یہ جاننا چاہیے کہ کٹرواد کیا ہے۔ انگریزی حاکموں کے ذریعے دیے گئے "فنڈامنٹلزم" کے تصور سے اگر یہ جنون پرور ذہن ناواقف ہیں تو انھیں جاننا چاہیے کہ کسی دوسرے مذہب پر اعتراض کیے بغیر اپنے مذہب پر پوری طرح عمل پیرا ہونا فنڈامینٹلزم یا (ان ناعاقبت اندیشوں کے مطابق) کٹرواد ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب اپنے پیروؤں کے لیے ایک مخصوص طرزِ زندگی فراہم کرتے ہیں اور انھیں (پیروکاروں کو) اپنے مذہبی اصولوں پر پوری طرح کاربند رہنا ہی چاہیے۔

مختار احمد مکی *

چند نصابی کتابوں میں مسلم رہنماؤں کا تذکرہ

ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمان پیش پیش رہے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں ۷ ہزار مسلمان شہید ہوئے لیکن ہماری درسی کتابوں میں مسلمان مجاہدینِ آزادی کا نام برائے نام آتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدوجہد آزادی سے مسلمان پوری طرح الگ رہے یا اس کے مخالف رہے۔ اس سے ایک طرف تو مسلمان طلباء احساس کمتری بلکہ ناکردہ احساس جرم کا شکار ہو رہے ہیں تو دوسری جانب غیر مسلم طلباء پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ مسلمان ہندوستانی نہیں بیرونی ہیں اور انہیں ہندوستان چھوڑ دینا چاہیے۔ اور اگر خود سے نہیں چھوڑتے ہیں تو ان سے زبردستی خالی کروایا جائے (مسلمانوں کا ایک ہی استھان۔ قبرستان یا پاکستان) آزادی سے قبل انگریز حکمران تاریخ نویسوں نے اپنی بدنام زمانہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی کے تحت مسلم حکمرانوں کی کردار کشی مسلسل جاری رکھی۔ ہندوستانی مورخ خاص طور پر بنگالی تاریخ نویسوں نے انگریزوں کی تحریر کو حرف آخر سمجھا اور اسی کو دہراتے رہے آزادی کے بعد جب آزادی ہند کی تاریخ مرتب کی گئی تو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہ صرف مسلمانوں کو نظرانداز کیا گیا۔ بلکہ انھیں تقسیم ہند کا مجرم گردانا گیا اس کے بعد پچھلے پچاس سالوں میں جو نسل تیار ہوئی وہ آج سیاست داں بریوکریٹ اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ ہے۔ وہ مسلمانوں کے مثبت پہلو کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور اگر اسے کچھ معلوم ہے تو وہ یہ کہ مسلمان غدار اور مطلب پرست ہیں۔

بہار انٹرمیڈیٹ کاؤنسل نے علم سیاسیات کے لیے جو نصاب مرتب کیا ہے اس کا ایک حصہ قومی تحریک سے متعلق ہے تقریباً سو سے ایک سو پچھتر صفحات اس موضوع پر مختلف مصنفوں نے تحریر کیے ہیں ان تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان قدامت پسند، ضدی، خود غرض، فرقہ پرست اور انگریزوں کے ایجنٹ رہے ہیں انہوں نے ہمیشہ کانگریس کو زک پہنچانے کی کوشش کی تاکہ اس کے اثرات کم یا ختم کیا جا سکیں ان مصنفوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ قومی تحریک سے صرف کانگریس پارٹی وابستہ رہی اور آزادی وطن کے لیے جان و مال کی قربانی بھی صرف ہندو عوام اور لیڈروں نے دی ہے مسلمان تقسیم ہند اور پاکستان کے قیام کے لیے ذمہ دار ہیں۔ ان مصنفوں نے مولانا آزاد، حسرت موہانی، علی برادران، ڈاکٹر محمود اور مولانا مظہر الحق جیسے نامور مجاہدینِ آزادی کا نام بھی ان کتابوں میں کہیں نہیں لیا ہے کچھ جگہوں پر مولانا آزاد کا نام ضرور آیا ہے لیکن وہ بھی مسلم لیگ کی مخالفت میں۔

ڈاکٹر پکراج جین نے اپنی کتاب راشٹریہ اندولن اور بھارتیہ شاسن (جو کہ ساہتیہ بھون آگرہ سے شائع ہوئی ہے)

---

* شعبۂ سیاسیات، ۱۲، سی، نیو کالونی، آزاد نگر جمشید پور۔ ۸۳۲۱۱۰۔

کے ایک سو دس صفحات میں ہندوستان کی قومی تحریک سے بحث کی ہے۔ جدوجہد آزادی کو انہوں نے محمد تغلق کے ظلم ت کیا ہے (ص-۳۰) یہ تاثر دینے کے لیے کہ کانگریس ایک ہمہ گیر قومی جماعت تھی انہوں نے بدرالدین طیب جی کا نام کانگریس کے صدر کے طور پر پیش کیا لیکن اسی سانس میں سرسید پر الزام بھی لگایا کہ انگریزوں کی شہہ پر انہوں نے کانگریس کی مخالفت کی اور بقول رضا حسین جو کانگریس کی مخالفت کر رہا ہے وہ مسلمان نہیں بلکہ حکومت کا ایجنٹ ہے (ص-۳۳) ۱۸۵۷ء کے ... میں کسی بھی مسلم شخصیت کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ گنگا دھر تلک کے اس جملہ کو پیش کیا گیا ہے کہ شیواجی نے افضل خاں کو قتل اس لیے دشمنوں کو زندہ جلایا جا سکتا (ص-۴۷)۔ عدم تعاون اور خلافت تحریک کے سلسلہ میں تحریر ہے کہ گاندھی جی۔ مسلمانوں کو جنگ آزادی میں شامل کرنے کی غرض سے خلافت تحریک کی حمایت کی گرچہ اس زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد تھا لیکن گاندھی جی کا یہ عمل غلط تھا (ص-۷۰) مسلم لیگ نے ہندوستان چھوڑو تحریک کی مخالفت کی کیوں کہ وہ ہندو ر کے قیام کے خلاف تھی (ص-۹۰) ۱۹۴۵ء کے انتخاب میں پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کی اکثریت نے کانگریس بر عکس مسلم لیگ کی حمایت کی (ص-۹۳) ماؤنٹ بیٹن اور کانگریس نے مجبور ہو کر تقسیم ہند کو منظور کر لیا کیوں کہ کو خانہ جنگی سے بچانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا (ص-۹۶) مولانا آزاد کے سلسلے میں صرف اس جملہ کو کافی سمجھا گیا کہ جنگ آزادی کے وہ بھی ایک لیڈر تھے (ص-۱۰۲)

ڈاکٹر بیکنٹھ ناتھ سنگھ نے اپنی کتاب بھارتیہ راشٹریہ اندولن اور شاسن (جو کہ گیان پرکاشن پٹنہ سے شائع ہوئی ۱۲۱ صفحات میں تحریک آزادی کا ذکر کیا ہے۔ مسٹر رحمت اللہ کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ ۱۸۹۸ء میں کانگریس صدارت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ انگریزی حکومت سے بہتر اور ایماندار حکومت روئے زمین پر اور کہیں بھی موجود (ص-۳۳) ڈھائی صفحات میں مسلم فرقہ پرستی کے آغاز کے کئی اسباب گنائے گئے ہیں مثلاً ہندوؤں کی مسلمانوں سے ... وہابی تحریک، ہندوؤں میں مذہبی تحریک کی شروعات پر برطانوی حکومت کے نقطۂ نظر میں تبدیلی تقسیم بنگال اور علی گ تحریک وغیرہ (ص-۳۸) لکھنؤ معاہدے کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ غلط تھا۔ کیوں کہ تیس سال بعد پاکستان کا قیام اسی سے ہوا (ص-۴۲) علیحدگی پسند مسلمان نہرو رپورٹ کے مخالف تھے گرچہ ڈاکٹر ذکریا اور شرافت احمد خاں نے اس کی بہت تعریف کی ہے (ص-۵۸) قومی رہنما کے تحت جن گیارہ رہنماؤں کی سوانح ہے اس میں ایک بھی مسلمان نہیں۔

ڈاکٹر رام نریش ترویدی نے اپنی کتاب راشٹریہ اندولن اور بھارتیہ شاسن (جو کہ سبودھ گرنتھ مالیہ رانچی سے شائع ہو کے ۱۵۵ صفحات میں جدوجہد آزادی کا تذکرہ کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ کانگریس تحریک کی ہر دل عزیزی کو دیکھتے ہوئے حکومت نے اس کو ہندو پارٹی قرار دیا اور مسلمانوں کو ورغلا کر مسلم لیگ قائم کروائی۔ (جو کہ فرقہ پرست علیحدگی پسند جماعت تھی تاکہ قومی تحریک کی پیش رفت کو روکا جائے (ص-۵۴) لکھنؤ معاہدے کے تحت گرچہ کانگریس اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے قر آئیں لیکن اسی کے نتیجے میں پاکستان کے قیام کی بنیاد بھی پڑی جب کہ کانگریس نے مسلم لیگ کو کچھ مراعات دیں (ص-۷۶ مسلمانوں کا عدم تعاون اور عدم تشدد پر کوئی یقین نہیں تھا لیکن انگریزوں سے بدلہ لینے کے لیے وہ کانگریس سے قر آئے اور جب یہ تحریک ختم ہو گئی تو محمد علی جیسے گاندھی جی کے پیروکار بھی فرقہ پرست بن گیے (ص-۸۹) نہرو رپورٹ گرچہ ایک اہم تخلیقی دستاویز تھی لیکن مسلم لیگ نے اس کی مخالفت زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے کی۔ کانگریس وزارت کے خاتمہ پر جناح نے مکتی دوس منایا اور انگریزوں کے ورغلانے پر پاکستان کا مطالبہ کیا (ص-۱۰۵) مسلم فرقہ

ہی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی (ص ۔ ۱۲۰) ہندوستان چھوڑو تحریک کی مخالفت مسلمانوں نے اس بنیاد پر کی کہ اس تحریک کا مقصد ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا ہے (ص ۔ ۱۲۸) ۱۹۴۵ء کے انتخاب میں مسلم ووٹ کا ۷۵ فی صد حصہ مسلم لیگ کو ملا (ص ۔ ۱۳۲) ۔ مسلم لیگ نے ڈائرکٹ ایکشن ڈے منایا اور بنگال کے وزیر اعلیٰ سہروردی کے اشارے پر فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا جس میں صرف کلکتہ میں ۵ ہزار افراد مارے گیے اور ۱۵ ہزار زخمی ہوئے (ص ۔ ۱۳۹)

ڈاکٹر بیر کیشور پرشاد سنگھ نے اپنی کتاب راشٹر آندولن اور بھارتیہ شاسن (جو کہ اسٹوڈنٹس فرینڈس گووندمترا روڈ پٹنہ سے شائع ہوئی) کے ۱۳۶ صفحات میں قومی تحریک پر بحث کی ہے ان کے مطابق تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت لارڈ کرزن نے مسلمانوں کے ایک جلسہ میں اعلان کیا کہ تقسیم بنگال کا مقصد مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ صوبہ کا قیام ہے (ص ۔ ۳۵) لکھنؤ معاہدہ مسلمانوں کو خوش کرنے کی پالیسی کا ایک حصہ تھا جس کے نتیجے میں ہندوستان تقسیم ہوا (ص ۔ ۵۱) سبھاش چندر بوس تک نے نہرو رپورٹ کی حمایت کی لیکن جناح نے اس کی مخالفت کی اور پھر کچھ ایسی تجاویز پیش کیں کہ اگر وہ تسلیم کر لی جاتیں تو اس کی بنیادی خصوصیت میں تبدیلی آجاتی (ص ۔ ۶۷) ہندوستان چھوڑو تحریک کی مخالفت مسلم لیگ کی جانب سے اس بنیاد پر کی گئی کہ یہ مسلم مفاد کے خلاف ہے اور مسلمانوں کو اس میں شامل نہیں ہونا چاہیے اس سے انگریزوں کو ہی فائدہ ہوا (ص ۔ ۱۰۳) ، ڈائرکٹ ایکشن ڈے کے موقعہ پر سہروردی حکومت نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف ورغلایا جس کے نتیجے میں کلکتہ، نواکھلی، پنجاب وغیرہ میں لوٹ مار قتل و غارتگری اور زنا وغیرہ کے واقعات بڑے پیمانے پر ان جگہوں پر ہوئے (ص ۔ ۱۱۱) ڈاکٹر بیر کیشور نے اپنی کتاب میں آزادی ہند سے وابستہ ۱۸ افراد کی سوانح بھی شامل کی ہے جس میں نصف صفحہ سے کچھ زیادہ حصے میں مولانا آزاد کی سوانح بھی شامل ہے ۔

ڈاکٹر راج کمار جھا نے اپنی کتاب راشٹریہ آندولن اور بھارتیہ شاسن (جو کہ موتی لال بنارسی داس پٹنہ کی جانب سے شائع ہوئی) کے ۱۸۷ صفحات میں قومی تحریک پر بحث کی ہے انہوں نے اسلامی اصلاحی تحریک کے تحت وہابی تحریک، علی گڑھ تحریک، احمدیہ تحریک، خدائی خدمت گار تحریک وغیرہ کا ذکر کیا ہے ۔ وہابی تحریک کے سلسلے میں ڈاکٹر جھا کا کہنا ہے کہ عرب کے وہابیوں کی ہدایت پر ہندوستانی علماء نے اسلام کو راسخ العقیدہ بنانا شروع کیا (ص ۔ ۶۶)، سرسید ابتداء میں نیشنلسٹ تھے لیکن بعد میں برطانیہ حکومت کے حمایتی بن گئے کیوں کہ انہیں ڈر تھا کہ آزادی کے بعد ہندو مسلمانوں پر حکومت کریں گے اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں فرقہ واریت شروع ہوئی۔ اور مسلمانوں کی اکثریت نے تحریک آزادی سے اپنے آپ کو دور رکھا جنگ آزادی کی پہلی دہائی میں مسلمانوں کی شمولیت کا تناسب صفر تھا۔ دوسری دہائی میں یہ ۴ء۸ فیصد ہوا اور تیسری دہائی میں یہ ۴ء۲ ہو گیا (ص ۔ ۷۴) اقبال کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ اقبال بنیادی طور پر انسانیت پسند تھے۔ اور اسلام کو ایک ہمہ گیر مذہب مانتے تھے لیکن بعد میں ان کے خیالات میں تبدیلی آئی وہ قومی تحریک کے مخالف بن گیے اور پاکستان کے قیام کی حمایت کرنے لگے (ص ۔ ۲۱) موپلا تحریک کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ لوگ عربی النسل تھے۔ اور انہوں نے کیرالا کے دراویدی طبقہ کی عورتوں سے شادی کر لی تھی یہ لوگ اسلام کے ماننے والے اور گرم مزاج تھے ۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف پرتشدد جنگ شروع کی اور جب حکومت نے اس کو دبا دیا تو ہندوؤں کے خلاف مذہبی جنگ چھیڑ دی زبردستی انھیں تبدیلئ مذہب پر مجبور کرنے لگے اور پھر قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہو گیا (ص ۔ ۸۴) ڈائرکٹ ایکشن کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ بنگال کی حکومت

محمد اسحاق*

میرٹ کلاس

ایک ہی جماعت میں عام طور پر طلبہ کی درجہ بندی کچھ اس طرح ہو جاتی ہے۔ ذہین، اوسط اور اوسط سے کم تر ذہین استعداد مختلف ہونے کی وجہ ان کا تعلیمی معیار، فہم اور سوجھ بوجھ بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ یہ نتیجہ ہے توارث Heredity اور ماحول (Environment) کا۔ توارث ماں باپ کا عطیہ ہے جو استقرارِ حمل کے بعد پھر اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں رہتی البتہ ہم ماحول کو جتنا چاہے مالدار بنا سکتے ہیں۔ یہ ہمارے قابو کی چیز ہے۔ بچہ حواسِ خمسہ کے ذریعہ اپنے ماحول میں اطراف واکناف میں سینکڑوں مشاہدات اور تجربات سے سیکھتا جاتا ہے لیکن مؤثر ماحول صرف تعلیم ہے۔ تعلیم ایک منصوبہ بند ماحول فراہم کرتی ہے۔ باوجود سب کو ایک ہی قسم کی تعلیم اور یکساں ا کے بعد بھی طلبہ میں فرق ہو جاتا ہے۔ وہ طلبہ جن کا توارث زرخیز ہے وہ تعلیم سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں اور جن کا توارث محدود اور غریب ہے اچھی سے اچھی تعلیم ان کے لیے زیادہ فیض رساں نہیں ہو پاتی۔ I.A.S کی کوچنگ کلاس میں ہزاروں گریجویٹس دن رات تیاری کرتے ہیں لیکن ہزار میں بس دو چار ہی اس اعلیٰ امتحان اور انٹرویو میں پورے اترتے ہیں۔ بائبل اور قرآن شریف میں اس کی ایک اچھی مثال دی گئی ہے۔ آسمان سے بارانِ رحمت تو زمین پر برستا ہے۔ لیکن جو بارش پتھریلی اور بنجر زمین پر ہوتی ہے وہاں کچھ گھانس پھوس اُگ آتی ہے۔ یہی بارش جب زرخیز زمین پر ہوتی ہے تو فصل شباب پر آتی ہے اور پھول پھل دے جاتی ہے۔ یہی حال ٹیچر کے سبق یا پروفیسر کے لکچر کا ہوتا ہے۔ ذہین طلبہ تو بہت کچھ اس سے اخذ کرتے ہیں۔ کند ذہن طلبہ کے سروں پر سے یہ لکچر نکل جاتا ہے۔

بچوں کی ذہانت کا معیار I.Q معلوم کرنے کے لیے سائنٹفک طریقے معلوم کر لیے گئے ہیں اسی طرح کسی کی شخصیت کے توازن کی جانچ کے لیے علم نفسیات میں مختلف ٹسٹ بنائے گئے ہیں۔ اگر توارث کا رقبہ وسیع ہو اور ماحول (تعلیم) بھی اچھا ہو تو ایسے طلبہ ضرور اپنے شعبہ میں کمال پیدا کرتے ہیں۔ اگر توارث زرخیز ہو لیکن مناسب اور موثر ماحول (تعلیم) نصیب نہ ہو تو وہ پودا چند دنوں بعد کھاد پانی کی کمی کی وجہ سے مرجھا کر رہ جائے گا۔ اس کے برخلاف توارث کا تحفہ محدود اور معمولی رہ گیا ہے۔ تو اس کے لیے بہترین ماحول اور تعلیم کا انتظام کیے جانے کے باوجود اس میں ذہنی استعداد کی کمی کی وجہ سے یہ ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ اعلیٰ امتحانات کے لیے عام طور پر کوچنگ ایک دو سال کے لیے گریجویشن کے بعد دی جاتی ہے۔ لیکن یہ کوچنگ بھی عام طور پر ضائع جا

---

* ریٹائرڈ پرنسپل، جاوید منزل، مکان نمبر ۶/۶۱۴-۴-۱۱، بازار گارڈ، حیدرآباد-۵۰۰۰۰۴

ہے۔ کیونکہ ایک دو سال میں اس پتھر میں جونک نہیں لگ سکتی۔ ہوش مند اور دور اندیش لوگ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے پانچ چھ سال کی عمر سے ایک پندرہ سالہ تعلیمی منصوبے اور پروگرام کے تحت ان بچوں کو ملک کے اعلیٰ امتحانات کے لیے تیار کرتے ہیں۔ اچھے پبلک اسکولس جن کی تعداد ملک میں ایک فی صد سے بھی بہت کم ہے۔ یہاں ہر بچے کو ابتدا ہی سے حکومت اور اقتدار کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

ہمارے اسکولوں میں ذہین طلبہ کی بڑی مشکل یہ ہے کہ انہیں کند ذہن، غبی اور لاپرواہ طلبہ جن کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، برسوں ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ ان کے سامنے مسابقت کے لیے کوئی اچھا گروپ نہیں ہوتا وہ ان تمام طلبہ میں اپنے آپ کو لیڈر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ٹیچرس کو نصاب کی تکمیل کی فکر رہتی ہے وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک اور توجہ کے پابند ہیں۔

ذہین طلبہ جماعت کے اس ماحول اور گھٹن کو محسوس کرتے ہیں۔ ماحول کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ان کی اٹھان کو کھینچ کر نچلی سطح پر لے آتا ہے۔ یہ کیفیت قریب قریب سب ہی گورنمنٹ اور پرائیویٹ اسکولوں کی ہے۔

مثال کے طور پر شہر حیدرآباد کے پرانے محلوں میں کئی ایک اسکول ہیں، یہاں ہر جماعت میں ایک دو طالب علم ذہین مل جائیں گے لیکن انہیں اچھی معیاری تعلیم دینا ایک مشکل مسئلہ ہے۔ شہر حیدرآباد کی بعض جانی پہچانی فعال شخصیتیں ایک عرصہ سے اس بات پر غور کرتی رہی ہیں کہ ایسے ذہین طلبہ جو شہر کے مختلف اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں اگر ان کا انتخاب کر کے ان کے لیے اچھی معیاری تعلیم کا انتظام کیا جائے تو ضرور ان میں کچھ جوہر نایاب نکل آئیں گے اور اکثر اچھی تعلیم کی وجہ سے وہ معاشرے میں اپنا ایک باوقار مقام بنا لیں گے۔

اس کے لیے محض نظریاتی سطح پر نہیں بلکہ اس تعلیمی سال سے عملی قدم اٹھانے کے لیے اس اسکیم کا خاکہ تیار کر لیا جائے۔ انگلش میڈیم کے وہ طلبہ جو ساتویں جماعت کامیاب کر چکے ہیں تو بعد سلکشن ٹسٹ اور انٹرویو کے ہم ذہین طلبہ کو چھانٹ لیا جائے اور کسی ایسے اسکول میں جس کی انتظامیہ اس میرٹ کلاس کو اپنے اسکول میں چلانے کے لیے رضامند ہو وہیں پر ان کی تعلیم کا انتظام کر دیا جائے۔ اس کلاس کو پڑھانے کے لیے قابل اور ٹرینڈ اساتذہ کو اچھے مشاہرہ پر منتخب کر کے اس کلاس کی تعلیم کی ذمہ داری سونپ دی جائے، اور ان کی تعلیم و تربیت کا اور خاص کوچنگ کا انتظام کیا جائے۔ ان طلبہ کو ٹیوشن فیس کی رعایتیں یونیفارم، کتب اور اسٹیشنری سے مدد کی جائے انہیں موجودہ دور میں صنعت و حرفت کے میدان میں جو انقلابات آئے ہیں ان سے روشناس کروانے کے لیے قرب و جوار میں جو صنعتی کارخانے ہیں مہینہ میں ایک مرتبہ ان کارخانوں کو دیکھنے کا انتظام کرنا بھی شامل کیا جائے۔

آٹھویں جماعت سے انٹرمیڈیٹ کی سطح تک پانچ سال کے لیے ان طلبہ کی بہتر تعلیم، تربیت اور نگرانی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اور اس مدت میں طلبہ کی تعداد بھی ۲۰۰ ہو جائے گی۔ اس کا پہلا بیاچ ۹۶-۱۹۹۵ء کے تعلیمی سال سے شروع ہو کر تین سال بعد ۹۹-۱۹۹۸ء میں میٹرک کے امتحان میں شریک ہوگا۔ تب ہی ایک اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان طلبہ کا معیار عام طلبہ سے کس حد تک اونچا ہے۔ اس کلاس کو کسی اسکول میں چلانے کے لیے چند احتیاطی تدابیر ضروری ہیں۔ کیوں کہ سمندر میں یہ ایک جزیرہ ہوگا یا صحرا میں نخلستان کچھ عجیب نہیں کہ یہ جماعت طلبہ اور اساتذہ کے رشک و حسد کا شکار نہ ہو جائے۔ پھر اس جماعت کے معیارِ تعلیم کو مسلسل اونچی سطح پر قائم

پروفیسر احمد سجاد*

اردو یونیورسٹی یا الیکشنی دھوکا

ہندوستانی جمہوری سیاست کی ایک قبیح روایت یہ بنتی جارہی ہے کہ کمزور طبقات کو ان کے دستوری و جمہوری حقوق بھی نہایت سست رفتاری سے ٹکڑے ٹکڑے کرکے بھیک کی طرح دیئے جاتے ہیں، وہ بھی کسی جذبۂ خیر یا حق پسندی کی بنا پر نہیں بلکہ عین الیکشن کے زمانے میں عام طور پر ووٹ بینک بنانے، کمزوروں پر احسان جتانے، ان کی خودی کو پامال کرنے اور فسطائی فرقہ پرستوں کو بھڑکانے کے لیے۔ چنانچہ ان دنوں جب پورے ملک میں انتخابات کی گرم بازاری شروع ہو چکی ہے مسلم اقلیتوں کے لیے ریزرویشن کے مسئلہ کو سیتا رام کیسری اور اردو یونیورسٹی کے مسئلہ کو ارجن سنگھ نے جس طرح فضا میں اچھالا ہے اس پر الیکشن کمیشن نے بھی گرفت کی ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے کرناٹک میں اردو نیوز بلیٹن کی ایک معمولی سی شروعات پر اردو والوں کا جس طرح خون خرابہ ہو گیا اس کی سرخی فضا میں ہنوز باقی ہے۔

الیکشنی گرم بازاری کا ایک مثبت فائدہ بہرحال یہ ہوتا ہے کہ عوامی عدالت کا سامنا کرنے کے وقت کمزوروں سے ہمدردی اور ان کے حقوق کا پاس و لحاظ اور بازیافت کا خیال کسی طرح پیدا ہو جاتا ہے مگر کمزور طبقات کی غربت، سیاسی بے شعوری اور ہمہ جہت پسماندگی کے سبب ان قیمتی لمحات سے بھی وہ پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ اس لیے اصحاب فکر و نظر کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ ہر بنیادی مسئلہ کا وہ تفصیلی و تجزیاتی مطالعہ کے ساتھ اس کا لائحۂ عمل بھی پیش کریں، انہیں سیاسی طور پر بیدار اور منظم کرکے آمادۂ عمل کریں۔

اندیشہ یہ ہے کہ الیکشن ختم ہوتے ہی اردو یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ ایک بار پھر آئندہ الیکشن تک سرد خانے میں ڈال دیا جائے گا کیوں کہ یہ مسئلہ کوئی نیا نہیں ہے کئی دہوں سے ارباب اقتدار اسے التوا اور استحصال کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ جب کہ اس دوران بعض علاقائی زبانیں جو چند اضلاع میں محدود و تقریباً گمنامی کے عالم میں تھیں آج بعض ریاستوں میں سرکاری زبان بن چکی ہیں اور دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ رانچی ریڈیو اسٹیشن سے جھارکھنڈ علاقہ کی چار مقامی بولیوں میں ہفتہ وار نیوز بلیٹن کا نشریہ شروع ہو چکا ہے مگر ریاست بہار کی دوسری سرکاری زبان اردو میں یہاں سے کوئی خبر نشر نہیں کی جاتی

---

* صدر شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی۔ (بہار)۔ طارق منزل، بریاتو ہاؤسنگ کالونی، رانچی۔ ۸۳۴۰۰۹

یہی حال یہاں کے زمانے بھر سے نرالے دوردرشن کا ہے۔ جب کہ اردو بولنے والوں کی تعداد اس علاقے میں ان چاروں بولیوں کے بولنے والوں کی مجموعی تعداد سے بھی بہت زیادہ ہے۔

دوسری عبرت انگیز مثال اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی نئی دہلی (قائم شدہ ۱۹۸۵ء) کی ہے جس کا ذریعۂ تعلیم برسوں سے انگریزی اور ہندی تھا مگر تازہ اطلاع کے مطابق اب مزید پانچ علاقائی زبانوں میں بھی اس کی تعلیم شروع ہو چکی ہے۔ باربار کی درخواست کے باوجود اس ،، قومی سرکاری اور مرکزی یونیورسٹی ،، میں اردو کے لیے کوئی جگہ نہیں نکل سکی ہے۔ یہ اس زبان کے ساتھ سلوک کیا جا رہا ہے، جو اس ملک میں یکے از قومی زبان ہے۔ جو عددی اعتبار سے چھٹے نمبر (۱۹۹۱ء کی مردم شماری کی رو سے ساڑھے تین کروڑ سے زاید) پر ہے۔ اور رقبہ کے اعتبار سے ہندی سے وسیع تر حلقے میں صدیوں سے بولی اور سمجھی جاتی ہے مگر آج سہ لسانی فارمولے کی سراسر خلاف ورزی کر کے اردو گھرانوں کی نئی نسل کو اردو سے جس طرح محروم کیا جا رہا ہے اس لسانی جبر سے دنیا واقف ہو چکی ہے

لطف یہ ہے کہ آزادی کے وقت تک ملک بھر میں جہاں صرف سولہ یونیورسٹیاں تھیں وہاں اب تقریباً دو سو یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں۔ ان میں درجنوں بعض مقامی طور پر اہم شخصیتوں کے نام پر بھی قائم ہو گئی ہیں مثلاً سدھو کانو یونیورسٹی، برسا یونیورسٹی، للت نرائن مشرا یونیورسٹی، ویر کنور سنگھ یونیورسٹی وغیرہ سنسکرت یونیورسٹی تک قائم ہو چکی ہے مگر اردو داں آبادی گوپال سنگھ کمیشن اور گجرال کمیٹی کی سفارشات کے حوالے سے ہزار دہائی دیتی رہے۔ کون سنتا ہے فغان درویش۔

اردو آبادی کو اہل سیاست کی ایک اور ،،حکمت عملی،، سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ دین دھرم اور زبان کے نام پر نصف صدی سے مارکاٹ کے سیاسی اور الیکشنی فائدے تو اٹھائے ہی جا رہے ہیں جہاں اور جس مسئلے پر فسادات نہیں ہوتے وہاں باہمی اختلافات پیدا کر کے ٹال مٹول کیا جاتا ہے اس سے بھی کام نہیں چلتا تو کمیٹی پر کمیٹی تشکیل دے کر چند پہنچے ہوئے لوگوں کو خصوصی مراعات سے نوازا جاتا ہے۔ اور یوں کمزوروں کی ،،بھلائی،، کے نام پر ان کے حقوق کی مسلسل پامالی ہوتی رہتی ہے۔

؎ مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

اردو والوں کی سادہ لوحی ملاحظہ ہو کہ ابھی اردو یونیورسٹی کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں مگر جھگڑا یہ شروع کرایا ہے کہ اسے فلاں ریاست اور فلاں شہر میں قائم کیا جائے۔

بنائے اختلاف یہ بھی ہے کہ اردو یونیورسٹی روایتی (Conventional) قسم کی ہو یا عصری تقاضوں اور چیلنجوں کے پیش نظر ،،اوپن،، (Open) ہو؟

تمام تر اختلافات اور انتخابی نعرے بازی سے قطع نظر ذیل میں اصحاب فکر و نظر کے لیے چند نکات پیش خدمت ہیں:-

(۱) آزادی کے بعد ریاستوں کی تشکیل جدید، منصوبہ بند انداز میں اس طرح کی گئی کہ اردو کسی ریاست کی اکثریتی زبان نہ بننے پائے چنانچہ رقبہ میں ہندی سے زاید اور ملک گیر ہوتے ہوئے بھی یہ ہر جگہ کمزور

اور بے بس بنا دی گئی ہے۔

(۲) آزادی کے بعد اردو کش پالیسی اور سیاسی و معاشی صورت حال نے اردو داں آبادی کو ہر اعتبار سے اس قدر مفلوک الحال اور پسماندہ بنا دیا ہے کہ وہ آج شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس سے بھی زیادہ غریب اور ان پڑھ ہو چکے ہیں۔ غربت اور معاشی پسماندگی کے سبب ابتدائی عمر ہی سے ان کی نئی نسل کی اکثریت محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہے۔ ان محنت کش نوجوانوں میں سے بہت سے لوگوں کو علم و ہنر کے اعلیٰ معیار کے حصول کا بڑا شوق رہتا ہے مگر ان کے لیے آگے بڑھنے کے تمام دروازے بند رہتے ہیں۔

(۳) غربت اور ہمہ گیر پسماندگی کی وجہ سے ہر جگہ اردو طلبہ کے "ڈراپ آؤٹس" (Drop-Out) کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے، دہلی جیسے ترقی یافتہ شہر میں ان کی تعداد اسّی فیصدی ہے۔

(۴) جدید سیاسی و معاشی پالیسیوں نے ملک گیر پیمانے پر ایک طرف تو علم و ہنر اور کاروبار کے معیار کو خاصا بلند کر دیا ہے تو دوسری طرف خاصا گراں بھی۔

(۵) حالات ایسے پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ اردو میں ادب و تنقید اور تہذیبی مسائل پر تو اہم اور ایک حد تک معیاری کاموں کی کمی نہیں۔ مگر اردو کو روزگار اور روز مرہ کے کاموں سے کاٹ دینے کی بنا پر جدید علوم و فنون اور سائنس و ٹکنولوجی کے بیشتر مضامین کی ابتدائی کتابیں تو کجا معمولی مضامین تک کا فقدان ہے۔

(۶) اردو محض ایک ترقی یافتہ زبان نہیں بلکہ اس کا اپنا ایک مخصوص کلچر اور تہذیبی پس منظر بھی ہے جس میں اعمالِ خیر، تہذیب الاخلاق اور نشر العلوم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

مندرجہ بالا نکات کے پیش نظر غور کیجیے تو روایتی قسم کی کوئی ایک نہیں بلکہ کئی یونیورسٹیاں بھی قایم ہو جائیں تو ان سے اردو والوں کا بھلا ہونے سے رہا۔ اس وقت اردو اقلیت کے لیے جدید علوم و فنون اور روزگار سے جڑی ہوئی تعلیم کی فوری اور شدید ضرورت ہے۔ محض اتنا ہی کافی نہیں، نصف صدی کی تعلیمی پسماندگی کی تلافی کے لیے لازمی ہے کہ طریقہ تعلیم ایسا ہو جو معیاری ہونے کے ساتھ ہی ساتھ غریبوں، محنت کشوں، عورتوں اور ہر طبقے کے لیے سہل الحصول اور سستا ہو۔ مضامین کے انتخاب میں آزادی اور وسعت ہو، تعلیمی دورانیہ اور امتحانات کے ضوابط میں آسانی اور لچک ہو۔ کلاس میں حاضری کی مسلسل پابندی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولتیں کسی روایتی یونیورسٹی سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس کے لیے تو عصرِ حاضر نے سب سے مؤثر اور بہترین طرز تعلیم اوپن یونیورسٹی،، یا Distance Education کا ایجاد کر رکھا ہے۔ لہٰذا فی الوقت ہماری اصل ضرورت مرکز کی نگرانی میں "اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی" (اگنو۔ IGNOU) نئی دہلی کے طرز پر "مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اوپن اردو یونیورسٹی" (مانو۔ MAANOUU) کی ہے۔

یہ کام نیا اور قدرے مشکل ضرور ہے مگر اب بھی اردو زبان اور اردو آبادی میں ایسی صلاحیت موجود ہے کہ ارباب اقتدار نے اگر "اردو یونیورسٹی" کے مسئلہ کو محض انتخابی نعرہ نہیں بننے دیا اور ایمان داری کے ساتھ "اگنو" کی طرح فراخدلی اور رواداری کا ثبوت دیا تو اس "اوپن اردو یونیورسٹی" (Open Urdu University) سے دیر آید درست آید کے مصداق ہمارے بہت سے تعلیمی و معاشی مسائل کے حل کی کامیاب شروعات ہو جائے گی۔

علی عباس ازل*

غرض دیکھیے اب یہ پانی چلا

زمانۂ قدیم میں دریا مقدس سمجھے جاتے تھے اور ان کو قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ مادرانہ سماج میں رہنے والے قدیم ترین مصریوں کی نظر میں دریائے نیل عن خیت دیوی کا روپ تھا جو زندگی کی تخلیق کرتی ہے۔ آریا ہندوستان میں آنے سے قبل مغربی ایشیا میں بھی بسے ہوئے تھے ان کے دیوتاؤں کے اکثر نام وہی ہیں جو ہمیں ہندوستانی آریوں کے یہاں ملتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں آکر انہوں نے بیشتر ندیوں کو وہی نام دیئے جو ایران وافغانستان میں تھے۔ مثلاً کبھا (کابل) سوواستو (سوات) کرمو (کرم)، گومل (گومتی) وغیرہ۔ آج ہمارے دریاؤں کے نام بھی دراصل ان ناموں کی بگڑی ہوئی شکل ہیں جو آریوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے قدیم باشندوں نے رکھے تھے۔ مثلاً گنگا خود سنسکرت نام نہیں ہے بلکہ کسی آسٹری نام کی ایک شکل ہے جس کا مطلب صرف ندی تھا۔ یہ تبتی وتھائی زبان میں کھانگ ہے جیسے می کھانگ یعنی ماں گنگا یا ماں ندی۔ قدیم چینی میں لفظ کی آنگ کا تلفظ کانگ ہے۔ چین میں اکثر ندیوں کے نام اسی طرح کے ہیں مثلاً یانگ سی کی آنگ گنگا کے اصلی معنی بنگالی میں ابھی تک محفوظ ہیں جس میں لفظ گانگ رگان کے معنی ہیں ایک ندی یا پانی کا بہاؤ۔

بہرکیف رگ وید میں ان ندیوں کی بڑی تعظیم کی گئی ہے اور کچھ عرصے بعد ان میں دریائے گنگا کو سب پر برتری حاصل ہو گئی۔ سورگ سے بھگیرتھ کے گنگا چرانے اور شیوجی کا اس کو اپنی جٹاؤں میں روک لینے کی کہانی خود یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس سماج میں گنگا کی کیا اہمیت تھی۔ گنگا جل کی پاکیزگی نے وہی درجہ حاصل کیا جو آب زمزم کو ملا تھا۔ مرتے وقت گنگا جل پلانا اور اسے مختلف مذہبی رسوم میں استعمال کرنا ابھی تک اسی عقیدت کے ساتھ باقی ہے۔ آج بھی مسافر جس جوش کے ساتھ "گنگا میا کی جے" کے نعرے لگاتے ہیں اور پانی میں نذر کے طور پر پیسے پھینکتے ہیں تو اسے دیکھ کر ندی کے سینے پر سے گزرتی ہوئی ریل جو قوائے فطریہ پر انسانی فتح کی ایک علامت ہے چند لمحوں کے لیے گنگا کی لہروں میں ڈوب جاتی ہے اور انسان ہزاروں سال پہلے دریا کے کنارے ننگے بدن کھڑا ہوا مقدس ندی کو کسی جانور یا انسان کی قربانی دیتا نظر آتا ہے لاش کو جلانے کے بعد اس کی راکھ گنگا میں ڈال دینا آج بھی ایک ضروری رسم ہے۔ یہ دسرجن قبل تاریخ کی ماں ندی پوجا کی ایک شکل ہے جس میں زندگی کا ماں سے پیدا ہو کر واپس ماں کے رحم میں پہنچ جانے کا خیال کارفرما ہے۔ یہ رسم بہت سی دوسری رسوم اور عقائد کی طرح آریوں نے قدیم ہندوستانیوں سے قبول کی ورنہ ان آریوں میں ماں پوجا کا رواج مطلق نہ تھا کیوں کہ وہ گلے بانی اور تانبے یا برنجی عہد کے لوگ تھے۔

---

* ۶۔ اے اسٹار مینشن، مرزا غالب روڈ بمبئی۔ ۴۰۰۰۰۸

...

ان جدید آریوں کے آنے کے بعد قدیم دیویاں ان کی دیو مالا میں اپسراؤں کے روپ میں جلوہ گر ہیں جیسا کہ اتھر وید کی حمدوں سے معلوم ہوتا ہے در اصل ماں دیوی کی علامت ہیں مثلاً دمینکا اور اُروشی (جنھیں کالی داس نے اپنے ناٹکوں کا کردار بھی بنایا ہے) پانی ہی کی دیویاں ہیں۔ مین کا یا منا کا آریوں سے قبل کا لفظ ہے جس کے معنی عورت کے ہیں اَم با۔ اَم بی کا۔ اَم بالیکا بھی پانی کی دیویاں ہیں کیوں کہ تینوں کا لفظی مفہوم ماں ہیں اور لفظ امبو اور امبھا اس کی وجہ سے پانی سے متعلق ہیں۔ کچھ زمانے کے بعد یہ روایت اور بھی واضح ہو جاتی ہے مثلاً لکشمی (وشنو کی شریک حیات) یونانی دیوی آفرودیت کی طرح سمندر سے پیدا ہوئی ہے اور اس کے ہاتھ میں جو کنول کا پھول ہے یہ خود عورت کے رحم (Uterus) کی علامت ہے۔ یہ علامت بھی قبل آریائی پرستش کی یادگار ہے۔ کیوں کہ ویدک آریوں میں پوجا اور دیگر رسوم میں مرکزی حیثیت مقدس آگ کو حاصل تھی۔ اعضائے تناسل کی پوجا فحلی پرستش کو وہ ابتدا میں بُرا سمجھتے تھے جیسا کہ رگ وید میں سہسنا پوجا کی مذمت سے معلوم ہوتا ہے۔

زراعتی عہد میں دریا کی اہمیت وافادیت اور اس کے نتیجے میں اس کی تقدیس اور بڑھ گئی۔ مادری سماج کی جگہ آبوی معاشرہ لے چکا تھا۔ لازمی طور پر دیویوں کی اہمیت کم ہونے لگی اور باپ دیوتا کی پرستش شروع ہوئی۔ نیل جو کبھی عن خیت دیوی کا روپ تھا اب خنی مُو دیوتا کا مظہر ہو گیا ہے جو آسمان اور زمین کا خالق سمجھا گیا۔ یہ دیوتا ان سالانہ سیلابوں کا باعث بھی مانا گیا جو مصری زمین کی گود ہر سال نہایت زرخیز مٹی سے بھرتے رہتے ہیں مصری صنمیات یا دیو مالا میں ان سیلابوں سے متعلق ایک خوبصورت کہانی ملتی ہے۔ کہتے ہیں کہ عوسی رس دیوتا کو اس کے سوتیلے بھائی نے قتل کر کے نیل میں پھنکوا دیا تھا۔ مقتول کے غم میں اس کی بیوی عی سس نیل کے کنارے جا کر رویا کرتی تھی۔ مصریوں کو یقین تھا کہ ۱۷۔ ۱۸ جون کی رات کو عی سس کا ایک آنسو دریا میں گرتا ہے اور سیلاب لاتا ہے۔ مصر کے قدیم تہوار لیلۃُ النکتہ (قطرے کی رات) کے پس منظر میں یہی کہانی ہے۔ اب ادقیانوس صاف پانی کا دیوتا تھا۔ ہیقس دریا کے دہانوں کا نگہبان مقرر ہوا تھا۔ رُبان زمین کی تہوں کے پانی کا مالک بنا ادعیا کنودں کا جاری کرنے والا مانا گیا۔ دجلہ و فرات کی تہذیب کا یہ عیا یا عنکی جسے سُمیر کی کئی مہروں میں پانی کے لیے حجرے میں سوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ دریائے سندھ کی تہذیب سے گزر کر ہندی صنمیات میں نارائن کے روپ میں دکھائی دیتا ہے۔ سات منہ کے اژدھے کا بستر بنائے ہوئے یا کنول کے پھول پر یہ دیوتا پانی میں سوتا رہتا ہے اور اب دریا نہ صرف کھیتوں کو سیراب اور زمین کو زرخیز کرتے تھے بلکہ دیوتا کا مظہر ہونے کی وجہ سے عورت کو بارآور یا حاملہ بھی کرتے تھے بابل کا قدیم خدا بعل جو اسلام سے سینکڑوں سال پہلے نجد و حجاز میں بھی پوجا جانے لگا تھا اور زیر زمین پانی اور چشموں کا رواں کرنے والا مانا جاتا تھا۔ اولاد بھی بخشتا تھا۔ یونانی دریا اس کامندرس میں کنواری لڑکیاں اپنی شادی کے دن نہاتی تھیں اور دعا مانگتی تھیں کہ "اے اس کامندرس ہماری دوشیزگی لے لے"۔

اُموی اور اَبوی دونوں سماجوں میں دریا چونکہ مقدس تھے اس لیے اس کے پوتر جل میں غسل کرنے سے گناہ بھی دُھل جاتے تھے۔ اسی عقیدت کی وجہ سے ہندوستان میں تمام بڑے تیرتھ استھان گنگا کے کناروں پر قائم ہوئے۔ کنبھ کا میلا جس میں لاکھوں آدمی دور دور سے اشنان کے لیے آتے ہیں اور اپنے پاپ گنگا کے حوالے کر جاتے ہیں، آج بھی دنیا کا سب سے بڑا اجتماع ہے جو بارہ سال کے بعد ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ رام کی یہ گنگا اب اتنی

حکی ہے کہ ہم خود تو کیا ہمارے دیوتا بھی اسے اشنان نہیں کرا سکتے ۔ ۴۰ کروڑ روپیہ اس کی صفائی پر خرچ کرنے کے بعد ناکام مرکزی حکومت نے اس پروجیکٹ سے ہی ہاتھ دھو لیے ہیں ۔ عیسائیوں کی رسم بپتسمہ میں پانی ضرور چھڑکا جاتا ہے ۔ یہ رسم عقیدے کی ایک صورت ہے ۔ پادری کا نوزائیدہ بچے پر مقدس پانی چھڑکنا یا سر دھلانا بچے کو اس ازلی گناہ عظیم سے نجات یتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اس دنیا میں آیا ہے ۔

دریا کے نقصان رساں پہلو زراعتی دور میں آکر ہی شدت سے محسوس ہوئے اور نیک دیوتاؤں کی طرح بد دیوتا بھی تخلیق ئے جن میں توریت کے کرداروں یہودا اور بعل زعابب یا ایرانی آتش پرستوں کے یزداں اور اہرمن کی طرح مسلسل جنگ رہتی ۔ رگ وید کا اندر دیوتا جو سات سورگ کے دریا دینے والا سمجھا جاتا ہے اس کی لڑائی پانی روکنے والے دیوتا ورترا سے اور ے دیوتا اگنی سے ہوتی تھی ۔ جس کو رگ وید میں قحط اور بھک مری لانے والا بتایا گیا ہے

مہابھارت کے زمانے میں یہ کہانی کرشن سے وابستہ ہو گئی جنھوں نے جمنا ندی کے خون خوار اژدھے کالیا کو شکست ے کر ہمیشہ کے لیے سمندر میں جلاوطن کر دیا ۔ آسام کے دریا برہم پتر کو دیکھ کر برہما کا جلال سامنے آجاتا ہے تقریباً ہر سال ہی یں باڑھ آتی ہے اور واقعی جب یہ دریا بپھرتا ہے تو ہزاروں خانماں برباد کرتے ہوئے یہ بھی نہیں سوچتا کہ یہ سب اس کے ے کے عقیدت مندوں میں سے ہیں ۔ یہی حال چین کے دریا یانگ سی کیانگ کا ہے جسے چینی دریائے غم کے نام سے پکارتے ، ہوانگ ہو یا زرد دریا سنہ ۱۶۵۲ء سے اب تک اپنے دہانے سے ڈھائی سو میل ہٹ چکا ہے ۔

سیلاب لانا ، رخ بدلنا ، زمین کاٹنا دریا کے ایسے اعمال ہیں جو ہمیں نظر آجاتے ہیں لیکن اس کا ایک عمل جتنی خاموشی یزی سے ہو رہا ہے اتنا ہی انسان اور حیوان دونوں کے لیے خطرناک ہے ۔ پہاڑوں سے آبشار یا چشموں کی صورت نکل کر اکبرالہ آبادی کی نظم " غرض دیکھیے اب یہ پانی چلا " ، گاتا ہوا دریا تلوار کی طرح تیز دھار سے وادیاں کاٹتا رہتا ہے ۔ پہاڑی منزل میں اس کا یہ عمل ڈی نیوڈیشن یا عریانی کا عمل کہلاتا ہے ۔ کیوں کہ پانی چٹانوں کو گھس گھس کر ننگا کرتا تا ہے اور میدانی منزل میں اپنے ساتھ مٹی بہا لے جانے کا کام کرتا ہے ۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ گنگا تقریباً نو لاکھ ٹن ن ۱۶ کلو گرام) ، سندھ دس لاکھ ٹن اور برہم پتر ان دونوں سے بھی زیادہ مٹی ہر روز بہا لے جاتے ہیں ۔ اس طرح یہ دریا مٹی ، ساتھ کئی زرخیز اور مفید نمک بھی زمین سے چھینتے رہتے ہیں ۔ یہ مقدار ایک سال میں کتنی ہوتی ہوگی اس کا اندازہ یوں ئیے کہ جنوبی امریکہ کا مشہور دریا امیزن جس کی لمبائی ۴ ہزار میل ہے ہر سال ۲۱۸۲۰۵ ارب لیٹر (Litres) پانی مندر میں ڈالتا ہے (یہ پانی اس تمام پانی کا بارہواں حصہ ہے جو سمندر میں جاتا ہے) اس پانی کے ساتھ ۴۴ کروڑ ٹن حل نے والے نمک اور تقریباً ۷۳ کروڑ ٹن حل نہ ہونے والے یا غیر محلل معدنی مادے سمندر میں چلے جاتے ہیں اور پھر یہ تو ف تین دریاؤں کا عمل ہے ۔ تصور کیجیے کہ ساری دنیا کے دریا جو معدنی نمک اور کیمیادی عناصر سمندر میں جھونکتے ہیں ان کا وزن کتنا ہو گا ؟ یہ سالانہ مقدار ہے ۱۸۸۳۲ ارب ٹن ! مردہ پتیوں ، جانوروں اور درختوں کے ساتھ جو ت سمندر میں پہنچتا رہتا ہے اس نقصان کی مقدار الگ رہی ۔

دنیا کے بعض علاقوں سے فاسفیٹ تقریباً چھ کروڑ ٹن کی مقدار میں سمندر میں چلے جاتے ہیں اور پھر کبھی خشکی پر واپس یں آتے جس کی وجہ سے یہ علاقے اتنے بنجر ہو چکے ہیں کہ اب ان میں خود رو گھاس بھی نہیں اگتی ۔ زرخیز نمک کی ایک ت ہی قلیل مقدار زمین کو ماہی خور چڑیوں کی بیٹ سے اور کچھ کاشت کاری میں مچھلی کی کھاد سے واپس ملتی ہے لیکن ان

طریقوں سے نمک کی واپسی اس مقدار کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو ہماری زمین پر لوٹ کر نہیں آتی۔ کچھ نمک سمندری ہوا کے ساتھ بھی خشکی پر آتا ہے لیکن خرابی یہ ہے کہ اس میں وہ مفید نمک تو کم ہی ہوتے ہیں جو دریا اپنے ساتھ بہا کر سمندر کو دے آتے ہیں۔ اور ایسے نمک کی مقدار زیادہ ہوتی ہے جو نقصان دہ ہے مثلاً پوٹاشیئم کے نمک جن کی پودوں کو سخت ضرورت ہوتی ہے بحری پانی کے ایک ٹن میں صرف ۴۰۰ گرام پائے جاتے ہیں جب کہ کھانے کا عام نمک جس کی نباتات کو مطلق ضرورت نہیں اتنے ہی پانی میں ۲۹ کلوگرام ہوتا ہے۔ اس کے برعکس زمین کی مٹی میں پوٹاشیئم کے نمک ایک ٹن میں ۲۷ کلوگرام ملتے ہیں۔ اسی طرح ایک ٹن زمین کی مٹی میں فاسفورس ½۱ کلوگرام ہوتا ہے۔ اور سمندری پانی میں صرف ۲۸.۵ گرام!

سائنس دانوں نے جب یہ کھوج کی کہ بحری پانی میں سے یہ پوٹاشیئم اور فاسفورس کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ تو پتا چلا کہ سمندر کے حیوانات اور نباتات ان کو ہڑپ کر جاتے ہیں کیوں کہ ایک سمندری جانور میں فاسفورس کی مقدار اپنے ماحول کے پانی کے فاسفورس سے سو گنا زیادہ ہوتی ہے۔ زمین پر رہنے والوں کے لیے فاسفورس کا یہ غیر معمولی نقصان ایک پریشان کن معاملہ ہے کیوں کہ ہمارے جسم کی اندرونی معاشیات میں خاص طور پر خون کے خلیئے (cells) بنانے کے لیے دماغ کی نشوونما کے لیے اور ہمیں ورثے میں ملنے والی عادتوں اور خصلتوں کے میکانیکی نظام کی تیاری کے لیے فاسفورس نہایت ضروری ہے۔

سمندر کے پانی میں تقریباً تمام کیمیاوی عناصر موجود ہیں بحری جان دار ان میں سے صرف ایک تہائی عناصر سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ کیمیاوی عناصر اور ان کے مرکبات جیسے پوٹاشیئم، کیلشیئم، فاسفورس، نائٹروجن، گندھک، میگ نی شیئم، لوہا، ال مونیئم، کلورین، اور سلی کون جو انسانی، حیوانی اور نباتاتی زندگی کے لیے ناگزیر ہیں زمین سے دریاؤں کے ذریعہ سمندر میں ڈھلے چلے جا رہے ہیں اور کبھی واپس نہیں آتے کیوں کہ سمندر کا پانی جب سورج کی تپش سے بھاپ بن کر اوپر کی جانب جاتا ہے تو نمک اور معدنیات (Minerals) کے وزنی سالمے (Molecules) سمندر ہی میں رہ جاتے ہیں۔ پانی کا سالمہ اتنا مختصر ہے کہ آج کی بہترین خوردبین سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ لیکن سائنس دانو نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ سالمہ ایک انچ کے دس کروڑویں حصے .... ۱/۱ کے برابر ہے۔ اور پانی کے ایک قطرے میں یہ دس کھرب کے دس کھرب گنا موجود ہوتے ہیں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا مگر یہ تعداد اتنی کثیر ہے کہ اگر دنیا کے تمام لوگ سب کام کاج چھوڑ کے بس چوبیس گھنٹے ایک سکنڈ فی عدد کے حساب سے گننا شروع کریں تو یہ گنتی ۱۵ ہزار سال میں ختم ہوگی۔

بہرحال میٹھے یا صاف پانی کے سالمے بارش کی صورت میں پھر زمین پر آتے ہیں اور پہاڑوں، میدانوں، اور زمین کی تہوں پر سے بہتے ہوئے اپنے ساتھ نمک اور معدنی اجزا سمیٹتے ہوئے دریا کے ذریعے ایک بار پھر سمندر میں جا ملتے ہیں جو ہر سال نمکین سے نمکین تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور زمین پر زندگی کے لیے مفید نمک کی فراہمی دریا کے اس دشمنانہ عمل سے برابر کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ تشویش کی بات ہے۔

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی*

موجودہ تعلیمی نظام کدھر؟

حکومت کو یہ طے کرنا ہوگا کہ تعلیمی اداروں میں کارخانوں کے کل پُرزے تیار کیے جائیں گے، یا اعلیٰ درجہ کی غلاقی قدروں کی حامل شرافت، انسانیت، خدمت، ایثار اور ہمدردانہ صفات کے لوگ۔

انگریزوں کے دور میں کہا جاتا ہے کہ کلرک اور بابو تیار کیے جاتے تھے۔ لیکن انصاف سے دیکھا جائے کہ ظام تعلیم پر انگریزوں کا کنٹرول ہونے کے باوجود اعلیٰ ترین صلاحیت کے لیڈر، سیاست داں، دانشور، ادیب ماعر، فلسفی، حریت پسند اور ایماندار لوگ جس بڑی تعداد میں تیار ہوئے اس کا عشر عشیر بھی اب تیار نہیں ہو رہے یں۔ تعلیم میں وسعت اور تعلیمی اداروں کی کثرت کے باوجود معاشرہ میں خود غرضی، لوٹ کھسوٹ، دولت مند ہونے ن ہوس جتنی بڑھی اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔

تعلیمی اداروں میں بے صلاحیت اور نا اہلوں کا عروج اور نقل کا رواج بھی کبھی اتنا نہیں ہوا۔

انگریزوں کے دور میں چند درجہ کی تعلیم سے بھی استعداد پیدا ہو جاتی تھی اور اب تو گریجویٹ بھی چوب مسجد ی معلوم ہوتے ہیں۔

حکومت کی نئی معاشی اور اقتصادی پالیسی نے جس بحران کا گیٹ کھولا ہے اس نے تعلیم کو دو حصوں میں قسیم کر دیا ہے۔ ایک تعلیم دولت مند پرائیویٹ سکٹر کی طرف سے دوسری حکومت اور غریب سکٹر کے ذریعہ دونوں سے دو علیحدہ علیحدہ پروڈکٹ مارکیٹ میں آئیں گے۔ ایک اعلیٰ مشینی پرزہ بن کر اور دوسرا اس کا غلام ن کر اس طرح دولت مندوں کی بالادستی بڑھتی جائے گی جس کلچر کو وہ چاہیں گے فروغ پائے گا جس قسم کا لباس وہ چلائیں گے وہ پہنا جائے گا جس قسم کی تہذیب وہ چاہیں گے وہ رواج پائے گی۔ اس کا تعلق نہ قدیم سنسکرتی سے ہوگا اور نہ مہذب دور سے وہ بالکل آزاد ہوگی۔ یا کھلے طور پر امریکن اور یورپین تہذیب کا چربہ ہوگی۔

کیا یہ تعلیمی نظام ایسا ہے جس پر آنکھ بند کر کے ایمان لایا جائے یا اس کی اصلاح کر کے اپنے ملک کی اعلیٰ قدار اور ضرورتوں کے مطابق بنایا جائے۔ جدید ٹکنالوجی سے تو کسی کو اختلاف نہیں لیکن اس پر سب کچھ قربان کر دینا نہ وقت کا تقاضا ہے اور نہ ملک کی ضرورت ہے۔

نئے تعلیمی پیٹرن سے جو طبقہ واریت پیدا ہو رہی ہے وہ ہندوستان جیسے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے

---

* کرامت منزل، اکبری گیٹ، لکھنؤ۔

رکھ دے گی۔

مسلم یونیورسٹی جس کی اپنی شناخت تھی جس کی روایات ہر ایک کو متاثر کرتی تھیں رفتہ رفتہ اس کی شناخت ختم ہو گئی طلبا اور اساتذہ کی تعداد بڑھی عمارتوں کی باڑھ آئی۔ سالانہ بجٹ ۶۰ کروڑ سے بھی متجاوز ہو گیا لیکن خود یونیورسٹی اپنا وقار کھو بیٹھی، انجنیرنگ اور میڈیکل کے طلبا میں بھی تشدد کی وبا عام ہو گئی، اساتذہ اور طلبا کے درمیان ادب و احترام کا رشتہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہے۔

اسی طرح جامعہ ملیہ جن کے روح رواں مولانا شیخ محمود الحسنؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، اور ذاکر حسینؒ جیسے لوگ تھے آج گوشۂ گمنامی کے اندھیروں میں ہیں نہ تو تعلیمی شناخت ہے اور نہ کوئی غیر معمولی حیثیت یا انفرادیت۔ جامعہ ضرور ہے لیکن ملیہ سے اسے کوئی نسبت نہیں صرف ماس میڈیا شعبہ ہے جس کا جامعہ کے اصل مقاصد سے کوئی دور کا رشتہ نہیں۔

اسی طرح بنارس، الہ آباد، لکھنؤ اور جواہرلال یونیورسٹیاں ہیں جہاں سال بھر طلبا اور اساتذہ کے درمیان ہنگامہ آرائی ہوتی ہے۔ کبھی ان تعلیمی اداروں سے اعلیٰ درجہ کی شخصیتیں نکلتی تھیں اب طالع آزما نیتاؤں کی فوج نکلتی ہے جس کے سامنے صرف ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے کہ کس طرح اقتدار حاصل کر کے دولت کمائی جائے جس سماج کو ایسے بے مقصد نااہل تعلیم یافتہ لوگوں سے سابقہ پڑے گا اس میں خیر کا کیا سوال۔!

حکومت نے ابھی اس مسئلہ کا سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا ہے اور نہ کسی سیاسی پارٹی کے سامنے یہ کوئی مسئلہ ہے جب کہ پورے ملک میں دس کروڑ بچے تعلیم سے محروم ہیں اور ۴۳ کروڑ کی آبادی مطلق جاہل ہے۔

تعلیم کو نہ تو بالکل مفت کرنے کی ضرورت ہے اور نہ اتنی گراں کہ ذہین بچوں کی دسترس سے باہر ہو جائے مقابلہ کی فضا بنائے رکھنے کی ضرورت ہے لیکن اس طرح کہ غربت کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ تعلیم کے ساتھ تربیت کو یکساں اہمیت دی جائے۔ تربیت کے بغیر تعلیم دو دھاری تلوار ہے جو کسی کو بھی لہولہان کر سکتی ہے۔ یہ بات اس وقت بہت واضح ہو چکی ہے اسی لیے جرائم میں بہت زیادہ پڑھا لکھا طبقہ ملوث ہے۔ جدید ٹکنالوجی نے جرائم کو بالکل ایک نئی جہت دے دی ہے جس کے تصور سے بھی بڑی بڑی سلطنتیں ہر وقت لرزتی رہتی ہیں۔

(باقی صفحہ ۲۹ کا)

اور اس کے وزیر اعلیٰ کی شہ پر مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملہ شروع کر دیا جس میں ۶ ہزار لوگ مارے گئے اور عورتوں کی عصمت دری کی گئی (ص ۱۲۴) حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ معاملہ مرکزی حکومت کے کنٹرول سے بھی باہر تھا (ص ۱۲۶) جناح نے دھمکی دی کہ پاکستان نہ ملنے پر خانہ جنگی شروع کر دی جائے گی (ص ۱۲۴) ڈاکٹر جھا نے جنگ آزادی سے وابستہ ۲۱ رہنماؤں کی سوانح بھی تیس صفحات میں تحریر کی ہے جس میں مسلمانوں میں صرف مولانا آزاد کا تذکرہ ہے نصف صفحہ میں۔

لٹر اقتدار حسین فاروقی*

عود۔ خوشبودار لکڑی

قدرت نے انواع اقسام کے نباتات انسان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے فراہم کیے ہیں اور میں سے بے شمار پودوں کو انتہائی فرحت بخش خوشبو کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔ گلاب، یاسمین، (چنبیلی) حنا ندی) جیسے نہ جانے کتنے پھول ہیں جو دل ودماغ کو اپنی خوشبو سے ایسا سکون بخشتے ہیں جن کے بیان کو الفاظ گرفت میں لانا دشوار ہے۔ یہ پھول جب تروتازہ ہوتے ہیں تو خوب مہکتے ہیں لیکن تازگی کے ختم ہوتے اپنی خوشبو کھودیتے ہیں حتیٰ کہ سڑنے اور گلنے کے بعد بدبو کا ذریعہ بن جاتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ نباتاتی اشیاء وہ خوشبودار ہی کیوں نہ ہوں باسی ہو کر جراثیم پیدا کرتی ہیں اور بدبودار بن جاتی ہیں۔ لیکن عطر بیز عود کی ل قدرت کے اس اصول سے مستثنا ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس کی بابت ایک سائنسی جائزہ پیش کیا تا ہے۔

شمال مشرقی ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں بالعموم اور آسام کے پہاڑوں میں بالخصوص بیس میٹر ایک درخت پایا جاتا ہے جس کا نباتاتی نام (Aqualaria Malaccnsis) ہے اس درخت کی خصوصیت ہے کہ جب تک جوان اور تندرست رہتا ہے اس وقت تک دوسرے کسی بھی درخت کی مانند عام لکڑی کا ذریعہ ہے لیکن جب کم وبیش پچاس سال کی عمر کو پہنچ کر اس کے تنے میں Aspergillus اور Fusarium نام کے کیڑے (Fungus) بیماری پیدا کر دیتے ہیں تو یہ درخت خوشبو بکھیرنے لگتا ہے اس کی لکڑی عود کہلاتی ہے ہندوستان کے بازاروں میں اسے اگر (Agar) بھی کہتے ہیں۔ یورپ اس کو Agarwood اور Eaglewood کے نام سے جانا جاتا ہے اس لکڑی میں بیماری پیدا ہونے کے میں ایک خاص قسم کا ریزن (Resin) جمع ہو جاتا ہے جو انتہائی خوشبودار ہوتا ہے اور جلنے پر ساری فضا معطر کر دیتا ہے۔ اسی لیے اسے دھونی (بخور) کے طور پر استعمال میں لاتے ہیں۔

"اگر" کے پورے درخت میں صرف تنے کے اندرونی حصہ میں تھوڑی سی جگہ پر Fungus کی بیماری لگتی ہے جس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب متاثرہ حصے کی چھال پھٹنے لگتی ہے اور اس پر کیڑے مکوڑے چلنے تے ہیں۔ یہ بیمار شدہ (Infected) حصہ کاٹ کاٹ کر نکال لیا جاتا ہے۔ اور عود کے نام پر کافی گراں

---

*سسٹنٹ ڈائرکٹر، نیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ۔ جون ۱۹۹۵ء

فروخت ہوتا ہے۔ چونکہ فی درخت سے مشکل سے دس کیلو ہی عود حاصل ہوتا ہے اسی لیے پورے آسام کے جنگلات سے عود کی پیداوار صرف ۷۵ ٹن ہے۔ اسی طرح پورے ہندوستان (شمالی مشرقی) کی عود کی پیداوار ایک سو ٹن سے زیادہ نہیں ہے اس کا بڑا حصہ یعنی تقریباً ۶۵ ٹن سعودی عرب عمان اور متحدہ عرب امارات کو برآمد کیا جاتا ہے جس سے ملک کو آٹھ لاکھ روپے سے زیادہ زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے عود کی لکڑی سے ایک نہایت خوشبودار تیل نکالا جاتا ہے جو Agarwood Oil کے نام سے ساری دنیا میں موسوم ہے یہ تیل دنیا کے کچھ بہت اچھے قسم کے عطر (Scents) کا اہم جز بنتا ہے۔ فرانس کی خوشبو کی صنعت میں اس کی کافی کھپت ہے۔ ہندوستان میں تیل نکال لینے کے بعد عود کی لکڑی کے برادہ کو اگربتیوں (Agarbattis) میں استعمال میں لاتے ہیں، اندرون ملک عود کی کھپت کو ملحوظ رکھتے ہوئے عود کی خاصی مقدار ملیشیا سے ہندوستان منگائی جاتی ہے ہندوستان کے بعد ملیشیا ہی عود کا سب سے اہم پیداواری ملک ہے۔ ماضی میں کافی کوشش کی گئی کہ آسام کے درخت عود (اگر) کو شمالی ہندوستان کے پہاڑیوں میں لگایا جائے تاکہ عود کی پیداوار بڑھائی جا سکے۔ یہ درخت یوں تو نئے ماحول میں خوب چل نکلے لیکن ان میں وہ بیماریاں پیدا نہ ہوسکیں جن کی بنا پر ان کی لکڑی خوشبو حاصل کرتی ہے چنانچہ عود کی پیداوار کے اعتبار سے وہ سارے درخت بے کار ثابت ہوئے۔

"عود" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی لکڑی یا درخت کی شاخ کے ہیں اس طرح کسی بھی درخت کی لکڑی یا شاخ کو عود کہا جا سکتا ہے لیکن ہندوستان میں عود کا مفہوم صرف "اگر" کی لکڑی سے لیا جاتا ہے یوں تو بعض لوگ لوبان کو بھی عود کا نام صرف اس لیے دے دیتے ہیں کیوں کہ دونوں کا استعمال بطور بخور کیا جاتا ہے برخلاف اس کے عربی زبان اور عرب و مصر کی طب میں مختلف طبی اہمیت کی لکڑیوں کو عود کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مثلاً قئے پیدا کرنے والی Cyperus Articulatus کی لکڑی کو عود القئ کا نام دیا گیا ہے چھینک لانے والی لکڑی کو عود العطاس کہا جاتا ہے۔ اسی طرح زخم اور پھوڑے پھنسیوں پر لگانے والی لکڑی عود القرح کہلاتی ہے۔ عود البرق Myrica Esculenta بھی طبی اعتبار سے اہم لکڑی ہے وہ لکڑی جس پر حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھایا گیا عود الصلیب کہلاتی ہے۔ عود لا نجبار اور عود قاقائی کچھ دوسری اہم لکڑیوں کے نام ہیں۔ عود قاقائی غالباً اسی درخت کی لکڑی ہے جس کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن میں عود قافلی کے نام سے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے جنگلات حضرموت میں پائے جاتے تھے۔

یہ تاریخی حقیقت اب بہت کچھ واضح ہو چکی ہے کہ عرب ہند کے درمیان تجارت کا سلسلہ اسلام کے قبل ہی شروع ہو چکا تھا۔ نباتاتی ادویات ہندوستان سے بڑے پیمانے پر عرب لے جائی جاتی تھیں۔ ان ادویات میں کٹھ نام کی لمبی اور موٹی جڑیں بھی کافی مقدار میں شامل ہوتی تھیں جن کو عرب کے حکماء قسط اور کست کے نام سے مختلف امراض کے لیے استعمال کرتے تھے اسے وہ عود ہندی (ہندوستان کی لکڑی) بھی کہتے تھے۔ قسط کی جڑیں کشمیر کے علاقے کی پیداوار تھیں جن کا نباتاتی نام Saussurea Lappa ہے

بڑیں آج بھی بے پناہ طبی اہمیت کی حامل ہیں ان جڑوں میں ایک خاص قسم کی خوشبو بھی ہوتی ہے جو چین میں
ت پسند کی جاتی ہے اسی لیے وہاں قسط کی دھونی بھی دی جاتی ہے۔

عود ہندی، قسط اور کست کا ذکر متعدد احادیث نبوی میں بھی ملتا ہے صحیح بخاری شریف کی کتاب الطلاق
کے باب ۲۰۳ اور ۲۰۴ کے تحت احادیث میں عورتوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ سوگ کے دوران
سط کی خوشبو کا استعمال کرسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب الطب کے باب ۴۱۸ میں عود ہندی اور قسط
کے بارے میں ایک حدیث یوں درج ہے :-

"عبیداللہ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ حضرت ام قیس بنت محصن رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو اسد خزیمہ کی
نسبت سے اسدیہ اور سب سے پہلے ہجرت کرنے والی عورتوں میں سے ہیں اور جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ
یہ وسلم سے بیعت کی تھی اور یہ حضرت عکاشہ کی بہن ہیں انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے بچے کو لے کر رسول اللہ
لی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں جس کو گلے کی تکلیف تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم
ن اولاد کو تالو دبا کر تکلیف کیوں دیتی ہو تمہیں چاہیے کہ عود ہندی (بخاری شریف العود ہندی) استعمال
یا کرو۔ کیوں کہ اس کے اندر سات بیماریوں کی شفا ہے جن میں ایک نمونیہ (بخاری شریف ذات الجنب)
ہے۔ عود ہندی سے مراد کست (قسط) ہے" (ترجمہ مولانا عبدالحکیم)

بخاری شریف کی کتاب الطب کے باب ۴۰۵، ۴۰۸، ۴۱۶ اور ۴۲۱ کے تحت بھی احادیث میں
سط (کست) بنام عود ہندی کا ذکر ایک ایسی دوا کے طور پر ہوا ہے جس کو سات بیماریوں میں مفید بتایا گیا
ہے۔ واضح رہے کہ موجودہ سائنسی تحقیق کی روشنی میں قسط کی جڑ گلے اور دمہ (Bronchial Asthma)
ی بیماری میں بہت مفید ہے کیوں کہ اس میں موجود کیمیاوی جز (Saussurine) کو بہترین Bronch-
odilator پایا گیا ہے اس کے علاوہ وہ امراض جن میں قسط مفید ہے وہ ہیں کالرا، بخار، جگری امراض،
سور، معدہ کی خرابی (Dyspepsia) دانت کا درد اور Rheumatism

بخاری شریف کی کتاب بدء الخلق کے باب ۲۹۲ کے تحت دو حدیثوں میں اور کتاب الانبیاء کے
ب ۳۰۲ کی ایک حدیث میں لفظ "الالوۃ" استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ مولانا عبدالحکیم نے عود کیا ہے مثلاً
اب الخلق (باب ۲۹۲) کی پہلی حدیث کا ترجمہ یوں ہوا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جو گروہ جنت میں سب سے
ل داخل ہوگا ان کے چہرے چودھویں کے چاند سے زیادہ تاباں اور درخشاں ہوں گے۔ ان کی انگیٹھیوں
ں عود (بخاری شریف الالوۃ) سلگے گا اور پسینہ مشک (بخاری شریف مسک) کی طرح خوشبو دار ہوگا"

اسی کتاب کی دوسری حدیث میں یوں فرمایا گیا ہے۔

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کی انگیٹھیوں میں الالوۃ سلگتا ہوگا۔ اس سے
الیمان نے العود مراد لیا ہے"

کتاب الانبیاء ... [illegible]

الالوہ سلگتا ہو گا جس میں عود کی خوشبو ہو گی۔

مندرجہ بالا احادیث نبوی ؐ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس عود ہندی کا ذکر کتاب الطب میں ملتا ہے وہ اصل میں ہندوستان کُٹھ (سنسکرت کُسٹ عربی۔ قسط) کی جڑ ہے نہ کہ ہندوستانی "اگر" کی لکڑی جب کہ کتاب بدء الخلق اور کتاب الانبیاء کی احادیث سے اس الالوہ کا ذکر ہے وہ عود کے مانند یعنی بو دینے والی چیز ہے خولڈنگی کی تحقیق کے اعتبار سے الالوہ اصل میں درخت صبر یعنی Aloe Succotrina (ہندی ایلوہ) سے نکلا ہوا منجمد مادہ (انگریزی Aloes) ہے جو مزہ میں انتہائی تلخ ہوتا ہے۔ یہ جلنے پر خوشبو بکھیرتا ہے اور سرزمین عرب کی نہایت اہم دوا ہے جس کے بے پناہ فوائد بتائے گئے ہیں سریانی (Syriac) زبان میں اس کو الوہ کہا گیا ہے جیسا کہ قدیم مصری لٹریچر سے واضح ہوتا ہے مصر میں فرعونی دور میں الوہ (ایلوہ) کو لاشوں کو محفوظ کرنے (Mummies) کے لیے لوبان اور مُر کلی کے ساتھ استعمال میں لاتے تھے اس طرح یہ بات کسی حد تک یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایلوہ (ہندی، فارسی) الوہ (سریانی) Aloe (انگریزی) اور الالوہ (عربی) ہم معنی الفاظ ہیں اور ان سے مراد درخت صبر سے حاصل کیے گئے مادہ سے ہے حالانکہ عربی کی بعض لغات میں الالوہ کے معنی "اگر" کی لکڑی کے بھی دیئے گئے ہیں مقدس بائیبل میں ایلوہ کے لیے جو عبرانی لفظ استعمال ہوا ہے وہ الوت ہے اور یونانی لفظ الوَن ہے (دیکھیے کتاب جان باب ۱۹) بعض محققین کا خیال ہے کہ بائیبل کے الوت کے دو معنی ہیں ایک Aloes (ایلوہ) اور دوسرے Aloewood (العود) بہر حال عود کے سلسلہ کا سائنسی لٹریچر کسی حد تک پیچیدہ اور مبہم ہے پھر بھی موجودہ سائنسی تحقیقات اور احادیث نبوی کی روشنی میں یہ بات بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ قدیم دور میں عرب میں جس شئے کو عود ہندی (ہندوستان کی لکڑی) کہتے تھے وہ اصل میں قسط کی لکڑی (جڑ) کا دوسرا نام تھا اور اس کا پودہ اب Saussurea Lappa کہلاتا ہے اس کے علاوہ الالوہ اصل میں ایلوہ کا عربی نام تھا جو صبر بھی کہلاتا ہے اور جس کا ذریعہ Aloe Succotrina نامی پودا تھا۔

(باقی صفحہ ۹ کا)

حافظ نے کہا تھا ؎

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود
زہرچہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

(میں اس شخص کے حوصلے کا غلام ہوں جو چرخ نیلگوں کے نیچے ہر اس شئے سے آزاد رہے جس سے تعلق کی بو آتی ہو)۔

غالب کی زبانی اس دعا پر ہم بہرے دار کے ذکر کو ختم کرتے ہیں ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اور آزاد مرد بھی کیسا؟ جس نے مذہبی سماجی اور انفرادی نہ معلوم کتنی بندشوں میں خود کو جکڑ لیا تھا۔

آفاق احمد عرفانی*

سرسید۔ شخصیت کا ایک پہلو

سرسید احمد خاں کی ذاتِ والا صفات ہندوستانیوں کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص ایک نعمتِ غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ انیسویں صدی کے مخلص اور ہمدرد راہنماؤں میں سرسید کا اضافہ ملک و قوم کے لیے یقیناً ایک نیک فال تھا مسلمانوں کی زبوں حالی کے پیشِ نظر فاطرِ ہستی نے خدمتِ قوم کے لیے سرسید کا انتخاب کیا۔ سرسید زندگی بھر آیۂ لاتقنطوا کی روشنی میں اپنی قوم کو قُوۡبِاذۡنِ اللّٰہ کی تلقین کرتے رہے۔ صدیوں کے تعمیر شدہ ایوانانِ سلطنت کے ملبے میں دبی ہوئی قوم کو وہ نہ صرف نکالتے رہے بلکہ اس کے زخم ہائے خوں بستہ کی شست وشو بھی کرتے رہے، اس مردِ ازغیب نے قوم کو قعرِ مذلت سے نکالنے اور اس کے عروجِ رفتہ کے آہوئے رم خوردہ کو رام کرنے میں اپنی تمام زندگی صرف کردی۔ انہوں نے قوم کو اقبالِ رفتہ کے مرغِ وحشی کے قیام بربام کے لیے حکیمانہ نکتے بھی بتائے اور یہ بھی سمجھایا کہ مشیت نے مرغِ اقبال کو وحشی اور بہ ہمہ وقت مائل بہ پرواز بنایا ہے چنانچہ وہ قوم کی اجتماعی غلطیوں سے اچاٹ ہو کر دوسرے بام کو شرفِ نشست بخشنے میں دیر نہیں کرتا۔ ؎

مرغجاں دلم را کہ ایں مرغِ وحشی　　　زبامے کہ برخاست مشکل نشیند

سرسید نے جب ہوش سنبھالا تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی صدی (۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء سے ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) اٹھارویں صدی کی یاس انگیز کابوسیت میں گرفتار رہے اور ملک و قوم کی بدنصیبی سے نہ جانے کتنے زلزلہ خیز ہنگامے ابھی بپا ہونے کو ہیں، ان حالات سے بہ احسن وجوہ مقابلہ کرنے کے لیے سرسید اپنی قوم کو جہالت اور اوہام کی تاریکی سے نکالنا چاہتے تھے تاکہ وہ کھلے دل سے مغربی علوم و فنون اور سائنس کی برکتوں سے فیض یاب ہو سکے وہ چاہتے تھے کہ ان کی قوم میانہ روی اختیار کرکے حکومتِ وقت سے متصادم ہونے کے خیال کو ذہن سے جھٹک دے نیز حالات کے جبر کے تحت ہندوستان کے دیگر دانش مند طبقوں کی طرح وہ بھی بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتا کرکے ملک کے عہدِ رفتہ کی خاکستر سے ایک جہانِ نو پیدا کرے تاکہ وہ ترقی یافتہ اقوام کے کم از کم دوش بدوش ہی کھڑی ہو سکے۔

سرسید کا مزاج دراصل تعمیر پسند تھا، تخریب سے انہیں نفرت تھی ان کا عہد "بہ زمانہ بہ ستیز" کا نہیں تھا۔ درحقیقت وہ زمانہ کسی نئی شورش کے لیے نامساعد تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کی ریاستوں کا رویہ بالعموم منافقانہ تھا۔ یہ ریاستیں اپنے پرانے حساب چکانے کے لیے انگریزوں اور دیگر غیر ملکی طاقتوں کی مدد سے پڑوسی ریاستوں کو برباد

* ریٹائرڈ، پی۔ جی۔ ٹی۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔ ۱۴/۱۴۰، گڑھیا حکیم صاحب، ہوسپیٹل روڈ، آگرہ ــــ ۲۸۲۰۰۳

کرانے کا موجب بنتی رہتی تھیں۔ جوشِ انتقام میں وہ یہ نکتہ بھول جاتی تھیں کہ پژمردگیٔ گل پر جب بھی اور جہ
بھی کوئی کلی مسکرائی ہے تو خزاں نے اسی وقت آواز دی ہے کہ تو بھی نظر میں ہے۔

سرسید کا بالیدہ تاریخی شعور ان کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ کم از کم اپنی کم خواندہ قوم کو حکومتِ وقت سے متصادم نہ
کی ترغیب دیں اور اس کو حصولِ تعلیم اور دیگر تعمیری کاموں کی طرف متوجہ کریں، اس عہد کا دانش ور طبقہ اس حقیقت
بخوبی سمجھ چکا تھا کہ انگریزی حکومت مستحکم بنیادوں پر قایم ہو چکی ہے نیز قوت اور طاقت کے بل بوتے پر انگریز در
میدانِ جنگ میں للکارنے کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اس عہد کا ہر ہندوستانی اس تکلیف دہ حقیقت سے بخوبی واقف
جب ہندوستان کی چھوٹی اور بڑی ریاستوں نے طوقِ غلامی بہ خوشی یا بہ جبر یا بر بنائے مصلحت زیبِ گلو کر لیا تو پھر
نہتے عوام انگریزوں کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی پریشان حال قوم کو خصوصیت سے اس فنجانی طوفان کے
اثرات سے کبھی واشگاف انداز سے اور کبھی کنایتہً آگاہ کرتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک زیرک مرغ تہہ دام
اہلِ ہند پرواز کے لیے سازگار وقت کے تعین کرنے کا گُر سیکھیں۔ اور اُس عبوری دور میں اپنی صلاحیتوں کو بہ رو
کار لا کر اہلِ ہند اپنی ہمہ جہت ترقی کی حتی الوسع کوشش کریں۔ انگریزوں کے ملازم ہونے کے باوجود سرسید نے اصولی مد
میں اپنے اعلیٰ انگریز افسران سے بھی کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ وہ عواقب سے بے تعلق ہو کر ہمیشہ اعلائے کلمۃ الحق کرتے رہے ان جیسے
اور بے باک انسان صدیوں کی گردشِ افلاک کے بعد ہی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ انگریزوں نے جہاں بھی اور جب
ہندوستانیوں کی تذلیل کی اس وقت وہ ہمیشہ سینہ سپر ہو کر آگے بڑھے۔ ۱۸۶۱ء میں آگرے کی نمائش کے دربار سے
ان کو ایک بڑا اعزاز ملنے والا تھا۔ وہ اس لیے چلے گئے کہ انگریزوں کی نشست گاہ ہندوستانیوں کی نشست گاہ سے بلند تھی
ان کے اس جسارتی احتجاج پر ان سے جواب طلب کیا گیا مگر انہوں نے نہایت بے باکی سے افسرانِ بالا کو اپنے موقف
مطلع کر دیا۔ ان کی حق گوئی کا زندہ ثبوت رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند ہے۔ اس رسالے کی طباعت آگرے میں ہوئی
بعد طباعت پانچ سو مطبوعہ جلدیں سرسید کے پاس مراد آباد بھیج دی گئیں۔ رائے شنکر داس منصف مراد آباد (ماسٹر ر
کے برادرِ خُرد) نے از راہِ دوستی ان تمام جلدوں کو نذرِ آتش کرنے کا مشورہ دیا کیوں کہ ان کو اندیشہ تھا کہ یہ رسالہ سر
زندگی کو خطرے میں ڈال دے گا۔ سرسید بھی یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ ان کے دوست کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ تاہم انہ
اس رسالے کو کونسل بھیج دیا، اس وقت کے فارن سکریٹری بیڈن نے رائے ظاہر کی کہ سرسید نے نہایت باغیانہ
لکھا ہے اور ان سے بازپرس کی جائے اور اگر وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکیں تو ان کو سخت سزا دی جائے، قوم کی
قسمتی سے کونسل کے دوسرے ممبران بیڈن کی رائے سے متفق نہیں ہوئے ورنہ سرسید بغاوت کے جرم میں دوسرے
(جن کو ہم جنگِ آزادی کے بہادر سپاہی کہتے ہیں) کے ساتھ حوالۂ دار کر دیئے جاتے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی
ہے کہ اس زمانے میں تحریراً اس جرأت کا مظاہرہ کسی نے بھی نہیں کیا۔ سرسید کے بیشتر مخالفین خود اعلیٰ سرکاری عہ
پر فائز تھے۔ سرسید نے مذکورالصدر وجوہات کی بنا پر انگریزوں کی جائز طرفداری ضرور کی مگر ضمیر فروشی کبھی نہیں کی طرفدا
وقت کے سلسلے میں وہ تنہا نہیں تھے بلکہ مختلف فرقوں کے بالغ نظر راہ نماؤں نے بھی عوام کو عدم تشدد کی راہ پر چلنے کا
دیا تھا۔ البتہ قنوطی ذہنیتوں نے ہدفِ ملامت صرف سرسید کو ہی بنایا۔ اس صریح بے انصافی کی جتنی بھی مذمت
کی جائے وہ کم ہو گی۔

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی*

نشانِ قدم روشن ہے

حضرت حسینؓ اہلِ کوفہ کی دعوت پر مکہ سے جانبِ کوفہ سرگرمِ سفر ہیں۔ ساتھ میں ایک چھوٹا سا کارواں ہے جس میں بوڑھے بھی ہیں، جوان بھی، عورتیں بھی ہیں اور بچے بھی، ماں باپ، بیٹا بیٹی، بھائی بہن، چچا چچی، بھانجہ شوہر، بیوی، دوست، ساتھی، اور عقیدت مند سبھی شامل ہیں۔ سماجی زندگی کے تمام تر ممکنہ جائز اور ضروری رشتوں کی نمائندگی ہو رہی ہے ہونا بھی چاہیے کہ یہ سفر محض سفر نہیں ہے، کتابِ زندگی کا ایک سبق بھی ہے۔ دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ اس کارواں کے کس فرد نے کس موقع پر کس سے کیا کہا، کس کے ساتھ کیا سلوک کیا، اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کو کس طرح نباہا اور رشتوں کے تقدس کو کیوں کر برقرار رکھا۔ کتنے لوگ ہیں جنہیں گھر کے مانوس ماحول اور سماج کی جانی پہچانی فضاؤں میں بھی حسنِ معاشرت سے گزارا کرنے کی توفیق نہیں ہوتی اور ایک حسینؓ اور رفقائے حسینؓ ہیں کہ سفر کی صعوبتوں اور امتحان کی گھڑیوں میں بھی باہمی بھائی چارے اور اخلاص و محبت کی دنیا بسائے چلے جا رہے ہیں۔

کل بیاسی نفوس پر مشتمل خاندانِ رسالت اور محبانِ اہلِ بیت کا یہ مختصر سا قافلہ زمانے کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہے کہ چاہے وقت کا تیور کتنا ہی بدل جائے، اسلام کے جاں نثاروں کی تعداد عنقا نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ حسینؓ میں اتنی ہمت ہے کہ وہ تنہا میدانِ عزم و عمل میں اتر سکتے ہیں لیکن کیا جان کی بازی لگا دینے کا وہ بے انتہا جذبہ جس نے کبھی غزوۂ بدر کی سنگلاخ زمینوں میں فتح و کامرانی کے پھول کھلائے تھے، اب سمٹ کر صرف قلبِ حسینؓ کا حصہ بن گیا ہے؟ وہ عالم گیر جذبہ تو خدا کے فضل و کرم سے ہر عاشقِ رسول کے سینے میں دل بن کر دھڑک رہا ہے البتہ طبیعت اور مزاج کے فرق نے راہِ عمل الگ الگ متعین کر دی ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ اگر سیدنا امام حسینؓ کسی وجہ سے خاموش رہ جاتے تو قرونِ اولیٰ کے تمام مسلمان بلاچوں وچرا یزید کی حکومت کو تسلیم کر لیتے۔ اس وقت بھی دلوں میں اخلاص کی وہ گرمیاں باقی تھیں جن کی حرارت سے فولاد کا جگر پگھلتا ہے اور مصلحتِ وقت کی ہر زنجیر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ صدائے احتجاج یقیناً بلند ہوتی، ہاں مگر ذرا دیر سے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس وقت تک پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوتا اور غیروں کے لیے اسلام کے مزاج پر انگلی رکھنے کی گنجائش نکل آتی لہٰذا ہم تو یہی کہیں گے کہ حضرت

* لکچرر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

امام کی پیش قدمی بروقت اور برمحل تھی البتہ وہ لوگ جو یزید کی تخت نشینی کے ابتدائی ایام میں کچھ سوچ کر خاموش تھے ہمارے نزدیک ان کی نیت پر شبہ کرنا بھی درست نہیں۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:-

"امام حسین کے علاوہ بعض صحابہ و تابعین جو حجاز و شام اور عراق میں تھے، ان کی رائے تھی کہ یزید اگرچہ فاسق و نااہل ہے لیکن قتل و خوں ریزی کے پیش نظر اس کے خلاف کسی طرح کا اقدام مناسب نہیں ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے عملاً حضرت حسین کا ساتھ نہیں دیا۔ انہیں امام حسین کے حق پر ہونے سے انکار نہ تھا اور نہ ہی انہوں نے امام حسین کو خطا کار ٹھہرایا کیوں کہ وہ مجتہد ہیں اور مجتہد کی یہی شان ہے۔ اس غلطی سے ہمیشہ بچنا چاہیے کہ حضرت حسین کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے صحابہ کو گنہ گار کہو۔ کیوں کہ یہ بھی ان کا ایک اجتہاد تھا۔" (مقدمہ ابن خلدون ص ۱۸۱)

تاریخ کا بہ نظر غایر مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کا غیور طبقہ انداز فکر کے اعتبار سے تین مختلف گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ بنیاد تینوں کی ایک تھی، سوچنے کا انداز الگ الگ تھا۔

کچھ لوگ اپنے صلح پسندانہ مزاج اور نرم طبیعت کے سبب یزید کی حکومت کو ناپسند کرنے کے باوجود لڑائی جھگڑے اور افتراق بین المسلمین کے خیال سے خاموش تھے، اس سلسلے میں عبداللہ ابن عمر اور محمد بن حنیفہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جلد بازی سے کام لینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ پہلے حالات کا جائزہ اور یزید کے آئندہ اقدام کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے پھر حق کی حمایت میں باطل کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جیسے عبداللہ ابن زبیر وغیرہ۔

بعض حضرات اعلاء کلمۃ الحق کے جذبے سے حد درجہ سرشار اور اس خیال سے بے حد مضطرب تھے کہ کہیں وقت کا کارواں دبے پاؤں گزر نہ جائے اور قوم مصلحتوں کی قبا اوڑھے یوں ہی سوئی رہ جائے اگر ایسا ہوا تو تاریخ کے صفحات پر حق پرستوں کے نشان قدم کی جگہ صداقت کے خون کے چھینٹے ہوں گے حضرت حسین اور ان کے ساتھیوں کی فکر کی بنیاد ان ہی خطوط پر تھی۔

غالباً واقعات کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے اتنا اشارہ کافی ہے۔ لہٰذا اب یہ بات نہایت اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جو حسین کی رفاقت میں اپنا گھر بار چھوڑ کر پابہ رکاب ہیں، قابل مبارکباد ہیں اور جو مکہ و مدینہ کی پاک سرزمین پر خود رک کر حضرت حسین کو بھی اپنے پاس روکنا چاہتے ہیں الزام انھیں بھی نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ سفر ابتدائی مراحل میں کوئی جنگی اقدام تو تھا نہیں کہ عالم اسلام کی ساری آبادی تلوار لے کر باہر نکل آتی۔ دعوت حضرت امام کو دی گئی تھی، وہ جا رہے تھے اور کسی جنگی تیاری کے بغیر تشریف لے جا رہے تھے کہ تخت و تاج، منصب و جاہ کا حصول پیش نظر نہیں تھا، یہ بتانا مقصود تھا کہ مہیب اندھیروں کا گلا گھونٹنے کے لیے نبی کے گھرانے کا ایک چراغ کافی ہے! وہ مٹھی بھر ساتھی جو برضا و رغبت ہمراہ ہو گئے تھے، وقت آنے پر آپ نے انھیں بھی سمجھایا کہ میرا ساتھ چھوڑ دو مگر رفیقوں نے ایک لمحے کے لیے بھی رفاقت سے منھ موڑنا گوارا نہیں کیا اچھا ہی کیا ورنہ وقت کا کوئی ناسمجھ مورخ کہہ دیتا کہ حسین کے سوا یزید کی خلافت پر اور کسی کو اعتراض تھا ہی نہیں!

[redacted]

محمد مجتبیٰ قریشی*

والدین کی ذمّہ داریاں

بچوں کو کس طرح کی تعلیم سے آراستہ کرنا ہے یہ والدین پر منحصر ہے اس سلسلہ میں والدین یا سرپرست کو کن کن مسائل
دو چار ہونا پڑے گا ان تمام باتوں پر بخوبی غور و خوض کر لینے کے بعد اسی طرح کی تعلیم سے آراستہ کریں، چونکہ ابتدا سے
ے کے رجحان کو آپ پرکھتے رہتے ہیں اس لیے یہ ذمہ داری بھی آپ کی ہے کہ اس کے رجحان کے مطابق تعلیم سے آراستہ
، بیشتر ایسا دیکھا گیا ہے کہ بچے کا رجحان کسی اور مضمون کی طرف ہے لیکن والدین اپنی مرضی کو ظاہر کرتے ہوئے بچے کی دلچسپی
رجحان کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا حکم جاری کرتے ہیں کہ سائنس، ایگریکلچر، کامرس، سوشل سائنس یا آرٹس پڑھنا ہے
صورت میں بچے والدین کی ضد کے آگے اپنی لاچاری اور بے بسی کے سبب اپنا ذاتی فیصلہ تبدیل کر دیتے ہیں اور بے دلی
والدین کی خواہش کے مطابق مضامین کا انتخاب کرتے ہیں جس کا منفی نتیجہ سامنے آتا ہے۔ والدین اپنے اخراجات کو
تے ہوئے مزید موقع دینے کا ارادہ ترک کر دیتے ہیں گویا والدین یا سرپرست اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے بجائے منفی
کا ذمہ دار بچے کی صلاحیت کو قرار دیتے ہیں، لیکن جب بچہ اپنی مرضی کے مضامین کا انتخاب کرتا ہے تو اپنے منتخب
مضامین میں پوری لگن اور مستعدی کے ساتھ محنت و مشقت کرتا ہے اور کامیابی حاصل کرتا ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ہر والدین یا
ست اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی محسوس کریں اور ابتدائی تعلیم سے پہلے اپنے بچے کے ذہن کو پرکھیں پھر اس کے مطابق تعلیم سے آراستہ
تو یقیناً ان تمام ناگزیر حالات سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

والدین یا سرپرست کو چاہیے کہ ہفتہ پندرہ روز یا ماہ میں کم از کم ایک دو بار وقت نکال کر بچے کے اسکول جائیں اور اساتذہ
مل کر بچے کی تعلیمی کارکردگی دریافت کرتے رہیں، ایسا کرنے سے بچے پر نفسیاتی دباؤ پڑے گا بچے کے بگڑنے اور تعلیم سے
واہی برتنے کے امکانات ختم ہو جائیں گے اور بچے کی کمزوریوں کا بھی پتا چلتا رہے گا بچہ ایک اچھی سرپرستی میں اپنی
کو جاری رکھ سکے گا۔ آپ کا تعاون بچے کے مستقبل کو سنوار سکتا ہے۔

ہماری قوم کا المیہ یہ ہے کہ فضول اور بے مقصد باتوں پر بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں اگر وہ بچوں کی تعلیم اور تعلیمی زندگی
یاری بنانے پر توجہ دیں تو دیگر قوموں کے ہم قدم ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان فضول باتوں پر غور و فکر اور منصوبہ بنانے کے
ان کے پاس وقت ہی وقت ہوتا ہے اور ان فضول کاموں میں دلچسپی لینے کے ساتھ ساتھ منصوبوں کو کامیاب
نے کے لیے جدوجہد کرتے رہتے ہیں لیکن بچے کے بہتر مستقبل کے لیے ان حضرات کے پاس وقت کی کمی ہوتی ہے۔ آخر

نائب مدیرہ تہذیب الاخلاق اور نشانت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ایسا کیوں؟ ظاہر ہے ایسے والدین تعلیم پر پیسہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی یہ بھی خواہش ہوتی رہتی ہے کہ اے خدا چھپّن کروڑ کا چوتھائی حصہ مجھے دے دے۔ ایسے والدین اپنے بچے کے مستقبل کو پامال کرتے ہیں۔ بعض والدین ایسے بھی ہیں جو اپنے کاروباری سلسلے میں اکثر و بیشتر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کئی کئی روز بعد گھر آتے ہیں یا دیر رات گھر آئے اور صبح ہوتے ہی کاروباری سلسلہ کے تحت چلے گئے۔ بچوں کو ماں کے زبانی آنے اور جانے کی اطلاع ملتی ہے اور بچے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہیں، طرح طرح کے پروگرامس بناتے ہیں۔ بچاری ماں تمام پابندیوں اور بندشوں کے باوجود وہ سختی نہیں کر پاتی جو باپ کی تھوڑی سختی کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے والدین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی تمام معروفیات کے باوجود اپنا کچھ قیمتی وقت بچوں کو بھی دیں۔

بچوں کے تعلیمی ماحول کے لیے گھر کا ماحول بھی سازگار ہونا چاہیے جس گھر میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں یا گھر کا کوئی فرد شراب نوشی کے بعد گھر کے افراد سے گالی گلوچ یا مار پیٹ کرتا ہے یا جوئے میں ہار کر گھر کے افراد پر غصہ دکھاتا ہے تو اس گھر کا ماحول بچوں کی تعلیم کے لیے سازگار ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسی صورت میں بچے پر غلط اثر پڑتا ہے۔ وہ ایک عجیب الجھن اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور تعلیم چھوڑ کر گھریلو ماحول میں کھو جاتا ہے جس گھر کا ماحول سازگار ہوتا ہے اس گھر کے بچے صرف تعلیم پر غور و فکر کرتے ہیں اپنے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے نت نئے منصوبے بناتے ہیں اور اسی کے مطابق اپنی تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے پختہ ارادے کے ساتھ کڑی محنت کرتے ہیں اور کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے گھریلو ماحول تعلیم کے لیے ضروری ہے اس کے بغیر بچے کا مستقبل سنوار نا ممکن نہیں۔

بچوں کو تعلیم دلانا ایک اہم مسئلہ ہے کیوں کہ ہمارا سماج تین حصوں میں منقسم ہے۔ اعلیٰ طبقہ، متوسط اور ادنیٰ طبقہ۔ پہلے طبقے کے لوگوں کو خوشحالی اور فارغ البالی حاصل ہے ان کو اپنے بچوں کی تعلیم دلانے کے لیے کسی طرح کی کوئی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور اچھے سے اچھے اسکول میں اپنے بچوں کو داخلہ دلاتے ہیں اگر داخلے میں کسی قسم کی کوئی دشواری آتی ہے تو اپنے اثر و رسوخ اور دوسرے مختلف ذرائع کا استعمال کرتے ہیں اور داخلہ کرا کے ہی دم لیتے ہیں مگر داخلے کے بعد بچہ کیا کر رہا ہے تعلیم میں دلچسپی لے رہا ہے یا نہیں یہ دیکھنے یا معلوم کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے۔ متوسط طبقے کے لوگ اوسط زندگی گزارتے ہوئے اپنے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں وہ داخلے کے لیے مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کراتے ہیں اگر بچہ خود اپنی لیاقت سے داخلہ حاصل کر لیتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ یہ طبقہ بھی اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرنے سے نہیں چوکتا۔ پس اس حد تک اپنے ذرائع کا استعمال نہیں کر پاتا جتنا اعلیٰ طبقہ کے لوگ کرتے ہیں۔ یہ طبقہ داخلے کے بعد اپنے بچوں کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ تیسرا طبقہ ادنیٰ طبقہ ہے۔ جو مالی دشواریوں میں گھرا رہتا ہے۔ جب کہ اس طبقے کے بعض بچے بہت ذہین ہوتے ہیں مگر ان کے والدین مالی دشواریوں کے سبب پڑھائی کے اخراجات کو برداشت نہیں کر پاتے۔ جو والدین تعلیم کی اہمیت اور افادیت کا شعور رکھتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ والدین اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے ان کی دیکھ ریکھ کریں اور ان کی پریشانیوں اور دشواریوں کو دور کریں تو بچے کے بگڑنے یا تعلیم سے غفلت برتنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ بچہ اپنے والدین کی امیدوں کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا اور کامیابی حاصل کرے گا اس لیے والدین کو چاہیے کہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے بچوں کے مستقبل کو روشن بنانے میں مدد کریں۔ آپ کا تعاون ہی بچے کے بہتر مستقبل کا ضامن ہے۔

(کمانڈر) ایس۔ این۔ اے فردوسی*

بازگشت

(گزشتہ سے پیوستہ)

اسی طرح یہاں کا آپسی بھائی چارہ، میل میلاپ اور رواداری بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ ہر دور میں گو کہ یاروں نے بڑی بڑی کوششیں کیں کہ یہاں کے ماحول کو پراگندہ کر کے مطلب براری حاصل کریں مگر ہر بار انھیں منھ کی کھانی پڑی۔

سرسیّد علیہ الرحمہ نے اس ادارے کی بنیاد عوام کے چندے سے شروع کی تھی۔ جیسے جیسے رقم آتی جاتی کام آگے بڑھتا رہتا۔ جب یونیورسٹی کی جامع مسجد بنی تو کچھ شر پسندوں نے بعض شیعہ حضرات کو ورغلایا کہ میاں ادارہ کی تعمیر میں تم نے بھی تو چندہ دیا ہے اور اب یہاں جب کہ شیعہ طلباء بھی زیرِ تعلیم ہیں تو ان کے لیے بھی ایک الگ جامع مسجد ہونی چاہیے۔ مطالبہ سرسیّد کے سامنے رکھا گیا۔ مرحوم نے اپنے رفیقوں (خصوصاً محسن الملک) سے مشورہ کیا اور پھر شیعہ اور سنّی دونوں کو ایک ساتھ بلایا اور سنّیوں سے پوچھا کہ بھائی آپ ظہر کی نماز کتنے بجے پڑھتے ہیں۔ جواب ملا کہ ڈیڑھ بجے۔ پھر شیعہ حضرات سے دریافت کیا کہ آپ کتنے بجے پڑھتے ہیں تو انھوں نے بتایا کہ ڈھائی بجے۔ اسی طرح عصر، مغرب اور عشاء کے بارے میں بھی دریافت کیا تو ہر نماز میں تقریباً نصف گھنٹہ کا فرق تھا۔ اس پر سرسیّد بولے کہ بھائی تو اب کیا مشکل ہے۔ پہلے ایک جماعت سنّیوں کی ہو جائے پھر دوسری جماعت شیعہ حضرات کی ہو جائے۔ چنانچہ جب سے اب (۱۹۹۵ء) تک ایسا ہی ہوتا آرہا ہے۔ حتّٰی کہ جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی اسی طرح پڑھی جاتی ہیں۔ سنّیوں کے لیے اُن کے امام اور شیعوں کے مجتہد مقرر ہیں جو اپنے اپنے مسلک کے اعتبار سے نمازیں پڑھاتے ہیں اور کسی قسم کا کوئی اختلاف کسی کو نہیں ہوتا۔ شاید برصغیر میں یہ اپنی مثال آپ ہے۔

دراصل یہ آپسی رواداری اور افہام و تفہیم سرسیّد کی تعلیم و تربیت کا ہی نتیجہ ہے۔ اس کی ایک اور دلچسپ مثال یہاں قائم ہے۔ سرسیّد کے دو شاگرد (جن میں سے ایک سنّی اور دوسرا شیعہ) آپس میں اس قدر شیر و شکر تھے کہ اپنی اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی جب وہ نوکریوں میں گئے اور بالآخر انھوں نے اپنی اپنی کوٹھیاں یہیں علی گڑھ میں تعمیر کیں تو ایک دوسرے نے اپنی کوٹھی کا نام اپنے دوست کے نام پر رکھا۔ 'ولایت منزل' (جو آرٹس فیکلٹی کے ملحق ہے) جس میں آج کل فیکلٹی آف تھیولوجی (دینیات) قائم ہے ڈپٹی حبیب اللہ خاں کی کوٹھی تھی جو انھوں نے اپنے جگری دوست ولایت حسین کے نام پر تعمیر کی اور یونیورسٹی کو وقف کر دی۔ ڈپٹی حبیب اللہ خاں سنّی تھے اور ولایت حسین شیعہ تھے۔ ولایت حسین نے جب اپنی کوٹھی لال ڈگی (علی گڑھ) پر تعمیر کی تو اس کا نام 'حبیب اللہ منزل' رکھا جو آج بھی قائم ہے۔ یہ انوکھی مثالیں ہیں۔

اور پھر بعد از خرابیِ بسیار وہ شبِ انتظار بھی آہی گئی جس کے تصور سے ہر نو وارد لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔ یہ اور بات تھی

---

* سابق پبلک ریلیشنز آفیسر، ۴۱/۱۱۰۔ دودھ پور، سول لائنز، علی گڑھ۔

کہ اپنے جیسے ہی نوواردوں کی ٹولی میں بڑا سورما بننے کے لیے ڈینگیں مارتا ہو۔ اس کی حالت کا موازنہ شاید اس بچّے سے کیا جا سکتا ہے جس سے یہ کہا جائے کہ اندھیرے آنگن کے پار چلے جاؤ۔ تم تو بہادر ہو کچھ نہیں ہوگا اور وہ لوگوں کو یقین دلانے کے لیے اپنی تھرائی آواز میں کہتے ہوئے صحن پار کرتا ہے کہ 'میں کہاں ڈرتا ہوں'، "میں کہاں ڈرتا ہوں"۔

انٹروڈکشن نائٹ یا وہ شب جس میں نوواردوں کا تعارف پرانے رہنے والوں سے کرایا جائے کچھ عجیب چیز تھی یا پھر یاروں نے اسے کچھ انتہائی عجیب چیز بنا دیا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ عام طور پر سنیچر کی رات ہر نووارد کو تاکید ہوتی کہ وہ کمرے میں ہی رہے۔ ہوسٹل کا گیٹ ویسے ہی مقفل ہوتا مگر اس رات اور زیادہ سختی سے اس پر عمل کیا جاتا۔

کسی بڑے کمرے میں اس تعارفی رات کا اہتمام ہوتا، جس میں صرف "سینیر" حضرات ہی داخل ہو سکتے تھے۔ سینیر کی تعریف یہ تھی کہ وہ مسلسل پانچ سال تک ہوسٹل میں رہا ہو۔ اس میں کلاس کی کوئی قید نہ تھی۔ منٹو سرکل (آج کا ایس۔ ٹی۔ ہائی اسکول) کے ہوسٹل کے قیام کو بھی سینیرٹی کے لیے تسلیم کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی نووارد براہِ راست پی۔ ایچ ڈی میں بھی داخلہ لیتا تو اس کا شمار بھی نوواردوں (جونیر) میں ہی ہوتا۔ اور پھر اس طرح تقریباً رات کے دس بجے یہ ایکسرسائز (Exercise) شروع ہوتی۔ کمروں کے نمبروں کے لحاظ سے نووارد باری باری بلائے جاتے اور وہ بیچارہ ہانپتے کانپتے دھڑکتے دل کے ساتھ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوتا سارے ہی سینیر یک بارگی ایک فلک شگاف قہقہے سے اس کا استقبال کرتے۔ غریب کی رہی سہی ہمت بھی دم توڑ دیتی۔ اس کے بعد باری باری سے اس سے سوالات کیے جاتے مثلاً 'کیا نام ہے صاحبزادے؟' اگر جواب معقول ہوتا یعنی جواب کا انداز پُر اعتماد ہوتا تو اگلا سوال کیا جاتا 'تشریف کا ٹوکرا کہاں سے آیا ہے'، یا 'جناب کس کھیت کی مولی ہیں'، وغیرہ اگر نام 'دلچسپ' ہوتا تو اس پر ہی کچھ سوالات کیے جاتے کہ میاں ابّا اماں کو اس کے علاوہ کوئی اور نام نہ ملا جو یہ رکھ دیا وغیرہ وغیرہ۔ مختلف سوالات کے ذریعے نووارد کی خود اعتمادی، تعلیمی ذوق، خاندانی پس منظر، کھیل کود یا ثقافتی دل چسپی وغیرہ کے بارے میں پوری معلومات حاصل کی جاتیں۔ اگر کوئی نووارد ذرا بھی نروس (Nervous) ہوتا تو وہ اچھا خاصا دل چسپی کا سامان بن جاتا۔ اگر نووارد واقعی خود اعتمادی سے جوابات دیتا رہتا تو پھر اس سے ذہانت کے سوالات کیے جاتے۔

دراصل علی گڑھ کی تعلیم و تربیت کا ایک مقصد طلباء میں خود اعتمادی پیدا کرنا بھی رہا ہے۔ اس لیے کہ بغیر خود اعتمادی کے کوئی شخص بھی ترقی کی منزل کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس دانش کدے سے فارغ طالب علم اپنی ذہانت، طور طریقے، خود اعتمادی، حاضر جوابی اور اندازِ گفتگو کے باعث ہر جگہ، ہر محفل حتیٰ کہ ہر انٹرویو میں دوسروں سے الگ نظر آتا۔ اس میں شوخی، ظرافت اور بذلہ سنجی تو ہوتی مگر تہذیب کی حدود سے وہ کبھی باہر نہ جاتا اور اس تربیت کا پہلا زینہ یہی انٹروڈکشن نائٹ ہوتی۔ نئے پرانے کچھ دیر بعد جب ذرا کھل جاتے تو گفتگو کا دوسرا دور شروع ہوتا۔ اب معاملات علمی، ادبی یا عام معلومات (G.K) سے متعلق ہوتے۔ یہاں البتہ اگر کوئی اکڑو خاں ہوتے تو پھر اُن کی کھینچائی بھی طبیعت سے ہوتی۔ یہاں تک کہ کبھی میز پر کھڑے ہونے کو کہا جاتا، تو کبھی مرغا بن جانے پر زور دیا جاتا وغیرہ وغیرہ۔

سنجیدہ ماحول ہو جانے کے بعد فرمائش ہوتی کہ کوئی گانا سنایئے۔ گانا نہ آتا ہو تو کوئی غزل ہی سنایئے اور آخری حد میں بات یہاں تک آتی کہ پچھلے پڑھے ہوئے کورس میں سے کسی استاد کا کوئی شعر سنائیں۔ اور پھر موجودہ سینیرز باری باری سے اپنا تعارف کراتے اور سرسید علیہ الرحمہ کے دور سے قایم روایات، جو سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں اُن کا درس دیا جاتا اور ہدایت کی جاتی کہ میاں یہ امانت ہم نے تم تک پہنچا دی اور اب تم اپنے آگے آنے والوں تک اسے پہنچا دینا۔

چنانچہ جب اس خاکسار کا نمبر آیا تو اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ داخل ہوتے ہی شاندار فرشی قہقہوں نے ا
خاکسار کا بھی استقبال کیا مگر جب چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو ساری ہی جانی پہچانی صورتیں موجود تھیں۔ دراصل اس کی و
تھی کہ میرا داخلہ اس شب مخصوص سے تقریباً بیس دن پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا اور یہ سارے سینیرز پابندی سے (ہوسٹل کی
میں ملتے تھے۔ دن میں کم از کم چار بار کی ملاقات کے بعد اجنبیت باقی نہیں رہی تھی۔ اُن میں سے اکثر میرا نام جانتے تھے اور
بھی ان کے سامنے ناموں کی فہرست رکھی تھی۔ پھر بھی وہی سوالات مجھ سے بھی کیے گئے، مگر کسی قدر سنجیدہ لہجے میں۔ اس کے
فوراً ہی گفتگو ادبی انداز کی ہونے لگی اور پھر وہی فرمائش گانے کی۔ میں اکثر غزلیں گنگنایا کرتا تھا، یہ گنگنانا اس وقت کام آگ
مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے پہلے تو وہ غزل سنائی جس کا مطلع ہے ؎

جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا — آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا

اور پھر دوسری فرمائش پر چکبست کی وہ غزل جو ہمارے نصاب میں تھی

رحمتِ باری کے سکے داغِ عصیاں ہو گئے — رہ گئی بازارِ محشر میں گنہگاروں کی ساکھ

سنائی۔ اب فرمائشیں بڑھنے لگیں تو میں ذرا ٹھٹھکا۔ اس پر فیروز صاحب جو دراصل اس محفل کو کنڈکٹ کر رہے تھے بولے کہ اچھا
کے کلام میں سے کچھ سنا دیجیے۔ میں نے کہا کہ کیا ترانۂ ہندی ع 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' تو وہ بولے کہ نہیں،
کچھ اور سنا دیجیے اور اس کے بعد پھر ہم بھی سنائیں گے۔ میں نے اقبال کی مشہور نظم جس کا یہ بھی ایک شعر ہے ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں — تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کرلے

سنائی۔ اس کے بعد فیروز صاحب نے سوال کیا کہ میاں آپ کو آئے تقریباً بیس دن ہو چکے ہیں کیا آپ نے علی گڑھ کا ترانہ
کرلیا ہے۔ میں ذرا چونکا۔ پھر کہا کہ کیا ترانۂ ہندی؟ تو انھوں نے کہا کہ نہیں۔ وہ تو ہے ہی سب گاتے ہیں۔ میں تو علی گڑھ کے تر
کے بارے میں دریافت کر رہا ہوں۔ اور پھر خود بولے: لیجیے سنیے میں سناتا ہوں اور آپ بھی یاد کر لیجیے گا۔ اس کے بعد انتہائی
اور پُرجوش آواز میں اقبال کی نظم 'طلبائے علی گڑھ سے خطاب' جھوم جھوم کر گانے لگے ع 'اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے'
اس زمانے تک عام محفلوں میں غیر رسمی طور پر ترانۂ ہندی اور یہی نظم پڑھی جاتی تھی۔ مجاز کا ترانہ دراصل ہم میں سے کچھ سرپھ
نے ۵۳-۱۹۵۲ء میں مجاز کے انتقال کے بعد 'ترانۂ علی گڑھ' کی حیثیت سے اپنایا (اس کی تفصیلات بعد میں آئیں گی)۔

فیروز صاحب نے اپنی نظم ختم کرنے کے بعد باقی سینیرز سے پوچھا کہ کیا آپ لوگوں کو کچھ اور پوچھنا ہے تو محسن صاحب جو مزاجاً
خاموش طبیعت کے انسان تھے بولے کہ ہاں۔ (ان کو یہ معلوم تھا کہ اس خاکسار نے تجویدکی کلاس میں داخلہ لیا ہے اور قاری
صاحب کا شاگرد ہے)۔ ان سے تو کوئی رکوع سنا جائے۔ تھکنے کے باوجود کلام اللہ کی فرمائش پر مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔ سورۂ
کا پہلا رکوع سنایا جس کو سب نے انتہائی ادب سے سنا اور پھر محفل کا موڈ اب بدل چکا تھا۔ چنانچہ آخری دور شروع ہوا۔ فیر
صاحب نے ہی بات شروع کی اور فرمایا کہ اب آپ علیگ برادری کے ایک فرد ہیں۔ لہٰذا آپ کی ذمہ داری بھی اتنی ہی ہے جتنی ہ
کہ ہم یہاں کی روایات قائم رکھیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں افضل وہ ہے جو سلام میں پہل کرے چن
ہم بھی کوشش کریں گے اور آپ بھی کوشش کیجیے پہل کرنے کی۔ (یہ بات انتہائی دلچسپ ہے اور خصوصاً آج کے سینیرز کے
قابلِ توجہ کہ فیروز صاحب ایم۔ ایس سی فزکس کے فائنل ایئر کے طالب علم تھے۔ چند ماہ بعد وہ ہمارے ڈیمانسٹریٹر بھی ہو گئے اور
پریکٹیکل کروانے لگے۔ تقریباً ½۱ سال بعد وہ علی گڑھ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ (اس ½۱ سال کے عرصے میں میری حسرت ہی ر

میں انھیں پہلے سلام کر پاتا۔ ہر بار وہی سبقت لے جاتے۔)

اس کے علاوہ جو کچھ اور باتیں انھوں نے بتائیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔ دیکھیے کبھی کسی کے کمرے میں بغیر دستک دیئے داخل نہ ہوں۔ اپنے پارٹنر کی کوئی بھی چیز حتیٰ کہ اس کے میز پر رکھی اس کی پینسل ہی ہو بغیر اس سے پوچھے استعمال نہ کریں۔ کمرے سے باہر کبھی بنیائن میں نہ نکلیں، چاہے بیرے کو ہی آواز دینی ہو۔ ہوسٹل سے باہر ہمیشہ مناسب (Proper) لباس میں جائیں۔ شیروانی اگر نہیں سلوائی ہے تو جلد از جلد سلوالیں اور ہمیشہ پورے بٹن بند رکھیں۔ ہمیشہ اپنے پاس اپنا شناختی کارڈ رکھیں۔ کلاس میں بغیر شیروانی کے کبھی نہ جائیں۔ ہمیشہ چھوٹے بڑے کا ادب لحاظ رکھیں۔

اُس زمانے میں ہر ہوسٹل کے بیت الخلاء اصل عمارت سے کچھ فاصلے پر بنے ہوئے تھے اور پُرانی وضع کے تھے جن کی صفائی کے لیے ہر ہوسٹل میں ۴۔ ۵ مہتر ہوتے تھے۔ یہ مسلسل ان کی صفائی کرتے رہتے تھے۔ بیت الخلاء میں اکثر صرف سامنے آڑ کے لیے ایک دیوار ہوتی تھی اور دروازے نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا اس انٹروڈکشن نائٹ میں یہ بات بھی بتائی گئی کہ آپ جب بھی بیت الخلاء جائیں تو وہاں پہنچ کر پہلے اپنا پیر تھپتھپا کر یہ معلوم کرلیں کہ اندر کوئی ہے تو نہیں۔ اگر آپ خود اندر ہیں تو گلا کھنکھار کر آنے والے کو مطلع کر دیں کہ اندر کوئی ہے۔ بظاہر یہ چھوٹی سی بات لگتی ہے مگر عملی زندگی کے لیے کس قدر اہم ہے۔

آج (۱۹۹۵ء) میں ہر ہوسٹل میں لگے فلش لیٹرین کو دیکھ کر اس کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے کہ وہ کیسی صورت حال رہی ہوگی۔ انٹروڈکشن کا طوفان گزر جانے کے بعد اب حالات یہ تھے کہ اگر کسی نووارد کو (جس کا انٹروڈکشن ہوچکا ہے) کوئی پرانا طالب علم (جو پورا سینیئر نہیں ہوتا اور کسی دوسرے ہال کا ہوتا) چھیڑ چھاڑ کی کوشش نیکلٹی میں کرتا تو اس نووارد کے اپنے ہال کے طالب علم اس کی مدد کے لیے آجاتے۔ البتہ اس طالب علم کو اُس وقت تک ٹوکا جاتا رہتا جب تک وہ باقاعدہ شیروانی میں نظر نہ آجاتا۔ یا پھر اگر وہ سلام میں کوتاہی برتتا۔

علی گڑھ کے ماحول میں عام طور پر سگریٹ کا رواج بالکل نہ تھا۔ اِکّا دُکّا جو پیتے، چھپ کر پیتے اور اپنے سینیر کے سامنے تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ بعض اساتذہ سگریٹ اور بعض سگار پیتے تھے۔

میرے انٹروڈکشن میں جو لوگ موجود تھے اُن کے نام یہ ہیں: فیروز صاحب، محسن صاحب، اسرار صاحب (سینیر ہاؤس) کلیم صاحب (طالب علم قانون)، مظہر صاحب (سینیر ہال۔ جو کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے)، کچھ سینیر آئے ہی نہیں۔ اور ان کے علاوہ کچھ چھٹ بھیّے جو اندر آ نہیں سکتے تھے صرف دروازوں اور کھڑکیوں کی درازوں سے تاک جھانک ہی کرتے رہتے یا پھر چوروں کی طرح دیواروں سے کان لگائے کچھ سننے کی کوشش میں لگے رہتے۔ (باقی آئندہ)

(باقی صفحہ ۳۱ کا)

رکھنے کے لیے متعلقہ اساتذہ کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت اور پروگرام بنانا ضروری ہے۔

میرٹ کلاس کی اسکیم انوکھی اور دلچسپ ہے۔ پانچ سال بعد یہ معلوم ہوگا کہ یہاں کے طلبہ کن پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلہ کے مستحق ہوئے ہیں۔ یہ اسکیم ضرور کامیاب ہوگی بشرطیکہ تعلیمی پروگرام پر نہ صرف گہری نظر ہو بلکہ اس کی کامیابی کے لیے مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ کے گارجینز کا تعاون بھی حاصل ہو۔ تعلیم کا کام دیرپا اور صبر آزما ہوتا ہے اس قسم کی عملی شروعات نہایت مبارک اور تعلیم کے میدان میں ایک فال نیک ہے۔


شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ
کے لئے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں
کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے
پھنسی، خارش اور داد
کھجو کی دوا
خمیرہ اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ


ہمدرد
سنکارا الکحل سے پاک صحت بخش جڑی بوٹیوں سے
بھرپور نادر مرکب ہے۔ اس میں موجود مقوی اجزا کو
جسم قدرتی طور پر قبول کرلیتا ہے۔
سنکارا کے استعمال سے:
● عام کمزوری دُور ہوتی ہے ● چھوت کی بیماریوں سے بچاؤ
ہوتا ہے ● قوتِ برداشت بڑھتی ہے ● قوتِ حافظہ
بڑھتا ہے ● حمل کے دَوران خون کی کمی نہیں ہوتی
● جوش اور دلولہ برقرار رہتا ہے۔
آپ اور آپ کے خاندان کی صحت اور
خوش حالی کے لیے
ہر موسم کا سدابہار ٹانک سنکارا
cinkara
جو پیتا وہی سکندر
cinkara
ہر روز
دو چمچے
دو بار
cinkara
سنکارا جگائے جینے کی اُمنگ

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۴ | جولائی ۱۹۹۵ء | شمارہ ۷

بانی: سرسیّد احمد خان

مُدیر

پروفیسر مسعود عالم

شریک مُدیر ــــــــــــــــ نائب مُدیر

ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی ــــــــــــــــ احمد مجتبیٰ قریشی

سرکولیشن انچارج: محمد عتیق قاضی

فی شمارہ	6 = 50	روپے	زرسالانہ	65 = 00	زرسالانہ طلبہ 00 = 45 روپے
بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک)	30 = 00	امریکی ڈالر	بیرونی ممالک (عام ڈاک)	15 = 00	امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ (اندرون ملک)	650 = 00	روپے	لائف ممبرشپ (بیرون ملک)	300 = 00	امریکی ڈالر

ترسیلِ زر کا پتہ

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اور نشانت

ایشبلی روڈ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ترتیب

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے متفق ہو]
ایڈیٹر، پبلیشر پروفیسر مسعود عالم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کے توسط سے چھپوا کر ادارۂ تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا۔

حرف آغاز

ان دنوں ادارہ تہذیب الاخلاق اور نشانات کا سب سے بڑا مسئلہ ۱۹۹۵ء کے اواخر تک ایک خصوصی نمبر کی اشاعت کا ہے۔ ایک ایسا خصوصی نمبر جسے مدرسۃ العلوم مسلمانانِ ہند، بعد ازاں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور بالآخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کہلانے والے اس تعلیمی ادارے کی تاریخ کہہ سکیں۔ یہ منصوبہ تہذیب الاخلاق کے مدیر پروفیسر مسعود عالم کا ہے (جو اس ماہ کے اواخر میں مدیر کے عہدہ سے سبکدوش ہو رہے ہیں) ہماری خواہش ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پلیٹنم جوبلی کے موقع پر شائع ہونے والا مجوزہ نمبر اس ادارے کے قیام، مختلف ادوار، مسلمانانِ ہند کی زندگی، زبان و ادب، صحافت اور قومی سیاست پر اس کے اثرات، سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں اس کی ترقی اور دیگر تعلیمی شعبوں میں پیش رفت، اس کے معروف ادارے، اخبار و رسائل، ہاسٹل، طلبا یونین، اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، ڈیوٹی سوسائٹی، طبیہ دواخانہ، میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج، ویمنس کالج، طبیہ کالج اور دیگر انسٹی ٹیوٹ، اہم مسائل، نامور اساتذہ اور قابلِ ذکر فارغین کا کسی قدر احاطہ کر سکے۔ اس سلسلے میں ہمیں آپ کے قلمی تعاون، تجاویز اور مشوروں کی ضرورت ہے۔

قمر الہدیٰ فریدی

ڈاکٹر ڈی۔ آر۔ گوئل *
مترجم محمد شمیم الزماں

سپریم کورٹ اور مشترکہ سول کوڈ

بلا امتیاز مذہب و ملت تمام ہندوستانیوں پر نافذ کیا جانے والا یکساں سول کوڈ ایک نئے ہنگامی مسئلے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ابھی تک تو یہ مسئلہ فرقہ وارانہ اختلاف کی ضمن میں ثانوی حیثیت رکھتا تھا لیکن اب کچھ ہندو خواتین کی جانب سے ان کے شوہروں کے ذریعے دوسری شادی رچانے کے لیے اسلام قبول کرنے کے پس منظر میں دائر مقدموں کی سماعت کے بعد سپریم کورٹ کے دو رکنی بنچ کے ذریعے جاری کی گئی ہدایتوں کی ضمن میں یہ مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی (بی۔ جے۔ پی) اور اس کی ہم نوا جماعتیں اس فیصلے کو بنیاد بنا کر ہندو اکثریت کو ورغلانے کی کوشش کر رہی ہیں تاکہ ان کا ووٹ بینک اور مضبوط ہو سکے۔ بی جے پی صدر ایل۔ کے۔ اڈوانی نے یہ قیاس لگاتے ہوئے کہ یکساں سول کوڈ کا معاملہ آئندہ لوک سبھا انتخابات میں ایک بڑا انتخابی مسئلہ ثابت ہوگا، اسے ایک سنگ میل کی حیثیت کا فیصلہ بتایا ہے۔ جس تیزی کے ساتھ تھیرو وننتھا پورم اور نئی دہلی میں یکے بعد دیگرے پریس کو بیان دینے کے لیے وہ موجود رہے ہیں۔ اس سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس انداز میں اس موضوع کا استحصال کرنا چاہتے ہیں۔ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ "راؤ حکومت اس میدان میں بالکل چت ہو گئی ہے" اور "حکومت اس فیصلے کی خلاف ورزی صرف اس قیمت پر کر سکتی ہے کہ اسے حکم عدولی کا مجرم قرار دیا جائے۔"

راجیہ سبھا میں ان کی پارٹی کے ایک رفیق نے اس مافی الضمیر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "حکومت یکساں سول کوڈ کو اس لیے نافذ نہیں کر رہی تھی، کیوں کہ وہ مسلمانوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔" عورتوں پر کیے جا رہے نام نہاد مظالم کے تدارک کی دہائی دیتے ہوئے انھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ "اگر ہندو "ستی پرتھا" اور "بال وِواہ" جیسی رسموں کو چھوڑ سکتے ہیں تو مسلمانوں کو بھی اپنے پرسنل لا سے متعلق یہی مثال اپنانی چاہیے۔"

اس بیان میں ہندو مسلم کشیدگی کو ہوا دینے کی کوشش صاف طور سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ اگر مقصد محض عورتوں کو انصاف دلانے کے لیے معاشرتی اصلاح کا ہے تو اس سلسلے میں یکساں سول کوڈ کی ضرورت شاید ہی پڑے۔ کیوں کہ اگر ہندو چند غلط رسموں کو اپنے سول کوڈ سے بغیر کسی غیر ہندو کوڈ کو مانے ہوئے نکال چکے ہیں تو مسلمان بھی اسی قسم کا لائحہ عمل اختیار کر سکتے ہیں۔ پھر اسے انتخابی موضوع کیوں بنایا جائے اور یہ اعتراض کیوں پیدا کیا جائے کہ حکمراں جماعت مسلمانوں کی ناراضگی سے خوف زدہ ہے؟

اس مسئلے کو سنگھ پریوار جو رُخ دینا چاہتا ہے وہ آر۔ ایس۔ ایس کے ہندی ترجمان "پنج جنیہ" میں شائع دیویندر سروپ کے اس مضمون سے مزید واضح ہو جاتا ہے جس میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کو قومیت کے سنگ بنیاد کی حیثیت سے ٹھیک اسی طرح

---

* چیف ایڈیٹر "سیکولر ڈیموکریسی"۔ نئی دہلی۔

پیش کیا گیا ہے جیسے ایودھیا پر بی۔ جے۔ پی کے وہائٹ پیپر کے مصنف کے ذریعے بابری مسجد کے انہدام کو "ہندوتو" یا "درست قومیت" کی جانب ایک بڑا قدم بتایا گیا تھا۔ اس مضمون کا مصنف کوئی معمولی کالم نگار نہیں ہے بلکہ وہ دین دیال اپادھیائے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر ہے جو کہ سنگھ پریوار کا دماغ ہے اور بی۔ جے۔ پی جس کی ایک رکن ہے۔

سروپ نے عدالت کے اس تبصرے کو جواہر لال نہرو اور ہندوستان کے سیاسی افق کے مذہبی رواداری کے عظیم ستونوں پر شدید نکتہ چینی کے لیے استعمال کیا ہے۔ انھوں نے نہرو پر مٹھی بھر مسلمان عوامی نمائندوں کے سامنے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کو آئین میں درج بنیادی حقوق کے باب میں رکھنے کی بجائے رہنما اصولوں کے باب میں رکھنے کے سلسلے میں خود سپردگی کا الزام لگایا ہے۔ ان کا الزام ہے کہ جب ۵۴ء سے ۱۹۵۶ء کے درمیان نہرو نے ہندو معاشرے میں کئی اصلاحات کا نفاذ کیا۔ اس وقت ان کے اندر اتنی جرأت نہیں تھی کہ " وہ مسلم معاشرے کو دقیانوسی اور غرق انجماد شریعت کی بندشوں سے نجات دلا سکتے" سروپ کے مطابق نہرو کو اسی وقت پوری دنیا کو یہ بتانا چاہیے تھا کہ " ہندوستان میں ہندو معاشرہ ہی واحد سچا معاشرہ ہے کیوں کہ یہ اپنی رسم و روایات میں تبدیلی کو وسیع القلبی کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ قومی وحدت کے مفاد میں عمل کرتا ہے اور تبدیلی زمانہ کے ساتھ خود بھی بدل جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

سروپ کے اس مضمون کا بے مقصد بہاؤ کسی تبصرے کا حامل نہیں، پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ سچائی وہ نہیں ہے جیسا کہ انھوں نے اخذ کیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حقیقت یہ نہیں کہ تمام ہندوؤں نے ان تبدیلیوں کو خوشی سے قبول کیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو امبیڈکر کے ذریعے پیش کیا گیا ہندو کوڈ بل یونہی رد نہیں کر دیا گیا ہوتا۔

سروپ نے خود اس بات کی توثیق کی ہے کہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اس بل کے نفاد کے مخالف تھے اور یہی رویہ آر۔ ایس۔ ایس کے چیف ایم۔ ایس گولوالکر کا تھا جن سے ایک پریس کانفرنس میں اس موضوع پر جب پوچھا گیا تو انھوں نے اس معاملے میں حکومت کے ذریعے کسی بھی قسم کی دخل اندازی کی شدید مخالفت کی۔ ان کا جواب تھا؛

"سماج کی فطری ترقی کے مراحل میں قانون قدرتی طور پر بنتے اور مستند ہوتے ہیں اور حکومت انھیں بعد میں صرف منظور کرتی ہے۔ اس لیے حکومت کا کام راستہ دکھانے کی بجائے ان قوانین کو قبول کرنے کا ہونا چاہیے۔"

انھوں نے سماجی وحدت اور اخوت کے لیے یکساں سول کوڈ کی ضرورت پر زور نہیں دیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ:

" زمانے سے ہم لوگ بے شمار قوانین کے حامل رہے ہیں اور ہم لوگ کسی کے لیے بھی بُرے ثابت نہیں ہوئے۔ ابھی حال تک کیرل میں مادرانہ نظام Matriarchal System) رائج رہا ہے تو اس میں آخر کیا خرابی تھی؟ تمام قوانین کے معمار خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید اس بات پر متفق ہیں کہ رسوم کو قانون پر فوقیت حاصل ہے اور ہونی بھی چاہیے۔ مذہبی کتابوں میں آیا ہے کہ "شاسترن رودتھیور دھاییتی" یعنی رواج شاستروں سے زیادہ موثر ہیں اور اسی لیے رواج مقامی یا اجتماعی قانون ہے۔ تمام معاشروں نے مقامی رواجوں یا قوانین کی قوت اور معقولیت کو تسلیم کیا ہے۔"

یہاں یہ یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ بی۔ جے۔ پی کی پہلی شکل یعنی بھارتیہ جن سنگھ نے مختلف النوع ہندو پرسنل قوانین میں ایک ہندو کوڈ بل کے ذریعے یکسانیت لانے کی کوششوں کی پُرزور مخالفت کی تھی۔ ۱۹۹۲ء کی انتخابی مہم میں بھارتیہ جن سنگھ اور اس کی ہم نوا پارٹی رام راجیہ پریشد کا سب سے اہم موضوع اس قسم کی کسی بھی کوشش کی مخالفت تھا۔ یہی تمام عناصر مل کر آج بی۔ جے۔ پی کو ترتیب دیتے ہیں۔ حالانکہ آج بھی جنسی مساوات اور عورتوں پر جاری گھریلو قسم کے جبر سے تحفظ دلانے کے مقاصد کو بنیاد بنا کر ہندو

قانون میں کسی بھی قسم کی اصلاحات کے سوال پر وہ خاموش ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ہندو شادی، جانشینی اور وراثت ایکٹ کے
[illegible] کرنے کا اظہار کیوں کرتے جب کہ ایک ہی سانس میں وہ اس کی بھی توثیق کر رہے ہیں کہ ہندوؤں کی اکثریت نے تمام ا
[illegible] خوش دلی کے ساتھ قبول کیا ہے۔ اگر کثیر الازدواجیت کے معنی عورتوں کے تئیں ناانصافی ہے تو مسلمانوں کی خوشامد سے تعبیر
کی بجائے ہندوؤں کے تعلق سے اسے خوش آمدید کہنا چاہیے۔ یکساں سول کوڈ سے متعلق ان کا اظہار خوشی مسلمانوں کو طعنہ دینے
اکسانے کے مترادف ہے۔

بی۔ جے۔ پی کا انتخابی تجربہ یہ رہا ہے کہ انتخابی میدان میں اس کی کامیابی بے واسطہ طور پر یہ تاثر دینے میں کامیابی
متوازی ہے کہ اس کی مخالف پارٹیوں کا واحد مقصد مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنا اور مسلم ووٹ بینک کو اپنے حق میں ہموا
ہے اور یہ چیز ہندو ووٹ بینک بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے جو اپنے آپ میں زیادہ وسیع ہے۔ ۱۹۸۶ء شاہ بانو کیس
سلسلے میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے پس منظر میں وہ عوام کے جذبات کو ابھارنے میں کامیاب رہے اور انھوں نے ایک رد
بیدار کرکے متذبذب اور پریشان حکومت پر پہلے تو ایودھیا کی عبادت گاہ کا دروازہ کھولنے اور پھر وہاں شیلا نیاس کی اجاز
دینے کے لیے دباؤ ڈالا۔ اس کے بعد کے مراحل نے سیاسی نظام کو اس طرح درہم برہم کر دیا کہ بی۔ جے۔ پی اور اس کی ہم نواجما
کو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے ارتکاب جرم اور سپریم کورٹ کی کھلی خلاف ورزی کا موقع ملا۔

اس قسم کے کسی بھی سانحے کے دوبارہ رونما ہونے سے بچنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہر ممکن غصے کی شدت ۔
گریز کیا جائے۔ یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ غیر بی۔ جے۔ پی جماعتوں نے ایک متوازن ردّعمل پیش کیا ہے اور یہ کوشش جا
ہے کہ درپیش مسئلے پر منصفانہ اور تعقل پسندانہ انداز میں بحث کی جائے۔ مسلم فرقے نے جج کی اپنی ذاتی رائے کے فیصلے سے پرا
ہونے کے باوجود ہندوستانی آئین اور عدالتی نظام کے تئیں عدم اعتماد کا ویسے متشدد اور جنونی ردّعمل کا مظاہرہ نہیں کیا ہے
کہ ۱۹۸۶ء میں ایک شدت پسند طبقے کے ذریعے پیش کیا گیا تھا۔ ماضی کے تجربوں کی بنا پر یہ امید کی جاتی ہے کہ مسلم علما ایسا
نہیں کریں گے جس سے یہ مسئلہ ہندو مسلم سیاسی اختلاف کا مسئلہ بن جائے۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے پر حقیقت پسندی اور
کے ردّعمل کی بنا پر تعقل پسندانہ بحث ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں دلائل ایسے ہوں جو نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ پوری قوم
لیے قابل قبول ہوں۔

ججوں نے وزیراعظم کے ذریعے حکومتِ ہند سے اپیل کی ہے کہ وہ آئین کی دفعہ ۴۴ پر ازسرنو غور کرے اور "پورے ہندوس
میں شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوشش کرے۔" مزید انھوں نے حکومت کو یہ بھی ہدایت دی ہے کہ وہ اگست ۱۹۹۶
کسی ذمہ دار افسر کے ذریعے اس ضمن میں ایک حلف نامہ بھی عدالت میں پیش کرے کہ حکومت ہند نے اس مقصد کے حصول کے
کیا اقدامات کیے ہیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ عدالت میں داخل عرضیاں سول کوڈ سے متعلق عدالت کی رائے نہیں جاننا چاہتی تھیں جیسا کہ
ججوں نے اس کی وضاحت کی ہے کہ زیر غور معاملات مندرجہ ذیل تھے:

کیا کوئی ہندو جس کی شادی ہندو قوانین کے تحت ہوئی ہو، اسلام قبول کرنے کے بعد دوسری شادی
کا مجاز ہے؟

کیا ایسی شادی پہلی شادی کے خاتمے کے بعد قانونی پہلو سے جائز ہوگی جب کہ پہلی بیوی اب بھی

ہندو ہے ؟

کیا وہ مرتد شوہر I.P.C کی دفعہ ۴۹۴ کے تحت مجرم سمجھا جائے گا ؟

ہندو قانون اور مقدمات کے تجزیے کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی کہ :۔

اس قانون (ہندو وواہ قانون) کے تحت ہوئی شادی کو ختم نہیں کیا جاسکتا ۔ علاوہ اس کے کہ اس قانون کے سیکشن ۱۳ میں درج وجوہات مانع نہ ہوں۔

کسی بھی مرتد شوہر کے ذریعے قبولِ اسلام کی توجیہہ کے تحت دوسری شادی اس قانون کی دفعات کی خلاف ورزی کے بعد شادی ہی نہیں مانی جائے گی ۔ اس لیے ایسے شخص کی دوسری شادی غیر قانونی ہوگی ۔ اگر اس کی بیوی جس نے اس قانون کے تحت شادی کی ہو اور اب بھی اس کی بیوی ہو ۔

ہندو شوہر کے ذریعے اسلام قبول کر لینے کے بعد کی گئی دوسری شادی انصاف، اصول معادلت اور نیک نیتی کی سراسر خلاف ورزی ہونے کی وجہ سے ان بنیادوں پر بھی کالعدم قرار دی جائے گی اور I.P.C کے سیکشن ۴۹۴ کی دفعات بھی اس میں ملوث ہوں گی ۔

ایسی دوسری شادی فطری قوانین کی بھی خلاف ورزی ہوگی اور یوں اسے کالعدم قرار دیا جائے گا ۔

ان تاثرات کے جواز کے طور پر ججوں نے فیصلے کی مزید صراحت کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

" یہ ضروری ہے کہ دو علیحدہ قسم کے نظام قانون کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جائے جیسی کہ دو فرقوں کے درمیان ہونی چاہیے I.P.C کے سیکشن ۴۹۴ کی جو توضیح ہم نے پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف ہندو قانون دوسری طرف مسلم قانون دونوں اپنے اپنے دائرے میں بغیر ایک دوسرے کے پرسنل لاز میں حارج ہوئے اپنی اپنی حدود میں کام کریں گے ۔ چوں کہ نہ تو یہ اسلام کا مقصد ہے اور نہ ہی روشن خیال مسلم فرقے کا یہ منشا کہ کسی ہندو شوہر کو صرف اس لیے مسلمان ہونے دیا جائے کہ وہ دوسری شادی کا حق حاصل کرکے، اپنے پرسنل لا کی خلاف ورزی کر سکے ۔ اس لیے عدالت کو مائل کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایسے قوانین وضع کرے جو ہندو شوہر کو مسلمان بن کر اس صورت میں دوسری شادی کرنے سے منع کرے اگر قانون کے تحت اس کی پہلی شادی ٹوٹ نہ چکی ہو "

اس حد تک تو عدالتی فیصلہ غیر اہم ہے اور سب اس کو مانتے ہیں لیکن مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب دفعہ ۴۴ سے متعلق حصّہ سامنے آتا ہے ۔ ججوں کا خیال ہے کہ یہ دفعہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے سلسلے میں ایک " واضح فرمان " ہے ۔ ان کے خیال میں یہ قومی استحکام کے لیے ایک فیصلہ کن قدم ہے ۔ یہ فیصلہ اس ریمارک کے تحت بی ۔ جے ۔ پی کے فرقہ وارانہ موقف سے کس حد تک قریب ہے کہ :

" جب ۸۰ فی صد سے زیادہ شہریوں کو مدون پرسنل لا کے تحت لایا جاچکا ہے تو ہندوستان کے تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کو معرضِ التوا میں رکھنے کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا ۔ "

جج کی اس ذاتی رائے کو کسی خاص مسئلے پر دیے گئے فیصلے سے جوڑتے ہوئے کہا گیا :۔

جب تک ہم اپنا مقصد ۔ یعنی تمام ہندوستانی شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ ۔ حاصل نہیں کر لیتے تب تک ایسے

ہندو شوہر کے لیے جو پہلی شادی کے قائم ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں، یہ ترغیب بنی رہے گی کہ وہ مسلمان بن جائیں کیوں کہ ہندوؤں کے یہاں ہی ایک شادی کا قانون ہے اور مسلمانوں کے یہاں زیادہ سے زیادہ چار شادیوں کی اجازت ہے اس لیے ہندو شوہر ہندو قانون کی دفعات سے دھوکا کرنے کے لیے اور تعزیری نتائج سے بچنے کے لیے اسلام قبول کر لیتے ہیں۔"

اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

"جو لوگ تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ گئے وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندوستانی رہنما دو قومی یا سہ قومی نظریے میں یقین نہیں رکھتے اور جمہوریہ ہند میں صرف ایک ہی قوم رہے گی اور کوئی بھی فرقہ مذہب کی بنیاد پر ایک الگ اکائی ہونے کا دعویٰ نہیں کرے گا۔"

معزز ججوں کے تئیں پورے احترام کے ساتھ کہنا چاہوں گا کہ یہ تمام دلایل حقیقت اور مفہوم کی بنیاد پر غلط ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں اندرونی سطح پر کئی تضادات موجود ہیں جو مجھ جیسے قانونی میدان میں نااہل آدمی کی نظروں میں بھی چبھتے ہیں۔ مثال کے طور پر جسٹس سہائے اپنے ایک متوازی فیصلے میں سیکولرزم کی بنیاد مذہبی آزادی کو کسی فرقے کی مرضی کے خلاف دفعہ ۴۴ کے نفاذ کو مخالفت بر آمدہ مانتے ہیں۔

ان کے خیال میں مذہب محض یقین سے زیادہ بڑی چیز ہے اور آئین نہ صرف ضمیر کی آزادی یا مذہبی اعتقاد کے داخلی پہلو فراہم کرتا ہے بلکہ آزادانہ اپنے مذہب کو ماننے اور اس کی تشہیر کرنے کی ضمانت دے کر وہ اس کے خارجی اظہارات" کی بھی ضمانت دیتا ہے۔ وہ مزید فرماتے ہیں کہ "شادی، وراثت، طلاق، تبدیلیٔ مذہب اپنی فطرت میں خالص مذہبی باتیں ہیں اور دیگر اعتقادات کی طرح کی ہی اہمیت کی حامل ہیں۔" ایسی حالت میں یکساں یا مشترکہ سول کوڈ کا نفاذ عوام کے ذریعے عطا کیا ہوا اختیار نہیں ہو سکتا۔

یہ سوچنا غلط فہمی ہے کہ اس قسم کا کوڈ محض مسلمانوں یا عیسائیوں کے مذہبی اعتقادات کو متاثر کرے گا۔ شادی سے متعلق ایک مشترکہ قانون کی تدوین ہندو شادی کو اس کے مروجہ دستور سے اٹھا کر ایک قانونی بندھن کی شکل دے دے گا اور "کنیا دان" کا تصور کالعدم ہو جائے گا جو ہندو قانون کی بنیاد اور ہندو مذہب کا ایک اہم حصّہ ہے۔ کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ رام کے مقام پیدائش کے سوال پر جذباتی رہنماؤں کی باتوں پر ڈانواڈول رہنے والی ہندو قوم اس بات کو منظور کرے گی۔ ہندو بیواہ قانون سے متعلق سلیکٹ کمیٹی (Select Committee) کی کارروائیاں یہ بتاتی ہیں کہ اس قانون میں صرف انھیں دفعات کو شامل کیا گیا جو کسی نہ کسی مروجہ رسم سے مطابقت رکھتی تھیں۔ یہ قانون درحقیقت وسیع پیمانے پر مروجہ ہندو رسم و رواج پر ایک قانونی سند ہے۔ اس لیے دعوے سے یہ کہنا کہ ہندوؤں نے اپنی کسی اہم مذہبی وراثت کو چھوڑ دیا ہے اور اسی بنیاد پر مسلمانوں سے بھی ایسا کرنے کا مطالبہ کرنا بالکل درست نہیں ہے۔ یہ دلیل کہ کثیر ازدواجی مسلم قانون مرتد ہندو شوہروں کے لیے ایک بے جا ترغیب ہے، موجودہ فیصلے سے مطابقت نہیں رکھتی جس کے تحت یہ کہا گیا ہے کہ اس قسم کی شادی کالعدم قرار دی جائے گی اور I.P.C. کے سیکشن ۴۹۴ کے تحت قابل تعزیر ہوگی۔ ایسی صورت میں جب تعدد ازدواج پر پابندی پہلے ہی موجود ہے تو پھر یکساں کوڈ کی ضرورت ہی کہاں رہ جاتی ہے؟

مزید براں اس قسم کے واقعات کی تعداد اتنی کم اور غیر اہم ہے کہ اس میں کسی اہم آئینی اور قانونی تبدیلی کی گنجائش نہیں

مسلمانوں میں کثیرالازدواجی کی اجازت ہونے کے باوجود کثیرالازدواجی کے واقعات غیر مسلموں میں زیادہ ہیں۔

۱۹۶۱ء میں مردم شماری کمیشن کے ایک سروے کے مطابق غیر مسلموں میں اس کی شرح زیادہ تھی۔ جیسے قبائلیوں میں ۱۵،۲۷ فی صد، بودھوں ۷،۹ فی صد، جینیوں میں ۶،۷۲ فی صد، ہندوؤں میں ۵،۸۰ فی صد اور مسلمانوں میں ۵،۷ فی صد اور ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے درمیان اس شرح میں بتدریج کمی آتی جارہی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں شائع عورتوں کی صورت حال سے متعلق کمیٹی کی ایک رپورٹ کے مطابق ۵۱-۱۹۴۱ء اور ۶۱-۱۹۵۱ء میں ہندوؤں کے درمیان اس شرح میں ۱.۰۹ فی صد اور مسلمانوں کے درمیان ۱.۰۶ فی صد کمی واقع ہوئی جس کا مطلب ہے کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی اکثریت کثیرالازدواجی سے پرہیز کررہی ہے۔

اگر مسلمان یا دوسرے فرقوں کے درمیان معاشرتی اصلاح کے موضوع پر معقول و فہمیانہ مباحثہ ہو تو اس سے اس قسم کی غلط بیانیوں کا پردہ بھی فاش ہوگا اور عوام کو اس قسم کے جذباتی رہنماؤں سے بھی نجات دلائی جاسکے گی۔

یہ اعتراض کرنا ناانصافی ہے کہ تقسیم کے بعد بھی مسلمانوں نے علیحدگی پسندی کے رجحان کو ختم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے علیحدہ انتخابی حقوق، ریزرویشن اور اہمیتِ خاص سب کچھ تیاگ دیا جس سے وہ پہلے سرفراز تھے۔ درحقیقت اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جو لوگ ہندوستان میں رہ گئے تھے وہ دو قومی نظریے کے وفادار تھے۔ ان کی ایک بڑی تعداد ان لوگوں سے آخر تک لڑتی رہی جو دو قومی نظریے کے حامی تھے۔ اگر وہ تقسیم کو ٹالنے میں ناکام رہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے زیادہ تر کو رائے دہندگی کا حق حاصل نہیں تھا۔ آزادی کے فوراً بعد مشترک اور بالغ حق رائے دہندگی کے اصول کو اپنانے کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے علیحدہ سیاسی تشخص کے مطالبے کو ترک کردیا۔

مذہب کی بنیاد پر علیحدہ سیاسی تشخص کو ترک کردینے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ایک مذہبی فرقے کی حیثیت سے علیحدہ سیاسی شناخت ہوجائے۔ یہ بات ایک مشترک قومیت کی راہ میں کثیر الاقوام ہندوستانی معاشرے کی نشوونما کا حصہ نہیں تھی۔ اس سلسلے میں ۱۸۸۸ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے چوتھے اجلاس (الٰہ آباد) میں پاس کیے گئے اس ریزولیوشن کی یاد دلانا برمحل ہوگا جس میں کہا گیا تھا کہ:

> "ایسا کوئی معاملہ سبجیکٹ کمیٹی (Subject Committee) کے ذریعے بحث کے لیے پاس نہیں کیا جائے گا یا کسی بھی کانگریس میں اس کے صدر کے ذریعے اس پر بحث کی اجازت نہیں دی جائے گی جس کے نفاذ سے ہندو یا مسلم نمائندگان مشترکہ طور پر اتفاق رائے سے یا قریب الاتفاق رائے سے اور اگر کسی ایسے موضوع پر بحث کے لیے منظور کیا گیا ہوگا، یہ ظاہر ہوگا کہ تمام ہندو یا تمام مسلم نمائندے مشترکہ طور پر اتفاق رائے سے یا قریب الاتفاق رائے سے اس ریزولیوشن کی مخالفت کرتے ہیں جسے پاس کرنے کے لیے پیش کیا گیا ہو ایسا ریزولیوشن رد کردیا جائے گا۔"

ظاہر ہے کہ یہ تمام اقلیتوں کے لیے ایک اعلان تھا کہ اکثریتی فرقے یعنی ہندوؤں کو محض اپنے مفاد اور جذبات کی تکمیل کی خاطر بے لگام نہیں ہونے دیا جائے گا۔ یہی وہ اجلاس تھا جس میں سامراجی قوتوں کے ذریعے سیاسی علیحدگی پسندی کے رجحان کی پرورش کی خاطر علیحدہ حق رائے دہندگی کے نظریے کے نفاذ کی کوشش کی سب سے پہلے مخالفت کی گئی تھی۔

آزاد ہندوستان نے قومی اتحاد اور مذہبی آزادی کی اس پوری روایت کو اپنالیا۔ قومی استحکام یا اتحاد کے لیے یہ

قطعی ضروری نہیں ہے کہ ملک سے کثیر الجہتی کو ہی مٹا دیا جائے جیسا کہ گولوالکر نے ایک بیان میں کہا تھا کہ ایک معاشرتی و مذ
فرقے کے اتحاد اور استحکام کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ دوسری جانب تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ایک سول کوڈ کا قیام اپنے آپ میں
کے لیے کافی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پورا یورپ ایک قوم ہوتا۔ پاکستان کو کسی تفرقے کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور ہم لوگوں کو وہ ا
دیکھنے کو نہیں ملتے جو عراق۔ ایران یا عراق۔ کویت کے درمیان ہیں۔

جب جواہر لال نہرو نے یہ کہا تھا کہ "ابھی اس کو (یکساں سول کوڈ کو) ہندوستان میں آگے بڑھانے کا صحیح وقت نہیں آیا۔
تو ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس قسم کی کوشش ان کے لیے انتخابی سطح پر کسی ثانوی اثر کی حامل ہوگی جیسا کہ بی۔ جے۔ پی کے بہادر ،
ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں۔ اگر ان کی یہی منطق ہوتی تو انھوں نے ہندو قانون کی تدوین کی بات ہی نہ کی ہوتی جس کے لیے انہ
اپنی پارٹی میں اور باہر بھی سخت تنقید و تنقیص کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا مقصد تو پورے معاشرے کی نفسیاتی اور ذہنی نشوو
اگر عورتوں کو انصاف دلانے کے لیے کسی مشترکہ سول کوڈ کی ضرورت ہے تو یہ کسی ایک فرقے کا کوڈ نہیں ہوگا جسے دو
پر زبردستی لاد دیا جائے، بلکہ یہ تمام قوانین سے لیے گئے بہتر عناصر پر مبنی کوڈ ہوگا جو تمام لوگوں کے لیے قابلِ قبول بھی ہوگا۔ جیسے
ہمارا آئین دنیا کے کئی آئینوں سے ماخوذ ہے جنھیں ہمارے عوامی نمائندوں نے حسب حال اور بہتر سمجھ کر اپنا لیا لیکن اس سے
ایک ماحول سازی کرنا پڑے گی جس میں کوئی بھی فرقہ یہ نہ محسوس کرے کہ اس کا مذہبی تشخص خطرے میں ہے۔ جسٹس سہا
بھی جن کا خیال ہے کہ "... مشترکہ کوڈ کا مطالبہ شبہ سے بالاتر ہے ...." یہ محسوس کرتے ہیں کہ "اسے کوئی معنوی
تبھی دی جا سکتی ہے جب سماج کے ان دانشوروں اور مدبّروں کے ذریعے اس کے لیے کوئی معقول فضا ہموار کی جائے۔
تشخص ذاتی مفادات سے اوپر اٹھ کر عوام کو تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کر سکے۔" یقینی طور پر کوئی عدالتی فرمان، ملک ،
کر دینے کی کوئی دھمکی یا مفروضہ ہستی سے مٹا دینے کا کوئی اعلان اس قسم کی فضا ہموار کرنے کا معقول طریقہ نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر اخلاق احمد*

مسلمان کیا کریں؟

مسلمان کیا کریں؟ یہ مسئلہ اس وقت نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ پوری ہندوستانی قوم کے لیے اہم ہے کیونکہ اس وقت جو قدم مسلمان اٹھائیں گے۔ اس کی چھاپ مستقبل کے ہندوستان پر پڑنی لازمی ہے۔ لیکن یہ سوال کہ مسلمان کیا کریں؟ جب بھی سامنے آتا ہے تو یہ تاثر پیدا ہوتا ہے جیسے مسلمان غور و فکر کی زحمت گوارا نہیں کرتے ایسا نہیں ہے بلکہ مسلمان پہلی جنگ آزادی کے بعد ہی سے خائف اور فکرمند ہو کر سنجیدگی سے مسائل کو حل کرنے کی کوشش میں لگے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہندوستان کی سیاسی کشمکش آڑے آتی رہی جس کی وجہ سے کامیابی اور ناکامی کے دائرے بنتے اور بگڑتے رہے، جذبات کی شدت سے عمل کی حرارت زایل ہوتی رہی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ پورے قومی مسایل کے حل تلاش کرنے کی ذمہ داری مسلمان لیڈروں کے سپرد تھی لیکن یہ لوگ قوم کو صحتمند طور سے بیدار کرنے اور عملی راہوں پر گامزن کرنے کے بجائے خود بیدار اور چوکس نظر آتے ہیں۔ کچھ مذہبی ہستیاں ضرور مخلص نظر آئیں جن کا خیال تھا کہ مسلمان مذہب، عقیدے، معاشرت، تاریخ اور روایت کے لحاظ سے بالکل ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں جن کا باقی رہنا ضروری ہے لیکن دوسرے مسایل مرکز شعاع سے ہٹ گئے۔ مذہب پر زیادہ زور دیا گیا جب کہ اتنے بڑے ہندوستان میں مسلمان معاشی اور عملی زندگی کے میدان میں بکھر چکے تھے جس کا سیدھا اثر یہاں کی سیاست پر پڑنا لازمی تھا مثلاً مسلمان کسان مزدور، دست کار، فاقہ مست، ذات پات، اعلیٰ طبقہ، ہنر کاری، ملازم وغیرہ سب کا سیاسی اور معاشی حل پیچیدہ اور مشکل ہوتا گیا۔[1]

برطانوی عہد کے آخری دور اور آزادی سے پہلے ہر ہندوستانی مسلمان کے سر پر فیصلے کی گھڑی کھڑی تھی کہ مسلمان کیا کریں؟ کانگریس اور مسلم لیگ کے ترازو کے پلڑے فائدے کے منتظر تھے۔ ادھر ڈنڈی مارنے کے خوف اور جذباتیت کے تحت لوگ مسلم لیگ میں شامل ہو جاتے۔ مسلم لیگ سے شاکی مسلمان کانگریس میں نظر آتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمان کانگریس سے خوش نہیں تھے۔ کچھ شکایتیں جائز اور بجا تھیں۔ کچھ محض بدگمانی اور بدظنی کا نتیجہ تھیں۔ اہم مسایل زبان، گائے اور معاشرت کے تھے۔ پورے برطانوی

---

[1] "مسلمان کیا کریں؟" کے عنوان کے تحت مختلف الخیال، عقیدہ، سیاست دانوں اور رہنماؤں کے مضامین "مدینہ" بجنور اکتوبر ۱۹۳۸ء سے اپریل ۱۹۳۹ء تک مسلسل شایع ہوتے رہے۔ ہر پہلو اور ہر نقطۂ نظر سے بڑی مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ مضامین "مسلمان کیا کریں؟" کے عنوان کے تحت ایک کتابی شکل اختیار کر گئے ہیں جو اس مضمون کے محرک ثابت ہوئے۔ جنگ آزادی اول کے بعد اور آزادی کے بعد مسایل شکل بدلتے رہے لیکن حل سے خالی رہے۔

---

* سابق ریڈر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، اے۔ایم۔یو۔ علی گڑھ۔ ——— سرسید نگر، علی گڑھ

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جولائی ۱۹۹۵ء

عہد میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہندوستان کی تاریخ میں ہندو مسلم اتحاد کی سب سے پہلی سرحد نظر آتی ہے۔ سرحد پار کرنے کے بعد پھر منزل کی تلاش میں راہیں مختلف ہوتی گئیں اور مسافر بھٹکنے لگے لیکن جب خلافت تحریک شروع ہوئی تو ہندو مسلم اتحاد کا دوسرا سنگ میل نظر آیا۔ میل ملاپ کا ایسا منظر تھا کہ محبت، عقیدت اور اخلاص کی لذت آشنائی سے سرشار ہو رہے تھے، لیکن خلافت تحریک کے بعد مسلمان بحیثیت ایک جماعت کانگریس سے علیحدہ ہوتے گئے۔ خالی جگہیں ہندو سرمایہ دار، زمین دار اور تاجر لوگوں سے پُر ہوتی گئیں۔ عوام کے اندر کوئی خاص تنظیم نہیں تھی، اس لیے متحدہ قومیت کا کوئی خاص صحت مند تصور نہیں پیدا ہو سکا تھا بلکہ فرقہ واریت زور پکڑ رہی تھی۔ تعصب کے مقابلے میں ردِّ عمل کو روکنا ناممکن ہوگیا۔ یہ اعتراض تھا کہ مسٹر جناح اور ان کے زیادہ تر ساتھی حکومتِ برطانیہ کے خیر خواہ ہیں۔ وجوہات کچھ بھی ہوں لیکن مسلم لیگ مسلمانوں کی ایک علیحدہ تنظیم خطرناک صورت میں نمودار ہوئی جس کی کامیابی کے بعد سارے قومی، سیاسی، تمدنی، لسانی مسایل حل ہونے کے بجائے بکھرتے چلے گئے۔ ایسی حالت میں فرقہ وارانہ جماعتوں کو اُبھرنے کا موقع ملا، جوجوش، تنگ نظری، تعصب، کوتاہ نظری کو تو آسانی سے جنم دے سکتی ہیں اور ترقی پسندی کی راہوں میں روڑے اٹکا سکتی ہیں لیکن قوم کو متحد اور مضبوط نہیں بنا سکتی ہیں۔ کیوں کہ قومی یک جہتی سے ان کے ذاتی اغراض کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ بھولے بھالے عوام کو سمجھاتے ہیں کہ مذہب خطرے میں ہے۔ سیاسی معاشی اور ذاتی اغراض کے تحت یہ خود مذہب کے بڑے دشمن بن جاتے ہیں۔ ایک طرف مسلمانوں کے اندر مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار وغیرہ جماعتیں قایم ہوئیں تو دوسری جانب ہندوؤں کے اندر مہاسبھا، آر۔ایس۔ایس، رام راجیہ پریشد اور جن سنگھ وغیرہ جماعتیں وجود میں آئیں، جس طرح جھگڑے اور مارپیٹ کی شروعات سخت الفاظ اور گالی گلوچ سے ہوتی ہے۔ اسی طرح تقسیم سے پہلے اور بعد میں ناعاقبت اندیش، مذہبی دیوانے، جاہل، گندے، مفلوک الحال، ناتربیت یافتہ، وطن دشمن، فرقہ پرست، رجعت پسند جیسے الفاظ سے مسلم عوام کو نوازا گیا۔ وقتی طور سے مسلم لیگ کی کامیابی ہوئی یا اس کی ہٹ پوری ہوئی لیکن مسلمانوں کے مسایل حل نہیں ہو سکے — مولانا آزاد اس بات پر راضی تھے کہ چاہے دس سال بعد آزادی ملے لیکن ملک تقسیم نہ ہو مگر دوسرے اکابر کے ہاتھ آزادی کے جام تک پہنچ چکے تو مولانا آزاد تنہا کیا کر سکتے تھے۔

ہندو مسلم تحریکات کی شروعات اپنے کو مغرب سے بچانے کے لیے تھیں لیکن دھیرے دھیرے آپس میں مخالفت شروع ہو گئی ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ناکام ہوئیں، کیوں کہ دونوں کی تہذیبوں میں اختلاف تھا۔ اگر دونوں میں سے کوئی بھی تہذیب کھوکھلی اور ناپائیدار ہوتی تو مسئلہ اتنا سنگین نہ ہوتا جیسا کہ مسلمانوں سے پہلے قومیں یہاں آتی رہیں اور ضم ہوتی رہیں۔ آج امریکہ میں اس قسم کا کوئی جھگڑا نہیں ہے کیوں کہ تہذیب کے بارے میں وہ نو وارد ہیں۔ ہندوستان کی جمہوریت اور سیکولرازم اور یورپ کی جمہوریت اور سیکولرازم میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ یورپ کے کلچر میں بنیادی اتحاد موجود ہے۔ ایک ہی رنگ کے لوگ پائے جاتے ہیں، بائبل کو مقدس کتاب مانا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے کا ہر ایک قایل ہے۔ لٹریچر اور ادب میں ایک رنگ پایا جاتا ہے۔ نسل، آب و ہوا اور جغرافیائی بناوٹ کے لحاظ سے وہ ایک خود مختار قوم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے شاعری، کہانی، ضرب المثل، دوہے، بانے اور گیت وغیرہ کے اندر یہاں کی چیزوں کو سمو لیا لیکن رامائن اور مہابھارت کو سکندر نامہ اور شاہ نامہ کا مقام نہ دے سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کے لحاظ سے ہر چیز کی پیمایش ہندو مسلم اور راجاؤں اور بادشاہوں کے پیمانوں سے ہوتی تھی۔

مسلمان انگریز دشمنی میں پکے اور جنگ آزادی میں سچے تھے لیکن اس سلسلے میں ان کو کبھی مطمئن نہیں کیا جا سکا کہ آزادی کے بعد نئے جمہوری نظام کے اندر ان کی صحیح پوزیشن کیا ہو گی۔ وہ اقلیت ہیں یا قوم ہیں۔ اپنی زبان، کلچر، رسم و رواج اور مذہب کے بارے

میں ہمیشہ مذبذب رہے۔ نہ ٹھیک طریقے سے ان کو سمجھایا جاسکا نہ وہ خود سمجھ سکے۔ گھبراہٹ اور بدحواسی میں یہ نہ طے ہو سکا کہ کس کا دامن پکڑیں اور کس کا چھوڑ دیں۔ وجہ یہ تھی کہ مسلم رہنماؤں کا تعلق عوام سے نہیں تھا بلکہ عوام کا تعلق مسلم رہنماؤں سے تھا جو مسلم عوام کی مجبوریوں اور پریشانیوں کو نہیں سمجھ سکے۔ آنے والے نئے جمہوری نظام میں جب وہ اپنے کو انگلیوں پر شمار کرتے تھے، تو اُن کو چُپ لگ جایا کرتی تھی۔ عام طور پر مسلم رہنما نئے طرز حکومت کی مدافعت اور مخالفت میں اونچے پلیٹ فارموں سے اظہارِ خیال کرتے رہے جو عوام کے سر سے گزرتی رہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے جذبات سے کھیل کر کام نکالا گیا اور ملک کی تقسیم ہوگئی۔ غلطیاں دونوں جانب سے ہوئیں یا اُن کو غلطی کرنے پر مجبور کیا گیا۔ کیوں کہ انگریز نہیں چاہتا تھا کہ ملک تقسیم کیے بغیر آزادی دے دی جائے۔ جیسا کہ اس کے دوسرے نوآبادیاتی علاقوں میں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً مصر اور سوڈان الگ ہوئے۔ سنگاپور اور ملیشیا کی تقسیم ہوئی۔ تقسیم ملک کے بعد مسلمان پاکستان چلے گئے مگر زیادہ تر یہیں پر رہ گئے۔ ویسے تو پورے ملک کے حالات خراب تھے لیکن پاکستان جانے والے خواب وخیال کی دنیا میں جانا چاہتے تھے اور گئے، جہاں ان کی خواہشات اور تمناؤں کے شیشے چور چور ہو گئے جو آج تک ان کے وجود کو زخمی بنا رہے ہیں۔ اگر موقع ملے تو آج بھی زیادہ سے زیادہ مہاجر اپنے ملک واپس چلے آئیں۔

عرب تاجر، سلطان اور بادشاہ ہندوستان سے دوچار ہوئے۔ عرب تاجر اسلامی فکر اور تہذیب کے حامل تھے۔ جب کہ سلطان اور بادشاہ اپنی حکومت اور قوم کے پاسبان رہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد ایک انقلاب کی پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اگرچہ یہ انقلاب داخلی نہیں تھا بلکہ خارجی تھا لیکن داخلی حالات نے اس انقلاب کو گوارا کیا۔ نوواردوں نے وحدت کے نئے تصور سے یہاں کے لوگوں کو آشنا کیا۔ یہاں کے لوگوں کو خودی اور خودداری کا احساس دلایا۔ مذہب، تعلیم اور سماج کے پہرے داروں کو ہٹنے پر مجبور کیا۔ سماجی روابط اور ارتقائی رشتے بڑے خوش گوار ماحول میں قائم ہوتے رہے۔ اس چمن زار کی شاخوں سے گل بوٹے پھوٹتے رہے، ٹوٹتے رہے۔ حالات بنتے اور بگڑتے رہے لیکن پھر بھی نقشِ حیات ابھرتے رہے۔ ازل سے ابد تک کی کہانی تاریخ کی زبانی سنی جاسکتی ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے کہ: "مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے"۔[1] خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہاں کے دریاؤں، موتیوں، پہاڑوں کے جواہرات اور جنگلوں کی خوشبو کی کہانی عرب سیاح سے دھیان دے کر نہیں سنی۔ سندھ میں عربوں نے صرف اموی حکومت کی نمائندگی نہیں کی بلکہ اسلامی رواداری اور وسیع النظری کو پیش کیا۔ الور کے راجا کی خواہش کے مطابق قرآن کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ یہاں ہندو اور عرب کے گھرانے ساتھ ساتھ آباد ہونا شروع ہوئے۔ عرب بڑی خوشی کے ساتھ اپنے کو سندھی لکھتے تھے۔[2]

عباسی عہد کی نشانیوں میں جہاں امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ نظر آتے ہیں وہیں پر بیت الحکمۃ قائم ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ وہاں پر مختلف علوم کی کتابوں کے ترجمہ کے لیے بلا امتیاز مختلف قوم سے تعلق رکھنے والے زبانوں کے عالموں کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ ان کو صرف اجرت نہیں دی جاتی تھی بلکہ انعام و اکرام سے نوازا بھی جاتا تھا۔ سدھانت کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔ ہندی اصطلاحیں عربی میں داخل ہوئیں۔ اس کے علاوہ پنچ تنتر کی کہانیاں کلیلہ و دمنہ، ہیئت، علم ہندسہ، طب وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ یہ چیزیں

---

[1] سید سلیمان ندوی۔ عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکادمی، ۱۹۳۰ء، ص ۳۔

[2] سید سلیمان ندوی۔ عرب و ہند کے تعلقات ص ۶۴ اور خلیق احمد نظامی۔ اسلامی فکر اور تہذیب کا اثر ہندوستان پر۔ لکھنؤ، ۱۹۸۲ء

صرف عربوں کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے چراغ بنیں۔ عرب مسلمان وید دان ہوئے۔ یہ چیزیں عالم بنے۔ البیرونی کو یہاں کے پنڈتوں نے منہ نہیں لگایا۔ شاید محمود غزنوی کی کسافت کا ردِ عمل تھا لیکن پھر بھی وہ مہا وید وان بن کر سنسکرت زبان، یہاں کے مذہبی علوم، جغرافیائی حالات، تاریخی پس منظر سمجھنے میں کامیاب ہوا۔ اسی طرح گجرات اور سندھ کے راجاؤں اور مقامی مسلمانوں کی جان کاری مسعودی کے ذریعے ہوتی ہے۔

آزادی سے پہلے ہندوستان سارے جہاں سے اچھا تھا۔ آزادی کے بعد چاند پر انسانی پرچم لہرانے کے بعد بھی ہندوستان اچھوں سے اچھا دنیا کی ایک بڑی جمہوریت ہے۔ اس کی آغوش میں مسلمانوں جیسی سب سے بڑی اقلیت پائی جاتی ہے۔ یہاں کی فضاؤں میں وہ برابر کا حصہ دار ہے۔ یہاں کی پیداوار میں شریک ہے۔ یہاں کے پہاڑ اور ندیاں اس کو اپناتی ہیں، یہاں کی ہوائیں اس سے اٹکھیلیاں کرتی ہیں۔ یہاں کے گیت اس کے کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ یہاں کے پھلوں کی لذت سے اس کی زبان آشنا ہے۔ یہاں کے موسموں کی آمد پر وہ خوشی کے گیت گاتا ہے۔ یہاں کے حسن سے اس کے دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں کے پھولوں کی خوشبو سے اس کی روح معطر ہوتی ہے۔ چڑیوں کے چہچہانے کی آواز سن کر وہ اپنے دکھ درد بھول جاتا ہے، سکھ کی گھڑی میں وہ مگن رہتا ہے۔ دکھ کی گھڑی میں کسی سے شکایت نہیں کرتا ہے نہ کسی کو دوش دیتا ہے بلکہ ان کو جھیلتے ہوئے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے خدا کے سامنے دعاؤں کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے اور مرنے کے بعد اسی مٹی میں دفن کر دیا جاتا ہے۔

کمیونزم کے اثر یا فیشن کے لحاظ سے مذہب کو ترقی کی راہ میں روڑا ثابت کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ پورے ایشیا میں جاپان سے زیادہ کون ملک اور قوم ترقی یافتہ ہے جہاں مذہب کی برتری سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مذہب، سائنس یا کوئی ازم کے منفی پہلو کے بجائے مثبت حقائق پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ ہر چیز بنی نوع انسان کی بہبودی کے لیے ہوتی ہے۔ تخریبی رجحانات ان کے اندر شامل کرنا بھی انسانی فعل ہے۔ ہندوستان کے اندر بہت سارے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ ہر مذہب صلح و امن و امان کا پیغام دیتا ہے۔ کوئی بھی مذہب پرست اپنے مذہب کی اچھائیوں پر عمل کرتے ہوئے دعوت عمل پیش کر سکتا ہے، لیکن کسی دوسرے مذہب کو برا کہنا اخلاقی جرم ہے۔ یہی جرم پھر سماجی اور سیاسی جرم بن جاتا ہے جو ایک خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس سے بچنا سب سے بڑی مدافعت ہے۔

آج پوری قوم لیڈر کی تلاش میں بھٹک رہی ہے۔ ایک وقت تھا کہ لیڈر قوموں کو جنم دیتے تھے لیکن آج کے دور میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ قومیں اور حالات لیڈر کو جنم دیتے ہیں۔ عروجِ اسلام، یورپ کا صنعتی انقلاب، انقلاب فرانس بغیر لیڈر کے ترقی پذیر ہو کر لیڈروں کو جنم دیا۔ کیا جاپان اور اسرائیل کی ترقی کسی لیڈر کی مرہونِ منت ہے۔ اگر قوموں کے اندر بیقراری پیدا ہوتی ہے تو نظام کہیں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ پھر غور و فکر کی بجلیاں بھر جاتی ہیں۔ تحقیق کا کرشمہ سامنے آجاتا ہے۔ قدم قدم پر ناکامیوں کے لشکر کو شکست ہوتی ہے اور کامیابی قدم چومتی ہے۔ تلخیٔ زمانہ کو پی کر زندگی کی سحر پیدا کی جاتی ہے۔

ہندوستان کے اندر جمہوری اور غیر مذہبی حکومت ہے جس کے اندر شہری حقوق، سیاسی حقوق، تہذیبی اور انفرادی آزادی، قانونی، معاشی، سماجی انصاف وغیرہ کی گارنٹی دی گئی ہے۔ ہر ایک برابر کا شہری ہے۔ اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جمہوریت میں اکثریتی فرقے کے خیالات غالب رہتے ہیں۔ سیکولرازم کے ماننے والے انسانیت اور ایک دوسرے سے مل کر رہنے کو پسند کرتے اور مانتے ہیں۔ مذہبی لوگ اپنے مذہب کو مانتے ہوئے سیکولرازم کے اندر رہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ کون سا مذہب انسانیت سے انکار کرتا ہے یا مل جل کر رہنے سے روگردانی کرتا ہے۔ ہندوستان کا آئین اس طرح کا بنا ہوا ہے کہ سیکولرازم کی چھتری کے اندر ہندوستان

کے سارے مذہب اور مذہبی فرقے رہتے ہیں اور آئین کو مانتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ اسلامی حکومت کے اندر ہیں یا غیر اسلامی حکومت میں ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی حکومت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر خلفائے راشدین تک نظر آتی ہیں۔ اس کے بعد مسلم حکمراں، ان کے اصول اور ان کی حکومت پائی گئی۔ مسلم حکمراں اور مسلم عوام پہلے حق و انصاف کے قریب تر پائے گئے۔ دھیرے دھیرے معاملہ بندی کے اندر فرق آتا گیا۔ مسلمان حکومت کے اندر عوام کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی عوامی زندگی اور خاندانی اور مذہبی کے درمیان خلیج بن گئی۔ اچھے خاندان والی زندگی میں شریعت پر عمل ممکن تھا لیکن عوامی زندگی میں حکومت کی پالیسی کو مدّنظر رکھنا پڑتا تھا۔

اِسلامی اصولوں کے ذریعے آخرت کی نجات کے علاوہ دنیاوی زندگی کو کامیاب بنانے کا بھی عقیدہ ہے جس کے لیے حالات کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ملک کے اندر ذات پات، زبان اور مذہب کے نام پر جھگڑے ہوتے رہتے ہیں جن کے پیچھے معاشی اتار چڑھاؤ کا راز بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں ہمت، کوشش، جدوجہد اور قربانی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ صبر و تحمل سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوؤں کی زیادہ تعداد ان جھگڑوں سے دور رہنا چاہتی ہے۔ وہ کھل کر جھگڑے فساد کی مذمت بھی کرتے ہیں۔ وہ مذہب کو مانتے ہوئے مذہب کے نام پر جھگڑنے کو نہیں مانتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دوسرے مذہبی فرقوں کا وجود ہی رہنا مشکل ہوجاتا۔ دھرم اور مذھب میں فرق ہے۔ ہندو دھرم کے اندر ہندو کلچر پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جس کے ہم کافی حصّے دار ہیں اور روزمرہ کی سماجی زندگی میں کوئی خاص ٹکراؤ نظر نہیں آتا۔ شادی بیاہ، خوشی، غم، دوستی، دشمنی، میلے ٹھیلے وغیرہ میں مشترک قدریں نظر آتی ہیں۔

ایسی بھی مثالیں سامنے آتی ہیں کہ ہم مذہب لوگوں سے زیادہ غیر مذہب کے لوگ ہمدرد، مددگار، وفادار، ایمان دار اور ثابت قدم پائے جاتے ہیں۔ غیر مذہب کے آدمی کے عقیدے سے تو آپ کا اتفاق نہیں ہوسکتا ہے لیکن کوئی ضروری نہیں کہ وہ غلط آدمی ہو دنیاوی زندگی میں وہ ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہجرت کا وقت بڑا نازک اور خطرناک تھا۔ ایسے وقت میں آپ نے عبداللہ بن عرقد پر بھروسہ کیا جو مسلمان نہیں تھے۔ غارِ ثور سے جب یثرب کا سفر شروع ہوا تو آپ کی اونٹنی کی مہار انھیں کے ہاتھ میں تھی جو یثرب کے بجائے قبیلۂ قریش کے سرداروں میں بھی پہنچ سکتے تھے جہاں انعام و اکرام کی بولیاں لگ رہی تھیں۔ سیرت پاک کے ذریعے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ زندگی کا پہلا چالیس سالہ دور خدمتِ خلق سے بھرا پڑا ہے۔ بلا تفریق انسانیت کی خدمت کی گئی۔ اس کے بعد پوری زندگی انسانی بہبودی کے ساتھ ساتھ تبلیغ اِسلام میں صرف ہوئی۔ اپنے کردار کے ذریعے مسلمانوں نے حکومت الٰہیہ قایم کی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ پہلے حکومت الٰہیہ قایم ہوجائے پھر کردار پیش کیا جائے۔ حکومت سے مجبوری اور ہندوؤں سے دوری کا احساس ختم ہونا چاہیے۔ شروع شروع میں جب مسلمان یہاں آئے اس وقت طاقت اور حکومت کا کوئی تصوّر نہیں تھا۔ اسی سماج کے اندر عروج و پستی سے گزرتے ہوئے زمین زیست ہموار کرتے گئے۔ تقسیم ملک کی وجوہات بے شمار ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ اکثریت پر بھروسہ نہ کرنا تھا لیکن آج کرنا ہوگا۔ جب ایک ساتھ رہنا، اٹھنا بیٹھنا، دشمنی دوستی، مرنا جینا ہے تو تعصب، زیادتی اور بدگمانی کی وجہ سے قومی دھارے سے الگ رہنا ممکن نہیں ہے۔ دھارے کے اندر صرف پانی کی روانی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے اندر بے شمار چمک دار قطرے، جنبش لہریں، قیمتی موتی، برقی لہریں وغیرہ شامل ہوتی ہیں جو اپنے وجود کو نہیں کھوتی ہیں بلکہ سب مل کر ایک دھارے کو وجود میں لاتی ہیں۔ مسلمانوں کو معلوم ہے کہ وہ ملک کے اندر ترقی کی راہوں میں پیچھے ہیں لیکن ان کو رُسوا اور ذلیل کرنے کے بجائے ان کی صلاحیتوں کو اُبھار کر ان سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ نفاق

کے نیزوں سے ایک دوسرے کے دلوں کو چھلنی نہیں کرنا چاہیے۔ کون سا ایسا میدان ہے جہاں مسلمان نظر نہیں آتے ہیں۔ یہ اور با
کر تناسب کے لحاظ سے کم ہیں۔ مکان کی تعمیر، مختلف قسم کے سامان استعمال ہوتے ہیں۔ اگر کسی معمولی سامان کی کمی رہ جائے تو ب
عمارت کو کسی وقت بھی خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کو ملک کی تعمیر میں حصّہ لینا چاہیے اور ان کو موقع دیا جانا چاہیے۔ کچھ
کا خیال ہے کہ مسلمان اپنی شناخت اور اصلیت کو چھوڑ کر قومی دھارے میں شامل ہو جائیں۔ ایسے لوگوں کو مسلمانوں سے زیاد
فکر ہوتی ہے۔ ایک چیز جب اپنا وجود کھو دے گی تو اس کا استعمال کیسے ممکن ہوگا۔ لون لگی اینٹ اور گھنی ہوئی لکڑی تعمیری کام
کون استعمال کرے گا۔ مسلمانوں کے الجھے ہوئے مسایل اگر تقسیم سے نہیں حل ہوئے تو صلح کے ساتھ بھی تجربہ کیا جا سکتا ہے۔
نے برطانوی حکومت اور عیسائیوں سے دشمنی کے بجائے صلح کے ساتھ فائدہ اُٹھایا۔ گاندھی جی نے بھی صلح یعنی عدم تشدد
ملک کو آزاد کرایا۔ انگریز اہل کتاب ضرور تھے لیکن غیر ملکی تھے۔ یہاں کے اکثریتی طبقے کے لوگ ہم وطن اور مستقل ساتھی ہیں۔
اور وطن والوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے تو ان کے صبر کا پیماد
ہو جاتا ہے۔ ایسے میں وہ جذبات کو کہاں دفن کریں لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ان کی طرف سے بھی زیادتیاں ہوتی ہیں۔
کو انتقام کے بجائے صبر سے کام لینا چاہیے یہاں تک کہ ان کی اچھائیاں برائیوں پر غالب آجائیں۔ یہ کام اسی وقت ممکن
جب وہ اپنے فرائض منصبی کو پورا کریں۔ نجی اور انفرادی ضرورتوں سے بڑھ کر اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں
عیش کوشی سے نفرت اور جفا کشی سے الفت ہو جائے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اگر مسلمان دولت کی دوڑ لگائیں تو شاید
کے مسایل حل ہو جائیں۔ معاشی حالت کی درستگی ہر حال میں اور ہر کام کے لیے ضروری ہے۔ مثبت کام کے لیے دولت
نہیں ہے لیکن صرف دولت سے کام نہیں چلتا ہے۔ دنیا کے امیر ترین نظام کی دولت اس کے مرنے کے بعد ستائیس
میں ختم ہو گئی۔ قیمتی ہیرے جواہرات نیلام ہونے شروع ہو گئے۔ ورثا کا سامان بازاروں میں بکنے لگا۔ عربوں سے ز
دولت مند کون ہے لیکن ان کی پس ماندگی بھی اپنی مثال آپ ہے۔ زیادہ اور بغیر منصوبے کی دولت امیروں کو نفس پرستی
جال میں پھنسا کر مفلس اور کنگال بنا دیتی ہے پھر دماغ کے دریچوں کو بند کر دیتی ہے۔

مسلمانوں کو کچھ پرانی روایتی قدروں کو چھوڑنا ہوگا اور کچھ نئی قدروں سے ناتا جوڑنا ہوگا۔ مسلمان صرف ہندوستان میں نہیں
بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک اور مقامات پر آباد ہیں لیکن ہر جگہ کی معاشرتی زندگی میں فرق پایا جاتا ہے۔ اگر جگہ کی معاشرتی ز
کو دوسری جگہ کی معاشرتی زندگی پر منطبق نہیں کیا جا سکتا ہے تو کیا ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی زندگی منفرد نظر نہیں آسکتی
اگر مسلمانوں پر ملک سے بے وفائی کا الزام عاید کیا جائے تو مدافعت کرنے یا جوش میں آنے کے بجائے اپنا محاسبہ خود کرنا چاہیے
حقیقت کیا ہے۔ نتیجے کے طور پر تو پچھتر فیصد سے زیادہ ایسے لوگ ملک کے غدار ثابت ہوئے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں سے نو
ہے۔ یہ ایک خاموش اور بہترین جواب ہے اور مسلمانوں کے لیے باعث تسکین بھی ہے۔ غلطی کا امکان ختم نہیں ہو جاتا ہے
محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی سوچنا ہوگا کہ اُن کو اکثریت کے وہ بلند مقامات نہیں حاصل ہوں گے جو اُن کے اپنے قومی، مل
اور مذہبی نظریات کی وجہ سے حاصل ہیں۔ یہ بڑی جیت ہوگی اگر دشمنی اور نفرت کا جذبہ ختم ہوتے ہوئے دوستی قایم ہو
ایسی حالات میں مسلمان بہترین شہری اور کامیاب افراد ثابت ہوں گے کیوں کہ ان کی کامیابی کی راہیں رکی ہوئی ہیں، ختم نہ
ہوئی ہیں۔ جمہوری نظام میں ووٹ کی بڑی قدر ہے۔ اس سلسلے میں غفلت اور سستی کے بجائے ہوش مندی اور اتحاد
کام لینا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ تعمیر کے بعد بانس بلّی کی طرح نکال پھینکے جائیں۔ جو سیاسی جماعتیں مسلمانوں سے اتفاق نہیں رکھتی

آج وہ دوستی کا ہاتھ بڑھا رہی ہیں، دوسری طرف ان کے تعلقات اور معاملہ بندی تخریب پسند جماعتوں سے بھی ہیں گویا شمع دونوں طرف سے جلائی جا رہی ہے۔ ایسی بھی جماعتیں ہیں جو مسلمانوں کے تعاون پر بھروسہ کرتے ہوئے کامیابی کا خواب دیکھتے ہیں۔ ایسے میں اپنی اندرونی کمزوریوں پر قابو پاتے ہوئے اپنے پیر اور دوسروں پر بھروسہ کرنا ہوگا، دھوکا بھی اٹھانا پڑے گا۔ کوئی حرج کی بات نہیں ہے مسلمانوں کا منافقین اور مخالفین سے سابقہ ازل سے پڑتا چلا آ رہا ہے اور ہر عروج و زوال میں یہ سلسلہ جاری رہا۔ کسی کے ڈر سے ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔ سفر شروع ہونا چاہیے۔ ہر سفر پہلے قدم سے شروع ہوتا ہے۔ سفر کی دشواریاں سفر کو روک نہیں سکتی ہیں۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ سینٹرل ایشیا اور مشرق وسطیٰ سے ہندوستان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ جہاں اس ملک کے مذہبی ثقافتی اور تجارتی اثرات قایم تھے۔ بخارا کافی پرانا شہر ہے۔ تین سو سال قبل مسیح میں اس شہر کو تجارتی اور ثقافتی مرکزیت حاصل تھی۔ پورے سینٹرل ایشیا کے اندر بودھ مذہب کے مبلغ بھکشو پھیلے ہوئے تھے جہاں اُن کی تبلیغ کا سلسلہ جاری تھا اور عبادت گاہیں بنی ہوئی تھی۔ اس عظیم شہر کا نام بودھوں کے ذریعے پڑا تھا۔ کیوں کہ یہاں پر بودھ مذہب کی ایک بڑی عبادت گاہ تھی جس کو " ویہار" کہا جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد " بے خارہ" کہا جانے لگا پھر بخارا ہوگیا۔ بنی امیہ کے دور میں اور ولیداول کے زمانے میں قتیبہ ابن مسلم نے اس علاقے کو فتح کیا۔ شاہ راہ ریشم اسی علاقے سے گزرتی تھی۔ اس کی اقتصادی حالت بہتر تھی۔ اس لیے یہاں پر مسلمانوں کی ثقافت، مذہب، سیاست، ادب اور سائنس کو ترقی کرنے کا موقع ملا اور مشہور ہستیاں ابھر کر سامنے آئیں۔ مثلاً بہاء الدین نقش بندی، امام بخاری، ترمذی، محمد موسیٰ خوارزمی، رازی، ابن سینا، فارابی، البیرونی، تیمور، بابر وغیرہ۔ سرد جنگ کے بعد روس تباہ ہوگیا، اس کے کس بل ڈھیلے ہوگئے۔ سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا اور مسلمانوں کی نو آزاد جمہوریائیں، اس طرح نکل کر سامنے آگئی ہیں جیسے برف پگھلنے کے بعد سبزے اور پھول نمودار ہوجاتے ہیں۔ یہ نئی ریاستیں نئے نئے مسایل سے دوچار ہورہی ہیں۔ مارکیٹ، اکنامی بازار، آزاد معیشت، تجارت، درآمد برآمد، بیرونی ممالک سے تعلقات جیسے مسایل ان کے زیر بحث ہیں اور امداد کے خواستگار ہیں۔ مسلمانوں کے ذریعے ان سے تعلقات کو جائز کہا جاسکتا ہے اور رشتے جوڑے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ ہماری حکومت اس طرف سے غافل نہیں ہے۔ ترکی، ایران اور پاکستان وغیرہ اپنا مذہبی، لسانی اور تہذیبی رشتہ جوڑتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہندوستانی مسلمان بھی اس علاقے کے رشتہ دار ہیں اور اپنے ملک سے رشتہ جوڑنے میں وفادار ہیں۔

عہدِ وسطیٰ کی تہمتیں آج کے دور میں مسلمانوں کے کاندھوں پر ڈالی جارہی ہیں اور مثبت پہلو سے روگردانی کی جاتی ہے عہدِ وسطیٰ کی اچھی یادوں کو بھی بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔ ملک کی حفاظت کے تحت نئے قلعوں کی تعمیر اور پرانے قلعوں کی مرمت شروع ہوئی۔ ہرے بھرے باغات لگائے گئے، تالاب اور نہریں پانی سے لبریز ہوئیں۔ دوآبہ کی زمین پر کھیتی کرنے کے نئے نئے تجربات ہوئے۔ بادشاہ نے شہزادے کو وصیت کی کہ بغیر تفریق اور تعصب کے رعیت کے ساتھ انصاف کرنا۔ مہابلی کے نعرے اور سیکولازم کی راگنی سنائی دی۔ بے خودی میں حکومت کو محبت کے پردے میں چھپا یا گیا لیکن اس وقت انصاف کے گھنٹے کی آواز آج بھی سنائی دے رہی ہے۔ عہد زریں جب امن و سکون کی وادی میں پہنچ گیا تو صدیوں پرانی سنگ مرمر کی سوئی ہوئی آبادی کو جگایا گیا۔ اس پتھر کی قیمت سیم و زر سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ محبت کی داستان سنگ مرمر میں اس طرح پنہاں ہوگئی کہ آج بھی عقل محو تماشا ہے۔ آج کے دور میں حالات کے تحت کہیں کہیں آبادی کے پاکٹ نظر آتے ہیں لیکن اس دور میں مسلمانوں نے کوئی ایسا گاؤں، قصبہ یا شہر نہیں آباد کیا جہاں صرف مسلمان آباد ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ شخصی حکومت کا اپنا ایک مزاج ہوتا تھا۔ اسی کے مطابق حکومت کی پالیسی بنتی اور بگڑتی تھی۔ پھر بھی طاقت کے نشے میں کچھ غلطیاں بھی ہوئیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ شخصی حکومت کے فریم کے

اندر راجاؤں اور بادشاہوں کی تصویریں کم و بیش ایک سی نظر آتی ہیں۔ عوام کسی بھی ظلم و زیادتی سے بری الذمہ تھے۔ دلّی کے تخت پر راجا یا بادشاہ بیٹھتے اور اُترتے تھے۔ حکومتیں بدلتی رہتی تھیں لیکن عوام کے کاروبار اور روزمرہ کی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا تو پھر آج مسلم عوام کو کیسے مجرم قرار دیا جا سکتا ہے۔

ملک کے اندر جھگڑے فساد ہوتے رہتے ہیں اور کم و بیش ہوتے رہیں گے۔ ان کے نتائج سے بھی دوچار ہونا پڑے گا۔ زندگی بر دوش ہوتے ہوئے غفلت نہیں برتی جا سکتی ہے کیونکہ مستقبل کی صبح سامنے ہے۔ انسانوں کے علاوہ جانوروں، پرندوں، درختوں، پھولوں اور پودوں کے درمیان حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ہرن کا شکار ہوتا ہے تو کیا وہ مرغزاروں میں نظر نہیں آتے ہیں۔ اگر چیونٹیاں پیروں سے کچل جاتی ہیں تو کیا بلوں سے نکلنا چھوڑ دیتی ہیں۔ اگر پرندوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے تو کیا وہ ہری بھری شاخوں پر چہکنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر درختوں کو کاٹ کر ایندھن بنا دیا جاتا ہے تو کیا دوسرے درخت نمودار نہیں ہوتے ہیں۔ اگر پھولوں کو توڑ کر زیب گلو کر لیا جاتا ہے تو کیا غنچے چٹکنا چھوڑ دیتے ہیں۔

مسلمانوں کی پس ماندگی کی خاص وجہ ان کے اندر تعلیم کی کمی ہے لیکن اب ان کے درمیان دھیرے دھیرے تعلیمی بیداری شروع ہو رہی ہے۔ مذہبی اور نئی تعلیم کے درمیان خلیج کم ہونا شروع ہو گئی ہے۔ مدرسے اور علماء اس کام میں زیادہ مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ پہلے مسلمانوں کا پڑھا لکھا اور دانش ور طبقہ عوام سے کافی الگ تھلگ رہتا تھا۔ اب مسلمانوں کی تعلیم کی فکر سب کو دامن گیر ہے۔ عام طور سے بنیادی تعلیم کا معیار بڑھ رہا ہے۔ شمالی ہند اور جنوبی ہند کا فرق نمایاں ہے۔ اقلیتی کردار کے ادارے کھولنے کی اجازت کے بعد جنوبی ہند میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ شمالی ہند میں بھی یہ سلسلہ جاری ہو رہا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاست سے بھی بالکل جدا نہیں رہا جا سکتا ہے۔ پہلے سیاست کا تعلق حکومت اور سیاست سے ہوتا تھا لیکن آج کے نئے جمہوری نظام میں اس کا گہرا تعلق سماج سے ہو گیا ہے اور انسان سماج سے الگ نہیں رہ سکتا ہے۔ اگر معاشیات کو نظر انداز کیا گیا تو تباہی گلے لگ جائے گی۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو اپنی آمدنی اور خرچ پر نظر رکھنا ہوگا۔ رسم و رواج، عیش پرستی، مقدمہ بازی وغیرہ ختم کرنا ہوگا ورنہ آمدنی بارش کے پانی کی طرح ان ندیوں کے ذریعے بہتی رہے گی۔ حکومت کی نئی رعایتوں کا علم ہونا چاہیے۔ یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کی ان اسکیموں سے باخبر رہنا چاہیے جن کا اسلامی اصولوں سے ٹکراو نہیں ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسلامی بینک کیا ہے اور اس سے کیا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ علماء سر جوڑ کر اجتہادی قدم اُٹھائیں۔ آج مسلمان بکھرے ہوئے ہیں لیکن کل کو اتحاد ہو سکتا ہے۔ پھر کامیابی کی دوسری راہیں نمودار ہوں گی۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ خاص طور سے ہندو مسلم فساد کیوں ہوتا ہے۔ آخر دوسری اقلیتیں بھی تو ہندوستان میں رہتی ہیں۔ سب سے پہلے تو ہندوستان کی پوری جمہوریت کو یہ جواب دینا ہوگا کہ مسلمان جذباتی کیوں ہے اور کیوں نہیں مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بڑی اقلیت کے بڑے مسائل ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ کا حل اکثریت کے ہاتھ میں ہے۔ جیسے جیسے عنایت کی نظر ہوتی جائے گی یہ مسئلہ خود بخود حل ہوتا جائے گا۔ مسلمانوں کو بھی انا سے کام نہیں لینا چاہیے کیوں کہ اس کی سرحد فنا سے ملتی ہے۔ اگر یہ صبر و ضبط، محنت و خاموشی کے ساتھ مفید کاموں میں لگ جائیں تو اس الزام سے بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔ اقلیت کا احساس کمتری ختم ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اقلیت صرف نمبر سے نہیں ہوتی ہے بلکہ طاقت کے کم ہو جانے سے بھی ہو جاتی ہے۔ آپس میں اتفاق ہو، تعلیم کی کمی نہ ہو، اقتصادی حالت درست ہو، حکومت کی کلیدی جگہیں ناممکن نہ ہوں تو کافی حد تک صرف کمی پوری نہیں ہوگی بلکہ فروغ حاصل ہوگا۔ اسرائیل کی عربوں کے درمیان حکومت اور امریکہ کے اندر اقتدار کی وجہ یہی کھلے ہوئے راز ہیں۔

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

محمد مونس انصاری اعظمی*

مولانا آزاد کا تصوّرِ قومیت

آزادیٔ ہند کی تاریخ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی بے بہا اور عظیم جدّوجہد کو نظرانداز کرنا بڑی ہی بے انصافی ہوگی۔

ایس رادھا کرشنن کے مطابق سیکولرزم کا مطلب مذہب سے بیگانگی یا الحاد نہیں بلکہ یہ باضابطہ مختلف راہوں سے حاصل کی ہوئی مذہبی قدروں میں اتفاق کا اعلان ہے۔ "انڈین کانسٹی ٹیوشن اور گورنمنٹ" این سی ای آر ٹی کے مطابق ہندوستان ایک سیکولر ریاست ہے جس کی بنیاد اِس اصول پر استوار ہے کہ اس کی وفاداری کسی خاص مذہب سے مختص نہیں بلکہ اس کی تمام تر وفاداریاں سبھی مذاہب کے ساتھ یکساں ہیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے پارلیمنٹ میں ایک مباحثے کے دوران کہا تھا کہ سیکولر ریاست اس بات کی مجاز نہیں ہوگی کہ عوام پر کوئی خاص مذہب نافذ کرے۔ ایک موقع پر مسز اندرا گاندھی نے کہا کہ سیکولرزم نہ ہی مذہب ہے اور نہ اس سے بے اعتنائی۔ وہ سبھی مذاہب کا برابر احترام نہ صرف رواداری کی شکل میں بلکہ مثبت احترام کی شکل میں دیکھنے پر زور دیتی نظر آتی ہیں اور اس کی عدم موجودگی میں قوم Nation کا کوئی مستقبل تصور نہیں کرتیں۔ سابق چیف جسٹس پی۔ بی گجیندر گڈکر کے بقول سیکولرزم نہ جامد ہے نہ منفی۔ اسی طرح نہ ملحد ہے اور نہ لادین۔

۱۹۷۶ء میں بیالیسویں ترمیم کے ذریعے دستور کی تمہید (PREAMBLE) میں لفظ "سوشلسٹ" اور "سیکولر" کا اضافہ کیا گیا۔ اگرچہ کہ ملک کا دستور پہلے سے سیکولر بنیادوں پر استوار تھا مگر وقت اور حالات کے تناظر میں سیکولرزم کی وضاحت ضروری تھی چنانچہ یہ مزید وضاحت تھی اس قانون کی جو بقائے باہم کی ضمانت دیتا ہے۔ چونکہ سیکولرزم کی دستورِ ہند میں کوئی تشریح موجود نہیں تھی لہٰذا اہلِ علم نے اپنے اپنے انداز میں سیکولرزم کی تشریح کی ہے۔ اس سلسلے میں پنڈت نہرو اپنی سوانح عمری میں تحریر کرتے ہیں کہ جس طرح لفظ مذہب کی تشریح تمام زبانوں میں مختلف لوگوں نے متضاد زاویے سے کی ہے۔ اُسی طرح سیکولرزم بھی ایک تصور ہے جس کا وجود مذہب کی طرح متضاد معنوں میں سمجھا گیا ہے۔ اس تمہید کے تناظر میں ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں سیکولرزم کے معنی مذہبی رواداری، ایک دوسرے کے تہذیبی رویوں کا احترام اور مذہبی عقاید کا پاس ہے اور ان پر عمل پیرا ہو کر ہی انسانی اخوت کے رشتے کو مضبوط کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ تاریخ پر نظر ڈالیے تو جہاں ایک طرف سادھو سنت اس روایت کے فروغ میں کوشاں نظر آتے ہیں وہیں مسلم صوفیوں نے بھی اس کی اشاعت میں موثر کردار ادا کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کو چار بڑے خانوں میں تقسیم کر کے ان کے سیکولر رویے کو پرکھا جاسکتا ہے۔ یعنی مذہب، ادب، سیاست اور صحافت لیکن اس طرح یہ مشکل پیش آتی ہے کہ بہت سے افکار و خیالات سامنے آنے سے رہ جاتے ہیں۔ وہ اس

---

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

لیے کہ ان کے علاوہ بھی دوسرے بہت سارے خانے ہیں جو مولانا آزاد کی زندگی سے عبارت ہیں۔ اس لیے یہاں شعوری آزاد کی زندگی کو خانوں میں تقسیم کرکے دیکھنے سے گریز کیا گیا ہے۔

مولانا آزاد کی پوری زندگی کا ایک ایک عمل اور ایک ایک فعل سیکولرزم سے عبارت ہے۔ علم اور مذہب کے عمیق مطالعے میں بالغ نظری اور خود اعتمادی پیدا کردی تھی۔ اسی لیے وہ مشکلات کے وقت بالخصوص سیاست کے ہنگاموں سے کبھی بدد چونکہ سیکولرزم کی تشریح کا موقع بہت سے دانشوروں کو حاصل رہا اور یقیناً نیک نیتی پر مبنی انھوں نے سیکولر نظریہ اپنے ا کیا جو مغرب کے مذہب دشمنی پر مبنی سیکولر نظریات سے یکسر مختلف تھا مگر بدقسمتی سے آج فرقہ پرست طاقتیں مغرب کی تقلید میں مفادات کے تحفظ کے پیش نظر سیکولرزم کی وہی تشریح پیش کر رہی ہیں۔ ابھی حکومت ہند نے بھی بعض اسباب کی بناء پر سیکولرزم کی تش ضرورت محسوس کی ہے۔

آزادیٔ ہند کے فوراً بعد سے ہی کہا جاتا رہا ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جائے جب کہ ہندوستان جیسے ملک میں پر اور عام طور پر کسی بھی ملک میں سچی رواداری، مذہب پر عمل پیرا رہ کر اور اس کا سیاست سے ایک خاص رشتہ قایم رکھ کر ہی قا ہے۔ دراصل مذاہب کے پیروکاروں کی غلط روش اور تنگ نظری جو تاریخی عوامل کے ساتھ جلوہ گر ہے، اُس نے آج مذہب کو سیا الگ رکھنے کی روش پر سوچنے اور اس طرز عمل کو فروغ دینے کی طرف توجہ مبذول کرادی ہے۔ اس صداقت کی سمجھ سے قاصر رہ کے سدّباب سے غفلت برتنے کی صورت میں اب جب کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے تو ایک بار پھر مذہب کو سیاست سے ال بازگشت کانوں کو سنائی دینے لگی ہے۔ تروپتی کے کانگریس اجلاس میں وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ

"جب ہندوستان ایک سیکولر جمہوری ملک ہے اور آئین میں یہ بات درج بھی ہے تب غیر سیکولر پارٹیوں کو چناؤ میں حصہ لینے کی کیسے اجازت دی جاسکتی ہے۔" (قومی آواز۔ نئی دہلی، ۱۷؍مئی ۱۹۹۳ء)

خود سابق وزیر اعظم آنجہانی راجیو گاندھی نے ۱۹۸۹ء میں جب ایل۔ کے۔ اڈوانی نے رتھ یاترا شروع کی تھی، سیاس سے الگ تھلگ کرنے کے لیے بحث چھیڑ دی تھی لیکن حکومت گر جانے کے سبب یہ بحث بند ہو گئی تھی۔

سیاسی میدان میں فرقہ پرستی کا زہر سرایت کرتا جا رہا ہے۔ بی۔ جے۔ پی جیسی جماعتیں اپنے سرپرست آر۔ ایس۔ ا کے طور پر آج جس طرح کا پروپیگنڈہ کر رہی ہیں، خیال کریں تو یہ وہی ماحول ہے جو ۱۹۴۷ء میں موجود تھا۔ یقیناً وہی جڑ آج برگ ہے اور ان حالات میں ۲۷؍ دسمبر ۱۹۴۷ء کو وکٹوریا گراؤنڈ لکھنؤ میں مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا تھ

"پولیٹیکل میدان میں فرقہ پرستی ملک کے لیے بھی اور ملت کے لیے بھی زہر قاتل ہے۔ صرف ایسی فرقہ وار جماعتیں ہونی چاہییں جو مذہبی، تعلیمی اور تمدنی معاملات سے متعلق ہوں۔ یہ خانہ ضروری ہے اور اس کو لازماً بھرنا چاہیے۔ ۔۔۔ ملک کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اور ملک کے مستقبل کی خاطر یہ ضروری ہوگیا ہے کہ فرقہ پرستی جو مذہب کے نام سے اُبھاری گئی ہے ملک کی سیاسی زندگی سے نکال دی جائے۔"

دراصل مولانا آزاد کی پوری زندگی سیکولر تھی۔ ان کے اول تا آخر نظریات وافکار کا نچوڑ اگر ایک قطرے میں سمٹنا ممکن ہوا تو سیکولرزم کی ہی صورت میں نمودار ہوگا۔ وہ اپنے سیکولر خیالات پر جو عین اسلام کی روح کے مطابق تھا ڈٹے رہے اور ذر کسی لمحے انحراف نہیں کیا۔ انھوں نے جو راستہ چن لیا تھا آخری وقت تک اُسی پر قایم رہے۔ وقت اور حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ اُن کا ایک ایک قدم مستقبل میں، جو اُن کے سامنے ایک بار پھر ماضی تھا، ہوبہو ویسا ہی نکلا جیسا کہ مولانا آزاد نے محسوس کیا تھا کہ

کیا نتائج سامنے آئیں گے۔ چنانچہ "غبار خاطر" میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہیں:

"مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا، کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ جس راہ میں بھی قدم اُٹھایا، وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہو گیا کہ جب مڑ کر دیکھا تو گرد راہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اُڑائی ہوئی تھی۔"

مولانا آزاد کی ذہانت، فطانت اور دور اندیشی نیز حالات پر مضبوط گرفت، کچھ تو اپنے خاندان کی وراثت کے طور پر اور کچھ اپنی خدا داد صلاحیت و ذاتی مطالعہ اور کائنات کے مشاہدے کے سبب تھی۔ جب ۱۹۱۲ء میں خوب پرکھ کر انھوں نے اپنے لیے، ہندوستان کے لیے اور انسانیت کے لیے ایک نظریہ قایم کر لیا تو عمر کی آخری منزل تک اس پر قایم و دایم رہے۔ کئی ایک جگہوں پر اپنی مختلف تصانیف میں اس کی وضاحت خود انھوں نے کی ہے۔ خطبۂ صدارت مجلس خلافت آگرہ ۲۵ راگست ۱۹۲۱ء میں انھوں نے فرمایا:

"..... ہندوستان کی نجات کے لیے ہندوستان میں مسلمانوں کے بہترین فرائض کے انجام دینے کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے، یہ میرا عقیدہ ہے جس کا اعلان میں ۱۹۱۲ء میں الہلال میں کر چکا ہوں۔"

آگے رقم طراز ہیں:

"الہلال کے پہلے نمبر میں جس بڑے نمایاں مقصد کا اعلان کیا گیا تھا، کیا تھا میں فخر کے ساتھ اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق تھا۔" (خطبات آزاد مرتبہ مالک رام)

اجلاس خصوصی انڈین نیشنل کانگریس دہلی، ۵ ردسمبر ۱۹۲۳ء کو انھوں نے فرمایا:

"جس طرح میں نے ۱۹۱۲ء میں اپنے تمام ہم مذہبوں کے مسلک کے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہار حق سے نہ روک سکا تھا، ٹھیک اُسی طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ ان تمام بھائیوں کے خلاف اپنی صدا بلند کر دوں، جو ہندو سنگٹھن کی تحریک کے علم بردار ہیں۔" (خطباتِ آزاد، ص ۲۰۷)

مندرجہ بالا اقتباسات میں جہاں مولانا آزاد نے اوّل اوّل قایم اعتقاد و یقین کو غیر متزلزل طور پر پیش کیا ہے وہیں ہم کو ان کی حب الوطنی وطن کی محبت میں دل سوزی اور ہندو مسلم اتحاد کی بے بہا کوشش اور تڑپ کی بھرپور جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ محمد عبد الرزاق فاروقی نے اپنی تصنیف "ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات" میں "حیاتِ سرمد" کے عنوان کے تحت مولانا آزاد کے ایک کتابچے سے جسے مولانا محمد یونس خالدی نے لکھنؤ حمیدیہ پریس سے طبع کرایا ہے، یہ اقتباس نقل کیا ہے:

"ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خونریزیاں جو پولیٹکل اسباب سے ہوئی ہیں انھیں مذہب کی چادر اڑا کر چھپا دیا گیا ہے۔" (ملاحظہ ہو صفحہ ۵۵ پر)

مولانا آزاد کی تمام سرگرمیوں کا محور مذہب رہا ہے، ان کا کہنا تھا کہ دین ایک ہے، البتہ شریعت و منہاج میں فرق رہا ہے۔ اس لیے تمام مذاہب کی بنیادی صداقتیں ایک ہی ہیں۔ ان کا یقین تھا کہ نزاع کا حل انھیں بنیادی صداقتوں پر عمل پیرا ہونے میں مضمر ہے۔ وہ اس سیکولرزم کے قایل نہ تھے جو مذہب کو ذاتی معاملہ قرار دے کر سیاست میں شمولیت کو پسند نہیں کرتا۔ ایسا سیکولرزم جو سیاست اور دین کو الگ رکھے چنگیزی عطا کرتا ہے۔

مندرجہ اقتباس میں مولانا آزاد نے اس روش سے پردہ اُٹھایا ہے جو مذہبی تنگ نظری کا موجب ہے۔ دراصل بنیادی صداقتوں کو بھول کر، شریعت و منہاج کے اختلاف کو رنگ دے کر، گندی سیاست کے سبب سے پیدا شدہ خونریزیوں کو مذہب کی

چادر اوڑھا کر شاید مفاد پرستی کے دو مقاصد حاصل کرنے کی سعی ناتمام کی گئی ہے۔ اول یہ کہ ایسے افراد کے خونی ہاتھ پہچان میں نہ آسکیں۔ دوم یہ باور کرانے کی کوشش کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک قوم نہیں ہو سکتے۔ مولانا آزاد کا یہ ایقان تھا کہ اگر تمام مذاہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کی بنیادی صداقتوں پر ایمان لائیں اور عمل پیرا ہوں تو مذہبی رواداری اور بھائی چارہ کا ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔

مولانا آزاد کے نزدیک اسلامی کلچر کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ کلچر علاقوں کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ یعنی پوری دنیا کے مسلمانوں کی ایک مذہبی یونٹ ہونے کے ساتھ ہی ان کے اپنے علاقائی کلچر بھی ہیں اور جن کے سبب سے ان کی پہچان ہوتی ہے کہ وہ کس خطے، کس قوم اور کس رنگ و نسل سے متعلق ہیں۔ ان کے مطابق بحیثیت مسلمان ہم ایک امّت ضرور ہیں لیکن ہماری قومی شناخت بھی ہے اور اس چیز کی وضاحت انھوں نے متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کے زیر عنوان بڑی صراحت سے کی ہے۔ قومی یکسانیت کی اس زبردست مثال سے آخر کون نظر بچا سکتا ہے کہ ہندوستانیوں کے ناموں میں ذرا سے اختلاف کے ساتھ کس قدر اشتراک ہے۔ فاطمہ آمنہ، اویس، جنید، ایوب۔ نیز نام رکھنے کی جو روح ہے کیا وہی شکنتلا، پاروتی، ساوتری، اشوک، سدھارتھ، نانک، کنہیا وغیرہ نام رکھنے کی روح نہیں معلوم ہوتی۔ خداداد، اللہ داد اور ایشور پرساد، رام پرساد، بھگوان پرساد میں آخر کیا فرق ہے۔ اسی طرح موہن داس، کالی داس، گورو داس اور غلام جیلانی، غلام رسول اور غلام نبی میں کیا فرق ہم محسوس کرتے ہیں۔ رمضان علی، محمد شوال، محرم علی اور چیت رام، ساون کمار، بلعم رام اور منگل دیو میں آخر کیا امتیاز ہے۔

مولانا آزاد عالم اسلام کی وحدت کے زبردست قائل تھے لیکن وہ قومی محبّت و وحدت کے بھی قایل رہے ہیں۔ وہ اسلام کی روح کے مطابق تمام مسلمانوں کو ایک جسم کی مانند سمجھتے تھے لیکن وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہماری علاقائی، جغرافیائی، لسانی اور تمدنی ضرورتیں اور مجبوریاں بھی ہیں جس سے ہم منکر نہیں ہو سکتے۔ کیا وجہ ہے کہ افریقہ کا مسلمان ہو کہ ہندوستان کا مسلمان، انگلش مسلمان ہو یا کسی اور ملک کا مسلمان، ایک مذہب کا پیرو ہونے کے باوجود اپنی کچھ علاقائی شناخت بھی رکھتا ہے اور ہم دور ہی سے دیکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہندوستانی مسلمان ہے اور یہ انگلش مسلمان، یہ چینی مسلمان ہے اور یہ ملیشیا کا مسلمان۔ مولانا آزاد کا دل و دماغ تعصب و کینہ سے پاک تھا۔ چنانچہ وہ اپنی تحریروں کے آئینے میں اپنے سیکولر کردار کے ساتھ بے نقاب نظر آتے ہیں۔

مولانا آزاد کے بارے میں صباح الدین عبدالرحمٰن نے کہا تھا کہ:

"یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ علم ان کے لیے تھا یا وہ علم کے لیے تھے۔"

مولانا آزاد کے تبحر علمی پر دال ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو نے یوں ہی یہ بات نہیں کہہ دی تھی کہ مولانا آزاد اپنی پیدائش کے وقت ہی پچاس سال کے تھے۔ یہاں اس پس منظر میں مولانا آزاد کا درج ذیل اقتباس "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" بہ روایت ملیح آبادی بیشتر خدمت ہے جو ابتدائی مولانا آزاد کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں:

"کس قدر تجربہ و صداقت سے بھرا ہوا یہ قول ہے کہ "شک، جستجو کی علّت ہے" جستجو سے تحیّر پیدا ہوتا ہے۔ اور تحیّر "وسیلۂ یقین ہے"! امام غزالی کا یہ قول ان کے تمام علم و افتخار کا ماحصل ہے۔ میں اس قول کی صداقت پر گواہی دینی چاہتا ہوں۔"

دراصل مولانا آزاد نے اپنے موروثی عقاید سے آزادی حاصل کرنے کے ضمن میں یہ بات کہی ہے۔ کسی جگہ آزاد، تخلص کرنے کا سبب بھی یہی بتایا ہے۔ "غبار خاطر" صفحہ ۳۸ پر رقم طراز ہیں۔

"عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثے کے طور پر ملتا ہے اور مجھے بھی ملا لیکن میں موروثی

عقاید پر قانع نہ رہ سکا؛ میری پیاس اس سے زیادہ نکلی جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔"

اس سلسلے میں مختلف مدارج سے گزرنے کے بعد کا احوال یوں بیان کیا ہے:

" قدامت اور روایت کی وہ تمام پُراسرار تاریکیاں جنھیں نوع انسانی عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھنے کی خوگر ہو گئی تھی، ایک ایک کر کے نابود ہو رہی ہیں! یہ راہ ہمیشہ شک سے شروع ہوتی ہے اور انکار پر ختم ہوتی ہے۔"

پھر انجام کار لکھتے ہیں:

" البتہ جو عقیدہ کھویا تھا، وہ تقلیدی تھا؛ اور جو عقیدہ پایا، وہ تحقیقی تھا!"

اسی طرح ملیح آبادی کے نام ایک خط میں مولانا آزاد نے لکھا ہے۔

" شک اور انکار کے بعد یقین اور اعتقاد کے حصول میں میرے نظر و فکر کا کیا عالم رہا اور میرے تمام لاینحل سوالوں کے کیا کیا جواب ملے؟ یہ بہت " لمبی " چوڑی داستان ہے اور میری موجودہ تصنیفات انھیں کی شرح ہیں۔"

انکار و خیالات میں تذبذب اور تغیّر و تبدّل چوبیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے قرار حاصل کر لیتا ہے اور اب مولانا آزاد ہندوستان کے حالات کے پس منظر میں، نیز برِ صغیر میں مسلمانوں کی حالت اور بین الاقوامی تغیرات کی روشنی میں اپنا ایک نظریہ مرتب کر چکے ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ الہلال ۱۹۱۲ء کے مضامین کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور مولانا آزاد کی آخری سانس تک ان کا ساتھ نبھاتا ہے۔ یہ پختہ یقین، ان کی فکر کی وسعت اور صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت کا ضامن ہے۔ انھوں نے ' الہلال ' کے اجرا کا مشن ہی یہ قرار دیا تھا کہ آزادی کا صور قوم خفتہ میں پھونکیں اور مسلمانوں کو اسلام کے اولین مطالبات و فرائض سے آشنا کرائیں۔ ایک جگہ فرمایا ہے کہ نہ تو انگریزی حکومت پر بے جا اعتماد کیجیے اور نہ ہی غیروں کے حلقۂ درس میں شریک رہیے؛ بلکہ اس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے الہلال پر جب اعتراض کیا کہ یہاں مذہب اور سیاست دونوں کی حدیں مل گئی ہیں تو مولانا آزاد نے انھیں لکھا کہ سیاست اور تعلیم کو مذہب سے الگ سمجھنا گمراہی ہے۔ دراصل تِلک اور گاندھی جی نے "گیتا" سے اور مولانا آزاد نے قرآن کریم سے روشنی حاصل کی تھی اور مذاہب کی بنیادی صداقتوں کی روشنی میں اخوت اور بھائی چارہ کی تعلیم دی۔

' الہلال ' کے بعض مضامین کے عنوانات ان قارئین الہلال کے لیے جس کا مطالعہ مولانا آزاد کی بعض تحریروں تک محدود رہے تعجب خیزی پیدا کر سکتا ہے۔ کیوں کہ ان کی تحریروں کے بعض عناوین مذہبی رنگ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کارزار ملّی احرار اسلام، القسطاس المستقیم، شئونِ اسلامیہ، حزب اللہ، الجہاد الجہاد وغیرہ لیکن یہ تعجب خیزی اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک کہ ان کے مضامین کے مباحث کا مطالعہ نہیں کیا جاتا۔

مولانا آزاد کے جس موقف کا زمانہ بعض کے نزدیک ۱۹۲۱ء گردانا جاتا ہے اس کا حرف آغاز مولانا آزاد نے ۱۹۱۳ء میں ہی لکھ دیا تھا۔ مسلم لیگ کے نظریات اور اس کے طریقۂ کار کی مخالفت، ہم وطنوں کے ساتھ بھائی چارہ، یوروپی استبداد کے خلاف جدوجہد ان جیسے دوسرے موضوعات الہلال کے موضوعات تھے۔ مولانا آزاد نے نہ صرف مذہب و سیاست کے بہترین امتزاج کی کوشش کی بلکہ اس وقت کے حالات کے تقاضوں کے تحت انھوں نے کانگریس کی ہم نوائی کر کے متحدہ قومیت کی تحریک میں جان ڈال دی تھی۔

مولانا آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن، بالخصوص تفسیر سورۂ فاتحہ میں جس نے ام الکتاب کے نام سے شہرت حاصل کی، اسے لکھنے سے پہلے

بیشتر طبع شدہ دوسری بہت سی تفاسیر کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، خود قرآن کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کا ذکر مولانا آزاد نے کیا۔ اور جب اس کے نچوڑ کی شکل میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھی تو اس کی تعلیمی روح نظریہ وحدتِ دین میں مجسم ہو گئی۔ وہ افراد جن کے نز مذہب میں تنگ نظری، دوسرے فرقے کے تئیں نفرت اور دشمنی کا جذبہ مناسب ہے، مولانا آزاد کا قلم ان کے خلاف جنبش کرنے ذرا بھی تساہلی نہیں برتتا۔ انھوں نے لکھا ہے۔

" مذہب کے دوکانداروں نے جہل و تقلید اور تعصب و ہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے اور روشن خیالی و تحقیق جو خیر کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کو حکمت و اجتہاد کے لباسِ فریب سے سنوارا ہے . . . . . . نہ مدرسے میں علم ہے . . . . نہ محرابِ مسجد میں اخلاص . . . . اور نہ میکدہ میں رندانِ بے ریا۔ اربابِ صدق و صفا ان سب سے الگ ہیں اور سب سے پناہ مانگتے ہیں، ان کی راہ دوسری ہے۔"

ایک دوسری جگہ مولانا آزاد یوں رقم طراز ہیں۔

" میں اپنے ماحول کی مذہبی فضا سے مطمئن نہیں ہو سکا اور رائج رسموں اور عقیدوں کو قبول کرنا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ سب سے پہلے جس بات نے مجھے پریشان کیا وہ مسلمانوں کا باہمی اختلاف تھا۔ میں نے اسلام کا اور دوسرے مذاہب کا تفصیل سے مطالعہ کرنا شروع کیا اور اضطراب، تذبذب اور انکار کے متعدد مراحل سے گزر کر مذاہب کی اصل حقیقت اور اسلام کی اصل روح کو سمجھنے میں کامیاب ہوا۔ میں جس نقطۂ نگاہ پر پہنچا اس کی تفاصیل سورۂ فاتحہ کی میری تفسیر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بہر حال میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اسلام دنیا میں انسانی حریت اور مساوات کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔"

اسلام اور دوسرے مذاہب میں نزاع کے اسباب کیا ہو سکتے تھے، اس پر مولانا آزاد نے اظہارِ خیال کرتے ہو۔ لکھا ہے کہ قرآن مذہبی گروہ بندیوں کا مخالف ہے اور دین کی وحدت کا اعلان کرتا ہے۔ ان کے مطابق اگر دوسرے پیروان مذاہب یہ مان لیتے تو انھیں یہ بھی ماننا پڑتا کہ دین کی سچائی کسی ایک ہی گروہ کے حصے میں نہیں آئی ہے لیکن یہی ماننا ان کی گروہ پرستی پر شاق گزرتا تھا۔ بہرحال مولانا آزاد نے قرآن کی عالم گیر سچائی کو نوعِ انسانی کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے تمام مذاہب کی سچائی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ :

" ایک چیز دین ہے، ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال بھی اس کے لیے اختیار کیے جائیں۔"

مولانا آزاد سیاست کے میدان کے آدمی نہیں تھے لیکن انھیں حالات نے اس میدان کا آدمی بنا دیا۔ وہ فرماتے ہیں:
"علم کی زندگی سیاست کی زندگی سے کچھ اس طرح مختلف واقع ہوئی ہے کہ دونوں کا ایک ہی وقت اور محل میں جمع ہونا بہت مشکل ہے۔ میری زندگی کی مشکلات میں پہلی مشکل یہ واقع ہوئی کہ میں نے چاہا کہ دونوں کو بیک وقت اور بیک محل جمع کر دوں۔" (سوانح حیات مولانا آزاد، ص ۳۳-۳۴)

اگرچہ علمی زندگی اور عملی سیاست کا رشتہ استوار کرنے میں مولانا آزاد کو بڑی مزاحمتوں کا سامنا تھا لیکن وہ دلیری سے

اس پر قایم رہے۔ یہاں آزادیِ ہند تک کی ان کی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو مولانا آزاد سرتاپا اُس تصویر کا عملی نمونہ بن کر سامنے آتے ہیں، جہاں کئی بار انھیں شکست بھی کھانی پڑی لیکن یہ شکست ان کے اندازِ فکر یا عملی اقدام کے سبب سے نہ تھی بلکہ اس راہ کی ناکامی اور وہ بھی کسی لمحے انھیں کے شریک کاروں کے سبب سے تھی۔ پنڈت نہرو نے مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت کا اعتراف اُسی طرح کیا ہے جیسی کہ ان کی ذات اُس کی مصداق تھی۔ انھوں نے لکھا ہے:

"میں صرف عملی سیاست ہی نہیں جانتا، سیاست کا اسکالر بھی ہوں، سیاست کی کتابیں مجھ سے زیادہ ہندوستان میں اوروں نے نہیں پڑھیں پھر تیسرے چوتھے سال میرا یورپ کا پھیرا بھی ہو جاتا ہے۔ جہاں سیاست کی رفتار قریب سے دیکھنے میں آجاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے سیاست کا تازہ ترین علم حاصل ہوگیا ہے لیکن جب ہندوستان پہنچ کر مولانا ابوالکلام آزاد سے باتیں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بھی آگے ہیں۔"

مولانا آزاد کے مخاطب اگرچہ ہندو مسلم دونوں ہی تھے لیکن وہ اکثر مسلم قوم کو ہی ہدف بناتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف مسلمانوں کو ہی موجودہ حالات کا ذمہ دار گردانتے تھے لیکن اُن کا یہ عقیدہ ضرور تھا کہ مسلمان اگر خود اِسلام کی اصل پر قایم ہوجائیں اور وہ تمام برائیاں جو اپنے دوسرے قومی بھائیوں میں بھی موجود ہیں اُن سے احتراز کریں تو یہی چیز اپنے دوسرے بھائیوں کو اس اصل صداقت و سچائی میں رنگنے کا موجب ہوگی۔ چنانچہ لکھنؤ میں ۱۹۴۸ء میں مسلمانانِ ہند کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے واضح الفاظ میں فرمایا تھا کہ:

"اُن بربادیوں میں جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہوتی رہی ہیں بدقسمتی سے ہر فرقہ پرست جماعت کے لوگ اضافہ کرتے رہے ہیں اور کوئی جماعت ایسی نہیں جس کے دامن پر خون کا دھبہ نہ لگا ہو ...... میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جس دروازے سے یہ فرقہ پرستی آئی ہے اُس دروازے کو بند کردیں۔"

فروری ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کی یادگار قایم کرنے کے لیے جو اجتماع ہوا تھا اس کی صدارت کے لیے مولانا آزاد کا نام تجویز ہوا تھا، صدارت کے لیے یہ نہایت موزوں نام تھا وہ اس لیے کہ یہ دونوں عظیم ہستیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ دونوں ہی نکتہ سنج، نکتہ شناس، یکتائے روزگار اور ایک ہی منزل کے ہم دم و ہم راہی تھے۔ مولانا آزاد نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"گاندھی جی ہندو تھے اور ہندو ہی رہے لیکن انھوں نے ہندو دھرم کی اتنی اونچی جگہ بنائی تھی کہ جب وہ اس بلندی پر سے دیکھتے تھے تو دنیا کے تمام جھگڑے اُن کو مٹے ہوئے نظر آتے تھے۔"

درج بالا اقتباس میں اگر گاندھی جی کی جگہ مولانا آزاد اور ہندو کی جگہ مسلمان کا لفظ استعمال کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ یہاں گاندھی جی کی عظمت کو کم کرنا مقصود نہیں بلکہ مولانا آزاد کی اسی روح کی پیش کش مقصود ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہرچند بعض اختلافات کے باوجود مولانا آزاد کی رانچی میں نظربندی اور رہائی کے بعد دلّی میں گاندھی جی سے جو سب سے پہلا ربط قایم ہوا تھا وہ گاندھی جی کی شہادت تک قایم رہا۔ شہادت کے دن مولانا آزاد اور گاندھی جی ایک ساتھ کسی کام میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد جب مولانا آزاد ان سے جدا ہوئے تو اچانک انھیں خیال ہوا، چند امور کسی خاص مسئلے سے متعلق تشنہ رہ گئے ہیں اور جب وہ گاندھی جی کے پاس دوبارہ لوٹتے ہیں تو اُن کو یہ جانکاہ خبر سننے کو ملتی ہے کہ گاندھی جی شہید کردیے گئے۔

مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کا آغاز اور اس وقت مسلمانوں میں خوف وہراس کا عالم جس کے باعث مسلمان اس سمجھ سے قاصر تھے کہ جدوجہد آزادیٔ ہند میں شرکت، اُن کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔ ایسے میں مولانا آزاد نے میدانِ سیاست میں قدم رکھ کر اُن کی مشکل کو آسان بنادیا۔ ہفتہ وار "پیغام" جدید ایڈیشن کے ابتدایے میں لکھا گیا ہے کہ:

"مولانا نے سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا تو مسلمانوں کے لیے ایک ذہنی رکاوٹ اور دلوں میں خوف موجود تھا۔ مولانا کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس رکاوٹ کو دور کر کے ان کے لیے سیاسی زندگی کے گناہ کے تصوّر کو بدل دیا۔"

بنیادی صداقتوں کے اختیار کرنے اور اس سے حاصل شدہ طاقت نے مولانا آزاد کی ذات میں دلیری اور شجاعت کے ساتھ تحمّل بردباری اور وسیع النظری نیز معاملات کو اُن کی اصل میں دیکھنے کی جو صلاحیت پیدا کر دی تھی ان کی پوری سیاسی زندگی میں اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ " انڈیا ونس فریڈم" میں مولانا آزاد کے سیاسی افکار و نظریات کی جو تصویر سامنے آتی ہے اُن کی عقاب نگاہی کا پتہ دیتی ہے۔

بعض ناموافق حالات کے سبب اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ صوبائی مسلم لیگ کے سیشن میں جب محمد علی جناح نے دو قومی نظریہ اخبار "ٹائم اور ٹ یڈ" کے ایک مضمون میں تفصیل سے پیش کیا تو اس وقت مولانا آزاد اس کے مضرات سے پریشان ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے دو قومی نظریے کے نقصانات کو واضح کیا اور بتایا کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے اور آپسی بھائی چارے کے لیے متحدہ قومیت کا قیام ہی واحد راستہ ہے اور اس طرح انھوں نے ایک وسیع حلقہ اپنے گرد جمع کر لیا۔ مولانا آزاد کا بعض دفعہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو سے بھی اختلاف ہوا۔ مولانا آزاد وفاقی حکومت میں شمولیت کے بابت مسلم لیگ سے ازسرِ نو بات چیت کے بالکل مخالف تھے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ انٹرم حکومت میں، لیگ کی شمولیت سے متعلق، ازسرِ نو بات چیت نے ہی دراصل لیگ کو تقویت پہنچائی۔ مولانا آزاد کا یہ خیال تھا کہ اس وقت مسلم لیگ کی عوامی حیثیت ختم کے قریب تھی۔

اسی طرح ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء میں جب حکومت برطانیہ نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لیے ایک کیبنٹ مشن ہندوستان روانہ کیا تو اس وفد کے اراکین لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹیفورڈ کرپس اور مسٹر اے۔ وی الیگزنڈر تھے۔ مولانا آزاد نے ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کا جو حل ترتیب دیا تھا، کیبنٹ مشن نے بھی انھیں خطوط پر اپنا حل پیش کیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے ہی کیبنٹ مشن پلان کو منظور کیا تھا لیکن ۱۰ جولائی ۱۹۴۶ء کو جب پنڈت نہرو نے بمبئی کی ایک پریس کانفرنس میں یہ کہا۔

"کانگریس دستور ساز اسمبلی میں اس طرح شرکت کرے گی کہ وہ معاہدات سے بندھی ہوئی نہیں ہوگی اور جو حالات پیش آئیں گے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔"

اِس سوال کے جواب میں کہ

"کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کیبنٹ مشن پلان میں بھی ترمیم کی جا سکے گی؟"

پنڈت نہرو نے زور دے کر کہا کہ:

"کانگریس صرف دستور ساز اسمبلی میں حصّہ لینے پر تیار ہوئی ہے اور جس طرح مناسب سمجھے کیبنٹ مشن پلان میں ترمیم کرنے یا اُسے بدلنے کے لیے اپنے کو آزاد سمجھتی ہے۔"

مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ

"میں یہ بات محفوظ کر دینا چاہتا ہوں کہ جواہر لال کا بیان غلط تھا۔"

اور اس موقع پر مولانا آزاد کو کانگریس کی صدارت چھوڑنے کا شدّت سے احساس تھا وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ مسند صدارت پنڈت نہرو کو نہ سونپتے تو محمد علی جناح کو یہ موقع ہاتھ نہ لگتا کہ وہ پنڈت نہرو کے اس طرزِ عمل کے سبب دو قومی نظریے کے تحت پاکستان کی مانگ کریں۔

مولانا آزاد نے اپنے خطبات کے ذریعے مسلمانوں میں متحدہ قومیت کی روح پھونکی۔ کبھی مسلمانوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کرتے ہیں تو کبھی تحریک خلافت کی افادیت اور اس میں شمولیت کی ترغیب، کبھی کانگریس کی سیاسی حرکت میں شرکت کی دعوت تو کبھی مسلمانوں کے وسوسوں اور خدشات کو دور کرنے کی سعی۔ جس کی کچھ مثالیں اس مضمون میں دوسری وضاحتوں کے ضمن میں آچکی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پیش ہے :

"..... ہندوستان میں نہ کسی ہندو سنگٹھن کی ضرورت ہے نہ مسلم سنگٹھن کی۔ ہمیں صرف ایک سنگٹھن کی ضرورت ہے اور وہ یہ "انڈین نیشنل کانگریس" ہے"۔

اور جب نامساعد حالات نے بٹوارے کی سمت رُخ کر ہی لیا اور ملک تقسیم ہوگیا تو ایسے میں پاکستان کوچ کرنے والے ایک گروپ سے شاہجہانی مسجد دلّی میں خطاب کرتے ہوئے مولانا آزاد کے دلی صدمات کو تبیلی کرتی تقریر اور اسی طرح ۱۹۲۱ء میں ترک موالات کی تحریک کے سلسلے میں بغاوت کے مجرم کے طور پر مولانا آزاد پر مقدمہ اور اُن کا 'قول فیصل' کے نام سے وہ مشہور بیان جس پر گاندھی جی نے فرمایا تھا۔

"اس سے زیادہ پُرزور، صداقت سے پُر اور بے باک بیان کسی ستیہ گرہی کا نہیں ہو سکتا"۔

یہ امور مولانا آزاد کی صاف گوئی، حق جوئی اور حبّ الوطنی نیز اُن کے سیکولر کردار کے آئینہ دار ہیں۔

مولانا آزاد متحدہ قومیت کے لیے آخری لمحہ تک کوشاں رہے۔ گاندھی جی کی پٹنہ واپسی سے قبل مولانا آزاد نے ان سے آخری اپیل کی اور کہا کہ دو تین سال تک موجودہ صورتِ حال ہی برقرار رکھی جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ممکن ہے مسلم لیگ کسی مناسب تصفیے پر آمادہ ہو جائے لیکن کامیابی نہیں ملی۔ لہٰذا ۱۴ رجون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں مولانا آزاد نے نہایت ہی دردمندی کے ساتھ کہا

"یہ عجیب ترین میٹنگوں میں سے ایک تھی جس میں بدقسمتی سے مجھے شریک ہونا پڑا۔ کانگریس جو ہمیشہ ہندوستان کے اتحاد اور آزادی کے لیے لڑتی رہی تھی، اب ایک ایسی سرکاری قرار داد پر غور کر رہی تھی جس کا مقصد ملک کا بٹوارہ تھا۔"

لیکن تقسیم کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا

"تقسیم ہندوستان کے لیے ایک المیہ ہے اور اس کے حق میں صرف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہم نے بٹوارے کو روکنے کی بہترین کوشش کی لیکن ہم ناکام رہے۔ بہرحال ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قوم ایک ہے اور اس کی ثقافتی زندگی یکساں ہے اور یکساں رہے گی۔ سیاسی اعتبار سے ہم ناکام رہے ہیں اور اس لیے ملک کا بٹوارہ کر رہے ہیں ہمیں اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے لیکن ساتھ ہی کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے تمدن کا بٹوارہ نہ ہو سکے۔"

متحدہ قومیت حاصل کرنے کے لیے سیکولرزم کا فروغ یعنی مذہبی رواداری وقت کی اہم ضرورت تھی اور مولانا آزاد کی پوری زندگی اس متحدہ قومیت، دوسرے معنوں میں سیکولرزم کے استحکام اور بقا کی کوششوں میں صرف ہوئی۔

مظفر حسین غزالی*

مولانا محمد علی جوہر کا تصورِ تعلیم

مولانا محمد علی سیاسی رہنما اور صحافی کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ ان کی دوسری حیثیتوں سے یا تو لوگ واقف اور اگر واقف بھی ہیں تو ان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے کیوں کہ وہ قومی رہنما کی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہوئے۔ سیاست صحافت کی گھن گرج میں ان کی شاعری اور تعلیمی فکر دب کر رہ گئی۔

انھوں نے تعلیم کا مغربی مفکرین تعلیم کی طرح چونکا دینے والا فلسفہ تو پیش نہیں کیا لیکن مقصد زندگی سے راست پر بحث کرتے ہوئے تعلیم کے مقصد کا تعین ضرور کیا ہے۔ ”تعلیم آدمی کو انسان بنانے کا ذریعہ ہے۔“ یا ”تعلیم کا مقصد اسلام ایسے جانباز سپاہی پیدا کرنا ہے جو ہر مورچہ پر اس کی مدافعت کریں۔“ جس تعلیم کا مقصد محض پیٹ بھرنا اور تن ڈھانکنا ہو اسے ناقص اور نامکمل تصور کرتے تھے۔ البتہ ایسی تعلیم کو ضروری خیال کرتے تھے جو انسان کو زندگی گزارنے میں دیگر حیوانات سے ممیز ممتاز کر سکے اور اسے متمدن کا لقب دلا سکے، لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہونی چاہیے اور اس کا حصول بھی ان ہی حدود رہ کر کیا جائے جو حقیقی تعلیم کے لیے متعین کی گئی ہیں۔ ان کے یہاں مقصد کو خاص اہمیت و مقام حاصل ہے اس لیے وہ تعلیم کو کا جزو بنا دینا چاہتے ہیں۔

مولانا محمد علی ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل برطانیہ میں رہ کر کی تھی۔ وہ قدیم اور مروجہ تعلیمی سے اچھی طرح واقف تھے۔ کیوں کہ انھوں نے تعلیم کی تکمیل کے بعد معلمی اور تعلیمی اداروں کی سربراہی کے فرائض انجام دیے اور اس دوران خود تعلیمی تجربات بھی کیے تھے۔ انھیں تعلیم پر غور کرنے اور تجربہ کرنے کا زیادہ موقع رام پور میں ملا جب وہ ۲ء میں اسٹیٹ ہائی اسکول کے پرنسپل تھے۔ ان کی تعلیم میں لگن اور صلاحیت کے پیش نظر بعد میں ریاست کا چیف ایجوکیشن آفیسر کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے ریاست کے تعلیمی نظام میں جو اصلاحات کیں وہ قابلِ غور ہیں۔ انھوں نے تعلیم اقدار کے مسئلے کو اٹھایا تھا۔ اس مسئلے کو ہمارے ملک کی نئی ایجوکیشن پالیسی ۱۹۸۶ء میں اٹھایا گیا ہے لیکن مولانا نے لگ بھگ اسّی سال پہلے اس پر توجہ دی تھی۔

انھوں نے درسی کتب کی خامیوں کی نشاندہی کی اور ریاست کا اپنا تعلیمی مقصد ہونا چاہیے اس بات پر زور د کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ رائج نظام تعلیم طلبا کو اسناد دے سکتا ہے جس کی بنیاد پر انھیں نوکریاں مل سکتی ہیں لیکن ان کی کو پروان نہیں چڑھا سکتا۔ انھیں تن پروری، زر اندازی اور حصول جاہ کے چکروں سے اوپر نہیں اٹھا سکتا۔ انسانیت اور اد

---

* ۳۷-اے۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵

نداز سے طلباء کی دوری انھیں سادہ زندگی اور بلند خیالی کے اصولوں سے یکسر عاری کر دیتی ہے۔ ایسی تعلیم کو وہ پوری نسل کے لیے ہلاکت کا پیش خیمہ تصور کرتے تھے۔

انھوں نے ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے کچھ اصول مرتب کیے۔ تاکہ تعلیم صحیح خطوط پر چل سکے۔ اس کا اظہار روزنامہ ہمدرد ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے شمارے میں ایک خط کا جواب دیتے ہوئے کیا ہے:

"ہمارا مطمح نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم اپنی درس گاہوں سے ایسے نوجوان تیار کریں جو نہ صرف حسب معیار زمانہ حال تعلیم و تربیت یافتہ شمار کیے جانے کے مستحق ہوں بلکہ صحیح معنوں میں ایسے مسلمان ہوں کہ جن میں اسلام کی روح سرایت کر گئی ہو اور جو اپنے مذہب کی تعلیمات سے اس قدر بہرہ اندوز ہوں کہ مبلغین اسلام کے دستوں میں دوسروں کی امداد سے مستغنی ہوں اور بے نیاز ہو کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔"

اس کی مزید وضاحت ۱۰ ارجنوری ۱۹۲۸ء کے روزنامہ ہمدرد میں اس طرح کی ہے:

"دین اور دنیا کو اس طرح ملا دینا جس طرح رسول نے ملایا تھا دین داری کو صحیح دنیا داری سمجھنا اور دنیا کو صحیح طریقے پر برتنا ہی دین کا جاننا ہے۔ زمانے کے نامساعد حالات اور ناخوش گوار ماحول کی بنا پر تین مکتب خیال کے پیرو مختلف سمتوں میں کام کر رہے ہیں۔ ایک گروہ کے خیال میں تعلیم کے مقاصد میں ترقی کے مواقع فراہم کرنا دوسرے طبقہ کے مطابق تہذیب شناسی کے ساتھ ذاتی صلاحیتوں کو فروغ دینا اور تیسری جماعت کی رائے میں انفرادیت کی بجائے اجتماعی حیثیت سے شہریوں کی تربیت کا سامان مہیا کرنا مقصدِ اولین قرار دیا جائے۔"

ان نظریات کا محاسبہ کرتے ہوئے مزید فرمایا:

"ہندوستان سے انگریزی تسلط کو پسپا کرنے کے لیے دینی اور دنیوی تعلیم دونوں کا اہتمام ہو — ہندوستانی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے اور فطری صلاحیتوں کے پیش نظر پیشہ کی اہمیت کو واضح کیا جائے اور اس طرح نظامِ تعلیم کو اجتماعیت کے آئینے میں برتا جا سکتا ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں محمد علی جوہر نے ایک ماہر تعلیم کی طرح پورے تعلیمی نظام کا جائزہ لیا ہے اور ایک ایسے نظامِ تعلیم کے خدو خال ابھارنے کی کوشش کی ہے جو سماج اور زندگی کے ہر گوشے سے بحث کرتا ہو اور انسان کے مقام کے تعین کے ساتھ سماج میں اس کی حیثیت کو واضح کر دے۔ نیز انسان کو دنیاوی زندگی کے بعد کی زندگی کی طرف بھی متوجہ کرتی ہو۔ انھوں نے زبان کے مسئلے پر ذریعۂ تعلیم کے نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔ اس سے ان کی پالیسی کی وضاحت ہوتی ہے کہ ہندوستان میں تعلیمی نظام کو زیادہ موثر بنانے کے لیے ذریعۂ تعلیم کے طور پر ہندوستانی یعنی اردو کو اپنایا جائے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کا مسئلہ بھی ان کے پیش نظر تھا۔ انھوں نے اس موضوع پر بھی تفصیلی اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کو اپنی فطری صلاحیتوں اور دلچسپیوں کے مطابق ہی پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ تاکہ سماج کو وہ ترقی کی راہ پر گامزن کر سکے۔ متذکرہ تین بنیادوں پر ہی ان کے تعلیمی نظریات کی عمارت تعمیر ہوتی ہے، جس کا ذکر ۸ ارجنوری ۱۹۲۸ء کے ہمدرد میں کیا ہے۔ ان کا مشورہ ہے کہ:

۱- طلباء میں دینی جذبہ پیدا کیا جائے اور انھیں دین سے کماحقہ واقفیت دلائی جائے۔

۲- تعلیم کو زیادہ موثر بنانے کے لیے ذریعہ تعلیم مادری زبان کو بنایا جائے۔
۳- پیشہ ورانہ تعلیم کو تعلیمی اسکیم کا ایک جزو بنایا جائے۔

مولانا محمد علی نے اپنی تعلیمی اسکیم میں دینی تعلیم دینے اور دینی جذبہ پیدا کرنے کو اولیت دی ہے۔ وہ مسلمانوں کے لیے قرآن کی تعلیم کو ہر ہر مرحلے میں ضروری قرار دیتے ہیں اور ثانوی منزل میں دینیات کی مزید تعلیم دینے کے حامی ہیں۔ ان کے خیال میں تمام مذہبی گروہوں کو اپنے طلبا کو ایک خاص مسلک مذہبی تعلیم دینی چاہیے اور انھیں اپنی تعلیمی اسکیم میں مذہبی تعلیم کو جگہ دینی چاہیے تاکہ وہ اپنی اقدار سے واقف ہوسکیں۔ ان کا یہ تصور تھا کہ کوئی بھی قوم اپنے مذہب اور اقدار کا سہارا لیے بغیر صحیح معنوں میں زندگی کا لطف حاصل نہیں کرسکتی اور نہ طمانیت قلب پاسکتی ہے۔ اس تعلیمی اسکیم کی اشاعت کے نو سال بعد آنجہانی ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ایک چھوٹی سی کتاب "کل کی" کے نام سے لکھی۔ اس میں انھوں نے دنیا کی متمدن قوموں کا جائزہ لینے کے بعد اس کرب و بے چینی کا ذکر کیا ہے جس میں پوری دنیا مبتلا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ زندگی کی تمام آسائشوں کے ہوتے ہوئے بھی انسان لطف حیات سے یکسر محروم ہے۔ ان امور پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد انھوں نے بھی یہی تجویز رکھی ہے کہ مذہبی اور دینی تعلیم کو تعلیمی اسکیم کا ایک ایسا جزو بنایا جائے جو زندگی میں پوری طرح رچ بس جائے۔

ان کی تعلیم کا دوسرا بنیادی نکتہ تھا، کم وقت میں زیادہ علم کی تحصیل ہو۔ اس اصول کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ چاہتے تھے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہو، یعنی ذریعۂ تعلیم کے طور پر مادری زبان کو اختیار کیا جائے۔ شمال کے لوگوں کی مادری زبان اردو ہے اور ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتی ہے۔ لہٰذا اُن کو تعلیم دینے کے لیے ذریعۂ تعلیم کے طور پر اردو کو اپنایا جائے۔ یہ تجویز اس شخص کی ہے جس نے خود انگریزی ماحول میں تعلیم پائی تھی۔ آج کے تمام ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ بچوں کی تعلیم ان کی اپنی مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ مولانا محمد علی نے مادری زبان کے علاوہ کسی دوسری یا غیر ملکی زبان کو اختیار کرنے کے سلسلے پر سخت تنقید کی اور واضح طور پر کہا:

"مختلف علوم کی تعلیم و تدریس کے لیے ایک غیر ملکی زبان کے دیر طلب ذریعے کو اختیار کرنا ایک نامعقول اور غلامانہ تصور ہے اور اس چیز کو کلیتاً مسترد کیا جا چکا ہے۔"[۱]

جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں اردو کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار کیا گیا۔ اس پر مولانا محمد علی نے یہ امید ظاہر کی کہ اب طلبا کے علم میں گہرائی پیدا ہوگی اور وہ زیادہ معلومات حاصل کرسکیں گے۔

"چونکہ غیر ملکی زبان (انگریزی) کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے مسترد کر دیا گیا ہے، اس لیے اب نہایت وثوق سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ طلبا کی علمیت میں گہرائی پیدا ہوسکے گی اور جو مدت وہ اس وقت لگاتے ہیں اتنی ہی مدت میں وہ وسیع معلومات حاصل کرسکیں گے۔"[۲]

ان کی تجویز میں تیسرا نکتہ تھا پیشہ ورانہ تعلیم کا۔ وہ اس کو تعلیم کا لازمی جزو بنا دینا چاہتے تھے۔ اس وقت حکومت ہند نے اس طرف توجہ کی ہے اور مختلف سطح پر پیشہ ورانہ کورسوں کو نصاب تعلیم میں داخل کرنے پر زور دیا جا رہا ہے جب کہ مولانا محمد علی نے آزادی سے قبل اپنی یہ تجویز رکھی تھی۔ اگر آزادی کے بعد اس تجویز پر عمل ہوگیا ہوتا تو آج بے روزگاروں کی شرح میں اس قدر اضافہ نہ ہوا ہوتا۔ مولانا نے طلبا کو مشورہ دیا تھا کہ:

"ہر طالب علم کو اپنے پورے تعلیمی دور میں ایک یا زیادہ پیشوں کے سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے

تاکہ آئندہ چند سالوں میں ہندوستانی طلبا، موجودہ مالی مجبوری اور کلرکی یا دیگر ادنی ملازمتوں پر
بھروسہ کرنے سے چھٹکارا پا جائیں..... یہ ضروری نہیں ہے کہ آئندہ زندگی میں طالب علم کوئی
ایسا ہی پیشہ اختیار کرے جس کی تعلیم اس نے اسکول یا کالج میں حاصل کی ہے۔" ۳ے

ان کا خیال تھا کہ پیشہ ورانہ تعلیم کے رائج ہونے سے پڑھے لکھے نوجوانوں کو محنت کرنے کی عادت ہوگی اور دوسری طرف پیشہ ورانہ کام کرنے والوں کے سلسلے میں ان کے اندر جو ایک طرح کی نفرت یا مغائرت پائی جاتی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی۔ یہ سمجھتے تھے کہ کسی پیشے کے اختیار کرنے سے انسان بڑا یا چھوٹا، اعلیٰ یا ادنیٰ نہیں ہوتا بلکہ انسان کی بلندی اس کے اپنے اخلاق اور کردار پر منحصر ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"پیشہ ورانہ تعلیم ایک پڑھے لکھے نوجوان کو محنت کی عزت و منزلت اور اہمیت کا احساس بھی دلاتی ہے
اور اس مغائرت کو بھی رفع کرتی ہے جو فی زمانہ تعلیم یافتہ طبقے اور ان عام لوگوں کے درمیان
پائی جاتی ہے جن کا انحصار پیشوں پر ہے۔" ۳ے

محمد علی کے نزدیک اہم ترین مقصد اخلاقی قدروں کی نشو و نما ہے۔ اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو ذہنی تربیت کر سکے اور جس میں دماغی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس لیے وہ پہلے عام تعلیم کو اہمیت دیتے ہیں۔ بلکہ انھوں نے عام تعلیم کو صنعتی تعلیم پر مقدم رکھا ہے۔

وہ اپنے زمانے کے تعلیمی نظام اور درس گاہوں سے مطمئن نہ تھے۔ کیونکہ تعلیمی اداروں میں انگریزوں کا بے جا عمل دخل تھا جسے وہ پسند نہ کرتے تھے۔ دوسری طرف ان کا نصاب و نظامِ تعلیم اس انداز کا مرتب کیا گیا تھا جس سے ان کی ضرورت کے لوگ تیار ہو سکیں۔ اس کا اندازہ محمد علی کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام سے قبل علی گڑھ میں کی تھی۔ انھوں نے قومی درس گاہ کے قیام کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا تھا:

"ہمیں اب ایک ایسی قومی درس گاہ کے قیام کی ضرورت ہے جو سرکاری دخل اندازی سے آزاد ہو تاکہ
نوجوانوں میں وطن دوستی، ثقافت شناسی اور قومی یک جہتی کی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔" ۳ے

یہ وہ زمانہ تھا جب آزادی کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ خلافت تحریک اور نان کوآپریشن تحریک ایک ساتھ چلائی جا رہی تھی۔ محمد علی چاہتے تھے کہ علی گڑھ کے طلبا بھی اس میں شریک ہوں۔ علی گڑھ کالج کے ذمہ داران نہیں چاہتے تھے کہ علی گڑھ کالج کے طلبا حکومت برطانیہ کے خلاف چلنے والی تحریک میں شریک ہوں۔ اس لیے انتظامیہ نے مولانا جوہر اور ان کی تحریک میں شریک طلبا سے خطرہ محسوس کیا اور انھیں پولیس کے ذریعے کالج سے نکلوا دیا۔ محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں اور مختار احمد انصاری کی مدد سے ایک نئی درس گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں لائے۔ جامعہ کا افتتاح ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مولانا محمود حسن نے علی گڑھ جامع مسجد میں جمعہ کے دن کیا۔ اس موقع پر مولانا شبیر احمد عثمانی اور حکیم اجمل خاں نے مختصر تقریریں کیں۔ مولانا عثمانی صاحب نے مولانا محمود حسن صاحب کا خطبہ صدارت پڑھا۔ اس زمانے کے انگریزی اخباروں انڈی پنڈنٹ اور رٹری بیون نے علی گڑھ کی خبروں کو بہت نمایاں مقامات پر شایع کیا۔ ان کی سرخیاں کچھ اس طرح تھیں۔ پیرانے علی گڑھ کی راکھ سے نیا علی گڑھ، تحریک نان کوآپریشن کا بڑا شیریں بچہ، اور رینٹل یونیورسٹی کی پوری داستان وغیرہ۔ مولانا محمد علی جامعہ کے پہلے پرنسپل ہوئے۔ انڈی پنڈنٹ نے ۳ر نومبر کے شمارے میں اس کی تفصیلی رپورٹ اپنے نامہ نگار کے حوالے سے شایع کی ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"اس (جامعہ) کی بساط دو بنگلے اور بہت سے خیمے ہیں جو ترتیب وار بڑے سلیقے سے نصب کیے گئے ہیں۔ ان گھروں اور خیموں میں پرنسپل (محمد علی جوہر) اپنے خوش و خرم طلبا کے خاندان کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ قافلہ مگن ہے مگر اس کو اپنی ذمّہ داری کا پورا احساس ہے اور اس بڑے کام کا بھی جو اس کے سامنے ہے۔ ان کو اپنے کیے پر قطعی افسوس نہیں ہے، نہ جو قدم انھوں نے اُٹھایا ہے اس پر رنجیدہ ہیں۔ ان میں تو صرف مستی ہے اور اس بات کی سچی خواہش کہ پرانے علی گڑھ کی راکھ سے نیا علی گڑھ بنائیں ایک قابلِ قدر گھر قومی اور اسلامی کلچر کا۔

طلبا کو ان کے معاملات سپرد کر دیے گئے ہیں۔ انھوں نے اسی غرض سے ایک جنرل کمیٹی اور ایک سب کمیٹی بنائی ہیں۔ چھٹی کے لیے درخواستیں بھی پہلے طلبا کی سب کمیٹی میں پیش ہوتی ہیں۔ اس کے بعد پرنسپل صاحب کے سامنے رکھی جاتی ہیں۔" ؂

خود مولانا محمد علی نے جامعہ کی جو کیفیت ہمدرد کے ایک اداریہ میں بیان کی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو:

"جامعہ ملیہ نے جس سادہ طرزِ زندگی کو اپنے طلبا میں رائج کیا ہے۔ اسے دیکھ کر یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ کوئی شخص اثر پذیر نہ ہو۔ جامعہ کے دورِ ابتدائی میں تو قدرت کی پیدا کی ہوئی زمین لکچر روم بھی تھی اور ڈائننگ ہال بھی اور بڑے بڑے درختوں کا سایہ شبنم اور دھوپ سے سب کو پناہ دیتا تھا۔ طلبا اور اساتذہ میں کبھی کوئی فرق معلوم ہوتا تھا۔ تو عمر کا یا اساتذہ کی طلبا پر فوقیت جب کہ ایک طرف ایک فاضل اجل کے بحرِ علم کی موجیں اُٹھ اُٹھ کر نہ صرف یہ کہ طلبا کو بلکہ تمام آس پاس کی فضا کو بھی اپنی آغوش میں لے لیتی تھیں اور دوسری طرف شوق، استعجاب اور تعلیم کے جذبات سے لبریز ننھے منّے دل یہ ایک نقشِ دیوار کی طرح ہمہ تن گوش بنے ہوئے نظر آتے تھے۔ طلبا کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور کھیل کود غرضیکہ تمام کام اساتذہ کی معیت اور ان کی نگاہوں کے سامنے ہوا کرتے تھے اور اس طرح قابل اور فدائے قوم اساتذہ کی سادہ اور قابلِ تقلید زندگی ہر وقت چراغِ راہ کی طرح طلبا کے سامنے ہوتی تھی۔ علم اور حبِ قوم و وطن کی لہریں اساتذہ کے سینوں سے اٹھتی تھیں اور طلبا کے دلوں سے ٹکراتی تھیں اور اس طرح جامعہ کے بوریہ نشین طلبا میں کوئی ملازمت حاصل کرنے کے بجائے علم و فن کی حقیقی طلب پیدا ہو جاتی تھی جس نے انھیں تمام درس گاہوں سے ممتاز کر دیا تھا۔" ؂

درج بالا اقتباس سے جامعہ کے ابتدائی حالات، ماحول اور مقاصد کا کسی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ مولانا محمد علی کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ انھوں نے بغیر کسی سرمایہ کے ایک یونیورسٹی کی بنیاد چند خیموں میں ڈال دی۔ جامعہ کے قیام کے بعد اُس کے مقاصد کا تعین کیا گیا۔ جامعہ کو نیشنل یونیورسٹی کہا گیا اور اس کے قیام کا بنیادی مقصد ملکی و قومی تقاضوں کے مطابق طلبا کو تیار کرنا قرار پایا۔ اس کے ذریعے قومی تعلیمی اسکیم (جو گاندھی جی نے تیار کرائی تھی) کو فروغ دینے کی بھی کوشش کی گئی۔ محمد علی جوہر کے ذہن میں قومی تعلیم کا تصور کیا تھا اور وہ جامعہ سے کیا توقعات رکھتے تھے اور اس کے نظامِ تعلیم کی ترتیب کیا چاہتے تھے؟ ان سوالات کا جواب اُن کے اپنے اخبار ہمدرد کے ۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۵ء کے شمارے سے ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دارالعلوم یعنی جامعہ ملّیہ اسلامیہ پہلے جامعہ اور ملیہ ہے یعنی اس میں دین اور دنیا دونوں پڑھائے جاتے ہیں۔ نہ وہ دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ نظامیہ کے طرز پر صرف علوم دینی کی تعلیم دیتی ہے اور نہ انگریزی کالجوں کی طرح صرف علوم دنیوی پہ اکتفا کرتی ہے۔ پھر جامعہ تو جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ یعنی اس میں اسلام کی تعلیم کے ساتھ دیگر مذاہب کے پیرؤں کے لیے اس کا دروازہ بند نہیں ہے۔" ۸؎

ں مضمون میں آگے چل کر تعلیم کے نظام خصوصًا جامعہ کے پس منظر میں اپنی پالیسی کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ اپنی ملت کی محبت میں کوئی مسلمان اتنا سرشار ہو جائے کہ بنی آدم کے ساتھ انصاف کو یک قلم ترک کر دے۔ تعلیم کا پیشہ کسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔ یہ وہ شعبہ زندگی ہے جس میں ہر فرد کو گفتار و کردار کی آزادی ہو۔" ۹؎

یہیں انھوں نے جامعہ کے نصاب کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی درج ذیل چار خصوصیات بیان کی ہیں:

اول: جامعہ میں عربی زبان و ادب کو ہر مسلمان طالب علم کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم کے علاوہ عربی نثر کے نصاب کو قرآن کریم پر مبنی کیا ہے اور اس نصاب کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ اس کے ذریعہ دین اور دنیا کی دولت نصیب ہو۔

دوم: جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ذریعۂ تعلیم مادری زبان اردو ہے۔ کیوں کہ زبان اظہار خیال کا ذریعہ ہے۔ دیگر یہ کہ مادری زبان ذریعۂ تعلیم ہونے کی بنا پر دیگر اداروں کے مقابلے میں جامعہ کے طلبا کی معلومات بہتر ہوتی ہے۔

سوم: جامعہ میں مثالی ہندوستانی قومیت اور اسلامی ملّی اخوت کے اجزائے مفرد کو احسن طریقے پر مرکب کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جامعہ کے طلبا اور اساتذہ میں کسی قسم کی بھی عصبیت نظر نہیں آتی بلکہ انھوں نے جہاں ملت پروری کو اپنا شعار بنایا ہے وہیں وطن دوستی کو بھی ایک ولولہ انگیز جذبہ تصور کیا ہے۔

چہارم: دست کاری کی تعلیم کا نہ صرف انتظام ہے بلکہ ہر طالب علم کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ "تاکہ کوئی بھی نوجوان "اکل حلال" کو چھوڑ کر حرام خوری پر مجبور نہ ہو جائے اور کسی سبب سے اس کی دماغی قابلیت "قوت لایموت" کے لیے حلال طریقہ اختیار نہ کر سکے تو وہ دست کاری تعلیم کی وجہ سے اپنے آپ کو بے دست و پا نہ سمجھے۔" ۱۰؎

جامعہ کا جو نقشہ مولانا کے پیش نظر تھا وہ اپنے زمانے کے لحاظ سے انتہائی ترقی یافتہ تھا۔ انھوں نے ساٹھ سال پہلے جن چیزوں و نظام تعلیم کا حصہ بنائے جانے پر زور دیا تھا۔ آج ان امور کی تعلیم میں شمولیت پر حکومت متوجہ ہے۔ اس سے مولانا محمد علی کی :ور اندیشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے ذہن میں شاید آزادی کے بعد کے ہندوستان کی شکل و صورت واضح تھی۔ اسی لیے انھوں نے علیم کے مزاج کو سیکولر رکھتے ہوئے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے والے نظام تعلیم کی تدوین کی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد طالب علم بیروزگار نہ رہے، اس کا بھی تعلیمی نظام میں انھوں نے انتظام کیا تھا۔

بقول سیّد محمد ہادی جنھوں نے ۱۹۲۴ء سے کامریڈ اور ہمدرد میں محمد علی کے ساتھ کچھ برس کام کیا:

"آخری دور میں مولانا (محمد علی) کا جامعہ کے لیے جوش ختم ہو گیا تھا اور وہ سرد پڑ گئے تھے۔" ۱۱؎

ممکن ہے ان کا تاثر صحیح ہو لیکن اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی یہ ہو سکتا ہے صحت کی خرابی یا جامعہ کو وہ جن خطوط پر ترقی دینا چاہتے تھے بعد کے لوگوں نے جامعہ کو دوسری راہ پر ڈال دی ہو لیکن جامعہ کی بنیاد ڈالنے کا سہرا انھیں کے سر جاتا ہے۔

محمد علی کے تعلیمی خیالات کو پڑھ کر ممکن ہے انھیں ماہر تعلیم تصور نہ کیا جائے لیکن یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ وہ تعلیم کے ہر پہلو سے متعلق اپنے واضح نظریات رکھتے تھے اور انھوں نے تعلیمی نظاموں کا بھی گہرائی سے جائزہ لیا تھا اور تعلیم کے مقاصد کا تعین، نظام تعلیم کی ترتیب اور انتظام مدرسہ کا کام بھی کیا تھا۔ ان کے تعلیمی نظریات اور کام اس درجے کے ہیں کہ انھیں منفرد تعلیمی فکر رکھنے والے دانشور کی حیثیت سے بھی یاد کیا جائے گا۔

حواشی

۱۔ برگ گل، جوہر نمبر۔ شعبہ تصنیف و تالیف وفاقی گورنمنٹ اردو کالج، کراچی ۱۴۰۱ھ/۱۹۷۸ء، ص ۱۸۴۔

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۴۔ ایضاً

۵۔ روزنامہ ٹریبون (انگریزی) ۲۷ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء ص ۳۔ کالم ۴

۶۔ روزنامہ انڈی پنڈنٹ (انگریزی) ۷ر نومبر ۱۹۲۰ء

۷۔ روزنامہ ہمدرد، ۱۸ر جنوری ۱۹۲۸ء

۸۔ ہمدرد، ۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۵ء

۹۔ ایضاً

۱۰۔ بحوالہ ہفتہ وار ندائے ملت، لکھنؤ، ۲۴ر فروری ۱۹۹۱ء

۱۱ برگ گل، جوہر نمبر۔ کراچی۔ ص ۲۲۱۔

ڈاکٹر محمد فاروق اعظم*

خالق کائنات ۔ سائنسی حقائق کی روشنی میں

میرے ایک دوست ڈاکٹر منوج کمار جھا ماہر جراح (Surgeon) ہیں ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے ایک ملاقات کے دوران میں نے ان سے استفسار کیا کہ ہمارے سائنسداں کہتے ہیں کہ ہمارے پیٹ میں آنت سے جڑی ہوئی ایک بیکار چیز بھی ہے جسے اپینڈکس (Appendix) کہا جاتا ہے اس چیز کو کاٹ کر نکال دیا جاتا ہے تو اس سے ہمارے جسم پر یا ہماری صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ ہمارے سائنسداں انسانی جسم میں موجود اس بے کار چیز کے وجود کو بنیاد بنا کر کہتے ہیں کہ اگر خدا نے ہماری تخلیق کی ہوتی تو اس بے کار چیز (Useless Part) کو وہ بناتا ہی کیوں؟ اس طرح ان کا کہنا ہے کہ خدا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میں نے ڈاکٹر صاحب کا خیال جاننا چاہا تو انہوں نے کہا:۔

"خدا ہے اور خدا نے ہی پوری دنیا تخلیق کی ہے اور اسی نے ہم انسانوں کو بھی پیدا کیا ہے۔ اب رہی بات Appendix جیسی بیکار چیز کی تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ کوئی بیکار چیز نہیں ہے جس کی تخلیق خدا نے کر دی یا غلطی سے تخلیق پا گئی اس Appendix کا اچھا یا برا اثر ہمارے جسم پر ہمارے سائنسداں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے تاہم اتنا طے ہے کہ اس چیز کی موجودگی اور اس کی وجہ سے ہونے والی سنگین بیماری Appendicitis سے معاش کا مسئلہ جڑا ہوا ہے۔ اور ہم جیسے سرجنوں کو اس سے معاشی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ خدا نہیں ہے تو یہ غلط ہے۔ خدا ہے اسی نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور وہی کسی نہ کسی بہانے ہمیں رزق بہم پہنچاتا ہے۔ خدا کی حکمت کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں"

ڈاکٹر منوج کمار جھا کی باتوں کو سن کر میں دنگ رہ گیا میں نے کہا کہ یہ بہت ہی اہم پہلو ہے اور میں آپ کی باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ بہرحال بات آئی گئی ہو گئی۔ ایک روز میں مطالعۂ قرآن میں مصروف تھا کہ میری نظر سورہ النمل کی ایک آیت پر جا کر ٹک گئی:۔

أَمَّن يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ (النمل ۶۴)

ترجمہ: "اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خدا بھی ہے؟"

اس آیتِ کریمہ کی تشریح بیان کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جو کچھ کہا ہے اس کے مطالعے سے یہ حقیقت

* کھیری باندھ، بھاگلپور۔ بہار

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جولائی ۱۹۹۵ء

بہت واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف انسانوں کو بلکہ پوری کائنات اور اس میں جو کچھ ہے ان سب کو اللہ نے حکمت و تدبر کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

صاحب تفہیم القرآن لکھتے ہیں کہ یہ سادہ سی بات (جو مذکورۂ بالا آیت میں کہی گئی ہے) جس کو ایک جملہ میں بیان کر دیا گیا ہے اپنے اندر ایسی تفصیلات رکھتی ہیں کہ آدمی ان کی گہرائی میں جتنی دور تک اترتا جاتا ہے اتنے ہی وجود الٰہ اور وحدت الٰہ Existence of God & Oneness of God کے شواہد ملتے چلے جاتے ہیں۔

آئیے! پہلے ہم عملِ تخلیق پر ہی غور کریں۔ انسان کا علم آج تک یہ راز نہیں پا سکا ہے کہ زندگی کیسے اور کہاں سے آتی ہے اس وقت تک مسلم سائنٹفک حقیقت یہی ہے کہ بے جان مادے کی محض ترکیب سے خود بخود جان پیدا نہیں ہو سکتی۔ حیات کی پیدائش کے لیے جتنے عوامل (Factors) درکار ہیں ان سب کا ٹھیک ٹھیک تناسب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آ جانا دہریوں کا ایک غیر علمی مفروضہ تو ضرور ہے لیکن اگر ریاضی کے قانون بخت و اتفاق (Law of Chance) کو اس پر منطبق کیا جائے تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں نکلتا اب تک تجربی طریقے پر سائنس کے معملوں (Laboratories) میں بے جان مادے سے جاندار پیدا کرنے کی جتنی کوششیں بھی کی گئیں ہیں، تمام ممکن تدابیر استعمال کرنے کے باوجود وہ سب قطعی ناکام ہو چکی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز پیدا کی جا سکی ہے وہ صرف وہ مادہ ہے جسے اصطلاحاً DNA (Deoxyribose Nucleic Acid) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مادہ ہے جو زندہ خلیوں (Cells) میں پایا جاتا ہے۔ یہ جوہر حیات تو ضرور ہے مگر خود جاندار نہیں ہے۔ زندگی اب بھی بجائے خود ایک معجزہ ہی ہے جس کی کوئی علمی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ یہ ایک خالق کے امر و ارادہ اور منصوبے کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد آگے دیکھیے! زندگی محض ایک مجرد صورت میں نہیں بلکہ بے شمار متنوع صورتوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس وقت تک روئے زمین پر حیوانات کی تقریباً دس لاکھ اور نباتات کی تقریباً دو لاکھ انواع کا پتہ چلا ہے۔ یہ لاکھوں انواع اپنی ساخت اور نوعی خصوصیات میں ایک دوسرے سے ایسا واضح اور قطعی امتیاز رکھتی ہیں اور قدیم ترین معلوم زمانے سے اپنی اپنی صورتِ نوعیہ کو اس طرح مسلسل برقرار رکھتی چلی آ رہی ہیں کہ ایک خدا کے تخلیقی منصوبے (Design) کے سوا زندگی کے اس عظیم تنوع کی کوئی اور معقول توجیہ کر دینا کسی ڈارون کے بس کی بات نہیں ہے آج تک کہیں بھی دو نوعوں کے درمیان کی کوئی ایک کڑی بھی نہیں مل سکی ہے جو ایک نوع کی ساخت اور خصوصیات کا ڈھانچہ توڑ کر نکل آئی ہو اور ابھی دوسری نوع کی ساخت اور خصوصیات تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ متحجرات (Fossils) کا پورا ریکارڈ اس کی نظیر سے خالی ہے اور موجودہ حیوانات میں بھی یہ خنثیٰ مشکل کہیں نہیں ملا ہے۔ اور ہر وہ افسانہ جو کسی مفقود کڑی کے بہم پہنچانے کا وقتاً فوقتاً سنا دیا جاتا ہے، تھوڑی مدت بعد حقائق اس کی ساری پھونک نکال دیتے ہیں۔ اس وقت تک یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل اٹل ہے کہ ایک صانع حکیم، ایک خالق البارئ المصور ہی نے زندگی کو یہ لاکھوں متنوع صورتیں عطا کی ہیں۔

یہ تو ہے ابتدائی تخلیق کا معاملہ۔ اب ذرا اعادۂ خلق پر غور کیجیے۔ خالق نے ہر نوع حیوانی، نباتی کی ساخت و ترکیب میں وہ حیرت انگیز نظام العمل (Mechanism) رکھ دیا ہے جو اس کے بے شمار افراد میں سے بے حد و حساب نسل ٹھیک اسی کی صورت نوعیہ اور مزاج و خصوصیات کے ساتھ نکالتا چلا جاتا ہے اور کبھی بھولے سے بھی ان کروڑہا کروڑ چھوٹے چھوٹے

کارخانوں میں یہ بھول چوک نہیں ہوتی کہ ایک نوع کا کوئی کارخانۂ تناسل کسی دوسرے نوع کا ایک نمونہ نکال کر پھینک دے۔ جدید علم تناسل (Genetics) کے مشاہدات اس معاملے میں حیرت انگیز حقائق پیش کرتے ہیں۔ ہر پودے میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اپنی نوع کا سلسلہ آگے کی نسلوں تک جاری رکھنے کا ایسا مکمل انتظام کرے جس سے آنے والی نسل اس کی نوع کی تمام امتیازی خصوصیات کی حامل ہو اور اس کا ہر فرد دوسری تمام انواع کے افراد سے اپنی صورتِ نوعیہ میں ممیز ہو۔ یہ بقائے نوع اور تناسل کا سامان ہر پودے کے ایک خلیے (Cell) کے ایک حصے میں ہوتا ہے جسے بمشکل انتہائی طاقت ور خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا انجینئر پوری صحت کے ساتھ پودے کے سارے نشو و نما کو حتماً اسی راستے پر ڈالتا ہے جو اس کی اپنی صورت نوعیہ کا راستہ ہے اسی کی بدولت گیہوں کے ایک دانہ سے آج تک جتنے پودے بھی دنیا میں کہیں پیدا ہوئے ہیں انہوں نے گیہوں ہی پیدا کیا ہے۔ کسی آب وہوا اور کسی ماحول میں یہ حادثہ کبھی رونما نہیں ہوا کہ دانۂ گندم کی نسل سے کوئی ایک ہی دانۂ جو پیدا ہو جاتا۔ ایسا ہی معاملہ حیوانات اور انسان کا بھی ہے کہ ان میں سے کسی کی تخلیق بھی بس ایک دفعہ ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ ناقابل تصور وسیع پیمانے پر طرف اعادۂ خلق کا ایک عظیم کارخانہ چل رہا ہے جو ہر نوع کے افراد سے پیہم اسی نوع کے بے شمار افراد وجود میں لاتا چلا جا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص توالد و تناسل کے اس خوردبینی تخم کو دیکھے جو تمام نوعی امتیازات اور موروثی خصوصیات کو اپنے ذرا سے وجود کے بھی محض ایک حصے میں لیے ہوئے ہوتا اور پھر اس انتہائی نازک اور پیچیدہ عضوی نظام اور بے انتہا لطیف و پرپیچ عملیات (Processes) کو دیکھے جن کی مدد سے ہر نوع کے ہر فرد کا تخم تناسل اسی نوع کا فرد وجود میں لاتا ہے، تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایسا نازک اور پیچیدہ نظام العمل کبھی خود بخود بن سکتا ہے اور پھر مختلف انواع کے اربوں ملین افراد میں آپ سے آپ ٹھیک چلتا بھی رہتا ہے یہ چیز نہ صرف اپنی ابتدا کے لیے ایک صانع حکیم چاہتی ہے بلکہ ہر آن اپنے درست طریقے پر چلتے رہنے کے لیے بھی ایک ناظم و مدبر اور ایک حیّ و قیوم کی طالب ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی ان کارخانوں کی نگرانی اور رہنمائی سے غافل نہ ہو۔

یہ حقائق ایک دہریے کے انکار خدا کی بھی اسی طرح جڑ کاٹ دیتے ہیں جس طرح ایک مشرک کے شرک کی۔ کون احمق یہ گمان کر سکتا ہے کہ خدائی کے اس کام میں کوئی فرشتہ یا جن یا نبی یا ولی ذرہ برابر بھی کوئی حصہ رکھتا ہے اور کون صاحبِ عقل آدمی تعصب سے پاک ہو کر یہ کہتا ہے کہ یہ سارا کارخانۂ خلق و اعادۂ خلق (Factory of creation & recreation) اس کمال حکمت و نظم کے ساتھ اتفاقاً شروع ہوا ہے اور آپ سے آپ چلا جا رہا ہے۔

رزق دینے کا معاملہ بھی اتنا سادہ نہیں ہے اس زمین پر لاکھوں انواع حیوانات اور لاکھوں ہی نباتات کی پائی جاتی ہیں، جن میں سے ہر ایک کے اربوں افراد موجود ہیں اور ہر ایک کی غذائی ضروریات الگ ہیں۔ خالق نے ان میں سے ہر نوع کی غذا کا سامان اس کثرت سے اور ہر ایک کی دسترس کے اس قدر قریب فراہم کیا ہے کہ کسی نوع کے افراد بھی یہاں غذا پانے سے محروم نہیں رہ جاتے۔ پھر اس انتظام میں زمین اور آسمان کی اتنی مختلف قوتیں مل جل کر کام کرتی ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ گرمی، روشنی، ہوا، پانی اور زمین کے مختلف الاقسام مادوں کے درمیان اگر ٹھیک تناسب کے ساتھ تعاون نہ ہو تو غذا کا ایک ذرہ بھی وجود میں نہیں آ سکتا۔

کون شخص تصور کر سکتا ہے کہ یہ حکیمانہ انتظام ایک مدبر کی تدابیر اور سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر اتفاقاً ہو سکتا تھا

پروفیسر ظہیر۔م۔قریشی *

قرآنی نظریہ علم

اس میں کوئی شک نہیں کہ توحید قرآن پاک کا کلیدی موضوع ہے مگر وحدۂ لاشریک پر یقین محکم کے لیے استدلالی تحقیقات پر مبنی جستجوئے علم کو دوسرا درجہ دیا گیا ہے، قرآن پاک کے *Content Analysis* سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے اسماء حسنیٰ قرآن پاک کے متن پر حاوی ہیں، "علم" اور اس کے مرکبات کم ازکم ۸۵۰ مرتبہ "عقل" اور اس کے مرکبات ۵۳ مرتبہ تذکرے میں آئے ہیں۔ قرآن پاک کے نزول کا اعلان" اقراء" کے لفظ سے ہوتا ہے کی پہلی قسم" وَالقَلَمِ وَما یَسطُرُون" ہے۔ حضورؐ سے اپنے علم میں اضافہ کرنے کی دعا کی تلقین کی گئی (وَقُل رَّبِّ زِدنِی عِلمًا) خود اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں عالم الغیب والشہادۃ، علام الغیوب اور علیم شامل ہیں۔

قرآن پاک میں یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ تخلیق کائنات کا ایک مقصد ہے (وماخلقنا السمٰوات والارض وما بینھما لاعبین) اور اس کی روح استدلالی اور تجربی تحقیقات (*Empirical Probing*) سے واضح ہوسکتی ہے قرآن پاک یہ اعلان کرتا ہے : جبکہ گذشتہ رسولوں اور ان کے پیغامات کے ثبوت کے طور پر معجزات کو بروئے کار لایا گیا اس دین کامل کی بنیاد معجزات کے بجائے بینات پر قائم ہے۔ اس میں یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ ہر وہ شخص جو صدق دلی داخلی علم کا خواہاں ہے، کائنات کی حقیقت اور اس کی تخلیق کے مقصد کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ کیوں کہ خالق کائنات کے مظاہر خارجی ماحول میں بکھرے ہوئے ہیں۔ سورہ الرحمٰن میں ۳۱ ایسے خارجی موضوعات درج ہیں جو فضلِ الٰہی کے بینات مطلقہ ہیں۔ قرآن پاک نے معروف مظاہر کا ذکر کرنے کے بعد ۱۳ مرتبہ "افلا تعقلون"، ۱۱ مرتبہ" ان کنتم تعلمون" اور ۶ مرتبہ" وانتم تعلمون" لکھا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اس مقصد کے حصول کے لیے تمام صلاحیتیں عطا کی ہیں، خلیفۃ اللہ علی الارض کی حیثیت سے وہ اشرف المخلوقات ہے۔ جس کو" اسماء کلھا" ودیعت کیا گیا ہے اور" البیان" سے نوازا گیا ہے، تاکہ وہ علم کی مدد سے نئی راہیں اجاگر کرسکے۔ "اسماء کلھا" اور" البیان" کے ذریعہ وہ اس کائنات کے علوم وفنون پر عبور حاصل کرسکتا ہے جس کو اولوالالباب کے لیے خالق مطلق نے ثبوت کے طور پر تسخیر کیا ہے

توحید کے تصور میں علم الوجود (*Ontology*) اور علم العلوم (*Epistemology*) کے لیے دو درس نتیجے پنہاں ہیں: عالم حقیقی اور عالم مجازی ایک ڈوری میں بندھے ہوئے ہیں۔ مادی دنیا کا روحانی دنیا سے رشتہ ایسا ہے کہ انسان کی دنیاوی زندگی

---

* پروفیسر سیاسیات، دہلی یونیورسٹی ساؤتھ کیمپس۔ ۱۸۷ ویشالی پتیمپورا، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۳۴

تہذیب الاخلاق علی گڑھ جولائی ۱۹۹۵ء

یب سراحیات قبل از پیدائش سے اور دوسراحیات بعد الممات سے ملتا ہے۔ اس تسلسل کی وجہ سے ہماری دنیاوی زندگی کی بہت اہمیت ہے۔ اگر ہم تسلسل کو فروگذاشت کر دیں تو ہماری دنیاوی زندگی بے معنیٰ اور لاحاصل ہو جائے گی۔

علم پوری کائنات ہے علم غیوب سے شہادت تک پھیلا ہوا ایک عکسی پردہ (Spectrum) ہے۔ اس میں انسانی فہم و فراست جہاں تک پہنچ سکتی ہے وہ شہادت ہے اور جو کچھ اس کی دسترس سے باہر ہے غیب ہے۔ مثلاً تخلیق کائنات کا علم و فن قادر مطلق کے دائرہ حکمت میں ہے اسی طرح ماورائی زندگی کی مکمل تفہیم انسانی جستجوئے علم کے دائرے سے باہر ہے زیادہ سے زیادہ اپنی روحانی صلاحیت سے وہ اس کا دنیاوی علامات پر مشتمل ایک خاکہ بنا سکتا ہے۔ دراصل، خود دنیاوی زندگی کی مکمل تصویر بھی انسانی ذہن کے حدود سے باہر ہے کیوں کہ الگ الگ عمل کس طرح یکجا ہوتے ہیں، مستقبل کی قطعی تصویر کیا ہو گی۔ اور اجمالی علوم ایسے نصب العین ہیں جن تک رسائی عبث ہے۔ کوئی شخص حتمی طور پر یہ نہیں جانتا کہ اس کے دوست، عزیز اور دشمن کیا کیا ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے ذہن میں کسی بھی صورتحال کی کوئی مکمل تصویر نہیں ابھر سکتی ———— تاہم تجریدی تحقیقات کے ذریعہ انسان نظام کائنات میں موجود ہم آہنگی کی مکمل تفہیم کی صلاحیت حاصل کر سکتا ہے۔ چاہے وہ اس طرح حقیقت کے حل تک پہنچنے سے قاصر رہے مگر بڑی حد تک وہ صحیح تصویر کھینچ لیتا ہے۔ اگر تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ نجات کی روحانی جستجو میں علم کی تجریدی تحقیقات مضمر ہے "حق" کا لفظ قرآنی نظریہ علم میں کلیدی اصطلاح ہے۔ یہ ایک مخروطی (Pentamerous) لفظ جس کے گوناگوں پہلو ہیں۔ بیک وقت اس کے مفہوم میں حقیقی اور مجازی سچائی، دینی اور دنیاوی حقائق اور حقوق و فرائض شامل ہیں "الحق" اللہ تبارک و تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں بھی ہے۔ دنیاوی انصاف کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ حقیقت روحانی اور مادی حقائق کا عماز ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد حقوق و فرائض کے اجمالی نظام کی بنیاد ہیں۔

مذکورہ بالا بیان اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ قرآنی نظریہ علم اصل میں عمل (Praxis) کی تلقین کرتا ہے ایک طرف وہ قادر مطلق اور اس کے بندوں کے درمیان حقوق اور فرائض کے رشتوں کو استوار کرتا ہے دوسری طرف انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض کا تعین کرتا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن پاک نے جہاں باہمی تعلقات کے لیے حق کو مشعل راہ بنانے کی تلقین کی وہاں خارجی صورتحال کی مجبوریوں کے سبب صبر کی راہ اختیار کرنے کی سفارش بھی کی ہے۔ اس پس منظر میں باعمل مومنوں کی امت تاریخ کو ایک زندہ حقیقت گردانتی ہے۔

قرآن پاک نے ہر فرد پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ مادی دنیا کے مظاہر پر لگاتار غور کرے تاکہ قادر مطلق کے بارے میں ان کی فہم و فراست میں تیقن بڑھ جائے۔ کلام اللہ کی حیثیت سے قرآن پاک کا پڑھنا، سمجھنا اور اس کو لائحہ عمل بنانا چاہیے، ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس کا مطالعہ کرے تاکہ اس کی آیات کو روزمرہ پنجوقتہ نمازیں پڑھے۔ جس طرح ایک مومن کی زندگی میں قرآن پاک کی حیثیت بنیادی ہے اور جس کا مطالعہ ضروری ہے اسی طرح حصول علم ہر فرزند توحید کی ذمہ داری ہے چاہے اس خاطر اس کو دور دراز حتیٰ کہ چین تک کا سفر کرنا پڑے، نظریاتی اعتبار سے ایک ایسے مسلمان کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو یکسر ناخواندہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ امت کی پہلی نسل پورے طور پر علم کی دولت سے آراستہ نہ تھی۔ حالانکہ اسلامی توسیع کے عمل نے اس صورت حال کو بدل دیا۔ تاہم علم و بیان کی خواہش دلوں کو برماتی رہی۔

ڈاکٹر آفتاب حسین اختر*

اسلام اور سماجی انصاف

سماجی انصاف یا سوشل جسٹس (Social Justice) کا مطلب سب کے لیے انصاف ہے۔ ذات یا نسل یا رنگ یا فرقہ یا عقیدہ کی بنا پر انصاف کرنے کے دوران کسی کے ساتھ کسی طرح کی کوئی تفریق نہ کرنا۔ انصاف پانا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اور ہر شخص کو انصاف دینا اور برابر کا انصاف دینا حکومتِ وقت کا بنیادی فرض۔ ہر شخص کے ساتھ انصاف کرنا اور برابر کا انصاف کرنا صرف حکومتِ وقت کا ہی فرض نہیں بلکہ ہر فرد کا بھی فرض۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد کا رویہ دوسرے فرد کے ساتھ اور ہر جماعت کا رویہ دوسرے جماعت کے ساتھ منصفانہ چاہیے۔ جو لوگ دوسروں کے ساتھ انصاف نہیں کرتے، ہو سکتا ہے کہ دنیا اور سماج کی عدالت ان کی گرفت کر سکے لیکن خداوند قدوس کی عدالت جو سب سے بڑی اور آخری عدالت ہے وہ اس کا فیصلہ ضرور کرے گی اور جس فرد نے بھی ناانصافی کی ہے اسے اس کی ناانصافی کے لیے سزا ملے گی۔

اسلام سے پہلے انسانی سماج میں اس قسم کا مساویانہ انصاف نظری اور عملی دونوں اعتبار سے لگ بھگ معدوم تھا۔ اسلام نے انسانی تاریخ میں مساویانہ انصاف کو قائم کیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف غیر مسلم مفکرین نے بھی کیا ہے۔

انسانی برابری اور مساوی انصاف کے حق میں ایک مکمل نظریہ (Ideology) درکار ہے۔ نیز نظریہ کو لازمی طور پر حقیقی بھی ہونا چاہیے۔ اسلام نے اس سلسلے میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں دونوں صفات پائی جاتی ہیں۔

زمانہ قدیم سے سماج کے اندر اونچ نیچ کے نظریات پائے جاتے رہے ہیں۔ تقریباً ہر دور میں سماجی ناانصافی کا عمل جاری رہا ہے۔ تاریخ کے صفحات دور قدیم کی سماجی ناانصافی سے بھرے پڑے ہیں۔

قدیم یونان (Greece) مفکرین اور مصلحین کی پیدائش کے لیے بہت مشہور رہے ہے۔ مگر قدیم یونان کا مشہور فلسفی ارسطو (Aristotle) (افلاطون کا شاگرد) جو کئی علوم کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے، اس نے انسانی برابری کے اصول سے انکار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ لوگ پیدائشی طور پر غلام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گرچہ بعد کے مفکرین نے اس خیال کی مخالفت کی تاہم یونان میں غلامی کا سلسلہ رائج رہا۔ قدیم یونان میں دو طرح کے لوگ

* ایم۔اے۔ اے ہائی اسکول، پٹنہ سیٹی۔ ۸۰۰۰۰۸

کرتے تھے۔ ایک طبقہ شہریوں (Citizens) کا تھا جنہیں ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ دوسرا طبقہ غلاموں کا تھا جو بہت سارے حقوق سے محروم تھا۔ جن کے ووٹ دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

روم (Rome) کا جابرانہ نظام بھی غلامی پر ہی موقوف تھا۔ یوں فتوحات اور تعمیرات کی بنا پر رومی تہذیب دنیا کی اہم تہذیبوں میں شمار کی جاتی ہے لیکن ان فتوحات اور تعمیرات کے پیچھے غلاموں کی پسپائی تھی۔ رومن بادشاہ تو غلاموں کو جانوروں کی طرح لڑا کر تماشہ دیکھا کرتے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ روم میں بھی انسانی برابری کا تصور مفقود تھا۔

قدیم ہندوستان میں بھی ویدک تہذیب (Vedic Civilization) انسانی برابری کے تصور سے خالی ہے منو سمرتی (Manu Smriti) کے مطابق سماجی طبقوں کی تقسیم، کام کے بڑے اور چھوٹے ہونے کے اعتبار سے کی گئی ہے چھوٹے طبقے کے لوگ جن کی تعداد کافی بڑی رہی ہے۔ ہمیشہ بنیادی حقوق سے محروم رکھے گئے۔ ظاہر ہے کہ جس سماج کی بنیاد ذاتوں پر ہو وہاں برابری کے تصور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یورپ کے متمدن ممالک نے افریقہ کے سیاہ فام لوگوں کو نسلی طور پر کمتر سمجھا۔ وہ افریقہ سے سیاہ فام لوگوں کو قید کر کے لے جاتے اور انہیں یورپ اور امریکہ کے بازاروں میں فروخت کرتے۔ یورپ میں آج بھی نسلی امتیاز قائم ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ اور انگلینڈ میں آج بھی وہ لوگ جو کہ گورے چمڑے والے نہیں ہیں، حقارت کی نظر سے مزور دیکھے جاتے ہیں۔ اور انہیں برابری کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

نسلی بادشاہت کے نظام میں شاہی خاندان والوں نے اپنے آپ کو آقا سمجھ لیا اور دوسروں کو رعایا۔ ان کا خیال تھا کہ دوسروں پر انہیں پیدائشی فضیلت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے تئیں خدا کا نمائندہ ہونے کا دعویٰ کیا اور دوسروں کو اپنی اطاعت کا درس دیتے رہے۔ قدیم مصر (Ancient Egypt) کی تاریخ آج بھی اس کی شاہد ہے اسی طرح دولت مند لوگوں نے اپنے آپ کو حقوق یافتہ طبقہ اور غریب لوگوں کو محروم طبقہ سمجھ لیا۔ جس شخص کے پاس دولت آگئی (خواہ کسی طرح آئی ہو) گویا یہ سمجھا جانے لگا کہ خدا کی اس پر خاص رحمت ہے۔ غربا کے سلسلے میں یہ رائے قرار پائی کہ ان کی محرومیت ان کے کردار کی بنا پر ہے۔ ایسے تصورات کی گنجائش اسلام کے اندر قطعی طور پر نہیں ہے۔

میکاویلی (Machiavelli) پریٹو (Pareto) نیٹشے (Nietzsche) اور ہٹلر (Hitler) کے نظریے کے مطابق انسان انسان برابر نہیں ہے۔ ہٹلر کا قول تھا کہ جرمن قوم آریائی نسل سے ہے اس لیے اسی کا حق ہے کہ دنیا پر حکومت کرے۔ مسولینی کا فاسسٹ (Fascist) نظریہ بھی انسانی برابری کی نفی کرتا ہے۔

اسلام آیا تو اس نے مکمل طور پر اس قسم کے تمام نظریات کو ختم کیا اور ان ستون کو گرا دیا جن پر ایسے نظریوں کی عمارت قائم تھی۔ اسلام نے مسلسل مختلف طریقوں سے یہ تصور پیش کیا کہ ظاہری تفریقات کے باوجود تمام انسان برابر ہیں۔ سب کو یکساں طور پر عزت اور انصاف کا حق حاصل ہے۔ کوئی انسان نہ کسی سے برتر ہے اور نہ کوئی انسان کسی سے کمتر۔

قرآن کریم میں اعلان کیا گیا ہے:۔

"اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

قرآن پاک میں انسانوں میں رنگ و نسل کا جو فرق ہے۔ وہ تعارف کے لیے ہے، امتیاز کے لیے نہیں۔ انسان اپنی اصل کے اعتبار سے سب کے سب ایک ہیں۔ ان میں امتیاز کی بنیاد اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ ان کا کردار (*Character*) ہے۔ قابل عزت وہ ہے جو خدا پرست ہے۔ جو خدا اور بندوں کے حقوق کو پہچانتا ہے۔ اور ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں فرزندانِ رعونت، برادرانِ عصبیت اور غرور و جاہلیت قابل احترام نہیں ہیں۔

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں خطبہ دیا اس وقت آپؐ نے جو باتیں فرمائیں ان میں سے ایک بات یہ تھی:

"اے لوگو! سن لو بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ سن لو کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں، اور کسی کالے کو کسی سرخ پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی سرخ کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ جو کچھ فضیلت ہے وہ تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔"

اس اعلان کے مطابق آپؐ نے تمام لوگوں کو بتا دیا کہ تمام انسان ایک ہیں۔ تمام انسان آپس میں بھائی بہن ہیں۔ ان میں ظاہری اعتبار سے فرق ہو سکتا ہے مگر عزت اور احترام اور قانونی انصاف کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ ایک اور دوسرے میں فرق کا احساس سماجی ناانصافی کو جنم دیتا ہے۔ جب ایک اور دوسرے کا فرق مٹ جائے گا تو اس کے بعد سماجی ناانصافی کا بھی لازمی طور پر خاتمہ ہو جائے گا۔

اسلام نے سماجی ناانصافی کو فرد اور فرد کے بیچ کا معاملہ نہ رہنے دیا۔ بلکہ اسے فرد اور خدا کے بیچ کا معاملہ بنا دیا۔ اس طرح اسلام سماجی ناانصافی کے خلاف ایک عظیم محرک ہے۔

برسوں قبل ایمنسٹی انٹرنیشنل (*Amnesty International*) کا ادارہ بغرض حفاظت حقوق انسانی بنا تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر لندن (*London*) میں تھا۔ اس ادارہ کے اغراض و مقاصد آج بھی قائم ہیں مگر انسانوں کے ہاتھوں انسان کی پامالی کو روکا نہ جا سکا۔ دوسری جنگ عظیم کی بے پناہ تباہ کاریوں کے بعد ستمبر ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ (UNO) وجود میں آئی لیکن ویت نام کی جنگ برسوں چلتی رہی۔ عراق اور ایران برسوں آپس میں جھگڑتے رہے۔ عراق پر امریکہ کا تباہ کن حملہ جاری رہا۔ اور آج افغانستان میں کسی طرح خانہ جنگی جاری ہے! ادارے موجود ہیں لیکن دنیا میں آج بھی امن اور سلامتی کی فضا قائم نہ کی جا سکی ہے۔

آخر ایسا کیوں؟ ایسا اس لیے کہ امن اور انصاف دنیا میں صرف اپیلوں اور اخباری بیانات سے قائم نہیں کیے جا سکتے۔ اس کے لیے ایک مستحکم نظریہ (*Ideology*) کی ضرورت ہے۔ اسلام وہ آئیڈیالوجی پیش کرتا ہے۔ سوشل جسٹس کے معاملہ میں اسلام کی بہت بڑی دین یہ ہے کہ اس نے مساویانہ انصاف کا ایک کامل

نونہ قائم کیا۔ خاندانی اور سماجی زندگی سے لے کر حکومت اور اقتدار تک ہر مرحلہ پر اس اصول کو عملاً برت کر دکھایا کہ تمام انسان برابر ہیں۔

زینب بنت جحش پیغمبر اسلام کی پھوپھی کی لڑکی تھیں وہ قریش کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ قدیم زمانہ میں کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی کا نکاح کسی غلام کے ساتھ ناقابلِ تصور تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو توڑنے کے لیے زینب کا نکاح اپنے آزاد غلام زید بن حارث کے ساتھ کیا۔ قدیم تاریخ میں یہ ایک انوکھا اور انقلابی واقعہ تھا۔

کعبہ ایک مقدس عبادت خانہ تھا۔ اس کی چھت پر صرف نامور قبیلہ کے افراد ہی چڑھ سکتے تھے فتح مکہ کے بعد پیغمبر اسلام نے اس رسم کو توڑا۔ رسول کریم ص نے حبشی غلام بلال بن رباح کو حکم دیا کہ وہ کعبہ کی چھت پر چڑھیں اور اس کے اوپر کھڑے ہو کر اذان دیں۔

حضرت علیؓ بن ابی طالب کی ایک زرہ گم ہو گئی۔ یہ کوفہ کے ایک نصرانی کے یہاں برآمد ہوئی۔ یہ معاملہ قاضئ وقت شریح بن الحارث کی عدالت میں پیش ہوا۔ حضرت علیؓ عام شہریوں کی طرح ان کی عدالت میں پیش ہوئے۔ گواہی میں حضرت علیؓ نے اپنے بیٹے کو پیش کیا۔ قاضی نے اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں خلیفۂ وقت عدالت سے اپنا مقدمہ ہار گئے۔ نصرانی اس بات سے بہت متاثر ہوا کہ اسلامی عدالت میں ایسا انصاف ہوتا ہے اس نے خود سے اقرار کیا کہ علی بن ابی طالب سچے ہیں اور یہ زرہ سچ مچ انہیں کی ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ مدینہ سے بغرض معاہدہ فلسطین روانہ ہوئے۔ ان کے جسم پر ایک معمولی کپڑا تھا اور ایک خادم اور ایک اونٹ۔ مسافرت طے کرتے وقت کبھی اونٹ کی نکیل غلام کے ہاتھ میں ہوتی اور حضرت عمرؓ اونٹ پر، تو کبھی غلام اونٹ پر ہوتا اور اونٹ کی نکیل حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں۔ غلام کو برابری کا درجہ دینا اسلام کا ہی عطیہ ہے۔

ہم مسلمان اسلامی اصولوں کو اپنی زندگی میں برتیں یا نہ برتیں، اپنے اندر اسلامی کردار پیدا کریں یا نہ کریں لیکن اسلام نے اپنے فکری انقلابات اور عملی نمونوں کے ذریعہ جو تاریخ قائم کی ہے وہ عالمی پیمانے پر اپنی مثال آپ ہے

ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی*

علاج و معالجہ اور واہمہ پرستی

یورپ کا ایک مشہور مؤرخ ڈگلز گتھری (Douglas Guthrie) قدیم دور کے توہمات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے ظاہر کرتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں عیسائیوں نے ابتدا ہی میں نہ تو علم سے گہری دل چسپی کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی فن طب کو ابھرنے دیا ہے کہ فن طب میں مسلمانوں کا اثر کلیسا سے کہیں زیادہ تھا کیوں کہ علم کے لیے مسلمان جتنا فراخدل اور حمایتی تھا عیسائی نا متحمل اور مخالف۔ پورے یورپ میں گنڈے اور تعویذوں کے ذریعہ سے علاج و معالجہ کی مقبولیت کو اس ضروری اور لازمی قرار دیا گیا کہ بقول گتھری، کٹر عیسائی علاج کے لیے کسی دوسرے طریقہ کی اجازت نہ دیتے تھے۔ یونان حکما کو ملحد اور مرتد بتایا گیا جنہوں نے عقلیت کی بنیاد پر طبی علم کو فروغ دینے کے لیے زبردست تصنیفات مرتب کی تھیں خلاف بالعموم اور طبی علم کے خلاف بالخصوص نفرت اس حد تک بڑھی کہ قدامت پسند عیسائیوں نے ۳۹۱ عیسوی اسکندریہ کی مشہور لائبریری کو آگ لگا دی جو علم کا اس زمانہ میں ایک بیش قیمت خزانہ سمجھا جاتا تھا اور جہاں جالینوس (Galen) اور بقراط (Hippocrates) کی بیشتر طبی تصانیف موجود تھیں۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے گتھری ہے کہ "یہ تھا وہ صدمہ جو عیسائیوں نے ابتدائی دور میں طبی سائنس کو پہنچایا ہے۔ یہ تھا کلیسا کا نقصان دہ اثر۔ اس کے اسلام نے اپنے ظہور کے فوراً بعد ہی نہ صرف یہ کہ یونانی طبی علم کی قدر کی بلکہ اسے موزوں، موثر اور ضروری اضافہ فروغ دیا جس سے ساری دنیا فیض یاب ہوئی" اور علاج کے سلسلہ میں توہمات نے مقبولیت کھو دی۔ مسلمانوں طبی علم سے دل چسپی کے وجود کا جائزہ لیتے ہوئے گتھری نے تحریر کیا ہے کہ اس اسلامی انداز فکر کی بنیاد پر یقیناً پیغمبر اسلام حدیث تھی جس کا انگریزی ترجمہ گتھری نے اس طرح کیا ہے:- ...servant of God, use medicine ...use God hath not created a pain without a remedy.

گتھری نے اس حدیث کا ماخذ نہیں بتایا ہے لیکن صاف طور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا اشارہ ترمذی وہ حدیث ہے جو حضرت اسامہ بن شریکؓ سے مروی ہے اور جس میں فرمایا گیا ہے:-

"ہاں اللہ کے بندو۔ علاج کراؤ اس لیے کہ اللہ نے جو بھی بیماری پیدا کی ہے اس کے لیے شفاء اور دوا بھی

مندرجہ بالا حدیث کے علاوہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی وہ حدیث بھی شاید گتھری کے علم میں ہو جس میں ارشاد ہے:-

"ما انزل اللہ من داء الا انزل لہ شفاء"

(خدا نے ایسی کوئی بیماری نہیں پیدا کی جس کی شفاء نہ پیدا کی ہو۔ راوی حضرت ابوہریرہؓ)

---

* اسسٹنٹ ڈائرکٹر، نیشنل ریسرچ انسٹیٹیوٹ، لکھنؤ۔

علاج کی بابت مسند احمد میں ایک انصاری صحابیؓ سے روایت حدیث بیان ہوئی ہے وہ کچھ اس طرح ہے :-

"سبحان اللہ۔ اللہ نے زمین میں کوئی مرض نہیں اتارا مگر یہ کہ اس کے لیے شفاء بھی رکھی ہے ۔"

اسی موضوع پر سنن ابوداؤد میں بھی ایک حدیث درج ہے جو حضرت ابو درداءؓ سے مروی ہے اور جس کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

" بے شک اللہ تعالیٰ نے بیماری اور دوا دونوں چیزیں اتاری ہیں۔ ہر بیماری کی دوا رکھی ہے لہٰذا تم علاج کراؤ"

صحیح مسلم کی وہ حدیث جو کتاب السلام میں شامل ہے نہایت اہم ہے کیونکہ اس میں مسلمانوں کو دوا اور دعا کا مفہوم سمجھایا گیا ہے اور اس طرح توہمات سے دور رکھا گیا۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا :-

"لکل داء دواء فاذا اصیب دواء الداء برأ باذن اللّٰہ"

جس کا ترجمہ ایک عالم نے اس طرح کیا ہے :-

"ہر مرض کی دوا ہے۔ جب دوا لگ جاتی ہے تو اللہ کے حکم سے شفاء ہوتی ہے"۔

اسی حدیث کا ترجمہ ایک دوسرے عالم نے یوں کیا ہے :-

"جب دوائی کے اثرات بیماری کی ماہیت سے مطابقت رکھیں تو اس وقت اللہ کے حکم سے شفاء ہوتی ہے"۔

مندرجہ بالا احادیث کے علاوہ علاج و معالجہ کے سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو طبی علوم کی طرف متوجہ کیا اور طب کو واہمہ سے پاک کر دیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے طبی علوم کو اس بلندی پر پہنچا دیا کہ طب نے ایک زبردست اور مکمل سائنس کی صورت اختیار کر لی۔ اسلامی دنیا نے نہ جانے کتنے جید عالم پیدا کیے جنہوں نے طب کو ایسا علمی جامہ دیا جس کی شکل جادو، ٹونا، اور توہم سے بالکل جدا تھی۔ زکریہ رازی، بوعلی سینا، الکندی، ابوالقاسم زہراوی ابن زہر وغیرہ طبیبوں نے اپنی دھاک پورے یورپ میں اس طرح جمالی کہ مغربی سائنسداں ان کو باوائے طب میں شمار کرنے لگے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ ایک ہزار سال تک دنیائے طب پر حکومت کرنے کے بعد مسلمان علم کی راہ سے بھٹک کر خود ہی توہمات کا شکار ہونے لگا اور کسی حد تک علاج میں ان فرسودہ خیالات کو جگہ دینے لگا جن سے اس نے ساتویں صدی میں پیچھا چھڑا لیا تھا۔ اب بساط کچھ الٹ سی گئی تھی۔ مغرب کی قوموں نے بالعموم اور عیسائیوں نے بالخصوص طب کو واہمہ کی گرفت سے نکال لیا اور اسلامی طب بنام یونانی طب کی روشنی میں نئے طریقوں سے علاج و معالجہ میں اتنی حیرت انگیز ترقی کی کہ جس کی افادیت کو ساری دنیا نے تسلیم کیا۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد مغرب کی قوموں نے اسلامی علوم کو اپنا کر طب پر کلیسا کے اثر کو نقصان دہ ہونے کے بجائے حقیقت پسندانہ بنا دیا۔ اب کلیسا کے تحت ہزاروں عیسائیوں نے نئے سائنسی طریقوں سے کمزوروں ناداروں اور مفلسوں کا علاج کرنا اپنا دینی اور ملی فریضہ سمجھا۔ نہ جانے کتنے عیسائیوں نے اس خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ آج کی دنیا میں مغرب کے اس رول کی اہمیت کو تسلیم نہ کرنا سخت ناانصافی اور ہٹ دھرمی ہو گی۔

آیئے اسلام سے قبل کے عربی و غیر عربی توہمات کا جائزہ لیں جو ایک عرصہ تک علاج و معالجہ کے لیے دوا سے ضروری تصور کیے جاتے تھے اور جن کے مضرت رساں اثرات سے چھٹکارا دلانے میں اسلامی دنیا کا نہایت مثبت رول رہا ہے۔

ایک یوروپین مؤرخ نے بہت صحیح لکھا ہے کہ کسی قوم یا علاقہ کی حالت اور فکری صلاحیتوں کا اندازہ ان کی سیاسیات

یا دینیات سے اتنا نہیں لگایا جا سکتا ہے جتنا کہ ان کے توہمات سے کیوں کہ مذہب اور سیاست وہ علوم ہیں جن کو عوام دینی رہنماؤں اور سیاست دانوں سے حاصل کرتے ہیں جبکہ توہمات خود ان کے اپنے دل ودماغ کی اختراع ہوتے ہیں لہذا ان کے انداز فکر کی نشاندہی کرتے ہیں۔

قدیم دور میں لوگ مرض کو قدرتی عمل نہیں مانتے تھے بلکہ یقین رکھتے تھے کہ کسی کا عارضہ میں مبتلا ہونا یا تو خدا کی ناراضگی کے سبب ہوتا ہے یا پھر کسی مردہ انسان کی روح کی خفگی کا نتیجہ۔ اور اگر ان دو میں سے کوئی بھی وجہ نہ ہو تو پھر یقینی طور دشمن کی جادوگری۔ چنانچہ امراض کا علاج بھی خدا سے یا مردہ کی روح سے معافی مانگ کر کیا جاتا۔ اور اگر معلوم ہو جائے کہ مرض کا تعلق خدا ت اور کسی روح سے نہیں ہے تو جادو کے ذریعہ ہی جادو کی کاٹ کر کے کیا جاتا۔ سانپ کا کاٹنا بھی کوئی قدرتی عمل نہ تھا بلکہ یہ کسی بدروح کا سانپ بن کر ڈسنا اور بدلہ لینا تھا۔ اس بدلہ کے تصور سے لوگوں کو خوب ڈرایا جاتا۔

جب کوئی شخص کسی بھیانک اور مہلک روگ میں بنتلا ہو جاتا تو یہ سمجھا جاتا کہ مریض کی اصل روح اس کے جسم سے باہر آکر بھٹک رہی ہے اور اس کی جگہ کسی خبیث روح نے لے لی ہے۔ اب خبیث روح کو نکالنے اور اصل روح کو واپس بلانے کے بڑے جتن کیے جاتے۔ اس کام کے لیے بہت پہنچے ہوئے اور تجربہ کار عاملوں کی ضرورت پڑتی ہے جو اکثر دور دراز علاقوں سے بڑی منت وسماجت کر کے بلائے جاتے۔ یہ عامل بڑے کراماتی ہوا کرتے تھے۔ مریض کو سامنے لٹا کر یہ زوردار آوازیں کچھ پڑھتے جنہیں عام آدمی نہ سمجھ سکتا کیوں کہ یہ زبان یا الفاظ روحوں کو مخاطب کر کے استعمال ہوا کرتے اور صرف ان ہی کے سمجھ میں آسکتے تھے۔ پڑھتے پڑھتے اور پھر کچھ کرتب کے داؤں دے کر یہ عامل وجد (Trance) میں آجاتے اور بے ہوش ہو جاتے۔ اب ان کی اپنی روح ان کے جسم سے نکل کر مریض کی روح کو ڈھونڈتی پھرتی۔ کافی تگ ودو کے بعد جب مریض کی بھٹکتی روح عامل کی طاقتور روح کو مل جاتی تو اسے ایک کنکر میں قید کر کے عامل ہوش میں آجاتا۔ اب اب یہ کنکر مریض کے جسم پر زور سے رگڑا جاتا حتی کہ روح کنکر سے کھال کے راستہ جسم میں داخل ہونے پر مجبور ہو جاتی۔

اب مریض کے جسم میں ایک طرف تو اس کی روح ہے اور دوسری طرف خبیث روح بھی ہے۔ پوری طرح صحتیاب کرنے کے لیے عامل کا عام طور سے مشورہ ہوتا کہ خبیث روح کا جسم سے باہر نکالنا نہایت ضروری ہے لیکن یہ کام عامل کا نہ تھا کیونکہ ایسا کرنے کے لیے عمل جراحی ضروری تھا جو بڑا تکلیف دہ اور زیادہ تر جان لیوا ہوتا تھا۔ اس کام کے لیے مریض کی کھوپڑی میں ایک سوراخ کیا جاتا تاکہ خبیث روح پریشان اور کسی حد تک شرمندہ ہو کر باہر نکل آئے۔ کبھی یہ سوراخ ایک سے زیادہ بھی ہوتے تھے۔ اصل میں سوراخ کی تعداد اس کی شناخت اور رقبہ کا طے کرنا اس بات پر منحصر تھا کہ عامل اس روح کو کتنا خبیث اور تندرست سمجھتا تھا۔ یورپ، امریکہ اور افریقہ کی کھدائیوں میں ایسی بے شمار کھوپڑیاں ملی ہیں جن پر چھوٹے بڑے گول اور چوکور سوراخ کیے گئے تھے۔ ان کھوپڑیوں کی جانچ سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ سوراخ کرنے کے عمل (Taphening) کے فوراً بعد ہی مریض فوت ہو جایا کرتے تھے لیکن اطمینان یہ ہوتا تھا کہ مرنے سے قبل اس کا جسم خبیث روح سے تو پاک ہو ہی گیا۔ کچھ کھوپڑیاں ایسی بھی ملی ہیں جن کی جانچ سے ظاہر ہوا ہے کہ بعض مریض عمل جراحی کے بعد بھی زندہ رہتے تھے۔

توہماتی علاج میں صحیح تشخیص پر بہت زور دیا جاتا کیوں مرض کی نوعیت معلوم کر کے ہی علاج تجویز ہوتا۔ بعض متعدی امراض کا علاج کچھ اس طرح تھا کہ مریض کو کسی جرم کی پاداش میں پھانسی دی گئی لاش کے پاس بٹھا دیتے اور پھر تھوڑی دیر بعد مریض اور مردہ میں مصافحہ کرواتے۔ ایسا کرنے میں مصلحت (توہم) یہ تھی کہ مردہ تو اپنی جان سے گیا ہی ہے اب چلتے

(کمانڈر) ایس۔این۔اے فردوسی *

بازگشت

(گذشتہ سے پیوستہ)

اکتوبر کا مہینہ ختم ہونے والا تھا۔ تعلیمی سال کافی پیچھے ہو چکا تھا، جس کا احساس سب کو تھا۔ طلبا و اساتذہ سب کے سب اب تعلیمی سرگرمیوں میں منہمک ہونا چاہتے تھے۔ کلاسیں زور شور سے شروع ہو گئیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اتوار اور چھٹیوں کے علاوہ روزانہ ہی صبح کلاس لگنے سے پہلے سائرن بجتا تھا۔ یہ اس بات کی اطلاع تھی کہ اب کلاس لگنے میں صرف ۱۵ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ موسم کے لحاظ سے وقت میں کچھ تھوڑی بہت تبدیلی ہو جاتی تھی۔ البتہ پورے سال رات کو ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے سائرن بڑی پابندی سے بجا کرتا تھا۔ رات کا یہ سائرن اس بات کی اطلاع دیتا تھا کہ ہوسٹل کا گیٹ بند ہونے میں اب صرف آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے۔ اس لیے کہ ٹھیک ۹ بجے تمام ہوسٹلوں کے گیٹ بند کر دیئے جاتے تھے جس کے بعد آنے والا دس بجے تک داخلے کے وقت گیٹ پر رکھے رجسٹر میں اپنا نام درج کرتا تھا۔ یہ رجسٹر روزانہ سینئر ہاؤس اور پھر وارڈن کے سامنے پیش ہوتا۔ اس میں سے اگر کچھ لوگ عادی 'مجرم' ہوتے تو اُن کی پیشی وارڈن کے سامنے ہوتی۔ دس بجے کے بعد صرف وہی لوگ داخل ہو سکتے تھے جن کے پاس وارڈن کا جاری کردہ اجازت نامہ ہوتا۔ یہ دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک تو عارضی یعنی اُن لوگوں کے لیے جو کسی عارضی کام کے سلسلے میں دس بجے کے بعد ہوسٹل سے باہر جانا چاہتے تھے۔ مثلاً کسی کو اسٹیشن جانا ہوتا یا پھر اسی قسم کے کسی اور کام کے لیے۔ ایسے طلبا کی چیکنگ اسٹیشن پر بھی وہاں ڈیوٹی پر موجود پراکٹوریل مانیٹر کرتے۔ اگر وارڈن کا جاری کردہ اجازت نامہ اُن کے پاس نہ ہوتا تو اُن کی رپورٹ پراکٹر کے ذریعے متعلقہ وارڈن کو کی جاتی۔ جس پر اگر معقول وجہ نہ بتائی جاتی تو سزا بھی ملتی (عام طور پر یہ فائن ہی ہوتا تھا)۔ کوئی شخص غلط بیانی سے اپنی غلط پہچان چھپا نہیں سکتا تھا۔ اس لیے کہ ہر طالب علم کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنے پاس اپنا شناختی کارڈ ہر وقت رکھے اور مانگنے پر دکھائے۔ اگر کارڈ نہ ہو اور پاس بھی نہ ہو تو یہ دوہرا جرم تصور کیا جاتا تھا۔

دوسرا پاس مستقل نوعیت کا ہوتا تھا۔ یہ عام طور پر ایم۔اے، ایم۔ایس سی یا ریسرچ کے طلبا کے لیے ہوتا تھا جو رات گئے تک اپنی لیب میں یا سیمینار لائبریری میں کام کرتے اور پھر لوٹتے۔ سینما طلبا یا تو اتوار کی میٹنی شو میں دیکھتے یا پھر فرسٹ شو میں۔ سیکنڈ شو کی اجازت کسی بھی صورت میں نہ تھی۔ ہر سینما ہال پر پراکٹوریل مانیٹر ہوتے جو چیک کرتے۔ اس وقت تک مولانا آزاد لائبریری کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ مرکزی لائبریری کی حیثیت لٹن لائبریری کو حاصل تھی جو سرسید ہال میں اسٹریچی ہال سے ملحق تھی۔

---

* سابق افسر رابطۂ عامہ، وایڈیٹر مسلم یونیورسٹی گزٹ۔ ۱۱۰/۴، دودھ پور، سول لائنز، علی گڑھ۔

ہوجائے گا۔ چنانچہ حاکم وقت نے "اپنے خدا" سے دعا کی کہ ایس کلے پیس کو قتل کر دیا جائے۔ دعا قبول ہوئی اور وہ ہلاک کر دیا گیا۔ اس واقعہ کا علم عوام کو ہوا تو انہیں شدید صدمہ پہنچا۔ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنی حاجتوں کو پورا کروانے کے لیے ایس کلے پیس کی قبر سے رجوع کریں اب کیا تھا دور دور سے لوگ جوق در جوق اس کی قبر پر حاضری دینے لگے آہستہ آہستہ کسی بھی دعا کی مقبولیت کے لیے ضروری ہو گیا کہ حاجت مند قبر کے قریب دعا کرتے کرتے سو جائے تاکہ رات میں کلے پیس اس کے خواب میں آکر درد کا درماں بنے۔ اکثر بیمار شدہ لوگوں کے خواب میں ایس کلے پیس آتا۔ نبض دیکھ کر مرض کی تشخیص کرتا اور پھر دوا بھی دیتا۔ اور اگر ضرورت پڑتی تو آپریشن تک کر دیتا۔ اس طرح صبح کو جب روگی اٹھتا تو بھلا چنگا ہوتا۔ اور خوشی خوشی اپنی منزل کو روانہ ہو جاتا۔ ایک دل چسپ واقعہ یہ بھی مشہور ہے جس کا تفصیلی ذکر یونانی ادب میں ملتا ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص جو شدید سر کے درد میں مبتلا تھا۔ حسب دستور ایس کلے پیس کے مزار پر آکر دعا گو ہوا اور آرام کی نیند سو گیا۔ رات میں خواب میں ایس کلے پیس جلوہ گر ہوا۔ مرض کا حال پوچھا اور درد سے نجات پانے کے لیے تجویز کیا کہ وہ بڑے بڑے پہلوانوں سے کشتی لڑے۔ مریض نے اس تجویز پر قدرے فکر کا اظہار کیا کیوں کہ وہ فن پہلوانی سے واقف نہ تھا۔ اس کے علاوہ نحیف اور کمزور بھی تھا۔ ایس کلے پیس نے اس عذر کو بے معنی بتا کر مریض کو خواب ہی میں پہلوانی کے گر سکھلا دیے۔ درد سے بے حال وہ شخص صبح کو اٹھ کر ایک اکھاڑے میں گیا۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے وہاں موجود سارے پہلوانوں کو چت کر دیا اور درد سے بھی نجات پا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص بعد میں ملک یونان کا مشہور ترین پہلوان بن گیا۔

قبروں سے توقعات کا سلسلہ یونان تک محدود نہ تھا بلکہ یہ چلن ان سارے علاقوں میں تھا جہاں رومیوں کا اقتدار تھا۔ اور جہاں بعد میں بازنطینی حکومت کرنے لگے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رومن اور دوسری صاحب اقتدار قومیں عیسائی تو ہو گئیں لیکن قبر پرستی اور شخص پرستی کو نہ چھوڑ سکیں۔ چنانچہ بیت المقدس، مصر، لبنان، شام اور یورپ کے مختلف مقامات پر لاتعداد ایسے مراکز قائم ہو گئے جہاں گذرے ہوئے بزرگان دین کے نام پر دعائیں مانگی جاتیں اور اس بات کی تشہیر کی جاتی کہ عیسائیوں کے لیے طبی علاج دور جاہلیت اور الحاد کی دین ہے لہٰذا اس سے پرہیز کیا جائے۔ جالینوس کو زندیق کہا جاتا اور یونانی علم کا مذاق اڑایا جاتا۔ چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیوں میں ایک ایسا طبقہ ابھرا جس نے غیر علمی اندازِ فکر کو غیر عیسائیت سے تعبیر کیا اس طبقہ کی قیادت نسطوریس (Nestorius) نامی ایک شخص نے کی لہٰذا اس کے ماننے والے بعد میں نسطورین کہلائے قدامت پسند عیسائیوں نے نسطورین کے خلاف زبردست محاذ قائم کر دیا۔ لہٰذا ان لوگوں کو بیت المقدس، شام و لبنان چھوڑ کر ملک فارس کے علاقہ نیشاپور وغیرہ میں پناہ لینی پڑی مسلمانوں نے جب ساتویں صدی میں فارس فتح کیا تو نسطورین نے عام طور سے ان کا استقبال کیا اور بعد ازاں اسلامی سائنس اور طب کے فروغ میں مسلمانوں کو مکمل تعاون دیا۔ حنین بن اسحاق اور جبریل بن بختیشوع نسطوری جید عالم اور طبیب گذرے ہیں۔ جنہوں نے عباسی دور میں بڑی شہرت حاصل کی اور جنہوں نے یونانی علوم کے عربی تراجم بڑی خوبی سے کیے۔

یورپ کے متعدد مورخین نے جن میں ای۔ بی کرم بھار (E.B. Krumbhaar)، ڈگلز گتھری (Douglas Guthrie) ای وی براؤن (E.V. Brown) اور ڈونالڈ کیمبل (Donald Cambell) شامل ہیں۔ یورپ اور بازنطین کے

علاقوں میں شخص پرستی اور قبر پرستی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ان بزرگان دین کے نام دیے ہیں جو اپنی زندگی میں تو مشہور ہوئے ہی لیکن موت کے بعد کہیں زیادہ شہرت پا گئے۔ کیوں کہ ان کے ماننے والے اور مریدوں نے ان کو الگ الگ امراض کی شفا کے لیے اپنی دعاؤں کا مخاطب بنا لیا۔ مثلاً پاگل پن کے علاج کے لیے لوگ سینٹ ڈم فنا (St. Dymphna) کے مزار پر یا ان کے نام کی کلیسا کا رخ کرتے آنکھ کی بیماریوں میں سینٹ ٹرائی ڈونا (St. Triduana) کا جاپ کرتے۔ کچھ دیگر نام اور ان سے جڑے ہوا امراض حسب ذیل ہیں۔

سینٹ کاس ماس (St. Cosmas) سرجری۔
سینٹ روش (St. Roch) طاعون۔
سینٹ برنار ڈائن (St. Bernardine) سینے کی بیماریاں
سینٹ اپالونیا (St. Apollonia) دانت کی تکالیف
سینٹ بلیز (St. Blaise) حلق کے امراض
سینٹ ایورٹن (St. Avertin) مرگی
سینٹ فیاکر (St. Fiacre) بواسیر

یہ بات بڑی حد تک باعث مسرت ہے کہ موجودہ دور میں مغرب کے عوام بزرگان دین کی عزت تو کرتے ہیں لیکن ان کے مزاروں اور کلیساؤں کو دعا کا مرکز نہیں مانتے ہیں بلکہ ان مراکز کو ایسے اداروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے جہاں عیسائی مشنریاں باقاعدہ اسپتال چلاتی ہیں اور بیماروں کی خدمت میں مصروف رہتی ہیں۔ گویا کہ حضرت عیسیٰؑ کے اس قول کو کہ "بیمار کا علاج کرو"۔ "Heal the Sick" لوگ صحیح پس منظر میں سمجھنے لگے ہیں۔ مغرب کی یہ قومیں اب علم و تدبر پر بھروسا کرتی ہیں اور علاج و معالجہ میں توہمات میں گرفتار ہو کر ملت کو نقصان نہیں پہنچاتیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مغرب کی قوموں نے اپنے کو توہمات سے تو آزاد کرا لیا اور بہت خوب کیا لیکن مادہ پرستی میں کچھ زیادہ ہی پھنس گئی ہیں۔ تاریخی جائزہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ان کے موجودہ رویہ کے ذمہ دار بڑی حد تک ان کے وہ دینی رہنما ہیں جنہوں نے کئی سو سال تک ان کو اوہام پرستی میں گرفتار رکھ کر گویا غلام بنائے رکھا لہٰذا جب ان کو واہمہ کی اس غلامی کا احساس ہوا تو نشاۃ ثانیہ کے بعد اپنے ماضی سے اس حد تک متنفر ہوئے کہ مادہ پرستی کو توہم پرستی پر ترجیح دینے لگے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پورا مغرب مادہ پرست ہو گیا ہے اور روحانیت یا دین سے منکر ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مدر ٹریسا جیسی شخصیتوں نے جنم نہ لیا ہوتا۔ وقت آ گیا ہے کہ مشرق مغرب سے سبق لے اور توہمات سے آزاد ہو کر دین حق کی جانب واپس آئے۔ دنیا کی امامت صرف وہ قومیں کر سکتی ہیں جو دین اور دنیا دونوں کا حق ادا کر سکتی ہیں۔

ڈاکٹر عرفان احمد*

توانائی اور برقی ترقی ـــــ ایک جائزہ

آج پورے عالم میں توانائی کی فراہمی، بنی نوع انسان کے لیے ایک زبردست مسئلہ ہے اور اس کے حصول کے لیے ساری دنیا کے بہترین دماغ معروف کار ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم توانائی کا جائزہ لیں، اس کا ایک مختصر تاریخی پس منظر پیش خدمت ہے۔

توانائی کا سب سے پہلا استعمال انسان نے زمانۂ قدیم میں آگ کی شکل میں کیا۔ آگ نے اس کو سرد موسم اور جنگلی جانوروں سے محفوظ رکھا۔ نیز اس کی مدد سے بے ذائقہ اور ناقابل ہضم چیزیں لذیذ غذا بن گئیں۔ رفتہ رفتہ آگ ہی کی مدد سے انسان نے دھاتوں کو پگھلا کر مختلف اوزار بنا سیکھا۔ اس طرح توانائی کی اس پہلی شکل نے انسان کے ہاتھ میں پتھر کی جگہ دھات کے اوزار پکڑا دیے۔ پھر انسان نے جانوروں کو پالتو بنا کر ان کا استعمال بار برداری اور سواری کے لیے شروع کیا۔ پہیہ کی ایجاد نے اسے بہت ساری دوسری سہولیات میسر کرائیں۔ انسانی برادری جو اب تک چھوٹے چھوٹے خاندانوں پر مشتمل تھی، اب نئے نئے علاقوں کی تلاش میں نکلنے لگی۔ پہیے کی ایجاد کے ایک طویل مدت کے بعد یعنی پہلی صدی قبل مسیح میں "پن چکی" وجود میں آئی۔ انسان نے اونچائی پر واقع پانی کے قدرتی ذخائر کا استعمال کرنا سیکھ لیا۔ اگرچہ یہ پن چکیاں اس وقت صرف پسائی کرنے کے کام آتی تھیں لیکن ان کی اہمیت اس معنی میں بہت زیادہ ہے کہ انسان نے اپنی اور جانوروں کی جسمانی قوت سے باہر پہلی بار توانائی کا ایک ذریعہ دریافت کیا۔ بلاشبہ انسان اس وقت شمسی توانائی سے بھی فیض یاب ہوتا تھا لیکن یہ توانائی نہ تو اس کی پیدا کردہ تھی اور نہ ہی اس کے دائرۂ اختیار میں تھی اور سچ تو یہ ہے کہ شمسی توانائی کے کل فوائد اس وقت انسان پر آشکارا بھی نہیں ہوئے تھے۔

بارہویں صدی میں انسان نے ہوا کی توانائی کا استعمال کرنا سیکھا اور "پون چکی" وجود میں آئی۔ پھر سولہویں صدی تک توانائی کی ضرورت پون چکی سے ہی پوری ہوتی رہی۔ بلاشبہ مغربی یورپ میں صنعت سازی کی شروعات انھیں پن چکیوں کی مدد سے ہوئی لیکن ان کی قوت اور استعمال محدود ہونے کی وجہ سے اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے ہی مغربی یورپ کی صنعتیں توانائی کی قلت کا شکار ہونے لگیں۔ اسٹیم انجن کی ایجاد نے نہ صرف اس قلت کو دور کیا بلکہ توانائی کے میدان میں ایک سنگ میل قایم کر دیا۔ توانائی کے اس نئے ذریعہ کو آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا تھا۔ بھاپ سے چلنے والی مشینوں، کشتیوں اور ریل گاڑیوں میں پہلے لکڑی استعمال ہوتی تھی۔ سنہ ۱۸۳۰ء سے کوئلے کا استعمال شروع ہوا جو لکڑی کے مقابلے میں زیادہ توانائی فراہم کرتا تھا۔ اسٹیم انجن کی ایجاد کے بعد توانائی کے میدان کی اہم دریافت بجلی تھی۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں مائیکل فیراڈے Michael Faraday نے ڈائنمو (Dynamo) ایجاد کر کے بجلی پیدا کی۔ پھر محض پچاس سال کے اندر ہی بڑے پیمانے پر اس کا استعمال شروع ہو گیا۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں پہلا بجلی گھر قایم ہوا جس نے ذاتی استعمال کے لیے عوام کو بجلی مہیا کر دی۔ ان بجلی گھروں میں

---

* ریڈر شعبۂ طبیعیات، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ۔

لکڑی اور کوئلہ ہی استعمال ہوتا تھا۔ ۱۸۶۱ء میں توانائی کے افق پر پٹرولیم کا سورج طلوع ہوا۔ کوئلے اور لکڑی کے مقابلے میں پٹرولیم کو استعمال کرنا، لانا اور لے جانا زیادہ آسان تھا۔ اس لیے اس کی مقبولیت بڑھتی ہی گئی۔ ۱۹۱۰ء میں کل توانائی کا صرف دو فی صد پٹرولیم سے آتا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں اٹھارہ فی صد ہوا اور اب چالیس فی صد سے زائد ہے۔ پھر انسانی تاریخ میں وہ دور بھی آیا جس میں صنعتی ترقی کی ہی بنیاد پر ملکوں کی گروہ بندیاں شروع ہوئیں اور ہمیں صنعتی ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور غیر ترقی پذیر ممالک جیسی اصطلاحات سننے کو ملیں۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو توانائی نے دنیا کی تشکیل و ترتیب میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ پٹرولیم کے بعد قدرتی گیس منظرِ عام پر آئی جس کا استعمال دوسری جنگ عظیم کے بعد خاص طور سے مقبول ہوا۔

صنعتی ترقی نے جہاں انسان کو بے شمار سہولتیں مہیا کردی ہیں وہاں توانائی پر ان کا انحصار بھی بڑھادیا ہے۔ شہروں میں رہنے والے افراد کا انداز زندگی کچھ ایسا رُخ اختیار کرچکا ہے کہ تمام مصروفیات توانائی کے گرد گھومتی ہیں۔ توانائی کا استعمال اس بات کی بھی نشان دہی کرتا ہے کہ کون سا ملک کس درجہ ترقی یافتہ ہے۔ امریکہ میں توانائی کی کھپت کی شرح دس ہزار یونٹ سالانہ فی کس ہے، جب کہ برصغیر میں یہ اوسط سالانہ دوسو یونٹ فی کس ہے۔ بھارت میں فی کس توانائی کی کھپت عالمی اوسط کی پچیس فی صد ہے۔

ہماری توانائی کے جملہ وسائل کا مرکز کوئلہ، پٹرولیم اور قدرتی گیس ہیں۔ بدقسمتی سے توانائی کی یہ تمام اقسام محدود اور ناقابل تجدید ہیں۔ ان کو ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہی ہے۔ مستقبل کے ان اندیشوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے توانائی کے ماہرین نے توانائی کے ان ذرائع پر توجہ دینی شروع کردی ہے جو لامحدود اور قابل تجدید ہیں۔ لامحدود قسم میں شمسی توانائی، سمندری لہروں کی توانائی، ہوا کی توانائی اور زمینی حدت کی توانائی آتی ہیں۔ توانائی کی یہ تمام اقسام تجرباتی سطح سے گزرنے کے بعد اب زیر استعمال ہیں۔ قابل تجدید ذرائع میں پانی سے پیدا شدہ بجلی، پٹرپودوں سے حاصل توانائی نیز فضلے سے بنی گیس شامل ہیں۔ نیوکلیائی توانائی اگرچہ قابل تجدید ذرائع میں نہیں آتی لیکن چوں کہ اس میں ایندھن کی بہت کم مقدار استعمال ہوتی ہے اس لیے اس کا شمار بھی توانائی کے متبادل ذرائع میں ہوتا ہے۔ ان تمام وسایل میں نیوکلیائی توانائی اور شمسی توانائی کافی ترقی یافتہ شکل اختیار کرچکی ہیں۔

پچھلی کئی دہائیوں سے دنیا کے بیشتر ممالک میں نیوکلیائی توانائی سے بجلی پیدا کی جارہی ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں چارسو نیئس ایٹمی بھٹیاں کام کررہی ہیں جس میں نیوکلیر فشن (Nuclear Fission) کے عمل سے توانائی حاصل کی جارہی ہے۔ اس عمل میں یورینیم، تھیوریم وغیرہ جیسی وزنی دھاتوں کے ایٹم کو توڑ کر توانائی پیدا کی جاتی ہے۔ بلاشبہ ایٹمی توانائی حاصل کرنے کا یہ بہت ہی موثر ذریعہ ہے لیکن یہ دھاتیں بہت کم مقدار میں پائی جاتی ہیں نیز نیوکلیائی ٹکنالوجی سے وابستہ خطرات نے اس کو پھیلنے سے روک دیا ہے۔ ایٹمی توانائی سے بجلی حاصل کرنے کا فشن سے زیادہ موثر طریقہ نیوکلیر فیوژن Nuclear Fusion ہے۔ اس عمل میں ہلکے ایٹم کے نیوکلیس (Nucleus) جیسے ڈیوٹیریم (Deuterium) اور لیتھیم (Lithium) وغیرہ آپس میں ضم ہوکر بھاری ایٹم کے نیوکلیس کو جنم دیتے ہیں جس کے نتیجے میں بڑی مقدار میں توانائی خارج ہوتی ہے۔ ہائیڈروجن بم اسی اصول پر بنایا گیا ہے۔ فیوژن میں ایندھن کی تھوڑی سی مقدار سے بہت زیادہ توانائی ملتی ہے۔ اس ایندھن کو حسبِ منشا سمندر کے پانی سے نکالا جاسکتا ہے۔ فیوژن سے توانائی حاصل کرنے میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس عمل میں صرف ہیلیم (Helium) گیس نکلتی ہے جس سے کوئی نقصان نہیں۔ ابھی تک اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکا ہے کہ فیوژن عمل میں کتنی فی صد حرارت کو بجلی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے لیکن امید کی جاتی ہے کہ ۵۰ یا ۶۰ فی صد حرارت بجلی میں تبدیل کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں مزید تحقیقات

جاری ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ اس فیوژن عمل سے بجلی تیار کی جا سکے گی۔

لکڑی، کوئلہ، پٹرول اور نیوکلیائی ایندھن کے استعمال سے توانائی حاصل کرنے میں ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ان مسائل کے مدِنظر اس بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے توانائی کے ایسے متبادل ذرائع دریافت کرنے کی ضرورت ہے جو نہ ختم ہونے والے ہوں اور اس کا اثر بھی ماحول پر خراب نہ پڑے تاکہ ترقی پذیر ممالک بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ شمسی توانائی ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس میں یہ خوبیاں کافی حد تک موجود ہیں اور جنھیں مزید تحقیق کے ذریعے اور بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق سورج کی توانائی چالیس ارب سال قایم رہ سکتی ہے یعنی توانائی کا ایک نہ ختم ہونے والا ذریعہ ہمارے سامنے ہے۔ شمسی توانائی کا استعمال عام طور پر ہم اپنی زندگی میں روزانہ کرتے ہیں۔ مثلاً کپڑا سکھانا، اناج اور فصلوں کا سکھانا وغیرہ۔ ایک اندازے کے مطابق ایک مربع میٹر پر روزانہ اوسطاً دوسو بیسٹھ کلوواٹ گھنٹہ (K W H) توانائی سورج سے ہم تک پہنچتی ہے۔ یہ مقدار خطِ استوا (Equator) کے نزدیک اگر موسم صاف ہو تو آٹھ کلوواٹ گھنٹہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے ترقی پذیر ممالک فائدے میں ہیں کیوں کہ ان میں زیادہ تر خطِ استوا ہی کے قریب واقع ہیں۔ زمین پر مختلف ذرائع سے فی سیکنڈ جو توانائی حاصل کی جاتی ہے جس میں تیل، کوئلہ، لکڑی، یورینیم، سمندری لہریں اور دوسرے ذرائع سے حاصل کی گئی بجلی بھی شامل ہے۔ اگر ہم جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان تمام ذرائع سے جو توانائی ہمیں ملتی ہے وہ سورج کی اس توانائی کا جو ہم تک پہنچتی ہے صرف اعشاریہ ایک فیصد ہے۔

بنیادی طور پر تین طریقوں سے شمسی توانائی کو کارآمد شکل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ پہلے طریقے میں شمسی توانائی کو حرارت میں تبدیل کر کے ضرورت کے مطابق استعمال میں لایا جاتا ہے۔ دوسرے طریقے میں شمسی توانائی کو شمسی سیل (Solar Cells) کی مدد سے براہ راست بجلی میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ تیسرے طریقے میں پودے شمسی توانائی کی مدد سے شعاعی ترکیب عمل (Photo Synthesis) کے ذریعے کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی سے اس طرح کے کیمیائی مرکبات تیار کرتے ہیں جن میں توانائی کی کافی مقدار ہوتی ہے۔ روسی نوبل انعام یافتہ نکولائی سیمونوف نے ایک آسمانی پاور ہاؤس کی پیشین گوئی کی ہے جس میں چاند کی سطح پر سیمی کنڈکٹر کا ایک غلاف چڑھا کر اس پر پڑنے والی شمسی توانائی کو براہ راست برقی توانائی میں تبدیل کیا جائے گا اور پھر اس توانائی کو مائیکرو ویو (Microwave) کے ذریعے زمین پر بھیج دیا جائے گا۔ خلائی ٹکنالوجی کی شاندار پیش رفت کو دیکھتے ہوئے اس بات کے امکانات روشن ہو گئے ہیں کہ شاید وہ دن دور نہیں جب اس طرح کے منصوبے ممکن ہو سکیں گے۔

بھارت توانائی کے معاملے میں منفرد ہے۔ یہاں ایک طرف ہزاروں سال سے استعمال ہونے والے روایتی ایندھن لکڑی، گوبر اور کوئلہ مستعمل ہیں تو دوسری طرف جدید ترین نیوکلیائی بھٹیاں بجلی تیار کر رہی ہیں۔ نیوکلیائی توانائی کے حصول کا آغاز ۱۹۵۰ء سے پہلے ہو گیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی بصیرت اور بھابھا کے سائنسی شعور نے ایٹمی پاور اسٹیشن کے کام کرنے کے لیے راہ ہموار کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ملک میں پیدا کی جانے والی بجلی کا تین فی صد صرف ایٹمی بھٹیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ شمسی توانائی کے سلسلے میں ملک میں مختلف اقسام کے آلات تیار کیے گئے ہیں۔ پسماندہ دیہی علاقوں میں بجلی کی مزید سہولیات پہنچانے کے لیے شمسی بجلی گھروں کی تعمیر پر غور کیا جا رہا ہے۔ پچھلے کچھ سالوں سے زمین کے اندر کی حرارت کا استعمال بجلی پیدا کرنے میں کیا جا رہا ہے۔ ہوا کی توانائی کا بھی فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ زمین اور چاند کی کشش سے بنی ہوئی لہروں

ن ایک خاص جگہ جمع کر کے بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ انسان اور جانوروں کے فضلے سے بنی گوبر گیس گاؤں میں کافی مقبول
رہی ہے۔ نیز پیڑ پودوں کے فاضل حصوں اور کوڑے کرکٹ کو بھی اب توانائی کی مختلف شکلوں میں بدلا جا رہا ہے۔ ملک میں
ینی کی صنعت کو نسبتاً کم خرچ پر بجلی تیار کرنے کے امکان پر غور کیا جا رہا ہے۔

گاؤں میں برق کاری ملک کے دیہی علاقوں کی ترقی کا ایک اہم جزو ہے۔ ۱۹۶۹ء میں صرف تیرہ فی صد گاؤں میں بجلی
پہنچائی گئی تھی لیکن آج تراسی فی صد سے زائد گاؤں میں یہ کام انجام پا چکا ہے۔ ملک میں تقریباً ایک لاکھ گاؤں میں بجلی پہنچانے
کا کام باقی ہے۔ ان میں سے بیشتر گاؤں دشوار گذار مقامات پر واقع ہیں اور ان میں بجلی پہنچانے کے لیے نسبتاً زیادہ سرمایہ
ری کی ضرورت ہے۔ اس کے باوجود ان میں سے ستر ہزار گاؤں میں دیہی برق کاری کی مختلف سرکاری اسکیموں پر عمل
آمد کیا جا رہا ہے۔ ہریجنوں اور آدی واسیوں سمیت غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے دیہی کنبوں میں بجلی کا سنگل پوائنٹ
کنکشن دینے کی غرض سے حکومت نے ۱۹۸۸-۸۹ء میں ملک بھر میں "کٹیر جیوتی" کے نام سے بہبود کا پروگرام شروع کیا تھا۔
س سلسلے میں ۱۹۹۱-۹۲ء کے دوران بجلی کے چودہ لاکھ کنکشن مفت لگائے گئے جو ایک ریکارڈ ہے۔

گزشتہ تیس سالوں کے دوران بھارت میں بجلی کا استعمال گیارہ فی صد سالانہ اوسط رفتار سے بڑھا ہے۔ مارچ ۱۹۸۸ء
ں لیے گئے ایک جائزے کے مطابق ہمارے ملک میں ۵۴۲۴۶ میگا واٹ کے بجلی گھر کام کر رہے تھے جنھوں نے ۱۹۸۷ء
سو دو ارب یونٹ بجلی تیار کی لیکن بجلی کی اتنی بڑی مقدار بھی ہماری ضروریات کے لحاظ سے کم تھی۔ توانائی کے مشاورتی بورڈ
اندازے کے مطابق ۲۰۰۴-۰۵ء کے دوران ہم کو چھ سو چون ارب یونٹ بجلی درکار ہوگی لیکن وسائل کی شدید قلت کی وجہ سے
ویں منصوبے کے دوران منصوبہ بندی کمیشن اس کے لیے چھ سو ارب روپیے سے زیادہ رقم مخصوص نہیں کر سکا ہے۔ اس کے
ج یہ ہوں گے کہ ملک میں تیرہ ہزار میگا واٹ بجلی کی کمی پیدا ہوگی۔ توانائی کی ضرورت اور اس کی فراہمی کے دوران بڑھتی ہوئی اس
ج کو روکنے کے لیے صرف دو طریقے ہیں۔ اول یہ کہ توانائی کے استعمال میں بے حد کفایت شعاری سے کام لیا جائے اور دوسرے
توانائی کے دیگر ذرائع تلاش کیے جائیں تاکہ آئندہ آنے والی صدی میں ہم توانائی کے بحران سے دوچار نہ ہوں۔

آفاق احمد عرفانی *

سرسید آگرے میں

سرسید احمد خاں کی جولاں گاہ بننے کا شرف آگرے کو بھی حاصل رہا ہے چنانچہ مناسب ہوگا اگر ان کے اکبرآبا کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جائے

آگرے کے کمشنر رابرٹ ہملٹن نے سرسید کو فروری ۱۸۳۹ء میں اپنے دفتر میں منشی نائب مقرر کیا۔ ۱۸۴۰ء میں 'جام جم' آگرے میں طبع ہوئی جس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک تینتالیس بادشاہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ آگ ہی سرسید نے قانونِ دیوانی متعلقہ منصفی کا خلاصہ تیار کیا جو منصفی کے امیدواروں کے لیے بہت مفید ثابت اسی زمانے میں سرسید نے منصفی کا امتحان پاس کیا اور ۲۴ دسمبر ۱۸۴۱ء کو ان کا تقرر بحیثیت منصف مین پو ہوا لیکن ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ کو وہ فتح پور سیکری آگئے اور چار سال تک فتح پور سیکری میں بحیثیت منصف اپنے فرائض کو انجام د اور یہاں ان کو رہنے کے لیے جو مکان دیا گیا تھا وہ دراصل اکبر کی خواب گاہ تھی[1] حالی حیات جاوید میں رقم طراز ہ

"جب سرسید نوکر ہو کر آگرے گئے تو اس زمانے میں صدر دیوانی عدالت یعنی ہائی کورٹ آگرے میں تھی اور وہاں امیر علی خاں، مولوی غلام امام شہید، مولوی غلام جیلانی، مولوی محمد شفیع اور بہت سے اشراف خاندانوں کے نامی وکیل عہدے داروں کا مجمع تھا۔ یہ سب لوگ نہایت زندہ دل، مرنج و مرنجاں اور زندگی بے فکری اور فارغ البالی کے س ہنسی خوشی گزارنے والے تھے۔ تاج محل، اعتماد الدولہ اور نور افشاں باغ میں وہ آئے دن جلسے کرتے تھے، سرسی بھی ان جلسوں کی کیفیتیں دیکھی تھیں۔ اور ان میں شریک ہوئے تھے۔"[2]

۱۸۵۷ء کے بعد چھ سال تک جامع مسجد آگرہ کے دروازے مسلمانوں پر بند رہے۔ مولانا قمر الاسلام کی کوشش ور ۱۸۶۴ء میں مسجد واگزاشت ہوئی۔ واگزاشتی کے بعد پہلی نماز جو جامع مسجد میں پڑھی گئی وہ عید الاضحیٰ کی نماز تھی جس سرسید شریک ہوئے تھے۔ شکرگزاری کے جلسے میں سرسید نے جو دعا خدا سے مانگی تھی اس کے چند جملے اس طرح ہیں:

"اے ہمارے مقدس خدا تیرا نام ازل سے مقدس ہے، اے قدوسِ مطلق تیرا نام ابد تک مقدس رہے گا........ اے خدا تو ہمیں گناہوں سے بچا اور اپنی مرضی پر چلا اور اپنے گھر کو اپنے مقدس نام سے آباد رکھ....... آمین۔"[3]

۱۔ صفحہ ۶۲، حیاتِ جاوید از حالی مطبوعہ ترقی اردو بیورو دہلی، تیسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۹۰ء

۲۔ صفحہ ۵۱، ایضاً

۳۔ خطباتِ سرسید جلد اول، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔

---

* ریٹائرڈ، پی۔ جی۔ ٹی۔ ایم یو علی گڑھ۔ ۱۴/۱۴۰، گڑھیا حکیم صاحب، ہوسپیٹل روڈ، آگرہ۔ ۲۸۲۰۰۳

ڈپٹی سید امداد علی آگرے کی ایک اہم شخصیت تھے، جو محلہ پنجہ شاہی آگرہ کے رہنے والے تھے اور سر سید سے دو تین سال چھوٹے تھے۔ وہ ۱۸۲۰ء میں آگرے میں پیدا ہوئے، کانپور میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ ۱۸۷۲ء میں مراد آباد سے ریٹائر ہو کر آگرے آگئے۔ ۱۸۸۲ء میں انتقال ہوا۔ وہ سر سید کے بہت اچھے دوست تھے مگر سر سید کے مذہبی عقائد سے نالاں ہو کر ان کے خلاف علماء سے فتوے حاصل کر کے ان کی اشاعت کی۔ تہذیب الاخلاق کے جواب میں امداد الآفاق رسالہ نکالا۔ سر سید کے بعض رسالوں کے جوابات لکھے اور ہزاروں کی تعداد میں اپنے صرفے سے چھپوا کر عوام میں مفت تقسیم کیے مکاتیب سر سید مرتبہ مشتاق حسین[1] سر سید کے تین خطوط ڈپٹی صاحب موصوف کے نام ملتے ہیں۔ دو خطوط اردو میں لکھے گئے ہیں اور ایک فارسی میں ہے۔ ظاہر ہے یہ خطوط خوشگوار تعلقات کے زمانے میں غازی پور سے جولائی اور اگست ۱۸۶۲ء میں لکھے گئے تھے۔

اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ، ۲۰ اپریل ۱۸۶۶ء کے صفحات پچاس واکیاون پر سائنٹفک سوسائٹی کے اکبر آبادی ممبران کے اسمائے گرامی یہ ہیں ——— (۱) مولوی حاجی ڈپٹی سید امداد العلی۔ (۲) شاہ اسد علی وکیل۔ (۳) مولوی امجد علی وکیل۔ (۴) مولوی محمد امام اللہ وکیل (۵) مولوی حیدر حسین وکیل۔ (۶) چوبے دھنپت رائے ڈپٹی کلکٹر آگرہ۔ (۷) مولوی سمیع اللہ خاں وکیل۔ (۸) سید ظہور حسین وکیل (۹) مولوی عبدالستار وکیل (۱۰) مولوی سید فرید الدین وکیل۔ (۱۱) مولوی محمد بخش خاں وکیل۔ (۱۲) رائے مان رائے وکیل۔ (۱۳) منشی نجم الدین حیدر تحصیل دار۔ (۱۴) منشی ہنومان پرشاد وکیل۔

اس مختصر فہرست سے اہل آگرہ سے سر سید کے وسیع تعلقات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی آگرے کی ادبی تنظیمیں یوم سر سید پر ادبی تقریبات کے علاوہ وقتاً فوقتاً سر سید پر سیمنار منعقد کرتی رہتی ہیں جن میں بہ صمیم قلب و بشرح صدر ان کو خراج عقیدت پیش کر کے یہ ثابت بھی کرتی رہتی ہیں کہ اہل اکبر آباد اُن کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہے۔

---

[1] مکاتیب سر سید مرتبہ مشتاق حسین فرینڈس بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ۔

(باقی صفحہ ۱۸ کا)

اعلیٰ تعلیم کی ڈگری حاصل کرنے کی کوشش کے علاوہ فن، ہنر، کاری گری، پیشہ ورانہ کمپیوٹر وغیرہ کی تعلیم کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آج کے دور میں یہ کامیاب اور نایاب چیزیں ہیں۔ بڑی بڑی ڈگریاں لیے لوگ بیٹھے رہ جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی سندیں زیادہ کارگر ثابت ہو جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے بچوں کو زیادہ تر نئے اداروں اور ان کے کورس کا علم نہیں ہوتا ہے۔ ان اداروں میں داخلے کی دشواریاں پیش آتی ہیں لیکن اگر منزل کا تعین ہو جائے تو سفر کی تکلیفیں جھیلی جا سکتی ہیں۔ مقابلے کے امتحانات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ایسے تربیت یافتہ ہو کر نکلیں کہ قومی مانگ کے معیار کے لحاظ سے پورے اترتے ہوں اور پرائیویٹ سیکٹر میں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے۔ مسلمان بچوں کے عملی قدم اس جانب اٹھنا شروع ہو گئے ہیں لیکن ذرا سنبھل سنبھل کر اُٹھ رہے ہیں۔ ان کو نااہلی کے کوڑے لگانے کے بجائے ہمت افزائی اور مدد کی ضرورت ہے۔ قوم کے ہر فرد کو اس طرف توجہ دینا چاہیے۔

ڈاکٹر سید راشد حسین *

ایک صاحب

شاعری میں جو مقام عنقا کو حاصل ہے کم و بیش وہی مرتبہ "ایک صاحب" کو ہمارے حلقۂ احباب میں ملا ہوا ہے کے لیے مشہور ہے کہ اگر مل گیا تو عنقا نہیں اور عنقا ہے تو ملے گا نہیں یہی کیفیت "ایک صاحب" کی ہے۔ مل گئے تو ایک د نہیں، ایک صاحب ہیں تو ملیں گے نہیں۔ لہٰذا وہ ہیں تو ضرور مگر نہیں بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ سب کو ملنے لگے تو ان کے اثرات کیا ہوں گے؟ بقول شاعر ؎

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے　　مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

ان کی زبانِ بے زبانی سے وہ وہ نادر شگوفے سننے کو ملتے ہیں کہ انسان عش عش کرنے لگتا ہے۔ م آپ کی شخصیت کے بارے میں ایسی ایسی باتیں بیان فرمادیں گے جن کا آپ کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوگا۔ کبھی کبھی ا ہوتا ہے کہ آپ کے تحت الشعور میں جس بات کا گزر تک نہیں ہوا وہ بات آپ کے نام سے مشہور ہو جاتی ہے۔ اب آپ تردید و تصحیح کرتے پھریئے، ان کی بلا سے، وہ تو اپنا کام کر چکے۔

مگر صاحب اس کے باوجود "ایک صاحب" ہیں بڑے کام کے۔ ان کی حرکات و سکنات کا دائرہ اس قدر و ہے کہ مہ و سال کی گردش اور خشکی و تری کے طول و عرض میں نہیں سما سکتا۔ بالخصوص یونیورسٹی میں ان کی گرد اس قدر تیز ہے کہ کسی کونے یا گوشے میں تو کیا سات تہ خانوں میں چھپ کر بھی کانا پھوسی ہو رہی ہو تو بھی ایک صاحب اس کی خبر ضرور ہو جائے گی، اور پھر ان کے کارندے دانستہ و نادانستہ پورے کیمپس میں پھیلا دیں گے۔ صاحب معا ہے، بس کس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا؛ کس نے کہا، کس سے سنا اور کہاں سنا؟ یہ صحیح بھی ہے یا غلط، اس کی کسی کو فکر نہیں بس "ایک صاحب" نے کہا ہے لہٰذا اب تو سب کو کہنا اور سننا ہے۔ اس قسم کے مشاہدات غیر معمولی صورت م ہر وقت اور عام حالات میں وقتاً فوقتاً دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر کبھی کوئی ایجیٹیشن ہو، فرقہ وارانہ فساد ہو یا کرفیو نافذ ہو، اس وقت ان کے جوہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہر شخص "ایک صاحب" کی خدمت کرنا، ان کو اپنا بھرپور تعا دینا بلکہ ان سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جانا، اپنے اہم فرائض منصبی میں شمار کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک آپ ا کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے "تا رگزیدہ مردہ شود" کے مصداق ہو چکا ہوگا۔

جہاں ایک طرف "ایک صاحب" لوگوں سے کام لیتے ہیں، وہیں علی گڑھ کے لوگ بھی "ایک صاحب" کے نام خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے ذریعہ وہ سب کہہ جاتے ہیں جو سمجھنے والے کے لیے تازیانۂ عبرت اور عقل و ہوش کے

---

* شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ے لیے نوشتۂ دیوار ہوتا ہے۔

"ایک صاحب" خطرناک بھی ہیں اور لائق احترام بھی۔ مگر بہر صورت ان سے ہوشیار رہنا لازم ہے۔ حاکم وقت اور باب حل وعقد کو ان کی جنبشِ زبان وابرو پر بہت گہری نظر رکھنی پڑتی ہے۔ جیسی وہ خود ان لوگوں کی زبان وقلم پر مضبوط گرفت رکھتے ہیں۔

"ایک صاحب" کی اپنی ایک دنیا ہے اور اس کا نظم وضبط اس قدر مستحکم ہے کہ جناب شیطان بھی علی گڑھ سے بے نیاز رہتے ہیں اور اپنی قوت وصلاحیت کو بلاخوف وخطر دوسری جگہوں پر صرف کرتے ہیں۔

میں نے بارہا اس پر غور کیا ہے کہ "ایک صاحب" کے کام کرنے کا ڈھنگ کیا ہے اور وہ کون سے عوامل ہیں جن کو وہ بروئے کار لاتے ہیں۔ ایک روز شعبہ میں بیٹھا اسی سوچ میں غرق، تفکرات کے سمندر میں غوطہ زنی کر رہا تھا، ذہن بے قرار تھا کہ آخر یہ کیسی گتھی ہے جو آج تک سلجھ نہیں سکی۔ شاید میری اس الجھن وپریشانی کا علم بھی 'ایک صاحب' کو ہو گیا، اور انہیں بھلا کیوں نہ ہوتا۔ وقت کافی گزر چکا تھا۔ میں تھک بھی گیا تھا، سب جا چکے تھے بھوک بھی اپنا دامن پھیلا کر چلنے پر اکسا رہی تھی۔ اسی دوران معلوم نہیں کون آیا اور ایک پڑیا میرے حوالے کی اور یہ کہتا ہوا کہ 'ایک صاحب' نے دی ہے، چلا گیا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں چنے تھے۔ بغیر کسی تامل کے مٹھی بھری اور منھ میں ڈال لیے۔ منھ چلاتے ہی دن میں تارے نظر آنے لگے۔ لوہے کے تھے۔ کاغذ کو دیکھا تو کچھ تحریر نظر آئی۔ چشمِ خرد سے پڑھا تو، لکھا تھا

۱۔ آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

۲۔ آتش نشاندن واخگر گزاشتن، افعی کشتن وبچہ نگاہ داشتن کار خردمنداں نیست

۳۔ خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

۴۔ جو آزمائے کو آزمائے اسے خدا شرمائے۔

۵۔ نکوئی با بداں کردن چنانست
کہ بد کردن بجای نیک مرداں

قوال زریں کو پڑھتے ہی ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، غور وفکر کے جھنجھٹ کو چھوڑ، بیگ اٹھایا، کمرہ بند کیا، پرانی سائیکل سنبھالی اور گھر چل دیا۔

مئی ۱۹۹۵ء کے شمارے میں ڈاکٹر سید مشرف علی کا مضمون "اوزون چادر — اہمیت واثرات" شائع ہوا ہے۔ یہ موصوف کا طبع زاد مضمون ہے، مرتبہ نہیں ہے۔ اس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے —

(کمانڈر) ایس۔ این۔ اے۔ فردوسی*

بازگشت

(گزشتہ سے پیوستہ)

سینہ بہ سینہ چلی آرہی روایات کی منتقلی کے بعد کچھ باتیں یونیورسٹی سے متعلق بطور معلومات عامہ (G. K) کی گئیں یعنی موجودہ وائس چانسلر کون ہے (اسی وقت ذاکر صاحب کو آئے ہوئے چند ماہ ہی گذرے تھے)، پی۔ وی۔ سی کا نام کیا ہے (اس وقت سید نوراللہ صاحب نئے پی۔ وی۔ سی بنائے گئے تھے)، ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور سائنس کا نام، کامرس کی فیکلٹی اس وقت تک وجود میں نہیں آئی تھی اور یہ شعبہ فیکلٹی آف آرٹس کے تحت تھا۔ اسی طرح گو کہ طبیہ کالج موجود تھا اور اس کے پرنسپل شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب تھے مگر یہ بھی انجینیرنگ کی طرح فیکلٹی آف سائنس کے تحت کام کرتے تھے۔

یونیورسٹی کا ڈاکخانہ اس وقت بھی وہیں موجود تھا جہاں آج ہے یعنی آفتاب اور ممتاز ہوسٹل کے درمیان۔ اس وقت اس کا پوسٹ ماسٹر اسی بلڈنگ کے پچھلے حصہ میں رہتا بھی تھا جو اب (اے۔ ایم۔ یو کا ایک الگ ڈیلیوری زون بن جانے کے باعث) سوٹنگ روم بنا دیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کا پراکٹر آفس بھی اسی بلڈنگ میں تھا جہاں آج ہے۔ نقل و حرکت کے لیے صرف تانگے ہوتے تھے۔ گو کہ یکے بھی تھے مگر گھٹیا سمجھے جاتے تھے۔ اور طلبہ اس پر نہ بیٹھتے سائیکلیں بمشکل دو فی صد طلبہ کے پاس تھیں البتہ اکثر اساتذہ سائیکل استعمال کرتے تھے۔ خصوصیت سے جن لوگوں کے نام لیے جا سکتے ہیں ان میں یونیورسٹی کے بارعب لیکن ہر دل عزیز پراکٹر جو صدر شعبہ کامرس بھی تھے پروفیسر ایس۔ ایم۔ شفیع صاحب کا نام سر فہرست آسکتا ہے۔ گو کہ آپ کے پاس اپنی کار موجود تھی مگر وہ روزانہ اپنی کوٹھی دجو پرانی چنگی۔ رائڈنگ کلب کو ملانے والی سڑک پر واقع تھی جس میں اب انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر ہے) سے صاحب باغ، شمشاد مارکیٹ ہوتے ہوئے اپنے دفتر تشریف لے جاتے۔ اس وقت کامرس کا شعبہ بھی وہیں سر سید ہال کے جنوب مشرقی کونے میں جو اولڈ بوائز لاج کے سامنے ہے، واقع تھا۔ اس میں اب وائلڈ لائف کا ایک نیا شعبہ کھل گیا ہے۔

دوسری اہم شخصیت پروفیسر ہادی حسن صاحب کی تھی۔ چوڑی دار پاجامہ، شیروانی، مخمل کی سیاہ ٹوپی ذرا آگے جھکی ہوئی، آنکھوں پر بغیر کمانی کی عینک جس کی سیاہ ڈوری دونوں طرف کو لٹکتی ہوئی۔ ماشاء اللہ کافی وجیہہ اور گورے چٹے تھے۔ ان کے پاس بھی اپنی کار موجود تھی مگر یہ بھی چنگی کے پاس سے اپنے شعبہ جو اس وقت باب اسحاق سے اندر جا کر باب علم سے (جو یونین کی طرف اب بھی کھلتا ہے) ملے ہوئے دو کمروں پر مشتمل تھا سائیکل پر ہی جاتے۔ انہی کمروں میں

* سابق پبلک ریلیشنز آفیسر۔ ۱۰/۴۱، دودھ پور سول لائینز، علی گڑھ

اردو کا شعبہ بھی تھا ــــــ اور

تیسری اہم شخصیت جس کا ذکر بھی ناگزیر ہے پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب تھے یہ بھی اپنی کوٹھی (واقعہ تار بنگلہ کی پشت ـ جس کو اب ذاکر باغ کہتے ہیں) سے اپنے شعبہ کے لیے سائیکل پر ہی تشریف لے جاتے ـ رشید صاحب بھی علی گڑھ کٹ پاجامہ، شیروانی اور اس پر ذرا چوڑی باڑ کی مخمل کی ٹوپی پہنتے تھے ـ گول کمانی دار چشمہ لگاتے تھے ـ شیو کرتے تھے مگر اچھی خاصی کتری ہوئی مونچھیں رکھتے تھے جب کہ ہادی صاحب کی مونچھیں نہ تھیں ـ شفیع صاحب بھی مونچھیں شیو کرتے تھے ـ وہ اکثر سوٹ پہنتے لیکن جمعہ کے دن پابندی سے شیروانی اور اس پر مخمل کی سیاہ ٹوپی اوڑھتے ـ

یہی حال، کم و بیش دیگر اساتذہ کا بھی تھا ـ جن طلبہ کے پاس اپنی سائیکل نہ ہوتی وہ دوسروں سے مستعار لے کر کام چلاتے اور حساب دوستاں در دل، ہو جاتا ـ ویسے کرایہ کی سائیکلیں بھی ملتی تھیں جن کا کرایہ ایک آنہ گھنٹہ ہوتا تھا ـ صرف رات بھر کے لیے آٹھ آنے اور ماہانہ ۱۵ روپے پر اچھی سائیکلیں مل جاتی تھیں ـ اس وقت تک وطن عزیز میں سائیکل بنانے کی صرف دو تین کمپنیاں تھیں لہٰذا تقریباً ساری سائیکلیں باہر کی ہی ہوتیں ـ ہرکولس اور ریلے ۱۲۵/- روپے کی ملتی تھی ـ اور پھر انہی کمپنیوں کے خصوصی ماڈل رنگ، ساخت اور مزید سہولیات کے اعتبار سے ۲۰۰/- روپے تک کے بھی موجود تھے ـ آج (۱۹۹۵) میں جب ہم اس کا ذکر کرتے ہیں تو کتنا عجیب سا لگتا ہے ـ ایک اعداد و شمار کی رو سے صرف دلی، دلی کے اطراف میں ۱۴۰ کمپنیاں ایسی ہیں جن کی سائیکلیں اب غیر ملکوں کو برآمد کی جا رہی ہیں بہر کیف تلقین اور اطلاع کے لیے یہ بھی ہدایت کی گئی کہ آپ جہاں بھی جائیں ہر چیز کے لیے یونیورسٹی پراکٹر آفس سے منظور شدہ ایک نرخ نامہ آپ کو وہاں ملے گا ـ آپ پیسوں کی ادائیگی اسی کے لحاظ سے کریں ـ حتیٰ کہ تانگوں پر بھی یہ نرخ نامے جڑے ہوتے تھے ـ مثلاً پورا تانگہ مع سامان اور چار سواریوں کے اسٹیشن سے سرسید ہال آٹھ آنے میں ـ وی ـ ایم ہال کے لیے بارہ آنے وغیرہ ـ چلتے چلتے یہ بھی سن لیں کہ اس وقت سامان کس طرح کے ہوتے تھے ـ اس وقت تک بکس صرف ٹین (لوہے) کے ہی ہوتے تھے ـ بہت کم لوگ چمڑے یا زین کے سوٹ کیس رکھتے تھے ـ بستر بڑے بڑے ہولڈالوں میں باندھا جاتا تھا ـ ایک آدھ ٹوکری بھی ضرور ساتھ ہوتی تھی جس میں کچھ فوری استعمال کی چیزیں ہوتی تھیں ـ کچھ اپنے ساتھ صراحی بھی لے کر چلتے تھے جو مٹی کی ہونے کے باعث اکثر لکڑی کے فریم میں ہوتی تھی ـ خصوصاً بہار اور مشرقی یوپی (غازی پور بلیا وغیرہ) سے آنے والے طلبہ اکثر اپنے ساتھ گھی کے کنستروں کو کاٹ کر بنائے ہوئے ڈھکن دار ڈبہ لاتے جس میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں اور دیسی گھی ہوتا ــــ اور اکثر یہ یاروں کے نذر ہو جاتا اور یہ معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی ـ اس لیے کہ اس دعوت شیراز میں اصل مالک کو بھی مدعو کیا جاتا ـ دعوت کا انتظام کرنے والے کچھ مزید اشیاء کا اہتمام اپنی جانب سے بھی ضرور کر لیتے تھے ـ

مختلف اشیاء کے ریٹ کی فہرست دراصل پراکٹر آفس میں ایک اسسٹنٹ پراکٹر دکانداروں کو بلا کر ان سے میٹنگ میں گفت و شنید کے بعد طے کرتا اور پھر وہی فہرست جاری کر دی جاتی ـ حتیٰ کہ پھلوں کے بھاؤ، چائے کی قیمت، لسی، دودھ اور کھانے پینے کی اشیاء تک اس میں شامل ہوتیں ـ یہ اور بات تھی کہ ،صاحب لوگ، خوش ہو کر ،ٹپ، کے نام پر کچھ بھی دے دیں ـ مثلاً تانگہ والے نے ایک فرشی سلام جھاڑا اور نواب صاحب نے کہا کہ روپیہ رکھ لو ـ پیسہ واپس کرنے کی ضرورت نہیں ـ اس نے ایک اور فرشی سلام کیا اور چلتا بنا ـ

ہاں ۱۹۵۰ء میں کچھ ایسے طلبہ بھی آنے شروع ہو گئے تھے جن کو ان لوگوں سے بحث وتکرار کرتے دیکھا جانے لگا
میں نے اپنے بڑوں سے جو یہاں کے اولڈ بوائز تھے ایسی باتیں سن رکھی تھیں لہذا ذہنی طور پر ان کے لیے تیار ہو
میرا مطلب سر سید علیہ الرحمہ کی فاتحہ کے لیے نذرانہ، جس سے بعد میں بھیا پارٹی اور مرغا پارٹی ترتیب دی جاتی تھی
وانٹر ویو، ختم ہونے کے بعد چلنے سے پہلے سینئرز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کچھ سرگوشیاں ہوئیں گر فیروز صاحب۔
آوازیں کہاں نہیں نہیں۔ چھوڑو ۔ اور میری خلاصی ہو گئی ۔ میں سمجھا کہ شاید یہ ٹیکس، مجھے بعد میں دینا پڑے گا مگر نہ
کیوں وہ نوبت کم از کم میرے لیے نہ آئی۔

ہر نو وارد اس بات کے لیے کوشاں ہوتا کہ اسے بھی کوئی ایک سیٹ والا کمرہ الاٹ ہو جائے۔ چنانچہ نو واردو
کھینچائی کے لیے یہ بھی مشغلہ ہوتا ۔ جو بہت اُتاولے ہوتے ان سے کہا جاتا کہ میاں یہاں کوئی کام بغیر درخواست د
خود طے نہیں ہوتا۔ لہذا تم بھی منٹو ای (جو کہ یونیورسٹی کا قبرستان ہے) کے پرووسٹ جو ابھی حال میں مقرر ہوئے ہیں ا
تم نے ان کا نام بھی سنا ہوگا، جو ابھی حال تک ڈین فیکلٹی آف سائنس بھی تھے، کرنل حیدر صاحب کے نام در
لکھو کہ وہ تم کو وہاں ایک کمرہ الاٹ کر دیں اور پھر اسی درخواست کو لے کر اپنے پرووسٹ یا وارڈن کے پاس جا
ان سے اس پر No Objection لکھوالو تو کام ہو جائے گا ۔ یہ بات اتنی سنجیدگی سے کہی جاتی کہ نو وارد پوری
سے سارا کام کرتا اور آخری منزل پر پہنچ کر ہی عقدہ کھلتا، پرووسٹ یا وارڈن کی ڈانٹ سنتا اور مارے شرم کے
سینڈر روم کا نام تک زبان پر نہ لاتا اور نہ ہی یہ واقعہ کسی اور سے کہتا۔

ہفتہ بھر کے بعد بقرعید تھی ۔ چھٹی صرف ایک دن کی تھی ۔ سیشن لیٹ ہونے کے باوجود اس کے دوسرے دا
ہی فرسٹ ٹرمینل امتحانات شروع ہونے والے تھے ۔ لہذا اکثر طلبہ نے یہ طے کیا کہ وہ چھٹی میں یہیں رہیں گے ۔
بھی یہی فیصلہ کیا۔

جیسا کہ اوپر تحریر کر چکا ہوں کہ چمن سر سید میں اکثر معاملے طلبہ اور اساتذہ کے مشورے سے طے ہوتے تھے۔ ا
فیصلہ کرتے اور طلبہ اُن کو عملی جامہ پہناتے ۔ بقرعید کا ڈنر ہونا تھا۔ آفتاب ہال کے پرووسٹ قاری محمود صاحب
انہوں نے سینئر طلبہ کی ایک میٹنگ طلب کی کہ ڈنر کہاں ہو اور مینو وغیرہ کیا ہو۔ اس میٹنگ میں میکڈانلڈ کے
آفتاب سے کے تین، ممتاز کے تین یا چار اور ماریسن کورٹ کے دو سینئرز موجود تھے ۔ میکڈانلڈ والے یہ چاہتے
ڈنر آفتاب میں ہو جب کہ ممتاز، ماریسن کورٹ کے سینئرز اور خود پرووسٹ صاحب اس حق میں تھے کہ یہ ڈنر ماریہ
میں ہو۔ کافی بحث کے بعد جب بات نہ بنی تو میکڈانلڈ کے سینئرز یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے کہ ٹھیک ہے آپ جو فیصلہ فر
ہمارے لڑکے اس ڈنر میں شریک نہیں ہوں گے ۔ برائے مہربانی آپ ڈائننگ ہال انچارج سے فرمادیں کہ وہ
لڑکوں کا کھانا ہمارے بیروں کو دے دیں۔

یہ لوگ ہوسٹل آئے اور بیروں کو بلا کر کچھ ہدایت دی ۔ اس دن میکڈانلڈ میں سو میں سے چالیس طلبہ موجو
اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے اکثر بیرون ممالک کے تھے ۔ صبح ہوئی ۔ غسل کیا گیا۔ کپڑے پہنے گئے عطر لگا اور ہم نو
یونیورسٹی کی جامع مسجد کی طرف روانہ ہو گئے ۔ مسجد میں بھیڑ بھاڑ زیادہ نہ تھی ۔ اس لیے کہ اکثر طلبہ گھروں کو جا چکے تھے
وہی رکے تھے جن کے امتحان دوسرے دن سے تھے ۔ نماز مولانا (ڈنڈا) نے پڑھائی یہ یونیورسٹی کے امام تھے ۔ لوگوں۔

و یہ لقب دے رکھا تھا۔ وہ خطبہ کے دوران ایک عصا، اپنے ہاتھ میں رکھتے (جو مسنون بھی ہے)۔ وہ خوبصورت کافی عرصے تک بعد میں بھی نظر آیا۔ مگر اب نظر نہیں آتا۔ نماز ہوئی خطبہ پڑھا گیا، دعا ہوئی، لوگ گلے ملے اور پھر اپنے اپنے ہوسٹلوں کی جانب روانہ ہوئے اور وہاں سے یونیورسٹی قبرستان کی طرف گئے اور وہاں سے فراغت کے بعد اپنے ملنے والوں کی طرف چل پڑے ۔

مسجد میں شہر کے بھی بہت سے لوگ نماز عید ادا کرنے آئے تھے۔ شاید یہ ان کی عقیدت کے باعث تھا جو وہ سرسید کے اس دانش کدہ سے رکھتے تھے۔ اس میں سب طرح کے لوگ تھے۔ پڑھے لکھے بھی، دستکار بھی، بے پڑھے بھی، بھی ضعیف بھی اور بچے بھی۔ ان میں سے اکثر نے سرسید کے قبر پر فاتحہ پڑھی۔ ان کی آنکھوں کی عجیب چمک اس بات نظیر تھی کہ انہیں اس ادارہ پر کتنا ناز ہے۔ اور پھر وہ بھی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ لیے۔

دونوں ہی گھروں میں حسب لیاقت خوان سجائے جائیں گے
زردار چلا زردار کے گھر، نادار رہا ناداروں میں

اللہ اللہ کر کے جس طرح بھی ہوا دن گذرا اور زندگی میں پہلی بار اس شعر کا مفہوم سمجھ میں آیا۔

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر باہیں غریب
عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آگیا

شام ہوئی تو بیروں نے صرف اتنا کہا کہ میاں اس ہوسٹل کا کھانا نہیں آئے گا آپ لوگوں کو جانا نہیں ہے۔ بڑہ ، بیرے کھانا اپنے اپنے لکڑی کے بکسوں میں لے آئے اور ڈائننگ ہال کے ہاٹ کیسوں میں رکھ بھی دیئے۔ عام طور یہ بیرے کھانا مغرب کے بعد لگا دیا کرتے تھے۔ مگر اس دن مغرب ہوجانے کے بعد وہ نظر نہ آئے۔ آواز دینے پروہ ف اتنا کہتے رہے اچھا میاں! اچھا میاں!،۔ اور پھر تقریباً ۹ بجے بجے لیئے ہوئے آئے کہ میاں ذرا اپنی چھوٹی ٹیبل ے دیجیے اور یہ کہہ کر تیزی سے میز اور میز پوش لے کر باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھا کہ تقریباً ۲۰۔۲۵ میزیں ران میں جمع ہیں اور ان کو فیروز صاحب اور اسرار صاحب مل کر ایک دائرے میں لگا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں اللہ صاحب اور محسن صاحب بھی آگئے اور ان لوگوں نے بیچ میں ایک بڑا سا بانس زمین میں لگا دیا اور اس پر چار بلب دوسو واٹ کے جن کو وہ اپنے بیڈ منٹن کھیلنے میں استعمال کرتے تھے لگا دیئے۔ تار کا کنکشن فیروز صاحب نے برآمدے سے خود لگایا اور اس طرح انتظام پورا ہوا۔ بیرے پھر حرکت میں آئے اور ہر کمرے سے ایک ایک دو دو کرسیاں لیں اور روں طرف قرینہ سے لگا دیں۔ اب فیروز صاحب نے بیروں کو کھانا لگانے کا حکم دیا۔ گرم گرم کھانا میز پر لگا دیا گیا تو طلبہ سے آنے کی درخواست کی گئی۔ ہم سب جمع ہوگئے اور وہی ڈنر جو ہمارے ہال کے دوسرے طلبہ نے لیا تھا مزے لے لے کر کھایا۔ مینو وہی تھا، بریانی، دہی کا رایتا، شامی کباب، سلاد، قورمہ، روٹی اور شاہی ٹکڑا۔

کھانا تقریباً ۸½ پر ختم ہوا تو فیروز صاحب کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ آج کا دن ہے۔ آج ہم آپ کے بڑے بھائی ہونے کے طے اپنے تمام چھوٹے بھائیوں کو عید کی مبارکباد دیتے ہیں اور گذارش کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ شمشاد چل کر کیفے ڈی صابری سا ایک پیالی چائے پیئیں ہم سب اٹھے وہاں پہنچے تو نہ صرف پیش گرین لیبل کی چائے پیش کی گئی بلکہ اس کے ساتھ علی گڑھ کی روایتی برفی بھی تھی۔ سب نے انتہائی خوشگوار ماحول میں لطف اٹھایا۔ کیفے ڈی صابری سے باہر نکلے تو سامنے بُند پان

والے کی دکان تھی (یہ دکان آج بھی موجود ہے مگر اس میں اب جنرل مرچینٹ کی دکان کھل گئی ہے۔ بندو کے لڑکوں میں سے دو ایک نے تو پڑھ لیا ہے اور ملازمت کرتے ہیں، باقی نے دوسری طرف دکان لے لی ہے۔ فیروز صاحب نے ساتھیوں سے پھر پان لینے کی گذارش کی۔ اکثر نے لیا۔ بعض بیرون ملک طلبہ اس سے الگ رہے۔ میرے افریقی دوست چینگونڈا ائل نے بڑے شوق سے پان کا بیڑہ لیا۔ اور کھایا۔

اب پھر فیروز صاحب کی درخواست تھی کہ ہم سب واپس ہوسٹل چلیں۔ ہم لوگ واپس آئے تو خاصی دیر ہو چکی تھی رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ لہٰذا تقریباً پورا چاند مشرق سے کافی اوپر آچکا تھا۔ ہم سب پھر اسی کھلے میدان میں آکر بیٹھ گئے موسم میں اکتوبر کی خوشگوار خنکی تھی۔ بلب بجھا دیئے گئے۔ چاندنی رات اور بھی سہانی لگنے لگی۔ جب سب لوگ بیٹھ گئے تو فیروز صاحب پھر کھڑے ہوئے اور بولے کہ بھائیو۔ آج کے جشن کی یہ آخری قسط ہے۔ آئیے کچھ گلا صاف کرلیں اور پھر بولے کہ لیجیے پہل میں ہی کیے دیتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے دو ایک غزلیں سنائیں۔ اس زمانے میں ادب سے زیادہ لگاؤ تھا کے علاوہ فلمی گانوں کو اس طرح کی محفلوں میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اچھے کلام کی داد بھی دی جاتی تھی بہرکیف یہ طے تھا کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ سنائے گا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ محسن صاحب جو جونیئرز کی کھینچائی کرنے میں تو بڑی ہی خاموشی سے پیش پیش رہتے تھے مگر اپنے معاملے میں بھی زیادہ نمبر پانے کے مستحق نہ تھے۔ چنانچہ جب ان کا نمبر آیا تو بڑے تکلف سے دو اشعار تحت اللفظ میں سنا پائے۔ سبھی ان کی اسی پر جان بخشی کردی۔

ابھی تقریباً آدھے آدمی ہی کچھ سنا پائے تھے کہ ہوسٹل کے مین گیٹ پر کچھ سائے دکھائی دیئے۔ اسرار صاحب نے دیکھ لیا۔ فوراً فیروز صاحب کو متوجہ کیا۔ وہ فوراً سمجھ گیے اور پہچان گئے بغیر کسی تاخیر کے یہ تمام سینئرز ایکدم سے گیٹ کی طرف لپکے اور وہاں سے محمود صاحب پرووسٹ اور حقی صاحب وارڈن کا استقبال کرتے ہوئے اپنے ساتھ لے آئے اور بولے کہ لیجیے صاحب ہمارا اڈنر اب مکمل ہوگیا۔ چیف گیسٹ اور گیسٹ آف آنر کی کمی تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔ سب لوگ مسکرا دیئے۔ محفل پھر جم گئی اور نووارد بھی اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔

دراصل مین ڈنر تو وہیں مارلین کورٹ میں ہی ہوا۔ جس میں پرووسٹ اور تمام وارڈن صاحبان نے شرکت کی مگر اس تعلق کو کیا کیجیے کہ ان مشفق اساتذہ کے دل کو چین نہ آیا اور وہ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اُس فنکشن کے بعد یہاں ان روٹھے ہوئے بدمعاشوں کو دیکھنے چلے آئے۔ سارے گلے شکوے جاتے رہے۔

غزلوں کا سلسلہ ختم ہوا تو پھر فیروز صاحب نے باقاعدہ دونوں مہمان کو خوش آمدید کہا۔ ان کی دلچسپی اور سرپرستی کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔ جس کے بعد محمود صاحب نے بھی بہت عمدہ تقریر فرمائی جو ایک افسر یا استاد کی کم اور ایک مشفق و مہربان کی گفتگو زیادہ تھی۔

رات کے ۱۲ بج رہے تھے۔ ہم میں سے وہ جن کے پرچے دوسرے دن تھے جلد اٹھنے کے لیے بیتاب تھے لیکن پہلے اُٹھ جانا بھی تو سوئے ادب تھا۔

(باقی آئندہ)


بہارِ نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت
شربت نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ کے لئے
مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے
پھنسی، خارش اور داد
کھجلی کی دوا
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U. ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ


ہمدرد
cinkara
cinkara
● جوش اور ولولہ برقرار رہتا ہے۔
آپ اور آپ کے خاندان کی صحت اور
خوش حالی کے لیے
ہر موسم کا سدابہار ٹانک سنکارا
جو پیئے
ہر روز
دو چمچے
دو بار
سنکارا جگائے جینے کی امنگ

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

۱۴   اگست ۱۹۹۵ء   شمارہ ۸

بانی سرسیّد احمد خاں

مدیر ——————— نائب مدیر

فیسر نعیم احمد ——————— احمد مجتبیٰ قریشی

سرکولیشن انچارج : محمد عتیق قاضی

شمارہ	6 = 50 روپے	زرسالانہ 00 = 65	زرسالانہ طلبہ 00 = 45 روپے
ونی ممالک (ہوائی ڈاک)	00 = 30 امریکی ڈالر	بیرونی ممالک (عام ڈاک)	00 = 15 امریکی ڈالر
ف ممبرشپ (اندرون ملک)	00 = 650 روپے	لائف ممبرشپ (بیرون ملک)	00 = 300 امریکی ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اور نشانت

۱۔ شبلی روڈ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ترتیب

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے متفق ہو]
ایڈیٹر پبلیشر پروفیسر نعیم احمد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کے توسط سے چھپوا کر ادارۂ تہذیب الاخلاق اور نشانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا۔

اداریہ

۲۱ ویں صدی کی دہلیز پر پہنچ کر ہمارا ملک ایک زبردست نظریاتی ۔تہذیبی کشمکش میں مبتلا ہے ۔ نئی سیاسی اکائیاں بن رہی ہیں ۔جمہوریت، جمہوری حقوق، سیکولرزم اور قانون کی حکمرانی کو کچھ سیاسی گٹھ بندھن ایک نیا مفہوم دینے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ایسے میں اردو زبان بولنے والے اس سے محبت کرنے والے لوگوں اور جمہوریت اور جمہوری حقوق کے تحفظ کے لیے کمربستہ افراد، اداروں، گروہوں اور انجمنوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نہ صرف خبردار رہیں، اردو زبان کے حقوق کا جواز بھی مدلل اور پرزور انداز میں پیش کرتے رہیں ۔ ہندوستان میں جمہوریت، سیکولرزم اور جمہوری حقوق کی بقا کا دارومدار اردو زبان کی بقا اور فروغ پر ہے ۔

اردو مختلف نظریوں اور ثقافتوں کے امتزاج، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور علاقائی حد بندیوں سے بلند ہو کر سوچنے اور بات کہنے کی کاوشوں کے نتیجے میں پیدا ہوئی ۔ اسے حکمراں طبقوں نے نہیں، میل ملاپ کے لیے تڑپ رہے عام لوگوں نے، نفاق، تفریق، امتیاز سے بیزار کام کرنے والے لوگوں نے اپنا بنایا تھا ۔یوں رواداری، ہم آہنگی اور یگانگت اردو کے خمیر میں شامل ہے ۔ یہ کام کرنے والے لوگ مختلف مذاہب کے ماننے والے تھے ۔یوں عصبیت اردو زبان سے ہمیشہ بارہ پتھر باہر رہی اور سیکولرزم اس کا ناگزیر جزو بن گیا ۔ یہ عام لوگوں کی، جمہور کی زبان بنی ۔یوں اسی زبان نے عام آدمی کو، جمہور کو، اس کے حقوق دیئے ۔

اردو زبان کے چلن سے قبل جس زبان میں خیالات، جذبات، احساسات، آرزوؤں، تمناؤں اور محرومیوں کا اظہار کیا جاتا تھا، وہ جمہوری زبان نہیں تھی ۔یوں جمہور کو اپنی بات کہنے کا حق حاصل نہیں تھا ۔ اردو نے جمہور کو اظہار بیان، اظہار رائے کا حق بخشا ۔ یہ سب سے بڑا اور سب سے اہم حق ہوتا ہے ۔جمہور کو یہ حق بخشنے کا سہرا اردو ہی کے سر ہے ۔

سامراجی غلامی سے نجات اور جاگیردارانہ استحصال کے خلاف جنگ کے لیے بھی اردو زبان نے ہی برصغیر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگوں کو سرگرم عمل کیا تھا ۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ اردو ہی نے دیا تھا جس نے آزادی کی وہ تڑپ پیدا کی تھی، دلوں کو یوں گرمایا تھا کہ بالآخر غلامی کی بیڑیاں پگھل کر گر پڑی تھیں ۔

آزادی کی جدوجہد کے دوران ہی ایسی قوتیں بھی وجود میں آئی تھیں جو سامراجی کھیل ر
وارانہ ہم آہنگی، سیکولرزم، جمہوریت اور جمہوری حقوق سے انہیں ازلی بیر تھا۔ اس لیے انہوں نے گنگا جم
اس کی زبان اردو کو اپنا سب سے بڑا نشانہ بنایا۔ ان قوتوں نے اردو زبان کا گلا گھونٹنے کی سر توڑ کوشش
تاکہ وہ نظریات اور نصب العین ہی گونگے ہو جائیں۔ اور یہ ایک نئی پٹی پڑھا سکیں۔

گنگا جمنا کے دوآبہ اور اس سے ملحق علاقوں میں بھی ان قوتوں کے عزائم بہرحال پورے نہیں
گنگا جمنی تہذیب اور اردو کو زک پہنچانے کی کوشش میں وہ نصب العین ضرور مجروح ہو گئے، جو ہمار
زندہ و تابندہ حقیقت ہیں ـــــــــــ سیکولرزم، سوشلزم اور جمہوریت ـــ

اردو کے حقوق کا معاملہ کسی ایک لسانی یا تہذیبی گروہ کا نہیں۔ یہ تو ہر ایسے اعلیٰ نصب العین کا
کا معاملہ ہے جس کے لیے ہمارے بزرگوں نے صبر آزما مصیبتیں جھیلی تھیں۔ یہ ایک ایسے ہندوستان
ہے جس کا ہمارے بزرگوں نے خواب دیکھا تھا۔ اردو کے حقوق کا معاملہ اس انداز میں پیش کیا جانا
یہ ظاہر ہو کہ اگر یوں ہو جائے تو ہندوستان فیل پا کی گرفت سے آزاد ہو جائے۔ اس رہائی کے بعد ہی
معنیٰ میں اپنی مرضی سے ترقی کی راہ پر چل سکے گا۔ ہم بہت وقت گنوا چکے ہیں۔ اکیسویں صدی کے تقا
کے لیے ماضی کی زنجیروں کو نہیں، ان اقدار کو اپنانا ہوگا جو اپنی قدر و قیمت کا ثبوت پیش کر چکی ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقتدار حسین فاروقی*

عہدِ وسطیٰ میں اسلامی سائنس کا عروج و زوال

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "علم دماغ کو روشن کرتا ہے" اور "انسان کی حفاظت کرتے ہوئے اس کو بندگی پر آمادہ کرتا ہے"۔ برخلاف اس کے جہل انسان کے لیے عرفان سے محرومی کا سبب بنتا ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں خلفائے راشدین کے ارشادات نے عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں کو سائنس کی جانب اس حد تک متوجہ کیا کہ مشہور مصنف جارج سارٹن George Sarton یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ساتویں صدی عیسوی سے لے کر بارھویں صدی عیسوی کے دور کو اگر پچاس سال کے ادوار میں منقسم کر کے ان میں سے ہر ایک دور کو دنیا کے کسی ایک عظیم عالم سے منسوب کیا جائے تو پتا چلے گا کہ یہ سارے ادوار مسلمان سائنس دانوں کے ناموں سے منسلک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے سائنس داں اور مورخین کا متفقہ نظریہ ہے کہ یونانی سائنس کے زوال کے بعد ساتویں صدی سے چودھویں صدی کے سائنسی دور کو واقعتاً اسلامی سائنس کا دور سمجھنا چاہیے۔ اسلامی دور میں علم کی اہمیت کا اندازہ غرناطہ یونیورسٹی کے صدر دروازے پر لکھے گئے اس ایک نعرہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس میں تحریر تھا کہ دنیا چار چیزوں پر قائم ہے ۔ ۱۔ عاقل کا علم۔ ۲۔ حکمراں کا انصاف۔ ۳۔ پرہیزگار کی عبادت۔ ۴۔ بہادر کی شجاعت۔

چودھویں صدی عیسوی کے بعد مسلمان تجرباتی اور تحقیقاتی علم کے بجائے روایتی علم کو زیادہ اہمیت دینے لگے اور بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی:

> "سائنس کی عظیم الشان خدمات انجام دینے کے بعد عرب اور مسلمان اپنی تحقیقی و علمی روش بھول گئے اور تجربہ و مشاہدہ کو وسیع تر کرنے کے بجائے مقلدانہ اور روایتی ذہنیت کا شکار ہو گئے جس کے نتیجے میں وہ سائنسی و صنعتی میدان میں مغرب سے پیچھے رہ گئے اور ان سے ہی سیکھے ہوئے علمی و سائنسی حربوں اور ہتھیاروں سے مغرب نے انھیں غلام بنا دیا۔"

مسلمانوں کا تیزی سے دنیاوی علوم پر چھا جانا اور پھر دفعتاً اُن علوم سے بیزار ہو جانا انسانی تاریخ کا ایک عبرت انگیز باب ہے۔ اسلامی سائنس کا زوال جب چودھویں صدی کے اواخر میں نظر آنے لگا تو مفکرِ اسلام ابن خلدون (۱۳۳۲ - ۱۴۰۶ء) نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا اور علم سے اس دوری کو غیر اسلامی عمل قرار دیا۔ اسلامی سائنس جب انیسویں صدی عیسوی میں اپنے زوال کی انتہا کو پہنچ گئی تو سر سید مسلمانوں کی پستی دیکھ کر کرب سے بے تاب ہو گئے اور امتِ مسلمہ کو ایک بار پھر اپنی اصلی روش پر واپس آ کر علم

* اسسٹنٹ ڈائرکٹر، نیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ۔

علوم کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دینے لگے۔ افسوس کہ مسلمانوں نے صدقِ دل سے اس دعوت پر لبیک نہ کہا جس کا نتیجہ آج سامنے ہے۔
آج مسلمان اپنے ماضی کی تو خوب بات کرتا ہے لیکن حال کے ذکر سے کتراتا ہے۔

علم سے اسلامی رغبت کی مثالیں سات سو سال کی عہدِ وسطیٰ کی اسلامی سائنس کے عروج کی تاریخ سے عیاں ہیں جن میں ایسے سائنس دانوں اور مفکروں نے جنم لیا جن کے خیالات، تجربات اور انکشافات سے یورپ نے فائدہ اُٹھا کر اپنے آپ کو تاریک دور (Dark age) سے نکال لیا اور ساری دنیا میں نئے سائنسی انقلاب کے روحِ رواں بن کر گویا اس کے بانی بن گئے۔

اسلامی دنیا کا درخشاں سائنسی دور وہی ہے جو یورپ کا تاریک دور سمجھا جاتا رہا ہے۔ ڈی کیمبل (D. Campbell) نامی سائنس داں نے اس فرق اور تضاد کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

During the period of Islamic Science, Europe was in dark ages and evils of pedantry, bigotry, cruelity, charms, amulets and relics were common there.

جس کا ترجمہ اس طرح کیا جاسکتا ہے:

"اسلامی سائنس کے عروج کے دور میں یورپ میں مکمل تاریکی تھی اور وہاں ظلم و زیادتی، کٹرپن، جادو ٹونا اور جھاڑ پھونک عام تھی۔"

کیمبل (Campbell) عہدِ وسطیٰ کے یورپ اور اسلامی دنیا کے علمی ماحول کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جس وقت بغداد اور قرطبہ کے خلفاء عوام میں تعلیم کو عام کرنے میں اس حد تک کامیاب تھے کہ ان دو شہروں میں بارہ سال سے زیادہ کا ہر لڑکا اور لڑکی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اس وقت یورپ کے حکمران (Lords) اور امراء (Barons) کی بیویاں (رانیاں) اور بچے (شہزادے) اور بچیاں (شہزادیاں) اپنے نام بہ مشکل لکھ سکتے تھے۔ واضح رہے کہ عہدِ وسطیٰ میں بغداد کی آبادی دس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی اور تقریباً اتنی ہی آبادی قرطبہ کی تھی۔

کیمبل (Campbell) مزید لکھتا ہے کہ علم کو عام کرنے اور اس کے حصول کے سلسلے میں مسلمان خلفاء مذہب کی بنیاد پر کسی فرق کو غیر اسلامی تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اسلامی دور کے عہدِ وسطیٰ کے مشہور سائنس دانوں میں مسلمان ناموں کے ساتھ ساتھ یہودی اور نسطوری (عیسائی) نام بھی ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر مسلموں کی قدر و منزلت کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں جن کی مدد سے یونانی، چینی اور ہندوستانی علم سے دنیائے اسلام نے فیض اُٹھایا۔

عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں کی سائنس سے شدت سے دلچسپی کو پی۔ کے ہٹی (P.K. Hitti) نامی مورخ Voracious appetite for learning (علم کی بے پناہ بھوک) سے تعبیر کرتا ہے اور کسی حد تک حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے حدیثِ نبوی "علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین جانا پڑے" کی پیروی کرتے ہوئے علم کی تلاش میں دور دراز کے سفر اختیار کیے۔ سفر کے دوران جن عالموں نے اپنی جانیں دیں ان کا مرتبہ شہیدوں کے مرتبے کے برابر سمجھا گیا۔

ڈی بوائر (De Boer) اسلامی سائنس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ عہدِ وسطیٰ کے مسلمانوں کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سائنس کو فرسودہ اعتقادات سے آزاد کرالیا اور یونانی مسالہ (علم) کو بنیاد بنا کر ایک خوب صورت محل (سائنس کا) تعمیر کردیا جس سے بعد میں ساری دنیا مستفید ہوئی۔

مشہور مصنف میرہاف (Meyerhoff) اسلامی سائنس کے عروج و زوال کی دلکش اور کسی حد تک عبرت انگیز تصویر کشی

اپنے الفاظ میں اس طرح کرتا ہے :

Islamic Science reflected the light of Hellenic Sun when its day had fled and they shown like a moon, illuminating the darkest night of European Middle Ages The moon faded at the dawn of a new day - the Renaissance.

یعنی ڈوبتے ہوئے یونانی سورج (علم) کی روشنی لے کر اسلامی سائنس کا چاند دمکنے لگا اور یورپ کے عہدِ وسطیٰ کی تاریک ترین رات کو روشن کر دیا۔ یہ چاند بعد میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دن نکلنے سے قبل ماند پڑ گیا۔

اسلامی سائنس کے زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور مصنف E. Atiza نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ چودھویں صدی کے بعد مسلمانوں میں سوچنے کی صلاحیت ختم ہوتی دکھائی دی اور وہ کسی نئی ایجاد کی جگہ روایتی علم پر انحصار کرنے لگے خیالات کی جگہ الفاظ پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ الفارابی، ابن سینا اور غزالی جیسے مفکر اسلام کی تصنیفات کو پڑھنا بے سود سمجھنے لگے۔

زیرِ نظر مضمون میں اسلامی سائنس کے عروج و زوال کی مکمل تاریخ پیش کرنا راقم الحروف کے بس کی بات نہیں لیکن ان سائنس دانوں کی ایک مختصر فہرست تو یقیناً پیش کی جاسکتی ہے جن کے نام اور کام پندرھویں صدی سے یورپ والوں کے لیے اتنے عام ہو گئے کہ ان ناموں کو لاطینی (Latin) جامہ دے دیا گیا۔ کہا جاتا ہے اسلامی سائنسی دور کے چار اطباء ایسے ہیں جن کی تصنیفات کا یورپ والے علم رکھتے ہیں۔ آج بھی یوروپین سائنس داں اسلامی دنیا کے سائنس دانوں کی قدر کرتے ہیں اور ان کی تصنیفات کو اپنی لائبریریوں میں باقاعدگی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ الکندی کی ایک سو سے زیادہ تصنیفات یورپ کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح جابر بن حیّان کے کارناموں کی تفصیل روم، لیوں اور پیرس وغیرہ کی لائبریری میں دیکھی جاسکتی ہے۔ زکریا رازی کی الحاوی Continens اور بوعلی سینا کا القانون Canon کے اصل نسخے نہ صرف یہ کہ یورپ میں محفوظ ہیں بلکہ ان کے ترجمے تقریباً یورپ کی ہر زبان میں دستیاب ہیں۔ دلچسپ اور حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ اسلامی دنیا (عہدِ وسطیٰ) کی سائنس اور سائنس دانوں کی قدر یورپ میں تو ہے لیکن مشرق میں لوگ ان سے زیادہ واقف نہیں۔ ذیل میں چند ایسے سائنس دانوں کے نام پیش کیے جاتے ہیں جن کے تذکرے سے مغرب کے سائنسی لٹریچر میں اب بھی خوب ملتے ہیں لیکن یہ نام چونکہ لاطینی جامہ لیے ہوئے ہیں لہٰذا بعض لوگ نہیں جان پاتے کہ ان کا تعلق عہدِ وسطیٰ کی اسلامی سائنس سے ہے جس کا زوال ہوئے کئی برس بیت چکے ہیں اور نہ جانے کتنے لوگ اس کے Revival یعنی از سرِ نو زندگی کے منتظر ہیں۔

۱. جابر بن حیان	Geber	(۷۲۱-۷۷۶ء)	۲. زکریا رازی	Rhazes	(۸۴۱-۹۲۶ء)
۳. بوعلی سینا	Avicenna	(۹۷۹-۱۰۳۷ء)	۴. ابن رشد	Averroes	(۱۱۲۶-۱۱۹۹ء)
۵. ابوالقاسم زہراوی	Albucasis	(۹۳۶-۱۰۰۹ء)	۶. عیسیٰ بن علی نسطوری	Jesu haly	(۹۵۰-۱۰۱۲ء)
۷. ابن اسحٰق الکندی	Alkindus	(۸۱۳-۸۷۳ء)	۸. حنین بن اسحاق نسطوری	Johannitus	(۸۰۷-۸۷۳ء)
۹. یحییٰ بن سرابی	Serapion Senior	(۱۰۴۲ء پیدائش)	۱۰. علی بن عباس	Haly Abbas	(۹۵۴ء وفات)
۱۱. ابن نفیس	Annafis	(۱۲۸۸ء وفات)	۱۲. یوحنا بن ماسویہ	Janus Damascenus	(۷۷۷-۸۵۷ء)
۱۳. ابن ابوخالد	Algazirah	(۱۰۰۴ء وفات)	۱۴. موسیٰ بن میمون یہودی	Maimonides	(۱۱۳۵-۱۲۰۸ء)

۱۵۔ ابن وافد	Aben Guefit (۹۹۶-۱۰۷۵ء)	۱۶۔ ابن بیطار	Albetor (۱۲۴۸ء وفات)
۱۷۔ ابن سرابی	Serapion Junior (۱۰۷۰ء وفات)	۱۸۔ ابن جبریل یہودی	Avencebrol
۱۹۔ ابن باجہ	Avempace (۱۱۳۸ء)	۲۰۔ ماسویہ الماردینی	Mesue Junior (۱۰۱۵ء وفات)
۲۱۔ ابن الہیثم	Al hazen (۹۶۵-۱۰۲۱ء)	۲۲۔ الفارابی	AlPharbius (۹۵۰ء وفات)
۲۳۔ الطبری	Al Tarir (۸۲۲-۸۹۹ء)	۲۴ ابن زہر	Aven Zoar (۱۰۹۱-۱۱۶۲ء)
۲۵ ماشاءاللہ	Macellama (۸۰۶ء وفات)	۲۶ ابن سینان البتانی	Albatenius (۸۰۶ء وفات)
۲۷ ابن یحییٰ زارقلی	Arzachel (۱۰۲۹-۱۰۸۷ء)	۲۸ ابوالمعانی زہر	Alguazir (۱۱۳۰ء وفات)
۲۹۔ ابویعقوب اسحٰق یہودی	Judaeus (۸۵۰-۹۴۱ء)	۳۰۔ ابوعباس فرغانی	Afraganus (۸۸۲ء وفات)

مندرجہ بالا ناموں کے علاوہ بھی ایک طویل فہرست ایسے مسلمان سائنس دانوں کی ہے جو اپنے اصل ناموں سے یورپ میں جانے جاتے ہیں اور جن کی تصنیفات وہاں محفوظ ہیں مثلاً البیرونی، خوارزمی، مسعودی، اصطرلابی، مسکویہ، خردازبہ، عمر خیام (بہ حیثیت ریاضی داں) وغیرہ وغیرہ۔

واضح رہے کہ یورپ میں اسلامی دنیا کے مشہور مسلم و غیر مسلم سائنس دانوں کے سارے نام چودھویں صدی عیسوی کے بیشتر کے ہیں ان میں زیادہ تر کی تصانیف یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں صدیوں شامل رہیں۔ مثلاً جابر بن حیان کی کیمیا کو چھ سو برس تک پڑھایا جاتا رہا۔ بوعلی سینا کی القانون کا مطالعہ تقریباً پانچ سو سال میڈیکل درس گاہوں میں ضروری سمجھا گیا۔ اسی طرح خوارزمی کے الجبرا کی اہمیت انیسویں صدی کے آخر تک قائم رہی۔ دلخراش بات تو یہ ہے کہ پندرھویں صدی سے انیسویں صدی کے دور میں مسلم دنیا ایک بھی سائنس داں ایسا پیدا نہ کر سکی جس کی چھاپ مغربی سائنس پر ہو اور جس کا نام یورپ میں احترام کے ساتھ لیا جاتا رہا ہو جیسا کہ جابر، رازی، البیرونی، خلدون، فارابی وغیرہ کا نام تھا۔ پندرھویں صدی سے نہ جانے کیوں مسلمانوں میں سائنس سے بیزاری، بے توجہی اور کسی حد تک نفرت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر میں پوری اسلامی دنیا چودھویں صدی کے بعد کی مغربی سائنس سے قطعاً ناآشنا تھی بلکہ بقول Atiyah مسلمانوں کو اس سائنس کا بھی مکمل علم نہ تھا جسے انھوں نے ساتویں صدی سے چودھویں صدی تک حاصل کیا تھا گویا کہ سائنسی زوال کے دوران انھیں اپنے سائنسی عروج کا حال تک معلوم نہ تھا۔ وہ تو بس "روایتی" اور "مقلدانہ" علم کو اصلی علم سمجھنے لگے تھے اور اسی میں پناہ لے کر خراب دور (انیسویں صدی) کے گزر جانے کے انتظار میں تھے اور اللہ سے دعا گو رہتے تھے کہ معاشی، سیاسی اور اخلاقی پستی سے انھیں نکال لیا جائے۔ شاعر کی یہ تنبیہ بھی ان کی غیر علمی یعنی غیر اسلامی روش کو نہ بدل سکی، کہ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی ۔۔۔ نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

حکیم محمد حسین خاں شفا*

کچھ آثار قاضی عبدالغفار

قاضی صاحب بڑے باصلاحیت اور بہت بے چین طبیعت کے مالک تھے۔ آپ کی پیدائش مرادآباد میں ہوئی تعلیم و تربیت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں قاضی صاحب کے خاندان کے رواسائے رام پور سے دیرینہ تعلقات تھے۔ اسی بنا پر آپ کا رام پور آنا جانا کثرت سے رہتا تھا۔ اسی سب سے آپ کی یادیں اور کچھ یادگاریں آج بھی رام پور میں محفوظ ہیں۔ رام پور سے ایک رسالہ نیرنگ شائع ہوتا تھا اس کے ایڈیٹر کی یہ دلی خواہش تھی کہ قاضی صاحب اپنی سوانح اور کوئی اچھی سی تصویر اشاعت کے لیے دیں۔ قاضی صاحب چونکہ بےحد منکسر المزاج اور خود پوش تھے اس بنا پر ٹالتے رہے آخر ایڈیٹر کو بتوسط فضل رب ہارغ سنبھلی اپنی اس خواہش میں کامیابی ہوئی۔ اور قاضی صاحب نے مختصر سوانح اور تصویر عنایت کی جو نیرنگ مارچ ۱۹۲۹ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں "میں اپنی زندگی کے حالات کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ عمر کے بیالیس سال ایک جستجوئے بےمعنی میں گزر گئے۔ ابتدائی عمر سرکاری ملازمت میں گزری اس سے جی اکتایا تو اخبار نویسی کی بلا میں پھنس گیا۔ شروع سے اخبار ہمدرد کا ایڈیٹر رہا پھر کلکتہ سے صداقت اور جمہور روزنامہ نکالا۔ وہاں ۱۹۱۷ء میں ایک بلوہ ہوا اس کے سلسلہ میں مجھے خارج البلد کیا گیا۔ اور آٹھ ماہ نظربند رہ کر جب چھوٹا تو دہلی آیا۔ یہاں سے روزنامہ صباح جاری کیا۔ حکیم مسیح الملک مغفور کی صنمیت میں شعر و شاعری کا چرچا رہا کرتا تھا۔ مغفور حکیم اجمل خاں کبھی کبھی اصلاح فرمادیا کرتے تھے۔ آج تک میرا کلام کبھی شائع نہیں ہوا۔ صباح کی ضمانت ضبط ہونے کے بعد وفد خلافت کے ساتھ انگلستان گیا پھر کچھ اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں دو دفعہ یورپ کا سفر کیا۔ ۱۹۲۵ء میں واپس آکر مرادآباد میں اقامت اختیار کی۔

۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ مرادآباد میونسپل بورڈ کا چیرمین ہوا اب دسمبر میں دوبارہ منتخب ہوا۔ ایک بےمعنی اور مہمل زندگی آدھی سے زیادہ گزر گئی معلوم نہیں کتنی باقی ہے۔ کلام کو شائع کرنا نہ کبھی پسند کیا نہ وہ شائع کرنے کے قابل ہے۔ دوچار شعر آپ سن لیجیے اور اگر رسالہ میں درج کرنے کے قابل ہوں تو درج فرما دیجیے

"عبدالغفار" رسالہ نیرنگ رام پور صفحہ ۲۳۳) ایڈیٹر نے قاضی صاحب کا ایک بھی شعر تحریر نہیں کیا ہے۔ مرادآباد کی چیرمینی کے بعد قاضی صاحب حیدرآباد چلے گئے اور وہاں سے "پیام" نام کا اخبار نکالا۔ قاضی صاحب کی مستقل تصانیف میں "لیلیٰ کے خطوط" مجنوں کی ڈائری، تین پیسے کی چھوکری، اس نے کہا، خلیل جبران، سیب کا درخت، آثار جمال الدین، آثار ابوالکلام اور حیات اجمل ہے۔ قاضی صاحب اپنی تصانیف میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی سوانح کو بہت

---

* رضا لائبریری رام پور، رام پور۔ (یوپی)

اہمیت دیتے تھے۔ قاضی صاحب کا کافی وقت صحافت سیاست اور قیادت میں مشاہیر وقت کے ساتھ گزرا۔ لیکن اپنے مزاج اور طبیعت کی وجہ سے ان سب سے بیزار رہے اس سلسلے میں ان کی کچھ مشاہیر سے نوک جھونک اور اختلاف بھی رہا جس کے بارے میں رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب دید و شنید میں قاضی صاحب پر محسن کشی اور احسان فراموشی کا الزام لگایا ہے۔ قاضی صاحب مولانا محمد علی کے شیدائی تھے۔ اور انہوں نے بھی مولانا محمد علی کی طرح اپنا سب کچھ سیاست کی نظر کر کے آخری عمر بہت کسمپرسی کے عالم میں گزاری۔ وہ کسی معقول ملازمت کے متلاشی رہے۔ اس سلسلے میں شوکت علی اور مولانا عرفان سے درخواست کی کہ وہ امیر افغانستان سے سفارش کر کے انہیں سروس دلا دیں لیکن کام نہ بنا۔ عرفان صاحب نے قاضی صاحب کو میدانِ سیاست و صحافت میں جمے رہنے کا مشورہ دیا۔ جس کے سلسلے میں دلچسپ خط قاضی صاحب نے مولانا عرفان کو تحریر کیا۔ وہ لکھتے ہیں "مولانا صحافت اور سیاست کا تو خیال بھی نہ کیجیے شکستہ خاطر ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پہلا سوال روٹی کا ہے اگر مجھے سرمایہ مل جائے اور میں کوئی آزاد اخبار جاری بھی کر دوں تو جانیے کہ ہندوستان کے اس عہد میں کوئی ایماندار اخبار نویس دو وقت روٹی بافراغت نہیں کھا سکتا۔ روٹی کی فکر کے ذریعہ سے استحصال بالجبر کیجیے یا قومی چندے جمع کر کے ہضم کیجیے یا طلائے واجد علی شاہی اور حبِ ملذذ کے اشتہار شائع کیجیے۔ مسلمانوں کی سیاست اب صرف یہ ہے کہ ہر مسلم لیڈر نے اپنے چھپر میں چھید کر لیا ہے اور منتظر ہے کہ اللہ میاں چھپر پھاڑ کر دیں گے۔ گلے میں ڈھولک ہے ہاتھ میں طنبورہ ہے حلق بڑا ہے زبان لمبی ہے اور اگر مولوی ہے تو معدہ توی۔ سے ایک بڑا مقتدر موجود ہے۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ۔

"پہچانتا نہیں ہوں ابھی رہبر کو میں"

حکیم کی سیرت کا کام شروع کر دیا ہے۔ گو دشواریاں بہت زیادہ ہیں اور بدقسمتی سے کچھ لوگ مجھے اس کام کے لحاظ اپنے اغراض و مقاصد کے موزوں نہیں سمجھتے اس لیے جن اطراف سے کافی امداد ملنا چاہیے وہ نہیں ملتی۔ مسیح الملک کا سوانح نگار بننا چاہتا ہوں یہ کام مجھ سے بن آئے تو سمجھوں گا کہ زندگی کی تمام ناکامیوں کا نعم البدل مل گیا۔

قاضی صاحب کی علمی اور انتظامی صلاحیت کا ظہور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہونے کے بعد ہوا۔ انہوں نے توسط سے اردو زبان اور علم و ادب کی جو خدمت کی وہ ناقابل فراموش ہے۔ قاضی صاحب کا بڑا وقت حکیم اجمل کے ساتھ گزرا۔ وہ حکیم صاحب کی شخصیت سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں جب حکیم اجمل خاں صاحب بحالی صحت کے سلسلہ میں نواب صاحب رام پور کے ساتھ یورپ کا سفر کیا تو پیرس میں قاضی عبدالغفار صاحب رہا۔ جب پیرس سے حکیم صاحب نے احباب رام پور کے نام خط لکھا تو اس میں اپنے دوست ڈپٹی صاحب کے لیے قاضی صاحب نے بھی تحریر کر دیں۔ قاضی صاحب کا ۱۷ر جنوری ۱۹۵۶ء کو باسٹھ سال کی عمر میں علی گڑھ میں انتقال ہوا اور وہیں ان کی تدفین ہوئی۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی*

پیغامِ محمدیؐ

عقل اور دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ بنی نوع انسان کی حقیقی بھلائی، اعمال کی نیکی، اخلاق کی بہتری اور دلوں کی صفائی کی کامیاب کوشش اگر کسی نے انجام دی ہیں تو وہ صرف ان انسانوں نے انجام دی ہیں جو کہ خدا کے فرستادہ ہو کر اس دنیا میں آئے اور دنیا کو نیک تعلیم وہدایت دے کر اپنے بعد بھی لوگوں کے لیے چلنے کا ایک کامیاب راستہ بنا کر چھوڑ گئے۔

پروردگار عالم کی بے شمار نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ان ہستیوں کی آمد، اور اس کی نوازشوں میں سب سے دلکش عطیہ ان ہستیوں کی سیرت اور ان کا کردار وعمل ہے ـــ انسانیت کی آبرو انہی پاک دامن ہستیوں کے وجود سے قائم رہی جن کو پروردگار ہر دور میں دنیا کے مختلف خطوں میں پیدا کرتا رہا، اگر ان ہستیوں کے کردار اور جوشِ عمل کو کائناتِ ہستی کے نقشہ سے علیحدہ کر دیا جائے تو دنیا کی تاریخ ہوا وہوس، اوہام وخرافات اور جنگ وجدال کی بے رونق پُر وحشت اور خاموش داستان بن کر رہ جاتی ہے۔ ان پاک باز اور نیک نہاد شخصیتوں نے بے پناہ جدوجہد کے ساتھ ماحول کی انتہائی ناسازگاریوں اور ناموافق ترین حالات میں اللہ کی مرضی کو پورا کیا اور اس کے احکام کو انسانوں تک پہنچایا

رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس جماعت کے سربراہ اور سردار ہیں۔ اس لیے قدرتی طور پر آپؐ کی سیرت اور کردار کا قالب بھی زیادہ دل آویز و مکمل ہے۔ اور آپؐ کی زندگی کے حالات کا ایک ایک گوشہ خستہ حال اور بھٹکی ہوئی دنیا کی رہنمائی اور دست گیری کے لیے اپنی تمام رعنائیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ سیرتِ محمدیؐ میں خدا کے بھیجے ہوئے تمام پیغمبروں کی سیرتوں کا عطر آسمانی ہدایت کا جوہر اور روحانی طاقت و اثر انگیزی کا سب سے بڑا خزانہ پوشیدہ ہے

آیئے ان لمحات میں حضورؐ کی سیرت اور پیغمبرانہ کارناموں پر ذرا ایک طائرانہ نظر ڈالیں اور حالات کی ان کروٹوں میں ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ جن کے بارے میں شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم یوں سخن سنج ہوتے ہیں

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے — غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق ومستی میں وہی اول وہی آخر — وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین وہی طٰہٰ

آپؐ کے پیغام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا تعلق کسی خاص طبقے اور نسل سے نہیں پوری کائنات انسانی سے ہے۔ آپ کی زبان سے تمام عمر کوئی لفظ بھی ایسا نہیں نکلا اور نہ زندگی بھر کوئی ایسا کام کیا جس سے یہ بھی شبہ

---

* شیخ الجامعہ جامعہ دارالسلام، دہلی گیٹ، مالیر کوٹلہ۔ ۱۴۸۰۲۳ (پنجاب) انڈیا
تہذیب الاخلاق علی گڑھ اگست ۱۹۹۵ء

ہو سکتا ہو کہ آپ کو انسانوں کے ایک طبقے کے مقابلے میں دوسرے طبقے کے مفاد سے زیادہ تعلق ہے، چنانچہ آپ نے سب سے پہلے اس معبود حقیقی کا تصور پیش کیا جو صرف رب المسلمین نہیں رب العالمین ہے۔ آپ نے نسلی اور وطنی تعصب میں پھنسی ہوئی دنیا کو بتایا کہ وطنی، قومی اور قبائلی خداؤں کی کوئی حقیقت نہیں اللہ وہ ہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے۔

وحی الٰہی نے بار بار آپ کی زبان سے یہ اعلان کرایا کہ انسان کی تخلیق بہترین معیار پر ہوئی ہے۔ اور اسی بنیادی طور پر مستحق عزت اور لائق تکریم ہے۔ نسل، رنگ اور زبان کے تفرقے بے حقیقت اور بے معنی ہیں، امتیاز انسانوں کے لیے ہے۔ تمام انسان انسانی وحدت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں، کسی عربی کو غیر عربی پر کسی کالے پر کوئی فضیلت اور برتری نہیں، سب کے سب آدم کی اولاد اور کنبہ ہیں، اور آدم کا پتلا مٹی سے بنا۔ اس کے ساتھ آپ نے ضمیر اور عقیدے کی آزادی کے احترام اور تحفظ کے لیے یہ انقلاب انگیز اعلان فرمایا کہ معاملے میں کسی طرح کا کوئی جبر و اکراہ نہیں یعنی یہ کہ عقیدہ دل کے یقین اور روح کے اطمینان کا نام ہے اور زور زبردستی نہیں ہو سکتی۔

ضمیر اور مذہب کی آزادی کے بعد یہ تعلیم بھی غیر معمولی اہمیت کے ساتھ دی کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبر برحق ہیں خواہ وہ کہیں بھی مبعوث کیے گئے ہوں ان کے درمیان کوئی امتیاز اور تفریق نہیں، ان پر اور ان کی صداقت پر ایمان لانا اسلام میں داخل ہونے کی پہلی شرط ہے۔ غور کیا جائے تو اس ایک اعلان نے ہی بندیوں کے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔

پیغام محمدیؐ نے انسانیت کا درجہ اتنا اونچا کر دیا کہ اس کی پیشانی اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہیں اس پیغام سے پہلے انسان اکثر مخلوقات سے اپنے کو کم رتبہ سمجھتا تھا۔ وہ خوبصورت پتھروں، اونچے پہاڑوں دریاؤں، شاداب اور سایہ دار درختوں، زہریلے سانپوں، ڈراؤنے جنگلوں، غرض کہ دنیا کی ہر اس چیز کے آگے جھکا دیتا تھا جس سے نفع کا خواہشمند تھا جس سے ڈرتا تھا۔ حضورؐ نے دنیا کے رہنے والوں کو بتایا کہ اے انسانو! یہ چیزیں تمہاری آقا نہیں ہیں تم ان کے آقا ہو، تم ان کے لیے پیدا نہیں کیے گئے، وہ تمہارے لیے ہیں۔ اور نہ انسانوں ہی میں سے کوئی انسان تمہارا آقا اور مالک ہے۔ تمہارا آقا اور مالک تمہارا معبود اور پروردگار اللہ ہے جس کی عبادت و اطاعت ہی مقصود کائنات ہے۔

پیغام محمدی میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ جو کچھ ہے اس اللہ کا ہے، اسی کی فرماں روائی ہے جو عرش تک جاری و ساری ہے اور ہر انسان اپنی زندگی کے سارے معاملات میں اس اللہ کے سامنے جوابدہ ہے۔

وحدت الٰہ، وحدت آدم اور ایک اللہ کے سامنے جواب دہی کا یہ تصور اور عقیدہ پیغام محمدیؐ میں محض تصور اور خیال کی حد تک نہیں ہے۔ بلکہ سوسائٹی کے تن مردہ میں یہ عقیدہ خون بن کر دوڑ گیا اور اس کی بنیاد پر نیا نظام زندگی اور تہذیب و تمدن کا عملی نقشہ ابھرا، عقیدے اور عمل کا یہ واضح تعلق ہی در اصل پیغام محمدیؐ کی جو ہمیں ہر موڑ پر یاد رکھنا چاہیے۔

پیغام محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں اسلامی زندگی جس چیز کا نام ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ انسان اس کا

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی*

عہد وسطیٰ کے مسلم سائنسدانوں کا تعلیمی پس منظر

دینی مدارس کے نصاب میں اصلاح و ترمیم اور اس میں سائنسی مضامین کی شمولیت اس وقت دینی و علمی حلقوں میں ایک دلچسپ و اہم موضوع بحث ہے۔ اس موضوع پر سیمینار و مذاکرات کے انعقاد کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ رسائل و مجلات کے خصوصی شمارے بھی اس سے متعلق شایع ہو رہے ہیں۔ اور اب اس مسئلے پر مضامین و کتب کی بھی کمی نہیں رہ گئی ہے۔ مدارس کی افادیت بڑھانے یا جدید تقاضوں سے ان کی تعلیم کو ہم آہنگ کرنے کے لیے ان کے نصاب پر بحث و تمحیص قابل اعتراض نہیں بلکہ خوش آئند بات ہے۔ اس لیے کہ اس سے ان اداروں کے تئیں فکر مندی و احساس کی بیداری کا ثبوت ملتا ہے لیکن بعض اوقات نصاب تعلیم میں اصلاح و ترمیم کے لیے جوش و خروش یا عصری تقاضوں کے غلبے کی وجہ سے کچھ ایسی باتیں پیش کی جاتی ہیں جو تاریخی حقایق کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی ہیں۔ مدارس میں سائنسی مضامین کی شمولیت کے حق میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عہد وسطیٰ میں مسلم تہذیب و تمدن کے عروج کے زمانے میں اگر یہ مضامین مدارس کے نصاب میں شامل رہے ہیں اور ان سے مستفید ہو کر مسلمانوں میں سائنسی علوم کے ماہرین بلکہ ائمہ پیدا ہوئے ہیں تو آج کے مدارس میں تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کے ساتھ ان مضامین کی شمولیت میں کیا چیز مانع ہے بلکہ آج بھی انھیں نصاب کا حصہ بنا کر مدارس کے فارغین کو اسلامی علوم کے ساتھ سائنسی علوم کا ماہر بنایا جا سکتا ہے۔ اسی نکتہ کی اس انداز میں مزید وضاحت کی جاتی ہے کہ اگر ماضی میں مسلمانوں کا نظام تعلیم خوارزمی، رازی، ابن الہیثم، ابن حیان ابن بیطار، ابن سینا، زہراوی، البیرونی وغیرہ جیسے ممتاز سائنس داں پیدا کر سکتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج کے مدارس ایک جامع نصاب کے ذریعے مسلم امت کو ایسے محققین و دانشور نہیں فراہم کر سکتے جو سائنسی علوم میں اپنی مہارت کا جا سکیں اور امت کا نام روشن کر سکیں۔

عہد وسطیٰ میں مسلمانوں میں ماہرین سائنس کا پیدا ہونا اور کچھ لوگوں کا مختلف قسم کے علوم پر عبور پانا ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن مدارس کی تعلیم یا کسی مقررہ نصاب کی تکمیل سے اس کا تعلق جوڑنا خلاف واقعہ ہوگا جیسا کہ ان سائنس دانوں کے حالات زندگی بالخصوص ان کے تعلیمی پس منظر کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ مطالعہ بڑا دلچسپ و مفید ہوگا کہ مسلم تہذیب و تمدن کے عروج کے زمانے میں جن مسلم دانش وروں نے سائنسی علوم کے میدان میں مہارت حاصل کر کے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی تعلیمی زندگی کیسی تھی، تعلیم و ترتیب کے کن مراحل سے وہ گزرے۔ وہ مدارس یا تعلیم کے رسمی ادارو ں

* لکچرر ادارۂ علوم اسلامیہ، اے۔ ایم یو، علی گڑھ

سے فراغت یافتہ تھے یا تعلیم کے دوسرے ذرائع سے مستفاد تھے۔

عہد وسطیٰ کے تعلیمی نظام پر غور و خوض اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین کے حالات زندگی کے مطالعے سے یہ بات آتی ہے کہ مدارس یا باقاعدہ تعلیمی اداروں کے معتدبہ تعداد میں موجودگی کے باوجود اعلیٰ تعلیم یا کسی مضمون میں اختصاص کے انفرادی مراکز تدریس یا ماہرین فنون کی نجی مجلسیں زیادہ موثر کردار ادا کرتی رہی ہیں اور پھر ذاتی دلچسپی و شوق، مطالعے میں تحقیق و جستجو کی لگن اس کے اضافی لیکن اہم عوامل ثابت ہوئے ہیں اس پر ایک واضح ثبوت اس سے فراہم ہوتا ہے کہ ما فنون کے تذکروں میں مدارس سے تعلیم حاصل کرنے یا کسی مقررہ نصاب کے پورا کرنے کا ذکر بہت کم ملتا ہے بلکہ اُن زیادہ دیا جاتا ہے جن سے انھوں نے مختلف علوم حاصل کیے یا مضامین پڑھے۔ ان کے تعلیمی حالات میں عام طور پر یہ کہ ایک استاد سے تفسیر کی کتابیں پڑھیں تو دوسرے سے حدیث کا درس لیا اور تیسرے سے فقہ کی تعلیم کے لیے رجوع عقلی علوم کے باب میں استفادہ کیا۔ پھر جو لوگ کسی خاص فن یا مضمون میں اختصاص کے خواہاں ہوئے تو وہ اس فن کی مطالعے میں منہمک رہے اور اس میدان میں تحقیق و جستجو میں بھی سرگرداں رہے۔ اس سے دلچسپ بات یہ کہ مختلف کے جو بڑے بڑے ماہر گزرے ہیں ان میں سے متعدد کے تعلیمی پس منظر میں رسمی تعلیم کا ذکر ہی نہیں ملتا بلکہ یہ پتا چلتا ہے میں ان کا مشغلہ کچھ اور تھا۔ ایک عرصے تک وہ اس میں مصروف رہے۔ پھر وہ کسی خاص وجہ سے علم کی جانب راغب کی طلب میں انھوں نے مختلف اساتذہ سے رجوع کیا۔ کسی ایک فن میں ان کی خاص دلچسپی پیدا ہوئی اور پھر اسی سے م تحقیق ان کا مستقل مشغلہ بن گیا یہاں تک کہ وہ اس کے ماہر بن کر نمایاں ہوئے۔ اس صورت حال میں نہ تو کسی مدرسے اکتساب فیض کا موقع ہوتا تھا اور نہ ہی کسی مقررہ نصاب کو پورا کرنے کی گنجائش۔ دوسرے یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جو لوگ مراحل میں مدارس کی راہ سے گزرتے تھے وہ بھی بعد میں کسی خاص مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اس فن کے سے انفرادی طور پر رجوع کرتے تھے، اس لیے کہ مدارس یا تعلیمی اداروں میں ایک عام سطح تک مروجہ مضامین کی تعلیم کا اہتمام جہاں تک کسی فن میں اختصاص پیدا کرنے کا سوال ہے۔ اس کے لیے اساتذۂ فنون سے رہنمائی حاصل کرنے مطالعہ و تحقیق میں اور ذاتی محنت و مشقت صرف کرنے کی روایت بہت مستحکم تھی۔ یہ نکات اسی وقت اچھی طرح سمجھے جا سکتے ہیں جب ان دانوں کی تعلیمی زندگی کا جائزہ لیا جائے جنھوں نے سائنس کے میدان میں امتیازی کارنامے انجام دیے اور جن کے نام مثال پیش کیے جاتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ان سب کے تعلیمی پس منظر پر روشنی ڈالنے کی گنجائش نہیں۔ یہاں زیر بحث کے لیے صرف چند کی تعلیمی زندگی کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

ابونصر محمد بن محمد فارابی :

فارابی فلسفہ کے میدان میں اپنی غیر معمولی مہارت اور بیش بہا خدمات کی وجہ سے معلم ثانی و فیلسوف کے لقب سے معروف ہیں۔ ان کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے بھی یہ پیشہ اختیار کیا لیکن علم کے انھیں اسے چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے وطن کو بھی تیاگ دیا اور مختلف مقامات کا سفر کرتے ہوئے پہلے انھوں نے مختلف زبانیں سیکھیں پھر علوم عقلیہ کی جانب راغب ہوگئے۔ ان علوم میں ان کی دلچسپی پیدا ہونے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دوست نے ان کے یہاں ارسطو کی کچھ کتابیں بطور امانت رکھی تھیں، ان کو انھوں نے پڑھنا شروع دلچسپی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ تمام کتابوں کو ختم کر ڈالا اور ان کے مطالب بھی اچھی طرح جذب کر لیے۔ منطق و فلسفہ کی تعل

میں بعض اساتذہ (ابوبکر بن السراج، متی بن یونس، یوحنا بن حیلان) سے ان کے استفادے کا بھی ذکر ملتا ہے۔[۲۶] اس کے بعد وہ انہی علوم کی کتابوں کے مطالعہ و تحقیق میں تاحیات مصروف رہے۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے ارسطو کی کتاب النفس سو بار، اور السماعی الطبیعی چالیس بار پڑھی تھی۔[۲۷] کتابوں کے مطالعے کا انھیں اس قدر شوق تھا کہ دمشق میں قیام کے دوران (جہاں وہ ایک باغ کی نگہبانی کرتے تھے) وہ رات کو چوکیدار کی قندیل کی روشنی میں فلسفہ کے مطالعہ میں منہمک رہتے تھے۔ اس لیے کہ وہ اس زمانہ میں مفلسی کی وجہ سے خود اپنی روشنی کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔[۲۸] مختصر یہ کہ فلسفہ کے میدان میں فارابی کو جو امتیاز حاصل ہوا اس میں ان کے ذاتی ذوق و شوق مطالعہ میں انہماک اور تحقیق و جستجو کی لگن کا زیادہ دخل تھا۔

جابر بن حیان:

ابن حیان جو علم کیمیا کے باوا آدم (FATHER OF ALCHEMY) کے لقب سے معروف ہیں، ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا آبائی پیشہ عطاری تھا۔ بچپن ہی میں باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ زندگی کا ابتدائی حصہ کوفہ کے بعض رشتہ داروں کے یہاں بسر ہوا۔ تعلیم کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہو سکا۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد کوفہ شہر کا رخ کیا۔ وہاں کے علمی ماحول نے انھیں تعلیم کی جانب راغب کیا اور ایک مدرسہ میں داخل ہو کر مروجہ تعلیم حاصل کی۔[۲۹] اس کے بعد کیمیا گری اور سونا بنانے کا شوق ان پر ایسا غالب ہوا کہ وہی اُن کا دن رات کا مشغلہ بن گیا اور اُن کا گھر کیمیا گری کا تجربہ خانہ ہو گیا۔ وہ دواؤں کی خاصیتیں معلوم کرنے کی دھن میں لگے رہتے۔ طرح طرح کی دھات پر تجربہ کرتے۔ اسی طرح جڑی بوٹیوں کے ساتھ ملا کر ان کے اثرات کا پتہ لگاتے۔ اسی دھن میں نہ معلوم کتنے تجربے کر ڈالے۔[۳۰] تحقیق و جستجو کی اسی لگن اور نئے نئے تجربات کے شوق نے ابن حیان کو کیمیا کا موجد بنا دیا۔ یہاں تک کہ اس میدان میں ان کی تحقیقات و تجربات سے اہل علم و فن آج بھی مستفید ہو رہے ہیں۔

ابو محمد عبداللہ بن احمد بن بیطار:

علم نباتات میں امتیازی مقام رکھنے والے ابن بیطار اسپین کے معروف شہر ملاقہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی تعلیمی زندگی کی تفصیلات دستیاب نہیں لیکن اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ انھیں شروع ہی سے نباتات سے گہری دلچسپی تھی اور خاص اس میدان میں انھوں نے وہاں کے ایک ماہر فن ابوالعباس النہاتی سے استفادہ کیا اور ان کی صحبت کے اثر سے اس علم میں ان کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ انھیں کے ساتھ وہ اسپین اور آس پاس کے علاقوں میں پودوں کی تلاش و شناخت میں مصروف ہوئے۔[۳۱] تقریباً بیس سال کی عمر میں وہ اسی مشن پر دوسرے ملکوں کے سفر پر روانہ ہوئے اور چار پانچ سال تک وہ افریقہ، مراکش، الجزائر اور تونس وغیرہ کے علاقے میں پودوں کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہے اور ساتھ ہی ساتھ اس فن کے ماہرین سے ملاقات کر کے ان سے استفادہ بھی کرتے رہے۔[۳۲] اس کے بعد مصر کے ایوبی سلطان الکامل کے یہاں ان کی رسائی ہوئی اور جڑی بوٹیوں کے خاص ماہر (رئیس علیٰ سائر العشابین Chief Herbalist) کی حیثیت سے وہ دربار سے منسلک کیے گئے۔ کچھ عرصے بعد الکامل کا دائرہ اختیار دمشق تک وسیع ہوا تو ابن بیطار کو وہاں بھی جانے کا موقع ملا۔ ان کی علمی و تحقیقی دلچسپیاں اس شہر میں بھی جاری رہیں۔ شام کے مختلف علاقوں میں گھوم گھوم انھوں نے نئے نئے پودے تلاش کیے اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔[۳۳] اس طرح ایک طویل عرصے تک پودوں کی جستجو میں سرگرداں رہنے اور انھیں جمع کر کے ان کی نوعیت و خصوصیت کی چھان بین کے بعد ابن بیطار کو اس میدان میں ماہرانہ جانکاری حاصل ہوئی اور اس سے متعلق انھوں نے اس قدر قیمتی تحقیقات پیش کیں کہ آج بھی جدید ماہرین نباتات کے یہاں ان کا اعتراف ملتا ہے۔

ابوبکر محمد بن زکریا رازی: —— رازی فلسفہ و طب دونوں کے ماہر تھے لیکن ان کی ماہرانہ صلاحیت طب

کے میدان میں زیادہ نمایاں ہوئیں۔ ان کی تعلیمی زندگی کے شروع ہونے کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ وہ بچپن میں عود (ساز) دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا اور گانا بجانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا لیکن جوانی کے آثار ظاہر ہونے کے بعد انھیں ان سب سے نفرت ہوگئی اور تعلیم کی جانب راغب ہوئے۔[۱۱] مختلف علوم وفنون میں انھوں نے پہلے فلسفہ میں خاص دلچسپی لی اور اس کے لیے اساتذہ بالخصوص ابوزید بلخی سے رجوع کیا اور پھر کیمیاگری کا شوق ان پر غالب ہوا اور دن رات اسی میں مصروف رہنے لگے تک کہ بھٹی میں مسلسل کام کرنے کی وجہ سے وہ آشوب چشم کا شکار ہوگئے۔ ایک طبیب کے پاس علاج کے لیے گئے تو اس نے کا مطالبہ کیا۔ مجبوراً یہ رقم دے کر انھیں علاج کرانا پڑا اور کچھ عرصے بعد وہ اچھے ہوگئے۔ رخصت ہوتے وقت طبیب نے فخریہ انداز میں یہ کہا کہ اصل کیمیا یہ (طب) ہے نہ کہ وہ جس میں تم دن رات جان کھپاتے ہو۔[۱۲] اس وقت انھیں یہ احساس کی تعلیم ناقص ہے علم کی طلب میں وہ اہل وعیال کو چھوڑ کر عازم بغداد ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۰ برس سے متجاوز کر چکی انھوں نے خاص طور سے علم طب کے اکتساب میں گہری دلچسپی لی اور علی بن سہل اور دوسرے ماہرین فنون سے استفاد برابر پورے انہماک کے ساتھ مطالعہ وتجربہ بھی جاری رکھا۔ تجربے کے لیے وہ بغداد کے معروف اسپتال مقتدری جاتے اور علی بن سہل کے ساتھ مریضوں کی جانچ پڑتال کرتے رہے۔ رازی کو طب کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے اور تجربات حاصل کرنے کا اس وقت اور موقع ملا جب وہ یکے بعد دیگرے بغداد اور رے کے اسپتال کے نگراں مقرر ہو ایک طویل عرصے تک یہ خدمات انجام دیتے رہے۔[۱۳]

ابوعلی الحسین بن عبداللہ بن سینا:

طب کے میدان میں دوسری ممتاز شخصیت بوعلی سینا کی ہے۔ اس فن میں انھوں نے اتنی ناموری حاص کے ساتھ ان کا نام جزء لاینجزی بن گیا ہے۔ ان کا اصل وطن بلخ تھا نوح بن منصور کے زمانے میں ان کا خاندان ہوا اور وہیں ان کی نشو ونما ہوئی۔ دس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے بوعلی سینا نے قرآن کریم و مروجہ مضامین کرلی۔[۱۴] پھر وہ خصوصی طور پر عقلی علوم کی تحصیل کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس میدان میں ان کی دلچسپی اس وجہ ہوئی کہ ان کے خاندان کے لوگوں میں فلسفہ، ریاضی وعلم ہندسہ کا کافی چرچا رہتا تھا اور اس کو سن کر انھیں بھی ان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ریاضی کی تعلیم انھوں نے محمود مساح سے حاصل کی جو سبزی فروش تھے لیکن ریاضی بالخصہ طریقۂ حساب کے ماہر تھے۔ اسی اثنا میں ایک طالب عبداللہ ناتلی بخارا آئے جو فقہ کے ساتھ منطق وفلسفہ کے درس معروف تھے۔ بوعلی سینا کے والد نے ان کو اپنے گھر میں رکھا اور ان کی خوب خاطر تواضع کی تاکہ ان کے بیٹے ان سے یہ علم سکیں۔[۱۵] اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے عقلی علوم کی کتابوں کا ذاتی مطالعہ بھی جاری رکھا اور مشکل سے مشکل مسائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان علوم میں دستگاہ پانے کے بعد انھوں نے علم طب کی جانب توجہ دی اور پھر اسی کا سیکھنا ان کا مستقل مشغلہ بن گیا۔ اس فن میں انھیں کیسے مہارت حاصل ہوئی اس کی وضاحت ان کی خود نوشت سوانح ملاحظہ ہو:

"یہ کوئی مشکل علم نہیں ہے۔ میں نے طب کی کتابوں کا مطالعہ خود کیا اور کسی سے مدد نہیں لی اور تھوڑی ہی مدت میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ اچھے اچھے طبیب مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ اب میں نے مطب بھی شروع کردیا اور اس کام میں مجھے غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔"[۱۶]

اپنی دلچسپی کے مضامین کی کتابوں کے مطالعے میں ان کے انہاک کی کیفیت کیا تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پوری رات سو سکتا تھا نہ دن میں کچھ آرام کر سکتا تھا۔ مطالعے کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ اس دوران کبھی کسی مشکل ترین مسئلہ کو سمجھنے میں دقت آتی اور وہ کسی طرح حل نہ ہوتا تو میں فوراً وضو کر کے جامع مسجد چلا جاتا تھا اور نماز کے بعد دعا مانگتا تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کی گرہ کھول دیتا تھا۔ رات کے وقت چراغ سامنے رکھ کر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جاتا۔ جب نیند کا غلبہ ہوتا اور طبیعت مضمحل ہوتی تو پانی اور کچھ قوت پہنچانے والی چیزیں کھا پی لیتا۔۔۔۔ غرض اس طرح جملہ علوم و فنون میں اچھی خاصی استعداد میں نے پیدا کر لی۔"[۳۸]

ابو عبداللہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی:

ریاضی کے زبردست عالم، ہندوستانی علم الحساب کو نئی زندگی بخشنے والے اور الجبرا کے موجد الخوارزمی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی بالخصوص تعلیم و تربیت کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کی پیدائش اور نشو و نما خوارزم (موجودہ ازبکستان کا ایک معروف شہر) میں ہوئی۔ بعد میں ان کے والدین بغداد منتقل ہوئے جہاں ان کی علمی دلچسپیاں ظاہر ہوئیں[۳۹]۔ علوم و فنون کے اس مرکز میں الخوارزمی کو اپنی صلاحیتیں اجاگر کرنے کا بھرپور موقع ملا اور ریاضی کے میدان میں ان کی تحقیق و جستجو کے جوہر بہیں نمایاں ہوئے۔ الخوارزمی کو ریاضی میں دلچسپی اور اس کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق شروع ہی سے تھا اور وہ خوارزم میں بھی ریاضی کی کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہتے تھے لیکن وہاں گمنامی کی حالت میں تھے۔ بغداد میں جب انھیں علمی ماحول ملا اور خلیفہ مامون کی قدردانی نصیب ہوئی تو ان کا شوق مطالعہ و تحقیق پروان چڑھا۔ خلیفہ کی ایما پر جب وہ بیت الحکمۃ سے منسلک ہوئے تو انھیں تحقیقات و تجربات کے نئے مواقع فراہم ہوئے[۴۰] اور پھر ریاضی کے فن میں انھیں ایسا امتیاز حاصل ہوا کہ اہل یورپ بھی ان کی علمی خدمات سے استفادہ کے لیے مجبور ہوئے۔

ابو عبداللہ محمد بن جابر البتانی

البتانی علم ہیئت کے میدان میں اپنی تحقیقات عالیہ اور خدمات جلیلہ کے لیے معروف ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بھی بہت کم تفصیلات ملتی ہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے اپنے وطن بتان (شمالی عراق کے ایک مردم خیز علاقے حران میں ایک مقام) میں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ الرقہ (شام کا ایک شہر) منتقل ہوئے جہاں انھوں نے کچھ عرصہ اور تعلیم جاری رکھی اور پھر اپنی دلچسپی کے فن ہیئت کی کتابوں کا مطالعہ اور اجرام فلکی کا مشاہدہ ان کا محبوب مشغلہ بن گیا[۴۱]۔ البتانی نے بالخصوص سورج، زمین، چاند اور تاروں کو اپنی تحقیقات و مشاہدات کا مرکز بنایا۔ علم ہیئت کے اکتساب میں ان کی لگن اور محنت مشقت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تقریباً ۴۲ سال تک الرقہ کی رصدگاہ میں فلکیات کے مشاہدہ و تحقیق میں مصروف رہے[۴۲]۔ یہی چیزیں اصلاً اس میدان میں ان کی گراں قدر تحقیقات اور عظیم الشان خدمات کا موجب بنیں۔

ابو علی حسن بن علی الہیثم:

الہیثم جو علم المناظر (Optics) میں اپنا ثانی نہیں رکھتے بصرہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے مروجہ تعلیم کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی لیکن اس میں جی نہ لگا۔ اس لیے کہ ان کی دلچسپی کا اصل میدان حکمت و طبیعیات تھا۔ ان علوم کی کتابوں کا مطالعہ جاری رہتا تھا بلکہ ملازمت کے دوران جب بھی فرصت پاتے کتابوں کے مطالعے میں مصروف ہو جاتے

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے مصر کا رُخ کیا۔ مصر کی علمی فضا اور فاطمی خلیفہ الحاکم کی معارف پروری سے ان جستجو کی عادت کو اور تقویت ملی اور علمی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے بہترین مواقع فراہم ہوئے۔ فن انجینرنگ سے انھیں رغبت تھی اور اس میدان میں اپنا جوہر دکھانے کے لیے انھوں نے مصر میں دریائے نیل پر اسوان بند کی تعمیر کا منصوبہ بعض وجوہ سے یہ روبہ عمل نہ آسکا۔ اس کے بعد انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کرلی اور کتابوں کے مطالعے میں اور منہمک گذر بسر کے لیے ریاضی و ہیئت کی مشہور کتابوں کی نقلیں تیار کرتے اور انھیں شائقینِ علم کے ہاتھوں فروخت کرتے۔ کے میدان میں الہیثم کی گہری تحقیقات کا اصل دور اس وقت شروع ہوا جب انھوں نے جامعہ ازہر کے ایک حجرے میں کو محبوس کرلیا اور پڑھنے لکھنے اور غور وفکر کے علاوہ اور کسی چیز سے انھیں مطلب نہ رہا۔ ایک طویل عرصے تک وہ نور کی روشنی کے مسائل پر غور وفکر کرتے رہے اور ایک روایت کے مطابق انھوں نے تقریباً بائیس سال اسی علم سے متعلق مطا تحقیق میں صرف کیے۔ الہیثم نے اس موضوع پر اپنے نتائج تحقیق کتاب المناظر میں پیش کیے جو آج بھی اس فن کتاب سمجھی جاتی ہے۔

ابوالحسن علی بن حسین المسعودی۔

علم جغرافیہ میں امتیازی شان رکھنے والے المسعودی ایک عرب خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کا سلسلہ نسب صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود سے جا ملتا ہے۔ ان کی پیدائش ونشوونما بغداد میں ہوئی۔ ان کی تعلیم کن مراحل سے اور کہاں معلومات دستیاب نہیں لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ بغداد جیسے مرکزِ علم وفن ہی میں ان کی مروجہ تعلیم مکمل ہوئی ہوگی۔ ان کے متعدد ایسے اساتذہ وعلماء کا ذکر ملتا ہے جن سے انھوں نے استفادہ کیا اور عقلی علوم کے میدان میں وہ ان سے بحث ومباحثہ ان میں خاص طور سے ابن جریر طبری، ابن سعید دمشقی، ابن درید، ابن بشار انباری، ابوعلی الجبائی، ابوالحسن علی الاشعری، رازی زیادہ معروف ہیں۔ جہاں تک علم جغرافیہ کے میدان میں ان کی غیر معمولی صلاحیت ومہارت کا تعلق ہے یہ انھیں اس کی ذاتی دلچسپی، مسلسل سیاحت، طویل اسفار اور ان کے اپنے مشاہدے وتجربے کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ ۹۱۲ء یا آس پاس انھوں نے علمی سفر شروع کیا تھا اور تقریباً ۳۳ سال انھوں نے سیاحت میں گزارے۔ سب سے پہلے وہ اصطخر گئے جہاں ایک سال مقیم رہ کر انھوں نے کچھ تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد وہ اگلے سفر پر روانہ ہوئے۔ المغرب (م اور تیونس) کے علاوہ انھوں نے تمام اسلامی ممالک اور بعض غیر مسلم ملکوں کی بھی سیاحت کی جن میں ہندوستان بھی شامل یہ اسفار تفریحاً نہیں تھے بلکہ علم جغرافیہ کی تحصیل کے ہی ان کے ذرائع تھے اور سفر کے دوران ان کا مشاہدہ وتجربہ ہی اس ان کی تحقیقات وعلمی خدمات کا ماخذ ثابت ہوا۔ سیاحت کے دوران وہ مشاہدہ وتجربہ کے علاوہ دوسرے سیاحوں او دانوں سے بھی ملاقات کرتے اور ان سے اپنی جغرافیائی معلومات میں اضافہ کرتے اور اگر کوئی سفرنامہ یا جغرافیہ سے متعلق مخطوطہ مل جاتا تو اس کا مطالعہ بھی جاری رکھتے۔ اس زمانے کے ایک دوسرے مشہور سیاح ابوزید سیرافی سے ان ملاقاتوں کا ثبوت ملتا ہے۔ انھیں کے توسط سے معروف سیاح سلیمان التاجر کا سفرنامہ انھیں ملا جس کا مطالعہ انھوں دلچسپی وگہرائی سے کیا۔ اس طرح علم جغرافیہ کے اکتساب کے لیے ان کی یہ مسلسل تگ ودو اور مشاہدہ وتجربے کی راہ میں ان کی جدوجہد اس فن سے ان کی گہری واقفیت اور اس سے متعلق ان کی عظیم الشان خدمات کا باعث بنی۔

ابوریحان محمد بن احمد البیرونی: البیرونی کو مختلف علوم وفنون (فلسفہ، ریاضی، علم نجوم، ہیئت،

ہندوستان کے علمی وثقافتی ورثہ) میں درک حاصل تھا۔ مشہور روایت کے مطابق وہ خوارزم کے مضافاتی علاقہ یا خوارزم کے باہر (بیرون) ایک گاؤں کے رہنے والے تھے اسی لیے وہ البیرونی کے لقب سے معروف ہوئے۔ البیرونی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کی زندگی کا ابتدائی حصہ آزمائش و مصائب سے پُر تھا۔ اسی لیے ابتدائی تعلیم کے بعد اس کا کوئی باقاعدہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ان کے اساتذہ میں ابونصر منصور بن علی بن عراق کا ذکر ملتا ہے جو قدیم خوارزم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک طویل عرصے تک وہ خوارزم کے سلطان ابوعبداللہ محمد خوارزم کے دربار سے منسلک رہے لیکن بعد میں اس سلطنت میں اتھل پتھل کی وجہ سے انھیں وطن چھوڑنا پڑا۔ تقریباً سات سال تک وہ مختلف شہروں میں ٹھوکریں کھاتے رہے۔ اس کے بعد انھیں وطن جانے کا موقع ملا۔

البیرونی کو مطالعہ کا شوق اور تحقیق و جستجو کی لگن شروع ہی سے تھی۔ آزمائشی حالات میں بھی وہ اپنی دلچسپی کے فنون کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے اور مشاہدات و تحقیقات کی راہوں سے گزرتے رہے۔ انھیں ان کاموں کو اطمینان کے ساتھ آگے بڑھانے کا اس وقت موقع ملا جب ۱۰۱۷ء میں خوارزم کا علاقہ سلطان محمود غزنوی کے زیرنگیں آیا اور دوسرے اراکین شاہی کے ساتھ وہ بھی غزنہ منتقل ہوئے۔ سلطان ان کے علم و فضل کا پہلے ہی شہرہ سن چکا تھا اس لیے انھیں اس کے دربار میں کافی قدر دانی نصیب ہوئی اور وہ خاص درباریوں میں شامل کر لیے گئے۔ ہندوستان مہم کے دوران سلطان انھیں بھی ساتھ لے گیا اور البیرونی ۱۵سال سے زیادہ یہاں مقیم رہے اور مختلف علاقوں میں گھوم گھوم کر سماجی و تمدنی اور مذہبی و علمی حالات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ اس کے علاوہ ہندو پنڈتوں و عالموں سے مل کر ہندو مذہب، فلسفہ، معاشرت اور ہندوستان کے قدیم علوم و فنون کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرتے رہے۔ مزید برآں انھوں نے سنسکرت زبان سیکھی تاکہ ہندوستانی علوم و فنون کی قدیم کتابوں تک ان کی براہ راست رسائی ہو سکے۔ انھیں مطالعہ اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں کس قدر انہماک تھا اس کا اندازہ اس بیان سے ہوتا ہے کہ "ان کی انگلیاں قلم کو، ان کی آنکھیں مطالعہ کو اور دل غور و فکر کو صرف کھانے پینے کے اوقات میں چھوڑتے تھے"۔ اس طرح البیرونی کو ہندوستانی علوم و فنون بالخصوص فلسفہ، ریاضی و علم ہیئت پر عبور حاصل ہوا جس پر ان کی معروف و مشہور تصنیف کتاب الھند بجا طور پر شاہد ہے۔

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں میں جو ممتاز و نامور سائنس داں گزرے ہیں ان کی تعلیم و تربیت کے ذرائع کیا تھے اور وہ کس راستے سے سائنسی علوم کے میدان میں امتیازی مقام یا امامت کے منصب تک پہنچے تھے۔ عہدِ وسطیٰ میں مختلف علوم و فنون کی اشاعت میں مدارس کی خدمات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا لیکن اعلیٰ تعلیم یا اختصاص کے میدان میں تدریس کے انفرادی مراکز اور علماء و دانشوروں کی نجی مجلسوں کا زیادہ موثر کردار رہا ہے۔

جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا اس عہد میں تعلیم کا سیدھا سادہ نظام یہ تھا کہ مدارس یا انفرادی مراکز تدریس میں ایک عام سطح تک مختلف مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی پھر جو طالب علم کسی خاص فن یا مضمون میں مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اپنی دلچسپی کے مطابق کسی ایک کو منتخب کرتا تھا اور اس کے ماہرین سے انفرادی طور پر استفادہ کے ساتھ وہ ذاتی مطالعہ و تحقیق یا مشاہدہ و تجربہ کی راہیں بھی اختیار کرتا تھا اور اس کام میں پوری محنت و مشقت و جانفشانی اٹھاتا تھا اور بعض تو اسی میدان میں عمر کھپا دیتے تھے تب جاکر وہ اس میدان میں ناموری کا تمغہ حاصل کرتے تھے۔ حصولِ علم سے متعلق عہدِ وسطیٰ اور آج کل کے دور کے مزاج میں ایک بہت بڑا فرق یہ تھا کہ اس زمانے میں تعلیم حاصل کرنے کی کوئی خاص میعاد یا مدت مقرر نہیں تھی بلکہ علمی ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ

زندگی بھر اکتساب علم کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ دوسرے اس زمانے میں تعلیم سے کسب معاش کا تعلق اتنا گہرا نہیں تھا جتنا آج ہے۔ دور کی طرح صورت حال یہ نہ تھی کہ طالب علم تعلیم کی ایک خاص منزل تک پہنچ کر یا کوئی مقررہ کورس پورا کرنے کے بعد معاشرتی ضروریا یا عملی زندگی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیتا تھا۔ اس لیے اس وقت مختلف علوم میں درک حاصل کرنا یا ایک فن میں اختصاص پانا زیادہ مشکل نہ تھا۔ اس عہد کے شائقین علم صرف مدرسہ کی تعلیم پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اکتساب علم کے مختلف ذرائع استعمال کرتے تھے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ عہد وسطیٰ میں مدارس کا نصاب اس طور پر مرتب کیا گیا تھا کہ ان سے فراغت پانے والے لازمی طور پر اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم کے بھی ماہر بن کر نکلتے تھے اور نہ ہی اس کی شہادت پیش کی جا سکتی کہ جتنے بڑے بڑے سائنس داں گزرے ہیں ان کی سائنسی مہارت کسی مدرسہ کی تعلیم یا کسی متعینہ کورس کی تکمیل پر مبنی تھی۔

آخر میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ نہ تو سائنس یا جدید مضامین کی افادیت سے انکار ہے اور نہ ہی اس حقیقت سے اعراض کیا جا سکتا ہے کہ مسلم امّت کو ایسے دانش وروں کی سخت احتیاج ہے جو جدید علوم پر عبور رکھتے ہوں۔ یہاں مقصود اس نکتہ پر زور دینا ہے کہ جدید علوم کے ادارے یا عصری جامعات کثیر تعداد میں موجود ہیں جہاں پوری آزادی کے ساتھ سائنس اور دوسرے جدید علوم کے سیکھنے کے مواقع فراہم ہیں۔ مزید براں سائنسی علوم کے میدان میں مطالعہ و تحقیق اور مشاہدہ و تجربہ کی وہ راہیں آج بھی کھلی ہوئی ہیں جن سے گزر کر عہد وسطیٰ میں بڑے بڑے سائنس داں پیدا ہوئے تھے اس لیے مدارس کو مسلمانوں میں سائنسی علوم کے فروغ کا ذریعہ بنانا یا ان میں اسلام کے اساسی علوم کے ساتھ سائنسی مضامین کو شامل نصاب کرنا نہ تو مدارس کے لیے مفید ہے اور نہ مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے ممد و معاون۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلم امت کے وسیع تصور اور اس کو درپیش کثیر الجہات مسائل کے حل کے لیے مسلمانوں میں سائنس و جدید علوم کے ماہرین بھی درکار ہیں لیکن کیا ضروری و مناسب ہے کہ اس کی ذمّہ داری مدارس پر ڈالی جائے اور مدارس کے طلباء کو اس کا پابند بنایا جائے۔ خلاصہ یہ کہ مسلم سائنس داں پیدا کرنا ضروری ہے نہ کہ مدارس کے طلباء کو سائنس داں بنانا۔

رہا یہ سوال کہ مدارس کے نصاب میں سائنس یا عصری علوم کو شامل کر کے ان اداروں کو قدیم و جدید کا سنگم بنایا جا سکتا ہے یا ایسے افراد تیار کیے جا سکتے ہیں جو اسلامی و عصری دونوں علوم میں مہارت رکھتے ہوں۔ خواہش، تجویز اور بحث و مباحثہ کی حد تک یہ بات جس قدر اچھی و دلکش ہے، اس کو عمل میں لانا اتنا ہی مشکل و پیچیدہ ہے۔ اس ضمن میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ کل سائنس کی تعلیم اس قدر ترقی کر چکی ہے اور اس کے لوازمات اتنے بڑھ چکے ہیں کہ مدارس میں بنیادی و ضروری مضامین کے ساتھ اس معیار کی سائنس کی تعلیم ممکن نہیں کہ وہاں کے طلباء سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے اہل ہو جائیں یا وہاں کی اسناد کو عصری تعلیم کے اداروں میں سائنسی مضامین میں داخلے کے لیے منظوری مل جائے۔ دوسرے لفظوں میں صاف صاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ مدارس میں اسکول کی سطح کی بھی سائنس کی تعلیم کو شامل نصاب کرنا اسلام کے اساسی علوم (تفسیر، حدیث، فقہ) کی تعلیم میں خلل اندازی کرنا اور ان کے بنیادی کردار کو مجروح کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم و جدید علوم میں امتزاج کے نقطۂ نظر سے ہندوستان میں مدارس کے نصاب کی اصلاح کی تحریک کو تقریباً ایک صدی بیت چکی ہے لیکن اب تک نہ تو کوئی ایسا مدرسہ قائم کیا جا سکا اور نہ ہی کسی مدرسہ کے نصاب میں ترمیم و تبدیلی اس نہج سے موثر ثابت ہو سکی کہ اس سے فراغت پانے والے طلباء قدیم و جدید دونوں دھاراؤں کا سنگم بن گئے ہوں۔ بعض مدارس کے نصاب میں جدید علوم کی شمولیت کے لیے کچھ جزوی ترمیمات کی گئیں یا پیوندکاری کا طریقہ اپنایا گیا لیکن اس کا بھی ابھی تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہ آ سکا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج مدارس کی تعلیم سے مستفید ہونے والے یا ان سے سند یافتہ لوگ

ایسے حضرات ہیں جنھیں قدیم وجدید دونوں علوم میں درک حاصل ہے لیکن یہ مستثنیات ایسے لوگوں کی ہے جنھوں نے مدارس سے فراغت کے بعد عصری جامعات میں اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور نئے نئے مضامین اختیار کیے یا پھر جنھوں نے جدید علوم کے میدان میں اپنی دلچسپی کے مضمون میں ماہرین فن سے استفادہ اور مطالعہ وتحقیق کی راہیں اپنائیں اور اس کام میں ہمہ تن مصروف رہے۔ موجودہ دور میں بھی ایسی مثال مشکل ہی سے ملے گی کہ کوئی شخص کسی مدرسے سے فراغت پاتے ہی اسلامی وعصری علوم کا جامع بن گیا ہو یا دونوں میدانوں میں اپنی مہارت کا سکہ جما دیا ہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مدارس کو لاحاصل کاموں کی تجربہ گاہ نہ بنایا جائے اور ان کی خصوصیات کو ملیامیٹ کرنے کا سامان نہ بہم پہنچایا جائے۔ اس صورت حال میں جب کہ بہت سی مخالف قوتیں دینی تعلیم کے ان قلعوں کو نقصان پہنچانے و کمزور کرنے کے درپے ہیں اس بات کی ضرورت اور بڑھتی جارہی ہے کہ مدارس کی بنیادی خصوصیات کو اور مستحکم کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب قرآن، حدیث، فقہ اور عربی وفارسی زبان وادب کی تعلیم کے نظام کو اور بہتر بنایا جائے۔ مبادیات یا تعارف کی حد تک سائنس کے مضامین کو شامل نصاب کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے یا مکتب کی مدت تعلیم میں کچھ اضافہ کرکے اس سطح پر ان مضامین کی تعلیم کا باقاعدہ اہتمام کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ آج کل بعض مدارس میں یہ طریقہ رائج ہے۔ اسی طرح مدارس سے ملحق جدید علوم یا تکنیکی تربیت کے ادارے قائم کرنا اور مدارس کے طلباء کو ان سے استفادہ کی سہولت بہم پہنچانا بھی افادیت سے خالی نہیں جیسا کہ ماضی میں بعض مدارس میں ابتدائی نوعیت کی اس نوع کی سہولتیں فراہم تھیں اور آج بعض دینی ادارے معیاری سطح پر اس نہج پر کام شروع کرچکے ہیں اور اس کے بہتر نتائج سامنے آرہے ہیں، لیکن ان سب کے بجائے مدارس میں اعلیٰ تعلیم کے مرحلے میں ہائی اسکول یا انٹر کے معیار کے برابر سائنسی مضامین کو شامل نصاب کرنا مدارس کے نصاب کو ملغوبہ بنانا اور ان کی بنیادی خصوصیات میں خلل اندازی کرنا ہے۔ درحقیقت اس طرح کی کوششوں سے قدیم وجدید تعلیم میں امتزاج کا مسئلہ اور پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ بعض مدارس میں اس نہج پر کئی سال کے تجربے کے بعد جب اس راہ کی دشواریاں پر قابو پانا مشکل ہوگیا اور تجربات کے متوقع نتائج بھی سامنے نہیں آئے تو ذمہ داران مدرسہ یہ سوچنے اور فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے کہ قدیم نصاب تعلیم ہی زیادہ مناسب ومفید ہے۔ مختصر یہ کہ موجودہ دور میں اسلام کے اساسی علوم اور جدید علوم کے میدان میں تعلیم کے نظام، نصاب کے معیار اور درس وتدریس کے منہج میں اتنا بُعد پیدا ہوگیا ہے کہ دونوں میں امتزاج کی بات کرنا یا ایک ہی طالب علم سے دونوں میدانوں کو سر کرنے کی توقع رکھنا ایک بے جا خواہش ہے جس کا کچھ حاصل نہیں۔ اسی طرح عہدِ وسطیٰ کے مسلم معاشرے میں تعلیم کا جو مزاج اور درس وتدریس کا جو انداز پایا جاتا تھا اور آج کل کے مدارس میں جو نظام رائج ہے، دونوں کے فرق کو ملحوظ رکھے بغیر، ایک کا دوسرے سے موازنہ کرنا کسی صورت میں بھی درست نہ ہوگا بلکہ غلط نتائج کا حامل ہوگا۔

حواشی و مراجع

۱؎ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے سیاق میں اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں راقم کا مضمون: عہدِ اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ذرائع، تحقیقات اسلامی ۱۳/۱ جنوری۔ مارچ ۱۹۹۴ء ص ۴۴۔ ۶۴

۲؎ علی بن یوسف القفطی، تاریخ الحکماء، لیپزگ، ۱۹۰۳ء، ص ۲۷۷، ابن خلکان، وفیات الاعیان

مکتبۃ النہضۃ المصریہ، القاہرہ، ۴/ ۲۳۹، عبدالسلام ندوی، حکماءِ اسلام، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۹-۱۱۰۔

۳۔ القفطی، ص ۲۷۷، ابن خلکان ۴/ ۲۴۰

۴۔ القفطی، ص ۲۷۷، ابن خلکان، ۴/ ۲۴۰

۵۔ ابن خلکان، ۴/ ۲۳۹

۶۔ محمد لطفی جمعہ، تاریخ فلاسفۃ الاسلام (اردو ترجمہ: میر ولی الدین) جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۱۹۴۱ء

۷۔ ابراہیم عمادی ندوی۔ مسلمان سائنس دان اور ان کی علمی خدمات، مکتبہ الحسنات دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۲-۲۳ Hakim Mohammad Said Medeival Muslim Thinkers and Scientists, Delhi, 1991, Page No 37

۸۔ عمادی ندوی، ص ۲۳۔

۹۔ حکیم محمد سعید، محولہ بالا، ص ۲۳۔ دائرہ معارف اسلامیہ (اردو اسلامی انسائیکلوپیڈیا) پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۴ء، ۱/ ۴۳۹

۱۰۔ ابن ابی اصیبعہ، عیون الانباء فی طبقات الاطباء، القاہرہ، ۱۸۸۲ء، ۲/ ۱۳۳۔

۱۱۔ دائرۂ معارف اسلامیہ، ۱/ ۴۳۹ - ۴۴۰

۱۲۔ القفطی، ص ۲۷۱-۲۷۲، ابن جلجل، طبقات الاطباء والحکماء، قاہرہ، ۱۹۵۵ء، ص ۷۷، ابن ۴/ ۲۴۴، عبدالسلام ندوی، ص ۱۶۲۔

۱۳۔ عبدالسلام ندوی، ص ۱۶۴-۱۶۵۔ عمادی ندوی، ص ۵۹۔

۱۴۔ عمادی ندوی، ص ۵۹-۶۰۔ حکیم محمد سعید، ص ۴۹۔

۱۵۔ القفطی، ص ۴۱۳-۴۱۴، ابن ابی اصیبعہ، ۲/ ۲-۳، عمادی ندوی، ص ۱۵۹۔

۱۶۔ عبدالسلام ندوی، ص ۳۰۹-۳۱۰۔ عمادی ندوی ص ۱۵۹۔ محمد لطفی جمعہ، تاریخ فلاسفۃ الاسلام (اردو ترجمہ: میر ولی الدین)۔ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۴۱ء، ص ۷۲-۷۳

۱۷۔ عمادی ندوی، ص ۱۶۰

۱۸۔ حوالہ مذکور، ص ۱۶۰

۱۹۔ دائرۂ معارف اسلامیہ، ۹/ ۳۵-۳۶، حکیم محمد سعید، ص ۳۹

۲۰۔ عمادی ندوی، ص ۳۷-۳۸

۲۱۔ حکیم محمد سعید، ص ۹، عمادی ندوی، ص ۵۶

۲۲۔ دائرۂ معارف اسلامیہ، ۴/ ۲۴-۲۵۔ ابن خلکان، ۴/ ۲۵۰-۲۵۲، حکیم محمد سعید ص ۹۔

۲۳۔ عبدالسلام ندوی، ص ۲۷۶-۲۷۷۔

۲۴۔ دائرہ معارف اسلامیہ، ۱/ ۷۳۰-۷۳۱۔ عمادی ندوی، ص ۹۷

۲۵ عمادی ندوی، ص ۹۷-۱۰۲، حکیم محمد سعید، ص ۲۵-۲۶

۲۶ دائرہ معارف اسلامیہ، ۱۸/۲۱-۱۹، حکیم محمد سعید، ص ۴۵

۲۷ Tarif Khalidi, Islamic Historiography: The Histories of Masudi, Albany (N. York) 1975. PP. 149-150.

۲۸ دائرۂ معارف اسلامیہ، ۱۹/۲۱، حکیم محمد سعید، ص ۴۵، سیّد مقبول احمد، مسعودی بحیثیت جغرافیہ نگار (اردو ترجمہ: ڈاکٹر انور معظم)، دہلی، ۱۹۷۸ء، ص ۱۰-۱۱

۲۹ سیّد مقبول احمد، محولہ بالا، ص ۷۹، ۱۱۰۔

۳۰ عبدالسلام ندوی، ص ۳۵۸-۳۵۹، دائرۂ معارف اسلامیہ ۲۶۱/۵-۲۶۲، عمادی ندوی، ص ۱۸۲-۱۸۳۔

۳۱ دائرہ معارف اسلامیہ، ۲۶۲/۵-۲۶۳، عمادی ندوی ص ۲۸۵

۳۲ عبدالسلام ندوی، ص ۳۵۴، دائرہ معارف اسلامیہ، ۲۶۳/۵

۳۳ عمادی ندوی، ص ۱۸۴

۳۴ قدیم و جدید تعلیم میں امتزاج کے مسائل پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ کریں راقم کا مضمون "قدیم و جدید تعلیم کا امتزاج — مسائل و تجاویز" رفیق منزل، تعلیم نمبر، جنوری ۱۹۹۳ء، ص ۳۷-۴۲

ڈاکٹر اخلاق احمد*

دینی تعلیم کے افادی پہلو

ہندوستان میں بے شمار، قصبات، گاؤں اور شہر پائے جاتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی مسلمانوں کی کم وبیش
ہے وہاں مکتب، مدرسہ اور دارالعلوم کے ذریعے دینی تعلیم کا سلسلہ پایا جاتا ہے۔ ہر مضمون اور موضوع پر بے شما
رسالے ملتے ہیں لیکن دینی درس گاہوں اور تعلیم کے بارے میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ موجودہ دور میں اس تو
میں بھرپور مطالعہ وتحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ دینی مدارس اور تعلیم کے بارے میں مضامین ضرور لکھے جاتے ہ
دو پہلو اجاگر کیے جاتے ہیں۔ ان کی خامیاں اور اصلاحات کی ضرورت ان کی خوبیوں اور اچھائیوں کی طرف نگاہیں ک
اکثر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ خوبیوں اور خامیوں کے علم کے بغیر تنقیدی پہلو زیادہ اختیار کیا جاتا ہے۔

ہر قوم اپنی تہذیب، مذہب، زبان اور تعلیم کی پاسبانی کرتی ہے۔ اگر اس طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے تو وہ
ہے۔ پھر قومی وملی سطح پر بڑی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ حکومت کی سرپرستی ہٹ جانے، عمومی بے توجہی اور عصر
پیچھے رہ جانے سے دینی تعلیم کی افادیت کم ہو گئی۔ مقاصد کی تکمیل کے لیے صرف علما، فضلا اور ماہرین تعلیم ہی ذر
بلکہ ہر مسلمان کو اپنی قابلیت، گنجائش اور حیثیت کے ساتھ سوچنا ہوگا۔ درس نظامی اپنے وقت کے تقاضوں
مناسب تھا تو آج بھی اسی فریم کے اندر دوسری نئی تصویریں لٹکائی جا سکتی ہیں۔ مسلمانوں کے ایمان اور مذہ
علم سے ہوتی ہے۔ اسی لیے علم حاصل کرنے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہوئی۔ عالم کو دیدہ ور اور جاہل کو نابینا کہا گیا۔

دینی تعلیم کی یہ اہمیت ہی تھی کہ اسے حاصل کرنے کے لیے لوگ سفر اور ہجرت کرتے تھے۔ حدیث نبوی کے
راہ میں سفر کرنے والوں کے لیے اللہ بہشت کی راہ آسان فرماتا ہے۔ صحابۂ کرامؓ تابعین اور قدماء نے علم
لیے سفر کیے۔ صرف ملک کے اندر ہی نہیں بلکہ بیرونی ملک کا بھی سفر کیا۔ علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف
لوگوں کے بارے میں معلومات اور تجربے کا علم حاصل ہوا۔

خیالات میں وسعت پیدا ہوئی، معاشرتی زندگی میں نئے اضافے ہوئے۔ دوسرے مذاہب کی جانب
مذہب کا اثر دوسروں پر چھوڑا۔ دوسروں کے علوم کو تحقیق کے ذریعے نئے انداز سے پیش کیا۔ تاریخی روایات
غزنوی نے مال ودولت و توسیع سلطنت کی خاطر ہندوستان پر حملہ کیا۔ ایسے ناموافق حالات میں البیرونی یہاں کو

---

* سرسید نگر، علی گڑھ۔

اور علم سیکھنے پر کمر بستہ ہوا اور ساری تحقیق کو کتاب الھند کی شکل میں پیش کیا۔ آج دینی تعلیم کے طالب علم جدید تقاضوں اور عصری علوم سے کافی بے گانہ نظر آتے ہیں لیکن یہ کمی دینی تعلیم کی نہیں ہے بلکہ طریقہ تعلیم اور علم طلب کرنے والوں کی ہے۔ وجہ صاف ہے کہ پہلی جنگ آزادی کے بعد حالات کے تحت مسلمانوں نے دینی تعلیم کے ذریعے مذہب کو بچانے میں تعلیمی وسعت کو محدود کر دیا۔ جس کی وجہ سے مذہب تو محفوظ ہو گیا لیکن معاشرت، زبان اور ملک کی تاریخ وغیرہ میں فقدان پیدا ہو گیا۔ اسلام کے اندر دین اور دُنیا دونوں کی اہمیت پائی جاتی ہے۔ ایک دور تھا کہ دینی تعلیم دونوں چیزوں کے لیے مفید تھی۔ بدلتے ہوئے حالات میں چوک یہاں ہو گئی دینی تعلیم کے اندر دین کے مسائل اور عبادات کا تحفظ ہو لیکن معاملات دنیوی میں کمی پیدا ہوتی گئی۔ اگرچہ علم فقہ مشکل کشا ثابت ہوا لیکن ایک حد تک۔ تغیرات اور انقلابات کو روکا نہیں جا سکتا۔ جو حالات قوموں کی زندگی، ماحول اور مقامات پر اثر انداز ہوتے ہیں، تو آسان طریقہ یہی تھا کہ دینی تعلیم کے اندر دنیاوی معاملات کی تبدیلیوں پر نظر رکھی جاتی تو آج بھی یہ تعلیم نئی تعلیم کے دوش بہ دوش نظر آتی۔ یہ تعلیم اور معاشرے کی تبدیلیوں کی آئنہ دار ہوتی جو انسانی فلاح کے لیے بہتر ثابت ہوتی۔ اس تعلیم کے اندر یہ خوبی موجود ہے کہ اہم موڑ پر نئی قدروں کو اپنانے میں اتنی وسعت سے کام لیا کہ وہ دینی تعلیم کا جزو بن گئیں۔ یونان کی سائنس اور فلسفہ کو کس طرح دلارا اور پیارا بنایا گیا۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ دینی تعلیم دوسرے نئے مضامین کو اپنے پہلو میں جگہ دیتی ہے جو آج بھی ممکن ہے۔

اِسلام کا گہوارہ تو سرزمین حجاز تھی، ان کی درس گاہ صحرا اور نصاب عربی زبان، شاعری، گھوڑے کی سواری، تیرنا، تیر چلانا، شراب پینا وغیرہ تھی۔ طلوع اِسلام کے بعد مکہ مکرمہ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضہ کا مکان اِسلام کی پہلی درس گاہ بنا۔ دار ارقم مسلمانوں کی تربیت گاہ اور درس گاہ تھی۔ مسجد نبوی کے اندر صفہ باضابطہ درس گاہ تھی۔ نصاب قرآن، حدیث، مسایل زندگی وغیرہ تھا۔ خلفائے راشدین کے عہد میں اِسلام سرزمین عرب کی سرحدوں کو پار کر گیا اور مختلف ممالک اور قوموں سے دوچار ہوا۔ تعلیم کی طرف توجہ دی گئی۔ جگہ جگہ درس گاہیں کھولی گئیں۔ قرآن اور حدیث کے علاوہ لکھائی پڑھائی، شہ سواری، لغت، عربی کی تدریس، نحو، بلاغت اور فقہ پر توجہ دی گئی۔ مسجدیں زیادہ تر درس گاہیں بنیں۔ بصرہ، کوفہ، بغداد، دمشق، حران، رے، نیشاپور، بلخ، ہرات، بخارا، سمرقند، فاس، قیروان، قرطبہ، غرناطہ، بدخشاں، دہلی، ڈابھیل، سرہند وغیرہ مشہور مراکز تھے۔ ان مختلف ادوار میں اور مختلف مقامات پر نصاب کے اندر دُنیاوی اور آخروی فلاح اور بہبودی پائی جاتی تھی اور نصاب کا اتار چڑھاؤ صاف نظر آتا ہے۔

یوں تو بیت الحکمۃ اور جامعہ ازہر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن بعد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے مشہور درس گاہ مدرسہ نظامیہ بغداد کی تھی۔ اس کے ذریعے بے شمار مدرسے قایم ہوئے تھے۔ سلجوقیوں کے بادشاہ الپ ارسلان اور ملک شاہ کے ایرانی وزیر نظام الملک طوسی نے اس مدرسے کو قایم کیا تھا۔ شیعہ اور معتزلہ کے مقابلے میں اشاعرہ نے اس مدرسے کو اپنا مرکز بنایا۔ عمر خیام اس کے مربّی بنے۔ غزالی نے اس میں درس دیا۔ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو خالی ہاتھ نہیں آئے بلکہ علم اور تمدن سے مالا مال تھے۔ اپنے ساتھ نظام تعلیم اور نصاب تعلیم بھی لائے۔ ساتھ ہی ساتھ نصاب کی کتابیں بھی آئیں لیکن آخری مغل دور میں ملا نظام الدین سہالوی نے نیا نصاب بنایا جو درس نظامی کے نام سے مشہور ہوا۔ یہاں دینی تعلیم میں ایک نیا موڑ نظر آیا۔ اب نصاب کے اندر باہر سے آئی ہوئی نظامیہ مدرسہ کی کتابیں شامل نہیں تھیں بلکہ اس نئے نصاب کی کتابوں کے مصنف ہندوستانی تھے۔ ابتدائی دور سے اب تک جب ہم غور کرتے ہیں تو دینی تعلیم کے اندر دنیاوی امور کے مختلف موڑ نظر آتے ہیں۔ جہاں مختلف کتابیں اور مختلف مضامین گھٹتے بڑھتے رہے۔ اس لیے انسانی فلاح میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ درسِ نظامیہ وقت اور حالات کے لحاظ سے کامیاب نصاب تھا لیکن مدتوں بعد تک یہ نصاب لوگوں

پر چیک کر رہ گیا یا یہ نصاب لوگوں پر چپک گیا۔

شروع میں دینی تعلیم کے اندر دینی و دنیوی معاملات میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا تھا اسی لیے اس کو دینی تعلیم کہ
جہاں تک عبادات کا تعلق ہے ان میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ معاملات کی تبدیلیوں کو روکا نہیں جا سکتا۔
ایسا ہوا تو خرابی پیدا ہونا شروع ہو جائے گی۔ معاملات کے اندر لوگوں کی دنیاوی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ دنیاوی بہتر
کی بہبودی ہوتی ہے۔ اس لیے نفع پہنچانے والی چیزوں کو اختیار کرنے کے بعد نقصان سے بچایا جا سکتا ہے اور د
کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ دینی تعلیم رحمت ہے نہ کہ زحمت۔ اس میں تنگ نظری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دینی تعلیم کے
عملی پہلو اختیار کیا گیا اس میں عبادات اور معاملات دونوں کے ساتھ ایک رویہ اختیار کیا گیا یعنی تبدیلی کہیں بھی گوارا
گئی، جب کہ معاملات کے اندر ہر زمانے اور ہر حالات میں جائز تبدیلی قبول کر لینا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اگر کوئی
ہوئی بھی تو برائے نام جو نہیں کے برابر تھی۔ یہاں تک کہ زمانے کے اثرات قبول کرنے کی طاقت ہی ختم ہو گئی اور دینی تع
بن کر رہ گئی۔ ہر ایک کو اس کی خرابیاں نظر آنے لگیں۔ تنقید در تنقید ہونے لگی۔ ایسے لوگ اس تعلیم کے بارے میں قلم
لگے جو اس کے اہل نہیں تھے۔ اصلاحات کی فہرستیں پیش کی جانے لگیں، مشورے دیئے جانے لگے۔ کھوج کھوج کر کمزو
جانے لگیں۔ گویا ایک مریض کو بہت ساری دوائیں تجویز ہونے لگیں۔ یہ نہ دیکھا گیا کہ مریض دوا پینے کے لیے تیار ہے کہ نہ
ظاہر ہے کہ اس کا رد عمل کیا ہوا۔ بہت ساری تبدیلیوں کو اگر ایک ساتھ ٹھونس دیا جائے تو بہت ساری اچھائیاں تو ہا
لگیں گی لیکن جو خوبیاں موجود ہیں ان کے کم ہو جانے کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ اساتذہ جن چیزوں سے چمٹے ہوئے ہیں ان کو
کو تیار نہیں۔ ایک طرف پرانی قدروں کے کھو جانے کا ڈر، دوسری طرف اگر وہ وہاں سے ہٹے تو ان کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں
گی۔ اس لیے دونئی تبدیلیوں کو کیوں کر قبول کریں۔ دینی تعلیم اس جھمیلے میں پھنس گئی تو اس کا کیا قصور ہے۔ اگر دنیاوی م
کو اس تعلیم کے اندر نظر انداز نہ کیا گیا ہوتا تو علمائے کرام کے لاکھ زور لگانے کے مسلم عوام پر اثر انداز نہ ہو سکے اور قائد اعظ
ہو گئے۔ انھوں نے دنیاوی معاملات میں مذہب کو خطرے میں بتلایا اور یہ بات زیادہ تر مسلمانوں کے حلق سے اتر گئی۔
بھی چاہتے ہیں تو آگے نہیں سکتے۔ دینی تعلیم نے جب اپنا سفر شروع کیا تو اس نے معاملہ بندی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ معا
دامن سے دامن ملا کر چلی۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا اور ہر موڑ پر تبدیلیوں کو قبول کر لیا جاتا تو مسائل کے انبار نہ لگ جاتے،
پست ہوتی۔ دینی تعلیم کے عدم تبدیلی کے احساس نے کافی نقصان پہنچایا جس کی وجہ سے نئی تعلیم کے اضافے کی اہمیت کو ختم کر دیا
کہ دینی تعلیم کے اندر تبدیلی نہیں ہوئی لیکن علوم کی تبدیلی کے بجائے کتابوں کی تبدیلی کی طرف توجہ دی گئی۔ ولی اللہی نصا
ہمارے سامنے موجود ہے۔

دینی تعلیم کے انحطاط کے سلسلے میں نئے زمانے کے خطرناک وجوہات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پہلی جنگ آزا
مسلمان صرف زخمی نہیں ہوئے تھے بلکہ چور چور ہو گئے تھے۔ زخموں پر نئی جلد آنا شروع ہوئی تھی کہ نئے زخم پھر ہرے ہ
۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم سے دو چار ہونا پڑا۔ پڑھا لکھا ہوشیار طبقہ پاکستان چلا گیا۔ زمین داری ختم ہوئی۔ نوکریوا
بند ہونا شروع ہو گئے۔ فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی جو اب بجھائے نہیں بجھتی۔ تحفظ کی دیواریں بنتی اور بگڑتی رہ
روٹی کا مسئلہ بڑھتا گیا۔ شروع ہی سے اپنے پیشے میں غرق ہو کر معاشی حل تلاش کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ بچے
اور کالج تو درکنار مکتب اور مدارس کی راہیں بھولنے لگے۔ بگڑا ہوا ماحول تعلیم کے لیے بالکل موزوں نہیں رہا۔ نئے د

تعلیم کی سطح سے مسلمان بچے غائب ہونا شروع ہو گئے۔ کچھ تعصب کی ہوائیں چل پڑیں کہ سارا باغ اُجڑ کر رہ گیا۔

اگر دینی تعلیم نہ ہوتی تو ہم کو پتہ بھی نہ ہوتا کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔ اس کے ذریعے دین اور شریعت محفوظ ہیں۔ عمل ہو یا نہ ہو لیکن صحیح اور غلط کا علم ضرور ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اپنے اعمال کا جواب دہ ہونا ہے۔ نفس پرستی اور حق فراموشی بری چیز ہے لیکن کیا کیا جائے اگر دنیا کا بندہ عالم بھی بن جاتا ہے تو اس کو دنیا سے سیری نہیں ہوتی۔ پیدا ہوتے ہی دینی تعلیم کے ذریعے اذان کی صدا کانوں میں گھول دی جاتی ہے جو مسلسل سانسوں کے ذریعے دل میں دھڑکتی ہے۔ مرنے کے بعد بھی دینی تعلیم ساتھ دیتی ہے۔ آج بھی اس تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کی بہبود اور فلاح ممکن ہے۔ اگر عربی مدارس کے طالب علم کالج اور یونیورسٹی میں داخلہ لے سکتے ہیں تو عربی مدارس کے اندر اس قسم کی تبدیلی لائے کہ وہاں کالج اور یونیورسٹی کے طالب علم داخلہ لے سکیں۔ محنت کے ساتھ ساتھ مزاج بھی بدلنا ہوگا۔ سختی کے ساتھ نہیں نرمی کے ساتھ محدود ہو کر نہیں وسیع ہو کر، لالچ کے ساتھ نہیں فنا کے ساتھ، آرام کے ساتھ نہیں محنت کے ساتھ، خوف کے ساتھ نہیں بلکہ نڈر ہو کر، غرض کے ساتھ نہیں بلکہ بے غرض ہو کر کام ہوگا۔ بہت کچھ اپنانا بھی ہوگا تو ہی مدارس قلعے بن کر ہر نئے دعوے کو قبول کریں ورنہ مقبرے بن کر رہ جائیں گے۔ سرسید غیر روایتی طور پر روایتی تعلیم کے پروردہ تھے۔ وہ انیسویں صدی کے اندر بیسویں صدی کی آہٹ کو پہچان گئے تھے اور اس کے استقبال کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تو کیا آج ممکن نہیں ہے کہ دینی تعلیم کے اندر کچھ ایسی جائز تبدیلیاں لائی جائیں جو نئے دور میں قابلِ قبول ہوں۔

شہزادۂ آفتاب کے دور میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند کا کسی وجہ سے صدق دل سے ملاپ نہ ہو سکا لیکن اب کچھ عربی مدارس کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ناطہ جوڑنے کی عملی کوشش کی گئی ہے۔ مدارس اور یونیورسٹی کے درمیان آشنائی سے امکان پیدا ہو رہے ہیں۔ سید حامد صاحب جب یہاں یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو چند عربی مدارس کے عالم اور فاضل سند یافتہ طالب علموں کو مسلم یونیورسٹی کے اندر بی۔ اے اور ایم۔ اے میں داخلہ لینے کی اجازت حاصل ہو گئی۔ تقریباً اسی قسم کی سہولت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، لکھنؤ یونیورسٹی، طبیہ کالج علی گڑھ، طبیہ کالج جامعہ ہمدرد، طبیہ کالج بینا پارہ، اعظم گڑھ وغیرہ میں بھی ہے۔ مدارس کے ہونہار طالب علموں کا نئے اداروں اور ماحول میں استقبال کیا جاتا ہے لیکن عملی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دینی تعلیم یونیورسٹی اور کالج کی دکانوں پر سستی قیمتوں پر فروخت ہو رہی ہے۔ کیوں کہ زیادہ تر دینی تعلیم کے فارغین خود نمونہ بننے کے بجائے نئے ماحول کو نمونہ بنانا چاہتے ہیں۔ تقویٰ و طہارت، تزکیہ نفس اور اخلاص کے پرندے نہ مادیت کی شاخوں پر طرز کے ساتھ لٹکتے نظر آتے ہیں۔ غلط طریقے سے دینی تعلیم کو داؤں پر لگا کر عزت اور شہرت حاصل کرنے میں دریغ نہیں کیا جاتا۔ دینی تعلیم کے کچھ فارغین ایسے بھی پائے جاتے ہیں۔ تقویٰ اور طہارت پر قائم رہتے ہوئے دینی تعلیم اور نئے علوم پر پوری طرح دسترس رکھتے ہیں۔ ایسی ہستیاں قابل مبارک باد ہیں جو نئے ماحول میں فانوس دار مینارے بن سکتے ہیں۔ ابھی تو شروع شروع کی بات ہے ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں تفریق کم ہو جائے اچھائی غالب آجائے اور احساس کمتری ختم ہو جائے۔

عبدالودود انصاری*

استاد - ایک عظیم شخصیت

استاد ایک فارسی لفظ ہے جس کے معنی سکھانے والا، کامل فن، مشاق وغیرہ کے آتے ہیں۔ قر وسطی دور سے جب بنی نوع انسان نے یہ محسوس کیا کہ علم کے حصول اور اس کی اشاعت میں ہی انسان شخصیت، درندگی سے نجات، اجتماعی زندگی، اچھے سماج کی تعمیر، تہذیب و شائستگی اور توہمات وجہالہ جکڑ بندیوں سے آزادی جیسے عناصر مضمر ہیں تو اپنے محسوسات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حصول علم کی جا ہوا۔ حصول علم کے بعد جو طبقہ علم کی اشاعت میں مصروف ہوا وہ استاد کہلایا جیسے ہمارے ہندوستان میں گنگا جمنو نے ایک طرف پنڈت، گرو، ادھیاپک، اپادھیہ، اپدیشک، شاستر اور شکچھک کے نام سے یاد کیا تو دوسری استاد، معلم، علامہ، شیخ اور پیر کے نام سے موسوم کیا۔ اس دور کے استادوں نے دور جدید کی تمام سہولتوں موجودگی کے باوجود نالندہ ٹکشلا جیسی قدآور درسگاہوں کی بنیاد ڈالی جن کی تعلیمات کا ڈنکا نہ صرف ہندو ساری دنیا میں بجتا تھا۔ اور ایک عالم اس کی روشنی سے فیضیاب ہوتا تھا۔ استاد کیا ہے؛ استاد تعلیم کا وہ در ستارہ ہے جس کی روشنی سے نہ صرف ایک فرد یا ایک قوم بلکہ پوری انسانیت نسل در نسل فیضیاب ہوتی چلی آر اور ہوتی رہے گی۔ کسی موقع پر ہمارے سابق صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے بڑے اچھوتے انداز میں استاد کی تصویر ک انہوں نے فرمایا کہ "بچے کی طرف سے جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں باقی رہتی ہے ایک اس کی ماں اور دوسرا اچھا استاد"۔ پگمے لین (Pygmalion) نے استاد کی حقیقت طرح اعتراف کیا ہے کہ "ہر مخلص معلم اپنے تجربات کے دوران بے ہنگم اور بد قطع پتھر سے ایک خوبصورت ا مجسمہ تراشتا ہے اور پھر اس میں جان ڈالتا ہے۔ بارینگٹن نے تو ایک اچھے شہری کی تخلیق کا ذمہ دار استاد کو بتاتا ہے۔ ا شاعر نے بڑے حسین پیرائے میں انسان کی خوبصورتی ہیرے وجواہرات، سونا اور چاندی سے اہم بتا کر ا تعریف کی ہے وہ اس طرح ہے۔

Not gold but only men
Can make a people great and strong

(سونا نہیں بلکہ صرف انسان لوگوں کو عظیم اور طاقتور بناتا ہے) یقیناً شاعر نے انسان سے مراد استاد لیا

---

* پرنسپل، اردو میڈیم گورنمنٹ ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، پوسٹ بنالی کل، ضلع ہوگلی۔ ۷۱۲۴۰۷ (مغربی بنگال)

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اگست - ۱۹۹۵ء

استاد کے سلسلے سے مشہور ماہر تعلیم ہمایوں کبیر نے کہا ہے کہ "استاد کا کام صرف یہ نہیں کہ ایک بالٹی سے دوسری بالٹی میں رقیق انڈیلنے کی طرح بچوں میں تعلیم دے" یا پھر ڈاکٹر ذاکر حسین کی زبان میں کہ "تدریس میں یہ نہیں ہونا چاہیے کہ استاد کی نوٹ بک سے طالب علم کی نوٹ بک میں تعلیم منتقل ہو جائے" پھر آخر کون سی خصوصیت کی بنا پر استاد کو "روحانی باپ" یا "پدر ثانی" کا درجہ دیا جاتا ہے۔ درس و تدریس میں استاد کے عملی فعل دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ایک مخصوص مدت میں مخصوص مضمون کے اسباق سے طالب علموں کو روشناس کراتا ہے۔ طالب علم امتحان میں اچھے نمبروں کے حصول کو مدنظر رکھتے ہوئے استاد کے ذریعہ دیئے گئے درس کو رٹ رٹا کر ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے۔ امتحان ختم ہونے کے بعد آہستہ آہستہ اسباق کے مواد بھولتا جاتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بیشتر حصہ اس کے ذہن سے ختم ہو جاتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر استاد شاگرد کو کس طرح فیض پہنچاتا ہے؟ دراصل ایک کامیاب ترین استاد اپنے درس کے دوران جو حب الوطنی کا جذبہ، مساوات، سچائی و دیانت داری، تعصب پسندی سے بعد، حالات سے بزد آزمائی، اچھی شخصیت کے حصول کے ذرائع، حق گوئی، اجتماعی محبت و اخوت، جمہوریت کی علمبرداری، سماجی رواداری وغیرہ کو بالواسطہ یا بلاواسطہ تدریس کے دوران بتاتا ہے بس وہی اس کے ذہن میں آخری دم تک ذہن نشین رہتا ہے جو اس کی شخصیت میں چار چاند لگاتا ہے اور جب کبھی بھی طالب علم اپنی عملی زندگی میں متذکرہ عناصر پر عمل کرتا ہے تو کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ ماہر تعلیم پستالوزی کا واقعہ ہے کہ جب وہ درجہ میں داخل ہوتے تو بچوں کو پہلے سلام کرتے کسی نے وجہ دریافت کی تو پستالوزی نے جواب دیا اس کو تاریخ نے اس طرح محفوظ کر رکھا ہے جو آج کے اساتذہ کرام کے لیے درس عبرت کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے فرمایا، بھائی! ان بچوں میں مجھے نہیں معلوم کون بڑا فلسفی، کون بڑا انسان اور انسانیت والا بیٹھا ہے اور جب وہ اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد ترقی اور قدر و منزلت کی منزل پر پہنچے گا تو اس وقت ان کی تعظیم کے لیے حیات سے رہوں نہ رہوں، نیلسن۔ ایل۔ بوسنگ نے ایک ضخیم کتاب "ثانوی اسکولوں میں تدریس" تصنیف کی ہے۔ مصنف موصوف نے اس کتاب کی تصنیف کی وجہ بھی بلا تامل اپنی صدق بیانی کے ساتھ اس کتاب میں درج کر دی ہے "میری ایک استانی تھی جس نے مجھے جونیر ہائی اسکول میں تعلیم دی تھی۔ حقیقت میں ان کی رغبت تعلیم اور حوصلہ افزائی کا اثر محرکہ نہ ہوتا تو میں آج اس کتاب کا مصنف نہ ہوتا" پروفیسر رسک (Rusk) نے بھی اس طرح کہا ہے کہ استاد کے سوا شاید کوئی شخص کام کرنے والا نہیں جس کے فلسفہ اور منطق کا اتنا زیادہ اثر انسان پر پڑتا ہو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ استاد میں وہ کیا کیا صفات ہونی چاہئیں جن کی بنا پر اسے ایک کامیاب معلم کہا جا سکتا ہے۔ ایک کامیاب استاد اسی کو کہا جا سکتا ہے جو خود درس و تدریس کے آخری لمحے تک اپنے آپ کو طالب علم سمجھے جس کو مشہور ماہر تعلیم رابندر ناتھ ٹائیگور نے بڑے حسین پیرائے میں بیان کیا ہے "کوئی استاد کبھی حقیقی طور پر تعلیم نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ خود ابھی تک سیکھ نہ رہا ہو۔ ایک چراغ دوسرے چراغ کو ہرگز منور نہیں کر سکتا جب تک اس کا شعلہ خود منور نہ ہو۔ وہ استاذ جو اپنے مضامین ختم کر چکا ہے اور جس کا اپنے علم سے کوئی زندہ تعلق باقی نہیں بلکہ وہ صرف اسباق کو اپنے طالب علم کے سامنے دہراتا ہے۔ استاد کا یہ فعل طلباء کے ذہنوں کے بوجھ میں تو اضافہ کر سکتا ہے مگر ان کی نئی زندگی میں روح نہیں ڈال سکتا"۔ دولت مشترکہ نے تحقیقی طور پر ایک اچھے استاد کے اندر پچیس صفات کو اجاگر کیا ہے وہ اس طرح ہے علم و فضل، ضبط نفس، کشادہ دلی، مطابقت پذیری، ہوشیاری،

ثابت قدمی، مناسب فیصلہ، ایمان داری، اچھی تندرستی، صبرو استقلال، صفائی، شائستگی، جدت پسندی، قوت کشش تنوع ہی، قیادت، ترقی پسندی، احتیاط، اشتراک، مستعدی، روانی تحریر و تقریر، کفایت شعاری، قابلِ اعتماد، ذاتی وضع قطع اور قیادت۔ یہی وہ سب اوصاف ہیں جن کے بناپر ایک استاد کامیاب ترین استاد ہو سکتا ہے۔ استاد کا عمل ہمیشہ دوستانہ، اشتراک اور ہمدردانہ رائے کا حامل ہونا چاہیے۔ اگر استاد کو طلبا کے لیے تکلیف اٹھانی پڑے تو تکلیف اٹھانا اس کے لیے غلط نہ ہوگا بلکہ یہ سمجھے کہ یہ شاگرد کا حق ہے۔ ایسے صفات کے مالک جب استاد بنے تو ایسے ایسے شاگرد پیدا ہوئے جن کی علمی لیاقت کا اعتراف خود استاد کرتا ہے۔ مشہور محدث امام بخاریؒ نے اپنے شاگرد امام ترمذیؒ کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ــــ " تم نے جو کچھ مجھ سے حاصل کیا اس سے کہیں زیادہ میں نے تم سے استفادہ کیا ہے"۔ پروفیسر آرنلڈ جو اقبال کے استاد کے استاد تھے اقبال کی تعریف میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے اور کہتے ہیں " ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے"۔ استاد سے جب طلبا خلوص و محبت پاتا ہے اور ان کے علم سے اپنے قلب کو منور کرلیتا ہے تو پھر طلباء کے اندر استاد کی قدر و منزلت ایسی پیوست کر جاتی ہے کہ جیسے وہ ساری زندگی یاد رکھتا ہے۔ بھیم راؤ امبیڈکر کے نام سے کون ہندوستانی ناواقف ہوگا جن کے وضع کردہ قوانین پر آج بھی ہندوستان قائم ہے۔ اصل نام تو ان کا بھیم راؤ تھا، امبیڈکر ان کے استاد کا نام تھا۔ مگر انہوں نے اپنے استاد سے ایسے ایسے علم کے انمول ہیرے جواہرات پائے جس سے متاثر ہوکر انہوں نے اپنے نام کے ساتھ استاد محترم کا نام جوڑ دیا۔ آج بھی پوری دنیا ان کے اصل نام بھیم راؤ سے زیادہ امبیڈکر کے نام سے مخاطب کرتی ہے۔ پروفیسر عبدالسلام جب نوبل پرائز پاکر کلکتہ آئے تو ان کے ایک بنگالی استاد جنہوں نے ان کو علم ریاضی پڑھائی تھی وہ عمر درازی اور بیماری کی حالت میں بستر پر تھے۔ عبدالسلام صاحب ان کے قریب گئے اور نہایت ہی عزت و احترام اور باادب ہوکر اپنے دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میڈل رکھ کر استاد کی نگاہوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں " میں آپ کا محبوب شاگرد ہوں میں نے یہ میڈل حاصل کیا ہے۔ ذرا اسے دیکھئے" پھر استاد اور شاگرد میں جو مختصر بات چیت ہوتی ہے اس کو الفاظ اور تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ یہاں بھی استاد کی قدر منزلت کا سبق ملتا ہے۔ آخر تو کوئی بات تھی کہ پروفیسر عبدالسلام نے کسی موقع پر فرمایا تھا۔ " استاد کی شفقت اور توجہ کی نگاہ شاگرد کو آسمان تک پہنچا سکتی ہے"۔ تھیلس جو یونان کے سات مفکروں میں شمار کیے جاتے ہیں جب ایک شاگرد پر نظر شفقت ڈالی تو وہ اپنے وقت کا فیثا غورث بنا۔ جب ایک مولوی جناب طالب علی پابندی نے اپنے شاگرد کو تعلیم سے آراستہ کیا تو سائنسی ارتقاء کا بادشاہ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر بن کر ابھرا۔

آکسفورڈ کے ایک پروفیسر سے فوج کے ایک اعلیٰ افسر نے طنزیہ سوال کیا تھا۔ آپ اس یونیورسٹی میں بیٹھے کیا کررہے ہیں جب کہ سبھی انگلستانی وطن کے لیے جان کی بازی لگا رکھی ہے پروفیسر نے بڑے سکون سے جواب دیا میں تو واقعی کوئی خاص کام نہیں کررہا ہوں بجز اس کے کہ آپ جس تہذیب کی بقا کے لیے لڑ رہے ہیں میں اس کی تخلیق میں ہاتھ بٹا رہا ہوں۔ آج ہر فرد، جماعت یا حکومت جو مستقبل کو خوش گوار دیکھنا چاہتی ہے اسے اپنے استادوں کے ساتھ ہر طرح کے خوشگوار معاملات میں پیش رفت کرنی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد فاروق اعظم*

دینی و عصری علوم میں توازن

وقت کی اہم ترین ضرورت

انسان ایک مہذب مخلوق ہے۔ اس کا تہذیب یافتہ ہونا ہی دراصل اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا سبب ہے اور اس کے تہذیب یافتہ ہونے کے لیے اس کا تعلیم یافتہ ہونا شرط لازم ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تخلیق آدمؑ سے قبل جب اللہ نے فرشتوں کو بلا کر انسان کو اپنے خلیفہ کی حیثیت سے پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور فرشتوں نے انسان کے متعلق جس شبہے کا اظہار کیا اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام بتا دیے یعنی ہر طرح کے علم سے نواز دیا۔ ایسا کرکے اللہ تعالیٰ نے گویا یہ بتایا کہ ہم انسان کو نہ صرف یہ کہ کچھ اختیار دیں گے بلکہ یہ بھی بتا دیں گے کہ اس کے اختیار میں کیا گیا ہے۔ اور کیا کیا نہیں ہے۔ اسی غرض وغایت کی خاطر اللہ تعالیٰ نے جب جب اور جہاں جہاں ضرورت محسوس کی انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے رسولوں کو مبعوث کیا اور کتابیں نازل کیں۔ اس سلسلے کی آخری کڑی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر نازل کی گئی کتاب قرآن مجید ہے۔ اور دنیا میں زندگی گزارنے کا طریقہ اور مکمل طریقہ اب دین اسلام ہے۔ قرآن کہتا ہے

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ۔

"آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اس بات کو پسند کر لیا کہ تمہارا دین اسلام ہو۔"

دنیا میں خدا کی سب سے بڑی نعمت اسلام ہی ہے۔ اس عظیم نعمت سے نواز کر اللہ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ لہٰذا اس احسان کا حق ادا کرنا ہم سب پر فرض ہے۔ اللہ کے نزدیک اس کے اس احسان کا حق ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم اسلام کے سچے پیرو اور علمبردار بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے سچے پیرو اور علمبردار بننے کے لیے اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا ہوگا۔ اسلام کے متعلق تفصیلی علم کے بغیر ہم یہ حق ادا نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں بھی ہمیں علم کی ضرورت و اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔ علم حاصل کیے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے علم ایک روشنی ہے اور جہالت تاریکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ـــــ

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ "علم کا حاصل کرنا ہر مسلم مرد و عورت پر فرض ہے"

اس میں شبہ نہیں کہ یہاں "علم" سے مراد "علم دین" ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ "علم دنیا" کو ہم پوری طرح نظر انداز کر دیں رسول اللہؐ کی ایک حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ ـــــ

کھیری باندہ، بھاگلپور، بہار۔

Tahzibul Akhlaq DECEM 95 Regd. No. 23 (86-87) Ph. 401027

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پلیٹنم جوبلی کے موقع پر
رسالہ تہذیب الاخلاق اور نشانات کے خصوصی نمبر

درج ذیل موضوعات پر اہل قلم حضرات کا تعاون درکار ہے۔ درخواست ہے کہ مضامین ۳۱ دسمبر ۱۹۹۵ء تک ہمیں بھیج دیے جائیں۔

- سرسید۔ تحریک اور شخصیت ● مسلم یونیورسٹی تحریک۔ مدرسۃ العلوم مسلمانان ہند اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ۔
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء۔ یونیورسٹی کا قیام۔ یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیمات ۱۹۵۱ء۔ ۱۹۶۵ء میں ایکٹ کی منسوخی اور آرڈی نینس۔ ایکشن کمیٹی ۱۹۷۲ء کا ترمیمی ایکٹ اور اس کے خلاف ایجی ٹیشن ۱۹۸۱ء کا ترمیم شدہ ایکٹ۔
- یونیورسٹی کے تعلیمی شعبے۔ ان شعبوں کی نمایاں خدمات (الگ الگ شعبوں کی خدمات کا جائزہ)
- یونیورسٹی کے دیگر ادارے۔ یونیورسٹی اسکولس۔ ویمنس کالج۔ طبیہ کالج۔ انجینیرنگ کالج۔ پالی ٹکنک۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ انسٹی ٹیوٹ آف اپتھلمالوجی۔ میڈیکل کالج۔ انسٹی ٹیوٹ آف بائیو ٹکنالوجی۔ انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر۔ طبیہ دواخانہ ● یونیورسٹی دفاتر۔
- یونیورسٹی کے اخبار و رسائل۔ علی گڑھ گزٹ۔ علی گڑھ میگزین۔ ہال میگزین۔ شعبہ جاتی جرنلس۔ فکر و نظر۔ تہذیب الاخلاق اور نشانات۔ یونیورسٹی پریس۔
- اسٹوڈنٹس یونین۔ نامور عہدے دار اور مقررین ● ڈیبیٹنگ سوسائٹی ● اولڈ بوائز ایسو سی ایشن (معروف ابنائے قدیم)
- مسلم یونیورسٹی اور قومی سیاست (۱۹۴۷ء تک) تحریک آزادی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام۔ تحریک پاکستان اور مسلم یونیورسٹی۔
- مسلم یونیورسٹی اور قومی سیاست (۱۹۴۷ء تا حال)
- مسلم یونیورسٹی اردو زبان و ادب اور صحافت۔ تحریکات۔ شخصیات۔
- مسلم یونیورسٹی کھیل کے میدان میں۔ معروف کھلاڑی ● مسلم یونیورسٹی اور ثقافت۔ ریڈیو۔ ٹی۔ وی۔ فلم۔ ڈراما موسیقی۔ مصوری۔ شخصیات۔
- مسلم یونیورسٹی اور مذہب۔ فکر و عمل ● علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سیکولرازم کی ایک کارگہ عمل ● مسلم یونیورسٹی اور خود اختیاری AUTONOMY
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اہم شخصیات۔ چانسلرس۔ پرو چانسلرس۔ وائس چانسلرس۔ پرو وائس چانسلرس۔ نامور اساتذہ اور دوسرے لوگ ● علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کدھر؟ تعلیمی ترقی اور برتری۔ تجربے اور امکانات۔ معیار تعلیم۔
- سیاسی، نیم سیاسی اور مذہبی تنظیموں کے اثرات ● ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں ● اساتذہ کے مسائل۔
- طلبہ کے مسائل۔ بڑھتی ہوئی تعداد۔ اقامت گاہیں (ہال اور ہوسٹل) اسٹوڈنٹس یونین کا رول۔ ڈسپلن۔
- غیر تدریسی عملا اور اس کے مسائل ● فرقہ واریت اور علی گڑھ۔ یونیورسٹی اور علی گڑھ شہر۔
- نئے تقاضے اور مطالبے۔ ٹکنالوجی اور سائنس کی ترقی کی رفتار۔ مسلم یونیورسٹی اکیسویں صدی میں۔
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کردار۔ علی گڑھ کلچر۔

AMU Press, Exhibition Road, Aligarh. Ph. : 23846

قطب الدین شاہد *

عصری تعلیم سے چشم پوشی۔ پسماندگی کا سبب

نوجوانوں کی تعلیمی قابلیت، ذہنی تربیت نیز بہترین شخصیت میں ہی قوموں کی ترقی کے راز پوشیدہ ہیں۔ بصورت دیگر تنزلی ہی مقدر ہوتی ہے آج ہم اس نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تعلیمی، سیاسی، معاشی، اقتصادی، سماجی نیز دینی میدانوں میں ہماری حالت قابل رحم ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہم اس سطح کسمپرسی سے مقام بلندی کی جانب پیش رفت کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ پھر روشن مستقبل کی ضمانت کون دے گا؟ مقام افسوس ہے کہ دنیا کی ایک محکم قوم آج مظلوم اور ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ خود کی صلاحیت پر منحصر نہ ہوکر امداد باہمی کی منتظر رہتی ہے۔ اپنی فتح و نصرت کے علم ہر میدان میں نصب کرنے والے اسلاف نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ اس قوم پر کبھی ایسا وقت آئے گا جب وہ اپنی روایتوں سے انحراف بھی کرے گی۔ انہوں نے دین و دنیا میں سرخرو رہنے کے لیے ایک بہترین لائحہ عمل مرتب کیا تھا اور خود عمل کرکے مہر صداقت بھی ثبت کردی تھی کہ ایسا ممکن ہے۔ مگر ہمیں نہ تو ماضی سے سبق لینے کی ضرورت محسوس ہورہی ہے اور نہ ہی مستقبل کی فکر پڑی ہے۔ بقول علامہ اقبال

بھلادی ہم نے جو اسلاف سے میراث میں پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

ہماری پسماندگی کے اسباب کیا ہیں؟ اس پہلو پر اگر حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو یہی بات سامنے آئے گی کہ عصری تعلیم سے کنارہ کشی ہی سب سے اہم وجہ ہے۔ دینی و عصری تعلیم کے درمیان خطِ فصیل قائم کرکے مسلمانوں کو اس سے دور رکھنے کی ایک منظم سازش برسوں سے جاری ہے اور ہم ہیں کہ بلاتحقیق و تردد عصری تعلیم سے غفلت برتتے آرہے ہیں۔ جب کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا تعلیم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے۔ کیا اس وقت چین میں دینی تعلیم رائج تھی؟ حقیقت تو یہ ہے کہ حضورؐ مسلمانوں کو دنیا و آخرت دونوں جگہ دیگر قوموں سے آگے ہی رہنے کی تلقین فرماچکے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر کا یہ تعلیمی تصور بھی کافی حد تک روشنی عطا کرسکتا ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر مضامین کی تعلیم کا انتظام کرنے سے علم دین و دنیا ایک ہی چھت کے نیچے جمع ہوں گے جس سے بلاشبہ منفعت پذیر ہوں گے۔ اور مغائرت کا وہ پردہ جو دونوں کے درمیان حائل ہے اور جس نے علم دین کو بے حس اور علم دنیا کو بے روح اور دور از خدا بنا رکھا ہے اٹھ جائے گا۔ مولانا حبیب ریحان خان ندوی اسی پر تبصرہ فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں

---

* نامہ نگار ہفت روزہ صبح و شام، میٹرو ڈائننگ شاہ منزل، مہتا کمپاؤنڈ، نارپولی، بھیونڈی، تھانہ۔ ۴۲۱۳۰۲ (مہاراشٹر)

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اگست ۱۹۹۵ء

کہ دین و دنیوی علوم کی یہ تفریق بہت بعد میں ہوئی۔ دراصل یہ داخلی تفریق نہیں تھی بلکہ خارجی و سامراجی اثر و ر
ہوئی۔ اور اس کا منفی پہلو یہ نکلا کہ دنیاوی علوم ایمان و یقین اور شریعت کی نگہبانی سے محروم ہوگئے اور دینی
ترقی سے غافل ہوکر صرف بحث و مباحثہ میں الجھ گئے یا انتہائی اصلاحی کوششوں کے بعد عقائد کی اصلاح اور عبادا
پر راضی ہوگئے۔ اور عالم کی پاسبانی اور خلافت علی الارض کی ذمہ داری اور جملہ کائناتی اور آفاقی علوم میں ک
کردار کی ادائیگی سے محروم ہوگئے۔ علوم شرعی و علوم دنیاوی میں خط فصیل قائم کرنے کی ذمہ داری علماء کے سر
ہوئے جلال الدین وزیر آبادی (مدرس الجامعۃ الاسلامیہ تلکمنا) نہایت حق گوئی و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہو
ہیں "آج کے علماء دین کو محصور کر رہے ہیں نہ انہیں زبان آتی ہے نہ تاریخ نہ علم شریعت کا مطالعہ ہے نہ قرآ
تحقیقی نظر۔ تعصب، تنگ نظری کٹاؤ نے ایک ایسی اسپرٹ پیدا کردی ہے جس سے پوری ملت انتشار کا شک
جو علم خلق خدا کی نفع رسانی کے لیے کائنات کے اسرار پر پڑے پردوں کو اٹھانے کے لیے آیا تھا طبقات الارض
علم الحیوانات کا علم کیوں مفید ہے۔ فلکیات و سمندری۔ علم و فنون کی افادیت پر ابھارتا ہے وہ ہم نے بڑی آ
سے غیروں کو وارث بنا دیا ہے"

محمد عالم انصاری ماضی کے اوراق پر نظر ڈالتے ہوئے نہایت مسرت سے فرماتے ہیں کہ "یہ بات روز ر
کی طرح عیاں ہے کہ ہر دور میں مسلمانوں نے کوئی نہ کوئی ایجادات ضرور کی ہیں۔ لیکن افسوس کہ آج مسلما
موجدات کی فہرست میں شاید ہی دیکھنے کو ملتا ہو۔ اس کی صرف یہی وجہ ہے آج ہم علوم فنون کے میدان سے کو
نظر آتے ہیں بلکہ تنقیدی مزاج کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں" اور اسی طرح کے ملے جلے رد عمل کا اظہار مفتی محمد خبیر
بھی کیا ہے۔ موصوف رقمطراز ہیں "اسلام نے اپنے ماننے والوں کو علوم و فنون، صنعت و حرفت، تہذیب و تمدن
ہر طرح کی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی بیش بہا ایجادات، تخلیقات اور انکشا
کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ علوم و فنون میں چاہے ریاضی ہو یا جبر و مقابلہ، ہیئت طبیعیات، کیمیا، نباتات و
جغرافیا، طب ارضیات، معاشیات، تجارت غرض یہ کہ کون سا علم ہے جس میں مسلمانوں نے رہبری نہ کی ہو۔ اور
آیات قرآنیہ سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو چکی ہے کہ قرآن نے جگہ جگہ انسان کو تدبر۔ تفکر۔ تفقہ اور تعقل د
ہے۔ تاکہ وہ آیات الٰہیہ کا مشاہدہ کرسکے"

امام غزالی نے احیاء العلوم میں اس خیال کی شدت کے ساتھ تردید کی ہے کہ علوم شرعی کے ساتھ علوم دینی کا
تطبیق ممکن نہیں ہے "بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ علوم عقلی۔ علوم شرعی کے منافی ہیں اور ان کے درمیان اجتما
ہے دراصل یہ خیال لوگوں کی کم نظری و کوتاہ بینی کی دلیل ہے۔ ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اس خیال سے" امام غزالی
نقطہ نظر سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی تعلیم کو زندگی سے تشبیہ دیتے ہوئے نہایت ہی مدا
میں کہتے ہیں کہ زندگی ایک اکائی ہے۔ اس میں تقسیم نہیں ہے اسی طرح تعلیم بھی ایک اکائی ہے اس میں دینی و دنیوی تقسی
ہونی چاہیے جب کہ سرسید احمد خاں اس خیال اور دعوے کو کہ "آدمی عصری اور دینی تعلیم ایک ساتھ حاصل نہیں کرسکتا چیلن
کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہارے دائیں ہاتھ میں قرآن بائیں ہاتھ میں سائنس ہوگا اور پیشانی پر کلمہ لا الٰہ الا اللہ تحریر ہوگا کون
کہ ایک ساتھ ممکن نہیں"، تعلیمی پسماندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے احمد رشید شیروانی جھنجھلا کر کہتے ہیں "کیا قیامت ہے جس مذہب نے صد

وضاحت اور شدت کے ساتھ علم حاصل کرنے کی تلقین کی اپنے آپ کو اسی مذہب کا پیرو کہنے والے آج تعلیم میں سب سے پیچھے ہیں۔ اپنی تاریکی و جہالت کو بھینچے اور لپٹائے ہوئے ہیں۔

علوم شرعی کے ساتھ ساتھ علوم عصری کی ضرورت ۔ اہمیت و افادیت پر بزرگان دین و دانشوران اسلام کے یہ مدلل و عاقلانہ بحث و تبصرے اب شاید لوگوں کے چشم بصیرت پر پڑی جہالت کی گرہ کچھ ڈھیلی کر سکیں اور لوگ اپنی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کیوں کہ یہ وقت کی ضرورت کے ساتھ ساتھ دنیا میں سر اٹھا کر جینے کے لیے اشد ضروری ہے۔ اور اگر ایسا ہوا تو وہ دن دور نہیں جب دنیا ہی ہماری ایجادات و انکشافات پھر سے حیرت کی نگاہوں سے دیکھے گی اور ہم لوگ ایک بار پھر اپنے حال کا رشتہ ماضی کی درخشانی سے جوڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیوں کہ دریا سے بچھڑے ہوئے قطرے کا دوبارہ دریا میں جا ملنا محال نہیں۔

(باقی صفحہ ۱۲ کا)

با ارادہ اور با اختیار مخلوق ہے اور اللہ کی پیدائشی رعیت ہونے کی وجہ سے اللہ ہی کے دیئے ہوئے ان اختیارات کو اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا ہے۔ اللہ کی مرضی معلوم کرنے کا واحد ذریعہ کتاب اور رسول ہے۔ اپنے آپ کو اپنی مرضی سے اللہ کی مرضی کے تابع کر دینے کے بعد جو طرز زندگی اختیار کرنا ہے اس کا مأخذ کتاب الٰہی اور اللہ کے رسول کے سوا کوئی نہیں ہے جس میں اللہ کی نازل کردہ کتابیں زبور، تورات، انجیل وغیرہ ہیں۔ آخری کتاب کا نام قرآن ہے اور رسولوں کے سلسلے کی آخری کڑی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

تیرا پیام خدا کا ہے آخری پیغام — سنا نہ پھر کوئی پیغام اس پیام کے بعد
مری زباں پہ ہے نام محمد عربی — ہر ایک کام سے پہلے ہر ایک کام کے بعد

[illegible]ب الحق انصاری *

کوانٹم تھیوری اور خدا کا تصوّر

سرسید نے جب سائنٹفک سوسائٹی بنائی یا مدرسۃ العلوم قایم کیا اور ساتھ ہی اسلام کے نام کو لینا عار نہ سمجھا تو ایک خیال نے ترویج پائی کہ شاید جدید علوم کے استفادے سے مسلمان ہونے کا مفہوم بجائے معدوم یا مفقود ہونے کے اور زیادہ واضح بھی ہو سکتا ہے۔ سرسید کا قول تھا کہ میں مسلمان ہوں تو غور و فکر اور استدلال کی بنا پر ہوں نہ کہ محض کسی ایسے اعتقاد کی بنا پر جس کی کوئی بنیاد نہ ہو۔ سرسید کے زمانے سے لے کر آج تک سائنس میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ فزکس میں کوانٹم تھیوری نام کے نظریے نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ یہ مضمون اسی تھیوری میں ہونے والے کچھ حالیہ مباحثات سے متعلق ہے۔

کوانٹم تھیوری کی حالیہ دور میں ترویج کی ابتدا اس صدی کے آغاز میں ہوئی جب جرمنی کے سائنس دانوں نے تجویز کیا کہ توانائی یا طاقت، مخصوص منفصل مقداروں یا کوانٹموں (Quanta) میں ہی کم زیادہ کی جا سکتی ہے۔ ایک اور سائنس داں (البرٹ آئن سٹائن) نے اخذ کیا کہ مثلاً روشنی توانائی کے پیکٹوں پر یوں مشتمل ہوتی ہے کہ ان میں یعنی ان پیکٹوں میں توانائی اور تحرک مرکوز ہوتے ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ توانائی اور تحرک کے حامل ہوتے ہیں اور تبادلاتِ فعل کے دوران وہ پورے کے پورے داخلِ عمل ہوتے ہیں یعنی ان کا کوئی حصہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ اُدھر مادے کے بارے میں تجویز پایا کہ چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے مل کر بنا ہے جنھیں اب بھی ایٹم (Atom) ہی کہا گیا (جیسا کہ عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کے فلسفیوں نے بھی کہا تھا) لیکن اب دریافت ہوا کہ ایٹم میں ننھا وزنی نیوکلیس (Nucleus) درمیان میں تو ننھے الیکٹران (Electrons) نیوکلیس کے اطراف پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ روشنی کے بارے میں زیادہ معتبر یہ تھا کہ برق مقناطیسی شعاعوں پر مشتمل ہوتی ہے لیکن آئن سٹائن کی تجویز کے بعد کئی تجربات سے یہ صاف ظاہر ہونے لگا کہ روشنی توانائی اور تحرک کے پیکٹوں پر جنھیں فوٹان (Photons) کہا گیا مشتمل ہوتی ہے۔ دوسری طرف کچھ ایسے اصول دریافت ہو چکے تھے جن سے کلاسیکی میکانیکس اور روشنی کے کلاسیکل نظریے کے مابین ایک طرح کی مماثلت کا اظہار ہو رہا تھا۔ مثلاً میکانکس کا ایک اصول تھا کہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک کوئی ذرہ اُس مدار پر ہو کر جائے گا جس پر جانے سے وہ ایک طبعی قدر کو جسے ایکشن (Action) کہتے ہیں، کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ کر سکتا ہے جب کہ روشنی کی بابت ایک ملتا جلتا اصول یہ تھا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ روشنی اس مدار پر ہو کر جائے گی جس میں کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ وقت لگے گا۔ اُدھر عدسوں اور آئینوں وغیرہ سے روشنی کے گزرنے کو یہ باور کر کے آسانی سے سمجھایا جانے لگا تھا کہ روشنی سیدھے خط پر چلتی ہے جیسے کہ کرنیں

* ــــ ریسرچ آفیسر، شعبۂ فزکس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ اگست ۱۹۹۵ء

ہوتی ہیں۔ اس موضوع سے متعلق علم کو جیومیٹریکل آپٹکس کا نام دیا گیا لیکن پھر بعض مخصوص کیفیات جیسے بعض طرح کی روشنی کا رکاوٹوں کے کناروں پر سے ہو کر گزرتے وقت مڑ سا جانا یا دو پاس پاس کے سوراخوں سے گزرنے پر روشن تاریک پٹیوں میں بدل جانا وغیرہ روشنی کو لہروں پر مشتمل سمجھ کر سمجھایا جا رہا تھا۔ روشنی کے لہروں پر مبنی ہونے سے متعلق علم کو فزیکل آپٹکس کا نام دیا گیا۔ گہرائی میں جا کر دیکھنے پر اندازہ ہو گیا کہ جیومیٹریکل آپٹکس، فزیکل آپٹکس کی وہ شکل ہے جہاں رکاوٹوں یا روشنی گزار وسیلوں کے سائز، روشنی کی لہروں کی لہر لمبائیوں سے بہت زیادہ بڑے ہوتے ہیں (لہر لمبائی سے مراد لہر کی ایک اونچائی سے دوسری اونچائی تک کا فاصلہ ہوتا ہے)۔

جب آئن سٹائن کی تجویز کے مطابق سوال پیدا ہوا کہ روشنی کی لہریں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کس طرح ایسے عمل کر سکتی ہیں کہ پوری پوری توانائی تبادل فعل کے وقت محض ایک ٹکڑے میں مرکوز ہو جائے لیکن پھر وہی توانائی روشنی کی لہر کی طرح ساری فضا پر پھیلی ہوئی بھی ظاہر ہو تو ایک اچنبے کا احساس ہونے لگا۔ الیکٹرانوں کو ذرے مانا جا رہا تھا۔ اب ایک فرانسیسی سائنس داں نے تجویز کیا کہ یہ بھی پھیلی ہوئی لہریں ہوتے ہیں اور روشنی کی لہروں کی طرح کے مظاہر دکھا سکتے ہیں۔ تجربوں نے اس تجویز کی تصدیقیں پیش کر دیں۔ اس طرح اچنبے میں اور اضافہ ہو گیا کیوں کہ الیکٹران تو ایٹم کا حصہ تھا اور ایٹم خود ایک ذرے کی طرح تھا تو کیا ایٹم میں الیکٹران ایک نہایت چھوٹے ذرّے کی طرح ہوتا ہے یا پھیلی ہوئی لہر کی طرح؟ جیسے جیسے ایٹم کے بارے میں مزید تفصیلات تجربوں سے حاصل ہوتی گئیں الیکٹران کی نوعیت کے بارے میں بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ مثلاً اگر الیکٹران ایک برقی ذرّے کی طرح ایٹم میں تیزی سے گھوم رہا ہے تو اسے ایک طرح کی روشنی خارج کر کے توانائی کھو کر ایٹم کے مرکز میں واقع نیوکلیئس میں گر کر ایٹم کی ساخت کو ختم کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن پھر ایٹم اس قدر مستقر اور مستحکم کیسے تھا کہ وہ ایک مستقل وجود رکھ سکتا تھا؟ تجویز ہوا کہ ایٹم میں الیکٹران کی بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں جو مستقر ہوتی ہیں اور جب ایٹم ایک حالت سے دوسری حالت میں جاتا ہے بعض تب ہی اشعاع کرتا ہے ورنہ نہیں۔ اس سے کچھ باتیں جیسے ایٹم سے نکلے اشعاع کے طیف (spectrum) کی لکیروں میں پائی جانے والی ترتیبیں کسی حد تک سمجھ میں آنے لگیں لیکن پھر یہ ماننا ضروری تھا کہ برق مقناطیسی لہروں کی طبیعیات ایٹم کے اندر غلط ہو جاتی ہے۔ ان پر پڑی روشنی کو جب ایٹم بکھیرتے ہیں یا اس سے متاثر ہوتے ہیں تو اسے سمجھانے میں یہ ایک اور عجیب بات معلوم ہوئی کہ الیکٹران کے دو خواص یعنی اس کا فضائی مقام جسے q سے ظاہر کرتے ہیں اور الیکٹران کا تحرک جسے p سے ظاہر کرتے ہیں، ریاضی کے عام قاعدے $pq = qp$ کے تابع نہیں ہوتے۔ بالفاظ دیگر یوں تو عموماً 3×4 لکھیں یا 4×3 لکھیں ایک ہی بات سمجھی جاتی ہے اور الجبرائی طور پر اسے xy یا yx دونوں طرح سے لکھ سکتے ہیں، کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن یہاں ایٹم کے اندر $pq \neq qp$ تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ نہ تو عام فزکس ہی ایٹم کے اندر درست بیٹھ رہی تھی نہ ہی عام ریاضیات کے قاعدے وہاں درست ثابت ہو رہے تھے۔ اس طرح ایٹم کی ساخت کی کوئی واضح یا منطقی تصویر نہیں بن کر سامنے آ پا رہی تھی۔ ان حالات میں یہ تجویز ہوا کہ ایک نئی میکانیکس تشکیل دی جائے جس کا عام میکانیکس سے کچھ اس طرح کا رابطہ ہو کہ جیسا رابطہ جیومیٹریکل آپٹکس کا فزیکل آپٹکس سے ہوتا ہے۔ چنانچہ کوانٹم میکانیکس کی وہ شکل جسے ویو میکانیکس (Wave Mechanics) کہتے ہیں وجود میں آئی جو حسب ذیل نقشے کے مطابق تھی۔

جیومیٹریکل آپٹکس ← فزیکل آپٹکس۔
↕
عام میکانیکس ← ویو میکانیکس۔

اُدھر معلوم ہو گیا تھا کہ $(pq - qp) \neq 0$ ریاضی میں میٹرکس (matrix) ضرب دینے کے قاعدے کا بیان تھا اور ایٹم کی میکانیکس کی ایک اور شکل میٹرکس میکانیکس محاسبات میں کامیاب ہو رہی تھی۔ جلد ہی یہ بھی پتہ چل گیا کہ چاہے ویو میکانیکس لیں چاہے میٹرکس میکانیکس دونوں ایک اور ریاضیاتی سطح پر ایک ہی طریقۂ حساب کی دو شکلیں بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔ میٹرکس میکانیکس اور ویو میکانیکس کا مشترکہ نام کوانٹم میکانیکس پڑ گیا اور ایک مشترکہ ریاضیاتی ساخت اس کے بیان کی دریافت کر لی گئی۔ یہ اس صدی کے پہلے ۲۶، ۲۷ سالوں میں معلوم ہو گیا تھا۔

جلد ہی کوانٹم میکانیکس وضع کرنے والوں اور آئن سٹائن کے درمیان تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ کوانٹم میکانیکس جس طرح کی تھیوری تھی وہ ایسا لگتا تھا کہ فطرت کی حقیقت کا بیان کم اور محض ایک حساب کرنے کا فارمولہ زیادہ ہے۔ یہ سب کچھ اس طرح تھا کہ طبیعیات میں کوانٹم میکانکس استعمال کرنے والوں سے اگر پوچھا جاتا کہ محاسبات کے آپ کے جواب تو تجربے کے مطابق حاصل شدہ عددوں کے برابر ہیں لیکن یہ جو مقداریں آپ معادلات میں استعمال کر رہے ہیں وہ فطرت کی کس طرح کی پکچر کا بیان ہیں تو حساب کرنے والے ایسے سوال گول کر جاتے تھے اور ایسے سوالات اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے یا فلسفے کی آڑ لے کر رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ آئن سٹائن کے نزدیک اس طرح کی باتیں غیر تشفی بخش تھیں۔ اس نے کئی طرح کے دلائل اور فرضی تجربوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی کوانٹم میکانیکس فطرت کے وصف کے بیان کی ایک عدم تکمیل شدہ شکل ہے جو ایک عارضی تھیوری ہے جسے آگے چل کر ایک مناسب تھیوری سے بدل دینا ہو گا۔ یہ بات آس کے اس قول سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ میں کوانٹم میکانیکس کو ادب سے لیکن شبہ کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

بہرکیف، محاسبات کی حد تک یہ بات واضح تھی کہ کوانٹم تھیوری کے طریقے اور اس کے فارمولے غیر معمولی حد تک کامیابی حاصل کر رہے تھے۔ ایسے محاسبات میں یہ مان کر چلتے تھے کہ جو لہریں ذرّوں کے ساتھ منسلک بتائی جاتی ہیں، وہ محض احتمال کی لہریں ہیں اور یہ ایسی لہریں نہیں ہیں جیسے کہ توانائی کو اِدھر سے اُدھر لے جانے والی لہریں ہوتی ہیں۔ کوانٹم میکانیکس کی مساوات یا معادلات اس طرح ذرّوں کی حرکت کی بابت احتمالات کی صحیح پیش گوئی تو کر سکتی تھیں لیکن پھر اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی ذرّے کی بابت یہ بتا دینا کہ یہ بالکل ٹھیک ٹھیک کس طرح حرکت کرے گا کہ احتمال یا امکان کے بجائے بالکل یقین سے یہ کہا جا سکے، ناممکنات میں سے تھا۔ مشہور تھا کہ ذرّے کی حرکت احتمالات کے قاعدوں سے متعین ہوتی ہے لیکن خود احتمالات لہروں کی شکل میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک مسافتیں طے کرتے ہیں! یعنی ایک بار یہ مان لیا جائے کہ ذرے کی حرکت محض احتمالات میں بیان کریں گے تو کوانٹم میکانیکس کی معادلات کی مدد سے ان احتمالات کو مخصوص طبعی نظاموں کے لیے دریافت کر لینا ایک سیدھا سادہ محاسبے کا کام تھا۔ ایک طرح کے تجربی (experimental) یا ثبوتیتی (positivistic) طور سے یہ کہا جانے لگا کہ اس مسئلے میں نہ پڑو کہ جس چیز کو بیان کر رہے ہو وہ ایک نقطئی ذرہ ہے یا پھیلی ہوئی لہر ہے بلکہ یوں کہو کہ یہ کبھی ذرّہ بن کر ظاہر ہوتا ہے تو کبھی لہر بن کر اور یہ کہ وہ ذرہ بنکر ظاہر ہوتا ہے، یا لہر بن کر اس بات پر مبنی ہوتا ہے کہ آپ اس چیز پر کن آلات اور ان آلات کی کس ترتیب سے پیمائش کر رہے ہوتے ہیں یعنی بعض تجربوں میں وہی چیز ذرہ بن کر ظاہر ہو گی تو بعض میں لہر۔ بار بار دہرانے سے رفتہ رفتہ یہ عجیب و غریب بات جو کہ ایک طرح سے معروضی حقیقت کے مفروضات سے ٹکراؤ کی حامل تھی مذکورہ بالا ثبوتیتی یا تجربی معنوں میں مانوس معلوم ہونے لگی اور عام طور پر طبیعیات دانوں نے اس عجیب و غریب مسلک کو قبول کر لیا لیکن آئن سٹائن جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے برابر اِس مسلک پر اعتراض کرتا رہا۔

۱۹۳۵ء میں آئن سٹائن نے ایک ایسے نظام کی بابت پیمائش کی تجویز رکھ کر جو نظام کہ از خود دو ذیلی نظاموں پر اس طرح مشتمل تھا کہ جو باہم تبادلِ فعل کرنے کے بعد جُدا کر کے دور کر دیے جاتے ہیں، یہ مسئلہ اُٹھایا تھا کہ اگر چیزوں کو معروضی حقیقت کے

طور پر مخصوص خواص کا حامل سمجھنا ممکن ہو تو یہ بات ان پیمائشوں کی منطق سے ثابت ہوتی تھی کہ کوانٹم میکانیکس سے ماخوذ نتائج مذکو
پیمائشوں سے تضاد میں ہیں۔ بالفاظ دیگر کوانٹم میکانیکس بطور طبیعیات کے ایک نظریے کے تکمیل طلب یا غیر مکمل تھی۔ ۱۹۳۵ء سے آج ت
آئن سٹائن کا یہ دعویٰ علمی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا رہا ہے۔ اس سے یہ سوال بار بار اُبھر کر سامنے آتا رہا کہ معروضی حقیقت سے
ہماری مراد کیا ہے اور اس کی اصطلاح میں بات کرنا کہاں تک جائز ہے۔ مثلاً کہا جانے لگا کہ ہم محض مظاہری (enomenological
انداز میں کائنات سے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور حقیقت سے متعلق دعوے بالآخر بے معنیٰ ہی ہوتے ہیں۔

اس صدی کی ساتویں دہائی میں اور اس کے بعد دقت نظر سے کیے گئے تجزیوں سے ایسے تجربوں کی نشاندہی ہوئی جوا
بات کا فیصلہ کر سکتے تھے کہ آیا ہم آئن سٹائن کے مخصوص معروضی حقیقت کے مفروضے کو درست مانیں یا کوانٹم میکانیکس کے بیا
کو۔ ان تجربوں سے جو نتائج ملے ہیں اُن سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ کوانٹم میکانیکس تو درست ہے لیکن فطرت کی معروضی حقیقت جس کی ت
ایک مخصوص منطقی انداز میں آئن سٹائن نے کی تھی دراصل ایک ایسی حقیقت ہے جو ہمارے روزمرہ کے تجربات سے ماورا باﺅ
اجنبی سی کوئی چیز لگتی ہے۔ چنانچہ پتہ چلا کہ کوئی ایسی حقیقت وجود رکھتی ہے جو نہایت دور دراز کے مقامات سے چشم زدن میں پیا
کے حالات پر اثر انداز ہو سکتی ہے، جب کہ تجربہ یہ بھی ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ عام پیمائشوں سے ثابت ہوتا ہے کہ طبیعیاتی اثرات
احساسات کی دُنیا میں روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں پہنچ سکتے۔ بالفاظ دیگر معروضی حقیقت
ایک ماورائی وجود ہے جو آفاقی اور غیر محلّی (Non local) اثرات کے ذریعے عالمِ امکان سے ایک عالمِ واقعات کا اِس
طرح پیدا کرتا چلا جاتا ہے جو ہم کو ہمارے احساسات کی دنیا میں واقعات کے ایک مخصوص تسلسل کی شکل میں ملتا ہے۔ ہم ان واقعا
کو اپنے طور پر محض احتمالات کی حد تک بیان کر سکتے ہیں لیکن کئی احتمالات میں سے کسی ایک مخصوص کیفیت کا منتخب ہو کر وقوع پذ
ہونا طبیعیات کی دنیا سے ماورا اس غیر محلّی آفاقی وجود کے اثر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ طبعی نظام کی کئی ممکنہ کیفیتوں میں سے کسی ا
کا منتخب ہو کر وقوع پذیر ہونا یک لخت تخفیف پانے کے عمل سے بیان کیا جاتا ہے جس کی از خود طبیعیاتی علّت پیش کرنا ممکن نہیں۔
یہ تخفیف آگے چل کر نئی امکانی حالتوں کی ایک تعداد کے ابھرنے کا ذریعہ بنتی ہے جو حالتیں ایک بار پھر پیمائش کے وقت کسی ایک حالت م
تخفیف پا جاتی ہے اور اس طرح عالمِ امکان سے عالمِ احساس کا تسلسل پیدا ہوتا چلا جاتا ہے جس میں ہر تخفیف میں طبیعیات۔
ماورا کوئی اور آفاقی وجود اپنے مخصوص طریقے سے مسلسل اثر انداز ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ عالمِ امکان سے
عالمِ وقوع میں یہ تخفیف طبیعیاتی علّت و اثر کی منطق کو توڑ کر ہوتی ہے۔ ایک ایسی ہی ماورائی مسلسل اثر انداز ہوتی ہستی کو ماقبل
کے مفکرین اور نظریہ والوں نے 'خدا' کا نام دیا تھا۔

اس غیر محلّی وجود کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کائنات کو ایک کُل کے طور پر دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایسے زاویۂ ن
کو کُلّی (Holistic) زاویۂ نگاہ کہتے ہیں۔ کوانٹم میکانیکس جہاں یک لخت غیر محلّی عدم علّتی اثرات کا عمل پذیر ہوتے رہنا ضرور
بتاتی ہے تو وہیں وہ ایک کلّی کائنات کا تصوّر بھی پیش کرتی ہے۔

اس نئے زاویۂ نگاہ کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب کوانٹم میکانیکس کے کلّی تصوّر کے ایک مظہر کے طور پر شعور کو سمجھانے کی کوشش
کی جا رہی ہے کہ شعور بھی دماغ کی کلّی کیفیت کا ایک اظہار ہے۔ ماقبل میں فلسفی ڈیکارٹس (Descartes) نے مادّے
شعور سے الگ بتا کر یہ فلسفہ پیش کیا تھا کہ طبیعیات کے قوانین مادّے کی کیفیات کا مکمل بیان فراہم کر سکتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے
دنیا پر کسی قدر منفی اثرات بھی مرتب ہوئے کیوں کہ ایسا لگنے لگا کہ نظامِ کائنات میں انسان کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے

اور اس طرح ایک طرح کی بے اطمینانی، اخلاقی بے ہمتی اور بے راہ روی سائنس کے فروغ کے ساتھ ساتھ پھیلتی گئی۔ اب نئے زاویۂ ن
خدا ایک حی اور قیوم ذات کی طرح سامنے آتا ہے جس کا اثر مسلسل جاری اور ساری ہے اور دنیا کا کوئی وقوعہ اس کے منشا ا
کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس امر کا اندازہ انسان نے دیگر اور ذریعوں سے بہت پہلے بھی کر لیا تھا۔ ایسا تصور مختلف انداز میں کئی مذاہ
میں ملتا ہے لیکن اسلام میں توحید کی تاکید کے ساتھ واضح طور پر پایا جاتا ہے اور اہمیت رکھتا ہے۔

کوانٹم میکانیکس جس معروضی حقیقت کے ماورائی طور پر ہونے کی کھلی نشاندہی کر رہی ہے وہ اس طرح محض ایک حد ہی سائنسی طور پر قابلِ فہم کہی جا سکتی ہے۔ ایک پُر حجاب حقیقت کا ایسا تصور مشرقی تہذیب کی تاریخ میں نیا نہیں ہے، د مادیت کے پرستار ایسے تصور پر تنقید کرنا ضروری سمجھتے رہے ہیں۔ ابھی جب فرانس کے طبیعیات داں فلسفی نے "حقیقت حجاب" (Veiled Reality) کا فلسفہ پیش کیا تو فوراً ایک دوسرے طبیعیات داں نے اعتراض کیا کہ جناب بطور طبیع داں ہمارا کام حقیقت پر سے حجاب کو ہٹانا ہے نہ کہ حقیقت کو زیرِ حجاب کر دینا! لیکن دیکھا جائے تو حقیقت کو زیرِ حجاب کہنے کوئی طبیعیات کی تضحیک نہیں ہے بلکہ محض اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ حقیقت کو پوری طرح سمجھ لینے یا اس کے مکمل علم کے دعو جو گاہے گاہے کیے جاتے ہیں وہ کم از کم کوانٹم میکانیکس کی موجودہ صورت کے پیشِ نظر درست نہیں سمجھے جا سکتے کہ موجودہ ان مطابق یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ایک ماورائی حقیقت کائنات کی ہے بلکہ وہ اپنے پورے وجود کی خصوصیات کے ساتھ ابھی تک زیرِ حجاب رہی ہے اور شاید ہمیشہ رہے گی جب کہ وہ مسلسل طبعی دنیا پر اثر انداز بھی ہے اور اپنے عمل طبیعیات کے منطقی اصولوں کی تشفی بھی نہیں کرتی بلکہ اُن سے ماورا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ "حقیقت اور طبیعیات داں" از برنارڈ ڈیسپاگناٹ، کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج۔ ۱۹۹۰ء (انگلش میں)۔

۲۔ "ذہن، مادہ اور کوانٹم میکانیکس" از ہنری پی۔ اسٹاپ۔ اسپرنگر فرلاغ، برلن، ۱۹۹۳ء (انگلش میں)۔

میں امریکی حکومت نے یہ ستارہ خرید لیا اور اسے نیویارک کے عجائب گھر میں رکھ دیا گیا۔

- ۱۹۴۷ء میں سائبیریا کے علاقے میں جو شہاب ثاقب گرا تھا اس کا وزن ۱۰۰ میٹرک ٹن تھا۔
- امریکہ کی ریاست ایری زونا میں زمین میں ایک گڑھا (CRATER) ۴۱۵۰ فٹ لمبا اور ۵۷۰ فٹ گہرا ہے۔ یہ شہاب ثاقب کے گرنے سے ۵۰۰۰۰ سال قبل پیدا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد جو پتھر دستیاب ہوئے ہیں وہ لوہے کے بنے ہوئے تھے۔
- کینیڈا کے صوبہ اونٹاریو کے شہر BRENT میں شہاب ثاقب کے گرنے سے پیدا ہونے والے گڑھے کا قطر چار میل ہے۔ نیز سڈبری شہر میں موجود گڑھے کا قطر ۱۴۰ کیلو میٹر ہے۔
- عراق میں ایک ایسے گڑھے کا قطر ۲ میل ہے۔
- دنیا کا سب سے وزنی شہاب ثاقب ساؤتھ افریقہ میں موجود ہے۔ اس کا نام HOBA ہے اور اس کا وزن ۶۰ ٹن ہے۔ اسی طرح گرین لینڈ میں موجود شہاب ثاقب مسمّٰی TRENT کا وزن ۳۰ ٹن ہے۔
- ۳۰ نومبر ۱۹۵۴ء کو امریکہ کی ریاست الباما میں ایک خاتون اپنے گھر میں آرام کر رہی تھی کہ اچانک ۴ کیلو گرام کا شہاب ثاقب اس کے کمرے میں گرا جس سے اس کے بازو اور ٹانگ زخمی ہو گئے۔
- ۱۴ اگست ۱۹۹۲ء کو یوگنڈا میں ایک نوجوان کے سر پر شہاب ثاقب لگا مگر چوں کہ یہ کیلے کے درخت سے ہو کر گرا تھا اس لیے وہ زیادہ زخمی نہ ہوا۔

کار پر شہاب ثاقب

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو نیویارک ریاست کے شہر PEEKSKILL میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ ہائی اسکول کی طالب علم ایک لڑکی می شیل MICHELLE اپنے گھر میں شام کے وقت صوفے پر بیٹھی آرام کر رہی تھی کہ اس نے دھماکے کی آواز سنی جس سے اس کے گھر کی کھڑکیاں ہل گئیں۔ اس وقت شام کے سات بج کر بچاس منٹ ہوئے تھے۔ یک لخت دھماکے سے گھبرا کر وہ باہر کو بھاگی تو اس نے دیکھا کہ اس کی شیورلیٹ کار کے پچھلے حصے میں سوراخ ہو گیا تھا۔ کار کے نیچے اس کو ایک سوراخ زمین میں نظر آیا جس میں فٹ بال کے سائز کا ایک پتھر پڑا ہوا تھا۔
می شیل کو یہ پتھر دیکھ کر بڑا تعجب ہوا اس نے پولس کو فون کیا مگر ان کا ردّ عمل یہ تھا کہ کسی نے شرارت کی ہوگی۔ عنقریب اخبار والوں کو اس کا علم ہو گیا اور جونہی یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی اس کو فون آنے شروع ہو گئے۔ بہت سے لوگ اس آسمانی مسافر کو خریدنے کو تیار تھے۔ اس نے یہ "آسمانی مسافر" ۶۹۰۰۰ امریکی ڈالر میں فروخت کر دیا اور ایک میوزیم والوں نے اس کی کار دس ہزار ڈالر میں خرید لی۔ یوں یہ پتھر اس کے لیے آسمانی مائدہ ثابت ہوا۔ قریبی شہروں میں جب لوگوں نے اس ستارے کو گرتے دیکھا تو انھوں نے ویڈیو فلم بنالی جو سائنس دانوں کو دے دی گئی۔ سائنس دانوں نے یہ بات اس پتھر کے مطالعے سے اخذ کی کہ یہ ستارہ یقیناً ASTEROID BELT سے آیا تھا۔ واقعی خدا جب دیتا ہے تو چھت پھاڑ کے دیتا ہے۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

پہلے دائرے میں قرآنی عربی نے مکمل فوقیت حاصل کرلی اور بول چال اور علم کی مقامی زبانیں اور رسم الخط مفقود ہوگئے اور عربی زبان اور رسم الخط عام ہوگئے۔ اس کے سبب اس خطے میں ثقافت اور ٹکنالوجی میں وہ نشاۃ ثانیہ نمودار ہوگیا جو ازمنہ وسطی میں اسلام کا طرہ امتیاز تھا۔

دوسرے دائرے میں آنے والی اقوام کو دینی اور دنیاوی اسباب سے یہ بات آسان اور مناسب معلوم ہوئی کہ وہ اپنی اپنی تحریری یا بول چال کی زبانیں قرآنی رسم الخط میں قلم بند کریں، مثلاً فارسی نے پہلوی حروف تہجی کو خیرباد کہہ کر عربی حروف تہجی کو اختیار کیا تاکہ ثقافتی تبادل اور سماجی تنقیل میں سہولت رہے۔ اس کے برعکس ترکی اپنی مختلف علاقائی تنوع کے باوجود بنیادی طور پر بول چال کی زبان تھی۔ اس کو قرآنی رسم الخط کے تحریری شکل نصیب ہوئی۔ اسلام کی اشاعت کے اس دور میں یوروپ کی رسمی زبان لاطینی تھی اور لوگ ہسپانوی، پرتگالی اور اطالوی جیسی جدید زبانیں اپنے نجی کام کاج اور تعلقات میں بول چال کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اندلس کے نومسلموں نے ہسپانوی زبان کو غیر رسمی اور نجی مقاصد کے لیے عربی رسم الخط میں لکھنا شروع کردیا۔ اس طرح اس زبان کی تحریری روایت قائم ہوئی۔ اس زبان کا نام عربوں نے الحمیدیہ اور ہسپانویوں نے Al-Jamaeada رکھ دیا جس کا اثر جدید ہسپانوی میں آج تک بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جدید پرتگالی اور اطالوی زبانوں پر کسی حد تک اس کے اثرات ملتے ہیں۔

مخلوط ثقافت کے خطے میں مسلمان اقلیت کے تعلیمی نصاب میں قرآن پاک کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ان میں اسلام کا اثر مقامی ثقافتوں میں سیاسی اقتدار اور تناسب آبادی کے حساب سے گوناگوں تھا، تاہم قرآنی رسم الخط عام ہوگیا اور بہت سی مقامی زبانیں تحریری شکل اختیار کرکے ادب کی دولت سے مالا مال ہوگئیں۔ اور تجارت کو فروغ ہوا چنانچہ مغربی افریقہ میں حوصا اور مشرقی افریقہ میں سواحلی جیسی زبانیں معرض وجود میں آئیں۔

قرآنی رسم الخط کی وجہ سے جن غیر رسمی زبانوں کو تحریری شکل نصیب ہوئی ان کی فہرست تو ماہر لسانیات کے پاس سردست دستیاب نہیں ہے۔ تاہم یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ دنیا میں اسلامی اثر کے تحت آنے والے پورے خطے میں جتنی بھی بول چال اور تجارتی مراکز کی زبانیں تھیں اپنی تحریری اور ادبی وجود کے لیے قرآنی رسم الخط کی مرہون منت ہیں ہم ازمنہ وسطی کے اس نشاۃ ثانیہ کا موازنہ دور حاضر کے لسانی نشاۃ ثانیہ سے کرسکتے ہیں، جس میں ریاضی کی علامتیں اور کمپیوٹر کی زبانیں ثقافتی حدود کو نیست و نابود کرچکی ہیں۔

عطا عابدی*

پہچانتی نہیں ہے ابھی راہبر کو قوم

ہر قوم کا اپنا ایک الگ اور مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ قوم کی شناخت اس کے عمومی وخصوصی مزاج کے ذریعہ پہلے کی جاتی ہے بعد میں کسی اور ذرائع یا عوامل کا حصہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلق سے اگر اس کی سماجی یا سیاسی شناخت دریافت کی جائے یا دوسرے لفظوں میں اس کے مزاج کی صورت گری اگر ایک دو جملے میں کی جائے تو غالب کے ایک مشہور شعر میں یوں تحریف کرنی پڑے گی ؎

چلتی ہے تھوڑی دور ہر ایک راہ رو کے ساتھ
پہچانتی نہیں ہے ابھی راہبر کو قوم

آخر ایسا کیوں ہے؟ اور اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟ آخر ہم (ہماری قوم) اپنے راہبر کو پہچاننے میں..... ناکام کیوں ہیں؟ مختلف راستوں پر چلنے والے مسافروں کے پیچھے پیچھے تھوڑی دور چلنے کا یہ تکلیف دہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ کیا ہمارے پاس وہ دیدۂ بینا نہیں جو ایک راہ رو اور راہبر کے درمیان امتیاز کی واضح لکیروں کو دیکھ اور پرکھ سکے؟ کیوں ہم آج بھی حقائق وحالات کا ادراک نہیں رکھتے اور محض افسانوی تانے بانے بننے کے عمل میں اسیر ہیں؟ کیوں ہم کسی راہبر کا تعین اس کے عمل کی بنیاد پر نہیں بلکہ دلفریب وعدوں، خوشنما دعووں اور نمائشی تقریبات کی سطح سے کرنے کی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں؟ .... یہ اور ان جیسے کئی سوالات ہیں جو برسوں سے ہمارے سامنے ہیں لیکن ہم ہیں کہ آج بھی ان سوالوں کے جوابات کے لیے سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے مختلف مصلحتوں کے نام پر اس خاموشی یا چشم پوشی کو ترجیح دیتے ہیں جسے اگر قومی جرم کا نام دیا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

کسی بھی قوم کے پاس اپنے راہبر کو پہچاننے کا ایک ہی پیمانہ ہے اور ہونا بھی چاہیے اور وہ پیمانہ ہے عمل کا، اس کی جدوجہد کا، اس کی قربانیوں اور محنتوں کا۔ یعنی ہمارا راہبر دراصل وہی ہے یا ہو سکتا ہے جو اپنی جدوجہد، اپنے عمل اور اپنی قربانیوں ومحنتوں سے اپنا تعارف کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ایسے راہبر کی پہچان انتہائی مشکل ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسے راہبر کی پہچان مشکل نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم اپنے ذہنوں کو کشادہ کریں اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور بلا کسی تفریق وامتیاز کے ہم تمام راہبر کی خدمات کا غیر جانبدارانہ یعنی منصفانہ جائزہ لیں۔ کوئی راہبر راتوں رات پیدا نہیں ہو گیا کہ ہم اسے پہچان نہ سکیں، ان کی خدمات کا احاطہ نہ کر سکیں۔ وہ لوگ جو مختلف اسباب

---

* ای ۲۲/۱۵۳، ذاکر نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اگست ۱۹۹۵ء

یا خدمات کی وجہ سے سماج یا سیاست میں نمایاں ہیں یا رہے ہیں، اور ہم اسے راہبر کا نام بھی دیتے ہیں، ان راہبروں میں کس کی راہبری لائق تقلید ہے اور کس کی نہیں، اس سوال کے جواب کے لیے مذکورہ نمایاں لوگوں کی مجموعی خدمات و سرگرمیوں پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہمارا پہلا قدم ہونا چاہیے۔

کسی کی عملی خدمات کبھی پوشیدہ نہیں رہتیں۔ لہٰذا ان پر نظر ڈالنے کے لیے بہت زیادہ تگ و دو کی ضرورت بھی نہیں یہ صحیح ہے کہ مختلف راہبروں کی خدمات کے زاویے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ زاویے کیا ہیں اور یہ خدمات کس نہج اور کس مرحلہ پر ظہور پذیر ہوئی ہیں، کون سی خدمات صرف ذاتی یا سیاسی مفادات کے تابع رہی ہیں اور کون سی خدمات محض مصنوعی کوششوں تک محدود رہی ہیں یہ بھی بہت زیادہ پوشیدہ نہیں ہیں۔ لہٰذا ان خدمات کے رد کرنے میں یا ایسے لوگوں کی راہبری سے انکار میں تذبذب مناسب نہیں ہے۔ بلکہ ایک واضح روشن اور فیصلہ کن موقف اختیار کرنے کی ضرورت ہے جن خدمات کی بنیاد کسی تعصب پر نہیں بلکہ حق و عدل کے روشن خطوط پر ہے، ان کی قدر افزائی کرنی چاہیے۔ ان خدمات کو انجام دینے والا چاہے کسی بھی فرقہ یا برادری سے تعلق رکھتا ہو، ہمیں ہر سطح پر اس کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ منفی خدمات کو رد کرنا جس قدر ضروری ہے اسی قدر مثبت خدمات کی پذیرائی اور اعتراف بھی ضروری ہے تاکہ مثبت و منصفانہ خطوط کی بنیاد پر روشن خدمات انجام دینے والا شخص ہماری پذیرائی اور اعتراف سے قوت حاصل کرکے نئی منزلوں کو سر کر سکے اور اپنی خدمات جلیلہ سے قوم کے خزاں آشنا چمن میں سرسبزی و شادابی بحال کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ ایسی خدمات کو انجام دینے والا شخص ہی راہبر کہلانے کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ پہچان ہم میں آگئی تو پھر ہر قدم پر ایک نئے راہ رو کی ہلاکت خیز تقلید سے ہم محفوظ رہ سکیں گے۔

موجودہ دور میں جب کہ اقدار کا بحران ہے اور خود غرضی و خود نمائی کا بول بالا ہے۔ کسی سے یہ امید رکھنا کہ وہ ہر ایک معاملہ میں سو فیصد کھرا ثابت ہوگا، شاید ایک قسم کی زیادتی ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی شخص اپنے معاملات و افعال میں (تقریر و تحریر میں تو خیر ہو ہی) سبھوں سے الگ تھلگ دکھائی دیتا ہے۔ اور جو بہت حد تک اقدار کے بحران اور خود غرضی و خود نمائی کے جراثیم سے محفوظ ہے، تو اس کی تقلید میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے بلکہ ایسے شخص کی راہبری سے انفرادی و اجتماعی استفادہ کی مسلسل راہیں استوار کرنی چاہیے۔ اس کے لیے اپنی ذہنی سطح بلند کرنی ہوگی۔ روایتی جمود و سکوت کی جگہ حرکت و عمل کو قبول کرنا ہوگا۔ نسلی، لسانی، علاقائی یا برادرانہ مفادات یا محض ذاتی اغراض تک محدود رہنے والی مکروہ سوچوں اور تہذیب کشی سے خود کو آزاد کرنا ہوگا۔ جرأت مندانہ طور پر یہ دیکھنا ہوگا کہ کس شخص کی خدمات اپنی زمین سے جڑی رہنے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ اور یہ کہ کس نے تعصبات سے بالاتر ہو کر حق و انصاف کی پاسداری کا احترام کیا ہے۔ کس کی فکر و سیاست جلسہ، سیمینار اور کانفرنس کے اسٹیج کو ہی فوقیت دیتی رہی ہے اور کس کی سیاست شہروں و دیہی علاقوں کے مظلوم و مقہور طبقات کے مصائب پر سوچنے اور عملی اقدام کے سبب جانی جاتی ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سوالات خدمات کی دو مختلف نوعیتوں کا اظہار ہیں۔ اگر ہم نے آج ان دونوں نوعیتوں پر نظر رکھ کر ایک کو پوری قوت سے رد اور دوسرے کی بھرپور پذیرائی نہیں کی تو پھر یہ ہماری بے حسی ہی نہیں بلکہ بے ضمیری کا بھی ثبوت ہوگا۔ اگر ایسا ہوا تو اسے ایک لمحۂ فکریہ ہی کہا جا سکتا ہے جس کا تسلسل یقینی طور پر ہماری گمراہی کو ہی دعوت دے گا۔

سب کے لیے روزگار — ایک قابل حصول نشانہ

آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے لیے روزگار سے متعلق حکمت عملی اس دہے (۲۰۰۲-۱۹۹۲) کے اختتام تک تقریباً مکمل روزگار کا نشانہ حاصل کرنے کے دس سالہ تناظر کے ایک حصہ کے طور پر ۱۹۹۲ء میں تشکیل دی گئی تھی۔

آٹھویں منصوبے کے شروعات پر مکمل بے روزگاری کا تخمینہ ۳۱۹۰ کروڑ مزدوروں میں سے ۱۷ء۰ کروڑ لگایا گیا تھا۔ بے روزگار لوگوں میں تعلیم یافتہ بے روزگار لوگوں کی تعداد تقریباً ۴۰ فی صد ہے۔ آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے دوران اور آئندہ پانچ برسوں (۱۹۹۷-۲۰۰۲ء) میں مزدوروں کی تعداد میں اضافے کا تخمینہ بالترتیب ۳ء۵ کروڑ اور ۳ء۶ کروڑ لگایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۲۰۰۲ء تک تقریباً مکمل روزگار کا نشانہ حاصل کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہوگی کہ روزگار کے مواقع میں سالانہ ۵ء۶ فی صد کی شرح ترقی سے مطابقت رکھتے ہوئے ۲ء۶ فی صد سے لے کر ۲ء۸ فی صد کی اوسط سالانہ شرح کے حساب سے اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ آٹھویں منصوبے کا مقصد روزگار کے مواقع میں اضافہ کی مطلوبہ سطحیں حاصل کرنے کے لیے روزگار کے بہت زیادہ مواقع والے شعبوں اور ضمنی شعبوں کی تیزی سے ترقی و فروغ کی لامرکزی اور گوناگوں حکمت عملی اختیار کرنا ہے۔ اس حکمت عملی کے اہم جزو یہ ہیں۔

۱۔ زراعت کی تیزی سے نیز جغرافیائی طور سے اور فصل وار متنوع ترقی و فروغ۔

۲۔ زراعت اور زراعت پر مبنی صنعتوں سے متعلق سرگرمیوں کا تیزی سے فروغ۔

۳۔ دیہی علاقوں میں غیر زرعی خاص طور سے اشیاء سازی کی سرگرمیوں کا فروغ۔

۴۔ اشیاء سازی کے چھوٹے اور لامرکزی شعبے کی ترقی و فروغ پر خصوصی توجہ۔

۵۔ خاص طور سے دیہی علاقوں میں صحت اور تعلیم کی بنیادی سہولیات کو مستحکم بنانا۔

۶۔ مناسب امداد کے نظاموں کے ذریعے خدمات اور غیر رسمی شعبے کی سرگرمیوں کا تیزی سے فروغ۔

آٹھویں منصوبے میں یہ تجویز بھی کیا گیا ہے کہ چونکہ تقریباً مکمل روزگار کا نشانہ صرف مقررہ مدت میں حاصل کیے جانے کی توقع ہے اس لیے فی الحال روزگار کے خصوصی پروگرام جاری رکھنا اور اس کی توسیع کرنا ضروری ہے۔ قومی ترقیاتی کونسل نے ۱۹۹۲ میں روزگار کے متعلق جو کمیٹی قائم کی تھی اس نے تجویز کیا تھا کہ اجرتی روزگار کے پروگراموں کو دیہی بنیادی ڈھانچے کی ترقی و فروغ نیز چھوٹے اور درمیانہ درجے کے شہروں کی مربوط ترقی سے وابستہ کیا جانا چاہیے۔ اور محدود روزگار کی ضمانت کا سلسلہ منتخبہ علاقوں میں شروع کیا جانا چاہیے۔

۹۵-۱۹۹۲ میں کی گئی پیش رفت آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے پہلے تین برسوں میں روزگار کے مزید ۱ء۸۲۸ کروڑ مواقع

پیدا کیے گیے ہیں، جس سے روزگار کے مواقع میں سالانہ ۲٫۶۲ فی صد کی اوسط شرح اضافہ کا پتا چلتا ہے۔

آٹھویں منصوبے کے پہلے تین برسوں میں روزگار کی صورت حال میں کچھ بہتریاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آٹھویں منصوبے کے پہلے تین برسوں میں روزگار کے مواقع میں اضافہ کی اوسط سالانہ شرح اس سے پہلے کے سات برسوں یعنی ۱۹۸۵-۹۲ کے دوران روزگار کے مواقع میں اضافہ کی اوسط سالانہ شرح (۱٫۷۸ فی صد) کے مقابلے میں زیادہ (۲٫۰۳ فی صد) رہی ہے۔ اسی طرح سے ۱۹۹۲-۹۵ کے دوران روزگار کے کل سالانہ مزید مواقع کی تعداد بھی ۱۹۸۵-۹۲ کی مدت کے مقابلے میں (۵۰ لاکھ) کہیں زیادہ (۶۳ لاکھ) رہی ہے۔ یہ اضافہ اس حقیقت کے باوجود ہوا ہے کہ مذکورہ مدت کے دوران مجموعی اندرون ملک پیداوار میں اضافہ اس سے پہلے کی مدت میں حاصل کردہ اضافے نیز آٹھویں منصوبے کے تجویز کردہ اضافے کے مقابلے میں بھی کم رہا ہے۔

دوسری یہ کہ مذکورہ منصوبے کے پہلے تین برسوں میں ترقی میں روزگار کے مواقع کے عنصر میں اضافہ ہوا ہے نیز روزگار کے مواقع میں کمی کا رجحان پلٹ گیا ہے۔ مذکورہ مدت کے دوران روزگار کے مواقع میں بہتری نسبتاً پسماندہ علاقوں میں زراعت جیسے شعبوں، اشیاء سازی کے غیر منظم شعبے، تجارت اور نقل وحمل کے شعبوں اور خدمات کے شعبے میں تیزی سے ترقی کی وجہ سے آئی ہے۔

روزگار کے خصوصی پروگرام۔

دیہی علاقوں میں آج کل روزگار کے جن خصوصی بڑے بڑے پروگراموں پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے ان میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام جواہر روزگار یوجنا اور یقینی روزگار کی اسکیم شامل ہیں۔ شہری علاقوں میں چلائے جانے والے پروگراموں میں نہرو روزگار یوجنا اور شہروں میں غریبی کے خاتمے کے سلسلے میں چھوٹے شہروں کے لیے حال ہی میں شروع کردہ وزیر اعظم کا مربوط پروگرام شامل ہے۔ مختلف ریاستی حکومتیں بھی روزگار کے خصوصی پروگراموں پر عمل درآمد کرتی ہیں، جن میں قابل ذکر مہاراشٹر کی روزگار ضمانتی اسکیم ہے۔ وزیر اعظم کی روزگار یوجنا اکتوبر ۱۹۹۳ میں شروع کی گئی تھی جس میں تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے خود روزگار کا پروگرام ضم کر دیا گیا ہے۔ وزیر اعظم کی روزگار یوجنا سے شہری اور دیہی دونوں علاقوں کے لوگوں کو مستفیض کیا جاتا ہے۔

گذشتہ برسوں میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کو بہتر بنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ ان اقدامات میں سرمایہ کاری اور ہنروں کی سطحوں میں اضافہ کر کے پروجیکٹوں کی پائیداری میں اضافہ کرنا اور سرگرمیوں کے دائرے کی توسیع کرنا شامل ہیں۔ مثال کے طور پر فی کنبہ سرمایہ کاری کی رقم ۱۹۹۲-۹۳ میں ۷۸۹ روپے سے بڑھا کر ۱۹۹۴-۹۵ کے پہلے آٹھ مہینوں میں تقریباً ۱۱۰۰ روپے کر دی گئی ہے۔

جواہر روزگار یوجنا کی گذشتہ برسوں میں توسیع کی گئی ہے۔ اور اب اس پر تین زمروں کے تحت عملدرآمد کیا جاتا ہے۔ پہلے زمرے میں اس پروگرام کے کل فنڈز کا تین چوتھائی حصہ تمام ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کو گاؤں کے غریب لوگوں کے لیے ان کے حصے کے طور پر جاتا ہے۔ دوسرے زمرے میں ان فنڈز کا پانچواں حصہ ۱۲۰ پسماندہ اضلاع کے لیے جاتا ہے، جہاں بہت زیادہ بے روزگاری اور کم روزگار ہے۔ اور تیسرے زمرے میں فنڈز کا بقیہ خصوصی اور اختراعی پروجیکٹ شروع کرنے کے لیے ہے۔ ۱۹۹۲ میں جواہر روزگار یوجنا کا جو جائزہ لیا گیا تھا اس کے مطا

جواہر روزگار یوجنا کے تحت اس یوجنا میں شرکت کرنے والے ہر ایک کنبے کے لیے ایک مہینے میں روزگار کے اوسط ۱۱.۵ افرادی دن یا ایک سال میں تقریباً ۶۲ دن فراہم کیے گئے ہیں۔ یہ تعداد جواہر روزگار یوجنا کی توسیع کے لیے مزید فنڈز کی دستیابی، اس یوجنا میں مزید زمرے شروع کیے جانے کا اور یقینی روزگار کی اسکیم شروع کرنے کی وجہ سے بعد کے برسوں میں اور زیادہ ہو گئی ہوتی۔ یقینی روزگار کی اسکیم سے ۲۶۱ اضلاع کے ۱۷۷۸ پسماندہ بلاکوں میں فی کنبہ روزگار کی کم سے کم سطح کے لیے ضمانت کا ایک جزو شروع کیا ہے۔

۹۵-۱۹۹۴ کے پہلے گیارہ مہینوں میں ان پروگراموں کے حقیقی اخراجات کی رقم ۳۵۳۴ کروڑ روپے ہے جب کہ ۹۳-۱۹۹۲ میں یہ رقم ۲۷۱۰ کروڑ روپے تھی۔ منصوبہ بندی کمیشن کے جائزے میں مجموعی طور سے ان پروگراموں سے دیہی علاقوں میں ہاتھ سے کیے جانے والے بغیر ہنر والے کام کے لیے تقریباً آدھی مانگ پوری ہوتی ہے۔

نہرو روزگار یوجنا پر شہری علاقوں میں عمل درآمد کیا جا رہا ہے جو تین جزویاتی اسکیموں سے تیار کی گئی ہے۔ ایک جزو شہروں میں چھوٹے کاروبار یا صنعتیں قائم کرنے کے لیے ہے اور دو جزو تعمیرات عامہ کے ذریعے نیز رین بسیروں کو بہتر بنا کر اجرتی روزگار کے لیے ہیں۔ ۹۵-۱۹۹۲ کی مدت کے دوران خود روزگار کے جزو کے تحت تقریباً ۵ لاکھ افراد کی امداد کی گئی ہے۔ عارضی تخمینوں کے مطابق مجموعی طور سے دیگر دو جزو سے مذکورہ مدت کے دوران اجرتی روزگار کے تقریباً ۲۷۵ لاکھ افرادی دن مہیا کیے گئے ہیں۔

تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے خود روزگار کے تحت ۹۴-۱۹۹۲ کی مدت کے دوران خود روزگار والے کام شروع کرنے کے سلسلے میں تقریباً ۳۴۰۰۰۰ نوجوانوں کی مدد کی گئی ہے۔ وزیر اعظم کی روزگار یوجنا کے تحت، جس میں ۹۵-۱۹۹۴ سے مذکورہ پروگرام کو ضم کر دیا گیا ہے، ۹۵-۱۹۹۳ کی مدت کے دوران ۴۰۹۰۰۰ نوجوانوں کی مدد کی گئی ہے۔

امکانات:۔

زراعت کی کارکردگی سے مجموعی طور سے روزگار کے مواقع میں اضافے پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے، جس کی وجہ روزگار کے کل مواقع میں اس کا مسلسل بہت زیادہ حصہ ہے۔ چونکہ بھارت میں زراعت کی ترقی و فروغ اب بھی ایک ایسے مرحلے میں ہے، جس میں پیداوار میں اضافے کی وجہ سے روزگار کے مواقع میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے زراعت کی ترقی و فروغ سے روزگار کے مواقع میں کافی اضافہ ہوتا رہے گا۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ خاص طور سے گاؤں میں روزگار کے پروگراموں کے ذریعے آبپاشی اور دیگر دیہی بنیادی ڈھانچے کو مستحکم بنانے کے لیے زراعت کے شعبے میں پبلک سرمایہ کاری میں اضافہ کیا جائے۔ خاص طور سے خشک زمینوں سے متعلق ٹیکنولوجیوں کو فروغ دینے اور ان کا استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ بارشوں پر زراعت کے انحصار کو کم کرنے کی غرض سے کی جانے والی کوششوں سے زراعت کی مناسب ترقی و فروغ یقینی ہوگی۔

جہاں تک روزگار کے بہت زیادہ مواقع والے دیگر شعبوں میں مذکورہ مواقع میں اضافے کے امکانات کا تعلق ہے، چھوٹے پیمانے کے شعبے کے سلسلے میں ۱۹۹۱ کی پالیسی چھوٹے پیمانے کے یونٹوں میں بڑے اور درمیانہ درجے کے صنعتی اداروں کے ذریعے ۲۴ فی صد تک سرمایہ جاتی شرکت کی اجازت دینے کو، دیہی اور چھوٹی صنعتوں کے لیے مناسب اور بروقت قرضے کو یقینی بنانے کے سلسلے میں ریزرو بینک آف انڈیا کے ذریعے اقدامات کے پیکیج کا اعلان نیز بنیادی ڈھانچے کی

مربوط ترقی و فروغ کے مراکز قائم کرنے جیسے حالیہ اقدامات سے خاص طور سے پسماندہ علاقوں میں چھو- شعبے کی صنعتوں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہونے کی توقع ہے امدادی سہولیات کے ذریعے پھلوں، سبزیوں، ڈبہ بنا اور مچھلی کی مصنوعات جیسی اشیاء کی برآمدات کے فروغ سے جس کے لیے بڑی تعداد میں مزدوروں کی ہے، روزگار کے مواقع میں مزید اضافہ ہوگا سیاحت کے شعبے میں، جو روزگار کے مواقع میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں کا اب بھی ایسی صلاحیت موجود ہے جسے بروئے کار نہیں لایا گیا ہے۔ اس صلاحیت کو ضروری بنیادی ڈھانچے کی ترقی و فروغ سے جاسکتا ہے۔ بنیادی ڈھانچے تیار کرنے اور مالی رعایات دینے کے سلسلے میں مزید نرمی سے ان شعبوں میں سرگرمیوں کے مواقع میں مزید اضافہ ہوگا۔ مالی اور کاروباری خدمات کے شعبے کی بھی توسیع ہوئی ہے۔ اور اسی طرح روزگار کے مواقع میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ توقع ہے کہ سرگرمیوں میں اضافے کا یہ رجحان جاری رہے گا۔

مذکورہ جائزے کی روشنی میں ۲۰۰۲ تک تقریباً مکمل روزگار کا نشانہ حاصل کرنے کے لیے درکا، مواقع میں سالانہ ۱ء۳ فی صد کی شرح اضافہ ممکن نظر آتی ہے۔ آئندہ برسوں میں روزگار کے مواقع میں کی لچک کی توقع کرنا نامناسب نہیں ہوگا جو کہ گذشتہ تین برسوں کے لیے تخمینہ شدہ اعداد و شمار کے ہے۔ ۲۰۰۲ تک سب کے لیے روزگار کے نشانے کا حصول بنیادی طور سے ۲۰۰۲-۱۹۹۵ کے دورا اندرون ملک پیداوار میں اوسطاً سالانہ تقریباً ۷ فی صد کی شرح اضافہ حاصل کرنے پر مبنی ہوگا۔ معید کے امکانات کے موجودہ جائزے سے بھی یہ شرح اضافہ ممکن نظر آتی ہے۔

(بشکریہ پریس انفارمیشن بیورو۔ گورنمنٹ آف انڈیا)

ہاوشوناتھ*

عورتوں کے مسائل

جنس کی بنیاد پر نابرابری ختم کرنے کے اقدامات

ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے، یہاں گوناگوں رسم و رواج ہیں اور یہاں کے روایات میں بڑی حد تک ع ہے ان حالات میں ہندوستان کی عورت کے بارے میں کوئی یکساں تصور قائم کرنے کی کوشش تقریباً ناممکن ہے وستان میں عورتوں کی آبادی ۴۰ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ یہاں سماجی، اقتصادی اور ثقافتی اختلافات کے جو بہت سے ایسے مسائل ہیں جن میں سبھی عورتیں گرفتار دکھائی دیتی ہیں۔ عورت آج جغرافیائی حدود سے ماورا ہو کر ماوات اور انصاف کی تلاش میں ہے۔

عورت ہزارہا سال سے اس جدوجہد میں لگی ہے کہ سماج میں وہ مردوں کے دوش بدوش کام کرے۔ وہ مردوں طرح سے ہی سماج میں خود کو بدلنا چاہتی ہے، چنانچہ اس صدی کے خاتمے پر اس سلسلے میں ایک جدوجہد جاری وساری ۔ ایک امریکی خاتون نے ۱۹۰۹ میں فروری کے مہینے کے آخری دن کو عورتوں کے پہلے قومی دن کے طور پر منایا۔ اگلے برس یہ دن بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور کوپن ہیگن میں منعقدہ سوشلسٹ بین الاقوامی میٹنگ میں خواتین ن منایا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے اور عالمگیر انے پر عورتوں کے مسائل کو حل کرنے سے دلچسپی لی جائے۔ اس کے بعد ہر سال ۸ مارچ کو عورتوں کے بین الاقوامی ن کے طور پر منانے کی بات ٹھہری۔

یہ وہ وقت تھا کہ ہندوستان میں بھی عورتوں کی مختلف تحریکیں چل رہی تھیں۔ ان میں عورتوں کی تعلیم اور بیوہ شادی وغیرہ کے مسائل کے حل پر غور ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے فکری سرمایہ میں عورتوں اور مردوں کو یکساں درجہ ینے کا تصور اس قدر سرایت کر چکا ہے کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں دونوں نے مل جل کر دوش بدوش کام کیا اور پاک مقصد کے لیے دونوں ہی شانہ بشانہ کھڑے دکھائی دیئے۔ ۱۹۳۱ میں انڈین نیشنل کانگریس نے بنیادی حقوق یہ قرارداد پاس کی، اس میں عورتوں اور مردوں کو مساوی درجہ دیا۔ چنانچہ حصول آزادی کے بعد ہمارے منصوبہ بندی اس حقیقت کو پوری طرح سامنے رکھا گیا کہ قوم کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب کہ مردوں اور عورتوں کو یکساں طور پر قی کے مواقع ملیں۔ ۱۹۵۰ میں ہندوستان کا آئین نافذ ہوا۔ اس میں عورتوں اور مردوں کے درمیان جنس کی بنیاد پر کوئی ق روا نہیں رکھا گیا۔ اس میں ایسے اقدامات پر زور دیا گیا جن سے جنس کی بنیاد پر امتیازات کو ختم کر کے ان کا رخ عورتوں حمایت کی طرف پلٹ جائے۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اگست ۱۹۹۵ء

۱۹۷۱ میں سرکار نے ہندوستان میں عورتوں کے مرتبہ سے متعلق ایک کمیٹی قائم کی، اس کے پانچ سال بعد ہی اقوام متحدہ نے عورتوں کے بین الاقوامی سال کو منانے کا اعلان کیا اور اس کے بعد ہی عورتوں کی ترقی سے متعلق دس برس پروگرام اقوام متحدہ کی طرف سے دیا گیا۔ کمیٹی نے کچھ بنیادی مسائل پر توجہ دی۔ اس نے وسائل، اقتدار اور اثاثہ جات تقسیم میں مردوں اور عورتوں کو یکساں طور پر شریک کیا۔ اس نے کہا کہ آئین میں عورتوں کو جو مساوات دی گئی ہے، ا قانونی طور پر لاگو کر کے عملی صورت میں پیش کیا جائے۔

۱۹۷۵ میں میکسیکو میں خواتین کی پہلی عالمی کانفرنس منعقد کی گئی اور اس کے اگلے سال سے خواتین کی ترقی کے دس برس کے پروگرام کا اعلان کیا گیا۔ اس میں یہ حقیقت واضح کی گئی کہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے کا بہت گہرا اثر اقوام کی بہبود پر ہوتا ہے۔ ۱۹۸۰ میں اقوام متحدہ کی دوسری چوٹی کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں عورتوں کے دہے۔ باقی پانچ برسوں کے لیے ایک نیا پروگرام وضع کیا گیا۔ تیسری کانفرنس نیروبی میں ہوئی، اس میں اس بات پر زور د کہ اب تک عورتوں کی بہبود اور ترقی کے لیے جو پروگرام وضع کیے جا چکے ہیں، ان کی رفتار ترقی برقرار رکھی جائے نیروبی۔ اعلانیہ میں یہ واضح کر دیا گیا کہ اگرچہ تعداد خواندہ ہے اور ان میں سے کافی تعداد اعلیٰ سیاسی منصب پر فائز ہیں لیکن پھ غریب عورتوں کی تعداد کافی ہے اور ان کی تعداد پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اس طرح حقوق انسانی کی ایسے بڑ پیمانے پر خلاف ورزی ہو رہی ہے جس کی مثال پہلے کبھی نہیں ملے گی۔

ہندوستان نے ان تمام کانفرنسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے یہاں ایسے پالیسی اقدامات وضع کیے جو ز کے اعلانیہ کی پیش قدمیوں کے عین مطابق تھے۔ مثلاً ۲۰۰۰ء تک کے لیے عورتوں کی بہبود کا مستقبل کے خیال سے منصوبہ وضع کیا گیا۔ لڑکیوں کو بہبود کے لیے ایک عملی نظریہ وضع کیا گیا، قید میں زندگی کاٹنے والی عورتوں کی بہبود ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

ان پالیسی اقدامات کو عملی شکل دینے کے لیے ضروری اقدامات کیے گئے۔ مثلاً یہ کہ عورتوں کو با اختیار بنایا گ وہ فیصد کی سطح پر شرکت کر سکیں۔ عورتوں کے لیے قانونی خواندگی مینول تیار کیے گئے۔ مہیلا سمردھی یوجنا چلائی گ عورتوں کی بہبود کے لیے قومی قرضہ فنڈ کھولا گیا۔ وسائل کے قومی مرکز اور قومی کمیشن برائے خواتین کے توسط سے ع کی بہبود اور ترقی کے پروگراموں کو ادارہ جاتی امداد فراہم کی گئی۔

عورتوں کی ترقی کے دہے کے دوران مختلف ملکوں کے تجربات سے پتا چلتا ہے کہ ہر ملک میں مردوں اور عو میں فرق کی صورت حال جدا جدا ہے لیکن اس کو دور کرنے کے لیے جو طریقۂ کار اپنایا گیا ہے، وہ عالمی سطح پر کم و بیش یکساں ہے۔ غریبی ایک ایسی بیماری ہے جس کی وجہ سے عورتوں کی پسماندگی ڈرامائی طور پر ان کو قعر مذلت میں ڈ رہی ہے۔ اس کی وجہ عرصہ دراز سے چلی آ رہی ہے اقتصادی بدحالی اور بحران ہے۔ اور نظم و نسق میں تال میل کی اس کا سبب ہے، پوری دنیا میں عورتوں کی پسماندگی اور غریبی باعث تشویش ہے، ستمبر میں بیجنگ میں منعقد والی چوتھی عالمی کانفرنس میں جن دس اہم شعبوں پر عورتوں کی پسماندگی پر توجہ دی جائے گی ان میں غریبی دور کر وجہ سے سب سے اول ہو گی۔ بیجنگ کانفرنس کے لیے ہندوستان نے جو عملی خاکہ تیار کیا ہے، اس میں اس بات ظاہر کیا ہے کہ عالمی صورت حال ایسی ہے کہ اس کی وجہ سے گزشتہ بیس برسوں میں عورتوں کی حالت میں آئے

مدھارا ور پیش رفتوں کو خطرہ ہے۔ اقتصادی اور تکنیکی طور پر جو ترقیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں ان کی وجہ سے غریب جنوبی
الک کے وسائل امیر شمالی ملکوں کی طرف منتقل ہونے کے امکانات میں اقتصادی ڈھانچہ کی تبدیلی کا عمل غریب ملکوں
ایک ایسی آزاد منڈی کی طرف لے جا رہا ہے جس سے غریب ملکوں میں عورتوں پر جو دباؤ پڑے گا وہ بہت زیادہ ہوگا۔
۱۹۹۵ کی عالمی کانفرنس ان دشواریوں کا تجزیہ کرے گی جو عورتوں کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں اور ان پر قابو پانے کے
سلسلے میں اقدامات کی سفارش بھی کرے گی، اس میں آئندہ صدی کے تقاضوں اور عورتوں کو درپیش مسائل پر قابو پانے
کے سلسلے کے اقدامات پر بھی غور ہوگا۔ اس طرح مساوات کو عملی جامہ پہنانے کے اقوام متحدہ کے سابقہ اعلان کے
وضوع پر ایک بار پھر زور دیا جائے گا۔

کوپن ہیگن کی عالمی چوٹی کانفرنس میں بھی عورتوں کے مسائل پر غور وخوض کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ اس میں ان
ورتوں کے مسائل بھی سامنے تھے جو محنت مزدوری کرنے کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہیں۔
ورتوں کے لیے مساوات، ترقی اور امن کی تحریکات کے عنوان سے ترقی کے اقدامات پر غور وخوض وقت کی اہم
ضرورت سمجھی گئی ہے۔ اسی لیے ہر سال ۸ مارچ کو عورتوں کا بین الاقوامی دن منایا جاتا ہے اس طرح عورتوں اور
مردوں کے درمیان مساوات قائم کر کے ۲۱ ویں صدی کے چیلنجوں اور تقاضوں سے نمٹنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

تہذیب اخلاق

شرح اشتہارات

۱۔ بیک ٹائیٹل پیج	(پورا صفحہ)	۱۲۰۰	روپے
بیک ٹائیٹل پیج	(آدھا صفحہ)	۶۰۰	روپے
بیک ٹائیٹل پیج	(چوتھائی صفحہ)	۳۰۰	روپے
۲۔ بیک انر ٹائیٹل پیج	(پورا صفحہ)	۱۰۰۰	روپے
بیک انر ٹائیٹل پیج	(آدھا صفحہ)	۵۰۰	روپے
بیک انر ٹائیٹل پیج	(چوتھائی صفحہ)	۲۵۰	روپے
۳۔ انر سائڈ پیج	(پورا صفحہ)	۷۵۰	روپے
انر سائڈ پیج	(آدھا صفحہ)	۴۰۰	روپے
انر سائڈ پیج	(چوتھائی صفحہ)	۲۰۰	روپے

نوٹ:۔ مشتہرین کو ۳۳ فی صد کی رعایت دی جائیگی ——— سرکولیشن انچارج

ایس۔ ایم۔ شاہ نواز*

خوشحالی کی کنجی

ایک انگریزی کہاوت ہے کہ وقت پر ایک ٹانکا نو ٹانکوں کو بچاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کسی مسئلے یا پریشانی کھڑے ہوتے ہی اس کا تدارک کرلیں تو آنے والے وقت میں ہم بہت سی پریشانیوں سے خود کو بچا سکتے ہیں۔

اس وقت بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ بھی بہت سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس کے ایسے بھیا نتائج سامنے آرہے ہیں کہ ساری دنیا کے ماہرین پریشان ہیں کہ اسے کیسے حل کیا جائے۔ کس طرح آنے والی نسلوں اس کے تباہ کن نتائج سے بچایا جائے۔

اب یہ مسئلہ کسی مخصوص علاقے، خطے یا ملک تک محدود نہیں رہا ہے، بلکہ پوری دنیا اس کی لپیٹ میں ہے۔ لیکو اس کا سب سے زیادہ اثر ترقی پذیر اور غریب ملکوں پر پڑ رہا ہے۔

پچھلے دنوں واشنگٹن میں قائم "ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ" نے اپنی ایک رپورٹ میں دنیا کو خبردار کیا تھا کہ ایٹمی جنگ کا خطرہ ٹل جانے کے بعد اب تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی دنیا کے مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے اس مسئلے نے اتنی سنگین صورت حال اس لیے اختیار کرلی ہے کہ پہلے ہم نے اس پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی حکومت نے تو اسے شروع سے ہی اپنے ترقیاتی منصوبوں میں شامل کر رکھا ہے۔ اس مد پر خرچ کی جانے والی رقم میں ہر پنج سالہ منصوبے میں خاطر خواہ اضافہ کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن پھر کیا وجہ ہے کہ ان کوششوں کے وہ نتائج سامنے نہیں آئے جو آنے چاہییے تھے۔

پچھلے ۴۸ برسوں میں ملک نے ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اس وقت ہندوستان کو دنیا کے دس بڑے صنعتی ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سائنسی اور تکنیکی صلاحیت اور مہارت رکھنے والے افراد کی تعداد کے لحاظ سے دنیا میں ہندوستان کا نمبر تیسرا ہے۔

لیکن اس افتخار کے باوجود ملک کی ۴۰ فی صد سے زائد آبادی غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے نو آزاد ملکوں کے مقابلے میں آج بھی لاتعداد ہندوستانیوں کا معیار زندگی اطمینان بخش سطح تک نہیں آسکا ملک میں مکانات کی قلت ہے بے شمار افراد جھگی جھونپڑیوں میں قابل رحم زندگی گزار رہے ہیں۔ ملک میں اسکولوں اور اسپتالوں کی کمی ہے زندگی کی آسائشیں اور سہولتیں حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو بے پناہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

---

* معرفت پریس انفارمیشن بیورو، گورنمنٹ آف انڈیا۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ اگست ۱۹۹۵ء

اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہماری ساری ترقی، ہماری ساری کامیابیوں کو بے روک ٹوک بڑھتی ہوئی آبادی نے بے اثر کر ڈالا ہے۔ جس شرح سے ملک کی آبادی بڑھ رہی ہے، اس کے مطابق ایک پورا آسٹریلیا ہر سال ہمارے ملک کی آبادی میں بڑھ جاتا ہے۔ بھلا سوچئے، اس شرح اضافہ کے اعتبار سے کتنے لوگوں کے لیے مکان تعمیر کیے جا سکتے ہیں؟ کتنے اسکول اور اسپتال کھل سکتے ہیں۔ اور نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع کس طرح پیدا کیے جا سکتے ہیں؟ آبادی کا یہ چڑھتا ہوا سیلاب نہ صرف ہماری معاشی ترقی، بلکہ ماحولیات کے لیے بھی خطرہ بن گیا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ خاندانی بہبود یا خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام محض سرکاری کوششوں سے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے، جب اسے ایک عوامی تحریک کی شکل دی جائے۔

اس کے لیے سب سے پہلے ذہنوں میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت ہے، خاص طور پر خواتین کی تعلیم پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ زیادہ بچوں اور معاشی پریشانیوں کا بوجھ زیادہ تر عورتوں کو ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ہندوستان کی ریاست کیرالہ کی مثال ہمارے سامنے ہے وہاں خواندگی کی شرح ملک میں سب سے زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں شرح پیدائش بھی دوسرے علاقوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم آبادی پر کنٹرول کے مسئلے کو مغرب کی نظر سے نہ دیکھیں۔ مغرب کا یہ اصول کہ ہر مسئلے کو ٹکنالوجی کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہے، ہمارے لیے رہنما اصول نہیں بن سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم صرف مانع حمل اشیاء اور طریقوں کے استعمال پر زور دے رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہم اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لیں گے۔ لیکن ہماری یہ خام خیالی ہے۔ ہمیں اپنے سماجی، معاشی، جغرافیائی اور ثقافتی حالات کے پیش نظر اس پروگرام پر نظر ثانی کرنی پڑے گی، اسی صورت میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ ایک ٹانکے کا وقت نکل چکا ہے، لیکن ابھی بھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ اگر ہم آج بھی خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھیں اور اسے اپنی زندگی کا ایک حصہ بنا لیں تو ابھی بھی ہم بہت ساری مشکلات اور ان بہت ساری رکاوٹوں سے بچ سکتے ہیں جو ہمارے ملک اور کنبوں کی ترقی کی راہ میں آئندہ چل کر حائل ہونے والی ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہماری ساری ترقیاتی سرگرمیاں اور کوششیں بے معنی ہو کر رہ جائیں گی اور ہماری آئندہ نسلیں ہمیں کبھی بھی اس غلطی کے لیے معاف نہیں کریں گی۔

تہذیب الاخلاق کی کچھ ایجنسیاں

میسرز بک ایمپوریم۔
سبزی باغ، پٹنہ۔ بہار۔
میسرز طالب حسین۔ ایف۔ ڈی۔ ہائر سکنڈری اسکول۔
کاٹھ دروازہ، مرادآباد۔ یو۔ پی۔
میسرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ۔ ای۔ آر۔ روڈ۔ بمبئی۔
میسرز ثنائی بک ڈپو۔
پرانہ قلعہ۔ سیوان۔ بہار
میسرز کتاب سینٹر۔ شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
میسرز عبدالقیوم۔ اردو لائبریری۔
تحصیل گیٹ، گھنٹہ گھر، بدایوں۔ یو۔ پی
میسرز کتاب محل۔
تکیہ۔ اعظم گڑھ۔ یو۔ پی
میسرز مکتبہ اسلامی۔ اپوزٹ بنّے میاں درگاہ۔
شاہ گنج۔ اورنگ آباد۔ (مہاراشٹر)
میسرز آزاد بک ڈپو۔
مین روڈ، مدھوبنی۔ مدھوبنی۔ بہار۔
میسرز ایم ایچ بک سیلر، ہول سیلر اور ریٹیلر۔
رحم گنج۔ دربھنگہ۔ بہار۔
میسرز سینٹرل نیوز ایجنسی پرائیوٹ لمیٹڈ۔
پوسٹ بکس نمبر ۳۷۴ نیو دہلی۔
میسرز عنایت علی۔
مکان نمبر ۱۔ ۱۲۔ ۶۴۔ مونا محلہ غانی۔
اورنگ آباد۔ (مہاراشٹر)

میسرز معارف الاسلام، ریاض الدین امیر محمد۔ جمعیت کا
انصار محلہ، روم نمبر ۶۸، فورتھ نظام پورہ بھیونڈی،
میسرز احمد حسین۔
جمال بک ڈپو، باری روڈ، گیا، بہار
میسرز سکریٹری غالب لائبریری
محلہ نجیبہ۔ فیروز آباد۔ یو۔ پی۔
میسرز ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ شمشاد مارکیٹ۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
میسرز فردوسی کتاب گھر۔ بکس سیلرز، پبلشرز
بھوسپا چوک۔ دھارواد۔ کرناٹک
میسرز اسلامک بک سینٹر۔
جامعہ کمپلکس۔ ایم۔ آر۔ روڈ۔ بنگلور۔
میسرز کریسنٹ بک
اردو بازار۔ دربھنگہ۔ بہار۔
میسرز اسلامی بک ڈپو۔ بک سیلر، نیوز پیپر ایجنٹ۔
نیو مارکیٹ، ٹاٹا پور چوک، بھاگل پور سٹی۔ (بہار
میسرز النور بک ایجنسی۔ آئی۔ جے صدیقی۔ کاتب
مکان نمبر ۱-۱۱-۱۱۷ مستان پورہ۔ ناندیڑ۔
میسرز راشد قریشی۔
۱۱-۴-۶۴۱۶ سکنڈ فلور۔ حیدرآباد۔ (اے۔
میسرز شان میگزین پیلیس۔ پروپرائٹر محمد شمیم خان۔
شبلی نیشنل کالج روڈ۔ اعظم گڑھ۔
میسرز شمس ایجنسی
۶-۳-۱۳۱ ۸، گوشہ محل روڈ۔
حیدرآباد۔ (اے۔ پی)



دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ


ہمدرد
سنکارا الکحل سے پاک صحت بخش جڑی بوٹیوں سے بھرپور نادر مرکب ہے۔ اس میں موجود مقوی اجزا کو جسم قدرتی طور پر قبول کر لیتا ہے۔
سنکارا کے استعمال سے:
● عام کمزوری دور ہوتی ہے ● چھوت کی بیماریوں سے بچاؤ ہوتا ہے ● قوتِ برداشت بڑھتی ہے ● قوتِ حافظہ بڑھتا ہے ● حمل کے دوران خون کی کمی نہیں ہوتی ● جوش اور ولولہ برقرار رہتا ہے۔
آپ اور آپ کے خاندان کی صحت اور خوش حالی کے لیے
ہر موسم کا سدابہار ٹانک سنکارا
cinkara
cinkara
ہر روز
دو چمچے
دو بار
cinkara
سنکارا جگائے جینے کی امنگ

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

ستمبر ۱۹۹۵ء شمارہ ۹

بانی: سرسیّد احمد خاں

دیر ______________________ نائب مدیر

سرنعیم احمد ______________________ احمد مجتبیٰ قریشی

سرکولیشن انچارج : محمد عتیق قاضی

6 = 50 روپے   زرسالانہ 65 = 00   زرسالانہ طلبہ 45 = 00 روپے

الک (ہوائی ڈاک) 30 = 00 امریکی ڈالر   بیرونی ممالک (عام ڈاک) 15 = 00 امریکی ڈالر

رشپ (اندرون ملک) 650 = 00 روپے   لائف ممبرشپ (بیرون ملک) 300 = 00 امریکی ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اور نشانت

۱۔ شبلی روڈ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)۔ علی گڑھ

ترتیب

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے متفق ہو]

ایڈیٹر پبلیشر پروفیسر نعیم احمد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کے توسط سے چھپوا کر ادارہ تہذیب الاخلاق اور نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا۔

اداریہ

گاندھی جینتی کی معنویت

ایسے میں جب ہندوستانی زندگی کا ہر شعبہ بحران کا شکار ہے، اتنا ہی نہیں تشدد کا رجحان بہت طاقت پکڑ گیا ہے، مذہبی عصبیت کی لاٹھی گھماتے ہوئے عدلیہ، انتظامیہ، آئینی و قانونی حکمرانی کے ہر بازو کو مفلوج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، لسانی عصبیت اور نسل پرستی کے خیالات کا پرچار کرتے ہوئے قومی تہذیب اور معاشرے کے پرخچے اڑانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے، انسانیت، انسان دوستی، رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا مفہوم بدلنے کا پرچار کیا جا رہا ہے، ہندوستانی تہذیب کی جو اقدار انجانے زمانے سے نسلاً بعد نسلاً سب کے لیے مایۂ ناز رہی ہیں، انہیں شرمناک قرار دینے کی جرأت کی جا رہی ہے، جب دہلی، کانپور، احمد آباد، بھاگلپور، سورت، بمبئی وغیرہ میں آلام و مصائب کی عمومیت یہ ہے کہ؛

ہر طرف ظلم ہو رہا ہے یہاں
اک سسکتا ہے ایک مرتا ہے

یوں ہر محبِ وطن اور قوم کے خیر خواہ کی روح ایک ایسے کرب میں مبتلا ہے جس کا ہر لحظہ اور ہر جگہ احساس ہو رہا ہے؛

شب کو فتِ سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ
وہ درد و الم تھا کہ کہے تو کہ یہیں تھا

اور جس ہاتھ سے دل کو تھامنے کی کوشش کی جا رہی ہے خود اس کی کیفیت یہ ہے!

داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب
ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا

اس سب کے باوجود بے بسی اور مایوسی کے جالے میں گرفتار ہونے کے بجائے ایک ایسی ہستی کے خیالات اور اعمال کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے جس کی شہادت پر یونیورسٹی ترانہ کے خالق نے کہا تھا؛

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انسان کی تلاش میں انساں چلا گیا

مگر اس کا نام لیوا بننے کی لو آج وہ قوتیں بھی دعویدار ہیں جنھوں نے ہمیشہ اپنے وجود کا تعین ہر اس قدر کی مخالفت، جارحانہ مخالفت سے کیا ہے، جن کے گاندھی جی علمبردار تھے۔ یوں گاندھی جینتی سے بہتر اور کون سا موقعہ ہوگا جب اس حقیقت پر عمل کیا جائے؛

گاہے گاہے باز خواں قصۂ پارینہ را

گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں سیاہ فام لوگوں کی جدّوجہد اور قربانیوں سے جو سبق سیکھا تھا وہ ہمیشہ

انھیں جوش وجذبہ فراہم کرتا رہا۔ گاندھی جی جب افریقہ سے ہندوستان لوٹے تو قومی تحریک کے اس وقت کے قائدین کے لیے ان کی ذات بڑی ہی انوکھی تھی۔ جنوبی افریقہ میں انہوں نے جو کارنامے انجام دئے تھے ان کے سبب، وہ لیڈران کی طرف کھنچتے تھے۔ لیکن عام آدمی سے قربت کا جو راستہ گاندھی جی اختیار کررہے تھے، وہ انہیں گاندھی جی کو ذرا پرے رکھنے کے لیے اکساتا تھا۔ گاندھی جی نے اپنی طبقاتی حیثیت، بیان بازی یا لفظی بازیگری کے ذریعے جذباتی استحصال کے چور دروازے سے اپنی قیادت مسلط نہیں کی۔ انہوں نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا، تیسرے درجے میں سفر کرتے ہوئے عام آدمی کی حالتِ زار کے تصور یا تماشے پر تجربے کو ترجیح دی۔ یوں عوام سے انہوں نے وہ قوت حاصل کی جس کے سبب وہ آناً فاناً ہندوستان کے سیاسی افق پر چھا گئے اور آزمودہ کار سیاسی و نظریاتی قائدین نے بھی برضا و رغبت ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

گاندھی جی نے سیاست کو عوام کے مسائل، ان کے جذبات، ان کی مرادوں اور امنگوں کے اظہار کا آلۂ کار بنایا۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے عوامی خدمت میں ایک کیف پیدا کیا۔ عوامی خدمت کو انہوں نے ایک بے لوث اور بے غرض قربانی کا روپ دیا جو ایسی سرشاری پیدا کرتی ہے جو سود و زیاں سے بالاتر ہوتی ہے چمپارن کے بدحال اور بے حال کسانوں کی جدوجہد میں عملی کردار ادا کرکے، ان کے مطالبات تسلیم کرا کے انہوں نے نہ صرف محنت کشوں میں جرأت و ہمت پیدا کی، بلکہ اس طرح اپنی سیاسی جماعت کو بھی شہرت اور مقبولیت بخشی گاندھی جی کے ان اقدامات کا بہر صورت یہ نتیجہ نکلا کہ زمیندارانہ جبر و ستم سے نجات اور آزادی کی تڑپ شیر و شکر ہو گئی۔

ترکِ موالات کی تحریک کو اسی سبب فروغ حاصل ہوا۔ نوجوان اپنا مستقبل سنوارنے کی راہ چھوڑ، مادرِ وطن کا مقدر بدلنے کے لیے نکل پڑے۔ اپنی طبقاتی برتری اور علیحدگی پر اصرار کرنے، اپنی لیڈری کا سکّہ ڈھالنے کے بجائے کسانوں اور سماج کے دیگر کمزور حصوں کے مطالبات کے نقیب بن گئے۔ طبقاتی تحریک آپ سے آپ ہمہ گیر قومی تحریک بن گئی۔

اس تحریک کے روحِ رواں کی حیثیت سے گاندھی جی نے عدم تشدد (اہنسا) پر زور دیا۔ استحصال سے نجات، قومی آزادی اور عزتِ نفس کی بھری ہوئی تڑپ کو اہنسا کی خنکی بخشتے ہوئے انہوں نے قومی تحریک کو مختلف طبقوں کی سرگرمیوں کا سنگم بنادیا ـــــ قومی تحریک کے جوار بھاٹا کے لیے فرقہ پرستی سب سے خطرناک زیرِ آب چٹان کے روپ میں نمودار ہوئی۔ اس کا علمبردار قوموں نے جو استحصال شروع کیا، گاندھی جی نے اس کے سیاسی مضمرات کا بخوبی اندازہ لگایا۔ انھوں نے قومی وحدت کی بقا کے لیے صرف اخلاقیات پر زور نہیں دیا۔ اسے انہوں نے اپنے سیاسی ایجنڈے میں شامل کیا۔ گاندھی جی نے اس حقیقت پر زور دیا کہ کسی انسانی گروہ کو کسی بھی بنیاد پر اس کے حقوق یا اقتدار میں اس کے حصے سے محروم کر کے نہ تو فرقہ پرستی کا خاتمہ کیا جا سکتا اور نہ ہی قومی وحدت پروان چڑھائی جا سکتی ہے ـــــ اس لیے ضروری یہ ہے کہ عوام کے تمام حصوں کو اقتدار میں شریک کیا جائے۔

ملک کی وحدت کے تحفظ کے لیے گاندھی جی کی تعلیمات سے یہ سبق حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ گاندھی جینتی کی تقریبات صرف اسی صورت میں بامعنی ہو سکتی ہیں۔

(مدیر)

محمد حبیب الحق انصاری*

فرنگی محل، ندوہ، دیوبند اور علی گڑھ

فتح اللہ شیرازی (وفات ۱۵۸۸ء) کی فارسی کی عالمانہ روایت کے حامی قطب الدین سہالوی (وفات ۱۶۱۹ء) فارسی کے مشہور رسالہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ اُن خواجہ عبداللہ انصاریؒ کی اولاد میں تھے جو فارسی کے اولیں رسالہ نگاروں میں سے تھے اور جن کا عرس ہرات (افغانستان) میں بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ خواجہ عبداللہ انصاری کی اولاد میں ایک ملّا کمال الدین (عرف ملّا بدھ) کے خاندان کی ایک خاتون اکبر بادشاہ کے نکاح میں آئی تھیں اور اس خاندان کو اکبر نے ۲۵۰۰ بیگھہ آراضی واگذار کرنے کا فرمان جاری کیا تھا۔ جب شر پسندوں کے حملے میں مُلّا قطب الدین عین اپنے گھر کے دیوان خانے میں شہید کر دیے گئے تو اورنگ زیب عالم گیر کے حکم سے اودھ میں فرنگی محل میں اس خاندان کو بسنے کا اجازت نامہ صادر ہوا اور اس طرح فرنگی محل اس قدیم عالمانہ خاندان کی کارگزاریوں کا مرکز بن گیا۔

فرنگی محل کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ یہ ایک ولندیزی تاجر کی کوٹھی تھی جو عالم گیری عہد میں ٹیکسوں کی عدم ادائیگی کی وجہ سے سرکار کی تحویل میں آگئی تھی۔ چوں کہ یورپی افراد عموماً فرانسیسیوں کی نسبت سے فرنچ، فرنک فرانک یا فرنگی کہلاتے تھے تو اس کوٹھی کا نام بھی مقامی بول چال میں فرنگی محل پڑ گیا۔ یہ کوٹھی جب قطب الدین سہالوی کے فرزندگان کی آماجگاہ بنی تو اس میں دینی تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا جو اس صدی کے اوائل تک کم و بیش زور شور سے جاری رہا۔ سترھویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں یہ دینی تعلیم کا اہم مرکز تھا۔ فرنگی محل مدرسے کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ معقولات کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ درسِ نظامی جو یہاں تشکیل دیا گیا سارے ہندوستان میں رائج ہوا۔ درس نظامی پر البتہ ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اس میں حدیث کی تدریس کی مناسب شمولیت نہیں کی گئی تھی بلکہ صرف چند ایک کتب پر ہی اکتفا کر لیا گیا تھا۔

آج کل اس خاندان سے محمد ولی الحق انصاری فارسی علمیت اور تدریس کی روایات کو آگے بڑھانے کی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ فرنگی محل میں تنوع کا نمودار ہونا فطری عمل تھا۔ ایک دلچسپ تاریخی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جیوں جیوں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء اور علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آتا گیا سو ہی فرنگی محل کے مدرسے کا

* ریسرچ آفیسر، شعبۂ فزکس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

زوال ہوتا گیا کیوں کہ اب مسلمانان ہند کے لیے معقولی علوم (جو مغرب میں اسی دوران بھرپور انداز سے فروغ پا چکے تھے) کے ح ایم۔اے۔او کالج اور پھر اے۔ ایم۔ یو کی شکل میں قایم ہوگیا تھا جسے پھر ہر دور میں سرکاری سرپرستی مسلسل حاصل ہو ندوہ اور دیوبند دینی تعلیم کے خاص مرکز بن چکے تھے۔ حالیہ دور میں فرنگی محل خاندان کے کئی افراد علی گڑھ کے فروغ میں اپنا بھرپور حصہ ادا کر چکے ہیں۔ مثلاً انور انصاری شعبۂ نفسیات کے قیام میں، نسیم انصاری سرجری کے شعبہ مہدی انصاری شعبہ عربی تو رضا انصاری شعبۂ الہیات میں تعلیم اور تحقیق کے میدان میں۔ اس کے علاوہ حیات اللہ انصار نے 'منصور منزل'، یونیورسٹی کو دی جہاں آج کل یونیورسٹی کینٹین بڑے پیمانے پر چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ کئی مقتدر علی گڑھ میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور رہ چکی ہیں، فرنگی محل خانوادے کا حصہ ہیں۔

دو سو سے زیادہ برسوں تک فرنگی محل مدرسے کے فارغ التحصیل پورے ہندوستان میں مختلف عہد ہوتے رہے۔ اودھ کے نوابوں میں فرنگی محل مدرسہ مقبول تھا اور وہاں سے نواب کو سرکاری بندوبست چلا کرنے کے لیے تربیت یافتہ عہدے دار برابر مل جایا کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ اگرچہ فرنگی محل کے علما سنی تھے مگر وہ شیعہ پوری دسترس رکھتے تھے اور شیعوں کے لیے فقہ جعفریہ یا دوسرے علوم کی بھرپور تدریس کا بھی ہمیشہ سلسلہ وہاں کھلا

اگرچہ فرنگی محلی مدرسہ دو تین سو برس تک ایسا کلیدی مدرسہ تھا لیکن یہ محض ایک خاندان کے زیر تحویل رہا صدیوں شادی بیاہ کے نتیجے میں لکھنؤ اور اس کے نواح کے قصبوں میں دور دور تک اپنی رشتہ داریاں قایم کر چکا تھا۔

فرنگی محلی مدرسے کے عروج کے وقت اس کی اہمیت کا ایک اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ء لکھنؤ سے ہجرت کر کے پہلے شاہ جہاں پور حافظ رحمت خاں کے ہاں گئے اور پھر چھ سو طلبا کے ساتھ نواب آف ارکا پر کوچ کیا تو اُن کا ہاتھوں ہاتھ استقبال کیا گیا اور نواب آف ارکاٹ ان کے اور ان کے طلبا کے استقبال کے لیے تشریف لائے۔ اس کے نتیجے میں ملا عبدالعلی اور ان کی اولاد ارکاٹ ہی میں رہ بس گئے اور درس و تدریس کا دور تک پھیلا دیا۔ خاص مدراس کی مسجد والا جاہ میں بحر العلوم کا مزار ہے جہاں اُن کا عرس دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد قصبات جو مسلم شرفا کے مراکز تھے رو بہ زوال ہونے لگے اور شہروں میں برطانوی نو آبا سرگرمیوں نے چھوٹے سرمایہ دار بنیوں کو اُبھار دیا۔ گورنمنٹ میں مسلمانوں کو عہدے ملنا کم ہو گئے۔ جہاں تک فار تھا وہ ۱۸۳۶ء ہی میں سرکاری زبان ہونا بند ہو گئی تھی۔ اس صورت حال کے ردّ عمل کے طور پر قصبات میں تعا کے ذریعے ایک تحریک پیدا ہونے لگی جو اپنے آپ کو اُسی طرح روشن خیال ظاہر کرنا چاہتی تھی جیسا کہ وہ اپنے اطراف اور تعلیمی اداروں اور اُن کی طرز، زبان اور طریقوں میں دیکھ رہی تھی۔ یہ تحریک قدیم اور جدید کے امتزاج کی کوشش ہوئی۔ اس کی مختلف شکلیں علی گڑھ تحریک، دیوبندی تحریک، اہل حدیث اور بریلوی مسالک تھے۔ ان کا روئے تر نو آبادیاتی نظام کے عہدے داروں یا کارندوں بلکہ نو آبادیاتی نظام میں مسلم معاشرے کی طرف تھا اور ایسا اکثر تحریکوں کو مہمیز یا تو راست نو آبادیاتی سرکاری ڈھانچے یا نو آبادیاتی نظام کے مسلم عہدے داروں نے دی۔ البتہ د قدر برٹش راج سے الگ رہے اور بریلویوں نے اپنا رُخ دیہاتی کسان کی طرف زیادہ کیا۔

مغربی چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ان تنظیموں نے قرآن اور حدیث کو زیادہ سے زیادہ اپنی بنیاد بنایا۔ وہ ایک طرف اصلاح تو دوسری طرف اجتہاد پر زور دے رہے تھے لیکن امت کے اتحاد کے لیے ضروری تھا کہ ایک وسیع

اتفاق رائے پیدا کیا جاسکے۔ ایک ایسے ماحول میں اتفاق کو مقصد بناتے ہوئے کچھ مفکروں، گورنمنٹ عہدے داروں اور مذہبی عمائدین کے مجموعے نے 'ندوۃ العلماء' کے فورم کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک کے اولین روح رواں برطانوی حکومت کے ایک عہدے دار ڈپٹی کلکٹر عبدالغفور (پیدائش ۱۸۵۵ء) تھے لیکن جب عبدالغفور صاحب نے دینی تعلیم کے ایسے فورم کی تجویز ۱۸۹۱ء میں اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس میں رکھنے کی بات کی تو سر سید احمد خاں کی منظوری سے اسے اس لیے رد کر دیا گیا کہ اس کا مقصد محض روایتی تعلیم کو بڑھاوا دینا تھا نا کہ انگریزی جدید تعلیم کو۔ چنانچہ یہ تجویز کانفرنس میں رکھی ہی نہ جاسکی۔ اس کے باوجود عبدالغفور صاحب اور کانپور اور دیوبند کے اطراف کے دینی مدرسوں نے کانپور میں اس سلسلے میں ایک بیٹھک کی اور اس طرح اگلے دو برسوں تک ماہانہ میٹنگوں کا ایک سلسلہ قایم ہوگیا۔ اس تحریک نے محتاط انداز سے اپنے آپ کو سیاسی میدان سے الگ تھلگ رکھا۔

اس تحریک نے روایتی دینی تعلیم والوں پر سخت اعتراضات کیے۔ انھوں نے جہاں جدید طریقوں کو اپنانے کی بات کی وہاں روایتی تعلیم والوں کی یہ تنقید کہ وہ بدعت کا دروازہ کھول رہے ہیں اس لیے غیر موثر ثابت ہوئی کہ انھوں نے یوروپی فکر کے مواخذ کو بھی اِسلامی ماضی سے ماخوذ بتلایا۔ اس طرح ایک طرف وہ روایتی تعلیمی نصاب اور طور طریقوں کی فرسودگی باور کرانے میں کامیاب ہوئے تو دوسری طرف اپنے آپ کو اصحاب سلف کی طرح خالص اِسلام کے دعوے دار بھی منوانے لگے۔

ندوہ کی تحریک میں پیر فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی (۱۷۹۳ء تا ۱۸۹۵ء) کے خلیفہ سیّد محمد علی مونگیری نقش بندی مجدّدی (۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۷ء) کا نام پہلے ناظم کے طور سے اہمیت کا حامل ہے۔ جناب مشہور مدرس لطف اللہ علی گڑھی (وفات ۱۹۱۶ء) کے شاگردوں میں سے تھے۔ یہ دونوں حضرات قصباتی معاشرے سے ابھرے تھے۔ قصبہ کاکوری کے مفتی عنایت احمد کاکوروی (۱۸۱۳ء تا ۱۸۶۳ء) بھی سیّد محمد علی مونگیری کے مدرسوں میں سے تھے۔ جناب بھی لطف اللہ علی گڑھی کی طرح نوآبادیاتی منصفی نظام میں مفتی اور قاضی کے عہدوں پر مامور رہے تھے۔ (لطف اللہ علی گڑھی حیدرآباد میں ۱۸۹۵ء میں مفتی مقرر ہوئے تھے) خود فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی قصبہ سندیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دیگر قصبے والوں کی طرح فضل الرحمٰن صاحب اور لطف اللہ علی گڑھی صاحب دونوں ہی برطانوی پالیسی کی وجہ سے عموماً بنیوں کے قرض دار رہا کرتے تھے۔ البتہ فضل الرحمٰن صاحب کے کانپور میں نظامی پریس کے مالک سے بڑے اچھے تعلقات تھے جو نئے ابھرتے ہوئے سماجی گروہوں کے نمائندے تھے۔ اسی طرح نظامی پریس کے مالک نے مفتی عنایت احمد کاکوروی کو بھی مدرسہ فیض عام کے لیے عطیہ دیا تھا ــــ مولانا مونگیری نے اسی مدرسۂ فیض عام سے تعلیم بھی پائی اور وہیں مدرسی بھی کی۔

اگرچہ ندوہ کی تحریک کے اولین محرکین میں ڈپٹی کلکٹر، کمشنر، تاجر، جج اور نیا تعلیم یافتہ طبقہ شامل تھا لیکن مولانا مونگیری کی ۱۸۹۴ء میں کانپور کے فیض عام مدرسے میں دستار بندی ثابت کرتی ہے کہ ایک حد تک روایتی طبقے کو آگے لانے میں بھی اُن کو کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔

مولانا مونگیری کے مطابق مسلم علم کلام فرسودہ ہوگیا تھا اور ایک نئے علم کلام کی سخت ضرورت تھی تاکہ مشنریوں کے چیلنج کا مقابلہ کیا جاسکے۔ ندوہ کی پہلی روداد میں انھوں نے ندوہ کے قیام کے تین مقاصد بیان کیے:

۱۔ نئی نسل پریشان اور آوارہ ہے۔ اگرچہ انگریزی تعلیم دی جارہی ہے لیکن بچے اسلام سے بے بہرہ ہیں۔

جو بچے دینی مدرسوں کو جا رہے ہیں وہاں فرسودہ نصاب پاتے ہیں۔

۲۔ دینی مدارس کے طلباء معقولات پڑھتے ہیں جو فرسودہ ہیں اور منقولات اور عربی (جو کہ ہماری قومی ا
زبان ہے) میں پوری استعداد کے نہ ہونے کے سبب عوام پر مناسب طور سے اثر انداز نہیں ہو پاتے۔ اس
ضروری ہے کہ علمائے سلف کی خاصیتیں پیدا کی جائیں اور ساتھ ہی عصری ضروریات کا لحاظ رکھا جائے

۳۔ علماء کے لیے ضروری ہے کہ نفاقِ باہمی کی بلا سے نجات حاصل کریں اور اپنے اختلافات بھول کر متحد ہو
مولانا مونگیری کہتے ہیں کہ ندوہ کسی ملکی یا سیاسی مقصد کے لیے نہیں قائم کیا گیا بلکہ اس کا مقصد تعلیمی نظام
کی اصلاح و تربیت اور نفاق کے سدِّ باب کا قیام ہے۔ اس طرح وہ اہل کار جو تاج برطانیہ کے وفادار تھے وہ بھی ندو
عوام کی حد تک مولانا مونگیری کی زبان اور لہجہ برطانوی ناقدوں کے لب و لہجے سے ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے، جیس
ہیں کہ مذہبی عالم عوام کی نظروں میں بے وقعت اور بے کار دیکھے جاتے ہیں اور مدرسوں میں نہ تو ذہنی تربیت ہوتی ہے
طریقے اور تربیت پر توجہ دی جاتی ہے۔ صرف طوطے کی طرح سے کچھ باتیں رٹا دی جاتی ہیں اور حروف شناسی کروا دی
مولانا مونگیری نے اپنے خیالات کے پرچار کے لیے ایک سیّد مشتاق علی کو ملک کے مختلف علماء کے پاس بھیجا۔
مولانا مونگیری کے شعور میں وہی عوامل کارفرما تھے جو ان مذہبی ہستیوں سے میل کھاتے تھے جو برطانو
عہدوں پر فائز تھے جیسے کہ مفتی، قاضی وغیرہ یا برطانوی سرکار کے تجارتی معاونین جیسے نظامی پریس کے مالک و
سیّد مشتاق علی اور مولانا مونگیری نے جہاں عوام میں کئی غلطیاں پائیں جیسے پامال مدرسے، علماء کی عد
اشخاص، علماء، طلباء اور سادات میں تنزل، طلباء میں اخلاقی گراوٹ اور علمیت کا فقدان، تجارت، کرخنداری
اور زراعت کے میدانوں میں مغربیت کا غلبہ وغیرہ اور ان سب کی وجہ انھوں نے مسلمانوں کی خود کی غفلت،
بے دینی کو ٹھہرایا، وہاں انہیں خود اپنے محرکین اور متعلقین جیسے کہ تعلقہ داروں، سرکاری ملازمین اور وسطی
میں منفی رجحانات دکھائی نہیں دیئے بلکہ ان موخر الذکر کو یوں ظاہر کیا گیا کہ جیسے یہ پہلے ہی اصلاح شدہ ہیں ا
کی ضرورت نہیں ہے۔

جہاں شبلی نے علی گڑھ سے مدد کا وعدہ کیا وہاں مکہ مکرمہ سے حاجی امداد اللہ کی ہمدردی سے تح
ہوا کیوں کہ حاجی امداد اللہ صاحب کے خلفاء اور مریدین کی تعداد ہزاروں میں تھی اور وہ خاص مکہ مکرمہ سے
کو درست قرار دے رہے تھے۔

یہیں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اُن ۷۵ ہندوستانیوں میں جن سے مشتاق علی نے خاص طور سے ملاقات ک
فرد نہیں تھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے سید مشتاق علی نے خاص کر کے فرنگی محلی علماء کو نظر انداز کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو
نمائندے معروف درسگاہ فرنگی محل کے جانشین بننے کے خواہش مند تھے اور یہ واقعہ ہے کہ وہ اس لکھنوی
جانشین بننے بھی جا رہے تھے۔

ندوہ کے پہلے کنونشن میں کانپور کے میونسپل کمشنر، تاجر، مذہبی اور سیکولر عالم، صحافی اور و
حنفی علماء کے علاوہ سلفی جیسے محمد ابراہیم آروی (وفات ۱۹۰۱ء)، اہل حدیث جیسے صحافی محمد حسین بٹالوی
اور شیعہ جیسے غلام حسنین کنتوری (۱۸۴۳ء تا ۱۹۱۸ء) اور علی گڑھ سے شبلی وغیرہ موجود تھے۔ شرکا

الہ آباد، اٹاوہ، لکھنؤ، فرخ آباد اور علی گڑھ سے آیا تھا جہاں کانپور کی صنعت کا منفی اثر پڑا تھا۔ ساتھ ہی یہ کہنا پڑتا ہے کہ روایتی دھارے کے کئی نمائندوں نے اس اجلاس میں شرکت نہیں کی، جیسے کہ بریلوی حضرات، فرنگی محلی حضرات کی اکثریت اور دیوبندی حضرات کی اکثریت جن کے سربراہ سلفی مخالف عالم مولانا محمود الحسن (۱۸۵۰ء تا ۱۹۲۱ء) تھے۔

تقاریر میں عربی زبان و ادب، تفسیر اور ایک نئے علم کلام کی تعلیم و تدریس اور تحصیل پر زور دیا گیا اور روایتی نصاب پر سخت تنقید کی گئی۔ ساتھ ہی انگریزی تعلیم کے ہندوستانیوں پر مضر اثرات کو نشانہ بنانا تجویز ہوا اور کہا گیا کہ اس سے بڑا نقصان ہو رہا ہے۔

اس طرح ۱۸۹۵ء کی میٹنگ میں دارالعلوم اور دارالافتاء کے قیام کی تجویز رکھی گئی۔ اس دارالعلوم میں مقررہ اوقات پر مقررہ کام کرنے تھے۔ کسب حلال کے لیے طلباء کو فنون صناعیہ کی تربیت بھی دینی تھی۔ اخلاقی امور پر ماہانہ اجلاس ہوتے تھے۔ ورزش اور کھیل کود کا اہتمام بھی تھا۔ غریب طلباء کی مدد کا انتظام تھا لیکن علی گڑھ کے مقابلے اس دارالعلوم میں کھانے، رہنے اور پہننے کے آداب کو عربی طرز کا ہونا تھا۔ علوم دینیہ میں دست رس الحاد اور دہریت کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھی۔ تزکیۂ باطن کے لیے غزالی کی احیاء العلوم اور سہروردی کی عوارف المعارف کا پڑھنا تجویز ہوا۔ تفسیر اور حدیث اور عربی کی تحصیل نہایت ضروری قرار دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ اوپری خیالات دراصل شبلی کے تھے جنہیں مولانا مونگیری نے اپنی طرف سے پیش کر دیا۔ چنانچہ نئے نصاب میں عربی پر زور میں بھی شبلی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ اگرچہ ۱۸۸۶ء سے لے کر ختم صدی تک اردو میں تاریخ اور سائنس اور اخلاقیات پر کئی کتابیں منظر عام پر آچکی تھیں جو کہ اکثر انگریزی کتابوں کے ترجمے تھے۔ اس کے باوجود شبلی یا مولانا مونگیری نے سائنس وغیرہ کو اپنے نصاب میں یہ کہہ کر شامل نہیں کیا کہ اس موضوع پر کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ بعد میں یہ بھی کہا جانے لگا کہ مغربی دنیا نے سائنس کو اپنے حساب سے بڑھا دا دیا ہے جب کہ ضرورت ایک اسلامی سائنس کی ہے۔

اگرچہ یہ سب باتیں تجویز ہوئیں لیکن برسوں تک کوئی متفقہ نصاب نئی طرز کا بن کر سامنے نہ آسکا۔ جہاں تک منقولات اور معقولات کا ذکر تھا ندوہ تحریک کے اہم نمائندے جناب سید عبدالحئی (۱۸۶۹ء تا ۱۹۲۳ء) کا کہنا تھا کہ شروع میں جب طاقت کا مرکز دہلی تھا تو نصاب مدرسہ منقولات، فقہ اور اصول فقہ سے پُر تھا لیکن جب مرکز دہلی سے لکھنؤ ہٹا تو معقولات کو منقولات پر بالادستی حاصل ہوگئی۔ سید عبدالحئی نے روایتی تعلیم کا جو تجزیہ پیش کیا اس کے بموجب روایتی فرنگی محلی تعلیم ایمان نظر اور قوت مطالعہ پیدا کرنے کے باوجود کامل علم مہیا کرنے سے قاصر تھی۔ چنانچہ اس سے تحصیل فن کم تر ہوتی تھی اور احتمال آفرینی کا رجحان زیادہ پیدا ہوتا تھا، جہاں تفسیر، ادب اور عربی پر کتابیں بہت کم تھیں وہاں منطق پر بہت زیادہ تھیں، جب کہ تاریخ، جغرافیہ، قرآنی معجزات اور دیگر مسائل بالکل نظر انداز کر دیے گئے تھے۔ منطق میں بھی گہرائی میں جاکر مسائل پر دسترس ممکن نہیں ہو رہی تھی۔

اسی طرح سید عبدالحئی صاحب اور اس سے پہلے سید مونگیری صاحب ماقبل میں شاہ ولی اللہ صاحب کے ان خیالات کا اعادہ کر رہے تھے جو دہلی مدرسے کی روایت تھے اور جن کے مطابق منقولات پر زور تھا کہ ان کی تحصیل سے سچا اسلام اور پختہ ایمان پیدا کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ لکھنوی فرنگی محل ان کا نشانہ بن گیا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان منقولی علما ... اپنی پوزیشن ایک شریفانہ نسب، نقش بندیہ مجددیہ سلسلے اور
ان کے پیروؤں کے فکری سلیقے اور ایک طرح سے ان کی مخالف نو آبادیاتی جدوجہد سے جائز ٹھہرانے کی کوشش
تو نہ تو ڈپٹی کلکٹر اور کمشنر حضرات نہ ہی شبلی کا تعلق اس طرح کی اشرافیہ سے تھا نہ ہی وہ تحریک جہاد سے وابستہ
ضرورت سے زیادہ اس بات کے حامی تھے کہ محض قرآنی علوم پر زور ہو اور معقولی امور کو پس پشت ڈال دیا جائے۔
چنانچہ ندوہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ آنے والے سالوں میں ہر دو طرح کی فکر میں باہمی اختلاف ندوہ کے ...
اور ابھی بھی یہ بات واضح نہیں ہے کہ کس حد تک جدید سائنس اور دیگر معقولی مضامین دینی مدارس میں شامل
کس حد تک نہیں۔

۱۹۱۵ء میں سید عبدالحیؒ نے جو معروف تاریخ داں بن چکے تھے، ندوہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی
زیادہ وضاحت سے شریفی نسب، نقش بندی، مجددی اور ولی اللّٰہی خیالات کی وراثت کے ساتھ ندوہ پر حاوی
تک (بیچ میں بجز ایک مختصر مدت کے) ندوہ کی باگ ڈور آں ہی کے خاندان میں چلی آرہی ہے، بلکہ یہ کہنا غلط
کی تحریک جو کہ علماء کی ایک کھلی کونسل تھی اس طرح ایک خاندانی بات بن گئی لیکن پھر اپنی پھیلی ہوئی دعوت جدوجہد
خیال کے ذریعہ ندوۃ العلماء عالمی رابطات بنانے میں کامیاب ہو گئی اور اس تحریک کو بڑے پیمانے پر بیرون ہندوستان
سے مالی اور اخلاقی سرپرستی فراہم ہونے لگی۔ اس طرح نصاب میں عربی تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کا شامل کیا جانا عرب
دریافت کی وجہ سے عربوں سے خصوصی رابطے پیدا کرنے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوا اور ندوہ تحریک کی تقویت
شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء تا ۱۷۶۲ء) اور ان کے خاص پیروؤں سید احمد شہید (۱۷۸۶ء تا ۱۸۳۱ء)
(۱۷۷۹ء تا ۱۸۳۱ء) وغیرہ کا مسلک یوں بیان کیا جاتا ہے کہ "شریعت + سنت - بدعت"۔ وہ ہندوؤں کی
اور اہل تشیع کی طرح محرم کے جلوس اور تعزیے وغیرہ نکالنے اور ماتم کرنے کو ممنوع قرار دیتے تھے۔ ان کے
مسلمان حکمرانوں کی مدد کرنی چاہیے اور روایتی نصاب کی جگہ اسلام کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کرنا چاہیے
دیوبندی، اہل حدیث، بریلوی اور ندوۃ العلماء کی تحریکیں شاہ ولی اللہ کی تحریک کے بعد کی دہائیوں میں آ...
اہل حدیث نے بھی صوفی مسلک کو غیر پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ ان پر ابن تیمیہ کا اثر زیادہ تھا۔ دہلی
تحریک دہلی کالج کا قیام تھا جسے اسحاق صاحب نے قائم کیا تھا، ۱۸۲۵ء میں۔ لیکن غدر کے بعد ۱۸۵۷ء میں
گیا۔ بریلوی حضرات حنفی ہونے کے ساتھ ساتھ مشائخ اور پیروں کے رہبرانہ موقف کے بھی طرف دار تھے۔
جیسا کہ لکھا جا چکا ہے دیوبندی مدرسے کے بانیوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۳۱ء تا ۱۸۸۰ء)
احمد گنگوہی (۱۸۲۷ء تا ۱۹۰۵ء) اور حاجی امداد اللہ صاحب (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۹ء) کا شمار کیا جا سکتا ہے۔
نے قائم کیا وہ کسی گروپ، فرقے یا سیاسی جماعت سے منسلک نہ تھا۔ اس کا دار و مدار عوام سے امداد اور
کسی جائداد یا سرکاری امداد پر رکھا گیا تھا۔ دیوبند میں بھی معقولات کی بجائے منقولات اور حدیث پر زور تھا
چہ منتخب کتابیں نصاب میں داخل کی گئی تھیں۔ ذریعۂ تعلیم اردو کو بنایا گیا تھا، مغربی تعلیم کی مخالفت تو نہیں کی گئی
اس پیسے زور دینا شروع کیا گیا کہ وہ ہندوستان میں قریب قریب معدوم ہو چلی تھی۔ حنفی مسلک کے چاروں اما...
کو مانا گیا اور کسی ایک فرقے سے وابستہ ہونے میں کسی قباحت کا ہونا نہ مانا گیا، کیوں کہ کہا گیا کہ چاروں مسلک

اجماع اور قیاس پر مبنی ہیں۔ ان اماموں کی تقلید کا یہ جواز پیش کیا گیا کہ دنیا اب زیادہ منتشر ہو گئی ہے اور اس زمانے میں ان جیسے قابل امام
اب ناپید ہیں اور یہ کہ اماموں کی تقلید کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ پیغمبر کی اہمیت یا سبقت پر کوئی آنچ آ سکتی ہے وغیرہ بلکہ دیوبندی
نصاب میں علم حدیث کو خاص مقام حاصل تھا۔ دیوبندی شیعہ مسلک کے خلاف تھے۔ انھوں نے ان رسموں کی نفی کی جس سے پیروں کی قبروں کی
پرستش ہوتی تھی یا بزرگوں کو کرامات کے ذریعے پیغمبر کے تقریباً برابر کا درجہ دیا جاتا تھا۔ دیوبندی حضرات فنافی اللہ کے قایل تھے،
ان کے خیال میں شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کے مدارج میں ہو سکتا تھا پہلے فنا فی الشیخ پھر فنا فی الرسول اور آخر میں
فنا فی اللہ۔ دیوبندی حضرات قدر کی مگر جبر کے زیادہ قایل تھے۔ دیوبندی مدرسے کا موقف قرآن کے تئیں اسے لفظ بہ لفظ
درست ماننے کا رہا ہے۔ ان کے مطابق قرآن و حدیث کے علاوہ کسی اور سیکولر یا مذہبی ادارے کے ذریعے قانون بنایا جانا
قابل قبول نہیں تھا، کیوں کہ اُن کے نزدیک اِسلام دینِ کامل تھا اور اس میں زندگی کے ہر پہلو کے لیے احکامات موجود تھے۔
چنانچہ کسی طرح کا امتیاز زندگی میں سیکولر یا مذہبی نام دے کر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دیوبندی علما، برطانوی حکومت کے
مداحوں میں سے نہیں تھے بلکہ سیاسی معاملات میں عدم دلچسپی کے باوجود انھوں نے مسلمانوں اور انڈین نیشنل کانگریس کے
بیچ تال میل کا فتویٰ دیا اور خلافت تحریک کے اس درجہ حامیوں میں سے تھے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران انھوں نے ترکوں سے
رابطہ پیدا کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔

جہاں تک سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء) کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے جہاں برطانوی حکومت سے
تعاون کو اپنایا وہاں انھوں نے (۱) اسلام کے تئیں ایک معقول رویہ اپنانے (۲) مغربی طرز پر سماجی اصلاحات کرانے (۳) انگریزی
کے ذریعے جدید تعلیم کے حصول (۴) مسلم قوم پسندی اور (۵) تمدن اور سویلائزیشن کی عالم گیر اخلاقی قدروں پر کم و بیش
زور دیا۔ معقول رویہ اپنانے کے زمرے میں انھوں نے سائنسی تعلیم پر زور دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں مسلمان ہوں تو پورے
سوچنے سمجھنے کے بعد مسلمان ہوں چنانچہ جدید سائنس کی تعلیم سے میرے ایمان پر کوئی منفی اثر نہیں پڑ سکتا۔ سماجی اصلاحات
میں وہ قرضہ لینے اور رسوم و رواجات اور فضول باتوں کے خلاف تھے۔ انگریزی کے ذریعہ تعلیم کے مقصد سے انھوں نے اینگلو-
محمڈن اورینٹل کالج ۱۸۷۵ء میں قایم کیا جو بعد میں ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا۔ مسلم قوم پسندی کے تئیں انھوں نے
مشنریوں کے اعتراضات کا جواب لکھنے کے لیے جد و جہد کی اور اسلام کا دفاع کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کے لیے حکومت
سے آسانیاں حاصل کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ اخلاقی قدروں کے فروغ کے لیے انھوں نے سادہ اردو میں اخلاقی
مضامین لکھے اور لکھوائے اور رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اے۔ ایم۔ او کالج علی گڑھ شروع سے ہی حکومت کی سرپرستی کا
حامل رہا۔ آج آزاد ہندوستان میں اے ایم یو کو سالانہ بیس کروڑ سے زیادہ کی سرکاری امداد ملتی ہے جس سے کوئی چھ ہزار
ملازمین کی تنخواہیں دی جاتی ہیں اور بیس ہزار سے زیادہ طلبا اور طالبات کی پڑھائی، ان کے رہنے وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے۔
علی گڑھ کالج نے انگریزی ذریعہ تعلیم مانا اور شروع سے ہی کلاسیکی ادب کے ساتھ جدید علوم بہ شمول ریاضی وغیرہ کے پڑھانے
کا بندوبست کیا۔ رفتہ رفتہ جدید سائنس اور پھر انجینیرنگ، میڈیکل اور دیگر متعدد علوم و فنون کے شعبے یکے بعد دیگرے کھلتے گئے
اور آج اے ایم یو ایک وسیع ادارہ ہے جہاں پڑھائی کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر تحقیق کا کام بھی کیا جا رہا ہے۔

دینیات بھی علی گڑھ میں شروع سے ہی پڑھائی جاتی رہی مگر چھوٹے پیمانے پر۔ تھیالوجی (دینیات) کے معاملات میں
بھی سر سید نے عقل کے استعمال پر زور دیا اور ایک جدید لبرل ذہن بنانے کی تلقین کی۔ سر سید چاہتے تھے کہ آزادانہ سوچ کو

فروغ دیں اور یوں اجتہاد کی اہمیت [illegible] دیا۔ انھوں نے فرقہ بندی کی جگہ انسانیت پر مبنی رشتوں کو سراہا۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی طرایق کی جگہ انھوں نے کئی بار اپنی عقل سلیم سے معاملات اخذ کرنے کی تلقین کی۔ اس کے علاوہ حدیث کے معاملے میں بھی انھوں نے تلقین فرمائی کہ بہت ہی کم حدیثیں درست اور قابل اعتماد کہی جا سکتی ہیں اور بخاری اور مسلم کے انتخاب کے مقابلے میں انھوں نے عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر حدیث کے مضمون کی سچائی ماننے پر زور دیا۔ تصوف کی حد تک عقلیت کے استعمال کو ہی ترجیح دی اور فنافی اللہ کے خیال اور فقیرانہ طرز زندگی کو غیر معتبر قرار دیتے ہوئے تلقین فرمائی کہ جہاں اسلامی احکامات واضح نہ ہوں تو جدید طریقے ہی اپنانا بہتر سمجھا جانا چاہیے۔ جبر کے مقابلے سر سید احمد خاں نے قدر پر زور دیا۔ انسان اپنی عقلِ سلیم کی روشنی میں اپنی زندگی بہتر طور پر گزار سکتا ہے۔ سر سید احمد خاں نے باور کرانے کی کوشش کی کہ قرآن حکیم میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو فطرت کے قوانین کے موافق یا اُن کے اثبات میں نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ قرآن میں جو معجزات کا ذکر ہے اسے مجازی یا اسطوری طرز پر سمجھنا بہتر ہوگا کیوں کہ ما فوق الفطرت مظاہر کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ان کے بقول پیغمبر نے کہا تھا کہ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان فانی ہوں۔ سر سید احمد خاں کے مطابق عقلِ سلیم اول درجے کی اہمیت کی حامل تھی اور جو باتیں عقل تسلیم نہیں کرتی تھی وہ قابل رد ہوتی ہیں۔ سر سید پر مختلف طرف سے نیچری اور کافر ہونے کا الزام تک لگایا گیا جو ایک افسوس ناک امر تھا، کیوں کہ اس سے سر سید کو یقیناً تکلیف ہوئی ہوگی۔ سر سید احمد خاں ریاستی نظام کی حد تک سیکولر خیالات رکھتے تھے۔ اس طرح سر سید احمد خاں نے برطانوی عہدے داروں سے تعلقات قایم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا اور اے ایم او کالج کے پرنسپل بھی کرسچین انگریز مقرر کیے گئے۔ سر سید احمد خاں نے نہ صرف برطانوی حکومت کی تعریف کی بلکہ برطانوی کلچر کو مثالی کلچر قرار دیتے ہوئے اس کے متعدد پہلوؤں کو اپنانے کی مسلسل تلقین فرمائی۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے کانگریس اور سیاست میں شریک ہونے کی مخالفت کی اور اسی طرح اردو کو دیو ناگری ہندی پر ترجیح دی۔ سر سید کا خیال تھا کہ خلافت ہندوستانی مسلمانوں کے لیے دو اعتبار سے خاص طور پر مضر ادارہ ہے۔ اول تو اس لیے کہ یہ اُن کا خیال تھا کہ اصل خلافت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تیس برس کے اندر ہی ختم ہو چکی تھی اور عثمانی خلیفہ سے وفاداری بے معنیٰ سی چیز ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے مسلمانوں کے ہندوستانی قوم ہونے اور ہندو مسلمان تعاون کے ہونے پر عثمانی خلیفہ کی وفاداری سے مضر اثر پڑتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی مسلمان بجائے عثمانی سلطان عبد المجید (۱۸۳۹ء تا ۱۸۹۱ء) کی اطاعت کے تاجِ برطانیہ کی وفادار رعایا کہلانے کو ترجیح دیں۔ سر سید نے بہت کچھ لکھا ہے اور وقت کے ساتھ ان کے بعض خیالات بدلتے بھی گئے۔ مثلاً شروع میں وہ اردو میں جدید علوم پڑھوانے کے قایل تھے مگر بہت جلد انھوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور انگریزی ذریعۂ تعلیم اپنا لیا۔ اسی طرح جہاں وہ شمالی ہندوستان کے مسلمان کی شناخت اور کلچر کو جدید طرز پر ڈھلتے ہوئے اس کی انفرادیت کو برقرار رکھنا بھی چاہتے تھے وہاں وہ ہندو اور مسلم کو دو ایسی قومیں بتاتے تھے جو ہندوستان کو اگر ایک دلہن سمجھا جائے تو جیسے اس دلہن کی دو آنکھیں ہوتی ہیں کہ ان میں سے ایک آنکھ بھی نہ ہو تو دلہن بھینگی کہلائے گی۔ سر سید کا مزاج جیسا کہ اوپر لکھا ہے دراصل سیکولر ہی تھا اگرچہ وہ ہندو اور مسلمان کو دو الگ الگ قومیں ہی سمجھتے تھے۔

آخر میں میرے خیال میں ہم اہم باتوں کا خلاصہ یوں کر سکتے ہیں۔

ندوۃ العلماء میں منقولات کے نصاب کے ساتھ ساتھ عربی زبان و ادب کی تحصیل اور ترویج پر زور دیا گیا تھا۔

۲۔ علی گڑھ اور ندوۃ العلماء ہر دو کو برطانوی حکومت یا برطانوی دور کے عہدے داروں کی ہمدردی اور مالی اعانت ملتی رہی اور فی الحال ہندسرکار علی گڑھ کو بڑی گرانٹ دیتی ہے جب کہ ندوۃ العلماء، رابطۂ اسلامی کے ذریعے امیر عرب ممالک سے مالی امداد پا رہا ہے۔

۳۔ دلی سے جب مسلم مرکز اقتدار لکھنؤ آیا تو اسلامی درس وتعلیم کا بڑا مرکز فرنگی محل بن گیا جہاں درس نظامی پڑھایا جاتا تھا جس میں قدیم طرز کی منطق وغیرہ بھی پڑھائی جاتی تھی۔ ندوہ اور دیوبند کی تحریکوں نے درس نظامی کو نشانۂ تنقید بنایا اور اپنے نصاب میں قرآن حدیث کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ اور عربی ادب وغیرہ شامل کیا اور اپنا رُخ عربستان کی طرف رکھا جب کہ علی گڑھ میں مغربی کلچر کی خوبیاں اپنانے کو اولیں ترجیح دی جاتی تھی۔ دیوبند کا رُخ اردو زبان کے ساتھ ساتھ ہندوستانیت کی طرف نسبتاً زیادہ رہا۔

۴۔ جہاں ندوہ اور دیوبند، فرنگی محل کے دینی نصاب کی تشکیل شدہ شکل کے ساتھ فرنگی محل کے جانشین بنے وہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جدید علوم کے نصاب کے ساتھ فرنگی محل کے معقولاتی نصاب کی دور حاضر میں جانشین کہلائی جا سکتی ہے۔ کچھ فرنگی محلیوں نے اب ندوہ کا رُخ کیا ہے تو کئی ایک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فروغ میں اہم حصہ ادا کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔ باقی فرنگی محل میں آج بھی فارسی میں مہارت کی روایت زندہ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

۵۔ ابھی بھی ایک ایسے ادارے کی ضرورت باقی ہے جو اردو میں جدید علوم کی اشاعت اور تعلیم وتدریس کا اہتمام کرے، کیوں کہ دیوبند میں بھی جدید علوم کا کوئی انتظام نہیں ملتا۔ مجوزہ اردو یونیورسٹی شاید اس ضرورت کو پورا نہ کر سکے۔ اس کے لیے شاید ایک ایسا ادارہ چاہیے جو فرنگی محل، ندوہ، دیوبند اور علی گڑھ کی صحت مند اقدار سے ترکیب پایا ہو۔ جہاں اپنی زبان میں سائنس کے اپنے خیالات کا گہرائی سے اظہار خیال ہو سکے اور جہاں فکر ایک ایسی سطح پر پہنچ سکے کہ سارے عالم کے لوگ دور دور سے یہاں آئیں اور فکر کے ان موتیوں سے اپنی اپنی جھولیاں بھر لیا کریں۔ اس میں فرنگی محلی علمیت، دیوبند کی سادگی اور قومیت، ندوہ کی بین الاقوامی اہمیت اور علی گڑھ کی حقیقت پسندی سبھی شامل ہوں گی۔ اس کام کو مزید آگے بڑھانے کے لیے ہمیں ایک طرف سائنس کی معنویت اور نوعیت کو واضح کرنا ہوگا تو دوسری طرف دین کو اس کے پورے پس منظر میں سمجھنا بھی ضروری ہوگا۔ یہ کام برابر جاری ہے اور انشاء اللہ اس پر آئندہ مزید وضاحت ہوتی رہے گی۔

پروفیسر بدرالدین الحافظ ٭

قرآن کریم اور سب کے لیے تعلیم کا منصوبہ

آج بین الاقوامی سطح پر تمام ممالک میں "سب کے لیے تعلیم" کے عنوان پر مختلف سیمینار منعقد کیے جار کروڑوں روپے کے خرچ سے تعلیم بالغان اور غریبوں کے لیے عام تعلیم کی کوششیں کی جارہی ہیں جو ترقی یافتہ دور ذرا پندرہ سو سال قبل کے اس دور پر نگاہ ڈالیے جب عرب کے ریگزاروں میں جہاں عام طور پر پڑھنے پڑھا نہ تھا، صرف شعر و شاعری اور خطابت سرمایۂ افتخار سمجھے جاتے تھے، اس عالم میں جب نبی برحق حضرت محمد مصطفیٰ پر قرآن کریم کی سورہ علق کا نزول ہوا تو اس کی ابتدا لفظ "اقرأ" "پڑھ" سے ہوئی اور صرف یہی نہیں بلکہ ان میں جو اس سورہ اور قرآن کریم کی اوّلیں آیات ہیں، دو جگہ "اقرأ" اور دو جگہ "علم" "اس نے سکھایا" کے گئے گویا ۵ آیات میں چار الفاظ پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے سے متعلق تھے، اور اسی ذیل میں "جس نے سکھایا قلم کے ذریعے" کہہ کر اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا تھا کہ تعلیم کا پہلا ذریعہ اگر پڑھنا ہے تو قلم ہے۔ اسی ذیل میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کی پہلی پکار "اقرأ" پر جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر ظاہر کیا کہ میں لکھا پڑھا ہوا نہیں ہوں تو حضرت جبریل علیہ السلام نے یہ سننے کے باوجود پھر کہ حضرت محمد صلعم نے جب دوسری بار بھی معذرت ظاہر کی تو بھی حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنا مطالبہ جاری رکھا اضافے کے ساتھ۔ اب آپ نے کہا "پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے سب کو پیدا کیا۔" اس جملے میں ایک اور تخلیق عالم کی طرف اشارہ بھی۔ یعنی جس پروردگار نے سارے عالم کو عدم سے وجود بخشا، تخلیق عالم کا وہ اَن پڑھ کو تعلیم یافتہ نہیں بنا سکتا، اس نے اگرچہ عوامی علم کے لیے قلم کو ذریعہ اور واسطہ بنایا مگر وہ اس کا محتاج نہیں چاہے تو ایک اُمّی کو جس کا نہ دُنیا میں کوئی استاد بنا نہ اس نے قلم کا ذریعہ اختیار کیا اس کو اپنے فضل و کرم سے کے سارے علوم کے خزانے عطا کر دے۔

میرے خیال میں قرآن کریم کی ان ابتدائی آیات میں "سب کے لیے تعلیم" کی اہمیت پر جو بنیادی اشارے رہتی دُنیا تک ایک مشعل راہ کا فرض انجام دیتے رہیں گے۔ اس کے بعد سورۂ الرحمٰن کی آیت میں ہمیں علم حاصل ذریعے "بیان" کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے بیان کی قوت اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ انسان کے لیے تعلیم ضروری اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے پڑھنا لکھنا اور بیان کرنا لازمی ہے

٭ مکان نمبر ۱۵۵۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

اس کے بعد آج کی ترقی یافتہ الیکٹرانکس کی دُنیا میں ذرائع ابلاغ عامہ یا ماس کمیونی کیشن کے لامتناہی پھیلے ہوئے ریڈیائی شعاعوں کے جال پر آپ غور کریں تو قرآن کریم کے ان ہی تین بنیادی ذرائع تعلیم کا جلوہ نظر آئے گا، انہی کے محور پر مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک کی دُنیا سمٹ کر ایک شہر یا گاؤں بن چکی ہے، دن رات ہم دیکھتے ہیں چاہے وہ لاتعداد زبانوں کے رسائل و اخبارات یا کتابوں کے بحر بے کراں ہو اُن میں باہم پیغام رسانی کا ذریعہ تو وہی قلم، تحریر یا تقریر ہے صرف ذریعہ ابلاغ تیز سے تیز تر ہو گیا ہے۔ پہلے زبان و بیان یا تحریروں کا سفر اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعے ہفتوں اور مہینوں میں طے ہوتا تھا اب وہی قلمی تحریر چند سکنڈ میں فیکس کے ذریعے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ اس طرح گوناگوں صلاحیت، قابلیت اور اہلیت کی بے مثال شخصیات سب مطالعہ تحریر اور تقریر یا زور بیان ہی کے ذریعے اس روئے زمین پر اپنے جوہر دکھاتی نظر آتی ہیں۔

یہ ہے قرآن کریم کا وہ عالمی تعلیمی پیغام جس نے صرف پڑھنے لکھنے ہی کی طرف متوجہ نہیں کیا بلکہ سورہ علق کی ان ہی ۵ آیات میں خلقتِ انسانی اور سارے عالم کے عدم سے وجود میں لانے کا ذکر کر کے خالق کائنات اور اس کی ان گنت مخلوق پر غور کرنے کی دعوت دے دی۔ ذہنوں میں ایک ہلچل مچا دی، فکری قوت کو جھنجھوڑ دیا، سائنس کی مختلف شاخوں کے دروازے کھول دیے اور کھلا اعلان کر دیا کہ پڑھو اور اس عالم ارض و سما، سمندر و صحرا، پہاڑ و رہ گزر ہر ایک کی کھوج میں سرگرداں ہو جاؤ تاکہ تمہارے علم میں اضافے کے ساتھ قدرت کی بے پناہ نشانیوں پر یقین حاصل ہو جائے اور تم ایک لازوال قوت ایک محور سے وابستہ رہتے ہوئے اشرف المخلوقات قرار دیے جانے کے مظہر بن سکو۔

قرآن کریم کی عمومی تعلیم اور خصوصی مطالعہ

اِسلام اور قرآن کی تاریخ تو یکساں ہی شروع ہوتی ہے جو عملاً اس دعوے کی دلیل ہے کہ قرآن کریم "سب کے لیے تعلیم" کا پہلا علم بردار ہے۔ اس سلسلہ میں تاریخ شاہد ہے کہ مختلف تاجروں اور سیّاحوں کے ذریعے دنیا کے جس گوشے میں اِسلام کی شعاعیں پہنچیں وہاں ساتھ ہی کلام اللہ کی تعلیم کی اشد ضرورت محسوس کی گئی کیوں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد نماز کا ادا کرنا اوّلین فریضہ ہے اور نماز بغیر قرآن کے ممکن ہی نہیں ہے چاہے وہ جزوی تعلیم ہو۔ اس طرح جس نے اِسلام قبول کیا اس نے کچھ نہ کچھ قرآن کریم پڑھا اور یاد کیا۔ اس کے بعد قدرتی طور پر قرآن سیکھنے والے کے دل و دماغ میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ وہ اس کو اپنی استطاعت کے مطابق سمجھے اس طرح قرآن کے ذریعے دُنیا کے کونے کونے میں عربی زبان پہنچی اور ایک دینی ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے لوگوں میں اس کے سیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے ہر ملک میں ہر مسلمان کو اپنی مادری زبان کے علاوہ ایک نئی زبان سے کسی نہ کسی درجے میں واقفیت حاصل ہو گئی اور اسی کے ذیل میں "تجوید" یعنی قرأتِ قرآن کا صحیح طریقہ تلفظ کی درست ادائیگی مخارج اور دیگر اصول و قواعد کا علم حاصل ہوا اور اس مقصد کی خاطر گاؤں گاؤں شہر شہر ناظرہ کلام پاک کے مکاتب قایم ہوئے۔ معمولی اخراجات پر ان میں تعلیم ہونے لگی اور رفتہ رفتہ یہ نظام پورے عالم اِسلام میں جاری ہو گیا جس میں دینی مسائل اور معمولی تاریخ اِسلام وغیرہ کا درس بھی دیا جانے لگا۔ اس طرح ناظرہ کلام پاک کی تعلیم کے طفیل ہر کچھ معمولی درجے کا تعلیم یافتہ ضرور بن گیا۔

ہندوستان میں ہماری بنیادی تعلیم کا آغاز اور ہزاروں بچوں کی طرح اسی شکل میں ہوا جہاں یہ منظر بھی ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزرا کہ جو والدین اپنی لڑکیوں کو مدرسہ یا اسکول بھیجنا پسند نہ کرتے تھے وہ بھی گھر پر ناظرہ کلام پاک اور معمولی اردو فارسی پڑھا دیا کرتے تھے تاکہ لڑکیاں بہشتی زیور وغیرہ پڑھ کر زندگی کے تمام اہم مسائل سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

یہ سلسلہ آج بھی دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں جاری ہے جو مسلمان بچوں کی عمومی تعلیم کا اہم ذریعہ ہے جس غیر تعلیم یافتہ یا ان پڑھ نہیں رہتا۔

اس کے بعد دوسرے طبقہ کو ہم خصوصی زمرے میں شمار کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن فہمی اور ترجمہ کی گہرا کی صلاحیت عطا کی ہے اور غالباً اسی طبقے کو مخاطب کرکے علامہ اقبالؒ نے بھی کہا ہے ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

کیوں کہ اس طرح کے کام کے لیے تو کچھ خاص دل و دماغ مخصوص ہوتے ہیں اور یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا قرآن سے لے کر آج تک جتنے مفسرین، مترجمین اور شارحین پیدا ہو چکے ہیں ان کا شمار میں آنا ہی مشکل ہے۔

اس کے علاوہ قرآن کریم نے اپنے مطالب و معانی کو سمجھنے کے لیے اپنے الفاظ میں جو اشارے سمو دیے ہیں ان خود علوم کے سوتے کھل گئے ہیں، غور و فکر کی راہیں نکل آئی ہیں۔ مثلاً سورہ "القریش" جیسی مختصر سورہ کی ابتدائی د میں قبیلۂ قریش کی سردی اور گرمی کے سفر سے انسیت کا ذکر، یہ سفر کیوں، کس سمت میں اور سردی گرمی میں میں تھا تو کیوں تھا۔ ہر قاری کو دعوت دیتا ہے کہ اس کی تاریخی اور جغرافیائی معلومات حاصل کرے۔ سورہ الرحمٰن کی آ میں موتی اور مونگے کا ذکر سمندری معلومات، وہاں کی مخلوق اور پانی میں بسی ہوئی ایک نرالی دنیا کا حال جاننے دلاتا ہے۔ پھل پھول، سبزیاں اور مختلف درختوں کا تذکرہ، نباتات کی تحقیق پر ذہن کو آمادہ کرتا ہے۔ عاد و ثمود، اصحٰب السبت، اصحٰب الفیل اور اصحٰب کہف نیز دیگر اقوام کا ذکر ان کے محل وقوع اور زمان و مکان معلوم کرنے کی جستجو ہے۔ قرآن کریم میں انبیاء کرام کے واقعات صرف ان کے حالات کا آئینہ نہیں ہیں بلکہ اپنے عہد کے سیاسی، اقتصادی، سماجی کتاب ہیں جن کا تحقیقی مطالعہ کرتے ہوئے ہر ذوق کا ریسرچ اسکالر ایشیا اور افریقہ کے بحر و بر، کوہ و صحرا کا احاطہ کر سکتا ہے

یہ تو محض چند اشارے ہیں ورنہ قرآن کریم کے علوم کو ایک مختصر مضمون میں سمیٹ لینا ممکن ہی نہیں ہے۔ ہاں اب باقی رہ جاتا ہے کہ ہم نے موجودہ دور کے منصوبہ "سب کے لیے تعلیم" کے مقابلے میں قرآنی تعلیم کا موازنہ کرنے کی جو کوشش اس میں عمومی اور خصوصی تعلیم کا فرق نمایاں نظر آتا ہے۔ یعنی قرآنی تعلیم عالمی ضرور ہے مگر صرف مسلمانوں کے لیے اور سب کا منصوبہ بلا تفریق مذہب و ملت ہے۔ اس سلسلہ میں ایک جواب تو یہ ممکن ہے کہ قرآن کریم کا نزول صرف مسلمانوں نہیں ہوا بلکہ ساری دنیا قیامت تک کے لیے اس کی مخاطب ہے اور اسی مفہوم میں قرآن کریم نے "یا ایھا الناس" کہہ کر سب کو مخاطب کیا ہے اور سب کو برائیاں چھوڑنے اور پرہیزگار بننے کی دعوت دی ہے۔ اسی لیے جو اسے قبو وہی استفادہ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآنی علوم کا مطالعہ کرنے میں غیر مسلموں نے جو حصہ لیا ہے اور جاں فز نتائج پیش کیے ہیں۔ وہ مسلم محققین سے بھی بعض جگہ بڑھ گئے ہیں جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "عربوں کے تجارتی راستوں اور تجارتی اشیاء پر یونانی محققین کا کام ملتا ہے۔ اس گوشے میں عرب علماء نہیں آتا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی علوم کی دعوت عام ہے۔ اس سے مسلم اور غیر مسلم سب ہی استفادہ کر اور کرتے رہے ہیں۔ اس طرح اس کا عمومی اور دائمی فیض عام ہے۔

محمد جنید خاں رام پوری*

مغلیہ کتب خانے کا بانی ــــ بابر

ظہیرالدین محمد بابر (۱۴ فروری ۱۴۸۳ ــــ ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء) کو ایک عظیم فاتح، زبردست مدبّر اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بانی کی حیثیت سے تو ہم جانتے ہیں لیکن ایک عظیم شاعر، بہترین منجم او رمصور، ایک شاندار خوش نویس، ایک زبردست نثر نگار، ایک عمدہ ادیب اور سلطنت مغلیہ کے پہلے کتب خانے کے بانی کی حیثیت سے ہم اس کے کارناموں سے بخوبی واقف نہیں ہیں۔ اُس کے موخر الذکر کام کے سلسلے میں اب تک کم ہی لکھا گیا ہے۔

ظہیرالدین محمد بابر۔ شیخ عمر مرزا کی آٹھ اولادوں، پانچ لڑکیوں اور تین لڑکوں، میں سب سے بڑا تھا۔ شیخ عمر مرزا خود بھی علم دوست، عالم باعمل، انتہائی دین دار، خوش عقیدہ، پابند مذہب اور سچے مسلمان تھے۔ دنیاوی معاملات اور کاروبارِ سلطنت میں مشغولیات کے باوجود نماز روزہ کے سخت پابند تھے۔ دینی اور مذہبی اُمور میں بھی اُن کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ علم مروجہ اور خصوصاً علم طب، نجوم ہیئت، شاعری وغیرہ سے خصوصی شغف تھا۔ اپنے دور کے علماء، عابد و زاہد لوگوں، شعراء اور صوفیائے کرام کا ایک وسیع طبقہ ان کے مقربین میں شامل تھا۔ اپنے والد کی ان ہی خصوصیات کا بابر نے تزک بابری میں اس طرح ذکر کیا ہے:

> "ان کے اخلاق و اطوار یہ تھے۔ حنفی مذہب اور خوش اعتقاد آدمی تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے قضائے عمری سب ادا کر دی تھی۔ بیشتر قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے مرید تھے۔ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت خواجہ بھی ان کو فرزند کہا کرتے تھے۔ وہ خاصے پڑھے لکھے تھے۔ خمسین (خمسہ نظامی و خمسہ خسرو) مثنوی مولانا رومی اور تاریخ کی کتابیں ان کے مطالعے میں رہتی تھیں۔ شاہ نامہ بہت دیکھا کرتے تھے۔ اگرچہ موزوں طبیعت تھے مگر شعر گوئی پر توجہ نہیں کرتے تھے۔"

شیخ عمر مرزا نے اپنے ہونہار بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنے مقربین میں سے جید علماء شیخ فرید بابا قلی، قاضی عبداللہ اور مولوی فرید بیگ کو متعین کیا۔ دوسری طرف تلوار زنی، گھڑ سواری، تیراندازی وغیرہ کی تربیت کے لیے بھی عمدہ شہسواروں اور بہترین تیراندازوں کو مقرر کیا۔

---

* روم نمبر ۹۲۔ عثمانیہ اپر، ایس۔ایس ہال نارتھ، اے۔ایم۔یو۔ علی گڑھ۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، ستمبر ۱۹۹۵ء

بابر کو ذہانت اور فطانت باپ سے ورثے میں ملی تھی، اس لیے کچھ ہی عرصے میں بہترین اساتذہ کی توجہ سے نکھار آنا شروع ہوگیا اور اس کی علمی صلاحیتیں اُجاگر ہونا شروع ہوگئیں۔ شیخ فرید بیگ بہت سے شاہ زادوں کے ا انھوں نے شاہزادہ بابر پر خصوصی توجہ دینی شروع کی۔ ان کی توجہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی بابر میں علمی صلاحیتیں فروغ پا۔ اور شائستگی، اخلاق و اطوار کی درستی قابلِ رشک ہوگئی۔ اپنے استاد شیخ فرید بیگ کے انداز گفتگو اور شائستگی۔ تک متاثر کیا تھا کہ اس نے اپنی توزک میں مہربان استاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ان کے قاعدے قرینے بہت اچھے تھے۔ شیخ عمر مرزا (والد مرحوم) کی سرکار میں اُن سے بڑا کوئی دو سہ امیر نہ تھا۔ وہ میرے پہلے اتالیق تھے۔"

ایک دوسرے استاد خواجہ قاضی عبداللہ انتہائی زیرک، متقی، عالم باعمل اور بہادری وحق گوئی میں بے مثال کا اثر بابر کی زندگی پر بہت گہرا پڑا تھا۔ علم وہنر میں دلچسپی، شعرگوئی، ادبی لطافتیں، عبادت و ریاضت میں دلچسپی رکھ جانے پر ثابت قدمی یہ تمام اوصاف ظاہری و باطنی خواجہ قاضی عبداللہ کے ہی فیضان کا نتیجہ تھے۔ ان شفیق میں بابر رقم طراز ہے:

"مجھ کو قاضی خواجہ کے ولی ہونے میں کچھ شک نہیں ہے۔ مولانا مرحوم عجیب شخص تھے۔ ڈر اور خوف تو ا میں نام کو نہ تھا۔ ایسا دلیر آدمی نہ دیکھا، نہ سنا۔ یہ صفت بھی ولایت کی دلیل ہے۔ دنیا دار کیسے بہادر ہوں مگر کچھ دھڑکا اور اندیشہ رہتا ہے، خواجہ اس سے بالکل پاک تھے۔"

فرید بابا قلی سے بابر نے گلستان سعدی، بوستان سعدی، خمسہ نظامی گنجوی، خمسہ خسرو دہلوی، قرآن کر، تفاسیر اور احادیث نبوی کی تکمیل کی۔

شاعری کا ذوق وراثتاً تھا۔ باپ شیخ عمر مرزا اور دادا سلطان ابوسعید مرزا سے پایا تھا۔ بابر خود شعر کہتا تھا شعرائے کے کلام کا مطالعہ کرتا تھا۔ کلام میں روانی، شیرینی، بے ساختگی، موزونیت اور شیفتگی اس کثرتِ مطالعہ کی کر وہ دیگر شعرائے کے کلام کا کیا کرتا تھا۔ زیادہ تر غزلیں، مثنویاں ترکی زبان میں ہیں لیکن بابر کے اشعار فارسی زبان میں میں ملتے ہیں۔ زبان دانی کے اعتبار سے بابر ترکی، فارسی، عربی اور پشتو زبانوں پر مکمل قدرت رکھتا تھا۔ اس۔ نسخہ جس میں اس کے اپنے ہاتھ بھی کچھ اشعار ہیں رام پور کی رضا لائبریری میں موجود ہے۔ ایک مثنوی جو زبان اور اس میں مذہبی، اخلاقی اور فقہی مسائل پر دو ہزار اشعار ہیں "مثنوی مبین" کے نام سے تحریر کی ہے۔ مزی وجودیہ جو اس کے پیرو مرشد خواجہ عبیداللہ احرار کی تصنیف ہے اس کا منظوم ترجمہ "رسالہ وجودیہ منظوم" کیا۔ علم عروض میں "رسائل عروض" نام سے ترکی شاعری پر ایک بہت اہم کتاب لکھی جو آج بھی افا اس دور کی شاعری پر بہت وقیع سمجھی جاتی ہے۔

غرض بابر کو سب سے زیادہ شوق کتب بینی اور کتب جمع کرنے کا تھا۔ اُس کے یہاں ہزاروں کتابیں مختلف پر موجود تھیں جن میں قرآن کریم کے مطلّا و مذہّب نسخے، حدیث نبوی، اصول حدیث، اسماء الرجال، فقہ، طب، نجوم، ہیئت، علم کلام، منطق، فلسفہ، علم اخلاق، ریاضی، مصوری، جغرافیہ، ادب، نثر، نظم، کیمیا، طبیعیات اور دیگر موضوعات پر بے شمار مخطوطے اس کی لائبریری کی زینت تھے۔

اس کی لائبریری کے قیام کا حوالہ ہمیں اس کے اس بیان سے ملتا ہے:

"جمعہ کے دن تیئسویں تاریخ جسم میں ایسی حرارت معلوم ہوئی کہ جمعہ کی نماز مسجد میں مشکل سے پڑھی گئی۔ ظہر کے بعد احتیاطاً "کتب خانے" میں گیا۔ بہت دیر تک بے چینی رہی۔ دوسرے دن ہفتہ کو بخار ہوا۔ کچھ جاڑا بھی چڑھا۔ سہ شنبہ، ۲۷ ویں صفر کی رات کو دل میں آیا کہ خواجہ عبیداللہ احرار کے رسالہ والدیہ کو نظم کروں۔ حضرت خواجہ کی دُعا سے ملتجی ہوا اور دل میں دعا کی کہ یہ نظم مقبول ہو۔"

اس کے کتابیں جمع کرنے کے ذوق کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے۔ جب بابر نے پنجاب پر حملہ کیا اور ایک خونریز جنگ کے بعد وہاں کے امیر محمد غازی خاں کو شکست دی تو اس نے غازی خاں کے کتب کے ذخیرے کو تلاش کرنے کا حکم دیا جس کی شہرت وہ سُن چکا تھا۔ فوج مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف تھی لیکن بابر کا ذوق علم اس کی لائبریری کی جستجو میں تھا۔ جب اس کو کتابیں مل گئیں تو اس کو اتنی خوشی مالِ غنیمت کے ملنے پر نہیں ہوئی جتنی کتابوں کی دستیابی پر ہوئی۔ اُن کتابوں میں سے اُس نے کچھ اپنی لائبریری کے لیے منتخب کیں، کچھ اپنے بیٹوں نصیرالدین ہمایوں اور مرزا محمد کامران کو عنایت کیں اور کچھ اپنی علم دوست بیٹی گلبدن بیگم کی لائبریری کو عطا کیں۔

بابر کی لائبریری میں جن مصنفین کی کتابیں تھیں اُن میں علمائے کرام، صوفیائے عظام، اطبائے کبار، منجم، ہیئت داں شعراء، جغرافیہ داں، مورخین، فلاسفہ، محدثین، مفسرین وغیرہ شامل تھے۔ ہر موضوع پر اُس کے کتب خانے میں کتابیں بہت اچھی ترتیب، بہترین کتابت، عمدہ جلد بندی کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ بابر اپنے یہاں لائبریری میں موجود بعض اہم کتابوں کے نسخے نقل کرانے کے بعد اہلِ علم، علماء، امراء، شاہزادوں اور بعض دیگر سلاطین کو "تحفتہً" بھیجا کرتا تھا۔ تاکہ علم میں وسعت ہو اور لوگوں میں لائبریری قائم کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

اپنی لائبریری میں موجود بعض اہم تصانیف پر بابر نے بہت اچھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ مثلاً شیخ الاسلام سیف الدین کی تصانیف پڑھ کر وہ بہت متاثر ہوا اور ان کے بارے میں تزک بابری میں تحریر کیا ہے کہ:

"وہ علم معقول و منقول سے خوب واقفیت رکھتے تھے۔ بڑے پرہیزگار اور متدین عالم تھے شافعی تھے مگر ہر مذہب کی رعایت کرتے تھے۔ ستر برس تک انھوں نے جماعت سے نماز ایک روز بھی قضا نہ کی۔"

میر جمال الدین علم حدیث کے ایک زبردست عالم تھے۔ ان کی حدیث کی چند کتابیں بابر کی لائبریری کی زینت تھیں۔ ان کے علم کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے:

"خراسان میں علم حدیث کا جاننے والا میر جمال الدین جیسا کوئی نہ تھا۔"

علی شیر بیگ کا ایک دیوان بابر کی لائبریری میں تھا۔ ترکی زبان میں اس کا دیوان بہت وقیع اور علمی حیثیت کا ہے۔ اس کے بارے میں تعریفاً لکھتا ہے:

"علی شیر بیگ بے نظیر آدمی تھا۔ ترکی زبان میں شعر کہتا تھا اور ایسا کہتا تھا کہ دوسرا کوئی کیا کہے گا۔"

آصفی بابر کے دور کا مشہ... گزرا ہے۔ بابر نے اس کے کلام کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔
... تحریر کرتا ہے:

"آصفی کے اشعار بامعنیٰ اور رنگین ہیں۔ عشق وحال دونوں میں کورا تھا"

ابر کی لائبریری میں جن مشہور مصنفین کی معروف کتابوں کا پتہ ہمیں تزک بابری سے ملتا ہے، ان
اس طرح ہیں:

سعدی شیرازی کی گلستاں و بوستاں، نظامی گنجوی کی خمسہ، مثنویاں اور دیگر کتابیں خسرو کی تمام تصانیف، ملفوظات تیموری، تزک تیموری، شرف الدین یزدی کی ظفر نامہ، مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی اور دیوان، نظام الدین شامی کی ظفر نامہ شامی، ابوعمر منہاج الجوزجانی کی طبقات ناصری، علامہ تفتازانی کی تمام تصنیفات، ملا سیف الدین کی جملہ تصانیف، شیخ ملا حسن کی علم کلام اور منطق و فلسفہ کی کتابیں، میر عطاء اللہ مشہدی کی ادب، عروض اور شاعری پر کتابیں علی شیر بیگ نوائی کے دیوان اور مثنویاں، سہیم بیگ کا مجموعہ کلام، آصفی کا مجموعہ کلام، دیوان صیفی بخاری اور رسالہ علم عروض صیفی مشہدی، یوسف بدیعی کی قصاید، ملا محمد بدخشی کا رسالہ معما، دیوان ہلالی، شاہ حسین کافی کا شعری مجموعہ۔

یہ ان کتابوں کی مختصر فہرست ہے جو ہر وقت سفر و قیام میں بابر کے مطالعے میں رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ جو مختلف علوم وفنون پر مشتمل تھے، اس کی لائبریری کی زینت تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے اپنی اولاد ہما اور گلبدن بیگم کو علم کی ایسی دولت سے نوازا تھا کہ ان تینوں کی لائبریریاں بھی بہت عظیم، وسیع اور بن گئی تھیں۔

بابر کی مشہور تصنیف تزک بابری جس نے عالم گیر شہرت حاصل کی بابر کی بہترین تصنیف شمار کی جاتی۔ بابر کی زندگی کے معمولی اور بڑے سے بڑے واقعات درج ہیں۔ طرز تحریر نہایت سادہ، شگفتہ و دل اس نے ان واقعات کے بیان کرنے میں ایسی طرز کو اپنایا ہے جیسے جو کچھ وہ تحریر کر رہا ہے پردۂ سیمیں پر قا ہے۔ واقعات کی سچائی اور صفائی کا خاص اہتمام کیا ہے۔

سوانح بابر میں ولیم ارسکن تزک بابری کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"بابر کی تزک اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب وغریب ہے۔ جن حالات میں وہ لکھی گئی وہ اور تعجب خیز ہیں۔ اس کے جذبات بالکل فطری نظر آتے ہیں اور ان میں کوئی تصنع و تکلف نہیں ہے"

ہنری ایسٹ نے تزک بابری کے سلسلے میں لکھا ہے:

"یہ کتاب نہ صرف تاریخی واقعات کے لیے اہم ہے بلکہ اس میں بہت سی معلومات ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہنشاہ کس قدر غیر معمولی دماغ کا آدمی تھا اور اس کا مشاہدہ کتنا قوی تھا"

بابر نے ایک خاص خط تحریر بھی ایجاد کیا تھا۔ یہ طرز تحریر خط نسخ کے مشابہ تھا۔ اس طرز تحریر میں اس نے

تحریر کر کے ملکہ معظمہ کبھی ارسال کیا تھا۔ تزک بابری میں اس ایجاد خط کا تذکرہ موجود ہے۔ چونکہ یہ خط اپنی بناوٹ اور طرز کے اعتبار سے دشواری سے لکھا جاتا تھا اس لیے کچھ زیادہ رواج نہ پاسکا۔ اکبر کی حکومت کے ابتدائی دور میں اس خط بابری کا ماہر میر عبدالحئی مشہدی گزرا ہے جس کو اس خط پر کمال حاصل تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ "یہ خط بابری، عہد اکبری میں ختم ہوگیا تھا"۔

بابر لڑائی کے لیے میدان جنگ میں جاتے وقت ایک قمیص پہنا کرتا تھا۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ جب سے اس نے اس قمیص کا استعمال شروع کیا ہے دشمن کے حملوں اور ان کی چالوں سے محفوظ رہا ہے اور مزید یہ کہ اس کو میدان جنگ میں فتح ضرور حاصل ہوئی ہے۔ اس قمیص کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر پورا قرآن کریم تحریر ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ۱۸۵۷ء میں یہ ایک انگریز فوجی افسر کے ہاتھ لگ گیا اور یہ قرآن کریم (قمیص) انگلینڈ منتقل ہوگیا۔ سر سید احمد خاں کے پوتے سر راس مسعود کو ان کے ایک انگریز دوست نے ہدیہ کیا اور پھر یہ نایاب قمیص ہندوستان واپس آگئی۔ اور آج یہ مولانا آزاد لائبریری کے شعبۂ مخطوطات کی زینت ہے۔ الطاف علی بریلوی نے حیات حافظ رحمت خاں میں لکھا ہے کہ اس کو روہیلہ سردار حافظ الملک حافظ رحمت خاں بھی پہنتے تھے، اور انگریزوں اور شجاع الدولہ کی فوجوں سے ۱۷۷۴ء میں جنگ کے موقع پر حافظ الملک نے اس کو زیب تن کیا تھا اور اسی کی برکت سے حافظ الملک کے جسم کے ٹکڑے ہونے سے محفوظ رہے حالانکہ ان کے سینے پر توپ کا ایک گولہ آکر لگا تھا۔ قمیص پر سامنے کی جانب ایک ہلکا کالا دھبہ آج بھی نظر آتا ہے۔

ظہیر الدین محمد بابر کے انتقال ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کے بعد اس کا یہ کتب خانہ اس کی اولاد میں تقسیم ہوگیا اور اس کی اکثر کتابیں اس کی بیٹی گلبدن بیگم کے حصے میں آئیں اور آج بھی ہند اور بیرون ہند کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔

ماخذ

۱۔ محمد فاضل خاں۔ کتب خانوں کی تاریخ۔ پاکستان

۲۔ الحاج محمد زبیر۔ اسلامی کتب خانے۔ دہلی۔

۳۔ ایل۔ ایف ولیمز۔ ظہیر الدین محمد بابر۔ انگلینڈ۔

۴۔ صباح الدین عبدالرحمٰن۔ بزم تیموریہ۔ اعظم گڑھ۔

۵۔ ظہیر الدین محمد بابر۔ تزک بابری، مترجمہ نصیر الدین حیدر گورگانی۔

۶۔ الطاف علی بریلوی۔ حیات حافظ رحمت خاں۔ کراچی، پاکستان۔

سید علیم اشرف جائسی*

فن تحقیق اور اسلام

ہم میں سے صرف عام لوگ ہی نہیں بلکہ خاصے تعلیم یافتہ لوگ بھی اس غلط فہمی کے شکار ہیں کہ علوم کے بہت سارے شعبوں کی طرح سائنٹیفک ریسرچ یا فن تحقیق و مقالہ نویسی بھی خالصتہً مغرب کی د حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ بلاشبہ اس فن کی آراستگی اور اس کے اُصول و قواعد کو سنوارنے اور نکھا مغربی دانشوروں کے سر ہی جاتا ہے۔ مگر اس فن کی بنیاد مسلمانوں نے ڈالی اور انھوں نے ہی اس کے اُصول وضوابط بنائے۔

علم حدیث کے سلسلے میں مسلمانوں کے وضع کردہ روایت و درایت کے ضوابط اور جرح وتعدیل مسلمانوں میں سائنسی تحقیق اور تصنیف وتالیف کے علمی طرز کو فروغ دیا۔

ایسے ہی علم منطق میں مسلمانوں کی دلچسپی نے بھی اس فن کو تقویت پہنچائی۔ مسلمانوں ہی نے اس استنباط کے طریقے وضع کیے، حجت و قیاس اور تمثیل و استقراء کے اُصول بنائے، قضایا کی تعریف و تق صحیح فکر ونظر کے ضوابط مقرر کیے اور تحقیق (ریسرچ) کے عمل میں منطق کے ان قواعد کی اہمیت ایک مسلمہ

”تصنیف وتالیف کے مقاصد“ فن تحقیق کا ایک اہم موضوع ہے، ہمارے اسلاف اس طور پر باخبر تھے، امام ابن حزم فرماتے ہیں:

”قابل ذکر تصنیف کی سات قسمیں ہیں اور ہر عقل مند و ذی علم شخص ان ہی میں سے کسی ایک کرتا ہے۔

(۱) ایسا نیا موضوع جس کی طرف کسی نے سبقت نہ کی ہو۔

(۲) نامکمل کی تکمیل کرنا۔

(۳) دشوار و مغلق کی شرح کرنا۔

(۴) طویل کام کو مختصر کرنا، بغیر اس کے کہ معانی و مطالب میں کوئی خلل واقع ہو۔

(۵) متفرق کو جمع کرنا۔

---

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، کلیۃ الدعوۃ الاسلامیۃ، طرابلس لیبیا۔ ایم۔ آئی۔ جی۔ ۱۱۵۹ سی، راجاجی پورم،

(۶) غیر مرتب کو ترتیب دینا۔
(۷) کسی سابق مصنف کی غلطیوں کی اصلاح کرنا۔" ۱ے

آج بھی تصنیف و تالیف کے اغراض و مقاصد یہی ہیں صرف ترجمہ اور مخطوطات کی تحقیق کا اضافہ ہوگیا "محقق یا ریسرچ اسکالر کی مطلوبہ خوبیاں اور اوصاف"، بھی فن تحقیق میں بے حد اہمیت کا حامل موضو ہے۔ اور ان اوصاف کی ایک طویل فہرست ہے جو اس فن میں گنوائی جاتی ہے، جیسے: تحقیق و انکشاف کی قدرت، وسعت اطلاع، صبر و برداشت کی صلاحیت، فکر کی گہرائی و گیرائی، تنقید کی صلاحیت، زبان و بیا پر قدرت، امانت علمی کا شعور، تواضع و انکساری، موضوعیت، غیر جانبداری، اور شجاعت وغیرہ۔

اگر ان اوصاف کا تجزیہ کیا جائے تو یہ سب چار صفتوں میں منحصر نظر آتی ہیں اور وہ ہیں: ۱۔عقل ۲۔صدق، ۳۔موضوعیت اور ۴۔وسعت اطلاع۔ ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام مالک فرماتے ہیں کہ "چار لوگوں سے علم نہیں لیا جائے گا۔ بے وقوف سے، نفس کی پیروی کرنے والے سے، دروغ گو۔ اگرچہ وہ حدیث شریف کے اعتبار سے متہم نہ ہو، اور نہ ہی اس شخص سے جو اپنی بات کو خود سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خواہ وہ متقی اور پرہیز گار ہی کیوں نہ ہو۔" ۲ے

ابن عبدالبر نے ان صفات کے ساتھ ساتھ تقویٰ، علمی مہارت اور امانت داری کو بھی محقق کے لیے ضرو صفات قرار دیا ہے۔ ۳ے

علامہ ابن رشد نے ذہانت و فطانت، انصاف پسندی اور مروت کو بھی محقق اور مصنف کی صفات میں گنوایا ہے۔ ۴ے

فن تحقیق کی روح یعنی علمی امانت داری کو مسلمان علماء و محققین کے نزدیک غیر معمولی اہمیت حاص تھی وہ اقوال و آراء کو ان کے قائلین کی طرف منسوب نہ کرنے کو علم میں بے برکتی کا موجب تصور کرتے تھے۔ ا قرطبی فرماتے ہیں،

"اس کتاب (تفسیر الجامع الاحکام القرآن) میں میری شرط یہ ہے کہ تمام اقوال و افکار کو ان کے قائلیو اور مصنفین کی طرف منسوب کیا جائے کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ قول کو قائل کی طرف منسوب کرنے سے علم میں برک ہوتی ہے۔" ۵ے

علماء مسلمین علمی "موضوعیت" (SUBJECTIVITY) کی قدر و قیمت سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ اور موضوعیت کے وسائل جیسے: قیاس و استنباط و استقصاء وغیرہ سے بھی آگاہ تھے۔ استقر ناقص، جس پر سائنس کی بیشتر تحقیقات و ایجادات کا دار و مدار ہے، کو بھی موضوعیت کے ایک اہم و کے طور پر جانتے اور استعمال کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ "غیر محصور شئی کو نقل ذریعے ثابت کرنا محال ہوتا ہے۔" ۶ے

"مقدمہ" کے بغیر آج ہم کسی تحقیقی مقالے یا علمی تصنیف کا تصور نہیں کر سکتے، اس خوش رسمی کی بن بھی مسلمانوں ہی نے رکھی، مسلمان علماء و محققین نے اپنی کتابوں پر مفصل مقدمات تحریر کیے، اور ان

تصنیف کی غرض و غایت، طریقۂ کار اور اجمالی خاکے وغیرہ کا ذکر کیا۔ اور اگر کتاب کسی خاص فن
تو ساتھ ہی ساتھ اس فن کی تعریف، اس کے موضوع کی تعیین، اس کی اہمیت وافادیت وغیرہ جنہ
عشرہ،، کہتے ہیں، کا ذکر بھی مقدموں میں کیا کرتے تھے۔ المراکشی لکھتا ہے کہ:

،،.... یہاں ایک مقدمے کا ذکر ضروری ہے جو میرے کام کی نوعیت کی توضیح کرسکے اور میں
کی بھی نشاندہی کرسکے۔ ۔ ۔ ،، ؎

مسلمان علماء و محققین کے یہاں رموز و علامات کا استعمال بھی ملتا ہے۔ کتاب میں بار بار آ
حوالوں کے لیے علماء رموز متعین کرلیا کرتے تھے۔ بالخصوص کتب احادیث میں ان رموز کی بڑی کث
جیسے بخاری شریف کے لیے ،،خ،، اور مسلم شریف کے لیے ،،م،، وغیرہ منقول عبارتوں کو بھی امتیا
سے واضح کردیا کرتے تھے تاکہ کوئی التباس پیدا نہ ہو جیسے ....آہ، یا.... الخ وغیرہ۔

مسلمانوں نے صرف فن تحقیق کے اصول وضوابط کے استعمال پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس فن پر
بھی تصنیف کیں جیسے خطیب البغدادی کی کتاب ،، تقیید العلم،، جلال الدین السیوطی کی تصنیف ،،ا
التصنیف،، اور ابن جماعہ کی کتاب ،،تذکرۃ السامع والمتکلم فی آداب العالم والمتعلم،، وغیرہ ؎

حوالہ

۱؎ رسائل ابن حزم، ۲: ۱۸۶ ومقدمہ ابن خلدون، ۱۰۲۶، معمولی تصرف کے سا
۲؎ ترتیب المدارک، ۱: ۱۲۳
۳؎ الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء، ۱۶
۴؎ فضل المقال، ۲۸
۵؎ تفسیر الجامع لاحکام القرآن، ۱: ۲
۶؎ روزنٹاک، مناہج العلماء المسلمین، ترجمہ: انیس فریحہ، ۱۱۳
۷؎ الذیل والتکملۃ، ۱: ۶
۸؎ عبد الحمید الھرامۃ، البحث والکتابۃ، ۱۷

مولانا شبیر احمد خاں غوری*

مسلمانوں کے علم ہندسہ کی ثروت

وہ فریب خوردہ شاہین کہ پلا ہو کرگسوں میں　　اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

مسلمانوں نے علم ہندسہ (جدید اصطلاح جیومیٹری) کی ترقی میں جو خدماتِ شائستہ انجام دی ہیں وہ سائنسی عالمی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہیں مگر ان کے اخلاف اس سے بے خبر ہیں۔ حالانکہ قوموں کے شاندار مستقبل کی تعمیر کے لیے اُن کے شاندار ماضی کی واقفیت اشد ضروری ہے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یورپی اقوام کا اپنے نشاۃ ثانیہ (Renaissance) میں یہی طریقۂ کار رہا ہے۔ عربی زبان میں سائنسی مآخذ کے تراجم کے توسط سے یورپی اقوام کے عالموں نے اپنے یونانی اسلاف کے سائنسی کارناموں سے واقفیت حاصل کی۔

یونانیوں نے جو ہندسی ورثہ چھوڑا تھا، افاضل اسلام نے اُس میں چار چاند لگائے اور اس طرح جدید مغربی ثقافت کے لیے ایک قابل قدر سرمایہ فراہم کیا۔ سنجیدہ اور دیانت دار فضلائے روزگار کو اس کی اہمیت کا اعتراف ہے۔ چنانچہ کارادی ووو (Carra de Vaux) نے اپنی مشہور تصنیف ورثۂ اسلام (Legacy of Islam) میں مسلم ریاضی وہیئت (Astronomy) پر جو مقالہ لکھا ہے، اُس میں وہ کہتا ہے:

> "مسلمانوں نے سائنس میں واقعی بڑے عظیم کمالات حاصل کیے۔ انھوں نے اعداد کی ترقیم کا طریقہ سکھایا، اگرچہ وہ اُن کی ایجاد نہیں تھا اور اس طرح وہ روزمرہ زندگی میں مستعمل ہونے والے بن گئے۔ انھوں نے علم الجبر والمقابلہ (Algebra) کو ایک تحقیقی علم بنا دیا اور اُسے بہت زیادہ ترقی دی۔ نیز تحلیلی ہندسہ (Analytical Geometry) کی بنیاد ڈالی۔ اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مستوی اور کروی علم المثلثات (Plane and Spherical Trigonometry) کے بانی وہی ہیں، جس کا سچ تو یہ ہے کہ یونانیوں کے یہاں وجود ہی نہیں تھا۔ علم الہیئت میں انھوں نے بہت سے مشاہدات کیے۔"

اِس سرمایہ فضل و کمال کی عظمت اور اہمیت کا اندازہ اس کی قسم در قسم تقسیم سے کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی علوم کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ علوم دینیہ یا شرعیات جو منقولات بھی کہلاتے ہیں۔

---

* نیو سر سید نگر، علی گڑھ

علوم حکمیہ یا فلسفہ و حکمت، جنھیں معقولات سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔
جملہ غیر دینی علوم (Secular Sciences) کا مجموعہ "فلسفہ" یا "حکمت" کہلاتا ہے۔ اس کی بھی دو بڑی
نظری اور حکمت عملی۔ اول الذکر کی تین ذیلی قسمیں ہیں۔ ریاضیات (Mathematics)، طبیعیات (Physics)
یا مابعد الطبیعیات (Metaphysics)۔ ثانی الذکر کی بھی تین ذیلی قسمیں ہیں:۔ اخلاقیات (Ethics)، تدا
سیاست مدن (Politics) ان اقسام شش گانہ میں سے ریاضیات کی متعدد اقسام ہیں، جن میں سے بعض اُصول (
ہیں اور بعض فروع (Applications) ریاضی کے اُصول چار ہیں:

۱۔ حساب۔ مگر یونانی اسلامی فلسفہ کا یہ حساب ہمارے زمانے میں اسکولوں میں پڑھائے جانے والے حساب
(Arithmetic) سے قطعاً مختلف ہے۔ وہ اس علم کا مصداق ہے جسے عہد حاضر میں ۔ heory
Arithmetical) of Numbers کہتے ہیں۔ اس لیے اُصولِ حساب علم الاعداد یا ارثماطیقی (
بھی کہلاتا ہے۔ متعدد کتابوں کے عنوانات (Titles) ان ہی دونوں اصطلاحات پر مبنی ہیں۔

۲۔ علم الہندسہ (Geometry)
۳۔ ہیئت یا فلکیات (Astronomy)
۴۔ موسیقی (Music)

ان اُصول چہار گانہ میں سے ہر اُصول کی متعدد فروع (Applications) ہیں۔ چنانچہ شیخ بوعلی سینا نے ا
فی اقسام العلوم العقلیہ" میں ہندسہ کی سات فروع گنائی ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ (مضم
بعد میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان فروع کی تعداد میں مزید اضافہ ہوتا رہا۔
اسلامی علم ہندسہ کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ہندسۂ خالص۔ ۲۔ تطبیقی ہندسہ۔ اول الذکر یعنی ہندسۂ خالص کی تین ذیلی اقسام ہیں:

۱۔ اُصول ہندسہ، جس سے مراد اقلیدس کے اُصول الہندسہ (Elements of Euclidean Geometry
تصانیف ہیں۔
۲۔ کرویات (Spherics) اس میں "علم المثلثات الکرویہ" یا Spherical Trigonometry
۳۔ مخروطات (Conics) اور دیگر غیر فرجاری منحنیات (Higher curves) کی طرح تطب
(Applied Geometry) کے سلسلے میں مسلمان فضلاء کی کوششوں نے تین علموں کی شکل ا

۱۔ علم الحیل (Mechanics)
۲ علم المناظر یا بصریات (Optics)
۳ فلکیات یا ہندسی علم الہیئت (Mathematical Astronomy)

الف: ان میں سب سے زیادہ اعتناء مسلمان ہندسہ دانوں نے "اُصول ہندسہ" کے ساتھ کیا۔ ا
کی مساعیٔ علمیہ حسبِ ذیل عنوانوں کے تحت بیان کی جاسکتی ہیں:

۱۔ اقلیدس کی کتاب "اُصول الھندسہ والحساب" کا ترجمہ

اقلیدس کی "اُصول الهندسہ" (Elements of Geometry) کی تلخیص۔
- اُصول الہندسہ پر مستقل تصانیف
- مساحت (Mensuration) اور علم المثلثات (Trigonometry)
- اُصول اقلیدس کی شروح (Commentries)
- مصادرات اقلیدس کی شروح اور "شکوک اقلیدس" کا حل۔
- خطوط متوازی کے مصادرہ (Parallel Postulate) کے اثبات کی کوشش۔
- نظریہ نسبت وتناسب (Proportions) کی شروح وایضاح۔
- نظریہ اعداد (Theory of Numbers) با لخصوص اصم (Irrational) اعداد کی بحث۔
۱۰۔ مجسمات خمسہ (Five Regular Polyhydra)

(ب) کرویات (Spherics) کے تحت مندرجہ ذیل زیادہ اہم ہیں۔
۱۔ کرویات ساکنہ۔
۲۔ کرویات متحرکہ۔
۳۔ علم المثلثات الکرویہ (Spherical Trigonometry)

(ج) ہندسۂ خالص کی تیسری قسم کو دو عنوانوں کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے :
۱۔ مخروطات (آج کل کی اصطلاح میں فصول مخروطی یا مخروطی تراشے (Conic Sections)
۲۔ دیگر غیر فرجاری منحنیات (Curves of Higher Degrees)

(د) علم الحیل کے سلسلے میں مندرجہ ذیل مباحث پر مشتمل علوم آتے ہیں :
۱۔ عمومی علم الحیل (General Mechanics)
۲۔ ماسکونیات (Hydrostatics)
۳۔ علم ہنگام گھڑی سازی کا علم۔

(و) علم المناظر یا بصریات کے سلسلے میں یونانیوں کے یہاں صرف ایک کتاب مشہور تھی یعنی اقلیدس کی کتاب المناظر (Optics) مگر مسلمانوں نے اسمیں مزید تنوع پیدا کیا، با لخصوص "مرایائے محرقہ" (Burning Mirrors) کے علم میں۔

(ز) فلکیات (Astronomy) کے تحت جو مباحث آتے ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں :
۱۔ زیج شہریار کی تشریح وتوضیح۔
۲۔ السندھند (سدھانت) کی تشریح جو قدیم ہندو جوتش سے ماخوذ تھا۔
۳۔ المجسطی (Almagest) کی توضیحات جو یونانی۔عربی علم الہیئت کا سنگِ بنیاد ہے۔
۴۔ مستقل ہیئتی متون۔ (Astronomical Text Books)
۵ اصطرلاب (Astrolab) سازی۔

۶۔ آلات رصدیہ (Astronomical Instruments) کی تیاری۔

فضلائے اسلام نے ان میں سے ہر صنف کے اندر اپنی عبقریت اور ابتکار فکر کا مظاہرہ کیا جس کی تفصیل مجلدات کی مقتضی ہے مگر آپ کے پاس اس کے پڑھنے کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔

تم وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانو　　غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

پھر بھی بمصداق مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ مذکورہ الصدر امور کا ایک مختصر تذکرہ مستحسن ہوگا مگر پہلے مسلمانوں کی ہندسی کاوشوں کا پس منظر پیش کیا جاتا ہے۔

علم ہندسہ کی ابتدا حسب تصریح ہیروڈوٹس (Herodotus) مصر قدیم میں پیمائش زمین کے سلسلے میں ہوئی۔ بعد میں مصر کے پروہت طبقے نے اس علم کو جو عہدِ حاضر کے علم المساحت (Mensuration) کے مترادف تھا، اپنی فکری سرگرمیوں کا موضوع بنایا اور اس طرح وہ علم وجود میں آیا جو علم الہندسہ کی اصل تھا۔ زاں بعد یونانی حکماء نے اس علم کو مصریوں سے لے کر مزید ترقی دی اور بہت سی نئی اشکال (Theorems) کو دریافت کیا اور اس طرح ہندسہ کی اشکال کا ایک غیر معمولی طور پر وافر ذخیرہ جمع ہوگیا۔ لہذا اس عظیم اور وافر ذخیرے میں سے بنیادی نوعیت کی اشکال کو منتخب کر کے ہندسی اشکال کے ملخص مجموعے تیار کیے گئے جنھیں اصول الھندسہ والحساب کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس قسم کا پہلا ملخص مجموعہ بقراط کیوسی (Hippocrates of Chios) نے تیار کیا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی حکیم اقلیدس (Euclid) کی "اصول الھندسہ والحساب" ہے جس منطقی تنظیم و ترتیب کے ساتھ اس نے اپنی کتاب کو مدون کیا اس کے پیش نظر اس کے پیش روؤں کی تصانیف ماند ہو کر گوشۂ گمنامی میں جا پڑیں، حتی کہ آج ان میں سے اکثر کے نام کو کوئی جانتا تک نہیں۔ یہی نہیں بلکہ کم کتابوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہوگی جتنی اقلیدس کی "اصول الھندسہ والحساب" کو ہوئی۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا ایک مقالہ نگار (Geometry) کے تحت لکھتا ہے:

> "علم ہندسہ کی اشکال کو اس تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کی پہلی جامع اور منظم کوشش جو ہم تک پہنچی ہے اور دنیا کے عظیم ادبی شاہکاروں میں محسوب ہونے کی مستحق ہے، اسکندریہ کے فاضل اقلیدس کی اصول الہندسہ و الحساب ہے۔ اس علمی شاہکار کے کم و بیش لفظ بہ لفظ تراجم پچھلی صدی کے زمانے تک انگلستان کے تمام پبلک اسکولوں میں (Text Books) کی حیثیت سے متداول تھے اور آج بھی جملہ ملکوں کی نصابی کتابیں اسی اصول اقلیدس کی ترتیب و تحریر Editions ہیں۔"

اسلامی ثقافت کے عہدِ عروج میں بھی یہ کتاب غیر معمولی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی تھی۔ ابن القفطی "تاریخ الحکماء" میں لکھتا ہے۔

"وکان عند المامون ان من لم یقرا ھذا الکتاب لایعد مھندسا البتۃ"

[خلیفہ مامون الرشید کے نزدیک جو شخص اس کتاب کو پڑھے ہوئے نہ ہوتا وہ مہندس نہیں سمجھا جاتا تھا]۔

اقلیدس نے اپنی کتاب الاصول میں جس ہندسی نظام کی تشکیل کی ہے، اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ فضا (Space) متشابہ الاجزاء (Homoloidal) ہے۔ اس بنیادی تصور کا نتیجہ بصراحت یہ ہے کہ

"دو متوازی خطوط مستقیم (Two Parallel St Straight) آپس میں نہیں ملتے۔"

یا جدید اصطلاحی زبان میں

"Two Parallel St- lines meet only at infinity"

اور چونکہ Infinity کا عالم موہوم سے ماوراء خارج میں کہیں وجود نہیں ہے، اس جدید انداز بیان کا ماحصل بھی یہی ہے کہ "وہ کہیں نہیں ملتے۔"

اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اقلیدس نے "خطوط متوازی" کے متعدد خواص کو مختلف اشکال میں قلم بند کیا مثلاً:

"اگر ایک خط مستقیم دو متوازی خطوط مستقیم کو قطع کرے تو متبادلہ زاویے (Alternate angles) آپس میں برابر ہوں گے۔"

اقلیدس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر نئی شکل (Theorem) کو پچھلی اشکال نیز کچھ بنیادی مقدمات کی مدد سے ثابت کرتا ہے۔ ان بنیادی مقدمات میں سے کچھ واضح بالذات (Self Evident) ہوتے ہیں اور اس لیے انھیں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے "جزو سے بڑا ہوتا ہے" (The whole is greater than the Part) یہ "علوم متعارفہ" (Axiom) کہلاتے ہیں۔

کچھ اتنے واضح بالذات تو نہیں ہوتے، پھر بھی بے نیاز ثبوت ہوتے ہیں اور اس لیے انھیں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے

"ایک نقطہ کو مرکز مان کر دیئے ہوئے فاصلے کے برابر نصف قطر (Radius) کے ساتھ دائرہ (Circle) کھینچا جا سکتا ہے۔"

یہ "اصول موضوعہ" (Hypothesis) کہلاتے ہیں۔

اور کچھ اس درجہ بے نیاز ثبوت تو نہیں ہوتے مگر طالب علم یا مخاطب انھیں حقیقت مسلمہ مان لیتا ہے، اگرچہ دل میں اس سے اختلاف رکھتا ہے۔ اس قسم کے بنیادی مقدمات "مصادرہ" (Postulates) کہلاتے ہیں۔

اقلیدس نے اپنی کتاب "اصول الھندسہ والحساب" میں جو مصادرات دیئے ہیں، ان میں سب سے اہم "خطوط متوازی کا مصادرہ" (Parallel Postulate) ہے جس کا کہنا ہے۔

"اگر ایک خط مستقیم دو خطوط مستقیم کو قطع کرے اور خط قاطع (کاٹنے والے خط) کے ایک جانب کے دو داخلہ زاویوں (Interior Angles) کا مجموعہ دو قائمہ زاویوں (Right Angles) سے کم ہو تو اس جانب یہ دونوں خطوط مستقیم بڑھائے جانے پر کہیں نہ کہیں مل جائیں گے۔"

اقلیدس نے اس مصادرہ کی مدد سے مندرجہ بالا شکل (مقالۂ اولیٰ کی انتیسویں شکل) کو ثابت کیا ہے جو متبادلہ زاویوں کی برابری سے متعلق ہے لیکن اقلیدس کے فوراً بعد ہی سے یہ مصادرہ قیل و قال کا موضوع بن گیا اور اٹھارویں صدی تک بنا رہا۔ اس حقیقت سے تو شاید ہی کسی نے انکار کیا ہو کہ:

"خط قاطع کے جس جانب داخلہ زاویوں کا مجموعہ دو قائمہ زاویوں سے کم ہوگا اس جانب وہ دونوں خط بڑھائے جانے سے کہیں نہ کہیں مل جائیں گے۔"

البتہ اس دعوئی کے مصادرہ ہونے سے اختلاف تھا۔ مخالفین کہتے تھے کہ ہر چند یہ دعوئی واضح بالذات نہیں ہے، پھر بھی اسے اقلیدس کی اشکال کی مدد سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یونانی علم و حکمت کے بعد اقلیدسی دور (Post Euclidean Period) میں بطلیموس (Ptolemy) اور عہد اسلام کی ہندسی تاریخ میں خواجہ نصیر الدین طوسی (محقق طوسی) ان اختلاف کرنے والوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں فاضلوں کو اور اسی طرح دوسرے اختلاف کرنے والوں کو اس ہندسی حقیقت سے (جو فضا کے بسیط کے Homoloidal ہونے کا منطقی نتیجہ ہے) تو انکار نہیں ہے انھیں اختلا

صرف اس بات سے ہے کہ یہ دعویٰ (یعنی اقلیدس کا مجوزہ "خطوط متوازی کا مصادرہ") بے نیاز ثبوت نہیں ہے "اقلیدس" کی دوسری اشکال (یا اس سے زیادہ واضح بالذات مقدمات) کی مدد سے ثابت کیا جاسکتا۔ کرنے والوں نے عملاً ایسا کیا بھی۔

اس کوشش کی تاریخ میں پہلے پندرھویں صدی مسیحی میں اطالوی ہندسہ داں سکیری ( ) اور اٹھارویں صدی میں بولیائی (Bolyaie) لوباچیوسکی (Lobochewsky) اور … نے اسے ثبوت بخلف (Reductio ad absurdum) کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ انھیں امید تھی نقیض کو صحیح مان کر جو نتائج برآمد ہوں گے وہ محال اور باطل ہوں گے اور اس طرح یہ مصادرہ خود بخود ثابت ایسا نہیں ہوا بلکہ جو نتائج برآمد ہوئے ان میں کوئی استحالہ نہ تھا بلکہ وہ آپس میں متوافق بالذات ( ) تھے۔ سکیری تو اسے کسی بدروح کا کرشمہ سمجھا (کہ کوئی بدروح اس کے دماغ میں گھس گئی ہے جو ایسی باطل کے ذہن میں آرہی ہیں) مگر اٹھارویں صدی کے ہندسہ دانوں (بولیائی وغیرہ) نے ان متوافق بالذات نتائج "اقلیدسی ہندسہ" (Non-Euclidean Geometry) کی بنیاد ڈالی جس کی تفصیل خارج از موضوع ہے

بہر حال حکمائے یونان سے مسلمانوں کو جو علمی ورثہ ملا، انھوں نے اس میں چار چاند لگائے۔ مثلاً اقلیدس کے "خطوط متوازی کے مصادرہ" کا بدل (Alternative) بلکہ "نعم البدل" دریافت کیا

"الخطان المستقیمان المتقاطعان لا یوازیان خطاً واحداً مستقیماً"

[دو ایک دوسرے کو قطع کرنے والے خطوط مستقیم ایک ہی خط مستقیم کے متوازی نہیں ہو سکتے]۔

اب علمی ڈکیتی ورقزاقی کا ایک شرمناک واقعہ سن لیجیے جو "Naked and Unashamed"

ایک برطانوی ہندسہ داں پلے فیر (Play Fair) نے ۱۷۹۵ء میں اُصول اقلیدس کا ایک نیا ایڈیشن مرتب کر دریافت کردہ بدل کو اپنے نام سے شائع کیا اور پھر بعد کے یورپی فضلاء نے اس شرمناک سائنسی ڈکیتی پر مہر توثیق ثبت کمال شوخ چشمی سے اسے Play Fair's Axiom (پلے فیر صاحب کا علوم متعارفہ) کہتے ہیں۔

اور ایک ہماری بے حسی ہے کہ آج تک ہمیں اس علمی ڈکیتی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی توفیق نہیں ہوئی

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا ۔۔۔ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ملحق

علم الھندسہ کی فروع مطابق ابن سینا

Of

۱۔ علم المساحت	Mensuration
۲۔ علم الحیل	Mechanics, rather Pneumatic
۳۔ علم جر الاثقال	Traction of heavy loads
۴۔ علم الاوزان والموازین	weight and measures
۵۔ علم الآلات الحربیۃ	Millitary armaments
۶۔ علم المناظر والمرایۃ	Optics and burning mirrors
۷۔ علم نقل المیاہ	Hydraulics.

پروفیسر مسعود الرحمن خان ندوی*

روجیہ جان شارل جارودی

(فرانسیسی فلسفی)

فرانس کے مشہور شہر مرسیلیا میں ۱۷ جولائی ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی نشو ونما و تعلیم حاصل کی۔ پیرس کے مدرسہ ہنری چہارم میں پڑھا۔ والدین ملحد تھے مگر چودہ سال کی عمر میں عیسائی (پروٹسٹینٹ) عقیدہ اختیار کیا۔ بیس سال کی عمر میں فرانس کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوئے تو کارل مارکس کی کتابوں اور دیگر کمیونسٹ لٹریچر کا گہرا مطالعہ کیا۔ آکس اور سٹراسبرج کے مشہور آرٹس کالجوں میں تعلیم حاصل کرکے ۱۹۳۶ء میں فلسفہ کی ڈگری حاصل کی۔ مدرسہ البی میں مدرس مقرر ہوئے اور اسی سال کمیونسٹ ٹارن فیڈریشن کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں فرانسیسی فوج کو رضاکارانہ خدمات پیش کیں اور شمالی افریقہ کے پیدل فوجی دستہ میں مامور ہوئے۔ جنگ عظیم دوم کے خاتمہ تک جزائر کے جلفہ علاقے میں قید رہے۔ رہائی کے بعد دو سال تک جزائر میں مزید قیام کے دوران ایک ہفتہ وار رسالہ الحریۃ کی ادارت کی۔ فرانس واپسی پر اٹھارہ سال تک کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت کے لیے اپنے کو فارغ رکھا اور ٹارن علاقے سے فرانسیسی قومی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ اسی دوران جزائر و تونس کے متعدد بار سفر کے علاوہ لاطینی امریکہ کے چودہ ممالک کے سفر بھی کئے۔ وہاں سے واپسی پر اپنی مشہور کتاب "کیا آج کمیونسٹ ہونا ممکن ہے؟" شائع کی۔ پارلیمنٹ کی رکنیت ختم ہونے کے بعد تعلیمی سرگرمیوں کے دوران سوویت یونین اور سینٹرل ایشیا کے ممالک کا دورہ کیا۔ وہ پہلے فرانسیسی تھے جنھوں نے ماسکو کی سائنسی اکاڈمی کے شعبۂ فلسفہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ فرانس واپس آکر اس مرتبہ پیرس حلقۂ انتخاب سے پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں مارکسی مطالعات کا ریسرچ سینٹر قائم کیا۔ پارلیمنٹ کی رکنیت اور نائب اسپیکر کے عہدے سے استعفا دے کر کلیر مین یونیورسٹی (فران) اور بوائیتہ یونیورسٹی میں فلسفہ کی تعلیم و تدریس کے لیے وقف ہوگئے۔ اس عرصے میں بیس سے زیادہ کتابیں شائع کرچکے تھے جن میں سے بیشتر کا تعلق کمیونسٹ افکار سے تھا۔

ذیل میں مصطفیٰ خلیفہ سے ان کی گفتگو کا ماحصل پیش ہے جو ہفت روزہ العالم الاسلامی، مکہ مکرمہ، شمارہ نمبر ۷۷ء ۳ میں شائع ہوئی۔

علمی و عملی زندگی کے دوران ان پر کمیونزم اور مارکسزم کی حقیقت کھلنا شروع ہوئی۔ انسان کی روحانی ضرورت سے ان کے وجود کی حقیقت اور موت کے معمے کے انجام کے بارے میں ان کی خاموشی ٹوٹی۔ ایک طویل اور پُر مشقت سفر کے بعد انھوں نے سابق اعتقادات افکار اور فلسفوں کو یکلخت مسترد کردیا اور لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی حقیقت کے سامنے سر جھکا دیا۔

کلمۂ توحید اور اقرار رسالت کی حقیقت کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ایک طرف اتنی سادہ شہادت ہے کہ عوامی فہم

---

* پروفیسر سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، ستمبر ۱۹۹۵ء

۱۹۴۴ء میں وہ جزائری مسلم علماء کی جمعیت کے صدر اور بزرگ عالم ابراہیمی صاحب سے دوسری بار ملے۔ وہیں انھوں نے پہلی بار انیسویں صدی کے مردِ مجاہد اور فرانس کے دشمن اول امیر عبدالقادر جزائریؒ کی بارُعب تصویر دیکھی۔ شیخ ابراہیمی کے ذریعے اسلامی تعلیمات سے آگہی حاصل کی، لیکن اسلام سے ان کا زیادہ لگاؤ ساتویں دہائی کے آغاز سے ہوا، جب ان کے سامنے کمیونزم کی حقیقت کھلنے لگی تو انھوں نے اسلام، اسلامی تہذیب اور قرآن وحدیث کا مطالعہ شروع کیا۔ انھوں نے کئی بار عرب ممالک جیسے مصر، لیبیا، جزائر وغیرہ کا دورہ کیا۔ مسلم علماء سے ملے، یہاں تک ۱۹۸۲ء میں جنیوا کے اسلامی ثقافتی مرکز میں اپنے اسلام لانے کا اعلان کر دیا۔

ان کو اپنے ماضی پر ندامت نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کے بقول میں نے اسی راستے سے گزر کر تبدیلی سیکھی، عقائد کا کھوکھلا پن دیکھا، شک کے دور سے گزرا جو دراصل خوابوں کے موڑ کی تعبیر ہوتا ہے، روحانی صحراؤں کو پار کیا جہاں مدد کے لیے رہنما بہت کم ملتے ہیں۔ میرے ماضی کے بغیر مجھے یہ تجربے کیسے ہوتے؟ اگر شک نہ ہوتا تو ایمان کی دولت کی قدر کیسے جانتا؟ وہ یقین جس کے اعلیٰ مقاصد تک پہنچنے کے لیے پوری زندگی داؤ پر لگانی پڑتی ہے۔ اس قیمت پر ایمان عقل کے خلاف نہیں بلکہ وہ عقل کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے جس میں عقل اپنے مسلّمات ومقاصد پر سوچتی سمجھتی ہے اور ان پر سوال قائم کرتی ہے۔ ایمان ہر متعین مقصد کے لیے ایک ناقدانہ تجزیہ ہے۔ وہ نفی کی نفی یعنی حدودِ انسانی کی نفی ہے اور اس حد کو انسان کیسے جانے گا جب تک کہ اس کو کم از کم یہ احساس نہ ہو کہ اس کے ماورا کوئی دوسری حقیقت بھی ہے۔

وہی روجیہ جارودی جن کا مغرب میں پہلے بڑا شہرہ تھا، اسلام لانے کے بعد غدّار وگنہگار گردانے جانے لگے۔ خاص کر اس لیے کہ انھوں نے صہیونی حکومت پر تنقید کی اور دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ اس کے جرائم کو مغربی رائے عامہ کے سامنے فاش کیا۔ انھوں نے اپنی کتاب "اسرائیل پروفائل: صہیونیت کے خواب اور گمراہ کن دعوے" میں یہ بات واضح کی کہ فلسطین میں صہیونی حکومت کے لیے کوئی تاریخی، توراتی یا قانونی جواز نہیں ہے۔ وہ شرمناک رشوتوں اور ناجائز دباؤ کے زیر اثر اقوام متحدہ کی غیر قانونی قرار داد کے ذریعے قائم ہوئی ہے۔ دراصل صہیونی سیاسی عقیدہ نسلی اور سامراجی صورتوں کی صرف ایک شکل ہے۔ مغربی دنیا میں صہیونیت سے ہمدردی کی وجہ یہ ہے کہ اس نے داستانی دعوؤں کو حقیقت کے روپ میں پیش کیا۔ اس کتاب میں جریدہ "کیغونیم ریویو" کا وہ مقالہ بھی اہم دستاویز کی حیثیت سے شامل ہے جو عالمی صہیونی تحریک کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اس کا لکھنے والا اسرائیلی خارجہ سیاست کا قدیم ترین کارکن ہے، اس لیے وہ کوئی عام قسم کا مقالہ نہیں ہے۔ کاتب نے اس میں وضاحت کی ہے کہ "اس صدی کی آٹھویں دہائی سے اس کے خاتمہ تک اسرائیلی سیاست تمام عرب ممالک کی نسلی وعنصری تقسیم پر اعتماد کرے گی۔ اردن میں فلسطینیوں کو بسانے کے بعد اس کی ایک اور تقسیم اردنی اور فلسطینی حصوں میں ہوگی۔ عراق شیعہ وسُنّی علاقوں میں بٹ جائے گا۔ مصر میں مسلم اور قبطی کشاکش بڑھا کر اس کے ٹکڑے ہوں گے۔ جزائر میں قبائلی آگ بھڑکا کر اس کے حصّے بخرے کئے جائیں گے۔ خلیج کی کمزور ریاستوں کے درمیان جن کی زیادہ آبادی غیر ملکی ہے، پٹرول کے لیے جنگ کی آگ کو مشتعل کرنا ہر وقت ممکن رہے گا۔" اس دستاویز کی اشاعت پر فرانس اور مغربی ممالک میں وسائلِ ابلاغِ عامہ پر قابض یہود وصہیونی ٹولے نے روجیہ جارودی پر بدترین الزام تراشی کی مہم چلائی اور قتل کی دھمکیاں دیں۔

مغربی اور صہیونی وسائلِ ابلاغِ عامہ کی طرف سے اسلامی بیداری کی شکل مسخ کرنے اور اس کو دنیا پر قبضہ کرنے والی "اصولی" تحریک ثابت کرنے کی کوششوں کے بارے میں روجیہ کا کہنا ہے کہ یہ سب سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق کیا جا رہا ہے تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ عالمی رائے عامہ کے تعلق وہمدردی پر روک لگائی جائے۔ "اصولیت" کے کئی مفہوم ہیں۔ اگر اس کا مطلب اپنی رائے کو دوسروں پر تھوپنا ہے تو مشرقی ممالک پر مغربی سامراج کے تسلّط کو تاریخ کی سب سے بڑی "اصولی" تحریک شمار کرنا ہوگا۔ اسی

طرح مال دار ممالک کی طرف سے "نئے عالمی نظام" کی اصطلاح بھی غریب اقوام کے مقدّر پر امیر اقوام کے تسلّط کے سوا او
حالانکہ پروپیگنڈے کے بل پر اس کے مضرات کو نظروں سے پوشیدہ رکھا جا رہا ہے ۔ افسوس اس بات پر ہے کہ بعد
اس کے دھوکہ میں پھنس چکے ہیں۔"

مغربی تہذیب میں انسان کی حقیقت پر غور و خوض کئے بغیر مادی ترقی پر مبنی قدیم مفہوم کو دیکھتے ہوئے میرا
کہ اس کو اسلحہ سازی کی ترویج و اشاعت کی ترقی یافتہ تہذیب کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ تہذیب اگرچہ علم، ترقی ا
اعلیٰ درجے تک پہنچ چکی ہے مگر حقیقت میں کھوکھلی تہذیب ہے، اور اب وہ زوال و انحطاط کی طرف مائل ہے کی
بنیاد ظلم و ستم پر رکھی گئی ہے اور وہ اصولوں اور اقدار سے بھی عاری ہو چکی ہے۔

انسانی معاشروں کو ترقی و خوش حالی سے مستفید کرنے میں سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں نظام ناکا
اس لیے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی توجہ "فرد" پر ہے، اور اشتراکیت کی توجہ "طبقہ" پر۔ یورپی ترقی کا مقصد دنیا کے
کے انسانوں کو غلام بنانا اور ان کی دولت کو لوٹنا تھا، تاکہ ان کو اسلحہ سازی اور ہلاکت کے وسائل پر بے دریغ
اشتراکیت نے بھی اسی میدان میں سرمایہ داری پر سبقت حاصل کرنے کو اپنا مقصدِ اوّلین بنایا۔ ان دونوں نظامو
تیسری دنیا کے دس کروڑ انسان افلاس بھوک اور غذائی قلّت کے سبب فوت ہوئے۔ مذکورہ بالا اعداد و شمار ہا
کے لیے بہتر معیار فراہم کرنے کے ان کے دعوؤں کو کھوکھلا ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دا
اجارہ داری، ذات پرستی اور عیاشی پر قائم ہے۔ جب کہ اشتراکی نمونہ استبداد اور انسان کی انسانیت کو کچلنے میں
اِس کے برعکس اسلامی نظام وقت نظر سے تیار کیا ہوا الٰہی نظام ہے۔ تمام انسانوں کے لیے باعزت زندگی فراہم ک
ہے۔ خود اسلامی شریعت ایک عالمی اخلاقی طریق کار ہے۔ مسلمان علما کو نئے تقاضوں کے مطابق فقہی نظام کی نئی تک
ہم جب بھی اسلامی شریعت کی تشکیلِ جدید کی بات کرتے ہیں تو ہمارے سامنے صرف ایک طریقہ رہ جاتا ہے کہ قرآن
اوّلین مصادر کی طرف رجوع کریں یعنی اس معاشرے کی طرف لوٹیں جو مدینہ منورہ میں شروع ہوا تھا۔ ہمارے
مشکلات و مسائل کا جواب ان ہی مصادر میں لفظی تکرار سے نہیں بلکہ قرآنی ہدایات کے تحت موجودہ وسائل کے ذ
سے ملے گا۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ ہم قرآنی تعلیم کی طرف رجوع کریں، آیاتِ قرآنی کو سمجھنے کے لیے بحیثیت بشر اپنی ذمہ
ان آیات و ہدایات کو زندہ و مؤثر رہنما گردانیں۔

محمد اسحاق*

ابراھم لنکن کا ایک خط

صدر امریکہ ابراھم لنکن نے اپنے فرزند کے ٹیچر کے نام جو خط لکھا تھا وہ اس قابل ہے کہ اردو داں طبقہ اس سے مستفید ہو۔ اس خط کے اصل انگریزی متن کے ساتھ اس کا آزاد ترجمہ پیش ہے۔ اس خط میں چند باتیں قابل غور ہیں ـــــ ابراھم لنکن نے باوجود صدر امریکہ ہوتے ہوئے بھی اپنے لڑکے کے ٹیچر کے نام شخصی خط لکھنا ضروری خیال کیا۔ اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ٹیچر کی کیا کچھ عظمت تھی اس کا کچھ اندازہ اس خط سے ہو جائے گا۔ وہ اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں کرتا کہ وہ آئندہ کیا بنے گا۔ اس کو سیاسی لیڈر، ڈاکٹر، انجینئر، اڈمنسٹریٹر، یا صنعت کار وغیرہ ایسا کچھ بنانے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا، لیکن اپنے بچے کو بے لاگ حق پرست، بے خوف، آزاد خیال اور ایک متوازن شخصیت کا مالک بنانا چاہتا تھا تاکہ وہ خود اس وسیع حقائق کی دنیا میں زندگی سے نبرد آزما ہو اور اپنا مقام آپ پیدا کر سکے۔ تعلیم کے دوران وہ جس شخصیت کی تعمیر کا آرزومند تھا، اس کے آدرش تعلیم کی دنیا میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ خط اس قابل ہے کہ ماں باپ، ٹیچرس، دانشوران قوم اور تعلیمی اداروں کے سربراہ ان اعلیٰ مقاصد پر دھیان دیں کہ ہم کس طرح ان سب خوبیوں سے بچوں کی شخصیت کی تعمیر کے مقصد کو اپنے تعلیمی پروگرام کا حصہ بنا سکتے ہیں۔

ABRAHAM LINCOLN'S LETTER TO HIS SON'S TEACHER

1. He will have to learn, I know	میں جانتا ہوں کہ اسے کچھ سیکھنا ہے
2 That all men are not just	سب لوگ انصاف پسند نہیں ہوتے
3. All men are not true	سب لوگ سچے نہیں ہوتے
4. But teach him also that	لیکن اس کو یہ سبق بھی دو کہ
5. For every scoundrel there is a law	ہر بدمعاش کے لیے ایک قانون ہے
6 That for every selfish politician	ہر خود غرض سیاست داں کے لیے
7. There is a dedicated leader	کوئی بے غرض مخلص لیڈر بھی ہوتا ہے

* سابق پرنسپل کالج آف ایجوکیشن، جاوید منزل، مکان نمبر ۶/۱۴/۶۱۴ - ۱۱، بازار گارڈ، حیدر آباد ۵۰۰۰۰۰

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، ستمبر ۱۹۹۵ء

8. Teach him that for every enemy there is a friend	کو بتاؤ کہ ہر دشمن کے لیے کوئی دوست بھی ہوتا ہے
9. It will take time I know	جانتا ہوں کہ اس کے لیے کچھ وقت درکار ہو گا
10 But teach him if you can	ممکن ہو تو اس کو بتاؤ کہ
11 That a dollar earned is of fair	ماندداری سے حاصل کیا ہوا ایک ڈالر
12 More value than five found	محنت کے حاصل ہونے والے پانچ ڈالر سے زیادہ ستا ہے -
13 Teach him to learn not to lose	ں کو سکھاؤ کہ وہ کہیں ہار نہ جائے
14.And also enjoy losing	وہ کبھی ہار بھی جائے تو ہارنے کی لذت سے محظوظ ہو
15 Skin him from enemy if you can	ہو سکے تو اس کو دشمنوں سے بچاؤ
16 Teach him if you can	ں کو سکھاؤ اگر تم سے ہو سکے
17 The wonder of books	ابوں کا جادو کیا ہوتا ہے
18 But give him quiet time to ponder the	لمن اسے تنہائی کی گھڑیاں بھی دو
19 Eternal Mystery of the birds in the sky	کہ وہ آسمانوں میں اڑتے پرندوں کا دوامی زیا سکے
20 Bees in the sun of flowers at great hill-side.	رشہد کی مکھیوں کو پہاڑوں کے دامن میں پھولوں کے جھنڈ پر منڈلاتے دیکھ سکے
21 In school teach him. It is more honourable to fail than to cheat	مکول میں یہ سکھلاؤ کہ ناکام ہو جانا زیادہ وقار طریقہ ہے بہ نسبت نقل کر کے کامیاب ہو جائے۔
22.Teach him to have in his own ideas.	ں کو سکھاؤ کہ وہ کسی مسئلہ میں اپنی ذاتی رائے قائم رسے
23. even if one tells him they are wrong	اسے کوئی اس کے خیال کو غلط ہی کیوں نہ کہہ دے
24. Teach him to be gentle with gentle people	ں کو سکھاؤ کہ وہ شریف لوگوں کے ساتھ شرافت سے پیش آئے
25. and tough with tough	ربدمعاشوں کے ساتھ سختی سے
26. Tryto give my son/the strength not to follow the crowd	رے لڑکے کو یہ طاقت دینے کی کوشش کیجیے کہ وہ ہجوم ا پیروی نہ کرے
27. When everyone is getting in the band-wagon	ب ہر ایک ایک خاص گروہ کی رائے سے متفق گیا ہو، اس کو بتاؤ کہ وہ
28. Teach him to listen to all men, but:	ب کی سنے اور ان کی رائے کو

29. teach him also to filter all he hears — سچائی کے پردہ پر چھان لے۔ وہی اچھی بات

30. On ascreen of truth and take only the good that comes through — قبول کرے جو اس طرح چھن کر سامنے آتی ہو

31. Teach him if you can to laugh when he is sad — ممکن ہو تو اس کو بتاؤ کہ رنج و غم میں بھی کس طرح ہنس سکتے ہیں

32. Teach him there is no shame in tears — اور یہ بھی کہ آنکھوں میں آنسوں بھر آنا کوئی شرم کی بات نہیں

33. Teach him to scoff at cynics and to beware — اس کو سکھاؤ کہ کس طرح دنیا بیزار لوگوں کی باتوں کو مذاق میں ٹالا جا سکتا ہے

34. Teach him to sell his brawn and brain to the highest bidders — ہاں خبردار وہ اپنی جسمانی اور ذہنی توانائیاں اس شخص کے حوالے کر دے جو سب سے زیادہ دام لگائے

35. But never to put a price tag on his heart and soul — حاشا! کبھی دل و روح (محبت اور خدمت) کی کوئی قیمت مقرر نہ کرے

36. Teach him to close his ears to a howling mob — وہ شور شرابے والے ہجوم کی آواز پر کان نہ دھرے

37. And to stand and fight if he thinks he is right — اگر وہ کسی بات کو حق جانتا ہو تو اس کے لیے لڑنے مرنے کے لیے کھڑا ہو جائے۔

38. Teach him gently but not cuddle him — اس کو نرمی سے سکھاؤ لیکن کہیں لاڈ و پیار میں بگاڑ نہ دینا

39. Because only the test of fire makes fine steel — کیوں کہ آگ میں تپنے کے بعد ہی لوہا خالص فولاد بنتا ہے۔

40. Let him have the courage to be impatient — اس میں یہ جرأت پیدا کرو کہ وہ حق کے لیے بے چین ہو جائے

41. Let him have the pateince to be brave — اور اس میں وہ تحمل پیدا کرو کہ وہ جری بن سکے۔

42. Teach him always to have sublime faith in himself — اس کو سکھلاؤ کہ ہمیشہ وہ اپنے اندر اعلیٰ ترین ایمان پیدا کرے تاکہ

43. Because then he will have sublime faith in mankind — وہ بنی نوع انسانی میں اعلیٰ ترین اعتقاد پیدا کر سکے

44. This is a big order, but see what you can do: — بے شک یہ باتیں بہت بڑی ہیں

45. He is such a fine fellow, my son!! — لیکن دیکھیے آپ میرے ہونہار لڑکے کے لیے کیا کر سکتے ہیں :

عبدالودود انصاری *

علم ریاضی میں پچھڑاپن

علم ریاضی سائنس کی ایسی شاخ ہے جسے تمام سائنسی علوم کی کنجی کہا جا سکتا ہے ہماری روزانہ زندگی میں اس کی بڑی اہمیت ہے کوئی فرد خواہ کسی پیشے سے منسلک ہو ریاضی کے بغیر اس کا کام نہیں چل سکتا ہے۔ حساب کتاب، ناپ تول، نفع نقصان، اوسط فیصد، وقت اور کام سب میں ریاضی کی ضرورت پڑتی ہے۔ تمام سائنسی علوم مثلاً علم طبیعات، علم کیمیا، علم حیاتیات، کمپیوٹر وغیرہ میں علم ریاضی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ استعمال لازمی ہے ہی مگر دیگر غیر سائنسی مضامین کی بھی تشریح اور اس کا مطالعہ علم ریاضی کے بغیر ممکن نہیں۔ جغرافیہ میں دیکھیے ملکوں کے طبعی حالات، بارش کی پیمائش، درجۂ حرارت کی جانکاری، طول البلد و عرض البلد کی پیمائش وغیرہ میں ریاضی کی ضرورت پڑتی ہے۔ علم معاشیات میں سامانوں کی درآمد برآمد، آبادی، صنعت، تجارتی چکر، بجٹ وغیرہ علم ریاضی کے بغیر ممکن نہیں۔ علم معاشیات میں تو اعداد و شمار کی پوری بنیاد ریاضی پر ہی ہے۔ علم سیاسیات میں ووٹوں کی گنتی ریاضی کی رہین ہے۔ علم زراعت میں زمین کے رقبوں کی پیمائش، اوسطاً اخراجات، اوسطاً آمدنی، فی اکائی پیداوار، مزدور کی مزدوری، بیج کی بالیدگی کی ناپ تول وغیرہ سے علم ریاضی اچھی طرح جڑا ہوا ہے اسی طرح علم نفسیات میں مقیاسِ ذہانت (*Intelligence Quotient*) کی پیمائش، علم دستکاری میں نقشے تصاویر کا بنانا، تواریخ میں جنگ کی تاریخ وغیرہ میں علم ریاضی اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ علم ریاضی سے کوئی بھی علم خالی نہیں ہے۔ جہاں حقیقت یہ ہے وہیں پر اس بات سے بھی انکار نہیں کہ بچے جتنا علم ریاضی سے خائف اور اس میں کمزور ہوتے ہیں دیگر مضامین میں اتنا نہیں۔ پبلک امتحانات کے نتائج اس بات کی بھرپور تصدیق کرتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر بچے ریاضی کو سخت کیوں محسوس کرتے ہیں؟ علم ریاضی میں کمزوری کو ریاضی میں پچھڑا پن (*Backwardness in Mathematic*) کہا جاتا ہے۔ اب ہم لوگ غور کریں گے کہ علم ریاضی میں بچوں کے پچھڑنے کے وجوہات کیا کیا ہیں اور ان کے تدارک کس طرح ممکن ہیں۔

پچھڑے پن سے کیا مراد ہے اس کو سمجھنے کے لیے پچھڑے پن کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلا عام پچھڑا پن اور دوسرا خاص پچھڑا پن۔

(۱) عام پچھڑا پن (*General Backwardness*)

عام پچھڑے پن سے مراد وہ بچے ہیں جو تمام مضامین کو سخت محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح کی کمزوری ان کی پیدائشی ہوتی

* پرنسپل اردو میڈیم گورنمنٹ ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، پوسٹ نالی کل، ضلع: ہوگلی۔ ۷۱۲۴۰۷ (مغربی بنگال)

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، ستمبر ۱۹۹۵ء

ہے جو مقیاسِ ذہانت کی کمی کے باعث ہوتی ہے ایسے بچوں کا مقیاسِ ذہانت تقریباً ۵۰-۷۰ فی صد کے درمیان ہوتا ہے ایسے بچوں پر کوشش اور محنت کی جائے تو زیادہ سے زیادہ ۷ یا ۸ درجہ تک ان کے مقیاسِ ذہانت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کے اندر یہ کمزوری تمام مضامین کے اساتذہ کی کوشش کے نتیجہ میں ہی دور ہو سکتی ہے۔ علم ریاضی کے استاد کو خاص کر اپنے مضمون میں بھرپور توجہ دینی ہوگی۔ ایسے بچوں پر اگر تمام تر کوششیں سود مند ثابت نہ ہوں تو پھر انہیں دستکاری یا محنت و مشقت کے کام سے جوڑ دینا چاہیے۔

(۲) خاص پچھڑاپن (Particular Backwardness)

خاص پچھڑے پن سے مراد وہ بچے ہیں جن کی کارکردگی علم ریاضی میں مایوس کن ہوتی ہے۔ مگر دیگر مضامین میں وہ ذہین ہوتے ہیں۔ خاص پچھڑے پن کو عام پچھڑے پن کی بہ نسبت دور کرنا نہایت آسان ہے کیوں کہ خاص پچھڑے پن کے سلسلے میں بقیہ مضامین میں ان کی نمایاں کارکردگی ان کے اندر جوش و خروش اور خود اعتمادی کے سبب آگے بڑھنے میں مدد دیتی ہے بچوں کے اس پچھڑے پن کی خامی کو دور کرنے کے ذمہ دار صرف اور صرف علم ریاضی کے استاد ہیں جن کے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ اس طرح کے پچھڑے پن کے وجوہات کیا کیا ہیں۔ اور ان کا تدارک کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں چند وجوہات ان کے تدارک اقدام کے ساتھ بیان کی جا رہی ہیں:

(۱) جسمانی کمزوری:-

بہت سارے بچے جسمانی کمزوریوں مثلاً بینائی کی کمزوری، قوت سماعت میں کمی، پیٹ اور سر کے درد و دیگر امراض میں مبتلا رہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مطالعہ میں اپنے ذہن کو مرکوز نہیں کر پاتے ہیں حالانکہ علم ریاضی ایسا مضمون ہے جس میں ذہن کی مرکوزیت خاص اہمیت رکھتی ہے۔

تدارک:- بچوں کے اندر اس طرح کی کمی کو دور کرنے کے لیے استاد گارجین کو معالجوں سے رجوع کرنے کا مشورہ دیں۔ کبھی کبھی جسمانی ورزش بھی سود مند ثابت ہوتی ہے۔ استاد گارجین کو ایسے اداروں میں داخلہ کے لیے رہنمائی اور تفصیلی جانکاری فراہم کریں جو جسمانی معذور بچوں کی تدریس کے لیے ہی مخصوص ہیں۔

(۲) ذہنی کمزوری:-

یہ کمزوری پیدائشی بھی ہو سکتی ہے یا اس کی وجہ ماحول کے اثرات بھی ہو سکتے ہیں جس سے بچوں کی مقیاسِ ذہانت نیچی سطح پر آجاتی ہے۔ دماغی بیماری، گھریلو مسائل، احساس کمتری، کم عقلی، علم ریاضی سے عدم دلچسپی وغیرہ وجوہات ہو سکتی ہیں۔

تدارک:- دماغی کمزوری اگر معمولی سطح کی ہے تو امید کی کچھ کرنیں باقی رہتی ہیں کہ وہ استاد کے ذریعہ ممکن ہے کہ دور ہو جائے لیکن اگر مرض نے شدت پکڑلی ہے تو پھر بچوں کو کسی ماہر نفسیات (Psychologist) یا ماہر تحلیلی نفسیات (Psychoanalyst) سے رجوع کرنا چاہیے ویسے استاد کی شفقت، ہمدردی، خوش اخلاقی، نرم رویہ وغیرہ بڑے معاون ہوتے ہیں۔

(۳) علم ریاضی کی ناپسندیدگی:-

ریاضی کی ناپسندیدگی فطری طور پر ہو سکتی ہے یا پھر اکتسابی (Acquired) ہو سکتی ہے۔

تدارک:- اگر ناپسندیدگی فطری ہے تو استاد کی محنت رائیگاں ہو جائے گی لیکن اگر اکتسابی ہے تو پھر اس کے ذمہ دار صرف ریاضی کے استاد ہیں جنہوں نے مضمون کو خشک، دشوار اور سخت بنا کر ان کے سامنے پیش کیا ہے نصاب کا بوجھ، مضمون کی سختی اور مشکل سوالات ریاضی میں ناپسندیدگی پیدا کرتے ہیں۔ ریاضی اگر نفسیاتی طریقے سے استعمال کر کے خوش اسلوبی کے ساتھ پڑھائی جائے تو پھر یہ بیماری پیدا نہیں ہوگی۔ بچوں کے سامنے ریاضی کی جمالیاتی قدر افادی قدر، تہذیبی قدر، اخلاقی قدر وغیرہ کو اجاگر کرنا ہوگا۔ استاد کو جلد بازی سے گریز، صبر و تحمل، بار بار دہرانے کے عمل وغیرہ کا استعمال کرنا ہوگا اور اپنے ذہن سے یہ بات نکال دینی ہوگی کہ *Once backward always back*.

(۴) ریاضی کے بنیادی تصورات:-

ریاضی کے بنیادی تصورات کی عدم جانکاری کے باعث بھی بچے پچھڑ سکتے ہیں۔ ریاضی کے تمام تر عنوان اپنے قبل کے عنوانات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ قبل کے عنوانات کا صحیح تصور نہ ہو تو مابعد کے عنوانات کو سمجھنا مشکل ہے۔

تدارک:- استاد کو ریاضی کا بنیادی علم صحیح صحیح شروع سے ہی بچوں کو ذہن نشین کرانا چاہیے اس کے لیے سبق کو بار بار دہرانا پڑے تو انہیں دہرانا چاہیے

(۵) سرپرستوں کے غلط رویے:-

کبھی کبھی بچوں کے سرپرست بچوں کو بچپن سے ہی اس مضمون کی سختی سے بیجا ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ کچھ گارجین تو بچوں سے یہاں تک کہہ ڈالتے ہیں کہ دیکھو حساب بڑا سخت مضمون ہے اس کو ٹھیک سے پڑھو، یا پھر بہت کم لڑکے حساب سمجھ پاتے ہیں یا بچے اکثر حساب میں فیل ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس طرح بچوں کے ذہن میں بچپن سے ہی حساب کی سختی بیٹھ جاتی ہے۔

تدارک:- سرپرستوں کو اس طرح کے مضرت رساں جملوں سے گریز کرنا ہوگا۔

(۶) استاد کے غیر متوازن رویے:-

ریاضی کے استاد کی سخت مزاجی، چڑچڑے پن، سخت سزا اور بے التفاتی سے بھی ریاضی میں بچے پچھڑ سکتے ہیں ٹھیک اس کے برعکس اگر ریاضی کا استاد حد سے زیادہ نرم ہو تو بچے غیر واجبی یا ناحق فائدہ اٹھاتے ہیں۔

تدارک:- پہلے کی طرح استاد کے اندر متذکرہ حوصلہ پست اور مایوس کن عناصر کو ختم کرنا ہوگا تاکہ بچے بلاخوف استاد سے قریب آسکیں دوسری طرف استاد کو ضرورت کی تحت سخت ہونا ہوگا۔ استاد کو طلبہ کا روحانی باپ اور ملت کا معمار سمجھنا ہوگا۔

(۷) اسکولوں کی تبدیلی:-

اسکولوں کی بار بار تبدیلی سے بھی بچے مضامین میں پچھڑ سکتے ہیں کیوں کہ بچے کو ایک ہی درجہ میں ایک مضمون کے لیے کئی استادوں سے سابقہ پڑتا ہے جس کی وجہ سے طریقہ تدریس بھی جدا ہو سکتا ہے اور طریقہ میں یکسانیت نہ پا کر بچے مضمون میں پچھڑ سکتے ہیں۔

تدارک:- گارجین کو تعلیم کی تکمیل تک اسکولوں کی تبدیلی سے گریز کرنا چاہیے۔

(۸) استاد کی اچھی شہرت نہ ہونا:۔
استاد اگر اسکول یا سوسائٹی میں اچھی شہرت کا مالک نہ ہونگے تو بچے ان سے اور ان کی تدریس سے دور بھاگیں گے اس طرح مضمون میں پچھڑ سکتے ہیں۔
تدارک:۔ استاد کو اعلیٰ شہرت کا مالک خوش اخلاق و ملنسار، خوش کلام، مساوات اور عدل و انصاف کا حامل اور نرم خو ہونا چاہیے

(۹) معیاری طریقۂ تدریس کی عدم فراہمی
بچے ہمیشہ نئے پن اور جدت پسندی کے قائل ہوتے ہیں علم ریاضی میں ہر طرح کی جمالیاتی، تہذیبی، اخلاقی، افادی اقدار موجود ہیں۔ اس طرح اگر ریاضی کا استاد ایک روایتی طریقہ کا پابند ہو کر درس دے گا تو بچے مضمون میں پچھڑ سکتے ہیں۔
تدارک:۔ استاد کو تربیت یافتہ ہونا چاہیے۔ اسے بچے کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے تدریس کے طریقوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ اگر ایک طریقہ موثر نہ ہو رہا ہو تو دوسرے، تیسرے کا استعمال کرنا چاہیے۔ بچوں کے سوالات و اعتراضات پر غصہ ہونے کے بجائے خندہ پیشانی سے جواب دے کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔

(۱۰) ہوم ورک مکمل نہ کرنا:۔
اگر بچے درجہ میں دیئے گئے ہوم ورک پورا نہیں کریں گے تو بھی مضمون میں پچھڑ جائیں گے۔ جب کہ ریاضی بغیر گھر کی مشق کے مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔
تدارک:۔ سرپرست کو بچوں کی نگرانی کرنی ہوگی کہ ان کے بچے ہوم ورک مکمل کر رہے ہیں یا نہیں۔ نگرانی کے ساتھ ساتھ بچوں کی پوری پوری مدد اس طرح کرنی ہوگی کہ انہیں پورا وقت میسر ہو سکے جس میں وہ اپنے ہوم ورک مکمل کر سکیں۔ استاد ہوم ورک ضرورت سے زیادہ نہ دیں اور پھر ہوم ورک کو بر وقت جانچ دیں تاکہ طلبہ میں کاہلی پیدا نہ ہو۔

(۱۱) درجہ میں لگاتار غیر حاضری:۔
بچے اگر درجہ میں لگاتار غیر حاضر رہیں گے تو پھر مضمون میں پچھڑ سکتے ہیں۔
تدارک:۔ استاد کو ایسے بچوں کی سخت نگرانی کرنی ہوگی۔ انہیں سخت سزا دینی ہوگی۔ سرپرستوں کو اطلاع کرنی ہوگی سرپرست کو اپنے بچے سے سخت باز پرس کرنی ہوگی اسے لگاتار درجہ میں حاضر کرانا ہوگا۔

(۱۲) ناقص تحریر:۔
کسی وجہ سے بچے کی تحریر صحیح اور خوشخط نہ ہو تو یہ کمی بھی بچوں کو مضمون میں پچھاڑ سکتی ہے۔ خاص کر جیومیٹری کی بناوٹ صحیح نہ ہو گی۔
تدارک:۔ خوشخطی مادری زبان کے استاد کے ذریعے صحیح کرائی جا سکتی ہے۔

(۱۳) معیاری نصابی کتابوں کی کمی:۔
ریاضی کی کتابیں اگر سائنٹیفک اور معیاری نہ ہوں تو بچے کا علم ریاضی میں پچھڑنا لازمی ہے۔
تدارک:۔ نصاب میں شامل ریاضی کی کتابیں معیاری ہونی چاہئیں اس کے لیے ریاستی اور قومی بنیاد پر

موثر اقدام درکار ہے۔

(۱۴) تدریسی امدادی سامان کا استعمال نہ کرنا:۔

تدریسی امدادی سامان کے استعمال سے بچے فطری اور آسان طریقہ سے مضمون سیکھ پاتے ہیں۔ یہ ترکیب توجہ کو اپنی جانب زیادہ مبذول کراتی ہے اور ساتھ ساتھ دلچسپی ابھارتی ہے۔ کسر، اوسط، فیصد، رقبوں کی پیمائش، ذواضعاف اقل، مشترک مقسوم علیہ اعظم، وغیرہ کے تصورات ذہن نشین کرانے کے لیے تدریسی امدادی سامان بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔

تدارک:۔ ریاضی کے استاد کو درس کے دوران تدریسی امدادی سامان استعمال کرنا چاہیے۔

تہذیب اخلاق

شرح اشتہارات

۱۔ بیک ٹائیٹل پیج	(پورا صفحہ)	۱۲۰۰	روپے
بیک ٹائیٹل پیج	(آدھا صفحہ)	۶۰۰	روپے
بیک ٹائیٹل پیج	(چوتھائی صفحہ)	۳۰۰	روپے
۲۔ بیک انر ٹائیٹل پیج	(پورا صفحہ)	۱۰۰۰	روپے
بیک انر ٹائیٹل پیج	(آدھا صفحہ)	۵۰۰	روپے
بیک انر ٹائیٹل پیج	(چوتھائی صفحہ)	۲۵۰	روپے
۳۔ انر سائڈ پیج	(پورا صفحہ)	۷۵۰	روپے
انر سائڈ پیج	(آدھا صفحہ)	۴۰۰	روپے
انر سائڈ پیج	(چوتھائی صفحہ)	۲۰۰	روپے

نوٹ:۔ مشتہرین کو ۳۳ فی صد کی رعایت دی جائیگی ——— سرکولیشن انچارج

اڈوارڈ فلیرو*

الیکٹرانکس؛ ترقی کا ایک اہم ذریعہ

سماج میں تیزی کے ساتھ تبدیلیاں آرہی ہیں، اس بدلتے ہوئے سماج میں الیکٹرانکس سماجی تبدیلی لانے کا اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے سماج میں زندگی کے سبھی شعبۂ جات کا نقشہ بدلا ہے۔ قومی معیشت کے کلیدی شعبوں میں کام کی رفتار بڑھانے اور لاگت سے بھرپور فائدہ اٹھانے نیز ہر کام کو بحفاظت انجام دینے اور صحت کے ساتھ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں الیکٹرانکس کا اہم رول رہا ہے۔ اطلاعاتی نظام میں انقلاب نئی تکنیکی اور اقتصادی دنیا کا نقیب بن چکا ہے۔ اس نے حال میں جو ترقیاتی نقشہ بدلا ہے، اس کی مثال کچھ ایسی ہے جیسا کہ بھاپ کے انجنوں کی ایجاد سے ایک نئی دنیا نے جنم لیا تھا۔

خواہ روزگار کے مواقع پیدا کرنا ہوں، خواندگی کی مہم چلانی ہو، تعلیم، صحت، زراعت اور بنیادی معاشی و دیگر سہولتیں فراہم کرنی ہوں، ہر جگہ الیکٹرانکس کے سبب ترقیاتی عمل کو تیز کیا جاسکتا ہے۔

روزگار:-

الیکٹرانکس کے شعبے میں روزگار دوسرے ترقی یافتہ شعبوں کی بہ نسبت زیادہ بڑھا ہے، صنعتی سیکٹر میں کل سرمایہ کاری کا تقریباً ایک فی صد الیکٹرانکس کے شعبے میں لگایا گیا ہے، پھر بھی اس کم سے کم سرمایہ کاری سے ہی صنعتی محنت کش طبقے کا تقریباً ۲ فی صد اسی سیکٹر میں کام پر لگا ہوا ہے، اس کے علاوہ یہ توقع ہے کہ ہر ایک براہ راست روزگار کے لیے دو جابس، ثانوی اور معاون سیکٹروں میں اس کے سبب پیدا ہوں گے۔

موجودہ صنعتوں میں پہلے سے قائم کردہ پیداواری اثاثہ جات سے بذریعہ الیکٹرانکس بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور یہ بھی روزگار کے مواقع نکالنے کا ایک اور ذریعہ بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر الیکٹرانکس میں جزوی سرمایہ کاری سے بجلی کی تیاری میں بہتری لائی جاسکتی ہے، تو اس کے نتیجے میں روزگار کے مواقع زیادہ پیدا ہوں گے اور یہ مواقع صرف بجلی کے شعبے تک محدود نہیں ہوں گے بلکہ ان تمام صنعتوں میں بھی اس کے خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے جو بجلی پر انحصار رکھتے ہیں۔ یہی صورتِ حال دوسری صنعتوں میں بھی ہے۔

---

*معرفت پریس انفارمیشن بیورو، گورنمنٹ آف انڈیا۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ ستمبر ۱۹۹۵ء

اطلاعاتی ٹکنالوجی سے ریلوے کے ریزرویشن نظام میں مدد لی گئی ہے، اس سے زیادہ نشستو
عمل میں آسکا ہے اور زیادہ ٹرینیں چلائی جاسکی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ریلوے کو منافع زیادہ ہو سکا ہے
تمام نشستوں کی بھرپور انداز میں بکنگ کی جا سکی ہے اور کہیں بھی نشستیں ریزرویشن سے خالی نہیں رہ
جس سے کہ ریلوے کو نقصان ہو۔

تعلیم:۔

ملک سے ناخواندگی دور کرنے اور پرائمری سطح کی تعلیم کو سب کے لیے عام کرنے میں الیکٹرانکس
ادا کیا ہے رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے لیے کمپیوٹر موثر تعلیمی امدادی سامان کے طور پر استعمال ہو رہے
دراز علاقوں کے لوگوں کو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے خواندہ بنانے میں مدد لی جا رہی ہے، یہ کام ب
ٹکنالوجی کی مدد سے لیا جا رہا ہے۔ نشریاتی رابطوں اور مناسب سافٹ ویر سسٹم سے بھی مدد لی جا
اس خواندگی کے عام ہونے سے بالواسطہ طور پر اضافہ آبادی کی روک تھام میں مدد ملی ہے اور اس سے
بڑھا ہے۔

صحتی دیکھ بھال

صحتی دیکھ بھال کے شعبے میں بھی الیکٹرانکس کی افادیت کم نہیں، نئے نئے آلات کی مدد سے پرائمری
دیکھ بھال کے نظام میں ایک انقلاب رونما ہوا ہے۔ امراض کی تشخیص، مریضوں کے علاج اور ان
نیز صحت سے متعلق ضروری اعداد و شمار کی فراہمی میں الیکٹرانکس کی افادیت مسلم ہے، اس سے ع
اور بہت جلد ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے مرض کی تاریخ اور تشخیص میں بہت مدد ملی ہے۔ اس
صحت کے معاملے میں بڑے پیمانے پر خدمت ہو سکی ہے۔ مثال کے طور پر شمسی توانائی پر مبنی جراثیم
کی مدد سے گندی بستیوں میں صحت کے معیار کو اوپر اٹھانے میں مدد ملی ہے۔

زراعت:

الیکٹرانکس نے زرعی پیداوار بڑھانے اور زرعی انقلاب لانے میں عالمی سطح پر ایک انقلاب بر
اس سے پیداواری صلاحیت بڑھی ہے اور دیہی علاقوں میں رہنے والوں کی آمدنی بڑھی ہے۔ زر
پر مبنی صنعتوں کو بڑھاوا دینے، زرعی پیداوار کا ذخیرہ کرنے اور اس کی تقسیم کرنے میں نیز کھیتوں
میں الیکٹرانکس سے مدد ملی ہے۔
مختلف زرعی اراضی اور آب رسانی کے مختلف نظام الیکٹرانکس کی مدد سے چلنے والے اد
سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ان کے جمع کردہ اعداد و شمار زرعی پیداوار بڑھانے میں مددگار ثابت
پیداواری صلاحیت کو زیادہ سے زیادہ بنایا گیا ہے۔ کیمیاوی کھادوں اور جراثیم کش دوائ

والے آلات، نمی کی پیمائش، پانی میں کھارے پن کی جانچ، مٹی کی تیزابیت، پودوں کی بیماریاں وغیرہ اس نظام سے پرکھی جاسکتی ہیں اور پھر پودوں کو لگنے والی بیماریوں کی روک تھام عمل میں آسکتی ہیں، اس طرح کے بہت سے آلات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ الیکٹرانکس سے زراعت میں کس کس طرح سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ زراعت میں پیداواری صلاحیت بڑھانے میں ریموٹ سینسنگ سے مدد لی گئی ہے، اس طرح کی ٹکنالوجی کے استعمال سے زرعی پیداوار میں ۱۴ فی صد تک کا اضافہ دیکھنے کو ملا ہے۔ مختلف طرح کی نئی ٹکنالوجیوں مثلاً الٹراسانک ساؤنڈ سسٹم سے چوہوں وغیرہ سے فصلوں کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔

آب رسانی کی صلاحیت بڑھانے کے لیے پانی کی فراہمی، پانی کا معیار، مٹی کی خصوصیات، موسمیاتی تغیر و تبدیلی وغیرہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ کمپیوٹروں کی مدد سے ان موضوعات پر اعداد و شمار کا موثر نظام وضع کیا گیا ہے اور اس طرح آبی وسائل کا بہتر نظم و نسق وجود میں آسکا ہے، اعداد و شمار مظہر ہیں کہ اس طرح کی جدید ٹکنالوجیوں کے استعمال سے پانی کے استعمال میں تقریباً ۲۰ فی صد بچت ہوسکی ہے جب کہ اکثر حالات میں مثلاً چاولوں کی فصل میں ۴۰ فی صد تک پیداوار میں بہتری دیکھنے کو ملی ہے۔

بنیادی سہولتوں میں اضافہ:۔

بنیادی سہولتوں کی فراہمی بھی الیکٹرانکس کے نظام کی مرہون منت ہے۔ انرجی، ٹرانسپورٹ، مواصلات، آب رسانی وغیرہ بنیادی سہولتوں میں شمار ہوتی ہیں۔ الیکٹرانکس کے استعمال سے پیداواری صلاحیت بڑھی ہے اور لاگت میں کمی آئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کام محفوظ ڈھنگ سے انجام پاسکا ہے نیز نتائج درست اور ٹھیک رہے ہیں۔

انرجی کے شعبے میں لوڈ ڈسپیچ، خودکار تقسیم کا نظام، بجلی کی ترسیل میں تضیع کو روکنے کا عمل اور بجلی کے استعمال کے نقصان میں کمی اور اس کے موثر استعمال وغیرہ کو الیکٹرانکس کی مدد سے انجام دیا جاتا ہے، آٹوموبائیل میں الیکٹرانکس کے طریقوں کے استعمال سے تیل کی کمی لائی جاسکی ہے، انرجی کے متبادل وسائل تلاش کیے جاسکے ہیں، ٹرانسپورٹ کے نظام سے موثر ڈھنگ سے بھرپور استفادہ کیا جاسکا ہے۔ یہ سب خدمات نہ صرف عمدہ اور باکفایت رہیں بلکہ ان کی برتری اور عمدگی نے صارفین کو بھی مطمئن رکھا۔

مواصلاتی نظام میں بھی الیکٹرانکس کا نمایاں رول ہے۔ طویل فاصلوں پر قابل بھروسہ خدمات پیش کی جاسکی ہیں، سیٹلائیٹ کمیونی کیشن کی ٹکنالوجی، فائبر آپٹکس ٹی وی/ریڈیو براڈکاسٹ اور سوئچنگ سسٹم سب کے سب الیکٹرانکس سے استفادہ کر رہے ہیں، یہ خدمات کاروبار کے لحاظ سے تو اہم ہیں ہی، تاہم ان سے موسمیاتی پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں اور ہنگامی ضرورتوں کو بھی پورا کیا جاتا ہے۔

دیگر بہت سی خدمات کو بھی الیکٹرانکس نظام نے سنوارا ہے مثلاً بینکنگ انشورنس وغیرہ۔ الیکٹرانکس کی مدد سے اس طرح کے شعبہ جات کی خدمات کو موثر اور سہل بنا کر صارفین کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے صنعت نفع بخش اور مقبول عام ہوسکی ہے، تجارت اور کاروبار میں ان خدمات کی وجہ

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

(کمانڈر) ایس۔ این۔ اے۔ فردوسی*

بازگشت

(گزشتہ سے پیوستہ)

ٹھنڈ بھی رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی ۔ شروع شروع میں تو ٹھنڈی شیروانی سے کام چل گیا جو ہلکے بادامی رنگ کی پہلے سے موجود تھی مگر اب تو سرسید کی طے کردہ سیاہ اور گرم شیروانی کی ضرورت تھی میرے کچھ عزیز (رشتے کے بھائی) سرسید ہال میں رہتے تھے۔ ان سے مشورہ ہوا۔ ان لوگوں نے کپڑا یہیں علی گڑھ سے لے لیا تھا۔ وہی محمد علی کا چوراہا۔ اور اس کے اطراف کپڑے والوں کی دوکانیں۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے ان کا کپڑا پسند نہ آیا۔ حالانکہ ان دنوں میں عام طور پر دھاری وال اور لال املی کی ہی سرج مل جاتی تھی جو آٹھ روپے گز سے لے کر تیس روپے گز تک ملتی تھی۔ یا پھر اٹلی کا الپا کا دو سو ڈھائی سو روپے گز کا بھی دستیاب تھا۔ اور اسی کے ساتھ چار روپے گز کا کشمیرا (جس کا بلیزر بنتا تھا) بھی مل جاتا تھا۔ اپنی اپنی حیثیت کے اعتبار سے ہر شخص کپڑا خریدتا اور شیروانی سلواتا۔ مگر بس دل سے دعا ہی نکلتی تھی بانئ درسگاہ کے لیے جنہوں نے اس رنگ کا انتخاب فرمایا۔ شیروانی پہن لینے کے بعد پانچ سو روپے والے کو ذہنی تسکین ہو تو ہو مگر دور سے اس میں اور چار روپے والی شیروانی میں کوئی نمایاں فرق نہیں محسوس ہوتا تھا۔ ہاں ذرا غور سے اور نزدیک سے دیکھنے پر فرق محسوس ہو جاتا تھا۔ مگر عام جلسوں (مثلاً کانوکیشن) میں یا پھر یونین کی نشستوں میں کسی کو احساس تک نہ ہوتا۔ وہاں تو بس یک رنگی ہی دکھائی دیتی۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہر شخص کے لیے لازم تھا کہ وہ نہ صرف اوپر تک بٹن بند کرے بلکہ کالر بھی بند کرے۔ یہ یہاں کی تہذیب میں داخل تھا۔ اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرتا تو سینئر طلبہ بازاروں تک میں اسے ٹوک دیتے۔ اساتذہ کلاسوں میں بٹن لگانے کو کہتے۔ بظاہر یہ ایک ٹریڈیشن تھا مگر اس کے پیچھے ایک فلسفہ یہ بھی تھا کہ کلاسیں صبح آٹھ بجے ہی لگ جاتی تھیں۔ طلبہ کو اکثر اپنے ہوسٹلوں سے کافی دور جانا پڑتا۔ اس زمانے میں عمارتیں کم تھیں۔ لہٰذا کھلے میدان زیادہ تھے۔ اس باعث صبح کی ٹھنڈی ہوا زناٹے بھرتی جو اگر سینے میں لگ جاتی تو کم از کم نزلہ زکام کی راہ ضرور ہموار کر جاتی۔

میں نے طے کیا کہ میں شیروانی کا کپڑا بجائے یہاں کے دہلی سے لوں گا چنانچہ دہلی میں چاوڑی بازار کی

---

* سابق افسر رابطہ عامہ، مسلم یونیورسٹی و ایڈیٹر مسلم یونیورسٹی گزٹ ۔ ۱۱۰/۴، دودھ پور سول لائنز، علی گڑھ

یک دوکان سے بہت اچھا کپڑا مل گیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ صرف ایک گز اور دس گرہ ہی تھا جب کہ شیروانی کے لیے پورے دو گز کی ضرورت پڑتی تھی۔ بڑی مشکل سے بزاز کو اس بات پر راضی کر لیا کہ ہمارے درزی نے انکار کر دیا تو میں اس کو واپس کر دوں گا اور اس کے بدلے آپ سے کوئی اور کپڑا خرید لوں گا۔

اس زمانے میں یہاں محمد علی درزی کی دھوم تھی۔ ان کی دوکان شہر میں محمد علی کے چوراہے پہ پھول چوراہے کی طرف مڑتے ہی بائیں ہاتھ پر ایک کمپاؤنڈ میں تھی جس میں شہر کا بڑا ڈاکخانہ بھی تھا۔ وہ ڈاکخانہ اب بھی (۱۹۹۵) وہیں موجود ہے۔ اور اب اسی دوکان میں محمد علی کے بھتیجے نے ٹیلرنگ کی دوکان کھول رکھی ہے۔ دوسرے لوگ جو شیروانی سلتے تھے۔ ان میں اوپر کوٹ جاتے ہوئے شیشہ والی مسجد کے مقابل محفوظ ٹیلر تھے۔ دوسرے شمشاد مارکیٹ میں جہاں اب فرینڈز بک ہاؤس ہے اس میں مستقیم ٹیلر تھے مگر یہ لوگ محمد علی کے پائے کے نہ تھے۔ مہدی حسن بالکل نئے نئے مارکیٹ میں آئے تھے۔ اور جونیئر سمجھے جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر شخص محمد علی کی خواہش کرتا۔ مگر صاحب وہاں بھی جونیئر اور سینئر کا سوال تھا۔ محمد علی ٹیلر چھوٹے قد کے، رنگ ذرا دبا ہوا، چہرے پر ہلکی سی داڑھی لیکن آنکھیں اور آواز بہت تیز تھیں۔ طلبہ سے بڑی بے تکلفی سے بات کرتے۔ ان کے یہاں دو دو اور تین تین مہینے بعد نمبر آپاتا۔

یہ بات اوپر تحریر کر چکا ہوں کہ اس زمانے میں ہر چیز کا ریٹ پراکٹر آفس کی طرف سے طے کر دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ گرم شیروانی کی سلائی صرف دس روپے تھی جس میں بٹن استر اور روئی یہ سب درزی اپنے پاس سے لگاتا۔ اکثر طلبہ خصوصی استر (اٹالین) یا بہتر روئی اور پیڈ کی فرمائش کرتے تو اس کے لیے دو تین روپے اور دینے ہوتے۔

میں بھی اپنے بھائیوں اور دو سینئرز کے ساتھ وہ کپڑا لے کر وہاں پہنچا۔ تو میرے ایک سینئر نے دور سے ہی کہا چچا میاں سلام عرض کرتا ہوں۔ جس پر محمد علی تڑک کر بولے آؤ میاں بھتیجے پھر کام اٹکا ہوگا۔ جو چچا میاں کی خدمت میں فرشی سلام جھاڑا جا رہا ہے۔ ورنہ کون پوچھتا ہے اس غریب کو۔ خیر جب شیروانی کی بات آئی تو وہی متوقع جواب کہ میاں چھوڑ جاؤ اور دو ماہ بعد آ کے خبر لینا۔ بہر حال بھتیجے نے بڑی مشکل سے چچا، کو راضی کر لیا کہ اچھا دس پندرہ دن میں دے دیجیے گا۔ اب میں ان کے سامنے گیا کہ ان کی شیروانی سلنی ہے۔ میں منتظر تھا کہ محمد علی ٹیلر اب کوئی فیتہ وغیرہ نکالیں گے۔ مگر انہوں نے پہلے کپڑا مانگا۔ میں نے پیکٹ ان کے حوالے کر دیا کھولتے ہی بھڑک گئے۔ کہنے لگے کہ میاں کہاں سے مار لیا۔ یہ کپڑا علی گڑھ میں تو ہے نہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ دلی سے لایا ہوں اور کپڑا کم ہے تو بولے کتنا کم ہے۔ میں نے بتایا کہ حضرت صرف ایک گز اور دس گرہ ہے لیکن اس کا عرض کچھ زیادہ ہے اب انہوں نے فیتہ نکال کر ادھر ادھر سے ناپ تول کی اور بولے جاؤ میاں اب تو تم اسے لے ہی آئے ہو اور کپڑا مجھے بھی اچھا لگا۔ یاد رکھو اگر اتنے کپڑے میں محمد علی تمہاری شیروانی نہ سی سکا تو دنیا کا کوئی ٹیلر نہیں سی پائے گا۔

ہم سب نے کہا کہ ماسٹر صاحب ہم اسی لیے تو آپ کے مرید ہیں اور آپ کے پاس آئے ہیں۔ ایک دم سے پھر تڑک کر بولے کہ لگے پھر مکھن لگانے۔ (اتنے میں چائے آگئی تو بولے) اچھا لو پہلے چائے پی لو۔ میں نے دبے

لفظوں میں کہا کہ ماسٹر صاحب آپ نے ناپ تو لیا ہی نہیں تو بولے صاحبزادے یہ خاکسار گزشتہ چالیس
سے اسی چکر میں پھنس گیا ہے۔ آنکھیں سیاہ کپڑے کے علاوہ کچھ اور دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔ پھر اپنے
سے کہا کہ رجسٹر لاؤ۔ وہ رجسٹر اور قلم لے کر تیار ہوا تو محمد علی میری طرف دیکھتے جاتے اور اس کو ناپ
پھر انہوں نے میرے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھا اور پھر کچھ اس کو نوٹ کرنے کو کہا۔ اور فرمایا کہ نمبر
آپ جائیں اور ہاں اس کے ساتھ ٹوپی کی توقع نہ کیجیے گا۔ میرے سینئر ساتھی نے ان سے کہا کہ استاد
ذرا اچھا والا لگا دیجیے گا۔ انہوں نے یہ بات بھی رجسٹر میں درج کروا دی۔

ایک زمانہ تھا جب کہ کالی شیروانی کی جگہ کالا ٹرکش کوٹ پہنا جاتا تھا جو اوپر سے تو بالکل ایسا ہی لگ
پیچھے کی جانب کمر سے نیچے اس کے دو پلے ہوتے اور اس کے ساتھ ترکی لال ٹوپی پہنی جاتی تھی۔ یہ کوٹ بند
بھی سلے جاتے تھے۔ اور عام کوٹوں کی طرح ٹائی والے کالروں کے ساتھ بھی لیکن رفتہ رفتہ اس کی جگہ موجودہ
لے لی۔ پرانے زمانے میں شیروانی ہر شخص عام طور پر نہیں پہنتا تھا۔ شادی بیاہ میں ہندو مسلمان سبھی نوشہ
شیروانیاں پہناتے تھے جو آج تک رسم و رواج کے طور پر باقی ہے۔ ہندوؤں میں اکثر کائستھ لوگ لمبا کو
جو آگے سے تو شیروانی جیسا ہوتا مگر پیچھے اس میں بھی چاک ہوتا۔ شیروانی میں بٹنوں کے نیچے ایک پلہ ا
جاتا ہے۔ مگر ان کوٹوں میں وہ نہیں ہوتا۔ شیروانیاں عام طور پر راجہ مہاراجہ یا نواب ہی پہنا کرتے
رواج میں بھوپال، حیدر آباد یا کسی حد تک رام پور میں بھی پہنی جاتی تھی۔ محمد علی خود رام پور کے ہ
حیدر آباد اور بھوپال کی شیروانیاں ایک تو کافی لمبی ہوتی تھیں اور دوسرے ان کے کالر کافی چوڑے

علی گڑھ کی شیروانی کی ساری خصوصیت اس کی فٹنگ میں ہی پوشیدہ ہے۔ اس کی لمبائی لبو
تک ہوتی۔ کالر اوسط اور سیاہ رنگ کی۔ بقول محمد علی کے "میاں یہ شیروانی لڑکوں کی ہے وہ اسے
کرکٹ کے بلے بھی چلائیں گے، لیبوریٹری میں جاکر پریکٹیکل بھی کریں گے۔ اور کلاس سے لوٹنے کے ا
اپنے بستر پر بھی دراز ہو جائیں گے۔ ارے میاں علی گڑھ کی شیروانی میں ان تمام باتوں کا لحاظ ر
ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ اگلے ماہ جب جاڑے کا زور ہوگا تو اس کے نیچے ایک آدھ سوئٹر بھی پہنا جائے
ان سب کے باوجود اسے جھول بھی نہیں بنایا جا سکتا۔" واقعی بالکل سچ کہا تھا محمد علی نے۔

تقسیم وطن کے بعد حالات نے جو موڑ لیا تھا، اس کی زد میں سب سے پہلے علی گڑھ کی ترکی ٹو
اس کی جگہ مختلف ٹوپیاں پہنی جانے لگیں۔ اس لیے کہ :-

ع ۔ ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ

پھر بھی علی گڑھ کے فرزند میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے اس ٹریڈیشن کو برقرار رکھے ہوئے
میں ایک نام تو شمیم صاحب کا ہے جو کیمسٹری کے لکچرر تھے۔ انتہائی گورے چٹے انسان تھے چہرے
والی داڑھی۔ اکثر سوٹ پہنتے اور اس پر ترکی ٹوپی اوڑھتے۔ دوسری شخصیت مختار صاحب کی تھی جو
داپنی ملازمت کے دوران آخر تک) تھے۔ لمبے چوڑے جوان۔ ہمیشہ شیروانی پہنتے اور اس پر ترکی ٹوپی
ریٹائرمنٹ کے بعد بھی یہیں علی گڑھ میں اپنا مکان بنا کر رہنے لگے۔ چند سال پہلے اللہ کو پیارے ہو۔

وقت تک اپنی وضع داری پر آنچ نہ آنے دی۔ انتقال کے بعد منٹو اسی کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے ان کی قبر مین گیٹ سے داخل ہوتے ہی بائیں جانب ہے۔ اللہ ان کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔ شمیم صاحب دو سال بعد ملازمت چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے۔ سنا ہے ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ انہیں بھی غریق رحمت کرے۔ ان لوگوں کے علاوہ کبھی کبھار عید بقرعید میں لوٹنی کے اختر صاحب بھی ترکی ٹوپی پہن لیا کرتے تھے۔

اور آج تک مسلم یونیورسٹی کے کانووکیشن کے لباس کا ایک اہم حصہ ترکی ٹوپی ہے حتیٰ کہ مہمان خصوصی کو بھی (اگر وہ کوئی اور چیز نہ پہنتا ہو تو) ترکی ٹوپی ہی پہنائی جاتی ہے۔ طلبہ اب ترکی ٹوپی بالکل نہیں پہنتے اور اس وقت بھی (۱۹۴۹) یہ رواج خواہ کسی بناء پر ہو، ختم ہو گیا تھا۔ صرف پراسپیکٹس میں لکھا ہوتا تھا کہ داخلہ کے بعد آپ کو فوراً ٹرکش کوٹ اور فیز (FEZ) (یعنی ترکی ٹوپی) پہننی ہوگی۔ ٹرکش کوٹ کی جگہ تو شیروانی آچکی تھی اور ٹوپی سر سے غائب ہو کر صرف یونین کے پلیٹ فارم پر نظر آتی تھی۔ عام طور پر طلبہ کھال والی ٹوپی ہی پہنتے تھے۔ جو اب تک رواج میں ہے۔ دراصل ٹرکش کوٹ کے ساتھ سفید زین کی پینٹ پہنتے تھے مگر قربان جائیے بانیٔ درسگاہ کے جنہوں نے پاجامہ کے لیے ایک الگ کاٹ جسے علی گڑھ کٹ کہتے ہیں رائج کی۔ عام طور پر درزی پاجامے کے لیے ڈھائی گز لٹھا لیتے ہیں مگر علی گڑھ کاٹ کی خوبی ہے کہ صرف دو گز میں ہی تیار ہو جاتا ہے یہاں پر کفایت شعاری کا درس دیا گیا ہے۔ پاجامے عام طور پر لڑکے اپنے گھروں پر ہی اپنی ماں بہنوں سے سلوا لیا کرتے تھے لہٰذا یہاں آنے کے بعد ہر نووارد کو وہ کاٹ بھی سمجھائی جاتی کہ اسے اپنے گھر جاکر سمجھا دو۔

درزی عام طور پر ایک پاجامہ کی سلائی بارہ آنے (۷۵ پیسے) لیا کرتے تھے۔ اسی طرح قمیص کی سلائی ڈیڑھ روپے سے لے کر ڈھائی روپے تک تھی۔ ڈھائی روپے میں ڈبل کف اور ڈی ٹیچڈ کالر والی قمیص سلتی تھی اوپر مستقیم درزی کا ذکر کر چکا ہوں جن کی دوکان شمشاد میں تھی یہ قمیص اور سوٹ کے لیے مشہور تھے تھری پیس سوٹ کے لیے یہ پچیس روپے لیا کرتے تھے۔ اگر رعایت کرنی ہوتی تو قمیص مفت سی دیا کرتے۔ اسی طرح شہر میں ریلوے روڈ پر رانٹے صاحب امراؤ سنگھ کے سامنے ایک البرٹ ٹیلر اینڈ ڈریپر کی دوکان تھی۔ یہ حضرت کہیں سے کٹنگ کا ڈپلوما کر کے آئے تھے۔ جسے انہوں نے بڑی شان سے فریم کر کے آویزاں کر رکھا تھا۔ باوجود اس ٹریننگ اور ڈپلوما کے کوئی بھی طالب علم ان کے پاس شیروانی کے لیے نہ جاتا۔ اس لیے کہ ان کی شیروانی میں وہ مولوی مدن والی بات نہ ہوتی تھی۔ ہاں البتہ اپنے سوٹ کے لیے مشہور تھے۔ اور ڈپلوما کے رعب میں پینتیس روپے چارج کیا کرتے تھے۔ ان کی دوکان اب (۱۹۹۵) محمد علی چوراہے سے آگے محمد علی کی پرانی دوکان کے پاس اسی احاطے میں ہے۔

اس زمانے میں اکثر طلبہ کمروں پر سلیپنگ سوٹ پہنا کرتے۔ ورنہ کم از کم اس کا پاجامہ تو ضرور ہی استعمال کرتے تھے جو چوڑی پٹی دار لائنوں کا ہوتا۔ کوئی اسے گھر سے سلوا کر لاتا تو کوئی یہیں سلوا لیتا۔ ہوسٹل سے باہر کوئی لڑکا صرف سوئٹر پہن کر نہ نکلتا۔ اکثر سفر وغیرہ کے لیے جیکٹ استعمال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اساتذہ بھی بہت کم سوٹ پہنتے تھے جیسے جائے کہ طلبہ۔

ایک رات تقریباً ۱۰ بجے میں [illegible] ہال کے مغربی سمت کے برآمدے میں وارڈن روم کے قریب کی لائٹ مدھم اندھیرے میں کسی سائے کو ٹہلتے ہوئے دیکھا جو کچھ دور آکر پھر لوٹ جاتا تھا۔ اتنے میں اسی ہمارا ایک دوست عبدالمقیط آتا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے پوچھا کہ میاں بات ہے تو بولا کہ وہ سامنے دیکھیے۔ میں نے کہا کہ دیکھ تو میں بھی رہا ہوں مگر یہ کون ہے اندھیرے کی وجہ نہیں پا رہا۔ تو وہ بولا۔ ارے وارڈن صاحب ہیں؛ وارڈن صاحب اپنا سوٹ سلوا کر لائے ہیں جسے پہن بار یہاں آئے ہیں مگر سب کے سامنے نہیں آنا چاہتے۔

دوسرے دن پتہ چلا کہ حقی صاحب (وارڈن) کو اسکالرشپ مل گیا ہے اور وہ ولایت مزید تعلیم جا رہے ہیں۔ اور اس طرح اس نئے سوٹ کا راز کھل کر سامنے آ گیا۔ مگر اس سے اُس وقت کے ماحول اور اقدار کی اہمیت پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ الحمدللہ پروفیسر حقی اب بھی سلامت ہیں اور یہیں علی قیام پذیر ہیں۔ اللہ انہیں اور لمبی عمر اور صحت سے نوازے۔

(باقی آئندہ)

(باقی صفحہ ۴۵ کا)

سے مقابلے کی سکت پیدا ہوئی ہے، کاروبار کی رفتار ترقی ہی اس کی کامیابی یا ناکامی کا پتہ دیتی ہے۔ ۶ الیکٹرانکس شعبے کی افادیت زندگی کے سبھی شعبوں میں محسوس کی جا رہی ہے ملک اکیسویں ص قدم رکھ رہا ہے، بلاشبہ اسی صدی میں الیکٹرانکس سے ہر شعبے میں مدد لی جائے گی۔ اور اس ط کے سبھی شعبے اس نئے نظام سے فائدہ اٹھائیں گے۔

اعلانِ ملکیت

مالک : علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
قومیت : ہندوس
ایڈیٹر : نعیم احمد
پرنٹر پبلیشر : نعیم
پریس : علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ
اشاعت کی مدت :
مقام اشاعت : ماہنامہ تہذیب الاخلاق اور نشانت، ۱۔ شبلی روڈ، اے۔ ایم۔ یو علی

میں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے یقین کی حد تک درست ہیں۔

نعیم احمد
(دستخط)



سنکارا جگائے جینے کی امنگ

ترتیب

ماضی کے جھروکوں سے

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے متـ
ایڈیٹر، پبلیشر پروفیسر نعیم احمد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کے توسط سے چھپوا کر ادارہ تہذیب الاخلاق اور نشانہ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا۔

اداریہ :-

سرسید کی معنویت

سرسید ہندوستانی مسلمانوں کے تاریخی مقدر کی پیچیدگیوں اور تضادات کی ایک نمایاں علامت ہیں۔ وہ ماضی کو جھان پھٹک کر تعلیم اور مذہب دونوں میں ایسی اصلاحات کے خواہشمند تھے جو سرمایہ دار ترقی کے تقاضے پورے کر سکیں۔ اسی سبب وہ راجہ رام موہن رائے، دیانند سرسوتی اور کیشب چندر سین کی اصلاحی تحریکوں کے مداح تھے۔ وہ قومیت کو ایک نیا مفہوم دینا چاہتے تھے۔ ملک، معاشرے اور سیاست سے متعلق محرومیوں اور بدنصیبیوں کا مداوا ان کے خیال میں روشن خیالی کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ روشن خیالی ہی کو وہ ترقی کا محرک سمجھتے تھے۔ تعلیم کی بنیاد وہ انسانی ذہن کی نئی فتوحات قرار دیتے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ انسانی زندگی، معاشرے، ثقافت، اخلاقیات، سائنس اور آرٹ نے اب تک جو ترقی کی ہے اسے گہرے غور و فکر کا موضوع بنایا جائے اور اس منتھن کے بعد جو ہاتھ آئے صرف اسے امرت سمجھا جائے۔ وہ ثقافت اور ٹکنولوجی کی ترقی کو ملک کی طاقت اور خوشحالی کی ضمانت قرار دیتے تھے۔

سرسید درسگاہ کو انسانی شخصیت کو زرخیز اور جدید بنانے کا ایک وسیلہ قرار دیتے تھے۔ ان کے عزائم کا عطر ان کے اس بیان میں موجود ہے :-

"اے دوستو مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے"

یوں سرسید یہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا جائے تاکہ عام ثقافتی اور اخلاقی معیار بلند ہوں اور نئے عہد کے تقاضے پورے کیے جا سکیں۔

یہ کام وسیع پیمانے پر اور کامیابی کے ساتھ اسی طرح انجام دیا جا سکتا تھا کہ مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے لیکن انگریزی نوآبادیت اور ہندوستان کے قومی تقاضوں کے مابین جو تضادات تھے، انہوں نے ایسی گتھیاں پیدا کیں جو آج تک سلجھائی نہیں جا سکیں۔ اردو اس صورتِ حال میں ایک ایسی زبان نظر آتی ہے جو ڈیڑھ سو برس قبل ہی اپنے امکانات کا برسوں تک عملی ثبوت دینے کے باوجود آج تک جدید تعلیم کے لیے بے مصرف قرار دی جا رہی ہے

دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو زبان اور اسے جدید تعلیم کے لیے استعمال کرنے والوں نے بر تک انگریزی زبان میں یہ تعلیم حاصل کرنے والوں پر اپنی برتری ثابت کی۔ ۷/مارچ ۱۸۳۵ کو بنٹینگ کی یہ بات تسلیم کی گئی کہ انگریزی ذریعہ تعلیم ہو۔ اس وقت جب اردو کو بھی جدید تعلیم کا ذ کی وکالت کی گئی تو نفی کے لیے وہی دلیل دی گئی جس کا سلسلہ آج تک برقرار ہے، یعنی اس کو ذریعہ ت کے لیے کتابیں کہاں ہیں!

لیکن ۱۸۵۷ سے قبل دہلی کالج میں اردو کے ذریعے جو کارنامہ انجام دیا جارہا تھا، وہ آج بھی س ہے۔ دہلی کالج میں مغربی علوم یعنی ہیئت، ریاضیات، فلسفہ، نیچرل فلاسفی اور تاریخ وغیرہ کی تعلیم کا ذ تھی۔ بات اتنی ہی نہیں تھی۔ پرنسپل کارگل نے ۱۸۵۲ میں کالج کے بارے میں جو سالانہ رپورٹ تیا، اس میں یہ حقیقت بھی درج تھی:۔

"مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبہ والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے"

اس رپورٹ کی صداقت کا اعتراف لیفٹیننٹ گورنر نے ان لفظوں میں کیا تھا:۔

"طلبا (شعبۂ مشرقی) کی سائنس کی ترقی کے متعلق جو یقین دلایا گیا ہے، اس سے بے حد مسرت ہوئی یہ کوئی حادثہ یا اکلوتا واقعہ نہیں تھا۔ کونسل آف ایجوکیشن بنگال کے سیکریٹری اور میڈیکل کا فزیشین فریڈرک جان موآٹ نے دہلی کالج کے سائنس کے ان طلبا کی لیاقت کا امتحان لیا تھا جو تعلیم حاصل کررہے تھے۔ ان کی رپورٹ کے بعد تعلیم عامہ کی جنرل کمیٹی نے اپنی ایک قرارداد میں ان کی رائے درج کی تھی:۔

"اردو کے ذریعے دہلی کالج میں جو سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی مسٹر موآٹ نے بہت تعریف کی ہے"

۱۸۵۶ تک یہی صورت حال تھی اور اردو کے ذریعے جدید علوم پڑھنے والے ان طالب علموں پر سب حاصل کررہے تھے جو انگریزی کے ذریعے یہ علوم حاصل کررہے تھے۔ اس حقیقت سے اس مفروضے کی ہو ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

جدید علم کی تعلیمی زبان بن کر اردو ایک اور اہم کام انجام دے رہی تھی اور وہ تھا روشن خیالی کو فر خود ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسر اس حقیقت کے معترف تھے۔ چنانچہ مغربی شمالی صوبوں کے ناظم تعلیمات نے اپنی رپورٹ میں یہ کہا تھا کہ دہلی کالج میں شعبۂ مشرقی برقرار رکھا جائے کیوں کہ اس کے سبب اردو نہ صرف علوم کی اشاعت ہوتی ہے بلکہ روشن خیالی بھی پھیلتی ہے۔

لیکن انگریزی سامراجیت ہندوستان میں نہ تو جدید علوم کی اشاعت چاہتی تھی اور نہ ہی رو کا فروغ اسی لیے اس نے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا اور علم کے پر باندھے تاکہ نہ تو ہندوستانی ذہن کشا

اور نہ ہی ہندوستانیوں کی صلاحیتوں کو جلا نصیب ہو۔ انگریزی مسلط کر دیئے جانے کے باوجود ۱۸۶۷ء میں ورنیکلر یونیورسٹی کی تحریک شروع کی گئی۔ اس میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مطالبہ بھی شامل تھا برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے وائسرائے کو جو عرض داشت بھیجی گئی تھی، اس میں یہ مطالبہ تھا کہ :-

"اعلیٰ درجے کی تعلیم کا ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے۔"

سرسید مادری زبان اور اس وقت کے تہذیبی ولسانی نقشے میں اردو کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے اردو زبان نے جس طرح مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک لڑی میں پرو یا، انہیں اس حقیقت کا بھی بخوبی احساس تھا اور اس لڑی کو توڑنے، کاٹنے اور بانٹنے کے خطرناک نتائج سے انہوں نے آگاہ بھی کیا تھا۔ صرف اقتصادی معاملات نہیں، بلکہ سماجی واقعات بھی، نفاق اور افتراق کی راہ ہموار کرتے ہیں، سرسید اس جدلیاتی حقیقت کی طرف متوجہ کر چکے تھے۔ زبان کا جھگڑا جس طرح مذہبی اور فرقہ وارانہ مخاصمتوں کا روپ لے رہا تھا اس کی پیش گوئی ان لفظوں میں کر چکے تھے کہ :-

"ہندو علیحدہ مسلمان علیحدہ ہو جاویں گے۔"

یعنی وہ مادری زبان کی، اردو کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ مگر سامراجیت نے ہمارے ملک کی معیشت کی طرح ہمارے تہذیبی ڈھانچے کو بھی اپنے اغراض ومقاصد کے لیے مسخ کیا۔ انگریزی کو اسی لیے تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا تاکہ ایک ایسی نوکرشاہی وضع کی جائے جو عام لوگوں سے ہر اعتبار سے کٹی ہوئی ہو۔ سرسید کے زمانے کی طرح یہ مسئلہ آج بھی لاینحل ہے کہ اپنی تہذیبی خو بو برقرار رکھتے ہوئے سائنس اور ٹیکنولوجی کی برکتوں سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے؟ روشن خیالی کو کس طرح فروغ بخشا جائے؟ انگریزی اور ہندوستانی علاقائی زبانوں کے مابین تعلیم سمیت زندگی کے ہر شعبے میں استعمال کی کشمکش اب ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے کہ ہندوستانی زبانوں کی فیصلہ کن فتح سامنے نظر آ رہی ہے۔ ایسے میں اردو کو کہاں استعمال کیا جائے جو ڈیڑھ سو برس قبل نام نہاد مغربی علوم کی تعلیم کا کامیاب ذریعہ بننے کا ثبوت فراہم کر چکی ہے؟

تاریخ کے اس موڑ پر بھی، اکیسویں صدی کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے بھی کیا ہم سرسید کی مرادیں بر لانے کے بارے میں ٹھنڈے دل سے نہ سوچیں؟ کیوں نہ ہم اس بات پر غور کریں کہ سرسید کے اس گلستان میں اردو کو وہ درجہ دے دیا جائے جو اسے قدیم دہلی کالج میں حاصل تھا؟

(مدیر)

پروفیسر شفیق احمد صدیقی*

خراج عقیدت

سر سید کے انتقال کو اب ایک صدی پورا ہوا چاہتی ہے۔ ان کی تقریباً ۸۰ سال کی عمر کا لف
متنازعہ نیک نامی میں بسر ہوا۔ باوجودیکہ انہوں نے مغل دربار سے تعلق قائم نہیں کیا، ان کو مغل باد
کا موروثی خطاب "جواد الدولہ" عطا کیا اور اس پر "عارف جنگ" کا مزید اضافہ کیا۔ سید الاخبار میں
سے وہ ایک اہلِ قلم اور صحافی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ دلی کے ذی علم لوگوں میں ان کو رسوخ
رہا۔ آثار الصنادید لکھ کر انہوں نے دادِ تحقیق دی جس کا اعتراف یورپ کے اہلِ علم نے کیا۔ اسی کی بنا
انھیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا فیلو مقرر کیا گیا۔ انگریزی حکومت کی ملازمت کی تو اپنی فرض شناسی
کے لیے نام پیدا کیا، اپنی صداقت، دیانت اور محنت سے انہوں نے افسران بالا اور حکومت کا اعتماد
اعتماد کے باعث تو "اسباب بغاوت ہند" میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کے سلسلے میں جو
اسے حکومت کے ہمدرد اور بہی خواہ کی ایسی رائے قرار دیا گیا جو غور کیے جانے کے قابل تھی۔ غرض کہ ا
بہت سی چھوٹی بڑی باتیں، ان کی زندگی کو استوار کرتی رہیں اور بقول حالی:

"جو کچھ ان سے چالیس برس بعد ظہور میں آیا، وہ اس کے لیے بچپن ہی سے تیار ہو رہے تھے۔"
۱۸۵۷ء کے انقلاب نے سوتوں کو جھنجھوڑا، نیم بیدار لوگوں کو بیدار کیا اور بیدار لوگوں کو عمل پر کمربستہ کرد
تیسرے زمرے سے تعلق رکھتے تھے۔ انقلاب، اس سے پیدا ہونے والی تباہی اور بربادی، نئی قوت کے
اور اس کے جلو میں آنے والی تبدیلیوں نیز احساس شکست نے ابتدا میں سر سید کو نہایت مایوس کیا او
ارادہ کیا کہ وہ ہندوستان چھوڑ کر مصر یا کسی دوسرے ملک میں جا بسیں گے۔ کوئی تیس سال بعد ا
کیفیت کا اس طرح بیان کیا ہے:

"غدر میں جو حال انگریزوں اور ان کے بچوں اور عورتوں پر گزرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا ا
نامی نامی خاندان برباد و تباہ ہوئے، ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے۔
کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا، نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا، جو کچھ رنج تھا اپن

---

* سر سید نگر، علی گڑھ

کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا......میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا، وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مراد آباد میں آیا جو ایک بڑا غمکدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا، اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"

اس قومی ہمدردی میں سرسید نے سیاسی رخ اختیار نہیں کیا، نہ کوئی سیاسی جماعت بنائی جس کا اس زمانے میں امکان بھی نہیں تھا)، نہ لوگوں کے جذبات کو مشتعل کیا، نہ کوئی تصادم کی راہ اختیار کی، بلکہ انھوں نے تعمیر قومی کے منصوبے بنائے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ ان کے تعمیری منصوبے اور عمل بتدریج اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے متنازعہ فیہ ہونے کی بنیاد بن گئے۔ جتنا جتنا انھوں نے آگے قدم بڑھایا اتنا ہی ان کی مخالفتوں میں بھی شدت پیدا ہوئی، یہاں تک کہ ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔ مگر وہ مرد آہن اپنی جگہ اٹل رہا۔ یہاں تک کہ اس کے ساتھی بھی پکار اٹھے ؎

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں ۔۔۔ بھائی سید تو کچھ دوانے ہیں

اور بالآخر زمانے نے ثابت کر دیا کہ اس "دوانے" ہی کا موقف درست تھا۔ اگر ایک طرف انھوں نے تاریخ سرکشی ضلع بجنور" اور "رسالہ اسباب بغاوت ہند" لکھ کر ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی نفرت اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف انہوں نے تعلیم کا نقشہ بھی جمانا شروع کیا۔ پہلا کام راستے کے کانٹوں اور زمین کی ناہمواریوں کو دور کرنے کے مترادف تھا تو دوسرا تعمیر کی بنیاد رکھنے کا آغاز تھا۔ ۱۸۵۹ء میں انھوں نے پہلا مدرسہ مراد آباد میں قائم کیا۔ یہ فارسی مدرسہ تھا اور بقول حالی مراد آباد میں اس سے پہلے کوئی مدرسہ نہ تھا۔ لیکن بعد میں وہاں سرکاری مدرسہ قائم ہوا تو اسے بھی اس میں ضم کر دیا گیا۔ یہ محض ایک مدرسے کا کھلنا اور بند ہونا نہ تھا، بلکہ یہ سرسید کی تعلیمی فکر کا اشاریہ بھی تھا۔ اور اس بات کی علامت بھی کہ سرسید زندگی کو نمو پذیر تسلیم کرتے تھے اور یہ بھی مانتے تھے کہ نمو پذیری کے عمل میں تبدیلیاں واقع ہونا ضروری ہیں۔ جن قوموں اور طبقوں کو قوت و اقتدار حاصل ہے، وہ ان تبدیلیوں کو اپنی منشا کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اور حسب دلخواہ ان کا رخ متعین کرتے ہیں جن کو قوت و اختیار حاصل نہ ہو ان کے لیے تین راستے کھلے رہتے ہیں: ان تبدیلیوں کو من وعن قبول کرلیں اور انھیں کے رنگ میں رنگ جائیں؛ تبدیلی کی ہر صورت کو مسترد کر دیں، قدیم ڈگر سے سرمو نہ ہٹیں اور زمانے کو اس کی راہ آگے بڑھنے دیں؛ زمانے کے تقاضوں کو سمجھیں اور ان کے پیش نظر تبدیلیوں کو جزوی طور پر قبول اور ان کے صالح عناصر

کو اختیار کرلیں۔ سر سید دوسرے طبقے سے تعلق رکھتے تھے، جس کو قوت و اختیار کچھ بھی حاصل نہیں تھا اور ان راستوں میں سے تیسرے راستے کو اختیار کیا۔

مغل دور میں فارسی دربار کی زبان تھی۔ وہی علم و ادب، شعر و شاعری، درس و تدریس کی ز اس دور کا علمی سرمایہ بھی اسی زبان میں تھا۔ لیکن فارسی ہندوستان کی عوامی زبان نہیں تھی اور لسانی کسی زبان کو جس عوامی قوت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اسے حاصل نہیں تھی۔ اس لیے فارسی کی پس ر تھی۔ بالخصوص زوال حکومت کے ساتھ اس میں اور زیادہ تیزی پیدا ہوگئی تھی۔ ادبی محاذ پر اٹھارویں ابتدا میں ہی اس بات کو محسوس کرلیا گیا تھا۔ اسی لیے تو سراج الدین علی خاں آرزو نے مرزا محمد رفیع سودا آزاد مشورہ دیا تھا کہ

"فارسی اب تمہاری زبان مادری نہیں۔ اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمہارا کلام اہل زبان کے مقابل میں قابل تعریف ہو۔ طبع موزوں ہے۔ شعر سے نہایت مناسبت رکھتی ہے۔ تم اردو کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہوگے"

انیسویں صدی شروع ہوتے ہی کمپنی بہادر نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈال دی تھی، جہاں انگریز اردو کی تعلیم دی جاتی تھی، ۱۸۲۵ء میں دہلی میں دلی کالج قائم کیا تو ہندوستانیوں کے لیے اردو میں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ ساتھ ہی جدید علوم کی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی ہونا شروع ہوا۔ سے تو اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ لیکن یہ بات بھی عام طور پر محسوس کی جارہی تھی کہ جا کا جو سرمایہ انگریزی میں موجود ہے اور جس میں برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے، اس سے فارسی اردو اور ہندوستا ساری ہی زبانیں محروم ہیں۔ اس علمی برتری سے انگریزی کی عظمت کا سکہ قائم ہوگیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میر کا کلی اقتدار قائم ہونے کے بعد انگریزی کی عظمت میں اور اضافہ ہوگیا کہ یہ حکمرانوں کی زبان تھی اور اعلیٰ سطح پر زبان بھی۔ تمام تر شواہد بتا رہے تھے کہ اب انگریزی کی حکمرانی قائم ہورہی ہے، حکومت اور اس سے متعلق م میں موثر شرکت انہیں لوگوں کی ہوسکتی ہے جو انگریزی سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہوں۔ کچھ طبقات نے جن کوئی لسانی میراث نہیں تھی اور جنہیں فارسی، اردو سے کوئی دلبستگی اور دلچسپی نہیں تھی، انگریزی کو بلاپ قبول کرلیا تھا اور وہی حکومت کے معاملات میں بھی پیش پیش تھے۔ اس لیے یہ بڑا سوال اٹھ کھڑا کہ ذریعۂ تعلیم کون سی زبان ہو ـــــ مادری زبان جو سب سے زیادہ موثر ذریعہ تعلیم ہوتی ہے، یا انگ میں علوم کا خزانہ بھی تھا اور جو حکمرانوں کی زبان بھی تھی؟ بیدار ذہن اس سوال کا جواب حاصل کر غلطاں پیچاں تھے۔ سر سید اس مسئلے پر برابر غور کرتے رہے۔ فارسی مدرسے کا بند کرکے اسے سرکاری (اردو میں ضم کر دینا بھی اسی غور و فکر کا نتیجہ تھا۔ تعلیم ضروری تھی۔ اس کا موثر نظام قائم کرنا بھی ضروری تھا بات بھی عیاں ہوچکی تھی کہ اب فارسی تعلیم وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت سے محروم ہوچکی سر سید عملی آدمی تھے۔ جب ان کو اس باب میں شرح صدر حاصل ہوگیا تو انہوں نے بلا توقف اپنے موقف بدل دیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنے ایک آرٹیکل "رائے در باب تعلیم" میں لکھا تھا:

"ہم کو چاہیے کہ اس بات پر بھی غور کریں کہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم چاہتے ہیں آیا اس زبان کی حالت ایسی ہے یا نہیں کہ اس زبان میں تعلیم کا ہونا ممکن ہو؟"

دراصل یہ رائے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے خلاف تھی، خاص طور پر اعلیٰ تعلیم کی سطح پر کہ اس وقت اردو میں کتابیں ہی مفقود تھیں۔ اگرچہ نصابی ضرورت کی کتابیں دلی کالج میں ترجمہ ہو چکی تھیں اور پھر بعد میں خود سرسید کی قائم کردہ سائنٹیفک سوسائٹی نے بھی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کرایا تھا، مگر گنتی کی چند کتابیں تعلیم کا مقصد پورا نہیں کر سکتی تھیں۔ اسی آرٹیکل میں آگے چل کر انھوں نے لکھا:

"انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی ترقی اس میں ہو سکتی ہے۔"

مگر ذریعہ تعلیم تو ایک ضمنی معاملہ تھا، اصل مسئلہ تو تعلیم کا تھا۔ آخر تعلیم کا وظیفہ کیا تھا؟ کیا صرف یہ کہ ہندوستانی باشندے تھوڑی سی زبان (انگریزی) جغرافیہ اور حساب وغیرہ سیکھ کر حکومت کی مشینری کا ادنیٰ سا پرزہ بن جائیں؟ سرسید اس کے سخت مخالف تھے۔ اسی لیے وہ حکومت کی تعلیمی پالیسی پر برابر اعتراض کرتے رہے۔ اپنے اسی آرٹیکل میں انھوں نے لکھا:

"ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اس کی عقل اور ذہن میں جودت پیدا ہو تاکہ جو امور پیش آئیں ان کے سمجھنے کی برائی بھلائی جاننے کی اور عجائب قدرت الٰہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو، اس کے اخلاق درست ہوں، معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امور معاد پر غور کرے۔"

یہ سرسید کے ۱۸۵۹ء کے خیالات تھے، بعد میں ان کا سارا فلسفہ تعلیم اسی بنیاد پر قائم ہوا۔ وہ تقریباً پندرہ سال ان امور پر غور کرتے رہے۔ سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام اور اس کی گوناگوں مساعی، غازی پور میں مدرسے کا قیام، سائنٹیفک سوسائٹی گزٹ کا اجرا اور اس میں سرسید کی تحریروں کی اشاعت، ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کی تحریک انگلستان کے سفر کے دوران وہاں کی تعلیم و ترقی کا مشاہدہ، وہاں کے نظام تعلیم کے نقائص کی نشاندہی وغیرہ سب امور ایسے تھے جو ان کے تصور تعلیم کی بنیادوں کو استواری فراہم کر رہے تھے۔ تہذیب الاخلاق کے اجرا کا مقصد بھی انھیں تصورات کی عمل آوری کے لیے راہیں ہموار کرنا تھا۔ کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان ہند کا قیام اور اس کے تحت ہونے والے مختلف اقدامات تو اس کالج کے قیام کے لیے عملی اقدام تھے، جہاں سرسید اپنے تعلیمی تصورات کو عملی شکل دینا چاہتے تھے۔ ابتدا تو ایک معمولی سے مدرسے سے ہوئی تھی، لیکن بنیادی اسکیم میں یہ وضاحت موجود تھی کہ اصل مقصد ایک مدرسے یا کالج کا قیام نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنا ہے اور وہ بھی ایسی یونیورسٹی جو قوم کے ذریعہ قوم کے لیے قائم کی جائے جس میں گورنمنٹ کی طرف سے "نگران حال" ہونے کے علاوہ کسی طرح کی مداخلت نہ ہو تاکہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ان کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام کیا جائے۔ سرسید اور ان کے رفقا کو یقین تھا کہ

"جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ان کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا، تب تک

اصلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی۔"

وہ چاہتے تھے کہ یہاں سے

"ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال پھیلانے کے لیے بمنزلہ آلہ ہو۔"

آگے چل کر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہ مجلس بھی ایم۔اے۔او کالج کا ہی ا جسے سرسید نے اس لیے قائم کیا کہ وہ مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج و اشاعت کرے اور معاشرتی امو کی رہنمائی کرے۔ اس مجلس نے تقریباً ساٹھ سال تک یہ وظیفہ بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس نے تعلیم قریہ قریہ پھیلایا، معاشرتی اصلاح میں جدوجہد کی، اقتصادی امور کے سلسلے میں بیداری پیدا کی۔ کا بننے میں اس کی مساعی کو بڑا دخل رہا۔

ان معروضات اور سرسید نیز ان کے رفقا کی تحریروں اور تقریروں پر غور کیجیے تو صاف م کہ ان کے پیش نظر تعمیر قومی کا ایک ہمہ جہتی تصور تھا۔ یہ ادارہ بھی اس کے لیے ایک ذریعہ تھا۔ اس کے قیام میں مندرجہ ذیل تصورات شامل تھے:

(۱) اسے مدرسے / کالج سے ایک یونیورسٹی میں منتقل ہو جانا ہے؛

(۲) اس یونیورسٹی کا نظام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو جہاں وہ اپنی ضرورتوں کے مطابق تعلیمی خاک

(۳) یہ محض تدریسی ادارہ نہ ہو بلکہ اعلیٰ تحقیق کا مرکز بن جائے جہاں جودت طبع بیدار ہو اور ا کا موقع بھی ملے؛

(۴) یہ ادارہ ایسا منبع و ماخذ بن جائے جس سے علم و تحقیق کی سوتیں پھوٹیں اور تمام قوم میں علم روشنی پھیلے؛

(۵) یہاں ایسے تربیت یافتہ ذہن تیار ہوں جو آئندہ ملک و قوم کے لیے سرمایۂ فلاح ثابت ہوں

(۶) یہ ادارہ مسلمانان ہند کی تعلیم، تہذیب و ثقافت اور دانشورانہ قیادت کا مرکز بن جا

ان میں سے آخری شق شاید عجیب معلوم ہوتی ہو۔ لیکن اگر یونیورسٹی کا تصور محض تعلیمی ف ہے تو یہ یونیورسٹی کے بنیادی تقاضوں میں سے ایک ہے۔ وہ ایم۔اے۔او کالج ہو یا علی گڑھ مسلم یہ تصور کبھی اس سے جدا نہیں رہا۔ خواہ اس فرض کو کما حقہ ادا نہ کیا جا سکا ہو، لیکن اسے کبھی نظروں بھی نہیں ہونے دیا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۸۰ء میں یونیورسٹی کا جو بنیادی دستور پارلیمنٹ سے منظور ہوا، اس میں کی بنیادی ذمہ داریوں میں یہ بات شامل کی گئی کہ یہ مسلمانانِ ہند کے تعلیمی اور ثقافتی امور کے فر کوشش کرے گی۔ یہ تقاضا اخلاقی تو ہمیشہ رہا اور کسی نہ کسی درجے میں اس پر عمل درآمد بھی ہوتا رہا یہ ایسا دستوری اور لزومی امر ہے جو یونیورسٹی کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اور جس پر عمل کے لیے بھی یونیورسٹی پابند ہے۔ یہ ملت کے ان تمام مفکروں اور بہی خواہوں کی امنگوں اور آرزوؤں ہے جنھوں نے اس دستور کا مسودہ کیا۔ ملک کی سب سے بڑی مقننہ پارلیمان نے اس پر مہر

کی اس طرح ملک کی جمہوری رائے بھی اسے استحکام بخشتی ہے۔ اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ یہ امر علی گڑھ کی اسپرٹ کے عین مطابق اور سرسید کے خوابوں کی تعبیرات میں سے بھی ایک ہے۔

ملک میں اس وقت تعلیمی خلفشار ہے۔ تعلیم صرف خواص کا حصہ نہیں رہ گئی ہے بلکہ جمہور عوام بھی اس میں شریک ہوتے جا رہے ہیں۔ روایتی تعلیم کم از کم ہوتی جا رہی ہے۔ سائنسی تکنیکی اور تکنیکیاتی تعلیم کی اہمیت روز افزوں ہے۔ تعلیم میں نئے تجربے کیے جا رہے ہیں، نئے منصوبے بن رہے ہیں، نئے نتائج بھی برآمد ہو رہے ہیں مجموعی طور پر سیل تعلیم آگے بڑھ رہا ہے۔ جو لوگ چشم و گوش وا رکھے ہوئے ہیں وہ اس کی اترتی چڑھتی لہروں کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، باقی پس روی کا شکار ہیں۔ زمانے کا اصول ہی یہ ہے ؎

چلتے جو رہے نکل گئے ہیں ٹھہرے جو ذرا کچل گئے ہیں

اول تو ملک میں مسلم تعلیمی ادارے تعداد کے اعتبار سے ہی کتنے ہیں اور جو ہیں وہ پہلے ہی بدحالی کا شکار ہیں خستہ و نزار حالت میں ہیں۔ اکثر و بیشتر موجودہ انقلابی صورت حال سے بے خبر اور بے نیاز اور شاید اس وقت تک نہ چیتیں جب تک یہ سیلاب ان کے سروں ہی سے نہ گزر جائے۔ مگر اس وقت چیتنا لاحاصل ہوگا۔ صورت حال اس امر کی متقاضی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنی اس قائدانہ ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے کمربستہ ہو۔ مسلمانان ہند کی تعلیم کا ایک مربوط خاکہ بنائے۔ اسکولی تعلیم چونکہ ریاستی ذمہ داری ہے اس لیے ریاستی فرق و امتیازات موجود ہیں، لیکن بہت سے امور میں نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا ہو چکی ہے۔ مثلاً ۱۰+۲+۳ کا نظام سارے ملک میں رائج ہے، تکنیکیاتی تعلیم پر ہر جگہ توجہ دی جا رہی ہے، نئے کورس ہر جگہ وضع کیے جا رہے ہیں وغیرہ پھر ثانوی تعلیم کے مرکزی بورڈ سے وابستہ اسکولوں کا جال پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ ان تمام اسکولوں میں نصابات وغیرہ کی یکسانیت موجود ہے۔ اس لیے ایک ایسا مربوط خاکہ ضرور بنایا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ مختلف ریاستوں کے تعلیمی اداروں کی رہنمائی کی جا سکے۔ رہنمائی کے کچھ پہلو مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں:

- بدلتے ہوئے تعلیمی منظرنامے سے جدید ترین واقفیت بہم پہنچانا
- تعلیمی طریق کار میں بہتری پیدا کرنے کی کوشش
- تعلیمی معیاروں کو بہتر بنانے کی کوشش
- معلمین کی تازہ کاری کے پروگرام
- منتظمین کے تربیتی پروگرام
- ان تعلیمی اداروں کو بہتر بنانے اور اوپر اٹھانے کی کوشش
- نئے تعلیمی اداروں کے قیام کی کوشش

دستور بنے ہوئے اب تقریباً پندرہ سال ہو رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی ٹھوس اقدام ابھی تک نہیں کیا جا سکا۔ ۱۹۹۵ء یونیورسٹی کی پلیٹنم جوبلی کا سال ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ پروگرام اس سال شروع کر دیے جائیں اور جب تین سال بعد سرسید صدی منائی جائے تو اس پروگرام سے حاصل ہونے والے بہت سے نتائج سید والا گہر کی روح کو خراج عقیدت کے طور پر پیش کیے جا سکیں کہ ان کے لیے یہی صحیح اور مناسب خراج عقیدت ہوگا۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۵ء

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی *

سرسید کے تفسیری اصول

سیّد احمد علیہ الرحمۃ (۹۸ — ۱۸۱۷ء) نے مسلم معاشرے اور اسلامی امت کی اصلاح و ترقی کا جو بیڑا اٹھایا تھ
فکری و عملی کارنامے بھی شامل ہیں اور عملی و مادی اقدامات بھی۔ ان کا عقیدہ تھا اور بجا عقیدہ تھا کہ فکر و خیال کی را
اقدام و عمل درست نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انھوں نے بالکل شروع سے ان دونوں سطحوں پر کام شروع کیا: فکر و خیا
کے لیے مضامین و مقالات اور کتابیں لکھیں اور عملی اقدامات کے بطور انجمنیں، مجلسیں اور ادارے قائم کیے[1]

چوں کہ سرسیّد بذات خود ایک مخلص، باعمل اور باشعور مسلمان تھے، اس لیے وہ اصلاحِ فکر و عقیدہ میں
اہم مذہبی عقائد و خیالات کی درستی کو سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک صحیح اور کتاب و سنت کے مطابق معتقدات کے بغیر بہتری م
نہ دنیا درست ہو سکتی تھی نہ عقبیٰ۔ ظاہر ہے کہ فکری اصلاح میں اولیں درجہ قرآن مجید کی صحیح تفہیم کا آتا ہے کہ اسی
"مدار قوت دینی" ہے[2]

سرسیّد نے اس دینی ضرورت اور قومی بہبود کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بہت سے تفسیری م
اور ان کے ساتھ ساتھ اپنے اصلاحی نقطۂ نظر سے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی۔ اس کام کے نقطۂ آغاز کی تعیین زمانی اتنی ضر
جتنی یہ حقیقت کہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے تقریباً آغاز سے انھوں نے مضامین قرآنی لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا
جاری رہا۔ بقول شخصے:

"جدید خیالات کی اس جدید تفسیر کا سلسلہ ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء سے شروع ہوا اور سرسید کی آخرِ عمر
تک جاری رہا۔ مگر مکمل نہ ہو سکا اور صرف ابتدائی ۱۴ پاروں کی تفسیر سورۂ نحل تک شائع ہوئی"[3]

مگر ایک دوسرے تبصرے بلکہ تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسیّد کی تفسیر ۱۶ پاروں پر مشتمل ہے اور سورہ طٰہٰ تک چھپی ہے۔ اگرچہ آ
اُن کی حیات مستعار کے بعد شائع ہو سکی[4]

اپنی تفسیر القرآن اور دوسرے قرآنی مضامین میں منتشر طور سے سرسیّد نے اپنی تفسیری اصول کی طرف مختصر اشا
ہیں لیکن ایک جگہ نسبتاً کافی وضاحت اور خاصی تفصیل سے ان پر اپنے ایک رسالے میں بحث کی ہے جو تحریر فی اصول ال
کے عنوان سے موسوم ہے۔ محمد اسمٰعیل پانی پتی کے مطابق یہ رسالہ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں شائع ہوا اور محمد ضیاء الدین انصاری

---

* ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

وہ مطبع مفید عام آگرہ سے اسی سنہ عیسوی میں چھپا تھا اور ۶۲ صفحات پر مشتمل تھا۔[۴۵] ہمارا مقالہ مولانا اسمٰعیل پانی پتی کے مرتب کردہ رسالہ پر مبنی ہے۔ وہ دراصل نواب محسن الملک سیّد مہدی علی خاں (م ۱۹۰۷ء ۔ ۱۸۳۷ء) کے دو خطوط نما استفسارات کے سرسیدی جواب پر مشتمل ہے۔ سرسیّد کا علمی انصاف ہے کہ انھوں نے محسن الملک کے دونوں تنقیدی خطوط کا متن بھی نقل کیا۔ ہے اور پھر اپنے تفسیری اصول کی صراحت کی ہے۔[۴۶]

یہ رسالہ بہت مختصر ہے اور جیسا کہ سرسیّد والا گہر نے فوراً وضاحت کردی ہے کہ :

"میرا ارادہ تھا کہ جب میری تفسیر پوری ہوجاوے گی اور اول سے آخر تک قرآن بنظر غائر تمام ہوجاوے گا۔ اس وقت میں دیباچہ تفسیر کا لکھوں گا اور اس میں وہ تمام اصول بیان کروں گا جو تفسیر لکھنے میں میں نے اختیار کیے ہیں مگر چونکہ اس کو زمانہ دراز درکار تھا اس لیے میں نے خیال کیا کہ مقدم اصولوں کو... لکھ دوں اور باقی اصول اس وقت پر منحصر رکھوں جب کہ تفسیر تمام ہوجاوے"..."[۴۷]

سرسیّد کے تفسیری اصولوں کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے متعدد کا تفسیر و تشریح سے زیادہ عقیدۂ فکر کی جولان گاہ سے تعلق ہے جیسے اصل اول "ایک خدا خالق کائنات موجود ہے"۔ اصل ثانی انبیاء کی بعثت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمی المرسلین ہونے سے، اصل سوم کا قرآن مجید کے کلام ہونے اور اصل چہارم کا قرآن مجید کے الفاظ سمیت قلب محمدی پر نازل ہونے سے تعلق ہے اور ان سب کا تعلق عقیدہ اور فکر سے زیادہ ہے۔ اسی طرح بعد کے دوسرے اصول کا معاملہ ہے۔ پانچواں اصول قرآن مجید کی صداقت سے بحث کرتا ہے جب کہ چھٹا اصول صفاتِ الٰہی مذکورہ در قرآن مجید کی صداقت سے متعلق ہے۔ ساتواں اصول بیان کرتا ہے کہ "صفات باری عین ذات ہیں اور وہ مثل ذات کے ازلی و ابدی ہیں اور مقتضائے ذات ظہور صفات ہے۔.."[۴۸] یہ تمام اصول فکر و عقیدے سے متعلق ہیں نہ کہ تفسیر و تشریح کے میدان میں آتے ہیں۔

آٹھواں تفسیری اصول "تمام صفات باری کی نامحدود اور مطلق عن القیود" ہونے سے بحث کرنے کے علاوہ یہ بھی وضاحت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کرنے کا اسی طرح مختار ہے جس طرح قانون فطرت قائم کرنے پر قادر ہے اور وعدۂ الٰہی اس کی قدرت کو محدود نہیں کرتا اور نہ وعدۂ الٰہی اور قانون فطرت میں تخلف ممکن ہے۔ سرسیّد نے اس اصول کی تفسیر مزید میں مختلف آیاتِ قرآنی سے استدلال کیا ہے۔ سرسیّد کا یہ اصول تفسیر زیادہ اہم ہے کہ وہ ان کی تفسیری نہج کو متعین کرتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ اُن کا پہلا تفسیری اصول ہے۔

سرسیّد نے اس نکتہ پر بہت زور دیا ہے کہ قرآن مجید اور کائنات کے قوانین میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں یا ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔ کیوں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا "قولی وعدہ ہے اور قانون فطرت عملی وعدہ" اُس قانون فطرت میں سے بہت کچھ خدا نے ہم کو بتایا ہے اور بہت کچھ انسان نے دریافت کیا ہے گو کہ انسان کو ابھی بہت کچھ دریافت نہ ہوا ہو اور کیا عجب کہ بہت کچھ دریافت نہ ہو مگر جس قدر دریافت ہوا ہے وہ بلا شبہ خدا کا عملی وعدہ ہے جس سے مختلف قولی وعدہ کے تخلف کے مساوی ہے جو کبھی نہیں ہوسکتا۔" پھر مفسر مرحوم نے عام قانونِ فطرت کے غیر مبدل ہونے سے متعلق کئی آیاتِ قرآنی نقل کی ہیں اور تخلیق انسان، تعیین منازل شمس و قمر، حرکت زمین، تاثیر آتش و آب اور فوائد بارش وغیرہ سے متعلق خاص قوانین فطرت پر روشنی ڈالنے والی آیات نقل کی ہیں اور اپنے دعوے کو مدلل کیا ہے۔ سرسیّد نے قرآن مجید کے بیان کردہ قوانین فطرت کو نہ صرف عام غیر مبدل مانا ہے بلکہ ان کے مستثنیات ہونے سے انکار کیا ہے کہ قرآن مجید سے استثنا ثابت نہیں ہوتا

اسی طرح وہ امکانِ عقلی کو وجودی شے نہیں مانتے کہ "صرف ایک خیال غیر محقق الوقوع ہے"۔ اس نکتہ کی تشریح میں یہ وضاحت کرتے ہیں کہ:

"یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ... کوئی قانون فطرت ایسا ہو جس سے مستثنیات ثابت ہوتے ہوں۔ اور امکان کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جو کبھی ہوا اور کبھی نہ ہو۔ لیکن جس چیز کا کبھی وقوع ثابت نہ ہوا ہو تو اس پر امکان کا اطلاق غلط اور محض سفسطہ ہے..."[۹]

نواں سرسید کی اصول تفسیر آٹھویں اصول کی توسیع ہے کہ وہ قرآن مجید کی آیات اور قانون فطرت میں مکمل ہم آہنگی تسلیم کرتے ہیں اور قانون فطرت کا مخالف امر آیات الٰہی میں تسلیم نہیں کرتے۔ اس اصول سے سرسید یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں بقول شاہ ولی اللہ دہلوی کسی نبی کے معجزے کا یا کم از کم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی معجزے کا ذکر نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو وہ شاہ کی مانند معجزات کو مسبب باسباب مانتے ہیں اور اس قول پر معجزات کا وقوع قانون فطرت کے مطابق ہوتا ہے... اور علاوہ کہ کسی امر کے واقع ہونے کا ثبوت نہیں ہے جو ما فوق الفطرت ہوا اور جس کو تم معجزہ قرار دیتے ہو اور اگر بفرض محال خا کے حوالے پر اس کو تسلیم بھی کریں تو وہ ایک بے فائدہ امر ہوگا جو نہ مثبت کسی امر کا ہے اور نہ مسکت للخصم"۔ چنانچہ سرسید ایسی قرآنی کی تفسیر و تشریح "موافق زبان و کلام عرب کے اور موافق محاورات واستعارات قرآن مجید کے" کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ معجزے کے روایتی اور جمہوری تصور کی نفی کرتے ہیں۔[۱۰]

دسواں اصول پھر عقیدہ وفکر سے متعلق ہے کہ وہ تمام نازل شدہ قرآن مجید بتمام موجود ہونے اور کمی بیشی سے محفوظ ہونے سے متعلق ہے۔ گیارہواں اصول خاصا اہم ہے کہ "ہر ایک سورہ کی آیات کی ترتیب میرے نزدیک منصوص ہے اور یہی قول شاہ ولی اللہ کا ہے..." بارہویں اصول میں وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ نہیں ہے یعنی اس کی کوئی آیت کسی دوسری سے منسوخ نہیں ہے... سرسید آیات الٰہی میں نسخ کے ذکر سے مراد یہ لیتے ہیں کہ ان کا تعلق اسلام سے پہلے کی شریعتوں کے منسوخ ہونے سے ہے۔[۱۱]

تیرھویں اصول کے تحت سرسید قرآن مجید کے مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا نازل ہونے، مختلف اوقات کے تقاضوں کے ہونے اور اسی بنا پر مختلف اسالیب کے موجود ہونے سے بحث کرتے ہیں اور اس ضمن میں شاہ ولی اللہ صاحب کی الفوز الکبیر سے استناد حاصل کرتے ہیں۔ ان کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی شانِ نزول متعین کرنے میں روایات سے گریز کرنا چاہیئے کہ وہ ہیں اور "جہاں اس کی ضرورت ہو۔ حتی المقدور صرف قرآن مجید کے سیاق و سباق کلام سے اور اس کی طرز ادائے کلام سے تلاش کیا جاوے اور جو اصول کہ قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں ان کو ہر ایسے مقام پر ملحوظ رکھا جاوے"۔[۱۲]

سرسید نے چودھویں اصول کے تحت یہ لکھا ہے کہ

"موجودات عالم اور مصنوعات کی نسبت جو کچھ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے وہ سب ھو ھو یا بحیثیۃ من الحیثیات مطابق واقع ہے۔"

سرسید نے قرآن مجید کو ورڈ آف گاڈ اور مصنوعات عالم کو ورک آف گاڈ سے تعبیر کیا ہے اور ان دونوں کا متحد ہونا ہے اور اگر "ورڈ ورک کے کسی حیثیت سے مطابق نہیں ہے تو ایسا ورڈ، ورڈ آف گاڈ نہیں ہو سکتا"۔ یہ دراصل آٹھویں اور نویں اصول کی بازگشت ہے۔[۱۳]

پندرھواں اصول یہ ہے کہ:

"قرآن مجید بلفظہٖ کلام خدا ہے مگر جب کہ وہ عربی میں اور انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے تو اس کے معنیٰ اس طرح پر لگائے جاویں گے جیسے کہ ایک نہایت فصیح عربی زبان میں کلام کہنے والے کے معنیٰ لگائے جاتے ہیں۔"

دوسرے الفاظ میں قرآن مجید کے معانی عام فصیح عرب کلام کی طرح متعین کیے جائیں گے۔ اس ضمن میں سر سیّد نے جو ذیلی اصول وضع کیے ہیں، وہ یہ ہیں: قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر میں دوسری آیت سے مدد لینا۔ عربوں کے کلام کے مطابق استعارہ کنایہ اور مجاز وغیرہ کی رعایت کرنا۔ الفاظ جن معانی کے لیے وضع کیے گئے ہیں صرف ان میں استعمال کرنا۔ مشترک المعانی الفاظ کی تعیین کرنا، ضمائر کا مرجع متعین کرنا، مضمر کا پتہ لگانا، تحقیق معانی وغیرہ کا جاننا، معانی کی تعیین میں عقلی معارضہ یا اختلاف سے گریز کرنا، کلام جاہلیت کی کمی اور لغات وغیرہ کی تہی مائگی کے باوجود اگر ان کے خلاف کوئی معنی قرآن مجید سے حتمی طور سے متعین ہوتے ہیں تو اُن کو مراد لینا، قرآن مجید کے معانی کی تعیین میں یہ تصفیہ کرنا کہ کلام مقصود کون ہے اور کون کلام غیر مقصود، تاویل سے بچنا اور لفظ کے اصلی یا مرادی معنیٰ متعین کرنا۔ قرآن مجید میں مذکورہ قصص خاص کر انبیائے سابقین اور امم سابقہ کے واقعات میں اسرائیلی روایات سے کلی احتراز کرنا اور ظاہری الفاظ سے ان کے معانی مقرر کرنا وغیرہ۔ سر سیّد نے آخری نکتے کے ضمن میں طوفانِ نوح، نار نمرود، ولادت عیسٰی علیہ السلام، ذو النون کی مچھلی کے جنگل سے رہائی وغیرہ کے واقعات سے متعلق آیات الٰہی کے ظاہری معانی پر اصرار کیا ہے اور نہ صرف اسرائیلی روایات کو نظر انداز کرنے کو کہا ہے بلکہ ان کی غلطی کے اسباب بھی واضح کیے ہیں۔

آخر میں سر سیّد نے یہ اہم بحث کی ہے کہ وہ:

"الفاظ کے وہی معنی لیتے ہیں جو عرب جاہلیت سمجھتے تھے... موافق زبان اہل عرب کے قرآن مجید کے الفاظ کے ان معنوں پر متوجہ کرتے ہیں جو علوم کی ترقی کے سبب ہم کو صحیح اور درست معلوم ہوتے ہیں"۔

... ہم سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید کا یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرز کلام پر نازل ہوا ہے کہ اُمّی اور عالم جاہل فلسفی کسی طرح پر اس کے معنی سمجھیں۔ سیدھے سادے طور پر یا علمی و فلسفی طریقے پر مگر نتیجے میں سب متحد ہو جاتے ہیں۔"

تنقیدی تجزیہ

سر سیّد نے اپنے اصول تفسیر کا بیان اپنے اس دعوے سے شروع کیا ہے کہ:

"میں نے بقدر اپنی استعداد و طاقت کے کتب اصول تفسیر پر توجہ کی اس امید سے کہ ان میں ضرور کوئی ایسے اصول قائم کیے ہوں گے جن کا مآخذ خود قرآن مجید یا کوئی اور ایسا ہوگا جس پر کچھ کلام نہ ہو سکے مگر... کوئی ایسے اصول نہیں بتائے ہیں جن سے وہ مشکلات جو در پیش ہیں، حل ہو سکیں۔" [۵۵]

مگر ان کا یہ دعویٰ محل نظر و بحث ہے کہ خود انھوں نے کم از کم شاہ ولی اللہ دہلوی کی دو کتابوں التفہیمات الالٰہیہ اور الفوز الکبیر کا نہ صرف حوالہ دیا ہے بلکہ ان کے اقتباسات دیئے ہیں اور ان سے مستقل استفادہ کیا ہے۔ متعدد اصول سر سیدی شاہ صاحب کے افکار کا چربہ اور ان کی بازگشت ہیں۔ مثلاً چوتھے اصول کی تشریح میں تفہیمات الٰہیہ ص ۱۵۸ کا حوالہ دیا ہے کہ الفاظ و معانی دونوں ہی وحی الٰہی سے قلب محمدی پر نازل ہوئے تھے۔ اسی طرح ساتویں اصول کی وضاحت میں فلاسفہ اور متکلمین

کی ذات باری کی صفات پر بحث میں تفہیماتِ الٰہیہ سے سند پکڑی ہے۔ نویں اصول میں معجزات کے حوالے سے پھر تفہیمات ا
کا حوالہ دیا ہے۔ الفوز الکبیر کے حوالے کے گیارہویں اصول میں آیات سورہ کی اندرونی ترتیب کے بارے میں اور ترتیب
قرآن کے مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا نازل ہونے اور آیات اور سورتوں کی باہمی ترتیب کے بارے میں پائے جاتے ہیں ا
کم از کم خاصا بڑا اقتباس ہے [illegible]

ان حوالوں اور ماخذوں کے ذکر صریح کے ساتھ ساتھ سرسید کے دوسرے ماخذ سے استفادہ کی بازگشت بھی
دیتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید کی تفسیر میں الفاظ ظاہر کے متبادر اور سامنے کے معانی کے مطابق تشریح و تعبیر کرنا، قرآن مجید
کے محاورات کلام کے مطابق نازل ہونا، تاویل و تفسیر میں ظاہری الفاظ کو حتی الامکان ان کے ظاہری معانی سے نہ پھیرنا، تف
آیات قرآنی سے مدد لینا، شان نزول کی تعیین میں قرآنی الفاظ اور سیاق و سباق کا لحاظ رکھنا اور ایسے کئی دوسرے
علیہ الرحمہ نے متقدمین خاص کر ابن تیمیہ، سیوطی (زرکشی) وغیرہ سے استفادے کے بعد ہی اٹھائے ہیں۔ [illegible]

سرسید علیہ الرحمہ کا نادر و طبع زاد اصول یہ ہے کہ کلامِ الٰہی (قرآن مجید) اور قوانین فطرت میں کوئی اختلاف و نزاع
ایک دوسرے کے مؤید و مصدق ہیں۔ چوں کہ قوانین فطرت حتمی اور تجربے سے ثابت شدہ مسلمات ہیں۔ لہٰذا ان کے خلاف
مجید میں مذکور نہیں۔ اگر وہ بظاہر نظر آتی ہے تو اس کی تاویل و توجیہ عقلی انسانی فہم و شعور کے مطابق کرکے اسے خارجی قوانین
ہم آہنگ کیا جائے گا۔ کیونکہ ان کے دعوے کے مطابق قرآن مجید میں نہ تو کوئی شے خلاف فطرت ہے اور نہ منافیٔ عقلِ ا

اس اصول تفسیر کے پیچھے دراصل سرسید کی یہ کاوش کارفرما ہے کہ تمام معجزات کو عام قوانین فطرت کے مطابق ا
اور مسلمہ اسباب سے مسبب ثابت کیا جائے اور تخلیق آدم، طوفانِ نوح، نارِ نمرود، ولادت عیسیٰ، نجات ذوالنون،
جبریل اور فرشتوں اور متعدد دوسرے معجزاتی امور و حقایق کو عام مسلّمہ قوانین کے مطابق ثابت کیا جائے اور یہ سار
دو اس مقصد سے تھی کہ علوم جدیدہ اور اسلامی و قرآنی تعلیمات میں کسی قسم کے تصادم سے انکار کرکے بتایا جائے
صرف ہم آہنگ ہیں بلکہ قرآن مجید کی ساری تعلیمات سائنٹیفک ہیں۔ [illegible]

قرآنی آیات اور بیانات کو عقلِ انسانی کی بنا پر علوم جدیدہ اور سائنس کے مطابق بنانے کی کوشش بلاشبہ سرسید
کے اخلاصِ نیت اور خلوصِ عمل پر مبنی تھی [illegible] لیکن وہ نہ صرف ان کو متضاد و منافی تشریحات و تعبیرات کی طرف لے گئی بلکہ
تفسیری سرمایہ اور متقدمین کے افکار و تفسیرات کے انکار پر منتج ہوئی۔ نتیجتاً ظاہر ہے کہ اُن کو اپنے معاصرین اور متاخرین
کا سامنا کرنا پڑا۔

تفسیر سرسید کے اصول جو جمہورِ علمائے اسلام کے نزدیک معتبر ہیں یا جو متفق ہیں ان پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں
انھوں نے نئی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے اس کا تجزیہ کرنا ضروری ہے تاکہ یہ واضح کیا جا سکے کہ ان نادر اصول و ضوابط
نے محض غلطی ہی غلطی کی ہے یا کچھ "کارِ لائق" بھی انجام دیا ہے۔

سرسید علیہ الرحمہ کا ایک بنیادی اصول کہ قرآن مجید میں کوئی شے خلافِ عقلِ انسانی نہیں ہے بلاشبہ صحیح ہے
عقل ہونے اور انسانی عقل و ادراک کی گرفت میں ہونے میں فرق نہیں کر سکے۔ ان کو خود تسلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذا
کی صفات دونوں عقلِ انسانی کے ادراک سے پرے ہیں اور اسی طرح دوسری تمام ماورائی حقیقتیں جیسے حشر نشر، جنت
[illegible] نے ان تمام چیزوں کو ملاکمت یا جیسی وہ قرآن مجید میں مذکور ہوئی ہیں ماننے کے بجائے ان کی تو

کردی۔ خاص کر ماورائی حقیقتوں کی۔ اس ضمن میں علمائے اسلام کا مسلک صحیح ہے کہ ذات و صفات الٰہی ہوں یا دوسری ماورائی حقیقتیں ان کی کنہہ و حقیقت تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور ان کو اس طرح ماننا اور تسلیم کرنا ضروری ہے جیسی کہ وہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں۔ سرسیّد نے جب خود یہ تسلیم کر لیا کہ ان کی حقیقت سے انسان واقف نہیں تو پھر وحی الٰہی کو قلب محمدی کا انبعاث، ملکۂ نبوت، جبریل اور فرشتوں کو ایجابی اور عمدہ خصائل اور شیطان و ابلیس کو سلبی یا بہیمی صفات و قوتیں قرار دینا تضاد بیانی ہے کیوں کہ ان کو خود بھی ان کی حقیقت و کنہہ کا علم نہیں۔ پھر وہ یہ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کی تفسیر و توجیہہ مراد الٰہی ہے یا آیات قرآنی کی صحیح اور حتمی تعبیر ہے۔[20]

بلاشبہ سرسیّد علیہ الرحمہ کا یہ اصول کہ قرآن مجید کی یہ تفسیر یں ایک آیت کے معانی دوسری آیت یا آیات سے واضح ہوتے ہیں بہت صحیح ہے اور علمائے اسلام خاص کر زرکشی، سیوطی، ابن تیمیہ وغیرہ نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے اور مقدم رکھا ہے مگر سرسیّد نے صرف آیاتِ قرآنی پر کلی انحصار کا جو خیال پیش کیا ہے وہ خطرناک بھی ہے اور گمراہ کن بھی۔ انھوں نے تفسیر ماثور کے تمام وسائل، صحیح احادیث نبوی، اقوال و تفسیرات صحابہ کرام، اقوال تابعین اور آرائے مفسرین وغیرہ سے پوری طرح صرف نظر کیا ہے۔ اگرچہ اس رسالہ میں سرسیّد نے صحیح احادیث وغیرہ کا ذکر نہیں کیا لیکن بعض دوسرے تفسیری مقالات میں نہ صرف ان کا ذکر کرتے ہیں بلکہ بطور ایک اصول تفسیر ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ حدیث کی صحت کا اپنا معیار قائم کرتے تھے جس کو امت اسلامی تسلیم نہیں کر سکتی۔ یہی صورت حال شان نزول وغیرہ کے باب میں نظر آتی ہے۔ اگرچہ سرسیّد نے یہاں حتی المقدور کی قید لگا کر احادیث و آثار سے کسی حد تک استفادہ کی گنجائش نکالی ہے۔[21]

تمام ادعائی اہل قلم کی مانند سرسیّد علیہ الرحمہ نے متقدمین کے تمام تفسیری سرمایے کی تغلیط کر دی ہے جو بہت خطرناک رجحان ہے۔ یہ دعویٰ تو صحیح ہے کہ بیش تر تفسیروں میں مندرج اسرائیلی روایات اور ضعیف و موضوع اقوال و آراء کو تفسیر قرآن میں خاطر میں نہیں لانا چاہیے مگر حدیث و روایت کے صحیح مآخذ، صحابہ و تابعین کے مسلمہ اقوال اور بیش تر مفسرین کی معقول توجیہات سے انکار کرنا اور گزشتہ پندرہ صدیوں میں تمام علمائے اسلام کی فہم و شعور کو ناقص ٹھہرانا جسارت بیجا نہیں تو تفسیر کے مسلمہ اصولوں سے روگردانی ضرور ہے۔ اس پر طرفہ ستم یہ کہ جہاں سرسید کو اپنے مطلب کے موافق کوئی رائے یا تعبیر مل جاتی ہے وہ اسے انھیں غلط مفسرین سے اخذ و قبول کر لیتے ہیں۔[22]

سرسید علیہ الرحمہ نے فطرت اور اس کے قوانین کی بحث میں تدریجی ارتقاء کا اصول نظرانداز کر دیا ہے اور اسی بنا پر وہ توحیدِ الٰہی کی مانند توحید قوانین فطرت کے قائل بن گئے ہیں۔ قوانین فطرت اور ان کی دریافت کا انحصار انسانی فہم و ادراک پر ہے مگر سرسید نے انسانی فہم کی نارسائی کو ماننے کے باوجود اس کے قصور و نقصان کو ماننے سے دانستہ یا نادانستہ گریز کیا ہے جب کہ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کائنات کے سربستہ رازوں یا واضح حقیقتوں کے فہم و ادراک اور تعبیر میں انسانی عقل نے برابر ٹھوکر کھائی ہے۔[23]

سرسیدی اصول تفسیر کا مثبت پہلو ایک تو یہ ہے کہ انھوں نے تجزیہ و تنقید سے بھرپور کام لیا ہے اور جہاں اُن کو کوئی بات نظر آئی جو تفسیری اصول یا عقیدہ قرآنی سے ٹکراتی ہے تو انھوں نے اس پر تنقید کر کے اس کو قوی دلائل کے ساتھ مسترد کیا ہے۔ مثلاً شاہ ولی اللہ دہلوی پر اس بنا پر نقد کیا ہے کہ ان کی عبارت سے قرآن مجید کے صرف معانی کے بذریعہ وحی آنے کا خیال ہوتا ہے۔ جب کہ سرسید نے معانی و الفاظ کا رشتہ بتلاتے ہوئے واضح کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ اپنے انھیں معانی کے ساتھ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر اُترے تھے ۔[۲۴]

قرآن مجید کی عقلی تفسیر میں اگرچہ سرسیّد دور تک چلے گئے بلکہ بسا اوقات حدود پار کر گئے مگر اُن کا ایک کارنامہ عقل انسانی کی بنا پر تدبّر وتفکر سے کام لینے کا اصول ہے ۔ اسی طرح قوانینِ فطرت اور کلام الٰہی میں موافقت کا اصول بھی اُن کی بالغ نظری کو واضح کرتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی تائید وتصدیق کرتے ہیں اور قرآن مجید میں ایسی کوئی شئے نہیں ہے جو قوانین فطرت کی نفی کرتی ہو مگر وہ معجزات کو قوانین فطرت کے برخلاف مانتے ہیں حالاں کہ ان کا اپنا ایک قانون فطرت ہے جو عام قوانین کی مانند مسلم وثابت ہے ۔[۲۵]

آیاتِ سورہ کی توقیفی ترتیب، الفاظ متبادر وظاہری سے معانی قرآن کی تعیین، قرآن کی قرآن سے تفسیر کلام عرب کے مطابق مجید کا نزول: راس کی آفاقی تفہیم، شانِ نزول کی تعیین میں قرآن کی آیات سے حتی المقدور استمداد، نظم قرآن کی بحث، قرآن مجید میں کلام مقصود اور کلام غیر مقصود کی تمیز، حالات نزول کے پس منظر میں آیات اور سورتوں کے معانی کی تعبیر اور ان جیسے بعض دوسرے اصولِ سرسید بہت عمدہ اور قابل لحاظ ہیں جو تفہیم قرآن کریم کی راہ کھولتے ہیں ۔[۲۶]

اگرچہ سرسیّد کی تفسیر اور ان کے اصولوں کو جدید ومعاصر علمائے کرام نے زیادہ لائق التفات نہیں سمجھا لیکن ایسا نہیں ہے کہ اُن کو یکسر مسترد کر دیا گیا ہو ۔ اعتراف اور عدم اعتراف سے قطع نظر سرسیّد کے بعض معاصر اور متعدد متاخر مفسرین نے ان کے اثرات قبول کیے اور ان کے تحت اپنی تفاسیر میں اُن سے استفادہ کیا ۔ مثال کے طور پر معجزات کے بارے میں فکر فراہی خالصتاً سرسیّد کی آرا کی بازگشت ہے اور اس طرح شان نزول میں قرآن مجید کی آیات پر انحصار کرنے کی فکرِ مودودی وفراہی بھی اسی کی دین ہے[۲۷] ۔ اس مختصر مقالے میں تفصیل کی گنجائش نہیں اس لیے بہت سے نکات پر روشنی نہیں ڈال جا سکی ۔

تعلیقات وحواشی

۱- الطاف حسین حالی، حیات جاوید - ترقی اردو بورڈ نئی دہلی، ۱۹۷۹ء کے مختلف ابواب ملاحظہ ہوں ۔

۲- پروفیسر اسلوب احمد انصاری، "سرسیّد کا نظریۂ عقل وفطرت"، فکر ونظر، سرسیّد نمبر اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۱-۱۷ کا خیال ہے کہ "سرسیّد بنیادی طور پر مذہبی فکر واحساس کے حامل تھے ... انھوں نے ایک طرف مسلمانوں کی اخلاقی اور تعلیمی ترقی اور اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور دوسری جانب مذہبی مسائل اور امور سے اپنے شغف کو بھی برقرار رکھا ..... مسلمانوں کی معاشرتی اور تعلیمی اصلاح کی طرف ان کی دردمندانہ توجہ اور اس میں انہماک بھی دراصل ان کے مذہبی رجحان اور تفکر ہی کا شاخسانہ تھا ۔"

۳- سرسیّد، مقالات، مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۸۴ء حصہ دہم، ۱۹، مرتب کا تعارفی نوٹ ۔

۴- محمد ضیاء الدین انصاری "سرسیّد اور علی گڑھ تحریک - منتخب کتابیات" فکر ونظر علی گڑھ سرسید نمبر اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۲۵۵ کے مطابق سرسید کی تفسیر القرآن کی چھ جلدیں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے ۹۵ - ۱۸۸۰ء میں حیات سرسیّد میں چھپیں اور جو سورہ بنو اسرائیل تک وسیع تھیں ۔ ساتویں جلد مفید عام پریس آگرہ سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی ۔ وہ سورہ کہف، مریم اور طٰہٰ پر مشتمل ہے ۔

۵- مندرجہ بالا ترتیب ص ۱۹۷ اور ۲۵۳ ۔ لیکن مولانا محمد قاسم نانوتوی کے رسالہ تصفیۃ العقائد، کتب خانہ اعزازیہ دیوبند

غیر مورخہ بحوالہ ظفر احمد صدیقی "سرسید احمد خاں اور مولانا محمد قاسم نانوتوی"، فکر و نظر، سرسید نمبر اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۱۶۷-۱۶۶
سے واضح ہوتا ہے کہ سرسید نے ۱۸۸۰ء سے کافی پہلے یہ اصول وضع کر لیے تھے اور مولانا نانوتوی کے ملاحظہ کے لیے پیرجی محمد عارف کے نام اپنے مکتوب میں لکھ کر بھیجے تھے۔ ڈاکٹر ظفر صدیقی نے اس مراسلت کی تاریخ نہیں دی ہے۔

۶- مقالات سرسید، دوم ص ۲۲۶-۱۹۷ تک مراسلت ہے اور تفسیری اصول سرسید ص ۵۸-۲۳۶۔

۷- مذکورہ بالا ص ۲۲۶-۲۰۲۔ سرسید کے اصول تفسیر پر مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مفصل تنقید کی تھی جو رسالہ تصفیۃ العقائد کے نام سے چھپی تھی۔ اس میں بعض اصول البتہ مختلف ہیں۔

۸- مذکورہ بالا ص ۳۰-۲۲۶، نیز ص ۲۰۶ جہاں سرسید نے محسن الملک کے پہلے خط کے جواب میں اپنے کم از کم چار اصول کا ذکر کیا ہے۔

۹- مذکورہ بالا ص ۳۸-۲۳۰، نیز ص ۷۰-۲۰۶ سرسید نے مختصراً اپنے چار اصولوں کا ذکر کرتے ہوئے ورک آف گاڈ یعنی قانون فطرت کو خدا کا عملی عہد قرار دیا ہے اور وعدہ و وعید کو قولی معاہدہ اور ان دونوں میں کسی اختلاف وتصادم سے انکار کیا ہے۔

۱۰- مذکورہ بالا ص ۴۲-۲۳۹، نیز ص ۲۰۷۔ سرسید نے دراصل عقل انسانی کو نہ صرف دوسرے حیوانات سے ممتاز کرنے والی قدرت بتایا ہے بلکہ یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ مذہب میں خاص کر اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو مافوق فطرت ہو۔

۱۱- مذکورہ بالا ص ۴۴-۲۴۲

۱۲- مذکورہ بالا۔ ص۔ ۴۶-۲۴۳

۱۳- مذکورہ بالا ص۔ ۲۴۶

۱۴- مذکورہ بالا ص ۵۷-۲۴۶

۱۵- مذکورہ بالا ص ۲۰۰

۱۶- مذکورہ بالا اصول سرسید کے صفحات۔

نیز ملاحظہ ہو شاہ ولی اللہ دہلوی، التفہیمات الالٰہیہ، المجلس العلمی، ڈابھیل سورت، مدینہ برقی پریس بجنور ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء اول ص ۱۸۵۔

۱۷- ان مباحث کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "متن قرآن کریم ۔ تشریح و تفسیر"، علوم القرآن، علی گڑھ، جنوری- جون ۱۹۹۳ء۔ جلد نمبر ۸، شمارہ نمبر ۱، ص ۶۳-۳۴۔

۱۸- سرسید علیہ الرحمہ نے اسی اصول کی روشنی میں تمام معجزات نبوی کی تشریح و تعبیر کی ہے اور ایسی تمام سورتوں اور آیتوں کی تفسیر بھی توجیہ عقلی کی بنیاد پر ہی کی ہے۔ جیسے سورۂ فیل کی تفسیر، مقالات دوم ص ۷۰-۱۱۲، سورہ جن کی تفسیر اور جنوں کی حقیقت بالترتیب مقالات دوم، ص ۴۹-۱۳۷ اور ص ۹۲-۱۵۰

۱۹- ان کے اخلاص نیت کا غالباً کوئی منکر نہیں۔ ملاحظہ ہو: ظفر احمد صدیقی، مقالہ سرسید احمد خاں اور مولانا محمد قاسم نانوتوی"، فکر و نظر، سرسید نمبر، علی گڑھ ۱۹۹۲ء، ص ۱۶۹ میں مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ

"...." سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندیِ اہلِ اسلام کا معتقد ہوں....

۲۰۔ وحی کے بارے میں ملاحظہ ہو: مقالات دوم: ص ۲۴۴ وغیرہ

۲۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون مذکورہ بالا۔ (متنِ قرآن کریم۔ تشریح و تفسیر"۔ علوم القرآن علی گڑھ جنوری۔ جون ۱۹۹۳ء، جلد نمبر ۸، شمارہ نمبر ۱، ص ۳۴ - ۶۳۔

۲۲۔ مقالات دوم، ص ۲۱۹۔ جہاں محسن الملک نے سرسید پر دعا اور اجابت دُعا، معجزات وغیرہ کے حوالے سے تنقید کی ہے۔۔۔۔۔۔۔ سورۂ فیل کے حوالے سے مفسرین پر سرسید کا نقد، ص ۱۷ -- ۱۱۶ وغیرہ۔

۲۳۔ مفسرین وعلماء سے اتفاق کی مثالیں اوپر گزر چکیں جیسے شاہ ولی اللہ دہلوی سے قدم قدم پر اتفاق کیا ہے۔ معجزات کے ایک پہلو پر اتفاق کیا ہے اور بقیہ سے اختلاف۔ مفسرین سے اختلاف ونقد کے لیے مزید ملاحظہ ہو دوم ص ۸۵، ص ۱۴۶ وغیرہ۔

۲۳ مثال کے طور پر سرسید نے انسان کے نطفہ سے پیدا ہونے اور پھر نسل انسانی کے اسی ذریعے سے چلنے کی حقیقت پر بحث کی ہے مگر مٹی سے تخلیقِ آدم کا اولین مرحلہ نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح تخلیق سماوات و ارض بلکہ تخلیق کائنات کے اولین مرحلہ اور اس کے بعد کے ارتقائی مراحل کو زیر بحث لانے سے گریز کیا ہے۔

سائنسی نظریات یا کائناتی رازوں اور فطرت کے قانونوں کے ادراک کا معاملہ ہے کہ بہت سے نظریات تبدیل ہو گئے اور اس سے انسانی فہم کا قصور واضح ہوا۔ اسی طرح یہ حقیقت کہ بہت سے قوانین کا علم ہی نہیں جیسے معجزات کا قانون بھی ان کے خیال کو شکست کرتا ہے۔

۲۴۔ ملاحظہ ہو مقالات دوم ص ۲۲۸ مگر ص ۲۴۴ پر سرسید نے آیات کی اندرونی ترتیب کو توقیفی مان لیا ہے مگر شاہ ولی اللہ دہلوی کے اس خیال پر کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی نہ تھی بلکہ صحابہ کرام کی ترتیب دی ہوئی تھی جو خلافت صدیقی میں انجام پذیر ہوئی تھی، پر نہ تو تنقید کی ہے اور نہ اس کو واضح طور پر قبول کیا ہے۔ غالباً دوسرے نظریے کی طرف ہی رجحان ہے، جب کہ اس موضوع پر یہ خیال جمہور علمائے قرآن کے نظریے کے خلاف ہے۔ ملاحظہ ہو: سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، دہلی ۱۹۸۴ء، اول ص ۲۸۔

۲۵۔ اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو: سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، اعظم گڑھ ۱۹۸۴ء، جلد سوم بالخصوص ابتدائی مباحث جہاں معجزات وقوانین فطرت سے بحث کی گئی ہے۔

۲۶۔ ان مباحث کے حوالے اوپر گزر چکے مگر یہ موضوعات یا امور مزید بحث وتحقیق کے طالب ہیں۔ یہاں بلا تکلف اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ سرسید نے ان پر غالباً سب سے پہلے اردو میں لکھا ہے۔

۲۷۔ مثلاً مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل اور معجزات کی بحث خالصتاً سرسیدی فکر سے متاثر ہے۔ ملاحظہ ہو: حمیدالدین فراہی، تفسیر نظام القرآن، دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء ص ۴۱۰-۴۱۱ -- ۳۶۳ علامہ حمیدالدین فراہی۔ حیات و افکار، مقالات فراہی سیمینار، دائرہ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء میں مولانا محمد سعود عالم قاسمی کا مقالہ "معجزہ کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ اور مولانا فراہی کے رجحانات کا

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

ڈاکٹر محمد اقتدار حسین فاروقی *

سرسید کا سائنسی انداز فکر

اٹھارویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام کا دور ہندوستان کی تاریخ کا بدترین اور تاریک ترین دور کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس دور میں سارا ہندوستانی سماج غضب کی مایوسی کا شکار تھا۔ عجب افرا تفری کا عالم تھا۔ آزادی کے متوالوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ برطانوی سامراج کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جارہی تھی عوام پر ظلم و زیادتی کے واقعات عام ہو گئے تھے سارا معاشرہ بکھرتا دکھلائی پڑتا تھا۔ غلامی، افلاس، ناکامی، ناامیدی اور نامرادی عوام کا مقدر بن گئی تھی۔ سماج کا ایک بڑا طبقہ علم سے بے بہرہ تھا اور پرانی قدروں اور مردہ رسوم میں اپنے کو کھوتا چلا جارہا تھا۔ توہم پرستی اپنے عروج پر تھی۔ خوش قسمتی سے اس نازک دور میں دو بہت اہم اور ہمہ گیر شخصیتیں ہندوستانی معاشرے میں ابھریں جنہوں نے سوتے ہوئے اور غافل ہندوؤں اور مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان میں ایک ہستی تھی راجہ رام موہن رائے کی اور دوسری سر سید احمد خاں کی ذات گرامی۔ راجہ رام موہن رائے نے ۱۷۷۲ عیسوی میں بنگال کے ایک برہمن گھرانے میں جنم لیا۔ انہوں نے کم عمری ہی میں یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کا مسئلہ تعلیم کی کمی اور سائنسی ادب کا فقدان ہے۔ انہیں یقین کامل ہوگیا کہ اگر عوام اپنے فرسودہ رسم و رواج اور پرانی تعلیم چھوڑ کر نئی سائنسی تعلیم کی جانب متوجہ ہوں تو وہ واقعی ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کا حق مانگ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہندوؤں میں انگریزی اور سائنسی تعلیم حاصل کرنے کی وکالت کی۔ شروع میں ان کی بے پناہ مخالفت کی گئی اور الزام عائد کیا گیا کہ وہ ہندوستانی قدروں کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ مخالفتیں زیادہ دن تک نہ سکیں اور وہ اپنے کچھ ساتھیوں کی مدد سے ۱۸۱۶ء میں کلکتہ میں ایک ہندو کالج قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جس میں انگریزی اور سائنس کی تعلیم دی جانے لگی۔ عام ہندو نئی تعلیم کی جانب متوجہ ہونے لگے۔ راجہ رام موہن رائے کا مشن کامیابی کے دور میں آیا ہی تھا کہ سر سید کی ہمہ جہت شخصیت بھی ہندوستان کے مسلم معاشرہ میں ابھر کر سامنے آئی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی تباہی پستی اور بربادی دیکھی۔ جناب موہن رائے کی طرح ان کو بھی احساس ہوا کہ مسلمانوں کو قعر مذلت سے نکالنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ان کو نئے سائنسی رجحانات سے باخبر کیا جائے اور انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے جو کچھ کیا وہ آج ہندوستان کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ آئیے سر سید کے سائنسی انداز فکر اور ہندوستانی مسلمانوں کے اعمال و افکار پر ان کے اثرات کا ایک جائزہ لیں۔

---

* اسسٹنٹ ڈائرکٹر، نیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ۔

سرسید احمد خاں نے ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک معزز گھرانے میں جنم لیا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت عبرت انگیز تھی۔ وہ ایک طرف مایوسی کا شکار تھے تو دوسری جانب نئے علوم سے قطعاً ناواقف۔ یہی نہیں بلکہ ذہنی پستی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی نئی فکر اور نئے سائنسی خیال اور ایجاد و دریافت کو غیر مذہبی اور شیطانی کام تصور کرنے لگے تھے۔ انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا ان کے نزدیک ایک ایسا گناہ تھا جو معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ۱۸۳۵ء میں جب لارڈ میکالے کی اسکیم کے تحت یہ قرار پایا کہ ہندوستانیوں کو یوروپین سائنس اور یوروپین زبان کی تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے تو مسلمانوں میں اس کی شدید مخالفت کی گئی۔ اور کلکتہ میں آٹھ ہزار رؤسا کے دستخطوں سے ایک درخواست گورنمنٹ میں گزاری گئی کہ حکومت کا یہ قدم ان کے مذہبی اعتقادات کے خلاف ہے۔ اس درخواست میں انگریزی تعلیم کو صرف غیر ضروری ہی نہیں بلکہ سماجی اور ذہنی اعتبار سے نقصان دہ بتایا گیا۔ سرسید نے جب ہوش سنبھالا تو ایک طرف مسلمانوں کی معاشی زبوں حالی دیکھی تو دوسری طرف ان کا نئے علوم کے لیے منفی اور غیر منطقی رویہ پایا۔ انہیں یہ یقین ہو چلا کہ مسلمانوں کو ہندوستانی سماج میں ایک باوقار اور باعزت مقام دلانے کا ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کو نئی سائنسی دنیا سے روشناس کیا جائے۔ نئے علوم سے واقف کرایا جائے۔ کتنی عبرت کا مقام تھا کہ جس قوم کے لیے اس کے پیغمبر کی یہ تعلیم اور نصیحت موجود تھی کہ "علم حاصل کرو خواہ اس کے حصول کے لیے چین جانا پڑے"۔ وہ قوم چین تو کیا خود اپنے ملک میں موجود سائنسی علم سے منہ چراتی تھی۔ بہرحال سرسید نے مسلمانوں میں سائنسی مزاج پیدا کرنے اور سائنسی علم عام کرنے کا بیڑا اٹھا ہی لیا اور عین حدیث رسول کی پیروی کرتے ہوئے علم حاصل کرنے اور نئے علمی کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے انگلینڈ کا سفر اختیار کیا اور وہ بھی اپنا گھر بار رہن رکھ کر۔ کئی ماہ تک وہاں کی درس گاہوں اور لائبریریوں کی تفصیلات جمع کیں۔ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کا دورہ کیا۔ صنعت و حرفت کے میدان میں ہوئی ترقیوں کا جائزہ لیا اور نئی سائنسی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر ماہروں سے گفت و شنید کی۔ اس دوران انگلینڈ میں لوگوں کا رہن سہن اور سائنسی تعلیم کی لیاقت دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ وہیں سے لکھے گئے اپنے ایک خط میں تحریر کیا کہ "کاش میری قوم کے بچے بھی ایسا ہی علم حاصل کرتے اور ملک کو وہی سب کچھ دیتے جو یہاں لوگوں کو میسر ہے"۔ ایک دوسرے خط میں لکھا کہ "جو قومیں حصول علم میں پیچھے رہ جاتی ہیں ذلت و خواری ان کا مقدر بن جاتی ہے"۔

انگلینڈ سے واپس آکر سرسید نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا اور تحقیقی اور تعلیمی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ مختلف اسکیمیں بنائیں جن کا مقصد نئے سائنسی علوم نوجوانوں تک پہنچانا تھا۔ یوروپین علوم کی اہمیت جتانے کے لیے ضروری تھا کہ کچھ اہم علمی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرکے انہیں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کی خاطر سرسید نے ایک مضمون بعنوان۔

"التماس بخدمت ساکنانِ ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند"

شائع کیا جس میں یہ تجویز رکھی کہ سائنسی علم عام کرنے کی غرض سے ایک تنظیم قائم کی جائے جس کا مقصد اردو میں سائنسی لٹریچر شائع کرنا ہو۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ سرسید اس کے اعزازی سیکریٹری مقرر ہوئے۔ شمالی ہندوستان میں یہ سوسائٹی اپنی قسم کی پہلی جماعت تھی جس نے پورے ملک میں سائنس کی اہمیت کا احساس لوگوں کو دلایا۔ اس سوسائٹی کے زیرِ اہتمام چند ہی سالوں میں کئی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں

ں سے ملت مغربی علوم سے روشناس ہوئی اور ان علوم کی بابت عام ذہنوں میں جو غلط تاثرات تھے وہ بڑی حد تک ہوگئے، سوسائٹی کے تحت ایک ہفتہ وار گزٹ ۱۸۶۶ء میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس گزٹ میں انگریزی اور اردو دونوں ربانوں میں کالم لکھے جاتے۔ ان کالموں میں عوام کے نقصان دہ تعصبات سے دور رہنے کی اپیلیں شائع ہوتیں اور مسلمانوں ئ دنیا کے چیلنج کا سامنا کرنے کی تلقین دی جاتی۔

سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام کے فوراً بعد ہی سرسید کی مخالفت کی ایک منظم مہم سارے ملک میں شروع کردی گئی ارات اور رسالوں میں ان کے خلاف مضامین شائع ہونے لگے جن میں ان کو مرتد، ملحد، قوم کا عیب جو، مسلمان کا ماجی، لام کا دشمن اور زندیق جیسے ناموں سے نوازا گیا۔ سرسید ان بہتان تراشیوں سے چنداں مایوس نہ ہوئے بلکہ ان مخالفتوں بعد اپنے عزائم کچھ زیادہ ہی قوی محسوس کرنے لگے۔ اور ایک کالج کے قیام کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری میں روف ہوگئے۔ اکبر الہ آبادی یہ کہنے پر مجبور ہوگئے۔

بھائی سید تو کچھ دیوانے ہیں وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں

سرسید میں مسلمانوں کو سائنس سے روشناس کرنے کا جذبہ اور ان کو باوقار مقام دلانے کا عزم ایک جنونی کیفیت تیار کرچکا تھا۔ بالآخر انہوں نے ۱۸۷۵ء میں ایک مدرسہ کی بنیاد علی گڑھ میں ڈال ہی دی۔ مدرسہ کی شکل میں نئی تعلیم کی رن بہت سے اندھیروں پر چھا گئی۔ یہ مدرسہ ۱۸۷۷ء میں کالج بنا جس کا اصل مقصد مسلمانوں میں سائنس کی تعلیم کو فروغ ناتھا۔ لیکن جس کے دروازے سارے ہندوستانیوں کے لیے کھلے تھے۔ سرسید کے نظریہ سے ہندوستان جیسی دلہن سن اسی وقت قائم رہ سکتا تھا جب کہ اس کی دونوں آنکھیں یعنی ہندو اور مسلمان نور سے بھری ہوں علی گڑھ کا یہ لج آج ساری دنیا میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہے۔ اور ہندوستانی معاشرے میں اس کی اہمیت ب کو تسلیم ہے۔ سرسید احمد خاں نے بہتان تراشیوں اور ملامتوں سے دل برداشتہ ہوکر اپنے مشن کو ترک کردیا بتا اور علی گڑھ کالج کا قیام عمل میں نہ آیا ہوتا تو آج اس ملک کے مسلمان کتنے خسارہ میں رہتے۔ ہم سائنسی علم سے کتنا دور ہوتے اور "علم الانسان مالم یعلم" کے مفہوم سے کتنا ناواقف ہوتے۔

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی *

سرسید احمد خاں کی دینی فکر اور خدمت انسانی کا تصور

تاریخ اسلام میں مسلمان جب بھی اخلاقی پستی اور سیاسی انحطاط کا شکار ہوئے تو مسلمان دانشوروں میں سے کچھ ایسے افراد ضرور پیدا ہوئے جنھوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے جد و جہد کی۔ ان میں اکثر پیغمبرانہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ انھوں نے قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں نامساعد حالات کا چیلنج قبول کیا اور مسلمانوں کی قیادت کی۔ اپنے اصلاحی سماجی مشن کی تکمیل میں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہیں کیا۔ رسول اللہ صلعم کی روحانی اور دنیاوی زندگی سے متعلق روایات کا احیا کیا۔ سرسید احمد خاںؒ بھی ایسے ہی اکابرین کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔ ان کی زندگی کا مشن مجددانہ تھا۔ ہم اس مختصر مقالے میں ان کے دینی اور سماجی نوعیت کے کارناموں کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ یقیناً سرسید احمد خاں دورِ جدید کے آغاز پر مسلمانوں میں اسلامی اقدار کے داعی تھے جن کے عمل کے نتیجے میں مسلمانوں میں بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کا ادراک ممکن ہو سکا۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ سرسید احمد خاں کے فکر کی ابتدا ایک روایتی مسلمان کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ اُن کے والد دہلی کے مشہور پیر طریقت شاہ غلام علی مجددیؒ کے مرید تھے۔ اپنے والد کی طرح سرسید بھی صوفیا کی کرامت اور روحانی عظمت پر یقین رکھتے تھے اور اس لیے ان کا نقشبندیہ صوفی سلسلے سے قلبی لگاؤ یقینی تھا لیکن اُن کو اسلامی لٹریچر کے مطالعہ کا زمانۂ طالب علمی ہی سے شوق تھا۔ ذاتی ذہانت کے باعث ان میں غور و فکر کی عادت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ علوم دین کے علاوہ اُن کو تاریخ اسلام اور ہندوستان کی تاریخ سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ تاریخ کے مطالعہ سے اُن کو جلد ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ ماضی میں مسلمانوں کی روحانی اور مادی ترقی صحیح اسلام کی رہین منت تھی اور بعد میں جب مسلمان فقہاء نے مسلمانوں کو درپیش مسائل کا حل دینی اجتہاد میں تلاش کرنے کے بجائے روایت پرستی پر عمل پیرا ہونا تصور کر لیا تو عالم اسلام میں رجعت پسندی اور تقلید نے جڑیں پکڑ لیں۔ جس کے نتیجے میں ایک ترقی پسند معاشرہ تنزل کی طرف مائل ہو گیا۔ سرسید کے نزدیک قرآن حکیم ہر زمانے میں اپنے پیروؤں کی رہبری کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ جب بھی قرآن کے پیرو نامساعد حالات سے دوچار ہوتے ہیں تو قرآن اُن کو اپنی تعلیمات پر غور و خوض کرنے کی دعوت ہی نہیں دیتا بلکہ وہ اُن سے ڈائیلاگ (Dialogue) شروع کرتا ہے۔ اس ڈائیلاگ کے نتیجے میں مسلم فضلاء اصلاحی کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ان کی مساعی سے لوگوں کی بڑی

---

* پروفیسر و چیرمین، ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

تعداد توہم پرستی سے بچ جاتی ہے اور احیائے دین ممکن ہو جاتا ہے۔ آج مسلمانوں کی اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ ہم سرسیّد کے مذہبی افکار اور خدمت انسانی کے تصور کا بے تعلق کے ساتھ مطالعہ کریں۔ اگرچہ یہ کام اُن کے عہد میں مسلمانوں میں تنگ نظری اور رجعت پسندی ہونے کی وجہ سے مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن ہمارے بدلے ہوئے زمانے میں جب کہ روشن خیالی کا دور دورہ ہے نہایت ضروری ہو گیا ہے۔

سرسید قرآن اور تاریخ کے اسکالر کی حیثیت سے اس بات کا علم رکھتے تھے کہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان برابر بہتری کی طرف گامزن ہے۔ مختلف ادوار میں انسان نے ثقافت اور تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اپنی آزادی اور تخلیقی صلاحیتوں کو مزید آگے بڑھایا ہے لیکن یہ ترقی کسی ایک خاص ملک یا خطہ میں رہنے والوں یا کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کا اجارہ کبھی نہیں بنی۔ جس انسانی گروہ نے اعلیٰ اخلاقی قدروں کو اپنا کر ترقی کی راہ اختیار کی، اس نے دوسروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ سرسیّد کے نزدیک جب بھی انسان مذہب کی اصل روح اور اس کے صحیح تصور سے بے بہرہ ہو کر روایت پرستی کا شکار ہوا تو وہ ذہنی جمود اور پس ماندگی کا شکار ہو گیا۔ عالم اسلام کی پس ماندگی کا سبب وہ مسلمانوں کی روایت پرستی سمجھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کی پسپائی کے بعد انھوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے مشن کا آغاز کیا[1] ان کے لائف مشن کا مقصد تھا مسلمانوں میں صحیح اسلامی روح پیدا کر کے ان کی اخلاقی اصلاح اور مادی ترقی کو ممکن بنانا تاکہ وہ روحانی اور دنیاوی ترقی کے ذریعے اقوام عالم میں اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکیں اس سلسلے میں وہ ایک نئے لائحہ عمل کی تلاش میں لگ گئے تھے۔ وہ ایسا لائحہ عمل چاہتے تھے جو کہ اصلی اسلام سے مطابقت رکھتا ہو۔ انھوں نے سب سے پہلے خود اپنا محاسبہ کرنا ضروری سمجھا۔ کیوں کہ کوئی بھی اصلاحی کام ممکن نہیں ہے جب تک کہ مصلح خود اپنی اصلاح نہ کرے۔

۱۸۵۷ء کے بعد سرسید کے لکھے گئے مقالات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے تبحرِ علمی اور غور و فکر کی عادت کی بنا پر اپنی مذہبی تصنیفات پر نظرِ ثانی کرنے لگے تھے۔ مثال کے طور پر سیرت طیبہ پر اپنی تالیف جلاء القلوب بذکر المحبوب[2] (مطبوعہ ۱۸۴۲ء) پر ریویو میں لکھتے ہیں کہ اس کو لکھتے وقت انھوں نے مدارج النبوت سے بہت سی ایسی روایات نقل کر دی تھیں جو کہ تاریخی شواہد کے خلاف تھیں اور جب انھوں نے اُن روایات کی تاریخ کی روشنی میں معروضیت کے ساتھ چھان بین کی تو ان کی تاریخی صداقت کے بجائے افسانوی نوعیت عیاں ہو گئی۔ سرسیّد مدارج النبوۃ کے مولف شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا نام نہیں لیتے، کیوں کہ ان کی تالیف مشہور تھی لیکن ان کی تالیف میں شامل روایات کو غیر تاریخی نوعیت کی بتانے میں تکلف نہیں کرتے وہ ایسی روایات کو مسلمانوں میں تاریخی شعور (Historical Sense) کے ختم کرنے کے لیے ذمّہ دار سمجھتے تھے۔ ان کے مذہبی عقائد اور فکر میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں ان کی اہمیت کا اُن کو احساس تھا اور وہ ان تبدیلیوں کو مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کے دانش وروں کے لیے بصیرت افروز سمجھتے تھے۔ لہٰذا اپنی زندگی کے آخری سالوں میں لکھتے ہیں:

۱۔ تفاصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے راقم الحروف کی انگریزی تصنیف: Islam and Muslims in South Asia: Historical Perspective.

۲۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب سرسیّد کی نبی کریمؐ کی سوانح عمری اور سیرت سے متعلق تالیف ہے۔

بہت لوگ ہیں جو دنیا کے انقلابوں کو دیکھتے ہیں اور کم ہیں جو اُس پر غور کرتے ہیں مگر بہت کم ہیں جو خود اپنے خیالات کے انقلابوں کو دیکھیں اور اُن کے سببوں کو سمجھیں سوچیں۔ اگر کوئی شخص اپنی تمام زندگی کی باتوں کو یاد کرے اور سمجھے تو جانے گا کہ اس کے خیالات میں ایسے عجیب عجیب انقلاب ہوئے ہیں کہ ویسے دنیا کی کسی اور چیز میں نہیں ہوئے۔ اگر پہلا خیال بغیر سوچے سمجھے تقلید و اعتقاد و تمدن و معاشرت کی وجہ سے قائم ہوا تھا، پھر اسی طرح اور ان ہی اسباب سے اس میں انقلاب ہوا ہے تو خیال ہو سکتا ہے کہ دونوں کے لیے یا دونوں میں سے ایک کے لیے کوئی معقول بنا تھی تو اس کے سببوں پر غور کرنا اور اس بات کو سمجھنا کہ پہلے خیالات کس بات پر مبنی تھے اور حال کے خیالات کس بات پر مبنی ہیں؟ اور ان دونوں بنیادوں میں سے کون سی بنیاد زیادہ ترجیح اور زیادہ تر مستحکم ہے، انسان کے لیے نہایت مفید ہے۔

دُنیا کے تمام خیالوں میں مذہبی خیال ایسا ہے جو انسان کے دل پر سب سے زیادہ اثر کرتا ہے، بہت کم برائیاں (جو دنیا میں بُرائیاں مان لی گئی ہیں) ایسی ہوں گی جن کا ذکر کرنے والا کبھی نہ کبھی اُن کی بُرائی کو خیال نہ کرے، مگر یہ مذہبی خیال ایسا ہے کہ اس کے سبب سے انسان ہزاروں برائیاں کرتا ہے اور پھر کبھی اس کو بُرا نہیں سمجھتا۔ ایسے خیال میں اس قسم کا انقلاب پیدا ہونا سب سے زیادہ توجہ کے قابل ہے۔

گو مجھ کو علمی لیاقت کچھ نہیں ہے اور میرا درجہ ایک جاہل آدمی سے شاید ہی کچھ زیادہ ہو لیکن اللّٰے پن بچاسے سوچنے والی طبیعت تھی جب حیوانی زندگی سے طبیعت نے دوسری طرف پلٹا کھایا تو اُس کی کروٹ بجز مذہبی کروٹ کے اور کیا ہو سکتی تھی، اور وہ پہلو بجز اُس پہلو کے جو عام تھا اور جس پر سب کا یقین تھا اور کیا ہو سکتا تھا مگر سوچنے والی طبیعت ہر دم ساتھ تھی اور وہی تمام انقلابوں کا باعث ہوئی اور اُسی نے سچائی تک پہنچایا جس کو میں ٹھیٹ اسلام یقین کرتا ہوں۔ گو کہ رسمی مسلمان اس کو ٹھیٹ کفر سمجھتے ہوں۔ اس عرصے میں متعدد مذہبی کتابوں کے لکھنے کا اتفاق ہوا جو ہر ایک وقت کے خیالات کے مطابق ہیں۔ اُن سب کا بہ ترتیب جمع کرنا گویا اِن تمام زمانوں کے خیالات کو بہ ترتیب سامنے رکھنا ہے جس سے شاید خود مجھ کو اور آئندہ آنے والی نسلوں کو فائدہ ہو۔ پس میں اپنی تصنیفات کے اس حصّے میں مذہبی کتابوں اور رسالوں کو ایک جگہ جمع کرتا ہوں[1]۔"

یہی فکری تبدیلی تھی کہ وہ رسول اکرمؐ کے عہد کی اصل اسلامی روایت کے احیاء کے قائل ہو گئے۔ ان کو محسوس ہوا سے غیر اسلامی روایات اور رسم و رواج کی گرد نے اکٹھا ہو کر ہماری روایت کی شکل کو دھندلا کر دیا ہے اور اس گرد کو اُڑا ہے۔ لہٰذا سرسید کو دوسرے مسلم دانش وروں کی طرح اہلِ حدیث تحریک نے بہت متاثر کیا۔ اہلِ حدیث تحریک کے بانی م رحیمیہ دہلی سے فارغ التحصیل عالم مولانا سید نذیر حسین محدث تھے۔ مولانا نذیر حسین محدث کا خیال تھا کہ صحیح اسلامی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان ہندوستان، ایران اور روم کے رواجوں کو ترک کر کے سنت رسول اللہؐ کا اتباع

---

[1] سرسید احمد خاں، ریویو تصانیف احمدیہ، حصہ اول، علی گڑھ، ۱۸۸۳ء، تمہید ص ۲۔

یہ تقلید کے بھی خلاف تھے۔ ان کی قیادت میں سرسیّد بھی غیر مقلد ہو گئے تھے اور وہ حیلۂ شرعی کو مذہب کی روح کے منافی تصور کرتے تھے۔ کسی بھی فقہ پر اندھا دھند عمل کرنے کے بجائے قرآن اور سنت کی روشنی میں نئے اجتہاد کو ضروری سمجھنے لگے تھے۔

اگرچہ سرسیّد اپنی زندگی کے آخری سالوں تک اہلِ حدیث مسلک پر قائم رہے لیکن جب انھوں نے علم الکلام اور تفسیر پر لکھنا شروع کیا اور عصری تقاضوں کے تحت یہ ثابت کیا کہ قرآنی قوانین قانونِ فطرت کے مطابق ہیں اور ما فوق الفطرت واقعات کی سائنٹیفک توجیہ پیش کی جا سکتی ہے تو تقلید پسند علماء کے علاوہ اہلِ حدیث سے متعلق علماء بھی اُن کے مخالف ہو گئے۔ سب اُن کے عقیدے پر تنقید کرنے لگے جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ وہ اسلام سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ سے سرسیّد کی علی گڑھ تحریک جس کا واحد مقصد یورپ کے علوم کو مسلمانوں میں رائج کرکے اُن کو عہدِ جدید میں لانا تھا اور یورپ کی قوموں کی طرح روحانی اور معاشی طور پر ترقی یافتہ بنانا تھا وہ بھی بُری طرح متاثر ہوئی۔ علماء کو مطمئن کرنے اور اپنی فلاحی تحریک کو فروغ دینے کے لیے انھیں علماء سے سمجھوتہ کرنا پڑا۔ جس کی رُو سے دانش گاہ علی گڑھ میں اسلامی دینیات کی تعلیم دینے کے لیے دیوبند مکتبۂ فکر کے علماء کا تقرر کیا گیا۔ علاوہ ازیں سرسیّد کے مذہبی افکار کی اشاعت کو روک دیا گیا۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد سرسیّد دوسرے دانش ور ہوئے تھے جنھوں نے اپنے عصر کے علاوہ آنے والے زمانے کے تقاضوں کو بھی محسوس کیا تھا۔ شاہ صاحب کی طرح سرسیّد نے بھی نئے علم الکلام اور قرآن حکیم کی تفسیر کے ذریعے نئی راہوں کی نشاندہی کی۔ وہ بھی وقت کے چیلنج کا قرآن و حدیث کی روشنی میں حل تلاش کرتے تھے۔ یقیناً سرسیّد نے اپنی تحریروں کے ذریعے شاہ صاحب اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ کی روایات کو آگے بڑھایا تھا۔

سرسیّد نے بھی قرآن کی تفسیر و تفہیم کے ذریعے ثابت کیا کہ زمانے کے بدلنے اور انسانی تمدن میں ارتقاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رویہ میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق سے کبھی بے پرواہ نہیں ہوتے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے اسلامی اقدار کا صحیح ادراک کرنا اور اُن پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔

بہرحال مذہبی مطالعہ اور تحقیق کے ذریعے سرسیّد کو اسلام کے صحیح مذہبی تصور کا علم ہو گیا تھا۔ اس سے ان کے یہاں روشن خیالی اور مذہبی رواداری پیدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی مذہبی تصانیف میں ہر شخص جو اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھتا تھا وہ خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اس کو انھوں نے قابلِ احترام شخص تصور کیا۔ اُن کے نزدیک امرِ الٰہی کی روشنی سے ہر شخص مستفید ہوتا ہے اور یہ روشنی اس کے دل میں اتر کر اس کو صاحبِ بصیرت بنا دیتی ہے۔ وہ اسی وجہ سے مارٹن لوتھر کالون (Calvin) کیشب چندر سین اور دیانند سرستی کو فیضِ الٰہی سے باریاب تصور کرتے تھے۔ حالانکہ ان لوگوں میں سے اکثر اسلام کے خلاف تھے۔ سرسیّد کا کہنا تھا کہ اللہ نے مارٹن لوتھر اور کالون کو اپنی توفیق سے پرانے راستے سے ہٹا کر روشن راستے پر لگایا۔ سرسیّد کے اپنے ہم عصر ہندوستانیوں میں اللہ نے بابو کیشب چندر سین کو توحید کی طرف متوجہ کیا اور دیانند سرسوتی کا دل بُت پرستی سے ہٹا کر ایک خدا کی طرف راغب کیا۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ماضی میں مسلم فضلا کی روش کی پیروی کرتے ہوئے سرسیّد نے ہندوستانی مسلمانوں میں مذہبی تعصب اور تنگ نظری دور کرنے کے لیے مذاہبِ عالم کے تقابلی مطالعہ سے متعلق روایت کا بھی احیاء ضروری سمجھا۔ ماضی میں جب بھی مسلم دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے دوچار ہوئے تو انھوں نے ان کی ثقافت اور مذہب

کے بارے میں معروضیت کے ساتھ علم حاصل کر کے ان پر لکھا۔ لہٰذا ہمیں عربی اور فارسی میں دنیا کے مذاہب کے متعلق اہم لٹریچر ملتا ہے۔ اس لٹریچر کے مطالعے سے دوسرے مذاہب کے بارے میں معلومات ہی نہیں بڑھتیں بلکہ اس سے مذہبی رواداری پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی مذہبی روایت کی اہمیت بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ مثلاً البیرونی کی ہندو کلچر پر شہرہ آفاق کتاب پڑھتے وقت اگر اس کے مولف کا دین پہلے سے معلوم نہ ہو تو قارئین کو اس کے مسلمان ہونے کا علم اس وقت ہوگا جب کہ وہ کہیں کہیں اسلام اور ہندو مذہب کے مابین تناقص بیان کرتا ہے۔ ہندو مذہب میں ذات پات کے احوال میں لکھتا ہے کہ اسلام میں معاملہ اس کے برعکس ہے، کیوں کہ اسلام میں سب انسان برابر تصور کیے جاتے ہیں اور فوقیت کسی کو صرف تقویٰ کی بنا پر حاصل ہو سکتی ہے لیکن اٹھارھویں صدی میں مسلمانوں میں مذہبی رواداری کا فقدان ہو گیا تھا۔ جب اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں مسلمانوں کا سیاسی انحطاط ہو گیا تھا اور انگریزوں کی سیاسی بالادستی قائم ہو گئی تو مسلمان دوسرے ہندوستانیوں کی طرح انگریزوں کے محکوم ہو گئے تھے۔ مسلمان نئے حکمراں طبقہ اور عیسائیت دونوں سے متنفر ہو گئے تھے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ تبدیلی کو مانا جائے اور دوسرے ہندوستانیوں کی طرح نئے حکمراں طبقہ کا اعتماد حاصل کیا جائے۔ سرسیّد کو یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی فلاح اور بہبود یورپ اور خاص طور پر انگریزی علوم کی تحصیل اور اس کے سائنٹیفک کلچر سے پوری واقفیت حاصل کرنے پر منحصر ہے۔ لہٰذا مسلمانوں میں مذہبی رواداری پیدا کر کے ان کو انگریزوں کے قریب لانے کی غرض سے انھوں نے بائیبل (انجیل) پر اردو میں تفسیر لکھ کر شائع کی۔ اس میں ظاہر کیا کہ انجیل مقدس کتاب ہے اور اس کی تعلیمات اکثر قرآن کے مشابہ ہیں۔ یہ وہی انجیل ہے جس کی بنا پر رسول اکرمؐ نے عیسائیوں کو اہل کتاب کا مرتبہ عطا کیا تھا۔ سرسیّد کی ان تمام مساعی کا مسلم جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ وہ اپنے اسلاف کی طرح اسلام اور عیسائیت کا تقابلی مطالعہ کر کے اپنی مذہبی روایت کے زیادہ قائل ہو گئے تھے۔

سرسیّد کے ہم عصروں میں شبلی نعمانی اگرچہ سرسیّد کی علی گڑھ تحریک سے متعلق رہے تھے لیکن ان کے مذہبی افکار سے اختلاف رکھتے تھے۔ وہ سرسیّد کے برخلاف قدیم علم الکلام کی اہمیت کے قائل تھے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب انھوں نے اردو میں علم الکلام پر قلم اُٹھایا تو اس کی ترغیب اُن کو سرسیّد ہی کی تحریر سے ہوئی۔ دوسرے وہ سرسید کے اثر سے پوری طرح نہ بچ سکے۔ مثال کے طور پر وہ قانون فطرت (Laws of Nature) کے بجائے اصول قدرت پر بحث کرتے ہوئے مانتے ہیں کہ ہر سانحہ کا ظہور اصول قدرت کے تابع ہے۔ شبلی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، سرسیّد کے علم الکلام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اپنی تصانیف میں تینوں سرسیّد کے فکری عمل (Approach) سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ غرضیکہ سرسیّد کے مذہبی افکار اور اُن کی سیرت کا مطالعہ ہمارے لیے بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ اس کے ذریعے ہم خود غرضی کے اندھیرے سے نکل کر روشنی کی طرف آ سکتے ہیں۔ بے لوث خدمت انسانی ہی قرب الٰہی کا وسیلہ ہے۔ یہی سرسیّد کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

پروفیسر محمد عمر *

سر سیّد اور محمد عبدہ

سر سیّد کی زندگی اور اس دور کے واقعات میں ہمیں ان سیاسی اور معاشرتی حالات کا عکس بھی نظر آتا ہے جن سے انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان اور عالم اسلام گزر رہا ہے۔ اس موقع پر ایک طرف مغربی سامراج کا بڑھتا ہوا سایہ نظر آتا ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کی پستی اور انحطاط اور ان کی غفلت و درماندگی کا اندوہگیں نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ وہ یہ زمانہ تھا جب مغربی تمدّن اپنے عروج کی انتہائی منزلیں طے کرتا ہوا اس نقطہ کے قریب تھا جہاں بلندی پستی میں تبدیل ہونے لگتی ہے اور تاریخ کا مسافر بے اختیار بام عروج سے نیچے اُترنا شروع کرتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تمدّن کو جو ایک مدّت دراز سے مائل بہ انحطاط تھا پستی کے وہ انتہائی مدارج در پیش تھے جن کے بعد کسی پستی کے بجائے یا تو منزلِ فنا آپہنچتی ہے یا یحی الارض بعد موتہا کے بمصداق تجدیدِ حیات کے آثار اُفق پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کی ذہنی خصوصیات میں مغربیت کا عروج و استحکام اور اسلامی تحریک کا ضعف و اضمحلال پوری طرح منعکس ہے اور ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ مغربیت آگے بڑھ رہی ہے اور اسلام کے نمائندے ایک شکست پذیر فوج کی طرح پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ مغرب فعال اور اثر آفریں ہے، مسلمانوں پر انفعال اور اثر پذیری غالب ہے۔ مغرب کو اپنے نقطۂ نظر کی صحت اور اپنے اصولوں کی صداقت پر اعتماد و یقین ہے۔ مسلمان اپنے اصول و مقاصد اور اپنے نقطۂ نظر کی صحت کا یقین کھو چکے ہیں۔ اہلِ مغرب تاریخ کو، علم کو، مذہب کو غرض انسانی زندگی کے جملہ مظاہر کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اعتماد و یقین کا مضبوط سہارا لیے ہوئے اپنے اصولِ فکر کی روشنی میں واقعات کی توجیح و تعبیر کرتے ہیں۔ مسلمان کا پائے نظر شک و ارتیاب (شبہ) کی رتیلی زمین پر پھسل رہا ہے۔ اس کے آگے یقین کی روشنی مدھم پڑتی جاتی ہے۔ پہلے ناگواری اور کبیدگی سے، پھر برضا و رغبت وہ اہل مغرب کے نتائج فکر اور اُن کی توجیہات پر ایمان لے آتا ہے اور اپنے مذہب، اپنے تمدن اور طرزِ زندگی کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ سیاسی محکومیت کے ساتھ ساتھ اس دور میں مسلمانوں پر مغرب کی فکری غلامی بھی مسلط ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے اکثر مسلمان مفکرین اور مصلحین پر مغرب کی مرعوبیت طاری تھی اور وہ نادانستہ طور پر اپنے مذہبی اور تمدنی مسائل کو مغرب کی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ ہندوستان میں سر سیّد احمد خاں اس گروہِ مفکرین کے سب سے زیادہ ممتاز نمائندہ تھے اور سر سیّد ہی نہیں بلکہ خود جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ جیسے بلند پایہ مسلمان اور اہلِ علم اس ذہنی مرعوبیت سے بالکلیہ محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ ان دونوں کے افکار و تخیلات میں غیر اسلامی طرزِ فکر کے دھندلے نشانات کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ اگرچہ اتنے نمایاں طور پر نہیں جیسے کہ سر سیّد کے خیالات میں غیر اسلامی نقوش اُبھرے ہوئے ملتے ہیں۔

---

* سابق پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

مندرجہ بالا مصلحینِ جدید کے بالمقابل قدیم علماء و صلحاء کا ایک گروہ تھا جس کے نمایندے اپنے زمانے کے حالات و مطالبات سے بالکل غافل اور بے خبر تھے اور محض قدامت پرستی کے جوش میں جدید مصلحین و مفکرین کی مخالفت میں سرگرم تھے۔ اس گروہ میں بھی ایسے لوگوں کی تعداد کافی تھی جو اسلامی اصولوں سے سچی محبت رکھتے تھے اور اپنے دین و مذہب پر ثابت قدمی کے ساتھ جمے ہوئے تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ ان کی سچی اسلامیت کا زرِ خالص قدامت پرستی اور روایت پسندی کے کھوٹ سے بے رنگ ہو گیا تھا۔ سرسید اور اُن کے ہم خیال اصحابِ فکر مغرب کی پیروی کر رہے تھے اور ہمارا مذہبی طبقہ قدماء کے اتباع میں مصروف تھا۔ تقلید سے نہ یہ بَری تھے اور نہ وہ کیونکہ اجتہادِ فکر کی صلاحیت کسی میں نہ تھی۔ دورِ جدید کے مفکرین و مصلحین دانستہ یا نادانستہ طور پر ہر مسئلہ میں مغرب کو سند بناتے تھے علماء اور مشائخ غیر شعوری طور پر متقدمین اور متاخرین کے اعمال و افکار میں اپنے لیے سند تلاش کرتے تھے۔ قرآن کی خالص تعلیم اور انبیاء کے طریق ع۔ کی طرف اُن میں سے کوئی بھی رجوع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ حالاں کہ مسلمانوں کی تمدنی اور معاشرتی فلاح نہ مغربیت کے اصولوں سے وابستہ ہے اور نہ اُن کے لیے متقدمین و متاخرین کا طرزِ فکر اور طریقِ عمل بہترین نمونہ ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی نجات و سعادت تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے نمونۂ عمل اور حکمتِ قرآنی کے دامن سے بندھی ہوئی ہے۔ ان دو کے علاوہ کسی اور شے کی طرف نگاہیں اُٹھیں گی تو نقصان و ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔[1]

خدا کا قانون سعی و عمل کا قانون ہے۔ اس کی کائنات میں ہر وہ فرد یا گروہ کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے جو اپنے مقصد کے لیے صحیح تدابیر اختیار کرنے اور ضروری قربانیاں دینے پر تیار ہو، خواہ اس کا مقصد منشائے الٰہی کے خلاف ہو یا اس کے موافق۔ ایسی حالت میں ان لوگوں کی کمزوریوں اور طریقِ فکر کی خامیوں کا لحاظ کرنا ضروری ہو جاتا ہے جن کی مساعی اصلاح زمانۂ سابق میں ناکام ہو چکی ہیں تاکہ آئندہ حصولِ مقصد میں ان غلطیوں اور کمزوریوں کا اعادہ نہ ہونے پائے۔

سرسید کی سیاست ایک مسلمان کی سیاست تھی جو مغربیت اور مشرقیت میں تال میل پیدا کرنا چاہتی تھی اور وہ اس کو مذہبی اغراض و مقاصد کے تابع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے یہ مقصد نہیں تھا کہ مغلیہ سلطنت دوبارہ بحال ہو جائے کیونکہ مسلمانوں کی ایک قوم کی قوم اخلاقی زوال اور پستی میں مبتلا تھی اور انگریزوں نے ہندوستان کے بیشتر علاقوں پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے دل سوز سانحات کے بعد سرسید کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ زوال پذیر مسلمانوں کی اقتصادی حالت سدھارنے کے لیے کون سا راستہ نکالا جائے؟ انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے جو عناد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کی شرکت کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا، اس کو کس طرح دور کیا جائے؟ اسی غرض سے انھوں نے "وفادار مسلمان" کے نام سے ایک رسالہ ترتیب دیا تھا جس میں انھوں نے مسلمانوں کی انگریزی حکومت سے وفاداری کو مدلل انداز میں بڑے شرح و بسط سے ثابت کیا تھا۔

سرسید اور دیگر مسلم مصلحین نے اس دور میں جو اصلاحی کوششیں کیں وہ درحقیقت اسی نوع کا فوری علاج تھا جس سے مسلمانوں کے اخلاقی امراض کا اصل سبب دور نہ ہو سکا۔ البتہ تھوڑی دیر کے لیے مرض کی شدت میں کمی ہو گئی۔ حالانکہ مسلمانوں کی اخلاقی پستی صرف ایک طریقے سے درست کی جا سکتی تھی۔ یعنی انبیاء کا طریقِ کار اختیار کیا جاتا اور جاہلیت کے جس قدر اثرات مسلمانوں بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں گھر کر چکے تھے، ان سب کو نکال پھینکنے کی کوشش کی جاتی۔ مسلمانوں کی معاشرت میں

---

[1] سر چارلس ایڈمس۔ محمد عبدہ۔ ترجمہ محمد ظہیر الدین صدیقی، بی۔ اے۔ مکتبہ پاکستان لاہور ۱۹۴۴ء۔ دیباچہ طبع ثانی۔ صفحہ ۷-۸

جو غیر اسلامی رسوم و عادات داخل ہو گئے تھے، ان کی بیخ کنی کی جاتی۔ ان کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے ایک جدید نظام تعلیم مرتب کیا جاتا غرضکہ اصلاح کی کوشش ہر جہت اور ہر رُخ سے شروع کی جاتی۔ اس کے لیے ایک جامع تحریک شروع کرنی چاہیے تھی جو ہر شعبۂ حیات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی اور اعمال کی ہر شاخ پر اپنا مرکزی اقتدار قائم کر دیتی۔ بہر حال اس دور کی بلند سے بلند ہستیاں مغرب کے ذہنی اثرات سے محفوظ نہیں تھیں اور غیر اسلامی طریقِ فکر کا کچھ نہ کچھ رنگ ان مصلحین کے پیمانۂ فکر میں بھی جھلک رہا تھا جنھوں نے مسلمانوں کی خدمت کے لیے اپنے کو وقف کر دیا تھا۔[1]

درحقیقت قرونِ اولیٰ کے بعد سے آج تک مسلمانوں کی اصلاح کے لیے جتنی تحریکیں شروع کی گئیں ان میں سے اکثر و بیشتر تحریکات ہنگامی اور وقتی تقاضوں کی تکمیل کے لیے معرضِ وجود میں آئیں اور اس لیے ان کے نتائج بھی عارضی اور وقتی تھے۔ حالانکہ اسلامی زندگی کی اساس کلی اور دائمی مصالح پر استوار کی گئی ہے۔ اسلام وقت اور حالات کے تقاضوں سے غفلت برتنے کی تعلیم نہیں دیتا ہے لیکن وہ ہنگامی ضروریات اور وقتی تقاضوں کی تکمیل کو فلاحِ انسانی کے دائمی اصولوں کا تابع رکھنا چاہتا ہے کیونکہ ان اصولوں کی روشنی میں وقتی مسائل کا حل تلاش کرنے سے دیرپا اور مستقل نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی تحریک زمان و مکان کی وحدت و تسلسل کو توڑ کر جزئی اقدار کی خادم بن جاتی ہے۔ یعنی قومی، وطنی یا مقامی بنیادوں پر انسانوں کی وحدت و اجتماع کی ضرورت پر زور دیتی ہے یا صرف وقتی ضروریات و مصالح پر اپنی تنظیم کی اساس رکھتی ہے اور ان کی تکمیل فطرتِ بشری کے دائمی تقاضوں اور فلاحِ انسانی کے مستقل اور ناتغیّر پذیر ضروریات کا لحاظ نہیں رکھتی ہے تو وہ اسلام کی روح و مزاج سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔[2]

ہندوستان میں سرسید مرحوم، مصر میں مفتی محمد عبدہٗ اور کل عالم اسلام میں سید جمال الدین افغانی ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سب سے پہلے ان قوتوں اور اجتماعی محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی جو زمانۂ جدید کی تشکیل میں حصّہ لے رہے تھے اور مغربی تمدن کے استیلا کا باعث ہوئے تھے۔[3]

سرسیّد اور محمد عبدہ کی زندگی میں ایک عجیب و غریب مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کی زندگی کا بیشتر حصّہ تعلیم کی اصلاح و اشاعت میں صرف ہوا۔

محمد عبدہ نے جامعہ ازہر کے طریقۂ تعلیم و نصابِ تعلیم کی اصلاح پر اپنی تمام کوششیں مرکوز کر دیں۔ سرسیّد نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ دونوں نے اپنی زبانوں میں ایک ادبی انقلاب کی ابتداء کی۔ عیسائی مورخین اہلِ اسلام کے خلاف جو زہر افشانی کر رہے تھے اور جس طرح اسلام کو دوسروں کی نظروں میں بزعم خود گرا رہے تھے، دونوں نے اپنے اپنے حدود میں اس کی نفی کے لیے کوشاں رہے۔ دونوں کو علمائے کرام کی ملامت کا نشانہ بننا پڑا اور اس کی وجہ سے جمہورِ مسلمین کی مخالفت برداشت کرنا پڑی اور یہی ان کی زندگی کا سب سے زیادہ المناک واقعہ ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ اسلام اور مسلمانوں کی عزت و وقار کے قیام کے لیے کیا۔ لیکن اس کے جواب میں انھیں علمائے وقت کی منظم مخالفت کا پھل ملا۔ یہ مخالفت اگر اصولی ہوتی تو کوئی حرج نہ تھا لیکن یہ شخصی تھی اور علمائے کرام کے اختلاف نے سبّ و شتم، بغض و عداوت اور لعن و طعن کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے جو راہ اختیار کی تھی، استقلال کے ساتھ اس پر گامزن رہے۔ یہاں تک کہ کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔[4]

---

[1] سر چارلس ایڈمس۔ محمد عبدہ۔ مترجمہ محمد ظہیر الدین صدیقی۔ بی۔ اے، مکتبہ پاکستان، لاہور، ۱۹۴۴ء۔ دیباچہ طبع ثانی ص ۷–۸

[2] ایضاً۔ ص ۱۲-۱۳۔ [3] ایضاً۔ ص ۲۰-۲۱۔ [4] ایضاً۔ ص ۲۰-۲۱

اور حقیقت تو یہ ہے کہ صرف سرسید اور محمد عبدہ ہی نہیں بلکہ اسلامی حکومتوں کے زوال کے بعد جو شخص بھی کوئی اجتماعی تحریک لے کر اٹھا، اس کو علمائے وقت نے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ علماء کے اس طرز عمل کی توجیہ کیوں کر کی جاسکتی ہے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ دو صدیوں سے ہمارے علماء کا طبقہ زمانے کی نت نئی ضروریات سے غافل اور مغرب کی ذہنی ترقی سے بے خبر ایک ایسے خیالی عالم میں زندگی گزار رہا تھا جس کو حقیقی دنیا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ادھر تو انقلابات کا سمندر موجیں مار رہا تھا اور مغربیت کے طوفان میں اسلام کی کشتی پھنسی ہوئی تھی، ادھر یہ جماعت غفلت کے قلعوں میں محصور جزوی اور فروعی مسائل میں اتنی منہمک تھی کہ اس کو آنے والے طوفان کا علم تک نہ تھا۔ اگر اس طبقہ میں اتنی اہلیت ہوتی کہ وہ ان انقلابات کی نوعیت کا کوئی صحیح اندازہ قائم کرسکتا اور اسلام پر جس رخ اور جن ہتھیاروں سے حملے کیے جارہے تھے اُن سے اپنے تئیں باخبر رکھتا تو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اور اسلامی فکر و نظر کو وہ شدید نقصان نہ اٹھانا پڑتا جس کی تلافی اب مشکل معلوم ہوتی ہے مگر تقلید، روایت پرستی اور شخصی عظمت سے مرعوبیت علماء کے دل و دماغ کو اتنا متاثر کرچکی تھی کہ اُن میں رہنمائی کی صلاحیت ہی باقی نہ رہ گئی تھی۔

اگر معاملہ بس اسی حد تک ہوتا تو کوئی مشکل نہ پڑتی۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان تمام خرابیوں کے باوجود جمہور اسلام کو علماء سے بے حساب عقیدت تھی۔ عام مسلمان صرف اُن کی ظاہری وضع قطع، سطحی مذہبیت اور تقلیدی علم و فضل کے پرستار تھے۔ انھوں نے اس پر کبھی کبھی نہیں غور کیا کہ انفرادی علوئے اخلاق اور شخصی مذہبیت اور چیز ہے اور جماعت کی رہنمائی اور اُمت کی قیادت کچھ اور شے ہے۔ اس کے لیے صرف اخلاقی فضیلت اور روحانی بلند پایگی کافی نہیں ہے بلکہ وسیع علم چاہیے۔ وقت و زمانے کے مطالبات اور ماحول کے تغیرات کی سمجھ بوجھ چاہیے اور اصول و فروع کے امتیاز کی اہلیت چاہیے۔

سرسید کی زندگی سے سب سے بڑا سبق جو ہم کو ملتا ہے وہ یہی ہے کہ ہماری دینی اور دنیوی اصلاح میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے علماء کی پستی، کم نظری اور مادی منفعت ہے۔ اصلاح کی کوئی تحریک جب اور جہاں کہیں اُٹھی، علماء کی مخالفتوں کا شکار ہوگئی۔ اس صورت حال کو ختم کرنے کے صرف دو طریقے ہوسکتے ہیں یا تو علماء کے طبقے میں چند ایسے افراد پیدا ہوجائیں جو اپنی جماعت کو زمانے کی ضروریات اور حقیقی زندگی کے مسائل کی طرف متوجہ کریں، اس کے اخلاقی تنزل کو دور کریں اور اس میں سے برہمنیت کا استیصال کریں یا پھر کمال اتاترک کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اس طبقہ کے اقتدار کو بالکل مٹا دیا جائے۔

[نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں سرچارلس ایڈمس کی مشہور تصنیف محمد عبدہٗ ترجمہ محمد ظہیرالدین صدیقی بی۔ اے۔ مکتبہ پاکستان، لاہور، طبع ثانی سے استفادہ کیا گیا ہے۔]

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی*

سرسیّد اور قدیم و جدید تعلیم کا امتزاج

موجودہ دور میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل میں ایک بہت اہم اور پیچیدہ مسئلہ قدیم و جدید تعلیم کا امتزاج ہے۔ اس کی خاص اہمیت اس وجہ سے ہے کہ وہ زندگی کا بہت ہی وسیع تصور رکھتے ہیں اور اپنے تمام مشاغل اور مصروفیات کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظامِ حیات (دینِ اسلام) سے مرتبط و منضبط سمجھتے ہیں۔ اسی ارتباط کے تحت مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بہتری اور ترقی اس بات کی متقاضی ہے کہ ان میں ایسے افراد پیدا ہوں جو اسلام کے اساسی علوم کے ساتھ جدید علوم سے بھی بہرہ ور ہوں اور اسلام کی تشریح و ترجمانی اور اس کے دفاع کی خدمت بہتر طور پر انجام دے سکیں۔ مذکورہ مسئلہ پیچیدہ اس وجہ سے ہے کہ یہاں برطانوی حکومت کے قیام کے بعد مسلمان دہرے نظامِ تعلیم کا شکار ہوئے تو اس کے مسائل پر اب تک قابو نہ پا سکے بلکہ دونوں نظام میں تفریق و دوری دن بہ دن اور بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ایک جانب ان کی دینی، تہذیبی و ثقافتی ضروریات و ترجیحات ہیں جو ایک مخصوص نظامِ تعلیم سے منسلک ہیں جنھیں قدیم یا دینی تعلیم کہا جاتا ہے۔ دوسری جانب سماجی ترقی، دوسری قوموں سے مسابقت اور معاشی زندگی کے مسائل ہیں جو کافی حد تک جدید تعلیم سے وابستہ ہیں۔ کس طرح ایک ہی مربوط و جامع نظامِ تعلیم کے ذریعے دونوں قسم کی ضروریات پوری ہوں، یہ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے بہت بڑا چیلنج ہے۔ اس پیچیدگی کے باوجود یہ مسئلہ برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ہی سے علماء، مفکرین و مصلحین میں زیرِ غور رہا ہے اور اس پر اظہارِ خیال کے ساتھ کچھ نہ کچھ عملی تدابیر بھی اختیار کی جاتی رہی ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں رہا ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی فلاح و بہبود کا تقاضا یہ ہے کہ وہ قدیم تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم کے نظام سے بھی مستفید ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے لیے کیا حکمتِ عملی اپنائی جائے اس میں اختلاف رہا ہے۔ یہاں اس مسئلہ پر خاص طور سے سرسیّد علیہ الرحمہ کے نقطہ نظر کی وضاحت مقصود ہے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ علم کی خدمت، تعلیم کی اشاعت اور مسلمانوں کے اجتماعی فلاح و بہبود کے کاموں میں بسر ہوا۔

زیرِ بحث مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے سب سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کی معاشرتی فلاح و بہبود اور سماجی ترقی کے لیے سرسیّد نے نہ صرف انگریزی زبان اور جدید علوم کی تحصیل پر زور دیا بلکہ اس کے لیے مشرقی علوم و فنون کے اکتساب کو بھی ضروری قرار دیا۔ انھوں نے اپنے خطبات و مقالات میں بار بار یہ حقیقت گوش گزار کرائی ہے کہ مسلمانوں کو ایسا نظامِ تعلیم درکار ہے جو ان کی دینی اور دنیوی ترقی کا ضامن ہو یا دین و دنیا دونوں کے لیے مفید

---

* ریڈر ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہو۔ مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں؛

"پس مسلمانوں پر واجب ہے کہ تعصب کو چھوڑیں اور بعد تحقیقات و مباحث کے سلسلۂ تعلیم مسلمانوں کا ایسا قائم کریں جو ان کے دین و دنیا دونوں کے لیے مفید ہو۔" لہ

اسی طرح اپنے مرتب کردہ تعلیمی خاکے کو پیش کرتے ہوئے آخر میں وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں؛

"جب ایسا انتظام و سلسلہ (تعلیم) قائم ہو جائے گا تب مسلمانوں کی تربیت اور دینی و دنیوی ترقی کی توقع ہو سکتی ہے۔" لہ

یہ مقصد کیسے حاصل ہو گا۔ سرسید کے خیال میں یہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب مسلمان سنجیدگی سے مختلف علوم کے سیکھنے میں دلچسپی لیں اور ایک ایسا نظامِ تعلیم اختیار کریں جو قدیم و جدید دونوں کا جامع ہو۔ اسی نکتہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں؛

"ہم کو گذشتہ و حال پر نظر کر کے ایک ایسا طریقہ معین، کرنا چاہیے جس سے علوم دین و دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجے تک ہم کو قابو ملے۔" لہ

اسی بات کو مزید واضح انداز میں ان کے ایک خطبہ میں ملاحظہ فرمائیں جس میں وہ جدید تعلیم کے اہتمام پر زور دیتے ہوئے مشرقی و مذہبی تعلیم کی جانب ان الفاظ میں توجہ دلاتے ہیں:

"اسی کے ساتھ ہم کو عربی کی بھی تعلیم دینی ضرور ہے جو قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمانوں کی زبان ہے ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی زبان ہے جس کی قدر کی جا سکتی ہے اور کسی طرح علمی زبان کے دائرہ سے علیحدہ نہیں رہ سکتی اور مسلمانوں کی ضروریات سے خارج نہیں رہ سکتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دینی بھی ادنیٰ درجہ کی یا اوسط درجہ کی یا اعلیٰ درجہ کی ہم پر فرض ہے۔ کیوں کہ مختلف اقوام کو جس چیز نے ایک قوم بنا دیا ہے وہ صرف اسلام ہے۔ اگر ہم اسی کا فکر نہ رکھیں تو قومیت قائم نہیں رہ سکتی۔" لہ

واقعہ یہ ہے کہ سماجی و ثقافتی ترقی کے لیے سرسید دنیاوی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کے اہتمام کو نہ صرف ضروری سمجھتے تھے بلکہ یہ تصور بھی رکھتے تھے کہ کسی بھی قوم میں عام تعلیم کا رواج اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں مذہبی تعلیم شامل نہ کی جائے۔ وہ صاف صاف لکھتے ہیں:

"جو لوگ ہندوستان میں مسلمانوں کی عام تعلیم پر کوشش کرتے ہیں ان کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ عام تعلیم کا رواج کسی قوم کے زن و مرد میں بغیر شمول تعلیم مذہبی کے نہ ہوا ہے نہ ہو گا اور نہ دنیا میں کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی موجود ہے جس میں عام تعلیم کا رواج بلا شمول مذہبی تعلیم کے ہوا ہو۔" لہ

تعلیم کے دو معروف منابع سے استفادہ کے تئیں سرسید کا نقطۂ نظر کیا تھا، اس پر پروفیسر خلیق احمد نظامی کا بہت متوازن نظر آتا ہے:

"وہ چاہتے تھے کہ مشرق کی ہر عمدہ چیز کو باقی رکھا جائے اور مغرب کی بھی کسی اچھی چیز کو حاصل کرنے میں گریز نہ کیا جائے۔" لہ

سرسید کو دراصل مسلم معاشرے کی عام ضروریات اور مسلمانوں کی مذہبی و ثقافتی زندگی کے مخصوص تقاضوں

احساس تھا اس لیے وہ ایسے نظام تعلیم کے داعی تھے جو دونوں اعتبار سے مفید ثابت ہو سکے۔ سرسید کی یہ واضح رائے حقائق کی ترجمان تھی کہ لوگ مختلف مقاصد کے تحت تعلیم کی جانب راغب اور اس کے حصول کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے کہ تمام پڑھنے والوں کا مقصد ایک ہی ہو۔ اس لیے وہی نظام تعلیم جامع اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہوگا جس میں تعلیم کے تمام معروف مقاصد کے حصول کی رعایت رکھی گئی ہو۔ سرسید کا یہ نقطۂ نظر یہاں خود اُن کے اپنے الفاظ میں پیش کرنا زیادہ مناسب ہوگا:

"ہم مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو (تعلیم کے ذریعہ) گورنمنٹ کے اعلیٰ اعلیٰ عہدوں کے حاصل کرنے اور انتظامِ گورنمنٹ میں شامل ہو کر دنیاوی عزت حاصل کرنے اور اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے کی آرزو رکھتی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ اس کو گورنمنٹ کے عہدوں کو حاصل کرنے کا کچھ خیال نہیں ہے بلکہ وہ اپنی قوتِ بازو سے بذریعہ تجارت یا اجرائے کارخانہ جات کے اپنی معاش پیدا کرنے کی خواہش مند ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ وہ صرف اپنی جائداد اور اپنے علاقہ جات کی درستی اور اپنے روزمرہ کی زندگی کے امورات کو بخوش اسلوبی انجام دینے کی آرزو رکھتی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ علوم و فنون کو حاصل کرنا اور اُن میں واقفیت کامل حاصل کرنا پسند کرتی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ اس کو ان تمام چیزوں سے چنداں تعلق نہیں ہے بلکہ وہ بلحاظ اپنی معاد کے علوم دین میں دستگاہ کامل حاصل کرنا اور اسی میں اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اور ایک جماعت عوام الناس کی ہے جن کے لیے کسی قدر عام تعلیم ہی ہونا ضروری ہے۔ بایں ہمہ ہر ایک کو اپنی اولاد کی نسبت یہ خواہش ہے کہ اس کے عقائد مذہبی بھی درست رہیں اور وہ ادائے فرائض منصبی سے بھی غافل نہ ہو جاوے پس جب کہ ہم تمام مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ قرار دیتے ہیں تو ہم کو ایسی تجویز کرنی چاہیے جس سے تمام مقاصد مذکورہ اور نیز دیگر مقاصد جو تعلیم سے متعلق ہیں حاصل ہوں۔"

ظاہر ہے کہ اس کثیر المقاصد تعلیم کا اہتمام اُسی وقت ممکن ہے جب ایک ایسا جامع نظام تعلیم تشکیل دیا جائے جو ادنیٰ سے اعلیٰ مرحلے تک مربوط ہو اور پڑھانے کے لیے ایک ایسا نصاب مقرر کیا جائے جو مختلف النوع مضامین پر مشتمل ہو اور کلاسیکیت کے ساتھ جدت کا عنصر بھی رکھتا ہو۔ سرسید کے خیال میں ایسا جامع نظام مسلمانوں کو خود قائم کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ حکومت سے یہ توقع بے سود ہے کہ وہ کوئی ایسا تعلیمی نظام جاری کرے گی جو مسلمانوں کی دینی و دنیوی دونوں قسم کی ضروریات کی کفالت کرے انھوں نے صاف طور پر یہ واضح کیا کہ سرکاری اسکولوں و کالجوں کا خاص مقصد ڈگری ہولڈرس پیدا کرنا اور ملازمت کے لیے لوگوں کو تیار کرنا ہوتا ہے۔ نہ تو ان اداروں میں مسلمانوں کی حسب منشا دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہو سکتا ہے اور نہ مشرقی علوم و فنون کی تعلیم کا خاطر خواہ نظم ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے اپنا مجوزہ خاکہ پیش کرتے ہوئے وہ آخر میں اس حقیقت کی جانب متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"پس یہ وہ طریقے ہیں جن سے میری دانست میں تعلیم مسلمانوں کی اس طریق پر جو دین و دنیا کے لیے مفید ہو جاری ہو سکتی ہے اور نکبت اور جہل جو مسلمانوں میں پھیلتا جاتا ہے، اس کا علاج ہو سکتا ہے مگر ہر شخص یہ بات بخوبی و بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ یہ طریقہ تعلیم کا نہ کسی طرح گورنمنٹ اختیار کر سکتی ہے اور نہ سرکاری کالجوں و اسکولوں میں جاری ہو سکتا ہے۔ خود مسلمان البتہ بخوبی جاری کر سکتے ہیں اور کچھ شک نہیں کہ اس کے اجرا کا مقدور رکھتے ہیں، صرف ہمت اور محنت اور توجہ درکار ہے۔" [۵۵]

اسی طرح ایک دوسری جگہ مسلمانوں کے لیے عام تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کی اہمیت واضح کرتے ہوئے حکومت کی جانب سے
کو خارج از امکان قرار دیتے ہیں اور مسلمانوں کو اس انداز میں دعوت فکر دیتے ہیں:

"اب اور کیا تدبیر ہے جس میں مسلمانوں کی بہتری و بہبودی ہو اور ان میں عموماً تعلیم کا رواج ہو اور اعلیٰ
اعلیٰ اور ہر قسم کے مفید علموں کی خواہ وہ مذہبی ہوں یا دنیاوی بنیاد پر قائم ہوں۔ ہر شخص اس کا جواب
دے سکے گا کہ صرف ایک ہی تدبیر باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم خود آپ اپنی تعلیم و تربیت پر مستعد و آمادہ
ہوں اور یہ جو ہندی مثل مشہور ہے کہ 'جیٹھ کے بھروسے پیٹ' اس کی عار نہ اٹھاویں بلکہ "آپ
کام مہا کام" کی نصیحت حکیمانہ سے نصیحت پکڑیں۔" ـه

اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کے خیال میں مسلمانوں کے لیے مفید اور قدیم و جدید تعلیم کا جامع
ان کا اپنا قائم کیا ہوا ہو سکتا ہے۔ ان کے مفید مطلب تعلیم کسی اور کے ذریعے یا حکومت کے بل بوتے پر نہیں جار:
اسی لیے وہ بار بار اس بات پر زور دیتے تھے کہ "کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ
میں نہ لیوے اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔" ـله

رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی بہتری و ترقی کے لئے خود سرسید نے کون سا نظام تعلیم پیش
مختلف صلاحیت کے افراد پیدا کرنے کے لیے انھوں نے قدیم و جدید کی تعلیم کے امتزاج کا کیا لائحہ عمل تیار کیا اس کا جواب مدرسۃ
لیے ان کے مجوزہ نصابی خاکہ، طریقہ تعلیم اور مراحل تعلیم میں بخوبی ملتا ہے۔ سرسید کے ذہن میں تعلیم کا جو وسیع تصور تھا ا
کی معاشرتی پستی، معاشی بدحالی اور قدیم علوم و فنون کے تحفظ کا جو شدید احساس تھا۔ اسی کے پیش نظر انھوں نے مد
کے قیام کا ایک نہایت جامع اور وسیع پروگرام مرتب کیا وہ صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ تین مدرسوں کو ملا کر ایک بڑا اد
کرنا چاہتے تھے وہ انگریزی و اردو دونوں میڈیم سے جدید علوم کی درسیات جاری کرنا چاہتے تھے تاکہ زبان کی دشوا
علوم کو سیکھنے میں حارج نہ آئے۔ اسی طرح جدید علوم سے مستفید ہونے والوں کو نہ صرف عربی، فارسی و دینیات
کرانا چاہتے تھے بلکہ ان لوگوں کو مشرقی زبانوں اور اسلامی علوم میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع بھی فراہم کرانا چاہتے تھے جو جدید علو
کے بعد اس کی خواہش و طلب رکھتے ہوں۔ سرسید کی یہ وسیع تعلیمی اسکیم اور قدیم و جدید تعلیم میں امتزاج کے لیے ان کی ا
عملی تدبیر خود اُن کے اپنے الفاظ میں زیادہ بہتر طور پر سمجھی جا سکتی ہے:

"یہ مدرسہ درحقیقت تین مدرسوں پر مشتمل ہوگا۔ اول انگریزی، دوم اردو، سوم عربی فارسی۔ جو
مدرسہ انگریزی کا ہوگا، اس میں بالکل انگریزی پڑھائی جاوے گی اور تمام علوم و فنون اور جو کچھ کہ
اس میں تعلیم ہوگا وہ سب انگریزی میں ہوگا الا کہ ہر طالب علم کو سیکنڈ لینگویج بھی پڑھنی ہوگی۔ لیٹن و
اردو یا لیٹن و فارسی یا لیٹن اور عربی اور اس کو بہ شمول اپنی تعلیم کے کچھ مختصر باتیں فقہ و حدیث و عقائد
کی اردو زبان میں پڑھ لینی ہوں گی ...

اردو مدرسہ: اس میں تمام علوم و فنون بزبان اردو پڑھائے جاویں گے اور جو کچھ اس میں تعلیم
ہوگی وہ سب اردو میں ہوگی۔ البتہ ہر طالب علم کو تین زبانوں میں سے کوئی زبان بطور سیکنڈ لینگویج
کے اختیار کرنی ہوگی۔ انگریزی، فارسی، عربی ...

عربی فارسی مدرسہ: اس میں ابتداءً کسی علم کی تعلیم نہیں ہونے کی، بلکہ جنہا انگریزی اور اردو پڑھنے والوں نے ان زبانوں میں سے جس کو بطور سیکنڈ لنگویج کے اختیار کیا ہوگا اور اردو میں علوم وفنون پڑھنے کے بعد عربی یا فارسی زبان کے لٹریچر و علوم میں کمال حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہوگا تو ان کی پڑھائی فارسی، عربی میں اعلیٰ درجہ تک اس مدرسہ میں ہوگی۔

تینوں مدرسے مل کر درحقیقت ایک مدرسہ ہوگا اور جو کہ ہر قسم کے یعنی انگریزی کے اور اردو فارسی و عربی کے اس میں موجود رہوں گے تو سلسلہ تعلیم ہر ایک مدرسہ کا جو قائم کیا گیا ہے وہ استادوں کی تقسیم اوقات سے بخوبی تکمیل پاتا رہے گا۔"[11]

یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ سرسید نے نہ صرف یہ کہ مذکورہ مدارس کی نوعیت واضح کی بلکہ ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ مقاصد بھی متعین کیے جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس طرح ایک جامع نظام تعلیم کے ذریعے مسلمانوں میں مختلف صلاحیت کے افراد پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کی اجتماعی ضروریات پوری ہوسکیں۔ اولین مدرسہ کا اہم مقصد انگریزی تعلیم میں مہارت بہم پہنچا کر سرکاری ملازمت کے اہل بنانا تھا۔ اسی کے ساتھ اس سے یہ بھی مطلوب تھا کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ تیار ہوں جو انگریزی زبان و جدید علوم سے بخوبی واقفیت کے ساتھ مشرقی زبانوں بالخصوص اردو کی اچھی صلاحیت پیدا کریں اور عصری علوم کی انگریزی کتابوں کو اردو میں منتقل کر کے ایک وسیع حلقے میں ان کی اشاعت کا ذریعہ بنیں[12] دوسرے مدرسہ سے خاص مقصود یہ تھا کہ جدید علوم سے بہرہ ور ہونے میں انگریزی زبان کی دشواری حائل نہ ہو اور طلبہ مادری زبان کے ذریعہ بآسانی ان علوم کا اکتساب کرسکیں۔ اس طرح کثیر تعداد میں طلبہ کو عصری علوم سے روشناس ہونے کا موقع فراہم ہوگا۔ اسی کے ساتھ اس مدرسہ کے طلبہ سے (سیکنڈ لنگویج کی شرط لگاکر) یہ مطلوب تھا کہ وہ اردو کے ساتھ حسبِ خواہش و رجحان عربی فارسی و انگریزی میں سے کسی ایک اور زبان سے بخوبی واقفیت حاصل کرلیں۔ مزید براں اس مدرسہ کے طلبہ کا دائرہ علم اور ان کی تعلیم کی افادیت بڑھانے کے لیے سرسید نے یہ بھی تجویز کیا تھا کہ وہ مدرسے کا کورس پورا کرنے کے بعد مزید تین سال اس زبان میں مہارت حاصل کرنے میں صرف کریں جسے انھوں نے بطور سیکنڈ لنگویج اختیار کیا تھا اس طرح انگریزی کی استعداد بڑھانے والے سرکاری نوکری یا نجی کاروبار کے لائق ہو جائیں گے اور عربی یا فارسی میں مہارت حاصل کرنے والے ان زبانوں یا جو علوم وفنون ان زبانوں کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان کی اشاعت و ترقی کا ذریعہ بنیں گے[13] قدیم و جدید تعلیم میں امتزاج کے اعتبار سے تیسرا مدرسہ سب سے اہم تھا، اور یہی اصلاً مشرقی و مغربی تعلیم کا سنگم تھا۔ اس میں ان طلباء کو عربی و فارسی اور متعلقہ علوم میں اعلیٰ تعلیم کی سہولت حاصل تھی جو انگریزی یا اردو کسی میڈیم سے جدید تعلیم کا کورس مکمل کرچکے ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس سے ایسے افراد کی فراہمی مقصود تھی جو انگریزی زبان و عصری علوم سے بخوبی واقفیت حاصل کرنے کے ساتھ عربی و فارسی اور اسلامی علوم کی بھی اچھی استعداد رکھتے ہوں تاکہ وہ مسلمانوں کے قدیم علمی و ثقافتی ورثہ کے تحفظ اور نئے علمی انداز میں اسلام و اسلامی تعلیمات کی تشریح اور ترجمانی کی خدمت انجام دے سکیں۔ یہی وہ طبقہ ہے جس کی مسلم معاشرے کو ضرورت روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور ملت کو جس کی کمی کا احساس تیز سے تیز تر ہوتا جارہا ہے۔

جہاں تک مدرسۃ العلوم کی درسیات یا کالج میں پڑھائے جانے والے کورسز کا تعلق ہے، ان کے لیے سرسید

نے مدرستہ العلوم کے قیام کے وقت اصلاً جو تجاویز پیش کی تھیں وہ نصاب کی جامعیت اور قدیم و جدید کے امتزاج کا واضح نمونہ پیش کرتی ہیں۔ اس مجوزہ نصاب میں دو قسم کے مضامین ملتے ہیں: ایک عام و دوسرے خاص۔ عام مضامین کا چار بڑے حصوں (دینیات، علم ادب، علم ریاضی و علم طبعیات) کے تحت ذکر کیا گیا ہے۔ یہ پوری تفصیلات خود سرسید کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

"مسلمانوں کی تعلیم دو قسم پر منقسم ہونی چاہیے۔ ایک تعلیم عام اور دوسری خاص۔ تعلیم عام مسلمانوں کی علوم مفصلہ ذیل میں ہونی چاہیے۔

اول دینیات۔ فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، علم سیر، علم عقائد۔

دوم علم ادب۔ زبان دانی اور انشاء پردازی اردو، فارسی، عربی، انگریزی و لیٹن، علم تاریخ، علم جغرافیہ، علم اخلاق، مینٹل سائنس یعنی علم قوائے انسانی، علم منطق، علم فلسفہ، علم سیاست مدن یعنی اصول گورنمنٹ، علم انتظام مدن یعنی پولیٹکل اکونمی۔

سوم ریاضی۔ علم حساب، علم جبر و مقابلہ، علم ہندسہ، فروعات اعلیٰ علم ریاضی کی۔

چہارم علم طبعیات۔ علم سکون، علم حرکت، علم آب، علم ہوا، علم مناظر، علم برق، علم ہیئت، علم آواز، علم حرارت، نیچرل فلاسفی۔

تعلیم خاص مسلمانوں کی ان علوم میں ہونی لازم ہے جن کی تفصیل ذیل میں مندرج ہے۔

انجینیری، انیمل فزیالوجی یعنی علم حیوانات، اناٹومی یعنی علم تشریح، ذوالوجی حسب انیمل فزیالوجی باٹنی یعنی علم نباتات، جیالوجی یعنی علم طبقات الارض، منرالوجی یعنی علم جمادات، کیمسٹری یعنی علم کیمیا۔"[۱۱]

عام و خاص مضامین کی تقسیم کے بارے میں مزید تفصیل نہیں ملتی لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ عام مضامین سب کے پڑھنے کے لیے تھے اور خاص مضامین میں سے کسی ایک کا انتخاب ضروری تھا[۱۲] اسی طرح یہ وضاحت بھی نہیں ملتی کہ مختلف مراحل یا درجات میں ان علوم کی تعلیم کا کس طرح اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نصاب سے متعلق یہ عمومی تجاویز تھیں اور مختلف درجات کے لیے مذکورہ مضامین اور ان کی مقدار کی تعیین بعد میں ہونی تھی جیسا کہ خود سرسید نے اس تجویز کے آخر میں اس جانب اشارہ کیا ہے[۱۳] یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مذکورہ نصابی خاکہ اس پس منظر میں پیش کیا گیا تھا کہ مدرستہ العلوم ایک بڑے ادارے کی حیثیت سے قائم ہوگا، جس میں ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ تمام مراحل تعلیم شامل ہوں گے اور انٹرنس (Entrance) (ہائی اسکول)، ایف۔ اے (انٹر)۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے تک کی تعلیم کا اہتمام ہوگا اسی اعتبار سے بعد میں مذکورہ مضامین کی تقسیم اور معیار و مقدار کی تعیین ہونی تھی۔ بہرحال اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ سرسید کے مجوزہ نصابی خاکے میں قدیم و جدید (یا آج کل کی اصطلاح میں اسلامی و عصری) دونوں قسم کے علوم شامل تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں عصری علوم کا غلبہ نظر آتا ہے جن کی مسلمانوں میں ترویج و اشاعت سرسید کے تعلیمی مشن کا خاص حصہ تھا۔

۱۸۷۵ء میں ایک اسکول کی حیثیت سے مدرستہ العلوم کی بنیاد پڑی اور ۱۸۷۷ء میں اس نے کالج کی شکل اختیار کی۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ سرسید نے اس ادارے کے لیے تعلیم کا جو وسیع پروگرام تشکیل دیا تھا اور اس کا جو جامع

سابق خاکہ مرتب کیا تھا پوری طرح اسی کے مطابق اس میں تعلیم کا اہتمام ہوتا رہا۔

مدرستہ العلوم یا ایم۔ اے۔ او کالج (Mohammadan Anglo Oriental College) کی کارکردگی کی تفصیلات سے صورت حال کچھ مختلف ہی نظر آتی ہے۔ کالج کے باقاعدہ شروع ہونے کے بعد جن مضامین کے پڑھائے جانے کا ذکر ملتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

زبان۔ انگریزی، عربی، فارسی اور سنسکرت۔

علم ادب۔ منطق، علم معانی، علم قوائے انسانی، علم اخلاق، علم تاریخ،

نیچرل فلاسفی، ریاضیات، طبعیات۔

اسلامی قانون، فقہ، دینیات۔[۱۸]

خاص طور سے بی۔ اے کی سطح پر جو مضامین اختیار کیے جا سکتے تھے ان میں انگریزی، فارسی، عربی، سنسکرت، علم سیاست، علم انتظام تمدن، تاریخ و ریاضی شامل تھے۔[۱۹]

دوسری جانب اردو میڈیم کے ذریعے کالج کی تعلیم کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ۱۸۸۵ء میں موقوف ہو گیا۔ اس طرح سرسید کے مجوزہ وسیع تعلیمی سلسلے کی ایک کڑی ختم ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جدید علوم و فنون کی اردو درسیات پوری طرح مہیا نہ ہونے کی وجہ سے اس سیکشن کی کارکردگی اطمینان بخش نہ رہی اور طلبا کی تعداد سال بہ سال گھٹتی رہی۔[۲۰] دوسرے اس کی ایک توجیہ یہ بھی کی جاتی ہے کہ کالج کے ارباب اختیار میں ایسے حضرات کی اکثریت تھی جن کی خاص توجہ و دلچسپی انگریزی میڈیم والے مدرسے میں تھی۔ اس لیے اردو میڈیم مدرسہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔[۲۱] مزید براں اس تیسرے (عربی فارسی) مدرسے کے قیام یا کارکردگی کے بارے میں کچھ تفصیلات نہیں ملتیں جو خاص طور سے انگریزی و جدید تعلیم کے فیض یافتگان کو عربی فارسی و اسلامی علوم میں اعلیٰ تعلیم بہم پہنچانے کے لیے تجویز ہوا تھا۔

اس طرح اصلاً اولیں انگریزی مدرسہ یا ایم۔ اے۔ او کالج کی تعلیمی مصروفیات ہی جاری رہیں اور سرسید کے خوابوں کی تعبیر اسی میں ظاہر ہوتی رہی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس ادارہ میں قدیم و جدید تعلیم کے بارے میں کیا عملی رویہ اختیار کیا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں انگریزی زبان و عصری علوم کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی لیکن اسی کے ساتھ عربی و فارسی زبان و ادب، دینیات و اسلامی تاریخ کی تعلیم کا اہتمام بھی ہوتا رہا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسکول و کالج کے مختلف مراحل میں دینیات کی تعلیم لازمی قرار دی گئی تھی اور سرسید کے یہاں محض اس کی رسمی تعلیم کا تصور نہیں تھا بلکہ اس کے تحت وہ ان تمام مضامین کی تعلیم کا اہتمام چاہتے تھے جنھیں معروف اصطلاح میں اسلامی علوم کہا جاتا ہے۔ وہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دینیات میں علوم مفصلہ ذیل داخل ہیں: فقہ، حدیث، تفسیر، اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر، علم عقائد، علم کلام۔ بس انہی علوم کی کتابیں سلسلۂ تعلیم علوم مذہبی میں جس طرح کہ مناسب ہوں داخل کی جاویں۔"[۲۲]

دینیات کی تعلیم کے سلسلے میں سرسید کا اہتمام اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ اسکول و کالج میں تعلیم کے مختلف مراحل میں ہر مرحلہ کے معیار کے مطابق اس مضمون کی درسیات داخلِ نصاب کی جائیں اور طلبہ کی استعداد و دلچسپی کے

مطابق عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں اس کی تعلیم کا نظم کیا جائے۔ مزید براں وہ اُن طلبہ کے لیے شروع ہی سے میں دینیات کا ایک خصوصی کورس جاری کرنا چاہتے تھے جو اس مضمون میں اعلیٰ تعلیم یا مہارت حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ کالج کے نظم و نسق کے لیے سر سید نے جو چار کمیٹیاں تشکیل دی تھیں ان میں دو (کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اہلِ سنت جماعت و کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اہلِ شیعہ اثنا عشریہ) صرف مذہبی تعلیم کی نگرانی کے لیے تھیں۔

قدیم و جدید تعلیم کے امتزاج کے بارے میں سر سید کے تصورات کا یہ پہلو بھی یہاں قابل ذکر ہے کہ جدید علوم کے ساتھ وہ جن قدیم علوم و فنون کی تعلیم کے حق میں تھے ان میں بھی وہ جدت کا پہلو شامل کرنے کے خواہاں تھے۔ وہ بار بار اس پر زور دیتے تھے کہ مشرقی زبانوں کی تعلیم ہو یا دینیات وغیرہ کی اس کی افادیت بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ ان مضامین کے درسیات کو عصری اسلوب دیا جائے اور نئے انداز میں ان کے پڑھانے کا اہتمام کیا جائے[24] مثال کے طور پر دینیات کے باب میں انھوں نے بار بار اس جانب علمائے وقت کی توجہ مبذول کرائی کہ اس کی درسیات کے لیے نئے علم کلام کی تیاری کی جائیں اس لیے کہ جدید علوم و فنون بالخصوص فلسفۂ جدید کی تعلیم سے طلبہ کے عقائد میں جو خلل و فساد واقع ہو وہ اس علم کلام سے دور نہیں ہو سکتا جسے عباسی دور کے متکلمین نے یونانی فلسفہ کے نقصانات کے ازالے کے لیے کیا تھا اور نہ ہی قدیم علم کلام کی تعلیم سے ان اعتراضات کے دفع کی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے جو جدید فلسفہ و سا کی روشنی میں اسلامی عقائد و تعلیمات پر عائد کیے جاتے ہیں[25]

گرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ایم۔ اے۔ او کالج (یا مسلم یونیورسٹی) میں سر سید کے مذکورہ تصورات کے مطابق د کی تعلیم جاری رہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ادارے میں عصری علوم کی درسیات کے ساتھ عربی، اور دینیات کی تعلیم کا اہتمام قدیم و جدید تعلیم کے امتزاج کا نمونہ پیش کرتا رہا۔ اس طرح سر سید کے قائم کردہ ادارے میں وجدید تعلیم کے امتزاج کی ایک جزوی صورت ہی روبہ عمل آسکی۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ بانی درسگاہ کے تعلیم کے تمام تر تصورات اور السنۂ مشرقیہ و اسلامی علوم و فنون کی قدر و قیمت کے اعتراف کے باوجود اس ادارے کے نصاب میں ان کی خاطر خواہ شمولیت میں عملی دشواریاں سامنے آتی رہیں جس کا اصل مقصد مسلمانوں کو عصری تعلیم سے بہرہ ور کرنا ا علوم و فنون کے میدان میں ان کی صلاحیتیں اجاگر کرنا تھا۔ غالباً سر سید کو پہلے سے ان دشواریوں کا احساس تھا او نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ یکساں مقدار و معیار میں دونوں قسم کے علوم کی تعلیم کا ساتھ ساتھ اہتمام مفید اور نہ دونوں میدانوں میں مہارت کے حصول کے مقصد کے لیے کارگر ثابت ہوگا۔ مدرسۃ العلوم کے قیام کے وقت تعلیم و نصاب وغیرہ سے متعلق اپنی تجاویز پیش کرتے ہوئے نباضِ وقت نے بہت صاف لفظوں میں متنبہ کیا تھا

"ایک اور بات بھی قابل اطلاع کے لیے ہے۔ میں اکثر مصنفین رسالوں کی بھی رائے دیکھتا ہوں اور ممبران کی بھی رغبت پاتا ہوں اور لوگوں کی رائے کا بھی رجحان اس طرف دیکھتا ہوں کہ انگریزی زبان اور علوم کی تعلیم کے ساتھ عربی زبان اور ان علوم کی بھی جو عربی میں ہیں تعلیم دی جاوے مگر یہ رائے اس سبب سے قائم ہوئی کہ ان لوگوں نے خیال نہیں کیا کہ انگریزی اور عربی کی تحصیل میں کس قدر محنت اور کس قدر وقت درکار ہوتا ہے۔ اگر اس بات کو جاری کیا جاوے گا اور کوئی حدّو تمیز اس کے لیے مقرر نہ ہوگی تو دونوں میں سے کوئی حاصل نہیں ہونے کا۔ لڑکے نہ اِدھر کے رہیں گے نہ اُدھر

کے ۔" لتھ

یہ مختصر سی سادہ عبارت ہے لیکن قدیم وجدید تعلیم میں امتزاج کے تئیں سر سید کے عملی اپروچ کو سمجھنے کے لیے کافی ہے ظاہر ہے کہ اس میں انگریزی زبان وعلوم کے ساتھ جس عربی زبان وعلوم کی تعلیم کی دشواری کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد ان مضامین کی عام نہیں بلکہ اعلیٰ سطح کی تعلیم ہے۔ اس پس منظر میں یہاں دوبارہ یہ ذہن نشین کرانا نامناسب نہ ہوگا کہ سر سید نے ایک ساتھ تین مدرسوں کے قیام کا پروگرام بایں طور تشکیل دیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے مربوط رہیں اور تینوں مل کر ایک اکائی ثابت ہوں۔ بلا شبہ ان میں تعلیم کا ایسا نظم قائم کیا گیا تھا کہ عصری تعلیم کے مدرسے کے فارغین بآسانی مشرقی تعلیم کے مدرسے سے مستفید ہو سکیں اور عربی وفارسی اور اسلامی علوم میں مہارت پیدا کر سکیں لیکن یہ تجویز یا تدبیر قابلِ عمل نہ سمجھی گئی کہ اعلیٰ سطح پر بہ یک وقت ایک ہی ادارے میں دونوں قسم کی تعلیم کا اہتمام کیا جائے۔ مزید براں یہاں پھر یہ بات دہرانی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ قدیم وجدید تعلیم کے امتزاج کے انہی سب مسائل کے پیش نظر مصلح قوم نے بار بار مسلمانوں کو اس پر ابھارا کہ اگر وہ صحیح معنوں میں معاشرتی اصلاح، سماجی ترقی اور دین ودنیا دونوں کی بھلائی چاہتے ہیں تو وہ ادنیٰ سے اعلیٰ ہر مرحلے کی تعلیم کے لیے خود اپنا نظم قائم کریں اور خود اپنا مرتبہ نصاب وطریقۂ تعلیم جاری کریں۔ انھیں بخوبی اس بات کا احساس تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل صرف علی گڑھ میں ایک مدرستہ العلوم قائم ہونے سے حل نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ اسی طرز پر ہر علاقے یا ہر ضلع میں مسلمان اپنا تعلیمی ادارہ قائم کریں تاکہ ان کی معاشرتی ومعاشی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ وقت کی اسی اہم ضرورت کی جانب توجہ دلاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> "ہر ضلع میں کم از کم ایک ایسا مدرسہ قائم کرنا چاہیے جس سے ہر قسم کے مطالب اور مقاصد پورے ہوں کیوں کہ تمام لوگوں کے ایک ہی مقاصد نہیں ہوتے۔ اگر کوئی شخص مولوی، محدث، فقیہ بننا چاہے تو مولوی بننے کا بھی اس میں موقع موجود ہو۔ اگر کوئی شخص بڑا ریاضی داں بننا چاہتا ہے تو وہ بھی اپنا مقصد اس میں حاصل کر سکے اور اگر کوئی شخص علوم وزبان انگریزی میں تحصیل کامل کرنا اور عہدہ ہائے جلیلہ گورنمنٹ کو حاصل کرنا چاہے وہ بھی کر سکے جب ایسا انتظام اور سلسلہ قائم ہو جاوے تب مسلمانوں کی تربیت اور دینی ودنیوی ترقی کی توقع ہوتی ہے۔" لتھ

اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ اگر سر سید کی اس دعوت پر لبیک کہا گیا ہوتا اور سنجیدگی کے ساتھ ان کے وسیع تعلیمی منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا گیا ہوتا تو تعلیمی وسماجی سطح پر آج مسلمانوں کی حالت بہت بہتر ہوتی۔ واقعہ یہ ہے کہ خود مدرستہ العلوم علی گڑھ میں تعلیم وتربیت کے نظام کے سلسلے میں سر سید کا خواب ادھورا رہ گیا ورنہ یہ مدرسہ یا ایم اے او کالج قدیم وجدید تعلیم کا بہت بڑا سنگم ثابت ہوتا اور اس کی موجودہ شکل مسلم یونیورسٹی ایسے باصلاحیت افراد پیدا کرتی جو جدید علوم وفنون کے ساتھ اسلام کے اساسی علوم اور مشرقی زبانوں پر بھی عبور رکھتے اور اس طبقہ کی کمی کو پورا کرتے جس کی ضرورت آج مسلم معاشرے میں شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ یہ عظیم درس گاہ اس وقت مختلف طریقوں (دینیات کو لازمی مضمون قرار دینے، مختلف سطح پر عربی، فارسی، اردو، سنسکرت واسلامی علوم کی تعلیم کے اہتمام، مدارس کے فارغین کو مختلف کورسز میں داخلے کی سہولیات اور مرکز فروغ سائنس کے تحت مدارس کے اساتذہ کے لیے سیمینار اور ورکشاپ کے انعقاد) سے قدیم وجدید تعلیم میں امتزاج کے مواقع فراہم کر رہی ہے لیکن اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ اگر سر سید کے اصل تعلیمی منصوبے

کو بروئے کار لایا گیا ہوتا تو اس کٹھن مسئلہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے زیادہ موثر و مفید ثابت ہوتا جس کے حل کے سطح پر کوششیں جاری ہیں اور مدارس میں بھی اس کے تجربے ہو رہے ہیں۔ آخر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر یہاں مجوزہ تین مدرسوں والے پروگرام کے مطابق تعلیم کا نظام قائم کیا جائے تو یہ ملک و ملت کے لیے بہت بڑی خدمت ہے۔ دینی مدارس کو بھی ایک قابل عمل نمونہ فراہم ہوگا کہ وہ اپنے یہاں تعلیم کا ایسا سلسلہ قائم کریں کہ دینی تعلیم کے اپنے اپنے ادارے میں عصری تعلیم سے بھی بہرہ ور ہو سکیں اور قدیم و جدید تعلیم میں امتزاج کا ایک اور ماڈل فرا معاشرے کے بہترین خادم ثابت ہو سکیں۔

حواشی و مراجع

۱ مقالات سرسید (مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۱ء، ۸/۲۸

۲ مقالات سرسید۔ محولہ بالا ۸/۱۰۷

۳ مقالات سرسید، لاہور، ۱۹۹۰ء ۵/۳۱۰ - ۳۱۱

۴ خطبات سرسید (مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (بدون تاریخ) ۲/۲۴۹-۲۵۰

۵ مقالات سرسید، ۸/۱۰۴

۶ پروفیسر خلیق احمد نظامی، سرسید اور علی گڑھ تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۲ء ص ۲۷

۷ مقالات سرسید۔ ۸/۷۴

۸ مقالات سرسید۔ ۸/۹۱-۹۲

۹ مقالات سرسید۔ ۸/۱۰۵

۱۰ سرسید احمد خاں، لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ منشی سراج الدین) لاہور، ۱۸۹۰ء، ص ۱۴۲

۱۱ مقالات سرسید، ۸/۸۲-۸۶

۱۲ مقالات سرسید، ۸/۸۳

۱۳ مقالات سرسید، ۸/۸۴-۸۵

۱۴ مقالات سرسید، ۸/۷۹-۸۰

: Masroor Hashmi, Muslim Responnse to Western Education,
New Delhi 1989- PP 90-91 ۱۵

۱۶ مقالات سرسید، ۸/۸۰

۱۷ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں، ثریا حسین، سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص ۳۲۰ - ۳۲۲، مسرور ہاشمی، ص ۸۶ - ۸۸

18- S. K. Bhatnagar. History of M.A.O. College, Bombay, 1969- P. 55

۱۹ بھٹناگر، محولہ بالا ص ۱۵۳

۲۰؎ مسرور ہاشمی ، ص ۹۳-۹۴
۲۱؎ نسیم قریشی (مرتب) علی گڑھ تحریک - آغاز تا امروز ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ، ۱۹۶۰ء ، ص ۱۱-۱۳
(مقالہ سیّد عابد حسین : سید کا خواب اور اس کی تعبیر)
۲۲؎ مکاتیب سرسید احمد خاں (مرتبہ مشتاق حسین) فرینڈس بک ہاؤس ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ،
۱۹۶۰ء ، ص ۳۲۵ - ۳۲۶
۲۳؎ مکاتیب سرسیّد ، محولہ بالا ، ص ۳۲۲ - ۳۲۵
۲۴؎ مقالات سرسیّد ، ۸/۲۵-۲۲ ، ۷۵-۷۶ ، ۹۰ ، ۱۰۷ ، ۱۳۰ - ۱۳۱
۲۵؎ سرسید احمد خاں ، تعلیم مذہبی ، تہذیب الاخلاق ۲/۲۰ ، یکم ذی الحجہ ۱۲۸۸ھ ، ص ۱۸۶ ، خطبات
سرسیّد ۲/۲۹۴ - ۲۹۸ ، مکاتیب سرسیّد ، ص ۲۳۱ - ۲۳۳
۲۶؎ مقالات سرسیّد ، ۸/۷۸
۲۷؎ مقالات سرسید ۸/۱۰۷

(باقی صفحہ ۲۰ کا)

مطالعہ" ص ۸۵ - ۱۵۸ ؛ مولانا مودودی، تفہیم القرآن ، ہر سورہ کی شان نزول کی بحث میں قرآن مجید کے مختلف مقامات کی تشریح کرتے ہوئے شان نزول کے مسئلے سے بحث کی ہے مگر روایات کے بالمقابل سورۃ و آیت کے الفاظ سے اس کو متعین کرنے کا نظریہ بڑی شد و مد سے پیش کیا ہے اور اس پر عمل بھی کیا ہے ۔ یہ غالباً سرسیّد کے خیال ہی کا پرتو ہے اور غالباً ان کے ہاں مولانا فراہی سے آیا ہے ۔ ملاحظہ ہو : تفسیر نظام القرآن ، ص ۳۸ جہاں وہ فرماتے ہیں کہ :

"شانِ نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیے اور احادیث و روایات کے ذخیرے میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کر دیں۔"

پروفیسر محمد سالم قدوائی *

سرسید کے مذہبی عقائد

ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی علمی اور سماجی زبوں حالی سے جس قدر سرسیدؒ متاثر ہوئے اوران کو جگانے، سمجھانے اوران کے عقائد کو استوار کرنے کی جتنی کوشش سرسیدؒ نے کی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ سرسید کا ذہن جدید حالات کی روشنی سے منور تھا اور مسلمانوں کی مجموعی پستی اور بے حسی کو وہ اُن کی مذہب سے دوری اوراس کو صحیح ڈھنگ سے نہ سمجھنا قرار دیتے تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی لیے لکھی کہ یہ مسلمانوں کی بنیادی کتاب ہے اوراس کو صحیح ڈھنگ سے سمجھے بغیر محض اس کی تلاوت کرتے رہنے سے ممکن ہے مذہبی فریضہ تو ادا ہو جائے لیکن جس مقصد کے لیے اُسے نازل کیا گیا ہے وہ ہرگز پورا نہیں ہوگا۔

سرسید کی جتنی بھی تصانیف ہیں اُن میں ان کی تفسیر کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اس لیے کہ انھوں نے اسے جس انداز سے لوگوں کے سامنے پیش کیا اس سے ان کے مخالفین کو تو ان کے خلاف نبرد آزمائی کے لیے مزید مواد ملا لیکن ان کے قریب ترین ہمدرد اور دوست بھی اسے دیکھ کر بدظنی اور بدگمانی کے شکار ہوئے اوران پر اعتراضات کی بوچھار کی۔ سرسیدؒ جو اپنے مخالفین کی تمام کڑوی باتوں کو شربت کی طرح پی جاتے تھے اپنے دوستوں کی بے رُخی اوراپنے بارے میں اُن کی غلط فہمی سے بہت افسردہ ہوئے لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری اوراس سلسلے میں خطوط اور مضامین کے ذریعے سے اس تفسیر کے اصول، ان کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھانے کی کوشش کی۔

سرسید کی اس تفسیر کو سمجھنے کے لیے ان کے مذہبی عقائد کو جاننا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ان کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ اسلام کے تمام اصول وضوابط عقل کے مطابق ہیں اور قرآن مجید میں کوئی ایسی بات بیان نہیں کی گئی ہے جو عقل انسانی کی حدود سے باہر ہو۔ ان کے عقائد مختصراً یوں ہیں:

۱- خدا ایک ہے جو ابتدا سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ ساری دنیا کو پیدا کرنے والا اور تمام کائنات کا بنانے والا ہے۔

۲- خدا کا کلام اوراس کے رسول کا کلام خلاف حقیقت و خلاف واقعہ نہیں ہو سکتا۔

۳- قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اوراس کی تمام باتیں درست اور سچی ہیں۔ اس کی جن آیات کو بظاہر خلاف واقعہ یا متضاد سمجھا جاتا ہے، ان آیات کو ہم سمجھنے سے قاصر ہیں یا غلط سمجھتے ہیں۔

۴- سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہے جس کے قول و فعل کو مذہبی

---

* ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

امور میں تسلیم کیا جاسکتا ہو۔

۵۔ احادیث میں جو مذہبی امور سے متعلق ہیں اور ان میں جو دنیاوی امور سے متعلق ہیں، امتیاز کرنا چاہیے اور صرف اول الذکر کو اگر ان کا قول رسول ہونا قطعی طور پر ثابت ہو، واجب العمل تسلیم کرنا چاہیے۔

۶۔ انسان ان امور کے لیے مکلّف نہیں ہے جو اس کی طاقت سے باہر ہیں۔

۷۔ اسلام کے تمام احکامات فطرت کے عین مطابق ہیں (اور فطرت کو پیدا کرنے والا خدا ہے)۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔ چوں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا تھا اس لیے اس کتاب کو لازمی طور پر ایسا ہونا چاہیے جو رہتی دنیا تک ایک مکمل دستور کا کام دے اور جس کے ذریعے سے ہر قسم کے مسائل کو حل کیا جا سکے۔ قرآن کریم کی سب سے بڑی افادیت اہمیت اور معجزہ یہی ہے کہ نازل ہونے کے بعد سے اب تک وہ ایک ایسے دستور کا کام دیتا رہا ہے جو دینی اور دنیاوی مسائل کے حل اور ان کی ہم آہنگی کے لیے مثال ہے۔ قرآن مجید کے پہلے مفسر خود رسول کریم تھے۔ آپ کی زندگی میں جو بھی مسائل مسلمانوں کو پیش آتے، آپ سے دریافت کرتے اور آپ حالات ورقرآنی دستور کی روشنی میں ان کا حل بیان فرماتے۔ آگے چل کر جب تفسیر نے ایک فن کی شکل اختیار کرلی تو مفسرین کے الگ لگ اسکول بن گئے اور مختلف نقطۂ نظر سے قرآن مجید کی تفسیریں لکھی جانے لگیں۔

لوگوں کو ہر زمانے میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی رہی کہ قرآن مجید کو حالات اور سماج سے ہم آہنگ رکھا جائے۔ ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات میں سرسیّد نے اس ضرورت کو سب سے پہلے محسوس کیا۔ چوں کہ سرسیّد ایک اچھے ور سمجھ دار مسلمان اور باشعور انسان تھے اس لیے انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہ بنا لیا تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی فلاح کے لیے کام کرتے رہیں گے اور اسلامی علوم کی ترقی اور اشاعت کی پوری کوشش کریں گے۔ ان کا یقین تھا کہ مسلمانوں کی ترقی سی وقت ممکن ہے جب وہ حالات کے مطابق اپنے میں لچک پیدا کریں۔ انگریزی اور جدید علوم سیکھیں، اپنے مذہب کو یح طور پر سمجھیں اور اپنے عقائد میں پختہ رہیں جس کی بنیاد قرآن و سنت پر ہونا چاہیے۔ سرسیّد اس بات سے بہت فکرمند تھے کہ مسلمانوں میں بہت سے توہمات نے مذہبی عقائد کا روپ اختیار کر لیا ہے جس کی وجہ سے وہ مذہب کی سچی روح کو سمجھ نہیں سکتے۔ انھوں نے خود مذہب کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کا اور اس دور کی مروجہ تفسیروں کا گہرا مطالعہ کیا تو اُن کو س بات کا اندازہ ہوا کہ بہت سی تفسیریں کمزور روایات اور ایسے قصوں سے بھری ہوئی ہیں جن کی بنیاد اسرائیلی روایات یں اور جو قرآن مجید اور قانون فطرت سے بالکل الگ ہیں۔ پھر انھوں نے اصول تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا تاکہ یہ سمجھ سکیں کہ قرآن مید کی تفسیر کن اصولوں کے تحت کی گئی ہے لیکن یہاں بھی اُن کو وہ باتیں نہ مل سکیں جو اُن کی ذہنی الجھنوں کو حل کرتیں۔ وہ خود ہتے ہیں:

> ”پھر میں نے بقدر اپنی طاقت کے خود قرآن مجید پر غور کیا اور چاہا کہ خود قرآن ہی سے سمجھنا چاہیے کہ ان کا نظم کن اصولوں پر واقع ہوا ہے اور جہاں تک میری طاقت میں تھا میں نے سمجھا اور میں نے چاہا کہ جو اصول خود قرآن مجید سے نکلتے ہیں ان کے مطابق کوئی مخالفت علوم جدیدہ میں نہ اسلام سے ہے اور نہ قرآن سے پھر انہی اصولوں پر ایک تفسیر قرآن مجید کی لکھنی شروع کی۔“ (مکاتبات الخلان ص ۳)

سر سید نے جب یہ تفسیر لکھی تو اُن کے خلاف عام طور سے آوازیں اُٹھنے لگیں اور انھیں کافر و ملحد کہا گیا، مگر انھوں نے ان باتوں کی زیادہ پرواہ نہ کی، وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جو لوگ ان کی جدید تعلیم اور انگریزی زبان و ادب کے حصول کی تحریک کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہ قرآن مجید کی اس تفسیر کو جو انھوں نے جدید علوم اور زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر لکھا ہے اور جس میں اندھی تقلید کے بجائے فہم و ادراک اور عقل کے استعمال پر زور دیا گیا ہے، کس طرح قبول کریں گے، لیکن جب اُن کے قریبی دوستوں نے بھی اس سلسلے میں اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا تو انھوں نے جن اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنی تفسیر شروع کی تھی انھیں الگ سے ایک رسالے کی شکل میں مرتب کر دیا اور اس کا نام تحریر فی اصول التفسیر رکھا۔ یہ پندرہ اصول ہیں جو اس رسالے میں مع تشریح کے موجود ہیں۔

نواب محسن الملک نے جن کا سر سید سے بڑا گہرا تعلق تھا اور جو سر سید کو بہت مانتے تھے، اپنے خط میں ان کی تفسیر پر خاصے اعتراضات کیے۔ ان کے پہلے خط کے جواب میں سر سید نے اپنی تفسیر کے انداز اور اصولوں کو جس طرح سے بیان کیا ہے اس سے سر سید کی مذہبی فکر کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ ان کے عقلی استدلال اور تفسیری انداز کو سمجھنے کے لیے اس خط کا ایک حصّہ درج ذیل ہے:

"جانِ من۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے خدا کی عظمت کا جس عظمت کے وہ لائق ہے اور قرآن مجید کی صداقت کا جس صداقت کے وہ لائق ہے اور مذہب اسلام کی عزت اور سچائی کا جس عزت اور سچائی کے وہ لائق ہے، اپنے دل پر نقش کالحجر نہیں کیا ہے۔ اس لیے تمہاری رائے یا تمہارا دل اور تمہارا ایمان ڈانوا ڈول ہوتا ہے۔ اگر تمام خیالات کو دل سے محو کرکے یہ سچا اور دلی یقین کر لو کہ خدا سچا ہے اور قرآن اس کا کلام اور بالکل سچا ہے تو تم کو اس قسم کے شبہات ہرگز پیدا نہ ہوں گے۔" (مقالات سر سید ص ۲۰۶)

اسی خط میں انھوں نے مختصراً وہ اصول بھی بیان کیے ہیں جن کی تفصیل تحریر فی اصول التفسیر میں ہے۔ لکھتے ہیں:

"پہلا اصول یہ ہے کہ خدا سچا ہے اور قرآن مجید اس کا کلام اور بالکل سچ اور صحیح ہے۔ کوئی علم یعنی سچ اس کو جھٹلا نہیں سکتا بلکہ اس کی سچائی پر زیادہ روشنی ڈالتا ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ اب ہمارے سامنے دو چیزیں موجود ہیں (۱) ورک آف گاڈ یعنی خدا کے کام (۲) ورڈ آف گاڈ یعنی خدا کا کلام یعنی قرآن مجید اور ورک آف گاڈ اور ورڈ آف گاڈ کبھی مختلف نہیں ہو سکتا۔ اگر مختلف ہو تو ورک آف گاڈ تو موجود ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ورڈ آف گاڈ جس کو کہا جاتا ہے اس کا جھوٹا ہونا لازم ہے، نعوذ باللہ منھا۔ اس لیے ضرور ہے کہ دونوں متحد ہوں۔

تیسرا اصول ورک آف گاڈ یعنی قانون قدرت ایک عملی عہد خدا کا اور وعدہ اور وعید یہ قولی معاہدہ ہے اور ان دونوں میں سے کوئی خلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ اس کی تسلیم سے خدا کی قدرت مطلق میں نقصان آتا ہے جیسا کہ میں سمجھتا ہوں تمہارا خیال ہے، محض غلط اور وہم اور ناسمجھی ہے۔

چوتھا اصول خواہ یہ تسلیم کرو کہ انسان مذہب یعنی خدا کی عبادت کے لیے پیدا ہوا ہے، خواہ

یہ کہو کہ مذہب انسان کے لیے بنایا گیا ہے۔ دونوں حالتوں میں ضرور ہے کہ انسان میں بہ نسبت دیگر حیوانات کے کوئی ایسی چیز ہو کہ وہ اس کے بار کے اٹھانے کا مکلف ہو اور انسان میں وہ شے کیا ہے عقل ہے۔ اس لیے ضرور ہے کہ جو مذہب اس کو دیا جاوے وہ عقل انسانی کے مافوق نہ ہو۔ اگر وہ عقل انسانی کے مافوق ہے تو انسان اس کا مکلف نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کہ بیل یا گدھے کو امر و نہی کا مکلف قرار دیا جاوے۔

مذہب اسلام اور خدا کا کلام ان تمام نقصانوں سے پاک ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ تم سمجھ لو اور سمجھ کر یقین کرو کہ جو کچھ خدا بتاتا ہے اور کہتا ہے وہ سچ ہے۔ اس سے زیادہ سچائی کیا ہو سکتی ہے جو بانی اسلام کی زبان سے کہہ دینے کو خدا نے فرمایا انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی انما الٰھکم الہ واحد۔ انما انا بشیر و نذیر۔ جان من! مذہب اسلام اور خدا کے کلام کو دیو اور پری کے قصے مت بناؤ۔ ورنہ جو فوقیت اسلام کو دوسرے مذاہب باطلہ سے ہے وہ ساقط ہو جاتی ہے اور اسلام عقل انسانی کی رو سے قابل یقین نہیں رہتا۔"

(مکاتبات الخلان ص ۷۷)

تفسیر لکھنے کے لیے سر سید نے انھیں اصولوں کو بنیاد بنایا۔ سر سید جس دور میں یہ کام کر رہے تھے اس وقت نئے نئے انداز فکر، نئے تخیلات اور نئی قدریں ابھر کر سامنے آرہی تھیں۔ سر سید مسلمانوں کی بگڑتی ہوئی حالت سے پوری طرح واقف تھے اور اس کی وجہ ان کی نظر میں یہ تھی کہ مسلمان اپنے مذہب کی سچی روح کو پوری طرح سے نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ مذہب کو محض تقلیدی چیز سمجھتے ہیں اور خدا کی کتاب کو صرف نماز میں پڑھی جانے والی سورتوں تک محدود کر رکھا ہے۔ سر سید کا دعویٰ تھا کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے اور قرآن سب سے سچی کتاب ہے اور اسی سے زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے وہ قرآن کو ہمیشہ کام آنے والی کتاب مانتے تھے اور زمانے کے تمام تقاضوں کا حل اسی سے نکالنے کے قائل تھے۔

سر سید کا عقیدہ تھا کہ محض ظاہری فصاحت و بلاغت قرآن کا معجزہ نہیں ہے بلکہ اس کا اعجاز وہ تعلیمات و احکامات ہیں جو قانون فطرت کے مطابق ہیں، ہر زمانے کے لیے ہیں اور ہر شخص انھیں آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ ان کے مذہبی عقائد کی بنیاد اس پر تھی کہ قرآن مجید اور قانون فطرت میں مکمل یکسانیت ہے اور ان دونوں میں ذرا بھی اختلاف کسی بھی لمحہ نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے بار بار لکھا ہے کہ کائنات اللہ کا عمل اور قرآن اس کا قول ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے قول و فعل میں تضاد ممکن نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو نعوذ باللہ خدا کی الوہیت میں شبہ ہوتا۔ وہ قرآنی احکامات کو ہر زمانے کے لیے واجب العمل سمجھتے تھے لیکن ان کو بہت سے مفسرین کی تفسیر و تاویل سے اختلاف تھا اور یہ اختلاف مذہبی امور میں نہیں بلکہ ان کی توجیہات میں تھا۔ وہ قرآن مجید کی تعلیمات کو ہر اعتبار سے مکمل اور زندگی کو منور اور مرتب کرنے والی چیز سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کے احکامات، اچھے اخلاق اور حسن معاشرت کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ اسے محض ایک تاریخی دستاویز یا فنی کتاب نہیں سمجھتے تھے۔ وہ قرآن مجید میں کسی ناسخ و منسوخ کے بھی قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک قرآن میں جن جگہوں پر ایسا سمجھا جاتا ہے وہ قدیم انبیاء کی بتائی ہوئی شریعتوں کی تنسیخ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ باقی رہنے والی شریعت کے آنے کے بعد منسوخ ہو گئیں۔

سر سید نے اپنی تفسیر لکھتے وقت انھیں سب باتوں کو پیش نظر رکھا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر میں بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں جو دوسرے روایتی مفسرین سے بالکل الگ ہیں۔ خاص طور سے ان مقامات پر جہاں وہ ہر بات کو عقل کی

کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور مفسرین کے بیان کیے ہوئے قصوں اور پرانی روایات کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اپنے بنیادی اصول کا بار بار ذکر کرتے ہیں اور اللہ کے قول اور اس کے فعل میں ذرا بھی فرق کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی تفسیری عمارت کی تعمیر اسی پر ہے کہ کائنات اللہ کا فعل اور قرآن اس کا قول ہے اور ان دونوں میں اختلاف ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح سے وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان ان باتوں کے لیے ہرگز مکلف نہیں ہے جو اس کی فہم و ادراک سے بالاتر ہوں۔ قرآن مجید کو وہ انسانوں کی رہنمائی کے لیے بنیادی کتاب مانتے ہیں اور اس کی باتوں کو فہم انسانی کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش، معجزات، طوفان نوح، جن، جنت دوزخ وغیرہ کے اس تصور کے قائل نہیں ہیں جنھیں عام مفسرین بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ باتیں عقل سے بالاتر ہیں اور ان بنیادی اصولوں سے مختلف ہیں جو کائنات کی تخلیق اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں بیان کی گئی ہیں۔ وہ قرآن مجید ہی سے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس میں جگہ جگہ تعقل، تدبّر اور تفکر پر زور دیا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کی جتنی کاوش کی جائے گی اس سے اس کے مطالب کی اتنی ہی وضاحت ہوگی۔ وہ سنی سنائی باتوں پر ایمان لانے کے قائل نہیں ہیں بلکہ غور و فکر کے بعد مذہب اسلام کو سمجھنے اور اس کے اصولوں پر عمل کرنے پر زور دیتے ہیں۔ وہ ہر ذی عقل کو اس بات کا حق دیتے ہیں کہ جن مسائل میں کوئی نص قطعی موجود نہ ہو اس میں اپنی عقل و بصیرت کے مطابق فیصلہ کرے۔ سرسیّد نے اس وقت جو باتیں کہی تھیں ممکن ہے ان میں سے کچھ وقتی اور اس دور کے نقطۂ نظر سے اس جمود کو توڑنے کے لیے کہی ہوں۔ لیکن ان کی فلسفیانہ توجیہات اور عقلی استدلال میں بڑی جان ہے اور ان کو صرف مجذوب کی بڑ سمجھ لینا اور اس کی اہمیت اور اس کے نتائج کی فکر نہ کرنا بڑی زیادتی کی بات ہوگی۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ جو باتیں سرسیّد نے اس دور کے حالات کے پیش نظر کہی تھیں اور جن کی مستقل قدر و قیمت ہے ان کو مزید سمجھنے کی کوشش کی جائے اور نئی معلومات اور نئے مسائل کی روشنی میں انھیں پرکھا جائے۔ ممکن ہے ہمیں سرسیّد کی باتوں سے اور ان کے فکری انداز سے اختلاف ہو لیکن اُن کی علمی تفسیر عملی جدوجہد اور فکری جسارت کو نہ صرف تسلیم کرنا ہوگا بلکہ ان کو اس راہ کا قائد ماننا ہوگا اور اس راہ میں ان کے خلوص نیّت اور اوّلیت سے انکار ممکن نہ ہوگا۔

سرسید کے تفسیری رجحانات اس وقت بڑے چونکا دینے والے معلوم ہوتے تھے لیکن جن لوگوں نے قدماء کی تفسیروں کا مطالعہ کیا ہے ان کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ یہ نہج بالکل نئی نہیں ہے پہلے بھی لوگوں نے عقل و خرد کو ٹھوکے لگائے ہیں اور انھی خطوط پر ایسی باتیں کہی ہیں۔ جدید دور میں بھی علامہ اقبال، مولانا آزاد اور مودودی صاحب وغیرہ نے عام روش سے ہٹ کر اسلامی فکر کو نیا قالب دیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جس وقت سرسیّد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ تنہا تھے اور ان کی باتیں بہت ہی انوکھی معلوم ہوتی تھیں۔ موجودہ دور میں سائنس کے انکشافات نے ہر بات کو ممکن اور سہج کر دکھایا ہے اور اب عقل بھی ہر چیز کو تسلیم کرنے کے لیے تیار معلوم ہوتی ہے اور بڑی سے بڑی بات پر بھی کوئی چونکتا نہیں ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ سرسیّد کے مذہبی خیالات کو از سر نو سمجھا جائے اور ان کی تشریح کی جائے جو غلط فہمیاں ان کے بارے میں پھیل گئی تھیں اور جو آج تک دہرائی جاتی ہیں ان کا ازالہ کیا جائے اور ان کے اس درد کی ٹیسوں کو محسوس کیا جائے جو ان کو ہر وقت بے کل اور بے چین رکھتی تھیں۔

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی *

علمائے کرام سرسیدؒ کی نظر میں

سرسیّد احمد خاں گوناگوں خصوصیات کے مالک تھے۔ ان کی خوبیوں اور اعلیٰ صفات کو قلم بند کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نہایت وسیع الظرف، منکسر المزاج اور فراخ دل تھے۔ اپنے مخالفین و اعداء کو سینے سے لگالینا ان کا شیوہ تھا۔ وہ مخالفتوں اور عداوتوں کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتے بلکہ چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے ان کا نصب العین تھا۔ ابتدا ہی سے ہندوستان کے علماء کرام کا ایک بڑا طبقہ ان کی بیخ کنی میں جی جان سے لگا رہا لیکن وہ اس سے قطع نظر اپنے مقصد کے حصول میں ہمہ تن مصروف رہے اور کبھی بھی علمائے کرام کے لیے اپنا سینہ تنگ نہیں کیا۔ سرسیّدؒ مختلف مواقع پر علمائے کرام کی شان میں رطب اللسان رہے۔ یہاں چند مثالوں کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ ان کے اندر کس درجہ خاکساری اور انکساری تھی۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے، سرسیّدؒ کا ان سے تعلیمی باب میں اختلاف تھا لیکن اس کے باوجود سرسیدؒ کے یہاں ان کی کس حد تک قدر تھی اس کا اندازہ سرسیّد کے اس خط سے لگایا جاسکتا ہے:

> "بعد سلام مسنون کے عرض یہ ہے کہ بزرگان سہارنپور نے جو نوازش اور دل سوزی میرے حالِ زار پر کی جس کا ذکر آپ نے مجھ سے فرمایا تو میں دل سے ان کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو میری سعادت ہے، میں اُن کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔"

سرسیّد کی اس تحریر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا کی شخصیت ان کے لیے کس قدر محترم تھی۔ اسی طرح سرسید پر جب ان کی تحریروں کی وجہ سے کفر اور ارتداد کا فتویٰ صادر ہوا تو سرسید اس پر اپنے کسی ردّ عمل کا اظہار کرنے کے بجائے انھیں لکھتے ہیں:

> "جناب من! میری تمام تحریریں جن کے سبب میں کافر و مرتد ٹھہرا ہوں اور وحدانیت و رسالت کی تصدیق کے ساتھ کفر جمع ہوا ہے جو میرے نزدیک محالات میں سے ہے، چند اصولوں پر مبنی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان اصولوں کو بزرگانِ سہارنپور کی خدمت میں بھیج دیں۔ اگر ان میں کچھ غلطی ہے تو بلاشبہ نصیحتِ ناصح کارگر ہوگی۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ ناصح ہی مجھ سے نہ ہوجاویں۔"

---

* لکچرر ڈپارٹمنٹ آف عربک، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اس اقتباس سے سرسید کی انکساری اور حلیمی بالکل واضح ہے۔ اسی طرح جب مولانا قاسم نانوتویؒ کا انتقال ہوا۔ تو سرسید نے ایک مضمون میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ابتدا ہی سے آثار تقدی اور ورع اور نیک بختی اور خدا ترسی کے اوضاع و اطوار ان سے نمایاں تھے۔"

اسی مضمون کے آخر میں سرسید مدرسہ دیوبند کے متعلق رقم طراز ہیں:

"دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعے سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقشہ جما رہے۔"

یہ بات وہ شخص کہہ رہا ہے جو اس مدرسے کے برعکس ایک دوسرے مکتب خیال کا مؤسس ہے۔

سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق، تفاسیر اور تصانیف کے خلاف ہندوستانی علمائے کرام اور قدامت پرستوں کے مابین ایک قیامت برپا ہوگئی۔ سرسید اس قیامت پر طعنہ و طنز کرنے کے بجائے نہایت بردباری اور سنجیدگی کا ثبوت دیتے ہوئے ہفت روزہ اخبار کے بانی جناب سید نصرت علی مرحوم کو لکھتے ہیں:

"افسوس یہ ہے کہ جن لوگوں نے مخالفت کے لیے کمر باندھی ہے، ان کو میری نسبت مخالفت کرنی اور میرے افعال و اقوالِ ناشائستہ کی تردید کرنی اور اس پر لعنت و ملامت کرنی نہایت زیبا ہے کیوں کہ میں اس سے بھی زیادہ کا لائق ہوں جو وہ لکھتے ہیں الا قومی فائدے کے لیے جو کام اختیار کیا گیا ہے اس میں حرج ڈالنے سے اور اس میں مخل ہونے سے کیا فائدہ ہے۔ خود اپنے آپ بربادی کرنی ہے۔"

ایک دوسرے خط میں انھیں لکھتے ہیں:

"نسبت ترجمہ حمایت اسلام کے بھی امید ہے کہ کوئی فتویٰ تکفیر کا نکلے ہم کو اس سے کیا بحث ہے۔ ان لوگوں کو اپنا کام کرنے دو، ہم کو اپنا کام کرنے دو۔ ہم کو اس عمدہ اسلامی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے۔ واصبر علیٰ مایقولون واھجرھم ھجراً جمیلا۔"

نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین سرسید کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں کالج کے سیکریٹری منتخب ہوئے اور دس برس تک نہایت امانت و دیانت کے ساتھ اس فریضے کو انجام دیتے رہے۔ سرسید نے انھیں متعدد خطوط لکھے۔ ایک خط میں مولانا محمد صدیق صاحب سے اپنی عقیدت و حمیت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"مولوی محمد صدیق صاحب سے میرا بہت بہت سلام کہیے گا۔ ان سے ملنے کو دل چاہتا ہے۔ افسوس ہے کہ سالار جنگ کا انتقال ہوگیا۔ ورنہ متعدد دفعہ موقعہ ملاقات کا ہوتا۔"

سرسید احمد خاں نے جس وقت سید محمود کو مدرسۃ العلوم کا اپنا جانشین مقرر کرنا چاہا تو مولوی سمیع اللہ وغیرہ نے سرسید کے خلاف بدنیتی کا خوب اشتہار کیا۔ قدرے نواب وقار الملک بھی زیر اثر آگئے لیکن بعد میں سرسید کے سامنے معذرت پیش کی تو سرسید نے کہا:

"اس وقت تک آپ نے جو کیا، مجھ کو یقین ہے کہ آپ نے مولوی سمیع اللہ خاں کے سبب سے کیا اور یہ کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے میرے ساتھ کوئی کینہ دیرینہ نکالا ہے بجز غلطی اور ناعاقبت اندیشی۔"

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء

اور غلط دین داری کے اور کوئی سبب نہیں ہے۔ پھر آپ سے قطع ملاقات جب علی گڑھ میں آویں کیا وجہ اور اگر میرے کلبۂ احزاں کو قدوم سے منور کرنا چاہیں تو مجھے کچھ مضائقہ ہوگا بلکہ خوشی ہوگی۔ بہت سے بہت آپ کی نسبت یہ خیال کر سکتا ہوں کہ بہت سے لوگوں نے دانستہ اور بدنیتی سے مجھے برا بھلا کہا ہے اور آپ نے نادانستہ اور نیک نیتی سے۔ میرا کلبۂ احزاں موجود ہے۔ جب آپ چاہیں تشریف لاویں۔"

اسی سے متعلق ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک تو خط واپس شدہ کا محفوظ رکھنا ایک رنج کی یادگار کو قائم کرنا ہے، جس کا وجود اور خیال سب معدوم کر دینا چاہیے۔ جب تک میرے دل میں کسی کی طرف سے رنج ہوتا ہے تو میں اپنے دل کو کفر میں ڈوبا ہوا سمجھتا ہوں۔"

سرسید نے مولانا سید میر حسن صاحب کو بھی متعدد خطوط لکھے۔ وہ اپنے خطوط میں انھیں نہایت ادب و احترام کے ساتھ مخاطب کرتے۔ یعنی انھوں نے ہر جگہ علمائے دین کی عزت و توقیر کو پیش نظر رکھا ہے۔ ایک خط کے جواب میں مولانا کو لکھتے ہیں:

"آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو پہنچا۔ ممنون عنایت ہوا۔ جو عنایت دلی اور حمیت و اشفاق بزرگانہ مجھ ناچیز کے اوپر آپ مبذول فرماتے ہیں اس کا میں دل سے شکر ادا کرتا ہوں مگر میں حقیقت میں اس قدر عنایتوں کے لائق نہیں ہوں جس قدر کہ آپ فرماتے ہیں۔ بہرحال آپ کی عنایتوں کا شکر کرنا واجب ہے۔"

سرسید کی اس تحریر سے ایک طرف علماء سے غایت درجہ محبت تو دوسری طرف ان کی حد درجہ کسر نفسی کا پتہ چلتا ہے۔

سرسید کی محبتوں اور انہی عقیدتوں نے بہت سے علماء کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔ انہی میں سے ایک نمایاں نام مولانا الطاف حسین حالی کا بھی ہے۔ ان کی مشہور شعری تصنیف "مسدس حالی" کے باب میں کتنی فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے:

"بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں اور کچھ نہیں۔"

ایک دوسرے خط میں مولانا حالی کو لکھتے ہیں:

"شملہ میں اس سے بڑھ کر اور میرے لیے کون سی نعمت ہو سکتی ہے کہ چند روز آپ کی صحبت رہے۔ میرا رمضان سچ مچ عید ہو جائے گا۔ آپ بلا تامل تشریف لائیے۔ مکان، دل، آنکھیں سب حاضر ہیں۔"

مذکورہ دونوں اقتباس بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کا دل علمائے اسلام کی محبت سے مملو تھا۔

مولوی ابوالحسن بدایوں کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے چار سال سرسید کے پرسنل اسسٹنٹ اور پرائیویٹ سکریٹری کا فریضہ انجام دیا۔ سرسید ان کی بابت لکھتے ہیں:

"یہ سب صفتیں مولوی ابوالحسن میں موجود تھیں اور میں تصدیق کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھ کو اس مشکل کام میں ہر طرح کی مدد کی اور نہایت ایمان داری اور مستعدی اور راز داری سے کام کیا۔"

سرسید کے اس اقتباس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ علماء کی صفات کے اعتراف میں وہ وسیع القلبی سے کام لیتے تھے۔

سرسید کو علمائے کرام کے درجات، عظمتوں اور عزت و ناموس کا ہر آن خیال رہتا۔ جا بجا اس کی شہادت ان کی مختلف

تحریروں میں موجود ہے۔ وہ علمائے کرام کو ملّتِ اسلامیہ کا بہت عظیم سرمایہ تصور کرتے تھے لیکن علمائے کرام نے انھیں ہو بنایا۔ اس سلسلے میں عماد الملک مولوی سیّد حسین بلگرامی کے نام خط سے چند سطریں ملاحظہ کریں:

"میں نے آپ کا نام کسی قدر بے ادبی سے لیا۔ کیوں کہ اس وقت جو میرے دل میں آیا کسی طرح آپ کا نام لینا ادب تھا۔ میں نے کہا کہ تم سید حسین کو نہیں جانتے میں نے آج تک ان سا نیک دل اور پاک باطن، ظاہر و باطن یکساں، سچّا دوست اور سرتاسر سچائی، کسی کو نہیں دیکھا۔ رنج یا کدورت کی ان کے دل میں خدا نے جگہ ہی نہیں پیدا کی۔"

مولوی سمیع اللہ جو سرسیّد کے شدید ترین مخالفین میں سے تھے ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان اختلافات کو رفع کرنے کے لیے دونوں صاحبان کے مابین ملاقات کروانی چاہی تو سرسیّد فوراً تیار ہو گئے اور کہا کہ:

"میں نے کہلا بھیجا ہے کہ جو آپ کی مرضی ہو مجھ کو اس میں کچھ عذر نہیں ہے، چنانچہ وہ مع سمیع اللہ خاں صاحب کے تشریف لائے اور ان کے سامنے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب سے ملا۔ میں نے چاہا کہ میں نواب صاحب سے عرض کروں کہ میرا مذہب اور میرا طریقہ اور عمل اس شعر پر ہے۔ (ص ۳۵۷)

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن　　　آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

آگے ایک خط میں مولوی سیّد زین العابدین کی جدائی کی اذیت کا ذکر کتنے پُر تاثیر انداز میں کرتے ہیں۔ انھیں لکھے

"ابھی تمہارا خط پہنچا، کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے مگر مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اس کو بُرا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا ہے بلکہ دل سونا ہو گیا ہے۔ صبح اُٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔" (ص ۵۰۱)

اسی طرح مولوی عنایت اللہ صاحب بیمار ہوئے تو انھیں کس درجہ فکر لاحق ہوئی ملاحظہ کریں۔

"تمہاری علالت طبع سے جس قدر مجھ کو رنج ہے، بیان سے باہر ہے۔ خدا تم کو صحت کامل دیوے میں نے آج ڈاکٹر رحیم خاں صاحب کو تمہاری نسبت خط لکھا ہے اور اس میں بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ امید ہے کہ وہ نہایت دلی توجہ سے تمہارا علاج کریں گے۔" (ص ۵۲۷)

مولوی اشرف الدین صاحب سے بھی سرسیّد کی علمی اور فقہی مسائل پر خط و کتابت رہی۔ مولوی صاحب کی کسی بر سرسیّد لکھتے ہیں:

"جو خیال آپ کا میری طرف ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس کو دل سے دور کر دیجیے۔ میں صرف گنہگار شرمسار آدمی ہوں، ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی مجھ گنہگار سے ہزار درجہ بہتر ہے۔" (ص ۶۰۵)

ان لفظوں سے یہ بات واضح ہے کہ ان کے اندر کبر و نخوت کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ وہ خود کو کمتر و کہتر تصور کرتے ہیں۔ شرف صاحب نے ہی سرسیّد سے ان کی نماز کے متعلق معلومات حاصل کرنی چاہیں تو انھوں نے لکھا کہ:

"بہرحال میری اندرونی تفتیش محض بیجا ہے۔ نہ میں مقدس ہوں، نہ مقدس ہونے کا دعویٰ ہے، نہ کسی کا ہادی بننا چاہتا ہوں۔ ایک گنہگار آدمی کے حالات کی تفتیش کیا؟ البتہ مسلمان کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے، اس میں کوشش کرتا ہوں۔" (ص ۶۰۶)

ان ہی کی کسی بات پر پھر خود کو ناچیز اور ہیچ تصوّر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ نے جو الفاظ اپنی عنایت سے میری نسبت لکھے ہیں، انھوں نے مجھے تکلیف دی۔ برائے خدا مجھ کو امام نہ سمجھیے، بلکہ احدمن الانام کالانعام سمجھیے۔ آپ نے لطیف بات لکھی ہے کہ علماء بتادیں کہ میں مہدی ہوں یا دجّال۔ میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ علماء نے میرے دجّال ہونے پر فتویٰ دیا ہے۔ میں تلاش کروں گا۔ اگر ملا تو اس کی نقل آپ کے پاس بھیج دوں گا۔" (ص ۶۰۸)

نواب محسن الملک جو سرسیّد کے دست راست تھے اور سرسیّد سے گہرے مراسم تھے۔ انھیں سرسیّد کی تفسیری آراء سے سخت اختلاف تھا۔ اپنے ان اعتراضات کو ان لفظوں میں پیش کیا:

"میں آپ کی تفسیر کے بعض مضامین کا مخالف ہوں اور مخالف بھی ایسا کہ اس مخالفت کو نہ آپ کی وہ عظمت و وقعت جو میرے دل میں ہے روک سکی اور نہ وہ محبت و ارادت جو مجھے آپ سے ہے اس کی مانع ہوئی، نہ آپ کی جادو بھری تحریر نے اثر کیا، نہ آپ کی پُرزور تقریر نے۔"

سرسیّد نے اپنی تفسیر کے لکھنے کے بہت سے اصول بتائے اور کہا کہ ان اصولوں کی روشنی میں میری تفسیر کو سمجھنا چاہیے جس پر محسن الملک نے کہا کہ:

"ان اصولوں کے متعلق میں اجمالاً بھی اپنی موافقت یا مخالفت ظاہر نہیں کرسکتا کیوں کہ جو اصول آپ نے بیان فرمائے ہیں اور جس طرح ان کو تحریر کیا ہے، اس کے ہر لفظ میں ہزار معنی پوشیدہ ہیں۔ اگر میں ان اصولوں کی بھول بھلیوں میں پڑ گیا تو نفسِ مطلب رہ جائے گا اور اس بحث کے چھڑ جانے سے تفسیر کے متعلق جو کچھ میں عرض کرنا چاہتا ہوں اس کی نوبت نہ آئے گی۔" (ص ۵۵)

محسن الملک نے جو خطوط سرسیّد کی تفسیر کے متعلق لکھے ہیں۔ ان کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسیّد سے محبت و عقیدت کے باوجود وہ ان کے تفسیری افکار و خیالات سے حد درجہ اختلافات رکھتے تھے، بلکہ اُن آراء کو مکروہ تصوّر کرتے تھے اور بعض مقامات پر حد درجہ کرختگی اور ترشی آگئی ہے جس سے ان کی قلبی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سرسیّد کے ان تفسیری نظریات کو کس قدر ناپسند کرتے تھے (ص ۱۰)[1] لیکن سرسیّد نے ان کی سخت سے سخت باتوں کا جواب نہایت متانت کے ساتھ دیا۔ ان خطوط کو پڑھ جائیے کہیں بھی انھوں نے غیض و غضب کو پاس آنے نہیں دیا ہے بلکہ ان کے انداز سے فروتنی ٹپکتی ہے۔ سرسیّد ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"میں نہایت خوش ہوں کہ آپ نے میری تفسیر کو دیکھنا شروع کیا ہے۔ مجھے نہایت خوشی ہے کہ آپ اس کو مخالفانہ اور غیر معتقدانہ طور پر دیکھیں اور اس کی ایک بات پر بھی یقین نہ کریں، سب کو غلط سمجھیں۔ مگر

---

[1] مکاتبات الخلان۔ مرتبہ محمد عثمان مقبول۔ مطبع احمد، علی گڑھ۔ (بدون تاریخ) ص ۱۰۔

اس کو دیکھیں اور غور سے پڑھیں۔" (ص ۳)

اسی طرح دوسرے خطوط میں بھی سرسید نے اظہار خیال کیا ہے۔ وہ خود کو اہل علم اور مفسرین میں شمار نہیں کرتے بلکہ ہر جگہ طالب علم کی حیثیت سے بات کرتے ہیں۔

معاصر علماء کی وفات پر سرسید نے اپنی دلی کیفیات کو قلم بند کیا۔ ان کی تعزیتی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ علما کی صحبتوں سے انھیں گہرا شغف تھا اور وہ ان کے انتقال پر سخت رنج و غم میں مبتلا ہو جاتے اور ان کی جدائی کو ملت کے غم سے تعبیر کرتے۔ ان کی تعزیتی تحریروں سے یہ بات بھی منظر عام پر آتی ہے کہ علمائے کرام ملتِ اسلامیہ کے مفادات کے لیے مفید تھے۔ ان کی وجہ سے بدعات و خرافات دور ہوتیں اور علم کی شمع فروزاں کرنے میں انھوں نے نمایاں رول ادا کیا اور مدارس اور تحقیقی مراکز کو فروغ دیا۔

مولوی احمد علی کی وفات پر سرسید لکھتے ہیں:

" مولوی محمد قاسم صاحب کے واقعہ کے متصل اس واقعہ کا ہونا اور بھی زیادہ حسرت اور افسوس کا باعث ہے۔ ایک ہی وقت میں دو ایسے بزرگانِ دین کا ایک حصۂ ملک سے اُٹھ جانا درحقیقت نہایت اندوہناک واقعات ہیں۔"

مولوی محمد اکبر صاحب کے انتقال پر لکھتے ہیں:

" مولوی محمد اکبر صاحب مرحوم فی نفسہٖ نہایت بزرگ اور خدا شخص تھے۔ علوم عربیہ میں اس زمانے میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔"

مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کی جدائی پر لکھتے ہیں:

" ہندوستان میں یادگار سلف ایک مولوی عبدالحئی صاحب رہ گئے تھے۔ افسوس زمانے نے ان کو بھی ہم سے لے لیا۔ موجودہ حالات نے یہ امید ہی منقطع کر دی ہے کہ ان کا کوئی جانشین پیدا ہو۔"

شمس العلماء مولوی محمد حسن کے اُٹھ جانے پر یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

" پٹنہ کے لوگ سر پیٹتے ہیں کہ کیسا شخص مر گیا۔ اسکول کے لوگ، اس کے طالب علم چشم نم ہیں کہ ان کے ساتھ اسکول کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ہم بھی علی گڑھ میں بیٹھے ان کو اور ان کے اسکول کو رو رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا بھی یہی حال ہونا ہے۔ مگر آرزو یہ ہے کہ خدا ایسا نہ کرے۔"

" علمائے کرام سے متعلق اس طرح کی سرسید کی اور بھی تعزیتی تحریریں ہیں جن کے ذریعے علمائے کرام سے اس تعلق خاطر اور گہرے لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے، سرسید نے اپنے اسی دلی تعلق کا اظہار اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں اس میں انھوں نے دہلی کے علماء اور بزرگوں کے لیے پورا ایک باب "تذکرہ اہلِ دہلی" کے عنوان سے لکھا ہے اور ان علمائے کرام اور بزرگوں کی صفات اور کمالات کو نہایت عقیدت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان مشائخ اور علمائے تعداد ۔۔ تک جا پہنچی ہے۔

سرسید کے مذکورہ بالا مختلف اقتباسات کی روشنی میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انھوں نے کبھی علما عزت و تکریم میں کوئی کمی نہ آنے دی، انھیں سر آنکھوں پر بٹھانا اور ان کی مجلسوں میں حاضری دینا اپنا فریضہ تصور کیا۔ لیکن خو

(باقی صفحہ ۲

احتشام الحق قاسمی*

سرسید کی اصلاحی مساعی کا نظریاتی جائزہ

انیسویں صدی عیسوی ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے بتدریج زوال کا زمانہ ہے۔ اس زمانے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر مسلمان شعوری اور لاشعوری طور پر ہر قسم کی فکری اور اخلاقی بیماریوں میں مبتلا تھے اور یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ جس قوم میں شعوری بیداری ختم ہو جاتی ہے، ان میں ہر قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور آہستہ آہستہ وہ قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ گویا اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا مسئلہ مسلمانوں کی بقا کا تھا اور یہ اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی کہ اس قوم میں شعوری بیداری پیدا کی جائے اور اس کی اخلاقی وعملی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے مستقل طور پر کوششیں کی جائیں تاکہ وہ اپنے وجود کو باقی رکھنے کے قابل ہو سکے۔ اس ضرورت کو سمجھنے والوں اور اس کے لیے عمل پیرا ہونے والوں میں سرفہرست سرسید کا نام آتا ہے۔

اگر سرسید کا زمانۂ قدیم کے مسلمان مصلحین سے تقابل کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو بالکل نئی اور مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا، جب کہ زمانۂ قدیم کے مصلحین نے جس زمانے میں اصلاح کی تھی اس وقت حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ وہ خود اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے علوم وفنون کے حامل تھے اور دوسری اقوام ان کی تہذیب اور ان کے علوم وفنون سیکھنے پر مجبور تھیں لیکن اب مسلمان حاکم نہیں رہے تھے بلکہ محکوم ہو گئے تھے۔ وہ اپنی زبان کو چھوڑ کر دوسروں کی زبان سیکھنے پر مجبور تھے۔ مہذب اقوام کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کو انہی کے علوم سیکھنے تھے۔ ان کو اب حاکم بن کر نہیں بلکہ ایک اچھی رعایا بن کر زندگی گزارنی تھی۔ چوں کہ اس وقت مسلمان تقریباً ایک صدی سے پستے چلے آرہے تھے اور ان کی ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئی تھیں، اس لیے ان کی نظروں کا ایک تنگ دائرے میں محدود ہو جانا اور ان کے اخلاق وعمل میں انحطاط کا آنا ایک فطری بات تھی۔ ایسے نازک وقت میں سرسید کو ان کی بقا اور پھر سے ارتقاء کے لیے مسلسل جدوجہد کرنی تھی۔

سرسید نے اس زمانے میں مروجہ خاص طور پر ان فکری واخلاقی اور عملی بیماریوں کے خلاف جو مسلمانوں کی ترقی اور ان کے مہذب ومتمدن ہونے میں مانع تھیں دو طرح سے جنگ شروع کی۔ ایک عملی طور سے دوسرے قلمی طور پر۔ عملی جنگ میں سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام آتا ہے اور قلمی جنگ میں وہ مضامین آتے ہیں جو

* ریسرچ اسکالر، ڈپارٹمنٹ آف عربک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

انھوں نے مستقل طور پر اپنی قوم کی اصلاح کے لیے "تہذیب الاخلاق" اور "اخبار سائنٹیفک سوسائٹی میں لکھے۔
سر سید نے قوم میں مروجہ جن بیماریوں کے خاتمے کے لیے کوششیں کیں ان کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے فکری نمبر دو عملی۔ فکری بیماریوں میں بنیادی طور پر تعصب، خود غرضی، غلط مذہبی عقائد، خوش فہمی، فکری کاہلی داخل ہے۔ عملی بیماریوں میں ریا، خوشامد، مخالفت، وحشیانہ نیکی، قدیم رسوم کی اندھا دھند پابندی، بحث ہوتی ہیں۔ اب ہم ان بیماریوں کا الگ الگ تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے سلسلے میں سر سید کے نظریات کا جائزہ

۱۔ **تعصب:** اس کے بارے میں سر سید کا نظریہ یہ تھا کہ یہ ایک ایسی بیماری ہے جو نیک آدمی اور بڑے آدمی کے لیے یکساں طور پر نقصان دہ ہے۔ اس کا اثر اخلاق، علم و ہنر، فضل و دانش، تہذیب و شائستگی غرض ہر چیز پر پڑتا ہے اور یہ بیماری اور بیماریوں کی جڑ ہے۔ دنیا کی بہت سی قوموں نے اپنی بے تعصبی سے دوسری قوموں کی اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ترقی کے اعلیٰ منازل تک پہنچ گئیں اور بہت سی قومیں بے جا تعصب کی وجہ سے دوسروں سے تنفر برتا اور اس طرح سے خود اپنی اچھائیوں کو برباد کر لیا میں خصوصاً مسلمانوں میں یہ بیماری بہت زیادہ عام رہی ہے اور خاص طور پر مذہبی علماء اس بیماری میں ملوث تھے اور اب بھی ہیں جو مسلمان قوم کی تنزلی و پستی کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔

سر سید کے زمانے میں انگریزوں سے تعصب کی وجہ سے مسلمان علوم جدیدہ سیکھنے کے خلاف تھے۔ کیونکہ ہندوستان میں انگریزوں ہی کے ذریعے متعارف ہوئے تھے۔ ان مہذب اقوام کے مقابلے پر آنے کے لیے ان علوم کو سیکھنا از حد ضروری تھا۔ اسی بنا پر سر سید نے اس مذہبی تعصب کو ختم کرنے کے لیے بے حد زور وجہ سے مسلمان علوم جدیدہ اور دنیاوی علوم کو سیکھنے سے دور رہتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

"ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، پس بڑی نادانی ہے جو دنیاوی علوم اور فنون سیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لادیں۔"

آگے کہتے ہیں:

"اگر یہ خیال آئے کہ ان علوم کو سیکھنے سے ہمارے مذہبی عقائد مشتبہ ہوتے ہیں تو یہ بے حد افسوس کا مقام ہے کہ ہم اپنے ایسے زبردست، روشن اور مستحکم مذہب کو ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں کہ ان دنیاوی علوم کی ترقی کو اپنے مذہب کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں بلکہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم ترقی پائیں گے اتنی ہمارے مذہب کی سچائی ثابت ہوگی۔" [۱]

۲۔ **خود غرضی:** ان کا نظریہ یہ تھا کہ مسلمان قوم کی پستی میں اور نامہذب ہونے کا سب سے بڑا سبب خود غرضی ہی اور یہ بیماری جس شخص میں ہوگی خود اسی کو ہلاکت میں ڈالے گی۔ اس سلسلے میں کہتے ہیں:

"سب سے بڑا عیب ہم میں خود غرضی کا ہے اور یہی مقدم سبب قومی ذلت اور نامہذب ہونے کا ہے، ہم میں سے ہر ایک کو ضرور ہے کہ رفاہ عام کا جوش دل میں پیدا کریں اور یقین جانیں کہ خود غرضی سے تمام قوم کی اور اس کے ساتھ اپنی بھی بربادی ہوگی۔" [۲]

۳۔ **خوش فہمی:** مسلمانوں کی عظمت کے ختم ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انھوں نے جو کچھ اپنی محنت

کیا تھا اسی کو مکمل سمجھا اور اس کے بعد اور جودت طبع سے محنت کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ چنانچہ زمانہ گزرنے سے وہ مکمل چیزیں زوال پذیر ہوئیں اور ان کی جگہ دوسری چیزوں نے لے لی اور ان دوسری چیزوں کے موجد ارفع و اعلیٰ ہو گئے" اور اس کے بعد بھی مسلمان قوم اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ ہم ہی مکمل اور ارفع و اعلیٰ ہیں۔ اس سلسلے میں سرسیّد کا کہنا ہے:

"جب کوئی شخص یا قوم کسی بات میں اپنے تئیں کامل سمجھ لیتی ہے تو اس میں سعی اور کوشش اور زیادہ تحقیقات اور نئی نئی باتوں کے ایجاد سے باز رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اُس چیز کو جس کو کامل سمجھا تھا زوال آجاتا ہے"۔ اور اس طرح وہ قوم بھی زوال پذیر ہو جاتی ہے۔

۴۔ **فکری کاہلی:**۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ ہاتھ پاؤں کی محنت چھوڑ دینے کا مطلب کاہلی نہیں ہے، کیوں کہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت پیٹ بھرنا ہے اور اس کے لیے مجبوراً ہاتھ پاؤں کی محنت کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ اصل کاہلی دلی قویٰ اور قوت عقلی کو بیکار چھوڑ دینا ہے اور ذہنی و جسمانی کاہلی افلاس کا سب سے بڑا سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر مسلمان مفلس ہیں۔ ؎۵

۵ **غلط مذہبی عقائد:** اس سلسلے میں ان کا نظریہ تھا کہ مسلمان اپنے اندر سے بدعتی خیالات اور وہ غلط باتیں جن کو وہ اپنے مذہب کا ایک حصّہ تصور کرتے ہیں دور کریں۔ ان بدعات میں سے بعض تو ایسی ہوتی ہیں جو کفر و شرک تک پہنچا دیتی ہیں اور ایسا شخص جو اُن میں مبتلا ہو اس کو مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ ان عقائد سے اسلام کی غلط تصویر غیر قوموں کی سامنے آتی ہے اور وہ اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۶۔ **اوہام پرستی:** ہندوستان میں چوں کہ مسلمان ایک عرصۂ دراز سے ہندو قوم کے ساتھ رہتے آرہے تھے اس لیے ان میں بھی اوہام پرستی حد درجہ داخل ہو چکی تھی۔ خصوصاً مسلمان عورتیں اس معاملے میں بہت آگے تھیں اور طرح طرح کے اوہام اور عقائد میں مبتلا تھیں اور مختلف بدشگونیوں کا تدارک تعویذ، گنڈے اور فلیتے سے کرتی تھیں۔ سرسیّد کا نظریہ یہ تھا کہ اوہام پرستی ایک تو خود ایمان کی بقا، کے لیے خطرناک ہے اور دوسری طرف اُس کی وجہ سے مہذب اقوام اسلام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اس لیے اس کو فوراً ترک کر دینا چاہیے۔

عملی برائیوں میں:-

۱۔ **ریا:**۔ سرسید کا نظریہ ہے کہ ریا ہمارے سماج کی ایک زبردست برائی ہے۔ ریا ایک ایسی بناوٹ کا نام ہے جس سے دوسروں کو فریب دیا جاتا ہے مگر اکثر ریاکار خود دھوکے میں پڑ جاتا ہے۔ وہ بناوٹ خود اپنے دل کے حال کو اس سے چھپاتی ہے۔ جس قدر وہ نیک ہے اس سے زیادہ اس کو باور کراتی ہے۔ پھر وہ آدمی یا اپنی برائیوں کو خیال نہیں کرتا یا ان کو نیکی سمجھنے لگتا ہے اور یہ ایک ایسی بیماری ہے جو مختلف اسباب سے لاشعوری طور پر انسان میں پیدا ہو جاتی ہے اور اس قسم کی بیماریوں سے بچنے اور ان کو پہچاننے کے لیے انھوں نے مختلف طریقے بتائے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے سلسلے میں ہمیشہ دوستوں کی رائے پر نہ جائے بلکہ دشمن کی رائے کو اہمیت دے۔ ؎۶

۲۔ **خوشامد:**۔ انھوں نے تمام بیماریوں میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کو قرار دیا اور یہ بیماری بہت ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ جس شخص کو خوشامد اچھی لگنے لگتی ہے اس کی آنکھوں پر ایک طرح کا پردہ پڑ جاتا ہے اور اس سے لوگ جو چاہتے

ہی کروا لیتے ہیں اور وہ دوسروں کے ہاتھوں کھلونا بن جاتا ہے اور جس شخص کو خوشامد کرنے کی عادت
مستقل طور پر جھوٹ کا عادی ہو جاتا ہے اور صرف باتوں سے کام نکالنے میں اپنی ساری صلاحیتوں کو صرف
بھی برباد ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی برباد کرتا ہے۔

۳۔ مخالفت: ان کا نظریہ تھا کہ مخالفت بذاتِ خود نقصان دہ نہیں ہے، کیوں کہ اگر وہ مہذب قوم میں ہو تو اس سے ا
طرح کے فائدے حاصل ہوتے ہیں اور اگر غیر مہذب قوم میں ہو تو مخالفت کرنے والا دوسروں کو بھی نقصان پہن
خود بھی نقصان میں رہتا ہے۔ تہذیب یافتہ قوموں میں اگر اختلاف ہو تو مہذب آدمی اپنے مخالف کی رائے
دل سے غور کرتا ہے اور اگر ایسی بات نہ ہو تو اپنے مخالف کی غلطیوں میں بہتر اور پُر حکمت طریقے سے ا
کوشش کرتا ہے۔ اس کے برخلاف نامہذب اور ناشائستہ آدمی مخالف کی رائے کی اچھائی اور برائی پر غور نہ
بلکہ براہ راست اس کی ذاتی خامیوں سے بحث کرنے لگتا ہے اور اس بحث میں اس پر ہر طرح کے الزام لگاتا
بدکلامی و درشت گوئی سے پیش آتا ہے جس سے لوگوں میں خود اس کی بے عزتی ہوتی ہے اور مخالف کو بھی نقص
اس بنا پر سماج اور ملک کا ماحول خراب ہوتا ہے اور بالآخر وہ قومیں جن میں اس قسم کی بیماری عام ہوتی ہے؛
کہلاتی ہیں اور اپنے مقصد کے لیے خود بدنامی کا سبب بنتی ہیں۔

۴۔ بحث و تکرار: چوں کہ ہندوستانی علماء میں مناظرے و مجادلے کا کچھ زیادہ ہی رواج رہا ہے اس لیے عام
مزاج میں بھی یہ عنصر داخل ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان کی محفلوں اور مجالس میں اکثر بحث و تکرار ہوتی اور یہ بحثیں
لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد کا سبب بنتیں۔ اس لیے سرسیّد نے اس امر کی طرف بھی توجہ کی اور نام
کی بحث و تکرار کو کتوں کی لڑائی سے تشبیہ دی اور اس سلسلے میں احتیاط برتنے پر زور دیا۔ چنانچہ کہتے
"جب کہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور
تکرار اور مباحثے کو آنے مت دو کیوں کہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب
دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اس کو ختم کر دو اور
آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔" [۱]

اگر ایسا نہ کریں اور لڑائی جھگڑے کرتے رہیں تو اس سے غیر قوموں پر مسلمانوں کا برا اثر پڑے گا
قوم ہے۔

۵۔ وحشیانہ نیکی: سرسید کا نظریہ تھا کہ جاہل قوم اگر کوئی نیک کام بھی کرتی ہے تو غلط انداز میں کرتی ہے اور
وحشیانہ انداز میں ہوتا ہے۔ اس میں نیکی تو الگ ہو جاتی ہے صرف برائی ہی رہ جاتی ہے مگر صحیح تعلیم کا ا
کہ وہ وحشی پن کو دور کر کے صرف نیکی کو باقی رکھتی ہے۔

۶۔ بے جا رسوم و رواج کی پابندی: اس سلسلے میں ان کا نظریہ تھا کہ اس طرح قوم اگر تقلیدی طور
کرے گی تو اس کی ان صفات میں ترقی نہ ہو گی جو اللہ نے مختلف اشخاص میں الگ الگ پیدا کی ہیں یعنی عقل
کرنا، قوت تحقیق، قوت تجویز، قوت استقراء، قوت استقلال، جودت طبع یہ سب مردہ ہو جائیں گی اور
ہی جز کا زندہ رہنا کسی بھی قوم کی ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"رسومات جو مقرر ہوئی ہیں غالباً اس زمانے میں جب کہ وہ مقرر ہوئیں مفید تصور کی گئی ہوں، مگر اس بات پر بھروسا کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں محض غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے ان کو مقرر کیا ہو ان کی رائے میں غلطی ہو اور ان کا تجربہ صحیح نہ ہو۔" ؎

اس لیے غور وفکر کرنا چاہیے اور جو مفید رسوم ہیں ان کو چھوڑ کر باقی تمام رسوم کو چھوڑ دینا چاہیے۔

مذہبی و دنیاوی امور کا خلط ملط:۔ اس معاملہ میں ان کا کہنا یہ تھا کہ مذہبی امور اور دنیاوی تمدنی امور الگ الگ ہیں اور ان دونوں کو ایک دوسرے میں نہیں ملانا چاہیے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

"دینی احکام کا نیچر دنیاوی احکام معاشرت کے نیچر سے بالکل مختلف ہے۔ دینی احکام جو روحانی اخلاق اور روحانی تہذیب سے علاقہ رکھتے ہیں دوامی و ناقابل تبدیل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ خدا نے انسان کی روح کو جس نیچر پر پیدا کیا ہے۔ جب تک انسان دنیا میں ہے اس کو تغیر و تبدل نہیں برخلاف امور معاشرت و تمدن کے جو روز بروز تبدیل ہو جاتے ہیں پس وہ داخل احکام مذہبی جو ناقابل تبدیل ہونے ہیں نہیں ہو سکتے ہیں۔ ان کو مذہبی احکام میں داخل کرنا ہی بربادی کا باعث ہے۔ دنیا آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور ہم اسی پرانی لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں اور ذلت و ادبار کو پہنچتے ہیں۔" ؎

اس معاملے میں سرسید کی دلیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول " وانتم اعلم بامور دینا کم" ہے۔ یعنی تم اپنے دنیاوی معاملات کو زیادہ سمجھتے ہو اور اس سلسلے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہو۔

اس کے علاوہ سرسیدؒ نے آزادی رائے اختیار کرنے، غیرمذہب پیشواوں کا ادب کرنے، کافروں سے حسن سلوک کرنے، صحیح عزت و غیرت پیدا کرنے، اوقات کا صحیح استعمال کرنے، صحیح کام کرنے کے لیے عزم جزم پیدا کرنے، اپنی مدد آپ کرنے، جھوٹ سے پرہیز کرنے، دوستوں سے صحیح راہ و رسم اختیار کرنے، صفائی اور صحیح طرز لباس اختیار کرنے، کھانے پینے کے معاملے میں صفائی برتنے، عورتوں سے صحیح سلوک اور ان کے حقوق ادا کرنے، صنعت و حرفت کو رواج دینے، زراعت کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ تعلیم اطفال، تعلیم نسواں، دوسروں کی خیرخواہی اور امور خانہ داری میں اصلاح کی مسلسل ترغیب دی۔ اس سلسلے میں ان کا نظریہ تھا کہ یہ ایسی صفات ہیں جو کسی بھی قوم میں پیدا ہو جائیں تو اس کے مہذب ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

حتیٰ کہ انھوں نے ان تمام گوشوں پر غور کیا جن سے کسی بھی قوم کی تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ خط و کتابت میں بے جا پابندیوں کا لحاظ، مذہبی متبرک الفاظ اور ان کے غلط استعمال، مذہبی معاملات میں غلط کام کرکے الفاظ کے الٹ پھیر سے اپنے آپ کو مطمئن کر لینے وغیرہ پر سخت ناقدانہ تبصرے کیے اور صحیح راستہ اپنانے پر زور دیا تاکہ مسلمانوں کے اندر صحیح تہذیب پیدا ہو۔

سرسید نے تہذیب و تمدن کے معاملہ میں صرف مسلمانوں کی اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہندوؤں کو سدھارنے کے لیے بھی مختلف ذرائع اختیار کیے۔ چنانچہ بیوہ عورتوں کے دوبارہ نکاح، ستی وغیرہ پر انھوں نے مستقل مضامین لکھے اور ان کے نقصانات کو گنا کر ان بیہودہ رسموں کو چھوڑ دینے کی ترغیب دی۔ اسی طرح انھوں نے جہاں مسلمان یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے لائحہ عمل پیش کیا وہیں ہندو یتیم اور لاوارث بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کے لیے مستقل منصوبہ پیش کیا۔

انگریز قوم کی تقلید کی ترغیب :-

سرسید انگریزوں کے تہذیب و تمدن اور ان کے علوم و فنون سے بے حد متاثر تھے۔ چنانچہ ان چیزوں
مسلسل ترغیب دیتے رہتے۔ مگر ان کی بھی اندھا دھند تقلید سے منع کرتے رہے۔ چنانچہ اس کے لیے ان کی خوبیو
الگ طور پر قوم کے سامنے رکھا اور خوبیوں کو اپنانے کی ترغیب دی۔ تاکہ مسلمان بھی مہذب ہو جائیں۔ اور ان کا نظ
قوم میں جو برائیاں ہوتی ہیں وہ بھی باعث تقلید نہیں ہوتی ہیں بلکہ ان کی برائیوں سے دور رہ کر اور ان کی خوبیو
سے زیادہ مہذب و متمدن بن سکتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اس وقت ایسی پریشانی کے عالم میں ہیں جس سے
قوموں کا سہارا لینا ضروری ہے پھر جب ہم کچھ قابل ہو جائیں گے تو خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں گے۔

تقلید میں مذہب کا لحاظ :

تقلید کے معاملے میں ان کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ اگر وہ مباحات شرعیہ میں ہو تو رسوم و رواج کی پ
لوگ برا کہیں ان کی تقلید کرنی چاہیئے اور اگر محرمات شرعیہ ہو تو اس سے سختی سے احتراز کرنا ضروری ہے۔ چنا
ان کو اندازہ ہوا کہ مسلمان متمدن بننے کے لیے اپنے مذہبی احکام کو نظر انداز کر رہے ہیں تو وہاں انھوں نے فوراً اس
اور مذہب پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی۔ جیسے عورتوں کے پردے کے معاملے میں سرسید ہی کے کچھ رفقا
کر رہے تھے کہ وہ عورتوں کی ترقی کی راہ میں حارج ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں یہ بحث ہونے لگی تھی کہ ہر و
سے ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔ سرسید نے فوراً اس بحث کی مخالفت کی اور پردے کی عظمت بیان کرتے ہوئے

"بعض ہمارے مخدوم جن کو ہم فخر قوم کہہ سکتے ہیں پردے کے مخالف ہیں مگر ہم کو لوگ نئے فیشن
سمجھیں مگر ہم تو اگرا س پرانے فیشن کے نہیں ہیں تو دقیانوسی مزاج کے تو ضرور ہیں اور اس لیے ب
اپنے مخدوموں کی رائے کے مخالف ہیں اور عورتوں کا پردہ جو مسلمانوں میں رائج ہے اس کو نہایہ
عمدہ سمجھتے ہیں۔" [۹]

اپنے مقصد کے سوا ہر قسم کی باتوں سے اجتناب :

جن بنیادی چیزوں کو سرسید نے اپنی قوم کی اصلاح اور ان کی ترقی کے لیے ضروری سمجھا اپنی محنتیں
کی تکمیل صرف کرتے تھے اور اپنی تمام توجہ انہی پر مرکوز رکھتے۔ چاہے دنیا میں کچھ بھی ہو ان مقاصد کے سوا کسی طر
بھی نہ دیکھتے۔ اس سلسلے میں "حیات جاوید" کے مصنف مولانا حالی کا کہنا ہے:

"سرسید مذہبی مسائل میں اس میدان سے جس کو انھوں نے اسلام کی حمایت کے لیے لازم پکڑ لیا
تھا، سرمو تجاوز کرنا نہیں چاہتے تھے، اگر کوئی نبوت بلکہ خدائی کا بھی دعویٰ کرتا تو اس کا رد لکھنے
سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ اکثر معترضین کے حملوں یا اعتراضوں کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے اور اپنے
دوستوں کو فضول بحثوں سے جن سے مسلمانوں میں تفرقہ پڑنے کے سوا کوئی نتیجہ نہ پیدا ہو ہمیشہ روکتے
رہتے تھے اور کبھی کسی ایسے مسئلے سے تعرض نہ کرتے تھے جو ان کے دائرۂ حدود سے باہر ہو۔" [۱۰]

سرسید کے مضامین کے مراجع :

سرسید بنیادی طور پر قرآن اور حدیث سے متاثر تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے اکثر مضامین میں

حادیث نبوی سے استشہاد کیا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں زیادہ تر بخاری شریف اور مشکوٰۃ شریف کا حوالہ دیتے ہیں، اس اوہ اسلامی مفکرین میں شروع شروع میں وہ امام غزالی ؒ سے متاثر تھے۔ ان کی کتاب "کیمیائے سعادت" کا ترجمہ بھی جو مکمل نہ ہو سکا) بعد میں متکلمین کی طرف مائل ہوئے اور پھر مغرب کے جدید افکار و خیالات کا بہت گہرا اثر قبول کیا۔ مثا عقل و نیچر یعنی فطرت کے نظریے سے وہ بہت متاثر تھے۔ اسی لیے اپنے مضامین میں مغرب کے مفکرین اور ادبا ء کے وخیالات بھی بیان کرتے ہیں۔ جن کے افکار بیان کیے وہ ایڈیسن[۱۰]، اسٹیل[۱۱]، مسٹر فاسٹر، پلوٹارک[۱۲]، پسٹلی، لارڈ ، ولیم ڈراگن، جان اسٹیورٹ مل، گبن وغیرہ ہیں، لیکن سر سیّد کی اصل فکر اسلامی سرچشموں سے سیراب ہوئی تھی۔

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ جدید عہد میں سر سیّد ہی پہلے مصنف ہیں جنھوں نے فکری اصلاح کا بیڑا اُٹھایا طریاتی طور سے مسلم قوم کو خاص کر برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو قومی بیداری سے ہم کنار کرنا چاہا۔ اس مقصد عظیم کی انھوں نے اصلاح و فلاح کی ہر ممکن سبیل اور ہر امکانی راستے کو اپنایا خاص کر قلمی جہاد کیا اور مسلم معاشرے کو اس کی فکری ملی برائیوں سے پاک کر کے ایک عملی حرکی اور صالح معاشرہ بنانا چاہا کہ اس کے بغیر کوئی قوم یا جماعت ترقی نہیں کر سکتی بلکہ نہیں رہ سکتی اور آج جو مسلم قوم میں بیداری، شعور، اصلاح کی فکر اور ترقی نظر آتی ہے اس میں سر سیّد کا حصّہ سب را ہے۔ یہی نہیں بلکہ موجودہ مسلم سماج کی خرابیوں کو دور کرنے کا ایک نسخۂ کیمیا یہی سر سیّدی نسخہ ہے۔

حواشی

مقالات سر سید۔ سر سیّد : مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔ (تعصب) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۰ء ج ۵، ص ۳۴۵

ایضاً (کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے) ص ۳۰۹

ایضاً (تکمیل) ص ۴۰

ایضاً (کاہلی) ص ۳۲۸

ایضاً (ریا) ص ۳۲۹

ایضاً (بحث و تکرار) ص ۱۵۹

ایضاً (رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات) ص ۲۰

ایضاً (مذہب و معاشرت) ص ۱

ایضاً (پردہ) ص ۱۸۶

حیات جاوید۔ الطاف حسین حالی : ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۹۰ء ص ۴۷۷

ایڈیسن جوزف (Addison Joseph): پیدائش ۱۶۷۲ء، بمقام انگلینڈ ۔ وفات ۱۷۱۹ء لندن، انگریزی مضمون نگار، شاعر اور ڈرامہ نگار تھے۔ انھوں نے اور ان کے ساتھی اسٹیل نے مل کر دو پرچے اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر نکالے تھے اور اس میں انگریز قوم کے سدھار کے لیے مضمون لکھتے تھے انھوں نے بالکل ویسی ہی صورت حال کا سامنا کیا جیسے سر سید نے کیا فرق صرف اتنا ہے کہ سر سیّد کو مذہبی علماء سے بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ دی

نیو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۱، ص ۹۳-۹۲

۱۲ رچرڈ اسٹیل؛ پیدائش ۱۶۷۲ء، وفات ۱۷۱۹ء۔ انگریزی مضمون نگار، ڈرامہ نگار اور جرنلسٹ دو داں تھے۔ ذی نیو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ج ۱۱، ص ۲۳۲ - ۲۳۱

۱۳ فاسٹر نام کے دو اشخاص ملتے ہیں:

۱۔ فارسٹر جارج Foster George (۱۷۵۴ء - ۱۷۹۴ء) وفات مقام پیرس۔ سراغ رساں سائنٹسٹ تھے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جرمن ادب میں سفرناموں کی ادبی حیثیت کو منوایا۔

۲۔ فاسٹر جان (Foster John) پیدائش ۱۸۱۲ء وفات ۱۸۷۶ء بمقام لندن۔ مضمون او جرنلسٹ تھے۔

(برٹانیکا - ج ۴۔ ص ۸۸۷ - ۸۸۸)

۱۴۔ پلوٹارک (Plutarch) ان کی تمام کاوشوں نے سولہویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی تک مغربی مضمون نگاری اور تاریخ نگاری میں انقلاب لانے میں اہم رول ادا کیا۔ یہ مضمون و سوانح نگار تھے ولادت تقریباً ۴۶ء اور وفات ۱۱۱ء کے بعد ہوئی۔ (برٹانیکا)

(باقی صفحہ ۵۴ کا)

تادم زیست علمائے کرام کی جانب سے (ما سوا معدودے علمائے کرام) ہمیشہ کافر مرتد کے الفاظ سننے پڑے کے خلاف اکسایا گیا لیکن سر سید نے ان کے لیے اپنی آغوش کو ہمیشہ وا رکھا یعنی ؎

گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

شفاق احمد عارفی *

سرسید کے معاشی اور اقتصادی نظریات

سرسید کی اصلاحی تحریک وقت کی اہم پکار تھی۔ معاصر تاریخ کی روشنی میں اب یہ سچائی چنداں تحقیق کی محتاج نہیں کہ ۱۸۵۷ء تک عام مسلمانوں کی حالت دوسرے ہم وطنوں کے مقابلے میں سیاسی، سماجی، تعلیمی، معاشی و اقتصادی سطح پر بھی بہت زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ غدر کے بعد مسلمانوں سے انگریز حکمرانوں کی غلط فہمی اور غیظ و غضب نے پستی و بدحالی اور ذلت و نکبت کو اور بھی پروان چڑھایا۔ عام مسلمانوں کی حالت تو ابتر تھی ہی بڑے بڑے رئیس اور عزت دار خاندان بھی بے گھر ہو گئے تھے۔ خود سرسید کی والدہ کو دہلی میں گھر بار لٹنے کے بعد ایک بڑھیا کی کٹیا میں رہنا پڑا تھا۔ سرسید نے تمام حالات کا خود مشاہدہ کیا تھا۔ دہلی اور اس کے قرب و جوار میں امیروں، رئیسوں اور بادشاہوں کی اولادوں کو قلی مزدوری کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان میں محمد بن تغلق کی اولاد اور خلیل اللہ شاہجہانی کے پوتے بھی شامل تھے۔

بدلے ہوئے حالات کے نتیجے میں سرسید نے ہندوستانیوں کے لیے عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے خصوصاً، زندگی کے جن شعبوں میں اصلاح کی کوشش کی ان میں عام طور پر سیاسی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی پہلو پر توجہ دی جاتی رہی۔ سرسید کی سماجی و تعلیمی اصلاح، تاریخی نظریہ اور مذہبی و سیاسی شعور پر تو بہت کچھ لکھا گیا لیکن ان کے اقتصادی و معاشی خیالات پر اب تک توجہ نہیں دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید تحریک کے اہم اور بنیادی مقاصد میں مسلمانوں کی معاشی صورت حال کی بہتری اور خوشحالی کو دوسرے اصلاحی کارناموں کے لیے بنیاد اور محرک کی حیثیت حاصل ہے۔ سرسید کی تقاریر، انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے صفحات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو سرسید کے اصلاحی مشن میں دوسرے خیالات اور کارناموں کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں کی معاشی اصلاح اور استحکام کی کوششیں پوشیدہ اور نمایاں طور پر ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ بلکہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کے دل میں قوم کی اصلاح کا خیال پہلے مرحلے میں مسلمانوں کی سماجی و معاشی ابتری کا نتیجہ تھا۔ خود سرسید کے اقوال و خیالات میں اس حقیقت کی طرف جگہ بہ جگہ اشارہ ملتا ہے:

> غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا ...... میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی

---

* ریسرچ اسکالر ڈپارٹمنٹ آف اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اور کچھ عزت پائے گی۔ اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔"

"جس حساب سے یہ تنزل شروع ہوا ہے اگر اسی اوسط سے اس کا اندازہ کیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی برس اس بات کو باقی ہیں کہ مسلمان سائیسی، خانسامی، خدمتگاری، گھسکھودے ہونے کے سوا اور کسی درجے میں نہ رہیں گے اور کوئی ایسا گروہ جس کو دنیا میں کچھ بھی عزت حاصل ہو مسلمان کے نام سے پکارا نہ جائے گا۔" ؎

گویا معاشی ابتری اور بدحالی اصل بیماری تھی جس کی حقیقی وجہ سرسید نے تعلیمی پسماندگی اور اپنی ساری توجہ، اصلاحی قوت و کوشش مسلمانوں کو جدید علوم و فنون اور اعلیٰ تعلیم سے آراستہ مرکوز کر دی:

سرسید نے اس خیال کا اظہار بار بار کیا کہ جہالت مفلسی کا سبب ہے اور اعلیٰ تعلیم، علم کامل دسترس مسلمانوں کو ان کے سارے حقوق و مراعات دلا دیں گے۔ مگر ساتھ ہی اعلیٰ تعلیم ا فنون حاصل کرنے کے لیے مالی وسائل کی ضرورت اور اہمیت سے انہوں نے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ بہتر معاشی حالات کو لازم و ملزوم قرار دیا:

"بے علمی مفلسی کی ماں ہے۔ جس قوم میں علم و ہنر نہیں رہتا وہاں مفلسی آتی ہے اور جب مفلسی آتی ہے تو ہزاروں جرموں کے سرزد ہونے کا باعث ہوتی ہے .... تمام قوموں نے اور بڑے بڑے دانشمندوں نے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ قومی ترقی قومی تعلیم پر منحصر ہے پس اگر ہم اپنی قوم کی بھلائی چاہتے ہیں تو قومی تعلیم اور قوم کو علم و ہنر سکھانے پر کوشش کریں۔" ؎

حالات کے تقاضوں اور معاشرے کی صورتِ حال کے پیشِ نظر ضروری تھا کہ ہر قسم کے اصلاح مذہب اور مذہبی احکام کی روشنی میں پیش کیے جائیں۔ اس لیے سرسید نے اپنے معاشی و اقتصادی تصو مذہبی منطقیت کے ساتھ پیش کیے۔ انہوں نے نہ تو دین اور دنیا کے باہمی رشتے سے انکار کیا اور نہ مذہب معاش و معاشرت سے علیحدہ کر کے دیکھا۔ سرسید دنیاوی اور معاشی امور سے متعلق خیالات کو مذہبی ا استدلال کے ساتھ پیش کرتے رہے۔ سرسید کا خیال تھا کہ:

"دین دنیا کا عجیب رشتہ ہے۔ دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی، مگر دنیا چھوڑنے سے دین جاتا رہتا ہے۔" ؎

مفلسی کے نتیجے میں جھوٹ، چوری، دغا، فریب، اور قتل و غارت گری جیسے مذہبی منکرات او جرائم کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی موجودگی میں افراد کی کردار سازی، انفرادی و سماجی ا بہتر خوشحال اور پرسکون ملک و معاشرہ کے قیام کا تصور بھی مشکل ہے۔ اس کے لیے افراد اور سماج کا خود کفالت اور فارغ البالی سے آشنا ہونا ضروری ہے۔

سرسید نے اپنی تحریر و تقریر میں مختلف جرائم کے معاشی اسباب و عوامل اور اس کی اصلاح پر ا

دلائی ہے۔ انھوں نے اپنی معرکۃ الآرا اور جرأت مندانہ تصنیف ''اسباب بغاوت ہند'' میں انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی بغاوت ۱۸۵۷ کے اسباب میں معاشی اسباب کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔ سرسید کو فرد اور معاشرے پر معاشی حالات کے دباؤ اور اثرات کا صحیح علم تھا اور وہ فرد، معاشرہ اور حکومت کے درمیان معاشی رشتے کے عملی اور نظریاتی تعلق سے پوری طرح واقف تھے۔ ''اسباب بغاوت ہند'' میں ضبط آراضی لاخراج نیلامی زمینداری، سختی بندوبست، تعلق داریوں کا شکست ہونا، سول ناواقفیت گورنمنٹ مال رعایا سے'' مفلسی ہندوستان علی الخصوص مسلمانوں کی نوکریاں بہت قلیل تھیں، خیراتی پنشن اور انعام بند ہونے سے ہندوستان کا زیادہ محتاج ہونا، کمپنی نوٹ سے ملک کی بیزاری اور صرف مفلسی کی وجہ سے رعایا کا تبدّل عملداری چاہنا جیسے عنوانات کے تحت بغاوت کی جن وجوہات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے سرسید کی معاشی بصیرت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مذہبی معاملات سے متعلق ہر وہ غلط فہمی لوگوں کے دل میں پیوست ہو چکی تھی اور جس کا براہِ راست منفی و مضر اثر افراد کی قوت عمل اور معاشی حالت پر پڑتا تھا'' سرسید نے ان تصورات سے ازالے کی بھی کوشش کی۔ انھیں تصوارت میں تقدیر اور قسمت کو ذمہ دار ٹھہرا کر زندگی کے حقائق سے فرار اور چشم پوشی کا رویہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے اندر زیادہ عام رہا ہے اور مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنی معاشی بدحالی اور فلاکت کو خدا کی مرضی اور قسمت کا لکھا سمجھ کر خوشی کے ساتھ قبول کرتی رہی ہے۔ سرسید نے اس عام تصور کی شدت کے ساتھ مخالفت کی اور قدر و عمل کی بحث میں تقدیر کے من جانب اللہ ہونے کا اقرار کرتے ہوئے جہد و عمل کی اہمیت کو نمایاں کیا اور کئی مقام پر قرآن کی آیتوں کے حوالے سے قوم کو محنت و عمل کے ذریعہ معاشی اور اقتصادی حالت درست کرنے کی ترغیب دلاتے رہے۔ تقدیر کے جبر سے پیدا بے عملی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرسید نے اپنے ایک مضمون ''مسلمانوں کا افلاس'' مطبوعہ اخبار انڈین پبلک اوپینین لاہور میں مسلمانوں کی معاشی و اقتصادی حالت کے متعلق دی گئی خبر کا ایک اقتباس نہایت دردمندی کے ساتھ نقل کیا ہے:

> ''مسلمانوں کا مذہب صرف لڑائی اور لوٹ مار کے مناسب ہے۔ تقدیر پر اندھا دھندی سے اعتبار و تکیہ کرنا جیسا کہ یہ مذہب سکھاتا ہے اور اس کے معتقدوں کو خوش خوش ایسے موقع کی طرف لے جاتا ہے جس میں یقینی بربادی کا سامان ہوتا ہے اور کوئی مذہب نہیں سکھاتا۔ مگر وہی خیال کہ تقدیر کبھی نہیں ٹلتی، تمام جرأت اور ہمت کو کھو دیتا ہے اور ترقی و بہبود کو پژمردہ کر دیتا ہے'' [۵]

اسی لیے سرسید اپنے اسی مضمون کے شروع میں مسلمانوں کی روزافزوں مفلسی پر افسوس ظاہر کرتے ہیں اور انہیں جائز وسیلوں سے دنیا کمانے اور نیک کام کے لیے مال و اسباب صرف کرنے کو خدا کی مرضی اور شریعت کا حکم قرار دیتے ہیں:

> ''ہم تمام مسلمانوں کی دین و دنیا کی بھلائی چاہتے ہیں۔ یہ خواہش کرتے ہیں کہ

احکام شریعت حقہ کے بجالاویں۔ ممنوعات ومکروہات سے بچیں مباح کے مزے اڑائیں، نیک طریقے اور اچھے پیشے اور مباح وسیلوں سے دنیا کمائیں اور پھر جس طرح خدا کی مرضی ہے نیک کاموں میں اس کو صرف کریں کہ یہی مرضی خدا کی اور یہی حکم شریعت مصطفی کا ہے۔

مگر نہایت افسوس ہے کہ مسلمانوں کا حال روز بروز بدتر ہوتا جاتا ہے۔ مفلسی ان کو گھیرتی ہے۔ جرائم میں وہ مبتلا ہوتے ہیں یا جیل خانے ان سے بھرجاتے ہیں۔ ...... ڈگریوں میں وہ پکڑے جاتے ہیں جائدادیں ان کی فروخت ہوتی ہیں"۔ ؎

مسلمانوں کی ابتر معیشت کی اصلاح کے لیے سرسید نے جو کچھ بھی نظریاتی او رعملی تدبیریں ا ان کی بہترین مثال ان کے مضمون "ایک تدبیر مسلمانوں کے خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچانے فراہم ہوتی ہے۔ سرسید نے اس بات کا خوب تجربہ حاصل کیا تھا کہ مسلمان صاحب مال کی جائداد اک انتقال کے بعد وراثت کی تقسیم کے نتیجے میں فروخت ہوجاتی ہے۔ صاحب جائداد لوگوں کی اولاد پر اپنے مورث سے حاصل ہونے والی وراثت کی امید میں کسی لیاقت اور قابلیت سے محروم رہ جا باپ کے انتقال کے بعد اولادوں کی جائداد اور آمدنی تو کم ہو جاتی ہے مگر اخراجات پورے رہتے ہو خاندانی عزت برقرار رکھنے کے لیے قرض پر قرض لیتے ہیں۔ اور جائداد فروخت کر بیٹھتے ہیں۔ ا حال کو دور کرنے کے لیے سرسید نے پوری حجت اور دلیل کے ساتھ شیعہ اور سنی دونوں فرقوں اعتبار سے ہر شخص کے لیے اپنی جائداد کو اپنے لیے اور اپنے اولاد کے لیے وقف کرنے کا اختیار ثابت کیا اور "قانون جائداد وقف خاندانی اہل اسلام" کے نام سے ایک مفصل ایکٹ کا مسود عوام کی رائے جاننے کے لیے تہذیب الاخلاق میں شائع کردیا۔ مضمون کے آخر میں اس قانون کا بتاتے ہوئے سرسید نے جن الفاظ کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی معاشی دوربینی اور قومی ہمدردی لگایا جاسکتا ہے:

"سب سے بڑا فائدہ اس قانون سے یہ ہوگا کہ مسلمان خاندانوں کی ریاستیں جو روز بروز برباد ہوتی جاتی ہیں وہ بربادی سے بچیں گی اور ہمیشہ کو قائم رہیں گی .... اس قانون سے اگر جاری ہو تو سب خرابیاں رفع ہوجاویں گی"۔ ؎

معاشی اور اقتصادی اصلاح کے لیے سرسید تعلیم کے بعد تجارت کی اہمیت اور افادیت پر مبذول کراتے رہے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کم سے کم گریجویٹ تک علم حاصل کرنے کے بعد تجارت اختیار کرنے کی رغبت دلاتے رہے تجارت سے مسلمانوں کی بے توجہی، غفلت اور کمتر کارکردگ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"تجارت جو بڑا وسیلہ دولت وسیاحت کا ہے، ہماری قوم میں بالکل نہیں ہے۔ کل ہندوستان کے مسلمان تجارت پیشوں کی اگر تعداد بمشکل حاصل بھی کی جاوے تو وہ

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۰ء

ایسی قلیل و ذلیل ہو گی جس کو بیان کرتے بھی شرم آوے گی۔"[۸]
یہ تو ظاہر ہے کہ سرسید نے حصول تعلیم کو امور معاش و معاد سے الگ کر کے کبھی نہیں دیکھا اور علم کے معاشی پہلو سے کبھی بے توجہی نہیں برتی۔ سرسید کا عہد ہندوستان کا وہ زمانہ تھا جب آج کی طرح اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم کے شعبوں کی نہ تو کثرت تھی اور نہ ہی ہندوستانیوں خاص طور سے مسلمانوں میں ان علوم و فنون کی طرف شوق اور دلچسپی کا رواج تھا۔ نیز تعلیم یافتہ نوجوانوں کے روزگار کا مسئلہ حکومت کے لیے اس وقت بھی لاینحل تھا۔ اس لیے تعلیم حاصل کرنے کے بعد محض نوکریوں کی امید میں صلاحیتوں کو ضائع کرنا سرسید پسند نہیں کرتے تھے۔ اس خیال سے اپنے مضمون "گریجویٹ اور تجارت"، میں بی۔ اے تک تعلیم حاصل کر لینے کے بعد وہ نوجوانوں کو تجارت پیشہ اختیار کرنے پر زور دیتے ہیں:

> اول تو ہم کو یہ کہنا چاہیے کہ ہندوستان میں بی۔ اے ڈگری تک تعلیم پانے کو جو اعلیٰ اسٹینڈرڈ تعلیم کا سمجھا گیا ہے، محض غلط ہے۔ بی۔ اے اسٹینڈرڈ کی تعلیم کو معمولی عام درجہ کی تعلیم کا اسٹینڈرڈ سمجھنا چاہیے کہ بغیر وہاں تک تعلیم پائے کوئی شخص دنیا کے معمولی کاروبار کے بھی لائق نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔
>
> جو لوگ انگریزی پڑھتے ہیں اور روز بروز اس تعلیم کو ترقی ہوتی جاوے گی اسی کے ساتھ وہ بہ خوبی اور بہ یقین کامل جانتے ہیں کہ گورنمنٹ کے پاس اس قدر نوکریاں نہیں ہیں کہ ان سب لوگوں کو دے سکے جو انگریزی میں تعلیم پاتے ہیں۔ ہاں بے شک یہ بات ضرور ہے کہ ہر ایک انگریزی خواں سرکاری عہدوں کی تمنا رکھتا ہے اور ایسا ہونا ایک نیچرل امر ہے۔
>
> مسلمانوں میں انگریزی تعلیم نے اب تک کافی رواج نہیں پایا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور جب تک مسلمانوں میں کافی سے بھی زیادہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم رائج نہ ہو گی اس وقت تک کوئی معتد بہ فائدہ دنیاوی اور بعض حالتوں میں دینی بھی حاصل نہ ہوگا۔۔۔۔ مسلمانوں میں بی۔ اے ڈگری پائے ہوؤں کی تعداد اس کثرت سے ہونی چاہیے کہ اگر کوئی شخص زمین پر سے ڈھیلا بھی اٹھاوے تو وہ بھی گریجویٹ ہو۔
>
> اس قدر بیان کرنے پر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو جو انگریزی تعلیم پاتے ہیں ایک خاص اسٹینڈرڈ تک پہنچنے کے بعد آئندہ زندگی کے واسطے کیا بہتر ہوگا ہندوستان بہت وسیع ملک ہے۔ اس میں جان و مال کا امن ہے، تجارت کے لیے بہت کچھ وسعت ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اگر مسلمان نوجوان لائق اور صفات حمیدہ سے معمور اور ان عادات و افعال سے بری ہو جاویں جو تجارت کے منافی ہیں تو اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھا سکیں۔"[۹]

قومی اور ملکی اقتصادیات و معیشت کی ترقی کے لیے تجارت اور سرمایہ کاری۔ *(Trade and*

کی اہمیت سے سرسید بخوبی واقف تھے اور تجارت کا ایک خاص مقصد اور مفہوم ر
مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی معاشی حالت کا اندازہ تھا اس لیے انھوں نے تجارت کے ایسے
پر زور دیا جو کسی ایک فرد یا ایک ہی معاشی سطح کے مختلف افراد تک محدود نہ ہو بلکہ جس کی سرما
منافع میں مختلف سرمایہ کے لوگ شریک ہوں۔ سرسید اس قسم کی تجارت کو سوسلائزڈ تجارت یعنی
کا نام دیتے ہیں۔ سرسید شخصی تجارت کو ان سوسلائزڈ تجارت سے موسوم کر کے متفقہ تجار
تجارت سے الگ کر دیتے ہیں:

"مگر تجارت دو قسم کی ہے۔ ایک سوسلائزڈ اور ایک ان سوسلائزڈ۔ ان سوسلائزڈ تج
سے ہماری مراد شخصی سے ہے۔ جو کوئی شخص اپنا ذاتی روپیہ لگا کے تجارت کرے گو ا
کو کیسی ہی ترقی ہو جاوے اور کتنا ہی بڑا کارخانہ اس کا پھیل جاوے وہ ان سوسلائزڈ تج
ہی کہلاوے گی، کیوں کہ اس سے خاص اس شخص کو فائدہ ہے نہ ملک اور قوم کو اور
اس قسم کی تجارت کو بہت زیادہ وسعت ہو سکتی ہے۔ بلکہ وہ چند ذی مقدور اشخا
میں محدود رہتی ہے۔

سوسلائزڈ تجارت وہ ہے جس میں قوم کے مختلف سرمایہ کے لوگ شریک ہو
اور ہر ایک کو بقدر اس کے سرمایہ کے منافع پہنچے۔ اس قسم کی تجارت ملک کے لوگوں
فائدہ پہنچانے والی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس قدر وسیع ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص تجارت
کرنے والا گو وہ کیسا ہی دولت مند ہو، اس کی برابری نہیں کر سکتا۔" [۱۰]

اسی مضمون میں سرسید، تجارت کے لیے بلکہ انہی کے لفظوں میں سوسلائزڈ تجارت کے
صلاحیت اور شرائط، اولسٹی اور ایمانداری، مستعدی اور وقت کی پابندی، ڈیوٹی کی تکمیل، بیـ
سیر و سیاحت وغیرہ کی نشاندہی کے بعد مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کو تجارت پیشہ اختیار کرنے کا

"اس مقام پر میں مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں .... اور میر
یقین کرتا ہوں کہ جب ہمارے نوجوان انگریزی تعلیم یافتہ سوسلائزڈ تجارت میں شریک ہوں
تو نہایت خوبی اور ایمانداری سے کام انجام دیں گے۔

تجارت کی بہت سی شاخیں کھلی ہوئی ہیں اور میں ان انگریزی خواں طالب علموں
جو خاص اسٹینڈرڈ یعنی بی۔اے کی ڈگری تک پہنچ چکے ہیں، صلاح دیتا ہوں کہ وہ اپنے
تئیں سوسلائزڈ یعنی متفقہ تجارت میں مشغول کریں۔ اس سے بہتر ان کے لیے کوئی بات
نہیں اور جب ایسے تعلیم یافتہ کثرت سے ہو جائیں گے تو خواہ مخواہ ان کو بھی یہی کام کرنا پڑے
گا .... بنگالی اور ہندو اس قسم کے کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور ملک اور
قوم کو فائدہ پہنچاتے ہیں .... پس ہم اپنے نوجوان تعلیم یافتہ گریجوٹوں کو صلاح دیتے
ہیں کہ اول وہ بی۔اے تک کی ڈگری حاصل کریں اور اسی کے ساتھ وہ صفتیں بھی اپنے میں

پیدا کریں۔۔۔۔۔۔۔اور اس تجارت میں جس کا ہم نے سویلائزڈ تجارت نام رکھا ہے مشغول ہوں اس سے بہتر کوئی طریقہ ان کی اور قوم کی اور ملک کی بھلائی کا نہیں ہے۔" سلا

غیر ملکی زرِ مبادلہ (Foreign Exchange Money) کسی بھی ملک کی معیشت میں بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں ہر چھوٹا بڑا ملک اس کی اہمیت سے واقف ہو چکا ہے۔ مختلف ممالک کے درمیان صنعت و تجارت اور سرمایہ کاری کے معاہدے، درآمدات و برآمدات کا سلسلہ، بین ملکی کمپنیاں (Multi Nationals) اور گیٹ (GATT) جیسے تجارتی سمجھوتے غیر ملکی زرِ مبادلہ حاصل کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ سرسید کا عہد اقتصادی اور تجارتی معاہدوں کا زمانہ نہیں تھا۔ ہندوستان جیسا وسیع اور قدرتی وسائل سے بھرپور ملک غیر ملکی تاجروں کا محکوم اور غلام تھا اور دن بہ دن اپنے سرمایوں سے محروم ہو رہا تھا۔ قومی تجارت اندرون ملک بلکہ چھوٹے چھوٹے علاقوں تک محدود تھی۔ غیر ملکی کمپنی ہندوستان کا مال اپنے ملک میں تیار کرتی اور بڑی قیمتوں پر فروخت کر کے کثیر زرِ مبادلہ حاصل کر رہی تھی ان حالات میں سرسید نے قومی معیشت کی ترقی اور استحکام کے لیے اندرون ملک تجارت (National Trade) کی جگہ بین الاقوامی تجارت (Inter National Trade) درآمدات کے مقابلہ میں برآمدات میں اضافہ اور درآمدات کو برآمدات میں تبدیل کر کے زیادہ سے زیادہ غیر ملکی زرِ مبادلہ حاصل کرنے پر زور دیا وہ بین ملکی تجارت کے مقابلے میں اندرون ملک تجارت کو اس تھیلی سے اس تھیلی میں روپیہ ڈالنے کے مترادف قرار دیتے تھے:

"آپ خیال کیجیے کہ ہندوستان جس میں ہزاروں قسم کی چیزیں تجارت کے فائدے کے واسطے موجود ہیں اور پیدا ہوتی ہیں ہمارا ملک ہے۔ اور وہ چیزیں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ مگر اس کے نفع کا کیا حصہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہندوستان میں تجارت کی بہت کچھ ترقی ہوئی مگر آپ خیال کیجیے کہ ملک کی تجارت اور دولت مندی کا اصول کیا ہے۔ وہ ملک دولت مند نہیں ہوتا جس میں دوسرے ملک کی چیزوں کی تجارت ہوتی ہے بلکہ وہ ملک دولت مند ہوتا ہے جس کی چیزوں کی تجارت کو دوسرے ملکوں میں ترقی ہوتی ہے۔ آج کل وہی ملک دولت مند ہو رہا ہے جس کی چیزوں کی تجارت دوسرے ملکوں میں ہوتی ہے ہندوستان کی چیزیں اگرچہ دوسرے ملکوں میں جاتی ہیں مگر محنت کی قیمت بڑھا کر پھر اسی ہندوستان میں آجاتی ہیں ہمارے ملک کی چیزوں کی نسبت بھی ہم لوگوں کی تجارت ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک یا ایک شہر سے دوسرے شہر تک محدود ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کی گرہ کاٹتا ہے۔ ہم لوگ اپنی چیز دوسرے ملک میں نہیں لے جاتے نہ دوسرے ملک کی چیزیں اپنے ملک میں لاتے ہیں۔ ہم

دریا کے کنارے پر بلکہ اس زمانے میں اپنی دوکان سے چند قدم فاصلے سے ریل کے اسٹیشن پر چار آنے کی چیز سوا چار آنے پر بیچ ڈالتے ہیں یا وہیں پر اس طرح سے خرید کر اپنے ملک میں بھیجتے ہیں۔ سمندر کے اندر ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ غیر ملکوں سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے ہم کو چاہیئے کہ دوسرے ملک میں آڑھت اور کمپنیاں قائم کریں جس سے اعلیٰ درجہ کے تاجر ہوں ملک میں پیداوار قدرتی چیزیں جو زمین میں گڑی پڑی ہیں ان سے فائدہ اٹھاویں۔ اس طریقہ سے کہ اپنے ملک میں اپنے ہی ایک بھائی کا روپیہ لے کر فائدہ اٹھاویں، ملک میں ترقی نہیں ہوسکتی۔ روپیہ کو کبھی اس تھیلی میں اور کبھی اس تھیلی میں ڈالنے سے روپیہ بڑھ نہیں جاتا جب تک کہ باہر سے لاکر اس میں روپیہ نہ ڈالا جاوے۔ جب تم ایسا کروگے اس وقت بے شک جس طرح ہمارے ملک کا روپیہ دوسرے ملک میں جاتا ہے ہم بھی دوسرے ملک کا روپیہ اپنے ملک میں کھینچ لاویں گے۔ یہ سب باتیں ہم کو صرف ہائی ایجوکیشن کے نہ ہونے سے حاصل نہیں ہوتیں۔" ۳۱ھ

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کے معاشی نظریات بیسویں صدی کی بعض جدید معاشی اصطلاحوں *Partnership* اور *Joint Stock Companies* تک

سرسید کے نزدیک قوت بخش اور ثمر حیات غذا ملک و معاشرے کی لازمی ضرورت ہو اس لیے اچھی اور منافع بخش پیداوار کے لیے ملک کی زرعی معیشت کو نت نئے وسیلوں سے زمینداروں، کاشتکاروں خاص طور سے حکومت کی اہم ذمہ داری ہوتی ہے۔ سرسید زراعت دولت اور ملک کی آبادی کا ایک اہم ذریعہ تصور کرتے تھے لیکن جب انھوں نے زراعت میں کا جائزہ لیا تو مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آسکا۔ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ میں انجمن اسلامیہ لاہور کے جلسہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تجارت کے بعد زراعت ایک بہت عمدہ طریقہ دولت اور ملک کی آبادی کا ہے۔ ہم نے علم فلاحت میں بہ نسبت زمانہ سابق کے کچھ تنزل نہیں کیا بلکہ جیسے تھے ویسے ہی ہیں مگر اس سبب سے کہ بہ نسبت سابق کے بعض کاموں کی زیادہ ضرورت پیش آئی ہے اور اس ضرورت کے انجام کی لیاقت ہم میں نہیں ہے، زراعت میں بھی ہم نے بہت کچھ نقصان اٹھایا ہے۔" ۳۱ھ

سائنٹیفک سوسائٹی (۱۸۶۳) اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال و مغرب کی علمی و اصلاحی کارکردگی کے پہلو بہ پہلو معاشی سرگرمی کو بھی قابل قدر حیثیت حاصل تھی۔ اس میں سائنٹیفک سوسائٹی سے *Political Economy* پر رسالہ علم انتظام مدن، اصول سیاست اور کاشتکاری کے فن پر "رسالہ علم فلاحت"، کی اشاعت بطور خاص اہمیت رکھتی ہے۔ سائنٹیفک سوسائٹی زراعت کے مروجہ طریقوں میں اصلاح اور تبدیلی کی خواہاں تھی تاکہ پیداوار میں اضافہ

زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو اور عوام کو کثیر مقدار میں خورد و نوش کی اشیاء حاصل ہو سکیں جس سے ملک میں فاقہ ر قحط پر قابو پایا جا سکے اور زائد لگان اور محصول سے حکومت کی آمدنی میں بھی اضافہ ہو۔ اسی لیے سوسائٹی کے ریعہ دولت حاصل کرنے کے ذریعوں اور طریقوں کا شعور اور جدید مشینوں اور مفید دکار آمد آلوں کے سمجھنے اور استعمال کرنے سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ سرسید کا ایک طویل تر مضمون ''یادداشت سبت ترقی حیثیت اراضی و امداد کاشتکاران و تقرر بینک ہائے زراعتی'' سے زمینی اور زرعی اصلاح و رقی کے سلسلہ میں ان کی گہری دلچسپی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

سرسید نے اپنے مضمون میں زمین کی حیثیت اور قوت پیداوار میں ترقی اور اضافے کے لیے آب اشی کے ذرائع کنوؤں کے قیام اور نہروں کی تعمیر کی ضرورت بتاتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اس کا نتظام حکومت کو خود اپنے سرمایے سے کرنا چاہیے اور اس کے بدلے میں عوام پر کوئی محصول لگانے کے بائے زمین کی پیداوار میں اضافے سے حکومت کو کسانوں سے حاصل ہونے والے لگان کی زائد شرح ی امید کرنی چاہیے جو یقیناً کنوؤں پر لگائے گئے محصول کی شرح سے زیادہ ہو گی۔

اس مضمون میں زمین کی قوتِ پیداوار میں کمی کے مختلف اسباب، آب پاشی کی سہولتوں اور ذریعوں میں کمی، درختوں کی کٹائی اور لکڑی کی مہنگائی کی وجہ سے بیلوں کے فضلات (گوبر) کے بطور ایندھن ستعمال کے نتیجے میں دیسی کھاد کی کم فراہمی، چراگاہوں کی کمی، بیلوں کی خراب اور کمزور صحت کی وجہ سے زمین ی جوت میں کمی جیسے مسائل اور ان کے حل کی جو تدبیریں پیش کی گئی ہیں ان سے یہ بات نمایاں ہو جاتی ہے کہ سرسید کو فرد اور ملک کی معاشی ترقی میں زرعی پیداواری قوت کے نکات اور مختلف پہلوؤں کا نہ صرف علم تھا بلکہ وہ اس کی باریکیوں سے بھی ایک ماہرِ فن کی طرح واقف تھے۔

ملک کی آزادی کے بعد نئی معاشی اور زراعتی پالیسیوں اور دیہی ترقیاتی منصوبوں کے تحت ماہرینِ فن اور حکومت نے دیہی ترقیاتی بینک (*Rural Development Bank*) اور زرعی ترقیاتی بینک (*Agricultural Development Bank*) کے نام پر جن فلاحی اور ترقیاتی اداروں کو عملی شکل دی، سرسید نے سو سال سے پہلے جون ۱۸۸۳ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے صفحات پر اپنے مضمون میں ان اداروں کی ضرورت و اہمیت اور ان کے فوائد پر روشنی ڈالتے ہوئے حکومت سے ان کے قیام کی پرزور سفارش کی تھی۔

سرسید کے اصلاحی مشن میں معاشی و اقتصادی پہلو کی ترجیح و فوقیت اس مضمون کا مقصود نہیں بلکہ یہاں سرسید کی مجموعی فکر میں ان کی معاشی بصیرت اور فکر و عمل کے معاشی پہلو کے تعارف و تعین کے ساتھ یہ باور کرانا ہے کہ ہندوستان میں انیسویں صدی کے معاشی مصلحین میں دادا بھائی نوروجی، رمیش دت، واچا، جوشی اور رانا ڈے کے ساتھ سرسید کا نام بھی اہم ہے۔

حوالے

۱۔ مکمل مجموعۂ لکچرز و اسپیچز سرسید۔ مرتبہ مولانا محمد امام الدین گجراتی۔ ص ۴۴

۲۔ مجموعۂ لکچرز و اسپیچز سرسید، مرتبہ امام الدین گجراتی ص ۲۷۴

۳۔ ایضاً " " ص۔ ۷۵، ۷۶

۴۔ " ایضاً " " ص۔ ۷۷

۵۔ " ایضاً " " ص۔ ۱۶۳

۶۔ " ایضاً " " ص۔ ۱۶۲

۷۔ " ایضاً " " ص۔ ۱۱۲، ۱۱۳

۸۔ مکمل مجموعۂ لکچرز و اسپیچز سرسید، مرتبہ امام الدین گجراتی، ص۔ ۱۰۰

۹۔ مقالات سرسید، مرتبہ اسماعیل پانی پتی، حصہ ۵ ص۔ ۶۲، ۶۳، ۶۵، ۶۶

۱۰۔ " ایضاً ص۔ ۱۶۷، ۱۶۶

۱۱۔ " ایضاً ص۔ ۱۷۰، ۱۶۹، ۱۶۸

۱۲۔ لکچر سرسید (ٹاؤن ہال امرتسر)
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ ۱۰ مئی ۱۸۸۴ء۔ ص ۵۰۸

۱۳۔ مجموعۂ لکچرز و اسپیچز سرسید، مرتبہ امام الدین گجراتی۔ ص۔ ۱۰۱، ۱۰۰

ندوی جمشید*

سرسید اور عربی زبان

قانون فطرت ہے کہ وہ جس سے جس قدر اونچے، اعلیٰ اور بامقصد کاموں کی تکمیل چاہتی ہے، اسی حساب سے اس شخصیت کو پروان چڑھاتی ہے، اُسے اعلیٰ صفات وکردار سے مزین کرتی ہے، اعلیٰ ترین صلاحیتیں ودیعت کرتی ہے۔ اس کی شخصیت کے ہر ہر پہلو کو نکھارتی وسنوارتی ہے تاکہ آگے چل کر اس کے ذریعے سے تکمیل اور انجام تک پہنچنے والے کسی کام میں رکاوٹ نہ پڑے جب ہم اس معیار پر سرسید کو تولتے ہیں تو اُن کی شخصیت چند علمی آراء سے اختلاف رکھنے ۔ جو ہمارے خیال میں اس زمانے کے ماحول کی شاخسانہ تھیں ۔ کے باوجود اس معیار پر مکمل اور کھری اترتی ہے ۔ اور اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے ان کی خاص قسم کی پرداخت کی تھی ۔

سرسید نادروگوناگوں صفات کے حامل تھے ان کی زندگی کے بہت سے پہلو ہمارے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اسی وجہ سے سرسید کے بیشتر پہلوؤں کو خوب اچھی طرح اجاگر کیا گیا ہے لیکن چند پہلو ابھی تشنہ ہیں جن میں سے ایک ان کی "عربی زبان وادب سے واقفیت" بھی ہے جس سے انھوں نے اپنی تصانیف میں جابجا فائدہ اُٹھایا ہے اور اس استشہاد کے ذریعے ان تصانیف ومضامین کو اور زیادہ قابلِ اعتبار بنادیا ہے ۔

سرسید کی تعلیم وتربیت اس زمانے کے شرفاء کے طور پر ہوئی تھی۔ علامہ حالی نے ان کی تعلیم وتربیت کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دیگر فنون کی کتابیں پڑھنے کے علاوہ عربی میں شرح ملاّ، شرح تہذیب، میبذی، مختصر المعانی اور مطول ما انا قلت تک پڑھی، مگر طالب علموں کی طرح نہیں، نہایت بے پرواہی اور کم توجہی کے ساتھ، ان کی تعلیم کا یہ پہلا دور اٹھارہ سال کی عمر پر ختم ہوجاتا ہے بطور خود کتابوں کے مطالعہ کا برابر شوق رہا۔[۱]

تعلیم کا دوسرا دور ۱۸۴۶ء سے شروع ہوتا ہے جب وہ فتح پور سیکری سے بدل کر دلی کی منصفی پر آئے تو انھیں یہ خیال پیدا ہوا کہ جو کتابیں ابتداء میں نہایت کم توجہی اور بے پرواہی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نسیاً منسیاً ہوگئی تھیں ان کو از سر نو خود اور توجہ سے پڑھیں ۔ اسی خیال کے تحت اس وقت دہلی کے مشہور استاد مولوی نوازش صاحب مرحوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ان سے پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا اور فقہ میں قدوری، شرح وقایہ، اصول فقہ میں شاشی، نور الانوار اور ایک آدھ اور کتاب پڑھی۔ نحو میں شرح جامی اور قطبی کے بیس بیس بائیس بائیس صفحے روز پڑھتے تھے۔[۲]

ہندوستان کے مشہور عربی ادیب وشاعر فیض الحسن سہارنپوری مرحوم سے مقامات حریری کے چند مقامے اور سبعہ معلقہ

---

* ریسرچ اسکالر، ڈپارٹمنٹ آف عربک، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سے کے چند قصیدے پڑھے ــــــــ شاہ عبدالعزیز دہلوی کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق
اللہ سے مشکوٰۃ، جامع ترمذی کا ایک حصہ، صحیح مسلم کے کسی قدر اجزا، پڑھے اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔ بقول حالی اس سے
کہ سرسید خود اقرار کرتے ہیں استاد سے کچھ نہیں پڑھا۔[۱۲]

سرسید کی ناقص تعلیم بھی شاید قدرت کے اشارے پر ہی ہوئی۔ کیوں کہ اگر سرسید بقول حالی مشرقی تعلیم کی اس حد
بڑھ جاتے تو شاید تقلید کے پھندے سے تازیست اپنا دامن چھڑا نہیں پاتے۔ اسی لیے شاید حالی نے قدیم و جدید علوم کی ناقـ
ان منجملہ اتفاقات حسنہ میں شمار کیا ہے جنھوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے ان کو جھجکنے نہ

مذکورہ عربی کتب نے سرسید کی علمیت کو مزید جلا بخشی تھی۔ ان ہی کتابوں کے مطالعے سے جو استعداد پیدا ہوئی
کی مدد سے انھوں نے دیگر عربی کتب کا مطالعہ جاری رکھا، جس نے انھیں اسلام کو سمجھنے اور اسے عصر حاضر کے مطابق
انداز میں پیش کرنے میں مدد دی جس میں وہ بسا اوقات تجاوز بھی کر گئے اور بہت سے ان مسلمہ حقائق سے انکار کر
کی عقل کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے ان حقائق کو اپنے مطالعے کی روشنی میں پیش کیا اور
راہ سے ہٹ گئے[۱۳] لیکن یہ اختلاف بھی نیک نیتی اور بلند مقصد سے خالی نہیں تھا کیوں کہ بقول مولانا محمد اسمٰعیل پانی پتی

"سرسید نے دیکھا کہ مغرب کے فشار تہذیب' جبر' تاریخ اور لزوم وقائع کے ماتحت سائنسی انکشافات
اس طرح سیلاب کی طرح بڑھتے چلے آ رہے ہیں کہ نوجوانوں کا طبقہ متذبذب' بدگمان بلکہ بدعقیدہ
ہو گیا ہے۔ یہ بات ملحوظ رکھ کر انھوں نے قرآن مجید کی بعض آیات کی ایسی تفسیر کی جسے آج شاید "بالرائے"
کہا جا سکے لیکن بہر حال ان کا مقصد نیک تھا، نیت درست تھی اور نیت درست ہو تو اعمال کا معاملہ خدا
کے ہاتھ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سرسید نے بہت سی باتیں مسلک جمہور کے خلاف بھی کیں، لیکن
ان کے خلوص کی بنا پر آج ان باتوں سے پیدا شدہ تلخی کم ہو گئی اور سرسید کی نیک نیتی روشن سے
روشن تر ہوتی گئی ہے۔[۱۴]

سرسید کی حمایت و مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس مقالے میں ان کی پہلو دار شخصیت کے ایک پوشید
اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کو عربی زبان و ادب پر کتنی گہری دسترس تھی جس سے
استفادہ کرتے تھے۔ اس لیے شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ اگر سرسید اپنی صلاحیتوں کو اس میدان میں صرف کرتے تو آج
کے نمایاں شہسوار ہوتے۔

سرسید نے عربی زبان و ادب میں مستقل کوئی یادگار نہیں چھوڑی ہے لیکن ان کے قلم سے بے تکلفانہ طور
عربی جملے، عبارتیں ان کی تحریروں میں نگینے کی طرح جڑی ہوئی ہیں کہ اگر انھیں اس جگہ سے ہٹا دیا جائے تو وہ عبارت
گی اور اس کی تاثیر کسی حد تک کم ہو جائے گی۔ اسی لیے وہ اپنی تحریروں میں قرآن و احادیث سے استدلال کرتے ہیں
اسلوب تحریر پہ سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہیں۔ آیات قرآنی و احادیث سے بلا تکلف استدلال ان کے اعلیٰ درجے
پر دلالت کرتا ہے۔

سرسید نے عربی زبان و ادب کی مکمل تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن انھوں نے عربی زبان کے مروجہ نصاب
حصہ کو پڑھ لیا تھا اور بعد میں اس کو اپنے شوق مطالعہ سے مزید جلا بخشتے رہے جس کا اندازہ ہمیں ان کے م

رہنے والی اہم عربی کتب و مصادر سے ہوتا ہے جس کے گہرے اثرات ان کی شخصیت پر مرتب ہوئے تھے۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے بہت سی کتابوں اور مضامین کے سرعنوان عربی زبان کے مطابق ہی باندھے ہیں اور اپنی تحریروں میں عربی زبان کے محاورات و الفاظ کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔

ان کی شخصیت کا اس پہلو سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات آشکارا ہوتی ہے کہ انھوں نے عربی زبان و ادب کے بہت سارے پہلوؤں جیسے الفاظ کی تحقیق، معانی الفاظ، نحو و صرف، بلاغت و اعجاز پر جستہ جستہ اپنی تحریروں میں قلم اٹھایا ہے ہمیں کہیں وہ الفاظ کی تحقیق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کہیں معانی بیان کرتے ہوئے۔ کہیں نحو و صرف کی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کہیں قرآن کی بلاغت و اعجاز کو پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ذیل میں ہم الگ الگ عناوین کے تحت ان کی عربی دانی کا ایک جائزہ انہی کی عبارتوں کے ذریعے پیش کر رہے ہیں:-

الفاظ کی تحقیق : سرسید کی عربی لغت پر گہری نظر تھی جس کا اندازہ ہمیں ان عربی الفاظ سے ہو سکتا ہے جن کی تحقیق انھوں نے جا بجا کی ہے۔ کہیں صرف ان کی تحقیق کر کے خاموش ہو گئے ہیں اور کہیں ان کے معنی بھی متعین کرتے ہیں۔

۱۔ **نصاریٰ :** یہ لفظ ناصرہ سے مشتق نہیں ہے بلکہ نصر سے مشتق ہے اور دلیل میں "من انصاری الی اللہ" آیت پیش کی ہے۔[۹]

۲۔ **کسب و اکتساب :** کسب اور اکتساب کے معنیٰ ہیں کسی چیز کے کسی ذریعے سے حاصل کر لینے کے، جس کو کمائی کہتے ہیں اور اسی بھلائی یا برائی کی نسبت بولے گئے ہیں جس کو انسان نے حاصل کر لیا ہے جیسے کہ ایک جگہ فرمایا ہے " تلک امۃ قد خلت لھا ماکسبت و لکم ماکسبتم۔[۱۰]

۳۔ **سماء :** اس لفظ کی تحقیق اور اس کے معانی کی تعیین بہت زیادہ شرح و بسط سے بیان کرتے ہوئے اس کے کئی معنی قرار دیئے ہیں اور ہر ایک معنیٰ کے اعتبار سے دلائل آیات قرآنی سے پیش کئے ہیں۔[۱۱]

۴۔ **حجارۃ :** یہ جمع ہے حجر کی اور لغوی معنی اس کے پتھر کے ہیں اور لفظ ترمیھم جو اس کے ساتھ ہے تو اس سے اور بھی لوگوں کو یہ خیال جم گیا کہ وہ ہر جانور کو پتھر مارتے تھے مگر بات یوں نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ پتھر مارنے سے مراد مصیبت میں ڈالنا ہے۔[۱۲]

۵۔ **جن :** لفظ جن لفظ اجتنان سے مشتق ہے جس کے معنی چھپے ہوئے کے ہیں اور عربی زبان کے محاورے میں جو چیز پوشیدہ ہو اس پر جن کا اطلاق کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ پیٹ کے بچے کو بھی جنین اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ پیٹ کے اندر پوشیدہ ہے۔ اسی طرح انھوں نے جان اور جنۃ کو جن کا مترادف بتایا ہے۔[۱۳]

۶۔ **لمس :** لفظ لمس جو قرآن مجید میں آیا ہے اس کے معنی چھونے کے ہیں مگر اس سے ڈھونڈھنے کا مطلب لیا جاتا ہے۔۔ عربی زبان میں چھونا بمعنی ڈھونڈنا بولا جاتا ہے۔ جناب عبدالقادر صاحب نے اس کا ٹٹولنا نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔۔۔۔ مگر ہم نے بنظر توضیح ڈھونڈنا ترجمہ اختیار کیا ہے۔"[۱۴]

نحو، صرف و بلاغت : سرسید جا بجا اپنی تحریروں میں عربی قواعد سے بھی بحث کرتے ہیں :

۱۔ السطی : السطی جس کے مشتقات آیت کریمہ یوم نطوی السماء کطی السجل لکتب۔ اور آیت کریمہ والسموٰت مطویات بیمینہ میں آئے ہیں۔ [۱۵]

۲۔ استکثرتم : یا معشر الجن قد استکثرتم من الانس میں لفظ "یا" جو جنوں کے لیے بطور ندا کے آیا ہے، صرف بطور خطابیات کے ہیں جیسے کہ جان چیزوں کو ندا دی جاتی ہے [۱۶]

۳۔ الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس (سورہ ناس) اور تمت کلمۃ ربک لاملئن جہنم من الجنۃ والناس (سورہ ہود) میں جنۃ اور ناس کا لفظ آیا ہے، بجائے لفظ جن و انس کے، جن اور جنۃ ایک لفظ ہیں، البتہ ناس میں تمام انسان شہری ہو یا پہاڑی سب شامل ہیں مگر پھر جن کو علیحدہ بیان کرنے سے اور انس کو علیحدہ بیان کرنے سے زیادہ تصریح و توثیق حکم کی مقصود ہوتی ہے، جیسے کہ عام کو بیان کرنے کے بعد خاص کو پھر بیان کرتے ہیں۔ جیسے خدا فرماتا ہے۔ من کان عدو اللہ وملائکتہ وجبرئیل ومیکال، حالانکہ فرشتوں میں جبرئیل اور میکائیل داخل تھے مگر پھر ان دونوں کو علیحدہ بیان کرنے سے تاکید، توفیق و تنبیہ حکم کی مقصود ہے۔ [۱۷]

۴۔ آیت الذین اتیناھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناھم " میں جو ضمیر مفعول لفظ یعرفونہ میں ہے وہ جیسا کہ عام مفسرین کہتے ہیں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد نہیں ہوتی بلکہ جیسا کہ ابن عباس، قتادہ، ربیع اور ابن زید سے منقول ہے تحویل قبلہ کے معاملہ کی طرف پھرتی ہے۔ [۱۸]

۵۔ اللہ الذی خلق سبع سمٰوٰت ومن الارض مثلھن" اس آیت میں ارض مفرد آیا ہے بلکہ تمام قرآن مجید میں کسی جگہ ارض بصیغہ جمع یعنی ارضین نہیں آیا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب ارض پر کسی حیثیت سے جمع کا اطلاق نہیں ہوا تو تعدد ارض نہیں پایا جاتا اور " والارض" میں جو "واو" ہے اس کا عطف سمٰوٰت پر ہے یعنی خلق الارض مثل السمٰوٰت بکمال وقدرتہ ....." [۱۹]

۶۔ سمٰوٰت کے ایک معنی سرسید نے مجازاً کواکب بھی مراد لیے ہیں اور استدلال " الذی خلق سمٰوٰت طباقا " سے کیا ہے۔ (اس آیت میں) " ظرف سے مظروف مراد ہونے پر قرینہ تو یہ موجود ہے یعنی اگلی آیتوں میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ ایسی اشیاء پر جو مرئی نہیں ہیں اور دکھائی نہیں دیتیں صادق نہیں آیا اور اس لیے ضرور ہوا کہ ظرف سے مظروف مراد لی جاوے۔
اس مقام پر ظرف کو مجازاً مظروف بیان کرنے میں ایک بڑی عمدگی و باریکی ہے کیوں کہ اگر یوں کہا جائے کہ الذی خلق سبع کواکباً طباقا " تو یہ قول صرف نفس کواکب پر دلالت کرتا حالاں کہ ان کے حالات اور ان کے حرکات اور جو انتظام کہ ان کے حرکات میں ہے وہ نفس کواکب سے بھی زیادہ عجیب ہیں اور ظرف سے جو اُن کا محل سیر ہے، ان پر اشارہ کرنے سے جو عجائبات کہ نفس کواکب اور ان کے حالات میں ہیں وہ سب کے سب یکلخت ذہن میں آجاتے ہیں۔ [۲۰]

۷۔ وبنینا فوقکم سبعًا شدادًا وجعلنا سراجا وھاجا کے متعلق سرسید فرماتے ہیں کہ افسوس کہ بعض اکابر نے اس آیت کی نسبت مکابرہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر سبع سے سات

ستارے معہودہ مراد ہوتے تو لفظ سبع کو معرف باللام لانا ضروری تھا۔ اگرچہ ہم سمجھتے ہیں کہ بحالت شہرت تعریف باللام لانا ضرور نہ تھا۔[۲۲]

سرسید اعلیٰ درجے کا عربی ادب کا ذوق رکھتے تھے جس کا اندازہ ہمیں ان کی ان تحریروں سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے جابجا آیات، احادیث، محاورات و فقرات اور اشعار پیش کیے ہیں۔ مولانا اسماعیل پانی پتی نے ان کے مضامین کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے رقم کیا ہے۔ "مضامین میں بالعموم عربی فقرات، قرآنی آیات اور احادیث نبوی کا بہ کثرت استعمال کرتے ہیں"[۲۳] چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

آیات قرآنی کا استعمال:

۱- "عقائد مذہب الاسلام" میں رقم طراز ہیں: اگر تمام موجودات کے عوارض نوعیہ یا شخصیہ معدوم ہوجاویں تو جو کچھ باقی رہے گا وہ ناقابل عدم ہوگا۔ قد قال تبارک و تعالیٰ کل من علیھا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔ اگر یہ مسئلہ (ایمان لانے کا مسئلہ) عقل انسانی میں آنے کے یا یوں کہو کہ انسان کی سمجھ کے لائق نہ ہوتا تو انسان ہرگز اس مسئلہ پر ایمان لانے کو مکلف نہ کیا جاتا کما قال تعالیٰ " لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔[۲۴]

۲- کتاب الاعمال والمیزان والموازنہ میں لکھتے ہیں " حالات معاد یا واقعات بعد الموت اس قسم کے ہیں جن سے انسان بالکل ناواقف ہے۔۔۔ اس لیے بجز اس کے اور کچھ چارہ نہیں ہے کہ ایسی تمثیلوں سے ان کو بیان کیا جاوے کہ انسان کے دل پر اس کا کچھ خیال پیدا ہو۔ خدا خود فرماتا ہے ویضرب اللہ الامثال للناس لعلھم یتذکرون۔

۳- ایک جگہ لکھتے ہیں" باہمی اختلاف کی وجہ سے اسلام کے مجمع کو متفرق کرنا اسلام کے اصول کے خلاف ہے اور اس برکت کی ناشکری ہے جو خدا نے دی ہے اور جس کی فالف بین قلوبکم کے لفظوں سے تعبیر کی ہے۔

۴- تقلید کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔" جناب مذہب اسلام تو آفتاب سے زیادہ روشن اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہے اور وہ کوئی معما اور بدر چاچ کا شعر نہیں جس کے حل کرنے کو مولوی امام بخش صہبائی اور حسن نعمانی درکار ہوں۔ خدا فرماتا ہے ھو الذی بعث فی الامیین رسولا۔ ذرا مہربانی سے قرآن کھول کر ملاحظہ فرمائیے اس میں یہی لفظ ہے یا بجائے ان کے یہ الفاظ ہیں۔ ھو الذی بعث فی الفلسفیین رسولا۔[۲۵]

۵- شرک فی النبوۃ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں" جو شخص رسول اللہ کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح واجب العمل سمجھتا ہے کہ اس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اسی کی تابع داری کو باعث نجات و ثواب سمجھتا ہے وہ بھی ایک قسم کا شرک ہے جس کو میں شرک فی النبوۃ سے تعبیر کرتا ہوں۔ خدا نے یہود و نصاریٰ دونوں کو اسی بات کا ملزم ٹھہرا کر فرمایا اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ۔ بس اسی طرح کی پیروی اربابا من دون اللہ تک پہنچا دیتی ہے۔

احادیث کا استعمال:

رسالت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں، موحدین محض کے مخلد فی النار ہونے یا نہ ہونے پر قدیم سے علماء میں بحث چلی آرہی ہے۔۔۔ اس بحث کو انہی عالموں کے لیے چھوڑ دو ہم کو اپنے حبیب کے اس قول پر رہنے دو

"علیٰ رغم انف ابی ذر" ؎

۲۔ خلافت کے عیسائی تصور کو واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "اور جب پوپ اُن کے گناہوں کو معاف کردے تو وہ شخص ایسا ہی پاک ہو جاتا ہے "کمن لا ذنب لہ" ؎

۳۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "مجھ کو خوف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ پیچھے ہٹتے ہٹتے گڈھے میں جا پڑو" لانکم علی شفا حفرۃ"؎

۴۔ "جو علماء اور غالباً حنفی علماء نصیحت کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے اور علوم جدیدہ میں ترقی کرنے سے مسلمانوں کے ایمان میں خلل آتا ہے" ان کو یاد رکھنا چاہیے "الایمان لا یزید ولا ینقص" ؎

اشعار سے استشہاد: سرسید کہیں کہیں عربی اشعار سے بھی استشہاد کرتے ہیں خصوصاً انھوں نے "جنوں کی حقیقت" مضمون میں۔ ربی شاعری سے استشہاد کیا ہے اس کے علاوہ انھوں نے "اگلے زمانے میں علوم دینیہ اور علوم عربیہ وفلسفہ یونانیہ کی ترقی کس وجہ سے تھی اور اب کیوں تنزل ہو گیا ہے" نامی مضمون میں عربی شاعری پر جامع اور مختصر انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے ہر دور کی شاعری کی خصوصیات اور اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔ ؎

۱۔ جنوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے جدع بن سنان غسانی کے یہ اشعار نقل کیے ہیں:

اتوا ناری فقلت منون انتم — فقالوا الجن فقلت عموا صباحا

نزلت بشعب وادی الجن لما — رایت اللیل قد نشر الجناحا

اتیتم غریبا مستضیفا — راوا قتلی اذا فعلوا جنابا

ترجمہ: میرے الاؤ کے پاس وہ آئے تو میں نے کہا کہ تم کون ہو تو انھوں نے کہا کہ جن (یعنی پہاڑی) ہیں میں نے کہا تمہاری صبح اچھی ہو۔ میں وادی الجن کی ایک گھاٹی میں اُترا تھا جب کہ رات نے اپنے پر پھیلائے تھے۔ میں اُن کے پاس گیا بطور ایک مسافر کے مہمان کے اور انھوں نے میرا مار ڈالنا، اگر وہ ایسا کرتے ایک گناہ خیال کیا۔ ؎

۲۔ جوہری کی صحاح سے بہ روایت اخفش یہ اشعار نقل کیے ہیں:

اتوا ناری فقلت منون انتم — فقالوا الجن فقلت عموا ظلاما

فقلت الی الطعام فقال منہم — زعیم نحسد الانس الطعاما

ترجمہ وہ میرے الاؤ کے پاس آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ تم کون ہو۔ انھوں نے کہا ہم جن ہیں۔ میں نے کہا تمہاری رات خوش گزرے۔ پھر میں نے ان سے کہا آؤ کھانا کھاؤ تو ان میں سے جو سردار تھا اس نے کہا ہم انس یعنی شہروں کے رہنے والوں کے کھانے پر حسد کرتے ہیں۔ ؎

۳۔ نابغہ ذبیانی کے دو اشعار جن کے متعلق اپنے قول کی تائید میں پیش کیے ہیں:

لقد قلت للنعمان یوم لقیتہ — یرید بنی جن ببرقۃ صادر

تجنب بنی جن فان قتالہم — کریہ و ان لم تلق الا بصابر

ترجمہ: جس دن نعمان مقام صادر کے رتیلے کنکریلے میدان میں بنو جن سے لڑنے کو تیار تھا اس دن میری ملاقات ہوئی تو میں نے بنو جن سے علیحدہ لے جاکر کہا "بیشک ان کے مقابل ہونا بُرا ہے، اگرچہ نہ ملے تو مگر

صابر آدمیوں کے ساتھ۔" ۳۲

یہ چند نمونے ہم نے صرف مقالات سرسید جلد دوم سے نقل کیے ہیں، ان کی دیگر تالیفات کے مطالعہ کے بعد ان کی تعداد میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ قرآن واحادیث واشعار کے مندرجہ بالا استدلال سے یہ مکمل طور پر واضح ہوتا ہے کہ وہ عربی زبان سے نہ صرف اچھی طرح واقف تھے بلکہ اس پر گہری نظر بھی رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ سرسید کی تحریروں میں جا بجا ان کی عربی عبارتیں سامنے آتی ہیں جن میں سے بعض سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی بولنے اور سمجھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ۳۳ ان کی عربی تحریروں کے چند نمونے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

عربی عبارتیں:

۱۔ مولوی عبدالحیؒ فرنگی محلی کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں " جو چیزیں اس کے (سرسید) کے نزدیک موجب تہذیب ہیں، وہی اہل سنت کے نزدیک باعث تخریب ہیں۔ فالحذر الحذر یا ایہا المسلمون والهرب الهرب یا ایہا المؤمنون ۳۴

۲۔ تفسیر میں غلط روایات کی شمولیت پر تبصرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ جو شخص ان غلطیوں کو آشکارا نہ کرے وہ اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ ومن یفعل ذلک فهو یودی حق الله وحق دینه وحق اهل دینه وقومه والله المستعان " ۳۵

۳۔ مضمون " طبقات علوم الدین کے آخر میں لکھتے ہیں۔ وان من اعظم نعم الله علی ان اتانی منه حظا وجعل لی منه نصیبا وما انفک اعترف بتقصیری وابرأ وما ابرأ نفسی ان النفس لامارة بالسوء " ۳۶

۴۔ مضمون کتابۃ الاعمال والمیزان والموازنہ " کے آخر میں لکھتے ہیں۔" ولهذا قال فی موضع "ونضع الموازین القسط" فالقسط هو العدل والموازین القسط هو العدل کما یقول الموازین هو العدل، المیزان هو العدل فنعتقد ان کراما کاتبین حق، والمیزان حق ووزن الاعمال حق ولکن کلها امثال ضرب الله الامثال للناس لعلهم یتذکرون "۔ ۳۷

ان کے علاوہ بہت سی مثالیں ان کی تحریروں میں بکھری پڑی ہیں جو ان تحریروں میں مزید دلکشی ورعنائی پیدا کرتی ہیں اور ان کی تاثیر میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ اگر ان عبارتوں کو اس جگہ سے ہٹا دیا جائے تو وہ تحریر پھیکی اور ماند پڑ جائیں گی۔

یہ اعتراض کوئی بھی کرسکتا ہے کہ ان چند جملوں کو تو ہر وہ شخص لکھ سکتا ہے جسے عربی سے ذرا بھی شدبد ہوگی۔ اس لیے اس میں سرسید کی شخصیت کا کوئی خاص امتیاز نہیں ہے۔ لیکن یہ اعتراض محض اعتراض ہے کیوں کہ ہم ان کی بعض طویل عبارتیں بھی پاتے ہیں جو اپنی سلاست وروانی، حسن بیان کی وجہ سے اس زمانے کا ادبی شہ پارہ قرار پاسکتی ہیں۔ خصوصاً رسالہ احکام طعام اہل کتاب کا خطبہ آپ کی عربیت کی دلیل ہے ملاحظہ فرمائیں:

الحمد لله الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ والصلوة والسلام علی رسوله محمد خاتم الانبیاء والمرسلین رحمة للعالمین الذین هدانا الی صراط مستقیم وجعل لنا الدین یسرا ولاعسرا حیث قال علیه السلام ان الدین یسر ولا رهبانیة فی الاسلام وعلی آله واصحابه واتباعه وامته اجمعین سیما علی الذین جاهدوا فی اشاعة مسائل دین القیمة الحنیفیه السمحه ولایخافون لومة لائم واستحقوا علی ذلک فرحة بعد فرحة۔ ۳۸

اسی رسالہ کے خاتمہ پر ایک طویل عبارت پھر لکھتے ہیں جس کا کچھ حصہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

"الآن نختم ھذہ الرسالۃ علی بیان امر یلیق بیانہ فی ھذا المقام فاعلم ان بعض علمائنا رحمۃ اللہ علیہ قد منع من تعظیم الکافرین سبقۃ السلام وغیرھا کما ھو عادۃ اہل دیارنا واستدلوا علی منعہ بما ھو مذکور فی التہذیب: ان کل فعل فیہ توقیر الذمی فھو حرام کالقیام والسلام والمصافحۃ والمعانقۃ لان الجزیۃ علیہم الاھانۃ وبالسلام توقیرھم وفیہ نظر علی وجوہ۔

الاول انہ لا یوافقہا الادلۃ الشرعیۃ لان اللہ تعالیٰ قال ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحاً وقال اننی من المسلمین ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم وما یلقّٰہا الا الذین صبروا وما یلقّٰہا الا ذو حظٍّ عظیم۔ وقال اللہ تعالیٰ وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھوناً واذا خاطبہم الجاہلون قالوا سلاما۔

الثانی: ان الروایۃ المذکورۃ فی التہذیب لیس یلائم حالنا ومن سکن دیارنا لان المشرکین او النصاریٰ فی دیارنا لیسوا باھل ذمتنا بل نحن معاشر المسلمین فی رعیتہم وفی جوارہم ونسکن فی امانہم ونعمر فی دیارھم وھم احسنوا الینا بوجوہ کثیرۃ لانہم یحکمون علینا بالعدل علیٰ ما یمکنہم ولا یراعون قوما دون قوم فی حکومتہم ومن قواعدھم التسویۃ بین حقوق العباد یہودیاً کان او نصرانیاً، مشرکاً کان او مسلماً ثم لا یمنعون اداء الفرائض کالصلوٰۃ والصیام والزکوٰۃ والحج ولا یزاحمون اقامۃ الحج والاعیاد الا البغی والفساد وای شئی اقبح من ھذین وھم یحکمون علینا فی قضایا التی یتعلق بالمذھب خاصۃ کالنکاح والطلاق والمیراث وغیرہ علی ما ھو ماثور فی شریعتنا فکیف لا نوقرھم علی انفسنا ونختارھم فانہم یحفظون انفسنا ویرعون اموالنا ویکلئون دمائنا علی ما بینا لما احسنوا وقد افترض علینا اطاعۃ امر السلطان وامتثال حکم یتعلق من امور الدنیا۔ [۳۴]

یہ چند مثالیں ہم نے ان کی چند تحریروں سے پیش کی ہیں اگر ان کی ساری تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو ان جیسی اور بھی مثالیں سامنے آسکتی ہیں۔ تاہم ان تحریروں سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ سرسید عربی زبان پر دسترس رکھتے تھے، اس سے بلا تکلف استفادہ کر سکتے تھے اور عربی زبان میں اپنے مافی الضمیر کو بحسن اور خوب صورت پیرائے اور اچھے اسلوب میں پیش کر سکتے تھے۔ ان کی تحریروں میں سلاست و روانی پائی جاتی تھی اور اس میں کسی قسم کا جھول نظر نہیں آتا ان تحریروں کی ادبی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم عہد سرسید کے پس منظر میں ان کا مطالعہ کرتے ہیں کہ اس وقت عربی زبان صنائع و بدائع کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی، اس میں کسی قسم کی روح باقی نہیں رہ گئی تھی۔ لہٰذا جب ہم اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے سرسید کی ان تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم ان کی عربیت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔

ان خصوصیات کے باوجود سرسید کی عربیت کا جائزہ لیتے وقت ہمارے ذہن میں یہ بات موجود رہنی چاہیے کہ سرسید نے الفاظ کے معانی، نحو و صرف کے نکات، لغات کی تحقیق اپنے نقطۂ نظر سے کی ہے اور یہ تحقیق بالعموم مسلم مفسرین کے خلاف جاتی ہے۔ اسی طرح لغت میں انھوں نے صرف وہی اقوال لیے جو ان کے مسلک و نظریے کی تائید کرتے ہیں۔ اشعار سے استشہاد بھی اپنے نقطۂ نظر کے حساب سے ہی کرتے ہیں جس سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ان خامیوں کے باوجود عربی زبان و ادب سے ان کی واقفیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی ان کی عربیت سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تمام تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے اور ان میں سے عربی زبان و ادب کے متعلق ان کی خدمات کو الگ سے پیش کیا جائے تاکہ سرسید کے اس پہلو پر بھی مکمل طور پر روشنی پڑ سکے اور ہم عربی زبان کے سلسلے میں ان کی آرا، نظریات اور خدمات سے واقف ہو سکیں۔

حواشی

۱ علامہ حالی: حیات جاوید۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء (طبع سوم) ص ۵۶-۵۵

۲ ایضاً ص ۶۴

۳ ایضاً ص ۷۰-۶

۴ ایضاً ص ۶۴

۵ ایضاً ص ۶۴

۶ حالی نے حیات جاوید میں ایسے گیارہ مسائل کا ذکر آیا ہے جن میں سرسید نے سلف سے مکمل طور پر اختلاف کیا تھا (ص ۵۳۴-۵۳۲) ساتھ ہی ان اہم مسائل کا تذکرہ بھی کیا ہے جن میں سلف میں سے کچھ لوگ سرسید کے ہم مسلک تھے۔

۷ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی: مقالات سرسید، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۸۴ء، طبع دوم جلد اول ص ۲۸-۲۷

۸ سرسید کے عربی مصادر کی تعداد اچھی خاصی ہے جن میں تقریباً ہر موضوع کی اہم کتابیں شامل ہیں۔ انشاءاللہ ان کے عربی مصادر کا جائزہ دوسرے مضمون میں لیا جائے گا۔

۹ حیات جاوید ص ۱۰۸

۱۰ مقالات سرسید۔ جلد اول ص ۲۰۱

۱۱ تفصیل کے لیے دیکھیے مقالات سرسید جلد دوم مضمون "تفسیر السموات" ص ۱۱۶-۱

۱۲ یہ تحقیق سرسید نے سورہ فیل کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کی ہے جو جمہور مسلک کے خلاف ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے متعلق جو روایات وارد ہوئی ہیں وہ صرف من گھڑت قصوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس سورہ کے ہر ہر لفظ کے معانی بالکل الگ بتائے ہیں جیسے "طیرا" کے معنی "غول" کے بتائے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے۔ مقالات سرسید جلد دوم مضمون "اصحاب الفیل کا واقعہ"۔

۱۳ سرسید جنوں کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے قرآن میں وارد آیات کی دور از کار تاویلیں بیان کی ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے مقالات سرسید جلد دوم مضمون "الجن والجان علی ما فی القرآن۔ ص ۱۹۶-۱۵۰

۱۴ ایضاً ص ۱۴۵

۱۵ ایضاً ص ۱۰۴

۱۶ه مقالات سرسید۔ جلد دوم مضمون "جن و جنات کی حقیقت قرآن" ص ۱۷۵

۱۷ه ایضاً ص ۷۸-۱۷۷

۱۸ه حیات جاوید۔ ص ۵۲۸

۱۹ه مقالات سرسید۔ جلد اول۔ ص ۲۵۰ (مضمون: سیر ارضین)

۲۰ه مقالات سرسید جلد دوم ص ۷۴-۷۳

۲۱ه ایضاً ص ۷۶-۷۵

۲۲ه مقالات سرسید جلد اول ص ۴

۲۳ه ایضاً جلد اول ص ۹

۲۴ه ایضاً ص ۳

۲۵ه ایضاً ص ۱۹۸۔

۲۶ه حیات جاوید ص ۷۶۶ ۲۷ه ایضاً ص ۷۷۱ ۲۸ه

۲۹ه یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جو بخاری و مسلم میں ابو ذر سے مروی ہے کہ حضور صلی فرمایا: ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علیٰ ذٰلک الا دخل الجنۃ۔ انھوں نے یہ سن الفاظ عرض کیے "وَاِنْ زنی وان سرق" آپؐ نے فرمایا "وان زنیٰ وان سرق" اور تیسری ساتھ یہ بھی فرمایا کہ "علیٰ رغم انف ابی ذر" حیات جاوید۔ ص ۷۶۴

۳۰ه مقالات سرسید جلد اول۔ ص ۶۵-۶۴ (مضمون خلافت و خلیفہ)

۳۱ه ایضاً جلد اول ص ۲۷۷۔ ۳۲ه ایضاً جلد اول ص ۸

۳۳ه ایضاً جلد اول ۶۴-۲۶۱ ۳۴ه ایضاً جلد دوم ص۔

۳۵ه ایضاً جلد دوم ص ۱۶۰ ۳۶ه ایضاً جلد دوم ص

۳۷ه اس کی دلیل میں ہم حیات جاوید سے یہ واقعہ پیش کر سکتے ہیں جو غالباً لندن جاتے وقت تھا۔ حالی نے بیان کیا تھا۔ "ایک بہت بڑے دین دار عالم نے جو ترکستان (یعنی ترکی) کے ایسا سخت مذہب تھا کہ باوجود میرے اصرار کے فوٹو گروپ کی تصویر کھنچوانے سے انکار کیا گردن مروڑی مرغی کے مجھ سے کہا۔ ھذا قصور النصاریٰ لا باس لنا فی اکلہ، قد احل اللہ الکتاب"۔ دیکھیے حیات جاوید ص۔ ۷۷۳۔

۳۸ه ایضاً؛ ص ۵۵۶ ۳۹ه ایضاً ص ۶۴۲

۴۰ه مقالات سرسید۔ جلد اول ص ۴۰۔ ۴۱ه ایضاً ص ۲۰۲

۴۲ه ایضاً جلد اول ص ۳۰۲-۳۰۱

۴۳ه ایضاً جلد اول ص ۸۱-۳۷۸

نواب محسن الملک

مذہب و علم

اکثر مسلمان مذہبی باتوں میں عقل کو دخل دینے یا مذہبی مسائل کو علم اور فطرت سے مطابق کرنے میں تعجب کرتے ہیں اور جو لوگ معقول و منقول یا مذہب و فطرت کی تطبیق میں کوشش کرتے ہیں ان کو مذہب کا حامی سمجھنے کے بدلے مذہب کا دشمن جانتے ہیں اور ایسے لوگوں کی کوششوں پر حیرت زدہ ہو کر پوچھتے ہیں کہ کیا خدا اور رسول کے فرمانے کے بعد حقیقت اور سچائی کے دریافت کرنے کی کچھ ضرورت باقی رہتی ہے ـــــ یا خدا اور رسول کے کلام کی تصدیق کے لیے کسی علم اور فطرت کی ضرورت ہے۔ ایسی ضرورت کا خیال کرنا خود دین میں شک کرنا ہے اور شک بے دینی اور کفر کا پہلا زینہ ہے۔ اس زمانے میں یہ اعتراض زیادہ تر سید صاحب پر کیا جاتا ہے جنھوں نے مذہب کو فطرت سے ملانے کا مشکل کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ اور ان کی تفسیر اور دیگر مذہبی مضامین بہت تعجب اور افسوس بلکہ نفرت سے دیکھے جاتے ہیں اور مجھے جب سے کہ میں نے ان کی تفسیر کے متعلق لکھنے کا ارادہ کیا ہے لوگ ان کا مخالف سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ چند لفظوں میں مذہب کو علم سے مطابق کرنے کی ضرورت اور جو فرق میرے اور سید صاحب کے خیالات میں ہے اس کی کیفیت بیان کروں۔

جو لوگ مذہب کو صرف مذہبی دلائل اور مذہبی اسناد سے جانچتے ہیں بلکہ وہ لوگ جو مذہبی مسائل میں دلیل اور سند کا خیال تک نہیں کرتے بلاشبہ ان کے عقائد نہایت مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں اور جہالت ان کے دین کی بڑی محافظ ہوتی ہے۔ مگر ایسے عقائد در حقیقت رسمی اور تقلیدی ہوتے ہیں اور گو ایک جاہل شخص کے لیے در صورت سچ ہونے اس مذہب کے جس کو وہ مانتا ہے بلحاظ نتیجے کے مفید ہوں، مگر ایسا شخص نہ اپنے مذہب کی اشاعت کر سکتا، نہ دوسروں کو اپنے مذہب کی دعوت دے سکتا، نہ مخالفین کے اعتراضات کو دور کر سکتا ہے۔ ایسا شخص غالباً ناجی ہو مگر ہادی اور حامی دین نہیں بن سکتا۔ اور مذہب اسلام چونکہ تمام دنیا کے لیے ہے اور ہر قسم اور ہر درجہ اور ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتی ہم مسلمانوں پر فرض ہے، اس لیے اسلام کی اشاعت کی خواہش رکھنے والے مسلمان پر لازم ہے، کہ وہ اپنے زمانے کے مختلف خیالات کے لوگوں کے موافق ان کو اسلام کی دعوت دے، اور موجودہ زمانے کی حالت دیکھ کر اسلام کی حقیقت ثابت کرے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جب خدا نے ہدایت کے لیے مامور فرمایا، تو صرف ایک ہی طریقہ پر اسلام کی طرف بلانے کا حکم نہیں دیا بلکہ ہر شخص کے خیال اور حالت کے موافق جدی جدی طور سے دعوت کرنے کے طریقے بتائے، اور ایک آیت میں اس کو بیان کر دیا وہ آیت یہ ہے ـــــ "ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ و جادلھم بالتی ھی احسن"۔ یعنی اپنے پروردگار کی راہ پر لوگوں کو حکمت

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ا کتوبر ۱۸۹۵

سے یا اچھی نصیحت [illegible] پلانا چاہیے اور جو لوگ کہ جھگڑالو ہیں ان کو انھیں کے طور پر اچھی طرح سمجھانا چاہیے۔ پس خدا کے ارشاد کے موافق پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حکمت اور موعظت اور مجادلہ تینوں طریقوں سے دعوت اسلام کے اصول قائم کیے، اور تینوں قسم کے آدمیوں کی سمجھ کے موافق خدا نے اپنا کلام نازل فرمایا، اور اپنے کلام معجز نظام میں ہر چیز کو اس طور پر بیان کیا کہ ہر شخص اپنے اپنے خیال و مذاق کے موافق اس سے مستفید ہو سکے۔ اسی اصول کو حامیان دین اور حامیان ملت نے ہمیشہ پیش نظر رکھا، اور ہر زمانے کے خیالات کے موافق قرآن کے معنی بیان کیے۔ جس زمانے میں علم کا چرچا نہ تھا، لوگوں کے دل علمی خیالات سے صاف تھے، ان کو ان ہی کے خیال کے موافق ظاہری باتوں کے سمجھانے پر قناعت کی۔ جب وہ زمانہ آیا جس میں حکمت و فلسفہ کا چرچا ہوا، یونانی علوم شائع ہوئے، اس وقت حکمائے اسلام نے خدا کی تعلیم کے موافق علم حکمت سے کام لیا، اور عالموں اور حکیموں کو علم و حکمت سے سمجھانا شروع کیا اور خدا کے کلام کے دقائق و حقایق اور نکات اسرار بیان [illegible] کا کام اپنے ذمہ لیا، اور مذہب اسلام کو علم و حکمت کے مطابق ہونا ثابت کیا۔ اگر بزرگان دین پہلے ہی طریقے پر قائم رہتے، اور فلسفہ جاننے والوں کو عرب و حجاز کے بدویوں اور عامیوں کی طرح ظاہری باتوں کے سمجھانے پر کفایت کرتے، تو غالباً بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا، اور اسلام ان کی نگاہوں میں جہالت کا مجموعہ سمجھا جاتا۔ اس زمانے میں جو ترقی علم سائنس نے کی ہے اور جو خوفناک اثر اس کا مذہب پر ہو رہا ہے وہ گزشتہ زمانے سے بہت زیادہ ہے، اور اس زمانے میں مذہب و علم کی تطبیق کی ضرورت اس زمانے سے بہت بڑھ کر ہے۔ جو لوگ اس زمانے کی علمی ترقیوں سے بے خبر ہیں ان کو اس کی ضرورت اور جو مشکلات اس کام میں اس وقت درپیش ہیں اس کا سمجھانا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس زمانے میں اسلام کی حمایت صرف اسی ایک بات پر منحصر ہے کہ اس کا سائنس و فطرت کے مطابق ہونا ثابت کیا جاوے۔ مگر اس زمانے میں اس طرح پر حمایت اسلام کی بہ نسبت گزشتہ زمانے کے نہایت مشکل ہے۔ اگلے زمانے میں گو فلسفہ و حکمت نے ترقی کی تھی مگر اس وقت علم محدود اور نظری تھا، مسائل اس کے مشتبہ اور موہوم تھے۔ اس زمانے کے فلسفہ کا رجحان روحانیت کی طرف تھا جس کو مذہب سے ایک نوع کی مناسبت تھی۔ علاوہ بریں مذہب کی حمایت کے لیے حکومت موجود تھی۔ اس لیے مذہبی عقائد کو علم کا چنداں خوف نہ تھا، اور نہ ان کی حفاظت زیادہ مشکل تھی۔ اسلام کا بہت بڑا وسیع دائرہ علم کے صدمہ سے اس لیے محفوظ رہتا تھا، کہ علم کی رسائی وہاں تک ہو ہی نہ سکتی تھی۔ اور وہ چھوٹا حلقہ جہاں حکمت و فلسفہ کا گزر ہوتا تھا علمی مسائل کے غیر محقق ہونے سے کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ کر لیتا تھا۔ اس پر بھی اگر مذہب و علم میں جھگڑا ہوتا تو مذہب کی حمایت کے لیے ایسے سامان اور ذریعے تھے کہ علم کو پیچھے ہٹنے کے سوا دوسرا چارہ نہ تھا۔ علم مذہب کے مقابلہ سے کبھی یہ کہہ روک دیا جاتا، کہ امر مکاشفہ سے متعلق ہے ایسا سوال ہی کرنا ناجائز ہے اور کبھی یہ کہہ کر چپ کر دیا جاتا کہ یہ خدا کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے اس کا فاش کرنا ممنوع ہے۔ اس پر بھی اگر کوئی نہ مانتا تو خدا کی زمین ایسے ملحد کے وجود سے پاک کر دی جاتی۔ مگر اس زمانے میں نہ علم محدود ہے اور نہ وہ نظری و خیالی ہے، اور نہ حکومت اس کی مدد کے لیے موجود ہے، بلکہ اس کی حدود روز بروز وسیع ہوتی جاتی ہیں اس کی بناء مشاہدہ پر قائم ہو رہی ہے، نہ مذہبی عقائد پر بحث کرنے والے کی تسلی مکاشفہ سے ہو سکتی ہے، نہ ھذا سر من اسرار الربوبیۃ کہہ کر کوئی روکا جا سکتا ہے اور نہ خدا کی پاک زمین شک کرنے والے کے نجس وجود سے پاک کی جا سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ یا تو ہر مذہبی عقیدہ کی بنیاد علمی مسائل کی طرح تحقیق پر قائم کی جاوے یا مذہب

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ۲ کتوبر ۱۹۹۵ء

۴۰ کیلومیٹر کی اونچائی تک نظر آجاتے ہیں۔

تباہ کن دھماکے۔

شہاب ثاقب جب زمین کی فضا میں داخل ہوتے ہیں تو اس سے دھماکہ پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ انسانی میں سب سے بڑا دھماکہ جو شہاب ثاقب سے پیدا ہوا وہ روس کے علاقے سائبیریا میں ۳۰ جون ۱۹۰۸ء کو رونما ہوا۔ اس عظیم دھماکے سے ایک ہزار مربع کیلومیٹر کا علاقہ بُری طرح متاثر ہوا۔ یہ دھماکہ اس قدر خوفناک تھا کہ ایک آدمی جو ۶۰ میل دور کھڑا تھا زمین پر گر پڑا اور پیدا ہونے والی SHOCK WAVES سے وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس واقعہ کو TUNGUSKA EVENT کہا جاتا ہے۔ دھماکے کے ہونے کی اصل وجہ ایک ۳۰ میٹر چوڑی چٹان تھی جو فضا میں ۱۰ کیلومیٹر کی بلندی میں یک لخت پھٹی۔ اس کے پھٹنے سے جو تباہی پیدا ہوئی وہ ۱۰ میگاٹن کے ایک ہائیڈروجن بم کے پھٹنے کے برابر تھی۔ کہتے ہیں کہ ۳۰ میل کے علاقے میں موجود تمام درخت جھلس کر راکھ ہو گئے تھے۔

زمین میں داخل ہونے والے شہاب ثاقب اور ہونے والے واقعات کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے شہاب ثاقب صحراؤں میں یا سمندر میں یا زمین کے بنجر و برفانی علاقوں میں گرتے ہیں جہاں آبادی زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ مانٹریال کے قریب جو شہاب ثاقب گرا تھا اس کو قریبی شہروں میں رہنے والے لوگوں نے بھی دیکھا تھا۔ اس ستارے کے گرنے سے جو فضاء میں ارتعاش پیدا ہوا وہ ۲۰۰ کیلومیٹر دور شہر اٹاوہ میں محسوس کیا گیا۔ ستارے کے گرنے کے بعد جو فضا میں سفید دھواں دھار لکیر نمودار ہوئی تھی وہ فضا میں ۲ منٹ تک قائم رہی تھی۔

ستارے کی ملکیت۔

جب شہاب ثاقب کسی کی زمین یا گھر کے اوپر گرتا ہے تو وہ اس کی ملکیت بن جاتا ہے۔ دنیا میں جو لوگ ایسے آسمانی پتھر اکٹھے کرتے ہیں، وہ بعض دفعہ کوئی بھی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ بعض ستارے قیمتی دھاتوں سے بنے ہوتے ہیں۔ کینیڈا کی وفاقی حکومت کے ادارے جیولوجیکل سروے آف کینیڈا نے مانٹریال کے قریب گرنے والے ستارے کو ۱۰۰۰۰ ڈالر ادا کر کے خرید لیا تھا اور اب اس ستارے کو National Meteriot Collection of Canada میں شامل کر لیا گیا ہے جہاں پہلے ہی ۷۰ ایسے ستاروں کے نمونے محفوظ ہیں۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ شہاب ثاقب کائنات کے سب سے زیادہ پرانے پتھر ہیں ان کی اکثریت مریخ کے سیارے اور عطارد (Mars) Jupiter کے سیارے کے درمیان پائی جانے والی Asteroid Belt کے ستاروں کے Junkyard سے آتی ہے۔ ماہرین فلکیات ان ستاروں کا گزشتہ دوسو سالوں سے عرق ریزی سے مطالعہ کرتے آرہے ہیں۔ ان ستاروں میں سے بعض آئرن اور نکل (nickel) کی دھاتوں سے بنے ہوتے ہیں مگر ان کی اکثریت نوّے فی صد پتھر سے بنی ہوتی ہے۔ دنیا میں آج تک تین ہزار قسم کے شہاب ثاقب دریافت ہوئے ہیں ان میں سے ۵۰ قسم کے کینیڈا میں پائے جاتے ہیں۔

عجیب و غریب حقائق۔

- نیویارک کے ایک عجائب گھر میں ایک شہاب ثاقب کا وزن ۳۱ میٹرک ٹن ہے۔ اس کو مشہور و معروف امریکی رابرٹ پیری (Robert Peary) نے گرین لینڈ کے ملک میں تلاش کیا تھا۔ ۱۸۹۴ء

تہذیب الاخلاق علی گڑھ دسمبر ۱۹۹۵ء

لیسا ہی بہادر اور تجربہ کار ہو تن تنہا کامیاب نہیں ہو سکتا، اکیلے ان سے ایسے بڑے جہاد میں کامیاب ہونے کی کون امید ہے۔ ان سے غلطیاں بھی ہوں گی، ان کی رائیں خطائیں بھی کریں گی، مگر چونکہ نیت ان کی نیک اور خالصاً للہ ہے اس لیے ا غلطی بھی دوسروں کے صواب سے بہتر ہے۔ میں تو ان کے اس ارادہ ہی کی تعریف کرتا اور اپنے آپ کو ان کے انصار اور ا میں سمجھتا ہوں۔ میں نے ان کی تفسیر کی نسبت جو اپنے خیالات ظاہر کرنے کا ارادہ کیا ہے وہ درحقیقت ایک طرح پر ان کی مد اور متابعت ہے نہ مخالفت۔

میں اس امر میں بالکل ان سے متفق ہوں، کہ مذہبی مسائل علمی نظر سے دیکھے جائیں، اور جس طرح علمی مسائل کی چھٹنی کی جاتی ہے مذہبی مسائل کی بھی اسی طرح تحقیق کی جاوے۔ اور مذہب کا فطرت کے مطابق ہونا (جیسا کہ درحقیقت ہے) ثابت کیا جاوے۔ یہی سچی حمایت اسلام کی ہے، اور یہی اصلی طریقہ اسلام کی حفاظت کا ہے۔ جو لوگ مذہب کی صرف مذ دلائل سے تائید کرتے ہیں، اور سائنس کے محققہ مسائل کو بے ہودہ اور خیالی دلیلوں سے غلط کہتے ہیں، وہ میرے نزدیک اس کے حامی نہیں ہیں بلکہ اس کے نادان دوست اور درحقیقت دشمن ہیں۔ میری مخالفت سید صاحب سے اس لیے نہیں ہے کہ اصول مذہب کی تطبیق کا فطرت سے انھوں نے اختیار کیا ہے اسے میں غلط جانتا ہوں یا قوانین فطرت کو قابل تبدیل سمجھتا ہو۔ بلکہ میرا اختلاف صرف اس میں ہے کہ جن باتوں کو وہ قانون قدرت سے خارج سمجھتے ہیں، میرے نزدیک وہ قانون قدرت میں داخل ہیں، اور اسی امر کو میں اپنی آئندہ کی تحریروں میں دکھانا چاہتا ہوں۔

کرامت حسین

ہربرٹ اسپنسر کی فلاسفی

ایک زمانہ وہ تھا کہ سلطنت لوگوں کو بتاتی تھی کہ ان کے مذہبی عقیدے کیا ہونے چاہئیں اب انگلینڈ میں پوری مذہبی آزادی ہے جس کے جی میں جو مذہب آوے اختیار کرے سلطنت کو کوئی دخل نہیں گو سلطنت نے بہت زور لگائے لیکن رفتہ رفتہ اہل انگلستان نے چند قرنوں میں جیسی مذہبی آزادی حاصل کی ہے ویسی ہی گفتار کی بھی آزادی حاصل کرلی ہے اس حد تک کہ دوسروں کو ستانا منظور نہ ہو ہر فرد مختار ہے جو چاہے کہے اس ملک والوں نے اس بات کی بھی آزادی حاصل کرلی ہے کہ جس قوم کے ساتھ چاہیں تجارت کریں غرض کہ سیاست کی نسبت انگلینڈ میں جو عقیدے اب شائع ہیں ان میں اور گزشتہ عقیدوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے فقط اسی میں نہیں کہ قوت سلطنت کن شخصوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیے بلکہ اس بات میں بھی کہ سلطنت کے اختیارات کی حد کیا ہے کن باتوں میں سلطنت دست اندازی کرسکتی ہے اور کن باتوں میں اس کو دست اندازی کا حق نہیں ہے۔

سیاست کے عقیدوں کا انقلاب یہیں نہیں تھم گیا ابھی تک جو انقلاب ہم نے بتا ئے وہ تو اب عام طور سے جمہور میں شائع ہیں مگر جمہور کے علاوہ انگلینڈ میں ایک گروہ اور بھی موجود ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ سلطنت کے اختیاروں کا دائرہ اب بھی بہت وسیع ہے اس کو اور بھی تنگ کرنا چاہیے وہ کہتے ہیں کہ جب یہ بات طے ہو چکی کہ سلطنت رعایا کی بہبود کے لیے ہے نہ یہ کہ رعایا سلطنت کی خدمت کو جیسا کبھی عقیدہ تھا تب جو جو تفریعیں اس کلیہ سے نکلیں ان سب پر عمل کرنا چاہیے وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے افعال و اقوال میں اس حد تک پوری آزادی ہونی چاہیے جس حد تک وہ دوسرے شخص کے اقوال و افعال کی پوری آزادی میں رخنہ نہ ڈالے اور سلطنت کو ہرگز اختیار نہ ہونا چاہیے کہ کسی طور سے فردوں کی آزادی مذکور میں فرق ڈال سکے اگر سلطنت اس آزادی میں کمی کرنا چاہے تو اس کا بڑا ظلم ہے نہ تو سلطنت کو کسی ایسے قول و فعل سے ممانعت کرنا چاہیے جو حیطہ مذکور کے اندر ہو یا کسی ایسے قول و فعل کا حکم دینا چاہیے جو اس سے باہر ہو اور آزادی مذکور کے قائم رکھنے کے لیے جتنا خراج ناگزیر ہے اس سے زیادہ خراج بھی ہرگز نہ لینا چاہیے۔

گروہ مذکور کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سلطنت کا اصلی کام یہی ہے کہ ایسا انتظام کرے جس سے ہر فرد کو اپنے افعال و اقوال میں اس حد تک کہ دوسروں کے افعال و اقوال سے مزاحمت نہ کرے کامل آزادی ہو نہ تو رعایا ایک دوسرے کی آزادی میں خلل انداز ہو سکے نہ کوئی باہر کا دشمن قوم یا فردوں کی آزادی میں رخنہ پیدا کرسکے۔ اس کام کے سوا سلطنت کا اور کچھ کام نہیں

ہے اگر وہ کچھ اور کرنا چاہے تو ظلم ہے یا غلطی۔ اس گروہ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اب تک جتنی ترقی تہذیب میں ہوئی ہے
ہی رعایا کی آزادی بڑھی ہے اور اتنا ہی سلطنت کا اختیار گھٹا ہے اور اس مناسبت سے قیاس میں آتا ہے کہ وہ بہترین س
حالت وہ ہوگی جس میں کل رعایا کی شخصی آزادی اکثر اور سلطنت کا اختیار بقدر امکان اقل ہو ہر فرد کو اس حد تک پوری آزاد
جس حد تک وہ باقی فردوں کی پوری آزادی میں دراندازنہ ہو اور سلطنت کا بس اتنا ہی کام رہ جاوے کہ وہ اس حالت کو قائم رکھے

بالجملہ مختلف وقتوں اور ملکوں میں سلطنت کے عقیدے نے کیسے پلٹے کھائے ہیں۔ بادشاہوں کی اصل میں، ان
اختیاروں میں، ان کے کام میں عقیدے نے کیا کیا رنگ بدلا ہے دھملاآس کی وہی جنسیں ہیں جو ہم بیان کر آئے ہیں ا
ایک جنس میں بے شمار نوعیں ہیں جن کا تفصیل سے بیان کرنا بیکار ہوگا۔

کیا حیرت انگیز نہیں ہے کہ کہاں تو ابتداء میں بادشاہ اللہ تھا پھر جزء اللہ ہوا پھر ذریۃ اللہ پھر ظل اللہ پھر خلیفۃ اللہ
خلیفۃ الناس ہے۔ ابتدائی اور انتہائی عقیدے میں وہی تفاوت ہے جو مشرق سے مغرب تک یا سیاہی سے سپیدی تک یا سید ھی
سے دائرہ تک۔ جب شاہی ماہیت میں ایسے انقلاب ہوں تو ضروری تفریع ہے کہ شاہی حقوق اور احکام کے رتبوں میں بھی مت
انقلاب ہوں۔ جب بادشاہ قادر توانا ہوگا تب بندوں کے جان و مال بھی اسی کے ہوں گے یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید اور اس
احکام قضا شیم ہوں گے۔ کسی بندے کے دل میں سرتابی کا خدشہ بھی نہ آتا ہوگا اور جیسے ہی بادشاہ نے لوگوں کے دلوا
عرش الٰہی سے خلافۃ الناس کے تخت کی جانب اترنا شروع کیا ویسا ہی اس کی قدرت اور حکومت کی وقعت گھٹنے لگی یا تو
قدرت مطلقہ تھی یا اب صرف اتنی قدرت ہے جتنی رعایا بحیثیت لوکل اس کو سونپ دے اور یا تو اس کے احکام پاک اور بے
خطا اور واجب العمل تھے یا رعایا کی مرضی سے بنائے ہوئے چند اصطلاحی قاعدے رہ گئے جن میں سدا خطا کا احتمال ہے اور
وقت ترمیم ہو سکتے ہیں۔

ماہران فن سیاست کا ایک گروہ اس بات کا معتقد ہے کہ صنعت تشریع یعنی رعایا کے لیے قانون بنانے کا اختیا
سلطنت کی ذاتیات میں سے ہے نہ ایسی صنعت ہے کہ رعایا کی اصطلاحی تفویض سے سلطنت کو مل جاوے۔ سلطنت تو بر
دستور العمل کی پابندی کرا سکتی ہے جو قومی زندگی اور بہبود کے اسباب سے مستنبط ہو مالی کو بالذات یہ حکومت نہیں ہو سکتی
ایسے قاعدے بناوے جن سے گلاب خزاں میں پھولے، آم چلے کے جاڑوں میں پھلے، سبزہ دھونی دینے سے لہلہاوے، در
پتھر مارنے سے بالیدہ ہوں۔

باغ کے پھولنے پھلنے اور ہرا بھرا رہنے کے لیے قانون قدرت نے خاص اسباب مقرر کر دیئے ہیں ان اسباب سے
کے درست رکھنے کا ایک دستور العمل مستنبط ہوتا ہے باغبان کو اگر وہ باغ کو شاداب رکھنا چاہے تو اس دستور العمل پر چلنا لازم
اپنی طرف سے دستور العمل بنا دینا نہ تو باغبان کی ذاتیات میں سے ہے نہ ایسی قدرت ہے جو درختوں کے سونپ دینے سے ا
سونپ سکتے ہوں باغبان کو حاصل ہو سکتی ہے ایسا ہی قوم کے زندہ اور خوش حال رہنے کے لیے چند قدرتی اسباب کا موجو
لازم ہے اور ان قدرتی اسباب میں فکر کرنے سے اس بات کے لیے ایک دستور العمل مرتب ہوتا ہے کہ اگر قوم زندہ اور خوش
رہنا چاہے تو باہمی برتاؤ میں قوم کے فردوں کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے مالی کی طرح سلطنت کا بس اتنا ہی کام۔
قانون فطرت کے اس دستور العمل پر جو قومی زندگی اور بہبود کے اسباب سے مستنبط ہوتا ہے عمل کرا دے ایسے دستور العم

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۵ء

عمل کرا دینے کے سوا نہ تو سلطنت کو بالذات تشریع کا اختیار ہے نہ یہ اختیار رعایا کے سونپ دینے سے اصطلاحاً سلطنت کو حاصل ہو سکتا ہے۔ سلطنت کی اصل واختیار و کام کی بابت جو مختلف عقیدے ہیں یا تو ان میں سے ایک بالکل صحیح ہے اور باقی بالکل غلط ایسا ہے کہ ایک بھی محض صحیح نہیں ہے لیکن سب میں واقعیت سے کچھ لگاؤ ہے غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ شق اخیر یعنی ہر ایک عقیدے کو واقعیت سے فی الجملہ لگاؤ ہونا صحیح ہے۔

سلطنت کی نسبت جو عقیدے کی جنسیں بیان ہو چکی ہیں وہ کیسی ہی مختلف بلکہ متناقض کیوں نہ معلوم ہوں مگر ان سب کا دار مدار اس واقعی اصل پر ہے کہ قوم کے زندہ اور فارغ البال رہنے کے لیے لازم ہے کہ اس قوم کے فردوں کی شخصی رغبتیں قومی ضرورتوں کی گونہ مطیع ہوں کوئی فرد اپنے شخصی اختیار سے ایسا کام نہ کر سکے جو قومی زندگی کے خلاف ہو اور جس سے قوم کو ضرر پہنچے اس میں نہایت اختلاف ہے کہ شخصی رغبتیں کسی شخص کی مطیع ہوں تا کہ کہا جا سکے وہ قومی ضرورتوں کی مطیع ہیں۔ اس میں بھی بہت اختلاف ہے کہ کیوں مطیع ہونا چاہیے آیا اس وجہ سے کہ مطاع کو فی ذاتہ اطاعت کا حق ہے یا قوم کے باہمی اتفاق نے اس کی اطاعت کو واجب کر دیا ہے یا اس وجہ سے کہ قومی زندگی کے اسباب کا تقاضہ ہے کہ اس کی اطاعت اور ان میں بھی اختلاف ہے کہ شخصی رغبتیں قومی ضرورتوں کی کس حد تک مطیع ہوں مگر شخص مطاع اور باعث اطاعت اور درجہ اطاعت سے قطع نظر کر کے اس پر سب کو اتفاق ہے کہ شخصی رغبتوں کو کسی نہ کسی کا کسی نہ کسی وجہ سے کسی نہ کسی درجہ تک ضرور مطیع ہونا چاہیے۔ اس وحشی میں جو اپنے بادشاہ کو اپنا خدا جانتا ہے اور اس کو اپنی جان و مال کا مالک حقیقی تصور کرتا ہے اور اس منکر سلطان میں جس کا عقیدہ یہ ہے کہ سلطنت کو کسی طور کا حق ہی نہیں ہے نہ ذاتی نہ رعایا کا دیا ہوا اور سلطنت کسی طرح سے اس منکر سلطنت کی شخصی آزادی میں دست اندازی نہیں کر سکتی۔ اتنا ہی تفاوت ہے جتنا نقیضوں میں ہوتا ہے۔ تاہم دونوں اس بات کو مانتے ہیں کہ شخصی آزادی کی حد ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی گو اس حد کا سبب وحشی کے عقیدے میں بادشاہ کی مرضی ہے اور منکر سلطنت کے دل میں پوری آزادی کے لیے تمام شخصوں کا یکساں استحقاق۔

سلطان احمد صدیقی (علیگ)

سر سید کی شاعری

سر سید کو بحیثیت شاعر کوئی نہیں جانتا۔ ان کی شاعرانہ حیثیت ایک ایسی حقیقت ہے جو اب تک منظر عام پر نہیں لا گئی۔ سر سید کی ان کے زمانے میں اس قدر موافقت اور ساتھ ہی ساتھ شدت سے مخالفت میں مضامین لکھے گئے، کسی میں ان شاعری کا ذکر نہیں آتا۔ تمام "تذکرے" اس بارے میں خاموش ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی کامل و مکمل سوانح "حیات جاوید" بھی اس چیز پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔ اس کا سب سے بڑا سبب غالباً یہ ہو سکتا ہے کہ اس عظیم المرتبت شخصیت کی دوسری۔ نظیر خصوصیتیں اس قدر اہم اور نمایاں تھیں جن کے آگے شاعری کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی۔ دوسرے سر سید نے شاعری دوسروں کی طرح اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ چنانچہ ان کے ایک ہم عصر تذکرہ نویس نے لکھا ہے کہ "شاعری دون مرتبۂ اوست" جو بالکل درست ہے۔

ان کی اعلیٰ دماغی قابلیتوں کی موجودگی میں یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان کی بلند حوصلہ طبع اس مذاق لطیف کی طرف تو نہ کرتی۔ اس کے علاوہ اس زمانے کا طرز تمدن، شرفا کا طریقہ معاشرت اور اردوئے معلیٰ سے سر سید کا خاندانی تعلق ایسے امور ہیں ان کے شاعرانہ مذاق کی ضمانت کے لیے کافی ہیں۔ پھر سر سید دہلی میں پیدا ہوئے جہاں کے ہر گلی کوچے میں شعر و شاعری کا چ رہتا تھا۔ سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ سلطنت و حکومت کا دائرہ بہت محدود ہو گیا تھا۔ تاخت و تاراج کی وجہ سے شا خزانے خالی ہو چکے تھے۔ خاندان مغلیہ کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر خود بڑے اچھے شاعر تھے اور شاعروں کے قدر دان بھی۔ از دربار اکثر بزم سخن کا منظر پیش کرتا تھا۔ غالب۔ ذوق۔ مومن۔ احسان وغیرہ اپنی شاعری کی آب و تاب سے دہلی کی رونق بڑ رہے تھے۔ اس لیے سب پر شاعری کا رنگ غالب آ گیا تھا اور اس عہد کے شرفا اور امرا میں شاعری منجملہ لوازمات شرافت و امار سمجھی جاتی تھی۔

ایسے ماحول میں پیدا ہو کر اور سانس لے کر سر سید کے لیے کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس عام کلیہ سے مستثنیٰ رہتے۔ ان دل جذبات کا دریائے مواج تھا۔ ان کے کارہائے نمایاں انہی جذبات کی لہریں تھیں۔ عنفوان شباب میں رنگین صحبتیں بھی تھیں۔ ہر وقت سوسائٹی میں شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ ان سب باتوں کا اقتضا تھا کہ وہ شاعر بھی ہوں، چنانچہ ان کی اردو فارسی نظمیں ہمارے دعوے کی موید ہیں۔

سر سید کی بسم اللہ دہلی میں بڑی دھوم دھام سے وہاں کے مشہور اور مقدس بزرگ حضرت شاہ غلام علی صاحب نے پڑھائی تھی جو حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور جانشین تھے، اس پر سر سید ہمیشہ ناز کرتے تھے چنانچہ اس

انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے۔

بہ مکتب رقم و ہمو ختم اسرار یزدانی　　زفیض نقشبند وقت جان جان جانانی

اسی طرح سے ان کا ایک تغزل کا شعر ہے

بتوں پہ دل و دیں فدا کر رہے ہیں　　بنارس میں یاد خدا کر رہے ہیں

یہ شعر اس وقت کا ہے جب آپ بنارس میں منصف تھے۔ فارسی میں ان کی ایک غزل مشہور ہے جس میں ان کے مذہبی جذبات کا زبردست تموج ہے۔

فلاطون طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم　　مسیحا رشک می دارد بہ درمانے کہ من دارم

خدا دارم دل بریاں ز عشق مصطفیٰ دارم　　ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

ز جبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم　　ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم

فلک یک جلوۂ خورشید دارد باہمہ شوکت　　ہزاراں ایں چنیں دارد گریبانے کہ من دارم

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۷۰-۱۸۶۹ء میں موزوں ہوئے ہوں گے کیونکہ یہی زمانہ خطبات احمدیہ کی تالیف کا تھا یہ کتاب عشق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوش و جذبے میں لکھی گئی ہے۔

انہوں نے جب ۴۵-۱۸۴۴ء میں آثار الصنادید تصنیف کی تھی تو اس کے دیباچہ میں سر ٹامس مٹکاف کی تعریف میں اٹھاون اشعار کی ایک مثنوی لکھی تھی۔ ابتدا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ممدوح زمانہ را ستائم　　صد در قد وصف او کشائم

بندم ز گل بہار اوصاف　　گلدستہ بدست طبع وصاف

آرم بحضور بارگاہش　　ریزم گل صد ثنا براہش

از بحر سخن گہر بر آرم　　بر فرق سرش گہر ببارم

ہر لولوئے شاہوار وصفش　　ہر گوہر آبدار وصفش

در سلک کشم بحسن و ترتیب　　ترتیب دہم بہ حسن و تہذیب

مضراب زنم بتار گفتار　　صد نغمہ بر آورم ازیں تار

وز ہر بن و مو ترانہ گویم　　صد رنگ بہر ترانہ جویم

در جام سخن مئے معانی　　ریزم بہ ہزار کامرانی

ہر عقدہ کہ افتدم بہر کار　　بکشائم ازیں شگرف اسرار

ان اشعار میں دیکھیے کس قدر سادگی، سلاست اور روانی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا آہستہ آہستہ بہتا چلا جارہا ہے۔

جب علی گڑھ میں ۱۸۶۴ء میں ہز آنر ڈریمنڈ نواب لفٹیننٹ گورنر سائنٹیفک سوسائٹی کا سنگ بنیاد نصب کرنے کے لیے آئے تو رسم ادا کرنے کے وقت سرسید نے تقریر سے پہلے ان اشعار میں اپنے جذبات ادا کئے۔

ہم غریبوں کی یہ قسمت ہے کہ آپ آئے یہاں
ورنہ شاہوں کو گداؤں سے کوئی ہے التیام

آپ کی بندہ نوازی سے ہوئی دولت نصیب
آپ کے تشریف لانے سے ہوئی عزت تمام

ہمتیں دونی ہوئیں اور آپ کے چرچے ہوئے
بندہ پرور آپ کے قدموں کے ہیں یہ سارے کام

آپ کی تشریف دولت یوں ہی جلوہ گر ہوئی
پایہ محفل نے پایا پایۂ والا مقام

آپ کے تشریف لانے سے ہوئی ہمت قوی
ورنہ ہم کیا ہیں کہ ہم سے ہو کوئی کام انصرام

صورت امید پیش آئی کہ آپ آئے یہاں
کیا مبارک مدعا یعنی رفاہ خاص و عام

اک بڑی بات آپ کا تشریف لانا ہے کہ آپ
مرجع آفاق ہیں اور مامن خیل انام

اک عنایت تھی کہ آپ اس جا کرم فرما ہوئے
ورنہ ایسے ناميوں کو ہے کوئی پروائے نام

اب دعا یہ ہے کہ اشفاق آپ کا قائم رہے
جب تلک باقی ہے دنیا میں نشان صبح و شام

ان دو نظموں سے زیادہ لطیف ایک نظم وہ ہے جو ۱۸۹۱ء میں لکھی گئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سر سید ڈ[illegible] کر بھوپال اور حیدر آباد گئے تھے اور بھوپال میں نواب شاہ جہاں بیگم (خلد مکان) نے ان کا بڑا احترام کیا باریابی کے [illegible] نے مدرستہ العلوم کی کیفیت، مسلمانوں کی حالت اور ان کو حسب مقتضائے زمانہ تعلیم کی ضرورت، اور ان کے تنزل [illegible] بیان کی۔ دوسرے دن سرکار خلد مکان نے بارہ ہزار روپیہ سرسید کے پاس بھیجے۔ سرسید نے ایک نظم اس عطیہ کے شک[illegible] میں پیش کی۔

اے شاہ جہاں باد جہاں حسب مراتب ۔۔۔ دارائے جہاں یاور و افلاک غلا[illegible]
ہم حکم تو نافذ بہ دل خلق جہاں باد ۔۔۔ ہم نظم جہاں باد بہ عنوان نظا[illegible]
بد خواہ تو پامال لکد کوب حوادث ۔۔۔ طغرائے ظفر باد بہ منشور [illegible]
آنان کہ بہ اندیشۂ مدح تو گرائید ۔۔۔ بالاتر از اندیشہ عنان باد مقا[illegible]
اے نصرت اسلام بہ ذات تو مسلم ۔۔۔ وے سکۂ دین پروری امروز بہ نا[illegible]

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ۱ اکتوبر ۱۸۹۵ء

دانی کہ چہ وقت است و چہاں روداُمروز　　براست خیر البشر از نکبت و شامت
کارش ز تنزل برسید است بجائے　　کش ساختہ خلقے ہدف تیر ملامت
طوفان زدہ شد کشتی اسلام مبادا　　کز دست رود رشتۂ امید سلامت
وقت است کہ آمرا بر ہاند ز طوفان　　زاں پیش کزو ہیچ نہ یابند علامت
تا ہست درت تکیہ گہ دولت اسلام　　یزدانت معین بادجہاں باد بکامت
تو شاہ جہاں باشی و خورشید شریعت　　پیوستہ درخشاں بود از گوشۂ بامت

کبھی کبھی دو چار شعر کسی خاص جذبہ میں بھی موزوں ہو گئے ہیں چنانچہ یہ شعر

تاب یک جلوہ نیاورد نہ موسیٰ و نہ طور　　ایں دلم ہست کہ زیں گونہ ہزاراں دیدہ است

جو ان کے سنگ مزار کا کتبہ ہے یا مثلاً نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں۔

میان احمد و مہدی نہ بود ہیچ حجاب　　تو خود حجاب خودی احمد از میاں برخیز

اس شعر کا پورا لطف حاصل کرنے کر لیے، اس خط کے جس میں یہ شعر ہے چند جملے پڑھیے " جس قدر دل کو مسرت آپ کے خط سے ہوئی ہے بیان نہیں کر سکتا۔ اگر یوسف زلیخا کو یا لیلی مجنوں کو ملتی تو شاید اسی قدر خوشی ہوتی۔ جس جذبہ محبت سے لکھا تھا وہ ان لفظوں میں موجود تھا اور آنکھ سے برابر دل میں پہنچتا تھا۔ جس محبت سے آپ نے اشعار لکھے تھے ان کو پڑھ کر میں ایسا محو ہوا گویا یہ سمجھنا دشوار تھا کہ وہ شعر میں نے آپ کے حق میں لکھے ہیں۔ اس کیفیت سے وحدت وجود کا مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔

ایم۔اے۔او۔ کالج کے لیے ایک جلسہ کیا۔ خود انہوں نے اور ان کے دوستوں نے سوانگ بھرا۔ اس موقعہ پر دل ہلا دینے والی تقریر بھی کی اور آخر میں خواجہ حافظ کی مشہور غزل "ساقیا برخیز در دہ جام را" میں اس شعر

ننگرد دیگر بسرو اندر چمن　　ہر کہ دید آں سرو گل اندام را

کے بعد دو شعر اضافہ کر کے خاص انداز میں سنائے

کیست آں سرو سہی کاندر سرش　　باختم دیں و دل و آرام را
قوم ما اے قوم ما کز بہر تو　　کردہ ام برباد ننگ و نام را

سرسید کو شاعری کا پورا ذوق تھا اور اچھے شعر سے لطف حاصل کرتے تھے۔ اچھے شعرا کے قدر شناس تھے اردو اور فارسی میں قومی شاعری کی بنیاد بھی ان ہی سے قائم ہوئی۔ حالی۔ شبلی۔ نذیر احمد کی شاعری کا رنگ ان ہی کے فیض سے بدلا۔ حالی نے ان کی فرمائش پر اپنا مشہور مسدس "مد و جزر اسلام" لکھا۔ جس کے لیے سرسید لکھتے ہیں کہ "اگر خدا پوچھے گا کہ میرے لیے دنیا سے کیا تحفہ لایا ہے تو کہوں گا کہ حالی سے یہ مسدس لکھوا لایا ہوں" ۔ اسی طرح قومی اور وطنی مثنویاں اور نظمیں ان ہی کی فرمائش پر لکھیں۔ ایرانی شعرا میں مرزا کمال الدین سنجر طہرانی نے سب سے پہلے قومی رنگ سرسید اور علی گڑھ کے اثر سے اختیار کیا۔ سرسید مرزا سنجر کے بڑے قدردان تھے۔ گھنٹوں شعر و سخن کا چرچا رہتا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ " اس ایرانی بچے نے مجھ کو جوان کر دیا" مولوی احمد علی شوق کی قومی رباعیاں بہت پسند تھیں اور ان کو " نعمۂ شوق" کہتے تھے۔ یہی صحبتیں اور یہی چرچے تھے جن سے کالج کے طلبہ میں قومی نظموں کی طرف رجحان ہوا۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۵ء

سر سید نے غزل گوئی اور قصیدہ خوانی کو اپنا پیشہ نہیں بنایا اور کبھی شاعروں میں اپنا کلام سنا کر داد سخن حاصل کی، سر سید کا نثر نگاروں میں درجہ متعین ہے۔ ان کو میر انیس کی طرح اپنی زبان پر ناز تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنی تحریر یا تقریر میں نہیں کیا لیکن ان کی خانگی زندگی میں اس کی ایک مثال ملتی ہے جس کو قارئین کی دلچسپی کے لیے[۶] ایک مرتبہ سر سید اور جسٹس محمود میں کسی لفظ پر بحث تھی۔ مسٹر محمود جس طرح کہتے تھے سر سید کو اس سے اختلاف تھا۔ بحث و تمحیص کے بعد مسٹر محمود نے ناز کے لہجے میں کہا کہ جس بزرگ گھرانے میں میں نے پرورش پائی ہے۔ وہ زبان ٹکسال ہے۔ لہذا جو لفظ میری زبان پر ہے وہ صحیح ہے۔ بزرگ باپ نے دلیل کی صحت سے اتفاق کر کے فرمایا لیکن میری کی صحت تم سے زیادہ معتبر ہے اور اسکا سبب یہ ہے کہ تمہاری پرورش کے زمانے میں یورپ کی رہنے والی ایک دایہ ملازم اس کے لب و لہجہ سے کسی قدر اثر پذیر ہونا لازمی تھا۔ اب جو تم غلطی کر رہے ہو یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ لیکن میری پرو قدرات نے کی جن کی زبان مسلمہ طور پر فصیح اور صحیح تھی کیونکہ میری پرورش میں علاوہ اور احتیاطوں کے صحت اور درستی بھی خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا۔ اس لیے زبان دانی کے معاملے میں میری زبان بطور "سند" کے ہے۔

سر سید نے ادبیات اردو میں حسین اور دلنشین اصطلاحوں اور ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ اپنے خاص دوستوں کو خط[۲] کبھی وہ بعض باتوں کی ایسی شاعرانہ توجیہ کر جاتے ہیں اور ایسے فقرے لکھ جاتے ہیں کہ عبارت منظوم معلوم ہونے لگتی سر سید کا یہی مذاق سخن ان کے لائق فرزند جسٹس محمود کو ورثہ میں ملا تھا اور وہ بھی بے مثل نقاد اور سخن فہم تھے۔ وہ شعر کہتے تھے۔ اور جو ہوتا تھا وہ شاعری کا بہترین نمونہ ہوتا تھا۔ نامور باپ اور محترم دادا کے اس مذاق کا اثر راس مسعود میں موجود تھا۔

سر سید کا غدر سے پہلے کا کلام قلمی اور مطبوعہ صورتوں میں تھا جو ہنگامہ غدر میں برباد ہو گیا۔ کہیں کہیں کچھ اوراق اور پرچے باقی ہوں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو یکجا جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ امید کہ یونیورسٹی کے علم دوست حضرات اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔



بہارِ نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے، دردانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے پھنسی، خارش اور داد کھجو کی دوا
خمیرہ اور بہت سی دوائیں
TIBBIYA COLLEGE
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ


ہمدرد
کحل سے پاک صحت بخش جڑی بوٹیوں سے
بھرپور نادر مرکب ہے۔ اس میں موجود مقوّی اجزا کو
جسم قدرتی طور پر قبول کرلیتا ہے۔
سنکارا کے استعمال سے:
● عام کمزوری دُور ہوتی ہے ● چھوت کی بیماریوں سے بچاؤ
ہوتا ہے ● قوتِ برداشت بڑھتی ہے ● قوتِ حافظہ
بڑھتا ہے ● حمل کے دَوران خون کی کمی نہیں ہوتی
● جوش اور ولولہ برقرار رہتا ہے۔
آپ اور آپ کے خاندان کی صحت اور
خوش حالی کے لیے
ہر موسم کا سدا بہار ٹانک سنکارا
cinkara
جو پیتا وہی سکندر
cinkara
ہر روز
دو چمچے
دو بار
cinkara
سنکارا جگائے جینے کی اُمنگ

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۴ — نومبر ۱۹۹۵ء — شمارہ ۱۱

بانی : سرسید احمد خاں

مدیر —— نائب مدیر

پروفیسر نعیم احمد —— احمد مجتبیٰ قریشی

سرکولیشن انچارج : محمد عتیق قاضی

فی شمارہ 50 = 6 روپے	زر سالانہ 65 = 00 زر سالانہ طلبہ 45 = 00 روپے
بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک) 30 = 00 امریکی ڈالر	بیرونی ممالک (عام ڈاک) 15 = 00 امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ (اندرون ملک) 650 = 00 روپے	لائف ممبرشپ (بیرون ملک) 300 = 00 امریکی ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اور نشانت

۱۔ شبلی روڈ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ترتیب

(تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے متفق
ایڈیٹر، پبلشر پروفیسر نعیم احمد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کے توسط سے چھپوا کر ادارہ تہذیب الاخلاق اور نشا
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا۔

اداریہ

خوش آیند کروٹ

اتر پردیش میں صالح انسانی اقدار کی علم بردار قوتوں اور ظلمت پرستوں کے مابین کش مکش فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگئی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں لسانی عصبیت اور منافرت کی چٹان میں کچھ سوراخ ہوئے ہیں۔ اردو زبان کے حقوق کا سوال اُٹھانا جی پر کھیل جانے کی بات نہیں رہی۔ ووٹ کی سیاست نے فاشیت کے بپھرتے ہوئے عفریت کی ناک میں نکیل ڈالی ہے۔ صدیوں سے دبے کچلے ہر انسانی حق سے محروم انسان میں صبر و شکر کرنے کے بجائے ہاتھ بڑھانے اور زور آزمائی کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگیا ہے۔

زور آزمائی کے لیے طاقت اور قوت کے بجائے ایک نئے حربے سے کام لیا جا رہا ہے۔ یہ ہے قوتوں کا نیا توازن۔ اب تک اقتدار اور اختیار کی اجارہ دار قوتیں فیل پا کی طرح دبے کچلے لوگوں کے کندھوں پر سوار انھیں اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور کرتی آئی ہیں۔ تہذیب ہو یا سیاست، معیشت ہو یا تعلیم، زبان ہو یا ثقافت، ہر میدان میں اپنی اجارہ داری برقرار رکھنے کی غرض سے "غیر" کا ہوّا کھڑا کیا گیا ہے اور انہی دبے کچلے لوگوں کو استعمال کیا گیا ہے۔

وقت جوش اور شور کا نہیں۔ خود اپنے آپ کو بہر حال صحیح سمجھنے اور یہ اعلان کیے جانے کا نہیں۔ دوسروں کو زور بیان کے بل پر اپنی بات مان لینے کے لیے مجبور کرنے کا نہیں۔ اپنی تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے موقع حاصل کرنے اور موقع دینے کے لیے دوسروں کو آمادہ کرنے کا ہے۔ دوسرے گروہوں کے ساتھ ایسی سمجھ پروان چڑھانے کا ہے جو اشتراکِ عمل کی راہ ہموار کرے۔ یہ راہ صرف اپنے مفاد پر زور دینے سے ہموار نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ صدیوں سے انسانی حقوق سے محروم لوگوں کے مفاد کا علم بلند کیا جائے۔ اپنے دکھ، اپنی محرومی کے احساس کے ساتھ دوسرے دبے کچلے لوگوں کے دکھوں اور محرومیوں کا بھی احساس کیا جائے۔ جن لوگوں کو صدیوں سے بستیوں سے باہر حاشیوں پر رہنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، ان کی بنیادی سماجی دھارے میں شمولیت کی کاوش میں ہاتھ بٹایا جائے۔ جس طرح آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی اردو زبان اور رسم الخط کو آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، ممنوع قرار دے کر کروڑوں لوگوں کو علم اور تعلیم، ثقافت اور معیشت کے دائرے سے زبردستی خارج کیا گیا، بالکل اسی طرح دیگر کروڑوں لوگ آج تک تاریخ کے اس جبر

کی سزا بھگت رہے ہیں۔

اس مشترک محرومی، جبر اور استحصال کی سرزمین میں انسان دوستی، موافقت، یگانگت اور رواداری کی فصل اگانی ہے۔ دوسروں کو ان کے احساس محرومی کے واسطے سے خود اپنی محرومی کا احساس دلانا ہے۔ یہ کام بڑی ہی نفاست اور زبردست قوت برداشت کا متقاضی ہے۔ اس کے لیے ایسی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے جس کا حاصل یہ ہو کہ اقتصادی اور تہذیبی استحصال کرنے والی قوتیں الگ تھلگ اور بے اثر ہو جائیں۔ تہذیبی نسل کشی پر بڑی رعونت کے ساتھ زور دینے والی قوتیں اس وقت بالکل بے نقاب ہو گئی ہیں۔ وہ دبے کچلے لوگوں کے مفاد کی کھال اوڑھ کر اقتدار کا تشکار کرنے کی صورت پیدا کر رہی تھیں۔ ان کی پر فریب کھال اب اتری پڑی ہے۔ سب کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ان قوتوں کے نوکیلے دانت اور پنجے صرف کسی ایک گروہ کے لیے مضر نہیں۔ حب الوطنی، قوم پرستی اور قومی مفاد کو اپنی ترجیح دکھاتے اور ثابت کرتے ہوئے ان گروہوں کے ساتھ اتحاد کرنا ہے جو تہذیبی نسل کشی کی پیش قدمی میں رکاوٹ بنے ہیں۔

عصر حاضر کے تقاضے صرف حال یا صرف ماضی پر زور دینے سے پورے نہیں ہو سکتے۔ تاریخ واقعات کا سلسلہ ہوتی ہے۔ اگلی سیڑھی پچھلی سیڑھی سے وابستہ ہوتی ہے، اسی سے نکلتی ہوئی معلوم بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح بلندی کی طرف بڑھنا ممکن ہوتا ہے۔ اگر آگے سیڑھیاں نہ جوڑی جائیں تو آدمی ایک ہی جگہ کھڑا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر نچلی سیڑھی گرا دی جائے تو وہ زمین پر آ گرتا ہے۔

دبے کچلے لوگوں کی ماضی اور حال کے مابین ایک کارگر تعلق پیدا کرنے کی جدّوجہد بھی جاری ہے۔ اس میں بھی اردو بولنے والوں کو ایک کردار ادا کرنا ہے۔ گنگا جمنی تہذیب نے عرب اور عجم کی تہذیبوں سے بھی قوت نمو حاصل کی تھی۔ ماضی کے اس ورثہ کو حال کی بین الاقوامی سیاسی۔ اقتصادی حقیقتیں نئی معنویت بخش رہی ہیں۔ مغربی ایشیا کی طرح وسطی ایشیا سے ہندوستان کے اقتصادی۔ تہذیبی تعلقات کو مزید فروغ حاصل ہونا ہے۔ اردو اس تہذیبی سمندر کی ایک ایسی لہر ہے جس میں ہر لسانی دریا کی خوشبو موجود ہے۔ ایک طرف مغربی ہندی کی بولیوں سے ہوتا ہوا اس کا سلسلہ پراکرت اور سنسکرت تک جاتا ہے تو دوسری طرف فارسی اور عربی تک۔ اردو کی اس لسانی و تہذیبی حقیقت کا بیان، اقتصادی و تہذیبی لین دین میں اس کی افادیت کی شرح، کروڑوں لوگوں کی مادری زبان کو اہمیت دیتے ہوئے انھیں ذہنی گھٹن اور جذباتی الجھن سے چھٹکارا دلا کر، میدانِ عمل میں لا اتارنے کے نکتہ کی تفصیل ۔ یہ سارے کام اس طرح ہوں کہ دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے۔ اردو ایک شیریں زبان ہے۔ ضرورت ہے کہ بڑے لکھی شیریں لب و لہجہ میں اس کی شیرینی عام کی جائے۔

(مدیر)

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی *

انسانی مشکلات اور اسلامی شریعت

نوٹ: یہ خطبۂ استقبالیہ آٹھویں فقہی سیمینار ۲۲-۲۴ ر اکتوبر ۱۹۹۵ء کے افتتاحی اجلاس میں پڑھا گیا۔ اس سیمینار کا انعقاد شعبۂ سنی دینیات نے اسلامی فقہ اکیڈمی کے اشتراک سے کیا

آٹھویں فقہی سیمینار میں آپ کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم بے حد خوشی اور فرحت محسوس کرتے ہیں اور اللہ کے حضور سجدۂ شکر بجا لاتے ہیں کہ اس کے رحم و کرم سے آپ جیسے دین کے خادموں اور ملت کے مخدوموں کی خدمت کا یہ زریں موقع ہاتھ آیا۔

میری طلب بھی تمہارے کرم کا صدقہ ہے ۔۔۔ قدم یہ اٹھتے نہیں خود اٹھائے جاتے ہیں

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں یوں تو ہر سال سینکڑوں سیمینار، سمپوزیم اور کانفرنس ہوتی رہتی ہیں مگر آج کا فقہی سیمینار اس لحاظ سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے شرکاء کی اکثریت علماء، فقہا اور اصحاب افتا پر مشتمل ہے، اور اس لحاظ سے بھی یہ سیمینار سنگ میل ہے کہ اس میں جن تین عنوانات پر غور و خوض ہونا ہے ان کا تعلق وقت کے سلگتے موضوعات اور امت کے ناگزیر معاشرتی مسائل سے ہے۔ یہ سیمینار سرسید رحمۃ اللہ علیہ کی بنا کردہ اس دانش گاہ میں ہو رہا ہے جس کی اساس مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور اقتصادی پیش رفت کے لیے رکھی گئی تھی اور اس کی سمت یہ تھی کہ "دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر شود"

اللہ سے دعا ہے کہ یہ سیمینار اس دانش گاہ کی سمت سفر درست رکھنے میں مدد دے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ فقہی سیمینار ایسے وقت میں یہاں ہو رہا ہے جب کہ یونیورسٹی پلاٹینم جوبلی منا رہی ہے یعنی اپنے قیام کی ۷۵ ویں سالگرہ۔

حضرات! عالم اسلام بالعموم اور ملت اسلامیہ ہند بالخصوص جن سنگین مسائل کا سامنا کر رہی ہے ان کا اندازہ کم و بیش ہر اس شخص کو ہے جس کی حساس انگلیاں نبض حالات پر ہیں۔ پچھلے دس سالوں میں ان مسائل میں جو تنوع، تموج اور توسیع پیدا ہوئی ہے، اس کے پیش نظر کسی بھی صاحب

---

* ناظم دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

علم و ایمان کا اپنی جگہ ساکت و جامد رہنا ممکن نہیں ۔ مثلاً گزشتہ دنوں قاہرہ اور بیجنگ میں کانفرنس ہوئیں، ان میں فیمنسٹ نظریات حتیٰ کہ ہم جنسیت کی جس زور شور سے وکالت کی گئی اس طور سے اسلام کے معاشرتی نظام اور اعلیٰ انسانی اقدار کو کھلا چیلنج دیا ہے اور تیسری دنیا پر م پرستی کو مسلط کرنے کی راہ ہموار کی ہے۔ جب کہ دوسری طرف ہمارے معاشرے میں عورتوں ک اور ان کے ساتھ نازیبا سلوک کی واردات روز افزوں ہے۔ امت کے مسائل خواہ خارجی ہوں تعلق دوسری قوموں کے سیاسی، معاشی اور نظریاتی تسلط اور جارحیت سے ہو یا خود اپنی دا ضعیف الاعتقادی، کج خلقی، کوتاہ عملی اور شکست خوردگی سے ۔ ہر دو کا مقابلہ کرنا بحیثیت امت فرض ہے بلکہ امت کی بقا اور ارتقا کا راز بھی اس میں پنہاں ہے۔

شریعت محمدی اور امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم دونوں دائمی اور عالمگیر ہیں، اس لیے ہر دور سطح پر ان چیلنجز کو قبول کرنا ہمارے لیے ضروری ہے جو امت اور شریعت کے سامنے آتے ہیں، اہ جو حامل وراثت نبوی ہے اس پر یہ فرض اپنی کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے زیادہ عائد ہوتا۔ بڑھ کر اس چیلنج کو قبول کرے اور امت کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دینی جا ادارے، اسلامی تنظیمیں، علما اور دانشوروں کی مجلسیں سب اسی فریضہ سے عہدہ برآ ہونے ہیں جو اپنے اپنے طریقہائے کار اور حوصلوں کے مطابق سرگرم ہیں۔ ان کوششوں میں اگر تال م جائے تو صدیوں کا سفر برسوں میں طے ہو جائے، فاصلے سکڑ جائیں اور منزل قریب ہو جائے۔

حضرات! اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) جس کے حوصلہ افزا تعاون سے یہ سیمینار منعقد ہ ہندوستانی مسلمانوں کے شکریے اور تعاون کی مستحق ہے کہ اس نے ملت کو درپیش داخلی مسا میں شرعی رہنمائی کے لیے نہ صرف نوجوان علما کی فقہی تربیت کے مراکز قائم کیے اور ان کو فقہ و فتا منہاج سے روشناس کرانے کی کوشش کی جو ہمارے اسلاف کی میراث ہے بلکہ ہم عصر علما اور اصح مجتمع کر کے مسائل کے اجتماعی حل کا شعور بیدار کیا اور ان کو ایسے لائحہ عمل سے مربوط کیا جو امت کے خیر و برکت اور موجب رحمت ہے۔

فقہ و فتاوی کی انفرادی خدمات، ان کی ضرورت اور اہمیت سے کوئی انصاف پسند انکار نہیں زندگی کی بے شمار الجھنوں اور مشکلوں میں ان سے جو روشنی اور رہنمائی ملتی ہے وہ تسلیم شدہ امر ہے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ فقہ و فتاوی کی انفرادی کوششوں پر بسا اوقات شخصی انداز فکر، ذا تی ناپسند، معاصرانہ رجحانات، گروہی میلانات اور مقام و ماحول کے بطن سے پیدا ہونے والے غیر صح جذبات کا رنگ جھلکتا ہے۔ خاص طور پر ان معاملات میں جن کا تعلق ایسے فرد یا مجموعہ افراد سے صاحب افتاء ذہنی ہم آہنگی محسوس نہ کرتا ہو، پھر اس کے منفی اثرات نہ صرف فقہ و فتاوی کی حر پڑتے ہیں بلکہ امت کی اجتماعیت، وحدت اور دینی اخوت بھی مجروح ہوتی ہے ان حالات میں ضرور فقہ و فتاوی کے اجتماعی منہاج کو قوت اور وسعت فراہم کی جائے کہ یہی اجتماعی اجتہاد کی راہ ہے

لیے بھی ضروری ہے کہ انفرادیت کے مقابلے میں اجتماعیت کو تائید ربانی حاصل ہے اور اس پر توثیق محمدیؐ کی مہر ثبت ہے۔ گویا انفرادی رائے کے مقابلے میں اجتماعی آراء کا جو مقام ہے وہی مقام انفرادی فقہ و فتاویٰ کے مقابلے میں اجتماعی طریق کار کا ہے۔ اس میں راست روی اور اصابت رائے کا زیادہ امکان ہے۔ یہ طریق کار اصحاب فقہ و فتاویٰ کے مختلف حلقوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا بھی موثر ذریعہ ہے۔ اس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے ایک دوسرے کے مابہ الاختلاف اور دلائل کو سمجھنے اور ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس سے ذہنی فاصلے کم ہوتے ہیں اور غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔ شام کے مجتہد و فقیہ امام اوزاعی نے عبداللہ بن مبارک سے ایک مرتبہ پوچھا: من ھذا المبتدع الذی خرج بالکوفۃ و یکنی ابا حنیفۃ؟،،

یہ کون بدعتی ہے جو کوفہ میں ظاہر ہوا ہے اور جس کی کنیت ابو حنیفہ ہے؟ عبداللہ بن مبارک نے اس سوال کا براہ راست جواب نہیں دیا بلکہ مشکل مسائل، ان کا طریق فہم اور ان میں فتاویٰ کا ذکر شروع کیا۔ امام اوزاعی نے پوچھا یہ فتاویٰ کس کے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا وہ ایک شیخ ہے جس سے میں نے عراق میں ملاقات کی ہے تو امام اوزاعی نے کہا یہ شخص نبیل مشائخ معلوم ہوتا ہے، جاؤ اور اس سے مزید استفادہ کرو تب عبداللہ ابن مبارک نے کہا یہی امام ابو حنیفہ ہیں۔ پھر مکہ میں امام ابو حنیفہ اور امام اوزاعی کی ملاقات ہوئی اور ان مسائل کا اعادہ ہوا جن کا تذکرہ عبداللہ بن مبارک نے کیا تھا اور امام ابو حنیفہ نے ان کی گرہیں کھولیں۔ جب دونوں جدا ہو گئے تو امام اوزاعی نے عبداللہ بن مبارک سے کہا اس آدمی کے وفور عقل اور کثرت علم پر مجھے رشک ہے میں اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں کہ میں ان کو الزام دینے میں صاف غلطی پر تھا ان کے بارے میں جو باتیں مجھ تک پہنچی تھیں میں نے ان کو ان کے برخلاف پایا"۔ (الخیرات الحسان ص ۳۳ لابن حجر الھیثمی الشافعی)

حضرات! اصحاب علم و فقہ کا ایک جگہ جمع ہو کر مسائل و نوازل پر غور کرنا اور مشکلات حیات کے حل کے لیے اجتماعی فکر و فہم کو فروغ دینا ایک طرف فرمان الٰہی "وامرھم شوریٰ بینھم" کی روح کو منعکس کرتا ہے اور دوسری طرف فقہ اسلامی کے اس اجتماعی اور تاریخی کردار کو آگے بڑھانے میں مدد دیتا ہے جس کی ابتدا خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد ہی سے ہو گئی تھی چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن قاسم اپنے والد کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں:

"حضرت ابو بکر کے سامنے جب کوئی ایسا معاملہ پیش آتا جس میں وہ اصحاب رائے اور اصحاب فقہ سے مشورہ کرنا چاہتے تو مہاجرین و انصار میں سے عمر، عثمان، علی، عبدالرحمن بن عوف، معاذ ابن جبل، ابی بن کعب اور زید بن ثابت (رضی اللہ عنہم) کو بلاتے۔ حضرت ابو بکرؓ کی زندگی بھر یہی طریق کار رہا، پھر حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو وہ بھی انہی اصحاب کو جمع کر کے رائے لیتے۔"

عہد صحابہ میں انفرادی اجتہاد اور فتاویٰ کے ساتھ اجتماعی اجتہاد کی جو رائے قائم ہوئی ان میں حسب ذیل چھ صحابہ خاص طور پر پیش پیش رہے۔

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی ابن کعبؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت ابو موسی اشعریؓ

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

اورحضرت زید بن ثابت ان میں بھی حضرت عمرؓ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشـ
ہم آہنگ ہوتے اور حضرت علیؓ ابی ابن کعب اور حضرت زید بن ثابت کے فیصلوں میں یکسانیت ہو
الرزاق کی صراحت "کان یاخذ بعضھم من بعض"، کے مطابق یہ سب آپس میں ایک دو
دلہ خیال اور افہام تفہیم کرتے۔

حضرات صحابہ کی یہ روایت تابعین کے عہد میں بھی برقرار رہی چنانچہ حافظ علی ابن حجر عسق
ابن مبارک کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ

"مدینہ کے سات فقہا تھے جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو سب مل کر اس پر غور کرتے قاضی
وقت تک فیصلہ نہیں کرتا جب تک کہ مسئلہ اس سات نفری فقہی مجلس کے سامنے نہ پیش کیا جاتا پھر وہ ا
کرتے اور فیصلہ صادر کرتے۔" (تہذیب التہذیب ۳/۴۳۷)

جب فقہی مکاتب و مسالک کی بنا پڑی خاص طور پر ائمۂ اربعہ کے فقہی حلقے وجود میں آ
بھی یہ روایت منتقل ہوئی چنانچہ خود امام ابو حنیفہ کا طریق کار یہ تھا کہ وہ پیش آمدہ اور متوقع مسا
کی مجلس میں رکھتے، ان پر کھلی بحث کرتے، پھر اگر اتفاق رائے سے کوئی مسئلہ طے ہوتا تو اسے لکھ لیا
اختلاف آراء نوٹ کیے جاتے۔ (الجواہر المضیہ ۱/۱۴۰)

حضرات! اہل علم و فقہ کے اس منتخب مجمع میں چند ناگزیر باتیں بطور یاد دہانی عرض کرنا چاہتا ہ
احکام و مسائل میں کچھ تو وہ ہیں جو قرآن و سنت کے حکم صریح پر مبنی ہیں، یعنی جن پر قطعی "الثبوت"
"الدلالہ" نص موجود ہے مثلاً بنیادی عقائد و عبادات کی فرضیت، بیع و نکاح کی حلت، حدود و قصا
تعیین یا سود، زنا، چوری، رشوت و غیبت وغیرہ کی حرمت ان جیسے احکام میں کسی اختلاف اور بحث
نہیں کیوں کہ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے بعد کسی انسان کو اس میں اپنی رائے کے استعمال کا حق نہ

"ماکان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ
امرھم" (الاحزاب-۳۶)

"کسی مومن مرد و عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی معاملہ میں
تو وہ اس معاملہ میں اپنے اختیار کا استعمال کرے۔"

دوسری قسم کے مسائل وہ ہیں جن کی اساس نص قطعی پر نہیں ہے بلکہ اجتہاد و قیاس اور استنباط وا
پر ہے، ایسے مسائل میں اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے کیوں کہ یہ مسائل انسانی ذہن کے
کردہ ہیں اور انسانی ذہنوں میں جو فرق ہے اس کا اثر ان کے اخذ کردہ نتائج پر پڑنا فطری اور ناگ
تاہم اس اختلاف سے امت کے لیے عمل کی راہ آسان ہوتی ہے اسی لیے اسے رحمت کہا گیا ہے۔ اس ا
کے بہت سے معقول اور موثر اسباب ہیں مثلاً قرآنی الفاظ کا مطلق و مجمل اور محتمل المعانی ہونا حدیث
تک نہ پہنچنا، یا ایک سے زائد احادیث کا موجود ہونا یا مسئلہ کا مجتہد فیہ ہونا وغیرہ جیسے مسائل میں
اگر صحیح نتیجے تک پہنچا تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر اس نے خطاء کی تب بھی وہ ماجور ہے کیوں کہ نیک

کے ساتھ مسئلہ کی گرہ سلجھانے کی سعی تو کی۔

ایسے تمام استنباطی مسائل کو جو تعداد کے لحاظ سے بنیادی احکام سے بہت زیادہ ہیں قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ کا درجہ نہیں دینا چاہیے کیوں کہ بظاہر تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد بھی جو نتیجہ برآمد کیا جائے گا اس باب میں اس کا امکان موجود رہے گا کہ دوسرے فقیہ کا استنباط زیادہ درست ہو، اس لیے ہر فقیہ یا مجتہد زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا مسئلہ بلکہ مسلک اقرب الی الصواب اور محتمل الخطا ہے، اسی لیے محدث و فقیہ امام مالک نے اپنی کتاب موطا کو تمام مسلمانوں کا مسلک بنانے سے صاف انکار کر دیا تھا حالانکہ خلیفہ وقت ہارون رشید نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا، یہی روش ہمارے اسلاف کی وراثت ہے۔

یہ دوسری قسم کے مسائل اپنے اندر زیادہ لچک رکھتے ہیں، ان میں حالات و زمانہ کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت ہوتی ہے ان میں انسانی عرف و عادات کا لحاظ ہوتا ہے اور ان میں بھی سہولت و راحت کے پہلو پنہاں ہوتے ہیں۔ ایسے مسائل پر غور کرتے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کو یمن کے علاقوں کا گورنر بنا کر بھیجتے وقت آپ نے صادر فرمایا تھا۔

"بشرا ولا تنفرا، یسرا ولا تعسرا وتطاوعا،" (بخاری کتاب الاحکام)

"تم دونوں خوش خبری دینا، نفرت نہ پیدا کرنا، آسانیاں فراہم کرنا تنگی میں نہ مبتلا کرنا اور باہم اتفاق سے فیصلہ کرنا۔"

اس فرمان کی قدر و قیمت اس عہد میں جتنی تھی اس سے کہیں زیادہ آج کے دور میں ہے اسلامی شریعت کی روح یہ ہے کہ انسان کو درپیش مشکلات و مسائل کا حل نکالا جائے اور اسے تنگی و دشواری سے بچایا جائے۔

فرمان الٰہی ہے "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (البقرۃ) "وما جعل علیکم فی الدین من حرج (الحج)

"اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا۔ اور اس نے تمہارے اوپر دین میں تنگی نہیں رکھی۔"

اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طریق کار بروایت حضرت عائشہؓ یہ تھا

"ماخیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اخذ ایسرھما مالم یکن اثما" (متفق علیہ)

"جب کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزوں میں اختیار دیا گیا تو آپ نے آسان تر کو اختیار کیا بشرطیکہ اس میں گناہ نہ ہو۔ یہیں سے فقہا و اصولیین نے یہ فقہی قاعدے اخذ کیے۔"

"المشقۃ تجلب التیسیر، الضرر یزال، الضرورات تبیح المحظورات وغیرہ"

(الاشباہ والنظائر لابن نجیم۔)

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

"مشقت آسانی چاہتی ہے، نقصان دور کیا جائے گا، ضرورتیں ممنوعات کو جائز کر دیتی ہیں"۔

اسی لیے ضرورت کی بنیاد پر مختار و راجح قول کے باوجود شاذ و مرجوح قول پر بھی فتویٰ کو روا رکھا گیا بلکہ ایک فقہی مسلک پر عمل کرنے والے کے لیے دوسرے مسلک میں سہولت کی راہ نکلتی ہے تو اس مسلک کے عالم و فقیہ کے لیے جائز ہوا کہ وہ دوسرے مسلک کے مطابق فتویٰ دے کر امت کے لیے سہولت کی سبیل نکالے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے اہم ستون علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں۔

"اپنے مسلک کے امام کے بجائے دوسرے امام کے اتباع کے جائز ہونے اور اس مسئلہ میں تنگی نہ ہونے سے یہ بات ظاہر ہے کہ مختلف مذاہب کی رخصتوں کی پیروی یعنی پیش آمدہ مسائل میں مختلف مذاہب سے آسان چیز کا انتخاب بھی جائز ہوگا۔ کیوں کہ اس میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے، اس لیے کہ اگر آسان راہ کو اختیار کرنے کی گنجائش ہو تو اس کو حق ہے کہ وہ اسی کا انتخاب کرے"۔

(تیسیر التحریر ۴/۲۵۴)

اس سلسلے میں دو باتوں کا خیال رکھنا لازم ہے، ایک تو یہ کہ سہولت بر بنائے ضرورت ہو نہ کہ بہ تقاضائے نفس، دوسرے یہ کہ ایک ہی مسئلہ میں متعدد اور مختلف آراء کو جمع نہ کر لیا جائے جو تلفیق کی مردود شکل ہے، علامہ ابن عابدین نے اس کی مزید وضاحت فرمائی ہے۔ (رد المختار ۱/۵۱)

عوام میں دین کا شوق پیدا کرنے اور شریعت کو انسانی زندگی کا طرز عمل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اصحاب فقہ و فتاویٰ اس پہلوئے خاص پر توجہ دیں، عصر حاضر میں اس کی کیا اہمیت ہے، مولانا اشرف علی تھانوی اس کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہیں:

"وسعت ہونے سے اعتقاد درست ہوگا کہ شریعت کیسی اچھی چیز ہے اور کیسی رحمت ہے، وسعت دینے میں شریعت سے محبت ہوگی، دوسرے یہ کہ جو اس سے منتفع ہوگا آرام سے رہے گا۔ اس سے حق تعالیٰ کی محبت غالب ہوگی (ورنہ) لوگوں کا تو یہ گمان ہو گیا ہے کہ شریعت میں سوائے لا یجوز کے اور کچھ ہے ہی نہیں"۔ (التبلیغ ۱۵/۱۵)

حضرات: آخری گزارش یہ ہے کہ قرآن و سنت، فقہ و فتاویٰ اور اجتہاد و استنباط کی اساس ہی نہیں بلکہ سرچشمہ ایمان و عمل بھی ہے اس کے عرفان میں کوتاہی و محرومی ہے اور اس سے انحراف گمراہی ہے، اس لیے ہر فقیہ کے لیے لازم ہے کہ وہ فقہی جزئیات اور فروعات کے استنباط میں قرآن و سنت کو اولیں مقام دے۔ اگر صحیح حدیث موجود ہو تو کسی امام کے قول اور کسی مجتہد کے اجتہاد کو ہرگز ترجیح نہ دے۔ خواہ اس کا مقام کتنا ہی بلند اور اس کی نظر کتنی ہی عمیق کیوں نہ ہو۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کو چاروں اماموں نے اپنا نصب العین بنایا ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں!

"رای الاوزاعی ورای مالک ورای ابی حنیفۃ کلہ رای وھو عندی سواء انما الحجۃ فی الآثار"

امام اوزاعی امام مالک اور امام ابو حنیفہ کی رائے تو رائے ہے اور وہ سب میری نظر میں برابر ہے

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

دلیل تو صرف آثار میں ہے۔" (الجامع لابن عبد البر ۲/۱۴۹)

حضرت امام شافعی فرماتے ہیں:

اجمع المسلمون علی انہ من استبان لہ سنۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یحل لہ ان یدعھا بقول احد" (اعلام الموقعین ۲/۳۶۱)

"مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس کے سامنے سنت رسولؐ ظاہر ہو جائے اس کے لیے جائز نہیں کہ اسے کسی کے قول کی وجہ سے چھوڑ دے۔"

حضرت امام مالک سے مروی ہے!

لیس احد بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا یوخذ من قولہ ویترک الا النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (الاحکام لابن حزم ۶/۱۴۵)

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے علاوہ ہر شخص کا قول لیا جائے گا اور چھوڑا جائے گا۔"

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے سلسلے میں علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں!

جب صحیح حدیث موجود ہو اور وہ مسلک کے خلاف ہو تو حدیث پر عمل کرے یہی اس کا مسلک ہوگا اور مقلد حدیث پر عمل کرنے کی وجہ سے حنفی مسلک سے خارج نہیں ہوگا، کیوں کہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے "جب صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔"

امام ابو حنیفہ نے اپنے شاگردوں کی جو تعلیم و تربیت کی اس میں اس بات کا لحاظ رکھا کہ ان کے فتاوی اور آراء کو معیار و مستدل بنانے کے بجائے ان کے مستدلات پر استنباط و تفریعات کی بناء رکھی جائے۔ انہوں نے تاکید فرمائی "لایحل لاحد ان یفتی بقولنا حتی یعلم من این قلنا (حاشیہ البحر الرائق ۶/۲۶۹)

"کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ ہمارے قول پر فتویٰ دے جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ ہم نے کہاں سے یہ بات کہی۔"

امام ابو حنیفہ کے اس قول کی حکمت اور معنویت یہ ہے کہ قرآن و سنت ابدی، لافانی، دائمی، ہمہ گیر اور عالم گیر ہے۔ زمانہ اور ماحول میں رونما ہونے والے مسائل و مشکلات میں انسان کی رہنمائی اور دستگیر ہے۔ اس کے برخلاف فقہاء کی تفریعات اور فقہی جزئیات پر ان کے عہد، حالات، ماحول، عرف و عادات اور خاندانی بلکہ شخصی رجحان کا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ "تغییر الفتوی بتغییر الزمان" کا اصول فقہا کے یہاں مسلم ہے۔ (اعلام الموقعین ۳/۱۴) (یعنی زمانے کے ساتھ فتویٰ بدل جاتا ہے)

مگر زمانہ اور ماحول کے بدلنے کے ساتھ قرآن و سنت میں کہیں تبدیلی کی گنجائش نہیں، اسی وجہ سے امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن شیبانی نے دو تہائی مسائل میں اپنے استاذ امام ابو حنیفہ سے اختلاف کیا۔

حضرات! میں ایک بار پھر آپ حضرات کو تہہ دل سے خوش آمدید کہتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ آپ حضرات کا قدم رنجہ فرمانا اہل علی گڑھ بلکہ ملت کے لیے باعث رحمت اور راحت ہے۔ (ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد)

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

سید حامد*

کھیل اور اس کے ایوارڈ

کھیلوں پر لکھنے کا حق راقم سطور کو کس نے دے دیا؟ بہت سے قارئین چھوٹتے ہی یہ سوال کریں گے۔ اور اگر جواب میں وہ پوچھ بیٹھے کہ اُس سے بھی زیادہ کیا کسی کو حق ہے؟ تو کیا کیجیے گا۔ پانچ اوپر ساٹھ سال سے زیادہ ہو گئے، اُسے کھیلتے یا کھلاتے ہوئے۔ شروعات چونکہ راقم نے اپنی "توصیف" سے کی ہے، تو یہ بھی کہہ دیا جائے کہ اس دیرینہ کھلاڑی کی پہلی وفاداری خالق کائنات کے ساتھ ہے اور اس برگزیدہ ہستی کے ساتھ جس نے اس کی طرف رہنمائی کی۔ اس کی دوسری وفاداری خلقِ خدا یا بنی نوعِ انسان کے ساتھ ہے۔ وہ بنی آدم کو ایک دوسرے کا عضو سمجھتا ہے۔ اس کی تیسری وفاداری اس خاک کے ساتھ ہے جس سے وہ اٹھا ہے اور جس کی گود میں اسے جانا ہے۔ اس نے قلم سے ہی روزی کمائی، اور دل کے ارمان بھی قلم سے ہی نکالے۔ ستر سال ہونے کو آئے قلم نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا لیکن اس احسان فراموشی کو کیا کہیے کہ اس کے ہاتھوں کو قلم کے لمس سے زیادہ عزیز ہاکی اسٹک اور ٹینس کے بلے کی گرفت رہی ہے۔

کھیلوں کا جو تصور لے کر وہ کارزارِ ہستی میں داخل ہوا وہ سخت کوشی، آسودگی اور کشادگی کا تصور رہے۔ کھیل انسانوں کو فکر اور فشار سے دور رکھتا ہے، سازشوں اور چالاکیوں کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ کھیل ان کو تندرست رکھنے کی ضمانت لیتا ہے، ان کی الجھنوں کو دور کرتا ہے۔ کھیل اُن کا تعارف زندگی کے مرحلوں، اس کی شکست و ریخت، اس کی ہار جیت سے کراتا ہے اور اونچ نیچ اور اُتار چڑھاؤ سے مردانہ وار نبٹنے کے ڈھنگ سکھاتا ہے۔ کھیل انہیں سکھاتا ہے کہ زندگی کی دھوپ چھاؤں کو یکساں خوش دلی کے ساتھ قبول کرو۔ زندگی میں ہار جیت لگی رہتی ہے، ہار زندگی کا تانا ہے، جیت اُس کا بانا ہے۔ صرف تانے اور صرف بانے سے کپڑا نہیں بنتا۔ جیت خوش گوار ہوتی ہے، ہار ناگوار۔ کھیل انہیں ہدایت کرتا ہے کہ زنہار جیت میں جامے سے باہر نہ ہونا، خبردار ہار میں منھ نہ پھلانا، منھ نہ لٹکانا، دل نہ بجھانا۔ کہ دراصل یہ دونوں چلتی پھرتی چھاؤں ہیں۔ جیت دھوپ کی طرح ڈھل جاتی ہے، ہار شبِ تاریک کی طرح دن کی خبر لاتی ہے۔ کھیل اکتاہٹ اور اتراہٹ دونوں سے بچاتا ہے۔ وہ ہماری برداشت اور نبرد آزمائی کی طاقت کو آزماتا ہے۔ وہ قوتِ ارادی پر سان رکھتا ہے۔ وہ ہمیں تناسب کے احساس سے اوّل اوّل روشناس

---

* سیکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی تعلیم آباد سنگم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۲

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

کردیتا ہے۔ وہ ہمیں دانش اور شعور، وزن و وقار سے بہرہ یاب کرتا ہے۔

آپ کہیں گے یہ مضمون نگار اگلے وقتوں کی باتیں کر رہا ہے۔ کھیل میں سازش گھس گئی ہے اور سیاست نے اسے داغ دار کر دیا ہے۔ وہ جواب دے گا کہ گہن میں سورج بھی آجاتا ہے لیکن جلد ہی جتن کر کے اس میں سے نکل آتا ہے۔ گہن کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہتا کہ سورج سے اس کی روشنی چھین لی گئی اور اب اندھیرا اسے اور اس کے گرد رقص کرنے والی زمین کو سدا تیرہ و تار رکھے گا۔ اس گئی گزری حالت میں بھی کھیل اپنے بنیادی اوصاف سے دستکش نہیں ہو سکتا۔

یہاں تک تو اطمینان کی باتیں تھیں جو آپ نے سن لیں۔ اب ان باتوں پر بھی کان دھریئے جو آپ کی نیند کو اچاٹ کر دیں گی۔ اس داستان میں تناسب فراموشی کا بیان بھی ہے اور اس تباہ کاری کا تذکرہ بھی جو سیاست کے ہاتھوں کھیلوں کی ہمارے وطن عزیز میں ہوئی ہے۔

دو سال ہوئے راقم سطور کھیلوں کے قومی ایوارڈ کے اس جلسہ میں شرکت کرنے کے لیے گیا تھا جو راشٹرپتی بھون کے درخشاں وضو فشاں اشوک ہال میں منعقد ہوتا ہے۔ اسے سوونیئر کے سرورق پر یہ دیکھ کر سخت دھکا لگا کہ برسر اقتدار سیاسی پارٹی نے مصلحت بر دوش شخصیت پرستی کے بھنور میں پھنس کر اپنی میراث کو ٹھکرا دیا ہے۔ ابھی تک دستور یہ تھا کہ ہمارے جو کھلاڑی کھیل میں امتیاز حاصل کرتے تھے انہیں مہابھارت کے ہیرو اور کروکشیتر کے فاتح ارجن کے نام پر ارجن ایوارڈ دیئے جاتے تھے۔ راقم سطور نے اپنی آنکھوں کو باور کرنے سے انکار کر دیا جب اس نے دیکھا کہ ارجن ایوارڈ کے اوپر ایک ایوارڈ اور مسلط کر دیا گیا ہے جو ارجن ایوارڈ پانے والوں میں سب سے اچھے کھلاڑی کو دیا جائے گا۔ اس کا نام راجیو گاندھی کھیل رتن ایوارڈ رکھا گیا ہے۔ دلم بسوخت زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است۔ کیسی اسنگت بات ہے یہ۔

(حیرت سے میرا دل خاکستر ہو گیا کہ یہ کیا انوکھی بات ہے)۔

دل نے کہا چہ نسبت خاک را با عالم پاک (خاک کو عالم پاک کے ساتھ کیا نسبت)۔ غور فرمائیے صدیوں بلکہ ابتدائے تہذیب سے ہندوستان کا بچہ بچہ ارجن کے نام پر فخر کرتا چلا آیا ہے۔ وہ ارجن جو تیر اندازی میں عدیم المثال تھا، باطل پر حق اور کوروؤں پر پانڈوؤں کی فتح کا سہرا جس کے سر باندھا گیا تھا، وہ ارجن جسے شری کرشن جی نے میدان جنگ میں وہ لافانی اپدیش دیئے جو گیتا کی شکل میں لیک بڑی آبادی کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہیں۔ اس ارجن کے مقابلے میں ہمارے تناسب سوز اور کوتاہ اندیش سیاست دانوں نے ایک ایسے شخص کو کھڑا کر دیا جسے چند سال کے لیے ہندوستان کے وزیر اعظم بننے کا شرف حاصل ہوا تھا، بیس سال بھی نہ گزریں گے کہ لوگ اسے بھول جائیں گے۔ ارجن کا نام اسی طرح اہل ہند کی خاتم دل میں نگینہ کی طرح جڑا رہے گا۔ مراتب شکنی، وراثت سوزی، اور اقدار فراموشی کی اس سے بدتر مثال کیا ہوگی کہ نامرادوں نے مہابھارت کے لافانی ہیرو ارجن پر شری راجیو گاندھی کو سبقت اور فضیلت دے دی۔ تناسب کا احساس اور اس کا عدم ناقابلِ تقسیم ہوتا ہے۔ عدم تناسب کی مثالیں ہمارے یہاں زندگی کے ہر شعبہ اور اہلِ سیاست کے ہر اقدام میں ملیں گی۔

چنانچہ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ ہمارے سابق صدر شری وینکٹ رمن کے خلاف ایک طوفان بے تمیزی

برپا کردیا گیا۔ کس خطا پر؟ انہوں نے شری راجیو گاندھی کی شفقت آمیز تعریف کے بعد ان کی ناپختہ کاری
(جسے انہوں نے نوعمری پر محمول کیا) اشارہ کردیا تھا۔

اپنی خود نوشت میں سابق صدر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ شری راجیو گاندھی نے بوفورس کے
کو پختہ کاری کے ساتھ حل نہیں کیا تھا۔ کیا توقع یہ کی جاتی تھی کہ ہمارا صدر، ہمارا سب سے بڑا شہری، شر
گاندھی کی شان میں قصیدہ لکھے گا یا مرثیہ پڑھے گا۔ چاپلوسی کیا ایک حرف صداقت کی بھی تاب نہیں لا
کتاب (*My Presidential Years*) کا چھپنا تھا کہ کانگریس کے بعض کارکن شری وینکٹ رمن
ہنگامہ آرا ہو گئے۔ جیسے انہوں نے کانگریس پر حملہ کردیا ہو۔ کیا ہماری سب سے بڑی سیاسی پارٹی یا
ایک ٹولی تنقید کی تاب لا ہی نہیں سکتی؟ کیا اس کے نزدیک ملک اور جمہوریت اور روایات سب بعد میں
ہیں، سب سے پہلے آتا ہے پارٹی کا مفاد۔ اور پارٹی کے مفاد کا مفہوم بھی کیسا الوکھا۔ کیا انہیں یہ بھی
رہا کہ طاقت ہر چند وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہو، مرتبت، وقار، فضیلت پر پہلا حق صدر جمہوریہ کا ہے کہ وہ
کی عزت اور آبرو کی علامت ہوتا ہے۔ حکومت اسی کے نام پر کی جاتی ہے۔ اور یہاں صرف منصب کے
نظر انداز نہیں کیا گیا، ان دونوں اکابر کی شخصیتوں اور اکتسابات کے فرق کو بھی بھلا دیا گیا۔ ایک سیا
نے تو سابق صدر کے تئیں تحقیر کا لہجہ اختیار کیا۔ خواص کا جب یہ وطیرہ ہو گا تو عوام کیا نہ کریں گے۔ د
طرازی، ہنگامۂ احتجاج، اس مطالبہ کے ساتھ کہ سابق صدر کی خود نوشت سوانح عمری پر قدغن لگادی
حیرت اس بات پر ہے کہ ان جمہوریت دشمن حرکات پر چپ سادھ لی گئی۔

نفس مضمون پر ہم بعد میں آئیں گے، قصر تمہید کا ایک ستون ہنوز توجہ کا طالب ہے۔ اشوک ہال جانے
راقم سطور لفٹ میں داخل ہوا۔ ذرا دیر کے لیے ساتھ ہو گیا کھیلوں کے وزیر اور ایک مقتدر خاتون کا آینہ
حمائل لیے ہوئے تھیں۔ وزیر محترم نے اس کی طرف اشارہ بطور استفسار کیا۔ ہنس کر فرمانے لگیں راجیو
یہی سوال کیا تھا تو میں نے جواب دیا تھا کہ یہ میری کرسی کی حفاظت کرتی ہے۔ قرآن کریم کی اس آ
ذکر جس کے آگے کائنات لرزہ براندام ہے، اس ناقدری اور خود غرضی اور بے تناسبی کے ساتھ کرنے کا
کو ہو سکتا ہے۔

آگے چلیے اشوک ہال میں اعلانات پر جو خاتون مامور تھیں انہوں نے (مولانا) ابوالکلام آزاد کو ع
کہا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے کتنی دور ہیں کہ اکابرین کے نام بھی ٹھیک سے نہیں لے پاتے
لگے اگر کوئی ڈاکٹر راجندر پرشاد کو ڈاکٹر راجیندر لعل کہہ کر پکارے۔ حاشا وکلاّ، ہم سے یہ بے ادبی سر
ہو سکتی۔

راشٹر پتی ایوارڈ دے رہے تھے، جس کھلاڑی کو ایوارڈ ملتا وہ ان سے ایوارڈ لیتا، مصافحہ کر
آگے بڑھ جاتا۔ نہ معلوم یہ کس کو سوجھی کہ اس نے راشٹر پتی کے علاوہ ان دو وزیروں سے بھی جو
دائیں بائیں کھڑے تھے ہاتھ ملانے شروع کردیئے۔ وہ وزیروں کو نظر انداز کیسے کرسکتے تھے؟ حالانکہ
بات بے تکی تھی۔ انعام دینے اور انعام لینے والوں کے درمیان دوسروں کا گزر کیسا؟ چاپلوسیاں

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

خمیر میں کیوں گھس گئی ہیں ؟

اب نفس مضمون پر آئیے ۔ ہندوستان نے کھیلوں کی دنیا میں ہنوز کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دیئے رومالی رقبے اور چھدری آبادی والے ملک مقابلوں میں ہم سے بازی لے جاتے ہیں۔ مانا کہ درجۂ حرارت کا نشیب و فراز تندرستی اور چابکدستی کے حق میں نہیں جاتا، لیکن اتنے وسیع رقبے، اتنے گوناگوں جغرافیائی حالات اتنی کثیر آبادی کا انعکاس اکتسابات اور امتیازات کی شکل میں ہوناتھا۔ کیوں نہیں ہوا، اس کے اسباب کئی ہیں آزادی کے بعد سرکار نے کھیلوں کو آگے بڑھانے کے لیے جتن کیے ۔ کھیلوں کی ہماری لغت میں کچھ ناموں کا اضافہ بھی ہوگیا۔ کھلاڑیوں کی قدر بھی ہوئی ؛ ان کو ملازمتوں میں ترجیح دی جانے لگی لیکن کھیل کے لیے جن میدانوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کی تعداد گھٹتی چلی گئی یعنی اسکولوں اور کالجوں میں کھیل کے میدانوں پر کمرے اور لیبا ریٹریاں بنالی گئیں ۔ بہت سے اسکولوں میں شروع سے ہی کھیلوں کے لیے جگہ نہیں رکھی گئی ۔ کھیلوں کی سب سے اچھی تربیت گاہ اسکول ہیں ۔ وہیں کھیل گھٹی میں پڑتے ہیں ۔ کھیلوں کے لیے دوسرے وسائل اور سازوسامان بعد میں آتے ہیں پہلے کھیلوں کے لیے جگہ ہونی چاہیے۔ گویا بازی شروع ہونے سے پہلے ہار لی گئی ۔

پھر بڑھتی ہوئی آبادی میں محدود ملازمتوں کے لیے مقابلہ اتنا سخت ہوگیا کہ کھیلوں سے دھیان ہٹنے لگا ۔

گرانی نے بھی کھیلوں کو غریبوں کی دسترس سے دُور کردیا۔ کھیلوں میں سیاست نے جو تباہ کاری کی اس کی شرح کے لیے سفینہ درکار ہوگا ۔ نااہل زورِ سیاست سے کھیلوں کے مناصب پر پہنچ گئے ، اور قدرت کے قانون کے مطابق جب ان کی باری آئی تو انہوں نے اکثر نااہلوں کا ہی انتخاب کیا ۔ ناانصافیوں سے اچھے کھلاڑیوں کے دل لوٹے اور ان کا کیریر شکست ہوگیا ۔

لیک آخری (اور ہمہ گیر) سبب ملک کی عام فضا جس میں دورنگی پنپ رہی ہے اور قدریں منھ چھپا رہی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کھلاڑی اس صحت مند اور حوصلہ افزا افتخار سے محروم ہوگئے ہیں جو کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتا اور جو سیلاب کی طرح بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے ۔

ریاض الدین احمد*

امریکہ میں مسلم معاشرہ

امریکن بنیادی طور پر اہل جستجو ہیں۔ ان کی جستجو نے آج سے تقریباً پانچ سو سال قبل امریکہ کو دریافت کیا۔ و[illegible] انیک پابند جستجو ہیں۔ وہ کسی مقام پر ٹھہرنا نہیں جانتے۔ زندگی کے ہر موڑ پر وہ آگے بڑھنے کے راستے تلاش کر[illegible] رہتے ہیں۔

اس مزاج نے ان کو ایک طرف خلاء میں پہنچا دیا تو دوسری طرف اخلاقیات کے قعر مذلّت میں ڈھکیل دیا عین اس وقت جب کہ وہ خلاء میں راکٹ کا اسٹیشن تعمیر کر رہے ہیں تو دوسری طرف گربی میلے (Gialbi Fairs) می[illegible] ننگا ناچ نچا رہے ہیں۔ یک نفری خاندان کے لیے مراکز کھول رہے ہیں۔ بے باپ کے ناجائز بچوں کے لیے پناہ گاہیں تیار کر رہے ہیں۔ آوارہ گرد خواتین کے لیے اسقاط حمل کے مراکز کھول رہے ہیں۔ لواطت پرست مرد (Gays) ا[illegible] لواطت پرست خواتین (Lesbians) کے لیے دستوری مراعات کی راہ نکال رہے ہیں۔ عریانیت مائل بہ برہنگی[illegible] ۸۰ رفیصدی اسکولی لڑکے اور لڑکیاں منشیات کے عادی ہیں۔ ۵۰ رفیصدی طلباء و طالبات جنسیات میں ملو[illegible] ہیں۔

اس ماحول میں امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کو بڑا چیلنج ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے علوم کی دوڑ میں و[illegible] ان کے شانہ بشانہ کام کر رہے ہیں۔ سائنس کے میدان میں انہوں نے اپنا خاصا وقار پیدا کر لیا ہے اور ناسا NASA جیسے خلائی مرکز پر یا یو۔این۔او (U.N.O) کے اداروں میں یا یونیورسٹیوں میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ ایک صاحب مجھے ملے جو کسی زمانے میں ہندوستان کے کسی اسکول میں ٹیچر تھے۔ اس وقت ایک امریکن یونیورسٹی کے شعبۂ انگریز[illegible] کے صدر ہیں۔ اس کے علاوہ حافظ اور قاری بھی ہیں۔ کھیل کے میدان میں باسکٹ بال کا مقبول ترین کھلاڑ[illegible] حکیم علاجوان اور کئی یونیورسٹیوں کے ٹاپر (Toppers) ہیوی ویٹ (Heavy Weight) کا قومی چمپین ٹائی سن (Tyson) بھی مسلمان ہو گیا ہے۔

منشیات کے انسداد میں حکومت ناکام رہی ہے۔ لیکن مسلمانوں نے بڑا کردار ادا کیا۔ اور سابق صد[illegible] بش (Bush) نے اس کی تعریف کی اور مسلمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ میرے سب سے چھوٹے پوتے کو (عم[illegible]

---

* ۸۲۲ A/۲، نوراللہ روڈ، الہ آباد (یوپی)

۸ سال) درجہ ۵ رکے اختتام پر انسداد منشیات کی مہم میں حصہ لینے کے لیے سرٹیفکٹ ملا ہے۔

امریکی معاشرے میں رہنے سہنے کے باوجود مسلم خواتین میں عریانیت کا لباس کہیں خال خال بھی نہیں نظر آیا۔ پردہ نہ کرنے کے باوجود وہ لباس کے معاملے میں کافی محتاط ہیں اگرچہ حدود شرعی میں نہ ہوں۔ نیویارک میں کچھ خواتین نے شرعی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اپنے لباس میں یہ تبدیلی کی ہے۔ شلوار پر کافی لمبا کرتا اور پورے سر کو ڈھانکنے کے لیے ایک بڑا رومال۔ ایک شہر میں ایک طالبہ کے کالج میں نقاب پہن کر جانے پر پولیس کارروائی کی نوبت آئی مگر اس نے مقدمہ لڑ کر اپنا حق حاصل کیا۔ یہ زریں مثالیں کم سہی مگر رجحان کا پتہ دیتی ہیں اور اخبارات انہیں شاہ سرخیوں سے شائع کرتے ہیں۔ ابھرتی ہوئی نسل پر ان کی زبردست چھاپ پڑتی ہے۔ ایک لڑکی نے رچمنڈ یونیورسٹی میں پردے پر اپنا ایک امتحانی مقالہ (Dissertation) پیش کرتے ہوئے اس کی افادیت پر اظہار خیال کیا اس کو اس مضمون پر "A" ملا۔ مسلمان لڑکیاں جو کار چلاتی ہیں انہوں نے اپنی گاڑی پہ کوئی اسلامی نشان لگا رکھا ہے مثلاً ایک کار پر جو تختی لگی ہوتی ہے اس پر لکھا ہے (Allah is only a prayer away) یعنی تمہارے اور اللہ کے درمیان میں صرف ایک نماز کا فاصلہ ہے۔

حرام کھانوں منشیات اور شراب سے عام مسلمان پرہیز کرتا ہے خواہ وہ دینداری میں آزاد منش ہی کیوں نہ ہو۔ بڑے بڑے شہروں میں حلال گوشت اور حلال کھانوں کی دکانیں موجود ہیں واشنگٹن میں ایک کمپنی ہے جس کا نام ہی حلال کو (Halal Co) ہے۔ چھوٹے شہروں میں حلال گوشت وین (Van) پر لاکر تقسیم کرتے ہیں۔ لوگ اپنی ضروریات کی اطلاع ان کو قبل از وقت بذریعہ ٹیلی فون کر دیتے ہیں۔ قربانی کے لیے بھی حلال دکانوں پر انتظام رہتا ہے۔ لوگ جانور پسند کرکے انھیں قربانی کا آرڈر دیتے ہیں۔ ہوسٹن میں ایک اسلامی مرکز شہر سے تقریباً ۶۰ میل کے فاصلے پر ہے، وہاں ایک بار میرا جانا ہوا طریقہ یہ تھا کہ ایک ٹریلر (Trailer) پر دو سو کے قریب بکرے لائے گئے۔ لوگوں نے وہیں خریدے قربانی وہیں ہوئی اور دن بھر گوشت کے پکوان پکتے رہے۔ شام کو لوگ واپس گئے۔

بازاروں میں ہر کھانے کی چیز پر غذائی اجزا کا لیبل لگا ہوتا ہے۔ اس لیے لوگ آسانی سے معلوم کر لیتے ہیں کہ اس میں کسی حرام چیز کا جزو تو نہیں ہے ایک چھوٹے سے شہر وسٹن (Weston) میں ہماری شرکت ایک شادی میں ہوئی تو معلوم ہوا کہ گوشت باہر سے منگانے کا اہتمام کیا تھا حالانکہ وہ لوگ نسبتاً آزاد خیال مسلمان تھے۔

عام طور پر وہاں مسلمانوں میں نماز کا چرچا ہے۔ دعوتوں میں نماز باجماعت کا انتظام ایک لازمہ ہے۔ سبھی مہمان جماعت میں شریک ہوتے ہیں۔ خواتین اپنی نمازیں الگ پڑھتی ہیں مگر مسجدوں میں خصوصاً جمعہ اور عیدین میں خواتین کی تعداد نصف کے قریب ہوتی ہے۔ نیویارک، واشنگٹن، ہوسٹن، رچمنڈ وغیرہ جیسے شہروں میں مرکز اسلامی بڑے عالی شان ہیں۔ ان مراکز پر مدرسے اور لائبریریاں بھی ہیں۔ واشنگٹن میں ایک کمپیوٹر سافٹ ویر (Soft Ware) کا مرکز بھی ہے۔ جہاں ایک ڈسک (Disc) عالم کے نام سے تیار ہوا ہے۔ یہ علوم قرآنی کا انسائیکلوپیڈیا ہے اور منٹوں میں قرآنی معلومات فراہم کر سکتا ہے۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

مراکز پر اسلامی تعلیمات کا کام زیادہ تر خواتین کے ہاتھ میں ہے۔ رچمنڈ میں بھی خواتین اعزاز
پر کام کرتی ہیں۔ مگر اپنا کام بڑی محنت، شوق اور پابندی اوقات کے ساتھ کرتی ہیں۔ خواتین اپنے
گھروں میں طلباء اور طالبات کے اجتماعات کرتی رہتی ہیں۔ یہ اجتماعات کسی نہ کسی کے گھر باری بار
بڑی پابندی سے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر بچوں کو سوالات کرنے کی پوری آزادی ہے۔ امریکی ماحول ج
وہ گزر بسر کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں بچپن ہی سے شکوک پیدا کر دیتا ہے۔ اجتماعات میں ان کے شکو
رفع کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ ہوسٹن کے ایک خاندان میں میں نے دیکھا کہ بچوں نے نماز کا
کمرہ الگ بنالیا ہے اور وہ خود ہی جماعت کرتے ہیں اور ان کے دوست احباب جو بروقت موجود ہو
سب کے سب شریک ہوتے ہیں۔

رچمنڈ کے اسلامی مرکز پر ماہ رمضان میں ہر سنیچر کو افطار ڈنر اور تراویح کی دعوت ہوتی ہے
کے قریب مرد اور عورتیں اکٹھا ہوتی ہیں۔ خواتین اپنے گھروں سے کچھ نہ کچھ کھانا پکا کر لاتی ہیں۔ اس طرح کھا
کافی انبار لگ جاتا ہے۔ عشاء سے پہلے کھانا ختم ہو جاتا ہے مگر تراویح کے بعد میٹھا چلتا ہے۔ کئی قسم کی ڈشیں
کی ہوتی ہیں اور آئس کریم بھی۔ اس سال تراویح کے لیے ایک مصری حافظ بلائے گئے تھے۔ دس رکعت
پڑھاتے تھے اور دس رکعت ایک ۱۷ سالہ امریکن سیاہ حافظ۔ حرمین شریفین میں بھی اس طرح قرآن س

جمعہ کی نماز میں بعض لوگ اپنے شیر خوار بچوں کو بھی لے کر آتے ہیں کیوں کہ اس وقت خاتون خانہ
پر ہوتی ہے۔ بچے کو ایک چھوٹے سے بستر میں محفوظ کر کے اپنے قریب ہی صف کے کنارے لگا دیتے ہیں۔ ب
بچے بھی نماز کی صف میں اپنے باپ کے برابر ہی کھڑے ہوتے ہیں۔ ان پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ ایسے ن
ہمارے ملک کی مسجدوں میں نہیں ملتے۔ خواتین مردوں کی صفوں سے ہٹ کر کافی پیچھے کی طرف اپنی صفیں بنا
ہیں۔ مردوں اور خواتین کے وضوخانے اور غسل خانے الگ الگ ہیں نہایت صاف ستھرے۔ ہر وضوخانے
کاغذی تولیے اور پاخانوں میں ٹیشو پیپر (Tissue Paper) اور لوٹے موجود رہتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ مسجد کی حاضری نے مسلم خواتین میں دینی رجحان اور فواحشات سے اجتناب کی بہت
افزائی کی ہے۔ (واللہ اعلم)

مگر ایک افسوسناک صورت ہمیں ہوسٹن (Texas) میں نظر آئی۔ وہاں ایک بڑا اسلامی مر
ہے اور حال ہی میں ایک عالی شان مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ مگر جب ہم نومبر ۹۴ء میں وہاں گئے تو مسجد بند پڑی
کیوں کہ لوگوں میں نظریاتی اختلافات تھے۔ لیکن جب مئی ۹۵ء میں گئے تو بحمد اللہ مسجد کھل گئی تھی اور و
نماز ادا کی۔

امریکہ کی مساجد میں جمعہ کا خطبہ سعودیہ کی طرح طویل ہوتا ہے۔ پہلے حصہ میں چند آیات قرآنی کی تلا
اور تشریح ہوتی ہے اور اسی سے متعلق حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ موضوع اکثر حالات حاضرہ پر روشنی ڈالنے و
ہوتا ہے۔ رچمنڈ کے امام ایک فلسطینی ہیں۔ وہ ایک حلال غذائی دکان کے مالک ہیں۔ اور امامت عا
طور پر کرتے ہیں۔ ان کا تبصرہ انگریزی زبان میں کافی مقبول ہے۔ مگر ایک مستقل امام کی تلاش ہو رہی

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

اب امام کے لیے ایک وسیع دومنزلہ مکان تعمیر ہو گیا ہے۔ اس مکان کو آراستہ کرنے کے لیے ۷۵ ہزار ڈالر کی اپیل کی گئی ہے۔

عید کی نماز میں رچمنڈ کے اسلامی مرکز پر تقریباً دو ہزار مسلمانوں نے نماز ادا کی۔ نماز کے وقت وہاں برف باری ہو رہی تھی۔ مگر یہاں بارش یا برفیلی بارش سے زندگی کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ نہ راستوں میں کہیں کیچڑ یا گندگی ہوتی ہے۔ نماز کے بعد کسی نہ کسی کے یہاں دعوت عام کا نظم ہوتا ہے۔ لوگ ملتے ملاتے گھر جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی دن چلتا ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایک دن رچمنڈ میں دعوت عام (Open House) تھی۔ پڑوسی امریکن خاندانوں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ ان لوگوں نے عید کے کھانے بڑے ذوق وشوق سے کھائے۔ ہمارے پڑوس کے سبھی مکانات تقریباً ۷-۸ کمروں کے ہیں۔ مگر عموماً ان کی آبادی ایک میاں ایک بیوی اور ایک کتے پر مشتمل ہے۔ اگر چھوٹا بچہ ہے تو وہ بھی ایک سہی۔ لیکن ہم لوگ جب ٹہلنے نکلتے تھے اور یہ لوگ بھی کسی وجہ سے باہر ہوتے تو سلام میں سبقت لے جاتے۔ پاس سے موٹر میں گزرنے والے بھی سلام کرتے جاتے۔ ضعیف اور معذوروں کا یہ لوگ بہت خیال کرتے ہیں۔ دکانوں پر معذوروں کے لیے مخصوص پارکنگ لاٹ دروازے کے قریب ہوتے ہیں۔ مسجدوں میں بھی ان کے لیے مخصوص پارکنگ لاٹ ہوتے ہیں۔ ہم جب کسی بازار میں داخل ہوتے تو ہم سے پہلے جانے والا مرد یا خاتون خود کار دروازوں کو روک کر کھڑے ہو جاتے تا ایں کہ ہم اندر داخل ہو جائیں۔ دکانوں کے اندر معذوروں کے لیے موٹر سے چلنے والی کرسیاں ہیں اسے لے کر وہ بازار میں گھوم سکتے ہیں۔ ہم ایک بار ہوسٹن میں اپنی پوتی صوفیہ کمال کا گریجویشن دیکھنے گئے وہاں موٹروں کی لائن اتنی لمبی تھی کہ سبھی کو تقریباً آدھا میل پیدل چلنا پڑتا۔ مگر ہمارے ایک عزیز شاہد میاں جو کار چلا رہے تھے۔ انہوں نے پولیس کنٹرول والوں سے کہا کہ ہمارے ساتھ کچھ ضعیف لوگ ہیں انہیں ہال کے دروازے پر اتارنا ہے۔ ایک پولیس والا ہمارے ساتھ ہو لیا اور ہماری کار کو گیٹ پر پہنچا دیا۔

آج کل امریکہ میں فیملی لائف پر واپس لانے کا بڑا چرچا ہے۔ ایک بار ہم ایک بڑے مارٹ میں بیٹھے ہوئے تھے ہماری چھوٹی پوتی آئس کریم لا لاکر ہمیں دے رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک امریکن جوڑا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے اشارہ کر کے ہماری پوتی کو بلایا۔ اور بات یوں شروع کی "میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ لوگ تمہارے دادا دادی ہیں"۔ نصرت نے اثبات میں جواب دیا۔ تو انہوں نے کہا "تم کیسی خوش قسمت ہو کہ اپنے دادا دادی کے ساتھ ہو۔ ہم ایسی زندگی کے لیے ترستے ہیں"۔

وہ اپنے ملک میں پھیلی ہوئی عریانیت سے بھی عاجز ہو گئے ہیں۔ اس کا ایک مظاہرہ یہ ہوا کہ ہم لوگ ایک پارک میں ٹہل رہے تھے۔ میری اہلیہ سر سے پیر تک چادر میں لپٹی ہوئی تھیں۔ چند امریکی خواتین ایک بینچ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہمیں ضعیف دیکھ کر انہوں نے پیش کش کی ہم بینچ پر بیٹھ جائیں وہ کہیں اور چلی جائیں گی۔ ہم نے معذرت کی۔ تو چلتے چلتے انہوں نے میری اہلیہ کو روک کر کہا۔ اپنے قومی لباس میں تم کتنی اچھی معلوم ہوتی ہو"۔

ایک بار رچمنڈ میں شادی کی ایک تقریب میں ہم شریک ہوئے۔ نکاح ہو چکا تھا اور اس دن دلہن

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی*

مسلمانوں کے تعلیمی مسائل اور ان کی ذمہ داریاں

ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے مسائل کا جائزہ اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ گذشتہ ۵، سال کی تاریخ کا بھی جائزہ نہ لیا جائے۔ اس کا ایک دور ۱۸ ویں صدی کی ابتدا سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا دور ۱۹۴۷ء سے شروع ہوتا ہے جس کا سلسلہ جاری ہے۔ پہلا دور انگریزوں کے دورِ حکمرانی سے متعلق ہے اور دوسرا دور انگریزوں کی حکومت کے خاتمے، ملک کی تقسیم اور مکمل آزادی سے متعلق ہے۔

مسلمانوں کی ایک مخصوص تعلیمی، تہذیبی اور دینی آئیڈیالوجی ہے۔ اس مسئلے میں وہ بے حد حساس ہیں، اس کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی دینا گوارہ کر لیتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان تفصیلات میں جایا جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے مسئلے میں ماہرین تعلیم کے مختلف نظریات کا بھی مختصر جائزہ لے لیا جائے تاکہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی حقیقت پسندی اور معقولیت واضح ہو سکے۔

ماہرین تعلیم کے نظریات:

تعلیم سے مراد وہ تربیت ہے جو بچے کی بنیادی خوبیوں کو پروان چڑھائے جس سے بچہ ان چیزوں سے نفرت کرنے لگے جن سے نفرت کرنا چاہیے اور ان چیزوں سے محبت کرنے لگے جن سے شروع زندگی سے آخر زندگی تک محبت کرنا چاہیے۔ ایسی تعلیم میرے نزدیک صحیح تعلیم کہی جا سکتی ہے۔

"تعلیم کا اثر انسان پر اتنا پڑتا ہے کہ اگر اسے صحیح تعلیم و تربیت دی گئی تو اس میں فطری و طبعی صفات نمودار ہوتی ہیں، لیکن اگر انسان کو غلط تعلیم دی گئی تو انسان خطرناک درندہ یا جنگلی جانور بن جاتا ہے۔" (افلاطون)

"تعلیم کا کام اور مقصد یہ ہے کہ انسان کو مکمل زندگی گزارنے کے لیے تیار کرے۔" (ہربرٹ اسپینسر)

"انسان کی اصلاح کے لیے صحیح علم سے زیادہ اور کوئی چیز نہیں۔ صرف وہ تعلیم قیمتی ہے جو انسان کو برائیوں سے محفوظ رکھے اور انسان کی مادی اور روحانی ترقیات کی ضامن بن سکے۔" (مہاتما گاندھی)

"میں محسوس کرتا ہوں کہ طالب علم کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی تربیت محض ذہنی ترقی سے زیادہ قیمتی ہے۔" (ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ)

---

* کرامت منزل، اکبری گیٹ، لکھنؤ۔

اطلاع بذریعہ سائرن دی جائے۔ اُن دنوں یہ سائرن بابِ اسحاق کے اوپر لگا ہوا تھا اور اس کا بٹن نیچے ہی برآمدے میں تھا جو ایک لکڑی کے بکس میں تھا اور اس پر تالا لگا ہوا تھا۔ طلبا پہلے تو سائرن بجانے والے کے پاس گئے مگر اس نے کہا کہ پہلے مجھے اجازت نامہ لا دیجیے۔ چوں کہ وائس چانسلر (ذاکر صاحب) باہر تھے، طلبا رجسٹرار کے پاس گئے۔ رجسٹرار نے صرف یہ کہا کہ ذاکر صاحب آتے ہی ہوں گے اُن کا انتظار کر لیجیے میں اجازت دینے سے قاصر ہوں۔ طلبا نے نہ جانے اس کا کیا مطلب نکالا اور ایک ہیجان سا اُن میں پیدا ہوگیا۔ بہرحال وہ سب کے سب پھر یونین آگئے اور وہاں تقریریں ہوتی رہیں۔ بعد میں یہ طے پایا کہ عام طور پر طلبا یونین میں ہی رہیں۔ صرف چند لوگ وی۔ سی کی کوٹھی پر (موجودہ وی۔ سی لاج ذاکر صاحب کے زمانے میں ہی وی۔ سی کی رہائش گاہ کے لیے منتخب ہوا تھا) جائیں اور ذاکر صاحب کے آتے ہی اُن سے اجازت حاصل کریں۔

تقریباً ۳۰۔۴۰ طلبا وی۔ سی لاج پہنچے اور باہر ہی انتظار کرتے رہے۔ ذاکر صاحب اپنی ذاتی کار (آسٹن سکس) سے دہلی سے آرہے تھے۔ اتفاقاً گاڑی میں کچھ خرابی ہوگئی اور مجبوراً خورجہ رکنا پڑا۔ بہرکیف گاڑی ٹھیک ہوئی اور وہ تقریباً ½۱۱ بجے شب کو یہاں پہنچے۔ اتنی رات گئے اپنی کوٹھی کے باہر اتنے سارے طلبا کو کھڑا دیکھ کر چونکے۔ گاڑی رکوائی اور دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ طلبا نے (جو خاصے جوش میں تھے) بغیر کسی تمہید کے یہ کہا کہ لیاقت علی صاحب کو گولی مار دی گئی ہے اور ہم سائرن بجانا چاہتے ہیں مگر رجسٹرار نہیں بجانے دیتے۔ ذاکر صاحب نے کافی سنجیدگی سے فرمایا کہ آخر آپ کیوں بجانا چاہتے ہیں۔ جس پر طلبا نے کہا کہ ایک تو وہ یہاں کے اولڈ بوائے تھے اور دوسرے ہماری یونین کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ ذاکر صاحب نے قدرے جھلّا کر کہا کہ اگر آپ اپنے رجسٹرار کا کہنا نہیں مانتے تو پھر مجھ سے پوچھنے کیوں آئے ہیں، جائیے! جو آپ کے جی میں آئے کیجیے! بس پھر کیا تھا طلبا سیدھے یونین پہنچے اور پھر وہاں سے باب اسحاق اس چھوٹے سے تالے کو کھولنا کیا بڑی بات تھی۔ ایک ذرا سے جھٹکے میں ہاتھ میں آگیا اور پھر ایک نہیں دو نہیں تین نہیں لڑکوں نے پورے سات سائرن رات کے تقریباً ایک بجے بجائے۔ شہر کے لوگوں نے جب سنا تو گھبرا گئے۔ اس لیے کہ اس وقت مسلسل سائرنوں کا بجنا یقیناً غیر معمولی بات تھی۔ چوں کہ اس وقت صرف ریڈیو اور اخبار ہی ذریعہ ابلاغ میں شامل تھے اور وہ بھی محدود لوگوں کے پاس ہی ہوتے تھے۔ وہ خبر ممکن ہے بہتوں نے سنی بھی نہ ہو۔ بہرحال شہر میں بھی ایک کھلبلی مچ گئی۔ ہاں البتہ اخباری نمائندوں نے فوراً دوڑ لگائی اور جاننے کی کوشش کی کہ واقعہ کیا ہے۔ مگر یہ وہ دور تھا کہ اکثر اخبارات کا ذہن اس مرکزِ تعلیم کے تئیں صاف نہ تھا اور وہ اس سے متعلق ہر چیز کو ایک خاص رنگ کی عینک لگا کر دیکھنے کے عادی تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہی ہوا کہ دوسرے دن اکثر اخبارات اور خصوصاً ہندی اخبارات کی شاہ سرخیوں میں یہ بات تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا اپنے شیخ الجامعہ تک کا کہنا نہیں مانتے۔ کئی اخبارات نے کچھ اور مزید گل کاریوں کی کوشش کی اور ایک انگریزی اخبار نے تو یہاں تک لکھ دیا 'MEND IT OR END IT'

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں اُس زمانے تک سرگرمی اور درس و تدریس پر پابندی نہیں ہوتی تھی۔ یہی حال سرسید ہال کے کمروں کا بھی تھا۔ اُس وقت تک وی۔ سی کا دفتر وکٹوریہ گیٹ کے نیچے (دائیں جانب) جہاں اب سرسید ہال (جنوب) کا پرووسٹ آفس ہے تھا۔ ذاکر صاحب تقریباً ۱۰ بجے اپنے دفتر تشریف لاتے تھے۔ اس سے پہلے کی ملاقاتیں اُن کی رہائش گاہ پر ہوتی تھیں۔

اس واقعہ کے ایک دن بعد جب ذاکر صاحب تشریف لا رہے تھے تو سامنے سے (پراکٹر آفس کی جانب سے) کچھ طالبات بھی ادھر آرہی تھیں۔ سرسید ہال کے کسی کمرے کے بیک روم سے اُن طالبات پر کسی لڑکے نے آوازے کسے جن کو ذاکر صاحب نے سن لیا۔ ایک تو اخبارات کے رکیک حملوں سے وہ بھنے بیٹھے تھے اور اس پر یہ واقعہ! ذاکر صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

مسلمانوں نے اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں بھیجنے میں احتیاط کی اور انھیں خصوصیت سے اپنے اسکولوں میں اپنے طرز پر اور ساتھ ہی عربی و فارسی کی تعلیم دیتے رہے۔ ہندوؤں کو سنسکرت زبان سے اتنا جذباتی تعلق نہیں تھا جتنا مسلمانوں کو عربی و فارسی سے تھا۔ اس لیے انھوں نے پوری گرم جوشی سے جدید تعلیم کا استقبال کیا اس نے ان کے لیے سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھول دیئے اور وہ ترقی کے میدانوں میں بہت آگے نکل گئے۔ ۱۸۵۱ء میں برٹش علاقوں میں انگریزی سرکاری زبان قرار پاگئی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو ملازمتوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ انگریزوں نے قدیم طرز تعلیم پر پابندی نہیں لگائی اور نہ اسکول بند کیے لیکن اپنے اسکولوں کے کھولنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ ان کے بچے مذہبی تعلیم کے بغیر کوئی اور تعلیم حاصل کریں۔

۱۸۵۷ء میں انگریز حکومت کے خلاف آخر جذبات بھڑک اُٹھے۔ دہلی اور اس کے نواح میں اور اترپردیش میں بغاوت پھیل گئی جن میں مسلمان پیش پیش تھے اور اُن کے ساتھ ہندو بھی شریک تھے، لیکن بغاوت ناکام ہوئی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ہر سطح پر ان انگریزوں کے غیض وغضب کا شکار ہوئے اور انھیں بڑی مصیبتوں سے سابقہ پڑا۔ کثرت سے انھیں پھانسیاں دے دی گئیں، جائدادیں ضبط کرلی گئیں، مکانوں کو گراکر ہل چلا دیئے گئے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں وہ گرفتار ہو گئے۔

بہار اور بنگال کی حکومت میں ۱۸۵۲ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک ۲۴۰ ہندوستانیوں کو سرکاری ملازمت دی گئی، جس میں ہندوؤں کی تعداد ۲۳۹ اور مسلمان صرف ایک تھا۔ ۱۸۶۹ء میں میڈیکل پریکٹس کے لیے ۱۰۴ آدمیوں کو لائسنس دیئے گئے جس میں ۹۸ ہندو، ۵ انگریز اور صرف ایک مسلمان تھا۔

مسلمانوں کی معاشی اقتصادی ہر حیثیت سے ایسی حالت زار ہوئی کہ انگریز گورنر جنرل کو بھی ترس آیا اور اس نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ اسکول کھولنے کی اجازت دی جس میں فارسی اور عربی پڑھائے جانے کی اجازت تھی۔ ملازمت کے دروازے مسلمانوں کے لیے بند تھے وہ بھی آخر کھول دیئے گئے لیکن ان اسکولوں میں قرآن پڑھانے کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے ان اسکولوں میں بھی مسلمان محتاط تھے۔

سرسید اور علی گڑھ تحریک:

سرسید احمد خاں جن کی نظروں کے سامنے یہ ساری تباہی آئی تھی اور منصفی کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ جدید تعلیم مسلمانوں کو موجودہ ذلت و پریشانی سے نکالنے میں معاون ہوسکتی ہے۔ انھوں نے خود اس کا نقشہ کھینچا ہے:

> "اور جو حالت اس وقت قوم کی تھی وہ کسی طرح دیکھی نہیں جاتی تھی، آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک ہونا چاہیے۔"

> "ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہیے اور اگر ہم میں خود داری (Self Respect) کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائے پر نہیں۔"

سرسید حکومت کے وفادار ہونے کے باوجود ملک وملّت کے بہی خواہ تھے۔ ان کے نزدیک حکومت سے وفاداری

کی شرط ضمیر فروشی نہیں تھی ان کی خواہش تھی کہ مسلمان جدید علوم وفنون میں کسی سے پیچھے نہ رہیں لیکن جدید تعلیم کا انتظام اسلامی ماحول میں ہو۔ وہ ایک سال کے لیے اپنے دونوں صاحبزادوں کے ساتھ ۱۸۶۹ء میں انگلینڈ گئے۔ وہاں اس نظام تعلیم کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور اکتوبر ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آئے۔

اپنے صاحبزادے سید محمود کی مدد سے انھوں نے تعلیم کی ایک اسکیم تیار کی، ایک کمیٹی بنائی تاکہ وہ تعلیمی مسائل کا جائزہ لے۔ وہ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ سرکاری اسکول مسلمانوں کی تعلیم کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو خود اپنے اسکول قائم کرنے چاہئیں۔ کمیٹی کا اس پر پورا اتفاق تھا کہ دینی تعلیم لازمی ہے اور اسے نصاب تعلیم کا جزو بنانے کی ضرورت ہے۔ اس طرح ۱۸۷۱ء میں جدید تعلیم کی طرف ایک مثبت قدم اُٹھایا گیا۔ اس مقصد کے لیے سرسید نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی بنائی جس نے ۴ سال میں ۱۶ لاکھ کی رقم جمع کرلی۔ علی گڑھ کو اس مقصد کے لیے انتخاب کیا اور ایم۔ اے۔ او (M.A.O.) کالج کی بنیاد ڈالی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو داخلہ لینے کی اجازت تھی لیکن مسلمان لڑکوں کے لیے نماز اور قرآن مجید پڑھنا اور دینی تعلیم لازمی تھی۔ ۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن کو اس کالج کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس موقع پر سپاس نامہ میں بہت واضح طور پر اعلان کیا گیا:

> "ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک ایسے کالج کا قیام عمل میں آرہا ہے، جو کسی فرد واحد کی اعانت یا کسی حکمراں کی سرپرستی کا مرہون منت نہیں ہے بلکہ پوری قوم کی اجتماعی خواہش اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ خدا کرے یہ کالج ایک یونیورسٹی میں تبدیل ہوجائے اور اس کے فرزند ملک میں سچائی، وسعت قلبی اور اعلیٰ درجے کے کردار کا مظاہرہ کریں۔"

آکسفورڈ اور کیمبرج کے طرز پر اس کالج کی حیثیت اقامتی ادارے کی تھی اور پورے ملک میں مسلمانوں کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا اور واحد ادارہ تھا۔ شروع سے اس کالج میں ہندی اور سنسکرت پڑھانے کا انتظام تھا۔ ۱۸۷۸ء میں سرسید نے یوپی میں گزشتہ بیس سال کے اعداد وشمار شائع کیے۔ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلیمی حیثیت سے تناسب اور مقام واضح ہوجاتا ہے۔

مسلمانوں کا تعلیم میں تناسب:

۳۱۵۵ ہندو اور صرف ۵۷ مسلمان تھے جنھوں نے بی۔ اے، ایم۔ اے آرٹس میں اور قانون انجینیرنگ اور میڈیسن میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ ۳۷۳ آرٹس گریجویٹ میں صرف تیس مسلمان اور ۳۲۶ پوسٹ گریجویٹ میں صرف ۵ مسلمان تھے۔ بنگال وبہار میں صورت حال اور نازک تھی۔ ۸۱-۱۸۸۰ء میں ۶۶۸۶ طلبا انگلش ہائی اسکول میں ہندو اور مسلمان صرف ۳۶۳ تھے۔ مڈل اسکول میں ۲۹۴۶۹ ہندو اور مسلمان ۲۴۳۴۶ تھے۔ اس صورت حال سے متاثر ہوکر سید امیر علی نے ایک کمیٹی بنائی اور تقریباً پورے ملک کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو اپنے ادارے قائم کرنے کی ترغیب دی۔

سرسید نے ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس All India Mohammadan Educational Conference) قائم کی اور پورے ملک میں مرکزی شہروں میں جلسے کیے اور تعلیم کے مسئلے کو آگے بڑھایا۔

مسلم یونیورسٹی کا قیام:

سرسید کا مارچ ۱۸۹۸ء میں انتقال ہوگیا لیکن اسی سال لاہور کی کانفرنس میں مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی اسکیم پیش کی گئی۔ ۱۹۱۱ء میں سیکریٹری آف اسٹیٹ نے اس تجویز کو اصولی طور پر تسلیم کرلیا۔ مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد ۳۱ جولائی

۱۹۲۰ء کے گزٹ میں [illegible] کیا۔
۲۷ اگست ۱۹۲۰ء کو یہ بل Imperial Legislation Council میں پیش کیا گیا۔ ۱۶ ستمبر
۱۹۲۰ء Aligarh Muslim University Act (ایکٹ نمبر ۴۰ برائے ۱۹۲۰ء) عمل میں آیا۔ ۱۷ دسمبر کو
کو یونیورسٹی کی افتتاحی تقریب عمل میں آئی۔

ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کی تعلیم کا یہ اہم ترین مرحلہ تھا۔ اگر یہ کوشش نہ ہوتی تو مسلمانوں کا مستقبل
تاریک ہو جاتا۔ ایم۔ اے۔ او کالج کے ۴۵ سالہ قیام کے دوران ہزاروں کی تعداد میں مسلمان اور ہندو تعلیم حاصل کر
کردار کے حامل اور محب وطن تھے جنھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں امتیاز پیدا کیا۔

مسلم یونیورسٹی کے عہد ساز فرزند :

راجہ مہندر پرتاپ، [illegible]شوری پرشاد، مولانا محمد علیؒ، مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر ذاکر
احمد قدوائی، مولانا حسرت موہانی، خان عبدالغفار خاں، شیخ عبداللہ، جنرل ایوب خاں، نواب زادہ لیاقت علی

اس موقع پر ایک اہم واقعہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مہاتما گاندھی نے جب یکم اگست ۱۹۲۰ء کو نان کو
(Non-Co-operation movement) شروع کرنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی سے ا
کرنی چاہی لیکن ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر وہ علی برادران اور مولانا آزاد کے ساتھ علی گڑھ آئے جہاں ا
کالج میں ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ ان کی تحریک کے نتیجے میں کالج کے ایک ہزار طلباء میں سے ۵۰۰ طلب
چھوڑ دی اور جنگ آزادی میں شریک ہو گئے اور کالج ایک مہینے تک بند رہا۔

ان واقعات کے تذکرے کا بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل اس تاریخی پس منظر میں سمجھنا آسان
اُن کی حب الوطنی، اسلام سے وابستگی، برادرانِ وطن سے رواداری، جنگِ آزادی میں شرکت، اپنے کلچر اور اپنے
کو باقی رکھنے کے جذبے کے ساتھ اس کے لیے تعلیمی میدان میں جدوجہد کی صحیح تصویر سامنے آ جائے۔

آزادی کے بعد مسلمانوں کے تعلیمی مسائل :

۱۹۴۷ء کے بعد ملک میں آنے والی تبدیلیوں سے مسلمانوں کی بے چینی خصوصیت سے تعلیم کے مسئلے میں بیشتر
پیچیدگیوں سے ان کی اُلجھنوں میں مسلسل اضافہ ہوا ہے اور ایک دن بھی انھیں یکسوئی نصیب نہیں ہو سکی ہے۔ انھیں
وطن کے برعکس زیادہ محنت اور جدوجہد سے سابقہ ہے۔ ہر مسلمان بچے کو کم سے کم پانچ زبانیں اردو یا کوئی مادری زبان ہندی، انگریزی،
سنسکرت سیکھنی لازمی ہیں جب کہ ہندو بچے کو دو یا تین زبانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ دنیا کے ماہرینِ تعلیم اس پ
کہ پرائمری تعلیم اگر مادری زبان میں دی جائے تو بچے کا ذہنی نشو و نما اور ترقی تیز ہوتی ہے۔

پرائمری تعلیم :

آزادی سے پہلے تمام پرائمری اسکولوں میں اساتذہ کے لیے دو زبانیں جاننا ضروری تھا۔ اس لیے سرکار
بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں میں کسی مرحلے پر مسلمان بچوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے میں کوئی دشو
ہوتی تھی لیکن اب یہ سہولت انھیں صرف ان ہی اسکولوں میں حاصل ہے جو خود اُن کے قائم کردہ یا زیرِ انتظام ہیں۔ مہ
بنگال، آندھرا پردیش میں بعض مرکزی شہروں میں چند ایسے اسکول ضرور ہیں، جہاں ہائر سکنڈری تک اردو میڈیم

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

کی سہولت ممکن ہے لیکن پورے صوبے میں ہر جگہ یہ سہولت موجود نہیں ہے جب کہ شمالی ہندوستان میں اتر پردیش، راجستھان، بہار، گجرات، ہماچل پردیش، مدھیہ پردیش میں تقریباً سارے اداروں میں اب تعلیم صرف ہندی میڈیم میں دی جارہی ہے۔

صوبہ اتر پردیش میں سرکاری طور پر اردو میڈیم میں اساتذہ کی ٹریننگ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ دوسرے جو ٹریننگ سینٹر ہیں ان میں بھی پورے ضلع میں مشکل سے صرف چند مسلمانوں کو ہندی میڈیم میں ٹریننگ حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے لیکن ان کو اردو میں سبق پڑھانے کا موقع نہیں ملتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان ٹرینڈ اساتذہ کا تناسب ہندو اساتذہ کے مقابلے میں مشکل سے تین چار فی صد ہے۔ آزادی کے بعد سے تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہندی ٹیچروں کا اتر پردیش میں تقرر ہو چکا ہے، ان میں سے شاید ہی کوئی اردو جانتا ہو۔ حالانکہ قومی یک جہتی کا بھی تقاضا ہے کہ پڑوسی کی زبان سمجھی جائے۔ ایک طرف دستور ہند کے آرٹیکل ۳۵۰ (الف) میں ریاستی حکومتوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے پرائمری سطح پر طلباء کو ان کی مادری زبان کے ذریعے تعلیم دی جائے، دوسری طرف اردو ٹیچروں کا صفایا ہو رہا ہے۔ اگر پرائمری سطح پر طلباء کو ان کی مادری زبان اردو میں تعلیم دینے کا بندوبست نہ ہوا تو ثانوی سطح پر اردو میں تعلیم کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ۱۹-۲۰ راگست ۱۹۴۹ء کو مرکزی وزارتِ تعلیم کی اہم کانفرنس ہوئی جس میں پرائمری درجات اور ثانوی درجات میں اقلیتی زبانوں کے طلباء کو ثانوی سطح پر ان کی مادری زبان میں تعلیم دیئے جانے کے بارے میں طے ہوا لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔

نصاب کی کتاب کی عدم فراہمی:

شعبۂ تعلیم کی طرف سے اردو میں کتابیں عرصۂ دراز تک شائع نہیں کی گئیں اور بار بار مطالبے کے بعد کی بھی گئیں تو صرف چند دوسری طرف انسپکٹر آف اسکول دھمکی دیتے رہے کہ غیر منظور شدہ کتابیں پڑھائی گئیں تو ایڈ بند کر دی جائے گی۔ ظاہر ہے والدین کب تک انتظار کرتے اور وہ خالص ہندی میڈیم میں تعلیم دلانے پر مجبور ہو گئے۔

اردو زبان کی حق تلفی:

دستور میں اردو کو قومی زبان تسلیم کیے جانے کے باوجود اور پورے ملک میں بولی اور سمجھی جانے کے باوجود اس کو علاقائی یا سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا گیا۔

دستور کے آرٹیکل ۳۴۵ اور ۳۴۷ کی موجودگی کے باوجود جس میں صوبائی اسمبلی اور صدر جمہوریہ کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایسا حکم جاری کر سکتے ہیں جہاں کسی خاص زبان کے بولنے والوں کی بڑی تعداد اُسے سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کا مطالبہ کرے لیکن اردو والوں کا یہ حق آزادی کے ۳۲ سال بعد بجز بہار گورنمنٹ کے حالیہ اعلان کے تسلیم نہیں کیا گیا۔ جب اردو میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی، زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی کوئی قیمت نہ رہے گی سرکاری ملازمتوں میں اس کے لیے مواقع نہ رہیں گے تو پھر اردو میں تعلیم حاصل کرنے کی کشش باقی نہ رہے گی۔ کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کے پیراگراف ۵۱/۱ میں مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کی اہمیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

> "ہندوستان کی جدید زبانوں کی ترقی کا دارومدار اس پر ہے کہ ان کو تعلیمی نظام میں بالخصوص یونیورسٹی میں کیا مقام دیا گیا ہے۔"

سنسکرت کی سہ لسانی فارمولے میں شمولیت:

سہ لسانی فارمولے کے ذریعے انگریزی اور اردو کو سہولت فراہم ہو سکتی تھی لیکن یوپی کی حکومت نے اردو کے بجائے

سنسکرت کو جو ایک کلاسیکل زبان ہے، سہ لسانی فارمولے میں شامل کرکے اس فارمولے کی غایت ہی ختم کر دی۔
۶۲۔ ۱۹۶۵ء میں سنسکرت کے چار ہزار چھ سو اڑتیس ایڈیشنل ٹیچر یو۔ پی میں رکھے گئے، اردو کے صرف ۴۵۰ و اسکولوں میں۔

مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر راؤ نے ۸ اپریل ۱۹۶۹ء کو لوک سبھا میں اعلان کیا کہ "سنسکرت کو سہ لسانی فارمو دینا دشوار ہے" لیکن صوبائی حکومتوں نے کوئی پرواہ نہ کی۔

کوٹھاری کمیشن کی سفارشات:

کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کے پیراگراف ۸/۳۱ میں یہ کہا گیا ہے کہ وزرائے اعلیٰ کانفرنس میں جو فارمولا منظو میں تعلیم سے زیادہ سیاسی اور سماجی امور کا لحاظ رکھا گیا ہے، رپورٹ کے پیراگراف ۸/۳۲ میں اس احساس کا بھی ذ کہ سہ لسانی فارمولے کے عمل درآمد نے بہت سی دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔

کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ پیراگراف ۵۶/۱ میں مزید کہا گیا ہے:

"گو کہ عام اصطلاح میں اردو علاقائی زبان نہیں ہے مگر یہ آل انڈیا اہمیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ یہ ملک کے مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ لہذا تعلیم کی مختلف سطحوں پر اردو کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔"

۱۹۵۲ء میں اعلان کیا گیا کہ بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے گی۔ ۲۰ اکتوبر ۸۵ء کو پھر اس کا اعادہ آج تک اس پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ اردو جہاں بطور میڈیم کے چل رہی تھی وہاں سے بھی غائب ہوگئی۔ اب زیادہ تر اردو صرف بطور ایک مضمون کے پڑھائی جا رہی ہے۔

اردو کے حقوق کی دیکھ بھال کے لیے ایک ڈپٹی ڈائرکٹر مقرر کیا گیا لیکن اس جگہ پر کوئی اردو داں مقرر نہیں کیا گ کے لیے ہندی ڈپٹی ڈائرکٹر کا تقرر انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ اردو ڈپٹی ڈائرکٹر کے پاس کوئی خاص کام بھی نہیں ہے۔

ثانوی سطح پر اردو تعلیم میں رکاوٹ:

۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۲ء تک برابر حکومت یوپی انٹرمیڈیٹ بورڈ کو ہدایت کرتی رہی ہے کہ وہ اپنے قوانین اور ضوابط ترمیم کرکے کہ جس طرح ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ میں بچے انگریزی میڈیم لے سکتے ہیں، اسی طرح وہ اردو میڈیم لے س آج تک یہ ترمیم نہیں ہوئی اس لیے کوئی اسکول اردو میڈیم نہیں کھول سکتا۔

محکمۂ قومی یک جہتی کی طرف سے جو کتابچہ اردو کے متعلق سہولتوں کے بارے میں ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا اس میں اع گیا کہ ایک اردو بورڈ آف اسٹڈیز قائم کر دیا گیا ہے، اس کا کام ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات کو درسی کتابوں کے بارے میں مشور لیکن ایسی کوئی تنظیم وجود میں نہیں آئی۔ دراصل مسئلہ مشورے کا نہیں درسی کتب کی تیاری کا تھا۔ جونیئر ہائی اسکول کا ا سرکاری طور پر لیا گیا مگر اردو میڈیم کی اہم کتابیں سائنس، جغرافیہ وغیرہ تاریخ امتحان تک بازار میں نہیں آئیں۔

عدالتوں میں اردو کی درخواستیں قبول کرنے کے لیے پہلا حکم ۱۳ اگست ۱۹۶۳ء کو آزادی ملنے کے ۱۶ سال بعد جار ۱۹۷۲ء میں اس پر عمل کرنے کی سختی سے ہدایت کی گئی لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ اردو جاننے والا عملہ مو نہیں ــــ اس حکم G.O.N. 1549/21-10(4)63 میں لفظ جہاں "سنبھو" یعنی جہاں مناسب ہو، بڑھا کر ناممکن العمل گیا ہے۔

ہمارے ملک کی تعلیمی پالیسی کا نفاذ کرنے والوں نے اس کو بے حد پیچیدہ مسئلہ بنا دیا ہے۔ دراصل اس کے پیچھے احیا پرستی اور تخیل پرستی کا جذبہ کارفرما ہے۔ وہ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ یہ ملک ایک جغرافیائی وحدت ہے جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے ہیں۔

سیکولر نظام تعلیم کے باوجود خالص ہندو مذہب اور عقائد کی نصاب میں شمولیت:

درسی کتب کے سلسلے میں جو پالیسی اختیار کی گئی وہ دستور ہند کی پالیسی کے سراسر خلاف تھی۔ سرکاری، نیم سرکاری اور امدادی اسکولوں میں ایسا نصاب رائج کر دیا گیا جو مشرکانہ عقائد، ہندو دیومالا، مذہبی رسم و رواج اور ایسی کہانیوں سے پُر ہے جن کو پڑھنے اور یقین کرنے کے بعد کوئی بچہ حقیقی معنوں میں اسلامی عقائد پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس سے تنگ نظری اور اوہام پرستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ دینی تعلیمی کونسل یوپی (قائم شدہ ۱۹۵۹ء) نے ایسے اسباق کا ایک جائزہ "یوپی کی سرکاری نصابی کتابوں کا قومی یک جہتی کے نقطۂ نظر سے جائزہ" کے نام سے شائع کیا۔

پرائمری اسکولوں کا قیام:

مسلمانوں نے مجبوراً دستور کے آرٹیکل ۳۰ کا سہارا لے کر ۲۰ ہزار مکاتب و درسگاہیں صرف یوپی میں قائم کیں تاکہ اردو زبان اور دینی معتقدات کا تحفظ ہو سکے۔

لیکن مختلف حلقوں سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ان پرائیوٹ تعلیمی اداروں کو قومیا لیا جائے۔

حالانکہ دستور کی آرٹیکل ۲۹ (۱) میں واضح طور پر ضمانت دی گئی ہے کہ ملک کے باشندوں کو خواہ وہ ملک کے کسی حصے میں رہتے ہوں یہ حق ہوگا کہ وہ اپنی مخصوص زبان و رسم الخط اور تہذیبوں کا تحفظ کر سکیں۔

دستوری حق:

۱۹۵۴ء آل انڈیا بمبئی مقدمہ ۴۶۸ میں جسٹس چھاگلا اور دکشت نے مقدمہ کا فیصلہ دیتے ہوئے واضح طور پر کہا:

> "ایک جمہوریت میں شہری کے لیے جو چیز سب سے زیادہ قیمتی ہے اور جو اُس کا حق ہے وہ آزادئ خیال ہے اور مسلمہ ہے کہ خیالات کو کنٹرول کرنے کا آسان طریقہ نوجوانوں کی تعلیم پر کنٹرول ہے۔"

مزید لکھا:

> "اسٹیٹ طلباء کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی اولاد کو وہ تعلیم دلائیں جسے حکومت مناسب سمجھتی ہے۔"

انسانی حقوق کا چارٹر:

انسانی حقوق کے چارٹر میں جس پر ہندوستان کے بھی دستخط ہیں لکھا ہے۔

> "آرٹیکل ۲۶ (۳) طلباء کے والدین کو یہ ترجیحی حق ہے کہ وہ انتخاب کریں کہ اپنی اولاد کو کس قسم کی تعلیم دلائیں۔"

کوٹھاری کمیشن نے جہاں جامع سفارشات کی ہیں وہیں اس نے ایسی سفارشات کی ہیں جن کے نتیجے میں پرائیوٹ تعلیمی اداروں کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا گیا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسکول یا تو سرکاری ہوں یا اسٹیٹ گورنمنٹ کی مرضی کے مطابق اس کے رحم و کرم پر ہوں۔ ظاہر ہے یہ دستور کے آرٹیکل ۳۰ (۱) کے بالکل خلاف ہے "ایک اقلیت کو صرف تعلیمی ادارہ ہی قائم کرنے کا حق نہیں ہے، بلکہ

اس کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا بھی حق ہے۔ حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی اقلیت کو مجبور کرے کہ اس کے تعلیمی ادا نوعیت کے ہوں۔"

کوٹھاری کمیشن کی پڑوسی اسکولوں کی اسکیم

کوٹھاری کمیشن کی سفارش ہے:

"دستورِ ہند کی رو سے ان کے قیام کو روکا نہیں جاسکتا۔ اُن میں سے بہت سے ایسے ہیں جو حکومت سے نہ امداد چاہتے ہیں اور نہ منظور کرانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ریاستی حکومت کا شعبۂ تعلیم ایسے تعلیمی اداروں کو کنٹرول نہیں کرسکتا۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ریگولیشن کے لیے پہلا قدم اُٹھایا جائے یہ مناسب ہوگا کہ تعلیمی اداروں کے لیے لازمی رجسٹریشن کا قانون بنایا جائے اور غیر رجسٹرڈ تعلیمی اداروں کا چلانا جرم قرار دے دیا جائے۔"

حسبِ ذیل وجوہ کی بنا پر ریاستی حکومت کو رجسٹریشن منسوخ کرنے کا اختیار ہوگا۔

۱۔ اسکول کی عمارت یا اس کا کوئی جز اسکول کے لیے مناسب نہیں ہے۔

۲۔ طلبا کی تعداد عمر اور جنس (sex) کو دیکھتے ہوئے عمارت میں گنجائش کم ہے۔

۳۔ مناسب اور معقول تعلیم کا بندوبست طلبا کی عمر تعداد اور جنس کو دیکھتے ہوئے نہیں ہے۔

۴۔ اسکول کا مالک یا اس کا کوئی ٹیچر ایک آزاد اسکول کے لیے مناسب نہیں ہے۔

یہ سفارشات خصوصیت سے نمبر ۴ دستور میں دیئے ہوئے بنیادی حقوق کے منافی اور سپریم کورٹ کے فیصلوں کے ہیں۔ اگر ان سفارشات پر عمل درآمد ہوا تو کسی اقلیتی ادارے کا حکومت کی دست برد سے محفوظ رہنا مشکل ہو جائے گا۔

ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ میں مضامین کا ایسا combination ہوتا ہے کہ اسے مجبوراً اردو چھوڑ دینی پڑ جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا سوال ہے خصوصیت سے میڈیکل، انجینیرنگ اور ٹیکنیکل اس کا حال بھی کچھ کم تشویش ناک نہیں

کالجوں اور یونیورسٹی کی سطح پر دشواریاں:

آزادی کی صبح طلوع ہوتے ہی عثمانیہ یونیورسٹی جو اردو میڈیم تھی اسے ہندی میڈیم یونیورسٹی کر دیا گیا۔ ۱۹۵۱ء یونیورسٹی ایکٹ میں تبدیلی کر کے اس پر سے مسلمانوں کا مکمل کنٹرول ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں چند طلبا کی اشتعال انگیزی کے ناخوش واقعے سے حکومت نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا تھا، حالانکہ ملک کی دوسری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اس سے کہیں ناخوشگوار اور سنگین واقعات پیش آتے رہتے ہیں لیکن ایسا سخت قدم نہیں اُٹھایا گیا۔ ڈیڑھ سَو یونیورسٹیوں میں ایک پر بھی جو خود ان کی قائم کی ہوئی تھی، انھیں کنٹرول سے محروم کر دیا گیا۔ ہمارے اسلاف کی پُرخلوص اور انتھک کوششوں مسلمانانِ ہند کی تمناؤں کا مرکز ہندوستان کے سیکولرزم کی زندہ تصویر جس کے متعلق گجندر گڈکر سابق چیف جسٹس کے کانووکیشن کے موقع پر فرمایا تھا:

"میں نے پندرہ کانووکیشن میں شرکت کی ہے لیکن میں نے آج تک کہیں ایسا نہیں دیکھا کہ یہاں کی طرح طلبا اتنی دیر تک صبر و سکون اور نظم کے ساتھ خاموشی سے شریک رہے ہوں۔"

"یونیورسٹی کی خودمختاری کا اصول بہتر ہے بشرطیکہ اس کا استحقاق ہو اور اگر کوئی یونیورسٹی خودمختاری

کی مستحق ہے تو وہ مسلم یونیورسٹی ہے۔"

میڈیکل کالجوں میں مسلمانوں کا تناسب :

مسلم یونیورسٹی میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں اور بعض دوسرے شعبوں میں ہندو طلباء کا تناسب کہیں پچاس فیصد اور کہیں اس سے زیادہ ہے جب کہ پورے ملک میں مسلمان طلباء کا تناسب ان شعبوں میں دو چار فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ یوپی کے سات میڈیکل کالجوں میں کل ۷۰۹ سیٹیں ہیں جن میں ۳۹۰ جنرل لڑکوں کے لیے ہیں۔ باقی ۳۸۹ میں ۸۷ جنرل لڑکیوں کے لیے اور باقی میں ۱۴۰ اسیڈولڈ کاسٹ، ۹۲ بیک ورڈ لڑکوں لڑکیوں کے لیے، ۴۶ پہاڑی علاقوں کے لیے، ۳۲ سیٹیں پولیٹیکل، فوجیوں وغیرہ کے لیے مخصوص ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم طلباء کی تعداد بعض میڈیکل کالجوں میں ایک دو بھی نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود اخبارات میں بڑا پروپیگنڈا ہوا کہ مسلمان ڈاکٹر اور انجینئر پاکستان چلے جاتے ہیں، حالانکہ ۱۴ دسمبر کو لکھنؤ میڈیکل کالج میں Medical Institute کا سنگ بنیاد کی تقریب کے موقع پر صدر جمہوریہ نے فرمایا کہ پندرہ ہزار ڈاکٹر ملک کے باہر ہیں جن کی بڑی تعداد مسلم ممالک میں بھی ہے۔ اسی طرح ہزاروں انجینئر مسلم ممالک میں ہیں، لیکن ان پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

ڈگری کالجوں کا تناسب :

پورے ملک میں پانچ ہزار ڈگری کالج ہیں۔ مسلمانوں کے صرف سو ڈگری کالج ہیں، ان میں بھی غیر مسلم طلباء کا تناسب خاصا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملک میں اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کا تناسب کیا ہے اور ان کی مشکلات کیا ہیں۔

قومی دھارا :

انھیں اپنی مادری زبان کے مسئلے سے لے کر نصاب تعلیم داخلوں اور اپنے اداروں کو چلانے میں کتنی دشواریوں کا سامنا ہے۔ ذہانت، صلاحیت، محنت میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں لیکن ملک کی تعمیر میں بڑھ کر حصہ لینے کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ آریہ سماجی اگر پنجاب میں اپنے اداروں کو اقلیتی ادارہ تسلیم کراتے ہیں تو کسی کو اعتراض نہیں ہوتا لیکن اگر مسلمان اپنے اداروں کو اقلیتی ادارہ تسلیم کرانے کی جد وجہد کرتے ہیں تو اُن کو قومی دھارے سے الگ ہونے کا طعنہ ملتا ہے، ان کے بڑے سے بڑے شخص کو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ آج تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ قومی دھارا ہے کیا؟ مسلمانوں نے کسی ہندوستانی زبان کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ ہندی قومی زبان قرار پائی تو انھوں نے اسے سیکھنا شروع کر دیا لیکن وہ اردو زبان کی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں ہیں جو ہندوستان کی کسی زبان کے مقابلے باہر کے ملکوں میں آج بھی زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جو ادب اور لٹریچر کے اعتبار سے دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں امتیازی مقام رکھتی ہے۔ اوپر ذکر کیے ہوئے مسائل آسانی سے حل ہو سکتے ہیں اور مسلمان تیز رفتاری سے ترقی کر سکتے ہیں بشرطیکہ دستور میں دیئے ہوئے حقوق اور سرکاری احکام کا انصاف کے ساتھ نفاذ ہو اور سیاست کے بجائے صرف حب الوطنی کو اصل معیار قرار دیا جائے۔

حاصل کلام :

مسلمانوں کو اپنا تہذیبی، دینی اور لسانی تشخص برقرار رکھنے کے لیے دستور کے بنیادی حقوق کی روشنی میں

کم ازکم چار محاذوں پر سخت جدوجہد کرنی ہوگی۔

۱۔ دینی مدارس۔

۲۔ لڑکیوں کی تعلیم۔

۳۔ جدید عصری تعلیم۔

۴۔ عوامی اور عمومی تعلیم۔

ان چاروں محاذوں پر بیک وقت پورے ملک میں مربوط طور پر اگر کوشش ہوئی تو کوئی بھی پارٹی یا جما
انھیں ان کے جائز حقوق سے محروم نہیں رکھ سکے گی۔

پٹنہ کے اقلیتی اسکول

پٹنہ میں مختلف اقلیتی تعلیمی ادارے ہیں۔ ان کے متعلق سرسری طور پر ایک تعارفی خاکہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ پٹنہ کی راجدھانی ہے۔ یہاں مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی ہے۔ ان کے تعلیمی ادارے بہت ہی کم ہیں۔ بہرکیف پٹنہ کے مشرقی حصے میں محمڈن عربک اسکول ملت اسکول، پٹنہ کے مشرقی وسطی علاقے میں ڈاکٹر ذاکر حسین ہائی اسکول، ملت اردو گرلس ہائی اسکول، پٹنہ مسلم ہائی اسکول اور ایوب اردو گرلس اسکول اقلیتی ادارے کی حیثیت سے چل رہے ہیں۔ ۱۔ محمڈن عربک اسکول پٹنہ سٹی :۔ یہ اسکول پٹنہ کے مشرقی علاقے پٹنہ سٹی میں سر سید احمد خاں کے ایما پر قائم کیا گیا تاکہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت میں اصلاح کی جاسکے۔ یہ اسکول ایک قدیم ترین اسکول ہے۔ حکومت بہار سے ملحق ہے۔ اس کے سکریٹری جناب نورالہدیٰ صاحب اور صدر جسٹس علی احمد صاحب ہیں۔ ۲۔ سر سید ملت اردو گرلس ہائی اسکول : یہ اسکول میں وہاں کے عوام کی مدد سے قائم ہوا۔ یہ ادارہ حکومت بہار سے ملحق ہے۔ اس میں لڑکیوں کی تعلیم کا اچھا انتظام ہے۔ ۳۔ ڈاکٹر ذا ہائی اسکول: اس اسکول کو پٹنہ کے مشرقی وسطی علاقے میں جناب پروفیسر محمد قاسم احسن وارثی نے اپنے مکان کے ایک حصے میں کھولا۔ یہ ۱۹۷۰ء میں قائم ہوا۔ ۱۹۹۲ء میں اس ادارے کو حکومت بہار نے انٹرمیڈیٹ کالج (+۲) کا درجہ دیا، جس میں آرٹس، کامرس اور سائنس کے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس ادارہ کا رزلٹ صد فی صد ہو رہا ہے۔ بی۔ اے اور بی۔ ایڈ کالج کھولنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس ادارے کے تحت ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ چلایا جارہا ہے۔ پرائمری ٹیچرس ٹریننگ کا الحاق ہوچکا ہے۔ آئندہ سال طلباء امتحان میں شریک ہوں گے۔ اس ادا لیے عمارت کی زمین حاصل ہوچکی ہے۔ فنڈ کی سعی کی جارہی ہے، تاکہ اس کی ایک شاندار عمارت ہاسٹل کے ساتھ مکمل ہوسکے۔ ۴۔ ملت اردو گرلس ادارہ بھی ڈاکٹر محمد قاسم احسن وارثی نے اپنے مکان کے ایک حصے میں کھول کر اس علاقے میں تعلیمی ماحول پیدا کیا ہے۔ اس علاقے میں لڑکیوں کی تعلیم کے یتی ادارہ ہے۔ یہ ادارہ سلطان گنج پٹنہ میں واقع ہے۔ اس کے سکریٹری وارثی صاحب ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ اس ادارہ کا بہار سرکار سے الحاق ہو بزکسا اور انٹر امتحان میں شریک ہوکر بہتر رزلٹ حاصل کر رہی ہیں۔ یہ اسکول ڈاکٹر ذاکر حسین ملت میموریل سوسائٹی کے زیر انتظام ہے۔ یہ سوسائٹی جسٹس کی سرپرستی میں قائم ہوئی تھی اور آج ایک تعلیمی تحریک کی شکل میں ابھر رہی ہے۔ ۵۔ پٹنہ مسلم ہائی اسکول : اس اسکول کو جناب حیدر اعلم بار ایٹ سے کھولا گیا۔ یہ ۱۹۴۰ء میں قائم ہوا۔ یہ حکومت بہار سے ملحق ہے۔ انٹر تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کی اپنی عمارت ہے جو آئی ڈی بی کی مدد سے بنی ہے سکریٹری جناب صہیب صاحب ہیں۔ ۶۔ ایوب اردو گرلس ہائی اسکول : یہ بانکی پور لال باغ میں واقع ہے۔ اس میں بچیوں کی تعداد کئی ہزار ہے تعلیم دی جاتی ہے۔ عمارت بھی شاندار ہے۔ اس کے سکریٹری بھی جناب صہیب صاحب ہیں۔

---

* سکریٹری ڈاکٹر ذاکر حسین ملت میموریل سوسائٹی، سلطان گنج، پٹنہ۔

شکیل احمد اصلاحی*

انسانی حقوق قرآن کی روشنی میں

اسلام اللہ کا بھیجا ہوا آخری دین اور مکمل ضابطۂ حیات ہے جسے آخری اور قطعی شکل میں ہمارے آخری رسول حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر اس دنیا میں تشریف لائے اور اس کی روشنی میں آپ نے ایک مثالی معاشرہ قائم کیا اسی دین کی پیروی میں تمام لوگوں کی دنیوی اور اُخروی کامیابی وابستہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض یہ تھی کہ اس دین کو دوسرے تمام ادیان پر غالب کر دیں۔ لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں۔ اسلامی اصول کی بنیاد پر اسلامی معاشرے کی تعمیر کا فریضہ انجام دیں اور انسانی حقوق کی تعمیر و ترقی میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑیں۔

اسلام کی آمد سے قبل انسان طرح طرح کی برائیوں، جہالت، نادانی، حقوق سلبی کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس وقت اس کی کشتی کو گمراہیوں کی بھنور سے نکالنے کے لیے ایسے ملاح کی ضرورت تھی جو تمام مصائب کا مقابلہ کرتا ہوا اپنے ساحلِ مراد تک پہنچ جائے۔ ان حالات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ آپ کی آمد سے تمام ظلمتیں اور تاریکیاں کافور ہو گئیں اور ایک ایسا مثالی معاشرہ قائم ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

اسلام نے تعلیم دی کہ خدائے واحد کی عبادت کی جائے اس کے علاوہ کسی کو اقتدار اعلیٰ نہ تسلیم کیا جائے اور اگر ایسا نہ ہوا تو صرف اس کی رحمت ہی سے نہیں محروم ہوتے بلکہ دنیا میں بھی تمہاری حقیقت مبغوص اور منحوس قوم کی سی ہو جائے گی۔

اسلام نے اللہ تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ بندوں کے حقوق پر بھی زور دیا انسانی حقوق میں والدین کے حقوق کو سب پر مقدم رکھا۔ اسلامی نظام معاشرت میں اس کا اوّل مقام ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> "اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوائے اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اگر پہنچ جائیں تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں سے یا دونوں تو نہ کہہ ان کو ہوں اور نہ جھڑک ان کو اور کہہ ان سے بات ادب کی اور جھکا دے ان کے آگے کندھے عاجزی کر کر نیازمندی سے اور کہہ اے رب ان پر رحم کر جیسا پالا انھوں نے مجھ کو چھوٹا سا۔" [1]

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں تعاون، ہمدردی، حق شناسی اور حق کی ادائیگی کی روح جاری وساری

---

* متعلم شعبۂ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

رہے۔ ہر رشتہ دار اپنے دوسرے رشتہ دار کا معاون و مددگار، ہر محتاج انسان دوسرے انسانوں سے مدد پانے کا حق دار سمجھے معاشرے میں حقوق کا تصور اتنا عام ہو چکا ہو کہ ہر شخص ان سب انسانوں کے حقوق اپنے اوپر محسوس کرے جن کے درمیان وہ بود و باش اختیار رکھے ہوئے ہو اور ان کی کوئی خدمت کرے لیکن یہ نہ سمجھے کہ وہ ان کے اوپر احسان کر رہا ہے بلکہ خدمت کی غرض سے تعاون و ہمدردی کی نیت سے انجام دے رہا ہے اور اگر کسی خدمت کے قابل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ وہ دوسروں کے کام آسکے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور دے قرابت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو اور مت اڑا بیجا، بے شک اڑانے والے بھائی ہیں شیطانوں کے اور شیطان ہے اپنے رب کا ناشکر اور اگر کبھی تغافل کرے تو ان کی طرف سے انتظار میں اپنے رب کی مہربانی کے جس کی تجھ کو توقع ہے تو کہہ دے ان کو بات نرمی کی۔" [۲]

اور لوگ اپنی دولت کو غلط طریقوں سے ضائع نہ کریں۔ فخر، ریا و نمود جو کے سبب انسان کی حقیقی ضروریات اور مفید کاموں میں صرف کرنے کے بجائے دولت کو غلط راستوں میں بہا دیں یہ دراصل کفران نعمت ہے جو لوگ اس طرح سے کریں گے وہ صحیح معنیٰ میں شیطان کے بھائی ہوں گے لوگوں میں اتنا اعتدال ہونا چاہیے کہ وہ نہ تو بخیل بن کر دولت کی گردش کو روک لیں اور نہ فضول خرچ بن کر معاشی طاقت کو ضائع کر دیں بلکہ معاشرے کے افراد میں توازن کی ایک ایسی حس پائی جانی چاہیے کہ وہ فضول خرچ سے باز ہی نہ رہیں بلکہ بیجا خرچ سے بھی باز رہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ اور نہ کھول دے اس کو بالکل کھول دینا، پھر تو بیٹھ رہے الزام کھایا ہارا ہوا۔ تیرا رب کھول دیتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے اور تنگ بھی وہی کرتا ہے۔ وہی ہے اپنے بندوں کو جاننے والا اور دیکھنے والا۔" [۳]

انسانی حقوق کے ذیل میں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نسلوں کی افزائش کو اس لیے روک دینا کہ کھانے والے بڑھ جائیں گے ایک بڑی غلطی ہے۔ جو لوگ اس اندیشے سے آنے والی نسلوں کو ہلاک کر دیتے ہیں، وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ رزق کا انتظام تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جس نے اس عالم کو آباد کیا ہے آنے والوں کے لیے، جیسے اس نے انتظام کیا تھا۔ وہ اب بھی سب پیدا ہونے والوں کا انتظام کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو بے شک ان کا مارنا بڑی خطا ہے۔" [۴]

انسانی حقوق کے سلسلے میں سب سے بڑا جرم کسی کو ناحق قتل کرنا اور حقوق زندگی سے محروم کرنا ہے انسانی جان کو اللہ تعالیٰ نے قابلِ احترام ٹھہرایا ہے۔ کوئی شخص نہ اپنی جان لینے کا حق رکھتا ہے اور نہ کسی دوسرے کی۔ خدا کی مقرر کی ہوئی یہ حرمت صرف اس وقت ٹوٹ سکتی ہے جب کہ خدا کا مقرر کیا ہوا قانون حق اس کے خلاف قائم ہو جائے۔ جیسا کہ معلوم ہے عرب میں لوگ لڑکیوں کی پیدائش کو بے عزتی خیال کرتے تھے۔ لڑکیاں شرم و عار کی چیز سمجھی جاتی تھیں۔ جب کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا۔ یہاں تک کہ بعض شقی القلب اپنے ہاتھوں اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ دوسرے ان کے یہاں کوئی دیت کا نظام نہیں تھا جو جس کو چاہتا تھا قتل کرتا۔ جو زبردست ہوتا وہ کمزوروں کو ستاتا۔ اسلام نے ان تمام چیزوں کے اصول اور قواعد

مقرر کیے اور ان برائیوں کا قلع قمع کیا۔ ارشاد خداوندی ہے:

"اور نہ مارو اس جان کو جس کو منع کر دیا ہے اللہ نے مگر حق پر اور جو مارا گیا ظلم سے تو دیا ہم نے اس کے وارث کو زور، سو حد سے نہ نکل جائے قتل کرنے میں اس کو مدد ملتی ہے۔" ۵؎

یتیموں کے مال کی اس وقت تک حفاظت ہونی چاہیے جب تک وہ خود اپنے بل بوتے پر کھڑا نہ ہو جائے۔ ان کے مال میں کوئی ایسا تصرّف نہیں ہونا چاہیے جو خود اُن کے حق میں بہتر نہ ہو۔

انسانی حقوق کی فہرست میں جان کے ساتھ مال بھی قابلِ لحاظ ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کا مال جو ہماری حفاظت کے مستحق ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور پاس نہ جاؤ یتیم کے مال کے مگر جس طرح کہ بہتر ہو، جب تک وہ پہنچے اپنی جوانی کو اور پورا عہد کرو۔ بے شک عہد کی پوچھ ہوگی۔" ۶؎

ناپ تول میں کمی کرنا بھی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ اس لیے اسلام کا حکم ہے کہ ناپ اور پیمانہ ٹھیک رکھیں اور لین دین میں صحیح تول تولی جائے تاکہ انسانی حقوق پامال نہ ہونے پائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"اور پورا بھر دو ناپ جب ناپ کر دینے لگو اور تولو سیدھی ترازو سے، یہ بہتر ہے اور اچھا ہے اس کا انجام۔" ۷؎

یہی بات دوسری جگہ بڑے زور سے کہی گئی ہے:

"خرابی ہے گھٹانے والوں کی وہ لوگ کہ جب ناپ کر لیں لوگوں سے تو پورا بھر لیں اور جب ناپ کر دیں ان کو یا تول کر تو گھٹا کر دیں۔" ۸؎

اسلام میں کمزور اور مظلوم طبقات کے حقوق کی وضاحت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ خاص طور پر عورتوں کے حقوق کا سب سے زیادہ پاس و لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسلام نے ان کا حصّہ وراثت میں مقرر فرمایا اور مہر کی ادائیگی کو لازم قرار دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور دے ڈالو عورتوں کو مہر ان کی خوشی سے۔ پھر اگر وہ اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تم کو اپنی خوشی سے تو اس کو کھاؤ رچتا پچتا۔" ۹؎

ان کی وراثت کے سلسلے میں قرآن نے یہ ہدایت کی:

"مردوں کا بھی حصّہ ہے اس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے اور عورتوں کا بھی حصّہ ہے اس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے تھوڑا ہو یا بہت ہو، حصّہ مقرر کیا ہوا ہے۔" ۱۰؎

غرضیکہ اسلام نے کسی حق دار کو اس کے حق سے محروم نہیں رکھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو۔"

حقوق کے ساتھ ساتھ ان کی مقدار کی بھی تعین فرمائی اور انسانی وجود کا کوئی ایسا پہلو نہ تھا جس پر اسلام کی روشنی نہ پڑتی ہو۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ نومبر ۱۹۹۵ء

قرآن مجید کے اعلان کردہ حقوق کی روشنی میں ہم مسلمانوں کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ کس قدر حقوق کی ادائیگی میں ہم کوتاہی کرتے ہیں اور کس حد تک اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ جو شخص بندوں کے حقوق سے غافل ہو وہ اللہ کے حقوق بھی ادا نہیں کر سکتا کیوں کہ بندوں کے حقوق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں، گو وہ بھی اللہ کے حقوق ہیں۔

حوالہ جات

۱۔	سورۃ بنی اسرائیل ،	ترجمہ	شیخ الہند	مولانا محمود الحسنؒ	آیت	۲۳
۲۔	ایضاً	"	"	"	"	"	۲۸
۳۔	ایضاً	"	"	"	"	"	۳۰
۴۔	ایضاً	"	"	"	"	"	۳۱
۵۔	ایضاً	"	"	"	"	"	۳۳
۶۔	ایضاً	"	"	"	"	"	۳۴
۷۔	ایضاً	"	"	"	"	"	۳۵
۸۔	سورۃ المطففین		"	"	"	"	۳
۹	سورۃ النساء		"	"	"	"	۴
۱۰	ایضاً		"	"	"	"	۷

(بقیہ صفحہ نمبر ۱۹ کا)

رخصت ہونے کی تقریب تھی۔ چھپے ہوئے پروگرام میں پہلے نماز مغرب۔ پھر زوجین کی ذمہ داریوں پر قرآنی احکام کے پیش نظر ایک تقریر۔ پھر ڈنر۔ ڈنر کے بعد نماز عشاء۔ عشاء کے بعد کیک کاٹا گیا اور تمام مہمانوں میں تقسیم ہوا۔ دعا کے بعد دلہن سسرال کے لیے روانہ ہوئی۔ ڈائس سے موٹر تک قرآن پاک کا سایہ کیے ہوئے چل رہے تھے۔ اور خواتین اسی طرح رو رہی تھیں جیسے ہندوستان میں رواج ہے۔ دلہن کے والدین کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک رہے تھے مگر کھلاڑیوں میں نماز اور دعاؤں کا چرچا ہم نے پہلی بار امریکہ میں دیکھا۔ باسکٹ بال قومی چمپین شپ (National Championship) کا ہیرو حکیم علاجوان مغرب کی نماز کے وقت کھیل کے میدان سے چلا گیا اور نماز ادا کی۔ اس وقت علاجوان کی پرانی تصویر چار چار سو ڈالر میں بک رہی ہے۔ بچے اور نوجوان علاجوان کی تصویر والی ٹی شرٹ (Ti - Shirt) پہنتے ہیں۔ فائنل میچ کے دن ایک گھر میں میرا گزر ہوا تو دیکھا کہ بچے اور نوجوان ٹی وی پر جمے ہوئے ہیں۔ شکست اور فتح کے درمیان چند سیکنڈ کا فاصلہ ہے۔ مشاہدین یا فتاح یا فتاح کا ورد زور زور سے کر رہے تھے۔ بالآخر میچ ختم ہونے سے آدھا سیکنڈ پہلے آخری گولی نٹ (Net) میں ڈال کر میچ جیت لیا۔ آخری لمحے میں میچ جیتنا ان کی روایات میں ہے۔ اور اخبارات اس کا چرچا کرتے ہیں۔ علاجوان کی اسلامی زندگی پر (Continental Airways) کے رسالے میں ایک مصور مقالہ درج ہے اور سرورق پر اس کی ایک بڑی تصویر ہے۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ نومبر ۱۹۹۵ء

پروفیسر کبیر احمد جائسی *

نئی علی گڑھ تحریک کی ضرورت

سر سید کے انتقال کو تقریباً سو برس ہونے کو آئے۔ اس تقریباً ایک صدی کے عرصے میں ہندوستان میں رہنے اور بسنے والے غیر مسلم حضرات کے حالات میں ہر طرح کی نہ صرف تبدیلی آئی ہے بلکہ انہوں نے نمایاں اور قابل لحاظ ایسی ترقی ہے جو دور سے نظر آتی ہے۔ اب سے سو سال پہلے جہاں جہل تھا وہاں علم کی روشنی پھیل چکی ہے، جہاں نکبت و افلاس کا دور دورہ تھا وہاں خوشحالی اور فارغ البالی نے سر اٹھانا شروع کر دیا ہے، جو لوگ ابھی کل حقیر، بے وقعت اور بے عزت سمجھے جاتے تھے، آج ان کو بھی وقعت و عزت و وقار کی دولتِ بیدار حاصل ہو چکی ہے اور وہ اُن میدانوں میں پیش رفت کی طرف گامزن ہیں جس کا اب سے پہلے تصور کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ کوئی بھی معاشرہ ہو، ترقی پذیر یا ترقی یافتہ، یہ تو ممکن نہیں کہ اس سے جہل نادانی، ناداری، افلاس شقاوت، تنگ نظری اور تعصب جیسی ذہنی اور نفسانی بیماریوں کا یکسر خاتمہ کر دیا جائے اور اس معاشرے کو ایک ہی جیسی فکر رکھنے والے افراد کا مجموعہ بنا دیا جائے اسی لیے ہندوستان کے غیر مسلموں میں آج بھی وہ تمام کمیاں، کجیاں اور کوتاہیاں موجود ہیں جو اب سے تقریباً سو برس پہلے موجود تھیں، لیکن جو نمایاں فرق ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ان خرابیوں میں بڑی حد تک کمی آگئی ہے۔ اگر پہلے اسی فی صد لوگ کمیوں اور کوتاہیوں کا شکار تھے تو اب ان کی تعداد گھٹ کر بیس پچیس فی صد کے لگ بھگ ہو چکی ہے۔ (یہاں "سیاسی تعصب" کا ذکر نظر انداز کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ موضوع ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے) کمی کا یہ سلسلہ جاری ہے، اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جلد ہی یہ بیس پچیس فی صد بھی گھٹ کر پانچ دس فی صد ہو جائیں گے۔

ایک طرف تو یہ صورت حال ہے دوسری طرف افسوس نہیں حیرت کا مقام ہے کہ جہالت، کم فہمی، نادانی ذہنی تعصب و تامل، بدخوئی، عیب جوئی، فرقہ بندی، تفرقہ پردازی، جلن، حسد، دوسروں کو خواہ وہ اپنے ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں پھلتے پھولتے نہ دیکھ سکنے کا جذبہ، ہر بڑھتے قدم کو پیچھے کی طرف کھینچ لینے کی سعیِ مسلسل جس نوع اور جس طرح اُس وقت تھی جب سر سید احمد نے اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز کیا تھا، آج تقریباً ایک صدی کے بعد بھی اُسی شدت سے مسلمانوں کی رگ و پے میں جاری و ساری ہے حالانکہ ۱۸۵۷ء کے

---

* ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

"غدر" اور ۱۹۴۷ء کے تقسیم وطن کے زخموں نے ملت کا وہ حال کر دیا کہ ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اس حال کے باوجود طرز کہن پر اڑنا اور آئین نو سے ڈرنا اسی طرح باقی ہے جس طرح سر سید احمد کے عہد حیات میں تھا۔

اسی طرز کہن پہ اڑنے اور آئین نو سے ڈرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک صدی کے گزر جانے کے باوجود جس سماجی اور سیاسی پسماندگی اور مذہب ناشناسی سے سر سید کے عہد حیات کا مسلمان دوچار تھا آج کا مسلمان بھی اسی سے دوچار ہے۔ سر سید نے اپنے زمانے کی جن سماجی برائیوں کے خلاف زبانی اور قلمی جنگ کی تھی ان میں سر فہرست جہالت، تنگ نظری، خود پرستی، جھوٹ، حسد، لالچ، وقت ناشناسی، ریا، نفاق، آپسی اختلاف، بے جا فرد مباہات، اسلاف پرستی، لکیر کا فقیر ہونا، جیسی سماجی بیماریاں شامل ہیں اس عالمگیر شہرہ کے باوجود کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اب بڑی ترقی کر لی ہے اور آزاد ہندوستان کا اونچا سے اونچا عہدہ کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ برقرار ہے کہ من حیث القوم مسلمان بڑی تیزی کے ساتھ زوال کے قعر مذلت کے کگار تک پہنچ رہا ہے اور اس کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہے کہ وہ بیسویں صدی کے آخری دہے سے اکیسویں صدی کی طرف جانے کے بجائے اٹھارہویں صدی کی طرف جا رہا ہے۔ اس رجعت قہقری کی بنا پر جس تیزی سے دنیا، اس کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں سے یہ توقع فضول معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے دین کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھامے رہ پائیں گے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا کو حاصل کرنے کے لیے دین کا حصول قطعی ضروری نہیں ہے مگر اپنے دین کو برجا برقرار اور اس پر آزادی سے عمل پیرا ہونے کے لیے دنیا کا حصول لازمی ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جس پر نہ تو سر سید احمد کے عہد حیات کے مسلمانوں نے غور کیا اور نہ ہی ان کے انتقال کے ایک صدی کے بعد کے مسلمان غور و فکر پر آمادہ نظر آتے ہیں جس کا نتیجہ دنیا ہی نہیں دین سے بھی محرومی کی شکل میں سامنے آ رہا ہے۔

چاہے اس بات سے اختلاف کیا جائے چاہے اتفاق، علی گڑھ تحریک کے بانی کا یہ خیال تھا کہ پہلے سماج کی اوپری سطح پر اصلاح کا کام کر لیا جائے جب اوپری سطح پر کامیابی حاصل ہو جائے گی تو نچلی سطح کے افراد کی اصلاح آسان ہو جائے گی۔ اسی لیے سر سید احمد نے اپنے افکار و خیالات کے اظہار کے لیے "لٹریچر" کو ذریعہ بنایا اور صرف اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنا رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس نے باوجود کچھ ڈپٹی کلکٹروں وغیرہ کے اختلاف کرنے کے اس زمانے کے پڑھے لکھے افراد کی فکر کو خاصہ متاثر کیا تھا۔ سر سید احمد اور ان کے رفقاء کے "لٹریچر" نے اس معاشرے کی جمود کی برف پگھلانے اور اونگھتوں کو جگانے کا جو فریضہ انجام دیا اس کا اثر تو پڑا لیکن کامیابی کے آثار نظر آتے ہی قوم کی قوم دوبارہ آسودۂ خواب غفلت ہو گئی۔ اور چند چھوٹے موٹے خوشنما چمکتے ذروں کو پاکر اس طرح مطمئن ہو گئی گویا کہ اس نے ہیروں کا انبار پا لیا ہے۔ اس اندازِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمان پھر انہی تمام خرافات کا دھیرے دھیرے شکار ہونے لگے۔ جن کا شکار سر سید کے عہد حیات میں تھے۔ ۱۹۴۷ء کی وطن عزیز کی تقسیم نے ہندوستانی مسلمانوں کو عقب ماندگی کے اس مقام پر لا کھڑا کر دیا جس کا لازمی نتیجہ فکر و نظر کی موت ہی تو ہوتا ہے۔ مقام شکر ہے کہ تقسیم وطن کے بعد چند

مذہبی اورنیم سیاسی ایسی جماعتیں عالم وجود میں آئیں جنہوں نے قوم پر مذکورہ موت کو تو حاوی نہ ہونے دیا مگر اپنے اندازِ نظر کے اختلاف کی وجہ سے یہ جماعتیں مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع نہ کر سکیں۔ اگر صرف ایسا ہی ہوتا تب بھی رو پیٹ کر صبر کر لیا جاتا۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ ہر ایک جماعت والا دوسری جماعت والوں کو نہ صرف ترچھی اور تیکھی نگاہوں سے دیکھنے لگا بلکہ اپنے دل کے نہاں خانے میں ان کو ضالّ و مضل سمجھنے لگا۔ وہ لوگ جو مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے اور ان کی حالت میں سدھار پیدا کرنے کا مقصد لے کر اٹھے تھے وہ اس طرح خانوں اور گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں کہ ایک عام آدمی حیران و پریشان ہے کہ کس کی بات سنے اور کس کی بات نہ سنے کس کو صحیح سمجھے اور کس کو غلط مانے۔ فی زمانہ ہمارے معاشرے میں وہ تمام سماجی برائیاں در آئی ہیں جن کے خلاف سرسید احمد اور ان کے رفقاء نے تہذیب الاخلاق کے علاوہ اپنے مضامین اور کتابوں میں بلند آہنگ آواز اٹھائی تھی۔ یہاں پر اس امر کا اظہار شاید بے محل نہ ہو گا کہ عصر حاضر کے ہندوستان میں پڑھے لکھے اور اعلیٰ ترین سند یافتہ افراد کی جتنی بڑی تعداد علی گڑھ میں یکجا آباد ہے اتنی بڑی تعداد ہندوستان کے شاید ہی کسی شہر میں آباد ہو۔ اعلیٰ ترین سند یافتہ افراد کی کثرت آبادی کے باوجود علی گڑھ اور لواحِ علی گڑھ کے مسلمانوں پر نہ تو علم کی گھٹا برستی ہے اور نہ ہی خوش عملی کا کوئی چھینٹا پڑتا ہے۔ اگر معاشرہ کو یہ اعلیٰ ترین سند یافتہ حضرات متاثر نہیں کر پائے تو اس کو زمانے کا قصور قرار دیا جا سکتا ہے لیکن خود اُن کی جو سماجی حالت ہے اس کا ذمہ دار کس کو قرار دیا جائے گا؟ ان پڑھے لکھوں کے محلّوں میں بھی وہ گندگی، عفونت، سڑاندھ، کوڑے کا ڈھیر، غلاظت کا انبار، سڑکوں پر پانی اسی طرح ہمہ وقت موجود رہتا ہے جس کے لیے بدھوا اور رجبرانی بدنام ہیں۔ اس معاشرہ میں بھی ایک دوسرے سے برتاؤ اور تعلقات کے سلسلے میں وہی تمام خرابیاں موجود ہیں جو سرسید کے عہدِ حیات میں تھیں، وہی حسد ہے لیکن چولا بدلے ہوئے، وہی جلاپا ہے مگر خوش رنگ پیرہن میں، وہی خبث باطنی ہے مگر مسکراہٹ کے ہجوم میں، وہی دوسروں کو بڑھتے نہ دیکھ سکنے کا جذبہ ہے مگر ہمدردی کا ملمع زیب تن کیے۔ گویا پہلے زمانے کی تمام سماجی برائیاں "بے ریا"، تھیں ہمارے سماج کی وہی برائیاں "ریاکار" ہو گئی ہیں۔ یہ اس شہر اور اس مقام کا عالم ہے جہاں علی گڑھ تحریک کا "عظیم الشان"، عملی نمونہ موجود ہے۔ ذرا ان شہروں کے بارے میں سوچیے جہاں علی گڑھ سے اٹھ کر ابر نہیں جاتا جب ابر جاتا ہی نہیں تو دشت و دمن اور ہر صحن چمن پر برسے گا کہاں سے؟ علی گڑھ تحریک کا عملی نمونہ بحمد اللہ قایم ہے مگر افسوس اس کے فیوض و برکات پر سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ علی گڑھ تحریک کے عملی نمونے کو جو فریضہ انجام دینا تھا اس میں اس نے کوتاہی ضرور کی ہے۔

علی گڑھ تحریک کی ایک خصوصیت خالص کھری اور بے میل "مذہبیت"، کی تلاش و جستجو بھی تھی یہ وہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر سرسید احمد اور ان کے رفقا کرسٹان، نیچری اور دہریئے کہلائے۔ سرسید احمد اور ان کے رفقا نے ان القاب و خطابات کو خوش دلی سے قبول کرتے ہوئے اپنی سعی و جد و جہد جاری رکھی اور مسلمانوں سے مطالبہ کرتے رہے کہ جن چیزوں کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے اور کسی وجہ سے ان کو مذہب کا جزو سمجھ لیا گیا ہے ان سے دست بردار ہو جائے۔ صرف اتنا کہنے

سے کہ فقہا نے لکھا ہے یا مفسرین نے بیان کیا ہے کسی بات پر آنکھ بند کرکے یقین نہ کر لیا جائے بلکہ اس بات کی جستجو کی جائے کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ کس فقیہ یا مفسر نے کہی ہے اور اگر یہ پتہ چل جائے کہ کس نے یہ بات کہی ہے تو اس کا بھی یقین کر لینا چاہیے کہ جس سیاق و سباق میں یہ بات کہی جا رہی ہے کیا کہنے والے نے اسی سیاق و سباق میں بات کہی ہے؟ اس سلسلے میں ہمارے تفسیری سرمایے نے ہم کو عجیب پریشانی میں مبتلا کیا ہے اگر ہم یہ بات یوں ہی کہہ دیتے تو ہم کو بھی نیچری کہہ کر گردن زدنی قرار دیا جاتا لیکن ہمارے گواہ تو اس دور میں سرسید احمد کے ایک مخالف اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل حضرت مولانا اسیرادروی صاحب ہیں جنہوں نے مفسرین کی "ایجاد بندہ" پر ایک مفصل کتاب ہی "تفسیروں میں اسرائیلی روایات" کے عنوان سے تصنیف فرمائی ہے۔ سرسید احمد نے سحر کی حقیقت، سموات کا تصور، اصحاب فیل کا واقعہ، تصور جن اور جن کی حقیقت، اصحاب کہف، ذوالقرنین، حضرت عیسیٰ کی پیدائش وغیرہ کے سلسلے میں جو کچھ تحریر کیا ہے یہ ضروری تو نہیں ہے کہ اس کے ایک ایک نکتے سے اتفاق کر لیا جائے یا اس کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لیا جائے مگر یہ کہاں کا انصاف ہوگا کہ سرسید احمد کی تحریروں کو بالائے طاق رکھ کر ان پر کفر کا فتویٰ لگایا جائے۔ اگر بہت سے "مسلمات" کے وجود سے مولانا اسیرادروی صاحب انکار کریں اور اگر ذوالقرنین کو مولانا ابوالکلام آزاد داریوش بزرگ قرار دیں تو "مومن کامل" اور اگر ایام جاہلیت کے عربی اشعار کی مدد لیتے ہوئے سرسید جن کے معنی متعین کریں یا یہ بتلائیں کہ ہمارے مفسرین نے سموات کا تصور کہاں سے اخذ کیا ہے تو راندۂ درگاہ بلکہ کافر مطلق۔

اصلاً یہ کام علی گڑھ تحریک کے عملی نمونے کے کرنے کا تھا کہ سرسید احمد اور ان کے رفقاء نے جن مذہبی امور کی توجیہہ، توضیح، تعبیر اور تشریح کی ہے، اس پر معروضی اور علمی انداز سے تنقیدی نظر ڈالی جاتی اور بربنائے بشریت سرسید احمد اور ان کے رفقاء سے جو واقعی غلطیاں صادر ہوتیں تو ان کی نشاندہی کرکے کھرے کو لے لیا جاتا اور کھوٹے کو وقت کی پہنائی میں دفن کر دیا جاتا لیکن افسوس یہ ہے کہ سرسید احمد کی تفسیر کے مطالعے سے "علی گڑھ تحریک کا عملی نمونہ" بھی اس طرح بدکتا اور بچتا رہا جس طرح ہمارے زمانے میں ایڈس کے مریض سے عوام ہی نہیں اسپتال کا عملہ بدکتا اور بچتا ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو سرسید احمد نے اپنی ناتمام تفسیر اور تفسیری مضامین میں جن افکار و آراء کا اظہار کیا ہے، ان سے ان کے بعد کے مفسرین نے اثر لیا ہے انھوں نے بھی جن کو ان کے ایمان تک پر شک و شبہ ہے۔ یہاں صرف ایک مثال کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے ایک بہت بڑے مفسر نے اصحاب فیل کی ہلاکت کا وہی سبب قرار دیا ہے جو سرسید احمد قرار دے چکے ہیں ستم ظریفی یہ ہے کہ جو کچھ کہا گیا سرسید احمد کو کہا گیا کسی اور کو نہیں۔

ہمارے نزدیک عہد حاضر کے مسلمانوں کے لیے "نسخۂ کیمیا" یہی ہے کہ علی گڑھ تحریک کا احیا ہو مگر ہو تو کیسے؟ ہم سب کا حال تو یہ ہے کہ ؎

سینہ خالی آنکھیں ویراں دل کی حالت کیا کہیے

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

احمد رشید (علیگ)*

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور سماجی پس منظر

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دنیا میں قومیں پیدا ہوتی ہیں ترقی کی راہیں حاصل کرتی ہیں اور انہیں راستوں میں گم ہو کر زوال پذیر ہو جاتی ہیں اور ان کی تباہ و بربادی کے نغمے تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہو جاتے ہیں یہ فنا و بقا ایک ناگزیر فطری قانون ہے جس میں انسان کی ادراک و فراست کا کوئی دخل نہیں ؟ بلکہ قوموں کی سماجی پستی اور اخلاقی انحطاط کی وجوہات کارفرما ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال کے لیے اغیار کو ذمہ دار قرار دینا بد دیانتی ہے کیوں کہ قوموں کی ترقی کا راز خود ان کے اخلاق و کردار کی بلندی علم و شعور کی آگہی پر منحصر ہے اگر مجموعی طور پر قوم تہذیب یافتہ بننا چاہتی ہے تو اس کے مرد و زن کو انفرادی طور پر ترقی کرنا ہوگی۔ قانون فطرت انصاف پر مبنی ہے چوں کہ رب العزت کسی قوم پر ظلم کرتا ہے نہ اس کی بیجا نازبرداری کرتا ہے قرآن کا فیصلہ ہے۔

"خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدلے"

۱۸۵۷ء کے غدر نے ملک میں افراتفری کا عالم پیدا کر دیا تھا۔ ایک قیامت خیز ہنگامہ تھا پورے ملک میں چاروں سمت خاک و خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ مغلیہ حکومت کی بساط الٹ چکی تھی ایک نئی قوم، نئی تہذیب نے جس کی زبان مختلف، بود و باش مختلف اور مذہب مختلف ملک میں اپنے آہنی قدم جما لیے تھے۔ اس کا اثر پورے ملک، ہندوستانی معاشرت پر پڑا لیکن مسلمان خصوصی طور سے متاثر ہوئے۔ مسلمانوں کے معاشرے میں معاشرتی، مذہبی اور تمدنی خرابیاں تو پہلے ہی موجود تھیں شاید اس سبب کہ وہ حکمراں قوم تھے اس لیے عیش و عشرت اور بیجا گھمنڈ و غرور میں پڑ گئے۔ علم کا حاصل کرنا معیوب سمجھا جانے لگا۔ اگر رواج تھا تو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا تھا جو ایک مخصوص طبقہ تھا فارغ التحصیل ہو کر مکاتیب اور مدارس میں معلمی کا پیشہ پاکر زندگی سے مطمئن ہو جاتا تھا۔

تاریخ ہند کے اس اہم موڑ پر قومی درد رکھنے والے چند افراد نے حالات کا نہ صرف جائزہ لیا بلکہ سیاسی نظام کی تبدیلی، ملک و قوم کی بدحالی اور زندگی کی بدلی ہوئی اقدار کا احساس دلایا۔

---

* گلی رہنٹ والا کنواں سرائے رحمٰن علی گڑھ۔

ادھر شمالی ہند میں ہندو، مسلمان اور عیسائی قوموں کے درمیان مذہبی مناظروں کا دور دورہ تھا ہر قوم ایک دوسرے پر بالا دستی حاصل کرنے کے لیے برسرپیکار رہتی تھی۔ ایسے حالات میں مختلف مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے دردمندانِ ملت اپنی اپنی نہج پر کام کر رہے تھے۔ تعلیم کے میدان میں بھی مشرقیت اور مغربیت کی کشمکش شروع ہوگئی تھی۔ یہ کشمکش عین فطری تھی۔ کیوں کہ انگریز جو فاتح قوم کی حیثیت سے ہندوستان پر اپنا تسلّط قائم کر چکے تھے ان کی تہذیب و تمدن اور زبان ملک و قوم کے لیے اجنبی تھی۔ اور مسلمان قطعاً ان کی تہذیب، زبان اور مغربی علوم کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو مغربیت کے اثرات کو بُرا خیال کرتا تھا۔ اور تمام مسلمانوں میں اس تہذیب کے خلاف نفرت اور بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش میں لگا تھا۔ اس لیے کہ ایک دُکھ مسلمانوں کے ہاتھوں سے حکومت چلے جانے کا تھا دوسرے اس کی سماجی پستی۔ تعلیمی پسماندگی اور سیاسی و نفسیاتی بدحالی کے ذمہ دار کافی حد تک انگریز حکمراں تھے ادھر انگریز بھی مسلمانوں کے خلاف بدخیالی رکھتے تھے۔ یوں مفتوح اور فاتح قوموں کے درمیان خلیج گہری ہوتی گئی۔ ہندوستان کی باقی ماندہ قوموں کو ترقی کرنے کے تمام مواقع حاصل ہوگئے جہاں حکومت کی جانب سے ان کو سہولتیں فراہم ہوئیں انہوں نے خود بھی اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ ہماری عافیت تحصیل علم میں پوشیدہ ہے اور اب انگریزوں کے قدم ہندوستان سے اکھڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ تعلیم کے میدان میں مشرقی اور مغربی تہذیب کا ٹکراؤ شروع ہو چکا تھا ایک جانب مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ حکومت کے اثر سے الگ دینی تعلیم پر زور دے رہے تھے وہ مسلمانوں کی تہذیبی بقا کے لیے دینی تعلیم ضروری محسوس کر رہے تھے۔ دوسری جانب سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا جدید مغربی تعلیم کو مسلمانوں کے تمام امراض کا مداوا خیال کرتے تھے مسلمانوں کے یہ دو فکری دھارے جو دو مختلف سمتوں میں بہہ رہے تھے ان کی منزل مسلمانوں کو پستی سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔ اور دونوں ہی مسلمانوں کے لیے تعلیم ضروری سمجھتے تھے۔ حالانکہ ان دونوں کے فکری اختلافات کی وجہ سے قوم و ملت کو بڑی آزمائش سے گزرنا پڑا جس کا خسارہ مسلمان قوم آج تک پورا نہیں کر پائی ہے۔ ان دونوں گروہوں کی سوچ ایک ہی اندازکی ہوتی تو مسلمان قوم دیگر قوموں کے مقابلے میں تعلیمی میدان میں اتنی پیچھے نہ ہوتی چونکہ دونوں قوتیں ایک دوسرے سے ٹکرانے میں اپنا وقت اور اپنی صلاحیت صرف کرتی رہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سرسید کے نقطۂ نظر کو کامیابی ملی اور بعد میں ان کی سوچ و فکر کو سراہا گیا۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ جدید مغربی تعلیم حاصل کرنے ہی میں مسلمانوں کو کامیابی اور کامرانی حاصل ہو سکتی ہے۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ سرسید کو اغیار سے ہی نہیں اپنوں سے بھی نبٹنا پڑا ہے کہ وہ خود اپنوں کے تیر کا نشانہ بنے ہیں۔

یہ ہے وہ سماجی پس منظر جس میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی گئی جس کا پہلا سہ روزہ اجتماع ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو ہوا۔ یہ کانفرنس مولوی سمیع اللہ خاں کی صدارت میں منعقد

ہوئی جس میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے تقریباً ''ایکسٹھ'' (۶۱) مندوبین شریک ہوئے اس کے علاوہ ڈیڑھ سو طلبہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے موجود تھے۔

اس کانفرنس کے مقاصد مندرجہ ذیل تحریر کیے جاتے تھے۔

(۱) مسلمانوں میں مغربی زبان و ادب کا دائرہ وسیع کرنا اور اس میں نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک ان کو پہنچانے کی کوشش کرنا ہے۔

(۲) مسلمانوں کے قدیم علوم پر تحقیقی کام شروع کرانا اور اس کو اردو اور انگریزی زبان میں شائع کراکر عام کرنا۔

(۳) معروف علماء اور مشہور مصنفین اسلام کی سوانح حیات کو اردو اور انگریزی زبان میں لکھوانا۔

(۴) مسلمان مصنفین کی تصنیفات جو نایاب ہیں ان کو بہم پہنچانے کی تدبیر کرنا اور ان کی نشر و اشاعت کا کام جاری کرنا۔

(۵) زمانہ قدیم کی تحقیقات کرانا۔ تاریخی واقعات کا پتہ لگا کر ان کو شائع کرانا اور ان پر تقاریر کرانے کا نظام قائم کرنا۔

(۶) دنیاوی علوم کے کسی مسئلہ یا تحقیقات پر کسی رسالہ کے تحریر ہونے یا لکھ دینے کی تدبیر کرنا۔

(۷) فرامین شاہی کو بہم پہنچا کر ان سے ایک کتاب الانشا کا مرتب کرنا اور ان کے مواہیر و طغرا کے نمونے فوٹوگراف سے قائم رکھنا۔

(۸) مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدارس مسلمانوں کی جانب سے قائم ہیں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور بقدر امکان عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

یہ وہ مقاصد ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی۔

اس کانفرنس کی بنیاد مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ چونکہ مسلمانوں کی اس ابتر حالت کا بنیادی سبب جدید تعلیم سے بے بہرہ ہونا تھا۔ مسلمانوں کی پستی کا یہ عالم تھا کہ اس زمانے کے ایک انگریز مفکر الفریڈ کرافٹ کی تعلیمی رپورٹ کے مطابق مسلمان تعلیمی اعتبار سے بہت پسماندہ تھے۔ پورے ملک میں مسلمان گریجویٹ کی تعداد بیس (۲۰) تھی جن میں ۱۷ بی۔ اے اور تین ایم۔ اے تھے لیکن مسلمانوں کو اپنی تعلیمی پسماندگی کا کوئی احساس نہ تھا۔ وہ اپنے قدیم علوم پر فخر کرتے تھے جب کہ قدیم علوم سے واقف بھی نہیں تھے۔ جدید علوم سے ناواقفیت بھی ان کی بے روزگاری، مفلسی اور اقتصادی کمزوری کا سبب تھی۔ تقریباً ایسی صورتِ حال ہم آج بھی محسوس کرتے ہیں۔

سرسید احمد خاں نے قوم و ملت کے اس درد کو شدت سے محسوس کیا ان کے نزدیک معاشرتی اصلاح کے لیے تعلیم سب سے زیادہ ضروری تھی۔ سرسید چاہتے تھے کہ نظام تعلیم میں اصلاح ہو اور جدید طرز کے تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں جہاں ان علوم کی تعلیم دی جائے جو عصری ضروریات کے اعتبار سے مفید ہوں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت تعلیم کے مقاصد محدود تھے۔ انسان کے کردار اور سیرت

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

پروفیسر مسعود الرحمٰن خان ندوی *

ڈاکٹر داؤد ولیم جونسون

صدر شعبۂ ترجمہ امریکن یونیورسٹی قاہرہ ڈاکٹر داؤد (جن کا سابق نام ڈیوڈ تھا) نے اپنے اسلام قبول کرنے کی داستان خود ان الفاظ میں بیان کی ہے:

میرے دادا پادری تھے۔ پانچ سال کی عمر سے وہ مجھ کو عیسائیت کی بنیادی تعلیمات کے بارے میں معلومات دینے لگے تھے، لیکن مجھے کو ایسا لگتا تھا کہ وہ شاید خود عیسائی مذہب سے مطمئن نہیں تھے، اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ عیسائیت میں کچھ باتیں ادھوری اور بعض چیزیں ناقابلِ یقین ہیں۔ دوسری طرف میرے والدین کا کوئی دین وایمان نہ تھا۔ اس لیے کوئی بیس سال تک میری تربیت ایک غیر مذہبی گھرانے میں ہوئی۔ اس وقت امریکی معاشرے کے معمول کے مطابق میں نے گھر چھوڑ کر آزاد وخود مختار زندگی گزارنا شروع کی۔ لیکن مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ اس دنیا میں انسان کسی دین ومذہب پر ایمان کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس لیے کہ اپنے آس پاس پھیلی ہوئی کائنات پر نظر ڈالتے ہی ذہن میں یہ سوال اٹھتا تھا کہ اس کائنات کو کس نے پیدا کیا؟ نت نئے ڈھنگ سے سجایا؟ اور نظم وضبط کا پابند بنایا؟ میں کبھی یہ اس کائنات کے بارے میں سوچتا تھا اور اپنے آپ سے سوال کرتا تھا کہ اس کا خالق ومالک کہاں ہے؟ ایک غیر مذہبی معاشرہ میں زندگی گزارنے کے باوجود کہ جس میں دین ومذہب ایک اختیاری معاملہ تھا اور ایک ہی خاندان میں یہودیت یا عیسائیت کے قائل یا ہر دین کے منکر افراد کا ہونا کوئی انوکھی بات نہ تھی مجھے تو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ میرا کوئی دین ہونا چاہیے۔ اس کے لیے پہلے میں نے عیسائیت کی تعلیمات کا حصول انجیل کے مطالعہ سے شروع کیا جس سے میرا پیدائشی تعلق تھا۔ یہ تو میں سن چکا تھا کہ صحیح انجیل لاپتہ ہے۔ لیکن پھر بھی دین کے حامل ہونے کی شدید رغبت کے تحت میں نے عہد قدیم اور عہدِ جدید دونوں کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ سے یہ پتہ چلا کہ تحریف شدہ انجیل عہد جدید تک میں ایسے اشارات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت کی تکمیل کرنے والا ایک پیغام خداوندی آنے والا ہے جیسے کہ وہ یونانی کلمات جن کے معنی مصطفیٰ، شافع، یا حنیف کے ہوتے ہیں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول

---

* سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

اب مجھے تم کو چھوڑنا ضروری ہے تاکہ میرے بعد وہ آئے جو اپنے رب کا پیغام تم تک پہنچائے گا۔ پھر عیسائیوں کے گھڑے ہوئے نام روح القدس یا روح اللہ یا ابن اللہ (جن کو بیٹا اور باپ اور روح القدس کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے) سے بھی مجھے بے اطمینانی ہوئی۔ میرے پادری دادا کی لکھی ہوئی کتابوں کے علاوہ بھی میں نے بہت کچھ پڑھا لیکن اطمینان نہ ہوا، نہ کسی دوسرے دین کی طرف رہنمائی ہوئی۔

حقیقت کی تلاش میں یہ ضرور ہوا کہ ایک بار میں یہودی عبادت گاہ گیا اور یہودی مذہب کے بارے میں بھی سوچا اور پڑھا، خاص کر اس لیے کہ وہ اپنی سبقت کے لحاظ سے عیسائیت کی اصل جڑ ہے۔ مگر جتنا پڑھتا گیا اور راہ راست کی ہدایت کے لیے جتنی خالق کائنات کی تلاش و جستجو کی اتنی ہی تہی دستی ہاتھ آئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں دس سال تک اللہ کو ڈھونڈتا رہا مگر مجھے حقیقت کا پتہ نہ لگا۔ میں اپنے دل کے نہاں خانہ میں قطعی طور پر صرف یہ چاہتا تھا کہ کوئی خدا و معبود ہے؟ لیکن وہ کہاں ہے یہ مجھے پتہ نہ تھا!!

ہم اس وقت اسلام کے بارے میں سنتے ضرور تھے لیکن ایک اجنبی نامانوس چیز کی طرح۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی تلاش حق اور دین صحیح کی جستجو کے زمانہ میں مجھے ڈاکٹریٹ کی تیاری کے لیے "شرق اوسط میں اسلام" کا ایک تعلیمی نصاب ۱۹۸۵ء میں مکمل کرنا پڑا۔ میری زندگی میں یہی تعلیمی مرحلہ بنیادی تبدیلی کا موڑ ثابت ہوا۔ قدرت کی کارگری دیکھیے ـــــ اس کی ابتدا میں میرے استاد ایک امریکی ڈاکٹر لیکچر ہال میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کہتے ہوئے داخل ہوئے۔ انھوں نے کورس کی تفصیل و تقسیم اور اسلام و مسلمانوں کے مطالعہ کا طریقہ بتاتے ہوئے کہا کہ دنیا میں تقریباً ایک ملیار (ارب) مسلمان پائے جاتے ہیں۔ ان کے "چار اسلامی (فقہی) مذاہب ہیں"، پھر اسلام اور عیسائیت کے مابین مذہبی فرقوں کا فرق بتاتے ہوئے کہا کہ عیسائیت کئی فرقوں میں بٹی ہوئی ہے جس کے ہر مذہب و ملت میں بڑا فاصلہ ہے، لیکن اسلامی فرقوں کے درمیان اصول میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دنیا کے کسی گوشہ کا کوئی بھی مسلمان ہو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے پیغامبر ہیں) پر یقین رکھتا ہے۔ جو بھی ان دونوں شہادتوں کو منھ سے ادا کرے اور ان پر ایمان لائے وہ مسلمان ہے۔ استاد کے یہ الفاظ میرے لیے نامانوس تھے لیکن ان کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا۔ میں نے فوراً ہی اپنے آپ سوچنا شروع کیا اگر میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ادا کروں تو میں مسلمان ہو جاؤں گا؟؟ اس طرح یہ سیدھا سادھا لیکچر میری زندگی کا راستہ بدلنے کا ذریعہ بن گیا۔ مجھے یقین کامل ہو گیا کہ بے شبہ اللہ تعالیٰ آسمانوں میں موجود ہے اور وہ ایک ہے تین نہیں۔

بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح دینی شخصیت یہ ہے کہ وہ بنی نوع انسان میں سے ہیں۔ اس لیے ان کو نہ اللہ کا بیٹا کہا جاتا ہے، نہ اللہ کی روح۔ حاصل کلام یہ کہ میں گھر لوٹا۔ استاد کی گفتگو کو دہرایا... ایک ایک لفظ یاد کیا... دنوں ان کی باتوں پر سوچتا رہا۔ تو اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام انبیاء اور رسولوں میں سے ہر ایک کا ایک پیغام تھا۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل کے خاتم تھے... وہ تمام انسانوں کے لیے پیغام الٰہی کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے... میں نے اپنے دل میں اقرار کر لیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد بے شک اللہ کے رسول ہیں.... اور مجھے اس دین سے انتساب کا احساس بھی ہونے لگا جس کے

بارے میں اب میں سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔۔۔ بہت سے سوالات تھے جن کے اطمینان بخش جوابا کیا کروں۔۔ مسلمان کی حیثیت سے کیسے پیش آؤں اور کیا آداب اختیار کروں۔۔۔؟ اس کے لیے مجھے تھی۔ عربی میں مبتدی ہونے کی وجہ سے پہلے اسلام پر بیشتر کتابیں انگریزی میں پڑھیں، پھر عربی کی اکثر کتابیں پڑھ ڈالیں، تفسیر ظلال القرآن کے زیادہ تر حصے ختم کر دیئے۔ اور مجھے یہ احساس تھوڑا تھوڑا اسلام سے قریب ہو رہا ہوں کبھی کبھی اکتاہٹ اور تھکن کا دورہ پڑتا تو مطالعہ چھوڑ شروع کرتا۔

۱۹۹۱ء میں عربی زبان اور شرق اوسط کی تعلیم کی تکمیل کے لیے مصر پہنچا۔ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۱ء باوجود میری اسلامی دینی واقفیت معمولی تھی۔ مصر پہنچتے ہی مجھے اپنے سوالات کے جوابات تلاش ہر ملاقاتی اسلام میں داخل ہونے کی ہمت افزائی کرتا تھا۔۔۔ آخر کار میں اس مرحلے پر پہنچ گیا قبول کرنے کا فیصلہ کرنا تھا۔ میں نے اسلام کے اعلان کا فیصلہ کر لیا تو اپنے ساتھ مقیم دوست نے میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ادا کر سکتا ہوں۔ دیگر لوگوں نے کہا کہ جب تم اسلام قبول کر چکے تو از کر دینا چاہیے۔ ازہر پہنچا تو وہاں سب نے خوش آمدید کہا اور بتایا کہ جس دن سے تم نے اسلام قبو اسی دن سے تم مسلمان ہو۔ پھر پوچھا کہ کیا اسلامی نام رکھنا چاہو گے؟ تو میں نے کہا کہ میرے نز نہیں ہے، اصل چیز تو میرے اور اللہ کے درمیان کا تعلق ہے، ویسے کچھ لوگ مجھے داؤد سے بلاتے ہیں ہے تو داؤد ہی لکھ دیجیے۔

اسی سال امریکہ واپسی پر ماہ مبارک رمضان آیا تو مجھ کو روزہ رکھنا تھا۔ میں نے اہل اسلام کی بابت بتایا تو اولاد جن کی عمر تیرہ اور گیارہ سال تھی انھوں نے کہا: اچھی بات ہے۔ میں نے ار میں اسلام قبول کر چکا ہوں تو تم لوگ تو اپنے باپ کے تابع ہی ہوئے۔۔۔ لیکن میں نے ان پر اسلام کو چاہا بلکہ اس بات کا خیال رکھا کہ اسلام ان کے دل میں قدم بہ قدم داخل ہو۔ ان کے دماغ میں انھیں کہ وہ سوچ سمجھ کر ایمان لائیں۔ اب میرے بچے میرے ساتھ یہاں مصر میں رہتے ہیں۔ ا سے اسلام کی بابت جو اختلافات شروع ہوئے تو ہم دونوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی پر ہی ختم ہو۔ ظاہر ہے وہ امریکہ ہی میں رہ گئی۔

عجیب بات یہ کہ میں نے روزے تو رکھے، لیکن میرے اسلام قبول کرنے کے سال بھر یا اس کے باوجود مجھے نماز ادا کرنا نہیں آتی تھی جس کو اب میں پانچوں وقت یقینی طور پر ادا کرنا چاہتا تھا اسلامی مرکز میں جا کر نماز سیکھی اور یقین حاصل ہوا کہ دن بھر میں پانچ وقت نماز ادا کرنے کا مطلب اس کے پروردگار کے درمیان مسلسل رابطہ کا قیام ہے، اس لیے کہ انسان پانچ مرتبہ اللہ کے سا ہو کر اس سے خشوع و خضوع کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے۔ اسی دن سے میں نے اپنی نمازوں کی کا شروع کی۔

میرے ذہن میں اب جب بھی کوئی سوال اٹھتا ہے تو میں اس کا جواب قرآن کریم اور حدیث شریف

کرتا ہوں اور خدا کے شکر سے شافی و کافی جواب پاتا ہوں۔ نماز، زکوٰۃ، حج اور مسلمانوں پر تمام فرائض کے اسباب و وجوہ ہیں۔ کوئی چیز حکمت و مصلحت سے خالی نہیں۔ کلمۂ طیبہ کو ادا کرنا بھی ایک عبادت ہے اور میں اللہ سے قربت حاصل کرنے کے لیے اس کا ورد کرتا رہتا ہوں۔

مصر آنے سے پہلے میں بھی اسلام اور مسلمانوں کی بگڑی ہوئی صورت سے متاثر تھا۔ یہاں آنے کے بعد یہ تصور یقیناً بدلا ہے۔ اور اب اس لیے کہ میں مغربی ذہنیت کو اچھی طرح جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اہلِ مغرب کو صحیح دین کی سخت ضرورت ہے، اس لیے میرا ارادہ ہے کہ میں مقالات لکھ کر ان کو بتاؤں کہ اسلام سے متعلق جن جھوٹے الزامات اور اوہام و خرافات کی نسبت کی جاتی ہے وہ سب غلط ہیں۔

اصل میں امریکہ کے ذرائعِ ابلاغ پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ دیکھیے امریکہ کا سب سے اہم اور طاقتور اخبار نیویارک ٹائمز ایک یہودی خاندان کی ملکیت ہے۔ بیشتر اخبارات اسی سے اپنی خبریں حاصل کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر ان کو اسلام کی حقیقت شائع کرنے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ ہاں ان کو اسلام کے بارے میں یہودی نقطۂ نظر کی اشاعت سے غرض ہے۔ دیکھیے پہلے ان کا تنہا دشمن کمیونزم بنا ہوا تھا۔ اس کے بکھرنے کے بعد ان کو ایک نئے دشمن کی تلاش تھی۔ لہٰذا انہوں نے اسلام کو اپنا نیا دشمن بنا لیا۔ میں جب امریکہ میں تھا اس وقت اسرائیلی وزیر اعظم اسحٰق شامیر نے امریکہ کی زیارت کے موقع پر ایک عام جلسہ میں کہا تھا کہ اب ہمارا اور مغرب کا صرف ایک تنہا دشمن اسلام ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ اسرائیل کی ہر بات وہاں سنی جاتی ہے اور اس کو وزن دیا جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس وقت اس حیثیت و مرتبہ پر آزمائش کے لیے رکھا ہے۔ امریکن یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ کی صدارت، اسلام اور اس کی حقیقی صورت کی وضاحت کے لیے میرے اوپر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ قرآن و سنت سے حاصل شدہ صحیح مفاہیم پر مشتمل اسلام کے خوبصورت چہرہ کی رونمائی اور اہلِ بغض و کینہ کی بگاڑی ہوئی تصویر کے ازالہ کے لیے میرے نزدیک ترجمہ کی بڑی اہمیت ہے جس سے میں اس دینی خدمت کا کام لوں گا۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد چھ ملین (ساٹھ لاکھ) سے زیادہ ہے جب کہ یہودیوں کی تعداد چار ملین (چالیس لاکھ) سے کم۔ مگر یہودیوں کا قبضہ نہ صرف رسائل ابلاغ عامہ پر ہے بلکہ وہ امریکی فیصلوں کے ذمہ دار محکموں پر بھی حاوی ہیں۔ اور مسلمان اکثریت بے حیثیت و بے قیمت ہے۔ اب کچھ تبدیلی کے آثار ظاہر ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد کا وزن تمام امریکی صوبوں میں محسوس کیا جانے لگا ہے۔ مسلمانوں کو بڑی محنت کی ضرورت ہے کہ وہ ابلاغ عامہ کے رسائل میں اپنی آراء کے اظہار کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی حقیقی تصویر نمایاں کر کے امریکی فیصلوں کے مراکز پر اثر انداز ہوں۔ مجھے تو یقین کامل ہے کہ امریکہ و مغرب کو اسلام کی سخت ضرورت ہے تاکہ چین و آرام اور اطمینان کی زندگی جی سکیں، اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جبکہ وہ اسلام کو پہچانیں گے۔ اسلام سے واقفیت ہوگی تو عدل و انصاف کو بھی جان جائیں گے۔

اگرچہ میں نے مستقل طور پر مصر میں قیام اور زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا ہے، لیکن اہلِ خاندان سے

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

پروفیسر شاہ محمد وسیم *

سرسیّد کا نظریۂ تعلیم اور عصرِ جدید کے تقاضے

کاروانِ حیات، انسانی بتدریج اپنی منزلیں طے کرتا ہوا، وقت کے اہم موڑوں پر ٹھہرتا ہے شاید خود اپنی ہی کدوکاوش اور اپنے ہی اقدامات کا جائزہ لینے کے لیے اور نئے عزائم سے عہد و پیمان کرنے کے لیے، تاکہ انسانیت قدم بہ قدم چلتی ہوئی تہذیب و ثقافت اور سماجی و اقتصادی ترقی کے ایک نئے موڑ تک پہنچ جائے، پھر سے عزمِ سفر باندھنے کے لیے، نئے اقدارِ اعلیٰ کی روشنی میں نئے اقدامات کے سہارے پھر ایک نئے نشانِ منزل تک پہنچنے کے لیے۔ یہی تہذیب و تمدن کا قصہ بھی ہے اور مستقبل کی نشاندہی کرتا ہوا سلسلۂ تخیل بھی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ہر سفر اپنے ساتھ نئے تجربات اور نئے مسائل کی ایک طویل فہرست لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور پھر نئے مسائل سے کامیابی کے ساتھ نپٹنے والوں کی سوجھ بوجھ تاریخ کے دامن میں محفوظ ہوتی جاتی ہے ضرب المثل بننے کے لیے۔ مسائل بڑھتے ہیں تو اُن کے کامیاب حل بھی سامنے آتے ہیں۔

کل تعلیم کا تصور نہ تھا۔ لوگ تجربات کو مشکلات کا حل سمجھتے تھے 'کرو اور سیکھو' تربیتی نظام کا ایک اہم ستون سمجھا جاتا تھا۔ لوگ سامنے آتے تھے، آگے بڑھتے تھے مگر وہ جو باہمّت ہوتے تھے جنھیں مسائل سے جھوجھنا آتا تھا۔ کامیابی اُن کی ہمّت، اُن کے عزائم کو جلا عطا کرتی تھی اور ناکامی باعثِ افسوس و نقصان ہوتی تھی مگر یہ تو اُن لوگوں کی بات ہے جن میں ہمت ہوتی تھی، عزم و خود اعتمادی ان کا ساتھ دیتی تھی مگر وہ جو ہمّت، عزم و خود اعتمادی سے محروم ہوتے تھے محزون ہوتے تھے۔ وقت کے تقاضوں کو مدِنظر رکھ کر اقدامات کرنے والے ہی کامیاب سمجھے جاتے ہیں اور حقائق سے منھ موڑ کر، محض سرگرمِ عمل رہنے والے منزلوں سے دور کھڑے نظر آتے ہیں۔ ہمت ان کا ساتھ چھوڑنے لگتی ہے اور مایوسی اور قنوطیت کے شکار ہو جاتے ہیں یہ لوگ! اور بس اپنی زندگی کو قسمت کے ہاتھوں سونپ کر وقت کے فرمان کا انتظار کرتے ہیں۔ نتیجتاً اُن کا رُخ کبھی اُس طرف ہوتا ہے اور کبھی اس طرف اور ان کے ہاتھ آتی ہے، صرف ناکامی یا محنت و جاں فشانی کی نسبت کم سے کم فائدہ یا نتیجہ۔

اسی لیے تیز رفتاری کے ساتھ بدلتے ہوئے معاشرے میں کامیابی سے زندہ رہنے اور اپنے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر فرد ان تمام نکات سے واقف ہو اور اس طرح کی تعلیم و تربیت سے آراستہ و پیراستہ ہو اور وہ ہر مصیبت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے اور کامرانی اس کے قدم چومے۔ تہذیب اور تمدن کے اس دور میں تعلیم

---

* کو آرڈینیٹر، ایم۔ ٹی۔ اے پروگرام، کامرس ڈپارٹمنٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اور خاص کر پیشہ ورانہ تعلیم ہی مسائلِ انسانی کا کامیاب حل ہے۔

مندرجہ بالا تحریر کی روشنی میں ذرا سرسیّد کے تعلیمی نظریات پر غور وفکر کیجیے اور داد دیجیے اس رہبر، اس مفکر، اس دوراندیش مرد بزرگ، اس ماہر تعلیم کو اور تجزیہ کیجیے اس کے نظریات کا، اس کی دوررس نگاہوں کا اور قدر کیجیے اس کے احساسات اور اس کے جذبات کی کہ پٹنہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"تم اپنے بزرگوں کے حال سے مقابلہ کرو۔ آپ کے بزرگ جس زمانے میں تھے انھوں نے اپنے تئیں اس زمانہ کے لائق بنالیا تھا۔ اس لیے وہ دولت اور حشمت اور عزت سے نہال تھے اور جس زمانہ میں کہ ہم ہیں ہم نے اپنے تئیں اس زمانے کے لائق نہیں بنایا اس لیے عزبت اور ذلّت میں ہیں۔" [۱]

زمانے پر نظر کریں تو معلوم ہوجائے گا کہ ایک دور تھا جب تلوار کے دھنی زمین پر دندناتے پھرتے تھے — جائز وناجائز قبضے کرتے پھرتے تھے زمینوں پر دولت واملاک پر۔ تلوار ہاتھ سے چھوٹی تو دولتوں کی کنجیاں زمین و املاک کے کاغذات ہاتھ آئے اور ان پر قبضہ۔ پھر علم کا بول بالا ہوا اور اب علم کے نتیجے میں حاصل ہونے والی طاقت باعث تقویت ہوئی۔ اقتدار ہو یا حاکمیت سبھی ایک صحت مند معاشرے میں آج علم وہنر کے مرہون منت ہیں۔

سرسید جانتے تھے کہ ذہن ونظر کی پرواز، زندگی میں ادب واخلاق، سائنسی وتکنیکی ترقی، ایجادات وکمالات پر قدرت اور نتیجتاً حاصل ہونے والی ترقی وخوشحالی سبھی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم ہی کی دین ہیں۔ اسی لیے وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے مسلمانوں کی حالت پر نظر ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

"جو علوم مسلمانوں میں مروّج ہیں وہ بلاشبہ غیر مفید ہیں اور حسب احتیاج وقت نہیں ہیں اور یہی باعث ان کی مفلسی اور محتاجی کا ہے۔ کیوں کہ مفلسی کا اصل سبب جہل ہے اور غیر مفید علوم کا عالم اور جاہل دونوں برابر ہیں، اس لیے کہ ان سے نہ لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ وہ خود کچھ اپنا بھلا کرسکتے ہیں جو تعلیم کہ حسب احتیاج وقت نہ ہو وہ غیر مفید ہوتی ہے اور جیسا کہ ایک عقلمند آدمی کا قول ہے اگر حسب احتیاج وقت لوگوں کی تعلیم وتربیت نہ ہو تو اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ اول مفلس اور محتاج اور پھر نالائق اور کاہل اور پھر ذلیل وخوار اور پھر چور وبدمعاش ہوجاتے ہیں۔" [۲]

اس طرح یہ سمجھنا آسان ہے کہ وقت خود ایک واضح حقیقت ہے اور اس کے تقاضوں کو مدنظر رکھنا آئین فکر و اقدام کی رو سے ایک اہم ذمّہ داری ہے لیکن تعلیم وتربیت حاصل کرنے والوں کی اس طرح کی آرزو وتمنا ہو تو ان کے لیے ایک سازگار ماحول نہایت ضروری ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل نو کرتے رہنا ارباب حل وعقد کی ایک اہم ذمّہ داری ہے اور تعلیم وتربیت بہم پہنچانے والوں کو خود کو علم وعمل کے ساتھ وابستہ رکھنا ہوگا تاکہ متعلم کو معلم شاہراہ زندگی پر ایک مستعد معمار کی صورت نظر آئے اور عزم وہمت کا سبق دیتے ہوئے خود بھی آگے بڑھے اور دوسروں کو بھی آگے بڑھتے رہنے کی ترغیب دیتا رہے۔ سرسیّد نے تحریر فرمایا ہے:

"ہم اپنے ہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں کہ ان کے روحانی قویٰ بالکل نیست ونابود ہوجاتے

تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ نومبر ۱۹۹۵ء

ہیں اور صرف زبانی بک بک یا تکبر و غرور اور اپنے آپ کو بے مثل و نظیر قابل ادب سمجھنے کے اور کچھ باقی نہ رہتا۔ زندہ ہوتے ہیں مگر دلی اور روحانی قوی کی شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مردار ہوتے ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں اور جس قدر عمدہ کتابیں افراط سے ہم پہنچیں ان کو اور زیادہ پڑھتے ہیں اور ان سے تربیت حاصل کرتے ہیں اور ایسے بیل کی مانند ہو جاتے ہیں جو برابر چرتا ہے اور پھر بھی چراگاہ ہی میں رہنے خواہش کرتا ہے۔ پس کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں آجاتی بلکہ وہ کتابی علم خود ان پر بوجھ ہو ہے۔" ؎

اور بقول ممتاز حسین جون پوری "سر سید جانتے تھے کہ مغرب کے سمندر سے جو خیالات اور علم کا سیلاب ام ہندوستان کی طرف آرہا ہے اس میں مسلمان بہہ جائیں گے" اسی لیے وہ جدید اعلیٰ تعلیم سے اپنی تمام تر امید یں تھے۔ ہندوستانیوں اور بالخصوص پچھڑے ہوئے مسلمانوں کو جدید علوم حاصل کرنے اور میدانِ عمل میں کود پڑ۔ دے رہے تھے اور اسی لیے وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو ایک اہم رول عطا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کا بھی قوم کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے بہترین جدید و اعلیٰ تعلیم و تربیت۔ کر دیا جائے۔ تہذیب الاخلاق میں تحریر فرمایا:

"مجھ کو اس بات کا رنج ہے کہ میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ، ان میں نہایت دلیری اور جراُت پاتا ہوں پر خوفناک، ان میں نہایت قوی استقلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا، ان کو نہایت دانا اور عقل مند پاتا ہوں پر اکثر مکر و فریب اور زور سے ملے بے موقع۔ پس میرا دل چاہتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی، ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاویں تو دین اور دنیا دونوں کے لیے کیسی کچھ مفید ہوں۔" ؎

مندرجہ بالا تحریر اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ تعلیم ہو یا تربیت انھیں حاصل کرنے اور بہم پہنچانے کے لیے عصر جدید کے تقاضوں چاہیے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو کامیابی، کامرانی اور سرخروئی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خود اپنے دام فرسودگی کا شکا اور ان پر مشتمل گروہ بس سانس پہ سانس لیے جائے گا۔ اس خیال خام کے ساتھ کہ وہ تعلیم یافتہ ہیں اور تربیت یافتہ بھی۔ بھلا اس حقیق انکار کر سکتا ہے کہ عہدِ نو کی آواز پر لبیک کہنا وقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور زندہ قوموں کی ایک اہم ذمہ داری بھی کہ یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

آج عصر جدید پھر نئے انداز، ایک نئے سماجی اور معاشرتی نظام کا متقاضی ہے چال ڈھال و نئی وضع قطع کا۔ مع اور تصورات میں نمایاں تبدیلی ہو چکی ہے۔ اشتراکی نظام، سوشلسٹ تحریک سبھی اپنی آب و تاب کھو بیٹھے ہیں۔ سرکا میں چلنے والی صنعتی و پیداواری اکائیاں بجائے عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے، معتوب ہو چکی ہیں کہ وہ یا تو منافع نہ ہیں یا پھر گھاٹے میں چل رہی ہیں۔ اس طرح ان کے لیے فضا با دمخالف کی طرح مشکلات پیدا کر رہی ہے۔ اس کے برعکا مسابقت کرنے والی نجی منطقے کی اکائیاں معاشی اور سماجی ذمہ داریاں سنبھالنے کو آگے آرہی ہیں اور سرکاری ام رہبری ان کے لیے بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ لہٰذا یہ واضح رہے کہ اب آنے والے وقت میں نوکریاں اور تجارت کے انھیں اکائیوں کے ہاتھوں دستیاب ہوں گے۔

لہٰذا اب اندازِ فکر بدلنا ہوگا، تعلیم و تربیت کے اداروں اور نصاب میں نمایاں تبدیلیاں لانا ہوں گی ا

تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ نومبر ۱۹۹۵ء

معاشی و تجارتی تقاضوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے کرنا ہوگا۔ مزید یہ کہ ان تقاضوں کا احاطہ صرف ملکی سطح پر نہیں کیا جانا چاہیے، بلکہ بین الاقوامی ضرورتوں کو بھی مدّنظر رکھنا ہوگا۔ ان بڑھتے ہوئے مواقع اور روزگار کی سہولتوں سے فایدہ اُٹھانے کے لیے سرسید کی تحریک سے وابستہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اس کے تدریسی شعبوں کو آگے آنا ہوگا۔ جدید تعلیمی منصوبوں کے ساتھ تاکہ یونیورسٹی کے تحقیقی اور اعلیٰ تعلیمی معیار کو یہ نئی جہت دے کر قائم و دائم بھی رکھا جائے اور ساتھ ہی ساتھ پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت دے کر نوجوانوں کو اس قابل کر دیا جائے کہ ان "... میں ایک ملکہ اور... عقل اور ذہن میں ایک جودت پیدا ہو تاکہ جو امور پیش آئیں اُن کے سمجھنے کی، بُرائی بھلائی جاننے کی اور عجایب الٰہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو۔" [۵]

اور یہ فکر و فہم ہی ہیں جن کے سہارے انسان ان راستوں کو، پر پیچ اور پر خطر راہوں کو طے کر لیتا ہے جس کے بعد ایک روشن مستقبل اور کامیاب زندگی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ خود بھی سرخرو اور کامیاب ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے معاون و مددگار بھی ہوتا ہے۔ اس طرح ایک فرد ہی نہیں، سارا معاشرہ ترقی کرتا ہے۔ سر سید احمد خاں روشن خیال اور زیرک افراد کی علیحدہ علیحدہ ترقی اور خوش حالی کے ساتھ ساتھ پوری قوم کی ترقی اور خوش حالی کی تمنا اور آرزو لیے ہوئے مستقبل کا نقشہ مرتب کر رہے تھے، جسے علم و عمل کی روشنی میں حقیقت میں بدلنے کے خواہاں تھے۔ وہ خوش حالی کے ساتھ بسر کی جانے والی کسی فرد واحد کی زندگی کو ترقی سے تعبیر نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ افراد بدلیں اور معاشرہ بدلے، افراد ترقی کریں اور اس طرح ترقی کریں کہ پوری قوم اتحاد و یک جہتی کے ساتھ کامیابی سے قدم بڑھاتے ہوئے نشانِ منزل تک پہنچے اور پھر عزم سفر باندھ کر منزل بہ منزل آگے ہی بڑھتی جائے۔ بڑھتی جائے ایک ترقی پذیر معاشرے میں نشو و نما پانے والی معیشت میں۔ لکھنؤ میں اپنی تقریر میں انھوں نے کہا:

> "اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔" [۶]

جس طرح فرد کی ترقی کے بغیر اجتماعی ترقی ناممکن ہے اسی طرح "اجتماعی ترقی کے بغیر فرد کی ترقی بھی ناممکن اور بے سود ہے۔" ایک مربوط معاشرہ میں افراد کی الگ الگ ترقی معاشرے کو اس کی نمود اور استحکام بخشتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں کمزور اور وسائل کی کمی سے دوچار افراد، اگر اسی خیال کے تحت ایک دوسرے سے تعاون کریں تو کیا نہیں ہو سکتا؟ آج کے اس دور میں جہاں آزاد معیشت کی تشکیل نو کی جا رہی ہے، جہاں افراد اور گروپ کو یہ آزادی عطا کی جا رہی ہے کہ معیشت کی نمود اور ترقی اگر وہ نجی تجارت کو فروغ دے کر یا صنعتی ادارے اور کمپنیاں وغیرہ بنا کر کرنا چاہیں تو آگے آئیں، البتہ ان کے پاس پیشہ ورانہ تعلیمی استعداد ہو اور وہ سرمایہ فراہم کر سکتے ہوں۔ اس خیال کے تحت ذرا سرسید کی دور رس نگاہوں پر نظر کیجیے اور داد دیجیے کہ ان کا خیال تھا:

> "مسلمانوں میں جو لوگ دولت مند ہیں وہ تجارت کی طرف مائل نہیں ہیں اور نہ ان کو ضرورت ہے کہ تجارت کے ذریعے سے کچھ روپیہ پیدا کریں۔ ضرورت ہے ان مسلمانوں کو جو قلیل سرمایہ رکھتے ہیں اور جب تک کہ کثرت سے لوگ آپس میں شریک نہ ہوں اس وقت تک کوئی کام تجارت کا جاری نہیں ہو سکتا۔" [۷]

اور کون نہیں جانتا کہ اس سائنسی اور تکنیکی دور میں پیداواری وسائل حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت

ہوتی ہے اور مسئلہ کا حل یہ ہے کہ کمپنیاں قائم کی جائیں جن کے حصص ان لوگوں کو فروخت کیے جاویں جن کے پا
ہے مگر چھوٹی رقوم کے حصص خرید سکتے ہیں۔

مسابقت کے اس دور میں وہ افراد جو استعداد رکھتے ہیں، تعلیم یافتہ ہیں اور تربیت نے انھیں م
انھیں حل کرکے نتائج برآمد کرلینے کے قابل بنا دیا ہے انھیں سامنے آنا چاہیے اور خوش حالی اور اقتصادی مضبو
معاشرے کو حیات نو بخشنا چاہیے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو خود بھی آگے بڑھیں گے اور دوسروں کی بھی رہبری کریں
انتظامیہ اور سماجی اداروں سبھی کو ان کی مدد کرنا چاہیے۔ سرسید جو مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی ابتری کی وجہ
پریشان نظر آتے تھے صرف یہی نہیں چاہتے تھے کہ صرف مسلمان ترقی کریں بلکہ وہ تو ہندوستان اور تمام ہندو
بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔

آج ہمارے ملک میں بین الاقوامی تجارتی کمپنیاں آرہی ہیں۔ سرسید کہتے تھے کہ:

"ہم کو ایسا لائق ہونا چاہیے کہ ... ہماری تجارت کی محمڈن اینڈ ھندو کمپنی کے نام سے کوٹھیاں لن
میں، ایڈنبرا میں، ڈبلن میں، برسلز میں، سینٹ پٹرس برگ میں، برلن میں، ویانا میں
قسطنطنیہ میں، پیکن میں، واشنگٹن میں اور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں... جس سے
ہم کو عزت، دولت، حشمت اور حکومت حاصل ہو۔"

یہی نہیں قوم کے ضمیر اور اس کی روح مسابقت کو یہ کہہ کر جھنجھوڑا:

"سمندر کے اندر ہمارا کچھ حصہ نہیں ہے۔ ہم کو چاہیے کہ دوسرے ملکوں میں آڑھت کمپنیاں قائم کر
جس سے اعلیٰ درجے کے کام ہوں۔ ملک کی پیداوار اور قدرتی چیزیں جو زمین میں گڑی پڑی ہیں
ان سے فائدہ اٹھاویں۔" [۵]

سرسید کی تعلیمی تحریک کے نتیجے میں ایم۔ اے۔ او کالج (M.A.O) بڑھتے بڑھتے یونیورسٹی بن گیا۔ "آج
جو" بقول مولانا ابوالکلام آزاد اپنی ماضی کی ایسی شاندار داستان رکھتا ہو قدرتی طور پر اس کا مستحق ہے
مستقبل اپنے سامنے دیکھے۔" مولانا آزاد ہی نے جو اس وقت وزیر تعلیم حکومت ہند تھے ۲ر فروری ۴۸ء
تقسیم اسناد کے موقع پر کیا خوب فرمایا تھا:

"... تم نے سعی و عمل کے جو پرانے پیمانے اپنے ہی ہاتھوں میں رکھے تھے وہ وقت کی نئی پیمائشوں
کے لیے کام نہیں دے سکتے۔ تمھیں اب نئے پیمانے ڈھالنے ہیں۔ تمھیں نئے بٹوں سے سعی و عمل
کی نئی مقداریں تولنی ہیں۔ تمھیں اب زندگی کی جد و جہد میں نئے ارادوں اور نئی اولوالعزمی کے
ساتھ قدم اٹھانا ہے اور اس قابلیت کو جو تم نے اس درس گاہ سے حاصل کی ہے ایسے کاموں
میں لگانا ہے جو تمھارے ملک کی نئی رفعتوں کا ساتھ دے سکے۔ اگر تم نے ملک کی ترقی پسند
قومیت کی روح اپنے اندر پیدا کرلی جو تمھاری جمہوری حکومت کا دستور العمل ہے تو تمھارے
وطن کی کوئی بلندی ایسی نہیں ہوگی جہاں تک تمھارا ہاتھ نہ پہنچ سکے اور کوئی کامرانی ایسی نہ ہوگی
جو تمھارا استقبال نہ کرے" اور آزادی کے بعد ملک کی تاریخ کا کوئی باب بھی ایسا نہیں ہے جس

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء

میں فرزندانِ علی گڑھ نے اپنے خیالات اور اقدامات کی مہر ثبت نہ کی ہو اور ناموری حاصل نہ کی ہو۔

حالات بدلتے ہیں، اقدار بدلتی ہیں، مقصد اور نشانِ منزل سب کی نظر کے سامنے ہوتے ہیں۔ عصرِ جدید کے سماجی، معاشی اور سیاسی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے یونیورسٹی، اس کے اساتذہ، طلباء اور انتظامیہ سبھی کو اپنی اپنی ذمّہ داری نبھانا پڑے گی تاکہ وقت کی آواز پر فرزندانِ علی گڑھ لبیک کہتے ہوئے مسائل کا بہترین حل پیش کریں اور کامیابیوں سے ہم کنار ہوں۔ سرسیّد کے چمن کے پھول اس طرح پھولیں، کردار کی خوشبو سے صحنِ عالم کو ایسا سرشار کر دیں کہ ہر زبان اور ذہن کہہ اُٹھے کہ "جتنے دماغوں نے گھراہٹ میں نہیں، بڑی سنجیدگی سے مدتوں سوچا اور غور کیا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ علی گڑھ تحریک کا نہ صرف مسلمانوں بلکہ انسانیت پر عظیم احسان ہے کہ مذہب پر سوچنے کے لیے نئی شاہراہ اور تہذیب و اخلاق کے زمانہ پسند جادے پر گامزن ہونے اور علم و ادب و تخیل اور رسوسائٹی، فرض شناسی اور پیکرِ انسانیت میں ایک تازہ روح پھونکنے میں علی گڑھ تحریک کا بڑا حصہ ہے۔ اس علی گڑھ کے مختلف موضوعات کے مضامین اور ناموَر فرزندان جو علی گڑھ نے پیدا کر کے مختلف دیار اور اطرافِ عالم میں بھیجے اور گوشے گوشے میں پھیلائے، ان سے بہت افراط کے ساتھ اس کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ علی گڑھ کی جامعیت نے ایسی شعوری زندگی پیدا کر دی ہے جو کسی اور طرح شاید ممکن نہ ہو سکتی"۔ [۹]

حوالے

۱۔ لیکچرز کا مجموعہ۔ ص ۴۱

۲۔ مضامین تہذیب الاخلاق۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۲۹

۳۔ تہذیب الاخلاق۔ جلد سوم۔ بابت ا رمحرم الحرام ۱۲۸۹ھ

۴۔ تہذیب الاخلاق، یکم شوال ۱۲۸۹ھ

۵۔ سرسیّد احمد خاں، حیاتِ جاوید، جلد ۲، صفحہ ۸۵

۶۔ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی، ۷ر اپریل ۱۸۷۶ء

۷۔ تہذیب الاخلاق جلد دوم نمبر ۴ (دورِ سوم) بابت یکم محرم الحرام ۱۳۱۳ھ

۸۔ لیکچرز کا مجموعہ صفحہ ۱۸۷

۹۔ ممتاز حسین جون پوری، سرسید اور زندگی کا نیا شعور، علی گڑھ میگزین ۵۴۔۱۹۵۳ء و ۵۵۔۱۹۵۴ء، ایڈیٹر نسیم قریشی، صفحہ ۲۲۷۔

پروفیسر ضیاء الحسن*

سماجی بہبودی میں ایک انجینیرنگ استاد کا کرد

اگر کسی سے یہ سوال پوچھا جائے کہ ایک استاد کا کیا کام ہے، تو اس کا ایک آسان جواب ہوگا 'در
لیکن اگر اس پر گہرائی سے غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ایک استاد کو پڑھنے پڑھانے کے علاوہ کچھ او
نبھانی پڑتی ہیں۔ مثلاً امتحان کے پرچے بنانا، کاپیاں جانچنا، نصاب تیار کرنا، تجربہ گاہوں کو قائم کر
وغیرہ کو ضابطوں کے تحت خریدنا۔ ان کے علاوہ بھی ایک استاد کو بعض اوقات کچھ مزید ذمہ داریا
جیسے لائبریری کی دیکھ بھال، تجربہ گاہ کا نظم و نسق، طلباء سوسائٹی کا انتظام وغیرہ۔

ان سب کاموں کے بعد بھی ایک استاد کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی۔ راقم الحروف کی رائے
استاد کی پوری ذمہ داری کو سو نمبر دیئے جائیں تو متذکرہ بالا کاموں کے حصہ میں ۲۵ نمبر آئیں گے
ذمہ داریوں کا ¼ حصہ۔ ایک استاد کی ذمہ داری کا جو اہم ترین پہلو ہے وہ اپنے طلباء کی صحیح تربیہ
کے لیے مستقل محنت درکار ہوتی ہے۔ تربیت میں بہت سی باتیں شامل ہیں۔ مثلاً خوش اخلا
حصول علم کا جذبہ پیدا کرنا۔ وقت کی قدر و قیمت کا احساس دلانا، حق و انصاف اور ایمانداری
کو ابھارنا اور ان پر زندگی کی اساس رکھنا وغیرہ۔ راقم الحروف کی رائے میں اس کام کے لیے چا
چاہئیں۔

ایک امریکی خاتون پروفیسر نے اپنے ایک مضمون میں کچھ اس طرح لکھا تھا کہ اگر ایک اس
زندگی میں صرف ایک طالب علم کے دل میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کر دے تو وہ یہ سمجھ لے کہ
استاد ہونے کا حق ادا کر دیا۔ یہاں مجھے جنرل ولیم ایک مشہور انجنیر کے وہ الفاظ یاد آرہے ہیں
۱۹۵۶ء میں انجنیرنگ کالج (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) میں اپنی آمد کے موقع پر دوران گفتگو کہے تھے کہ
اس وقت تک عزت پانے کا مستحق نہیں جب تک وہ اپنے مضمون کی ریسرچ میں نہ لگا ہو۔ یہ
بھی سامنے آتی ہے کہ ایک استاد کی ذمہ داریوں میں ریسرچ کرنا بھی شامل ہے۔ اس کام کے لیے
کی رائے میں ۱۵ فی صد نمبر مقرر کیے جاسکتے ہیں۔ ایک استاد کی ذمہ داریوں کی کہانی یہاں بھی ح

---

*پرنسپل، یونیورسٹی پالی ٹیکنک، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کیوں کہ ابھی سماجی بہبودی کا کام باقی ہے جسے ایک استاد کو ہی اپنی ذمہ داری سمجھ کر پورا کرنا ہے اور سماجی بہبودی کا عمل اس کی ذمہ داریوں کا ایک اہم حصہ ہے۔

ہم سب ہی جانتے ہیں کہ ہندوستان میں تکنیکی تعلیم مندرجہ ذیل تین سطحوں پر دی جاتی ہے، انجینئرنگ کالج، پالی ٹیکنک اور آئی ٹی آئی کی سطح پر۔

حکومتِ ہند کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ تھا کہ تکنیکی اداروں سے سماجی بہبودی کے کاموں میں مدد لی جاسکتی ہے۔ ان اداروں کے ذریعہ ان خستہ حال لوگوں کو جو اپنی مجبوریوں کے تحت تعلیم نہ پا سکے، کم سے کم وقت میں کوئی ایسا ہنر سکھا دیا جائے کہ وہ روزی روٹی کے معاملے میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے حکومتِ ہند نے درمیانی راستہ اختیار کرنا مناسب سمجھا اور تجربہ نے بھی بتایا کہ یہ فیصلہ صحیح تھا۔ ۱۹۷۹ء میں حکومتِ ہند نے کچھ منتخب پالی ٹیکنکس میں کمیونٹی پالی ٹیکنک کی اسکیم جاری کی ابتدا میں جس کا مقصد افرادی قوت کی ترقی تھا۔ اس اسکیم کے تحت جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے ایسے لوگوں کی ٹریننگ کا انتظام کیا گیا جو ناخواندہ تھے۔ اس ٹریننگ میں ان لوگوں کے لیے نہ تو عمر کی کوئی قید رکھی گئی نہ ہی جنس کی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی اسکیم کو بھی روبہ عمل لانے اور کامیابی سے ہم کنار کرنے میں ادارے کے استادوں کا ہی ہاتھ تھا۔ یہاں اساتذہ کو یہ طے کرنا تھا کہ کس صورت میں لوگوں کو ٹریننگ دی جائے۔ کیا نصاب مقرر کیا جائے۔ کس قسم کے آلات مہیا کرائے جائیں اور کس طرح کے دستکاروں سے تعاون حاصل کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ جب اس اسکیم پر عمل شروع ہو گیا اور مثبت نتائج سامنے آنے لگے تو دائرہ کار کو وسیع کیا گیا اور اس اسکیم میں ان مقامات کو خصوصاً شامل کیا گیا جہاں بے روزگاری زیادہ تھی مثلاً دور دراز کے دیہات میں جہاں باقاعدہ ایسے مراکز قائم کیے گئے اور ان کے ذریعے اسکیم سے متعلق تمام ضروری تفصیلات پہنچائی گئیں ساتھ ہی ساتھ اچھی اور سستی تکنیک کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا گیا اور دیہاتوں کے بچوں کو کوئی نہ کوئی دستکاری سیکھنے کی طرف مائل کیا گیا۔

گزشتہ عرصہ میں حکومتِ ہند نے یہ طے کیا کہ منتخب پالی ٹیکنک میں دیہی ترقی کے مراکز قائم کیے جائیں جہاں اس ادارے کے اساتذہ ریسرچ اور ترقی کے کاموں میں مصروف رہیں تاکہ دیہات کے لوگوں میں اس کے متعلق بیداری پیدا ہو۔ یہاں راقم الحروف ایک ایسے ادارہ کی زندہ مثال پیش کرنا چاہتا ہے جہاں اس طرح کے سارے کاموں میں اس کے اساتذہ حصہ لیتے ہیں اور وہ ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پالی ٹیکنک۔ یہاں کمیونٹی پالی ٹیکنک ۱۹۸۳ء میں اور دیہی ترقی کا مرکز ۱۹۹۳ء میں قائم ہوا۔ اس ادارے نے ۲۱ مارچ ۱۹۹۵ء تک جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) ۲۲۶۵ مرد اور عورتوں کو تقریباً سترہ طریقوں کی صنعت / دستکاری میں تین سے چھ ماہ تک تربیت و مہارت فراہم کی گئی جن میں بجلی کا کام، اسکوٹر اور موپیڈ کی مرمت کا کام، ٹی۔ وی۔ کی مرمت کا کام، ویلڈنگ کا کام، اسکرین ٹیکسٹائل پرنٹنگ، بڑھئی گیری اور کمپیوٹر وغیرہ

(۲) ۱۰۰۶ ـ افراد کو ملازمت ملی۔

(۳) پانچ طرح کی سستی ٹیکنک ایجاد کی گئی جیسے پیڑ کی سوکھی پتیوں سے جلنے والی انگیٹھی، سیمنٹ کی بنی ہوئی اناج کی کوٹھانی، مویشیوں کے کھانے کی ناند اور اپلے بنانے کی مشین۔

(۴) علی گڑھ کے گرد و نواح میں پندرہ دیہی مراکز کا قیام۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے تقریبًا یہ سارا کام غیر تعلیم یافتہ افراد کی بہبودی و ترقی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انجینیرنگ اداروں کے اساتذہ کم پڑھے لکھے یا پڑھے لکھے بے روزگا طرح کی کوئی اسکیم نہیں بنا سکتے۔ ایسی اسکیم یونیورسٹی پالی ٹیکنک میں کاری گروں کی ترقی سے چل رہی ہے۔ اس اسکیم کے تحت کاری گروں کے ان بچوں کو جو کسی مجبوری ؛ جماعت پاس کرنے کے بعد اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ پاتے، ٹریننگ دی جاتی ہے جس کی مدت د پروگرام میں بہت سے اساتذہ رضاکارانہ طور پر حصہ لیتے ہیں۔ اس وقت پورے ہندوستان ۳۵۰ پالی ٹیکنک اس طرح کے پروگرام چلا رہے ہیں۔ اس جذبہ سے یہ واضح ہوجاتا ہے اسکی نہیں، ضرورت ہے تو جذبہ عمل اور خوئے اشتراک کی۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۴۵ کا)

ملاقات کے لیے آمدورفت تو لگی رہے گی، اور ایسے مواقع پر میں اہل امریکہ سے اسلام کے بات چیت جاری رکھوں گا، لیکچر دوں گا، لکھوں گا، امریکی رائے عامہ کے اسلام اور مسلمانوں غلط تصورات کی تصحیح کروں گا۔ امریکی فیصلہ کرنے والے ذمہ داروں کو اسرائیل کے اسلام کے ہتھکنڈے استعمال کرنے سے آگاہ کروں گا۔ اور بتاؤں گا کہ اگر یہاں دہشت گردی نام کی کوئی اسلام دشمن عالمی صہیونیت کے ذریعہ باہر سے لائی گئی ہے، بیرون ہی سے اس کی سرپرستی ہو رہی سے اس پر مال و دولت ان ٹیکسوں ہیں سے خرچ کی جارہی ہے جو ہم امریکہ میں ادا کرتے ہیں مگر صہیونیت کی بدولت اسرائیل کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد پر ق
(ماہنامہ التوحید، قاہرہ، ۴/۲۴ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ، ص ۳۶-۴۲)

(بقیہ صفحہ نمبر ۴۱ کا)

کی تشکیل کی جانب کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ سر سید کا مقصد تھا کہ تعلیم یافتہ نوجوان ہر اعتبار سے مفید ثابت ہوں اور وہ ترقی پذیر معاشرے میں اپنی خدمات انجام دیں اور اپنا فرض ادا کریں جو نئے تقاضوں کے مطابق ہو۔

م۔ معتصم *

تعلیم بالغان میں ادیبوں کا رول

جس طرح سہولت کی خاطر انسانی تاریخ کو قبل از مسیح اور بعد از مسیح میں تقسیم کیا گیا ہے اسی طرح انسانی ندگی حرف شناسی سے قبل اور حرف شناسی کے بعد کے دور میں منقسم ہے۔ ادیب کا کردار دراصل حرف شناسی ے بعد شروع ہوتا ہے۔ تھوڑا پڑھنا سیکھ لینے کے بعد ہماری زندگی میں ادیب کی آمد ہوتی ہے۔ لیکن اس مضمون میں ادیب کے اس رول پر غور کر رہے ہیں جو حرف شناسی سے قبل کا ہے۔

لکھنا پڑھنا سیکھنے کا مطلب ایک نئی دنیا میں قدم رکھنا ہے۔ حروف کی اس دنیا میں داخلے کے بعد ہی ادیب رول شروع ہوتا ہے۔ اعداد و شمار کچھ بھی بتاتے ہوں، ہمارے ملک کے تقریباً ۷۰ فیصد افراد ناخواندہ ہیں۔ اس لیے موجودہ صورتِ حال میں وہاں ادیبوں کا کوئی رول نہیں ہے۔ اسے ۷۰ فیصد آبادی کی زندگی میں بھی ادب اور یب کا رول پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں لکھنا پڑھنا سکھایا جائے۔ اس لیے ادیبوں پر دوہری ذمہ داری اید ہوتی ہے۔ حرف شناسی کے بعد ہی نہیں بلکہ اس سے قبل بھی یعنی ادیب اپنا سبق خود تیار کرے۔ خواندگی اور تعلیم لغان کے فروغ میں خود ادیب کا اپنا مقصد ہے۔ اور وہ ہے اپنی زمین خود تیار کرنے کے مقصد کا حصول۔

ملک کی بیشتر آبادی کا ناخواندہ رہنا اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام ادھورا ہے۔ اس کمی کو ور کرنے کے لیے تعلیم بالغان کا سلسلہ شروع کیا گیا جو اس مسئلہ کا ایک لازمی حل ہے۔ لیکن دراصل خامی کہیں اور ہے۔ جسے دور کرنا ضروری ہے۔ یہ نقش مادی اور ثقافتی ورثے کی غیر مساوی تقسیم میں مضمر ہے۔ پبلو نرودا نے کہا تھا کہ "روٹی اور نظم میں سبھی کا حصہ ہونا چاہیے"۔ اس مقصد کے حصول اور مکمل سماجی تبدیلی کے لیے اس ستر فیصد آبادی کو بھی حرف شناسی کی تعلیم دینا لازمی ہے۔ اس آبادی میں بیشتر افراد وہ ہیں جو اناج پیدا کرتے ہیں اور کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ ہماری مادی زندگی پوری طرح سماج کے اسی طبقے پر انحصار کرتی ہے۔ اس کی محنت کے بل پر ہی ہمیں کچھ خالی لمحے حاصل ہوتے ہیں جن میں ہم لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ تہذیبی زندگی میں ان کی شرکت میں اضافہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس طبقے کو پڑھنا لکھنا سکھایا جائے۔ اس سے اس طبقے میں شعور پیدا ہوگا اور سماج میں مثبت تبدیلی آئے گی۔ تعلیم بالغان سماجی تغیر کے عمل کا ایک لازمی حصہ ہے۔ یہ بہت دور تک

---

* نیشنل ٹیلرنگ ہاؤس، کے۔ پی روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

اثر انداز ہونے والا ایک انقلابی عمل ہے۔ اسی لیے اس میں ادیب کا شامل ہونا بہت ضروری
خواندگی کے پروگرام میں ہر طبقے کے لوگ شریک ہیں اور پوری لگن کے ساتھ کام کر رہے ہیں لیکن
اس میں شمولیت کا مقصد کروڑوں افراد کو ذہنی غلامی سے آزادی دلانا ہے جب پورا معاشرہ خواندہ
طور پر سماجی اور سیاسی شعور کی سطح بلند ہوگی لوگ باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے اور زندگی کو ایک
گے۔ یہ تصور ہی کس قدر خوش کن ہے کہ کبھی فیض یا نرالا کی ایک نظم کو اسّی کروڑ قارئین اپنی
گنگنا رہے ہوں اور لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ ۸۰ کروڑ افراد ایک ساتھ غور و فکر کریں گے تو ملک
کی جڑیں مضبوط ہوں گی، لوگ خود سوچیں گے اور خود فیصلہ کر لیں گے۔ یہ فرد کی آزادی اور ذہ
سمت سب سے بڑا اقدام ہوگا۔ ان کروڑوں نئے قارئین میں سے ہزاروں نئے ادیب بھی تو پیدا ہو

یہ ایک بنیادی سوال ہے کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے انہیں کیسے سکھایا جائے۔ جو سیکھ
پڑھنے کے لیے کس طرح کی کتابیں دی جائیں اور اس عمل میں ادیب کا کیا رول ہو سکتا ہے۔ یہ بات غور
ہم انہیں پڑھنا لکھنا سکھانے جا رہے ہیں جو زندگی کو شاید ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ اس لیے سکھانے
خود سیکھنا ہوگا۔ ایک ادیب انسانی جذبات کو زیادہ باریکی سے سمجھتا ہے۔ اور اس کا احترام کرتا
سے لے کر ٹالسٹائی تک اور بالمیکی سے پریم چند تک ہر ادیب کی تصانیف میں عام انسان اور ا
کی زندگی اور زندگی کا شعور ہی بنیادی عنصر ہے۔ اس لیے مساوات کے تصور اور اس کے احترام کے
کا پروگرام بے معنی ہے۔ ادیب ناخواندہ افراد سے بات کر کے اور ان کے تجربوں کو سمجھ کر ان کے لیے مو
کر سکتے ہیں۔ اس طرح دو طرفہ پڑھائی ہوگی اور پڑھنے والوں میں اعتماد پیدا ہوگا۔ ادیبوں، ثقافتی
فن کاروں کا طبقہ گاؤں اور محلوں میں گھوم گھوم کر لوگوں کو پڑھائی کی طرف مائل کر سکتا ہے۔ لوگ
ہیں کہ اس پڑھائی سے انہیں کیا فائدہ ہوگا۔ یہ ایک بہت مشکل سوال ہے۔ اس کا جواب دینا اور لوگو
کی طرف راغب کرنا ادیبوں کی ذمہ داری ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ ادیب اس پروگرام کے لیے سبق تیار کر سکتے ہیں۔ یہ ذمہ داری ادیبوں کو سونپی جا
اس عمل میں خود ادیبوں کو زندگی کے نئے تجربات ہوں گے۔

تعلیم بالغان سماجی تبدیلی کے عمل کا ایک حصّہ ہے۔ اور شعور کی وسعت کا ایک لازمی ذریعہ۔ یہ انسان
کو خوبصورت اور خوشحال بنانے کی بنیاد ہے۔ ادیب کا خواب بھی تو یہی ہوتا ہے۔ اس لیے ادیب کا
شناسی کے بعد ہی نہیں پہلے بھی ہے۔ کروڑوں لوگوں کو سماج کے اصل دھارے میں لانے کے لیے
کوششیں کرنی ہوں گی آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ادیب آگے آئیں اور سماج کے تئیں اپنی اس
ذمہ داری کو پورا کریں۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۴ دسمبر ۱۹۹۵ء شمارہ ۱۲

بانی : سرسیّد احمد خاں

مدیر —————— نائب مدیر

پروفیسر نعیم احمد —————— احمد مجتبیٰ قریشی

سرکولیشن انچارج : محمد عتیق قاضی

فی شمارہ 50 6 روپے زر سالانہ 00 65 زر سالانہ طلبہ 00 45 روپے

بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک) 00 30 امریکی ڈالر بیرونی ممالک (عام ڈاک) 00 - 15 امریکی ڈالر

لائف ممبرشپ (اندرون ملک) 00 650 روپے لائف ممبرشپ (بیرون ملک) 00 300 امریکی ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اور نشانت

۱۔ شبلی روڈ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ترتیب

(تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ان سے
ایڈیٹر، پبلشر پروفیسر نعیم احمد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کے توسط سے چھپوا کر ادارۂ تہذیب الاخلاق
اور نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا۔

اداریہ

لمحۂ فکریہ

کیا اس لیے چنوائے تھے تقدیر نے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگادے

نظم وضبط، صبروتحمل، ذاتی مفاد پر معیار کو ترجیح، شخصی یا گروہی رائے کے مقابلے رائے عامہ کا احترام، ہر حال میں منصبی فرائض کی ادائیگی، منصبی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے اہلیت میں لگاتار اضافہ، صفوں سے باہر اور صفوں کے اندر شیرو شکر ان عناصر کے تئیں محتاط رویہ جن کے قول وفعل میں تضاد بار بار ثابت ہوتا رہتا ہے۔ ان عناصر سے باخبری جو بحرانی حالات پیدا کرنے میں سرگرم حصہ لیتے ہیں اور پھر رُخ بدل کر قصیدہ خوانی شروع کر دیتے ہیں۔ گزشتہ دس پندرہ برسوں سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انہی اسرار و رموز کو نظر انداز کرنے کے نتیجے میں پیدا شدہ صورتِ حال کی شکار بنی ہوئی ہے۔

طالبِ علموں کی تعداد میں کم سے کم چار گنا اضافہ ہوگیا ہے۔ داخلہ کے خواہش مندوں کی تعداد داخلہ پا جانے والے طالب علموں سے بھی چوگنی ہوتی ہے۔ اس سارے عمل میں جو غیر یقینی کیفیت اور الجھاؤ ہوتا ہے، اسے قسمت آزما نہ صرف ہوا دیتے ہیں، بہتی گنگا بنانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ جو انھیں ہاتھ دھونے سے روکے۔ نہ صرف اسے نشانہ بناتے ہیں، بلکہ سارے عمل کو زورِ بیان، قوت بازو اور تکرار سے بے وقعت بنانے میں جٹ جاتے ہیں۔

تقرر اور ترقی کے تناظر میں بھی یہ صورت حال کار فرما ہے۔ باصلاحیت خون جگر پی کر رہ جاتے ہیں جب کہ اندھی گلیوں سے پیش قدمی کرنے والے بعض عناصر پیر کا بس ایک انگوٹھا ٹکانے بھر جگہ کی کاوش کرتے ہیں اور پھر اپنے سرپرستوں اور مددگاروں کی مدد سے ایسے داؤ پیچ دکھاتے ہیں کہ

ع زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد

انتظامی اور تدریسی ماحول کو تہ و بالا کرنے میں یہی حالات اور عناصر کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

سرسید ہم عصر حالات اور مسلمانوں کی تعلیمی و تہذیبی پسماندگی پر خون کے آنسو روئے تھے۔ ان کا خونِ جگر اس تعلیمی ادارے کی رگوں میں دوڑ گیا تھا۔ ان کی آنکھوں سے ٹپکا ہوا ہر آنسو اس بے آب و گیاہ سرزمین کو شاداب اور محرومی و پسماندگی کی شکار ملت کو مالا مال کر گیا۔

سرسید نے تعلیم اور تربیت دونوں کا بیڑہ اُٹھایا تھا۔ ان کے خلوص نے اس درس گاہ کی فضاؤں کو وہ مہک بخشی جس سے سرشار ہر فرد علیگ کے نام سے موسوم ہوا۔ زمان و مکاں کا بُعد یہ سرشاری کم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ یہ یکجہتی اور رفاقت بس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی کا عطیہ ہے۔

یہ درس گاہ مسلمانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد کے لیے جدید اعلیٰ تعلیم کا وسیلہ بننے کے سبب ان عناصر کی آنکھوں میں کھٹکتی آئی ہے جنھیں مسلمانوں کا ایسی تعلیم حاصل کرنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ دسمبر ۱۹۹۵ء

ماضی قریب میں بزعم خود ملّت، طالب علموں اور مسلم یونیورسٹی کے بہی خواہوں نے مختلف منچوں سے جو چلائیں، ساری نیک نیتی کے باوجود ان کا حاصل اس کے ہر معیار پر کم سے کم سوالیہ نشان لگ جانے کے سوا کچ میں اس یونیورسٹی کے خلاف دھماکہ خیز مواد ہاتھ آنا چاہیے تھا، لیکن حال ہی میں نئے سربراہ نے خلوص، کا جو ثبوت فراہم کیا ہے اس نے رائے عامہ کے بہت بڑے حصے کو گرویدہ کرلیا ہے۔ انگریزی اور ہندی کے اختلال کی جس طرح رپورٹنگ کی اور اپنے اداریوں میں جن خیالات کا اظہار کیا، ان سے نہ صرف نیک خواہشات واضح ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

خیر سگالی کے یہ جذبات اور نیک تمناؤں کا یہ اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے ایک بڑا سرمایہ ہے ہوتے ہوتے یہ تلخ حقیقت سامنے آگئی ہے کہ اس وقت مسلمان تعلیم کی دوڑ میں کم سے کم اتنے ہی پیچھے ہیں سال قبل پیچھے تھے ملازمت اور کاروبار کو نئے تکنیکی تناظر نئی نئی صورتیں بخش رہے ہیں۔ دس بیس برس قب قرار دیا جاتا تھا، اسے اب روایتی سمجھا جانے لگا ہے۔

مسلم نوجوانوں کو موجودہ عہد اور اس عہد کے بطن سے جنم لے رہے نئے تعلیمی تقاضے پورے کرنے کے لیے ا ہے۔ اس کے لیے مکمل یکسوئی اور زبردست اہلیت اور صلاحیت درکار ہے۔ اس یونیورسٹی کو مسلمانوں میں جدید وسیلہ بنے رہنا چاہیے۔ اس کے دروازے پورے ملک کے ہونہار مسلم نوجوانوں کے لیے وا ہونے چاہئیں۔ یہ مقصد، کشادہ ذہنی کے ذریعے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ اس درس گاہ کو حقیقی معنوں میں دانش گاہ بننا چاہیے۔ اسے عہ سماجی بحران میں امن وسکون اور تحصیلِ علم کا ایک جزیرہ ہونا چاہیے۔ ملک کے کونے کونے میں یہ پیغام پہنچنا چا کے اس جزیرے میں ہر اس نوخیز کا خیر مقدم ہے جس کے پر وبال اونچی اڑان کے امکان کی خبر دیتے ہوں۔

یہ ایک کارگراں ہے، اسے صرف اسی صورت میں انجام دیا جاسکتا ہے کہ اس پر مفاد پرست عناصر کی گرفت کم جائے اور اسے زمیندارانہ رجحانات کے نرغے سے رہا کرا لیا جائے۔ اسے بے صلاحیت یا کم صلاحیت افراد کی پناہ گاہ ذہین اور محنتی افراد کی طیارہ گاہ بننا چاہیے۔

وقت کی پیشانی پر بالوں کی لٹ ہوتی ہے۔ اسے سامنے سے ہی پکڑا جاسکتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس و تیاریوں کا آغاز کر رہی ہے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملے پچھتر برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس اس درس گاہ نے مسلمانوں میں روشن خیالی، ذہنی بیداری اور جدید تعلیم کے فروغ کا تقاضہ کس حد تک پورا کیے یہ درس گاہ اپنے سے وابستہ عام مسلمانوں کی توقعات کس طرح پوری کر سکتی ہے؟ اس درس گاہ کی آغوش میں پلنے وا اپنے فرائض بے لوث انداز میں کس طرح انجام دے سکتے ہیں؟ اس وقت رائے عامہ نے خیر سگالی کے جن جذبات کا اظہا تحسین کس طرح کی جا سکتی ہے اور ان کے اعتماد پر پورا اترنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

ان سوالوں پر غور وفکر اور مقدور بھر ان کے جواب کی کوشش، اس گلشنِ سرسید میں نظم ونسق، درس وتدریس اور ذاتی وگروہی مفاد سے بالاتر ہو کر عمل پیرا ہونے کی سودمند اور طمانیت بخش فصلیں اُگا سکتی ہے۔ اسی صورت میں سے دانش وبینش کی وہ روشنی نکلے گی جسے دیکھ کر ہر شخص یہ کہہ اٹھے کہ ع آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے

مدیر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی *

انسانی شرافت وعظمت

اسلام کا نوع بشری پر ایک بڑا احسان، انسان کی شرافت وعظمت اور اس کے علوئے منزلت کا اعلان ہے۔ بعثت محمدی سے پہلے انسان ذلت ونکبت کی پستی میں گر چکا تھا اور روئے زمین پر اس سے زیادہ ذلیل وحقیر چیز نہیں رہ گئی تھی، بعض مقدس حیوان اور اشجار جن سے اساطیری (LEGENDARY) روایات اور معتقدات وابستہ تھے، وہ اپنے پرستاروں کے نزدیک زیادہ مکرم و محترم تھے اور انسان کے مقابلے میں انھیں حفاظت کا زیادہ مستحق سمجھا جاتا تھا، خواہ اس کے لیے معصوم کا خون ہی کیوں نہ بہانا پڑے۔ ایسے شجر وحجر کے آگے انسان کا خون اور گوشت بھی بے تکلف اور ضمیر کی خلش کے بغیر پیش کر دیا جاتا تھا۔ ہم نے اس کی مکروہ تصویریں اس بیسویں صدی میں ہندوستان جیسے بعض ترقی یافتہ ممالک میں بھی دیکھی ہیں۔

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کو اس کی شرافت وعظمت واپس کی اور اس کا کھویا ہوا وقار واعتبار بحال کیا، اور یہ اعلان کیا کہ انسان اس کائنات کا سب سے قیمتی وجود اور گراں قدر جوہر ہے اور یہاں اس سے زیادہ باعظمت اور محبت وحفاظت کی مستحق کوئی اور شے نہیں۔ آپ نے انسان کا درجہ اتنا بلند کیا کہ وہ اللہ کا نائب وخلیفہ قرار پایا جس کے لیے اس نے دنیا پیدا کی اور اسے اپنے لیے پیدا کیا۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (البقرہ۔ ۲۹)

ترجمہ: وہ وہی (خدا) ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب۔"

قرآن نے اسے اشرف المخلوقات اور صدر کائنات بتایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ
فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (الاسراء ۷۰)

ترجمہ: اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور ہم نے انھیں خشکی اور دریا دونوں میں سوار کیا اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں عطا کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی۔

اور اس ارشاد نبوی سے زیادہ انسان کی عزت وعظمت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عَيَالِهٖ (سنن بیہقی)

---

* ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

ترجمہ: خدا کی مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اللہ کو مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے۔

انسانی رفعت اور اس کی خدمت کے ذریعے تقربِ الٰہی حاصل کرنے کے سلسلے میں یہ حدیث بہت بلیغ اور معنیٰ خیز ہے جسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ :

"اللہ تعالیٰ قیامت میں پوچھیں گے اے ابن آدم! میں بیمار پڑا مگر تو نے میری عیادت نہیں کی؟ آدمی کہے گا، یارب! آپ تو رب العالمین تھے، میں آپ کی عیادت کیسے کرتا؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا تمہیں علم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا مگر تم نے اس کی عیادت نہیں کی؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اگر تم اس کی عیادت کرتے تو مجھے اس کے پاس پاتے۔

اے ابن آدم! میں نے تم سے کھانا مانگا تو تم نے مجھے کھلایا نہیں؟ آدمی کہے گا کہ بار الہا! آپ تو دنیا کے پالن ہار تھے۔ میں آپ کو کیسے کھانا کھلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تم سے کھانا مانگا مگر تم نے اسے کھانا نہیں دیا۔ اگر تم اسے کھلاتے تو مجھے اس کے پاس پا لیتے۔ اے ابن آدم! میں نے تم سے پانی مانگا مگر تم نے مجھے پانی نہیں دیا۔ آدمی کہے گا، خدایا! آپ تو رب العالمین ہیں، میں آپ کو پانی کیسے پلاتا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے فلاں بندے نے تم سے پانی مانگا مگر تم نے اسے پانی نہیں دیا۔ اگر تم اسے پانی پلاتے تو مجھے اس کے قریب پاتے۔" (صحیح مسلم)

کیا انسانی رفعت وعظمت کے اس سے زیادہ واضح اور صریح کسی اعلان کا تصور کیا جاسکتا ہے جیسے دین توحید نے پیش کیا ہے اور دنیا کے قدیم وجدید کے کسی دین وفلسفہ کے تحت انسان نے کبھی ایسی عظمت ومنزلت حاصل کی ہے؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آدم زادوں (انسانوں) پر رحم کرنے کو اللہ کی رحمت کے نزول کی شرطِ لازم بتاتے ہوئے فرمایا:

اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ (سنن ابوداؤد)

ترجمہ: رحم کرنے والے پر رحمٰن بھی رحم کرتا ہے۔ تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر — خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

وحدتِ انسانیت اور عظمتِ انسانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس کے لیے جدوجہد سے پہلے دنیا کی سیاسی واجتماعی حالت کا کچھ اندازہ کرنا ضروری ہے۔

آپ کی بعثت سے پہلے ایک ایک فرد کی مرضی پر ہزاروں انسانوں کی زندگیاں موقوف رہتی تھیں۔ کوئی بادشاہ اٹھتا اور ملکوں اور قوموں اور کھیتوں اور آبادیوں کو پامال کرتا چلا جاتا اور راج ہٹ یا سیاسی تفوق کی خاطر خشک وتر کو تہس نہس کرکے رکھ دیتا۔

سکندرِ اعظم (ALEXANDER THE GREAT) (۳۵۶-۳۲۴ ق م) آندھی پانی کی طرح اٹھتا ہے اور ایران، شام، ساحلی ممالک، مصر اور ترکستان کا بڑا حصہ زیر وزبر کرتا ہوا شمالی ہند پہنچ جاتا ہے۔ وہ فتح وتسخیر کے اس طویل سفر

میں صدیوں کی قدیم اور ترقی یافتہ تہذیبوں اور تمدنوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔

جولیس سیزر (Julius Caesar) (م ۴۴ ق م) اور دوسرے فاتحین اور فوجی قائدین جیسے قرطاجنہ (Carthage) ہنی بال (Hannibal) (۲۴۷-۱۸۳ ق م) اور دوسرے فوجی قائد اور کشور کشا انسانی آبادیوں میں اس طرح شکار کھیلتے ہیں، اور ہزاروں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارتے چلے جاتے ہیں جیسے مشاق و بے درد شکاری بلا امتیاز جنگلی جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔

تباہ کاری اور انسانی زندگی و برگزیدگی کے ساتھ یہ کھلواڑ حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کے بعد بھی جاری رہی چنانچہ ان کے بعد کے انسانیت پر ظلم ڈھانے والوں اور سنگ دلوں میں نیرو (Nero) (م ۶۸ ء) جیسے لوگوں نے اپنے ہم وطنوں کو بھی اپنے ظلم کا نشانہ بنایا اور اپنی ماں اور بیوی کو بھی نہیں بخشا۔ یہی شخص روما کی عظیم آتش زدگی کا بھی ذمہ دار ہے جب روما آگ کے شعلوں میں جل رہا تھا تو وہ چین کی بانسری بجا رہا تھا۔ (انسائیکلو پیڈیا ولیم لینگر)

یورپ کے وحشی قبائل یعنی مغربی و مشرقی گاتھ اور ونڈال وغیرہ جو بعثت محمدی سے ایک صدی قبل پانچویں صدی مسیحی میں سرگرم تھے، وہ دنیا کی بڑی بڑی اور متمدن راجدھانیوں کو تاراج کر دیتے اور روئے زمین پر بڑے پیمانے پر خوف اور دہشت پھیلا دیتے تھے۔ (انسائیکلو پیڈیا ولیم لینگر)۔

عربوں کی نظر میں انسانی زندگی کی قدر و قیمت اتنی کم تھی کہ جنگ اور خونریزی ان کے لیے ایک کھیل بن گئی تھی اور معمولی سا واقعہ بھی جنگ کا محرک بن جاتا تھا۔ چنانچہ بنی وائل کے دو قبیلوں بکر و تغلب کے درمیان چالیس سال تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا جس میں پانی کی طرح خون بہا۔ بات صرف اتنی تھی کہ کلیب (رئیس معد) نے بسوس بنت منقذ کی اونٹنی کے تھن پر تیر مار دیا تھا، جس سے اس کا خون دودھ میں مل گیا تھا۔ اس کے باعث جساس بن مرہ نے کلیب کو قتل کر دیا اور بکر و تغلب میں جنگ چھڑ گئی۔ اس خانہ جنگی کے بارے میں کلیب کا بھائی المہلہل کہتا ہے:

"انسان فنا ہو گئے، مائیں بے اولاد ہو گئیں، بچے یتیم ہو گئے، آنسو رکنے کا نام نہیں لیتے، اور مردے بے کفن دفن پڑے ہیں۔"

اسی طرح داحس و غبرا کی جنگ کا سبب یہ ہوا کہ داحس جو قیس بن زہیر کا گھوڑا تھا، وہ قیس اور حذیفہ بن بدر کے درمیان مقابلے میں آگے نکل گیا تھا، جس پر ایک اسدی نے حذیفہ کے کہنے پر گھوڑے کو چھیڑا اور اس کے چہرے پر طمانچہ مارا اور اس وجہ سے وہ گھوڑا پچھڑ گیا۔

اس واقعہ کے بعد قتل و انتقام اور قبائلی جنگ، قید و بند اور قبیلوں کے ترک وطن کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور اس میں ہزاروں آدمی مارے گئے۔ (ایام العرب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے غزوات کی کل تعداد ستائیس ۲۷ یا اٹھائیس ۲۸ ہے اور سرایا کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے، ان میں جنگی تاریخوں کو دیکھتے ہوئے سب سے کم خون بہایا گیا۔ ان میں طرفین کے صرف ۱۰۱۸ آدمی مارے گئے اور ان غزوات کا مقصد انسانی جانوں کی حفاظت، انسانی مفادات کا دفاع تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ اخلاقی آداب اور شریفانہ تعلیمات کی اس طرح پابند تھیں کہ نوع انسان کے حق میں تعذیب کے بجائے تادیب کا حکم رکھتی تھیں (نبی رحمت)

اسلام ایمان اور اپنی اخلاقی تعلیمات کے ذریعے انسان کی عظمت و شرافت کا ایسا شعور پیدا کرتا ہے جس سے ایک

(باقی صفحہ نمبر ۱۹ پر)

سید علیم اشرف جائسی *

استشراق کے محرکات

استشراق، مشرق کے خلاف عموماً اور عالم اسلام کے خلاف خصوصاً مغربی سازشوں کے مثلث کا ایک فریب کی اس مغربی تکون کے دوسرے دو زاویے: تبشیر اور استعمار ہیں۔ لیکن اپنے طویل اور دور رس اثرات ا: اہمیت کے اعتبار سے استشراق اس مثلث کا سب سے خطرناک زاویہ ہے۔

اگر مستشرقین اور ان کے مشرقی ہم نواؤں (جنھیں بعض حضرات مستغربین کے نام سے یاد کرتے ہیں) کا ا استشراق ایک خالص علمی تحریک ہے اور دنیائے مشرق پر جس کے گراں قدر احسانات ہیں مگر مستشرقین واقعہ ہے اور تاریخی حقائق کی نفی کرتا ہے۔ رہا ان کے مشرقی ہم نواؤں کا اس سلسلے میں اصرار، تو یہ تہذیب، مغرب نگاہوں کی خیرگی کے سوا کچھ نہیں۔

ہمیں استشراق کے ظہور او راس کے نمود وارتقا میں علمی محرک کی موجودگی کا اعتراف ہے مگر اس یقین کے کی حیثیت ثانوی درجے کی ہے۔ زیر نظر مضمون استشراق کے اہم محرکات کا ایک جائزہ ہے جن کی معرفت استشرا اور اس کے مقاصد کے تعیین میں ممد و معاون ہوگی۔

استشراق کے اہم محرکات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دینی محرک:

یہ استشراق کے ظہور وارتقا کا سب سے قوی محرک ہے جس کے وجود پر دلالت کرنے والے متعدد تاریخی ش

الف۔ مفکرین و محققین کا اتفاق ہے کہ استشراق کا آغاز کلیساؤں سے ہوا۔

ب۔ استشراقی کارواں کے اولیں مسافروں کا تعلق براہ راست کلیساؤں سے تھا جیسے فرانسیسی راہب جر، جو ۹۹۹ء میں ویٹکن کا سربراہ بنا، سلفسٹر دوئم، بطرس محترم ۱۱۵۶ء، جیرارڈ کریمونی ۱۱۸۹ء، ریکول ۱۳۲۰ء اور یوحنا اسقوبی ۱۴۵۶ء وغیرہ۔

ج۔ مشرقی علوم سے متعلق مغرب کے بیشتر علمی وثقافتی ادارے پادریوں اور راہبوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہ جیسے مشرقی زبانوں کی تعلیم کا ادارہ" جسے بابا ہونوریوس چہارم نے ۱۲۸۵ء میں فرانس میں قائم کیا۔ سوربون یونیورسٹی" جسے مشہور فرانسیسی پادری رویردی سوربو نے قائم کیا اور اس کی تجدید بھی ایک

---

* ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ، طرابلس، لیبیا۔

پادری ریشیسکو کے ہاتھوں ۱۶۲۹ء میں ہوئی۔ اسپین کا "دفتر مترجمین" جسے طلیطلہ کے اسقف اعظم ریمونڈ اول نے ۱۱۳۰ء میں قایم کیا۔ روم کا "مارونی کالج" جس کا قیام پاپا گریگوریس کی کوشش سے ۱۵۸۴ء میں عمل میں آیا اور اٹلی ہی کے ایک شہر فلورنسا کا "مدرسہ برائے مشرقی زبان" جس کی بنا ۱۶۲۳ء میں کارڈینال ڈی میڈیچی نے ڈالی۔ ایسے ہی اور بہت سے ادارے، مدرسے، کتب خانے، مطابع اور جامعات جو پادریوں اور راہبوں کی کوششوں کے مرہون منت ہیں۔

د۔ قدیم استشراقی ادب بھی اس محرک کے وجود کی ایک بہترین دلیل ہے جس کا سرسری مطالعہ اس یقین کے حصول کے لیے کافی ہے۔

ھ۔ مستشرقین اور مبشرین کے درمیان گہرے روابط اور افادہ و استفادہ پر مبنی تعلقات بھی اس کے وجود کی غمازی کرتے ہیں۔

و۔ خود بعض مستشرقین نے دینی محرک کے وجود کا اعتراف کیا ہے۔

۲۔ استعماری محرک:

یہ محرک دو عصروں میں منقسم ہے۔ ۱۔ عملی استعمار سے پہلے کا عصر جسے ہم استعمار کی فکری اور عسکری تیاریوں کا عصر کہہ سکتے ہیں اور ۲۔ عملی استعمار کا عصر اور دونوں عصروں میں استشراق کے اس محرک کی موجودگی کے وافر ثبوت اور دلائل فراہم ہیں مثلاً:

ا۔ عملی استعمار سے قبل مستشرقین نے مشرقی ملکوں میں علمی سیاحتیں کیں، ان کے نتائج کو استعماری مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا بلکہ بعض کا سفر تو استعماری قوتوں کے اشارے پر ہی ہوا جس کی بہترین مثال کتاب "ہمفرے کے اعترافات" ہے، ایسے ہی ۱۷۹۸ء میں نپولین کے مصر پر حملے کا محرک فرانسیسی مستشرق کانٹ ڈی وولنی کا مصر کا سفرنامہ تھا۔

ب۔ استعماری طرز و رنگ اور خو بو والا استشراقی ادب۔

ج۔ بعض مستشرقین کا یہ اعتراف کہ انھوں نے اور اُن کے بہت سے ساتھیوں نے استعماری طاقتوں کے لیے کام کیا۔ مشہور مستشرق مارٹینی نے ایک انٹرویو میں اعتراف کیا کہ "عملی استعمار کے عصر میں بیشتر مستشرقین اس کے ساتھ مکمل طور پر وابستہ تھے" (رسالہ الموقف الادبی عدد ۱۲۲، ۱۹۸۱ء)

د۔ کئی ایک مستشرقین نے استعماری فوجوں کے اعلیٰ مناصب پر کام کیا ہے، جیسے بوالٹسن اور رچرڈ وغیرہ۔

ھ۔ مغربی نوآبادکاروں نے مشرقی اقوام کے سلسلے میں اپنی حکمتِ عملی طے کرنے کے لیے استشراقی آداب اور مطالعوں کا سہارا لیا، جیسے برطانوی استعمار کی مشہور پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" دراصل استشراق کے طائفی اور فرقہ وارانہ مطالعوں سے ماخوذ ہے۔

و۔ نوآبادکاروں نے استشراق کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی کیوں کہ انھیں اپنی نوآبادیوں کے دینی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات سمجھنے کے لیے اس کی ضرورت تھی جس کے بغیر نہ تو نوآبادیوں پر گرفت رکھی جا سکتی تھی اور نہ ہی ان کی حدود میں توسیع ممکن تھی۔ اس سلسلے میں ولیم میور، کرومر، شبرنجر، مکالگ، والٹسن اور رلارنس وغیرہ سیکڑوں مستشرقین کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں جنھوں نے مختلف شعبوں میں استعمار کے لیے کام کیا۔

نمایاں انجام دیئے۔

۳۔ نفسیاتی محرک:

اس محرک کا تعلق انسان کے فطری تقاضوں سے ہے۔ انسان کہیں کا ہو لیکن یہ جذبہ سب ہی حیثیت رکھتا ہے۔ اس محرک کے مختلف مظاہر ہیں۔

ا۔ سفر و سیاحت کی خواہش۔
ب۔ دوسری قوموں کے احوال جاننے میں رغبت۔
ج۔ مادی فوائد کے حصول کا جذبہ۔
د۔ اپنے معتقدات اور نظریات میں دوسروں کو شریک کرنے کی آرزو۔

۴۔ اقتصادی محرک:

لبنانی نژاد اور معاصر امریکی مفکر " ایڈورڈ سعید" جو بین الاقوامی شہرت کے انگریزی ادیب استشراقیات ہیں، کی رائے ہے کہ استشراق کے ابتدائی دور میں دینی محرک کی جو حیثیت تھی وہی حیثیت آ اقتصادی محرک کو حاصل ہوگئی۔ آخری دور میں یہی استشراق کا محور تھا۔ باقی دوسرے محرکات ضمنی حیثیت

ایڈورڈ سعید کی اس رائے سے ہمیں جزوی اتفاق ہے اور وہ جزو ہے استشراق کے محرکات میں کا وجود۔ رہی اس دور میں دوسرے محرکات کو ضمنی قرار دینے کی بات تو یہ محل نظر ہے۔

۵۔ سیاسی محرک:

دوسری جنگ عظیم کے بعد بعض سیاسی اور سماجی حالات کے سبب مغرب کے لیے اپنی نو آبادیات نہ رہا یا پھر ذرائع ابلاغ اور وسائل نقل وحمل کی ترقیوں نے براہ راست استعمار کو غیر ضروری بنا دیا۔ ایشیا بہت سے ملکوں کو "آزادی" مل گئی اور مغربی ملکوں سے ان کے سفارتی تعلقات بھی قائم ہوگئے۔ مغرب کے لیے متوقع تھی۔ اس نے ان ملکوں میں قائم اپنے سفارت خانوں، کونسلروں اور سیاسی اداروں کو مستشرقین کے حو نے اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھایا جو مغربی ملکوں نے ان کے سپرد کی تھی۔ چنانچہ آزادی کے نصف صدی بو موجود سیاسی عدم استقرار، خوں ریزی، دہشت گردی، فرقہ واریت اور جاسوسی و تخریب کاری کے بیشتر براہ راست یا بالواسطہ یہ مغربی سفارت خانے ملوث ہیں اور بعض ملکوں میں تو یہ سفارت خانے اس قدر با اختیار ہیں کہ یہ ہمیں نو آبادیاتی دور کی ریزیڈنسیز کی یاد دلاتے ہیں۔

۶۔ علمی محرک:

مستشرقین میں ایک مختصر سی جماعت وہ بھی ہے جس نے مشرقی علوم و آثار کے مطالعوں کو خالص علمی کیا اور انسانی علوم و معارف کی قابل ستائش خدمت کی جیسے کارلائل، اتیان دی نے، مارشیل لوذا، رو

پروفیسر نسیم انصاری*

یورپ میں کمیونزم کا زوال

۱۹۱۷ء میں روس میں دو انقلاب ہوئے ایک فروری میں اور دوسرا اکتوبر میں ۔ فروری کے انقلاب کو عام طور سے جمہوری انقلاب کہا جاتا ہے ۔ اس انقلاب کے نتیجے میں زار شاہی ختم کر کے ایک جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی گئی ۔ لیکن یہ حکومت کمزور ثابت ہوئی اور وہ انقلاب کے ایک بنیادی مسئلہ یعنی قیام امن میں ناکام رہی۔ جرمنی سے روسی فوجیں شکست کھاتی رہیں، اس کے ساتھ ساتھ ملک میں بے روزگاری، غریبی اور افراتفری نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ بالکل نراج کی کیفیت ہوگئی۔ ایسے میں وہاں ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ کوئی ہے جو ایسی حکومت بنا سکے جس سے یہ افراتفری ختم ہو۔ بالشویک پارٹی کے لیڈر لینن نے کہا کہ ہاں ایسی ایک پارٹی ہے اور یہ بالشویک پارٹی ہے ۔ لینن نے سپاہیوں، کسانوں اور مزدوروں کے نام پر بالشویک پارٹی کے ذریعے اکتوبر میں حکومت پر قبضہ کر لیا۔

نئی حکومت نے بہت جلد جرمنوں سے صلح کرلی، تمام کارخانے اور بینک اپنی تحویل میں لے لیے، سرمایہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا گیا۔ فوج، انتظامیہ اور پولیس کی از سر نو تنظیم اس طرح کی گئی کہ حکومت کے ہر شعبے پر بالشویک پارٹی کا اختیار ہوگیا، عدالتیں بھی نئے سرے سے بنائی گئیں اور بالکل نئے قوانین نافذ کیے گئے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی دفعہ ایسی حکومت بنی جو نہ صرف سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے بغیر بنی بلکہ ان کی مخالفت میں اور سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لیے بنی. لینن نے مارکس کا نعرہ پھر بلند کیا " دنیا کے مزدوروں ایک ہو!"

اس نعرے پر دنیا کے تقریباً ہر ملک میں مزدوروں کی انقلابی پارٹیاں بننے لگیں اور اسی کے ساتھ ان پارٹیوں کو کچل دینے کی کوششیں بھی شروع ہوگئیں۔

ہندوستان میں کچھ دانش وروں نے ایک کمیونسٹ پارٹی بنائی۔ ۱۹۲۰ء میں اس پارٹی کا افتتاح کانپور میں ہوا۔ مولانا حسرت موہانی استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین تھے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عرصے میں کمیونسٹ تحریک نے حیرت انگیز طور پر دانش وروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہندوستان میں جن لوگوں نے روس کے انقلاب کا خیر مقدم کیا ان میں اقبال، ٹیگور اور جواہر لال نہرو سر فہرست ہیں۔

جہاں ایک طرف دانش ور کمیونسٹ خیالات کو قبول کرتے جا رہے تھے اور یورپ، ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے بہت سے

---

* ۴/۷۶۳، وکاس نگر، لکھنؤ، (یو.پی)

ملکوں میں کمیونسٹ پارٹیاں قائم ہو رہی تھیں، وہیں دوسری طرف بہت سی حکومتیں روسی حکومت کو ختم کرنے کر رہی تھیں۔ روسی حکومت نے زارشاہی کے تمام مقبوضہ ممالک کی شمولیت سے سوویت یونین بنالی تھی۔ سو ایشیا میں چین کی کمیونسٹ پارٹی سب سے بڑی اور مضبوط پارٹی تھی۔ ادھر سوویت یونین کی مخالف حکومتوں زبردست حکومت جرمنی میں ہٹلر کی تھی۔

دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر نے روس پر حملہ کر دیا۔ لڑائی میں جرمنوں کو شکست ہوئی اور روسی فوجیں ہوئی یورپ کے ایک بڑے حصے پر قابض ہوگئیں۔ جہاں جہاں موقع ملا سوویت فوجوں نے کمیونسٹ حکومتیں حکومتوں نے رومانیہ، ہنگری، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، چیکوسلاویکیہ، پولینڈ اور مشرقی جرمنی میں وہی کچھ کیا نے روس میں کیا تھا ادھر ۱۹۴۹ء میں دنیا کے سب سے بڑے ملک چین میں بھی کمیونسٹ حکومت قائم ہوگئی لینن کے جانشین اسٹالن کی زندگی میں شنگھائی سے برلن تک کا سارا علاقہ کمیونسٹوں کے زیر اقتدار آگیا

جس طرح کی حکومتیں یورپ میں سوویت فوجوں کی مدد سے بنی تھیں وہ عوام میں بہت مقبول نہیں تھ پارٹیوں کے اندر اختلافات نمایاں ہونا شروع ہوئے۔ سوویت یونین کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز یوگو مارشل ٹیٹو نے اٹھائی اور ۱۹۴۸ء میں اپنے ملک کا ناطہ سوویت یونین سے بالکل توڑ لیا۔ اس کے بعد تو یکے بعد مشرقی جرمنی، چیکوسلاویکیہ اور پولینڈ میں بغاوتیں ہوئیں لیکن سب بغاوتیں سوویت فوجوں نے کچل ڈالیں۔ بغاوت کے جو آخر میں کامیاب رہی۔

ادھر سوویت یونین میں بھی حکومت کے خلاف بے چینی شروع ہوئی اور بالآخر ۹۱-۱۹۹۰ء میں سوویت ہوگئی اور اس پر مشتمل ریاستوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

اب ساری دنیا کے دانشور سوچ رہے ہیں کہ آخر یہ محفل کیوں برہم ہوگئی؟ ایک خیال یہ ہوتا ہے کہ انقلاب میں جو ریاست بنی اس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ یہ مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ ہے جسے کسانوں نے قبول کر لیا ہے کا مطلب یہ لیا گیا کہ ریاست مزدوروں کے مفاد میں ہر قدم اٹھا سکتی ہے اور کسی اخلاقی، مذہبی، سیاسی یا سماجی تنظیم کے مفاد کے خلاف آواز اٹھانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، مزدوروں کا مفاد کیا ہے، اس کا فیصلہ کمیونسٹ شپ کرے گی۔

اس نظریے کے مطابق جو ریاست وجود میں آئی وہ کچھ اس طرح کی تھی جیسی کہ وہ ریاست جس کا خاکہ پہلے افلاطون نے اپنے رسالہ 'ریپبلک' میں تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل پیش کیا تھا۔ اس رسالہ میں ایسی ریاست تھا جس میں حکمراں طبقے کو مکمل اختیارات تھے اور انھیں کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ یہی صورت کمیونسٹ ریاست میں کمیونسٹ لیڈر شپ کی تھی ریاست کو تعلیم پر پورا اختیار تھا اور وہ یہ بھی طے کرتی تھی کہ کون سی کتابیں پڑھی جائیں سی نہیں۔ اسی اصول پر تمام کمیونسٹ حکومتوں میں عمل ہوتا تھا۔ وہاں کوئی کتاب، کوئی فلم، کوئی ڈرامہ حکومت کی اجازت بغیر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ خبروں پر مکمل سنسر تھا۔

دنیا کی تاریخ میں انسانوں کی اتنی بڑی تعداد پر اتنا جبر بھی شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ ایسی جابر حکومت انسانی مزاج کے خلاف تھی، چنانچہ لوگوں نے اسے ختم کر دیا۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

دوسری بات جو یورپ میں کمیونزم کے زوال کا باعث ہوئی وہ یہ کہ کمیونسٹ حکومت انسانی مزاج میں وہ تبدیلی نہیں لا سکی جس کی پیش گوئی مارکس نے کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ کمیونسٹ سماج میں محنت ایک زبردستی کے بجائے تفریح طبع اور لطف کا سامان ہو جائے گی اور لوگوں کو محنت پر مجبور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی، تہذیب کی ابتدا، سے اب تک لوگوں کو محنت پر مجبور کرنے کے لیے قبائلی سردار، جاگیر دار اور سرمایہ دار مختلف طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے رہے ہیں۔ کمیونسٹ سماج میں نہ تو یہ جبر کرنے والے رہیں گے اور نہ جبر کرنے کی ضرورت، پہلی دفعہ انسان بالکل آزاد ہوگا۔ عوام خود ڈسپلن قائم کریں گے۔ یہی نہیں بلکہ ہر قسم کا اجتماعی تشدد بھی ختم ہو جائے گا کیوں کہ اجتماعی تشدد یا جنگ کے پس پردہ ہمیشہ طبقاتی اغراض ہوتے ہیں تو جب طبقات ہی ختم ہو جائیں گے تو جنگ بھی بند ہو جائے گی۔ اس طرح کمیونسٹ سماج میں رہنے والے لوگ جانوروں سے بالکل علیحدہ ہو جائیں گے۔ افسوس کہ یہ سب کچھ نہیں ہوا اور انسانی کمزوریاں ویسی ہی رہیں جیسی کہ انقلاب سے پہلے تھیں۔ سوشلسٹ سماج بنانے کے لیے جس بے نفسی اور اخلاقی بلندی کی ضرورت تھی، وہ کمیونسٹ ریاستوں میں بالکل نظر نہیں آتی تھی۔

اسٹالن سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اخلاق کی کوئی اہمیت ہے۔ انھوں نے جواب اثبات میں دیا اور کہا کہ ہمارے اخلاق کی بنیاد مزدوروں کا مفاد ہے۔ ہر وہ چیز جس سے مزدوروں کی بھلائی ہوتی ہو وہ درست ہے اور ہر وہ چیز جو ان کے مفاد کے خلاف ہو بری ہے لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ مزدوروں کے مفاد کا فیصلہ صرف کمیونسٹ لیڈر شپ کرتی ہے۔ اس لیے ہر وہ چیز جو لیڈر شپ کے نزدیک بری ہے، بری ہوگی۔ اور ہر وہ چیز جو اس کی نظر میں اچھی ہے اچھی رہے گی۔ اس فلسفے پر عمل بھی ہوا اور کسی کو اس کے خلاف آواز اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کہاں کا سوشلسٹ نظام اور کیسا کمیونسٹ سماج! جو کچھ وجود میں آیا اس کا بیان کرسچاف نے سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس میں کر دیا اور جو کچھ باقی تھا وہ ماسکو، برلن، بوداپسٹ اور بخارسٹ کی سڑکوں پر کمیونزم کے زوال کے بعد سامنے آیا۔

مطلب یہ ہے کہ مارکسسٹ فلسفے کے مطابق جس طرح کے انسان سوشلسٹ اور کمیونسٹ سماج کو چلانے کے لیے درکار تھے وہ نہ پیدا ہو سکے۔ اس لیے انقلاب کے بعد جو سماج بنا تھا وہ دیرپا نہ ثابت ہوا۔

تیسری وجہ یورپ میں کمیونزم کے زوال کی یہ تھی کہ کمیونسٹ پارٹیوں نے روحانی تصورات اور مذہبی عقائد کو بے ضرورت ہی نہیں بلکہ عوام کے لیے مضر جان کر اُن کو زبردستی مٹانے کی کوشش کی۔ قانون ایسے بنائے گئے جن میں ہر قسم کے مذہبی خیالات کی اشاعت پر پابندی تھی لیکن مذہب کے خلاف باتیں کہنے کی مکمل آزادی تھی۔ مذہب کو ایک تنزل پرست تحریک کا نام دے کر اسے سماج سے بالکل علیحدہ کرنے کے بتدریج انتظامات کیے گئے۔

زہر کے اس گھونٹ کو عوام کے حلق سے اتارنے کے لیے ریاست کے جبر کا بلا کسی روک ٹوک کے استعمال کیا گیا۔ اس پر کسی نے دھیان بھی نہیں دیا کہ ابتدائے آفرینش سے انسانی ذہن کی سرگرمیوں کے تین میدان رہے ہیں۔ سائنس، فلسفہ اور مذہب ان تینوں میں سے ایک کو بھی اگر اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو زندگی نامکمل رہ جاتی ہے۔ انفرادی زندگی میں تو فلسفہ کا دامن اتنا پھیلایا جا سکتا ہے کہ مذہب اس میں چھپ جائے لیکن اجتماعی زندگی میں یہ ناممکن ہے اور کسی سماج میں سائنس، فلسفہ اور مذہب میں سے کسی عنصر کو اگر زبردستی نکالا گیا تو وہ ہرگز مستحکم نہیں رہ سکتا۔ یہی حال سوویت یونین اور یورپ کی کمیونسٹ حکومتوں کا ہوا اور جس عمارت کو اتنا مستحکم سمجھتے تھے وہ تاش کے پتوں کی طرح منہدم ہو گئی۔ حکومت

کے ختم ہوتے ہی گرجوں میں گھنٹے بجے اور مسجدوں میں اذانیں دی گئیں۔

چوتھی وجہ زوال کی یہ تھی کہ حقیقی پیداوار بڑھانے کے بجائے سماجی دولت کا ایک بہت بڑا حصہ فوجی قوت
ہوا۔ اس میں ایٹمی ہتھیار بھی آتے ہیں جن کے پیدا کرنے اور ترقی دینے میں اتنا سرمایہ لگا کہ غیر فوجی صنعت
دیوالیہ ہو گئی۔ ایک طرف تو فضا میں جانے والے جہاز تیار کیے جا رہے تھے تو دوسری طرف ضرورت کا سامان
لیے لمبی لمبی قطاریں لگتی تھیں۔ لوگ یہ حالت دوسری جنگ عظیم کے چالیس بیالیس برسوں کے بعد برداشت کر
نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے حکومت سے اپنی حمایت واپس لے لی اور جب کمیونسٹ اقتدار ختم ہوا تو اُس
والا کوئی نہیں تھا۔

پانچویں وجہ خود مارکسی فلسفہ کی کمزوری تھی۔ مارکس نے اپنے فلسفے کی بنیاد انیسویں صدی کی سائنس
رکھی تھی۔ مارکس کے زمانے میں وہ سائنسی فلسفہ اپنے عروج پر تھا، جسے گویا کہ نیوٹن نے اٹھارویں
کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اہم باتوں میں مارکس نے اپنے زمانے کی مادیت سے
کیا ہے، لیکن مارکس کے معاشی نظریات میں جبر کا جو پہلو ہے وہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے اس زمانے کی
مارکس سوشلزم کی حمایت اس لیے نہیں کرتے تھے کہ وہ سرمایہ داری نظام سے بہتر ہے بلکہ اس لیے کہ
ہے اور سرمایہ داری کے خاتمہ پر اس کا آنا ویسا ہی یقینی ہے جیسا کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن کے ملنے سے پا
میں آنا، اسی طرح وہ یہ بھی کہتے تھے کہ پیداوار کے ذرائع مثلاً کارخانے اور زمین سرمایہ داری نظام میں
ہوئے ہیں اور انھیں نشو و نما کی آزادی جبھی ملے گی جب کارخانوں کے مالک خود مزدور ہو جائیں گے اور
کرنے والوں کا اختیار ہو جائے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ سوشلزم میں اتنی صنعتی ترقی ہوگی جو سرمایہ داری نظام

لیکن ہر قسم کی ترقی میں جو ذاتی نفع کا پہلو ہوتا ہے، اسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا چنانچہ جو صنعتی ترقی یورپ
کے سرمایہ دار ملکوں میں ہوئی۔ وہ کمیونسٹ ملکوں کو بہت پیچھے چھوڑ گئی۔ ۱۹۸۰ء کے بعد یوروپ کے کمیونس
میں ایسا اقتصادی بحران آیا کہ ان ملکوں کی صنعت نے گھٹنے ٹیک دیئے، کمیونسٹ لیڈرشپ نے مارکسی نظر
پہلو کی کمزوریوں سے چشم پوشی کی اور وہ سوشلزم میں صنعتی ترقی کو لازم سمجھتے رہے۔ نتیجے میں سوشلزم ہی ختم ہو

ایک زمانہ تھا کہ دُنیا کے دانش ور کمیونسٹ تحریک میں جوق در جوق شامل ہو رہے تھے لیکن دوسری جنگ عظ
کے بعد بوڈاپسٹ، پراگ اور برلن کی سڑکوں پر جس بیدردی سے سوویت فوجوں نے مزدوروں اور طالب علموں
اور جلوسوں کو منتشر کر دیا اس نے دانش وروں کو چونکا دیا۔ آہستہ آہستہ ان کی صفوں میں بہت کم لوگ رہ گئے! و
رہ گئے، ان میں سے اکثر اپنے حالات سے مجبور تھے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا اس کا تعلق کمیونسٹ نظام کی بعض اندرونی کمزوریوں سے تھا۔ یوروپ میں کمیونز
زوال کی بہت اہم خارجی وجوہات بھی ہیں لیکن ان کا ذکر اس مضمون میں نہیں کیا گیا۔ اسی طرح ایشیائی کمیونزم پر
بحث نہیں کی گئی ہے۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

ڈاکٹر عابد رضا بیدار *

قاضی رضا حسین

قاضی رضا حسین جنھیں بجا طور پر بہار کا سر سیّد کہا جاتا ہے اور جنھوں نے بہار میں جدید تعلیم کے پھیلاؤ اور رفاہِ عامہ کے لیے بہت کام کیا۔ خدا بخش لائبریری نے ان کی حیات اور کارناموں پر ایک کتاب شائع کر دی ہے۔ ذیل میں اس کتاب سے مستفاد مرحوم رضا حسین کے بارے میں اور سر سید سے ان کے تعلق کے بارے میں اہم حصے دیئے جا رہے ہیں۔

حیات اور کارنامے:

سر سیّد کی وفات ۱۸۹۸ء میں ہوئی، بہار کے سر سید، قاضی رضا حسین کا انتقال ۵۵/۵۶ سال کی عمر میں ۱۸۹۱ء میں ہوا۔ کام کی مہلت کم ملی مگر اتنی عمر میں بھی انھوں نے قوم کے لیے بڑے یادگار کام انجام دے لیے۔ طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دیئے۔ وفات سے پہلے اپنی جائداد کو تعلیم عامہ کے لیے وقف کر دیا، علی گڑھ کے لیے بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کے واسطے، اسٹریچی ہال کی تعمیر کے لیے اور چاہِ اخوان الصفا کے لیے دل کھول کے مدد کی، نئی تعلیم کے ساتھ ساتھ مدارسِ اسلامیہ کی تعلیم و ترقی میں بھی کوشاں رہتے تھے اور امداد کرتے تھے۔ بہار کے آرٹس اسکول اور بہار کے انجینرنگ اسکول کی بنا اور ترقی میں مدد کی۔ بہار کا اپنی نوعیت کا پہلا اخبار "انڈین کرانیکل" انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں چھپتا تھا۔ اس کی اشاعت میں قاضی رضا حسین کا خاص ہاتھ تھا۔ محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ جس کی بنیاد سر سیّد کے ایک پُر جوش مخلص عقیدت مند شمس العلما محمد حسن اور میر احمد حسین رئیس صدر گلی، پٹنہ نے ڈالی، قاضی رضا حسین نے اس کے لیے ماہانہ چندہ مقرر کیا، وظائف دیئے اور وصیت نامے میں اپنی جوڑی اور گاڑی اسکول کے نام لکھ دی۔ مدارس اسلامیہ بہار شریف کی مدد کی۔ استھاواں اسکول کے لیے ماہانہ چندہ مقرر کیا، حکیم احمد حسین صوفی کے مدرسۃ البنات پٹنہ کی دل کھول کر مدد کی۔ گیا ریلوے لائن کے مسورھی اسٹیشن سے قاضی صاحب کے آبائی مسکن سائیں تک کوئی پختہ سڑک نہ تھی، اس کے لیے اپنی ذاتی زمین دے کر سڑک بنوائی۔ ایک ہفتہ وار جلسۂ قرآن خوانی کی بنا ڈالی جو برسوں چلتا رہا۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

کم عمر پائی لیکن اتنے عرصے میں ہی قوم کے لیے جو کچھ کر گئے اس کے لیے مدتوں یاد رہیں گے۔

---

* ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ (بہار)

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

سرسید اور قاضی رضا حسین

قاضی رضا حسین کے معاصر سوانح نگار عبدالغنی صاحب (م ۱۹۱۸ء) نے سر سید کے تعلق سے ان کے با
باتیں لکھی ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

سرسید سے تعلقات اور ان کے متعلق رائے

اس زمانے میں سر سید کی تعلیمی و اصلاحی تحریک کا ہر طرف چرچا تھا اور ان کے متعلق مخالفانہ وموافقا
پر ظاہر کیے جاتے تھے۔ قاضی صاحب کے بھی سر سید سے تعلقات تھے، لیکن یہ سمجھنے کے لیے کہ سر سید احمد خاں صاحب
صاحب پر کتنا اور کیسا اثر تھا اور دونوں کے باہمی تعلقات کی کیا نوعیت تھی، پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ سر
کیسا سمجھتے تھے۔ سر سید کے متعلق ان کے جو خیالات مجھے مختلف اوقات میں معلوم ہوئے ان کو مسلسل بیان کے
جو حسب ذیل ہیں:

سر سید کوئی داعی مذہب، مذہبی واعظ و مقتدائے حلقۂ ارادت و بیعت رکھنے والے یا کسی مذہبی منصب
مجددیت، قطبیت، مہدویت یا مسیحیت کے مدعی نہ تھے، اس لیے گو اُن کے عقائد کیسے ہی کیوں نہ ہوں اُن کی ذ
تھے۔ اُن کے متعلق یہ بدگمانی بھی نہیں کی جا سکتی کہ جب کوئی شخص اُن سے ملنے جاتا وہ فوراً اس کو اپنے عقائد کی تلقی

واقعہ یہ ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء نے مسلمانوں کو تہ و بالا کر دیا تھا، سر سید نے بڑے بڑے نامی خاندانوں کو
ہوتے اور جو باقی رہ گئے تھے اُن کو ذلت و پستی کی حالت میں دیکھا۔

انھوں نے روہیل کھنڈ بلکہ تمام صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ اور خصوصاً دہلی کے اعیان و اشراف کو دفعتاً ام
کے مرتبہ سے قعر مذلت و مسکنت میں گرتے دیکھا، پہلو میں اثر پذیر اور دردمند دل تھا۔ ان واقعات نے ا
کر دیا، اس لیے اُن کے غم زدہ دل سے صبح و شام، رات دن، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، غرض ہر وقت ہائے
قوم کی فریاد نکلتی تھی اور قوم کی صلاح و فلاح کے لیے والہانہ طور پر مصروف رہنا ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ اس حا
شخص بھی اُن کے پاس آجاتا تھا، وہ اگر دردمند دل رکھتا ہو تو اُن کے خیالات اور قومی درد سے متاثر ہوتا تھ

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

انقلاب ۱۸۵۷ء کے اندوہناک واقعات کا اثر بہت لوگوں پر ہوا، لیکن کچھ لوگ تو اسے
اپنے ساتھ قبر میں لے گئے اور کچھ اللہ والوں نے "مرضیِ مولا از ہمہ اولیٰ" کہہ کر تسلیم و رضا پر عمل کیا۔ چند خاندان ا
جنھوں نے افسردہ خاطر و مایوس ہو کر حرمین شریفین کی طرف ہجرت کی، جو رہ گئے وہ آخر تک نوحہ و ماتم کرتے ر
زندگی آہ و بکا میں وقف کر دی، یا ناچار طوعاً یا کرہاً دنیا کے کاروبار میں مشغول ہو گئے، لیکن سر سید جیسا ذکی ا
دردمند دل رکھنے والا شخص کیوں کر خاموش بیٹھ سکتا تھا، احساس کے علاوہ قدرت نے عقل و دانش سے بھی ح
عطا کیا تھا، یہ حالات دیکھ کر سر سید نے خیال کیا کہ گریہ و زاری اور نالہ و فریاد سے کچھ حاصل نہیں ہے

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال　　صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

بہت سے لوگ قوم کی زبوں حالت پر آہ و بکا کر کے چل بسے مگر قوم کو کچھ فائدہ نہ پہنچا، نہ اس برباد شدہ قافلۂ
شیرازہ مجتمع ہوا، وہ دیکھ رہے تھے کہ ابھی تو انقلاب کا روز اول ہے، آئندہ آنے والا زمانہ اس سے زیادہ ہو

اس وقت قوم کو رونے والوں اور سلف کی شان دار داستانوں یا مسلمانوں کی تباہی کی پُر درد کہانیوں کے سنانے والوں کی ضرورت نہیں، لہٰذا ضرورت ہے کہ اسی قوم میں رہ کر اور عقل و دانش اور ہمت مردانہ سے کام لے کر کچھ کیا جائے کیونکہ خیر الناس من ینفع الناس۔

سرسید نے مدت تک ان حالات پر غور کیا اور بدنصیب قوم کے مرض کی تشخیص اور اس کے اسباب و علامات کے تجسس و تفحص میں مصروف رہے، اس کے بعد طریقۂ علاج پر غور کیا، پھر علاج یعنی عمل کا مرتبہ آیا۔

سرسیّد کے نہ تھکنے والے دماغ نہ مایوس ہونے والی طبیعت کو سکون و خاموشی سے کیا واسطہ تھا، انھوں نے عزم راسخ اور ہمّت مردانہ سے کام شروع کیا اور اس طرح کہ ہمہ تن اُسی میں مصروف ہوگئے۔ اُنھوں نے اپنی زبردست شخصیت سے دوسروں کو بھی متاثر کیا، اُن کے پاس جو آیا اُسی رنگ میں رنگ گیا اور قومی کام میں دل و جان سے ان کا شریک ہوگیا۔ سرسیّد اپنے عقائد کی تو کسی کو تعلیم نہیں دیتے تھے لیکن اپنی تعلیمی تحریک میں ہر شخص کو شریک کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ وہ شخص مقلّد ہے یا غیر مقلّد، سنّی ہے یا شیعہ، خارجی ہے یا ناصبی۔ بس یہ کافی تھا کہ وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہے، مسلمانوں سے ہمدردی رکھتا ہے اور ان کا غم خوار و غم گسار ہے۔

سرسیّد نے مسلمانوں کے مرض کا اصلی علاج مغربی تعلیم کا ما، الجبّن تجویز کیا، مگر اس شرط پر کہ یہ خود مسلمانوں کی نگرانی و اہتمام سے نہ کہ دین و ایمان کے رہزنوں (مشنریوں) یا مذہب سے کام نہ رکھنے والوں کے انتظام سے دیا جائے۔

مگر چوں کہ قوم اصلی مرض جہل و نادانی کے علاوہ سخت یرقانی تپ میں مبتلا تھی اور چیزوں کو ان کے اصلی مزہ اور رنگ میں چکھنے اور دیکھنے سے قاصر، اس لیے ضرور تھا کہ اصلی علاج کے موثر بنانے کے لیے اُن کی دوا، غذا اور پرہیز کی تدبیریں کی جاتیں۔ غرض ایک طرف تو یہ خیال تھا اور دوسری طرف اس ناگزیر علاج ما ء الجبّن کی حالت میں الحاد و دہریت کی مضر صحت ہوا لگ جانے کا قوی اندیشہ تھا، اس لیے اوّل الذکر کے دفعیہ اور آخر الذکر کے حفظ ما تقدم کی نیت اور مسلمانوں کے ملکی و سیاسی اغراض کے لیے انھوں نے "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے سے مذہبی مسائل میں پڑنا ضروری سمجھا۔

اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بہت سے ایسے مسائل جن کو درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہ تھا اور محض لوگوں کے اوہام باطلہ سے تعلق رکھتے تھے اور قومی ترقی کے مانع تھے، نیز وہ مسائل جو دشمنانِ اسلام نے فرمان روایانِ وقت کو بدظن کر کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے اسلام کی طرف منسوب کر دیئے تھے اور کچھ ایسے مسائل جو اسلام کو بدنام کرنے کے لیے یورپ کے ملحدین و معترضین نے اسلام کے سر تھوپ دیئے تھے، سرسیّد نے بڑی قابلیت و کامیابی سے ان مسائل کو حل کیا اور اُن کے جوابات دیئے۔

قاضی سیّد رضا حسین کہا کرتے تھے کہ میں سرسیّد کو گریٹ (نامور) بلند خیال اور مسلمانوں کا خیرخواہ اور پشت پناہ سمجھتا ہوں، وہ مسلمانوں کے بہی خواہ اور اسلام کے جاں نثار ہیں، وہ جو کچھ کرتے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں وہ واقعی مسلمانوں کے لیے مفید ہے، لہٰذا مسلمانوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ دنیوی امور میں سرسیّد کو اپنا مخلص و ہم خیال سمجھیں۔

قاضی صاحب کی رائے تھی کہ سرسیّد اعلیٰ درجہ کے شریف النفس، پاک طینت، نیک نیت اور صاحب اوصاف حمیدہ شخص ہیں اور میں کسی طمع اور غرض کی وجہ سے نہیں بلکہ محض خلوص اور اسلامی بہی خواہی کی وجہ سے دوست رکھتا اور اُن کی عزت کرتا ہوں۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

وہ فرماتے تھے کہ میں بہت سے مسائل خصوصاً اعتقادیات میں سرسید کا ہم خیال نہیں ہوں۔
ملائکہ کو اُسی طرح مانتا ہوں جس طرح صراحتاً قرآن مجید سے سمجھا جاتا ہے، مگر سرسید کو کافر نہیں سمجھتا۔
اُن سے غلطیاں ضرور ہوئیں لیکن نیک نیتی اور اسلام کے تحفظ کے خیال سے ہوئیں۔

اس میں شک نہیں کہ اگر سرسید مذہبی مسائل و اعتقادیات میں مداخلت نہ کرتے اور قرآن م
میں نہ پڑتے تو اُن کی اس قدر مخالفت نہ ہوتی، بلکہ اُن کو مسلمانوں کی طرف سے زیادہ مدد ملتی، اس
بھی ہوا۔ چنانچہ ایک خاص مدت تک انھوں نے تہذیب الاخلاق کو بند رکھا اور جب دوبارہ لوگوں کے
مضامین کا رنگ بدلا ہوا تھا۔

قاضی صاحب اگرچہ مذہبی مسائل میں سرسید کے ہم آہنگ نہیں تھے اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا وہ محض
کی وجہ سے اُن کو مانتے اور دوستانہ تعلقات رکھتے تھے لیکن عام لوگوں کو ان تفصیلات کا علم نہ تھ
جب اس کا بہت چرچا ہوا کہ قاضی صاحب نیچری اور بالکل سید احمد خاں کے پیرو بن گئے تو مولوی ا
مرحوم نے جو قاضی صاحب کے پیرزادے اور بہت ہی پاک طینت، نیک مزاج اور قاضی صاحب کے
میر احمد حسین صاحب رئیس پٹنہ جو قاضی صاحب کے پیر بھائی تھے، ۸۰۔۱۹۷۹ء میں ایک کمیٹی بنائی، جس
قاضی صاحب کے عقائد وخیالات کی اصلاح کی جائے، اس انجمن یا کمیٹی کے سرگرم کارکن اور نفس ناطق
صاحب تھے اور ان تینوں بزرگوں کے علاوہ اور ذی علم اور صاحب اقتدار لوگ بھی اس میں شریک
قاضی صاحب سے گفتگو کی تو انھوں نے کہا کہ میں اصل عقائد میں ہرگز سید صاحب کا ہم خیال نہیں م
کو مانتا ہوں جو سرسید نے قرآن مجید کی آیات کے متعلق کی ہیں۔ ہاں بہت سی وہ باتیں جو عقائد میں د
محض توہمات ہیں اور محض زمانۂ دراز کی عادت کی وجہ سے لوگوں نے اُن کو اسلام کے لوازم میں
احمد خاں نے ان کا ابطال کیا ہے تو اُن باتوں کو میں بیشک نہیں مانتا جیسے جادو یا کسی مخصوص لباس
وہ رسم ورواج جس کو لوگ اسلام میں داخل سمجھتے ہیں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں جن کو اسلام سے
نے کہا کہ میں تہذیب الاخلاق کے وہ پرچے پیش کرتا ہوں جن میں اس قسم کے مضامین ہیں، آپ لوگ ا
دیں، میں نہایت خوشی سے قبول کروں گا مگر تحقیقات و مباحثے کی نوبت نہ آئی اور یہ کمیٹی چھ سات مہی
کسی مفید نتیجے کے ختم ہو گئی۔

غرض قاضی صاحب سرسید کو مسلمانوں کا بہی خواہ اور لیڈر مانتے تھے اور بہت سے عمدہ اوصاف
کرتے تھے، لیکن سرسید کے مذہبی مسائل کے متعلق اُن کا یہ رویہ تھا کہ بعض مسائل کو حق سمجھتے تھے اور بعض
لیکن اُن کی مخالفت وموافقت ایمان داری پر مبنی تھی، جائز طریقے پر اختلاف کرنے کو وہ بُرا نہیں سمجھ
حسد وکینہ پر مبنی ہو اس سے نفرت کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ سید احمد خاں بہادر کے مخالف دو قسم کے لوگ ہیں، ایک
کے پیرو جو قرآن مجید کی بیجا تاویلات اور دین کے بعض مسلّمہ مسائل کی تردید کی وجہ سے سرسید کے مخالف ہیں،
لکھتا ہے وہ باعتبار اکثر نیک نیتی اور دین کی حمایت وتائید کے خیال سے ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو خود علم
محرمات ومنہیات کا مرتکب، سراپا دنیا میں منہمک، سر سے پاؤں تک انگریزی میں ڈوبا ہوا، انگریزوں ک

ایمان سمجھنے والا اور قوم کا نام بیچ کر ذاتی اغراض حاصل کرنے والا، بلکہ انگریزوں اور ہندوؤں کی خوشامد سے قوم کو دیدہ و دانستہ ضرر پہنچانے والا، اس قسم کے لوگوں کی مخالفت کو وہ سراسر حسد و بد نفسی پر مبنی سمجھتے تھے۔

قاضی رضا حسین صاحب کہا کرتے تھے کہ میں بہت سے مسائل و معتقدات میں سیّد صاحب کا پورا مخالف ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جس ایمان داری کے ساتھ میں اُن کا مخالف ہوں، اسی ایمان داری کے ساتھ وہ علماء ماسبق کی رائے کے مخالف تھے۔ اختلاف رائے اور چیز ہے اور بغض و عداوت اور چیز، اس کی تمثیل میں یہ نقل بھی بیان کرتے تھے کہ ایک مجذوب بنی بڑ میں اللہ میاں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ بعض اور بچوں نے بھی اس کے سامنے خدا کو گالیاں سنائیں۔ مجذوب نے آگ بگولہ ہو کر پتھروں سے اُن کی خبر لی اور کہنے لگا 'بدمعاش! ہم تو یہ باتیں پیار سے کہتے ہیں تم کس منہ سے کہتے ہو' اور ہماری ریس کرتے ہو۔

جب میں پہلی دفعہ قاضی صاحب سے ملا اُس زمانے میں سر سیّد احمد خاں بہادر کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا تھا، اس کی وجہ ظاہر تھی کہ اس وقت تک میں علماء اور عربی خواں طلباء کی ہی صحبت میں رہا کرتا تھا اور برابر اخبار نورالآفاق اور نورالانوار کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ جب قاضی صاحب سے ربط بڑھا میں اپنے اسی خیال پر راسخ تھا، جب تہذیب الاخلاق میں کوئی چیز چھپتی تو قاضی صاحب مجھ کو اور اپنے مرشد زادے مولانا امین اللہ صاحب کو سناتے اور جب اس کا جواب نورالآفاق یا نورالانوار میں چھپتا تو میں ان کو سناتا۔ اس کے بعد تہذیب الاخلاق کے مضامین پر اپنی سمجھ کے موافق میں بھی برجستہ اعتراض کیا کرتا۔ قاضی صاحب یہ اعتراضات ٹھنڈے دل سے سنتے اور اس پر گفتگو کرتے۔ کبھی یہ اعتراضات ان کی بزرگانہ عنایات میں سدّراہ نہ ہوتے۔ یہاں تک کہ قاضی صاحب نے مجھے انگریزی پڑھنے علی گڑھ بھیجا۔ ڈیڑھ برس بعد جب میں واپس آیا اور قاضی صاحب کے پاس ٹھہرا تو ایک دن شب کے وقت تخلیہ میں پوچھا کہ "کیا اب تک آپ سر سیّد کو کافر سمجھتے ہیں؟"

اس موقع پر ناظرین کی واقفیت کے لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے چھ مہینے کے بعد مجھے کثرت سے اس کے دلائل ملے کہ سیّد صاحب کی طرف کفر کا انتساب غلطی ہی نہیں بلکہ صریح ظلم ہے۔ واللہ لا یحب الظالمین۔

(باقی صفحہ نمبر ۷ کا)

مسلمان اس معاملے میں بہت زود حس ہو جاتا ہے۔ وہ انسان کو کسی حال میں جانوروں کے درجے میں نہیں اُتارتا اور نہ وہ ان سے حیوانوں جیسا سلوک پسند کرتا ہے، نہ ہی انھیں اپنے ذاتی تفوق کے لیے غلام بناتا ہے۔ وہ اپنے اور دوسرے انسانوں کے درمیان کوئی ایسا فرق نہیں سمجھتا کہ اُن سے توہین آمیز سلوک کرے۔

محمد اسحاق*

تعلیم - ایک تحریک

(اکیسویں صدی کا اہم ترین چیلنج)

جدید تعلیم کی تحریک کا نقطِ آغاز مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں سرسید کی ذات سے شروع ہوتا ہے۔ غدر کے نے انھیں شدید احساس کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک حکیم و دانا کی طرح سرسید نے قوم کے مرض کی صحیح تشخیص کی او پر پہنچے کہ مسلم قوم کے سارے امراض کا ایک ہی بنیادی سبب تعلیم سے محرومی ہے۔ ۱۸۷۵ء میں ایک کمیٹی "خوا تعلیم مسلمانان" قائم کی گئی جس میں سرسید کے خاص احباب شریک تھے۔ جیسے اس کمیٹی کا نام دلچسپ ہے ویسے ہی بھی دلچسپ ہے۔ خود سرسید لکھتے ہیں:

"میں اس کمیٹی کا سیکریٹری تھا۔ خاص احباب جو ممبر تھے وہ بھی یہی کہتے تھے کہ مسلمان اور ان کی ترقی تعلیم کا خیال ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ ۔ ۔ ۔ چندہ جمع کرنے کا ذکر ہوا تو ایک روز دار قہقہہ پڑا اس خیال کو جنون اور دیوانہ پن تصور کرتے تھے۔ مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب اپنے ایک دوست کے بازو پر امام ضامن کی نیاز کا روپیہ بندھا دیکھا تو میں نے سوال کیا کہ مسلمانوں کی قوم سے زیادہ کوئی اور اس روپے کا مستحق ہے۔ وہ سبز کپڑا جس میں نذر بندھی ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھ کو دیا جب اس کو کھولا تو روپیہ اور دو منصوری پیسے تھے۔ یہ پہلا سرمایہ تھا جو ہماری کمیٹی کے خزانے میں ڈالا گیا۔"

اس طرح جدید تعلیم کی تحریک شروع ہوئی۔ سرسید کے سامنے تین مقاصد تھے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم سے مسلمانوں میں کا انتظام کرنا، ان میں سائنٹفک غور و فکر کا مزاج پیدا کرنا اور اصلاح معاشرہ کے ذریعے فرسودہ رسم و رواج کو ترک کرنا اپنے خاص دوست مولانا الطاف حسین حالی سے کہہ کر "مسدس" لکھوائی۔ مسدس حالی ایک بجلی کا کڑکا تھا جو اس ہوئے پانی میں تلاطم کا باعث ہوا۔ پہلی مرتبہ مسلم قوم میں وہ امراض جو ناسور کی طرح پھیل گئے تھے ان کا احساس ہوا۔ حالی سادی پیغمبرانہ زبان میں وہ باتیں کہہ دیں جو کسی خطیب یا واعظ سے کہنا ممکن نہیں تھا اور کہا ہے

اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے   کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے

انگریزی ذریعۂ تعلیم سے اعلیٰ تعلیم کا حصول صرف اونچے طبقے کے لوگوں کے طلبا تک محدود رہا۔ مسلم یونیورسٹی سے فو

---

* ریٹائرڈ پرنسپل، جاوید منزل، مکان نمبر ۶/۶۱۴-۴-۱۱، بازار گارڈ، حیدر آباد (آندھرا پردیش)

عام مسلمانوں میں تعلیم کو عام کرنے کے سلسلے میں کوئی قابل فخر کارنامہ انجام نہیں دیا سوائے ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے چند ساتھی ماہرین تعلیم کے جنھوں نے سیاست کی پرشور وادی میں قدم رکھنے کے بجائے قوم کی تعلیم کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ ان کی دور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مسلم قوم تعلیم اور اسلامی تعلیمات کی بنیاد جب تک مضبوط نہ ہو، کسی طرح ترقی نہیں کر سکتی۔

۱۹۲۰ء میں خلافت کی تحریک طوفان کی طرح اٹھی۔ گاندھی جی اور علی برادران کی قیادت میں تحریک ترک موالات بھی ساتھ ساتھ تھی۔ ان کی دھواں دھار تقریروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے ہندوستان میں آتش فشاں پھٹ پڑا ہے لیکن ۱۹۲۴ء میں جب "ترک ناداں" نے قبائے خلافت چاک کر ڈالی تو یہ غبار زمین پر بیٹھ گیا۔ اس تحریک کا سب سے بڑا فائدہ کانگریس کو ہوا اور سارے ملک میں کانگریس کی قیادت کا سکہ جم گیا۔ اس زمانے میں سارے قائدین کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان ۲۵-۵۰ برس میں آزاد ہو جائے گا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائدین نے اس تحریک آزادی میں سرفروشانہ حصہ لیا۔ لیکن اس سارے عرصے میں مسلم قوم میں تعلیم کو عام کرنے کے متعلق کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ ان قائدین کی تقریروں اور تحریروں میں مشکل ہی سے مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے، کسی اسکول کو کھولنے یا اُن کی جہالت کو دور کرنے کا کسی منصوبہ بند پروگرام کا ذکر ملے گا۔

آزاد ہندوستان کے سامنے ملک وقوم کی ترقی کا نشانہ رہ گیا جس کے لیے پڑھے لکھے لوگوں کی فوج درکار تھی۔ جو جاہل قوم سے متعلق ہوں وہ کس طرح حکومت کی مشنری کے کل پرزے بن سکتے تھے، وہ کس طرح جمہوری طرز حکومت میں کوئی موثر رول ادا کر سکتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں سارجنٹ کمیشن نے بتلایا کہ ملک میں عام تعلیم کا فی صد صرف چھ ہے تقسیم ہند کے وقت ۱۴ فی صد مسلمانوں میں ایک آدھ فی صد پڑھا لکھا تھا وہ بھی پاکستان چلا گیا۔ پھر یہاں سے صفر فی صد سے مسلمانوں کا تعلیمی سفر شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۹۱ء کے اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ سارے ملک میں تعلیم کا فی صد ۵،۴۵ تھا اور مسلمانوں میں ۴،۷ فی صد۔ مسلم خواتین میں تعلیم کا فی صد اس طرح ایک سے بڑھ کر نہیں ہوگا۔ ۱۹۸۶ء میں جدید قومی تعلیمی پالیسی کے پروگرام میں مسلمانوں کو تعلیمی لحاظ سے پسماندہ قرار دیا گیا۔ اس وقت مسلمانوں کے تعلیمی فی صد کا اظہار بھی سرکاری رپورٹ میں کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ یہ اس قوم کا حال ہے جب کہ چودہ سو برس پہلے پیغمبر اسلام پر سب سے پہلی آیت پڑھنے اور لکھنے سے متعلق آئی۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا یہ قول قابل غور ہے کہ اس زمانے میں دنیا کا کوئی عظیم دانش ور بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو پڑھے لکھے نہیں تھے، ان پر وحی کی پہلی آیت پڑھنے اور لکھنے سے متعلق ہوگی۔ ایبل بورڈیا سیکریٹری ایجوکیشن حکومت ہند نے ۱۴ فروری ۱۹۸۰ء ایک آل انڈیا سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں فرمایا:

> "مسلمانوں کا مذہبی، ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی سرمایہ اتنا شاندار رہا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ان کی ہمسری نہیں کر سکتی لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ان میں تعلیم سے محرومی، جہالت اور ناخواندگی کا فی صد ملک بھر میں سب سے زیادہ ہے۔"

یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ سرسید کی تعلیمی تحریک کو شروع ہونے کوئی ایک سو بیس برس ہو چکے۔ اس طویل عرصے میں تعلیم کی وادی میں ہم نے صرف دس کیلو میٹر کا فاصلہ طے کیا ہے۔ ہماری خواتین پیچھے کہاں پر ہیں نہیں معلوم۔ اس رفتار سے تعلیم کے میدان میں اہل وطن کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے ہمیں کئی سو برس لگ جائیں گے۔

تقسیم ہند کے بعد جن مسلمانوں نے اپنے وطن عزیز کو چھوڑنا پسند نہیں کیا، انھیں بے شمار مصائب برداشت کرنے پڑے۔ ایک عرصے تک ان کے ہوش وحواس ٹھکانے نہیں رہے۔ علی گڑھ تعلیمی تحریک کے ٹھیک ایک سو برس بعد ۱۹۷۵ء کے لگ بھگ تعلیم کے

میدان میں پھر کچھ حرکت کے آثار پیدا ہوئے اس سلسلے میں ہمدرد ملت جناب سید حامد کا نام لینا ضروری ہے جنھوں نے تقاریر اور تحریروں سے مسلمانوں کو تعلیم کی اہمیت اور اصلاح معاشرہ کے پروگرام پر توجہ دلائی۔ اس کا اثر ہر شہر اور قصبہ میں تعلیمی ہل چل پیدا ہوئی۔ اسکول، کالج، فنی اداروں اور دینی درس گاہوں کا قیام خوش آئند علامت ہے۔ اس تحریک میں تبدیل کرنے کے لیے ابھی بہت کام باقی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اہل علم و دانش کے غور و فکر کے لیے چند نکات ہیں، لیکن یہاں اس کا اظہار ضروری ہے کہ اب کسی عظیم لیڈر یا مصلح قوم کے ظہور کا انتظار بے کار ہے۔ اس جمہوری دور میں اداروں کے قیام کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

۱۔ علم کی تفسیر میں شکوک وشبہات دور کرنا ضروری ہے:

ایک زمانے سے عام مسلمان علم کی تفسیر میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ علم صرف دینی تعلیم ہے باقی سب جہل ہے۔ جدید نوجوانوں کے ذہن میں یہ بات آگئی ہے کہ جدید تعلیم دنیا کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے جو اصل مقصود نہیں ہے۔ یہ تفسیر آیات سے میل نہیں کھاتی؛

وعلم آدم الاسماء کلها

[اللہ تعالیٰ نے آدم (انسان) کو ان ساری اشیاء کا علم دے دیا جو زمین و آسمان کے درمیان نیچے اور اوپر موجود ہیں]

علم الانسان مالم یعلم۔

[ہم نے انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا ہے جو وہ نہ جانتا تھا]۔

اب اس میں دین و دنیا کی سب تعلیم آگئی۔ سائنس کی ایجادات، انکشافات، دنیا کی ساری اشیاء کی ماہیت کی دریافت اور انسان کی ترقی کا ضامن ہے اور جو آج معلوم اور جو کل معلوم ہوگا ان سب کا احاطہ ان آیات نے کر دیا ہے۔ دین و دنیا کو الگ خانوں میں بانٹ دینے سے جدید ذہن تذبذب کا شکار ہو چکا ہے۔ اگر ایک مرتبہ اس قسم کا شک و شبہ دل و دماغ میں بس جائے تو کوئی طالب علم اپنے شعبے کے علم کی انتہا تک پہنچنے کے خیال کو ترک کر دیتا ہے۔ ساری مسلم قوم کے لیے یہ ایک نفسیاتی بریک ہے۔ اس کے لیے ہندوستان کے علمائے دین، دانش ور حضرات اور تبلیغی جماعت کے امیر اس نکتے پر جمع ہو کر غور فرمائیں اور صاف اعلان کر دیں کہ دینی اور عصری تعلیم میں ایسی کوئی دوری نہیں ہے۔ اگر ایک مرتبہ یہ ذہنی تذبذب دور ہو جائے تو علم کے میدان میں ترقی کی راہیں کھل جائیں گی۔

۲۔ مسلم ایجوکیشن ٹرسٹ کا قیام:

سارے ملک میں مختلف اداروں کے تعلیمی اور فلاحی ٹرسٹ قائم ہیں اور بعض اہل خیر کے فیملی ٹرسٹ تعلیم اور کاموں میں مدد دینے کے لیے قائم ہیں، لیکن ایسا مرکزی ٹرسٹ یا ریاستی سطح پر مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کوئی ٹرسٹ قائم نہیں۔ ملک کی با اثر، باوقار، قابل اعتماد شخصیتوں کے ذریعے اس قسم کے تعلیمی فنڈ چند کروڑ روپے کی رقم کی حد تک قائم ہو جانا مشکل نہیں ہوتا لیکن آج تک ریاستی یا آل انڈیا سطح پر اس قسم کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس قسم کی ہر تجویز کو ہم پہلے ہی ناممکن کہہ کر سے شروع نہیں کر پاتے۔ اس وقت اہل خیر کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے لیکن اہل ہمت مخلص بندوں کا قحط ہے جو صدا لگانے سے شرماتے ہیں۔ اگر اس قسم کی ہر ریاست میں پانچ دس کروڑ کا تعلیمی ٹرسٹ قائم ہو جائے تو مسلمانوں کے تعلیمی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے یہ ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ ہو جائے گا جو ریڑھ کی ہڈی کی طرح سارے ڈھانچے کو سنبھالے

گا۔ ہمارے سارے اچھے پروگرام پیسے کی کمی کی وجہ سے درمیان ہی میں دم توڑ دیتے ہیں۔

یوم آزادی ۱۵ اگست ۹۵ء کو ہمارے وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ اقلیتوں کی تعلیمی اور معاشی بھلائی کے لیے ۵۰۰ کروڑ کی خطیر رقم مختص کی جائے گی۔ ہر ریاست کو اس میں سے حصّہ ملے گا۔ یہ رقم کس طرح آئے گی اس سے قطع نظر اگر اس ساری رقم کا پانچواں حصّہ ایجوکیشن (یا اقلیتی کمیشن فنڈ) کے طور پر محفوظ کرلیا جائے تو مسلمانوں کی تعلیم کو دوسری اقلیتوں کے ساتھ ترقی کی ضمانت مل جائے گی۔ شاید حکومت ہند کو ایسی تجویز کی معقولیت سے انکار نہیں ہوگا بشرطیکہ اقلیتی کمیشن اور مسلم دانش ور، سیاسی قائدین اس تجویز کو موثر انداز میں پیش کریں۔

۳۔ تعلیمی کارواں:

اترپردیش میں جناب سید حامد کی قیادت میں اب تک چار مرتبہ تعلیمی کارواں نکالے گئے، جو مختلف اضلاع کا دورہ کر چکے ہیں۔ اس کارواں میں پروفیسر، ڈاکٹر، انجینیر، ایڈوکیٹس، ماہرین تعلیم، صنعت کار اور سوشل ورکر شامل رہے ان کے جانے سے دیہات، قصبات اور اضلاع میں کافی روشنی آئی۔ اس کارواں کا اصل مقصد تعلیم کی تحریک کو پہنچانا اور اصلاح معاشرے کے کاموں پر توجہ دلانا تھا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، اس کے نہایت مفید نتائج سامنے آئے ہیں۔ اس قسم کے تعلیمی کارواں ہر شہر سے نکالے جاسکتے ہیں۔ ان کے اثرات بہت دور رس ہوں گے لکھنے اور بولنے سے زیادہ اس قسم کے تعلیمی کارواں سے اس تحریک کو بڑی تقویت ہوگی۔

تعلیم ایک منفرد قسم کا ادارہ ہے جس کے لیے مقامی لیڈر شپ کو متحرک کرنے اور مقامی وسائل کا استعمال کرنا ضروری ہے۔

۴۔ دینی تعلیمی کونسل کا تجربہ:

ہماری مسلم آبادی کا ۶۵ فی صد حصّہ دیہات میں رہتا بستا ہے۔ عام طور پر شہروں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کی دلچسپی اپنے اطراف و اکناف کے تعلیمی مسائل سے رہتی ہے۔ اصل کام ان دور دراز دیہات کی مسلم آبادی کا ہے جن میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب برائے نام ہے۔ اترپردیش میں تعلیمی کونسل نے گزشتہ چالیس سال کے عرصے میں دیہات میں کوئی تیس ہزار اردو میڈیم پرائمری اسکول کھول لیے ہیں۔ پانچویں جماعت تک مادری زبان اردو میں تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم و تربیت یہاں کے نصاب کا اہم حصّہ ہے۔ پانچویں جماعت کے بعد یہ طلبا سرکاری یا خانگی اسکولوں میں جہاں ہندی یا انگلش میڈیم ہے۔ شریک ہو جاتے ہیں۔ اس پروگرام میں مقامی آبادی کو بڑی حد تک متحرک کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد دیہات میں تعلیم کا جال پھیلانے میں دینی کونسل کا یہ قابل ستائش کارنامہ ہے۔

اس اسکیم کو کارنامہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ساری دنیا کے ماہرین تعلیم کا اس ایک بات پر اتفاق ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم گیارہ سال کی عمر تک اس کی مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ دینی تعلیمی کونسل نے مادری زبان اردو میں پانچویں جماعت تک انتظام کر دیا ہے اور اپنے مذہب اور کلچر کو بھی اس ابتدائی دور ہی میں محفوظ کرلینے کا انتظام کرلیا ہے۔ بچے بڑے بھی ہو جائیں، چاہے وہ کسی ذریعۂ تعلیم سے آگے تعلیم پائیں اور کیسے ہی ماحول میں نشو و نما پائیں، وہ اپنے ہی خاندان اور اپنے ہی لوگوں میں اجنبی نہیں رہیں گے اور نہ اسلامی تعلیمات سے دور ہو جائیں گے۔ دوسری طرف دستور ہند کی دفعات کا منشا بھی پورا ہوتا ہے کہ اقلیتیں اپنی مادری زبان، کلچر اور مذہب کی حفاظت کے لیے خود اپنے بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم کا انتظام کر سکتی ہیں۔ مسلمانوں میں انگریزی میڈیم یا مقامی زبانوں میں تعلیم کا مسئلہ الجھن کا باعث رہا ہے۔ اس کا ایک معقول حل دینی تعلیمی کونسل کا تجربہ بھی ہے۔

(باقی صفحہ نمبر ۳۱ پر)

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

ڈاکٹر حیدر علی خاں *

ہماری نئی نسل اور بدلتی قدریں

کسی بھی ملک کے روشن مستقبل کا دار و مدار اس کی نئی نسل پر ہوتا ہے۔ پوری قوم بڑی امید کے ساتھ نشو و نما میں منہمک رہتی ہے اور اس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں بھی پیش کرتی ہے۔ ملک و قوم کی توقعات یہ ہوتی ہیں کہ وہ اُن کی بیش بہا قدروں کی حفاظت کرے، ان کو پختگی اور پائداری بخشے اور ان میں مث مگر زمانے کی تیز رفتار تبدیلیوں کے چلتے اور بدلتے حالات کے تحت قوم و ملک کی توقعات پوری ہوتی دکھائی آج نوجوان اور پُرانی قدروں کے بیچ عجیب کش مکش کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنے بزرگ روایتوں اور قدروں کو دیکھتا ہے، دوسری طرف وہ بدلتی ہوئی قدروں، نئے ماحول اور وقت کے تقاض رکھتا ہے۔ ایسے عالم میں اسے اعتدال اور توازن سے کام لے کر اپنے لیے راستہ بنانا پڑتا ہے لیکن بعض او اتنی شدید ہوتی ہے کہ وہ راستے کا تعین نہیں کر پاتا۔ روایت سے بغاوت کر لیتا ہے۔ بدلتی ہوئی قدروں کا وقت کے سیلاب میں بہہ جاتا ہے اور اپنی منزل سے بھٹک جاتا ہے۔

آج ہم اپنی نئی نسل پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ عام طور سے وہ تناؤ (Tension) انتشار کا شکار ہے۔ اُن میں سے اکثر کے سامنے زندگی کا کوئی واضح مقصد نہیں ہے۔ اُس کے لیے پُرانی قدریں اپنی اہ جا رہی ہیں اور نئی قدریں پرکشش معلوم ہو رہی ہیں مگر ان قدروں کے محاسن اور معائب پر غور کیے بغیر وہ انکو کے لیے ضروری سمجھنے لگی ہے۔ یہ تبدیلی اس قدر اہم ہے کہ اس کا گہرائی سے تجزیہ کیا جانا ضروری ہے۔

آج کا دور مادیت پرستی (Materialism) کا دور ہے۔ روحانی اور اخلاقی قدروں کا زوال تیزی ہے۔ آدمی ایک مشین بنتا جا رہا ہے جس میں جذبات، احساسات، انس و محبت، رواداری، بھائی چارہ نا نہیں ہوتی۔ اس مادیت پرستی کا بے حد اثر ہماری نئی نسل نے قبول کیا ہے۔ وہ زندگی کی مادی ضرورتوں کو پورا لیے ناجائز وسائل اپنانے میں بھی نہیں ہچکچاتی۔ اس کی خواہشیں اور ضرورتیں دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہیں۔ وہ کسی اپنی خواہشات کی تکمیل کرنا چاہتی ہے۔ "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے" کے مصداق اسے اطمینا نہیں ہے اور زمانے کی رفتار کے ساتھ بے تحاشا دوڑ رہی ہے۔

مادیت پرستی کے اس دور میں گلا کاٹ مقابلوں (Cut Throat Competitions) سے نئی نسل

---

* شری مرلی منوہر ٹاؤن پوسٹ گریجویٹ کالج، بلیا، (یو. پی)

ہے۔ نتیجہ یہ کہ اُس میں انفرادیت کا جذبہ بے حد کارفرما ہوتا جارہا ہے۔ خودغرضی اور نفس پرستی کے چلتے باہمی تعاون (Co-operation) اور اجتماعیت کا جذبہ مرتا جارہا ہے۔ ایسی صورت میں معاشرے کی روح ہی ختم ہوتی جارہی ہے۔
آج ہماری مشرقی قدریں اور روایتیں زوال آمادہ ہیں۔ نئی نسل مغربی تہذیب اور قدروں کی دلدادہ ہے اور اُس کی ظاہری آب و تاب سے متاثر ہی نہیں بلکہ مرعوب بھی نظر آتی ہے۔ مغربی تہذیب نے ہماری تہذیبی پہچان اور انسانی قدروں کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ آج دنیا کے فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں ایک انقلاب آچکا ہے۔ ٹیلی ویژن کے عالمی چینل ہماری تہذیب اور قدروں کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ویڈیو کلچر ہماری نئی نسل کو گمراہ کررہا ہے اور نئی نسل پر ایک نشہ طاری ہے۔ وہ اس کے مضر اثرات سے شاید ابھی پوری طرح واقف نہیں ہے۔ جب نشہ ٹوٹے گا تو احساس ہوگا کہ ہم "ماڈرن" بننے کے شوق میں اپنا قیمتی ورثہ کھوآئے ہیں۔ آج فلموں اور ٹیلی ویژن اور فحش لٹریچر کی بدولت عریانیت، بے حیائی اور نشہ خوری بڑھتی جارہی ہے۔ شرم و حیا جو ہماری تہذیب کا زیور رہے وہ نئی نسل سے مفقود ہوتی جارہی ہے۔
آج فیشن کا دور ہے۔ آئے دن نئے نئے فیشن سامنے آرہے ہیں اور نئی نسل اس کی بُری طرح شکار ہے۔ نئی نسل اپنی شخصیت کی ترقی و تعمیر کے لیے اخلاق و کردار کی ترقی کے بجائے فیشن پرستی کے ذریعے اپنی پہچان بنانا چاہتی ہے جو ظاہر ہے کہ ایک بچکانہ سوچ ہے۔ ہمارے ملک میں "سادی زندگی اعلیٰ خیالات" کے مقولے پر عمل ہوتا رہا ہے لیکن فیشن پرستی نے زندگی کو پُرتصنع اور خیالات کو ابتری کی جانب مبذول کیا ہے۔
ابھی حال ہی میں مہاتما گاندھی نے عدم تشدد اور صداقت کے راستے کو تمام مسائل کے حل کا ذریعہ بتایا تھا۔ انھوں نے اس پر عمل (Experiment) کرکے ہمیں دکھلایا بھی تھا۔ ہندوستان کے اس تجربے کو افریقہ اور ایشیا کے کئی ممالک نے کامیابی کے ساتھ آزمایا۔ مگر آج ہماری نئی نسل ان پر کم ہی اعتبار کرتی ہے۔ آج تشدد، آگ زنی، لوٹ مار، جبریہ گھیراؤ وغیرہ تیزی سے نئی نسل کے اسلحہ ہیں۔ آج صداقت کی جگہ دغابازی، فریب، جھوٹ کا سہارا لیا جارہا ہے۔ پہلے مقصد کی حصولیابی کے لیے ذرائع کی پاکی پر زور دیا جاتا تھا، آج مقصد کسی طرح بھی (By Hook or Crook) حاصل کرلینا کامیابی کی دلیل بن گئی ہے۔ یہ نئی قدریں یقیناً معاشرے کو تباہی کی جانب لے جائیں گی۔
آج کا زمانہ اشتہار بازی کا زمانہ ہے۔ کھوٹی سے کھوٹی چیز اور کمترین خیالات کو اشتہار کی ملمع بازی کے ذریعہ بیش قیمت، نایاب اور پرکشش بناکر پیش کیا جاتا ہے۔ اکثر لوگ عام طور سے اور نئی نسل خاص کر اشتہاروں کے چکاچوندھ اور بھول بھلیوں میں بھٹک جاتی ہے۔ فریب کو حقیقت سمجھ کر اس کے پیچھے دوڑنا شروع کردیتے ہیں۔ اس سے وقت اور پیسوں کی بربادی تو ہوتی ہے۔ کئی بار نفسیاتی اور ذہنی پریشانیوں میں نئی نسل کو مبتلا ہوجانا پڑتا ہے۔ اُداسی، مغمومیت (Depression) کا شکار نوجوان کسی لائق نہیں رہتا۔ خاندان اور معاشرے کے لیے بوجھ بن جاتا ہے۔ ویسے تو پُرفریب اشتہاروں پر پابندی عائد کی جانی ضروری ہے۔ ساتھ ہی نئی نسل کی صحیح نہج پر تربیت بھی بے حد ضروری ہے تاکہ وہ وقت رہتے تباہ کن نتیجوں سے آگاہ ہوسکے۔ آج کا نوجوان حقائق کا مقابلہ کرنے کے بجائے سینما کے پردے پر نظر آنے والے ڈرامائی شاندار معیار زندگی کو حقیقی سمجھ بیٹھنے کی بھول کرتا ہے اور جب اس کی زندگی ویسے نہیں بن پاتی تو وہ راہ فرار اختیار کرتا ہے اور نشہ خوری کا عادی ہوجاتا ہے۔ آج نئی نسل کا زبردست مسئلہ نشہ خوری ہوگیا ہے۔ جس سے نجات دلانے کا زبردست کام ہمارے سامنے چیلنج بن کر کھڑا ہے۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

[illegible] سائنس کا دور ہے [illegible]ل ہر چیز کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کا طرزِ فکر استدلالی
([illegible] ہبی اصولوں، قدیم روایتوں اور قدروں کو تفکر اور تعقل کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا چاہتی ہے۔
لحاظ سے [illegible] نسل قابلِ تعریف ہے کہ وہ توہم پرستی کی قائل نہیں ہے۔ وہ "خطائے بزرگان گرفتن خطاست" پر
رکھتی ہے لیکن بعض وقت وہ حد سے تجاوز کر جاتی ہے اور اپنی اعلیٰ قدروں سے بھی انحراف کرنے لگتی ہے۔ کئی بار تجربوں
ہوئی آزمودہ اور بہترین معقول باتوں کو بھی نئی نسل شک وشبہ کی نظر سے دیکھتی ہے، اُن پر اعتبار نہیں کرتی او
ان پر عمل نہیں کرتی ہے جس کے کئی بُرے نتائج سماج کو اُٹھانے پڑتے ہیں۔

نئی نسل پر جوش کا غلبہ زیادہ کارفرما ہے۔ اُسے فوری طور پر نتائج کی برآمدگی چاہیئے جو ہمیشہ ممکن نہیں ہو
اس میں ہوش کا فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ یہ صورتِ حال بھی خطرناک ہے جس کا تدارک ضروری ہے، اس کی ذمہ د
پُرانی نسل پر عائد ہوتی ہے۔ پُرانی نسل نوجوانوں پر تنقید تو کرتی ہے مگر ان کے احساسات، جذبات، ضرورتوں ،
تقاضوں کی طرف ہمدردی کے ساتھ خاطر خواہ توجہ نہیں دیتی، نہ ہی راہِ راست پر لانے کی خاطر سنجیدگی سے قدم ہ
ہے۔ پُرانی نسلوں میں سے کچھ مذہب کے نام پر فرقہ پرستی کا جذبہ اُن میں بھرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو کچھ اُن
طور پر استحصال کر رہے ہیں۔ اس طرح نئی نسل کو گمراہ کرکے اسے اصلی نصب العین سے ہٹانے کی ذمہ داری سے پُرانی
بچ نہیں سکتی۔ پُرانی نسل کو وقت رہتے خود اپنی اصلاح کر لینی چاہیئے۔

ہمارے ملک میں نئی نسل انتشار اور خلفشار میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہے۔ ا
اخلاقی گراوٹ آرہی ہے۔ وہ معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہے کیوں کہ روزگار کے مواقع کافی کم ہیں، جب کہ ضرورتیں
بڑھ چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ناانصافیاں ہو رہی ہیں، اس کا ہر سطح پر استحصال ہو رہا ہے ان کی اس صورتِ حال پر مصا
قوم اور سیاست دانوں خاص کر پالیسی بنانے والوں (Policy Makers) کو توجہ دینی چاہیے، لیکن یہ کا
نئی نسل کی خود کی امنگوں اور کوششوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا نئی نسل کو پرانی قدروں کی ناقدری نہیں کرنی چاہ
بلکہ بہترین امتزاج کے ساتھ دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا چاہیے اور اس کے لیے صحیح خطوط پر جدّوجہد کرنی چاہیے۔ ا
مادیت پرستی اور انتہا پسندی سے دامن بچانا ہوگا۔ زندگی میں سادگی کو بھی پسند کرنا ہوگا۔ تعلیم پر خصوصی توجہ دینی
اور تنگ دائروں سے نکل کر پُرانی اور نئی قدروں کے درمیان اعتدال قائم کرنا ہوگا۔ اس میں نئی نسل کا بھی بھلا ہے
اور ملک و سماج کا بھی بھلا ہے۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

سید بہاء الحق رضوی *

ایک کلیم سربکف

قوموں کی زندگی میں ایسے مواقع آجاتے ہیں کہ حصولِ مقصد کے لیے اور منزل پر پہنچنے کے لیے دو راہیں ان کے سامنے آجاتی ہیں اور ہر راستے کی دشواریاں اور منزل پر پہنچنے کے نتائج مختلف ہوتے ہیں اور جدید و قدیم تہذیبوں میں تصادم شروع ہوجاتا ہے۔ قوم کا ایک بڑا حصّہ جدید راہوں کو اختیار کرنا چاہتا ہے اور دوسرا قدیم پر اصرار کرتا ہے۔ قدامت پرستی اور جدت پرستی کی جنگ معمولی نہیں ہوتی بلکہ بہت شدید ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ کش مکش زیادہ عرصے تک جاری رہی ہے اور بہت سے رہنماؤں کی جانیں جو کسی نہ کسی گروہ کے فریق ہوتے ہیں اس دور کش مکش میں ختم ہوجاتی ہیں۔ فتح جدت پسندی کی ہوتی ہے اور قدامت پرستی کو اپنی راہوں میں اصلاح کرنا پڑتی ہے یا شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ علاّمہ اقبال نے قوموں کی اس کش مکش کو اور جدّت پسندی کی فتح کو کامیاب ترین طریقے سے اور تاریخ کو اجمال کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے ؎

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں — جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب — جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت — اور ہوئی فکر کی کشتیٔ نازک رواں
ملّتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر — لذّتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

مسلم قوم میں اس انقلاب کے آنے کی اطلاع دیتے ہوئے علاّمہ نے اس طرح نشان دہی کی اور مستقبل کی راہ کا پتہ دیا ؎

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب — رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا — گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں ہندوستان کے مسلمانوں میں جنگ دیر میں شروع ہوئی اور بہت زمانے تک جاری رہی اور ہندوستان میں اس کا میدان علی گڑھ بنا اور تاریخ کے فیصلوں کے مطابق فتح جدید کی ہوئی اور اس کی کامیابی کا سہرا اس شخص کے سر ہے جو مسلم یونیورسٹی کی مسجد کے گوشے میں محوِ خواب ہے (سر سیّد)۔ اس ذات نے جو کام انجام دیئے ان کی چھاپ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ چمکتی رہے گی اور علم و ادب کے مصنفین خواہ اس کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں اس کی پیروی

---

* ایڈووکیٹ، ڈسٹرکٹ کورٹس، رام پور (یو۔پی)۔

اور نتیج سے نہیں بچ سکے گے لیکن اس مہم کو سر کرنے کے لیے اس کو تن، من، دھن کی بازی لگانی پڑی تھی۔ مخالفین کے طع
سنتے ہیں لیکن اس کے ساتھیوں نے اپنی ترکش کا کوئی تیر نہیں چھوڑا تھا جو اس کے جسم میں پیوست نہ کر دیا ہو۔

قوم کی اصلاح بلکہ قوم میں انقلاب لانے کی مہم کا خیال جیسے ہی سر سید کے ذہن میں آیا ان کو ایک خار زار نظر آئے
ایک ذہنی کشمکش ان کی ذات میں پیدا ہوئی کہ میں وطن چھوڑ دوں اور گوشۂ عافیت کا انتخاب کر لوں یا مشکلات کا
کر دوں۔ ان کی جواں ہمتی نے ان کو دوسرا ہی راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا اور انھوں نے ترکِ وطن کا ارادہ چھوڑ دیا۔
کی ناکام جنگ آزادی کے بعد اس کی پاداش میں مسلمانوں کو جو سختیاں جھیلنا پڑی تھیں اور مصائب کا سامنا کرنا
کا سارا منظر سر سید کی آنکھوں کے سامنے گزرا تھا۔ مسلمانوں کی روز بروز پستی اور انگریز حکومت کے روز بہ
ہوئے اقتدار اور استبداد کو سر سید نے محسوس کیا اور یہ سمجھ لیا کہ انگریزوں کی طاقت گھٹنے والی نہیں معلوم ہوتی،
جلی جائے گی اور مسلمان برادران وطن کے مقابلے میں پست ہوتے چلے جائیں گے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی تعلیم و تر
کوئی انتظام نہیں ہے۔ ایک وقت وہ آئے گا کہ ان کے "مٹنے" کے نشان تک مٹ جائیں گے، اس لیے تعلیم کے میدان کو
نے اپنایا۔ 'PIONEER' کے ایڈیٹر کے قول کے بموجب سر سید دراصل ایک عظیم سیاسی اور انقلابی رہنما تھے اور اس
کے لیے قوم کی تعلیم و تربیت اس انقلاب کا راستہ تھا۔ اس لیے ان کو ماہر تعلیم کا رول اختیار کرنا پڑا۔ وہ یہ سمجھ گئے تھے
کی قوموں نے سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعے سے ترقی کی ہے اور مسلمان بھی اسی راستے سے ترقی کر سکتے ہیں۔ ہندو۔
مسلمانوں کی نظر میں سائنس شجرِ ممنوعہ تھی اور سائنس کا صحیح تصور ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے نہ تھا۔ وہ سائنس کو ا
بے دینی کے قریب جانتے تھے اور آج تک یہ تصور قائم ہے کہ سائنس، الحاد اور ارتداد کا قریبی رشتہ ہے۔ حالاں کہ سائنس
کسی کو گمراہ نہیں کیا۔ فلسفے نے ضرور قوموں کو الحاد اور تشکیک میں مبتلا کیا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کے دو دشمن تھے۔ ایک
تنگ نظری اور تعصب اور دوسری طرف انگریز حکومت۔ انگریز حکومت یہ جانتی تھی کہ اس نے اقتدار مسلمانوں سے ح
ہے اور مسلمانوں کی سرکوبی ضروری ہے۔ اس طرح سر سید کو دوہرا کام کرنا پڑا۔ ایک طرف انگریزوں کی غلط فہمی کو دو
اور دوسری طرف قوم سے جہالت اور تنگ نظری کو دور کرنا۔ انگریزوں کی غلط فہمی کو دور کرنے کا کام وقتی اور عارضی تھا اور جہ
دور کرنے کا کام دائمی تھا۔ سر سید پر اسی لیے انگریز دوستی کا الزام لگا اور لوگوں نے ان پر چاپلوسی تک کا الزام لگایا۔ سر سید سب کچھ دوا کے کڑوے
کی طرح پی گئے۔ ان کے لیے یہ ذہنی تصادم بڑا سخت تھا کیونکہ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں آخری بیدار مغز انقلابی رہنما تھا اور اس پر الزام لگایا گیا انگریز دو

حصول مقصد آسان نہ تھا بلکہ اس کے لیے آخری قسم کے ایثار اور قربانی کی ضرورت تھی اور منزل تک پہنچنے کے راستے
ہزاروں قسم کی دشواریاں تھیں لیکن اس مردِ مجاہد نے کسی بات کی پرواہ نہ کی۔ دشوار گزار راستوں سے گزرتا رہا اور جو
مشکلات آئیں اس کی جرأت، ہمت اور مقابلے کی طاقت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جب اس کو قتل کی دھمکی دی گئی تو سجدۂ
بجا لایا کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے میری مہم کو قبول فرما لیا اور ببانگ دہل اعلان کر دیا کہ مجھے اب احساس ہو گیا ہے کہ میں
حق پر ہوں۔ اس لیے کہ حق پر جو لوگ ہوتے ہیں ان کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ میرے سامنے آ گئی ہیں
میری مہم کامیاب ہو گی۔ اس لیے کہ میری نامقبولیت میرے کام کے مقبول ہونے کی ضمانت ہے۔ جب اس کے خلاف
الحاد اور ارتداد کے فتوے دیئے گئے تو پھر اس نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ اسلام اور کفر میرا اور میرے خدا کا معاملہ ہے۔
میں اس کے حضور میں تم سے کسی سفارش کا کبھی طلب گار نہ ہوں گا۔ میرے لیے حضرت نبی آخر الزماں کی شفاعت کافی ہے

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

ایک مرتبہ کسی نے منھ در منھ کفر کا الزام لگایا تو اس کے سامنے ہی کلمۂ طیبہ پڑھ کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ جب مخالفت مزید بڑھی تو اس نے اپنی عزت اور آن کو بھی داؤں پر لگا دیا اور کہہ دیا کہ تمہارا مکان بنانے اور تمہاری مسجدیں تعمیر کرنے میں تو قلی، جوڑی جمار بھی تو کام کرتے ہیں تو کیا ان کی وجہ سے تم اپنے مکانوں میں آرام کرنے اور مسجدوں میں نماز پڑھنے سے انکار کر دیتے ہو کہ اس کے بنانے والے تمہارے رتبے کے آدمی نہ تھے؟ اسی طرح مجھے بھی سمجھ لو کہ میں ایک قلی اور جوڑی جمار ہوں، لیکن تمہارے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ بنا رہا ہوں جس میں تعلیم کے بعد وہ اعلیٰ مرتبے پر پہنچیں گے اور اگر آج تم نے میری بات نہ مانی تو کل کو تمہارے ہی بچے تم کو بُرا کہیں گے کہ تم نے ان کو تعلیم نہ دی۔

سر سیّد ترک رسوم کے بہت بڑے حامی تھے۔ وہ رسموں کے بے حد خلاف تھے اور اسی طرح نیوتے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن اپنے خاندان کی ایک شادی پر نیوتا لینے کا اعلان کیا تو ان کے عزیز و اقارب خوش ہو گئے۔ انھوں نے نیوتا قبول کیا اور ساری رقم ایم۔ اے۔ او کالج کو دے دی اور ثابت کر دیا کہ مجھے قوم کی خاطر ترک رسوم پر بھی اختیار ہے اور قوم ہی کی خاطر رسموں کے اختیار کرنے پر بھی اختیار ہے۔ دوسروں کے دیئے ہوئے روپیوں کے سلسلے میں ہی ایسا نہیں کیا بلکہ اپنی تنخواہ، اپنے گھر کی تقریبات میں خرچ ہونے والا روپیہ بجائے تقریبات میں خرچ کرنے کے بار بار کالج کو دے دیا۔ محسن الملک اور دوسرے احباب نے دعوت کرنا چاہی تو دعوت میں خرچ ہونے والی رقم نقد وصول کر لی اور ایم۔ اے۔ او کالج کو دے دی۔ لوگوں نے ان سے ترک تعلق بھی کیا اور ان کے احباب سے بھی ترک تعلق کیا لیکن اس ترک موالات کو بھی نہایت خوش دلی سے برداشت کیا اور اپنے تمام احباب کی یہ تربیت کر دی کہ ہمت کے ساتھ اس کو برداشت کریں اور یقین کر لیں کہ یہ ترک تعلق آئندہ بہترین تعلقات کا پیش خیمہ ہے۔ بہرحال اس مرد میدان کے سامنے اور جواں ہمت بوڑھے کے سامنے جتنی دشواریاں آتی چلی گئیں، اس کی کمر ہمت اور زیادہ مضبوط ہوتی چلی گئی اور ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف جانے کے لیے اس کا عزم اور ارادہ مزید پختہ ہوتا چلا گیا۔ مخالفین نے سختی، مخالفت کی تمام پرانی رسمیں تازہ کر دیں لیکن اس نے بھی ایثار اور قربانی کی تمام مثالوں کو زندہ کر دیا اور اپنی مثال خود قائم کر دی اور بلا تشبیہ اس مصرع کا مصداق بن گیا ؎

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

سر سیّد نے جس ریگ زار اور جس بنجر زمین میں قدم رکھا اس کو گل گلزار اور زرخیز بنا دیا اور ہر کام کے سلسلے میں اپنے آپ آخری مثال بنے اور کوشش و کاوش کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ وقت کے سلسلے میں ہمیشہ یہ فرماتے کہ موجودہ وقت میرے کام کے لیے ناکافی ہے۔ میں کس طرح وقت کو بڑھا سکتا ہوں۔ اس لیے کہ وقت کم ہے اور کام بہت زیادہ ہے۔ سر سیّد نے جتنے کام دیئے اور جتنی مہمیں سر کیں ان میں سے کسی ایک کام کو بھی انجام دیتے تو اس قطار کے صف اول کے آدمی ہوتے۔ حالاں کہ انھوں نے بہت سے کام ایک وقت میں پورے کیے وہ محقق تھے، انھوں نے "آثار الصنادید" لکھ کر ایشیاٹک سوسائٹی سے خراج تحسین حاصل کر لیا اور دنیا کے تمام تاریخ داں مصنفوں نے اس کو سند کا درجہ دے دیا۔ اس کی تصنیف کوئی آسان کام نہ تھا انھوں نے جھولے میں بیٹھ کر قطب مینار کے کتبے اور عبارتیں خود پڑھی تھیں اور ان کے دوست امام بخش صہبائی زمین پر کھڑے ان کو تکتے رہتے اور دعا کرتے رہتے کہ سر سیّد بخیر و عافیت قطب مینار سے اتر آئیں۔ صحافت کے میدان میں جب قدم رکھا تو سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ تہذیب الاخلاق نکالا تو اس سے قبل انگریزی اخبارات کے معیار کو انگلستان جاکر دیکھا، سمجھا اور تحقیق و تفتیش کے بعد اپنا اخبار نکالا۔ صحافت کے میدان میں امام قرار پائے۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

"اسباب بغاوت ہند" لکھی تو اس قدر تحقیق اور تفتیش کے بعد کہ ہاؤس آف کامنس میں بحث کو پھانسی دے دی جائے یا چھوڑ دیا جائے۔ اسی طرح "سرکشی ضلع بجنور" کی تصنیف پر بھی ہندوستان مقدس پر بھی کتاب تصنیف کردی جو عیسائی مذہب کے بارے میں ان کی وسیع معلومات کا اظہار کرتی کتاب جب منظر عام پر آگئی تو انھوں نے انگلستان سے محسن الملک کو خط لکھا کہ میرا دل کباب ہوگیا ہے مجھے اس کتاب کا جواب لکھنا ہے اور اس کے لیے روپے کی ضرورت ہے۔ میرا گھر فروخت کر دو یا رہن کر روپیہ لے لو تاکہ میں اس کا جواب لکھ سکوں۔ تفسیر قرآن نئے انداز پر لکھی۔ دوستوں اور دشمنوں میں کا بازار گرم ہوا لیکن اس مرد میدان نے آگے بڑھا ہوا قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹایا۔ بہرحال ہر میدان میں سے کبھی اور ایثار و قربانی کے لحاظ سے بھی وہ مثال پیش کی جس کا جواب آج تک نہیں ملتا۔ شخصیت میں ہندوستان کے عظیم ترین لوگ اس کے چاروں طرف عقیدت اور محبت کے ساتھ بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے سمجھے کہ علماء اور فضلاء کی صحبت میں بیٹھا ہوں، بزرگوں کی محفلوں میں حاضر ہوا ہوں لیکن جو سکون قلب دانائے روزگار کی صحبت میں حاصل ہوا وہ کہیں نصیب نہ ہوا۔ محسن الملک، وقار الملک، مولانا شبلی چراغ علی اور دیگر اکابر جو بذات خود علمی اور تصنیفی دنیا میں یا قومی کاموں میں اپنا مقام رکھتے تھے مرشد ماننے پر مجبور ہوئے اور ان کی طباعی اور ذہانت کے ہمیشہ قائل رہے۔ اختلاف بھی کیا تو اس اپنے استاد یا مرشد سے اختلاف کرتا ہے، برابر والے نہیں دوسروں کو بھی اظہار خیال اور اختلاف جرأت عطا کی کہ حیدرآباد کی ایک مجلس میں یہ فرمایا کہ محسن الملک اور وقار الملک کی رائے میں ہم نے محسن الملک کی رائے پر عمل کیا اور اس سے زیادہ فائدہ ہوا تو وقار الملک اپنی جگہ سے اٹھے سرسید کے سامنے اپنا سر جھکا دیا اور کہا کہ آپ میرے مرشد ہیں آپ کا احترام میرے اوپر لازم ہے اور ہے، لیکن یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج بھی اپنی رائے پر قائم ہوں کہ میری بات ٹھیک تھی اور اسی سے زیادہ کے رفقاء نے بھی تعظیم و تکریم بجا لانے اور حکم ماننے کی اور اپنی رائے جرأت اور ہمت کے ساتھ ظاہر کرنے کی آخری تھیں، قائم کر دیں۔

سرسید کی شخصیت کے تعارف اور ان کی حیات اور کارناموں پر مطالعہ اور تحقیق کا دائرہ نہایت شاید اس موضوع پر جتنا بھی کام ہوگا وہ ہر دور میں کم ہی تصور ہوگا۔ اُن کی سیاسی آرا دیڑ اُن کے مذہبی خیر علمی، تصنیفی اور صحافتی کارناموں پر تحقیق کا کام ایک فرد کا نہیں بلکہ ادارہ اور اکادمی کا کام ہے لیکن یہ ان تمام کاموں میں ایک دل درد آشنا کو سمجھنے اور اس کے تلاش کرنے کا کام ہے۔ ان کی پوری زندگی صادق آتا ہے ؎

آداب جنوں انگیز، آئین وفا مانگے — کیا دل ہے کہ ایک دنیا دنیا سے جدا مانگے!

سرسید کے ساتھ احباب اور اغیار دونوں نے زیادتی کی ہے اور اپنے ترکش کا ہر تیر ان پر چلا دیا۔ عزیزوں نے نیچری اور فرنگی کہہ کر بدنام کیا اور اغیار نے فرقہ پرستی کا الزام لگا دیا اور یہ سمجھ لیا کہ وہ دو قو حامی، اور ابتدا کرنے والے تھے، حالاں کہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔ سرسید نے اپنی تقریر بمقام گو

بتاریخ ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو اور بمقام پٹنہ ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء اور بمقام لاہور انڈین ایسوسی ایشن کے ایڈریس کے جواب میں بتاریخ ۳ جنوری ۱۸۸۴ء کو ایک قومی نظریہ سیکولرزم پر اپنے یقین کا بھرپور اعلان کیا ہے۔ ان کے مضامین اور تقریروں سے ان کے سیاسی اور قومی نظریات کا اظہار ہوتا ہے اس حقیقت سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ جہاں گئے ان کو ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر ایڈریس پیش کیے اور ان کی قومی اور ملکی خدمات کو سراہا گیا۔ آج بھی ان کے حالات اس بات کو ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ متحدہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے علم بردار ہیں۔ ملک اور وطن سے محبت کا جذبہ ہر طرح ظاہر اور ثابت ہے۔ انھوں نے ایک واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ نہر سوئز کی مرمت کرنے والے فرانسیسی انجینیر (Lesseps) سے جب یہ کہا گیا کہ اس نہر کا نام اس کے نام پر رکھ دیا جائے تو اس نے کہا کہ میرے نام پر نہیں بلکہ فرانس کے نام پر اس کا نام [illegible] Canal رکھا جائے۔

سرسیّد نے بار بار اس واقعہ کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ کاش ہمارے ملک میں ایسے لوگ ہوتے جو اپنے نام و نمود کے بجائے ملک اور قوم کے نام کو روشن کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ آج اس دور میں بھی سرسید کی ضرورت ہے۔ یہ اگرچہ ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ کاش ہندوستانی مسلمان اور خاص طور پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایسے لوگ پیدا کر پاتی جو سرسیّد کے پیرو ہوتے اور ان کے نام کو روشن کرتے لیکن نا امیدی کے بجائے امید پر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں ؎

نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے　　امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں　　ہزار بادۂ ناشغتہ در رگ تاکست

(باقی صفحہ نمبر ۲۳ کا)

۵- تعلیم کو تحریک میں تبدیل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قصبات اور اضلاع میں تعلیمی کمیٹیاں بنائی جائیں جن کے اراکین ہر سیاسی اور مذہبی جماعت کے ہو سکتے ہیں۔ عوامی ذرائع ابلاغ اور پریس موثر رول ادا کر سکتے ہیں۔ آپ کی انفرادی کوششیں بھی بہت کام کی ہیں۔ اپنے محلے یا خاندان کے غریب اور بے سہارا مددگار بچوں کو کسی قریبی اسکول میں شریک کروائیں، ممکن ہو تو ان کی کاپیوں، کتابوں اور فیس سے مدد کریں۔ چاہے وہ ایک طالب علم ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کی امداد سے معاشرے میں ایک تحریک اور تعلیم سے دلچسپی پیدا ہوگی۔

حکومتِ ہند کو دیر سے ہی سہی اب اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ بہترین سرمایہ کاری انسانی وسائل کے فروغ میں ہے اور انسانی وسائل کی ترقی تعلیم کے بغیر کسی حال میں ممکن نہیں۔ اس لیے بہترین سرمایہ کاری کا شعبہ تعلیم ہی ہے جو ملک و قوم کی یکجہتی کا ضامن ہے۔ اس کی خاطر قومی آمدنی کا ۶ فی صد حصہ مختص کیا جائے گا۔ اس کی خاطر دیہات کے بچوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے دوپہر کے کھانے کی اسکیم کا آغاز کیا جا چکا ہے۔ تعلیم بالغان، اکشر جیوتی، بال واڑی، آنگن واڑی، قسم کی کئی تحریکیں چل رہی ہیں۔ مسلمان ان سب اسکیموں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن یہ ممکن نہیں جب تک کہ تعلیم کو مسلمانوں میں عوامی تحریک کے طور پر تبدیل نہ کیا جائے اور یہ کام حکومت کا نہیں اپنوں کے کرنے کا ہے۔ اکیسویں صدی کا اہم ترین چیلنج تعلیم ہی ہے۔ اگر ان باتوں پر عملاً غور کیا جائے تو ۲۰۱۵ تک مسلمانوں میں تعلیم کا اوسط قابل لحاظ حد تک بڑھنے کی توقع ہے۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

آفاق عالم صدیقی *

بچوں کی اعصابی کمزوریاں

ذمہ دار کون؟

کہا جاتا ہے کہ یہ دور پورا کا پورا سائنسی اور مشینی دور ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں سائنس کہ
وقت تک تسلیم نہیں کرتی جب تک کہ وہ عملی طور سے ثابت نہ ہو جائے۔ آپ نے اکثر بزرگوں کو کہتے سنا ہو
کے دن بھی کیا دن تھے۔ نہ کسی بات کی فکر، نہ کسی قسم کی ذہنی الجھن نہ پریشانی۔ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ
کو یاد کر کے حسرت بھری سانسیں لیتے ہیں ورحال کی پریشانیوں اور الجھنوں کو برا بھلا کہتے ہیں، لیکن وہ لو
فکر و پریشانی اور تمام ذہنی الجھنوں سے پاک سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، کیوں کہ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بچپن
سے خالی نہیں ہوتا۔ ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ خود کو برا یا بھلا کہنے اور اپنے آپ کو لے کر پریشان رہنے کی
بچپن ہی سے شروع ہوتی ہیں اور عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ زیادہ گنجلک اور پیچیدہ ہو جاتی ہیں اور ا
ناقابل حل مسئلہ بن جاتی ہیں۔ ایسی حالت کو ڈاکٹر نروس نیس سے تعبیر کرتے ہیں۔

بچپن میں نروس نیس کا شکار ہونا بچوں کے ضرورت سے زیادہ حساس ہونے اور گھر خاندان اور ماحو
اس زمانے میں ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کے درمیان ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ریس جاری ہے۔ س
کا شکوہ ہے۔ لوگوں کے پاس اتنا بھی وقت نہیں کہ اپنے بچوں سے تھوڑی دیر بیٹھ کر ہنس بول لیں۔ ایسی حالت
اور عدم تحفظ کا شکار ہو کر نروس نیس کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بچوں پر ضرورت سے زیادہ سختی و پابن
اور تناؤ کا ماحول وغیرہ بھی بچوں کی نفسیات کو الجھا دیتا ہے۔ جن بچوں کو گھر اور خاندان میں کھلا ماحول نہیں مل
دل کی باتیں کھل کر نہیں کہہ پاتے وہ بھی نروس نیس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم بڑے
مناسب موقع نہیں دے پاتے کہ وہ کھل کر اپنی باتیں ہم سے کہہ سکیں اور نہ اس سلسلے میں ہم اُن کا حوصلہ
ہیں۔ حالاں کہ ہم یہ سب غیر شعوری طور پر کرتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ ایسا کرتے وقت ہم اپنے عزیز بچوں کے ذ
اور ان کی حق تلفی کے ذمہ دار ٹھہرتے ہیں اور اس طرح ہم اپنے بچوں کو ذہنی طور پر بیمار اور مفلوج ہو جانے کے لیے
بچوں کی طبیعت میں سادگی، معصومیت اور بہت جلد اثر قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے ان کے یہاں آ
ہے اور دفاع کرنے کی طاقت بھی۔ وہ نشو و نما پاتے ہوئے جسم کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر بھی نئی قوت حاصل کرتے ہو

---

* مقام پونہ، پوسٹ کہاریا، ضلع دربھنگہ، بہار۔

چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بچوں کے نازک دل پر گہرا اور مستقل اثر کرتی ہے۔ فوزیہ ہی کو دیکھیے اس کے والدین کو اس پر توجہ دینے کے لیے بالکل فرصت نہیں ہے اس لیے وہ ہوم ورک بھی ٹھیک سے نہیں کر پاتی اور جب وہ اسکول جاتی ہے تو بچے اس کے بے ڈھنگے کپڑوں نیز پھٹی پرانی کاپی، کتابوں اور کلاس میں مرغا بننے یا استاد کی ڈانٹ سننے پر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے اسکول میں بالکل اکیلی ہو گئی ہے۔ جب وہ اپنے ساتھ کے لڑکے اور لڑکیوں کو استاد سے شاباشی پاتے اور بچوں کو آپس میں خوشی سے اچھلتے کودتے دیکھتی ہے تو وہ اسکول سے بھاگ نکلتی ہے اور کسی نہ کسی بہانے اسکول سے ناغہ کرنے لگتی ہے، اس کے والدین اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے ہیں۔ بس اتنا مان لیتے ہیں کہ لڑکی پڑھنے سے جی چرا رہی ہے، اس لیے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے پھر اسکول بھیج دیتے ہیں، جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے پیار سے سمجھایا جائے، اس کا حوصلہ بڑھایا جائے اور اس کے اسکول سے بھاگنے اور پڑھنے سے جی چرانے کی وجہ دریافت کی جائے اور اس کی پریشانیوں کو دور کیا جائے، اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح اس کا نروس نیس کم ہوگا اور وہ بھی دوسرے بچوں کی طرح دل لگا کر پڑھے گی اور اچھے نمبر حاصل کرے گی۔ بچوں کی سماجی حیثیت کا بھی بچوں کی نفسیات پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس میں انفرادی حیثیت کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ غریب کا بچہ امیروں کے بچوں کے ساتھ نہیں کھیل سکتا۔ اگر کھیلے گا تو بات بات میں اختلاف اور نا اتفاقی کا اندیشہ رہے گا۔ لباس، بات چیت اور نہ جانے کن کن پہلوؤں سے وہ دوسروں کی شخصیت کو کچھ سوچنے، کچھ کہنے اور کچھ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس میں ارادے کو بھی دخل ہو یہ کوئی ضروری نہیں۔ یہ دائرے جو سماج نے بنا دیئے ہیں یا روز روز جو نت نئے دائرے بنتے جا رہے ہیں، یہ اتفاق ہی سے ٹوٹتے ہیں۔ کسی چھوٹے طبقے کا سماجی درجہ یا پھر اس کے افراد کی معاشی حالت جب اچھی ہو جاتی ہے تو اس کا اثر اخلاقیات پر بھی پڑتا ہے، گھر کا ماحول بدلتا ہے۔ لوگوں کے برتاؤ میں تبدیلی آتی ہے اور ان تمام تبدیلیوں کا بچوں پر خاص اثر پڑتا ہے۔ خاص طور پر خوب صورت بچے زیادہ ہی متاثر ہوتے ہیں یا پھر بدصورت بچے۔ خوب صورت بچے یہ تقابل کرتے رہتے ہیں کہ ان کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ امتیازی کیوں ہے۔ ان میں ان کی کمزوری، خوب صورتی، قدوقامت، رنگ و روپ، زیور و لباس اور وضع قطع کو کس حد تک دخل ہے اور اگر اس مرحلے میں کسی بچے کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کے ساتھ گھر والوں نے یا سماج اور معاشرے نے ناانصافی کی ہے یا کی جاتی رہی ہے تو پھر اس کی نفسیات مستقل طور پر اس سے متاثر ہو جاتی ہے۔

ان پڑھ اور پڑھے لکھے، خوب صورت اور بدصورت، خوش وضع اور بد وضع، آسودہ اور مفلس بچوں میں یہ فرق آ جاتا ہے۔ تعلیم، کھیل کود یا پھر کسی اور معاملے میں آگے بڑھنے والا بچہ اپنے دوسرے ساتھیوں پر کسی نہ کسی طرح اپنی برتری ثابت کر دینا چاہتا ہے اور دوسرے اپنے احساسِ کمتری اور کم مائگی کو کسی نہ کسی طرح کم کر دینے یا کوئی اور رنگ دے ڈالنے کی فکر میں پڑ جاتے ہیں۔

اس طرح یہ خیال کرنا کہ بچپن بے فکری کا زمانہ ہوتا ہے، سراسر غلط ہے۔ بچے طرح طرح کی ذہنی الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں جنھیں وہ پوری طرح بیان نہیں کر پاتے اور بچوں کے سرپرست گھوڑے بیچ کر اس خوش فہمی میں سوئے رہتے ہیں کہ بچے تو ابھی بچے ہیں۔ اس طرح وہ لوگ اپنے بچوں کو نروس نیس کا شکار ہونے کے لیے بالکل بے یار و مددگار چھوڑ دیتے ہیں۔

کم عمر بچوں کے سرپرستوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ذہنی اتار چڑھاؤ کا باقاعدہ جائزہ لیں کیونکہ اس عمر میں پڑا ہوا اثر آخری عمر تک آدمی کے ذہن سے چپٹا رہتا ہے۔ بچوں پر توجہ دینے کا اصل وقت یہی ہوتا ہے جو والدین

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

اپنے بچوں پر اس وقت توجہ نہیں دے پاتے، ان کے بچّوں کا ذہن مختلف پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ نوعمری کا
تبدیلیوں کا زمانہ ہوتا ہے اس میں انھیں کئی اہم تبدیلیوں سے گزرنا پڑتا ہے، اس لیے اس عمر میں بچوں کا خیال ر
ضروری ہو جاتا ہے۔ ہمیں اس بات پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے کہ ہمارے بچے کس بات کو کس طرح محسوس کر رہے ہیں
برتی گئی کسی بھی طرح کی لاپرواہی بچوں کے اندر جسمانی یا ذہنی کوئی بھی نقص پیدا کر سکتی ہے۔

جن بچوں کے والدین ضرورت سے زیادہ سخت گیر ہوتے ہیں اور پیار محبت کے نام پر ان کے یہاں صرف ڈانٹ
ہوتی ہے، ایسے والدین کے بچّوں کو عدم تحفظ کے احساس اور احساس کمتری کا شکار ہونے سے دنیا کی کوئی طا
جس گھر میں بزبرکشیدگی کا ماحول بنا رہتا ہو، والدین آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہوں، ایسے ماحول ـ
ارتقا نہیں ہو پاتا، ایسے ماحول کے پروردہ بچوں میں خود اعتمادی نام کو نہیں ہوتی۔ ایسے بچے سب کچھ یاد ہو
اسکول میں کھڑے ہو کر ٹیچر کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے۔ خود اعتمادی نہ ہونے کی وجہ سے ایسے بچے م
جاتے ہیں۔ دوست احباب ان کی اس حالت کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اس طرح یہ اور زیادہ عدم خود اعتمادی ا
کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کو آپ بھیڑ میں بھی پہچان سکتے ہیں۔ ایسے بچّوں کے چہروں پر خوشی کے ب
مسکینی ہوگی۔ یہ اپنے ساتھیوں میں بھی اکیلا ہوگا۔ یہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح ہنسی مذاق اور شرارت ـ
ہوگا۔ یہ جب بھی کہیں سے گزرے گا تو سہما سہما لگے گا۔

کچھ نوعمر لڑکیاں اپنے چہرے اور رنگ کو لے کر پریشان رہتی ہیں اور گھنٹوں چھپ چھپا کر آئینے کے سامنے گزار
لڑکے اور لڑکیوں کی زندگی ہزار ہا قسم کی الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایسے بچّوں کے سرپرستوں کو چاہیے کہ وہ پو
اور خلوص دل سے اپنے بچوں کے دوست بن جائیں۔ چوں کہ آپ نے ابتدا ہی میں ان پر بھرپور توجہ نہیں دی ہے ا
اس حال کو پہنچے ہیں، اس لیے اب بالکل آپ ایک لمحہ کو بھی ان سے غافل نہ رہیں۔ آپ بالکل ایک ہم عمر دوست کی
گھل مل جائیں۔ ان کی ذہنی پریشانیوں اور الجھنوں کو سمجھنے کی کوشش کریں، ان کا حوصلہ بڑھائیں کہ ان کے اندر
آپ سے کھل کر کہہ دیں۔ خبردار! آپ کے کسی بھی فعل سے بناوٹی اور مصنوعی دوستی کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بچے آپ
کی وجہ سے حد سے زیادہ حساس ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان کو سمجھانے اور ان کی تربیت کرنے، نیز ان سے ہمدردی
نہایت ہوشیاری سے کام لیں۔ ایسے بچّوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ یہ بچے وہاں تک محسوس کریں گے جہاں
گمان بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے پوری ہوشیاری اور صبر و تحمل سے کام لے کر ان کا کردار بنانے اور سنوارنے میں
کریں۔ یاد رہے کہ یہ آخری موقع ہے اگر آپ یہاں بھی چوک گئے تو پھر آپ کے بچوں کو نروس نیس کا شکار ہو
نہیں بچا سکتا۔

بچپن کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اگر شروع ہی میں توجہ دی جائے تو بچوں کو بہت ساری الجھنوں سے بچایا جا
یہی الجھنیں جو بچپن میں بالکل معمولی سی باتوں کو لے کر شروع ہوتی ہیں، نوعمری اور جوانی سے گزرتی ہوئی چڑھتی
کو بے حد کمزور اور معذور بنا دیتی ہیں، اس لیے بچوں کے سرپرستوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں پر بھرپور توجہ
مکمل تحفظ اور بھرپور اپنائیت و محبت کا احساس دلائیں۔ بچوں کے اندر اس بات کا حوصلہ پیدا کیا جائے
محسوس کریں ان کے دل میں جو بھی کھٹک ہو وہ کھل کر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بیان کر سکیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے

چھوٹی چھوٹی الجھنوں کو پیار اور دلچسپی سے سلجھائیں۔ ان کے اوٹ پٹانگ سوالوں کا تجزیہ کرکے ایسا جواب دیں کہ وہ مطمئن ہو جائیں ان کی جائز اور اچھی خواہشوں کا نہ صرف یہ کہ خوش دلی سے استقبال کریں بلکہ ان کا حوصلہ بھی بڑھائیں اور انھیں شاباشی بھی دیں۔ البتہ ان کی بے جا اور بیکار خواہشوں کو اس خوب صورتی اور نفسیاتی باریک بینی سے ٹالیں کہ بچوں پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔ ان کی پسند اور ناپسند کا تجزیہ کریں، ان کو اچھے اور بُرے میں تمیز کرنا سکھائیں۔ کسی بُری حرکت پر بے تحاشہ غصہ ہو کر کوئی سزا دینے سے بہتر ہے کہ پیار سے اس حرکت کی بُرائی سمجھا کر انھیں اس سے دور رکھنے کی کوشش کریں۔ سنجیدگی سے ان کے مزاج اور طرزِ فکر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یقین مانیے کہ آپ اگر بچہ کے مزاج کو سمجھ گئے تو حیرت انگیز طور پہ بچے بھی آپ کو اور آپ کے مزاج کو سمجھنے لگ جائیں گے۔ ان کے کردار کو بنانے اور سنوارنے میں اگر کبھی کبھی تھوڑی بہت سختی بھی کرنی پڑے تو زیادہ بُرا نہیں ہے۔ اگر آپ بہت مصروف ہیں تب بھی بچّے کے لیے وقت نکالیے۔ اتنا یاد رکھیے کہ آپ اگر اپنی محبت کے بدلے صرف ٹافی اور کھلونے سے اسے بہلائیں گے تو اس کا کردار تو بگڑے گا ہی، آپ کو بھی زندگی میں کبھی اس سے سچّی محبت نہیں ملے گی۔ کیوں کہ بچوں کو آپ کے کھلونوں اور ٹافیوں سے زیادہ آپ کی قربت اور شفقت کی ضرورت ہے۔ کبھی اکیلے پن اور سوتیلے پن کا احساس نہ ہونے دیں۔ ان کی تربیت اس طرح کریں کہ وہ حد سے زیادہ حساس اور ضرورت سے زیادہ جذباتیت کا شکار نہ ہوں۔ ان کی ذہنی نشو ونما اس طرح کریں کہ وہ اپنے آپ زندگی کے سارے پہلوؤں پر غیر جانب دارانہ انداز میں غور و فکر کرنے لگیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے کامیابیوں، ناکامیوں، خوبیوں، خامیوں، دکھ، سکھ غرض اس طرح کے تقابلی حالات کے تئیں مدلّل نظریہ اپنانے کی ترغیب دیں، نہیں تو اُن کے لیے زندگی کی جدوجہد میں کامیاب ہونا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔

تہذیب الاخلاق

نرخ اشتہارات

۱۔	بیک ٹائیٹل پیج	پورا صفحہ	۱۲۰۰	روپے
	بیک ٹائیٹل پیج	آدھا صفحہ	۶۰۰	روپے
	بیک ٹائیٹل پیج	چوتھائی صفحہ	۳۰۰	روپے
۲۔	بیک اِنر ٹائیٹل پیج	پورا صفحہ	۱۰۰۰	روپے
	بیک اِنر ٹائیٹل پیج	آدھا صفحہ	۵۰۰	روپے
	بیک اِنر ٹائیٹل پیج	چوتھائی صفحہ	۲۵۰	روپے
۳۔	اِنر سائڈ پیج	پورا صفحہ	۷۵۰	روپے
	اِنر سائڈ پیج	آدھا صفحہ	۴۰۰	روپے
	اِنر سائڈ پیج	چوتھائی صفحہ	۲۰۰	روپے

نوٹ:۔ مشتہرین کو ۳۳ فی صد کی رعایت دی جائے گی۔ سرکولیشن انچارج

ڈاکٹر عرفان احمد*

پروفیسر سبرامنیم چندر شیکھر

ایک عظیم سائنس داں

"عظیم آدمی کا جنم نہیں ہوتا۔ عظیم خود بنا جاتا ہے اور سبھی عظیم آدمی خود ہی عظیم بنے ہیں۔"

یہ قول ہے ۱۹۸۳ء کا طبیعات میں نوبیل انعام حاصل کرنے والے عظیم سائنس داں پروفیسر سبرامنیم چندر شیکھر کا جو حال ہی میں ۲۵ر اگست ۱۹۹۵ء کو پچاسی سال کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے شکاگو (امریکہ) میں چل بسے۔ بھارت کو ان کی موت سے گہرا صدمہ پہنچنا ایک قدرتی امر ہے۔ کیوں کہ آج جب ہمارے ملک میں دیو ہیکل میٹر ویو ریڈیو ٹیلی سکوپ (Giant meter wave Radio Telescope) بن گیا ہے تو اس میدان میں نت نئی نئی کھوج کرنے والا سائنس داں ہی نہیں رہا۔ زیر نظر مضمون میں اس عظیم سائنس داں کے حالات اور اس کے کارناموں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

سبرامنیم چندر شیکھر کی پیدائش ۱۹ر اکتوبر ۱۹۱۰ء کو لاہور میں ہوئی۔ یہ مشہور سائنس داں اور ۱۹۳۰ء کا طبیعات کا نوبیل انعام یافتہ سر چندر شیکھر وِنکٹ رمن (Sir C.V. Raman) کے بھتیجے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مدراس میں حاصل کی۔ وہ شروع ہی سے بلا کے ذہین تھے اور پڑھنے کے انتہائی شوقین۔ بڑی پابندی سے لائبریری جانا اور طبیعات کی نئی نئی کتابیں پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ آرنلڈ سمر فیلڈ (Arnold Sommerfeld) اور آرتھر کامپٹن (Arthur Compton) کی کتابوں نے چندر شیکھر کو جدید طبیعات (Modern Physics) کی طرف متوجہ کیا۔ ان کا پہلا تحقیقاتی مضمون محض ۱۸ سال کی عمر میں انڈین جرنل آف فزکس (Indian Journal of Physics) میں شائع ہوا۔ ایم۔ ایس سی کی ڈگری حاصل کرنے تک اُن کے کئی مضامین شائع ہو چکے تھے۔ ان میں ایک مضمون رائل سوسائٹی لندن کے جریدے (Proceedings of Royal Society London) میں شائع ہوا جو اتنی کم عمر والے شخص کے لیے واقعی بڑے فخر کی بات تھی۔ ۱۹۳۰ء میں ٹرینٹی کالج کیمبرج (انگلینڈ) میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جاتے ہوئے بحری سفر میں انھوں نے ایک تارے کے گرنے اور اس کے غائب ہونے کی سائنسی وجہ معلوم کی۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۳۵ء کو لندن کی رائل اسٹرونامکل سوسائٹی (Royal Astronomical Society London) کی ایک میٹنگ میں انھوں نے اپنا وہ مشہور تحقیقاتی مقالہ پیش کیا جسے آج دنیائے سائنس چندر شیکھر کے نظریئے کے نام سے جانتی ہے۔ ان کا یہ نظریہ ستاروں کے ریاضیاتی طرز عمل سے متعلق ہے۔ اس نظریے کے مطابق ستارے ہمیشہ یوں ہی چمکتے نہیں رہیں گے اور ایک نہ ایک دن اُن کی موت واقع ہو جائے گی اور پھر یہ چمک باقی

---

* ریڈر شعبۂ فزکس، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ۔

نہیں رہے گی۔ ستاروں کی چمک ان میں موجود کیمیائی عنصر ہائیڈروجن گیس میں تبدیلیوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب ستاروں میں یہ گیس ختم ہونے لگتی ہے اس وقت اس میں موجود دوسرے عناصر اس کی جگہ توانائی کے ذرائع بنتے رہتے ہیں لیکن اس طرح ستاروں میں دو تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ ستاروں میں چمک کم ہونے لگتی ہے۔ دوسرے ستارے کے مرکزی حصے کا وزن بڑھنے لگتا ہے اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی گیس، ہلکے عناصر، مرکبات کی پرتیں پھیلنے لگتی ہیں۔ ستارے کا مرکزی حصہ سکڑنے لگتا ہے اور وہ اپنا توازن کھونے لگتا ہے۔ اسی طرح چند تبدیلیاں اور ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ گھومتے ہوئے سیارے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے ہلکے مادے پھیلنے لگتے ہیں اور یہ جسامت میں بھی بڑھنے لگتے ہیں۔ مرکزی حصے میں دوبارہ پیدا شدہ ایٹم جمع ہونے سے وہ کافی وزنی ہو جاتا ہے اور اس کی کشش اور دباؤ کا توازن قائم نہیں رہ پاتا۔ یہ تبدیلیاں آس پاس گھومتے ہوئے سیاروں کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہیں۔ اس طرح یہ سیارے ایک ایک کرکے اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور آخر کار اسی میں سما جاتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جن تاروں کا وزن آج سورج سے ۱.۴ گنا ہوگا وہ آخیر میں سکڑ کر بہت بھاری ہو جائیں گے۔

ابتدا میں ان کے اس نظریئے کو سائنس داں ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ آکسفورڈ میں ان کے استاد سر آرتھر ایڈنگٹن (Arthur Eddington) نے اُن کا یہ کہہ کر مذاق اُڑایا کہ "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اتنے وزنی سیارے غائب ہو جائیں؟ ممکن ہے تمہاری ریاضی صحیح ہو لیکن تمہاری طبیعات بلا شبہ غلط ہے"۔ سر ایڈنگٹن کی شخصیت دنیائے سائنس میں اتنی بلند تھی کہ بہت سے مشہور ماہر طبیعات کھل کر چندر شیکھر کے نظریئے کی حمایت کرنے کی ہمت نہیں کر سکے۔ ان سائنس دانوں کی مخالفت کے باوجود چندر شیکھر نے اپنی تحقیقات جاری رکھیں اور ان کی سچائی کو مغربی سائنس دانوں سے منوا کر ہی دم لیا۔ اس نظریئے نے سفید بونے ستارے (White Dwarf Stars)، نیوٹران ستارے (Neutron Stars)، بلیک ہول (Black Hole)، سُپر نووا (Supernova) وغیرہ کو سمجھنے میں کافی مدد کی ہے۔ فلکیاتی طبیعات (Astro Physics) میں ان کا نام چندر شیکھر حد (Chandrashekhar Limit) کے لیے بہت مشہور ہے۔ سبھی ماہر فلکیات نے پایا کہ سفید بونے تاروں کا وزن چندر شیکھر کی بتائی ہوئی حد ہی میں محدود و محصور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد تجرباتی کسوٹی پر کھرا اترنے پر ہی علمائے سائنس نے اس نظریئے کو قبول کر لیا جس کے لیے انھیں ۱۹۸۳ء کا نوبل انعام پروفیسر ولیم فاولر (William Fowler) کے ساتھ عطا کیا گیا جن کی رہنمائی میں انھوں نے کیمبرج میں کام کیا تھا اور جنھوں نے ۱۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو لندن کی رائل اسٹرونامکل سوسائٹی میں چندر شیکھر کا تعارف سائنس دانوں سے کرایا تھا۔

یوں تو چندر شیکھر کی دھاک ایک ماہر فلکیاتی طبیعات کے روپ میں محض ۲۷ سال کی عمر میں ہی اچھی خاصی بیٹھ چکی تھی لیکن یہ ایک المیہ ہے کہ ۱۹۳۷ء میں جب آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کرکے وہ بھارت لوٹے تو انھیں کوئی نوکری نہیں ملی اور وہ اسی سال امریکہ چلے گئے جہاں وسکانسن (Wisconsin) میں واقع یرکس رصد گاہ (Yerks Observatory) کے ڈائرکٹر اور ماہر فلکیات آٹو سٹروب نے ان کی ذہانت کو پہچان لیا اور انھیں شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کر لیا۔ جہاں وہ لگن اور محنت سے تحقیقات میں جٹ گئے۔ اگرچہ ان کو بھارت میں عزت تو بہت ملی، بھارت سرکار نے انھیں پدم بھوشن عطا کیا لیکن ۱۹۳۰ء میں اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھارت چھوڑنے کے بعد وہ باہر ہی کے ہو کر رہ گئے۔ ۱۹۵۳ء میں اپنے والد اور خاندان کے دیگر افراد کی مخالفت کے باوجود انھوں نے امریکی شہریت اختیار کر لی لیکن آخیر تک وہ مزاجاً ایک ہندوستانی ہی رہے۔

اپنے استاد سر آرتھر ایڈنگٹن کا ان کی نظر میں کیا مقام تھا؟ یہ ان کی مشہور کتاب ۔ Eddington: The Most Distinguished Physicist of his time کے پڑھنے والے ہی جانتے ہیں۔ چندر شیکھر ایک انتہائی محنتی اور لائق استاد تھے اور اپنے محنتی اور ذہین طالب علموں کی بڑی مدد کرتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں وسکانسن کی یرکس رصدگاہ سے ۱۶۰ کلومیٹر دور شکاگو یونیورسٹی پہنچنے میں ایک دن خود گاڑی چلا کر اپنے دو شاگردوں لی (Lee) اور یانگ (Yang) کو پڑھانے کے لیے جایا کرتے تھے۔ لوگ پوچھتے بھی کہ ان شاگردوں میں ایسا کیا ہے جو اتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں؟ اس کا جواب ان لوگوں کو ۱۹۵۷ء میں اس وقت مل گیا جب ایک گرو کی پوری کلاس کو طبیعات میں نوبیل انعام سے نوازا گیا۔ یہ بھی دنیائے سائنس میں ایک قسم کا ایک ریکارڈ ہے۔

پروفیسر چندر شیکھر جو اپنے دوستوں میں چندرا کے نام سے پکارے جاتے تھے، کئی درجن کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ تقریباً بیس برسوں تک اسٹروفزیکل جرنل (Astrophysical Journal) کے ایڈیٹر بھی رہے۔ سیکڑوں تحقیقاتی مضامین لکھے جن کا اگر ہم شمار کریں تو ہر سال تقریباً آٹھ مضامین کا اوسط آتا ہے۔ پروفیسر چندرا نے یہ ثابت کر دیا کہ ایک اچھا سائنس داں انسانی معلومات میں اضافہ کرتا ہے، جب کہ ایک عظیم سائنس داں ایک نیا دروازہ کھول دیتا ہے۔ انھوں نے فلکیاتی طبیعات میں جس باب کا اضافہ کیا اس سے آج دنیائے سائنس بخوبی واقف ہے۔ ایک سوال اکثر ذہنوں میں آتا ہے کہ بھارت نے ان کی خدمات کیوں نہیں حاصل کیں؟ اس کا جواب میرے خیال میں آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ان الفاظ میں پوشیدہ ہے جو انھوں نے ۱۹۶۹ء میں پروفیسر چندرا کو بھارت سرکار کی طرف سے پدم بھوشن عطا ہونے پر ادا کیے تھے کہ:

"یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم چندر شیکھر کو اپنے دیش میں نہیں رکھ سکے لیکن ہم آج بھی نہیں کہہ سکتے کہ اگر وہ بھارت میں رہتے تو اتنا بڑا کام کر پاتے۔"

پروفیسر چندرا اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک تحقیق و جستجو میں انتہائی لگن سے جٹے رہے۔ اپنے آخری انٹرویو میں انھوں نے کہا تھا کہ:

"اگرچہ میں ایک ناستک (Atheist) ہندو ہوں لیکن جب میں تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہوں تو یہ پاتا ہوں کہ انسان کی سب سے عظیم اور حیران کن دریافت ایشور ہے۔"

غالباً اس میدان میں بھی ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ قدرت نے انھیں ایک عجیب تاریخ پیدائش عطا کی تھی۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۰ء؛ ۱۹-۱۰-۱۹۱۰ء

آج پروفیسر چندرا ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کی تحقیقات ایک عظیم و شاندار سائنسی اندوختہ کی صورت میں آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ چراغ راہ کے مانند درخشاں رہیں گی۔

نوٹ: مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل مضامین سے مدد لی گئی ہے

1. Science Reporter: Vol.32, No.10 (1995) P. 13 - V.G Kulkarni: Chandrashekhar — The Dazzling Star
2. Vigyan Pragati (Hindi): Vol.44, No.10 (1995) P. 43 Diksha Bist: Aur Khagol Vigyan ka Ek Aur Sitara Doob Gaya

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

راحت ابرار *

سرسید اور میرٹھ

سرسید احمد خاں کی علمی اور سماجی تحریک کو آگے بڑھانے میں میرٹھ کے ایک درجن سے زائد رفقا نے اہم کردار ادا کیا تھا اور خود میرٹھ کے حالات، واقعات اور حادثات کا سرسید کی زندگی پر گہرا اثر پڑا تھا اور اس انقلاب نے ان کے افکار و نظریات میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی پہلی لڑائی جسے سرسید نے غدر کا نام دیا تھا، میرٹھ سے ہی شروع ہوئی تھی اس دوران پانچ ماہ سے زائد عرصے تک سرسید میرٹھ ہی میں مقیم رہے۔ وہ بجنور سے نکل کر جب میرٹھ پہنچے تو ان کی جیب میں صرف چھ پیسے تھے اور تن پر پھٹے کپڑے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میرٹھ میں منشی الطاف حسین نے جو سرسید کے پرانے دوست تھے، ان کے رہنے کے لیے ایک مکان خالی کر دیا۔ میرٹھ ہی میں سرسید کو پتہ چلا کہ دلی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اور تمام سامان لوٹ لیا ہے اور سب لوگ دلی چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اور خود ان کے کنبے کے لوگ بھی جن میں ان کے ماموں وحید الدین خاں اور ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں شامل تھے، سپاہیوں کے ہاتھوں قتل کر دیئے گئے۔ ان کی والدہ اور خالہ حویلی چھوڑ کر اصطبل میں چھپ گئیں اور آٹھ دن تک نہایت تکلیف سے اس کوٹھری میں بسر کیے۔

سرسید میرٹھ سے دلی پہنچ گئے۔ دلی میں انھیں پتہ چلا کہ تین دن سے ان کی والدہ کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ کسی قدر گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا، اسی کو کھاتی رہیں۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہوگیا تھا اور پیاس کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھیں۔

سرسید اپنی والدہ کو لے کر میرٹھ چلے آئے۔ غدر کے دنوں میں بھوک اور پیاس کی وجہ سے وہ ایک بیماری کا شکار ہوگئیں اور یکم ربیع الثانی ۱۲۷۴ ہجری کو میرٹھ میں انتقال ہوگیا۔ سرسید کہتے تھے کہ:

"ان کے انتقال سے چند روز پہلے تمام کنبے کی عورتیں، مرد اور بچے جو مختلف مقامات میں تھے۔ سب ان کے پاس میرٹھ میں جمع ہوگئے تھے۔ اس لیے مرتے وقت وہ بہت خوش تھیں۔" [1]

کوئی بھی تحریک کسی نہ کسی واقعہ یا حادثہ کے رونما ہونے کے اثرات سے وجود میں آتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور ہی سرسید کی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔ خود سرسید اس بات کا اقرار کرتے تھے:

---

* اسسٹنٹ پی۔ آر۔ او۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

"غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا قوم کی بربادی کا۔۔۔۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر سے پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا ــــ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔" [3]

سرسید نے میرٹھ ہی میں اس بات کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب ایک وقتی ہنگامی اور مقامی انقلاب نہیں ہے بلکہ ایک عالمگیر انقلاب کا پیش خیمہ ہے جس میں دنیا کی قومیں ایک دوسرے سے قریب آجائیں گی۔ علوم و فنون کی ترقی ہوگی، حیرت انگیز ایجادات ہوں گی اور نظام زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل جائے گا۔ انھوں نے مغلیہ سلطنت کے جاہ و جلال کو اپنی آنکھوں سے مٹتے ہوئے دیکھا تھا، انھیں پختہ یقین ہوگیا کہ انگریزوں کے قدم اب ہندوستان میں جم چکے ہیں۔ وقت اور حالات کا تقاضا ہے کہ انگریزوں سے دوستی کی جائے تاکہ انگریز مسلمانوں کو جو ایک وحشی، جنگجو اور امن دشمن قوم تصور کرنے لگے تھے، اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جائے۔ سرسید کی انگریز دوستی مصلحت کا تقاضا تھی اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان نفرت کو ختم کرنے کا ایک وسیلہ بھی۔ وہ انگریزوں کے دوست تھے مگر انگریز پرست نہیں تھے۔

غدر کی ناکامی کے بعد میرٹھ کے سرکردہ مسلمانوں نے ایک ڈبیٹنگ سوسائٹی قائم کی۔ اس انجمن کے ذریعے ہی سماجی اصلاح اور نئے خیالات کے نعرے بلند ہوئے۔ غالب کے ایک ممتاز شاگرد حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی نے سب سے پہلے جدید علوم کے تصور کو اُبھارا اور اپنے تذکرے "بہارستان ناز" کے دیباچے میں تعلیم نسواں کی بھرپور حمایت کی۔ [4]

سرسید کے بچپن کے دوست مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی ان ہی دنوں میرٹھ میں حلقۂ سرسید کے ایک رکن مولوی ممتاز علی کے مطبع احمدی میں تصحیح کا کام کرتے تھے۔ مولوی ممتاز علی غالب کے بھی دوست تھے اور انھوں نے ہی غالب کے خطوط کا مجموعہ پہلی بار میرٹھ سے شائع کر کے اردو ادب کو خطوط نگاری سے متعارف کرایا۔ [5]

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے جہاں مسلمانوں کو سیاسی اقتدار سے محروم کیا وہیں مسلم قوم کو ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسے علی گڑھ اور دیوبند مل گئے۔ یہ بھی محض ایک اتفاق ہے کہ مولانا مملوک علی کے دو شاگردوں سرسید نے علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او کالج اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ یہ دونوں ادارے ہی ملت اسلامیہ کی نشاۃ الثانیہ کا سرچشمہ ثابت ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا بنیادی مقصد عیسائیت کی یلغار کو روکنا تھا۔ انگریز حکام ہندوستانیوں کو عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کرنے کو جائز قرار دے رہے تھے۔ سرسید کا بیان ہے:

"بعض ضلعوں میں مشنریوں کے ساتھ تھانے کے سپاہی شامل ہو جاتے۔ اس صورت میں مشنری صرف اپنی کتابوں کی تعلیمات کی وضاحت پر ہی قناعت نہ کرتے بلکہ دوسرے مذاہب کے پیروں اور مقدس مقامات پر دل آزار اور غیر موزوں زبان میں حملے کرتے اور سننے والوں کے جذبات کو اس قدر مشتعل اور مجروح کرتے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اس طرح سے لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں بے اطمینانی کے بیج بھی بوئے۔ جب ہندوستانیوں کو جبراً عیسائی بنانے سے متعلق گشتی کا علم ہوا تو خوف سے ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔" [6]

سرسید نے اپنے بچپن کے طالب علم ساتھی مولانا قاسم نانوتوی کی موت پر خون کے آنسو بہائے اور اپنی ایک

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

تعزیتی تحریر میں کہا:

"افسوس ہے کہ جناب ممدوح نے ۱۵ر اپریل ۱۸۸۰ء کو بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ انھیں کی کوششوں سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہے بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔۔۔۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت و افسوس سے کہہ کر خاموش ہو رہیں یا چند آنسو آنکھ سے بہاکر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کرلیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگاری کو قائم رکھیں۔"

سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی سے کئی سال قبل میرٹھ میں ترجمہ نگاری کا کام شروع ہوگیا تھا اور یہی ترجمے اردو ادب میں جدید نظم نگاری کا آغاز تصور کیے جاتے ہیں۔ میرٹھ میں سررشتہ تعلیم کے انگریزی افسر مسٹر کیمپسن کی ہدایت پر سرسید کے دیرینہ رفیق اور میرٹھ کے باشندے شیخ امام بخش صہبائی کے شاگرد حکیم غلام مولا بخش قلق میرٹھی نے پندرہ انگریزی نظموں کا ترجمہ "جواہر منظوم" کے نام سے کیا جو ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ پریس الہ آباد سے شائع ہوا۔ ان منظوم تراجم پر مرزا غالب نے بھی نظر ثانی کی تھی ؎ مولانا الطاف حسین حالی، مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی نے قلق کی شاعری سے متاثر ہوکر اپنا ذہن اس جانب مبذول کیا۔

میرٹھ ہی سے تحریک آزادی کا پہلا شعلہ بھڑکا اور اسی شہر میں جدید شاعری کا آغاز ہوا اور اسی شہر نے تعلیمی میدان میں ایک صحت مند انقلاب کی شمع روشن کی۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی سرسید تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے سرسید کی عقلیت پسندی کو بھی ادب میں پیش کیا اور علی گڑھ تحریک سے وابستگی اور سرسید احمد خاں کے اثر سے انھوں نے نہ صرف اپنی شاعری کا رُخ موڑا بلکہ اپنا لباس بھی تبدیل کر دیا اور ٹرکش کوٹ کا استعمال شروع کر دیا ؎ وہ علی گڑھ کو اپنی تہذیب کا مرکز سمجھتے تھے اور اس تحریک سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور جب بھی موقع ملتا اپنی شاعری کے ذریعے مسلم یونیورسٹی کی اہمیت کو واضح کرتے رہتے تھے۔ مولانا نے سرسید تحریک سے متاثر ہوکر ۱۹۰۹ء میں میرٹھ میں مدرسہ بنات المسلمین قائم کیا جو ۱۹۲۵ء میں اسمٰعیل گرلز کالج اور بعد میں اسمٰعیل نیشنل ڈگری کالج بن گیا۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے ۱۸۷۷ء میں روم اور روس کی جنگ پر ایک لیکچر میرٹھ میں دیا تھا جو مولوی بشیر الدین زبیری کے نجم الاخبار (میرٹھ) میں شائع ہوا تھا۔ اسے سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۲۰ر اپریل ۱۸۷۷ء کے شمارے میں شائع کرادیا تھا۔ ؎ مولانا اسمٰعیل میرٹھی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ذیلی شاخ انجمن ترقی اردو کی بورڈ مجلس شوریٰ کے بھی رکن تھے۔ اسی دور میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی انجمن کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں اپنی رائے دیا کرتے تھے۔ مدرسۃ العلوم کے قانون ٹرسٹیان کے مسودے کو بھی مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے ہی تیار کیا تھا ؎ کیوں کہ مولانا سررشتہ تعلیم کے دفتر سے منسلک رہے اور انھیں تعلیمی امور کا وسیع تجربہ تھا۔

جس وقت سرسید کی تعلیمی تحریک اپنے عروج پر تھی، میرٹھ ہی کے ایک ممتاز جدید نظم گو شاعر سید مرتضیٰ بیان یزدانی ا
کی حمایت میں اپنے حجرے سے باہر آکر مقامی جلسوں اور مشاعروں میں شریک ہوئے اور سرسید کی شان میں پرجوش قصید
پڑھے۔ وہ صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اپنے عہد کے ایک ممتاز صحافی بھی تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے جلوۂ طو
ادارت کی جو ۱۸۶۱ء میں میرٹھ سے جاری ہوا۔[12] انھوں نے ۱۸۸۱ء میں اپنا ذاتی ہفت روزہ طوطیٔ ھند جاری کیا جو
العلوم میرٹھ سے شائع ہوتا تھا۔ طوطیٔ ہند کو فروخت کرنے کے بعد بیان میرٹھی نے ماہنامہ لسان الملک جاری کیا۔

سرسید احمد خاں کی زندگی میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا آخری جلسہ جب ۱۸۹۶ء کو میرٹھ میں ہوا، ا
وقت منتظمین جلسہ بیان میرٹھی کو دعوت نامہ دینا بھول گئے۔ بیان میرٹھی کے دل میں سرسید اور جسٹس محمود سے ملنے کا
پیدا ہوا اور وہ اپنی پالکی میں سوار ہو کر کانفرنس کی قیام گاہ پر آئے اور" اسلام کا سرنگوں علم" عنوان سے ایک
سنائی جو بہت پسند کی گئی۔ نواب محسن الملک نے سب سے زیادہ داد دی۔ اس اجلاس کی صدارت نواب عماد الملک
سید حسین بلگرامی نے کی اور جلسہ میں سرسید، جسٹس محمود، محسن الملک، مولانا نذیر احمد، میاں محمد شاہ دین، میاں
شفیع، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں بھی شریک ہوئے۔[13]

سید مرتضیٰ بیان میرٹھی نے ایک طرف سرسید اور ان کی علمی تحریک کا اثر قبول کیا تو دوسری طرف خواجہ الطاف حسین
پر تنقید بھی کی۔ انھوں نے شکوۂ ہند کے جواب میں پاسخِ ہند لکھی اور اپنی نظم ایشیائی شاعری کی الوداع" میں حالی پر
طنز کیا۔[14]

انجمن پنجاب کی جانب سے جدید اردو شاعری کے فروغ کے لیے جو کوششیں شروع کی گئیں ان کا میرٹھ کے شعراء نے
سب سے پہلے استقبال کیا۔ خود رنج میرٹھی ان مشاعروں میں شرکت کرتے اور میرٹھ میں نظم سوسائٹی کی تشکیل عمل میں
آئی جس کے ایک جلسہ میں مولوی محمد حسین آزاد بھی شریک ہوئے۔ شہرت بخاری نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ میرٹھ کے
چند شاعر لاہور کی انجمن میں مجوزہ عنوانوں پر نظمیں کہنے لگے، ان میں بیان یزدانی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔[15]

سید محمد مرتضیٰ بیان یزدانی نے سرسید کے انتقال پر ایک مرثیہ بھی کہا جو سرسید سے ان کے جذبۂ عقیدت کی ترجمانی کرتا ہے

قہر ہے سرسید احمد خاں بہادر کی وفات — وہ زمیں کا فخر جو آسماں سے اُٹھ گیا
ہے اندھیرا چار سو یا رب یہ کیا اندھیر ہے — آج نجم الہند کیا ہندوستاں سے اُٹھ گیا
اے علی گڑھ تیرے ویرانوں کو اب دیکھے گا کون — خانہ آرائے ترقی خانماں سے اُٹھ گیا

[illegible] جب علی گڑھ میں سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام کا فیصلہ کیا تو سوسائٹی کی نئی عمارت کا افتتاح میرٹھ
کے کمشنر مسٹر ولیم نے کیا تھا۔[16] سرسید کی قائم کردہ اس سوسائٹی کے میرٹھ کے نواب اسحاق خاں، قاضی فضل احمد تحصیلدار
میرٹھ اور سید نصیر علی تحصیلدار باغپت ابتدائی رکن تھے۔[17] نواب اسحاق کے والد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی سائنٹیفک
سوسائٹی کے بنیادی رکن تھے اور سائنٹیفک سوسائٹی کے ایک جلسہ میں ہی انھوں نے حالی کی ملاقات سرسید سے کرائی تھی۔
نواب شیفتہ نے غدر کے بعد میرٹھ میں سکونت اختیار کرلی تھی اور غالب ان کی مزاج پرسی کے لیے میرٹھ تشریف لائے تھے۔[18]
نواب اسحاق خاں کے صاحبزادے نواب اسمٰعیل خاں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔

سرسید کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دوستوں کا بہت بڑا حلقہ میرٹھ میں آباد تھا۔ انھیں میں مولوی وجاہت

علی خاں وجاہت بھی شامل تھے۔ سرسیّد نے اپنے اس لائق دوست کے انتقال پر تعزیتی پیغام میں کہا تھا کہ :

"ہم کو اس خبر کے دیکھنے سے سخت قلق ہوا کہ ہمارا ایک لائق ہم عصر جو اپنی تیزی طبیعت اور حدّتِ مزاج اور قوت حافظہ کے لحاظ سے یکتا تھا، اس نے اس جہانِ فانی سے انتقال کیا۔ ہم کو ان کا نام لکھنے سے درد معلوم ہوتا ہے۔ ہم کو اپنے دوست کے اخلاق یاد آتے ہیں اور ہم بجز صبر کے اور کیا کر سکتے ہیں"۔ [۱۹]

مولوی وجاہت علی صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اخبار عالم کے مدیر بھی تھے جسے انھوں نے ۱۸۶۱ء میں میرٹھ سے شائع کیا تھا۔
میرٹھ کے رئیس اعظم نواب احمد اللہ خاں مرحوم کے انتقال پر بھی سرسیّد نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا :

"نواب صاحب مرحوم نہایت معزز خاندان کے تھے اور ان کے بزرگ عہدِ سلاطین مغلیہ میں نسلاً بعد نسلٍ نہایت معزز صاحب منصب و خطاب ہوتے رہے ہیں۔ نواب احمد اللہ خاں میں خاندانی اعزاز کے سوا ذاتی صفات بھی اعلیٰ درجے کی تھیں۔ نہایت مہذب اخلاق اور مسکین طبیعت کے تھے۔ وہ نہایت نیک دل انسان تھے"۔ [۲۰]

سرسیّد اور علی گڑھ تحریک کو پروان چڑھانے میں میرٹھ کے لوگوں نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ سرسیّد کے دست راست نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی اور سرسید کے شاگرد عزیز ڈاکٹر سر ضیاء الدین کا تعلق بھی میرٹھ ہی سے تھا اور یہ تینوں حضرات میرٹھ ہی میں پیدا ہوئے۔

سرسید جب سخت بیمار ہو گئے اور ان کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تب میرٹھ کے ہی مشہور میڈیکل آفیسر ڈاکٹر موربائی کو علاج کے لیے علی گڑھ بلایا گیا تھا۔

کل۔ آج۔ اور۔ کل کے اس عظیم انسان کی موت پر میرٹھ کے در و دیوار پر غم کے بادل چھا گئے۔ اس دور کے تمام شعراء نے سرسید کی موت پر مرثیے کہے۔ صحافیوں نے اپنے اداریوں میں سرسیّد کی خوبیوں کو بیان کیا اور سرسیّد کے رفقاء نے خون کے آنسو بہائے۔ میرٹھ کے شہریوں کی طرف سے ماہ اپریل میں ایک ماتمی جلسہ منعقد ہوا جس سے خطاب کرتے ہوئے میرٹھ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر پورٹر نے کہا:

"آج اس جلسہ میں ہم پر ایک غم کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ سرسیّد احمد خاں کے انتقال سے نہ صرف ملک نے ایک بڑا رکن سلطنت اور قوم کا بڑا خیر اندیش کھو دیا ہے بلکہ حاضرین جلسہ میں سے اکثر کا ایک ذاتی دوست ہاتھ سے جاتا رہا ہے۔۔۔۔ اس نے ابتدائی عمر میں معلوم کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان جہالت میں ڈوبے جاتے ہیں اور ان کو روشن ضمیر بنانے کی سخت ضرورت ہے۔۔۔ اس نے زندگی کے ایک ایسے زمانے میں جب کہ ہم میں سے اکثر ہاتھ پاؤں ہلانے سے جی چراتے ہیں اور باقی عمر کو اپنی آسائشوں اور ذاتی آسائشوں کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں۔ اپنا وقت، اپنی طاقت، اپنا روپیہ اور سچ پوچھو تو اپنا سب کچھ ہم جنسوں کی بھلائی کے لیے وقف کر دیا۔

صاحبو! ایک ایسے وقت میں جیسا کہ یہ وقت ہے میں جو ایک مختلف نسل کا ممبر اور مختلف مذہب پر یقین رکھنے والا ہوں، آپ سے ایک درخواست کر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم اختلافات اور حسد اور عداوت کو جس نے تمہیں متفرق کر رکھا ہے، اپنے مرحوم لیڈر کی قبر میں دفن کرنے پر

راضی ہو جاؤ۔ ۔ ۔ میں تم کو یاد دلاتا ہوں کہ دنیا میں اتفاق اور صرف اتفاق ہی کا نام طاقت ہے۔(۲۱)

حوالے

۱۔ حیات جاوید۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ۔ ص ۸۱
۲۔ ایضاً ص ۸۴
۳۔ ایضاً ص ۸۴
۴۔ تذکرۂ شاعرات بہارستانِ ناز، حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی۔
۵۔ عود ہندی، مطبع احمدی۔ میرٹھ۔
۶۔ انقلاب ۱۸۵۷ء، مرتبہ پی۔ سی۔ جوشی۔ ص ۱۶۴
۷۔ سرسید کی تعزیتی تحریریں، مرتبہ اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔
۸۔ قلق میرٹھی۔ حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر جلال انجم۔
۹۔ اسمٰعیل میرٹھی۔ حیات و خدمات۔ اسلم سیفی میرٹھی۔
۱۰۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ مورخہ ۲۰ر اپریل ۱۸۷۷ء
۱۱۔ حیات اسمٰعیل۔ ڈاکٹر سیفی پریمی
۱۲۔ تاریخ صحافت اردو۔ مؤلفہ امداد صابری۔ جلد دوم۔
۱۳۔ علامہ سر عبدالقادر۔ یادرفتگان سرسید نمبر بیداری علی گڑھ، ۲۴ر مارچ ۱۹۴۲ء
۱۴۔ بیانؔ میرٹھی۔ حیات و شاعری از ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ
۱۵۔ شہرت بخاری۔ ادبی تحریکیں۔ نقوش لاہور۔ سالنامہ
۱۶۔ حیاتِ جاوید۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ۔
۱۷۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، سرسید نمبر ۱۹۹۴ء، مضمون فرخ جلالی
۱۸۔ مکاتیب غالب، مرتبہ امتیاز علی عرشی۔
۱۹۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ، ۱۸۷۶ء
۲۰۔ سرسید کی تعزیتی تحریریں۔ مرتبہ اصغر عباس
۲۱۔ حیات جاوید۔ خواجہ الطاف حسین حالی، ص ۲۲۸۔

محمد انتخاب الرحمٰن ٭

خواب ــــــ فرائڈ کے خیال میں

عام طور پر نیند اور خواب دو متضاد شکلیں ہیں۔ گرچہ ہمارا علم نیند اور خواب کے متعلق اب تک نامکمل ہے، پھر بھی گزشتہ بیس سال کی تحقیق سے غیر متوقع حقائق سامنے آئے ہیں جو کہ نیند اور خواب کی گتھی کو سلجھانے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ شعوری سطح پر نیند بیداری سے دو اہم پہلوؤں کی وجہ سے مختلف ہے۔ اول یہ کہ ظاہری دنیا سے انسان کا رشتہ بہت ہی کم ہو جاتا ہے اور دوئم یہ کہ جسمانی حرکت اور مرکزی اعصابی نظام (Central Nervous System) کی حرکات میں تبدیلیاں بھی آجاتی ہیں۔ جب ہم سوتے ہیں تو تیزی کے ساتھ ہماری جسمانی حرکات میں کمیاں آنے لگتی ہیں۔ ہماری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، گرچہ دماغ ہمارے حواس خمسہ (Sense Organs) کے ذریعے ظاہری معلومات فراہم کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی ردّ عمل ظاہر نہیں ہو پاتا ہے۔ سونے کے دوران دل کی دھڑکنیں اور سانسوں کا سلسلہ کم ہو جاتا ہے اور ہماری بیداری کی کیفیت کم ہو کر رہ جاتی ہے۔ گرچہ نیند کے دوران خاموشی کی کیفیت ہو جاتی ہے اور انسانی رشتہ شعوری سطح سے ٹوٹ کر رہ جاتا ہے لیکن بے شمار ہیجانی کیفیات اندرونی طور پر رونما ہوتی رہتی ہیں۔

پوری طرح نیند کی آغوش میں آنے کے بعد ہم خود کو خوابوں کی دنیا میں پاتے ہیں۔ خواب وہ حقیقت ہے جس سے بنی نوع انسان کا گہرا رشتہ ہے۔ ماہرین نفسیات نے مختلف انداز میں اسے متعارف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اہم ناموں میں فشر (Fisher) اور براؤن (Brown) ہیں۔ سب سے پہلے خواب کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کا بیڑا فرائڈ (Freud) نے اُٹھایا۔ فرائڈ نے اپنی کتاب "تعبیر خواب" (The Interpretation of Dream) میں واضح کیا کہ خواب کا رشتہ انسانی رجحانات و رویہ سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خواب بے معنیٰ یا بے ضرورت نہیں ہوتے بلکہ بامعنیٰ اور ضرورت کے تحت ہوتے ہیں۔ اس نے خواب کو تکمیلِ خواہشات (Wish fulfilment) کا ایک ذریعہ تصور کیا ہے۔ فرائڈ کا نظریہ ہے کہ خواب نیند کی حالت میں لاشعوری ذہنی عمل ہے، جس کے ذریعے انسان دبی ہوئی یا دبائی ہوئی لاشعوری خواہشات کو ظاہر کرتا ہے اور مخفی صورتوں میں ان کی تکمیل کرتا ہے۔

فرائڈ نے خواب کی تشریح کرتے ہوئے ذہن کی تین سطحوں پر زور ڈالا ہے۔ شعور، تحت الشعور اور لاشعور۔ فرائڈ کے مطابق حالت بیداری میں لاشعور اور شعور کے درمیان اخلاقی احساسات و جذبات احتساب (Censor) کا کام کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے غیر مہذب، غیر سماجی اور بُرے خیالات و خواہشات شعور میں نہیں آپاتیں اور وہ دبا دی جاتی ہیں۔

٭ ریسرچ اسکالر، شعبۂ نفسیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

لیکن ایسے خیالات بھٹکنے کے بعد بھی لاشعوری سطح پر غیر متحرک نہیں رہتے بلکہ اور زیادہ مضبوط شکل اختیار کر کے شعور پر آنے کے لیے بے قرار رہتے ہیں اور جب بھی مواقع ملتے ہیں اپنی شکل بدل کر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ عالم خواب میں جب ر بند شیں کمزور ہو جاتی ہیں تو وہ دبی ہوئی خواہشات بدلی ہوئی شکل میں خوابوں کے ذریعے مکمل ہو جاتی ہیں۔ افلاطون د نے اپنی کتاب "ریاست" (The Republic) میں خواب کے متعلق اپنے خیالات کی یوں وضاحت کی ہے:

"جن افعال کو گناہ گار عالم بیداری میں کرتا ہے۔ شریف لوگ ان فعلوں کی تسکین خوابوں کے ذریعے کر لیتے ہیں۔"

لہٰذا خوابوں کے ذریعے خواہشات کی تکمیل ہی ہوتی ہے۔ فرائڈ (FREUD) نے ان ہی باتوں کو موکد انداز میں یوں لکھا کہ جنسی خواہشات اور جنسی آرزوؤں کی تکمیل خواب کے ذریعے بدلی ہوئی حالت میں ہوتی ہے۔ اس نے اپنے نظریۂ خواب میں بتایا ہے کہ خواب میں انسان کی اپنی ہی ادھوری خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے لیکن وہ لاشعوری خواہشات خوابوں میں حقیقی شکل میں نہ ہو کر پوشیدہ صورتوں میں ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان خواب دیکھنے کے بعد خود بھی یہ یقین نہیں کر پاتا کہ اسی کی خواہشات تھیں یا کچھ اور۔

خواب کی مخفی صورت کو واضح کرنے میں فرائڈ نے "موادِ خواب" (Dream Content) اور "عمل خواب" (Dream work) کا سہارا لیا ہے۔

خواب میں ہم جو کچھ بھی دیکھتے ہیں وہ اس کی صحیح صورت نہیں ہوتی۔ حقیقت میں اس کے معنی اس سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان چیزوں کا علم ہمیں خواب دیکھنے والوں کے "آزاد ایتلاف" (Free Association) سے ہی ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر فرائڈ نے خواب کے دو پہلو بتائے ہیں: ۱۔ موادِ آشکار یا ظاہر (Manifest Content) ۲۔ موادِ مخفی (Latent Content) خواب دیکھنے والا خواب میں جو کچھ بھی دیکھتا ہے اور جاگنے کے بعد وہ خواب کو ہو بہو بیان کر دیتا ہے تو اسے فرائڈ نے موادِ ظاہر (Manifest Content) کا نام دیا ہے۔ موادِ ظاہر کی تشریح سے ہی لاشعوری خواہش کا علم ہوتا ہے، کیوں کہ اس کے پیچھے خواب کا راز پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کی تشریح سے خواب کے جو معنی سامنے آتے ہیں اسے ہی "موادِ مخفی" (Latent content) کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی نے خواب میں اپنے کو شہر کی ایک سڑک پر کھڑا پایا جہاں جنگ ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ گولیوں کی بوچھار سے نہ جانے کتنی عورتیں آسمان میں اڑ گئیں۔ یہ خواب کا "موادِ ظاہر" (Manifest Content) ہوا۔ اس کی تشریح سے پتہ چلا کہ اس کے تعلقات اپنی بیوی سے اچھے نہیں تھے۔ وہ اس سے نفرت کرتا تھا لیکن سرِ عام وہ اسے رسوا کرنا غیر مہذب سمجھتا تھا۔ یہاں اس کا خواب عورت کے تئیں دبی ہوئی نفرت کا باعث بنا۔ اسے "موادِ مخفی" (Latent Content) کہتے ہیں۔ بعض دفعہ خوابوں میں 'موادِ ظاہر' اور 'موادِ مخفی' یکساں ہوتے ہیں۔ ایسے خواب کو "عام خواب" کہا جاتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خواب کا 'موادِ ظاہر'، 'موادِ مخفی' میں کیسے تبدیل ہو جاتا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے فرائڈ نے "نظام ہائے خواب" (Dream Mechanism) کا تذکرہ کیا ہے۔ فرائڈ نے "نظامِ خواب" کے پانچ اجزا پر روشنی ڈالی ہے، جن کے ذریعے خواب کے مواد بے راہ روی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ "نظامِ خواب" اس طرح ہیں۔

تکثیف: (Condensation) اس کے ذریعے موادِ مخفی کے مختلف اجزا، موادِ ظاہر کے ایک ہی سانچے کے

ذریعے واضح ہوجاتے ہیں۔ یعنی خواب بہت ہی مختصر انداز میں کسی حادثے کو پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر :۔ ایک عورت نے خواب میں ایک ایسے آدمی کو دیکھا جس کی جسامت بہت ہی چوڑی چکلی تھی۔ اس کی لمبائی چوڑائی اس کے والد سے ملتی جلتی تھی جس نے اُسے بچپن سے ہی سخت پابندیوں میں جکڑ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ ایک سپاہی سے بھی ملتا تھا جس سے خواب دیکھنے والی عورت بچپن سے ہی خوف کھاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس آدمی کی آنکھیں اس کی ساس سے ملتی تھیں جس سے وہ نفرت کرتی تھی۔ اس طرح بہت سارے خیالات کا ایک ہی دائرے میں سمٹ کر نظر آنا ہی تکثیف کہلاتا ہے۔

بے محلی (Displacement)

اس نظام خواب کے ذریعے آدمی کی لاشعوری خواہشات کسی خاص آدمی یا حادثہ سے متعلق نہ ہو کر خواب میں کسی دوسرے انسان یا حادثے کے ذریعے ظاہر ہوتی ہیں۔ یعنی اس فعل کے ذریعے کسی خاص انسان کی جگہ کوئی دوسرا انسان ہی دکھائی دیتا ہے۔ یعنی ایک نرس نے خواب میں دیکھا کہ ایک لال گھوڑا اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ خواب کی تشریح سے پتہ چلا کہ وہ نرس جرمن تھی اور اپنے ڈاکٹر سے محبت کرتی تھی۔ ڈاکٹر کا نام فریڈ تھا اور اس کے چہرے پر لال داڑھی تھی جرمن میں گھوڑے کو فریڈ کہا جاتا ہے۔ لہٰذا بدلی ہوئی شکل میں اُس نے دیکھا کہ لال گھوڑا اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

علامتی شکل (Symbolization)

یہ خواب کا ایک اہم حصّہ ہے۔ اس کے ذریعے ہی لاشعوری خواہشات خوابوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔" احتسابِ خواب" (Dream Censor) کی بنیاد پر غیر مہذب یا غیر سماجی خواہشات جو کہ لاشعور میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں، ایک علامت کی شکل اختیار کر کے سامنے آجاتی ہیں۔ فرائڈ نے کچھ "آفاقی علامتوں" (Universal Symbols) کا تذکرہ کیا ہے جن کے سہارے لاشعوری خواہشات شکل بدل کر خوابوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ فرائڈ کے مطابق سبھی علامتیں جنس (Sex) سے ہی وابستہ ہوتی ہیں۔ کیوں کہ خوابوں میں جو لاشعوری خواہشات ظاہر ہوتی ہیں وہ عموماً جنسی ہوتی ہیں۔ فرائڈ نے درج ذیل اہم علامات لکھی ہیں:

بوتل، جہاز، کشتی، صندوق، ڈبہ، مینہ، غار وغیرہ وغیرہ۔	عورتوں کی اندام نہانی سے وابستہ۔
بندوق، سانپ، پیڑ، درخت، ہتھیار، کھمبے، چھاتا، ڈنڈا، کنول ٹائی وغیرہ	مرد کے اعضائے تناسل سے وابستہ۔
چڑھنا، اترنا، ہوا میں اُڑنا، سفر کرنا، تیرنا، ناچنا وغیرہ۔	مباشرت سے وابستہ۔
آم، امردو، سیب، ناسپاتی، دیگر گول چیزیں وغیرہ۔	عورتوں کے پستان سے وابستہ۔
چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے یا دوسرے جانور وغیرہ۔	بھائی، بہن سے وابستہ۔
خدا، بادشاہ یا عظیم شخصیت وغیرہ	والدین سے وابستہ۔
سفر کرنا	موت سے وابستہ۔
گھر	انسان سے وابستہ۔

ڈرامائی شکل: (Dramatization):

اس نظام خواب کے ذریعے انسان کی لاشعوری خواہشات خواب میں مجرد شکل میں نہ آکر معین شکل میں آتی ہیں۔ یعنی جس طرح ڈرامے میں منظر یکے بعد دیگرے سلسلے وار آتے رہتے ہیں اسی طرح خواب کے مواد بھی سلسلہ وار

سامنے آتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اس ڈرامائی شکل کی وجہ سے بھی خواب دیکھنے والوں کی بے راہ رَو خواہشات کی شکل اخذ کر لیتے ہیں جس سے خواب کے موادِ ظاہر کو دیکھ کر ان کا صحیح علم حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ثانوی مفصل بیان (Secondary Elaboration):

عام طور پر ایسا احساس ہوتا ہے کہ خواب کی باتیں بے معنی اور غیر منطقی ہیں لیکن خواب کے بعد جب انسان جاگتا ہے وہ خواب کو بامعنی اور منطقی بنا کر پیش کرتا ہے۔ بیداری کی حالت میں انسانی شعور کام کرتا رہتا ہے، لہٰذا اس کی اَنا (ا کسی بھی مواد کو منطق سے منسلک کر کے دیکھنا چاہتی ہے۔ نتیجتاً انسان بکھرے ہوئے خوابوں کو ایک خاص سلسلے میں منظ کر کے بیان کرتا ہے۔ خوابوں کی تشریح سے پتہ چلتا ہے کہ انسان خواب کے مختلف پہلوؤں کو اس طرح موڑ دیتا ہے کہ ا صورت بالکل ہی بدل جاتی ہے۔

اس طرح درج بالا پانچ نظام ہائے خواب کی بنیاد پر فرائڈ نے یہ بتایا ہے کہ کس طرح خواب کا موادِ ظاہر موادِ مخفی میں تبدیل ہو جاتا ہے جس سے خواب میں دیکھے گئے واقعات کو سمجھنے میں دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس مذکورہ نظام کی تفہ کے بغیر خواب کی تشریح مشکل ہو جاتی ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خواب نیند کے لیے نقصان دہ ہے لیکن فرائڈ نے خواب کو نیند کا نگراں کہا ہے۔ DREAM IS THE GUARDIAN OF SLEEP کیوں کہ پریشانیاں، خواہشات کی عدم تکمیل یا محرومی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ خواب ذریعے انہی کے لاشعوری تجربات کی تکمیل ہوتی ہے اور انسان فرحت سے ہم کنار ہوتا ہے۔

جواہر لال نہرو کے نام خواجہ حسن نظامی کا تعزیتی خط

۱۰ فروری ۱۹۳۱ء

بھائی جواہر لال کو سلام

جب بڑے بڑے آدمیوں کے تار اور خط پڑھ چکے اور تھک گئے تو آخر میں کئی دن کے بعد ایک واقعی چھوٹے آدمی کا تعزیت نامہ بھی پڑھیے۔

آپ کے والد بادشاہ ہوتے تو آپ کو ان کے مرنے کی جلدی ہوتی مگر وہ غلط اور انسانیت کش بادشاہی کے خلاف تھے۔ اس لیے آپ نے ایک سعادت مند بیٹے کی طرح ساری رات بیمار باپ کے پہلو میں جاگ جاگ کر بسر کی اور آپ کو اُن کی جدائی کا صدمہ، قلق اور الم ہوا۔

مجھے ہر قسم کی بادشاہی سے محض اس وجہ سے اختلاف ہے کہ وہ اولاد کو ماں باپ کا دشمن بنا دیتی ہے اور اولاد بادشاہی اور دولت پر جلدی قبضہ کرنے کے لیے ماں باپ کا مر جانا چاہتی ہے۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے والد میرے دوست تھے کیوں کہ وہ علمیت وغیرہ لیاقت میں اتنے بڑے تھے کہ میں ان کی دوستی کا دعویٰ اپنی بے تمیزی سمجھتا ہوں، لیکن وہ مجھ کو جانتے تھے اور میں بھی ان کو سمجھتا تھا اور مجھے ان کی جدائی اور دنیا سے مفارقت اپنی سمجھ کی بنا پر اپنا ایک ذاتی صدمہ معلوم ہوتی ہے۔

خدا آپ کو صبر دے اور آپ ہندوستانی شرفا کی وضع داری کا ویسا ہی پورا نمونہ ہوں جیسے آپ کے والد ماجد تھے اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ کیوں کہ اس کے آثار موجود ہیں۔

اگر آپ کو ہندوستان کے چھوٹے بڑے کروڑوں آدمیوں کی دلی ہمدردی حاصل ہو جانے کے بعد ایک ایسے آدمی کے اظہار ہمدردی کی بھی ضرورت ہو جو خام تھا اور پختہ ہونے سے پہلے سوختہ ہو گیا تو میری مخلصانہ وصادقانہ ہمدردی کا یقین فرمایئے۔

آپ کو سچ مچ بھائی سمجھنے والا۔ حسن نظامی۔

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ء

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس لائبریری کا سنگِ بنیاد بھی اسٹریچی ہال کے سنگِ بنیاد کے ساتھ ساتھ ہی رکھا گیا تھا جو بانیٔ درس گاہ محسنِ قوم، مفکرِ زماں اور نابغ العصر بہادر محسنِ قوم سر سید علیہ الرحمہ کی موجودگی میں تعمیر میں آیا تھا۔ یہی وہ مرکز تھا جو اب بدل کر مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور جو پورے ایشیا میں اپنی نوع کا ایک یا دو ثانی رکھتی ہے۔ جگہ اور وسعت کی تنگ دامانی کے باعث وہ محدود ضرور تھی تاہم مختلف شعبوں میں سیمینار لائبریریاں فراہم کرکے کتابوں کی منتقلی در اصل اسی لائبریری کی توسیع تھی۔ آج بہرحال حالات مختلف ہیں۔

اس وقت یونیورسٹی کے لائبریرین بشیر الدین صاحب تھے جو بعد میں پروفیسر بھی ہو گئے تھے۔ ان کے ہی دور میں لائبریری سائنس کے سرٹیفکیٹ اور مابعد ڈپلوما کورسز شروع کیے گئے اور اب تو ماشاء اللہ نہ صرف بی۔ ایس اور ایم۔ ایس بھی ہے بلکہ ایک مستقل شعبہ لائبریری سائنس کا قائم ہو چکا ہے جس میں تحقیق کا کام بھی ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ۱۹۹۵ء میں اکثر اچھی لائبریریوں اور خصوصاً مختلف یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں بنانے علی گڑھ کے لائبریرین کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں یہ کلاسیں عام طور پر شام کو ہوا کرتی تھیں اور کوئی بھی طالب علم اپنی اصل تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کورس میں بھی داخلہ لے سکتا تھا۔

اس طرح کے کئی اور کورسز تھے جو ایک ساتھ کیے جا سکتے تھے۔ مثلاً مختلف بیرونی زبانوں میں سرٹیفکیٹ جیسے فرانسیسی، جرمن اور ۱۹۵۱ء میں عربی میں بھی داخلے لیے جا سکتے تھے۔ بی۔ ٹی ایچ بھی ایم۔ اے کے ساتھ ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ ایل ایل۔ بی بھی ایم۔ اے کے ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح تجوید کے لیے بھی داخلے ہوتے تھے۔ مگر کافی عرصے تک تعلیم (یعنی تھیوری اور پریکٹس) کے بعد حاضری اور امتحان اور پھر نتائج کا اعلان ہونے کے باوجود اس کا کوئی سرٹیفکیٹ نہیں ملتا تھا۔ اس کی تفصیلات انشاءاللہ بعد میں آئیں گی۔

ہم بات سائرن کی کر رہے تھے جو اب (۱۹۹۵ء میں) شاید صرف یاد ماضی کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہرحال اُس وقت بھی چاند ہونے کی اطلاع، سحر اور افطار کے اوقات کے اعلان کے لیے یہ استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ یہی سائرن اگر بے وقت تین بار بج جائے تو یہ اس بات کی علامت تھا کہ خدانخواستہ کوئی طالب علم یا استاذ اللہ کو پیارا ہو گیا اور پھر اس کے فوراً بعد کمرے کمرے نوٹس پہنچ جاتا تھا کہ کس کا انتقال ہوا ہے اور جنازہ کب اور کہاں سے اُٹھے گا۔ یہی سائرن اگر چھ بار بجتا تو یہ اس بات کی علامت ہوتا کہ دنیا کا کوئی بڑا آدمی نہ رہا اور اگر کہیں سات بار بجتا تو یہ سننے والوں کے لیے منحوس ترین خیال کیا جاتا۔ اس لیے کہ یہ صرف یونیورسٹی کے سربراہ یا پھر سربراہ ملک کی رحلت کی اطلاع کے لیے مخصوص تھا۔

انتقال کی اطلاع بذریعہ سائرن، بہرحال دلوں میں ہیجان پیدا کرتی تھی۔ بعض کمزور دل کے لوگوں کے لیے تو واقعی یہ کچھ عجیب ساحول پیدا کر دیتی۔ مرحوم ذاکر صاحب جو اُس وقت بحیثیت وائس چانسلر نئے نئے آئے تھے خود دل کے مریض تھے چنانچہ وہ خود بھی اس طریقۂ اطلاع کے حق میں نہ تھے۔ اُن کے زمانے میں اسی سے متعلق ایک انتہائی تاریخی واقعہ رونما ہوا جو اگرچہ ان کے آنے کے کئی سال بعد وقوع پذیر ہوا تسلسل کے لیے یہیں درج کر رہا ہوں۔

ذاکر صاحب کسی کام سے دہلی تشریف لے گئے تھے۔ غالباً اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈ پڑنے لگی تھی۔ ریڈیو سے اطلاع ملی کہ لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ چوں کہ وہ علی گڑھ کے اولڈ بوائے بھی تھے اور اسٹوڈنٹس یونین کے صدر بھی رہ چکے تھے اُس وقت کی کابینہ یہ چاہتی تھی کہ لیاقت علی خاں کے انتقال کی

ئے اور فوراً ایک نوٹس جاری کروایا کہ دوسرے دن اے بی اسٹریچی ہال میں ایک انتہائی اہم جلسہ ہوگا جس کو وائس چانسلر (ذاکر ب) خطاب کریں گے۔ غالباً اپنی نوعیت کا یہ پہلا اور آخری جلسہ تھا۔

دوسرے دن گیارہ بجے سے پہلے تمام کلاسیں ختم کر دی گئیں اور اسٹریچی ہال میں تمام پروفیسر صاحبان، اساتذہ، طلبا حتی ٰ تدریسی عملے کے لوگ بھی پابندیٔ وقت سے آموجود ہوئے۔ ہر شخص دم بخود تھا۔ ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب ٹھیک تشریف لائے اور انھوں نے اپنی تقریر انگریزی میں شروع کی۔ تقریر کیا تھی پھول جھڑ رہے تھے۔ وہ ہمیشہ اردو میں ہی بولتے مگر غالباً جذبات کی فراوانی کے باعث موصوف نے یہ تقریر انگریزی میں کی۔ کم از کم اس خاکسار نے اُن کی پہلی اور آخری انگریزی میں سنی جو قطعی فی البدیہہ تھی جس میں کرب تھا، شکوہ تھا لیکن وہ پدرانہ شفقت سے بھرپور تھی۔ ایوان پارلیمان میں اور ٹی وی پر تقاریر پہلے سے لکھی ہوئی ہوتی ہیں اور صرف پڑھ دی جاتی ہیں لیکن یہ مقالہ اُن کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہے تھے اس پر ضرب کاری لگی تھی۔ تقریر کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا:۔

"مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ میں بڑی توقعات کے ساتھ یہاں آیا تھا، مگر حال کے واقعات سے مجھے سخت تکلیف ہوئی ہے۔ آپ کے والدین نے آپ کو یہاں کس لیے بھیجا ہے؟ کیا اس لیے کہ آپ اپنی بہنوں پر آوازے کسیں؟ کیا یہی علی گڑھ تہذیب ہے؟

اور پھر اُس رات جو کچھ آپ نے کیا۔ کیا وہ سنجیدہ لوگوں کے طور طریقے ہیں؟ آپ کو شاید نہیں معلوم کہ مرحوم لیاقت علی میرے ہم جماعت تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سے اور وہ بھی اس انداز میں جس طرح آپ نے مجھے دی ہے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھ پر کیا اثر ہوا ہوگا، مگر آپ تو جوشیلے لوگ ہیں، آپ کو ہوش سے کام لینے کی کیا ضرورت۔

اس کے علاوہ آپ کا وہ قدم! جب آپ کے رجسٹرار نے جو آپ کے بڑے ہیں، آپ کو سائرن بجانے کی اجازت نہیں دی تھی تو آپ کو اُن کا کہنا مان لینا چاہیے تھا۔ مگر آپ نے جو مظاہرہ کیا اُس سے اخبار والوں کو موقع ملا اور دیکھا ہے آپ نے کیا کیا کچھ لکھا ہے ان لوگوں نے آپ کے بارے میں۔ چوں کہ گزشتہ ایگزیکیٹو کونسل کی میٹنگ میں یہ بات طے ہو چکی تھی کہ اب کسی کے انتقال کی خبر بذریعہ سائرن نہیں دی جائے گی، رجسٹرار نے آپ کو منع کیا تھا۔ صرف اس نوٹس کا جاری کرنا باقی رہ گیا تھا کہ یہ سانحہ عمل میں آیا۔ آپ کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ آپ کے بڑے کسی بات کے لیے آپ کو منع کر رہے ہیں۔ کیا میں امید کروں کہ اس طرح کی کوئی بات مستقبل میں دہرائی نہیں جائے گی۔۔۔۔"

پھر طلبا نے فوراً جا کر ذاکر صاحب سے معافی مانگی اور رمضان اُن کے طور طریقوں میں یک دم ایک تبدیلی محسوس کی جانے لگی۔

(باقی آئندہ)

بھی یہ خواہش انگڑائی لینے لگی کہ اس میں ان کا بھی مناسب حصّہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہر وہ منظوری جس کی اداروں کو ضرورت ہوتی ہے بیسہ کا کھیل بن گئی۔ وہ ادارے کے قیام کی منظوری ہو، وہ حکومت کی امداد جاری ہونے کا معاملہ ہو، جاری شدہ امداد کی رقم کی وصولیابی ہو، اسکول میں نئی جماعتوں کے کھولنے کی بات ہو۔ سرکاری عملہ کو ان کا "حق" ملنا چاہیے۔ ایک اسکول کی منظوری کے سلسلے میں معائنہ کے لیے جو افسر تعلیمات علی گڑھ آئے تو یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ خورجہ جانا چاہتے ہیں۔ گاڑی کے پٹرول کے مصارف تو اسکول کو دینا ہی تھے۔ صاحب نے چار پانچ ہزار روپیے کا چینی کا سامان خریدا اور بل اسکول کے ذمہ داروں کو دے دیا۔ مزید کے بھی طلب گار ہوئے۔ منظوری کے کاغذات کو آگے بڑھانے کے لیے اسکول کو تقریباً پندرہ ہزار روپے کا زیر بار ہونا پڑا۔ ایک اور اسکول میں نئے سیکشن کھولنے کی منظوری کے سلسلے میں افسر تعلیم معائنہ کے لیے آئے تو موٹر کے پٹرول کی قیمت تو طلب کی ہی ساتھ ہی اس کا ٹائر بدلوانے کا بوجھ بھی اسکول پر ڈالا۔ اپنی نوعیت کی یہ کوئی تنہا مثالیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ صورت حال اتنی عام ہو چکی ہے کہ اب کسی کو اس سے مفر نہیں۔ اس سے گریز کریں تو سیکڑوں اعتراضات وارد ہوں گے جن کو دور کرنا شاید ممکن نہ ہو اور کوئی معمولی سا کام بھی رو براہ نہ ہو سکے۔ لیکن اس صورت حال کی بنیاد تو انتظامیہ نے فراہم کی ہے۔ افسران کو معلوم ہے کہ انتظامیہ اداروں سے خود متمتع ہو رہی ہے۔ پھر ان کو اس میں سے حصّہ کیوں نہ ملے اور یہ ایسا "چکر" شروع ہو گیا ہے جس سے نکلنا دشوار ہے۔

ان تمام باتوں کے بُرے اثرات اداروں پر پڑ رہے ہیں۔ یہ تعلیم گاہوں کے بجائے سیاست کے اکھاڑے بن گئے ہیں۔ ان کے مختلف عناصر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ ان کے تعلیمی معیار برباد ہیں۔ پڑھنے لکھنے کا کوئی ماحول نہیں ہے۔ طلبا کو پڑھنے سے زیادہ تضییع اوقات کے کاموں میں دلچسپی ہے۔ وہ ہر طرح کی بے راہ روی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اسی سے ہر طرح کی لاقانونیت جنم لے رہی ہے۔ اسکولوں کی عمارتیں خستہ ہو ہو کر اپنے بانیین کی نوحہ خوانی کر رہی ہیں۔ ان میں ترقیاتی کام نہیں ہو رہے ہیں۔ ایسے ہائی اسکول/انٹر کالج ہیں جو پچاس پچاس سال سے اپنی حالت پر قائم ہیں یعنی ہائی اسکول کو انٹر کالج یا انٹر کالج کو ڈگری کالج بننے کی توفیق نہیں ہوئی۔ بیشتر اداروں میں سائنس کی تعلیم کے لیے معمل نہیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تباہی کی جس منزل پر یہ ادارے پہنچ چکے ہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے لیکن اب اس زوال اور پس روی کو رُکنا چاہیے۔ اس صورتِ حال میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ انتظامیہ کو خود کو تبدیل کرنا چاہیے۔ سیاسی طالع آزماؤں کو تعلیمی اداروں کو معاف کر دینا چاہیے اور سیاست کے میدان میں قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ معاشرے میں اس انحطاط و زوال پر کافی بے چینی ہے۔ بدعنوان انتظامیوں کے خلاف فضا پیدا ہو رہی ہے اور ان کو ہٹا دینے کے لیے نوجوان ذہن مضطرب ہیں لیکن انقلاب کے مقابلے میں اصلاح کا عمل ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔ اداروں سے منسلک لوگوں کو خود کو تبدیل کر لینا چاہیے اور اداروں کی قرار واقعی خدمت انجام دینا چاہیے، قبل اس کے کہ ان کو اس سے محروم ہو جانا پڑے۔

"ہر فرد کو حق ہے کہ وہ ایسی تعلیم حاصل کرے جس سے اس کی صلاحیتیں اجاگر ہو سکیں اور وہ مکمل طور پر انسانی زندگی بسر کر سکے۔" (مولانا ابوالکلام آزاد)

مذہب ہی جمہوریت کی بنیاد ہے کیونکہ انسانی اور سماجی زندگی کو ثبات اور معیار بغیر مذہبی دباؤ کے ممکن نہیں ہے۔

"قابل قبول علوم میں مذہبی علوم اولیت کا درجہ رکھتے ہیں اور کسی جمہوری نظام میں بچوں کو یہ معلوم ہونا لازمی ہے کہ مذہب نے عملی زندگی کا کیا تخیل پیش کیا ہے، اس میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ مادیت تخریب کے جذبے کو تقویت پہنچاتی ہے اور روحانیت تعمیر کا جذبہ تیز کرتی ہے۔" (پروفیسر گارفورتھ)۔

"ہندوستانی رواج کے مطابق تعلیم محض کمائی کا ذریعہ نہیں نہ محض خیالات کے جمع کرنے کا نام ہے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اس سے انسان کی روح کی تربیت اس طرح ہو سکے جس سے وہ صداقت اور نیک کاموں کو اپنا شعار بنا سکے۔" (رپورٹ آف یونیورسٹی ایجوکیشن ۱۹۶۴ء)

"تعلیم کا بنیادی خیال جو پورے نظام تعلیم پر حاوی ہونا چاہیے یہ ہے کہ تعلیم اس کوشش کا نام ہے جو بچوں کے والدین اور سرپرست اس نظریۂ حیات پر (جس پر وہ عقیدہ رکھتے ہیں) اپنی نئی نسل کو تیار کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ "مدرسہ" کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اُن روحانی طاقتوں کو جو اس نظریۂ حیات سے وابستہ ہیں طالب علم پر اثر ڈالنے کا موقع دے اور وہ طالب علم کو ایسی تربیت دے جو اس قوم کی زندگی کے تسلسل و ترقی میں طالب علم کی دستگیری کرے اور اس کے ذریعہ وہ مستقبل کا سفر جاری رکھ سکے۔" (سر پرسی نین، مشہور برطانوی ماہر تعلیم)

انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں کے تعلیمی مسائل :

اٹھارویں صدی کے اوائل میں انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جم چکے تھے اور رفتہ رفتہ ہندوستان کا زیادہ سے زیادہ رقبہ ان کے زیر اثر آتا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کی ۹ سو سالہ حکومت زوال کے آخری مرحلے میں تھی۔

۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی دوبارہ تجدید ہوئی اس میں خاص طور پر برٹش علاقے کے باشندوں کے لیے ایک لاکھ روپیے کی رقم سائنس اور لٹریچر کی تعلیم کے لیے مخصوص کی گئی۔ اس پالیسی سے فائدہ اٹھا کر راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں ۱۸۱۷ء میں ایک ایسوسی ایشن بنا کر ایک ہندو کالج قائم کیا جس کا مقصد ہندوؤں کا انگریزی اور سائنس کی تعلیم دینا تھا۔ ۱۸۱۸ء میں کلکتہ کے بشپ نے ایک کالج قائم کیا جس کا مقصد عیسائیوں کو بائبل اور انگریزی کی تعلیم دینا تھا، لیکن مسلمانوں نے اپنے کو علیحدہ رکھا۔ انگریزوں اور عیسائی مشنریوں کے طرز عمل سے انھیں خطرہ تھا کہ اس طرح ان کے بچوں کو اسلامی تعلیم سے محروم کر دیا جائے گا اور ان کے دل و دماغ میں عیسائیت کی تعلیم اتار دی جائے گی۔

اس دور کے ممتاز ہندوؤں نے یہ فیصلہ پسند کیا جنھیں سنسکرت کے بجائے انگریزی سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس کے برعکس کلکتہ کے ۸ ہزار مسلمانوں نے جن میں ہر مکتبہ خیال کے لوگ تھے گورنر جنرل کو درخواست دی کہ اس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب کی تعلیم نہ دے کر ان کو عیسائی بنا لیا جائے۔

۱۸۳۵ء میں میکالے کی مشہور زمانہ تجویز منظور ہو گئی جس میں یہ طے کیا گیا کہ گورنمنٹ اپنے فنڈ کا بڑا حصہ انگریزی اور سائنس کی تعلیم پر صرف کرے گی، چند برسوں میں کثرت سے مشنری اور سرکاری اسکول پورے ملک میں کھل گئے۔

وجس کی عمر طبعی غالباً قریب آ گئی ہے اپنی حالت پر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاوے سائنس یعنی علم اب چند خانگی مدرسوں میں بند نہیں ہے جہاں خاص لوگوں کے سوائے علم کو پہنچانا مشکل ہو۔ نہ وہ چند پاک کتابوں میں مقفل ہے جس کا کھولنا بجز مقدس ہاتھوں کے اوروں کو منع ہو، نہ وہ استعارہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا سمجھنا مشکل ہو، نہ وہ ان اسرار الٰہی میں سے ہے جس کے سمجھنے کے لیے اب الہام اور کشف صدور کی ضرورت ہو۔ بلکہ سائنس اب ان تمام چیزوں سے آزاد ہے، اس نے اپنے سارے طوق و سلاسل توڑ دیئے ہیں، جو اصول فلسفیوں کے سینے میں بند تھے وہ اب بچوں کی زبان پر ہیں، اور وہ باتیں جن کا زبان پر لانا مشکل اور منع تھا ان دنوں نقل مجلس ہو رہی ہیں۔ علم اب نظری نہیں رہا کہ منلق کی بھول بھلیوں میں گھومتا رہے بلکہ وہ اب آسان، دل پسند، ہر دل عزیز اور زندگی میں داخل ہو گیا ہے۔ لیڈیاں علم پر کتابیں لکھتی ہیں، مدرسہ کے لڑکے ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ پر بحث کرتے ہیں۔ اخباروں میں علمی مباحثے چھپتے ہیں۔ قلی اور مزدور تک علمی باتیں سمجھتے ہیں، ہر روز ایک نئی تحقیق اور جدید انکشاف کی خبر آتی ہے، ہر رسالہ اور ہر پرچہ اور ہر خبر کے کاغذ میں کوئی نہ کوئی نئی بات نظر پڑتی ہے۔ غرض کہ ان دنوں دلوں میں ایک نئی تحریک پیدا ہو رہی ہے الہامی باتوں پر اعتقاد دن بدن کم ہوتا جاتا ہے۔ تحکمانہ اور تقلیدی مذہب کا زور روز بروز گھٹ رہا ہے۔ مذہبی مسائل کے لیے علم کی سند مانگی جاتی ہے۔ کوئی چیز سوائے تحقیق کے مقدس اور پاک نہیں مانی جاتی۔ یا دلیل اور ثبوت کے بغیر کسی بات کی سچائی دل میں نہیں بیٹھتی ہے۔ اب اسے کوئی برا سمجھے یا اس پر افسوس کرے، یا چند قطرے آنسو کے بہاوے، مگر زمانہ تحقیق اور علم کا ہے اور اس کا اثر روز بروز مذہب پر پڑتا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے حالات سے جن کو واقفیت ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مذہبی عقائد سے بہت کچھ انحراف ہو گیا ہے۔ دہریت اور لاادریت وبا کی طرح پھیل رہی ہے۔ مذہبی باتوں میں نہ صرف شک اور شبہے کیے جاتے ہیں، بلکہ بغیر کسی خوف یا شرم کے ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ دہریت کے شعلے ہر مقام پر بلند ہو رہے ہیں۔ چرچ اور گرجے ہر جگہ جلتے نظر آتے ہیں۔ ایسے نازک زمانے میں جو مذہب کے نادان دوست ہیں وہ صرف افسوس کرنے پر قانع ہیں، مگر جو لوگ مذہب کی عاقلانہ حمایت کرنے والے ہیں، وہ مذہب کی بنیاد علم اور فطرت پر قائم اور دینی عقائد کو علم و فطرت کے مطابق ثابت کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ اسلامی دنیا میں عموماً اور ہمارے ہندوستان میں خصوصاً نہ صرف الحاد اور دہریت کے پھیلنے کی مصیبت ہے بلکہ اب تک مذہب کی حمایت کا جیسا کہ اس زمانے میں درکار ہے کسی کو خیال بھی نہیں ہے۔ ان ملکوں میں جہاں اسلامی سلطنت اب تک قائم ہے شاید دُرّوں اور فتووں سے کسی قدر مذہب کی حفاظت کی جاتی ہو۔ مگر دلوں کے شک اس سے دور نہیں ہو سکتے، اور مذہب جس کی بنیاد یقین پر ہے وہ ان تدبیروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اور ہمارے یہاں تو یہ کٹھ کے ہتیار بھی نہیں ہیں، نہ سوائے کفر کے فتووں کے مذہب کے بچانے کا کسی کے پاس کوئی اور ہتیار ہے۔ اور کفر کے فتووں کا یہ حال ہے کہ، یا پنساریوں کی پتریوں میں کام آتے ہیں، یا اس سے پہلے کہ ان کی سیاہی خشک ہو انھیں دیمک کھا لیتی ہے۔ ایسے زمانے میں جو شخص مذہب کی حمایت عاقلانہ طور پر کرے، اور مذہبی عقائد کو قوانین قدرت سے ملانے میں ساعی ہو۔ وہ درحقیقت نہ صرف سچا مومن اور پکا دیندار ہے، بلکہ مجاہد فی سبیل اللہ اور جہاد اکبر کے ثواب اور تمام مسلمانوں کی شکر گزاری کا مستحق ہے۔ اور چونکہ سید صاحب نے یہ بڑا کام اپنے ذمے لیا ہے، اور اس جہاد اکبر کا جھنڈا اٹھایا ہے، اس لیے اسلام ان کا شکر گزار ہے، اور تمام مسلمانوں پر ان کا احسان ہے۔ رہا یہ امر کہ کہاں تک وہ اس میں کامیاب ہوئے اور ہو سکتے ہیں، اس کا ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے، کہ ادنیٰ جہاد کے لیے بھی اعوان و انصار کی ضرورت ہوتی ہے، اور ایک آدمی کو ——

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۵ء

"میں تمہارے لیے دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک قرآن اور دوسری سنت۔ تم میں سے جو کوئی ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہے گا وہ گمراہ نہیں ہو سکتا۔"

دینی علوم کا سرچشمہ دراصل یہی دونوں چیزیں ہیں جنہیں پکڑے رہنا گمراہ ہونے سے بچنے کے لیے ضروری ہے ان کا چھوڑنا ہم سب کے لیے ہلاکت و موت کا باعث ہوگا لیکن ہمارا کام صرف یہی نہیں ہے کہ ہم گمراہ ہونے سے بچتے رہیں اور جنت حاصل کرنے کی تگ و دو بس ہماری ذات تک ہی محدود ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ ـــــ

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر و تومنون باللہ ط" یعنی تم بہترین امت ہو جو انسانوں کے لیے نکالی گئی ہو۔ تم بھلائی کا حکم دیتی ہو اور برائی سے روکتی ہو اور اللہ پر ایمان رکھتی ہو۔"

خاتم النبیین کی امت ہونے کے ناطے ہم پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بہت بڑی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور یہ کام ہمیں کسی ایک یا چند خطوں میں محدود ہو کر وہیں کے انسانوں کے لیے نہیں کرنا ہے بلکہ پوری دنیا میں اور پوری دنیا کے انسانوں کے لیے ہمیں یہ کام کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم اپنے ان فرائض منصبی کو ادا کرنے کے لیے جد و جہد شروع کریں گے تو ہمیں مختلف اصول و نظریات کے لوگوں کے مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ ان مسائل و مشکلات کی تفہیم اور اس کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش ان مختلف اصول و نظریات کے بغیر تفصیلی علم کیوں کر ممکن ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس پر غور کرنے سے "عصری علوم" سے ضروری حد تک واقفیت کی ضرورت و اہمیت سمجھ میں آتی ہے

مذکورہ بالا سطور میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کی روشنی میں اسلامی نقطۂ نظر سے دینی و عصری علوم کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لہذا تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دینی و عصری علوم حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ دینی علوم کی روشنی میں خود بھی اسلامی زندگی گزارنا سیکھیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف بلائیں۔

ہندوستان کی موجودہ صورتحال کے پس منظر میں دیکھا جائے تو آج دینی و عصری علوم میں توازن پیدا کر کے کام کرنے کی سخت ترین ضرورت سمجھ میں آتی ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان ایک مذہب پسند ملک ہے۔ یہاں سبھی باشندے کسی نہ کسی مذہب کو ضرور مانتے ہیں۔ ان کے مذہب سے گہرے لگاؤ کی بنا پر ہی یہاں کا مفاد پرست حلقہ ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر اپنا الو سیدھا کرتا رہا ہے۔ موجودہ دور میں بھی ایسا کیا جا رہا ہے۔ لہذا ایسی صورت میں بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے عام باشندوں کو صحیح مذہبی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے۔ خاص کر اسلامی تعلیمات کو عام کرنا ضروری ہے اور موجودہ نام نہاد ترقی یافتہ دور میں اسلام ہمارا ساتھ کہاں تک دے سکتا ہے۔ اس نکتہ کو سمجھانے کی سخت ضرورت ہے۔ یہ کام عصری علوم سے ضروری حد تک واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔

ہندوستان میں ایک خاص طبقہ یہاں کے عوام کو اسلام اور اسلامی تعلیمات سے متنفر کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ ان کی کوششوں کو سمجھنا اور انہیں ناکام بنانے کے لیے جد و جہد کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے بھی دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے واقفیت ضروری ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ دینی و عصری علوم میں توازن پیدا کرنے کی کوشش شروع ہو رہی ہے اور دینی مدارس میں بھی عصری علوم کی تعلیم کی گنجائش نکالی جا رہی ہے لیکن ابھی کام کا صرف آغاز ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں غور و فکر کا سلسلہ نہ صرف جاری رکھا جائے بلکہ اس میں تیزی لائی جائے۔

بھی اتنی ہی آسانی سے قبول کرلیتی ہے۔ دوسری طرف اس کی گہرائی کی وسعتیں اتنی لا محدود ہیں کہ اسلام کے سوتوں کو خشک نہیں ہونے دیتیں۔

اس شہادت کا پہلا جزو (لا الٰہ الا اللہ) معبود کے لیے انسان کی بیرون سے اندرون کی طرف توجہ کی تشکیل کرتا ہے اور موجودِ حقیقی کو ہر غیر موجود و غیر حقیقی سے ممیز کرتا ہے۔ غیر حقیقی سے ان کا مطلب اللہ کے تعلق سے خارج ہر محسوس یا مقصود چیز ہے کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی بھی چیز جو حقیقی ہو سکتی ہو وہ الٰہی نہ ہو۔ ایمانی اعتقاد ہمیشہ دیگر چیزوں کو اس اللہ سے الگ کرکے دیکھتا ہے جو ہر چیز کی اصل و معنی اور غرض و غایت ہے۔ اسی لیے جب وائٹ ہیڈ نے ایک معبود کے قول یعنی توحید کی تعریف ایک ایسے عقیدے کے طور پر کی جو اللہ کو سلطنت کا قائد، مجسم اخلاق اور آخری فلسفی مبدأ کی صورت میں سمجھتا ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ "فلسفۂ الوہیت کی عظیم رکاوٹ ظہورِ اسلام سے ختم ہو گئی۔"

اس شہادت کا دوسرا جزو (محمد رسول اللہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے اللہ کی انسان کی طرف توجہ ہے، جنھوں نے اللہ کی طرف سے براہ راست موصول قرآن شریف اس کے بندوں تک پہنچایا، اس لیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کے نمائندہ ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کلمۂ توحید خود ایک آیت ہے جس سے بیک وقت تمام آیاتِ قرآنی مراد ہیں اور اس سے تشکیل پانے والی تمام اشیا و الٰہی مبادی کی لسانی علامت ہیں، جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہم سے کلام فرماتا ہے۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "تسبح له السموات السبع والارض ومن فیهن وان من شیئ الا یسبح بحمده ولکن لا تفقهون تسبیحهم (ترجمہ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اس کے حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو)۔ ذاتِ مطلق نبیؐ میں رموز کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ ساری کائنات ذاتِ مطلق کی تھیوفانی (THEOPHANY) تجلی اور اللہ کا ظہور ہے۔

اسلام کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ آزادی و حریت کی اعلیٰ ترین شکل ہے اس لیے کہ وہ انسان کو اس کے نفسانی منافع اور اس کی محدود طماع آزمائیوں سے نجات دلاتا ہے اور چاہتا ہے کہ مقابلہ آرائی، فائدہ یا ترقی کا کوئی بھی اندھا مقصد لوگوں کو ان کے مصدرِ اول اور آخری مقصد یعنی اللہ تعالیٰ سے غافل نہ کردے۔ اس لیے کہ اللہ ایک ایسی قوت ہے جو تمام قوتوں سے بلند ہے۔

اسلامی عقیدے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے کہ "اقتدار" کی طرح "دولت و ثروت" بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے اور بندے صرف اس کے منتظم اور اس سے فائدہ اٹھانے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دنیا کے لیے اس تصور کے اقتصادی نتائج یقیناً بہت زبردست ہوں گے۔

اسلام سے روجیہ جارودی کا پہلا واسطہ ۱۹۴۱ء میں جنوبی جزائر کے جلفہ علاقے میں پڑا جہاں وہ نازی افواج سے مقابلہ کے جرم میں تقریباً پانچ سو قیدیوں کے ساتھ کانٹے دار تاروں کے درمیان سخت پہرے میں قید تھے۔ وہاں انھوں نے قیدی ساتھیوں کے ساتھ اسپینی عالمی گروہ کے پرانے رضاکار رفقا کی حمایت میں مظاہرہ کیا جس پر کیمپ کا افسر بہت غصہ ہوا اور اس نے قیدیوں کو تین بار وارننگ دی، مگر جب وہ نافرمانی سے باز نہ آئے تو اسٹین گن بردار مسلمان جزائری پہرے داروں کو گولی چلانے کا حکم دیا، مگر یہ مسلمان سپاہی سزا اور قتل کی دھمکیوں کے باوجود نہتے قیدیوں پر گولی چلانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ روجیہ جارودی کو پہلے تو اس انکار کا سبب معلوم نہ ہوا، بعد میں ان کو ایک جزائری مددگار نے بتایا کہ "مسلمان سپاہی کو اس کی عزتِ نفس نہتے انسان پر گولی چلانے سے باز رکھتی ہے۔" یہ ان کا اسلام سے پہلا تعارف تھا، جس نے خود ان کے بقول "مجھ کو سوبورن یونیورسٹی میں دس سال تعلیم سے زیادہ انسانیت کا سب سے مؤثر سبق سکھایا۔"

پروفیسر ظہیر م۔ قریشی*

قرآنی نظریہ علم کے سبب

قرآنی رسم الخط کے عالمی اثرات

بیسویں صدی میں بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے انگریزی کا درجہ مسلم ہے کیونکہ جمعیت اقوام سے اقوام متحدہ تک عالمی انجمنوں میں اس کا سکہ چلتا ہے۔ اس سے قبل نوآبادیاتی کھینچا تانی میں یوروپین اقوام نے دنیا میں رومن رسم الخط کو رائج کیا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سی چھوٹی موٹی بول چال کی زبانوں نے رومن یا سیریلک (Cyrillic) رسم الخط کو اختیار کر کے تحریری زبان کا درجہ حاصل کر لیا۔ تاہم یہ عمل اتنا وسیع نہیں تھا جتنا قرآن پاک کے رسم الخط کے اثر سے پیدا ہوا تھا۔ چونکہ طباعت کی ٹیکنولوجی یوروامریکن ماحول میں پروان چڑھی ہے، اس لیے ترکی سواحلی اور بھاشا انڈونیشیا جیسی متعدد زبانوں نے اپنے عربی رسم الخط کو تج کر رومن رسم الخط کو اپنا لیا تاکہ طباعت میں سہولت رہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں عربوں نے ایک عالمگیر سماج کو جنم دیا۔ اور بارہویں صدی تک اس کو علم وفن سے آراستہ کر کے پروان چڑھایا۔ چنانچہ اس دور میں پوری دنیا میں قرآنی رسم الخط کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ نتیجتاً اسپین اور پرتگال سے منگولیا اور چین تک اور دار السلام تک سینکڑوں بول چال کی زبانوں کو تحریری شکل نصیب ہوئی۔ اور یہ خط تہذیب وتمدن کی آماجگاہ بن گیا۔

تھوڑے سے عرصے میں اسلام کا دنیا کے اتنے بڑے خطے میں چھا جانا انسانی تاریخ کا ایک ایسا عجوبہ ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ محققین نے اس کے عمل، پس منظر اور خصوصیات کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے چنانچہ اس کا تفصیلی تذکرہ یہاں مناسب نہیں تاہم یہاں اختصار سے یہ بتانا برمحل ہوگا کہ یہ تاریخی عمل تین ادوار سے گذرا تھا۔ تاکہ ہمارے تجزئے مدلل ہو جائے۔

توسیع کے پہلے دور میں اسلام جزیرہ عرب کی ان اقوام میں پھیلا جو سامی زبانیں بولتی تھیں اور جن سے عربوں کے تجارتی اور ثقافتی رشتے تھے، عربوں اور ان اقوام کے درمیان ثقافتی زندگی اور نقل آبادی کی ساری حدود یکسر چکنا چور ہو گئیں۔ دوسرے دائرے میں وہ اقوام ہیں جنہوں نے دین اسلام تو قبول کر لیا لیکن اپنے مقامی ثقافت کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ پھر تیسرے دائرے میں وہ خطہ ہے جہاں اسلام نے مخلوط سماج کی داغ بیل ڈالی۔ یہاں غیر مسلم مقامی دانشوروں نے مسلم اقلیت کے ساتھ باہمی ردعمل کے ذریعہ مشترکہ تہذیب وتمدن کو ترویج دیا جس پر اقلیت کی ثقافت کی گہری چھاپ تھی۔

---

*پروفیسر شعبۂ سیاسیات دہلی یونیورسٹی ساؤتھ کیمپس، ۱۸۷ ویشالی پیتم پورا، نئی دہلی ۱۱۰۰۳۴

چلاتے وہ ایک بھلا کام ضرور کر جائے گا کہ وہ مریض کا مرض اپنے جسم میں منتقل کرے گا۔ اور اپنے سفر پر روانہ ہو جائے گا اس طریقہ علاج میں عاملوں کی ضرورت کم تھی جلادوں کی زیادہ۔

امراض کو انسانی جسم سے مردہ جسم میں منتقل کرنے کے علاوہ دوسری غیر انسانی اشیاء میں منتقل کرنے کا طریقہ بھی اچھے علاجوں میں شامل تھا۔ مثلاً دانت کے درد کو رفع کرنے کا موثر علاج یہ تھا کہ ایک کیل مسوڑھوں میں پیوست کر کے نکال لی جاتی اور پھر اس خون آلود کیل کو بلوط (Oak) نامی درخت میں گاڑ دیا جاتا۔ اس عمل میں گویا انسانی مرض کو نباتاتی جسم میں منتقل کرنا تھا۔ یورپ میں منہ کے السر اور بچوں کی کالی کھانسی (Whooping Cough) کو پانی میں اس طرح منتقل کیا جاتا کہ ایک زندہ مچھلی چند لمحوں کے لیے مریض کے منہ میں رکھ کر دیا یا تالاب میں پھینک دی جاتی اور باور کیا جاتا کہ ایسا کرنے سے دریا یا تالاب کا پانی تو ضرور آلودہ ہو جاتا ہے لیکن مریض کی جان بچالی جاتی ہے۔ انگلینڈ کے علاقہ لنکاشائر (Lancashire) میں جب کسی کے جسم پر پھنسیاں یا مسے زیادہ ہو جاتے تو ان پر ایک چھوٹی سی خوبصورت کنکری رگڑ کر عام راستہ میں پھینک دی جاتی اور امید کی جاتی کہ جو بھی اس کنکری کو اٹھائے گا اس کے جسم میں پھنسیاں اور مسے ابھرنے لگیں گے۔ اور پہلا مریض ٹھیک ہو جائے گا۔

چھرے یا چاقو سے لگے کاری زخم کو مندمل کرنے کا علاج بھی خوب تھا۔ اور وہ اس طرح کہ اس چاقو کو پہلے حاصل کیا جاتا جس سے زخم ہوا ہے پھر چاقو کو دھو کر اچھی طرح صاف کرنے اور پاؤڈر لگانے کے بعد احترام کے ساتھ کسی صاف ستھرے فرش پر لٹا دیا جاتا اور اس کی خدمت اس وقت تک ہوتی جب تک اس سے لگا زخم پوری طور سے بھر نہ جاتا۔

یورپ اور شام و مصر کے علاقوں میں جہاں روم کا اقتدار تھا گنڈے اور تعویذ بیماری کی اصل اور واحد دوا سمجھے جاتے تھے۔ بعض خاص قسم کی دھاتوں کے گول یا چوکور سکے تعویذ کے طور پر جھاڑ پھونک کے بعد عام طور سے مریضوں کی گردنوں میں لٹکا دیئے جاتے تھے۔ انہیں طلسماں (Talisman) کا نام دیا جاتا۔ ان طلسمات کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سر والٹر اسکاٹ (Sir Walter Scott) نے ایک ضخیم ناول ہی ۱۸۲۵ء میں دی طلسمان (The Talisman) کے نام سے لکھا اور اس میں چند سچی حکایات کا ذکر کیا جن کا تعلق یورپ کے دور جاہلیت سے تھا۔ اس نے لی پنی نامی ایک تعویذ کا قصہ بیان کیا ہے۔ جس میں زبردست طلسماتی خوبیاں سمجھی جاتی تھیں۔ اور جس میں نہ جانے کتنے امراض کا مداوا تھا۔ ایڈورڈ چہارم (Edward IV) کے زمانہ میں (۱۴۸۳ء - ۱۴۴۲ء) اس چاندی کے سکے کو افسانوی شہرت حاصل ہوئی اور یہ یقین کیا جانے لگا کہ جس پانی میں بھی اس سکے کو ڈبویا یا بھگویا جاتا تو اس پانی میں شفائی تاثیر پیدا ہو جاتی۔ یہ پانی وبائی امراض کے لیے اکسیر سمجھا جاتا تھا چنانچہ واقعہ مشہور ہے کہ جب نیو کاسل (New Castle) میں ۱۶۳۲ء میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی اور لوگ بڑی تعداد میں ہلاک ہونے لگے تو چارلس اول (Charles) نے اس طلسمات کو چھ ہزار پونڈ میں چند دنوں کے لیے مستعار لے کر اپنی رعایا کو گویا موت کے منہ سے بچا لیا۔

یونان میں ایس کلے پیس (Aesclapeus) نامی ایک طبیب گذرا ہے (۱۲۵۰ قبل مسیح) جس کی بابت یہ مشہور ہے کہ وہ دواؤں اور دعاؤں کے ذریعہ سے روگیوں کو صحت یاب ہی نہیں کرتا تھا بلکہ مردوں کو زندہ بھی کر دیتا تھا۔ اس کے اس کراماتی علاج سے حاکم وقت کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر موت سے اسی طرح بچتے رہیں گے تو ایک طرف زندہ لوگوں کی آبادی بہت بڑھ جائے گی اور دوسری طرف مردوں کی روحیں کمیاب ہو جائیں گی اور بغیر روحوں کے حکومت کا نظام چلانا مشکل